ماہِ نو

جلد ۸ شمارہ ۱

اپریل ۱۹۵۵ء

مدیر: رفیق خاور

نائب مدیر: ظفر قریشی

چندہ سالانہ:- پانچ روپے آٹھ آنے (پاکستان میں) سات روپے (ہندستان میں) فی کاپی آٹھ آنے (پاکستان میں) دس آنے (ہندستان میں)

کچھ اپنی باتیں

اقبالؒ ـــــ ہمارے پہلے "مردِ آفاقی" اس دور میں پیدا ہوئے جب مشرق و مغرب ایک بار پھر نئے حالات میں ایک دوسرے سے ہمکنار ہو رہے تھے اور ان کے اختلاط سے ایک نئی فضا ابھر رہی تھی جو تاریخی اعتبار سے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے بھی مشرق و مغرب کو کئی بار ایک دوسرے سے میل جول کا اتفاق ہوا تھا۔ اور اس سے بہت ہی دور رس نتائج رونما ہوئے تھے۔ مگر اب کی بار یہ اختلاط پہلے سے کہیں زیادہ وسیع پیمانہ پر رونما ہوا اور اس سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ۔ ایک ایسا یورپ جو محض ایک جغرافیائی ہیئت ہی نہ تھا بلکہ "سفید قوموں کے پشتارہ" کا حامل تھا یعنی وہ ہزارہا سال کے تہذیبی و تمدنی ارتقا کا آئینہ دار تھا اور جو کئی صدیوں پر گرنیہ پا ترقی کر رہا تھا۔ ایک ایسے ایشیا سے دوچار ہوا جو ماقبل تاریخ کے دھندلکوں سے لے کر اب تک ایک باوقار قدامت کا حامل تھا اگرچہ حالات کی ناگریز منطق نے اسے مقابلۃً پس ماندہ ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس آخری مگر سب سے زیادہ وسیع اختلاط نے ایک نیا ماحول، ایک نیا شعور، نئے تقاضے نئی تحریکات اور نئے رجحانات پیدا کئے جن میں اگرچہ مشرق کچھ عرصہ پیچھے ہی رہا اور مغرب کی رفتار برابر تیز رہی مگر جلد ہی مشرق کے یارانِ تیز گام نے بھی منزل تک پہنچنے کی سر توڑ کوشش شروع کر دی۔ فرزندانِ مشرق کے قدرتی جوہر پھر ابھرے اور عالمگیر تحریکیں اور رجحان بروئے کار آنے لگے۔ "شکریہ یورپ" بہت جلد یورپ کے مطالعہ اور تعریض و تنقید میں بدل گیا اور ایک نئی بحث و پز شروع ہوئی۔ مغرب کی سیاست، حکمت، تہذیب، تمدن ہر بات پر سرگرمی سے بحث ہونے لگی اور مشرق کے بھی ہر پہلو کا ٹٹول ٹٹول کر معائنہ کیا جانے لگا اس لئے کہ نوعِ انسان ان دونوں سے بلند تر نظام پیدا کرے۔ اس طرح ایک زیادہ آفاقی نقطۂ نظر رونما ہونے کا امکان پیدا ہوا۔ اور یہ ممکن ہو گیا کہ مشرق کی شوخیٔ فکر مغرب سے آگے بڑھ جائے اور زیادہ پُر مغز افکار سے دانایانِ فرنگ پر بھی غالب آجائے۔

عین اس موقع پر علامہ اقبالؒ میدان میں آئے۔ انہوں نے مشرق و مغرب کے حالات کا پورا پورا جائزہ لیا۔ رفتہ و آئندہ پر بھرپور نظر ڈالی اور ایک ایسا جامع حکیمانہ نقطۂ نظر پیدا کیا جس نے انہیں حقیقی معنوں میں ہمارا پہلا مردِ آفاقی بنا دیا جس کی رفتارِ فکر اپنے ہمعصروں سے بہت آگے تھی۔ ان سے پہلے بھی بعض دیدہ ور پیدا ہوئے جن کی شخصیت عالمی تھی لیکن اقبالؒ نے مشرق و مغرب کو محض سیاسی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ عمرانی اور فکری زاویۂ نگاہ سے دیکھا ـــــ ایک دانائے راز کے زاویۂ نگاہ سے جو زمانہ کی طبیعت کا تقاضا دیکھ لیتا ہے اور ماضی و حال کے تمام اہم سر رشتوں کو ملا جلا کر ان سے اہم ترین بنیادی حقائق کا سراغ لگاتا اور آئندہ امکانات کی نشان دہی کرتا ہے۔ اقبالؒ کا فکر صرف مشرق یا مغرب ہی نہیں بلکہ تمام نوعِ انسان کو محیط ہے اور اس لئے محض آفاقی بھی نہیں بلکہ اس سے بھی ایک درجہ آگے ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اب مغرب بھی وہ مغرب نہیں رہا جو اپنے علم و حکمت کے نشے میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا آج یورپ کے کئی اربابِ دانش کی نظریں مشرق کی طرف اٹھ رہی ہیں اور وہ اقبالؒ کے نظریات پر غیر معمولی توجہ دے رہے ہیں۔ ان حکماء کے خیالات لازماً جمہور پر اثر انداز ہوں گے۔ اور آگے چل کر نئی نئی تحریکات اور تغیرات کا پیش خیمہ ثابت ہوں گے ان سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا مغرب ہزارہا سال بعد اس تہذیب کو خیرباد کہہ رہا ہے جو ارسطو کے تتبع میں "صورت" کو اپنانے سے پیدا ہوئی تھی اور اس مقام سے آغاز سفر کر رہا ہے جہاں سے بالکل ابتدائی نصرانیت شروع ہوئی تھی ـــــ وہ مقام جو الیمانڈر دیوزانی جیسے بالغ نظر نقاد کی رائے میں اسلام سے پوری پوری مطابقت رکھتا ہے۔ اقبالؒ کے مردِ آفاقی اور صاحبِ نظر ہونے کا اس سے زیادہ ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟ ٭

مطالعۂ رومی کی تاریخ میں اقبال کا مقام

سید عبداللہ

مطالعۂ اقبالؒ کے سلسلے میں رومی کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا اعادہ لاحاصل ہے۔ کیونکہ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس کو اقبالؒ کے معمولی سے معمولی ناقد یا شارح نے بھی نظر انداز نہیں کیا۔ مگر مطالعۂ رومی کے سلسلے میں اقبالؒ کو جو اہمیت حاصل ہے اس کی طرف اب تک کوئی خاص توجہ نہیں ہوئی حالانکہ یہ موضوع بذاتِ خود اہم ہونے کے علاوہ اقبال اور رومی دونوں کے تقابلی مقام کو سمجھنے کے لئے بھی ضروری ہے۔ اسی خیال کے ماتحت میں نے اس مضمون میں مطالعۂ رومی کی تحریک کا عہد بہ عہد مگر مختصر جائزہ لینے کی کوشش کی ہے اس سے مقصد یہ بھی ہے کہ مختلف ادوار میں رومی کے اثرات و فیوض کا سراغ لگایا جائے اور یہ بھی کہ رومی کو تاریخ افکار میں جو رتبہ اقبال نے دلایا ہے اور ان کے معارف و اسرار کو جس طرح علوم ثانیہ کی روشنی میں بے نقاب کیا، اس کا صحیح صحیح اعتراف کیا جا سکے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا شاید غلط نہیں کہ اگر رومی نے اقبال کے فکر کو چار چاند لگائے ہیں تو اقبال نے بھی رومی کے افکار عالیہ کو بڑی عزت و شان سے دنیا میں متعارف کرایا۔ جس سے اُن کے رتبہ و مقام کو پہلے سے کہیں زیادہ سربلندی نصیب ہوئی یہ اقبال کی سعادت مندی ہے کہ وہ رومی کی غائبانہ شاگردی سے مفتخر ہوئے مگر یہ فکر رومی کی بھی خوش نصیبی ہے کہ اُس کو اقبال جیسا ہوشمند اور بالغ نظر شارح ملا جس نے اپنے نامور استاد کی عظمت کے مینار اور اونچے کر دئے۔ اور ان کی شہرت کو فلک الافلاک تک پہنچا دیا چنانچہ مثنوی کے زمانۂ تصنیف سے لے کر آج تک جتنے علماء و فضلاء نے افکار رومی کا تجزیہ کیا ہے ان میں شاید اقبال ہی مثنوی کے وہ واحد ترجمان ہیں جن کی توجیہات نے مثنوی کو ایک زندہ فکر اور مثبت و پائدار اقدار زندگی کا حامل ثابت کیا ہے اور ان کی اُن حکمتوں کو دریافت کیا ہے جن سے کائنات اور حیات کے ارتقاء و تکمیل کے بڑے بڑے راز دریافت ہوئے ہیں۔

مطالعۂ رومی کے سلسلے میں اقبال کی یہ اہمیت تبھی ثابت کی جا سکتی ہے کہ ہم پہلے مثنوی کے پرانے تنقید نگاروں یا عالموں کے کام پر نظر ڈال کر یہ واضح کر دیں کہ اقبال سے پہلے رومی کے مطالعہ کی نوعیت جزوی اور انفرادی سی تھی۔ یہ اقبال ہی تھے جن کے طفیل رومی کے افکار کی وہ تشریح ہوئی جس سے وہ حیات اجتماعی اور ارتقائے انسانی کے ایک بڑے ترجمان اور محرم اسرار ثابت ہوئے۔

مولانا روم کا انتقال ۶۷۲ھ / ۱۲۷۳ء میں ہوا ہے۔ اسکے بعد آج تک تقریباً سات سو سال کا عرصہ گزرا ہے۔ اس طویل مدت میں تقریباً ہر دور میں مثنوی پر کام کرنے والے بیسیوں کی تعداد میں نظر آتے ہیں جو مثنوی کی مقبولیت کا ایک ناقابل تردید ثبوت ہے۔ اس معاملہ میں اگر مثنوی کے مقابلے پر فارسی کی کوئی اور کتاب لائی جا سکتی ہے تو وہ دیوان حافظ ہے۔ مگر دیوانِ حافظ کی حیثیت محض شعر و معرفت کی کتاب کی ہے۔ مثنوی ان دونوں حیثیتوں کے علاوہ اسرار دین اور علم کلام کا مجموعہ بھی ہے۔ اس وجہ سے ایران و خراسان بلکہ ترکی اور ہندوستان میں بھی مثنوی کو ایک مقدس اور الہامی کتاب کا درجہ حاصل رہا ہے۔ چنانچہ یہ مشہور مصرع ع

ہست قرآں در زبانِ پہلوی

اسی حقیقت کا اعلان کر رہا ہے۔ غرض مثنوی رومی ادبیات فارسی کی مقبول ترین کتاب ہے جس کا ثبوت اس بات سے بھی مہیا ہوتا ہے کہ اس کی لاتعداد شرحیں، ترجمے اور فرہنگ لکھے گئے جن میں سے بعض کی

---

[1] مثنوی کی شرحوں، ترجموں، انتخابوں کا ذکر جن میں عربی، فارسی، ترکی، اور مغرب کی زبانوں کی سب تصنیفات شامل ہیں بانکی پور لائبریری کی فہرست مخطوطات ج ۱، ص ۹۵، نیز حاجی خلیفہ کشف الظنون ج ۵، ص ۳۷۵ میں ملاحظہ ہو۔

اپنی علمی سطح بھی اتنی بلند ہے کہ ان کو بذات خود ادبیات عالیہ میں شمار کیا جاتا ہے۔

رومی کے مطالعہ وتتبع کی تحریک خود رومی کی زندگی میں ہی شروع ہو چکی تھی۔ ان کے بیٹے ان کے فرزند سلطان ولد نے رباب نامہ کے نام سے ایک مثنوی لکھی جس میں اپنے والد بزرگوار کی مثنوی کا تتبع کیا۔ سلطان ولد کی مثنوی ولدی کے دیباچے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے والد (مولانا روم) کی مثنوی بہت جلد ان کے متبعین میں مقبول ہو گئی تھی اور کثرت مطالعہ وتلاوت کے سبب اس کا اسلوب اور وزن وبحر بھی اس قدر خاطر نشین ہو گیا تھا کہ مثنوی نگاری کے لئے (خصوصاً صوفیانہ مطالب کے سلسلے میں) کوئی دوسرا اسلوب لوگوں کو پسند ہی نہ آتا تھا "زیراں وزن از خواندن بسیار خو کردہ اند و ایں وزن در طبع شاں نشستہ است"۔

مثنوی رومی کے مطالعہ کی لہر نویں صدی ہجری کے آغاز میں اور بھی تیز ہو گئی جسین خوارزمی اسی زمانے کے ایک مصنف ہیں جنکی شرح مثنوی (جواہر الاسرار کے نام سے) ۸۳۵ھ میں تصنیف ہوئی۔ دسویں صدی ہجری میں مثنوی رومی عام مطالعہ کے علاوہ نصابِ درس وتدریس میں بھی شامل ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایران وخراسان میں اس کی مشکلات کو سمجھنے اور سمجھانے کی خاصی کوششیں ظہور میں آتی ہیں۔ اس تدریسی رجحان کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ مثنوی کے اسرار ومعارف کی پردہ کشائی کی بجائے اس کی لفظی مشکلات کی طرف زیادہ توجہ ہونے لگتی ہے۔ اس زمانے میں علامہ داعی شیرازی (متوفی ۹۱۵ھ) کی شرح اور شاہدی کا انتخاب گلشن توحید (تصنیف ۹۳۰ھ) اور سروری متوفی ۹۶۹ھ کی شرح مثنوی قابل ذکر ہیں۔ ان شرحوں میں صرف داعی شیرازی کا انداز تدوین اس قسم کا ہے کہ اس سے لفظی فرہنگ نویسی کے علاوہ مثنوی کے معارف کی بھی کچھ رہنمائی اور نقاب کشائی ہوتی ہے۔ یہ داعی حضرت شاہ نعمت اللہ کے دوست تھے اور ان کی رفاقت میں انہوں نے عمر کا ایک حصہ زہد وعبادت میں بھی گزارا تھا۔ چنانچہ ان کی اس زاہدانہ زندگی کا اثر ان کے مطالعات میں بھی نظر آتا ہے اور اس کے واضح نقوش ان کی اس شرح میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ مگر داعی کی شرح محض تدریسی یا محض زاہدانہ رنگ کی نہیں، اس میں فکر کی برجستگی بھی کسی حد تک ہے، یہ اور بات ہے کہ ان کے افکار میں تصوف اور زہد کا رنگ شوخ ہے۔

دسویں صدی کے آخر اور گیارہویں صدی کے شروع میں رومی کی مثنوی ہندوستان میں بھی باقاعدہ طور پر درس وتدریس میں شامل ہو جاتی ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کا دورِ عقلیت مثنوی کی عرفانی اور وجدانی روح کا متحمل نہ تھا۔ اس لئے بظاہر مثنوی رومی اکبر کے زمانے کے اہم مطالعات کے دائرہ میں جگہ نہیں پا سکی۔ اور تعجب تو یہ ہے کہ اس زمانے کا شاید سب سے باشعور مصنف ابوالفضل جو عقل کے تصرفات کا قائل ہوتے ہوئے عرفان اور وجدان کی برکتوں کا بھی معترف تھا۔

ایک موقع پر مثنوی کے کمیاب ہونے کی شکایت کرتا ہے۔ وہ جلال الدین اکبر کے ساتھ میدان پکھلی سے گزر رہا ہے اور فرصت کے اوقات کو کسی علمی مشغلہ میں گزارنا چاہتا ہے۔ اور اس وقت اس کی طبیعت مطالعۂ مثنوی کی طرف مائل ہے مگر بدقسمتی سے اسے اس گرد ونواح میں مثنوی کا کوئی مکمل نسخہ نہیں ملتا۔ اسلئے ناچار ابوبکر شاشی کے انتخاب مثنوی سے ہی کام نکالتا ہے اور اس سے اپنے ذوق وحال کے مطابق اشعار کا انتخاب کر لیتا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں (کم از کم اس گرد ونواح میں) مثنوی رومی شاید وقت کی متداول ترین کتابوں میں نہ تھی — بظاہر یہ بات تعجب خیز ہے مگر یہ دیکھ کر کہ مثنوی کا مزاج ایک خاص نفسی کیفیت اور اجتماعی شعور کا مطالبہ کرتا ہے اور بعض خاص ادوار میں اس کے مطالعہ کی طلب اور ادوار کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے۔ اس صورت حال پر کچھ زیادہ تعجب نہیں رہتا کہ اکبری دور میں مثنوی کا چرچا کیوں کم ہو گیا تھا۔ تاہم اکبری اور خصوصاً جہانگیری عہد اس معاملے میں بالکل کورا بھی نہیں۔ اور آنے والے ادوار میں تو مثنوی کا ذوق اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ ہر طرف اس کے شارح اور فرہنگ نویس بہ تعداد کثیر نکل آتے ہیں۔ چنانچہ گیارہویں صدی ہجری کے ہندوستان اور ایران میں لکھی ہوئی شروح مثنوی کی فہرست خاصی طویل ہے۔ ان میں عبدالفتاح کی مفتاح المعانی (۱۰۴۹ھ)، عبداللطیف عباسی (متوفی ۱۰۴۸ھ) کی لطائف المعنوی، محمد رضا کی مکاشفات رضوی (تصنیف ۱۰۸۴ھ) اور شرح شاہ عبدالفتاح (متوفی ۱۰۹۰ھ) چند قابلِ ذکر کتابیں ہیں۔

عبداللطیف عباسی کی کتاب لطائف المعنوی مثنوی کی مکمل شرح نہیں کیونکہ عباسی نے صرف مشکل اشعار کی شرح کی ہے جس میں عربی عبارتوں اور قرآن مجید کی آیتوں کا ترجمہ بھی ہے۔ عبداللطیف عباسی عہد شاہ جہانی کے بزرگ تھے۔ انہوں نے عمر کا بیشتر حصہ مثنوی کے

مطالعہ و تجزیہ میں صرف کیا۔ اس شرح کے علاوہ انہوں نے مثنوی کا ایک مستند نسخہ بھی تیار کیا جس کا نام نسخہ ناسخہ مثنویات سقیمہ رکھا اور لطائف اللغات کے نام سے مثنوی کے مشکل الفاظ کا فرہنگ بھی مرتب کیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہاں کے آخری زمانے میں مطالعہ مثنوی کی تحریک پہلے سے بھی زیادہ زور سے اٹھی اور آہستہ آہستہ اس میں اتنی شدت اور وسعت پیدا ہو گئی کہ اورنگ زیب کے زمانے میں مثنوی ہی وقت کی محبوب ترین کتاب بن جاتی ہے، اسکی بے شمار شرحیں لکھی جاتی ہیں، ترجمے ہوتے ہیں اور انتخابات تیار کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ درس میں اس کو مرکزی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کے اشعار مجالس اور محافل میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں اور اس سے واعظ اور خطیب تذکیر و تلقین کا کام لینے لگتے ہیں۔ غرض اس زمانے میں اسکو نہایت ہمہ گیر مقبولیت ملتی ہے اور عام و خاص سب اس کے مطالعہ سے لطف اور سعادت حاصل کرتے ہیں۔

عہد عالمگیری کے مثنوی شناسوں میں دو اہم شخص ایسے تھے جن کی مثنوی دانی کی اس عہد کے مورخین نے بڑی تعریف کی ہے۔ ان میں سے ایک عاقل خاں رازی (میر عسکری) تھے۔ جو اس زمانے کے اچھے شاعروں اور راویوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ اور دوسرے انہی کے داماد سید شکر اللہ خاں خاکسار تھے جن کی شرح مثنوی خاصی شہرت رکھتی ہے۔ عاقل خاں رازی کے متعلق مآثر الامراء میں لکھا ہے:-

"درحل تدقیقات مثنوی مولانائے روم خود را یگانہ می دانست"

اور نواب شکر اللہ خاں کے متعلق شیر خاں لودھی نے مرآۃ الخیال میں ہم کو یہ اطلاع دی ہے کہ:

"کمترین شاگردانش بہ مثنوی دانی معروف و ادنیٰ تلمیذش بصفات صوفیہ موصوف۔"

ان خوش ذوق امرائے عہد کی بدولت مثنوی کے مطالعہ کا شوق اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں اور اس کے بعد مثنوی کا علم شائستگی اور اوصاف مجلسی کا لازمی عنصر بن جاتا ہے جس کے زیر اثر شرحوں اور فرہنگوں کا سلسلہ بدستور قائم رہتا ہے۔ اس موقع پر اس عہد کی ان سب کتابوں کا تذکرہ جو مثنوی سے متعلق ہیں دشوار بھی ہے اور بے ضرورت بھی۔ البتہ ان میں سے قابل ذکر کتابوں کے نام لکھے جا سکتے ہیں مثلاً محمد عابد کی المغنی (۱۱۰۰ھ)، شاہ افضل الہ آبادی کی حل مثنوی (۱۱۰۴ھ)، شکر اللہ خاں کی شرح مثنوی، خواجہ ایوب پارسا لاہوری کی شرح مثنوی (۱۱۲۰ھ)، ولی محمد اکبر آبادی کی مخزن الاسرار (۱۱۴۹ھ)، بہلول برکی (۱۱۲۴ھ) کی شرح مثنوی، عبد الفتاح کی در مکنون، خلیفہ خوشگی قصوری کی اسرار مثنوی وغیرہ۔ ان سب کے آخر میں ملا عبد العلی بحر العلوم متوفی ۱۲۳۵ھ/۱۸۱۹ء کی شرح مثنوی آتی ہے جس پر مطالعہ مثنوی کا پچھلا دور ختم ہو جاتا ہے اور کچھ دیر کے بعد نئے حالات کے ماتحت مثنوی سے استفادہ کی جدید (اور کئی معنوں میں پچھلی تحریکوں سے مختلف) تحریک پیدا ہوتی ہے۔

اس تحریک کا آغاز شبلی نعمانی کی کتاب سوانح مولانا روم سے ہوا جس کی اشاعت سے حکمت رومی کا (جدید زمانے میں) پہلا علمی تعارف ہوا۔ اس علمی تعارف سے مطالعہ رومی کی شاہراہیں بہت کشادہ ہوئیں مگر اس اثنا میں قدرت نے ایک اور دانائے راز ایسا پیدا کیا جس نے مثنوی کو ایک نئے عصری تخلیق کا وسیلہ اور ایک نئی زندگی کی تشکیل کا ذریعہ بنا کر اسکو مستقبل کی "عصر آفریں کتاب" بنا دیا۔

مطالعہ مثنوی کی اس طویل تاریخ میں کم و بیش پانچ اہم سنگ میل ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اول خوارزمی کی جواہر الاسرار جو ۸۴۰ھ میں تصنیف ہوئی۔ دوم عبد اللطیف عباسی کی تصنیفات جو شاہجہاں کے زمانے سے متعلق ہیں۔ سوم ملا بحر العلوم کی شرح مثنوی جو ۱۲۳۵ھ/۱۸۱۹ء میں ہوئی۔ چہارم شبلی کی سوانح مولانا روم، پانچواں اقبال کا استفادۂ رومی۔ تاریخ پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مطالعہ رومی کے یہ پانچوں سنگ میل تاریخ اسلامی کے نہایت پر اضطراب زمانوں سے متعلق ہیں۔ اور یوں مثنوی خود بھی ایک ایسے پر آشوب زمانے کی یادگار ہے جس میں خدا پر ایمان و یقین اور انسان پر اعتقاد و اعتماد حملہ تاتار کے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گیا تھا۔ اور یہ ایک ایسا دہشت انگیز واقعہ تھا جس نے تہذیب کے پچھلے نقوش کو تقریباً مٹا دیا تھا گویا رومی کی تصنیف کا زمانہ ایک خلا اور ابہام کا زمانہ تھا۔ جس میں روحیں کسی نئی منزل کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں اور ذہن انسانی کسی نئی دنیا کی جستجو میں آوارہ و سرگرداں تھے۔ ایسے روحانی انتشار اور ذہنی خلفشار کے زمانے میں مثنوی ظہور میں آئی۔ اس میں وہ جذب و سرور اور وہ وجد و حال اور وہ بے خودی و مستی تھی جس کی اس زمانے کی پریشان و سرگرداں روحوں کو ضرورت تھی کیونکہ لوگ عام طور سے خدا، انسان اور کائنات تینوں کا اعتقاد کھو بیٹھے

تھے، ایسی حالت میں رومی نے جب اپنا نغمۂ عشق سنایا تو اس سے اعتقاد زندگی کی بجھی ہوئی چنگاریوں میں پھر گرمی پیدا ہوئی اور حیات نے اپنی بکھری ہوئی کڑیوں کو پھر سے جوڑا۔ غرض مثنوی کے پیغام اور اس کے بیان کی یہ مسلّم خصوصیت معلوم ہوتی ہے کہ اس سے بے یقینی، جمود اور روحانی بے اعتقادی کے ہر زمانے میں احیائے جدید کا کام لیا گیا جس کا سبب یہ ہے کہ رومی کے کلام میں ڈھارس بندھانے اور امید پیدا کرنے کی خاص صلاحیت پائی جاتی ہے۔ لہٰذا جب بھی روح کو امید کے آبِ بقا کی ضرورت ہوئی ہے رومی کے فیضانِ عام سے ہی اس کی پیاس بجھائی گئی ہے۔

حملۂ تاتار کی طرح تیمور کی ترکتازیوں کا زمانہ بھی انسانی شرافتوں کے لحاظ سے تاریکی کا زمانہ تھا۔ اس کی ظلمتوں میں خوارزمی نے پھر رومی کی شمع جلائی۔ اسی طرح ہندوستان میں اکبر کا زمانہ اگرچہ سیاسی عروج کا زمانہ تھا مگر عقلیت نے وجدان و یقین کے سرچشمے خشک کر دئے تھے۔ جہانگیر کے عہد میں رومانیت کی ایک لہر ضرور پیدا ہوئی جس میں مقبول ترین ادبی ہیرو حافظ بنے مگر یہ رومانیت لذت اندوزی اور روبہ انحطاط مسرت کوشی میں اعتقاد رکھتی تھی ـــــ اس لئے روحانی تسکین کے لئے کسی اور آب زندگی کی ضرورت پیدا ہوئی چنانچہ شاہجہاں اور اورنگ زیب کے زمانے میں پھر مثنوی کا غلغلہ بلند ہوا جس نے دل کے شیرازوں کو مجتمع کیا۔ غرض اسی طرح ہر زمانۂ زوال میں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد رومی کی روحانی امداد کی طلب پیدا ہوتی رہی یہاں تک کہ وہ زمانہ آگیا جس میں اقبال نے دنیا کے سامنے رومی کے پیغام کی نئی تعبیر پیش کی۔

مثنوی کے زمانۂ تصنیف سے لے کر اس وقت تک اس کے مطالعہ کے چار مختلف مطمحِ نظر اور مقصد نظر آتے ہیں۔ اوّل زبان کی مشکلات کے نقطۂ نظر سے۔ دوم صوفیانہ اسرار و معارف کے نقطۂ نظر سے۔ سوم علم و ادب کے نقطۂ نظر سے۔ چہارم علوم اجتماعیہ اور فلسفہ و حکمت کے نقطۂ نظر سے! بعض صورتوں میں پہلا اور دوسرا نقطۂ نظر ملا جلا سامنے آتا ہے۔ پرانے زمانے کے اکثر شارح اور مفسر مثنوی کو عموماً اسی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان میں سے تصوف اور عرفان کے نقطۂ نظر سے خوارزمی نے مثنوی کی نئی تعبیر و توجیہہ کی۔ داعی شیرازی نے بھی کسی حد تک اسی حیثیت سے مطالعہ کیا۔

عبداللطیف عباسی نے زیادہ تر زبان و بیان کی مشکلات کی طرف توجہ کی۔ ہندوستان میں شاید علامہ ابوالفضل پہلے شخص تھے جنہوں نے مثنوی کے مطالعہ کے لئے دانش رسمی اور عرفان دونوں کی اہمیت پر زور دیا مگر ابوالفضل کا مطمحِ نظر بھی فرد کی روحانی اصلاح و تہذیب سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ مغلوں کے آخری دور میں مثنوی کا عام مطالعہ دراصل روحانی سکون و تسکین کے خیال سے ہوتا رہا۔ اور یہ اس ذہنی اور روحانی انتشار کے خلاف ایک نسخۂ شفا تھا جس سے طبائع کو عارضی طور پر مسرت اور تفریح مل جاتی تھی۔

مطالعہ مثنوی کی تاریخ میں اقبال سے پہلے شاید سب سے بڑا نام مُلا بحرالعلوم کا ہے جن کی طویل و ضخیم شرحِ مثنوی نہ صرف مثنوی کی مبسوط ترین تفسیر ہے بلکہ اس کا درجہ فارسی تصوّف، اور علمِ کلام میں بھی بہت بلند ہے۔ مولانا عبدالعلی بحرالعلوم اس نامور خاندان کے ایک فرد ہیں جس کو اسلامی ہندوستان کے دورِ آخر میں احیائے علوم عربیہ کی تحریک کا بانی اور علم بردار سمجھا جاتا ہے۔ بحرالعلوم کے والد مولانا نظام الدین سہالوی نے درس نظامیہ کی بنیاد رکھی اور فلسفہ و حکمت پر بہت سی کتابیں لکھیں (انتقال ۱۱۶۱ھ) ـــ بحرالعلوم تجدید و احیاء کے لحاظ سے موروثی طور پر غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ وہ اپنے والد کی طرح حکمت، منطق اور علم کلام وغیرہ میں بھی کامل دسترس رکھتے تھے۔ انہوں نے مثنوی کو علم کلام اور محی الدین ابن عربی کے متصوفانہ نقطۂ نظر سے پڑھا۔ اور اس کی ایسی شرح لکھی جس میں فتوحاتِ مکّیہ کا پورا پورا رنگ منعکس ہے۔ اس لحاظ سے ان کی شرح معارفِ دین سے کہیں زیادہ معارفِ طریقت کی کتاب بن گئی ہے۔ اور یہی اس کی خصوصیت ہے۔ مطالعۂ مثنوی کے سلسلے میں شبلی کی یہ اہمیت ہے کہ انہوں نے مثنوی کے اس حصّے پر خاص توجہ دی۔ جس کا تعلق احیائے دین اور علوم طبعیہ کے بعض انکشافات سے ہے۔ شبلی نے مثنوی کو ابن عربی کے اثرات سے نجات دلا کر اس کو غزالی کی تحریک تجدید دین و تکمیل اخلاق سے منسلک کر دیا۔ انہوں نے مجرد فکر اور فلسفہ اجتماع دونوں کے نقطۂ نظر سے بھی اس کا علمی تجزیہ کیا ـــ! مثنوی رومی اور علوم جدید میں مطابقت پیدا کرنے کی یہ پہلی کوشش تھی جس نے آگے چل کر مثنوی کی علمی تشریح و تعبیر کی بڑی حوصلہ افزائی کی۔

جدید زمانے میں مطالعہ رومی کی تحریک کا نقطۂ عروج اقبال کا تجزیۂ مثنوی ہے۔ اس سلسلے میں اقبال کے مطالعہ رومی کا امتیازی وصف یہ ہے کہ انہوں نے مثنوی کو محض مطالعہ کی کتاب سے اثباتی فکر و عمل کی کتاب میں بدل دیا۔ ان کے نزدیک مثنوی کی غایت تفریح یا (بلند تر سطح پر) وجد و حال نہیں بلکہ عمل اور فکر کی وہ تعمیر ہے جس کے سہارے انسان عالمِ انفس و

آفاق کی تسخیر کرسکتا ہے اور یاد رہے کہ اقبال کی تسخیرِ نفس و آفاق کا دائرۂ اثر صرف ذات اور فرد کی اکائی تک محدود نہیں بلکہ اس کے قوسِ صعودی کی حد ملت اور اس سے بھی آگے نوعِ انسان کے نوعی اور اجتماعی ارتقاء کے بعید ترین گوشوں سے ٹکرا رہی ہے۔

میں نے سطورِ بالا میں یہ عرض کیا ہے کہ اقبال نے مثنوی کو مطالعہ کی کتاب سے عمل کی کتاب بنا دیا — اس سے میری یہ مراد نہیں کہ اقبال سے پہلے مثنوی ایک بے اثر کتاب رہی — مثنوی اس سے پہلے بھی یقیناً بڑی بااثر، مقبول اور مفید کتاب ثابت ہوتی رہی ہے۔ (جیسا کہ گذشتہ صفحات میں ثابت کیا گیا ہے) مگر اس میں کچھ کلام نہیں کہ مثنوی کے فیوض کی جو حدیں اقبال نے دریافت کی ہیں وہ ان سے پہلے کسی نے دریافت نہیں کیں۔ اور سوائے چند مستثنیات کے عموماً یہ نظر آتا ہے کہ مثنوی دانوں اور مثنوی خوانوں نے مولانا روم کی اس نصیحت پر عمل نہیں کیا جو انہوں نے (ایک روایت کے مطابق) مثنوی کے مطالعہ کرنے والوں کے لئے لکھی تھی۔ ان کی نصیحت یا ہدایت یہ تھی :

"مثنوی را جہتِ آں نگفتہ ام کہ حمائل کنند و تکرار کنند بلکہ زیرِ پا نہند و بالائے آسماں روند کہ مثنوی نردبانِ معراجِ حقائق است نہ آنکہ نردبان را بگردن گیری و شہر بہ شہر بگردی، ہرگز بر بامِ مقصود نروی و بمرادِ دل نرسی"

اور حق تو یہ ہے کہ مثنوی کے مطالعہ کی عمومی حیثیت اقبال تک ایک لحاظ سے یہی رہی جو "حمائل کنند و تکرار کنند" میں درج ہے۔ — اقبال نے اس کمی کو محسوس کیا۔ اور رومی کی ہم نوائی میں جاوید (یا نثرادِ نو) کو یوں خطاب کیا :-

پیرِ رومی را رفیقِ راہ ساز ۔۔۔ تا خدا بخشد ترا سوز و گداز

. . . . ۔۔۔ . . . .

شرحِ او کردند و او را کس ندید ۔۔۔ معنیٔ او چوں غزال از ما رمید

رقصِ تن از حرفِ او آموختند ۔۔۔ چشم را از رقصِ جاں بر دوختند

رقصِ تن در گردش آرد خاک را ۔۔۔ رقصِ جاں برہم زند افلاک را

علم و حکم از رقصِ جاں آید بدست ۔۔۔ ہم زمیں ہم آسماں آید بدست

رقصِ جاں آموختن کارے بود ۔۔۔ غیرِ حق را سوختن کارے بود

مطالعۂ مثنوی کے سلسلے میں اقبال کا نصب العین یہی رقصِ جاں ہے جس سے علم و حکمت تک رسائی ہوتی ہے — ایسے علم و حکمت تک جس سے زمین و آسمان کی تسخیر ممکن ہے۔ اقبال کے نزدیک قرآن کے بعد جو کتاب اس مقصدِ عظیم کو پورا کرسکتی ہے وہ مثنوی رومی ہے۔ اقبال کے مطالعہ مثنوی کا یہی پہلو نیا اور انوکھا ہے جس تک متقدمین و متاخرین میں سے کوئی نہیں پہنچا۔

اقبال کے میلانات کا ایک عجیب انداز یہ ہے کہ وہ مثنوی رومی کے اثر کا تو اعتراف کرتے ہیں مگر حدیقۂ سنائی کا چنداں اعتراف نہیں کرتے اور عطار کی عظمت تو ان کی نظر میں کچھ مشکوک سی ہے حالانکہ یہ دونو بزرگ رومی کے مرشدانِ روحانی تھے۔ ع

ما از پئے سنائی و عطار آمدیم

اس کا سبب یہ ہے کہ سنائی اور عطار کی کتابیں (اقبال کی نظر میں) اس رقصِ جاں یعنی اس ذوق و شوق اور علم و حکمت سے محروم ہیں جس سے رومی کی مثنوی از سرتاپا لبریز ہے۔ حدیقہ میں اخلاقیات کا پہلو غالب ہے اور عطار کی مثنویوں میں ظاہری دین داری پر زیادہ زور ہے — اقبال کی نظر میں یہ دونو باتیں فرداً فرداً چنداں لائقِ توجہ نہیں۔ اقبال کو جس کی طلب ہے وہ ہے زندگی کا سوز، اور ایک مثبت فلسفۂ حیات! ان مسائل میں اقبال کو رومی سے بہتر کوئی رہنما میسر نہیں آیا ؎

رومی آں عشق و محبت را دلیل
تشنہ کاماں را کلامش سلسبیل

اقبال نے شعر و شاعری میں بھی اس سلسبیل سے پیاس بجھائی ہے۔ اور اپنے حکیمانہ خطبات میں بھی، مگر اقبال کا استفادہ صرف استفادہ ہی نہیں، افادہ بھی ہے، انہوں نے رومی سے صرف لیا ہی نہیں، ان کو کچھ دیا بھی ہے — بہت کچھ! معتدبہ! اقبال کی پیش کش رومی کی بارگاہ میں وہ نئی تعبیر و توجیہہ مثنوی ہے جس سے رومی کے خیالات میں نئی تابانی نئی چمک پیدا ہوگئی ہے — رومی کی روح پہلی مرتبہ ان قیود سے آزاد ہوئی جن میں پرانے فرہنگ نویسوں اور شرح نگاروں نے اس کو قید کر رکھا تھا۔ اقبال نے رومی کو جدید حکمت سے متعارف کرایا ہے اور علم و دانش کے جدید ترین دبستانوں پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ رومی کے پاس عصرِ حاضر کے اُن مسائل پیچیدہ کے کامیاب حل موجود ہیں جن سے انسان حواس باختہ ہوکر خود انسان کی روشن تقدیر سے مایوس ہو رہا ہے۔ موجودہ دور میں دنیا کو ایک ایسے مذہب (یا مسلکِ فکر و عمل) کی تلاش ہے جس کے اساسی اصولوں سے سائنس بھی انکار نہ کرسکے۔ اور ایک ایسے سائنسی نقطۂ نظر کی ضرورت ہے جس میں وجدانیات کے وجود کو تسلیم کئے

بغیر چارہ نہ رہے۔ زیرکی اور عشق کا یہ اجتماع انسان کے روشن مستقبل کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا جسمِ انسانی کے لئے آب و ہوا کا وجود، اقبال نے ان میں سے اکثر مسائل کے حل رومی کے حوالہ سے پیش کئے ہیں۔ اور یہ حکمت رومی کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

اقبال نے رومی سے خود ہی استفادہ نہیں کیا بلکہ ایک دبستانِ فکر رومی کی بنیاد بھی رکھی ہے۔ ان کے زیرِ اثر رومی کے مطالعہ و تجزیہ کی تحریک کو بڑا فروغ ہوا ہے۔ چنانچہ اب اقبال کے خاص نقطۂ نظر سے رومی کے افکار کی چھان پھٹک کا کام بڑے زور سے ہو رہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ محض روحانی ذوق و شوق کے خیال سے بھی رومی کی تلاوت کا عمل پہلے سے کم نہیں مگر اقبال کے زیرِ اثر ان کی حکمت کی تشریح کی طرف بھی توجہ کی جا رہی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے سب سے نمایاں کام ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا ہے جن کی کتاب حکمت رومی، رومیاتی[1] ادب کی ایک ممتاز تصنیف ہے جس سے فکر رومی کے بہت سے عقدے حل ہوئے ہیں۔ ان سب پہلوؤں سے اگر دیکھا جائے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح مطالعۂ اقبال کے سلسلے میں رومی کی مثنوی اور ان کے افکار ایک اہم بلکہ اہم ترین ماخذ کا درجہ رکھتے ہیں۔ اسی طرح مطالعۂ رومی کے سلسلہ میں اقبال کی تشریح و تعبیر یکتا اور منفرد حیثیت رکھتی ہے۔

●

---

[1] نئے زمانے میں جن لوگوں نے مثنوی رومی کا خاص مطالعہ کیا ہے ان میں ڈاکٹر نکلسن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا شاہ اشرف علی تھانوی نے مثنوی کا ذوق عام کیا اور مولانا میر ولی اللہ، عبدالماجد دریابادی اور قاضی تلمذ حسین نے مثنوی سے استفادہ بھی کیا اور اس کی ترتیب و تدوین کی بھی کوشش کی۔ ڈاکٹر عشرت حسن بھی حکمت رومی کے بعض پہلوؤں کی اسرار کشائی میں مصروف ہیں۔ (س - ع)

اس سلسلہ میں اطالوی مفکر الیساندرو بوزانی کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ جس کے حقائق و بصائر نہایت دور رس اور انقلاب آفریں ہیں! (مدیر)

پھل　　　　عمل: زین العابدین

دانتے اور اقبالؒ

الیساندرو بوزانی

آدمی اندر جہانِ ہفت رنگ ۔۔۔ ہر زماں گرمِ فغاں مانندِ چنگ!
آرزوئے ہم نفس می سوزدش ۔۔۔ نالہ ہائے دل نواز آموزدش
لیکن ایں عالم کہ از آب و گل است ۔۔۔ کے تواں گفتن کہ دارائے دل است!
بحر و دشت و کوہ و کہ خاموش و کر ۔۔۔ آسمان و مہر و مہ خاموش و کر!
گرچہ بر گردوں ہجومِ اختر است ۔۔۔ ہر یکے از دیگرے تنہا تر است!
ہر یکے مانندِ ما بیچارہ ایست ۔۔۔ در فضائے نیلگوں آوارہ ایست!
کارواں برگِ سفر ناکردہ ساز! ۔۔۔ بیکراں افلاک و شب ہا دیر یاز!
ایں جہاں صید است و صیادیم ما؟ ۔۔۔ یا اسیرِ رفتہ از یادیم ما؟

زار نالیدم صدائے بر نخاست
ہم نفس فرزندِ آدم را کجاست؟

اے خوش آں روزے کہ از ایام نیست ۔۔۔ صبح او را نیمروز و شام نیست
روشن از نورش اگر گردد رواں ۔۔۔ صوت را چوں رنگ دیدن می تواں

غیب ہا از تابِ او گردد حضور
نوبتِ او لایزال و بے مرور! (جاوید نامہ)

اقبال کے "جاوید نامہ" کے شروع میں جو افسردگی نظر آتی ہے ویسی ہی افسردگی دانتے کی "ڈیوائن کومیڈی" کے شروع میں بھی دکھائی دیتی ہے جہاں شاعر "تاریک جنگل" میں بہت غمگین نظر آتا ہے جہاں تک اقبال کا تعلق ہے جدید انسان کے لئے جس نے فاؤسٹ کا تجربہ ذہنی حاصل نہیں کیا۔ یہ "تاریک جنگل" اس 'احساس' بلکہ ہیجان، کا آئینہ دار ہے، جو بندۂ مجبور اس جہانِ بے کراں کے روبرو محسوس کرتا ہے۔ اس بے بس انسان کا احساس جو تمام کائنات پر قدرتِ کاملہ حاصل کئے بغیر مطمئن نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال اپنے سفرِ افلاک پر روانہ ہو جاتا ہے صرف اس لئے کہ وہ تمام افلاک کو پاش پاش کر دے!

اقبال اپنے رہنما رومی سے پوچھتے ہیں:۔

باز گفتم پیشِ حق رفتن چساں؟
کوہِ خاک و آب را گفتن چساں؟
آمرِ خالق بروں از امرِ خلق
ما زِ شستِ روزگاراں خستہ حلق

دانتے کے سفر کا مقصد بالکل مختلف ہے۔ اس نے پورے سفر کے گیت میں، جو درحقیقت دورِ حاضر کا صحیفہ ہے، اس مسئلہ کو بمشکل چھوا ہی ہے۔ وہ تو اپنے سفر پر صرف اس لئے روانہ ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو تزکیۂ نفس سے مشاہدۂ حق کے قابل بنائے۔

میں نے کہا ہے کہ دانتے کے سفر کا مقصد بالکل مختلف ہے۔ مگر زیادہ غور اور امعانِ نظر سے دیکھا جائے تو حقیقتاً یہ اقبال کے مقصد سے اتنا مختلف نہیں جتنا کہ بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اقبال کا سفرِ فتح و تسخیر اسی وقت ممکن ہے جب دانتے اپنی تزکیۂ نفس کی مہم سے واپس آ جائے۔ برائے خدا! اقبال کو جو مذہبی روح سے اس قدر سرشار تھا۔ ان وجود پرستوں، میں شمار نہ کیجئے جن کے خیالات میں الحاد اور ترقی پسندی کا تال میل نظر آتا ہے اور جن سے آج کل ہماری دنیا بھری پڑی ہے ؎

از طریقِ آذری بیگانہ باش
بر مرادِ خود جہانِ نو تراش!
دل برنگ و بوئے و کاخ و کو مدہ
دل حریمِ اوست جز با او مدہ!

ایک اور جگہ اقبال نے جبر اور عبدہ، کے فرق پر زور دیا ہے۔ جبر قابلِ نفرت ہے۔ مگر حق کے سامنے تسلیم اور عبودیت کے بغیر انسان

ہمیشہ بے بس و ناتواں اور محدود رہتا ہے۔

لہٰذا جب دانتے کی متوازن یونانی دنیا جدید افکار و خیالات سے پارہ پارہ ہو جاتی ہے تو انسان، فاؤسٹ کی شکل میں پھر بندگیِ حق کا احساس تازہ کرتا ہے اور ناکام رہتا ہے۔ اقبال پھر دانتے کی طرف رجوع کرنے کا فیصلہ نہیں کرتا بلکہ ایک نیا سفر اختیار کرتا ہے جس میں اہلِ وجد و شوق اس خدا کی طرف گامزن ہوتے ہیں جو امر و خلق سے ماوراء ہے اور اس طرح وہ صحیح معنوں میں ایک قوت بن جاتا ہے نہ کہ محض ابال۔

اقبال کے آسمانی سفر میں ابتداءً کچھ ایسی کیفیت ہے کہ یہ دانتے کے سفر سے مختلف معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اس میں جہنم کی سیر کا کوئی ذکر نہیں۔ اور نہ گناہ کا زیادہ تذکرہ ہے۔ ان کا سفر، جو در حقیقت فتح و تسخیر کا سفر ہے۔ اور اس میں کم از کم گناہ کی ادنیٰ صورتوں پر فتح پہلے ہی سے فرض ہے، ایک چونکا دینے والی "تمہید آسمانی" سے شروع ہوتی ہے جس میں آفرینش کے پہلے دن آسمان زمین کو طعنہ دیتا ہے کہ یہ محض آب و گل کا بے ہنگم انبار اور کوری و بے نوری کا طومارِ گراں ہے اور بس:۔

طعنہ زد چرخِ نیلی بر زمیں
روزگارے کس ندیدم ایں چنیں
چوں تو در پہنائے حق کورے کجا
جز بقندیلم ترا نورے کجا
خاک اگر الوند شد جز خاک نیست
روشن و پائندہ چوں افلاک نیست

مگر ندائے حق اسے بشارت دیتی ہے کہ زمین پر قرآن مجید کی اصطلاح میں خلیفۂ حق مقرر کیا جائے گا جو مادی ارتقا کی انتہا اور اس سے بھی زیادہ حیران کن روحانی ارتقا کی ابتدا ہے ؎

اے امینے از امانت بے خبر
غم مخور، از بندۂ خود نگر
روز ہا روشن زغوغائے حیات
نے ازاں نورے کہ بینی در جہات

چنانچہ ملائکہ انسان کے حسنِ فردا کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان الفاظ میں اس کی سطوت و تأثیر بتاتے ہیں:۔

یکے در معنیٔ آدم نگر از ما چہ می پرسی
ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے!

دانتے کی "تمہید آسمانی" پر نسوانی شفقت و کرم اور نجات دہندگی کا سایہ ہے۔ بالفاظ دیگر اس پر بی بی مریم، لوسی اور اس بیاطرس کا پرتو نظر آتا ہے جس کے متعلق شاعر یوں نغمہ سنج ہے کہ "اس کی آنکھیں ستاروں سے بھی زیادہ تابناک تھیں!" اس کے برعکس اقبال کے یہاں، کہیں دور، انسان کی حیرت انگیز صلاحیتوں کی ایک دھندلی دھندلی بشارت دکھائی دیتی ہے۔

اتنے میں اقبال زمین پر اپنا رہنما تیرھویں صدی عیسوی کے مشہور ایرانی عارف شاعر رومی کی شکل میں پا لیتے ہیں۔ جسے دنیا کے بزرگ ترین اہلِ معرفت میں شمار کرنا چاہیئے اور جب وہ سفر کا آغاز کرتے ہیں تو اسی مرشدِ روحانی کے یہ نہایت ہی جدید بول ان کے کانوں میں گونج رہے ہوتے ہیں:۔

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

اس کے بعد ہم اقبال کو یکے بعد دیگرے ہفت افلاک کی سیر کرتے ہوئے پاتے ہیں جہاں وہ عارف ہندی وشوامتر[1] سے ہمکلام ہوتے ہیں اور الوہیت کے چار مہتم بالشان مظاہر گوتم بدھ، زرتشت، حضرت مسیح اور حضرت محمدؐ کے متعلق غور و فکر کرتے ہیں۔ یہ اختلافِ خیال کا ایک عجیب کرشمہ ہے کہ دانتے ان میں سے ایک کے سوا غالباً سب کو معتوبینِ حق میں شمار کرتا!

"فلک عطارد" پر اقبال کو بڑے بڑے مشرقی سیاست دانوں، مثلاً سید جمال الدین افغانی اور سعید حلیم پاشا کے ساتھ سرمایہ داری و اشتراکیت اور دنیائے مشرق و مغرب کے متعلق تبادلۂ خیالات کا موقع ملتا ہے۔ اپنی غیر معمولی بصیرت کی مدد سے وہ اشتراکیت کے مثبت پہلو کا ادراک کرتے ہیں یعنی پرانے فریب کارانہ نظام کی تباہی و بربادی۔ مگر ساتھ ہی وہ معاصرانہ حیثیت سے اس کی نااہلی کا بھی راز فاش کرتا ہے کہ یہ ایک حقیقی معنوں میں نئی دنیا تخلیق کرنے سے قاصر ہے۔ کیونکہ یہ اس اعلیٰ درجہ کی روحانیت سے بیگانہ ہے جس کی بدولت انبیاء نئی نئی دنیائیں تخلیق کرنے میں کامیاب ثابت ہوئے۔ اقبال،

---

[1] وشوامتر کے لغوی معنی ہیں بالکل شدہ یعنی پاک و صاف انسانی دانائی۔ "جاوید نامہ" میں وشوامتر کو "جہاں دوست" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

اسلام کی مذہبی جمہوریت (یعنی حق اور صرف حق تمام چیزوں کا آقا و مولا ہے۔ تمام انسان عباد اللہ ہونے کی حیثیت سے برابر ہیں۔ کوئی شخص کسی چیز کا مالک نہیں کیونکہ حقیقی مالک صرف خدا ہے) میں دنیا کے تمام مسائل ساحل پاتے ہیں۔

"فلک زہرہ" خصوصیت سے یورپ کی مخالفت میں ڈوبا ہوا ہے۔ کیونکہ اس میں کہیں عہد رفتہ کے سراغرساں ماہرین آثار قدیمہ پر حملے کئے گئے ہیں جو آثار کہن سے لذت حاصل کرتے ہیں، اور ان پارینہ تہذیبوں کے احیائے ثانیہ میں دلچسپی لیتے ہیں جن میں صنم سازی حیرت آفریں درجۂ کمال تک پہونچ گئی تھی۔ اور کہیں لارڈ کچنر کے ان مظالم کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے جو اس نے سوڈان کے مہدوی فرقہ پر رپا کئے تھے۔

گفت مردودِ "آدم از یزداں گریخت
از کلیسا و حرم نالاں گریخت
تا بیفزاید بہ ادراک و نظر
سوئے عہد رفتہ باز آید نگر!
می برد لذت ز آثار کہن
از تجلی ہائے ما دارد سخن!"

گفت "اے کشنر اگر داری نظر
انتقامِ خاک درویشے نگر!
آسماں خاکِ ترا گورے نداد
مرقدے جز در یم شورے نداد"

"فلک زہرہ" کو پاش پاش کرتے ہوئے شاعر "فلک مریخ" پر جا پہنچا ہے۔ یہ وہ زمین ہے جس کا آدم شیطان کے دام فریب میں نہ آیا۔ اسکے بجائے اس نے شیطان کو ہماری بدنصیبی کے لئے زمین پر دے پٹکا۔ اس فلک سے گذرنے کے بعد شاعر "فلک مشتری" پر پہونچتا ہے جس کا شمار نہایت ہی خوبصورت افلاک میں ہے اور جو اسلام کے تین بڑے جلیل القدر "ملحدین" منصور الحلاج، غالب اور ایران کی بابی فرقہ کی مشہور شاعرہ قرۃ العین طاہرہ سے منسوب ہے۔ جنہوں نے الحاد کے باوجود اپنی قربانیوں سے نئی دنیائیں تخلیق کیں:-

شوقِ بے پروا ندیدستی نگر!
زورِ ایں صہبا ندیدستی نگر!

غالب و حلاج و خاتونِ عجم
شور ہا افگندہ در جانِ حرم!
ایں نوا ہا روح را بخشد ثبات
گرمیٔ او از درونِ کائنات

دوسروں کی متعدد لمبی چوڑی بحثوں کے بعد طاہرہ کی عاقلانہ اور مجمل گفتگو بے اختیار دانتے کی بیاٹری کو یاد دلاتی ہے:-

از گناہِ بندۂ صاحب جنوں
کائناتِ تازہ آید بروں!
شوق بے حد پردہ ہا را بر درد
کہنگی را از تماشا می برد!
آخر از دار و رسن گیرد نصیب
برنگردد زندہ از کوئے حبیب!
جلوۂ او بنگر اندر شہر و دشت
تا نہ پنداری کہ از عالم گذشت!

یہ ایک عجیب توارد ہے کہ اسی فلک میں نصرانی دانتے نے بھی دو کافر ملحدوں یعنی ری فیئس اور ٹراجن کو جگہ دی ہے۔ بہشت میں ملحد! حق یہ ہے کہ ہر پرخلوص اقدام کے لئے پرزور رواداری بلکہ اس کی قدر دانی عظیم انسانوں کی ایک اہم مشترکہ خصوصیت ہے۔ دانتے بھی کیتھولک فرقہ کا اتنا ہی اچھا پیرو تھا جتنا اقبال اسلام کا۔ مگر دانتے رومن شہنشاہ کی خسروانہ کرم پیشگی کے سامنے سر تسلیم خم کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اور اقبال نے شاید زیادہ تہور کا ثبوت دیتے ہوئے ——— کیونکہ بعض اوقات کافر کی بہ نسبت ملحد کی داد دینا زیادہ مشکل ہوتا ہے ——— طاہرہ جیسی شیریں ہستی (جسے ۱۸۵۲ء میں طہران میں گلا گھونٹ کر مار دیا گیا) اور منصور (جس کو بغداد میں ۹۲۲ء میں نذرِ دار کر دیا گیا) کی شہادت کے سامنے سر جھکا دیا!

اور یہی فلک ہے جس میں "خواجۂ اہل فراق" اور "خونیں ایاق" ابلیس انسان کے نکما اور بودا ہونے پر فریاد کرتا ہے!

اس کے بعد آخری فلک یعنی "فلک زحل" آتا ہے جو غداروں کا ٹھکانہ ہے:-

منزلِ ارواحِ بے یوم النشور
دوزخ از احراقِ شاں آمد نفور

میں اس فلک کو وطن کے غداروں کا ٹھکانہ کہنے والا تھا۔ مگر یہ لوگ

اقبال کے نزدیک "ملت" کے غدار تھے۔ اور ملت کے معنی محض ملک یا وطن سے کہیں زیادہ وسیع ہیں۔ دانتے یا کسی اور مذہبی انسان کی طرح اقبال کا ملک تو اہلِ ایمان کی وہ عظیم جماعت ہے جو وطن سے کہیں برتر و بالا ہے۔ یہ ملک کچھ کچھ "مقدس رومن سلطنت" سے ملتا جلتا ہے۔ اقبال کو بھی غدارانِ ملت سے اتنی ہی نفرت ہے جتنی دانتے کو تھی۔ جو انہیں عین دوزخ کے دروازے پر جگہ دیتا ہے۔

"فلک زحل" کے بعد ہم افلاک کی آخری حد پر پہونچ جاتے ہیں۔ مگر اقبال کا نا مسعور ذوقِ تجسس اسے آنسوئے افلاک بھی لے جاتا ہے۔ اور یہاں ایک روح اس کے سامنے ظاہر ہوتی ہے:۔

برلغورِ ایں جہانِ چون و چند
بود مردے با صدائے دردمند!
دیدۂ او از عقابان تیز تر
طلعتِ او شاہدِ سوزِ جگر!
دمبدم سوزِ درونِ او فزود
بر لبش بیتے کہ صد بارش سرود!
"نہ جبریلے نہ فردوسے نہ حورے نے خداوندے
کفِ خاکے کہ می سوزد زجانِ آرزومندے!"

یہ نٹشے کی روح ہے جو ہر روحانی قدر سے کلیتہً ماورا ہونیکی علامت ہے۔ یہ روح کائنات کی آخری حد پر ظاہر ہوتی ہے جو جہانِ بے جہات کے محاذی واقع ہے۔ یہ دیکھ کر دل پر عجیب اثر ہوتا ہے کہ بیچارہ نٹشے جس کو ہر مذہب کے گندم نما جو فروش متقی پرہیزگار اور زاہدانِ ریاکار اس قدر شدید نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس کا آخرکار خیر مقدم بھی کیا گیا تو اس عالم میں جہاں شاعر کو اس کے فن کا لطیف و سبک پر پرواز لے گیا۔ یعنی بہشت نہیں بلکہ آنسوئے افلاک! اور یہ بھی محض اتفاق نہیں کہ نٹشے کی اس مذہبی رنگ میں مرتبہ شناسی کا حق ایک ایسے مذہب کے پیرو نے ادا کیا جو شاید تمام مذاہب سے زیادہ شدت کے ساتھ ذات باری کی صفاتِ جلال کی تفضیل کرتا ہے!

بود حلاجے بہ شہرِ خود غریب
جاں ز ملا برد و کشت او را طبیب!

اقبال کی رائے میں نٹشے کے نظریات کبھی تخریب کی حد سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اور اس نے اس "ورقِ خالی" پر کوئی مثبت چیز تحریر نہ کی جو بقول شوپنہار انسان کی تمام فضول ہرزہ سرائیوں میں سے باقی رہ جاتی ہے۔ لیکن

آنچہ او جوید مقامِ کبریاست
ایں مقام از عقل و حکمت ماوراست

نٹشے کے بعد ہم خود کو حقیقی بہشت میں پاتے ہیں جو روایتی تصور کے مطابق طلسماتی باغات مشرقی سلاطین کے حیرت انگیز قصور و ایوان اور خوبصورت حوروں سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ اس "کاخِ بریں" (دانتے نے بھی کاخ بریں کا ذکر کیا ہے۔ اور یہ اقبال کے یہاں کس قدر مناسبت لئے ہوئے ہے! حالانکہ دونوں مقامات میں کتنا ہی فاصلہ ہے۔ یہ بات بھی اس سلسلہ میں خاص اہمیت رکھتی ہے) میں اقبال پھر بھی رک کر دیگر ارواح جلیلہ سے ہمکلام ہونا چاہتے ہیں۔ مگر ان کا دلِ بے تاب تو صرف ذات باری کے لازوال حسن ہی سے مطمئن ہو سکتا ہے:

گرچہ جنت از تجلی ہائے اوست
جاں نیاساید بجز دیدارِ دوست!

اس لئے اگرچہ کیفیت یہ تھی کہ

با دلِ پرخوں رسیدم بر درش
یک ہجومِ حور دیدم بر درش!
بر لبِ شاں زندہ رود، اے زندہ رود
زندہ رود، اے صاحبِ سوز و سرود!
شور و غوغا از یسار و از یمیں
یک دو دم با ما نشیں، با ما نشیں!

لیکن پھر بھی وہ یہ نوا بلند کرتے ہوئے حوروں کو حیران و ششدر چھوڑ کر بہشت سے آگے بڑھ جاتے ہیں کہ

دگر بشاخِ گل آویز و آب و نم درکش
پریدہ رنگ! از بادِ صبا چہ می جوئی؟

اقبال کے نغمۂ سرمدی کا خاتمہ خاص طور پر دلچسپ ہے —
"جمالِ جاودان" کے حضور پہنچنے کے بعد زندہ رود اور محبوبِ حقیقی میں چند باتیں، چند سوال و جواب ہوتے ہیں۔ آخر میں زندہ رود التماس کرتا ہے کہ:

علامہ اقبال رح

عمل : چغتائی

اٹلی کا نامور مستشرق : الیساندرو بوزانی
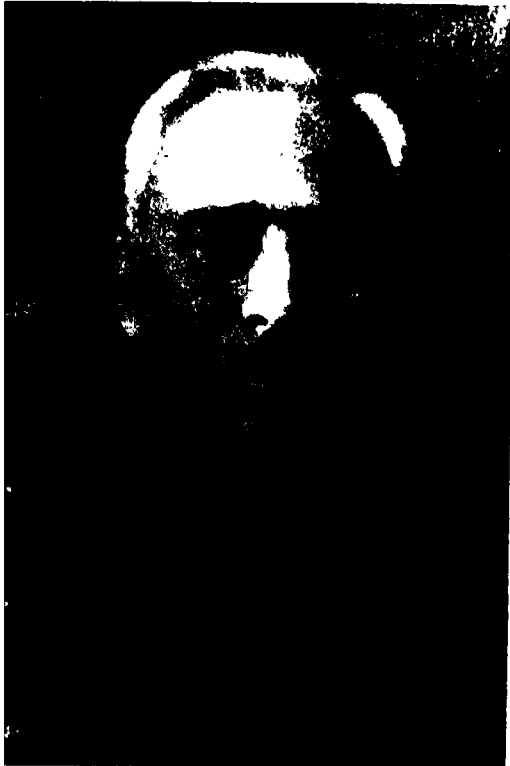
پروفیسر ایم ایم شریف
جنہوں نے دوسری پاکستان فلسفہ کانگریس کی

عکس خط علامہ اقبال رح

دیدہ ام تدبیر ہائے غرب و شرق
وانما تقدیر ہائے غرب و شرق

چنانچہ "تجلّیِ جلال" آشکار ہوتی ہے اور اس "نوائے سوزناک" پر خاتمۂ کلام کرتی ہے:

بگذر از خاور و افسونیِ افرنگ مشو
کہ نیرزد بجوے ایں ہمہ دیرینہ و نو

یہ وہی مشرق کی دیرینہ آواز ہے جس میں وجود و عدم، قدیم و جدید سے استغنا ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس طرح شاعر کے ہم مذہبوں کی وہ صوفیانہ کنارہ کشی جس پر اس نے بارہا اس قدر نکتہ چینی کی تھی۔ پھر واپس آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ کنارہ کشی سرگرمیِ عمل کی طرف لے جاتی ہے۔ نہ کہ دنیا و ما فیہا سے چشم پوشی کی طرف جس سے کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

زندگی انجمن آرا و نگہدارِ خود است
اے کہ در قافلہ، بے ہمہ شو با ہمہ رو!
تو فروزندہ تر از مہرِ منیر آمدۂ
آنچناں زی کہ بہر ذرہ رسانی پرتو!

دانتے اور اقبال کا فن کاروں کی حیثیت سے موازنہ بے سود اور لاحاصل ہے۔ کیونکہ فن کا موازنہ ممکن ہی نہیں۔ مگر ہماری اس دنیا میں جو اس قدر افراتفری کا شکار ہے۔ ان عظیم ہستیوں کا تبادلۂ خیالات جو محض اپنی موجودگی ہی سے ہماری پست زندگیوں میں تسکین و تشفی کا باعث ہوتی ہیں۔ اور ہم خواہ چاہیں یا نہ چاہیں وہ ہمیں کسی ایسے نظام یا حقیقی وحدتِ فکر سے ہموار اور ہم آہنگ کرتی ہیں جو تمام ادنیٰ عقائد کی حد بندیوں سے بالاتر ہے۔ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ تبادلۂ خیالات اس حقیقی قرب پر روشنی ڈالتا ہے جو اقبال کے پیش کردہ روایات اور قصص و حکایات سے پاک اسلام اور نصرانیت کی اصلی تعلیم یا قرونِ وسطیٰ میں یورپ کے مضبوط و توانا نصرانی نظام تمدن ۔ وہی جس کا نمائندہ دانتے تھا۔ میں پایا جاتا ہے۔

اس کے باوجود دونوں شاعروں میں کتنے ہی فرق باقی رہ جاتے ہیں۔ دیگر امور سے قطع نظر اقبال کا زمانہ فلورنس کے جلاوطن شاعر سے چھ سات سو سال بعد کا زمانہ ہے۔ اور اس کا دامن ایک مختلف مذہبی روایت کے ساتھ وابستہ ہے۔ ارسطو کی پُر قرار متوازن دنیا اقبال کی دنیا نہیں۔ بلکہ اقبال نے تو یونانی فلسفہ و حکمت پر نہایت کڑی تنقید کی ہے جس نے ان کی رائے میں قدیم نصرانی فلسفہ کی خالص اہمیت کو اپنے عقلیاتی دینیات اور کافرانہ رسوم و شعائر سے تباہ و برباد کر دیا جس کو اسلام نے اشاعرہ کے روایتی دینیات کے منافی نظریات سے بہ آسانی مغلوب کر لیا۔ گو اس مہم میں وہ خود بھی ارسطو کے افکار سے دامن نہ بچا سکا۔ یہ اشاعرہ ہی ہیں جنہوں نے تخلیق کی مطلق آزادی کے شوق میں تمام ثانوی اسباب کو منسوخ کر دیا۔

مگر ایک ایسی دنیا میں جس نے اپنے مذہبی احساسات کو بالکل خیرباد کہہ دی ہے اور جس نے خدا کو غیر شخصی بنا کر حالات اور تاریخ کو کم و بیش روحانوی قسم کے اوتار بنا رہا ہے۔ اقبال ایک بار پھر ایک نوائے لاہوتی بلند کرتا ہے جس میں انجیل مقدس کی آواز سنائی دیتی ہے۔ یہ آواز دنیائے مغرب کی بعض آوازوں کی بہ نسبت دانتے کی آواز سے یقیناً زیادہ مشابہت رکھتی ہے۔ واقعۂ معراج کے بارے میں ایک مسلمان صوفی عبدالقدوس گنگوہیؒ کا قول ہے: "محمد عربی عرشِ بریں پر پہنچ کر واپس آ گئے۔ اگر میں اس مقام پر پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ آتا!" اس سے پیغمبر اور عارف کا فرق ظاہر ہوتا ہے۔ کیونکہ پیغمبر وصالِ حق سے اپنے اندر ایک نیا تخلیقی ولولہ محسوس کرتا ہے۔ اور عارف یہی پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے اور دوسرے پیغمبروں موسیٰؑ اور الیاسؑ کے لئے دریائے سرمدی کے کنارے ایک خیمہ گاڑ کر بیٹھا رہے! اقبالؒ جمالِ حق سے تحریکِ عمل پاتے ہیں۔ اور ان کا پیغام پیغمبرانہ ہے نہ کہ عارفانہ۔

جیسا کہ اقبال نے اپنے خطبات دربارۂ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں کہا ہے، اپنے مذہبی واردات سے دنیا کی کایا پلٹ دینا۔ یہ خصوصیت ہے جو ایک پیغمبر کو عارف سے ممیز کرتی ہے۔ اقبالؒ کا شمار مشرق کے ان تھکے ماندے عارفوں میں نہیں جن کے اکثر اہلِ مغرب اس قدر مداح ہیں۔ لیکن وہ ایک بے دین پرستارِ عمل بھی نہیں۔ ایک ایسا انسان جو محض عمل برائے عمل کا دلدادہ ہو۔

مانا کہ اقبال عمل کے قائل ہیں۔ لیکن ہمیں یہ جاننا چاہئے کہ کسی اقدام سے پہلے انہوں نے افلاک کا سفر کیا۔ یہ درست ہے کہ انہوں نے "خودی" کو نئے معنی عطا کئے ہیں۔ مگر ہمیں احتیاط برتنی

(باقی صفحہ ۵۷ پر)

اقبال کی شاعری کا انسانی پہلو

عبادت بریلوی

اقبالؒ جدید دور کے ایک بڑے شاعر اور ایک بلند پایہ مفکر تھے۔ ان کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ مختلف زاویوں سے ان پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ لیکن ان کے فکر و فن کی تہہ تک بہت کم لوگ پہونچ سکے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اقبالؒ کی شخصیت میں ایسی ہمہ گیری ہے کہ ہر شخص اسی آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔ اور اپنے مطلب کی باتیں نکال کر اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے فکرِ اقبال کے صحیح خط و خال کو سمجھ لیا ہے۔ یہ اقبال کی بڑائی کی دلیل ضرور ہے۔ لیکن اس صورتِ حال نے انہیں نقصان بھی پہنچایا ہے۔ ان کے فکر و فن کا جیسا تجزیہ ہونا چاہیئے تھا نہیں ہو سکا ہے۔ ہر شخص اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے بیٹھا ہے اور بزعمِ خود یہ سمجھتا ہے، کہ وہ اقبال کے فکر و فن کا ماہر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے فکرِ و فن میں اتنی گہرائی، اس قدر وسعت اور اس درجہ ہمہ گیری ہے کہ اس کا سمجھنا کسی غیر متوازن اور جذباتی انسان کے بس کی بات نہیں۔ اقبال کو سمجھنے کے لئے فلسفی کے دماغ اور شاعر کے دل کے ساتھ ساتھ ایک انسانی شعور کی بھی ضرورت ہے۔ اس انسانی شعور کی روشنی میں ایک تجزیاتی اور تخلیقی زاویۂ نظر کے بغیر ان کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ انسانیت اور انسان دوستی کے صحیح شعور کے بغیر ان کو سمجھنا ناممکن ہے۔ بلکہ انسانیت اور انسان دوستی کا یہ شعور تو ان کے سمجھنے میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ یہی محور ہے جس کے گرد ان کے تمام افکار و خیالات گھومتے ہیں ـــ یہی بنیاد ہے جس پر انہوں نے اپنے فکر و فن کی بنیاد استوار کی ہے۔ اسی لئے تو ان کے یہاں انسان دوستی کا خیال اتنی شدت سے کارفرما نظر آتا ہے۔ ان کی ہر بات میں اس جذبے کی ایک لہر سی دوڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اقبال نے اسی انسان دوستی کے شدید جذبے کے ماتحت اپنے فکر و فن میں انسانی پہلو کو مختلف زاویوں سے نمایاں کیا ہے۔ اور یہ پہلو اس حد تک ان کے یہاں نمایاں ہوتا ہے کہ اس کے سامنے دوسرے پہلو بڑی حد تک پس منظر میں جا پڑتے ہیں۔

اقبال کے افکار و خیالات سے اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر ایک فلسفی تھے۔ انہوں نے مغرب و مشرق کے بہت سے فلسفیوں سے استفادہ کیا ہے۔ لیکن وہ ان میں سے کسی ایک فلسفے کے ساتھ بہہ نہیں گئے ہیں۔ انہوں نے ان فلسفوں سے وہ خیالات لے لئے ہیں، جو ان کے انسان دوستی کے نظریئے کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ ان خیالات کے امتزاج سے انہوں نے انسان دوستی کے نظریئے کی تعمیر و تشکیل کی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کوئی ایک فلسفیانہ خیال بھی ان کے یہاں ایسا نہیں ملتا جو ان کی انسان دوستی کو سہارا نہ دیتا ہو۔ ان کا فلسفہ صرف فلسفہ ہی نہیں ہے، حیاتِ انسانی کا ایک نظامِ فکر ہے جس میں انسان دوستی کا خیال بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے یہاں مختلف فلسفیوں کے گہرے اثرات ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک کی بات انہوں نے مانی نہیں ہے ہر ایک کے خیالات کو تسلیم نہیں کر لیا ہے بلکہ ہر ایک کے خیالات میں سے ایسی باتیں لے لی ہیں جن سے ان کا مقصد پورا ہوتا ہے جو ان کے بنیادی نظریات کی تشکیل و تعمیر میں ممد و معاون ہوتے ہیں۔ اسی طرح ان کے فلسفے کی بنیاد پڑی ہے۔ اس فلسفے کے جو عناصر ہیں وہ سب انسانیت کے گرد گھومتے ہیں۔ ان سب کی تان انسان دوستی پر جا کر ٹوٹتی ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ اقبال نے اس فلسفے کو صرف خیالی نہیں ہونے دیا ہے۔ اس سے متعلق ہر فلسفیانہ خیال کو عمل سے ہم آہنگ کیا ہے۔ انسانیت کی بلندی کا خیال اس عمل کی جولانگاہ ہے

فلسفیوں میں انہوں نے نطشے سے استفادہ کیا ہے۔ حالانکہ وہ اسے "مجذوبِ فرنگی" کہتے ہیں اور اسے خود یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ "مقامِ کبریا" کیا ہے۔ برگساں سے بھی وہ کسی حد تک متاثر ہیں۔ کانٹ، ہیگل، اور مارکس سے بھی انہوں نے

بعض خیالات لئے ہیں۔ اسلامی مفکروں میں رومی کو تو خیر انہوں نے اپنا مرشد اور رہنما ہی مانا ہے، لیکن ابن سینا، ابن العربی اور جمال الدین افغانیؒ کے اثرات بھی ان پر کچھ کم نہیں ہیں۔ ان تمام خیالات کو انہوں نے ایک مرکز پر جمع کیا ہے۔ یہ مرکز انسان دوستی کا مرکز ہے۔ یہیں سے ان کی انفرادیت وجود اختیار کرتی ہے۔ اسی لئے ان کا فلسفہ صرف فلسفہ ہی نہیں رہ گیا ہے، انسانی زندگی کے لئے ایک لائحہ عمل بن گیا ہے۔ وہ زندگی کے مسائل کو حل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ وہ ایک پیغام ہے اس زخمی انسانیت کے لئے جو زخموں سے چور ہے، جو سر سے پاؤں تک لہو لہان ہے، جو صدیوں سے جبر و استبداد کے پیروں تلے پڑی تلملا رہی ہے۔

یہ خیالات ان لوگوں کے لئے کسی قدر عجیب اور نامانوس ضرور ہیں۔ جو اقبالؒ کو اسلامی طرز فکر اور اسلامی نظام حیات کی طرف جھکتے ہوئے دیکھ کر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وہ صرف مسلمانوں کے شاعر ہیں۔ ان کے پیش نظر صرف مسلمانوں کی زندگی ہے، صرف انہیں کے مسائل ہیں۔ وہ صرف مسلمانوں ہی کو اس دنیا میں سرخرو اور سربلند دیکھنا چاہتے ہیں ___ لیکن اقبالؒ کے فن کو اس طرح دیکھنا، اس کی روح کا خون کرنا ہے۔ اس میں تنگ نظری بھی ہے اور کم نظری بھی!

ویسے یہ بات ٹھیک ہے، اور اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اقبالؒ نے اپنے فکر و فن کی بنیادیں اسلامی نظریات اور اسلامی نظام حیات پر رکھی ہیں، لیکن ان اسلامی نظریات نے انہیں محدود نہیں کیا ہے۔ ان کے یہاں تنگ نظری نہیں پیدا کی ہے۔ برخلاف اس کے ان کے شعور کو بیدار کیا ہے۔ اس کو وسعت دی ہے۔ کیونکہ اسلام انکے نزدیک تنگ نظری سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ اس میں ایک ہمہ گیری ہے، ایک وسعت ہے، ایک بلندی ہے۔ انسانی مساوات اور اخوت، انسانی ہمدردی اور محبت، انسانی بلندی اور برتری کو اس نظام حیات میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اسلام ایک مکمل نظام حیات بھی رکھتا ہے روحانی اور مادی دونوں اعتبار سے وہ انسانیت کو منتہائے کمال پر پہنچانے کا خواہشمند ہے۔ معاشی، معاشرتی، تہذیبی اور تمدنی اقدار میں ہم آہنگی کا خیال ہمیشہ اس کے پیش نظر رہا ہے۔ اسی لئے اس نے انسانیت کو ہر دور میں، ہر اعتبار سے آگے بڑھانے اور سربلند کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؒ انسانی نظریات کو انسانی فکر کی تاریخ میں نمایاں حیثیت دیتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ اسلام نے انسانیت کو آدابِ آدمیت سکھائے ہیں۔ اور اس کو تہذیب سے ہمکنار کیا ہے۔ اسلام نے طبقاتی تفریق کو بڑی حد تک ختم کیا ہے مساوات کی اہمیت ذہن نشین کرائی ہے اور بے لوث انسانی خدمت کا جذبہ افراد کے دلوں میں پیدا کیا ہے اور ایثار اور قربانی کو فرد اور جماعت دونوں کے لئے لازمی قرار دیا ہے۔ اقبالؒ اسی لئے تو اس نظام حیات کے بنیادی اصول اور نظریات کے پرستار ہیں ___ حقیقت یہ ہے کہ ان کی اس پرستش اور وابستگی میں ایک انسانی بلندی کا احساس شامل ہے۔ انسانیت کو ارتقا کے راستے پر گامزن کرنے کی خواہش پوشیدہ ہے۔ زندگی کو اقدار شر سے پاک کرنے اور اقدار خیر سے ہمکنار کرنے کی آرزو کارفرما ہے۔

یوں دوسرے نظریات حیات بھی انسانی زندگی میں موجود ہیں لیکن اقبالؒ کے خیال میں وہ مجموعی اعتبار سے مکمل نہیں ہیں۔ کوئی مادی اعتبار سے مکمل ہے تو کوئی روحانی اعتبار سے۔ مادیت اور روحانیت کا سنگم اگر کہیں ملتا ہے تو وہ اسلامی نظام حیات ہے، اور یہ دونوں انسانیت کی تکمیل کے لئے لازمی ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کی تکمیل کے بغیر انسانیت کی تکمیل اور بلندی ناممکن اور محال ہے۔ اس روحانیت اور مادیت کے صحیح امتزاج اور ہم آہنگی کی خصوصیتیں صرف اسلامی نظام حیات میں مل سکتی ہیں۔ اسلام روحانی اور مادی دونوں اعتبار سے زندگی بسر کرنے کا ایک مکمل لائحہ عمل پیش کرتا ہے۔ وہ ایک ایسی عالمگیر برادری کا نام ہے جس میں امتیاز رنگ و خون نہیں ہوتا جس میں نسل اور قوم کی قید نہیں ہوتی۔ بلکہ اس لڑی میں منسلک ہونے کے بعد ہر فرد جہانِ رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جاتا ہے۔ اس طرح کہ نہ کوئی تورانی باقی رہتا ہے نہ ایرانی! اور ظاہر ہے۔ ایسا کرنے سے اسلام کا مقصد صرف انسانیت کی بلندی اور سرافرازی ہے۔ وہ زندگی بسر کرنے کا ایک لائحہ عمل بھی صرف اسی انسان اور انسانیت کے خیال سے پیش کرتا ہے۔ اس نے ہر اعتبار سے زندگی کو برتنے اور بسر کرنے کی تاکید کی ہے۔ لیکن صرف مادیت اس کا نصب العین نہیں ہے وہ اس کے ساتھ ساتھ روحانیت کی فضا میں پرواز کرنا بھی سکھاتا ہے یہ دونوں پہلو اسلامی نظام میں گلے ملتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دوسرے نظریاتِ حیات میں یہ بات نہیں۔ کیونکہ ان میں سے اکثر میں یا تو تمام تر روحانیت ہی روحانیت ہے یا مادیت ہی مادیت!

دورِ جدید کے نظام زندگی میں نظریۂ اشتراکیت اقبالؒ کو اہم معلوم ہوتا ہے۔ وہ اس سے متفق نہیں ہیں۔ انہیں اس نظریئے سے بنیادی

افات ہیں۔ لیکن ان اختلافات کے باوجود وہ اس کی بڑائی کے قائل
۔ زندگی کے متعلق اشتراکیت کے تمام تر مادی نقطۂ نظر کو وہ انسانیت
لئے خطرناک سمجھتے ہیں۔ انھیں اشتراکیت کے بانی کارل مارکس سے
ی طور پر نظریاتی اختلافات ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اس کی عظمت
قائل ہیں۔ ان کے خیال میں "کلیم بے تجلی" اور "مسیح بے صلیب" ہے
ہرچند کہ اسے پیغمبر نہیں کہا جا سکتا لیکن اس کی بغل میں کتاب ضرور
ودہے ؎:

آں کلیم بے تجلّی آں مسیح بے صلیب
نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب

روس میں لینن کے ہاتھوں اس کے نقطۂ نظر کو جو عملی جامہ پہنایا گیا
، ارتقائے انسانی کی تاریخ میں وہ اس کی اہمیت کے معترف ہیں۔
ن اس کے ساتھ ہی ان کے خیال میں روحانیت کو خیرباد کہہ دینے
جہ سے روس کے یہ تمام تجربات بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کے
میں روس نے ایسا کر کے اپنے آپ کو ایک دلدل میں پھنسا لیا ہے۔
سی لئے اس نے ترقی کے بہت سے دروازے اپنے اوپر بند کر لئے
۔ زندگی کی راہ میں جس طرح اسے آگے بڑھنا چاہیئے تھا، نہیں بڑھ
ہے۔ لیکن وہ اس سے مایوس نہیں ہیں، بلکہ اس کے متعلق ایک رجائی
نظر رکھتے ہیں اور انھیں یقین ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن اپنے آپ کو
دلدل سے ضرور باہر نکال لے گا۔ کیونکہ آئین زندگی سے صحیح مطابقت
بغیر کوئی انسانی نظام زندہ نہیں رہ سکتا ؎

کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ
لا سلاطیں، لا کلیسا، لا الٰہ
فکر او در تند باد لا بماند
مرکب خود را سوئے الّا نراند
آیدش وقتے کہ از زور جنوں
خویش را زیں تند باد آرد بروں
در مقام لا نیاساید حیات
سوئے الّا می خرامد کائنات

اقبالؒ کے خیال میں اشتراکیت ایک ایسا نظام ضرور ہے جو رنگ و خون
نسل و قوم کے سطحی امتیازات کو مٹانا چاہتا ہے جس کے نزدیک طبقاتی
تفریق کو مٹا کر ایک ایسے نظام کی تشکیل لازمی اور ضروری ہے جس میں نفرت
نہ ہو، بغض و عناد نہ ہو، ہوس ملک گیری نہ ہو، غربت و امارت کا فرق نہ ہو،
اور دولت کی تقسیم غیر مساوی نہ ہو۔ اقبالؒ اشتراکی نظام کے ان پہلوؤں کی
اہمیت کے تو قائل ہیں لیکن اس نظام نے روحانیت سے جو چشم پوشی
کی ہے، اس کے وہ دشمن ہیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں روحانیت کے بغیر
انسانیت کی تکمیل ناممکن ہے، اور انسانیت انھیں بہت عزیز ہے۔
اس لئے اشتراکیت کی یہ کمی ان کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے۔
روحانیت کے بغیر انسان میں اخلاقی اقدار کی پاسداری اور خلوص صدق
دلی ہمیشہ باقی نہیں رہ سکتی۔ جو نظام حیات بیک وقت ان تمام باتوں کو
پورا کرتا ہے، وہ ان کے خیال میں اسلامی نظام حیات ہے اور اسلامی
نظام حیات ان کے خیال انسان دوستی اور انسانیت پرستی کا دوسرا
نام ہے۔

اقبالؒ اسلام کو اشتراکیت کی طرح ایک تحریک سمجھتے ہیں۔ یہ
تحریک ان کے خیال میں انسان دوستی کا سبق دیتی ہے۔ ملک و ملت کے
تفرقے مٹانا چاہتی ہے۔ طبقاتی تفریق کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ انسان کو صحیح معنوں
میں انسان بنانا چاہتی ہے۔ اقبالؒ اسی تحریک کے مفکر ہیں، اسی کے
ترجمان ہیں، اسی کے علمبردار ہیں۔ انہوں نے اس سلسلے میں نئی باتیں بھی
کہی ہیں اور پرانی باتوں کو نئے حالات سے مطابق کر کے نئے انداز میں پیش
بھی کیا ہے۔ وقت نے جن رگوں کو خون سے خالی کر دیا تھا، اقبالؒ نے
ان کے اندر ایک نیا خون زندگی دوڑایا ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اقبالؒ
نے اسلامی تحریک سے اپنے آپ کو وابستہ کر کے ایسی قومی برتری کا خواب
دیکھا ہے جس کی تہہ میں فسطائی رجحان کی جھلک ہے، وہ اس حقیقت کو
فراموش کر دیتے ہیں کہ اس قوم کے دروازے کسی پر بند نہیں ہیں۔ اقبالؒ ان
دروازوں کو ہر ایک کے لئے کھلا رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے ان کا یہ پیام
انسان دوستی ان افراد کے لئے بھی ہے جو اس تحریک کے مخالف ہیں، ان
کے لئے بھی ہے جو انسانی برادری کے اس رشتے میں منسلک ہونا نہیں چاہتے۔
اقبالؒ انھیں دعوت دیتے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کے جلال و جمال
دونوں کی آب و تاب دکھا کر انہیں اپنی جانب کھینچتے ہیں تاکہ انسانیت
کی تعمیر صحیح اقدار پر ہو سکے۔ اقبالؒ کی نظر میں یہ دیکھتی ہیں کہ انسانیت گھائل
ہے۔ قومی نسلی اور ملکی تفریق نے اسے زخموں سے چور کر دیا ہے۔ ان کی تعلیم
ان زخموں پر مرہم رکھنے اور اس طرح ان کو مندمل کرنے کی تعلیم ہے ان کا
پیام ان زخموں کو بھرنے کا پیام ہے ؎

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

یہ اخوت کا بیاں ہونا، یہ محبت کی زباں ہو جانا، یہ اچھل کر بیکراں ہو جانا، اپنے اندر بڑی معنویت رکھتا ہے۔ اقبالؒ کی تعلیم اور ان کے فلسفے کی بنیادی باتیں اس کے اندر موجود ہیں۔ وہ انسانی زندگی میں اخوت اور محبت کے چراغوں کو روشن رکھنا چاہتے ہیں۔ انسان کو بیکراں بنانا ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے اور یہی اسلام بھی چاہتا ہے۔ اقبالؒ نے اس بنیادی خیال کو زیادہ گہرائی اور رعنائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خرد نے انھیں حکیمانہ نظر عطا کی ہے اور عشق نے انھیں حدیثِ رندانہ سکھائی ہے۔ وہ رازِ درونِ میخانہ کے محرم ہیں۔ ان کی نظر اصلیت اور حقیقت تک پہونچی ہے۔ اسی لئے ان کے یہاں اس سلسلے میں خلوص اور صدقِ دلی کا احساس ہوتا ہے۔ عقل و شعور کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

یہ خیال یہاں پیدا ہو سکتا ہے کہ اقبالؒ نے اتحاد و اتفاق، اخوت و محبت کا یہ پیام صرف مسلمانوں کو دیا ہے لیکن یہ بات صحیح نہیں۔ مسلمانوں کا اتحاد، اس میں شک نہیں کہ ان کے پیشِ نظر ہے۔ لیکن یہ اتحاد انہیں قدروں کو عام کرنے کے لئے ان کے پیشِ نظر رہا ہے۔ اور ان قدروں کو وہ ساری انسانیت میں عام کرنا چاہتے ہیں۔ انسانیت کا خیال کبھی بھی ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ وہ اس خیال کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ انہوں نے واضح طور پر اس خیال کا اظہار کیا ہے۔ کہ "دراصل انسانیت کی بقا کا راز اس کے احترام میں ہے۔ جب تک تمام دنیا کی تعلیمی قوتیں اپنی توجہ کو محض احترامِ انسانیت کے درس پر مرکوز نہ کر دیں، یہ دنیا بدستور درندوں کی بستی بنی رہے گی" اور اس دنیا کو درندگی اور بہیمیت سے پاک کرنا، اور اس طرح اس کو تہذیب سے ہمکنار کرنا ان کا سب سے بڑا نصب العین ہے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے کہ وہ اپنے فکر و عمل کو صرف مسلمانوں ہی تک محدود رکھتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی دیکھتے ہیں۔ مسلمانوں کا خیال بے شک ان کے یہاں زیادہ ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ

اقبال خود مسلمانوں کی اس جمعیت سے تعلق رکھتے تھے، جس کو صدیوں کے مسلسل انحطاط و زوال نے کہیں کا نہیں رکھا تھا، جن کی انفرادیت ختم ہو چکی تھی، جو اس زندگی میں بے یار و مددگار رہ گئے تھے، اور جن کا کوئی پوچھنے والا نہیں رہا تھا۔ اس لئے اقبال کا ایک ایسی قوم کی فلاح و بہبود کی طرف متوجہ ہونا، انسان دوستی کے بنیادی خیال سے علیحدہ کوئی بات نہیں ہے۔ یہ اسی کا ایک حصہ ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ سارے مشرق کا خیال ان کے پیشِ نظر رہا ہے۔ کیونکہ یہ دونوں زمانے کے ہاتھوں بری طرح پامال کئے گئے ہیں۔ ان اشعار میں سارے مشرق کی حالت کو بہتر بنانے کا احساس کتنا شدید ہے ؎

تیرہ خاکم را سراپا نور کن — در تجلی ہائے خود مستور کن
تا بروز آرم شبِ افکارِ شرق — بر فروزم سینۂ احرارِ شرق
از نوائے پختہ سازم خام را — گردشِ دیگر دہم ایام را

فکرِ شرق آزاد گردد از فرنگ
از سرودِ من بگیرد آب و رنگ

اور ایک جگہ ہمالیہ، اٹک اور رودِ گنگ کو مخاطب کر کے ان خیالات کا اظہار کیا ہے ؎

اے ہمالہ اے اٹک اے رودِ گنگ
زیستن تا کے چناں بے آب و رنگ
پیرمرداں از فراست بے نصیب
نوجواناں از محبت بے نصیب
شرق و غرب آزاد و ما نخچیرِ غیر
خشتِ ما سرمایۂ تعمیرِ غیر

ایک اور جگہ ہندوستانیوں کی باہمی کشمکش اور اس کے نتیجے میں فرنگی قوم کی کامیابی پر اس طرح خون کے آنسو بہاتے ہیں ؎

ہندیاں با یک دگر آویختند
فتنہ ہائے کہنہ باز انگیختند
تا فرنگی قومے از مغرب زمیں
ثالث آمد در نزاعِ کفر و دیں
کس نداند جلوۂ آب از سراب
انقلاب اے انقلاب اے انقلاب

فکرِ شرق کو دستِ فرنگ سے آزاد کرنے کی خواہش اور انقلاب کا یہ نعرہ

انسان دوستی کے شدید جذبے کا نتیجہ ہے۔ اقبال کو مسلمان، ہندوستان اور مشرق سب کی پائمالی کا شدید احساس ہے۔ اور تاریخ کے مختلف ادوار میں اس پر جو دست درازیاں ہوتی رہی ہیں، وہ ان سے خوش نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ ان دست درازیوں کو انسانیت سے اور انسان دوستی کے بنیادی اصول کے خلاف سمجھتے ہیں۔

اس ساری بحث سے صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ اقبالؒ نے اپنے آپ کو صرف مسلمانوں ہی تک محدود نہیں کیا ہے اُن کے دل میں ہر پیش پا افتادہ قوم اور پائمال فرد کا درد ہے۔ وہ ان افراد اور اقوام کو بلند کرنا چاہتے ہیں لیکن ان کے خیال میں یہ بلندی انہیں اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جب وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کو اپنالیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں اسلامی اصول ہی انسان دوستی اور انسانیت کے اصول سے ہم آہنگ ہیں۔ اسلام کی ہر بات میں وہ انسانیت کی بہتری دیکھتے ہیں۔ اس کی پیش کی ہوئی تمام اقدار میں انہیں انسانیت پرستی کا خیال کارفرما نظر آتا ہے اور اس کی پیش کی ہوئی تمام اقدار میں انہیں بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود دکھائی دیتی ہے۔ لیکن ان کے یہ خیالات کسی جذباتیت پر مبنی نہیں ہیں۔ انہوں نے اس حقیقت کو محسوس کیا ہے کہ اسلام نے انسانی زندگی کے بنیادی مسائل کو حل کیا ہے۔ اور صحیح اسلامی نظام اقدار میں وہ طبقاتی کشمکش اور آویزش نظر نہیں آتی جس نے آج ساری دنیا کو ہنگاموں کی آماجگاہ بنادیا ہے۔ ساری انسانی زندگی جن کی وجہ سے ایک اچھا خاصا میدان کارزار بن گئی ہے۔

اقبالؒ نے اسی کشمکش اور آویزش کو شدت سے محسوس کیا ہے۔ اس آویزش اور کشمکش سے پیدا ہونے والے بنیادی مسائل کا وہ گہرا شعور رکھتے ہیں اسی لئے انہوں نے ان بنیادی مسائل کی طرف پوری طرح توجہ کی ہے، انسانی زندگی میں سرمایہ و محنت کی جو کشمکش جاری ہے، اس کا انہیں علم ہے۔ وہ اس کے سارے نشیب و فراز کو سمجھتے ہیں، اس کا سارا مدوجزر ان کے پیش نظر رہا ہے —— اس کو بنیاد بنا کر انہوں نے انسانی تاریخ کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں انسانی زندگی کو جن حالات سے دوچار ہونا پڑا ہے، اس کا اقبال کو بڑا دکھ ہے۔ وہ اس پر خون کے آنسو بہاتے ہیں اسی لئے تو اپنی شاعری کے ذریعے سے انہوں نے بندۂ مزدور کو بیداری کا پیام دیا ہے۔ وہ مشرق و مغرب میں اس کے دور کا آغاز دیکھتے ہیں: "خضر راہ" اور "شمع و شاعر" ان کی مشہور نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں انہوں نے انسانی زندگی کے انہیں بنیادی مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ انہوں نے ان مسائل کو خالص انسانی زاویۂ نظر سے دیکھا ہے جس زمانہ میں یہ نظمیں لکھی گئی ہیں، اس زمانہ میں ان معاملات و مسائل کو اس زاویۂ نظر سے دیکھنے کا کسی کو خیال بھی نہیں آتا تھا۔ اقبالؒ کو اس سلسلے میں اولیت کا شرف حاصل ہے۔ انسان دوستی کے شدید جذبہ ہی نے اقبالؒ سے ان اشعار کی تخلیق کرائی ہے ؎

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے دہقاں ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو
کیوں کسی کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے
راہ تو، رہرو بھی تو، رہبر بھی تو، منزل بھی تو

(شمع و شاعر)

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا، یہ ہے پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

("خضر راہ")

ان اشعار میں انسان کی اہمیت کا صحیح احساس ہے۔ انسانی زندگی کے تاریخی ارتقاء کا واضح شعور ہے۔ اقبال نے یہاں اس حقیقت کو محسوس کیا ہے کہ انسان اس زندگی میں ایک بہت بڑی طاقت ہے جن لوگوں نے زندگی کے غلط نظام اقدار کا سہارا لے کر اسے شکنجوں میں کسنے کی کوشش کی ہے، وہ ہمیشہ باقی رہنے والے نہیں۔ ان کے جبر و استبداد کے پائمال افراد کا احساس خودی بڑی آسانی سے موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے۔ چنانچہ انسان کے لئے اپنی اہمیت کا صحیح احساس ضروری ہے کہ اسی احساس سے فکر و عمل کی صلاحیتیں بیدار ہوسکتی ہیں اور انسانی زندگی کو ارتقاء پر گامزن کرنے کے لئے راستے ہموار ہوسکتے ہیں۔ اور جب یہ صورتِ حال پیدا ہو جائے تو سرمایہ دارِ حیلہ گر کو موت کے گھاٹ اتارا جا سکتا ہے۔ نسل، قومیت، کلیسا، تہذیب اور رنگ کے بت توڑے جا سکتے ہیں۔ بزم جہاں کا یہ انداز ہو تو مشرق و مغرب میں نئے دور کا آغاز ہو سکتا ہے۔ اقبالؒ کے خیال میں یہ صورت حال انسانی زندگی کی ارتقائی کیفیت کے لئے از بس ضروری ہے اسی لئے تو وہ

انسان کی تمام صلاحیتوں کو اس کام کے لئے وقف کر دینا چاہتے ہیں۔
چنانچہ دنیا کے غریبوں کو جگانا، کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دینا، غلاموں کا
لہو سوز یقیں سے گرمانا، کنجشک فرو مایہ کو شاہیں سے لڑا دینا ان کا پیام
بن جاتا ہے۔ ان کی نگاہیں سلطانیٔ جمہور کو آتے ہوئے دیکھتی ہیں۔ وہ نقشِ
کہن کو مٹانا، اور جس کھیت سے دہقاں کو روزی میسر نہ ہو۔ اس کے
ہر خوشۂ گندم کو جلانا چاہتے ہیں۔ اقبالؒ کے یہ خیالات تمام تر انقلابی ہیں۔
ان میں ایک جارحانہ انداز ملتا ہے۔ اور اس جارحانہ انداز کے پیدا ہونے کا
بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی اور اس کے نظامِ اقدار کو بدلنے
کا گہرا احساس اور شدید جذبہ رکھتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک یہ انقلاب
اور تبدیلی انسان اور انسانیت کی تکمیل کے لئے ضروری ہے، اسی لئے
انہوں نے اپنی انقلاب پسندی کو انسان دوستی سے ہم آہنگ کر لیا ہے۔

یہ خیالات و نظریات اقبالؒ نے غور و فکر کے ساتھ پیش کئے ہیں۔
ایسا کرنے کے لئے انہیں مختلف راہوں سے گزرنا پڑا ہے۔ انہوں نے
اس سلسلے میں تاریخ کے میدانوں کی خاک بھی چھانی ہے۔ مذہبیات کی
کوچہ گردی بھی کی ہے۔ تہذیب و تمدن کی ارتقائی کیفیت کا گہرا مطالعہ بھی
کیا ہے۔ فلسفہ و نفسیات کی گتھیاں بھی سلجھائی ہیں۔ عمرانیات و معاشیات
کے اسرار و رموز بھی کھولے ہیں۔ غرض یہ کہ انہیں دور دور پہنچنا پڑا
ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اس پیام میں بڑی ہمہ گیری ہے، بڑی وسعت
ہے، بڑی گہرائی ہے۔ اس کی بنیادیں زندگی کے حقائق پر استوار ہیں۔
تنگ نظری اس میں نام کو نہیں ملتی، اس کا آب و رنگ اسلامی ضرور ہے
لیکن وہ محدود نہیں ہے۔ اس میں کشادہ دلی اور روشن دماغی ہے،
دقتِ نظری اور بلند خیالی ہے، بے باکی اور صاف گوئی ہے، اس میں ایک
عمل کا پیام ہے۔ اور اس عمل کے پیام کی بنیاد ایک انسانی نقطۂ نظر ہے،
اقبالؒ نے بڑی خوبی سے اس کی وضاحت کی ہے ؎

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد
نہ فلسفی سے، نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو
یہ دل کی موت وہ اندیشہ و نظر کا فساد

درویشِ خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ اقبالؒ اپنے آپ کو محدود نہ کرنا
نہیں چاہتے۔ ان کے پیشِ نظر تو ساری دنیا ہے، ساری انسانیت ہے۔
ساری کائنات ہے۔ اقبال کی تعلیم فروعی باتوں میں الجھ جانے کا نام نہیں
ہے۔ وہ تو بنیادی انسانی معاملات پر نظر رکھتے ہیں، ان کے پیشِ نظر تو
صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے، اور وہ مقصد ہے انسانیت کی بلندی،
اس کے مسائل کو حل کرنے کی آرزو، نظامِ اقدار میں ہمواری کی تمنا
اور حالات کو ہر اعتبار سے بہتر بنانے کی خواہش، کہ اسی طرح انسان
صحیح معنوں میں انسان بن سکتا ہے۔

اقبال کی انسان دوستی کا یہ فلسفہ، جس کو ان کے پیام سے بھی
تعبیر کر سکتے ہیں، کئی عناصر سے مل کر تشکیل پاتا ہے۔ اقبال انسانی زندگی
میں فرد کی اہمیت کے قائل ہیں۔ انسان ہونے کی حیثیت سے انہیں اس کی
بلندی کا احساس ہے۔ احساس کی اس شمع کو وہ فرد کے دل میں فروزاں
کرنا چاہتے ہیں، اپنے فلسفے میں جس چیز کو انہوں نے خودی سے تعبیر کیا ہے
وہ بھی انسان کی بلندی کا احساس اور عظمت کا خیال ہے۔ لیکن یہ خودی
صرف فرد تک محدود نہیں رہتی۔ کیونکہ فرد انسانی زندگی کے اجتماعی نظام
کا ایک جزو ہوتا ہے۔ اس لئے آگے چل کر یہ خودی اجتماعی خودی کی
صورت اختیار کر لیتی ہے۔ فرد کو اجتماعی زندگی سے علیحدہ کر لیا جائے
تو بذاتِ خود اس کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی ؎

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

خودی کا عمل ساری انسانی زندگی میں جاری ہے
اسی سے زندگی میں ایک حرکت ہے، ایک جولانی ہے، ایک سوز ہے،
ایک ساز ہے۔ وہ محبت کو پیدا کرتی ہے اور محبت سے اس کا رشتہ
استوار ہوتا ہے ؎

نقطۂ نورے کہ نام او خودی است
زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است
از محبت می شود پائندہ تر
زندہ تر، سوزندہ تر، تابندہ تر

فرد اور جماعت میں خودی کی تکمیل کے لئے اطاعت، ضبطِ نفس

اور نیابتِ الٰہی کے خیال کا ہونا لازمی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ توحید، رسالت اور قرآن پر ایمان بھی ضروری ہے۔ اقبالؔ کے یہاں یہ باتیں محض رسمی اور روایتی انداز میں بیان نہیں ہوئی ہیں، انہوں نے ان میں نئے پہلو بھی نکالے ہیں، نئے گوشوں کو بھی تلاش کیا ہے۔ مثلاً توحید اقبالؔ کے خیال میں ایک خدا پر ایمان رکھنے کا نام ضرور ہے لیکن اس سے وہ انسانی وحدت کا کام بھی لینا چاہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے توحید سے یہ کام لیا بھی ہے۔ طاقت بھی اسی توحید کے خیال سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اقبالؔ طاقت کے پرستار ہیں۔ طاقت میں انہیں حسن بھی نظر آتا ہے، اس جلال میں وہ زندگی کا جمال بھی دیکھتے ہیں ؎

ملّتے چوں میشود توحید مست\
قوت و جبروت می آید بدست\
فرد از توحید لاہوتی شود\
ملّت از توحید جبروتی شود\
ہر دو از توحید می گیرد کمال\
زندگی ایں را جلال، آں را جمال

اقبالؔ طاقت کے ساتھ ساتھ فرد اور جماعت کے لئے محبت اور عشق کو بھی ضروری قرار دیتے ہیں۔ اور محبت اور عشق کا مفہوم ان کے یہاں محدود نہیں ہے۔ وہ تمام انسانی خصوصیات پر حاوی ہے ؎

طبعِ مسلم از محبت قاہر است\
مسلم ار عاشق نباشد کافر است

لیکن ان کے دوسرے تصورات کی طرح ان کے اس تصورِ عشق کی نوعیت بھی اجتماعی اور انسانی ہے۔ انسان اور انسانیت کی تکمیل ان کے خیال میں اس کے بغیر ممکن نہیں۔

یہ تمام خصوصیات جب کہیں یکجا ہوتی ہیں تو ایک انسانِ کامل وجود میں آتا ہے۔ جس کو اقبالؔ 'مردِ مومن' کہتے ہیں۔ اس مردِ مومن کی تمام صلاحیتیں انسانی زندگی کو عظمت اور بلندی سے ہمکنار کرنے کے لئے وقف ہوتی ہیں۔ وہ اپنے ارادوں میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کرتا ہے۔ کیونکہ اس کی ہستی میں ایمان کی روشنی ہوتی ہے، عمل کی قوت ہوتی ہے وہ اپنی دنیا آپ پیدا کرتا ہے، زندگی کو ذوقِ پرواز سمجھتا ہے، سفر کو منزل سے بڑھ کر پسند کرتا ہے۔ محبت کو اپنا مسلک جانتا ہے، کبھی ناامید نہیں ہوتا۔ بلکہ نومیدی کو زوالِ علم و عرفان سمجھتا ہے، اس کی امیدیں خدا کے راز دانوں میں ہوتی ہیں، اس کی نظر میں تلوار کی تیزی کا جادو ہوتا ہے! اور اس کی نگاہ سے تقدیریں بدل جاتی ہیں ؎

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے دست و بازو کا\
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اقبالؔ کے فکر و فن میں اسی مردِ مومن اور انسانِ کامل کی آواز سنائی دیتی ہے!

غزل

جگر مراد آبادی

صد آرزوئے خوشگوار و سرگراں لئے ہوئے
پھرا کرے گی زندگی کہاں کہاں لئے ہوئے

ہوا نہ دل ہی ملتفت اگرچہ مدتوں کے بعد
شمیمِ دوست آئی تھی، قرارِ جاں لئے ہوئے

برس رہی ہے زندگی، ترس رہی ہے زندگی
نفس نفس سے تشنگی کی داستاں لئے ہوئے

خوشا حیاتِ عاشقاں کہ موت بھی جب آئی ہے
تو ساتھ ایک حلقۂ پری وشاں لئے ہوئے

اب اس مقامِ عشق سے گذر رہا ہوں میں جگر
کہ ظلمتیں بھی ہیں جہاں تجلیاں لئے ہوئے

اجتماعی نشوونما کے اسباب[1]

ایم۔ ایم شریف

ارتقا کے معنی ہیں ایک حالت سے بہتر حالت کی طرف اقدام۔ اسلئے اس کی پہلی شرط حرکت ہے کسی عالمگیر اصول کا تخصیصی اطلاق ہونا چاہئے۔ وہ عالمگیر اصول یہ ہے کہ ہر حرکت ماحول کے مطالبات کا جواب ہوتی ہے۔ توانائی کے تمام مراکز خواہ وہ برقیے ہوں خواہ جوہر، پتھر، پودے، حیوان، انسان یا معاشرے، اپنے ماحول سے زندہ تعلق رکھتے اور اس کی طرف اعتنا کرتے ہیں۔ وہ دوچار ہونے اور متصادم ہونے کی صورت میں اپنا اپنا جداگانہ اثر ڈالتے اور ایک دوسرے کا اثر قبول کرتے ہیں۔ جب یہ لوگ اپنی سرگرمیوں کے دوران میں ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں تو ہر ایک دوسروں کے راستے میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ ان رکاوٹوں سے ان کی حرکت رک جاتی ہے، ان کی قوت ٹوٹتی، جمع ہوتی اور پھر وہی دوچار ہونے، ٹوٹنے، قوت جمع کرنے اور زیادہ زور سے پلٹنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس طرح ہر حرکت درحقیقت موج کی حرکت سے ملتی جلتی ہے۔ یعنی پے در پے تقاضوں کا سامنا کرتے چلے جانا۔

ارتقا محض تقاضوں کا پورا کرنا ہی نہیں بلکہ کامیاب تقاضوں کے کامیاب جواب کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ جہاں تک انسانی سوسائٹی کے ارتقا کا تعلق ہے۔ ٹائن بی کے الفاظ میں کامیابی اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے۔ جب کوئی اقلیت یا ساری کی ساری جماعت کسی مطالبے کا جواب اس طرح دیتی ہے کہ صرف وہی ایک تقاضا ہی پورا نہیں ہوتا بلکہ اسے ایک اور مطالبے سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ جس کے لئے ایک علیحدہ حل درکار ہوتا ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ جن مطالبوں کا کامیابی سے جواب دیا جائے اور اس کے نتیجہ میں مختلف تہذیبیں اور تمدن بروئے کار آئیں وہ تمام لوگوں کے لئے ایک ہی ہوں۔ یہ مطالبے جغرافی بھی ہو سکتے ہیں اور انسانی یا ملے جلے بھی۔ آئیے ہم پہلے جغرافی حالات پر نظر ڈالیں۔ ممکن ہے تہذیب کی نشوونما کا سبب زمین کا پانی سے محروم ہو جانا ہو جیسا کہ مصر اور سمیریا کے سلسلہ میں نظر آتا ہے۔ چین میں دلدلوں اور سیلابوں کی کثرت اس کا باعث ہوئی۔ جنوبی امریکہ کی آنڈیائی تہذیب کے سلسلہ میں خشک آب و ہوا، خراب زمین اور گرم سیر علاقوں کی شدید گرمی کو دخل تھا۔ کریٹش اور ایونان کی تہذیبیں سمندر کے چیلنج کا نتیجہ تھیں۔ مایا اور ہندوستان والوں کے لئے گھنے جنگلات اور شدید گرمی، شامیوں اور عربوں کے لئے صحرا اور حرارت اور یورپیوں کے لئے جنگلات، بارش، برف اور کہرا تہذیبی نشوونما کا باعث ہوئے۔ ایسے ہی مطالبوں کو پورا کرنا ایک حد تک برطانیہ، شمالی امریکہ، ہالینڈ، سوویٹ روس اور جاپان جیسی جدا جدا قومیتوں کی عظمت کا باعث ہوا۔

بایں ہمہ ممکن ہے کہ جغرافی حالات کسی قوم کے ایک خاص حد سے زیادہ ترقی کرنے کے لئے ناسازگار ہوں۔ چنانچہ پالی نیشیوں کے لئے سمندر، اسکیموں کے لئے بحر منجمد کی شدید برودت اور خانہ بدوشوں کے لئے کاہستان کا مقابلہ ایسا تھا کہ اس سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہونا انسانوں کی قوت سے ماوراء تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلی تو جانبر ہی نہ ہو سکی اور دوسری دونوں کا ارتقا رک گیا ہے۔ اس طرح بڑی بڑی تہذیبوں اور قوموں کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ جغرافی مطالبے جو کامیاب سعی و کوشش کے لئے حد سے زیادہ شدید ہوں انہیں مسخر کرنے کی تحریک دلاتے ہیں۔

---

[1] یہ مضمون اس خطبۂ صدارت کی تلخیص ہے جو دوسری پاکستان فلسفہ کانگریس میں پیش کیا گیا تھا۔ (مدیر)

حد سے زیادہ سردی، گرمی، سیلاب، لوہے اور کوئلے کی کمی، سیل زمین کی ٹوٹ پھوٹ اور بعض علاقوں کی خراب زمین پاکستان کے لئے تکلیف کی شکل میں رحمت ہیں۔ ان سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ جو بات بظاہر بری ہو۔ وہ بالآخر انسان کے لئے اچھی ہی ثابت ہوتی ہے۔ ہماری قوم کا احیاء ثانیہ اور دوبارہ مضبوط و توانا ہونا بڑی حد تک ان امور پر موقوف ہوگا جو بظاہر دشواریاں ہیں لیکن درحقیقت تندرست نشوونما کے لئے نہایت مؤثر ذرائع ہیں۔ ان کے بغیر زندگی بہت ہی سہل انگاری کا باعث ہوگی اور ہمیں ایک میٹھی نیند سلادے گی۔ زندگی میں شادکامی اور تمدنی نشوونما دشواریوں کے خلاف مردانہ وار سینہ سپر ہونے اور ان پر فتح حاصل کرنے ہی میں مضمر ہے۔

لیکن قوموں اور ملتوں کو نہ صرف جغرافی مطالبات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ انسانی ماحول کے تقاضوں سے بھی نبٹنا پڑتا ہے۔ یہاں بھی وہی اصول کارفرما ہے۔ بیرونی طاقتوں سے ناگہانی حملے تاوقتیکہ یہ بار بار نہ ہوں کسی قوم کو شکست دینے کے باوجود، متحد کرتے ہیں۔ اور اسے زیادہ سرگرمی پر آمادہ کرتے ہیں۔ جیسا کہ روما میں آلیا کی شکست تمام اسلامی ممالک میں صلیبی جنگوں، دنیائے مغرب میں موروں کے ہسپانیہ میں برابر دباؤ، ترکوں میں بلقان، تمام ترکی سلطنت میں تیمور کے حملہ، جرمنی میں نپولین کے محاربات اور جرمنی اور ترکی میں پہلی جنگ عظیم کے بعد ہوا۔ سمیریوں کو اہلِ مصر کے مقابلہ میں زیادہ شدید جغرافی ماحول اور بیرونی خطرات کا سامنا کرنا پڑا۔ اسلئے انہوں نے مصریوں سے کہیں زیادہ تہذیب و تمدن میں اضافہ کیا۔

یہی بات سوسائٹی کے اندرونی دباؤ پر بھی صادق آتی ہے۔ ایک پارٹی کے نعرۂ ہل من مبارز کو ضرور کوئی دوسری پارٹی قبول کر لیتی ہے۔ اور اس طرح اس میں نئی روح پھونک دیتی ہے۔ کسی جمہوری مملکت کی پارٹیاں ایک دوسرے کو برابر چیلنج دیتی رہتی ہیں۔ اور ترقی پر ابھارتی ہیں۔ اس لئے مختلف جماعتوں میں توانائی پیدا کرنے کے لئے اس کشاکش باہمی کو ہمیز دینا ضروری ہے۔ صرف ایک ہی پارٹی کی حکومت ارتقا کے خلاف ہے، اندرونی چیلنج اگر یہ قابل برداشت حد سے زیادہ ہو۔ تو اس سے اتحاد و یگانگت کے دائم برہم ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس سلسلہ میں مستقل بیرونی خطرہ کسی قوم کے لئے نعمتِ عظمیٰ ہے۔ چنانچہ طاقتور ہندوستان پاکستان کے لئے خطرہ نہیں اور نہ مضبوط پاکستان ہندوستان کے لئے خطرہ ہے۔ ان دونوں مملکتوں کی توانائی باہمی ردِ عمل کا ایک سلسلہ پیدا کردے گی جو برابر ان میں نئی روح پھونکتا رہے گا، انہیں اندرونی طور پر متحد رکھے گا اور مسلسل ارتقا کرنے میں مدد دے گا۔ ہندوستان کا چیلنج پاکستان اور پاکستان کا چیلنج ہندوستان کو مضبوط بنائے گا۔ اس لئے ہمیں طاقتور ہمسایوں کو ایک جنس گرانمایہ سمجھنا چاہئے نہ کہ ہماری ترقی کے راستے میں سدِ گراں۔

اس طرح ظاہر ہے کہ طبعی، موسمی اور سیاسی (اندرونی و بیرونی) داعیات کے بغیر کوئی قوم تہذیب تمدن میں نمایاں ترقی نہیں کر سکتی۔ تہذیبیں اور تمدن اسی لئے بروئے کار آئے ہیں کہ انسانوں نے داعیات کا کامیابی سے مقابلہ کیا ہے۔ اور اہم نتائج پیدا کئے ہیں۔ ان کے بغیر وہ کبھی پُر عظمت نہیں بن سکتے تھے۔ ان داعیات کی عدم موجودگی پیغامِ موت ہے۔ اور ان کی موجودگی پیغامِ امید بشرطیکہ وہ مؤثر جواب کے لئے حد سے زیادہ شدید نہ ہو۔

یہ درست ہے کہ تقاضے جواب پیدا کرتے ہیں۔ لیکن کمزور سوسائٹی میں ان سے کوئی ہلچل پیدا نہیں ہوتی۔ ایسی سوسائٹی آخر کار جواب سے معذور ہونے کے باعث فنا ہو جاتی ہے۔ اگر اس پر مصیبت نازل ہوتی ہے تو یہ تمام تر اس کا اپنا قصور ہوتا ہے۔ نہ کہ بیرونی طاقتوں کا۔ خواہ وہ قدرتی ہوں یا آسمانی۔

کسی قوم کے ارتقا کی دوسری شرط اس کے جوہر قابل اور تخلیقی اہلیت رکھنے والے انسان ہیں۔ برگساں اہلِ معرفت کی تعریف یوں کرتا ہے کہ "یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے تمام ارواح کے ساتھ رشتہ اور تمام انسانوں کے ساتھ ایک جذبۂ بے اختیار شوق، محسوس کیا ہے اور جن کی تمنا یہ ہے کہ وہ محبت کا پَرتو تمام نوعِ انسان پر محسوس کریں"۔

ہر پیغمبر یا عارف کے دل میں ایک جبلی آہنگ مضمر ہوتا ہے۔ پہلے وہ ایک عام انسان کی طرح زندگی بسر کرتا ہے۔ پھر وہ کنارہ کش ہو جاتا ہے اور تربیت نفس سے بصیرت افروز باطنی جلا پیدا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک گھڑی ایسی آتی ہے —— وہ گھڑی جو ابنِ خلدون کے الفاظ میں پل جھپکنے میں آتی اور گذر جاتی ہے۔ جب اسے کچھ القا یا فیضان ہوتا ہے، ایک پیغام سوجھتا ہے۔ روحانی ارتقا کے تیسرے مرحلے میں وہ پھر اپنے آپ میں آکر ایک اور ہی طرح کی زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح سوسائٹی کے ساتھ بھی اس کا تعلق بدل جاتا ہے۔ پہلے وہ اپنے

ابنائے جنس میں عادی زندگی بسر کرتا ہے۔ پھر ایک ایسا دور آتا ہے کہ جب وہ سوسائٹی سے علیحدہ ہو جاتا ہے اس کی شخصیت تخلیقی اہلیت پیدا کرتی ہے۔ اور اس طرح قلب ماہیت کے بعد وہ معاشرہ کی طرف زیادہ روحانی قوت کے ساتھ واپس آتا ہے۔ اس فلسفی بادشاہ کی زندگی بھی جس کا نقشہ حکیم افلاطون نے غار کی تمثیل میں پیش کی ہے اسی آہنگ کی حامل ہے اور یہی زندگی کے ہر شعبہ میں تمام بڑے بڑے لیڈروں کی ذاتی اور اجتماعی زندگی کا خاصہ ہے۔ کوئی خلاق فرد یا اقلیت زندگی سے کچھ دیر تھوڑا بہت کنارہ کش ہو کر شدید باطنی تربیت کے بغیر تخلیق نہیں کر سکتی۔ خواہ یہ کنارہ کشی غار میں ہو یا سائنسدان کی لیبارٹری، کاریگر کے ورکشاپ، فن کار کے اسٹوڈیو یا عالم کی کوٹھری میں۔ اور اس طرح تازہ قوتیں حاصل کر کے اسے پھر زندگی کی طرف بازگشت کرنا لازم ہے۔

اسی قسم کا آہنگ ایسے انسانوں کی روزانہ زندگی میں بھی نظر آتا ہے۔ یہی کنارہ کشی کا زمانہ ہے۔ جب رات کے آسودہ لمحات میں فرشتے اتر اتر کر عرفان و بصیرت کی تلاش کرنے والوں کو پیغامات پہنچاتے ہیں۔ جہاں انسانوں کا جمگھٹا ہو وہاں کوئی روشنی نہیں آتی اور نہ دفتری کاغذات کی ورق گردانی کرنے والوں کو روشنی نصیب ہوتی ہے۔ جو اپنا وقت عزیز نا و نوش، ناچنے، برج کھیلنے اور میٹھی نیند سونے میں بسر کرتے ہیں۔

انسانوں کی رہنمائی کے لئے خدا کی طرف سے ہدایت یا فیضان انہی لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جو اپنے مخصوص دائرۂ عمل ہی میں مشق و مہارت بہم پہنچاتے ہیں اور بس۔ کوئی لیڈر قوم کو جادۂ ترقی پر گامزن نہیں کرا سکتے، جب تک ان میں تخلیقی جوہر نہ ہوں اور وہ اس تربیت کے بغیر کچھ بھی تخلیق نہیں کر سکتے۔ ارتقا تخلیق کاروں ہی کا کام ہے۔ اور یہ صرف ان کی تخلیقی سرگرمیوں ہی سے ممکن ہے۔ یہ تخلیقی عمل ایک فرد یا کئی افراد انجام دے سکتے ہیں۔ چنانچہ کئی پیغمبروں نے تن تنہا قوموں کو خواب غفلت سے جگا کر تیز رفتار ترقی کی شاہراہ پر ڈال دیا ہے۔

لیکن سوسائٹی میں تخلیقی عنصر خواہ یہ ایک فرد پر مشتمل ہو یا کئی افراد پر، ہمیشہ ایک اقلیت ہی ہوتا ہے اور اسی اقلیت ہی سے تہذیب و تمدن کے تمام دھارے موجزن ہوتے ہیں۔ سوسائٹی کا بیشتر حصہ غیر خالق ہوتا ہے۔ اور پیچھے ہی رہتا ہے۔ لیکن اقلیت خواہ کتنی ہی خلاق کیوں نہ ہو۔ اکثریت کو ساتھ لئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی جیسا کہ ٹائن بی نے کہا ہے۔ ایسا کرنے کے لئے انہیں اپنے ساتھیوں کو اپنا پیرو بنانا پڑتا ہے۔ یہ کر تب وہ دو ہی طرح کر سکتے ہیں۔ یا وہ انہیں اپنے کارناموں سے تحریک دلا کر ان کے سینوں میں اپنی تخلیقی صلاحیت کی آگ روشن کریں۔ یا دوسرے انسان کی جبلی خوئے تقلید کو اکسا کر اپنی تقلید پر آمادہ کریں۔ چنانچہ اسلام کے قرون اولیٰ میں قرآن ہی کے پیغام نے لوگوں کو گرمایا اور پیغمبر اسلام کے نقش قدم پر چلنے سے نئی عادات ان کی طبیعتوں میں راسخ ہو گئیں۔ کوئی لیڈر جبر و تہمر، آمریت، تعلیم و تلقین اور پروپیگنڈے سے لوگوں کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ جبر و تحکم سے تو الٹا اثر مرتب ہوتا ہے۔ اگر تلقین و ہدایت اور پروپیگنڈا بے کیف ہو تو ناگوار گزرتا ہے۔ اگر یہ ولولہ پیدا کرے تو خوب ہے۔ لیکن کافی نہیں یہ چیزیں عوام کے دل و دماغ میں صرف اسی صورت میں رچ سکتی ہیں۔ جب ان کے ساتھ بڑے انسانوں کے اسوۂ حسنہ پر عمل بھی شامل ہو۔ ہر بڑا سیاست داں سلسلۂ حوادث میں ایک مرکزی قوت ہے۔ اس کی آنکھ کسی افتاد کے ہر پہلو کو دیکھ سکتی ہے۔ اور بہترین امکانات کو منتخب کرتی ہے۔ وہ ایک معلم ہے اور اپنی مثال سے تعلیم دیتا ہے۔ جیسا کہ اسپنگلر نے کہا ہے۔ ناموس، فرض، نظم و ضبط اور ارادہ یہ باتیں کتابوں سے نہیں سیکھی جاتیں۔ بلکہ زندگی کے بہتے پانی میں زندہ مثال ہی سے ابھرتی ہیں حقیقی لیڈروں کے جذبات عوام کے سینوں میں دوڑ جاتے ہیں۔ ان کے دل و دماغ کی کایا پلٹ دیتے ہیں اور ان کو ایسے کارناموں کے قابل بنا دیتے ہیں جن سے وہ عام حالات میں کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ ایسی اقلیت کے کارفرما ہونے سے عوام میں اعتماد کی ایک روایت پیدا ہو جاتی ہے تنقیح و تنقید کے جبلی شوق کے باوجود اقلیت پر اعتماد کی روایت کی بہترین مثال انگریز ہیں۔ اس اعتماد سے اطاعت پیدا ہوتی ہے اور اطاعت سے یہ یقین کہ حکومت انہی کی رضا و منشا پر مبنی ہے۔

خلاق رہنماؤں کی تقلید کا شرف ان کے کامیاب کارناموں کی کشش سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر لوگ ایک دفعہ ان کی تقلید شروع کر دیں تو ان سے غیر شعوری طور پر خود بخود نشو و ارتقا کا آغاز ہو جاتا ہے قائد اور مقلدین کا مطمح نظر ایک ہی ہو جاتا ہے۔ ساری کی ساری جماعت ایک ہی تمدنی منزل کی طرف گامزن ہو جاتی ہے اور تہذیب ہر چہار طرف اپنی روشنی پھیلانے

لگتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کا اثر باہر کے لوگوں پر بھی طاری ہونے لگتا ہے۔ اس کشش، اس جاذبیت کی موجودگی ارتقا کی بین علامت ہے۔ اس کی عدم موجودگی ظاہر کرتی ہے کہ یا تو ارتقا کا سلسلہ سرے سے شروع ہی نہیں ہوا یا رک گیا ہے۔

تمدنی نشوونما اجتماعی ارتقا کی روحِ رواں ہے۔ لیکن اس کے علاوہ زندگی کے دو عنصر ترقی پذیر اور انحطاط پذیر سوسائٹی کے مابین مشترک ہیں یعنی اقتصادی اور سیاسی عنصر جس سوسائٹی کا ثقافتی مرکز محو ہو چکا ہو، اس کا اقتصادی و سیاسی خول پھر بھی قوت پیدا کئے جا سکتا ہے لیکن ثقافتی عنصر کے بغیر اس کا ارتقا حقیقی نشوونما کے رک جانے کی علامت ہوگا۔ اقتصادی و سیاسی ترقی پر زور دینا اچھا ہے لیکن صرف یہی ایک چیز ارتقا کی ضامن نہیں ہے۔

جن اقلیتوں کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے، اجتماعی شکل میں دو فریقوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ایک اربابِ فکر یعنی مذہب، فلسفہ، سائنس، ادب، فنونِ لطیفہ اور ٹکنالوجی کے مجتہد اور دوسرے اربابِ عمل جن کا دائرہ نظم و نسق، قانون سازی، عدل و انصاف اور مسلح افواج ہیں۔ یہ دوسرا فریق حاکم اقلیت پر مشتمل ہوتا ہے۔ اگر پہلا فریق غیر خالق ہو تو یہ باقی ہی نہیں رہتا۔ کیونکہ غیر خالق ہونا اور ذہنی قیادت دونوں میں منافات ہے۔ اگر دوسرا فریق غیر خالق ہو تو یہ محض ایک برسرِ اقتدار اقلیت بن جاتا ہے۔ کیونکہ جہاں لیاقت یا عدم لیاقت سے حکمرانی نہیں ہو سکتی۔ وہاں کم از کم طاقت کچھ عرصہ حکومت چلا سکتی ہے۔ لیکن کسی نہ کسی وقت رشک و حسد کے باعث مناقشات پیدا ہو جاتے ہیں جس سے برسرِ اقتدار اقلیت کی جڑیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں، عوام اسے زبردستی نیچے اتار دیتے ہیں اور یہ ان کے ساتھ ہی ملیامیٹ ہو جاتی ہے۔ اگر اقلیتیں خالق ہوں تو وہ عوام کو نیچی سطح سے بلند کر کے تمدنی ترقی کے راستے پر ڈال دیتی ہیں۔ تخلیقی اقلیت اور غیر خالق اکثریت کے مابین قومی مقاصد، طور و طریق، لباس اور زبان کے بارہ میں کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ تخلیقی اقلیت کا کام ہے کہ وہ اس خلیج کو پاٹنے کے ذریعے اور طریقے دریافت کرے جو اس کے اور عوام کے مابین حائل ہے۔

اس اقلیت کے اوصاف کیا ہیں؟ یہ تو ظاہر ہے کہ اور تمام امور سے بڑھ کر اسے ایک جماعت مفکرین ہونا چاہیئے۔ ان لوگوں کی ذہنی سطح عوام سے بلند تر ہونی چاہیئے۔ بکل اور لیسٹر وارڈ نے سائنس کو ارتقا کا واحد ذریعہ قرار دے کر فکر کے منصب کو زیادہ مبالغہ سے پیش کیا ہے۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ علم و حکمت۔ الہامی یا مادی کے بغیر کوئی ارتقا ممکن نہیں۔ انبیاء و اولیاء نے ایک ہی ضرب کاری سے انسانی شعور اور موجدین و محققین نے انسان کی مادی قوتوں کو کہیں کا کہیں پہنچا دیا ہے۔ دراصل یہ غیر معمولی انسانوں کی وجدانی یا عقلی قوتیں ہی ہیں جن سے دنیا از سرِ نو تشکیل پاتی ہے۔ جو قومیں تاریخ میں کوئی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ ان کے لئے علم و عرفان کا ارتقا لازمی ہے۔ یہ اجتماعی ترقی کے لئے بالکل ناگزیر ہے۔ لیکن علم و حکمت کی ترقی صرف تخلیقی اقلیت ہی تک محدود رہتی ہے۔ اس کو عوام تک پہنچانے کے لئے اس کی نشر و اشاعت بھی اتنی ہی ضروری ہے۔ تمام پسماندہ قوموں کو پہلے عام خواندگی اور پھر عمومی تعلیم کے لئے فوری تدابیر تلاش کرنی پڑتی ہیں، تاکہ وہ دوسری ترقی یافتہ قوموں کی سطح پر پہنچ جائیں۔ آجکل علم و حکمت اس قدر تیزی سے ترقی کر رہے ہیں۔ کہ جب تک پسماندہ قومیں غیر معمولی تدابیر اختیار نہ کریں وہ ہمیشہ ہی دوسری قوموں سے پیچھے رہیں گی۔

اجتماعی ترقی کے لئے علم و حکمت تو ضروری ہیں ہی۔ لیکن قومیں صرف علم ہی سے نہیں بنتیں کسی قوم کی تخلیقی اقلیت کو صاحبِ کردار بھی ہونا چاہیئے۔ کیونکہ جب تک وہ صاحبِ کردار نہ ہو، قوم بھی کوئی کردار نہیں پیدا کر سکتی۔ علم و حکمت کی ترقی کے ساتھ انسان کو قدرت اور معاشرہ ہی دونوں پر بھی غلبہ کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس سے ایک اجتماعی رعونت بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ جو ممکن ہے حدِ اعتدال سے آگے بڑھ جائے۔ یہ خطرہ ہمیشہ باقی رہتا ہے کہ قدرت پر تسلّط کہیں قوموں کو باقی تمام مقاصدِ عالیہ اور اقدار سے بیگانہ نہ کر دے۔ وہ اپنی بے قید و بند خواہشات ہی کو مطمحِ نظر نہ گردانیں، دوسرے انسانوں کو اپنا مطیع و منقاد اور غلام بنا کر من مانی خواہشوں کا بازیچہ نہ بنا لیں اور اپنی قوتوں کو محدود طبقاتی مفادات کے لئے استعمال میں نہ لائیں جو تمام نوعِ انسان کے لئے خطرناک ثابت ہوں۔ لہٰذا کسی سوسائٹی کے ارتقا کے لئے اخلاقی کردار کی ترقی بھی ضروری ہے۔ یہی اخلاقی وجاہت ہے جس کے فقدان کے باعث تمام بڑی تہذیبیں انحطاط پذیر ہوئیں۔ اور جس کی موجودگی سے وہ مدارجِ ترقی ہوئیں۔ جب یونانی تہذیب زوال پذیر ہو رہی تھی تو بھی یونانی ذہانت تمام دنیا سے ارفع و اعلیٰ تھی۔ اخلاقی کردار کے معنی تو ہیں ارادہ کا صحیح نہج پر کارفرما ہونا۔ اس کے لئے دو باتیں ضرو

ہیں۔ ایک ارادہ کا بلند مقاصد کی طرف رجوع اور دوسرے اپنے آپ پر ضبط۔ تاوقتیکہ حاکم اقلیت یہ اوصاف نہ پیدا کرے۔ قوموں کے ذہن اور ایجادی کارنامے بالآخر ان کے لئے تباہ کن ثابت ہو سکتے ہیں۔ اجتماعی پسند یا ناپسندیدگی کا اظہار صحیح کردار پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے بہ الفاظ دیگر ابنائے جنس کی تعریف یا مذمت جو رائے عامہ کے طور پر ظاہر کی جائے۔ اخلاقی کردار کی نشو و نما کے لئے نہایت موثر محرک ہے۔ مثال کے طور پر انگلستان میں جہاں رائے عامہ سب سے زیادہ آزاد ہے۔ حاکم اقلیت کا اخلاقی کردار بہت بلند ہے۔ اجتماعی پسند یا ناپسندیدگی کا احترام اخلاق کے ایک بلند تر درجہ کے لئے اور بھی ضروری ہے۔ جہاں صحیح رویہ محض خوبی ہی نہیں بلکہ فرض خیال کیا جاتا ہے۔

وہ اخلاقی خوبی جس کی ہر قوم بڑی شدت سے تعریف کرتی ہے۔ ایثار ہے۔ ان لوگوں کی بڑی شد و مد سے تعریف کی جاتی ہے جو اپنے مفاد کو قوم کے مفاد پر قربان کر دیں۔ الزام کا خوف انسانوں کو مفادِ عامہ کے منافی رویہ اختیار کرنے سے باز رکھتا ہے۔ اور فرد کے مفاد جماعت کے مفاد سے شیر و شکر کر کے قانون کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ حاکم اقلیت میں بے نفسی، راست کرداری، دیانت داری اور خلوص جیسے اوصاف بھی جن کو مجموعی طور پر وجاہت قرار دیا جاتا ہے کچھ کم اہم نہیں۔ جن قوموں میں اخلاقی وجاہت اور جذبۂ ایثار پایا جاتا ہے۔ وہ کبھی کسی مصیبت کا شکار نہیں ہو سکتی۔

ہر جماعت میں بعض ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے لئے محض تعریف ہی کافی نہیں ہوتی۔ اس لئے جزا و سزا کی ضرورت پیش آتی ہے۔ بعض اوقات خاص قسم کے جرائم مثلاً چور بازاری، خویش نوازی اور رشوت ستانی کسی قوم میں عام ہو جاتے ہیں۔ ایسے جرائم کی عام قوانین سے روک تھام ممکن نہیں۔ اگر انہیں زیادہ ڈھیل دی جائے تو اندیشہ یہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ مستقل قومی عادات یا عیوب کی شکل نہ اختیار کر لیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو یہ قومی تباہی کا باعث ہوتے ہیں۔ لہذا خاص قوانین وضع کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ایسی برائیوں کے لئے سزائے موت ناگزیر ہے۔ اگرچہ یہ بجائے خود ایک اچھی چیز نہیں۔ غرض رائے عامہ کو تعریف و مذمت کے اظہار میں آزادی دینے اور معاشری برائیوں کو پیدا ہوتے ہی کچل دینے کے لئے ہنگامی قوانین وضع کرنا اور قانون اور انتخاب کے نظام کو لوث و غرض سے بالاتر رکھنا ذاتی اور جماعتی بلندیٔ کردار اور اس لئے خود ارتقا کے لوازمات میں شامل ہے۔

اتحاد، جمعیت، استقامت، حریت، مساوات اور آزادانہ اقدام یہ ہیں اعلیٰ قوم یا جماعتی کردار کے اوصاف۔ اتحاد یا سطحی ہو سکتا ہے یا حقیقی۔ سطحی اتحاد تحکم سے پیدا ہوتا ہے جیسا کہ ہم تمام آمرانہ حکومتوں میں دیکھتے ہیں۔ یہ صرف اتنی ہی دیر قائم رہ سکتا ہے جتنی دیر تحکم رہے۔ لیکن اس کی تہ میں افتراق کے جراثیم پرورش پاتے ہیں۔ اس لئے اس کا اثر بھی بالکل الٹ ہوتا ہے۔ حقیقی اتحاد یا مثبت ہو سکتا ہے یا منفی، اتحاد اس شدید تناؤ کے عالم میں پایا جاتا ہے جب قوم کو کسی زبردست مخالفت کا سامنا ہو۔ ایسے اتحاد سے حقیقی مقاصد حاصل نہیں ہوتے بلکہ جونہی تناؤ دور ہو جاتا ہے۔ یہ بھی دور ہو جاتا ہے۔ اور عین اس وقت جب ہمیں کوئی مثبت تعمیری کام کرنا چاہئے۔ مختلف فرقوں کے مفادات میں کھینچا تانی شروع ہو جاتی ہے۔ اور قوم بری طرح شکست و افتراق کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس لئے حقیقی اتحاد ارتقا کی صحیح علامت ہے

مثبت اتحاد پُرامن تعمیری کام میں ظاہر ہوتا ہے۔ اسلام کے سب سے بڑے کارناموں میں سے ایک یہ تھا کہ اس نے عرب کو مثبت اتحاد کی نعمت عطا کی۔ خدائے واحد پر عالمگیر اعتقاد نے ایک شدید مذہبی احساس پیدا کیا جس نے باہم گردست و گریباں قبائل کو متحد کر کے ایسی تحریک دلائی کہ انہوں نے ایک عظیم الشان تہذیب کی بنیاد ڈالی۔ اس اتحاد کے بغیر عربوں کے لئے کوئی خاص کارگزاری دکھانا ممکن نہ تھا — ضروری نہیں کہ یہ جذبہ مذہبی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ جرمنی، انگلستان اور ہندوستان میں وطنیت، سوویٹ روس میں اشتراکیت اور ایران میں ارض وطن کے تصور سے ظاہر ہے۔ پاکستان میں مذہبی اور وطنی احساس دونوں باہم مل کر ایک شدید جذبہ پیدا کر سکتے ہیں جس سے ایک پائدار اتحاد کی بنیاد قائم ہو سکتی ہے۔

اس قسم کا جذبہ گو بنیادی ہے۔ پھر بھی یہ اتحاد کی مختلف ابعاد میں سے صرف ایک ہے۔ تمام جذبات و احساسات امتداد وقت کے ساتھ منجمد ہو جاتے ہیں۔ تاوقتیکہ ایسے مواقع نہ پیدا کئے جائیں جن سے وہ وقتاً فوقتاً

(باقی صفحہ ۱۵ پر)

ستارہ بہ ستارہ

(مغربی پاکستان کے صوفی شعرا کے فن پارے)

سوزِ دروں

بولوں جھوٹ تو کچھ بچ جائے   سچ بولوں تو آگ جلائے
ان دونوں سے جی گھبرائے   ڈرتے ڈرتے لب پر آئے
منہ آئی بات نہیں رہتی!

لازم ہے اک بات ادب کی   ہے معلوم حقیقت ساری
ہر شے میں ہے جلوۂ باری   کیوں ہے ظاہر کیوں ہے مخفی؟
منہ آئی بات نہیں رہتی!

جب ظاہر ہوئی برقِ تجلیٰ   طور کا پربت جل گیا سارا
دار پہ جب منصور بھی پہنچا   میرا تیرا پوچھنا ہی کیا
منہ آئی بات نہیں رہتی!

گر اسرار کو ظاہر کر دیں   دنیا بھولے سب تکراریں
ناحق یار کو سارے ماریں   اچھی ہیں یاں مخفی باتیں
منہ آئی بات نہیں رہتی!

ہم سے الگ نہیں بلھا ماہی   اس کے بغیر نہیں یاں کوئی
آنکھ نہیں پر دیکھنے والی   اسی لئے ہے جاں دکھ سہتی
منہ آئی بات نہیں رہتی!

بلھا شاہ (۱۶۸۰-۱۷۸۵ء)

دردِ عشق

کس نے پایا بنِ درویشاں   جذبۂ عشق کی لذت کو؟
کل شے میں اس کل کو دیکھا   'وہی سب کچھ' کا درس دیا
کیا ہے مبارک صحبتِ پیراں   پئیں جو بادۂ وحدت کو
مدہوشی نے ناز دکھایا   عریانی نے رنگ جمایا
خرقہ پھاڑ کے پہنوں اے جاں!   میں رندی کے خلعت کو

اہلِ درد کو درد سلامت   بارِ محبت طعن و ملامت
کیا کیا درد اٹھتے ہیں یاراں   میں قربان کروں راحت کو
حسن نے کتنے ہی گھر لوٹے   روتی پھرتیں جنگل بیلے
سینکڑوں ہیریں اور سسیاں   دیکھو عشق کی شدت کو!

(شہاب رفعت)   خواجہ غلام فریدؒ (۱۸۴۴-۱۹۰۱ء)

چارہ گری

جب درد نہ دل میں سر اٹھائے
کیا کرنے کو چارہ ساز آئے
دل تو غمِ عشق سے تہی ہے
پھر بھی تجھے آرزو لگی ہے
آ کر کوئی سحر آزمائے
چارہ گرے، درد آشنائے

لینا اسے جان پر مری جان
جو کچھ بھی ہو چارہ گر کا فرمان
ہمت کبھی ہاتھ سے نہ جائے
شکوہ نہ یہ تیرے لب پہ آئے
"ان لوگوں نے جانے کیا کیا ہے
یاروں کو بہم جدا کیا ہے"
کہنا کہ "بھلا کیا انہوں نے
یاروں کو ملا دیا انہوں نے"

میرے کہے، صبر آزما کے
فرصت ہو تو سوچ سر جھکا کے
یہ غیظ و غضب بڑی بلا ہے
ہاں صبر و رضا میں اک مزا ہے
جن لوگوں کا کیش ہے صبوری
ہوتی ہے انہی کی بات پوری
نخوت کو ہمیشہ خوار دیکھا
سرکش کو بحالِ زار دیکھا

جو لوگ ہیں عاجل و رمیدہ
ہیں بارِ شکیب ناچشیدہ
اپنے پہ جو پا سکا نہ قابو
اس کا یہ مآل جان لے تو
ہوتا ہے وہ ایک دن پشیماں
پاتا ہے سزائے نا سزایاں
رکھے وہ دماغ کتنا عالی
جھولی رہے کینہ ور کی خالی

(ابن انشا)

انا الحق

سب تک رہی دل میں خودی — حق کا بھرم ہوگا تو کیا
سجدے ابھی بے کار ہیں — ہم پر کرم ہوگا تو کیا

جب جز و کل ہوجائے گا — اور من کہیں کھو جائے گا
تب فیض کی امید ہے
شانِ انا الحق ہے تبھی — اور کبریائی ذات کی
جب ذرہ بھی خورشید ہے!

وحدت و کثرت

وحدت سے کثرت نکلی
کثرت عینِ وحدت ہے — کل جگ ایک حقیقت ہے
پھر الجھن کی بات ہی کیا

کیا رکھا ہے مادّ من میں — دیکھو! نہ پھنسنا اس الجھن میں یار
راہ وہی ہے راہ وحدت
اس رستے پر چلتے جاؤ — طالب ہو، مطلوب کو پاؤ

ابیات!

یہ نغمے، یہ گیت رسیلے — میٹھے میٹھے بول سُریلے
شعر کہیں یا گیت انہیں؟
شعر کہاں، سنگیت کہاں — یہ ہیں حقیقت کے وہ نشاں
پاس پیا کے لے جائیں
راہ کسی کی دکھلائیں

یہ نغمے ابیات نہیں
یہ ہیں حقیقت کی آیات — شمعِ تجلّی کے لمعات
شاہدِ حق کی راہ دکھائیں
پاس جن کے پہنچائیں

شمع اور پروانے

آگ جلی اور پروانے — گھر گھر آئے دیوانے
وہ چنگاریاں، اڑتے دیپ — بھسم ہوئے ان سے مستانے
شعلے دیکھے پھر بھی نہ چوکے — دل میں کیا تھی کیسا جانیں
حق کی جوت پہ مٹ گئے سارے — رہ گئے دنیا میں افسانے

یادِ حق

جو جاگ کے ساری رات
اللہ کو یاد کریں
وہ ہوں اور حق کی ذات
نت اس میں محو رہیں
کیوں اوج نصیب نہ ہوں
ان کے اقبال بڑھیں
جھک جھک کے نہیں لاکھوں
کیونکر نہ سلام کریں

(رفیق خاور) (شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ)
(۱۶۸۹ء-۱۷۵۲ء)
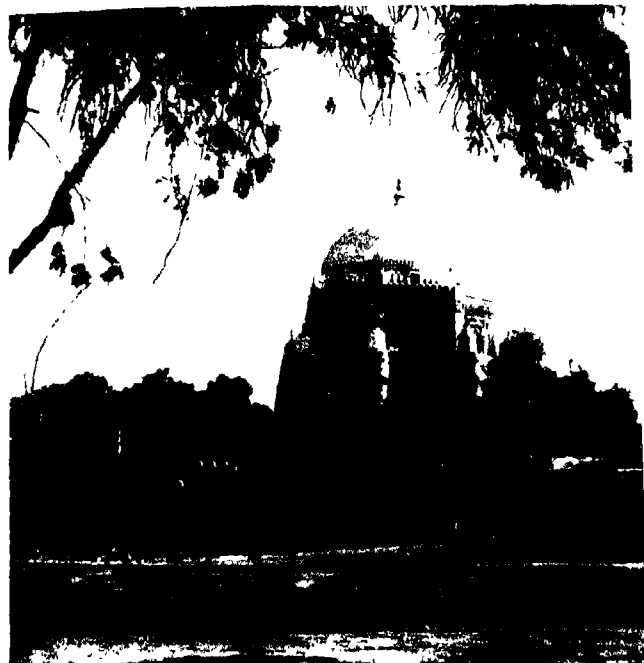
روضہ حضرت رکن عالم شاہ رح (ملتان)

روضہ حضرت داتا گنج بخش رح (

مغربی پاکستان کے صوفیائے کرام

مقبرہ حضرت شمس سبزوار رح (مل
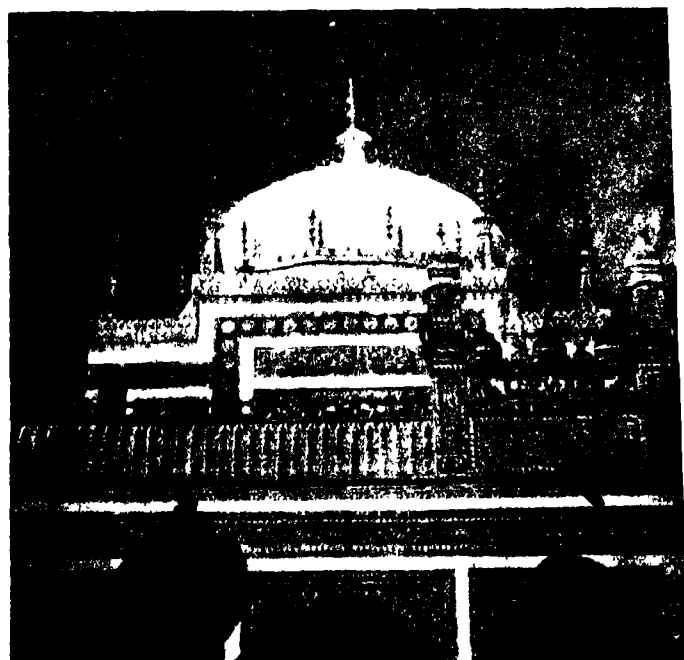
تیسری پاکستان سائنس کانگریس منعقدہ کراچی کا افتتاح : عزت مآب مسٹر غلام محمد گورنر جنرل پاکستان کی افتتاحی تقریر

کراچی میں پاکستان اور امریکہ کے فن عکاسی کی نمائش جس کا افتتاح آنریبل مسٹر محمد علی
وزیر اعظم پاکستان نے فرمایا

افسانہ

چند خطوط

غلام عباس

۲۵ ستمبر ۱۹۳۴ء

میرے پیارے افضل

مجھے تم سے جدا ہوئے آج دوسرا روز ہے یقین رکھو اب میں تمہیں کبھی نہیں مل سکوں گی۔ ہر چند تم اپنے خاندان والوں کی ناخوشی اور اپنے والد صاحب کی اس دھمکی کے باوجود کہ اگر تم ان کی مرضی کے خلاف کسی عورت سے (پھر وہ بھی مجھ ایسی عورت سے!) شادی کرو گے تو وہ تمہیں جائیداد کی وراثت سے محروم کر دیں گے، تم میرے ہی طلب گار رہو، میری ہی محبت کا دم بھرتے ہو۔ لیکن میں تمہاری اتنی بڑی قربانی کو قبول نہیں کر سکتی۔ میں نہیں دیکھ سکتی۔ کہ تم میری خاطر برباد اور بدنام ہو جاؤ۔ چنانچہ میں نے یہی مناسب سمجھا ہے کہ تم سے علیحدہ ہو کر کسی دور دراز نامعلوم مقام کو نکل جاؤں۔

کل جب میں نے تمہیں اپنے اس ارادے سے آگاہ کیا تو تم بھونچکے سے رہ گئے۔ تمہیں یقین نہ آیا۔ کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ تم حیرت سے میرے چہرے کو تکنے لگے رفتہ رفتہ میرے اس ارادے کے معنی تم پر آشکار ہونے لگے۔ ہمیشہ کی جدائی کے خیال سے تمہاری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور تم اپنی التجاؤں سے اپنی سہمی ہوئی نظروں سے مجھے روکنے کی کوشش کرنے لگے لیکن میں نہایت استقلال سے اپنی بات پر قائم رہی۔ شاید تمہیں تعجب ہوا ہو کہ میں یک لخت ایسی سنگدل کیسے بن گئی ہوں۔ لیکن افضل، تمہیں کیا خبر کہ اس وقت اندر ہی اندر مجھ پر کیا بیت رہی تھی۔ میرے دل میں جذبات اس شدت سے کھول رہے تھے۔ کہ معلوم ہوتا تھا ابھی باہر پھوٹ پڑیں گے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں اس آزمائش میں پوری اتری۔ میں نے اپنے پر قابو رکھا۔ آہ یہ نہ پوچھو کہ اس کے لئے مجھے کس قدر دکھ سہنا پڑا۔ مگر اب اس ذکر سے کیا فائدہ . . . .

جیسا کہ میں نے تم سے وعدہ کیا ہے۔ اب میرے اور تمہارے درمیان صرف ایک بندھن رہ جائے گا۔ وہ یہ کہ میں تمہیں کبھی کبھی خط لکھا کروں گی۔ لیکن میں تمہیں اپنا پتہ کبھی نہیں بتاؤں گی۔ تاکہ تم مجھ سے ملنے کی بے فائدہ کوشش نہ کرو۔ فقط

تمہاری شمیم

(۲)

۲۵ ستمبر ۱۹۳۵ء

پیارے افضل

پورے ایک برس کے بعد تمہیں دوسرا خط لکھ رہی ہوں۔ مجھے یقین ہے۔ ابھی تم مجھے بھولے تو نہ ہو گے۔ میں محسوس کر رہی ہوں کہ ان بارہ مہینوں میں ہماری محبت میں سرِ مو فرق نہیں آیا۔ تاہم کبھی کبھی ایسا گمان ہوتا ہے جیسے ان مہینوں نے ماضی پر سوگ کا ایک باریک پردہ ڈال دیا ہے۔

ایک دن میں نے چاہا کہ تصور ہی تصور میں تمہیں ایک نظر دیکھ لوں۔ چنانچہ میں نے اپنے ذہن میں تمہارے

خدو خال جمانے کی کوشش کی. لیکن مجھے تمہاری صورت دھندلی دھندلی سی نظر آئی۔ اگر کبھی تم بھی میری صورت کو یاد کرنے کی کوشش کرو۔ تو تمہیں معلوم ہوگا کہ وقت عزیز سے عزیز چیز کو بھی محو کر دیتا ہے۔

کل میں ایک باغ میں گئی۔ وہاں میں نے دیکھا کہ سورج کی ایک مسکراتی ہوئی کرن گلاب کے ایک سوکھے ہوئے پھول پر پڑی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے وہ مرجھایا ہوا پھول مسکرانے لگ گیا۔ اسی طرح سورج کی ایک مسکراتی ہوئی کرن میرے ہونٹوں پر بھی پڑی۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں بھی مسکرا رہی ہوں اس وقت سے مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے میری کوئی کھوئی ہوئی چیز مجھے مل گئی ہو۔ جب سے میں تم سے جدا ہوئی ہوں یہ میرا پہلا تبسم ہے۔ لیکن اب میں اکثر مسکراتی رہتی ہوں، میں تم سے التجا کرتی ہوں۔ کہ تم بھی مسکرایا کرو۔

تمہاری
شمیم

(۳)

۱۷ر دسمبر ۱۹۴۰ء

میرے پیارے افضل

لو میں پھر تم سے مخاطب ہو رہی ہوں۔ کیا میں ایک خواب کی مانند نہیں ہوں۔ کہ جب چاہوں آجاتی ہوں. مگر تم مجھے چھو نہیں سکتے؟

اب میں رنجیدہ نہیں ہوں۔ زمانے کی گردش نے میرے پژمردہ دل کو پھر شگفتہ کر دیا ہے۔ اور وہ دنیا جو پہلے تیرہ و تار معلوم ہوتی تھی، رفتہ رفتہ اس میں شعاعیں پیدا ہونے لگی ہیں۔

کچھ دن ہوئے میں ایک محفل نشاط میں شریک ہوئی تھی۔ ہر شخص شاداں و فرحاں نظر آتا تھا۔ ان کے چہرے زندگی کی بہار سے تابناک تھے۔ ان لوگوں میں میں نے خود کو بھی شاد خیال کیا۔ یہ میں تمہیں اسلئے لکھ رہی ہوں کہ تم بھی پچھلی باتوں کو بھلا دو۔ اور شاد شاد رہا کرو۔!

تمہاری
شمیم

(۴)

۶ - جولائی ۱۹۴۶ء

میرے پیارے افضل

سال پر سال گزرتے جا رہے ہیں۔ لو گیارہواں سال گزر گیا، اور اب بارہواں شروع ہے۔ لیکن مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کل کی بات ہو۔

عجب نہیں کہ اب تم گھر والے کہلا رہے ہو گے۔ اور عجب نہیں کہ اب تمہارا ایک چھوٹا سا قبیلہ بھی ہو۔ کہو اچھے تو رہے! میں تصور کر رہی ہوں۔ کہ تمہارا خوبصورت چہرہ پہلے سے کچھ بھرا بھرا سا ہو گیا ہوگا۔ شانے اور بھی فراخ ہو گئے ہوں گے۔ اور شاید تمہارے سر میں کوئی کوئی سفید بال بھی آ گیا ہو۔ مگر مجھے یقین ہے کہ تمہارا چہرہ مسکرانے سے پہلے درخشانی کا اب بھی وہی انداز رکھتا ہوگا۔

اور میں! نہیں میں تمہیں نہیں بتاؤں گی۔ کہ میں کیسی بڑھیا سی ہو گئی ہوں۔ ہاں بڑھیا سی۔ تم نہیں جانتے عورتیں مردوں کی نسبت کس قدر جلد عمر رسیدہ ہو جاتی ہیں۔

میں ایک دور دراز سفر پر گئی تھی۔ ابھی ابھی لوٹی ہوں۔ شاید عنقریب پھر جانا پڑے۔ فقط

تمہاری
شمیم

(۵)

۲۵ ستمبر ۱۹۳۴ء

میرے پیارے افضل

آج ہمیں جدا ہوئے پورے بیس برس ہو چکے ہیں۔ اور پیارے آج بیس ہی برس کا عرصہ ہو گیا ہے کہ میرا وجود صفحۂ ہستی سے مٹ چکا ہے۔ اگر اتنی مدت تک زندہ رہ کر اس خط کو پڑھ سکو۔ جو تمہیں اسی معتبر اور

ایماندار شخص نے بھیجا ہے، جس نے اس سے پہلے تمہیں میرے چار خط لمبے لمبے وقفے کے بعد اور مقررہ تاریخوں پر ارسال کئے تھے۔ تو میں تم سے اس فریب دہی کی معافی چاہتی ہوں کہ میں نے تم سے جدا ہونے کے دوسرے ہی روز خودکشی کر لی تھی۔

بھلا افضل یہ کیسے ممکن تھا کہ میں تمہارے بغیر ایک پل بھی زندہ رہ سکوں۔

کیوں افضل کل ہی ہم جدا ہوئے تھے نا؟ ذرا اس خط کے سرنامے پر تاریخ کو غور سے پڑھو۔ ہاں کل ہی کی بات ہے جب تم بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہے تھے۔ مجھے روکنے کے لئے التجائیں کر رہے تھے۔ تمہارا ننھا سا چہرہ جدائی کے صدمے سے اتر گیا تھا۔ آدھی کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس رات کے اندھیرے میں تمہارے آنسو میرے ہاتھوں پر ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ لیکن میں پوری مستقل مزاجی کے ساتھ چپ سادھے کھڑی تھی۔

اور اب میں، اس وقت میں اپنے اسی چھوٹے سے بالاخانہ میں تمہارے نام چار خط لکھ کر ختم کر چکی ہوں۔ جو تمہیں اپنی اپنی تاریخ پر پہنچ چکے ہیں۔ اور اب یہ آخری خط لکھ رہی ہوں۔ جو ۲۵ ستمبر ۱۹۵۴ء کو تمہیں ملے گا۔ اس کے بعد میری اور کوئی تحریر تمہیں نہیں ملے گی۔

بس اب میرے ذمہ دو کام رہ گئے ہیں۔ ایک تو ان خطوں کے یکے بعد دیگرے مقررہ تاریخوں پر تمہیں بھجوانے کا انتظام۔ دوسرے چپکے سے اپنی زندگی کا خاتمہ۔ میں یہ ہولناک تفصیل بیان نہیں کروں گی کہ شاید تمہارے دل کو ٹھیس لگے۔

اگر اسی وقت تمہیں میری خودکشی کی خبر ہو جاتی تو تم یہ صدمہ برداشت نہ کر سکتے، اور خدا جانے کیا کر بیٹھتے۔ اسی لئے میں نے یہ ترکیب سوچی کہ میں گاہے گاہے اپنے خطوں کے ذریعے تمہیں اپنی زندگی کا یقین دلاتی رہوں۔ اور تم مجھے زندہ تصور کرتے رہو جب بیس برس کی طویل مدت کے بعد اس آخری خط کے ذریعے تم پر میری خودکشی کا راز افشا ہوگا تو یقین ہے کہ اس وقت تک تم مجھے بالکل بھول چکے ہو گے، تمہارے دل پر دھکا سا تو لگے گا، لیکن اس کا اثر زیادہ دیر تک نہیں رہے گا۔

آہ میرے پیارے افضل آج کی ملاقات بھی کیسی عجیب و غریب ہے، ہم کیسے سکون کے ساتھ باتیں کر رہے ہیں، بعد زمین ہی کا نہیں وقت کا بھی ہے۔ اور لفظ "آج" میں کتنا عظیم فرق ہے اس کے لئے جو اسے ادا کر رہا ہے اور اس کے لئے جو اسے سن رہا ہے!

تمہاری
شمیم

(ماخوذ)

افسانہ

فراموش

انتظار حسین

سڑک سے اک ذرا ہٹ کر اونچے اونچے دودھیا کھمبے، سیمنٹ کا اجلا چبوترہ اور وہ حوض جس میں شفاف چمکیلا پانی ایک متوازن رفتار اور آواز کے ساتھ نالیوں کے ذریعہ بہتا اور نکلتا رہتا، وہ مقفل کوٹھری جس پہ سرخ لفظوں میں لکھا ہوا تھا "خطرہ ہے" اور ان سب سے ہٹ کر بیس تیس قدم پہ ایک سبک سفید مختصر سی کوٹھی جیسے کبوتری نے ابھی ابھی انڈا دیا ہو۔ ان سب نے مل جل کر کچھ ایک ہی قسم کی فضا پیدا ہوتی تھی۔ یا وہ سب ایک ہی قسم کی فضا سے پیدا ہوئی تھیں—— نرم نرم اجلی اجلی فضا، لیکن سڑک نہ تو یہاں سے شروع ہوتی تھی اور نہ یہاں ختم ہوتی تھی۔ اپنے محلے کی گلیاں طے ہو چکتیں تو آبادی ختم ہوتی نظر آتی اور وہ سڑک شروع ہو جاتی جو آبادی سے باہر بھی تھی اور آبادی کی نشانیاں بھی رکھتی تھی۔ کچے میں اتر کر کسی نیچے نیم سے ایک ٹہنی توڑ کر مسواک بنانا اور دانتوں سے چباتے ہوئے پھر اسی لمبی سڑک پہ ہو لینا۔ چنگی کی چوکی جہاں کبھی میلے اُجلے زرد خربوزے، کبھی ہری ہری ککڑیوں کی چھابڑی، کبھی گہرے ہرے کریلوں سے لدے گدھے کھڑے نظر آتے، پھر وہ رواں رواں کرتا ہوا رہٹ جس کا اونٹ جنگل جانے والوں کی لیٹوں اور گرمیوں کے شور سے بے خبر اسی بے کیف سے انداز میں چکر کاٹتا رہتا، پھر ٹیوب ویل کا سیمنٹ والا حوض اور وہ کھمبے اور وہ کوٹھی، کوٹھی سے آگے بہت دور تک دونوں طرف کھلا میدان جہاں کہیں کہیں بہت دور بہت سی بھینسیں خواب میں چلتی اور چرتی نظر آتیں، اور اس کے بعد اچانک سڑک موڑ کھاتی اور مشن اسکول کی سرخ عمارت سامنے آجاتی اور اس سے خاصی دور بھٹے کی خاموش کالی چمنیاں دکھائی دیتیں جو قریب آتی جاتیں قریب آتی جاتیں اور پھر سامنے سے پیچھے کی طرف ہو جاتیں، اور اس کے بعد ایکا ایکی ریل کی پٹری سڑک کو کاٹ جاتی۔ یہ اپنی آخری حد تھی۔ لیے کا وہ سفید کٹہرا کھلا ہو یا بند میں نے کبھی پٹری کو عبور کرنے کی خواہش ہی محسوس نہیں کی۔ فوراً پلٹ پڑتا۔ نیم کے کڑوے سفید ریشوں سے دانتوں کو ملتا دلتا، آموں کے گھنے درختوں کے نیچے سے ہوتا ہوا کہ شاید کوئی کچی امبیا ہاتھ پڑ جائے، بھٹے کی چپ چاپ چمنیوں اور مشن اسکول کی سرخ عمارت اور خواب میں چلتی ہوئی اور چرتی ہوئی بھینسوں کی معین نشانیوں سے گزرتا ہوا سیمنٹ والے حوض پر پہنچ کر دم لیتا، دانت صاف کر کے کلی کرتا، منہ ہاتھ دھوتا اور چپل اتار، مٹی میں اٹے ہوئے پیر ٹھنڈے ٹھنڈے پانی میں ڈال دیتا۔ عجب فرحت ہوتی۔ فرحت اور آسودگی تو اس فضا میں رچی ہوئی تھی۔ جانے دن بھر یہی عالم رہتا تھا یا یہ فضا اس وقت سے مخصوص تھی۔ کبھی رات کو بہت حبس ہوا تو بیشک اس وقت کالے کلوٹے ننگ دھڑنگ لڑکے حوض میں چھلانگیں لگاتے پانی اڑاتے دکھائی دیتے تھے، ویسے تو خاموشی ہی رہتی تھی، بس سیمنٹ کی نالیوں میں رکتا بہتا اجلا پانی بچوں کی مدھم کلکاریوں جیسا شور پیدا کرتا رہتا۔ یا کبھی کبھی کوٹھی کے سامنے سے گزرتے ہوئے ربڑ کی ایک سفید گیند گدے کھانے لگتی میں ٹھٹھک جاتا۔ اس خاموش فضا میں یہ ننھی سی بات بھی ایک شور، ایک واقعہ بن جاتی۔ کم از کم ایک دفعہ کو تو میں چونک ہی پڑتا تھا۔ گیند کے پیچھے پیچھے ایک جوان سا لڑکا کہ حلیئے سے نوکر لگتا تھا دوڑتا آتا اور بغیر کسی طرف دھیان دئے گیند اٹھا کر اسی یکسوئی سے واپس دوڑتا اور کوٹھی میں داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔ کبھی کبھی کے اس واقعے سے ہی مجھے اندازہ ہوا تھا کہ کوٹھی غیر آباد نہیں ہے اور انجینیر صاحب کے نام کی جو تختی دروازے پر آویزاں ہے وہ معنی اور مطلب رکھتی ہے۔ سامنے سڑک پر گدے کھاتی گیند کو دیکھ کر کبھی تو میں یوں چونکا کہ اس سفید ہلکی پھلکی کوٹھی کا کوئی حصہ اچھل کر سڑک پہ آپڑا ہے کھلی

فضا میں گول گول خطوں اور خموں والی سفید عمارت، سچ مچ یوں لگتا کہ ربڑ کی بہت سی گیندوں کو اوپر تلے رکھ کے کوٹھی بنائی گئی ہے۔

پھر ایک اور واقعہ ہوا، تھا گر نیا۔ کوٹھی کے عین سامنے سڑک پر چلتے ہوئے میرے قدم رک گئے۔ جیسے ایک ساتھ سامنے دیوار آ گئی ہو یا جیسے سامنے ریل کی پٹڑی رستہ کاٹ رہی ہو اور چوکیدار دل سے اچانک کہہ اٹھا رک جا۔ یا ہو۔ چکنی کالی سڑک پہ سفید چاک سے بڑے بڑے حرفوں میں لکھا ہوا تھا: فراموش۔ چاہے پھر میں چل پڑا لیکن ایک مرتبہ تو میں ٹھٹھک ہی گیا اور وسوسے میں پڑ گیا کہ اس رستہ کاٹتی ہوئی لکیر کو پھلانگوں یا نہ پھلانگوں۔ 'فراموش' کے لفظ سے باتیں اور یادیں بھی تو وابستہ ہیں۔ شاید ان کا یہ کرشمہ ہو۔ آموں کے موسم میں یہ لفظ اچھے خاصے ایک معمے کا کام کرتا ہے۔ کسی نے بچپن میں ہاتھ میں دو گاڑا آم تھما دیا اور کھٹ سے کہہ دیا 'فراموش' اور ہاتھوں میں ایک زنجیر سی بندھ گئی، یا جیسے اچانک کسی نے سارا جسم رسی سے کس دیا ہے۔ چینی کے پلیٹ پہ بڑے تکلف سے سرپوش ڈھکا ہوا، خیال ہوتا کہ کوئی تقریب ہوئی ہے اور کوئی بہت بڑھیا لذیذ شے اس تقریب سے بھیجی گئی ہے، اور اپنے میں ہاتھ سرپوش کی طرف بڑھتا اور اچانک ایک للکار 'فراموش' جیسے کسی نے جادو کی چھڑی چھوا دی ہو، یا کوئی دعا پڑھ کے چھو کر دی ہو، یا کنکریاں پڑھ کر مار دی ہوں، ہاتھ وہ گاڑا آم پہ جما کا جما رہ جاتا۔ وہ سو آم نذر کیجئے اور اس قید بے زنجیر سے، اس جکڑی ہوئی رسی سے جان چھڑائیے۔

دوسرے دن جب میں پھر وہاں سے گزرا تو وہ لکیر باقی تھی اگرچہ ادھ مٹی ہو گئی تھی، اور اس سے مجھ پر کھلا کہ اپنے اس خاص وقت پر موقوف نہیں۔ سارے دن ہی اس سڑک پہ آمد و رفت کا سلسلہ برائے نام رہتا ہے

پھر حرفی ادھ مٹی لکیر مٹی میں اٹی گئی مٹتی گئی مٹتے مٹتے بالکل ہی مٹ گئی۔ بات آئی گئی ہوئی۔ اپنا ورد اسی طرح جاری رہا۔ سڑک کے موڑ سے گذر کر مشن اسکول کی سرخ عمارت سے پرے، بھٹے کی خاموش کالی چمنیوں سے ادھر ریل کی پٹڑی کو چھونا، چھو کر پلٹنا، اور سیمنٹ والے حوض میں تھی بہتے ہوئے پیر ڈالنا، منہ ہاتھ دھونا، اور واپس گھر کو ہو لینا۔

فراموش ——— اپنے ورد میں ایک گرہ پھر پڑی لیکن اتنی ہلکی کہ نہ تو زمین نے قدم پکڑے اور نہ یہ کرید ہوئی کہ سفید انڈا اسی دیوار کو کس نے کیڑے سے کالا کیا ہے۔ وہی کچا کچا خط، ٹیڑھے میڑھے خم اور دائرے الٹا ایک اطمینان سا ہو گیا کہ کسی راہ چلتے نٹکھٹ لڑکے کی وہ شرارت نہیں تھی یہیں کہیں کوئی بچہ رہتا ہے۔ شاید اسی کوٹھی والا گیند کھیلنے والا بچہ ہو، جسے موسم کے بہانے اس لفظ کا چسکا پڑ گیا ہے۔

واپسی میں میں نے دیکھا کہ ایک شخص کہ اس کی پیٹھ میری طرف تھی اور شب خوابی کے لباس اور ادھیڑ عمری کے باوصف تیوروں سے افسری کی جھلک کھاتا تھا، ہاتھ میں چھڑی لئے دیوار کی طرف اشارہ کرتا ہے اور مالی سر نیوڑھائے دیوار یوں صاف کر رہا ہے جیسے اس میں ساری خطا اسی کی ہے۔

دوسرے تیسرے دن کا ذکر ہے کہ اسی مقام پر اسی خط میں وہ لفظ پھر لکھا نظر آیا، اور میرے واپس ہوتے ہوتے وہ پھر صاف کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد ایک مرتبہ نہیں کئی مرتبہ میں نے جاتے ہوئے وہ لفظ لکھا دیکھا اور واپسی میں وہ مٹایا جا چکا ہوتا یا مٹایا جا رہا ہوتا۔

انہیں دنوں باہر جانا نکل آیا۔ باہر جانا تو ہوتا ہی رہتا تھا، کبھی محصول وصول کرنے گاؤں کو کبھی مقدمے کے چکر میں شہر کو۔ آج ہمارے میں کھڑے ہیں تو کل تحصیل میں اور پرسوں ضلع کچہری میں۔ زیادہ سے زیادہ تین دن چار دن کسی اہلکار نے بہت ستایا تو ہفتہ عشرہ ہو گیا۔ پر اب کے تو پورے پندرہ دن لگ گئے۔ یہ الگ بات ہے کہ اتنے دن کی واپسی پر بھی موسم ویسا ہی تھا۔

دوسرے دن صبح میں نے اپنا ورد پھر شروع کیا ہے تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ لفظ اسی مقام پر اسی خط میں پھر لکھا ہوا ہے۔ گر حیرانی کی اب کونسی بات رہ گئی تھی۔ بلکہ اب تو اس لفظ کے مٹنے اور نقش ہونے کی تکرار بھی اپنے ورد کا جزو بن چلی تھی۔ ہاں حیرانی اس پہ ہوئی کہ تکرار کی یہ زنجیر ٹوٹ گئی۔ واپسی میں لفظ کو جوں کا توں دیکھ کر گمان ہوا کہ آج انجینئر صاحب اور انجینئر صاحب کے ملازم دونوں کی نگاہ چوک گئی گر حد ہو گئی کہ دوسرے دن بھی وہ لفظ اسی خط میں اسی مقام پر اسی طرح لکھا ہوا تھا اب ماتھا ٹھنکا کہ الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ سو سو طرح کا شک پڑا کہ انجینئر صاحب کیا ہوئے؟ وہ سے نہ نکل گئے کہیں تبادلہ تو نہیں ہو گیا۔ کیا خبر ہے کہ بیمار پڑے ہوں۔ گمانوں کی ڈوری لمبی ہوتی گئی گر گتھی گتھی ہوئی رہی۔

برسات اب کی بار دیر سے لگی تپتی دوپہریوں کا سلسلہ ٹوٹتے ہی نہ

آتا تھا۔ دن کو لو اور رات کو حبس۔ اور آندھی کا کوئی وقت مقرر نہ تھا کہ کبھی دن ڈھلنے سے پہلے اندھیرا ہو جاتا اور کبھی رات کی اندھیری میں اندھیار چلنے لگتی۔ آنگنوں اور کوٹھوں اور منڈیروں پہ کتنی مٹی اٹ گئی تھی، اس کا اندازہ تو پہلا چھینٹا پڑنے پہ ہوا۔ ایک روز صبح ہی صبح آنکھ کھلی تو ہر چیز دھلی دھلی اور ٹھنڈی ٹھنڈی نظر آئی۔ جس نیم سے روزانہ ٹہنی توڑ کے مسواک بناتا تھا وہ نہا دھو کر کیسا ہرا بھرا ہو گیا تھا۔ درخت اور کھمبے اور دیواریں سب ہی میں ایک شادابی کی رَو دوڑ رہی تھی۔ ہاں سیمنٹ والے حوض میں آج پانی نہیں چل رہا تھا بس بارش کا مٹیالا پانی رکا کھڑا تھا۔ انجنیئر صاحب کی کوٹھی بھی جو لوؤں اور آندھیوں کی گرد سے زرد پڑ چلی تھی۔ پھر سفید انڈا سی نظر آنے لگی اور وہ لفظ، کالے کوئلے سے لکھے ہوئے حرف دھل کر روشن روشن ہو گئے تھے۔

برسات کیا لگی کہ مینھ کی جھڑی لگ گئی۔ دن بارش، رات بارش۔ سوکھے تالاب منا منھ بھر گئے اور اونگھتی سوتی بھینسوں کی آنکھیں کھلیں اور رواں جاگا خستہ چھجوں کی لکڑی بھیگ بھیگ کے کالی پڑ گئی اور گلنے لگی اور اس میں سے سفید سفید سانپ کی چھتریاں ابھرنے لگیں۔ چولائی کی ننھی پتیاں پھیلتی گئیں، چوڑی ہوتی گئیں۔ پتھریلی منڈیروں پہ سبز سیہ سائی اور لکڑی کے گیلے کواڑوں پر سفید پھپھوندی جمنے لگی۔ انجنیئر صاحب کی کوٹھی کی سفید دیواروں پہ بوسیدگی کے ایسے آثار نمایاں نہیں تھے۔ ہاں وہ لفظ دھندلاتا جا رہا تھا۔ خوں کی پھیلی ہوئی سیاہی کو دیکھ کر یوں لگتا کہ رسی کے بل کھل رہے ہیں۔ ف کا نقطہ تو بالکل ہی مٹ گیا۔ ش کے تین نقطے ہلکے پڑتے گئے، پھیلتے گئے اور مدغم ہو کر ایسے بن گئے جیسے تتلی چھترا رہی ہو۔ مجھے فکر ہوئی کہ کہیں یہ لفظ بالکل ہی نہ مٹ جائے۔ دراصل اپنا اس لفظ سے ایک رابطہ سا قائم ہو گیا تھا۔ اس سڑک کی یوں کس چیز سے اپنا رابطہ نہیں۔ لیکن بعض خاص خاص چیزیں اپنے لئے نشانیوں کا بلکہ سنگِ میل کا مرتبہ رکھتی ہیں۔ اپنے اس روزانہ کے چھوٹے سے سفر کی نوعیت خالصتاً بھی ہے۔ منزل ہی نہیں، میل اور سنگِ میل بھی اپنے مقرر کئے ہوئے ہیں۔ پنٹلی کی چوٹی، رہٹ، مشن اسکول کی سرخ عمارت، بھٹے کی خاموش چمنیاں۔ یہ سنگِ میل ہی تو ہیں۔ اب یہ لفظ بھی ایک سنگِ میل بن گیا تھا۔ اس سنگِ میل کو چھوتے ہی لگتا کہ باقی میل یوں طے ہوئے اور ریل کی پٹڑی اب آئی۔ کبھی کبھی یہ سنگِ میل منزل بن جاتا۔ گویا اسے چھونے کے لئے ہی گھر سے نکلے تھے اور اگر ریل کی پٹڑی تک جا رہے ہیں تو محض وضعداری کی خاطر۔

برسات ڈھلنے لگی مینھ کا زور ٹوٹ چلا۔ گھٹا ایسی گھر کے آتی، جیسے ٹوٹ کے پانی پڑے گا۔ مگر دم بھر پانی پڑتا اور آن کی آن میں مطلع صاف۔ بڑی بڑی ساونی جامنوں کی جگہ چھوٹی بدرنگ بھدیاں بننے آئیں۔ پھر بھدیاں جامنیں بھی غائب ہونے لگیں۔ چولائی کے پتے ہرے سے سرخ اور سرخ سے پیلے ہوئے۔ سانپ کی چھتریاں جس تیزی سے پھولی تھیں اسی تیزی سے مرجھائیں۔ طوطوں کے بچے نیم کی کھوکھل سے نکل کر شاخوں پر آ گئے تھے۔ اور ٹہنی ٹہنی پھدکتے پھرتے تھے۔ منھا منھ تالاب گھٹنے گئے گھٹتے گئے یہاں تک کہ پانی بھینسوں کے گھٹنوں تک رہ گیا۔ گری ہوئی چھتوں، جھکی ہوئی کڑیوں اور چھجوں اور دو اینٹی دیواروں کی مرمت شروع ہو گئی تھی اور احاطوں میں سے ڈھئی ہوئی دیواروں کا ملبہ اٹھنے لگا تھا۔ انجنیئر صاحب کی کوٹھی کے احاطے میں چونے کی بوری رکھی نظر آئی تو کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ سفید بدرنگ دیواروں کا جائزہ لیتے ہوئے نظریں اپنے ٹھکانے پر جا کر ٹک گئیں۔ ف کا نقطہ پہلے ہی معدوم ہو چکا تھا۔ اب میم کی گھنڈی بھی گھل چلی تھی۔ شین کی ہتلی کچھ اور بکھرا گئی تھی۔ رسی کے بل کھل رہے تھے، بکھر رہے تھے۔ مگر اب تو کوٹھی کے ایک کنارے پر یہ پورا کا پورا چھ حرفی افسانہ حرفِ غلط بن جائے گا۔ اس خیال سے جی اک ذرا اداس سا ہو گیا۔ پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ یہ لفظ سنگِ میل نہیں، رستے کا ساتھی تھا جو اپنی جگہ پہ کھڑا دور سے اشارہ کرتا رہتا تھا اور دور تک اشارہ دیتا رہتا تھا۔

چونے کی بوری احاطے میں ڈیڑھ دو دن جوں کی توں رکھی رہی۔ پھر بڑے بڑے دو ڈھول رکھے نظر آئے جن میں قلعی گھل رہی تھی، اور دو تین کوچیاں، اور ایک سیڑھی۔ دوسرے دن کوٹھی کو میں نے ادھ پچی حالت میں دیکھا۔ اندر کے بڑے حصے میں قلعی ہو چکی تھی مگر باہر کی دیواروں کو ابھی نہیں چھوا گیا تھا۔ دوسرے دن دیکھا کہ ساری کوٹھی پہ سفیدی ہو گئی ہے...... مگر میں دنگ رہ گیا..... باہر کی دیوار پر اس اہتمام سے سفیدی کی گئی تھی کہ فراموش اپنی جگہ پہ قائم تھا اور اس سلیقے سے کہ چونے کی ایک بوند کسی حرف پہ نہیں پڑی تھی۔ میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا اور ایک بل کھلی پھوسڑے نکلی رسی نے میرے ہاتھ پیروں کو اس طرح جکڑ لیا کہ میں نہ آگے بڑھ سکتا تھا نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا۔

ٹہلنے کا ورد نہیں بدلا، رستہ نہیں بدلا، رستے کی شکل بدل گئی

نشانوں کی ترتیب بدل گئی۔ آگے وہ ایک لمبی لکیر تھی اب گول چکر بن گئی۔ اول و آخر کا قصہ ہی پاک ہو گیا، سارے نشان ایک گھوم میں گم ہوتے چلے جاتے اور گھوم پھر کر وہ نشان پھر آ جاتا، دیوار بن کر سامنے کھڑا ہو جاتا پھر یہ سارے نشان زائل ہونے لگے اور وہ ایک نشان پھیلنے لگا۔ پھیلتے پھیلتے نقطہ محیط بن گیا، مرکز بھی وہی، محیط بھی وہی، منزل بھی وہی سنگ منزل بھی وہی۔ میں ورد کے مطابق پورا رستہ طے کرتا پر اپنی جگہ پہ کھڑا نظر آتا۔ چلتے چلتے ریل کی پٹڑی کو پھلانگتا اور دور نکل جاتا۔ اور پھر بھی وہیں کا وہیں رہتا۔ کبھی کوٹھی کے بالکل برابر سے نکلتا اور اس بھید بھرے لفظ کی تہ میں اترنے کی کوشش کرتا لیکن ادھ مٹے حروف کا ایک خم بھی ٹس سے مس نہ ہوتا اور پھوسڑے نکلی پیچ دار رسی اسی طرح گرمڑی مارے پڑی رہتی۔ پھر میں آپ ہی اپنی اس روش پہ لعنت ملامت کرتا اور دوسرے دن اس عزم سے سڑک کے دوسرے کنارے چلتا کہ ادھر آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھوں گا، لیکن کوٹھی کے مقابل پہنچنے سے پہلے ہی عزم ڈگمگانے لگتا اور پہلے کنکھیوں سے اور پھر ہار کر براہ راست اس مقناطیسی گرہ کو دیکھتا۔ کئی مرتبہ خیال آیا کہ مالی سے کیوں نہ پوچھ لیا جائے۔

وہ ہمیشہ ہاتھ میں لمبی قینچی یا کوئی کھرپا، بظاہر بہت مصروف بنا ہوا کوٹھی کے باغیچے سے اچانک نکلتا اور اچانک گم ہو جاتا گویا سایہ تھا کہ دکھائی دیا اور اوجھل ہو گیا۔ ایک مرتبہ تو میں بالکل اس کے برابر پہنچ گیا مگر عین موقع پر جھجک گیا۔ سمجھ ہی میں نہ آیا کہ کیا پوچھوں اور کیسے۔ بات شروع کروں پھر یہ سوچنے لگا کہ یہ یوں سائے کی طرح کیوں دکھائی دیتا اور اوجھل ہوتا ہے اور انجینئر صاحب؟ یہاں واقعی کوئی انجینئر رہتا ہے؟ نام اور عہدے کی یہ تختی کسی گذرے ہوئے زمانے کی تو یادگار نہیں ہے؟ پھر وہ شب خوابی کے کپڑوں میں ملبوس ادھیڑ عمر شخص کہ بس ایک ہی دم بھر کے لیے نظر آیا تھا، کون تھا؟ کہاں گیا؟ اور وہ سفید گیند؟ اب وہ کیوں نہیں لڑھکتی ہوئی اپنا رستہ نہیں روکتی؟ سو سو شک گذرتے اور طرح طرح کا وہم گذرا۔ بچپن میں دیکھے ہوئے وہ زنگ لگے تالوں اور گرد میں اٹے کواڑوں والے مکان یاد آئے جن میں اپنا یقین تھا کہ جن رہتے ہیں۔ کہانیوں کی وہ بھید بھری حویلیاں یاد آئیں جن میں داخل ہو کر نکلنے کا رستہ نہیں ملتا تھا اور جادوگرنیوں کی کوٹھی تھی کہ گلے میں آشنائی کا پھندا ڈالتیں یا ہرن بنا کے رکھتیں۔ فراموشی سے یہ سیدھا سادا مگر مبہم لفظ کسی عمل کا عمل نہ ہو، یا کیا خبر ہے کہ جادو ہو۔ جادو لفظ ہی سے تو پیدا ہوتا ہے نہ سمجھ میں آنے والے لفظ سے۔ عام حروف سے بٹی ہوئی یہ غیبی رسی جادو کا پھندا بن کر گلے پڑ گئی۔

دنوں کا زنجیر اچھلتا گیا اور جادو کا پھندا آپ ہی آپ ڈھیلا پڑنے لگا۔ جاڑے آئے۔ جاڑے کے ساتھ پالا، ٹھٹھرن اور دھند آئی۔ صبح کو اوورکوٹ لادے اور مفلر کانوں سے لپیٹے ٹہلنے نکلتا۔ درخت، ٹیلیفون کے تار، ٹیوب ویل کے دودھیا کھمبے، بھٹے کی کالی چمنیاں سب کی سب چیزیں دھند میں لپٹی ہوئی اور سوئی ہوئی نظر آتیں۔ واپسی میں کہ اس وقت دھند ذرا چھنٹ جاتی تھی۔ یہ سب چیزیں گیلی ہوئی دکھائی دیتیں۔ وہ سفید دیوار بھیگی بھیگی سی لگتی تھی۔ اور وہ لفظ، اب وہ پھر گیلا ہو کر میلا ہونے لگا تھا۔ نقطے سے محروم ف کی اس گنتی کے بھی بل کھل رہے تھے جو اس کی انفرادیت کا نشان ہے۔ اور الف کے نام تو بس ایک ہلکا سا عکس باقی رہ گیا تھا۔ شین کے تنے ہوئے جڑواں نقطے تو پہلے ہی ڈھلک گئے تھے اب اس کا خم کھایا ہوا لمبا پیٹ بھی نرم پڑ چلا تھا۔ رسی کے سارے ہی بل نکل گئے تھے۔ کبھی میں اسے بے دھیانی میں دیکھتا چلا جاتا، کبھی بغیر دیکھے گذرا چلا جاتا۔ کئی کئی دن گذر جاتے اور دیوار پہ نظر بھی نہ اٹھتی۔ یہ خیال بھی نہ آتا کہ اب یہ لفظ مرکز کشش نہیں ہے۔ دائرہ ٹوٹ کر پھر لمبی لکیر بن چلا تھا۔ سڑک اپنی پہلی والی شکل پہ آتی جا رہی تھی اور مٹی ہوئی نشانیاں اور گمشدہ سنگ میل پھر نمودار ہو رہے تھے۔

بسنت آنے پہ پالا پلے کے ساتھ جاڑا گیا۔ گلابی جاڑا چمکا، ماند پڑ گیا ہولی آئی تو بستروں سے لحاف رخصت ہو گئے اور رضائیاں آئیں، اور چارپائیاں کچھ بند کمروں سے دالانوں میں اور کچھ آنگنوں میں آ گئیں۔ گیہوں کی فصل کٹ رہی تھی۔ مجھے بار بار گاؤں جانا پڑا اور کئی کئی دن واپسی نہ ہوئی۔

واپسی پہ ٹہلنے کا وظیفہ پھر شروع ہو گیا۔ اب خیال بھی نہ آتا تھا کہ انجینئر صاحب کی کوٹھی کی طرف دیکھوں۔ نظر آپ ہی اس طرف اٹھ گئی تو اٹھ گئی۔ ورنہ اب تو اس طرف دھیان بھی نہ جاتا تھا۔ دراصل یہ کوٹھی اور اس کی وہ کوئلے سے لکھے ہوئے لفظ والی دیوار بھی بچپن والے زنگ لگے تالوں اور مٹی سے اٹے کواڑوں والے مکانوں میں شامل ہو کر یادوں کی فضائے بسیط میں پرے سرکتی جا رہی تھی۔ لیکن ایک روز ادھر نگاہ جو پڑی تو اک تبدیلی سی نظر آئی۔ احاطے میں چند کرسیاں بے ترتیبی سے پڑی تھیں اور برآمدے میں کئی بند پیٹیاں اور کچھ کھلا سامان بکھرا سا دکھائی دیتا تھا۔ دل میں ایک کرید سی ہوئی کہ آخر بات کیا ہے۔ شک سا پڑا کہ انجینئر صاحب کا تبادلہ تو نہیں ہو گیا اور

یہ ان کے جانے کی تیاریاں ہوں۔ واپسی میں میں مخالف سمت کو چھوڑ کر کوٹھی کے برابر سے نکلا۔ دیکھا کہ برآمدے میں تین چار بچے بے طرح دھما چوکڑی مچا رہے ہیں۔ اندر کے کمرے سے اس کے خلاف نسوانی احتجاج کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر ایک مردانہ ڈانٹ۔ مجھے بڑا اچنبھا ہوا۔ بچے، بڑے، عورتیں، مہین اور موٹی اور نرم رسیلی اور درشت آوازوں کے یہ رنگ برنگے تار کہ ایک بناوٹ بن کر پھیل رہے تھے۔ آخر یہ نئی زندگی اچانک کیسے اور کہاں سے پھوٹ پڑی۔ خاموش برآمدے اور احاطے، شیشے والے بند دروازوں اور گنگ کمروں کی کایا ایکا ایکی کیسے پلٹی۔ سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ بس یہ جو لیا کہ کہیں سے مہمان آئے ہوں گے۔

دوسرے دن کوٹھی کا چولا بدلا نظر آیا۔ دور سے پتہ چل رہا تھا کہ سفیدی ہوئی ہے۔ پھاٹک کے باہر قلعی کے ادھ بھرے ڈھول بھی رکھے تھے۔ کہ جیسے راج کام کرتے کرتے انہیں چھوڑ گئے ہیں اور آ کے پھر کام سے لگ جائیں گے۔ میرے قدم نا دانستہ تیز تیز اٹھنے لگے۔ کوٹھی کے قریب پہنچتے ہی میری نگاہ نے اسی باہر والی دیوار کو ٹٹولا۔ دل دھک سے رہ گیا۔ ساری دیوار پہ سفیدی پتی ہوئی تھی اور سفیدی پہ نقطوں شوشوں اور خموں سے پیدا ہوا وہ جالا سفیدی میں ڈوب چکا تھا۔ اچانک پھر کسی نے میرا رستہ کاٹ دیا اور ایک ان دیکھی رسی مجھے جکڑے لے رہی تھی۔

ہاتھ میں وہی لمبی سی قینچی۔ باہر کی روش پہ دور رویہ جھاڑیوں کی ہری ہری گھنی شاخوں اور پھننگوں کو تیزی سے چھانٹا چلا جا رہا تھا۔ اب تو واقعی مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ یوں بھی اب وہ مالی ہی لگتا تھا۔ کوئی پراسرار مخلوق نظر نہیں آتا تھا کہ مجھے جھجک ہوتی۔ اس کے قریب سے گذرتے ہوئے سادگی سے رکا اور اسی سادگی سے پوچھا "انجنیئر صاحب کے تو آج بہت مہمان آئے معلوم ہوتے ہیں؟"

"مہمان تو کوئی نہیں" مالی کی قینچی اسی طرح چلتی رہی "نئے انجنیئر صاحب کے گھر والے ہیں۔"

"نئے انجنیئر صاحب" میں چونکا اور نگاہ فوراً نام کی تختی پہ گئی۔ تختی واقعی بدلی ہوئی تھی۔

مالی اسی طرح ہاتھ روکے بغیر سادگی سے بولا "ہاں جی اب نئے انجنیئر صاحب آ گئے ہیں۔ پہلے انجنیئر صاحب تو گئے۔"

"کہاں؟"

"انہوں نے پنشن لے لی۔"

"پنشن؟ اچھا؟" مجھے یہ بات نہ جانے کیوں اتنی عجب معلوم دے رہی تھی۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ بس ہری شاخوں میں قینچی کے بردر کرنے کی آواز آتی رہی۔ پھر مالی آپ ہی بولا، اور اس مرتبہ اس کی آواز میں افسوس کی سی ایک کیفیت تھی۔ "اجی اچھا ہی ہوا کہ ان کی پنشن ہو گئی۔ جب سے ان کا بیٹا مرا تھا ان کا دماغ چل بے چل ہو گیا تھا۔"

"بیٹا؟ اچھا بیٹا مر گیا تھا انجنیئر صاحب کا؟" یک بیک الجھی ہوئی ڈور کا سرا ملتا دکھائی دیا۔

"نہیں جی وہ بیٹا نہیں تھا۔" مالی نے قینچی روکی، قینچی زمین پہ ڈال کر سیدھی کر، میری طرف رخ کر کے کھڑا ہو گیا۔ "انجنیئر صاحب بیچارے تو اکیلے تھے۔ وہ ان کا لے پالک تھا۔ بہت لاڈ کرتے تھے، اس کا بس وہ دم تھے۔ انجنیئر صاحب اور لے پالک۔ اور کیا دیکھنا رہ گیا تھا انہیں بس اسے دیکھ دیکھ کے جیتے تھے۔ نہ کسی سے ملنا، نہ کسی کے پاس جانا، نہ کوئی میل ملاقات۔ دفتر یا دورہ، وہاں سے سیدھے گھر۔ نہ کوئی قصہ نہ بکھیڑا، اسی کے ساتھ مگن رہتے تھے۔ ...... پورے برس اسے یوں لگ گئی کلی کی طرح یوں مرجھا گیا ......" مالی کسی سوچ میں ڈوب گیا، پھر آپ ہی آپ بڑبڑایا "انجنیئر صاحب بیچارے اکیلے رہ گئے۔ بہت دکھی رہتے تھے بیچارے بالکل کھوئے کھوئے رہنے لگے تھے۔ نوکری سے بھی جی اچٹ گیا تھا۔ اب دورے پہ بھی ایسے دلیے ہی جاتے تھے۔ بس اسی کا خیال ہر وقت رہتا تھا۔ اس کی ایک ایک چیز کو، گیند کو، بتے کو سینت کے رکھ چھوڑا تھا ..... اچھا ہی ہوا پنشن لے لی۔ بالکل چل بے چل ہو گئے تھے۔" اس نے آہستہ سے جھک کر قینچی اٹھائی۔ اور میری طرف دیکھے بغیر دوسری روش کی طرف ہو لیا۔

کھلے میدان میں کہیں کہیں بہت دور اکا دکا خواب میں چلتی اور رینگتی ہوئی جیپیں، پھر وہ دور رویہ آموں کے بے ثمر درخت کہ ختم ہونے میں نہ آتے تھے۔ اسکول کی سرخ عمارت، عمارت سے کہیں بہت آگے نکل کر بیٹے کی کالی کالی چپ چاپ چمنیاں جو قریب ہونے کی بجائے دور ہوتی نظر آ رہی تھیں، اس روز وہ لمبی اونچی نیچی گرد آلود سڑک کہ کبھی سیدھی چلتی اور کبھی ٹیڑھ کھاتی دکھائی دیتی۔ اتنی لمبی لگی اتنی لمبی لگی کہ میں بیزار ہو کر ریل کی پٹری کو چھوئے بغیر واپس ہو لیا۔

سِرِّ آدم

روشؔ صدیقی

تو نے سمجھا اس جہاں کو کارگاہِ بے ثبات
خواب ہے تیری نگاہوں میں شبستانِ حیات
یہ تری سادہ دلی اے موجِ بحرِ کائنات!

زندگی بھر جادہ پیمائے دُعا رہنا ترا
اور مفہومِ مشیت سے جدا رہنا ترا
نذرِ فردا کر دیا تو نے جہانِ ممکنات

سوچتا ہوں کیا نویدِ خُلدِ فردا ہے یہی؟
کیا فروغِ صبحِ جنت کا تقاضا ہے یہی؟
اور بھی تاریک ہو جائے غمِ دوراں کی رات

تو سدا الفاظ کے گلشن کھلاتا ہی رہا
آتشِ کردار سے دامن بچاتا ہی رہا
یوں تو ٹوٹا ہے نہ ٹوٹے گا طلسمِ خواہشات

کیا یہی ہے ترکِ دنیا اور ترکِ ما سوا؟
تو رہے نا آشنائے دردِ مخلوقِ خدا
تیرے دامن تک نہ پہونچے گردِ راہِ حادثات

تال پر نازاں ہے تو اے نغمہ خوانِ کن فکاں
اور دنیا ہے سراسر کارگاہِ امتحاں
امتحاں ہے شرط، اے دانندۂ راہِ نجات!

دل میں خاک اُڑتی ہے سوزِ زندگانی کے لئے
فکر ہے شمعِ حرم کی پاسبانی کے لئے
اور بجھتی جا رہی ہے مشعلِ راہِ حیات

آگ ہو دل میں تو ہے اک آہِ لرزیدہ بہت
ایک آنسو در پسِ مژگانِ نم دیدہ بہت
ورنہ بے ہنگام شورِ دجلہ و نیل و فرات

زندگی کی تیغِ نادیدہ سے بسمل ہو کے دیکھ
بندگانِ خلق کے دُکھ سکھ میں شامل ہو کے دیکھ
سِرِّ آدم تجھ پہ کھُل جائے گا اے تارکِ صفات!

یہ لمحے

ضمیر اظہر

یہ غم کے لمحے ہیں کتنے پیارے
کہ زندہ جن کے وصال سے ہیں یہاں کئی حسرتوں کے مارے
یہ غم کے لمحے ہیں کتنے پیارے

طویل تنہائیوں میں اکثر
مری نگاہوں کی کھڑکیوں سے ہیں گذری ایسی سیاہ راتیں
کہ جیسے صحرائے بے صدا میں
فسردہ بے بال و پر فضا میں
رواں گناہوں کا کارواں ہو
مگر یہ لمحے، یہ غم کے لمحے!
نجوم کا روپ دھار کر یہ دل کو دل سے کرتے رہے اشارے
یہ غم کے لمحے ہیں کتنے پیارے!

جہاں کہ اک حادثوں کا گھر ہے
الجھتا رہتا ہے نت نئے حادثوں سے جس میں غریب انساں
اگر نہ ہوتے یہ غم کے لمحے
تو کس سہارے عبور کرتا حیات کے تلخ و تیز دھارے؟
یہ غم کے لمحے ہیں کتنے پیارے!

وادیٔ شفق سے

صفیہ شمیم

پُر کیف ہو جب دنیائے چمن، اور ہر سو ہو آغازِ سحر
انگڑائیاں لیں نازک شاخیں اور جھوم رہے ہوں مست شجر
جب نہروں اور تالابوں پر ہوں عکس فگن انوارِ سحر
ہر قطرۂ شبنم موتی ہو، ہر ذرۂ خاکی لعل و گہر
جب غرقِ تبسم عالم ہو، گُلِ صحرا کو مہکاتے ہوں
جب کھیت ہوا کے جھونکوں سے میدانوں میں لہراتے ہوں
جب مست فضائیں نکھری ہوں جیسے ہوں دُھلی آبِ زر سے
چاندی سے جھلکتے دریا پر جب کرنوں کا سونا برسے
آراستہ ہو سلمائے سحر انوار کے ترشے زیور سے
انگڑائیاں لے خوابیدہ فضا مہتاب کے سیمیں منظر سے
کوئل کی صدائیں آتی ہوں جب رہ رہ کے گلزاروں سے
اک نغمۂ شیریں پھوٹ پڑے جب دل کے نازک تاروں سے
اس وقت شفق کی وادی سے تو کاش چمن میں بھی آئے!
ہستی کا مری ذرہ ذرہ تصویرِ مسرت بن جائے!

غزل

حفیظ ہوشیارپوری

سحر قریب ہے تاروں کو نیند آئی ہے — شبِ فراق کے ماروں کو نیند آئی ہے

شعاعِ مہرِ جہاں تاب سے یہ کون کہے — ابھی ستارہ شماروں کو نیند آئی ہے

جفا کا بھیس بدل اے نسیمِ مہر و وفا — نگاہِ لطف کے ماروں کو نیند آئی ہے

خروشِ حشر میں بھی سر نہ آستاں سے اٹھے — یہ کس کے سجدہ گذاروں کو نیند آئی ہے

جگانے آئے گا پھر کوئی نے نواز انہیں — خزاں نہیں، یہ بہاروں کو نیند آئی ہے

تھپک تھپک کے یہ کہتی ہے موجِ بیتاب — تھکے تھکے سے کناروں کو نیند آئی ہے

سکونِ خواب سے محروم ایک میں ہی نہیں — مری طرح سے ہزاروں کو نیند آئی ہے

ہوائے کوئے غریباں خیال ان کا رہے — یہاں یہاں مرے پیاروں کو نیند آئی ہے

سنائے جائیں گے ہم داستانِ ہجر و فراق — یہ اور بات ہے یاروں کو نیند آئی ہے

حفیظ تم بھی چلو اب تو گھر خدا کے لئے

طویل راہگذاروں کو نیند آئی ہے

غزل

یوسف ظفر

تیرا جلوہ بھی اگر صورتِ ہجراں ہوتا
تجھ سے کیا، میں ترے سائے سے گریزاں ہوتا

راہیں منزل نہیں، منزل سے مگر کم بھی نہیں
تو کبھی ہوتا، تو مرے ساتھ پریشاں ہوتا

میرا ہونا تری فرقت کا اثر ہے اے دوست!
میں نہ ہوتا تو ترا حُسن نمایاں ہوتا

دل نے پھر گردشِ دوراں کا فسانہ چھیڑا
کاش اس دور میں ملنا ترا آساں ہوتا

سانس، لینے ہی کو جینا تو نہیں کہتے ہیں
زندگی تھی، جو ترے وصل کا امکاں ہوتا

تجھ کو اُلفت نہ سہی، کوئی طلب تو ہوتی
دل ترا غنچہ بھی ہوتا، تو گلستاں ہوتا

میں ہی وہ کشتۂ اُمیدِ وفا ہوں کہ ظفر
گر مجھے موت بھی ملتی تو غزل خواں ہوتا

غزل

ریاض قادر

درد کی شوخیٔ خرام خموش
ہے لبوں پر بھی اس کا نام خموش

اب وہ افسانۂ بہار کہاں
سو رہا قلبِ تشنہ کام خموش

طائرِ نغمہ خواں سے ہے آباد
وہی اُجڑا سا گھر، وہ بام خموش

اے مسافر ٹھہر، پرانے دیار
تجھ سے کرتے ہیں کچھ کلام خموش

یہ کبھی زندگی کا مرکز تھے
یہ جو اوندھے دھرے ہیں جام خموش!

زندگی آپ اپنا محور تھی
مر رہا سوزِ ناتمام خموش

شوق سے کچھ نکل گئے آگے
ہو گئیں منزلیں تمام خموش

یوں چلے ہر دیارِ رعنا سے
آنکھ بھر پور اور گام خموش

نگاہیں..

ہم لوگ

ضمیر جعفری

ہمارے گروپ میں زیادہ تر ادیب، شعرا، فن کار اور دانشور شامل تھے جو دن بھر ایک باقاعدہ بے قاعدگی کے ساتھ کسبِ معاش کا دھندا کرتے، رات کو بڑے خلوص کے ساتھ شہر کے مختلف قہوہ خانوں میں گپ لڑاتے اور اس کے بعد جو وقت بچ رہتا اس میں ادب، آرٹ دانش وغیرہ کی تخلیق کرتے۔ بعض فن کار، فن کو زندگی سے اتنا مقدم سمجھتے تھے کہ زندگی خود ان کی گرفت سے نکل گئی تھی۔ چند بڑے افسر بھی گروپ میں شامل تھے جو اگر بڑے افسر نہ ہوتے تو بہت چھوٹے آدمی ہوتے۔ ان کے علاوہ کچھ ایسے لوگ تھے جو بظاہر زندگی کے ایسے شعبوں سے تعلق رکھتے تھے جن کا ادب اور آرٹ سے کوئی تعلق نہ تھا مگر وہ ادب اور آرٹ کے سرپرست سمجھے جاتے تھے۔ پھر بعض متفرق قسم کے افراد، جو نہ معلوم کیوں، کب اور کس طرح مجتمع ہو کر گروپ میں در آئے تھے مگر اب اس کا جزو بن چکے تھے۔

آزادی سے پہلے ہم لوگ عموماً مختلف ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں بیٹھتے تھے۔ آزادی کے بعد جب پرانی قدریں بدلنے لگیں تو شہر کے بڑے کلب کے دروازے بھی ہم پر کھل گئے۔ جب یہ دروازے کھلے تھے تو یوں محسوس ہوا تھا جیسے ہم پر جنت کے دروازے کھل گئے ہوں۔ ہم میں سے بعض کو آزادیٔ وطن کی تمنا ہی محض اس لئے تھی کہ بڑے کلب میں داخل ہونے کی آزادی مل سکے گی مگر جب وہاں داخل ہوئے تو بہت جلد باہر نکلنے کی آرزو نے بے چین کر دیا۔ کلب کے خلاف ہمارے گروپ میں ہزاروں اعتراضات پیدا ہو گئے۔ ہزاروں تو خیر میں نے یونہی اجمالاً کہہ دیا۔ تفصیل میں موٹے موٹے اختلافات چار پانچ سے زیادہ نہ تھے مگر ہاں غم و غصہ ہزار ہا اختلافات سے بھی زیادہ تھا۔ اس پر گروپ کا "قومی مزاج" کچھ اس قسم کا کہ ہم کسی ایک اختلاف پر بھی کلب کو توڑ کر پھر اسی دلیرانہ جا بیٹھتے جہاں سے کچھ پہلے کلب کے جگمگاتے ہوئے چھری کانٹوں کو دیکھا کرتے تھے۔

ہمارے نقطۂ نگاہ سے بڑے کلب میں بعض بہت بڑی قباحتیں اصلاح طلب تھیں۔ بنیادی قباحت کلب کا معیار تھا جو اتنا اونچا نکل گیا تھا کہ زندگی کلب سے باہر چلی گئی تھی۔ کم از کم قومی سانچے میں ڈھلی ہوئی جس بھرپور مخلصانہ زندگی کو ہم سینے سے لگائے پھرتے تھے وہاں اس کے تصور کی بھی گنجائش نہ تھی۔ فرنگی تو فرنگی، خاص اپنے لوگوں کا یہ عالم تھا کہ ابھی تک یورپ سے واپس نہیں آئے تھے۔ جو یورپ نہیں جا سکے تھے وہ پانی کے جہاز میں بیٹھے تھے۔ یہ لوگ عموماً موسم اور کلچر پر بحث کرتے تھے جو ہوتے ہوتے اس قدر آسان ہو چکی تھی کہ صاحب لوگوں کے اٹھ جانے کے بعد بیرا لوگ بھی موسم اور کلچر پر بحث کر لیتے تھے۔ یہ لوگ ایران کے قالین و سموور سے واقف تھے مگر ایران کے حافظ و سعدی سے بے خبر۔ نہ ہم میں سے ضرور تھے مگر ہماری طرح کے ہرگز نہیں تھے۔

کلب کے مشروبات و ماکولات میں سے بیشتر چیزیں عقیدہ و توفیق کی مجبوریوں کے باعث ہماری دلچسپی سے خارج تھیں۔ ایک سے ایک بڑھیا اور مفرح دیسی شربت بازار میں موجود تھا مگر بوتلوں کی صورت ایسی واہیات تھی کہ ان کے بارپانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ مشکل سے اجنبی ناموں والے درجنوں قسم کے کھانے وہاں ضرور مل جاتے تھے اور ان میں سے بعض یقیناً مزیدار بھی تھے مگر ان لاطینی کھانوں کے ساتھ جب تک پیرس کے "الجزائر کلب" کی چہل پہل پر تبصرہ نہ کیا جائے یوں محسوس ہوتا گیا ہم کھانے کو نہیں۔ کھانا ہمیں کھا رہا ہے۔ ادھر اپنا یہ عالم کہ پاس کچھ اپنے بجز نعرۂ تکبیر نہیں، لے دے کے ترنم کے ساتھ اشعار پڑھ سکتے تھے، سو اس میں یہ بجوگ آ پڑا تھا کہ چھری سے

کاٹ لینے کے بعد لوالے کا پرزہ کاٹنے کی نوک پرانی مدت تک ٹک ہی نہ سکتا کہ آدمی اطمینان سے شعر سنا سکے یا جھوم سکے۔

شیروانی کے تذکرے سے یہ نہ سمجھئے کہ ہیئت و صورت کی قید لوٹل ہی تک محدود تھی۔ ممبروں پر لازم تھا کہ وہ اچھی وضع قطع کے ساتھ کلب میں آئیں۔ انسان اندر چاہے جیسا کچھ بھی ہو، لباس ضرور عمدہ ہو۔ لوٹل شربت سے زیادہ اہم تھی۔ آزادی کے بعد اگرچہ کلب کے قوانین شیروانی پاجامے پر بھی اتر آئے تھے مگر ہم پر یہ پابندی بھی سخت گراں تھی۔ گروپ کے اصحاب الرائے کے نزدیک تفریح کو اگر لباس میں جکڑ دیا جائے تو چہرا چمک اٹھتا ہے، روح مرجاتی ہے۔ اختلاف فروعی نہیں اصولی تھا۔ جہاں عام لوگ لباس کو زینت سمجھتے تھے وہاں ہمارے "مردانِ حُر" اس کو زحمت و مشقت گردانتے تھے ؎

کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالہ کی حنابندی

انتظامیہ کو ایک مرتبہ خیال آیا شاید یہ لوگ گھر سے آئینہ دیکھ کر نہیں نکلتے۔ اس پر کلب کے برآمدے میں دو تین قدِ آدم آئینے نصب کر دیئے گئے مگر فن کا ممبر جب آئینے میں اپنی ہیئت دیکھ کر اس پر الٹا اظہارِ اطمینان کرنے لگے تو دوسرے ممبر مارے حیرت کے آئینہ بن گئے۔

مغربی رقص و موسیقی کا معاملہ بھی عجیب تھا۔ جب تک ہم کلب کی بیرونی دیواروں پر سے دیکھتے، سنتے تھے، یہی رقص یہی موسیقی ایک آسمانی نعمت معلوم ہوتی تھی۔ قریب پہنچے تو اس رقص و موسیقی سے جان چھڑانا مشکل ہو گیا۔ رقص میں تو خیر پھر بھی ایک کیفیت تھی لیکن موسیقی نہایت وحشت آمیز ثابت ہوئی۔ رقص کے کسی نقطہ پر جب ذرا محظوظ ہونے لگتے تو گروپ کے بعض ممبر، جو انتظامِ حکومت میں تو کوئی آواز نہیں رکھتے تھے مگر اپنی جگہ نظامِ حکومت کا پورا فلسفہ منضبط کئے بیٹھے تھے، اس سرور کو فسق و فجور کی تعریف میں لے آتے۔

ایک مرتبہ ہم نے کلب میں اردو ڈرامہ کھیلنے کی تجویز پیش کی تو دوسرے ممبروں نے تجویز کے ساتھ ہمیں بھی حقارت کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا۔ بہت زور دینے پر اس شرط کے ساتھ اجازت ملی کہ اول پروگرام دو گھنٹے سے زیادہ نہ ہو اور ثانیاً پروڈکشن کی نگرانی بوڑھی مس شیپ شینک کے سپرد ہوگی تاکہ کلب کی شہرت پر حرف نہ آنے پائے۔ اپنے کلچر کی خدمت کے خیال سے ہم نے یہ شرط بھی قبول کر لی مگر کلب کے ہموار و ناہموار، متضاد و متصادم رجحانات کے طفیل تجویز کا بقول شخصے وہی حشر ہوا کہ ؎

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے!

ہوا یہ کہ پہلے تو سرے سے کوئی ایسا ڈرامہ ہی ملنے میں نہ آیا جو ڈرامہ بھی رہے اور دو گھنٹے کیا معنی چار گھنٹے میں بھی ختم ہو سکے۔ ناچار گروپ کے ایک تمثیل نگار نے جو مقامی آغا حشر کے لقب سے مشہور تھے، جہانگیر اور نورجہاں کے تاریخی معاشقے کے تار و پود پھیلا کر خود ہی ایک ڈرامہ تصنیف کر ڈالا۔ "شانِ جہانگیر عرف کابلی معشوقہ"

مصنف آخر ڈرامہ نگار ہی تھا مورخ نہ تھا اس لئے ڈرامہ میں بعض تاریخی غلطیاں رہ گئی تھیں تاہم بحیثیت مجموعی ڈرامہ ایسا برا بھی نہ تھا۔ البتہ پرجوش مصنف نے مغلوں کی عظمت و شوکت اور رنگینی پر جو دریا دلی صرف کی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سات آٹھ قلعوں، پندرہ بیس جرنیلوں اور تیس چالیس پری جمال کنیزوں کے بغیر جہانگیر ٹہلنے پر بھی آمادہ نہ ہوتا تھا۔ مزید برآں اکبر کو تو خیر وہاں ہونا ہی چاہیے تھا مگر تمہید کے طور پر بابر اور ہمایوں، بیرم خاں اور کوئی میرزا کوکا بھی اسٹیج پر چلے آتے تھے۔ جہانگیر کے دربار میں استاد عرفی اور طالب آملی کا مشاعرہ بھی دکھایا گیا تھا کہ ؏

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر!

شیپ شینک بڑی ذہین خاتون تھیں۔ مدتوں لندن کے ایک مستانہ تھیٹر میں کام کر چکی تھیں۔ ہم نے اپنے ڈرامے کا پس منظر، کاسٹ اور مطالبات ان کے سامنے رکھے تو بھونچکا سی رہ گئیں۔ دانتوں میں انگلی دباتے ہوئے بولیں۔ یہ ڈرامہ تو شہنشاہ جہانگیر کی ذاتی سرپرستی ہی میں کھیلا جا سکتا ہے۔ کاسٹ کی وضع قطع متعین کرنے کے لئے ہم نے مغلوں کی جو تصویریں پرانے کیلنڈروں میں سے کاٹ کر جمع کی تھیں ان سے بیچاری شیپ شینک کو یہی سمجھ میں نہ آتا کہ ان میں بابر کون ہے اور جہانگیر کون؟ کاسٹ کے لئے ملے جلے کردار اکھٹے کئے گئے تو ہر خاتون نورجہاں بننے پر مصر تھی۔ ریہرسل شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ کانونٹ سکولوں میں پڑھی ہوئی یہ بیبیاں ڈرامے کے پرشکوہ مکالمے ادا کرنے تو درکنار ٹھیک سے پڑھ بھی نہیں سکتیں۔ ماحصل یہ کہ ایک دن ہم جس نورجہاں کو گھیر گھار کر لاتے مکالموں کے خوف سے وہ دوسرے دن بھاگ جاتی۔ جہانگیر موجود، نورجہاں غائب۔ ایک نسبتاً قدامت پسند کنبے کی قدرے روشن خیال لڑکی درمیان میں ایسی بھی مل گئی تھی جو

اردو بے تکلف پڑھ بول سکتی تھی مگر اسے جہانگیر کا بانا۔ انداز میں لپک لپک کر نور جہاں کی طرف پیش قدمی کرنا سخت ناگوار تھا۔ وہ صرف کسی ایسے مرنجاں مرنج جہانگیر کو برداشت کر سکتی تھی جو دربار لگانے کے بجائے بازار میں خوانچہ لگاتا ہو۔

خارجی موانع کے علاوہ رفتہ رفتہ داخلی شاخسانوں نے بھی سر اٹھانا شروع کیا۔ ایک ریسرچ اسکالر نے اعتراض کیا کہ یہ جو پورے چھ فٹ کا جہانگیر ٹہلنے کو چھوڑ دیا گیا ہے، ان انچ لغو ہیں ہے۔ فرشتہ کے بیان کے مطابق جہانگیر کا قد پانچ فٹ سے زیادہ نہ تھا۔ ہمارے لئے یہ مشورہ بوجوہ ناقابل عمل تھا، پانچ فٹ کا جہانگیر دیکھ کر پوری قوم کے احساسات مجروح ہوتے تھے۔ پانچ فٹ کے جہانگیر کی عظمت بحال رکھنے کے لئے پونے پانچ پانچ فٹ کے مان سنگھ اور شائستہ خاں اور رخانی خاں کہاں سے پیدا کرتے؟

پورے میک اپ کے ساتھ ریہرسل ہو رہا تھا کہ اتفاقاً اس روز کرنل فردوسی تشریف لے آئے۔ کرنل صاحب کا نام تو کچھ اور تھا مگر ایران میں مدت تک رہنے نیز فارسی ادبیات سے گہرے شغف کے باعث دوستوں کے حلقے میں وہ کرنل فردوسی کے نام سے مشہور تھے۔ ریہرسل میں جب عرفی اور طالب آملی عصا ٹیکتے ہوئے اسٹیج پر نمودار ہوئے تو کرنل صاحب نے پوچھا:

"دوہری کمر والے یہ سفید ریش بزرگوار کون ہیں؟"

"ملک الشعرا استاد عرفی"

"ہائیں!" کرنل صاحب بیتاب ہو کر اچھل پڑے "یہ عرفی ہے؟ کیسا عرفی! ارے کونسا عرفی ہے یہ؟"

"جی! نہیں طالب آملی والا عرفی" مصنف نے جواب دیا۔ "وہی۔ آوازِ سگاں کم نہ کند رزقِ گدارا۔ والا عرفی۔"

"غالباً کرنل صاحب کو عرفی کی لمبی رومی کلاہ پسند نہیں آئی"۔

"فکر کا بات نہیں" مس شیپ شینک خرابی کا اندازہ کرتے ہوئے بولیں۔ "ہم اس کا ڈاڑھی اور لمبا کر دے گا"

"نہیں سمجھے!" کرنل فردوسی بڑے کرب کے ساتھ بولے۔ "ظالمو! یہ کیسا لبِ گور قسم کا عرفی گھڑ لائے ہو۔ ارے میاں! عرفی تو ایک روایت کے مطابق اڑتیس اور دوسری کے مطابق انتالیس برس کی عمر میں مر بھی چکا تھا؟"

"مگر حضور سنئے تو" مصنف اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔ "غمِ جاناں و غمِ دوراں میں سے کسی چیز نے بیس ہی برس میں عرفی کی کمر دوہری اور بال سفید کر دیئے تھے"۔

"جی ہاں" ایک شاعر صاحب بولے۔ "خیال رہے کہ عرفی شاعر تھا فوج کا حوالدار میجر کالا خان نہ تھا کہ ستر برس کی عمر میں بھی تیر کی طرح سیدھا رہتا" "پھر یہ بھی ہے۔ ایک دوسرے ممبر نے مصرع اٹھایا۔ کہ شاعر جتنا غلط بنے اتنا ہی صحیح بنتا ہے"۔ "فکر کا بات نہیں"۔ مس شیپ شینک کرنل فردوسی کے اعتراض کو سمجھتے ہوئے بولیں۔ "عرفی کا ڈاڑھی ہم شائستہ خاں کو لگا دیگا"۔

"ہاں! یہ ٹھیک رہے گا" کرنل صاحب نے اطمینان کا سانس لیا۔ "شائستہ خاں کا اس میں بگڑتا ہی کیا ہے۔ مگر عرفی کے معاملہ میں تاریخ کی صداقت مسخ ہوتی ہے۔ بھئی میں طہران کی نیشنل گیلری میں عرفی کی تصویر دیکھ چکا ہوں"۔ کرنل صاحب بات کرتے کرتے اسٹیج پر چلے گئے اور عرفی بنے ہوئے کیپٹن خواجہ امین کو غالباً پہچان کر افسرانہ تحکم کے ساتھ بولے "عرفی ڈاڑھی کے بغیر ہوگا اور آدمیوں کی طرح سیدھا چلے گا — اٹن شن!" — اور بیچارہ عرفی ایڑی سے ایڑی ملا کر اٹن شن کھڑا ہو گیا۔

مس شیپ شینک عرفی کی لمبی سفید ڈاڑھی نوچ کر شائستہ خاں کے لگا رہی تھیں کہ گرد و پیش کے" ابن بطوطہ" شیخ مصباح الدین، مولوی عبدالحلیم شرر کا کوئی ناول بغل میں دبائے اندر داخل ہوئے اور بوڑھے شائستہ خاں کو دیکھتے ہی تڑپ اٹھے۔ پہلے زور سے ایک نعرۂ تکبیر بلند کیا، پھر گرج کر بولے:

"خبردار! شائستہ خاں کے ساتھ یہ ناشائستگی؟ فاتح گو لکنڈہ کے ساتھ یہ مذاق؟ غازی شائستہ خاں وہ بطلِ جلیل اور رندِ بدکبیر تھا کہ مغل اعظم محی الدین اورنگ زیب عالمگیر بھی اس کی تلوار کی قسم کھاتا تھا"۔

اس بھبک پر سہم کر جب لوگ ذرا سنبھلے تو کسی نے ڈرتے ڈرتے کہا:

"مگر میاں صاحب! شائستہ خاں بوڑھا بھی تو ہو سکتا ہے"

"نہیں۔ ہرگز نہیں" میاں مصباح الدین کڑک کر بولے۔ "مردانِ غازی مر سکتے ہیں، بوڑھے نہیں ہو سکتے۔"

"کیوں نہیں ہو سکتے؟"

"بس نہیں ہو سکتے، کہہ تو دیا"

اس پر مس شیپ شینک نے شائستہ خاں کی ڈاڑھی جڑ سے اکھاڑ کر

جہانگیر کے خزانچی لالہ لوبت رائے کی ٹھوڑی پر جما دی۔ یہ جھگڑا پوری طرح طے نہیں ہوا تھا کہ کرنل فریدی نے پائپ سلگاتے ہوئے ایک نیا شگوفہ یہ چھوڑ دیا کہ عرفی اور طالب آملی دونوں بیک وقت جہانگیر کے دربار میں کبھی یکجا نہیں رہے۔ ان کے علم کے مطابق دونوں شاعروں میں سے کوئی ایک جہانگیر کے عالم شہزادگی ہی میں مر چکا تھا۔ اب یہاں عرفی و طالب کو یکجا دیکھ کر کرنل صاحب کی خفگی کا یہ عالم تھا کہ اگر انہیں اجازت دی جاتی تو وہ عرفی و طالب میں سے کسی ایک کو اسی وقت گولی سے اڑا دیتے۔ بذات خود یہ کوئی ناقابل حل دشواری نہ تھی۔ مس شیپ شینک نے نہایت ٹھیک کہا تھا کہ عرفی یا طالب یا دونوں کے نہ ہونے سے جہانگیر کی حکومت پر کوئی اثر نہیں پڑتا لیکن اگر شاعر دربار کے بغیر دربار سجتا ہی نہیں، تو قرعہ اندازی کر لو۔ مگر اتنے میں ادھر عرفی اور طالب کے حامیوں کے جذبات اس قدر مشتعل ہو چکے تھے کہ اب یہ سوال عرفی و طالب میں سے کسی ایک شاعر کے انتخاب کا سوال یا ڈرامے کی کسی انتظامی سہولت یا ضرورت کا معاملہ نہیں رہ گیا تھا بلکہ مغلوں کی پوری تہذیب و ثقافت کا مسئلہ بن چکا تھا۔ رفتہ رفتہ فریقین کے جذبات اتنے کھول اٹھے کہ خود "ظل ہمایونی عالم پناہ شہنشاہ جہانگیر" یعنی مسٹر الطاف لودھی تاج سلطانی اور جیغہ خسروی کو ایک طرف ٹیک کر اس بحث میں کود گئے جس کا خلاصہ یہ نکلا کہ اس صحبت میں ڈرامہ کھیلنے کا فیصلہ ہی ترک کر دیا گیا۔

ڈرامہ کی ناکامی کا ہمارے گروپ پر نہایت گہرا اثر پڑا۔ ناکامی کی تمام تر ذمہ داری اگرچہ خود ہمیں پر عائد ہوتی تھی مگر چونکہ اپنے آپ کو مطعون کرنے کی بہ نسبت دوسروں کو الزام دینا ہمیشہ آسان ہوتا ہے لہذا ہم لوگ کلب سے بیزار ہو گئے۔ اس واقعہ کے بعد ہم اس قطعی نتیجہ پر پہنچ گئے کہ غلامی کے زمانہ میں اندر ہی اندر ہماری قوم کے صاف دو ٹکڑے ہو چکے ہیں۔ ایک یہ لوگ جو کلبوں اور جمخانوں میں پروان چڑھتے رہے۔ ایک ہم لوگ جو گلیوں اور کوچوں میں گھومتے پھرے۔ صدیوں کے بعد دونوں ٹکڑے اب اس کلب میں جوڑے جا رہے تھے مگر اے کاش ذہنوں کی مسافت میلوں میں ناپی جا سکتی! استاد عرفی اور طالب آملی میں سے کوئی ایک یقیناً بہت پہلے مر چکا تھا۔

بڑے کلب سے نکل کر گروپ نے ایک نئے کلب کی بنیاد رکھ دی "آزاد کلب"۔ آرزو یہ تھی کہ نئے کلب میں اپنے قومی و تہذیبی نقوش کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کیا جائے۔ مساوات و آزادی اس کلب کے بنیادی پتھر تھے۔ مگر چونکہ اس سے پہلے گروپ کو کسی چیز کی بنیاد رکھنے کا کوئی تجربہ نہ تھا لہذا آزاد کلب کی بنیاد آزادی سے زیادہ بے قاعدگی پر جا پڑی۔ آزاد کلب کی رکنیت اور انجمن خدام الاسلام کی رکنیت میں کوئی فرق نہ تھا۔ ظاہر ہے اس قسم کا کلب کا چلنے میں نہیں آتا یا سمجھنے میں نہیں آتا۔

کلب کا پورا ڈھانچہ امداد باہمی پر استوار کیا گیا تھا۔ ممبروں کو چندہ ادا کرنے سے پہلے اپنے حصہ کی کرسی "ادا" کرنا پڑتی تھی۔ مگر ایک مدت تک تو کرسی کے علاوہ کسی نوع کا کوئی چندہ تھا ہی نہیں۔ کلب کی اپنی عمارت ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ہم اس سے پہلے کئی کلبوں کا حشر دیکھ چکے تھے کہ جب ان کی اپنی عمارت بن گئی تو خود کلب ٹوٹ گئے۔ یوں بھی آزاد کلب کو کسی مقام کا پابند کر دینا چہ معنی دارد۔ چنانچہ ابتدا میں کلب کو کبھی شہر کے ایک اسکول میں رکھا گیا کبھی دوسرے میں۔ جب تقریباً تمام اساتذہ اور طلبا سے کلب کے شاعروں، فن کاروں کے تعلقات کشیدہ ہو گئے تو آزاد کلب کو ایک افغان ہوٹل سے ملحق سفید زمین کے ایک کشادہ قطعہ میں لا کر اس طرح چھوڑ دیا گیا کہ

> پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
>
> اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

اتفاق دیکھئے کہ کلب کی جڑیں اسی زمین میں سرسبز ہوئیں۔ قبولیت کا وہ دور نہیں آ کر شروع ہوا جو شروع ہو کر پھر تھمنے میں نہیں آتا۔ چائے، قہوہ، شربت وغیرہ طلب کرنے پر افغان ہوٹل سے نقد و ادھار آ جاتے تھے۔ کرسیاں افغان ہوٹل کا زندہ دل اور شاعر مزاج مالک رانجھا خاں رانجھا رات کو سمیٹ کر ہوٹل میں رکھ دیتا تھا۔ کھیل کود سے ممبروں کو کوئی خاص رغبت نہ تھی۔ وہ یہاں محض بیٹھنے اور خالص گپ لڑانے کے لئے آتے تھے۔ تاہم بیٹھ کر کھیلے جا سکنے والے بعض معروف کھیلوں کا اہتمام بھی موجود تھا۔ افغان ہوٹل کا مستعد ریڈیو ہوٹل کے گاہکوں، سڑک کے راہگیروں اور آزاد کلب کے ممبروں کی خدمت میں ہمہ وقت مصروف تھا اور کیا چاہتا ہے دیوانے!

رکنیت پر کوئی خاص قید نہ تھی۔ صلائے عام تھی یاران نکتہ داں کیلئے۔ چند ہی دنوں میں آزاد کلب کی جغرافیائی اور معنوی سرحدیں افغان ہوٹل سے جا ملیں۔ بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہو گئے۔ بذات خود

یہ بری بات نہ تھی مگر مصیبت ایسے بُرے طریقے سے ہوئی کہ دیکھنے والے تو دیکھنے والے خود ممبروں کو معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ یہ آزاد کلب چل رہا ہے یا افغان ہوٹل۔ "بندہ و صاحب و محتاج و غنی" ایک نہیں ہوئے تھے، تاہم گتھم گتھا ہو گئے تھے۔ شاعروں کی منڈلی کسی میز پر میر تقی میر کو لئے بیٹھی ہے کہ کسی موٹے تازے بیوپاری نے اپنا حقّے کا کستر لا کر عین میر تقی میر کے سر پہ رکھ دیا۔ شعرا کو ہی سے، نلکی والے کو میر تقی میر سے کوئی واسطہ نہیں مگر کلب سے دونوں کا واسطہ ہے۔ شامت کا مارا کوئی افسر اپنے ادب و تمدن کے عشق میں گرفتار آزاد کلب میں آ نکلتا تو راشن کے ڈپو ہولڈروں، عام دکانداروں اور شہر کے پیشہ ور خوش آمدیوں کا ایک ہجوم اس غریب کو یوں گھیر لیتا جیسے بچوں کی کسی بستی میں کوئی ریچھ والا آ نکلا ہو۔

یہ بات نہ تھی کہ آزاد کلب شہر کے معززین کی سرپرستی سے یکسر محروم تھا۔ ہاں یہ بات ضرور تھی کہ جو شرفا ہمارے ساتھ ہیں آئے تھے۔ ان میں سے بیشتر کچھ اس موڑ پر بکھرے تھے جہاں دولت و شرافت کے راستے الگ ہو جاتے ہیں اور ذہن و فکر کی پابندی راستہ ہی چھوڑ دیتی ہے۔ ان میں سے بعض رئیس زادوں کی قسمت پر اول اول ہمیں بڑا ناز آتا کہ دیکھو منہ میں چاندی کا چمچہ لے کر پیدا ہو گئے ہیں اور دیکھیے کیا مزے کر رہے ہیں۔ قریب سے دیکھا تو محسوس ہوا کہ ان سے زیادہ قابلِ رحم حالت شاید کسی کی نہ ہو۔ انہیں سرے سے یہی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ زندگی کے بے معنی خلا کو پورا کیونکر کیا جائے؟ جو قدرے ہوشمند تھے انہوں نے سیاست کا چسکا پال رکھا تھا۔ بعض عالی ظرف انتخابات کے معرکے جیتنے کے لئے نہیں ہارنے کے لئے لڑتے تھے۔ وزارت بڑے کلب میں تھی، جمہوریت آزاد کلب میں۔ جلسہ کہیں بھی ہو نعرے کی گونج یہیں سے پھوٹتی تھی۔

ہمارا گروپ اس صورتِ حال پر سخت پریشان تھا۔ ہم جس مقام کو ایک مجلسی و تہذیبی مرکز بنانے کے خواب دیکھ رہے تھے وہ کہیں چوپڑی گھسیٹے کی بیٹھک بن گیا تھا اور کہیں راجہ بازار۔ رئیسانہ بیٹھے حقہ پی رہے ہیں، چمڑے ہڈی وغیرہ کے تاجر مول تول کر رہے ہیں، نمک ہلدی کے بیوپاری نمک ہلدی کے نمونے بھی ساتھ اٹھا لائے تھے۔ لباس، وضع قطع، تہذیب وغیرہ سب کا دامن تار تار ہو کر کلب میں بکھرا پڑا تھا۔ اردو شاعری میں جس چاک گریباں کا ذکر آیا ہے اس کی بھی ایک صورت ہوتی ہے۔ یہاں وہ صورت بھی نہ تھی۔ آزاد کلب میں لیڈری کی جا سکتی تھی،

بازار سے سودا سلف خریدا جا سکتا تھا، لیکن نکھری ہوئی مجلسی زندگی کے ملنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ زندگی خود زندگی میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔

سب سے برا حال شعرائے کرام کا تھا۔ شعر سے زیادہ ان کا اپنا قافیہ تنگ تھا۔ غزل پہ غزل ہو رہی ہے مگر کلب میں سننے والا کوئی نہیں، سن کر سمجھنے والا کوئی نہیں، سمجھ کر داد دینے والا کوئی نہیں۔ الگ تھلگ ہو کر شعر بازی کرتے ہیں تو دوسرے لوگ کلب کے اس بیجا و غلط استعمال پر معترض ہوتے ہیں، بعض برملا ہنستے بھی ہیں۔ ادھر یہ آرزو کہ شام کو "مطلع" شروع ہو تو "مقطع" صبح کی خبر لائے۔ ادھر یہ قصد کہ غزل کا سانس مطلع ہی میں گھونٹ دیا جائے۔ وہاں نمونۂ کلام سے زیادہ نمونۂ اجناس کی مانگ تھی۔

لپٹن کمپنی والے ایک زمانہ میں اپنے برانڈ کے فروغ کے لئے لوگوں کو مفت چائے پلایا کرتے تھے۔ آزاد کلب میں ذوقِ سخن کا راستہ صاف کرنے کی غرض سے ہم نے ایک مشاعرے کا بندوبست کیا جو بدقسمتی سے بڑے کلب کے ڈرامے سے بھی زیادہ ناکام رہا۔ جوش و خروش کی کمی نہ تھی۔ جوش و خروش اگر کم ہوتا تو مشاعرہ شاید کامیاب ہو جاتا۔ کلب کے عام ممبروں نے مشاعرہ کو کسی میلے پر ہونے والا مجرا یا اس کے لگ بھگ کوئی تماشہ سمجھ لیا۔ وہ نہ صرف خود جوق در جوق تشریف لائے بلکہ محلے میں سے دوستوں، رشتہ داروں کو بھی فوج در فوج پکڑ لائے۔ یہ بظاہر، حوصلہ افزا علامت تھی مگر دراصل یہ اس قسم کی تعمیر تھی جس میں خرابی کی صورت مضمر ہوتی ہے۔ جمہوریت کی طرح مشاعرہ بھی ان پڑھ لوگوں کے بس کی چیز نہیں۔ آپ مبالغہ سمجھیں گے مگر میں واقعہ بیان کر رہا ہوں کہ جس وقت سیکریٹری نے مشاعرہ کی کارروائی شروع کرنے کی غرض سے مشاعرہ گاہ پر جائزہ لینے والی ایک نظر ڈالی تو سرسری اندازے کے مطابق سامعین اور سامعین کے حقّوں کی تعداد تقریباً برابر تھی۔ شعرا کی گنتی بھی اگرچہ بہت کافی تھی لیکن ان بیڑیوں سے کم ہی تھی جنکو بیڑی بازی کے دلدادہ معززین مٹھی میں دبائے ہوئے مشاعرہ سننے چلے آئے تھے۔ شعرا ان سامعین کو دیکھ کر ہی لرز اٹھے لیکن حضرتِ داغ کی پیروی میں جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے۔ یہاں تک پھر بھی غنیمت تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہی احتمال تھا کہ سامعین ڈھنگ کی داد نہیں دیں گے مگر کم از کم یہ اطمینان تو تھا کہ وہ کلام میں سے شتر گربہ وغیرہ بھی نہیں پکڑ سکیں گے۔ لیکن مشاعرہ شروع ہونے پر خدا معلوم سامعین

(باقی صفحہ ۵۸ پر)

انسانی نشوونما کے اسباب :- بقیہ صفحہ ۳۰ سے

انہ ہوتے رہیں۔ ان کی تقویت ایک اور بُعد سے ہوسکتی ہے۔ اور وہ ہے نصب العین قائم کرنا اور ان کے حصول کی کوشش کرنا۔ یہ نصب العین زیادہ غیر محدود نہیں ہونے چاہئیں۔ مثلاً ملی ارتقا، اسلامی احیاء یا عالمگیر برادری۔ یہ سب اسقدر غیر محدود اور تجریدی قسم کے ہیں کہ ان سے شدید جذبات نہیں پیدا ہوسکتے۔ ان پر نہ زیادہ فلسفہ آرائی کارآمد ہے نہ ان کی تلقین و ہدایت، کیونکہ یہ روح کو بھا نہیں سکتے۔ قومی ضروریات ہی وقتاً فوقتاً مقاصد کو جنم دیتی رہتی ہیں۔ ور سب سے زیادہ شدید ضرورتیں وہ بہترین مقاصد پیدا کرتی ہیں جو کسی قوم کو اتحاد کی ترغیب دلا سکتے ہیں۔

مقاصد اس وقت تک کچھ نہیں جب تک وہ روح پر حاوی ہو کر عمل کی تحریک نہ دلائیں۔ علامات، نعرے، بول بے اندازہ قوت کے مالک ہیں اور خون کی حرارت سے بھی زیادہ قوی ہیں۔ اگر غالب اقلیت انہیں احتیاط اور سوجھ بوجھ سے استعمال کرے اور یہ اس کے ہاتھ سے نکل کر دوسرے فرقوں اور پارٹیوں کا آلۂ کار نہ بن جائیں تو یہ عمل کے قوی محرکات ثابت ہوں گے۔ اور قومی مقاصد کے حصول میں مدد دینگے۔

اتحاد کی تیسری بُعد یا کیرگی ول ہے یعنی طبقاتی اور قبائلی امتیازات کے زہریلے عناصر سے آزادی۔ اسلامی تمدن پہلا تمدن ہے جسے یہ شرف حاصل ہے کہ اس نے اس بُعد کا ادراک کرکے رنگ و خون اور نام و نسب کے امتیازات کو ملیا میٹ کر دیا۔ اتحاد کی ایک اور بُعد افراد اور قوم کے چھوٹے چھوٹے گروہوں کے مابین رضامندانہ تعاون ہے۔ ڈارون کا یہ خیال غلط تھا کہ صرف کشمکش حیات ہی ارتقا کا واحد باعث ہے۔ یہ عمل ارتقا کا ایک عنصر ضرور ہے۔ لیکن ایک اور اتنا ہی اہم عنصر تعاون ہے جس کے معنی ہیں ذاتی مفاد کو دوسروں کے مفاد سے وابستہ کرنا اور برضا و رغبت ایک مشترکہ جدوجہد میں شریک ہونا۔ صرف وہی قومیں برقرار رہ سکتی ہیں جو سب سے زیادہ شہری اطاعت سے کام لیں اور بہترین ادارے قائم کریں جن میں باہمی تعاون سے کام کیا جا سکے۔ اور ان کے اراکین میں زیادہ سے زیادہ جذبۂ ایثار پیدا ہو۔ شہروں میں رضامندانہ تعاون نسبتاً آسان ہے۔ تجارت اور صنعت کے ساتھ یہ بھی ترقی کرتی ہے۔ لیکن صرف یہی کافی نہیں۔ دیہات کو بھی اس کے دائرہ میں شامل کرنا چاہئیے۔ اجتماعی ارتقا کی موجودہ حالت میں دیہات کے سلسلہ میں جدوجہد بھی ارتقا کے لئے اتنی ہی ضروری ہے۔ اجارہ داروں کا مقابلہ کرنے کے لئے صنعت کاروں، صارفین اور بیوپاریوں میں تعاون لازمی ہے۔

جہاں اتحاد کا تعلق قومی وحدت سے ہے وہاں جمعیت کا تعلق کثرت سے ہے لیکن ایک خاص رنگ میں۔ اس کے معنی ہیں کسی جماعت کے اراکین میں مفادات، ہمدردی، مقاصد اور تعلقات کی ہم آہنگی اور جماعت کے ساتھ وفاداری کا جذبہ جو مختلف مشترکہ احساسات کی شکل میں ظاہر ہو۔ جس جماعت میں جمعیت نہ ہو اس کے جنگ میں ہار جانے کا سب سے زیادہ اندیشہ ہوتا ہے گو جنگ میں یکا نگت بھی پوری یکانگت نہیں۔ کیونکہ جہاں جنگ ساری جماعت میں اطاعت، ضبط، خدمت اور ایثار کو ترقی دیتی ہے وہاں یہ بالاکثر دوسرے لوگوں کے حقوق اور جماعت میں افراد کی حیات اور شخصیت کو نظر انداز کرنے کا باعث بھی ہوتی ہے۔ اس قسم کی کامل یکانگت جو اسلام کے ابتدائی زمانہ میں ظہور پذیر ہوئی تھی۔ ان حقوق کو نہ امن کے زمانہ میں نظر انداز کرتی ہے، نہ جنگ کے زمانہ میں۔

استقلال کے معنی ہیں ایک جماعت اور ارد گرد کی دوسری جماعتوں کے مابین قوتوں کا توازن جو کئی شرائط پر موقوف ہے۔ یونانی تہذیب، رومن سلطنت اور اسلامی خلافت کے زوال سے جو سبق حاصل ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ کسی قوم کو مختلف اکائیوں میں نہیں بٹ جانا چاہئے بلکہ ایک کمزور مرکز نے ڈھیلے ڈھالے طور پر آپس میں جوڑ رکھا ہو۔ اور موجودہ فرانس سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ جس ملک میں حد سے زیادہ مرکزیت ہو اسے کبھی استقلال نہیں ہوسکتا۔ زیادہ تغیرات استقلال کے منافی ہیں۔ ایسی مملکت جو ایک جمہوریہ بن سکے لیکن اتنی خوش قسمت نہ ہو کہ وہ برطانیہ کی طرح ایک جمہوری روایت قائم کرے۔ اس کے لئے امریکی وضع کا دستور یہ غالباً سب سے زیادہ استقلال کا باعث ہوگا۔ جس میں غیر سیاسی عدلیہ کا اہتمام کیا گیا ہو۔

استقلال کی دوسری شرط عام خوشحالی پیدا کرنا ہے تاکہ قوم کے مختلف طبقوں میں منافست نہ رہے یعنی نہ امیر زیادہ امیر ہوں نہ غریب زیادہ غریب، اہل امریکہ پر اشتراکیت کا کوئی اثر نہیں جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہاں کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ تنخواہوں کا فرق تمام ملکوں سے کم ہے۔ غالباً

۱ اور ۸ کا فرق۔ حالانکہ روس میں بھی، اگر ہماری معلومات درست ہیں، ۱ اور ۲۰ کا فرق ہے۔

تیسری شرط یہ ہے کہ آبادی قابو میں رہے تاکہ آبادی اور غذائی پیداوار میں توازن قائم رہے۔ آخری شرط یہ ہے کہ صحت، کام، کھیل کود اور آزاد اقدام کا مناسب اہتمام ہو۔ سچ پوچھئے تو استقلال اسی ملک کو نصیب ہوتا ہے جس میں کوئی بھوکا نہ رہے، جہاں بیمار کم ہوں، کام خوشگوار مگر زیادہ نہ ہو، ہمدردی عام ہو اور انسانی خوف سے آزاد ہوکر آنکھوں کانوں اور دل کا حظ حاصل کریں۔

مساوات، حریت اور کاروبار میں آزاد اقدام تین اور اعلیٰ درجے کے اجتماعی عوامل ہیں جو ارتقا کا باعث ہیں۔ لیکن ان میں مساوات سے ٹکرا جانے کا میلان پایا جاتا ہے۔ اسلئے انہیں مناسب حدود میں رکھنا ضروری ہے۔ کاروبار میں آزادی وسیع پیمانہ پر صنعت و تجارت کا باعث ہوتی ہے۔ اور ترقی کرتے کرتے اجارہ داری اور نیم اجاری اداروں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں جس کے سبب چھوٹے پیمانہ کی کاروباری کوششیں گم ہو جاتی ہیں۔ اور امیروں غریبوں کے مابین خلیج زیادہ فراخ ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ امریکہ میں ہیئت جدیدہ (NEW DEAL) سے پہلے تھا۔ اس خلیج کو صرف اس طرح پاٹا جا سکتا ہے کہ کاروبار کی آزادی کو مناسب حدود میں رکھا جائے۔

آزادی کبھی مساوات کے ساتھ متصادم ہوتی ہے جب یہ جرائم مثلاً چوری، قتل اور چور بازاری وغیرہ کی طرف میلان پیدا کرتی ہے۔ اس لئے اس کو بھی مناسب اخلاقی حدود میں رکھنے کی ضرورت ہے۔

اجتماعی ارتقا کی آخری شرط جسے افلاطون نے سب سے پہلے محسوس کیا تھا منصوبہ بندی ہے۔ خود افلاطون نے جو منصوبہ پیش کیا تھا وہ ناقابلِ عمل ہونے کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکا۔ جامع منصوبہ بندی ہمارے سائنسی زمانہ ہی کی دریافت ہے۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں سائنس نے بڑی تیزی سے ترقی کی۔ اس کی دریافتوں کے استعمال نے انسان کے مادی لوازمات میں بے حد تبدیلی پیدا کر دی۔ اس سے یہ خیال پیدا ہوا کہ انسانی ترقی کی کوئی انتہا نہیں۔ ڈارون کے نظریۂ ارتقا نے اس عقیدہ کو بہت تقویت پہنچائی۔ چنانچہ یہ فرض کر لیا گیا کہ حیات برابر فوائد حاصل کرتے ہوئے ترقی پاتی اور زیادہ پیچیدگی اور اکملیت کی طرف بڑھتی ہے۔ لیکن حال میں زندگی کی پیچیدگیوں کے باعث اقتصادی دَوروں، قوموں میں بڑھتی ہوئی کشمکش اور اسلئے عالمگیر جنگوں کے ظہور اور ایٹم اور ہیڈروجن بموں کی تباہی و بربادی کے امکانات نے جو سائنس کی گریزپا ترقی کے باعث رونما ہوئے ہیں۔ نوعِ انسان کے برابر بلند سے بلند تر مدارج ارتقا کرنے کے عقیدہ کو پاش پاش کر دیا ہے۔ اسلئے اب یہ عقیدہ زیادہ قوت پکڑتا جا رہا ہے کہ اجتماعی ارتقا صرف جانی بوجھی منصوبہ بندی ہی سے ممکن ہے۔ اور اس کی عدم موجودگی سے ممکن ہے تمام نوعِ انسان تباہ و برباد ہو جائے۔

واضح رہے کہ محض مادی و اجتماعی بہتری کے لئے منصوبہ بندی کافی نہیں کیونکہ اس کا تعلق صرف خارجی ذرائع سے ہے۔ اس سے بھی زیادہ جو بات ضروری ہے وہ روحانی ارتقا کے لئے منصوبہ بندی ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق مقاصد سے ہے۔ کوئی ارتقا بھی اس وقت تک صحیح معنوں میں عظیم نہیں ہو سکتا جب تک یہ انسانوں کو ذرائع سے مقاصد تک نہ لے جائے۔ اور وہ مقاصد برابر بلند سے بلند تر نہ ہوتے چلے جائیں۔

ر۔خ

نقد و نظر

نقد اقبالؒ

از جناب میکش اکبر آبادی
صفحات ۲۱۶، قیمت تین روپے
ملنے کے پتے:
۱۔ مصنف، میوہ کٹرہ۔ آگرہ
۲۔ حکیم مرزا احسان علی بیگ۔ نرنکاری بازار
۱۴۱ راولپنڈی

علامہ اقبالؒ کے فلسفہ اور نظریات کے بارہ میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ جہاں تک ان کے کلام اور افکار کی تشریح کا تعلق ہے۔ اس کا حق تو کافی حد تک ادا ہو چکا ہے۔ مگر ابھی تحقیق اور تنقید کا حق ادا ہونا باقی ہے۔ ظاہر ہے کہ اقبالؒ کا فلسفہ صدہا سال پر پھیلے ہوئے طویل سلسلہ فکر کی ایک کڑی ہے۔ جو مشرق و مغرب کے بیشمار مفکروں کے نظریات، گوناگوں تحریکات اور مکاتب فکر پر مشتمل ہے۔ اسلئے خواہ اقبالؒ کے کسی نظریہ یا نکتہ پر نظر ڈالی جائے۔ اس تمام سرمایۂ فکر کی طرف رجوع ناگزیر ہے۔ اور صرف اس جامع و ہمہ گیر مطالعہ اور محققانہ چھان بین ہی سے ہم زیادہ صحیح اور معقول نتائج تک پہنچ سکتے ہیں۔

زیر نظر کتاب میں یہی روش اختیار کی گئی ہے۔ اور اس لحاظ سے یہ یقیناً مستثنیٰ حیثیت رکھتی ہے۔ مصنف نے اقبالؒ کی خودی کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی خودی کو فراموش نہیں کیا۔ اور ان کے نظریات اور اقوال کو اس وسیع ذخیرۂ علم و حکمت کی روشنی میں پرکھا ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ یہ ایک بڑی کٹھن مہم تھی جسے مصنف نے بڑی کامیابی سے سر کیا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اقبالؒ کے ارشادات پر مدلل بحث بھی کی ہے۔ ان کے نتائج بالعموم صحیح ہیں۔ مثلاً انہوں نے تحقیق پر ابتدا سے صوفیوں نے بالاتفاق زور دیا ہے۔ بقا باللہ کے معنی بھی دراصل تحقیق خودی کے ہیں۔ خودی کا سارا فلسفہ "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ" میں جمع ہے۔ اور الیساندرو بوزانی نے تو مثنوی مولانا روم سے متعدد مثالیں پیش کر کے اس حقیقت کی توضیح کی ہے کہ صوفیائے کرام کی فنا محض اصطلاحی حد تک فنا ہے۔ اور عدم کا مفہوم بھی اس کے عام مفہوم سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری رائے میں اقبالؒ کے فکر و فلسفہ کی اکثر پیچیدگیوں کا بنیادی سبب ان کی اصطلاحات۔ خودی، زندگی، عمل وغیرہ کی دورُوئی ہے۔ اگر ان کا مفہوم ٹھیک ٹھیک متعین کر دیا جائے۔ تو الجھنیں یکلخت دور ہو جائیں گی۔ چنانچہ خودی کی بجائے مسلمان خودی یعنی روح، زندگی کی بجائے روحانی زندگی اور عمل کی بجائے عرفان باکہ ایمان سے عقائد کی نوعیت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد دوسری گتھیاں جن کا دارومدار ان اصطلاحات پر ہے خود بخود سلجھ جاتی ہیں۔ مثلاً تصوف، اشتراکیت، نٹشے، مسولینی، نادر کا خواب وغیرہ کے سلسلہ میں اشتباہات۔ اگر اقبالؒ تمام تر روح، ایمان اور دین کے قائل ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ وہ زندگی کو اپنا سرچشمہ کیوں قرار دیتے ہیں، ان دونوں کی فعالیت اور مرکزیت نقطۂ ایمان ہی کی تفسیر ہے، ان کا مقصود منزل کبریا ہے اور جس طاقت کے وہ قائل ہیں حق یا جلال یعنی روح کی طاقت ہے۔ الیساندرو بوزانی نے درست کہا ہے کہ اقبالؒ حیات برائے حیات اور عمل برائے عمل کے قائل نہیں۔ وہ روح اور صرف روح کے لئے ہیں۔

غرض زیر تبصرہ کتاب، اقبالؒ کے افکار و پیام کے سلسلہ میں خاص اہمیت رکھتی ہے، یہ بعض نہایت دشوار مرحلوں میں ہمارے لئے مشعل راہ اور عام معلومات کا ایک بیش بہا ذخیرہ ہے۔

نام ونگ

از عبدالمجید بھٹی۔ صفحات ۱۲۰
ناشر: سنگم پبلشرز لمیٹڈ، لاہور۔

یہ شاعر، فارسی کی شیرینی اور ہندی رس کا دھنی اپنے سینے میں ایک لطیف سند دل اور زبان میں ایک عجیب مٹھاس رکھتا ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ وہ بیک وقت ان دونوں کی لطافتوں کو کیسے اپنا لیتا ہے۔ کیونکہ اگر شاعر فارسی کی پُرکاری میں کھو جائے تو وہ ہندی کی سادگی کو بہت کم پا سکتا ہے۔ عبدالمجید بھٹی ایک کے مہانے سندر بول بھی اسی نرمی و درد سے بول سکتا ہے جتنے دوسری کے شگفتہ و رنگین الفاظ۔ ہندی کے دردیلے، سُریلے بولوں کے ساتھ اس نے ہندی دھنوں، ہندی سموں اور ہندی رسموں، رتوں کو بھی بڑے سبھاؤ سے اپنایا ہے۔ مثلاً:

بیون بگ پر پہلے ڈگ میں دیکھ کے اپنی ٹھور
پلو تھام کے چلی باوری ہاتھ پرائے ڈور

کیا اس میں ہندی دوہوں کا وہ کومل رس نہیں ہے جس نے کتنے ہی دلوں کو لبھایا ہے؟ بھٹی نے چھوٹی چھوٹی، لمبی لمبی بحروں، ان کے نت نئے گٹھ بندھن جو کہیں پابند ہے اور کہیں آزاد۔ ایک عجیب گنگا جمنی بلکہ سرت رنگا لہراؤ پیدا کیا ہے جس میں فن کی پکار رہ رہ کر بولوں کے انوکھے جادو سے مل مل کر نس نس کو جگاتی اور روم روم کو سہلاتی نظر آتی ہے۔

بھٹی کا موقلم نت نئی تصویریں بنانے میں ماہر ہے اور اس کے چھوٹے چھوٹے مصرعے ایک عجیب ترنم کے ساتھ ایک چلتی پھرتی تصویر بنا دیتے ہیں جن میں حواس کا چنچل پن اور نکھار بہت نمایاں ہوتا ہے۔ ان خصوصیات کے پیش نظر ان کا کلام خصوصی توجہ اور مطالعہ کا مستحق ہے۔ ابتدا میں ابوالاثر حفیظ کا نہایت دلچسپ اور جلیلا مقدمہ اس نئی "مورت" کے شاعر کو بہت پیارے اور کرارے انداز میں پیش کرتا ہے جس کی نظمیں ہمارے لئے سوز اور حظ کے کتنے ہی پُر کیف لمحے مہیا کرتی ہیں۔

○

لہو اور قالین

از میرزا ادیب — صفحات ۳۱۸
قیمت: تین روپے

ناشر: مکتبۂ اردو۔ لاہور۔

ایک انسان اور فن کار دونوں کی حیثیت سے میرزا ادیب کی نمایاں خصوصیت میانہ روی ہے۔ انہیں "صحرا نورد کے خطوط" کی رومانوی دنیا سے نکلے ہوئے کتنا ہی عرصہ گذر چکا ہے۔ دوسری طرف ان کی متانت زندگی کے ہنگامہ آفریں اور گھناؤنے پہلوؤں سے بھی گریز کرتی ہے۔ یہی اعتدال پسندی ان کے افسانوں کی بھی روح رواں ہے۔ وہ جو واقعات یا کردار پیش کرتے ہیں، تمام تر اسی سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ ان میں ایک سکون پرور ٹھہراؤ، ایک دل خوش کن وضعداری اور کلاسیکل توازن ہے۔ جو بعض جدید سنسنی خیز افسانوں کے برعکس طبیعت پر ایک خوشگوار اثر چھوڑتا ہے۔ مصنف نے ان ڈراموں کو "تکمیل" قرار دیا ہے۔ اور ان میں واقعی تعزیجی قصوں کا انداز نمایاں ہے۔

○

کلیاتِ ولی

(تیسرا ایڈیشن)

مرتبہ: سید نورالحسن ہاشمی ایم اے (علیگ) ایم اے، پی ایچ ڈی (علیگ)
صفحات ۴۲۸ مع ضمیمہ و فرہنگ مشتمل بر ۱۰۵ صفحات
قیمت پانچ روپے

یہ کتاب انجمن ترقی اردو پاکستان کے سلسلۂ مطبوعات کی ایک اہم کڑی ہے جس میں ولی دکنی کا کلام مناسب تحقیق اور چھان بین کے بعد پیش کیا گیا ہے۔ "مقدمہ" کے زیر عنوان ولی کے حالات، کلام اور زبان پر سرسری بحث کی گئی ہے۔ ولی کے کلام کے متن اور اس کے تعارف کی حد تک یہ کتاب تدوین و ترتیب کے جملہ تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ مگر اب جب ذوقِ سخن کلام یا تعارف سے بلند تر مقاصد کا جویا ہے شاعر کے کلام اور فن کے مختلف پہلوؤں کو جدید علم تنقید کی روشنی میں اجاگر کرنا زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ہمارے بعض بالغ نظر ناقدانِ فن نے قدیم و جدید شعراء کا از سر نو نئی نگاہوں اور نئے زاویوں سے مطالعہ کرنا شروع کیا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا اردو کالج کراچی کے رسالہ "برگ گل" کے پہلے شمارہ میں ڈاکٹر سید عبداللہ کا ایک نہایت سیر حاصل مضمون شائع ہوا تھا جس میں ہم ولی کی شاعری اور مزاج کو ایک اور ہی رنگ میں دیکھتے ہیں۔ اس میں شاعر کے ذوق اور طبیعت کی بہت صحیح اور دلچسپ نباضی کی گئی ہے۔ اسی انداز میں ولی بلکہ ہر اردو شاعر کا مطالعہ کرنے کی اور بھی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر ولی کی شاعری میں یہ خصوصیت کسقدر نمایاں ہے کہ وہ نہایت شگفتہ مسلسل تراکیب کثرت سے استعمال کرتا ہے۔ ولی کا مزاج اور کلام ایک مستقل دعوتِ فکر و نظر ہے اور ہماری کیف اندوزی بھی اسی نسبت سے افزوں ہوگی جتنا کہ ہم اپنی ذوقی صلاحیتوں کو کام میں لائیں گے۔

رسید کتب

کتاب	مصنف	ناشر
ادبی تنقید	ڈاکٹر محمد حسن	ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ
چند نظمیں	برجموہن دتاتریا کیفی	رحمت قطبی، احاطہ کالے صاحب دہلی
اردو میں تنقید	ڈاکٹر محمد احسن فاروقی	ادارۂ فروغ اردو۔ لکھنؤ
مشرق	سلیم اللہ فہمی	مشرق کواپریٹیو پبلیکیشنز لمیٹڈ ۹۷ آغا صادق روڈ۔ ڈھاکہ
جواہر القرآن	قاضی عبدالرزاق	مدینہ دارالاشاعت۔ آؤٹ رام روڈ۔ کراچی
تحفۂ حرم	اسد ملتانی	ادارۂ روزنامہ شمس ملتان شہر

نفیس
پارچات
لیڈی ہملٹن
بروکیڈ
ساٹن
لینن
ڈوریا وائل
اور دوسرے کئی پارچات
خوبصورت رنگ اور نظر فریب ڈیزائن
ALAMGIR
RAYON
MILLS
LTD.
FADDOO BUILDING. BUNDER ROAD. KARACHI.
KAYS
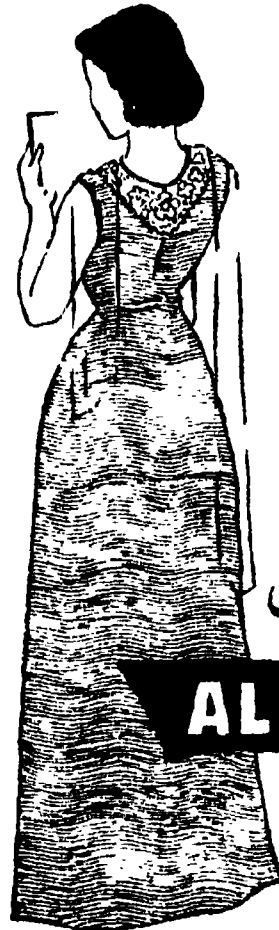
معقول حضرات ٹریٹ بلیڈ
ہی استعمال کرتے ہیں
Treet
A Treet FOR YOUR FACE
MADE IN PAKISTAN
ٹریٹ
کا شیو پُر لطف شیو ہے
پاکستان کے بہترین بلیڈ
۵ آنے میں ۵

اپنی کھانسی کے
اسباب کا خاتمہ کیجئے
- اُسے محض دبا دینا ہی ٹھیک نہیں -
ایسی دواؤں پر بھروسہ نہ کیجئے جو آپکی کھانسی کو محض روک
دیتی ہیں۔ سیرولین اُن جراثیم کا خاتمہ کر دیتی ہے جو کھانسی کا باعث
ہوتے ہیں اور بلغم کو آسانی سے خارج ہونے میں مدد دیتی ہے۔
یہ آپکے نظام معدہ کو درست کرتی اور ہاضمہ میں مدد دیتی ہے۔
اپنے گھر میں ہمیشہ ایک بوتل موجود رکھئے۔
SIROLIN
روش سیرولین

دانتے اور اقبال

بقیہ صفحہ ۱۸

چاہیئے کہ کہیں اس کے بالکل ظاہری معنی ہی مراد نہ لے لیں۔ وہی جس کے ہم اہلِ مغرب اس قدر عادی ہیں۔ اقبال اشتراکی ہیں کیونکہ وہ بالکل مذہبی ہیں۔ ان معنوں میں جو اسلام یا قرآن سے مخصوص ہیں۔ اور جنہیں سامی بھی کہا جا سکتا ہے۔ یعنی وہ ایک بہت ہی سیدھی سادی مگر ہمارے نزدیک بڑی ہی الٹی نسلی وا اثرگونی فکر کے حامل ہیں۔ جس کے لئے وہ معین اور متوازن نظامِ کائنات جس کا تصور اہلِ یونان اور خود دانتے کے ذہن میں جاگزیں تھا۔ سرے سے موجود ہی نہیں۔

یولے سز جو دانتے کی نظم میں یونہی برائے نام یونانی ہے یقیناً "ڈیوائن کومیڈی" کا وہ کردار ہے جسے اقبال نے سب سے زیادہ پسند کیا ہے۔ اور جو دونوں شاعروں کے مابین ربط پیدا کرتا ہے۔ یولے سز جو غالباً دانتے کا سب سے زیادہ غیر کلاسیکی کردار ہے کیونکہ وہ نصرانی سے زیادہ کافر ہے۔ حالات میں ایک عجیب پیچیدگی کے باعث جہنم میں جگہ پاتا ہے۔ یعنی اس کو نصرانی، ارسطاطالیت کی قربان گاہ پہ بھینٹ چڑھا یا گیا کیونکہ اس نے اس سکونی کائنات کے راستے میں ناقابلِ عبور رکاوٹیں پیدا کر دی تھیں۔ جیسے ابتدائی نصرانی شہدا نے ذاتی قربانی کے بے پناہ شوق میں پارہ پارہ کر دیا تھا۔

"وَاِلٰی رَبِّکَ مُنْتَہٰہَا"۔ قرآن کی یہ عمیق آیت اقبال کو ایک لامحدود بصیرت عطا کر دیتی ہے جو مادی کثافتوں کے خلاف ایک زبردست ہتھیار ہے۔ قدرت اقبال کے نزدیک "فطرت اللہ" ہے۔ اسلام کا یہ بنیادی طور پر الٰہیاتی تصور کہ تمام کائنات ہر لحہ فنا ہو کر برابر از سرِ نو تخلیق ہوتی رہتی ہے۔ ان کے لئے بے حد دلچسپی کا باعث ہے۔ اور اسی میں انہیں ہر قسم کے جبر اور مادہ کی غلامی سے نجات دکھائی دیتی ہے۔ دانتے کا یولے سز ایک لحاظ سے اقبال کا پیشرو ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اقبال میرے ساتھ پورا پورا اتفاق کریں گے۔ اگر میں یہ کہوں کہ یورپ میں یولے سز کے تاٗملین نے دہریت کے پردہ میں نشوونما پائی ہے۔ اور وہ اسلئے کہ ہماری مذہبی روایت کا دامن یونان کے نصرانیت سے ماقبل ڈھانچ سے وابستہ رہا ہے۔ جس نے یولے سز کو مردود قرار دیا تھا۔

اب اقبال ـــ۔ وہ یولے سز جس کو اقبال کے الفاظ میں قرآن کے کلاسیکیت کے منافی تصور نے نجات دلا دی ہے۔ دوبارہ سفرِ افلاک پر روانہ ہونے کو تیار ہے۔ اب کی بار وہ سفر یونان کے قدیم طیطانیوں۔ عظیم الشان طاغوتی باغیوں کی طرح نہیں بلکہ خدا کی منظوری اور حوصلہ افزائی کے ساتھ کرتا ہے۔ یہ پرواز دانتے کی پرواز سے مختلف ہے کیونکہ اس میں انسان کا حصہ زیادہ ہے۔ مگر یہ انسان وہ مکمل انسان ہے جسکے پیچھے وہ تزکیہ باطنی بھی ہے جو دانتے کے سفر کا ماحصل تھا۔ اور سفائدشت کے مردود ہونے کی تنبیہہ بھی۔

اور یہ نیا انسان جسے اقبال نے پیش کیا ہے۔ ہمیں کافی کچھ سکھا سکتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ دانتے اور اقبال جیسے عظیم سیاحانِ فلاک کے تجربے ہمیں تین باتیں سکھاتے ہیں،

اوّل۔ یہ کہ رواداری اور جدید انسان کے نام نہاد اوصاف مادراٗ میں ایک سیدھے سادے ایمان محکم سے دست و گریباں نہیں ہیں۔ "وعین ما تولوا فثمہ وجہ اللہ" اور وہ شخص جو خدا کے نزدیک ہے غالباً دوسرے تمام لوگوں سے زیادہ تراجن، حلاج اور طاہرہ کو بہشت میں جگہ دے سکتا ہے۔ دوسرے، انسان جو محض بندۂ ناچار ہے۔ اس ہستیٗ کامل سے تکمیل پاکر جو "اقرب من حبل الورید" ہے۔ قدرتِ کاملہ پیدا کرتا ہے اور نئی نئی روحانی دنیاؤں کا خالق بن جاتا ہے۔

تیسرے، اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اطاعت لازم ہے۔ یعنی دانتے کا انفعال اور اقبال کا اعلان بندگی حق۔ وہ حق جس کا جلال تمام کائنات میں دائر و سائر ہے۔ خواہ وہ نور جو اکیلا ایک گوشے میں منزدی ہے اور تمام ابدی قوت کا ناقابل رسا سرچشمہ ہے۔ "ایک چیز میں زیادہ ہو اور دوسری میں کم"۔

اور اب ان آسمانوں سے پرے جو عقائد و آئین کے گوناگوں حجابات ہیں۔ اور شاید اس دنیائے حادثہ میں دانتے اور اقبال کو ایک دوسرے سے الگ رکھتے۔ بلکہ بعض تنگ نظر لوگوں کی رائے میں آج بھی انہیں الگ رکھتے ہیں۔ دونوں شاعروں کی روحیں پوری

ہم آہنگی کے ساتھ (جو امید ہے اس دُنیا میں اور بھی زیادہ واضح اور رنگین ہم آہنگی کی علامت اور بشارت ہوگی) اس خدائے واحد کی تمجید میں رطب اللسان ہوں گی جس کے متعلق قرآن کے بلیغ الفاظ میں کہا گیا ہے:

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْہَا مِصْبَاحٌ ط اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَۃٍ ط اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّہَا کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیْتُوْنَۃٍ لَّا شَرْقِیَّۃٍ وَّلَا غَرْبِیَّۃٍ لا یَّکَادُ زَیْتُہَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْہُ نَارٌ ط نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ ط

ہم لوگ : بقیہ صفحہ ۵۰

پہلے شاعر کے کلام یا اس کی صورت پر ہی اس طرح بھڑک اٹھے کہ آزاد کلب کا سارا میدان قہقہوں کے شور سے گونج اٹھا۔ ان قہقہوں میں تمسخر یا استہزا یا تذلیل کا جذبہ بالارادہ شامل نہ تھا۔ ان کی خصوصیت وہ بے ساختہ و بے قابو مسرت تھی جو ناگہانی و بے اندازہ حیرت سے پیدا ہوتی ہے۔ انہیں یہ سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ شعر سننے کے بعد وہ کریں تو کیا کریں شعر سن کر اگر وہ قہقہہ بھی نہ لگاتے تو میرے اندازے کے مطابق وہ اپنے دل میں سخت شرمندہ یا پشیمان ہوتے۔ چنانچہ تین چار شعرا گزر جانے کے بعد جب لوگ سمجھ گئے کہ مشاعرہ یہی کچھ ہوتا ہے تو اکثر معززین شاعر سے زیادہ وہیٹر کی طرف متوجہ ہوگئے۔

مشاعرہ تو نیر شعرا کی سخت جانی کے طفیل جوں توں کر کے ختم ہوگیا لیکن اس دن سے ہم لوگ برابر اس فکر میں غلطاں ہیں کہ اس کلب کو اب توڑا کیسے جائے۔ آزاد کلب کچھ اس وارفتگی سے چل پڑا ہے کہ تھمنے میں نہیں آتا۔

REGD. NO. S. 1086 · MAH-I-NAU, KARACHI, APRIL 1955.

ہماری مطبوعات

ثقافت پاکستان

اگرچہ ہمارا ملک سیاسی طور پر ایک نوزائیدہ مملکت ہے لیکن ثقافتی اعتبار سے اس کی بنیادیں ماقبل تاریخ عہد کی گہرائیوں تک پہنچتی ہیں - فی الحقیقت پاکستان تہذیب، علم اور تمدن کا قدیم ترین گہوارہ ہے اور تقسیم ملک کے بعد اس برصغیر کے بہترین تہذیبی ورثہ کا حصہ اعظم پاکستان ہی کے حصہ میں آیا ہے۔ "ثقافت پاکستان" ایک مبسوط کتاب ہے جس میں پاکستان کے ثقافتی ورثہ کا مکمل جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کتاب کی تدوین میں ملک کے نامور مفکرین اور اہل قلم نے حصہ لیا ہے -

دیدہ زیب مصور سرورق - مجلد پارچہ، طلائی لوح، ۱۶ تصویری صفحات، متن ساڑھے تین سو صفحات - قیمت ساڑھے چار روپے

انتخاب کلام - مسلم شعرائے بنگال

پچھلے چھ سو سال میں مشرقی پاکستان کے مسلمان شعرا نے بنگالی ادب میں جو بیش بہا اضافے کئے ہیں ان کا ایک مختصر مگر سیر حاصل انتخاب عہد قدیم سے لیکر معاصر شعرا تک پیش کیا گیا ہے۔ یہ ترجمے پروفیسر احسن احمد "اشک" اور یونس احمر نے براہ راست بنگالی سے اردو میں کئے ہیں -

۲۰۰ صفحات مجلد (پارچہ)، طلائی لوح، ساڑھے چار روپے - سادہ مجلد - چار روپے

عبداللہ

یہ بنگالی زبان کا ناول پہلی بار اردو میں منتقل کیا گیا ہے - یہ ناول عبوری دور کے معاشرہ کی جیتی جاگتی تصویر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے - جس میں نئی زندگی پرانی زندگی کے ساتھ محو کشمکش ہے - اور آخر کار نئے تقاضے حیات کا رخ بدل دیتے ہیں -

ناول کا پس منظر بنگال کا ہے - مگر اس کی کہانی ہم سب کی اپنی کہانی ہے - اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کے دونوں حصوں کا تاریخی ارتقا کس طرح ایک ہی نہج پر ہوا اور ہم ایک دوسرے سے کس قدر قریب ہیں -

۴۰۰ صفحات - مجلد کتاب، دیدہ زیب سرورق، قیمت سادہ جلد چار روپے، طلائی جلد ساڑھے چار روپے

مشرقی بنگال کا پوتھی ادب

مسلم بنگال کی عوامی زبان اور ادب اسلامی افکار و علوم سے مالامال رہا ہے - مسلم ادبا و شعرا نے اس زبان کو دیوی دیوتاؤں کے تصور سے نجات دلا کر انسان اور زندگی کو اپنا موضوع بنایا اور اپنے تاثرات کو ایسے سانچے میں ڈھالا کہ ان کا ادب مذہب، تصوف، تاریخ، تمدن، روایات اور قومی داستانوں کا لازوال سرچشمہ بن گیا - اسے پوتھی ادب کہتے ہیں - یہ کتاب مسلمانان بنگال کے اس ادب کا مکمل تعارف ہے - اس کے ذریعے آپ بنگال کے مسلم عوام کی روح تک پہنچ سکتے ہیں - قیمت صرف ۱۲ آنے -

مئی ۱۹۵۵ء

ڈاکٹر مولوی عبدالحق — سید وقار عظیم

آغا بابر — سید عبدالحمید عدم

احسان دانش — جگن ناتھ آزاد

مغربی پاکستان

جلد ۸۔ شمارہ ۲

مئی ۱۹۵۵ء

مدیر: رفیق خاور
نائب مدیر: ظفر قریشی

چندہ سالانہ: پانچ روپے آٹھ آنے (پاکستان میں) سات روپے (ہندوستان میں) فی کاپی آٹھ آنے (پاکستان میں) دس آنے (ہندوستان میں)

آپس کی باتیں

گوئٹے نے کہا ہے کہ "تاریخ بڑے انسانوں کا سایہ ہے" یعنی یہ ان کے دم قدم کے ساتھ حرکت کرتی ہے۔ کچھ روحانی پیشوا ہوتے ہیں جو زندگی کے اسرار کھولتے ہیں۔ اور کچھ اہلِ عمل جو اپنے کردار کی قوت سے دنیا کو آگے بڑھا کر لے جاتے ہیں۔

سرسید احمد خاں انہی عہد آفریں شخصیتوں میں ہیں۔ وہ ایک پیغمبرِ عمل تھے۔ اور ان کے پیکر میں ایک دلِ بیدار اور دیدۂ بینا تھا۔ جس کے بغیر عمل کارگر نہیں ہوتا۔ بصیرت، دردمندی اور عمل کی توفیق۔ یہی باتیں ہیں جو انسان کو عام سطح سے بلند کر کے "شہسوارِ اشہبِ دوراں" بنا دیتی ہیں۔ اور وہ زندگی کے حقیقی تقاضوں کو سمجھتے ہوئے ان کا صحیح حل پیش کرتا ہے۔

سرسید نے ایک ایسے بحرانی دور میں آنکھیں کھولیں جب اکثر انسان ایک شدید ذہنی کشمکش کا شکار تھے۔ یہ کشمکش قدیم و جدید، روح کی کشمکش تھی جس میں اکثر قوتِ فکر کے ساتھ عمل کی صلاحیتیں بھی ماؤف ہو جاتی ہیں اور بڑی نکتہ رس نگاہیں بھی بھٹک جاتی ہیں۔ ایک طرف روایات کہن دامنگیر ہوتی ہیں، دوسری طرف نئے تقاضے۔ اور انسان اکثر جذبات یا تعصبات کی رو میں بہہ جاتا ہے۔

سرسید کے لئے یہ باتیں سدِ راہ نہ ہوئیں۔ انہوں نے واقعات کا امعانِ نظر سے جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ہماری نجات حالات سے فرار میں نہیں بلکہ ان کا سامنا کرنے میں ہے۔ تاکہ ہم زندگی کے اس موڑ پر جو مشرق و مغرب، قدیم و جدید، پرانی اور نئی روشنی کے تصادم اور اختلاط سے پیدا ہوا تھا۔ مناسب لائحہ عمل اختیار کر سکیں۔ سرسید نے جو روش اختیار کی اس کے خلاف اگرچہ بہت کچھ کہا گیا لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ عملاً نہایت نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔

اس مہینے میں جب کہ سرسید علیہ الرحمتہ کی برسی واقع ہوتی ہے۔ ہم بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی ایک نشری تقریر پیش کر رہے ہیں جس میں اس "مردِ راہداں" کی سرگرمیوں کا ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

قاضی نذرالاسلام اس سنہری سلسلہ کی ایک اور کڑی ہیں جس نے اس برصغیر کو حیات تازہ عطا کی ہے۔ وہ بھی ایک ایسے دور میں پیدا ہوئے جب آزادی کی تحریک نے ملک میں ہیجان برپا کر رکھا تھا۔ یہی وقت تھا کہ کوئی "دیوانۂ آتشِ نوا" اٹھ کر ایک نعرۂ مستانہ بلند کرتا۔ جیسا کہ "ودروہی" اور "اگنی وینا" کے مصنف نے کیا۔ اس نے جو "کوچ کا ترانہ" سنایا وہ قوم کے لئے ایک پیغام منتظر تھا۔ مشرقی پاکستان کے اہلِ درد اور اہلِ ذوق کے دلوں میں نذرالاسلام کو جو جگہ حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ مغربی پاکستان کے ادیب انہیں کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس کا اندازہ ابن انشا کے اس مضمون سے لگایا جا سکے گا۔ جو اس شمارہ میں پیش کیا جا رہا ہے۔

رسالہ قریب تکمیل تھا کہ دورِ حاضر کی ایک جلیل ہستی حکیم آئن سٹائن کے انتقال کی خبر موصول ہوئی۔ سائنس کی دنیا کا آفتاب غروب ہو گیا۔ لیکن علم کی روشنی امر ہوتی ہے۔ اپنی انقلاب آفریں دریافتوں سے جو باب حکیم موصوف نے علم کی دنیا میں کیا، ہمیشہ باقی رہے گا۔ اگرچہ اس سے ابھی بہت کم آنکھیں آشنا ہیں تاہم ایٹم کا دور آغاز ہو چکا ہے جس کے حکیم آئن سٹائن بانی قرار دیئے جاتے ہیں۔ کائنات کی ہیئت کے بارے میں جو نئے تصورات انہوں نے پیش کئے نہایت دور رس نتائج کا امکان رکھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں نظریۂ اضافیت خاص اہمیت رکھتا ہے جس سے صدہا سال کے مسلمات یکایک بدل گئے۔ دہر اور زماں کی گرہ کشائی میں بھی انہیں خاص دخل رہا ہے۔ چنانچہ حکمائے مغرب کے بارہ میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے اقبالؒ نے انکے متعلق خوب کہا ہے کہ

من چہ گویم از مقامِ آں حکیمِ نکتہ سنج   کردہ زردشتے زنسلِ موسیٰؑ و ہارونؑ ظہور

سر سیدؒ — ایک خاکہ

مولوی عبدالحق

ع "ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتے ہیں"

یہ قول سراسر حقیقت پر مبنی ہے۔ سید احمد خاں نے جب سے ہوش سنبھالا اس وقت سے لے کر مرتے دم تک کوئی ساعت ایسی نہ گزری کہ وہ کام سے غافل رہے ہوں۔ اور کام بھی ایسا وسیع اور ہمہ گیر جو ہماری قومی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی تھا۔ علمی، تعلیمی، معاشرتی، سیاسی، ادبی، لسانی غرض کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس پر انہوں نے گہری نظر نہ ڈالی ہو اور کڑی تنقید نہ کی ہو۔ اُن کے کارنامے اس قدر عظیم الشان، حیرت انگیز اور مختلف نوعیتوں کے ہیں کہ ان کا تذکرہ سمندر کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کرنا ہے۔

وہ ابھی اٹھارہ انیس برس کے تھے کہ ایسے کام میں لگ گئے جو قسام ازل نے پہلے سے ان کی قسمت میں لکھ دیا تھا اور جو آگے چل کر انہیں عمر بھر کرنا تھا۔ یعنی انہوں نے "سید الاخبار" مرتب کرنا شروع کر دیا جو ان کے بھائی نے ۱۸۳۶ء میں جاری کیا تھا۔

قطع نظر بعض مذہبی، قانونی اور ریاضیات کے رسائل کے جو ابتدائی زمانے میں لکھے گئے ان کی معرکتہ الآرا تصنیف "آثار الصنادید" ہے جو ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی۔ یہ پہلی کتاب ہے جو دلی کی عمارات پر کمال تحقیق، غیر معمولی محنت و مشقت اور صحت کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ ان کا دوسرا ابتدائی علمی کام "آئین اکبری" کی تصحیح و ترتیب ہے۔ علمی اعتبار سے یہ سر سید کا حیرت انگیز کام ہے، اسے جس انتہائی غور و فکر، کامل تحقیق و جستجو اور محبت اور سچے شوق سے انجام دیا، ایک صدی کے بعد اب بھی ہمارے ملک کا بڑے سے بڑا محقق اس سے زیادہ نہیں کر سکتا۔ ان کتابوں کی ہمارے ملک میں تو قدر نہ ہوئی، اور ہوئی تو فرانس اور انگلستان میں۔ تالیف و تصنیف کا یہ سلسلہ جاری رہتا تو وہ ایک اعلیٰ پائے کے مصنف اور محقق ہوتے لیکن قدرت کو ان سے کچھ اور کام لینا تھا۔ یکایک مئی ۱۸۵۷ء میں ایک ایسا غیبی گولہ آ کر پھوٹا جس نے سارا نظام درہم برہم کر دیا اور ملک میں ہولناک انقلاب برپا ہو گیا۔ اس میں مسلمان سب سے خسارے میں رہے۔ ان پر ادبار و مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ حکمران قوم انہیں اس شورش کا بانی، اپنی حکومت کا باغی اور غدار سمجھتی تھی۔ اور برادرانِ وطن نئی نئی قوت اور آزادی کے زعم میں اور کچھ نئے آقاؤں کی شہ پا کر انتقام پر کمربستہ تھے۔ قوت پانے کے بعد مفتوح کا انتقام بڑا غضب ناک ہوتا ہے۔ ایسی دو زبردست قوتوں کا مقابلہ مسلمانوں کے بس کی بات نہ تھی۔ ان پر افسردگی اور مایوسی کی گھٹا چھائی ہوئی تھی اور دل چھوٹ گئے تھے۔ خود سید صاحب جو اس شورش میں بہت سی آفات اور کھکھیڑیں اٹھا چکے تھے، اس عام مایوسی کا شکار ہو گئے اور تہیہ کر لیا کہ ہجرت کر کے کسی دوسرے اسلامی ملک میں جا بسیں لیکن وہ جلد ہی سنبھل گئے اور قوم کو تباہی کی حالت میں چھوڑ کر اپنی جان سلامت لے جانے کو نامردی اور بے مروتی پر محمول کیا اور یہ ارادہ ترک کر دیا اور پھر قوم کی دہکتی ہوئی آگ میں کود پڑے۔

باوجود سرکاری ملازم ہونے کے ملک و قوم کی خاطر جو سب سے بڑا کام اس وقت ان سے عمل میں آیا وہ "اسباب بغاوت ہندوستان" کا تحریر کرنا تھا۔ اس میں سید نے مسلمانوں کو بغاوت کے الزام سے بری کرنے کی کوشش کی ہے اور گورنمنٹ پر جو الزام عائد ہوتے ہیں انہیں نہایت آزادی اور دلیری سے بیان کیا ہے اور اہل حکومت نے جو اسباب اپنے ذہن میں جاگزیں کر رکھے تھے ان کی تردید کی ہے۔ ایسے زمانے میں جب آزادی کے نام پر زبان کٹتی ہو، حاکم کی زبان ہی قانون ہو، مارشل لا کا دور دورہ ہو اور مسلمان ہونا بذاتِ خود ایک جرم ہو، ایسی حیرت انگیز

اخلاقی جرأت کا اظہار سید احمد خاں ہی کر سکتے تھے۔ اس پر انگریز حکام بہت برہم ہوئے اور بعض نے مصنف کو باغی اور قابلِ دار قرار دیا مگر یہ رسالہ انجام کار بغیر اثر لئے نہ رہا۔ یہ رسالہ اساس ہے برِ عظیم ہند و پاک کی سیاست کا۔ مسٹر ہیوم، بانیٔ انڈین نیشنل کانگریس نے اعتراف کیا کہ مجھ کو انڈین نیشنل کانگریس کا خیال صرف سید احمد کی کتاب "اسبابِ بغاوت" دیکھ کر پیدا ہوا۔

اس وقت سے سید مسلسل اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں سرگرم رہے۔ بے گناہ مسلمانوں کو جو مجبوری اور دباؤ سے باغیوں کے ساتھ ہو گئے تھے یا جن کے خلاف ذاتی عناد یا سرکار میں رسوخ حاصل کرنے کے لئے مخبریاں کی گئی تھیں ان کو بغاوت کے الزام سے بری کرایا اور ان کی جائداد واپس دلائیں۔ ایک رسالہ "لائل محمڈنز آف انڈیا" جاری کیا جس میں صحیح واقعات اور قطعی شہادتوں سے مسلمانوں کی خیر خواہی ثابت کی۔ اہلِ یورپ اور انگریزوں کے دلوں میں قدیم سے مسلمانوں کے خلاف جو تعصب اور بدگمانیاں چلی آ رہی تھیں انہیں رفع کرنے کے لئے وسیع پیمانے پر بائبل کی تفسیر لکھنی شروع کی۔ یہودی عیسائیوں کو حقارت سے "ناسری" کہتے تھے۔ اسلام میں انہیں نصاریٰ کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔ عیسائی اسے حقارت کا لفظ سمجھتے تھے۔ سید صاحب نے اس لفظ کی تحقیق میں ایک رسالہ لکھ کر اس بدگمانی کو رفع کیا۔ اسی طرح رسالہ "احکامِ طعامِ اہلِ کتاب" تحریر کیا جس میں آیاتِ قرآنی، احادیثِ نبوی اور روایاتِ فقہی سے اہلِ کتاب کے ساتھ کھانا کھانا جائز ثابت کیا۔ رسالہ "ابطالِ غلامی" لکھ کر یہ ثابت کیا کہ اسلام نے دنیا میں سب سے پہلے غلامی کا قلع قمع کیا۔

یہ سب کچھ سید نے اس لئے کیا کہ مسلمانوں پر جو ہر طرف سے مختلف پیرایوں میں آفات کا نزول ہو رہا تھا ان سے بچایا جائے۔ غرض جب کبھی اسلام یا مسلمانوں پر آنچ آئی تو سینہ سپر ہو گئے۔ چنانچہ جب ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب "انڈین مسلمانز" شائع ہوئی جس میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ مسلمان گورنمنٹ سے لڑنا اور جہاد کرنا مذہبی فرض سمجھتے ہیں اور کسی حال میں گورنمنٹ کے خیر خواہ نہیں ہو سکتے اور وہابیت اور بغاوت دو مترادف لفظ ہیں۔ اس کا سید نے نہایت مدلل اور دنداں شکن جواب دیا اور لکھا کہ میں خود وہابی ہوں اور وہابی ہونا جرم نہیں۔

۱۸۶۲ء میں انہوں نے سائنٹیفک سوسائٹی کی بنا ڈالی جس کا مقصد انگریزی سے علمی و تاریخی کتابیں ترجمہ کر کے ملک میں روشن خیالی پھیلانا تھا۔ اور کچھ دن بعد سوسائٹی کا اخبار "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" جاری کیا جس میں علمی، معاشرتی اور سیاسی مضامین شائع ہوتے تھے۔ سیاسی مضامین اکثر سید صاحب خود لکھتے تھے۔

۱۸۶۶ء میں ورنیکلر (اردو) یونیورسٹی کا منصوبہ گورنمنٹ میں پیش کیا۔ جو گورنر جنرل اور وزیرِ ہند نے بہ نظرِ استحسان دیکھا مگر وہی فرسودہ اعتراض پیش کئے کہ دیسی زبانوں میں اس کی صلاحیت نہیں۔ کتابیں کہاں ہیں، پڑھانے والے کہاں سے میسر ہوں گے۔

اب سب سے بڑا مسئلہ ان کے سامنے یہ تھا کہ مسلمانوں کو پسماندگی اور ذلت سے کیونکر نکالا جائے۔ کامل غور و خوض اور اتنی مدت کے تجربہ کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ جب تک مسلمانوں میں جدید تعلیم نہ پھیلے گی ان کا پنپنا اور عزت سے رہنا ممکن نہیں۔ اس منصوبے کی تکمیل کے لئے یہ نہایت ضروری سمجھا کہ وہ بذاتِ خود انگلستان میں قیام کر کے وہاں کا طریقہ تعلیم دیکھیں اور پھر ہندوستان واپس آ کر اپنے حالات کی مناسبت سے اس کا ڈول ڈالیں۔ اسی زمانے میں سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" شائع ہوئی جسے پڑھ کر وہ بیتاب ہو گئے۔ اس میں اسلام کی حقانیت اور رسول کریم صلعم کے کیرکٹر پر حملے اور اعتراض تھے۔ اس کے جواب کے لئے ہندوستان میں کتابوں اور نوشتوں کا کافی سامان نہ تھا۔ اس کے لئے بھی انگلستان جا کر رہنا ضروری تھا۔ لیکن ان میں اتنی استطاعت نہ تھی کہ وہ لندن کا شاہی خرچ برداشت کر سکیں۔ اپنی کتابیں اور اثاث البیت بیچا، گھر اور کوٹھی رہن رکھی۔ دوستوں سے قرض لیا اور اللہ کا نام لے کر چل کھڑے ہوئے۔

قیامِ انگلستان میں سر ولیم میور کی کتاب کے جواب میں "خطباتِ احمدیہ" لکھی۔ یہ بڑے پائے کی کتاب ہے اور پہلی کتاب ہے جس میں مخالفین کے جواب کمال تحقیق سے لکھے گئے ہیں۔

انگلستان سے واپسی پر مسلمانوں کے حالات کی اصلاح کے لئے "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔ جس میں مذہب، اخلاق و معاشرت وغیرہ پر ایسے مضامین لکھے گئے جن سے لوگوں میں ہلچل پیدا ہو گئی اور توہمات اور تعصبات پر کاری ضرب لگی۔ اس کے بعد جب مدرسۃ العلوم کی اہمیت پر زور دیا تو ہر طرف سے مخالفت کا طوفان برپا ہو گیا اور انہیں کافر، ملحد، کرسٹان، لامذہب، دجال کے خطاب عطا ہوئے اور کفر کے فتوے لکھے گئے۔ مگر انہوں نے نہایت استقلال سے

اپنا کام جاری رکھا اور مدرسۃ العلوم مسلمان قایم کر کے چھوڑا۔ یہ تعلیم گاہ ہی نہ تھی، تربیت گاہ بھی تھی۔ جہاں کتابی درس کے ساتھ انسان گری کا بھی سبق دیا جاتا تھا۔ آخر کار یہ روشن خیالی اور قومیت کا سرچشمہ اور مسلمانوں کی علمی، سیاسی، تعلیمی، تہذیبی، معاشرتی تحریکوں کا مرکز بن گیا اور یہی کالج بعد میں مسلم یونیورسٹی کے درجے کو پہنچ گیا۔ اسی کالج کی تائید اور مسلمانوں میں تعلیم کا شوق پیدا کرنے کے لئے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔

سیاست میں بھی سرسید کا کارنامہ کچھ اہم نہیں تفصیل کی گنجائش نہیں، بس اس سے اندازہ کر لیجئے کہ وہ مسلمان اکابر جو انڈین نیشنل کانگریس کے شیدائی اور ستون تھے اور جنہیں بارہا کانگریس کی صدارت کی عزت بخشی گئی، آخر بیزار ہو کر ایک ایک کر کے الگ ہو گئے اور اس کے خلاف وہی باتیں اور دلیلیں بیان فرمانے لگے جو کبھی سرسید نے بیان کی تھیں اور جن کی بدولت وہ مورد لعن ہوا تھا۔

منجملہ بے شمار احسانات کے جو سرسیّد کے ہماری قوم پر ہیں ان میں بہت بڑا احسان اردو زبان پر ہے۔ انہوں نے زبان کو پستی سے نکالا، انداز بیان میں سادگی کے ساتھ قوت پیدا کی، سنجیدہ مضامین لکھنے کا ڈول ڈالا، جدید علوم کے ترجمے کرائے، اپنے اندازِ تحریر بے لاگ تنقید اور روشن خیالی سے اردو ادب میں انقلاب پیدا کیا اور جب کبھی اردو پر آنچ آئی تو سینہ سپر ہو گئے۔

جب ۱۸۶۷ء میں ہندوؤں نے سرکاری دفتروں اور عدالتوں سے اردو کو خارج کرنے اور اس کی بجائے ہندی بھاشا رائج کرنے کی کوشش کی اور سرکار میں محضر بھیجے تو سرسید کو سخت رنج اور صدمہ ہوا، وہ لکھتے ہیں کہ اب تک میں نے جتنے کام کئے وہ ملک کی ترقی اور تمام باشندگانِ ہند کی فلاح و بہبود کے لئے تھے لیکن جب سے ہندوؤں نے اردو زبان کو مٹانے کی کوشش کی تو مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہم ملکر کام نہیں کر سکتے۔

اس وقت سے محض اردو کی مخالفت کی وجہ سے ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہو گئیں اور دو قومی نظریے کی بنیاد پڑی جو پاکستان کی بنا کا باعث ہوا۔ اور اس میں ذرا مبالغہ نہیں کہ قصرِ پاکستان کی بنیاد میں سب سے پہلی اینٹ اسی پیرمرد کے مبارک ہاتھوں نے رکھی۔ اور وہ اینٹ اردو زبان تھی۔ اور یہی اب پاکستان کی وحدت و سالمیت کے قیام و استحکام کی ضامن ہے ؛

(بہ شکریہ ریڈیو پاکستان۔ کراچی)

میر اور نیرنگِ عناصر

سید عبداللہ

چار دیواریِ عناصر میر

خوب جاگہ ہے پر ہے بے بنیاد

عام طور پر میر تقی میر کو محض قلبی کیفیات کا ترجمان قرار دیا جاتا ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ کائنات کی خارجی رنگارنگی اور اس کے مناظر کے متعلق ان کی آنکھ عموماً بند رہی ہے اور انہیں اپنی ذات سے باہر کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ لطیفے کی حد تک تو یہ سب باتیں پُر لطف ہیں مگر میر کی کلیات نظم سے اس کی تردید ہوتی ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ کائنات کے خارجی مظاہر و مناظر سے میر نے ایک خاص نقطۂ نظر کے ماتحت غیر معمولی دلچسپی لی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں انہوں نے بار بار اوروں کو بھی دعوت دی ہے کہ وہ جہان میں آنکھیں کھول کر پھریں اور کائنات کے خارجی مظاہر اور ان کے پس پردہ کیفیات اور اسرار کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کریں ؂

ہر مشتِ خاک یاں کی ہا ہے سے اک تامل

بن سوچے راہ مت چل، ہر گام پر کھڑا رہ

تعجب یہ ہے کہ جو شخص دنیا کو یہ سمجھاتا سمجھاتا مر گیا کہ ؏

"بن سوچے راہ مت چل، ہر گام پر کھڑا رہ"۔ اس کے متعلق یہ خیال کر لیا گیا ہے کہ اس نے مظاہر کائنات سے بالکل آنکھیں بند کی ہوئی تھیں اور ہر وقت چشم بندی اور مراقبے کی حالت میں صرف اپنے آپ ہی کو دیکھتا رہا حالانکہ اس کا اپنا دعویٰ یہ ہے کہ اس نے کائنات کو دیکھا، اس کا مطالعہ کیا اور اس کے سیر و مطالعہ سے سبق، بصیرت اور حکمت حاصل کی۔

چنانچہ میر کہتے ہیں:

کھول کر آنکھ، اڑا دید جہاں کا غافل

خواب ہو جائے گا پھر جاگنا سوتے سوتے

ان کے کلام میں سیر، گلگشت، دید، تماشا وغیرہ کی طرح کے الفاظ اور خیالات بتعداد کثیر موجود ہیں۔ پھر کیا یہ سب کچھ ذہنی اور خیالی نیرنگ اور امنگ ہے؟ نہیں! میر نے مطالعۂ فطرت سے واقعی بصیرت حاصل کی۔ اور اس کے نتیجے کے طور پر ان کے قلب و دماغ کو وہ روشنی حاصل ہوئی کہ انہیں ہر جگہ اس جہان کے پردے میں ایک "جہانِ دیگر" نظر آیا ؂

سرسری تم جہان سے گذرے

ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میر نے اپنے "سیر و مطالعہ" سے جس جہانِ دیگر کا سراغ لگایا ہے اور دوسروں کو اس کی گلگشت کی دعوت دی ہے۔ وہ ہے کیا؟ کیا ان کا جہانِ دیگر صرف وہی ہے جو ان کے خیال اور دل کے اندر جلوہ فگن ہے یا وہ اس دنیا میں بھی کہیں ہے جس کو آنکھ دیکھ سکتی ہے اور اس سے محظوظ ہو سکتی ہے؟

میر کے کلام پر غور کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ میر کے مطالعات کے دو بڑے میدان تھے، اول انسان کا دل۔ دوم، نیرنگِ عناصر، انہوں نے ان دونوں موضوعوں کا ایک خاص نقطۂ نظر سے گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ان کا مرکزی موضوع انسان اور اس کا دل ہے اور انہوں نے کائنات کا مطالعہ بھی خاص انسان کے نقطۂ نظر اور حوالے سے کیا ہے مگر ان کا مطالعۂ کائنات بذاتِ خود بھی کچھ کم قابلِ توجہ نہیں۔ میر کو قلبِ انسان اور کائنات دونوں میں عجیب عجیب اور نئے نئے جہان نظر آئے ہیں جن کی رنگارنگ کیفیتوں سے وہ بڑی ذہنی اور خیالی لذت حاصل کرتے رہے۔ اس مختصر مقالے میں میر کے اس جہان کی سیر مطلوب ہے جس کو "نیچر" کا جہان کہا جاتا ہے جس میں عناصر کی حیرت انگیز "صورت بازیاں"

اور تعجب خیز "شعبدے" انہیں نظر آتے ہیں ؎

چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر
منہ نظر آتا ہے دیواروں کے بیچ

ہیں عناصر کی یہ صورت بازیاں
شعبدے کیا کیا ہیں ان چاروں کے بیچ

میرؔ اپنے ذہن کی غم آلود فضا کے باوجود "نیچر" کے حسن کا اعتراف کرتے ہیں اور کبھی کبھی اس سے محظوظ بھی ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ ساری دنیا ایک "آئینہ خانہ" ہے جس میں حسن کے اجزا بکھرے پڑے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس حسن کا انعکاس میرؔ کی نظر میں انوکھے جلوے اور ان کے خیال میں عجیب قسم کے رنگ ابھارتا ہے مگر وہ نگارخانۂ فطرت کے سب حسین و جمیل نقوش کے معترف ہی نہیں، در پردہ دلدادہ بھی ہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری کی فضا تیار کرنے میں جس فیاضی سے اجزائے فطرت سے کام لیا ہے اور فطرت کے مضمون میں قدیم روایتوں سے مختلف قسم کی جو جدتیں پیدا کی ہیں وہ زمانۂ قدیم کے دوسرے شاعروں کے کلام میں بہت کم نظر آتی ہیں۔

میرؔ کی "نیچر شاعری" کے تذکرے سے معاً ہمیں یورپ کی نیچر شاعری کا خیال آجاتا ہے۔ مگر میں یہ غلط فہمی فوراً رفع کر دینا چاہتا ہوں۔ میرؔ بلکہ ہمارے سب قدیم شعرائے فطرت اور مظاہر فطرت سے جس طرح اعتنا کیا ہے وہ اپنی ماہیت اور نوعیت میں اس نقطۂ نظر اور طریق کار سے بالکل مختلف ہے جس کا اظہار مغرب خصوصاً انگریزی شاعری میں ہوا ہے۔ میرؔ نے اس طرح "نیچر شاعری" نہیں کی۔ انہوں نے کیٹس، شیلی، ورڈزورتھ اور ٹینی سن کی طرح خاص مظاہر و مناظر پر نظمیں نہیں کہیں، نہ وہ "لیک پوئٹس" کی طرح اپنا شاعرانہ جذبہ ابھارنے کے لئے جنگل جنگل وادی وادی پھرے۔ انہوں نے ان باتوں میں سے کوئی بات نہیں کی۔ ہاں یہ ضرور کیا کہ وہ جہاں جہاں گئے اور جدھر جدھر پھرے انہوں نے ہر جگہ اشیائے فطرت کی باریکیوں اور ان کے حسن کی لطافتوں اور خصوصیتوں سے تاثر قبول کیا۔ ان کے ذہن میں ان کے متعلق ایک ردّ عمل پیدا ہوا۔ ان کا دل ان کو دیکھ کر بعض خاص تأثرات اور احساسات سے مالا مال ہوا۔ فطرت کے متعلق اس قسم کے نقوش ان کی شاعری میں محدود نہیں، وسیع پیمانے پر ملتے ہیں۔ سرسری نہیں بڑی غائر نظر کا نتیجہ و ماحصل بن کر سامنے آتے ہیں۔ غرض میرؔ نے اصطلاحی یا رسمی طور پر نیچر شاعری نہیں کی۔ ہاں انہوں نے نیچر سے اپنی شاعری اور نقطۂ نظر کی توضیح کے لئے مواد ضرور حاصل کیا ہے۔ ان کی شاعری میں مرغزاروں، کہساروں، وادیوں، سبزہ زاروں اور جوئباروں کے حسن کے مرقعے نہیں مگر فرداً فرداً انہوں نے ان میں سے اکثر چیزوں کا اثر لیا ہے۔ اور اس خاص قید کے ماتحت ان کے کلام میں مطالعۂ فطرت کے کئی پہلو پیدا ہو گئے ہیں جو ہر لحاظ سے قابل توجہ ہیں۔

میرؔ کے کلام میں باغ و چمن[1] اور گل و گلزار کے مضامین بکثرت ہیں۔ اور یہ فارسی اردو شاعری کا سرمایۂ خاص (یعنی اس باغ کا سبزۂ پامال) ہے مگر ان کے علاوہ فطرت کے بہت سے دوسرے اجزا اور مظاہر کا تذکرہ مل جاتا ہے۔ ان میں رات، چاندنی رات، آسمان، تارے، شفق، ابر، برسات، بجلی، بحر، موج دریا، چشمہ، چشمۂ کہسار، جنگل بیابان، صحرا، دشت، صبح، تاریک رات، سحر، شام، آندھی، بگولا، گرد باد، گرداب، نسیم صبا، بلبل، قمری، فاختہ، کتا، بوزنہ، بلی، آہو، ناقہ، عنکبوت، چیونٹی زنبور وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

میرؔ نے ان سب عناصر سے اپنے آئینہ خانے کو جلا دی ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے ان عناصر فطرت کی مناسب ترکیب سے مرقع نگاری بہت کم کی ہے۔ ان اجزا کی ترکیب و ترتیب کے کچھ نمونے ان کے قصائد اور مثنویوں میں ہیں۔ مگر ان میں تخیل حقیقت پر غالب ہے۔ تاہم یہ رائے غالباً بیجا اور غلط نہ ہوگی کہ ان کے یہ مرقعے مرزا سوداؔ اور میر حسنؔ کے مماثل مرقعوں سے کہیں زیادہ حقیقت کے

---

[1] اس سلسلہ میں ملاحظہ ہو مضمون بہ عنوان "فارسی اردو شاعری میں گل و گلزار کی حقیقت" مطبوعہ "اورینٹل کالج میگزین" ۱۹۳۲ء جس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ فارسی شاعری میں شبلیؔ کے خیال کے برعکس عموماً گل و گلزار کا تعلق قدرتی مناظر سے نہیں بلکہ ان بنائے ہوئے اور تیار کئے ہوئے باغوں سے ہے جو شہروں میں یا ان کے مضافات میں عمارتوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔ خصوصاً چمن ایک ایسی مختصر عمارت کو کہتے ہیں جس کے ساتھ باغ بھی ہو، لغات میں بھی اس کے یہ معنی درج ہیں۔

قریب ہیں۔ چنانچہ میر اور سودا کے لامیہ قصیدوں کو آمنے سامنے رکھ کر مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ میر کے لامیہ قصیدہ در منقبت حضرت علیؑ کی بہاریہ تمہید میں تذکرۂ بہار کا تقریباً وہی انداز ہے جو غزلیات کے بہاریہ اشعار کا ہے۔ اس تشبیب کا ماحصل یہ ہے کہ جب ماہ حمل کے خورشید نے طلوع کیا ہے "ہرے پات کے اوپر رنگِ گل جھمک رہا ہے۔ اور جوشِ گل کا یہ عالم ہے کہ جہاں تک نگاہ کام کرتی ہے۔ دشت و جبل لالہ و نرگس و گل سے بھرے پڑے ہیں۔ سبزۂ لب جو نرتن سا معلوم ہوتا ہے۔ اور تازگی، خرمی اور شادابی کا یہ جوش ہے کہ خشک درختوں نے کونپلیں نکالیں ہیں، برگِ گل گویا آگ کی انگیٹھی ہے۔ اور ہر لالہ نے تمام جنگل میں آتشِ گل سا لگا رکھی ہے۔" یہ بہار کا منظر ہے مگر اس عالم میں بھی شاعر کو حسن کے زوال و فنا کا خیال ستاتا ہے۔ ؎

تو یوں ہی کھینچے ہے یہ نقش بر آب اے منعم
کیسی محبوب زمیں ہو گئیں اس خاک میں رل

میر کے شکارناموں اور بعض دوسری مثنویوں میں بھی بہار اور ہجوم لالہ و گل کے مرقعے ہیں مگر جزئیات کے حقیقی اور ٹھوس ہونے کے باوجود ان کے تاثر میں خلوص اور جذباتی سچائی معلوم نہیں ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ عناصر فطرت کے متعلق ان کا صحیح جذباتی ردِ عمل ان کے اشعارِ غزل میں ہی ظاہر ہوا ہے جہاں شاعر نے غیر شعوری طور پر مطالعۂ فطرت اور مشاہدۂ قدرت کے متعلق اپنے تاثرات کو اپنے شعروں میں جذب کر لیا ہے اور جس بے ساختگی اور تکرار سے انہوں نے فطرت کے متعلق اپنے جذباتی مطمحِ نظر کا اظہار کیا ہے اس کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہی تاثر ان کا سچا تاثر ہے۔

میر کے تصویر خانۂ عناصر کے جو نقوش ان کے کلام کے مطالعے سے قائم ہوتے ہیں وہ بڑے خیال انگیز اور موثر ہیں۔ ان سے میر کے ذہنی رجحانات کی بڑی اچھی تشریح ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنی تشبیہات و استعارات اور لفظی تصویروں میں جن تاثرات کو جذب کیا ہے ان کے الٹ پھیر سے ان کے جذباتی ردِ عمل کا کچھ اس طرح کا نقشہ بنتا ہے۔

بہار کے موسم کی دلآویزی تو مسلّم ہے مگر میر کے یہاں اس کا جوبن عجیب رنگ دکھاتا ہے۔ باغوں میں پھول کھلے ہیں، ان کا رنگ دور سے دیکھنے پر یوں معلوم ہوتا ہے گویا آگ لگی ہوئی ہے ؎

گلشن میں آگ لگ گئی یوں رنگِ گل سے میر
بلبل پکاری دیکھ کے صاحب پرے پرے

ہوا کے جھونکوں سے گلبن کی شاخیں انگڑائیاں لے رہی ہیں، جھکے ہوئے پھول شاید کسی کے انتظار میں تھک کر جماہیاں لینے لگے ہیں اور سرخ پھولوں کا رنگ اس قدر شوخ ہے کہ کسی عاشق کے خونیں آنسوؤں سے ان کو تشبیہ دی جا سکتی ہے۔

باغباں صبح کے وقت پھولوں کی کیاریوں کو پانی دیتے ہیں۔ پھر گلچیں آتے ہیں، پھولوں سے جھولیاں بھر کے لے جاتے ہیں۔ باغ کی جوئے رواں میں غنچۂ لالہ پانی پر اس طرح بہا پھرتا ہے جیسے کسی کا داغدار دل آنسوؤں میں تیر رہا ہو۔

میر کو باغوں اور گلزاروں کا حسن قدرتاً عزیز ہے زیادہ پرلطف سماں تب پیدا ہوتا ہے جب آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہوں اور بوندا باندی ہو رہی ہو۔

گلستاں کے ہیں دونوں پلے بھرے   بہار اک طرف اک طرف ابر ہے

چلتے ہو تو چمن کو چلیے سنتے ہیں کہ بہاراں ہے
پھول کھلے ہیں پات ہرے ہیں کم کم باد و باراں ہے

---

(۱) مثلاً "مثنوی در بیان ہولی کت خدائی" میں آغاز ؎
آؤ ساقی شراب نوش کریں۔ الخ
بہاریہ مثنوی کا آغاز ؎
سیر کریے کنارِ نہر و گشت   لالہ و گل کھلے ہیں تا سرِ دشت
یا دوسری مثنوی بعنوان "مثنوی در بیان ہولی" ؎
ہولی کھیلا آصف الدولہ وزیر   رنگِ صحبت سے عجب ہیں خورد و پیر

بادوباراں کی یہ فضا ان کے کلام میں کئی طریقوں سے پیش ہوئی ہے۔ ان کے ہاں کبھی تو کم کم کی کیفیت ہے (جو بہر حال دل پسند ہے) مگر برسات کی طوفانی کیفیتیں ان پر اور بھی اثر ڈالتی ہیں۔ کیونکہ وہ عاشقوں کے سیلاب گریہ سے مماثلت رکھتی ہیں۔ برسات کے موسم میں بادل اس طرح آسمان پر چھا جاتے ہیں گویا کسی نے سفید شال اوڑھ رکھی ہو۔ خنک اور ریزہ ریزہ بادل بھی ان کی نظر سے اوجھل نہیں جن کو "تار تار گریبان" سے تشبیہ دی ہے۔ ابر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے سفید رومال معلوم ہوتے ہیں۔ سمندروں کے مدوجزر اور موجوں کی کشاکش نے شاعر کو متاثر کیا ہے۔ وہ موجوں کی البیلی روش، حباب کے کاسہ ہائے خالی چشموں کی موسیقی اور دریاؤں کی روانی سے بھی متاثر ہوئے ہیں۔ پہاڑوں پر ڈھاک کھلا ہے، کہساروں میں سبزہ اگا ہے، لب جو کا سبزۂ نو دمیدہ، بید کی جھومتی ہوئی شاخیں، انگور کی بیلیں بھیانک رات اور راتوں کی چاندنی، آفتاب اور ماہتاب اصبا اور نسیم، وغیرہ سب اپنی اپنی نسبت سے میر کے تاثر کی دنیا میں موجود ہیں۔ مگر وہ ان کو بے جان نہیں سمجھتے، جان دار سمجھتے ہیں۔ اور ان کے حوالی میں دوسری جاندار چیزوں کو چلتا پھرتا بھی دکھاتے ہیں۔ بے جان اشیا میں ابر اور جاندار چیزوں میں بلبل کے ذریعے ساری فضا میں زبردست تحرک اور بڑی چہل پہل پیدا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ صبا اور نسیم کی "آوارہ گردی" بھی ان کے لئے زندگی بخش ہے۔

میر کے تاثر کی دنیا میں قدرت کے قہر آلود اور بھیانک نظارے بھی ویسی ہی ہلچل پیدا کرتے ہیں جیسے لطیف و جمیل مشاہدات، میر کے قدرتی مشاہدات میں جلتے ہوئے نگر بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں جن کی تاریک ویرانی میں کوئی اکا دکا چراغ اپنی تنہائی سے نمایاں ہے۔ ان نگروں کا دھواں شہروں سے دور۔ فضا میں کسی کالے دیو کی طرح آسمان سے ہم کنار ہونے کے لئے بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔ بیابانوں میں اڑتی ہوئی ریت، زرد آندھیاں اور پریشان کن بگولے بھی میر کے دل پر بڑا اثر ڈالتے ہیں۔ شہروں کی بربادیوں کی طرح خزاں کی ویرانیاں بھی میر کے احساسات میں ہنگامہ پیدا کرتی ہیں۔ ان میں بلبلوں کے مرقد، ان کے بچے ہوئے بال، صحن چمن کے گوشوں میں بال، پر کے ڈھیر، باغوں میں ٹوٹی ہوئی ڈالیاں، پژمردہ کلیاں، کمہلائے ہوئے پھول، خشک نہروں کے کنارے جھلسا ہوا سبزہ... بزم چمن کے ساتھ ساتھ قفس اور پس دیوار چمن "کسی دل شکستہ کے گیت"۔ الغرض یہی میر کی بہار و خزاں ہے جس پر ان کی نظر ایک تماشا بین کی حیثیت سے نہیں ایک حساس غمگین مگر سوچنے والے کی حیثیت سے برابر پڑ رہی ہے۔ ان کی دنیا میں جہاں گل کی ہوس تو سودائے خام ہے۔ خار و خس کی محبت ہی ایک قابل عمل سودا ہے ؎

ذکر گل کیا ہے صبا اب کی خزاں میں ہم نے
دل کو ناچار لگایا ہے خس و خار کے ساتھ

ان میں سے اکثر کیفیتیں یاس آفریں ہیں۔ (اور میر کی اصلی جذباتی کیفیتیں یہی ہیں) مگر کچھ ایسی کیفیتیں اور لطافتیں بھی ہیں جن کی میر کو تمنا معلوم ہوتی ہے (اور اگر زمانہ انہیں موقع دیتا تو شاید وہ ان سے متمتع ہونے کو دل سے پسند کرتے) ان میں سے ایک چاندنی رات ہے۔ اس سمے میں باغوں کی شب نشینی انہیں مرغوب ہے۔ اسی طرح سایۂ گل میں لب جو پر گلابی کا ہونا اور پھر کم کم بادوباراں کی حالت میں مستی و بے خودی کی حالت! انہیں مستوں کی یہ ادا بھی پسند ہے کہ وہ سایۂ تاک میں دھت ہو کر پڑے رہتے ہیں۔ اسی طرح خمار کی حالت میں محبوبوں کی انگڑائیاں اور جماہیاں وغیرہ وغیرہ ان کے تصور کے مرغوب پہلو معلوم ہوتے ہیں۔ زندگی کی یہ ادائیں انہیں غم میں بھی اچھی لگتی ہیں۔

غرض میر نے نگار خانۂ فطرت کے اکثر نقوش و تصاویر پر نظر ڈالی ہے اور ان کے رنگوں اور خوشبوؤں کو دیکھا اور سونگھا ہے۔ مگر قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان کے متعلق انہوں نے جو تاثر قائم کیا ہے اس پر ان کے اپنے نظریۂ زندگی اور احساس کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ گویا مشاہدۂ فطرت کے سلسلے میں ان کی نظر اور ان کے نظریئے کے مابین مستقل جنگ برپا معلوم ہوتی ہے۔ ان کی نظر کو اشیائے فطرت میں حسن کی جو جھلک نظر آتی ہے اس پر ان کا احساس کچھ اور رنگ چڑھا دیتا ہے۔ بہر حال فطرت سے متعلق ان کا مشاہدۂ حسن ان کے غم آلود نظریئے کا تابع ہے۔

میر کے اس ذاتی نقطۂ نظر کا ان کے مشاہدات فطرت پر جو اثر پڑا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے یہاں فطرت کے صرف وہی اجزا موجود ہیں جو خوش نما، شاندار اور غیر معمولی ہیں، جن کو میر کی فطرت نے بہ کمال خندہ پیشانی اسی طرح اپنا بنا لیا ہے

جس طرح حسین اور خوشگوار عناصر کو اپنایا ہے۔ ان کی مصورئی فطرت میں لطیف اور بھدے رنگ ایک ساتھ ملتے ہیں۔ ان کے نعمت خانہ احساسات میں شیرینیوں کے ساتھ ساتھ تلخیاں بھی ہیں۔ ان کے چمن میں بلبلیں بھی ہیں مگر ان کی نظر عنکبوت اور چیونٹی پر بھی پڑتی ہے۔ غرض ان کی نیچر کی دنیا صرف گل و گلزار ہی کا نام نہیں اس میں پھولوں کے ہمراہ کانٹے بھی ہیں اور وہ ان کی نظر میں اسی طرح رچے اور بسے ہوئے ہیں جس طرح لالہ و گل اور سمن اور گلاب۔ ان کی نظر صرف باغوں میں ہی الجھی نہیں رہتی، وہ دشت و بیابان اور اس میں اٹھنے والی زرد آندھیوں کو بھی دل میں جگہ دیتے ہیں۔ بلکہ شاید ان ناگوار عناصر کا ان کی نگاہ کچھ زیادہ تپاک سے خیر مقدم کرتی ہے۔

میر کی دنیا گل و گلزار سے معمور ہے مگر ان کا احساس ان کو یہ بتاتا ہے کہ پھولوں کا حسن فانی ہے، گلزاروں میں لالہ و گل کی کثرت ہے تو کیا جب ایک آن میں شفق کی طرح باغوں کا رنگ ہی کچھ اور ہو جاتا ہے۔ باغباں ہر سحر کلیوں کو چٹ چٹ توڑتا ہے اور بلبلوں کے دلوں کو مجروح کرتا ہے آخر اس میں کیا حکمت ہے؟ غرض حسن اور مسرت کی یہ گریز پائی اور بے ثباتی میر کو محظوظ نہیں ہونے دیتی ان کے نزدیک حسن ہر چند دلکش ہے مگر اس کا آنی جانی ہونا خود اس کے خلاف ایک دلیل ہے۔

بوئے گل اور رنگ گل دونوں ہیں دلکش اے نسیم
لیک بقدر یک نگاہ دیکھئے تو وفا نہیں

جہاں اب خار زاریں ہوگئی ہیں
یہیں آگے بہاریں ہوگئی ہیں

میر کے مشاہدہ فطرت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی قلبی کیفیتوں کو نیچر میں منعکس دکھایا ہے اس کے علاوہ بعض جگہ ان کے احساس نے اشیائے فطرت کے خواص و کیفیات بلکہ ان کی ماہیتوں کو بھی بدل دیا ہے۔ ان کی نظر میں چمن کا ہر ہر پھول اور ہر ہر غنچہ گویا قلب انسانی کے نازک احساسات کا آئینہ دار ہے۔ ان کی نظر میں پھول ایک عاشق وارفتہ ہے جس کے پیراہن میں سو جگہ رفو ہے اور غنچہ کسی عاشق کا دل ہے جو سینکڑوں آرزوؤں سے پر ہے:

چمن کی وضع نے ہم کو کیا داغ
کہ ہر غنچہ دل پر آرزو تھا

مگر دیوانہ تھا گل بھی کسو کا
کہ پیراہن میں سو جاگہ رفو تھا

میر کی نظر میں سمندر وں کے جزر و مد میں قلب انسانی کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔ ان کے تصور میں صحراؤں میں ہواؤں کے زور سے ریگ رواں کا اچھلنا ہے۔ اور بیابانوں کی آندھیاں گویا بیاباں نورد مجنوں ہیں جو عالم وحشت میں ادھر ادھر بے تحاشا دوڑتے پھرتے ہیں۔

میر کے مطالعہ فطرت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو نیچر سے کچھ اس طرح ہم آہنگ کر لیا ہے کہ اس کے مظاہر و مناظر میں انہیں اپنی ہی تصویر نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک فطرت ایک شاہد رعنا نہیں بلکہ ایک غم زدہ اور سوختہ زدہ عاشق ہے جس کی ادائیں معشوقانہ نہیں عاشقانہ ہیں، وہ حسن کی مظہر نہیں جذبے کی ترجمان ہے۔ غرض اس کے پردے میں اکثر اپنی خیالی تصویر بنائی ہے۔ اسی سبب سے ہم دیکھتے ہیں کہ فطرت ان کی رازدار بھی ہے اور ہمدم و رفیق بھی، دوست بھی ہے اور حریف بھی، شریک حال بھی اور ندیم بھی! اس سلسلے میں ان کے بڑے اور اہم رفقا ابر، بجلی آندھی اور گرد و بیاباں ہیں اور پرندوں میں یہی حیثیت ان کے نزدیک بلبل کو حاصل ہے۔

آ ابر ایک دو دم آپس میں رکھیں صحبت
کڑھنے کو ہوں میں آندھی رونے کو ہے بلا تو

جاتے نہیں اٹھائے یہ شور ہر سحر کے
یا اب چمن میں بلبل ہم ہی رہیں گے یا تو

خوب ہے اے ابر یک شب آؤ باہم روئیے
پر نہ اتنا بھی کہ ڈوبے شہر کم کم روئیے

تو کہ بان چپکی نہیں رہتی عندلیب   رکھتا ہے منہ میں غنچہ گل کو زباں کے تیئں

میرؔ کے کلام میں فطرت کا حسن اپنی خوبیوں کے باوجود دوسرے درجے کا حسن ہے ان کے تصور میں مثالی حسن کا جو نقشا ہے اس کا اعلیٰ ترین اور خوب ترین پیکر انسان کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک فطرت کا حسن اپنے سارے جمال کے باوجود حسن انسانی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ وہ یہ مانتے ہیں کہ حسن مطلق کا جلوہ ہر ہر جگہ نظر آتا ہے اور نظر آسکتا ہے۔ مگر جو جمال و کمال پیکر انسانی کو ارزانی ہوا ہے وہ فطرت کو نصیب نہیں ہوا۔ اسی خیال کے ماتحت میرؔ نے فطرت کے مقابلے میں حسن انسانی کو رنگا رنگ پیرایوں میں چمکایا ہے، چنانچہ انہوں نے کبھی تو حسینان فطرت کے حسن کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے محبوب کو اس پر محض ترجیح دی ہے مگر بالعموم فطرت میں عیب اور رخنے لگائے ہیں۔ اور ان مشابہتوں کو بڑی تحقیر سے رد کیا ہے جن کے ذریعے حسن فطرت اور حسن انسانی کو (شاعری میں) ہم پلہ ثابت کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ذیل کے اشعار سے اس کی بخوبی تشریح ہوتی ہے ؎

گل ہو مہتاب ہو آئینہ ہو خورشید ہو میرؔ
اپنا محبوب وہی ہے جو ادا رکھتا ہے

سرو و گل اچھے ہیں دونوں رونق ہیں گلزار کی لیک
چاہیئے رو اسکا ہی رو ہو قامت ویسا قامت ہو

اگرچہ گل بھی نمود اس کے رنگ کرتا ہے
ولیک چاہیئے ہے منہ بھی ناز کرنے کو

پھول، گل شمس و قمر سارے تھے
پر مجھے ان میں تمہیں بھائے بہت

میرؔ اپنی عملی زندگی میں لاکھ تنہائی پسند ہوں مگر ان کا کلام یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ تصور کے اعتبار سے خلوت پسند نہ تھے، ذہناً وہ فطرت کے ان پرستاروں میں سے نہیں جو حسن فطرت کو محض حسن فطرت کے طور پر پسند کرتے ہیں۔ اور گل و گلزار اور دشت و کہسار کے بے جان مناظر کو دیکھ کر جھومتے رہتے ہیں۔ محض نیچر کی پرستش ضعیف جذبات کی پیداوار ہے۔ حسن و محبت کے قوی تر جذبات غالباً اس 'بے لطف، اور بے تہ' مسرت سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔ پہاڑوں اور دریاؤں کی سیر و گلگشت لاکھ دل آویز سہی مگر یہ سب کچھ دل اور دل کے محبوب کی ہمراہی میں ہی پر لطف ہو سکتا ہے ورنہ ہیچ۔ اس لحاظ سے نری نیچر کی پرستش ان عارفوں اور صوفیوں کی خیالی عقیدت یا مسرت سے مشابہہ ہے جو کسی خیالی اور نادیدہ محبوب کے عشق میں گویا اندھیرے میں ٹامک ٹوئیے مارتے رہتے ہیں۔ مگر وہ بھی آخر مجازی محبوب کا سہارا لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ فطرت انسانی کا تقاضا شاید یہی ہے کہ انسان کا محبوب انسان ہی ہو سکتا ہے۔ باقی جذبے اس انسانی جذبے کے تابع ہیں۔ پس نری فطرت پرستی کھوکھلی سی حسن پرستی ہے اور میرؔ ایسے فطرت پرست نہیں۔ میرؔ نے فطرت کے ضمن میں جہاں کہیں بھی حصول مسرت یا لذت کا اظہار کیا ہے وہاں کسی رفیق و ہمدم کی موجودگی کو بھی تسلیم کیا ہے یا اس کو ضروری قرار دیا ہے، ایسے عالم میں وہ مستی اور بے خودی کے بھی طلب گار معلوم ہوتے ہیں جس کے طفیل زندگی کا جمود کچھ دیر کے لئے رفع کیا جا سکتا ہے ؎

سایۂ گل میں لب جو پہ گلابی رکھو
ہاتھ میں جام لو اور آپ کو بدنام کرو

مستی میں ہم کو ہوش نہیں نشأتین کا
گلشن میں اینڈتے ہیں پڑے زیر تاک ہم

کن نے بدی ہے اتنی دیر موسم گل میں ساقیا
دے بھی مے دو آتشہ روز ہی سرد ہے ہوا

اچھی لگی ہے تجھ بن گلگشت باغ کس کو
صحبت رکھے گلوں سے اتنا دماغ کس کو
گلچین عیش ہوتے ہم بھی چمن میں جا کر
آہ و فغاں سے اپنی لیکن فراغ کس کو

فطرت کی یہ ادا اس فضا حسن کا ذرہ ذرہ اور چپہ چپہ شاعر کیلئے ایک شہادت گہ ہے، جس کے چمن کا ہر گل خونیں کفن ہے اور اس کا ہر غنچہ ایک گھٹا ہوا دل ہے آخر شاعر کو یہ کہنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ خارجی کائنات کی فضاؤں میں کیا رکھا ہے، اس سے بہتر گلزار تو دل کے اندر موجود ہے

کروں کیا حسرت گل کو وگرنہ
دل پُر داغ بھی اپنا چمن ہے

گلگشت کا بھی لطف دلِ خوش ہے اے نسیم!
پیشِ نظر وگرنہ دلِ زار کیوں نہ ہو

اردو شاعری میں صوفیانہ وحدت الوجود کے زیرِ اثر فطرت خود خدا کا روپ ہے، اس کے ذرّے ذرّے میں خدا خود جلوہ گر ہے۔ میرؔ کے یہاں یہ صوفیانہ تخیل (شاید رسماً) کہیں کہیں دخیل ہو گیا ہے۔ مگر اس میں بھی ان کا ذہن زہمہ اوستی کم، "ہمہ از وستی" سانچے کا معلوم ہوتا ہے ؏

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اسی کا ذرہ ظہور تھا

اس شعر میں حسن کائنات کو حسن ازل سے مستعار مانا گیا ہے مگر اس کے برعکس ان کے کلام میں اس طرح کے شعر بھی مل جاتے ہیں۔

جلوہ ہے اسی کا سب گلشن میں زمانے کے
گل پھول کو ہے اس نے پردہ سا بنا رکھا

مگر ان کے تصورات کا عام انداز یہ کہتا ہے کہ وہ خدا، انسان اور فطرت تینوں کی الگ الگ شخصیت کے قائل ہیں اگرچہ رسماً یہ بھی مانتے ہیں کہ فطرت کے اندر ایک ہی روح جاری و ساری ہے، اس کے مختلف روپ مختلف حالات میں مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوتے رہتے ہیں، نہ حسن کی کلیت کے بھی قائل ہیں اور کائنات کی سب اشکال جمیل کو اس کُلّی کا پرتو مانتے ہیں ؎

گر گل ہے گاہ رنگ، گہے باغ کی ہے بو
آتا نہیں نظر وہ طرح دار اک طرح
نیرنگ حسن دوست سے کہ آنکھیں آشنا
ممکن نہیں وگرنہ ہو دیدار اک طرح

ان کے اس قسم کے اشعار سے ان کا "ہمہ اوستی" تصور ظاہر ہوتا ہے۔ مگر مجموعی لحاظ سے ان کا عام نقطۂ نظر یہ احساس دلاتا ہے کہ ان کے نزدیک فطرت، خدا اور انسان الگ الگ وجود ہیں، نگارخانۂ فطرت ان کے خیال میں خوش گوار اور ناگوار، خوش نما اور بدنما سبھی عناصر کا مجموعہ ہے۔ اگرچہ اس میں پُرخوف، ناگوار اور غم انگیز اثرات و نقوش کا غلبہ ہے جس سے انسان کو ہر لحظہ دوچار ہونا پڑتا ہے، ان کے نزدیک فطرت کی آنکھ جتنی حسین ہے اتنی مغموم اور خشمگین بھی ہے، فطرت ان کے خیال میں خود کو سنوارتی بھی ہے اور بگاڑتی بھی ہے اور اس کی اکثر عادتیں انسانوں کی سی ہیں (خدا کی سی نہیں) مثلاً انسان کی طرح یہ فنا پذیر ہے اور زوال اس کی فطرت میں ہے، اس کا جمال عارضی اور فریب دہ ہے اور یہ سب کچھ محض عناصر کا کھیل ہے۔ اس میں حسن ہے مگر اس کے حسین انداز قائم بالذات نہیں، تخریب اور بگاڑ کے رہینِ منت ہیں ؎

گل و سنبل ہیں نیرنگ قضا، مت سرسری گذرے
کہ بگڑے زلف و رخ کیا کیا بنا تے اس گلستاں کو

غرض یہ سب اوصاف ایسے ہیں جن کو خدائی اوصاف نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ یہ انسانی اوصاف ضرور ہیں پس ان کے نزدیک فطرت اور انسان ایک ہی قانونِ عالم گیر کے تابع وجود ہیں۔

حسن فطرت کے متعلق خیامؔ اور حافظؔ اور بعد میں غالبؔ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ باغوں کے پھول گل دراصل حسن انسان ہی کی قلبِ ماہیت ہیں مثلاً نرگس حسینوں کی آنکھ اور سرو حسینوں کا قامت اور سنبل کسی محبوب کے گیسو ہیں اور یہ زمین میں دفن شدہ حسینوں کے حسن کی ایک بدلی ہوئی صورت ہے بقول غالبؔ ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

میرؔ کے یہاں بھی حسنِ فطرت کا یہ تصور ملتا ہے ؎

گل یادگارِ چہرۂ خوباں ہے بے خبر
مرغ چمن نشانِ [illegible] ہے زبان کا

؎ لختِ جگر پڑے ہیں نہیں برگ ہائے گل

یہ دراصل اس طرز فکر کی پیداوار ہے کہ انسان نہ صرف اشرف المخلوقات ہے بلکہ احسن المخلوقات بھی ہے اور کائناتی حسن کا منبع اسی کا پیکر جمیل ہے اور بس۔

"اندر سبھا" کی ادبی حیثیت

وقار عظیم

امانت لکھنوی کی اندر سبھا، جو عرفِ عام میں صرف 'اندر سبھا' ہے عرصہ تک علمی اور ادبی حلقوں میں بحث کا موضوع بنی رہی۔ اس کتاب کے متعلق بعض ایسی روائیتیں عام ہوگئی تھیں جن کا کوئی سر پیر نہیں تھا۔ لیکن تحقیق اور چھان بین نے ان غلط روایتوں کو غلط ثابت کرکے اس کے ماخذ اور محرکات کے سلسلے میں جو نتائج اخذ کئے ہیں انہوں نے ان تمام غلط فہمیوں کا ازالہ کردیا ہے جو پڑھنے والے کے ذہن کو غلط راہوں پر ڈالتی تھیں۔ "ناٹک ساگر" کے مولفین نے اندر سبھا کے متعلق یہ لکھا کہ وہ کسی فرانسیسی کے تخیل کا نتیجہ ہے اور امانت نے واجد علی شاہ کے ایما سے اسے تصنیف کیا ہے۔ پھر یہ کہ اندر سبھا کو قیصر باغ میں اسٹیج کیا گیا، اور واجد علی شاہ نے اس میں راجا اندر کا پارٹ ادا کیا۔ مولانا عبدالحلیم شرر اور پروفیسر مسعود حسن رضوی نے بڑی واضح دلائل اور شہادتوں کی بنا پر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی صحیح نہیں ان شہادتوں اور دلیلوں پر نظر ڈالنے کے بعد کسی کو ان دونوں محققوں کے نتائج کے صحیح تسلیم کرنے میں تامل نہیں ہوتا۔

اندر سبھا کے مصنف نے شرح اندر سبھا میں اس بات کی صراحت کردی ہے کہ یہ منظوم قصہ اس نے اپنے ایک دوست کی تحریک پر اس غرض سے لکھا کہ دیکھنے والوں کے لئے دلچسپی اور تفریح کا سامان مہیا کرسکے۔ یہی دلچسپی اور تفریح کا سامان مہیا کرنے کے لئے اندر سبھا کو اس کی موجودہ صورت دی گئی۔ یعنی قصے کو اس انداز سے ترتیب دیا گیا کہ وہ اسٹیج بھی کیا جاسکے، اور اس میں موسیقی اور رقص کے ایسے عناصر شامل ہوں جو ناظرین اور سامعین کے نشاطِ خاطر کا سرمایہ بہم پہنچا سکیں۔ اندر سبھا کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس کے بنیادی تخیل میں اردو کی وہ مافوق الفطرت کہانیاں شامل تھیں جو مثنوی کی شکل میں خواص اور عوام میں قبول حاصل کرچکی تھیں۔ اسے ایک شکل دینے کے لئے کہ اندر سبھا بجائے مثنوی کی طرح پڑھی جانے کے اس طرح عملی صورت میں پیش کی جائے کہ وہ "جنت نظر اور فردوس گوش" بھی بن سکے۔ امانت کے سامنے وہ 'رہس' موجود تھے جن کا لکھنؤ کے گردوپیش کی ہندوانہ معاشرت میں عام رواج تھا۔ اس طرح امانت نے اپنے ایک دوست کے کہنے سے مثنوی اور رہس کی ملی جلی بنیادوں پر اردو میں ایک ایسی چیز لکھی جو ہمارے موجودہ ڈرامے کی بنیاد بنی۔

ہمارے ڈرامے کا سارا ادبی اور فنی تخیل اندر سبھا سے ماخوذ ہے، اور اپنے ابتدائی دور میں ہمارے ڈرامے کی ساری روایت 'اندر سبھا' کی دی ہوئی روایتوں پر قائم ہے — کہانی کا مافوق الفطری اور تخیلی ماحول، رقص اور موسیقی کا غلبہ، ڈرامے میں قصہ کہانی کی ایک ثانوی اور ضمنی حیثیت، کرداروں کی گفتگو اور عمل میں شخصیت کا واضح فقدان، ان کو بنیادی طور پر دلچسپی، تفریح اور نشاطِ طبع کا ایک وسیلہ بنانے کا غالب رجحان — اپنے ابتدائی دور میں ہمارا ڈراما ان خصوصیات کا حامل ہے لیکن ان ساری خصوصیات میں رقص و سرود کی حیثیت ایک محور کی سی ہے، جس کے گرد باقی ساری چیزیں گردش لگاتی ہیں۔ ان ابتدائی ڈراموں میں قدم قدم پر گھنگھروؤں کی جو جھنکار اور نغموں کی جو گونج سنائی دیتی ہے وہ اندر سبھا کے پیدا کئے ہوئے رقص و نغمہ کی صدائے بازگشت ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اکثر اوقات اندر سبھا کے نغموں اور اس کے زیر اثر لکھے جانے والے ڈراموں میں نمایاں طور پر وہی فرق نظر آتا ہے جو اصل اور نقل میں ہونا چاہیئے — یوں کبھی کبھی ان میں سے بعض میں "نقش ثانی" کی رنگینی بھی جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔

'اندر سبھا' کا مطالعہ کرنے والا بالکل شروع ہی میں یہ بات آسانی سے

محسوس کر لینا ہے کہ امانت نے دلچسپی، تفریح اور نشاطِ طبع کا واحد وسیلہ موسیقی کو بنایا ہے اور یہ بات کتاب کا مطالعہ ختم کرتے کرتے پڑھنے والے کے ذہن پر ایک گہرے نقش کی طرح ثبت ہو جاتی ہے کہ "اندر سبھا" کا بنیادی تصور موسیقی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں جو کچھ ملتا ہے اس کی حیثیت ضمنی اور ثانوی ہے۔

اندر سبھا کا آغاز سات شعروں کی ایک غزل سے ہوتا ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

سبھا میں دوستو اندر کی آمد آمد ہے
پری جمالوں کے افسر کی آمد آمد ہے

قصہ میں یہ بات کہیں نہیں بتائی گئی کہ یہ غزل کس نے گائی ہے۔ لیکن غزل کے مختلف اشعار میں جو باتیں کہی گئی ہیں ان کا مقصد صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اہلِ مجلس کو بتانا چاہتا ہے کہ اب کیا کیا خاص چیزیں اسٹیج پر آنے والی ہیں۔ مثلاً غزل کا چوتھا اور پانچواں شعر ہے ؎

[illegible] کے ساتھ محفل میں
پری کے دیو کے لشکر کی آمد آمد ہے
زمیں پہ آئیں گی راجا کے ساتھ سب پریاں
ستاروں کے مہِ انور کی آمد آمد ہے

ان شعروں سے معلوم ہوتا ہے کہ محفل میں راجا (اندر) آئیں گے، پریاں آئیں گی اور دیو آئیں گے۔ اس خوشخبری کے ساتھ چھٹے شعر میں جو نویدِ جاں فزا سنائی جاتی ہے وہ بڑی معنی خیز ہے اور اسے پڑھ کر (یا سن کر) یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سامعین کو اب تک جو خبر سنائی گئی ہے وہ اتنی اہم نہیں۔ اصل خبر وہ ہے جو اب سنائی جا رہی ہے۔ اسے سن کر سننے والے پھڑک جائیں گے۔ شعر یہ ہے ؎

غضب کا گانا ہے اور ناچ ہے قیامت کا
بہارِ فتنۂ محشر کی آمد آمد ہے

غزل جس شعر پر ختم ہوتی ہے وہ یہ ہے ؎

بیان راجا کی آمد کا کیوں کروں استاد[1]
جگر کے جان کے دلبر کی آمد آمد ہے

یہ شعر راجا کی آمد کا پیش خیمہ ہے۔ اس کے بعد راجا اندر خود اسٹیج پر آتے ہیں اور اپنا تعارف لوگوں سے کراتے ہیں۔ سیاق و سباق کو دیکھنے کے بعد یہ قیاس کر لینا دشوار نہیں کہ اندر سبھا کی پہلی تعارفی غزل کسی ایسے شخص کی زبانی ہے جو قصہ میں راوی کے فرائض انجام دیتا ہے چنانچہ اس موقعہ پر وہ راجا کا ذکر کرکے ہٹ جاتا ہے اور راجا خود سامنے آکر کہتے ہیں ؎

راجا ہوں میں قوم کا اندر میرا نام
بن پریوں کی دید کے مجھے نہیں آرام

"بن پریوں کی دید کے مجھے نہیں آرام" میں کردار نگاری کی ایک ہلکی سی جھلک ہے۔

پہلے شعر کے بعد راجا کالے دیو کو تخت بچھانے، سبھا تیار کرنے اور پریوں کو لا کر باری باری ان کا مجرا کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اس کے بعد پھر "راوی" سامنے آتا ہے اور سامعین کو یہ مژدہ سناتا ہے کہ ؎

محفل راجہ میں پکھراج پری آتی ہے
سارے معشوقوں کی سرتاج پری آتی ہے

اس تعارف اور اعلان کا چوتھا اور آخری شعر یہ ہے ؎

رنگ ہو زرد حسینوں کا نہ کیونکر اُستاد
غل ہے محفل میں کہ پکھراج پری آتی ہے

یہ شعر ختم ہوتے ہی پکھراج پری اسٹیج پر آتی ہے اور اپنی تعریف میں ۹ شعر کی ایک غزل گاتی ہے۔ غزل کا مطلع ہے ؎

گاتی ہوں میں اور ناچ سدا کام ہے میرا
آفاق میں پکھراج پری نام ہے میرا

اس "حسب حال شعر خوانی" کے بعد تین شعروں میں راجا کو دعا دیتی ہے اور اس کا شکر یہ ادا کرتی ہے کہ اس نے اسے محفل میں یاد کیا۔ دُعائیہ شعر پڑھ کر پکھراج پری ایک ٹھمری، ایک بسنت، ایک غزل (بسنت) ایک ہولی اور پھر دو غزلیں (یعنی چھ گانے) گاتی ہے۔

راجا اندر کی درخواست پر پکھراج پری راجا کے پاس جاکر بیٹھ

---

[1] ۔ غزل کے مقطع میں اُستاد امانت کا دوسرا تخلص ہے۔ اس تخلص کے متعلق شرح اندر سبھا میں امانت نے لکھا ہے۔ "چونکہ یہ جلسہ کہنا سب کو مرغوب تھا مگر اپنے نزدیک معیوب تھا۔ اس لحاظ سے اپنا تخلص بدل اس میں اُستاد تخلص کیا۔" امانت کے اس بیان کی تائید ان سب غزلوں سے ہوتی ہے جو پریوں نے سبھا میں گائی ہیں لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ بعض غزلوں میں اُستاد کی جگہ امانت تخلص بھی موجود ہے اور ایک غزل میں تو ایک ساتھ دونوں تخلص ہیں۔

جاتی ہے اور 'راوی' اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ ؎

سبھا میں آمدِ نیلم پری ہے
سراپا وہ نزاکت سے بھری ہے

اس کے بعد واقعات کی ترتیب وہی ہے جو اس سے پہلے پکھراج پری کی آمد پر پیش آئی تھی ــــ شعر خوانی حسب حال زبانی نیلم پری، چھند زبانی نیلم پری، ٹھمری، ہولی، غزل، غزل دوسری، غزل تیسری، اس کے بعد لال پری کا راجا اندر کے پہلو میں بیٹھ جانا ــــ اور اس کے بعد پھر وہی ترتیب راوی کی زبانی لال پری کی آمد کا اعلان۔ ع

سبھا میں لال پری کی سواری آتی ہے

اور شعر خوانی زبانی لال پری، چھند زبانی لال پری، ٹھمری، ساون غزل ساون، ہولی، غزل، دوسری غزل، اور اس کے بعد راجا کی درخواست پر لال پری کا راجا کے پہلو میں جا کر بیٹھ جانا اور محفل میں سبز پری کا آنا۔

سبز پری کی آمد پر بھی 'راوی' سامنے آکر اس کی آمد کا اعلان کرتا ہے ؎

آتی نئے انداز سے اب سبز پری ہے
لب سُرخ ہیں، پر سبز ہیں پوشاک ہری ہے

اور اس اعلان کے آخر میں یہ شعر پڑھتا ہے ؎

اُستاد عجب عاشق و معشوق کے ہیں نام
شہزادۂ گلفام ہے یہ سبز پری ہے

یہ شعر محبت کے اس آنے والے طوفان کی خبر دیتا ہے جس کی لہریں اس "شعر خوانی" میں اُٹھتی اور پھیلتی نظر آتی ہیں جو سبز پری نے حسب معمول اپنا حال بیان کرتے وقت کی ہے۔ اس شعر خوانی کے آخری تین شعروں میں سبز پری شہزادۂ گلفام سے اپنی محبت کا ذکر اس طرح کرتی ہے۔ ؎

زندہ نہ رکھے گا مجھے سُن لے گا جو راجا
شہزادۂ گلفام کی صورت پہ مری ہوں
وہ شمع، میں پروانہ ہوں، وہ سرو میں قمری
وہ گل ہے جہاں میں، میں نسیم سحری ہوں
اُستاد کے دم سے چمن حسن ہے سرسبز
میں واسطے طاؤس کے دانۂ جگری ہوں

ابھی سبز پری یہ شعر ختم نہیں کر چکتی کہ راجا کو نیند آ جاتی ہے۔ وہ سو جاتا ہے تو پری باغ میں چلی جاتی ہے اور وہاں جا کر کالے دیو کو بتاتی ہے کہ راجا کی محفل میں آتے ہوئے میں نے شہزادہ گلفام کو بام پہ سوتا ہوا دیکھا، اس کی صورت دیکھ کر دل بے قرار ہو گیا اور میں نے اُسے خوب جی بھر کے پیار کیا۔ اب میرا حال یہ ہے کہ محفل میں میرا جی نہیں لگتا اس لئے تو جا کسی طرح شہزادے کو یہاں اٹھا لا۔ کالا دیو پری سے شہزادے کا پتہ پوچھتا ہے۔ سبز پری اس سے کہتی ہے ؎

چھلا میں دے آئی ہوں اپنا اسے نشان
سبز نگوں کی آب سے تو اس کو پہچان

اس کے بعد کے واقعات یہ ہیں کہ کالا دیو شہزادہ گلفام کی تلاش میں جاتا ہے اور ہندوستان سے اس کا پلنگ اٹھا لاتا ہے۔ پھر سبز پری سے پوچھتا ہے کہ دیکھ یہی تیرا محبوب ہے؟ شہزادی کہتی ہے کہ ہاں یہی میرا دلدار ہے۔ اس کے بعد شہزادے کو جگا کر ہوشیار کرتی ہے۔ یہ سارے واقعات تین شعروں میں بیان ہوتے ہیں ؎

لایا میں شہزادے کو جا کر ہندوستان
تو اپنے معشوق کو سبز پری پہچان

یہی ہے شہزادہ مرا، یہی ہے میری جان
یہی مرا دلدار ہے، میں اس پر قربان

سوتے ہو کیا بے خبر چھوڑ کے تم گھر بار
آنکھیں کھولو لاڈلے، نیند سے ہو ہشیار

قصے کے اس حصہ کو امانت نے جس روا روی کے ساتھ بغیر کسی ربط اور تسلسل کے، اور زمان و مکان کے فنی تقاضوں سے بے نیاز ہو کر تین شعروں میں بیان کر دیا ہے، اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ قصے سے زیادہ ناچ اور گانے کو اہم جانتے ہیں اور ان کی کوشش یہ ہے کہ جلدی سے جلدی کوئی ایسا محل پیدا کریں کہ ناظرین کے لئے جنہیں تین پریوں کے ناچ گانے کے بعد کوئی باقاعدہ گانا سننے کا موقع نہیں ملا، جلد سے جلد کوئی گانا سُن سکیں۔ چنانچہ بادل ناخواستہ قصہ کی یہ منزلیں غیر معمولی سرعت سے طے کر کے

وہ ایک ایسی جگہ پہنچ جاتا ہے جہاں اسٹیج رنگا نا گایا جا سکے۔ ہوتا یہ ہے کہ جب پری شہزادے کو جگاتی ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ اس کا پلنگ سوتے میں کہیں سے کہیں پہنچ گیا تو وہ بقول امانت "عالمِ حیرت میں بے تاب ہوکر" ایک غزل گاتا ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

گھر سے یاں کون خدا کے لئے لایا مجکو
کس ستم گار نے سوتے سے جگایا مجکو

اس غزل کے بعد وہ بہاگ کی ایک چیز گاتا ہے۔

اس کے بعد سبز پری شہزادے کا ہاتھ تھام کر اُسے لبھانے کی کوشش کرتی ہے اور اس سے اس کا حسب نسب اور پتہ نشان پوچھتی ہے۔ شہزادہ اُسے بتاتا ہے کہ میں ہند کا شہزادہ گلفام ہوں لیکن تو آخر کس قوم کی عورت ہے اور تیرے دونوں کندھوں پر یہ کیا چیز نکلی ہے۔ سبز پری اسے بتاتی ہے کہ میں سبز پری ہوں۔ اس پر شہزادہ اس سے پوچھتا ہے کہ میں یہاں کس طرح آیا۔ پری اس کے جواب میں شہزادے سے اپنی محبت اور فریفتگی کا حال کہتی ہے اور شہزادے کو طرح طرح سے اپنانے کی کوشش کرتی ہے۔ بالآخر شہزادہ اس شرط پر اس سے "وعدۂ وصل" کرتا ہے کہ وہ اسے اندر کی سبھا میں لے جا کر پریوں کا ناچ دکھا دے۔ سبز پری شہزادے کو اس خیال سے باز رہنے کی تلقین کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ انسان کا پری زادوں میں جانا کتنی خطرناک بات ہے۔ لیکن جب شہزادہ کسی طرح باز نہیں آتا تو اُسے اپنے تخت کے پایہ کے سہارے اندر کی سبھا میں لے جاتی ہے۔ وہاں پہنچ کر راجا سے شکایت کرتی ہے کہ مجھے سبھا میں بلوا کر آپ سو گئے اب میں ؎

کرنے اپنا کام یہاں پھر میں ہوں آئی
ٹھمری، چھند، غزل کی جی میں دھن ہے سمائی

یہ کہہ کر دو ٹھمریاں اور دو لمبی لمبی غزلیں گاتی ہے۔ دوسری غزل کا مقطع ہے ؎

پھنسی ہے عشق کے پھندے میں بے ڈھب جان اماؔنت کی
مدد کو یا علی پہنچو دمِ مشکل کشائی ہے

اس شعر میں بظاہر اپنے اور شہزادہ گلفام کی مصیبت کی طرف اشارہ ہے۔ اور یہ اشارہ اس لئے پُرلطف ہے کہ اس شعر کے ختم ہوتے ہی لال دیو راجا اندر کے سامنے آتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ "مہاراج! میں نے شمشاد کے درخت کے پیچھے ایک آدم زاد کو دیکھا ہے، معلوم نہیں وہ یہاں کیسے آیا"۔ اس پر سبز پری لال دیو کو ڈانٹ کر کہتی ہے کہ اے بے مروت اس طرح کی باتیں نہ کر۔ ذرا اپنی زبان کو تھام۔ سن لے کہ چغل خور کے منہ کو سانپ ڈستے ہیں۔ ان پانچ شعروں میں آخری شعر یہ ہے ؎

دل عاشق کا اس بات سے ہل گیا
تجھے ہائے کم بخت کیسا مل گیا

شعر سبز پری کی دلی کیفیتوں کا ترجمان ہے۔

راجا اندر لال دیو کی باتیں سُن کر کہتا ہے کہ یہ تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔ بھلا میرے باغ میں انسان کا کیا کام۔ ممکن ہے کہ اسے کوئی دیو یہاں لایا ہو، یا کوئی پری لائی ہے۔ تو جا اور جلد اسے پکڑ کر میرے پاس لا" یہ حکم پاتے ہی لال دیو گلفام کے پاس جاتا ہے اور غصہ میں اس سے پوچھتا ہے کہ تو کون ہے اور تجھے یہاں کون لایا ہے؟ چل راجا کے دربار میں تیری طلبی ہے"۔ غرض لال دیو شہزادہ گلفام کو کھینچ کر راجا کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔ راجا گلفام سے پرستان میں آنے کی کیفیت دریافت کرتا ہے اور غصہ میں اس سے کہتا ہے ؎

بتا حال آنے کا اے دردناک
جلا کر ابھی ورنہ کردوں گا خاک

راجا کے سوال پر گلفام عرض کرتا ہے کہ ؎

کہوں کیا فلک کا ستایا ہوں میں
یہاں کھیل کر جی پہ آیا ہوں میں

اس کے بعد اپنے اور سبز پری کے عشق کا حال بیان کر کے بے بسی سے کہتا ہے ؎

بلا میں پھنسا یاں گرفتار ہوں
جو چاہے سزا دو گنہ گار ہوں

راجا کو شہزادے کی باتیں سُن کر بے حد غصہ آتا ہے۔ وہ سبز پری کو سامنے بُلا کر اُسے سخت لعنت ملامت کرتا ہے۔ راجا کی زبان سے اماؔنت نے اس موقع پر جو شعر کہلوائے ہیں ان میں الفاظ کے انتخاب اور اُن کی نشست بے حد موزوں اور مناسب ہے۔ راجا کی زبان سے نکلے ہوئے پانچ شعر یہ ہیں ؎

اری او پری سبز، او بے حیا
مرے سامنے جلد آ بیسوا

ٹھڑی ہے تری ذات بنیاد پہ
کہ عاشق ہوئی آدمی ذات پر
بنایا ارے تو نے انساں کو یار
بقولِ حسن سُن تو اسے نابکار
ترا رنگ غیرت سے اُڑتا نہیں
تجھے کیا پری زاد جڑتا نہیں
سبھا میں لگا لائی انساں کو ساتھ
ترا اب گریباں ہے اور میرا ہاتھ

ان شعروں کا ایک ایک لفظ راجا اندر کی شخصیت اور اس کے جذبات کا بڑا صحیح عکس ہے۔ بے حیا، بیسوا، ٹھڑی، نابکار، یار، جڑتا نہیں میں جو معنویت اور بلاغت ہے وہ اندر سبھا کے مکالموں میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ سبز پری، گلفام اور راجا اندر کی زبان سے امانت نے جو شعر نکلوائے ہیں اُن میں کردار کے مزاج اور محل کے علاوہ ان تینوں کے جذبات و احساسات کی بڑی مصوّری ہے اور امانت کے فن کارانہ انتخابِ الفاظ کی شہادت اور دلیل ہے۔

اس بات کو جملۂ معترضہ سمجھئے اور آگے چلیئے ——— راجا کے اظہارِ ناراضی پر سبز پری بے حد نادم ہوتی ہے اور گلفام سے مخاطب ہو کر اور اسے گلے لگا کر بڑی حسرت سے کہتی ہے ؎

جو جیتے رہیں گے تو مل جائیں گے
نہیں تو کئے کی سزا پائیں گے

اس کے بعد راجا لال دیو کو حکم دیتا ہے کہ "آدمی زاد کو قاف کے کنوئیں میں مقید کر دے اور اس بیسوا کے پر و بال نوچ کر اُسے اکھاڑے سے نکال دے۔"

راجا اندر کے آخری الفاظ یہ ہیں کہ ؎

اُڑاتی پھرے خاک یہ کو بہ کو
نہ آئے ہمارے کبھی روبرو

اس شعر کے بعد جو کچھ پیش آیا اُس پر امانت نے فن کا لطیف پردہ ڈالا ہے۔ یہ بات ناظر کے تصور کے لئے چھوڑ دی ہے کہ وہ جوگن کے اکھاڑے سے نکالے جانے کے واقعہ کو خود حقیقت بنتا دیکھ لے۔ راجا اندر کے الفاظ کے بعد فوراً ہی سبز پری یہ غزل گاتی ہوئی سنائی دیتی ہے ؎

جوگن آتی ہے پری بن کے پرستان کے بیچ
سُمرنیں ہاتھوں میں، مندلے ہیں پڑے کانوں کے بیچ

اس غزل کے بعد جوگن (یعنی سبز پری) دو ٹھمریاں اور دو غزلیں گاتی ہے۔ یہ پانچوں گانے، بحر، وزن اور الفاظ کے انتخاب کے علاوہ مضامین کی نوعیت کے اعتبار سے جوگن کی جذباتی کیفیت اور اس کے احساسِ غم اور درد کی کسک کے ترجمان ہیں۔ پہلی ٹھمری کے ابتدائی بول ہیں:

میں تو شہزادے کو ڈھونڈھن چلیاں

اور دوسری کے:

کہاں پاؤں، کہاں پاؤں یار رے میں

اسی طرح پہلی اور دوسری غزلوں کے مطلعے ہیں:

(۱) مرتا ہوں ترے ہجر میں اے یار خبر لے
اب جان سے جاتا ہے یہ بیمار خبر لے

(۲) روح بدن میں ہے طپاں جی کو ہے کل سے بے کلی
جلد خبر لو ہمدمو! جان فراق میں چلی

ادھر تو جوگن کوچۂ و بازار میں لوگوں سے اپنا درد دل کہتی پھر رہی ہے اور ادھر کالا دیو راجا اندر سے جا کر کہتا ہے کہ پرستان میں ایک جوگن آئی ہوئی ہے۔ وہ اتنا اچھا گاتی ناچتی ہے کہ ایک خلق اس کی تماشائی ہے۔ اس کی بھیروں کی ہر تان پر خدائی کا دل قربان ہے ——میں نے تو ع

نہ دیکھی ہے جوگن نہ ایسی سُنی

راجا اندر کے دل میں کالے دیو کی باتیں سُن کر اشتیاق پیدا ہوتا ہے اور وہ کالے دیو سے کہتا ہے کہ ممکن ہے یہ جوگن کسی کی ستائی ہوئی ہو اور میرے پاس فریاد لے کر آئی ہو۔ مجھے راگ اور ناچ کا شوق ہے اس لئے اس جوگن سے کہو کہ بغیر کسی وسوسے اور اندیشے کے میرے پاس آئے اور مجھے اپنا جمال دکھائے۔

کالا دیو جوگن کے پاس جاتا ہے اور اس سے راجا اندر کے اشتیاق کا ذکر کرتا ہے۔ جوگن جواب میں طعن آمیز اور لگاوٹ کی باتیں کرتی ہے ؎

یہ باتیں نہ لاؤ زباں پر کبھی
فقیروں سے اچھی نہیں دل لگی

فقیروں کو دولت کی پروا نہیں
یہاں ہر کے اقبال سے کیا نہیں
طبیعت مخاطب اگر پاؤں گی
جو آتا ہے تجھ کو سنا آؤں گی[1]

کالا دیو جوگن کو راجا کے سامنے لے جاتا ہے اور اس کے گانے کی تعریف ان لفظوں میں کرتا ہے ؎

عجب خوش گلو ہے یہ زہرہ جبیں
اڑاتی ہے جنگلے میں کیا بھیرویں

راجا جوگن سے اس کا حال پوچھتا ہے اور گانے کی فرمائش کرتا ہے۔ جوگن جواب میں کہتی ہے کہ مجھ سے میرا محبوب چھٹ گیا ہے، میں اس کی تلاش میں نکلی ہوں۔ میں آپ کو گانا سناتی ہوں۔ ممکن ہے اس طرح دل کی مراد مل جائے۔ اگر میرے گانے سے آپ پر اثر ہو تو میرا سوال رد نہ کیجئے گا۔ یہ باتیں کہہ سن کر جوگن بھیرویں میں ایک ٹھمری گاتی ہے۔ راجا خوش ہو کر ایک گلوری پیش کرتا ہے تو جوگن یہ کہہ کے عذر کر دیتی ہے کہ ع

پان لے کے کیا کروں کسی سبز رنگ کا دھیان ہے

اور پھر ایک ہولی بھیرویں کی دُھن میں گاتی ہے۔ راجا خوش ہو کر اسے ہار انعام میں دینا چاہتا ہے لیکن وہ یہ شعر پڑھ کر انکار کر دیتی ہے ؎

ہار زنہار نہ لوں گی دل کو خار ہے
اپنا گل عذار گلے ہار ہو تو بہار ہے

اس انکار کے بعد وہ ایک غزل بھیرویں کی دھن میں گاتی ہے۔ غزل کا مطلع ہے ؎

دل کو چین اک دم تہِ چرخ کہن ملتا نہیں
وہ مرا گلفام وہ گل پیرہن ملتا نہیں

راجا یہ غزل سُن کر جوگن کو شالی رومال دیتا ہے جوگن یہ کہہ کر رومال لینے سے انکار کرتی ہے کہ ؎

رومال انھیں دیجئے جو تنگ دست ہیں
فقیر اپنی کملی میں یاں مست ہیں

اور اس کے بعد طلب گلفام میں ایک غزل گاتی ہے۔ راجا سبز پری کو پہچان لیتا ہے اور لال دیو سے کہتا ہے کہ جوگن نے مجھے بڑا دھوکا دیا۔ اس کا محبوب اسے کبھی نہ ملتا۔ لیکن میں قول ہار چکا ہوں اسلئے گلفام کو کنوئیں سے نکال کر اس کے حوالے کر۔ لال دیو گلفام کو لاتا ہے اور دونوں عاشق معشوق آپس میں سوال جواب کر کے ایک دوسرے کا حال پوچھتے ہیں۔ ایک شعر سبز پری پڑھتی ہے۔ اسی زمین میں ایک شعر شہزادہ پڑھتا ہے، پھر ایک شعر پری اور ایک شعر شہزادہ۔ اس طرح دونوں ۱۵ شعروں میں ایام جدائی کی ساری داستان ایک دوسرے کو سنا دیتے ہیں۔ اس مکالمے کے آخر میں شہزادے اور پری نے جو دو شعر پڑھے یا گائے وہ یہ ہیں ؎

میں ترے ہاتھ لگا تو مرے پھندے میں پھنسی
میرا مطلب ہوا، امید بر آئی تیری

یہ تمنا ہے مرے دل میں کہ اب حشر تلک
فضلِ استاد سے دیکھوں نہ جدائی تیری

اس کے بعد سبز پری گلفام سے بغل گیر ہو کر پریوں کے ساتھ مل کر مبارکباد گاتی ہے اور اس پر سبھا ختم ہوتی ہے۔ مبارکباد والی غزل میں نو شعر ہیں اس کا مطلع یہ ہے ؎

شادیٔ جلوۂ گلفام مبارک ہووے
عیش و عشرت کا سرانجام مبارک ہووے

اور مقطع یہ ؎

چھینے شہزادے کو اب ہم سے نہ راجا استاد
یہ امانت سحر و شام مبارک ہووے

اندر سبھا کے اس خلاصے سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ اس کے

---

[1] یہ شعر پڑھ کر ذہن فوراً مثنوی میر حسن کے اُن شعروں کی طرف منتقل ہوتا ہے جو نجم النسا کی زبان سے اسی طرح کے ایک موقعے پر نکلے ہیں۔ نجم النسا جوگن کے بھیس میں ملک فیروز شاہ کی مجلس میں آتی ہے اور فیروز شاہ اس سے گانے کی فرمائش کرتا ہے تو وہ جواب دیتی ہے:

کہا کچھ بجانا نہیں اپنا کام — ہر اک طرح لینا ہیں ہر کا نام
ہے بیزار فرمائشوں سے فقیر — دے کیا کریں اب ہوئے ہیں اسیر

مصنف نے قصے کا سارا تخیل رقص و موسیقی کی بنیادوں پر قائم کیا ہے
اس کا اصل مقصود یہی ہے کہ وہ ایک ایسی بزم آراستہ کرے جس
میں کئی اچھے گانے والے اور گانے والیاں اپنے ہنر کا کمال دکھا کر
ناظرین و سامعین کو محظوظ کریں۔ اس نے ایک ایک پری سے
بہ یک وقت کئی کئی چیزیں گوائیں اور ہر موقعے پر اس کا خیال رکھا کہ
جو چیزیں گائی جائیں ان میں اتنا تنوع ہو کہ ہر طرح کے سننے والوں کو
ان میں پورا لطف آسکے۔

اندر سبھا کے جو متعدد نسخے لکھنؤ، کانپور، امرتسر، لاہور اور بمبئی
کے چھپے ہوئے میری نظر سے گزرے ہیں ان میں ایک آدھ شعر کے
فرق کے ساتھ ۵۶۳ شعر ہیں۔ ۵۶۳ شعروں میں سے قصہ ۲۰۵
شعروں میں بیان ہوا ہے۔ باقی ۳۵۸ شعروں میں گانا ہی گانا ہے۔
بلکہ سچ پوچھئے تو ان ۲۰۵ شعروں میں سے بھی جو شعر سبز پری اور
شہزادہ گلفام کی زبان سے ادا ہوئے ہیں، وہ بھی گانے ہی میں
شامل ہونے چاہئیں۔ ایسے شعروں کی تعداد سو کے قریب ہے۔
اس طرح ۵۶۳ شعروں میں سے کوئی ساڑھے چار سو شعر گانے کی
ضمن میں آجاتے ہیں۔

اس بات کا اندازہ کہ امانت نے اندر سبھا کی تخلیق، ترتیب اور
تکمیل میں سب سے پہلی جگہ موسیقی (اور رقص) کو دی ہے اور بھی کئی
باتوں سے ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک بات تو یہ ہے کہ اندر سبھا کے
مختلف کردار، جن میں راجا اندر، پریاں اور دیو سب شامل ہیں بار بار
ناچ گانے کی اہمیت کا تذکرہ کرتے ہیں۔ راوی محفل (سبھا) کی ترتیب
سے پہلے سات شعر کی جو تعارفی غزل پڑھتا ہے اس میں راجا اندر اور
پریوں کے ذکر کے علاوہ یہ بھی کہتا ہے کہ ؎

غضب کا گانا ہے اور ناچ ہے قیامت کا
بہار فتنۂ محشر کی آمد آمد ہے

اس کے بعد راجا اندر اسٹیج پر آتا ہے تو کہتا ہے کہ ؏

جی میرا ہے چاہتا جلسہ دیکھوں آج

اور حکم دیتا ہے کہ ؎

لاؤ پریوں کو میرے جلدی جا کر یاں
باری باری آن کر مجرا کریں یہاں

اس کے بعد محفل جمتی ہے اور پکھراج پری آتی ہے تو سب سے پہلے
یہ شعر گاتی ہے ؎

گاتی ہوں میں اور ناچ سدا کام ہے میرا
آفاق میں پکھراج پری نام ہے میرا

پکھراج پری کے بیٹھ جانے پر نیلم پری کی آمد پر یہ شعر پڑھتا ہے ؎

غضب گانا ہے اور اس کا چمکنا
کبھی زہرہ کبھی وہ مشتری ہے
نہ دیکھا ہوگا ناچ ایسا کسی نے
بلا ہے، سحر ہے جادوگری ہے

نیلم پری اپنے حسب حال شعر خوانی میں یہ شعر گاتی ہے ؎

زہرہ مرے خیال میں دھنتی ہے سر سدا
مرتے ہیں تان سین ترانے کی تان پر

اسی طرح سبز پری جب دوبارہ سبھا میں آتی ہے تو یہ چھند گاتی ہے ؎

سبھا میں بلوا کر مجھے آپ کیا آرام
آئی ہوں میں پھر یہاں کرنے اپنا کام
کرنے اپنا کام یہاں پھر میں ہوں آئی
ٹھمری، چھند، غزل کی جی میں دھن سمائی
سماں بندھے گا آج میں جی کھول کے گاؤں
کہیں گے سب استاد نے کیا کیا چیز بنائی

راجا اندر سبز پری کے پر اکھاڑ کر اسے پرستان سے نکال دیتا ہے تو جوگن کے
بھیس میں گاتی پھرتی ہے۔ اس حالت میں اس نے جو پہلی غزل گائی
ہے اس کا ایک شعر ہے ؎

سر کو دھنتے ہیں صدا سن کے پرند اور چرند
بھیرویں کا عجب انداز ہے ہر تان کے بیچ

جوگن کے ناچ گانے کا پرستان میں اتنا شہرہ ہوتا ہے کہ کالا دیو راجا اندر
سے اس کی تعریف کرتا ہے اور کہتا ہے ؎

وہ ہے ناچتی گاتی اس آن سے
کہ جن صدقے ہوتے ہیں سو جان سے
غضب بھیرویں کی ہر اک تان ہے
خدائی کا دل اس پہ قربان ہے

راجا جوگن کی تعریف سن کر کالے دیو سے اس کے ناچ گانے کا اشتیاق
ظاہر کرتا ہے ؏

مزا راگ کا ناچ کا شوق ہے

اور جب کالا دیو جوگن کے پاس پہنچ کر راجا کے اشتیاق کا ذکر کرتا ہے تو منجملہ اور باتوں کے یہ بھی کہتا ہے کہ راجا ع

ترے ناچ گانے کا مشتاق ہے

جوگن کالے دیو کے کہنے پر جب راجا کے سامنے آتی ہے تو کالا دیو راجا سے کہتا ہے ؎

عجب خوش گلو ہے یہ زہرہ جبیں
اڑاتی ہے جنگلے میں کیا بھیرویں
ہر اک تان پہ لوٹ جاتا ہے جی
سنا ہوگا گانا نہ ایسا کبھی

اس کے بعد راجا جوگن سے اس کا حال پوچھتا ہے اور گانے کی فرمائش کرتا ہے ؎

سُنا اپنا گانا مجھے بھی ذرا
سُنا بھیرویں، چھیڑ یا جوگیا

مختصر یہ کہ اندرسبھا میں شروع سے آخر تک امانت کے ذہن سے یہ بات نہیں نکلی کہ یہ سبھا ایک نئے انداز کی محفل رقص و سرود ہے۔ یہ بات وہ سامع اور ناظر کو بھی بار بار یاد دلانا چاہتے ہیں کہ یہ ساری "انجمن آرائی" محض رقص و نغمہ کی خاطر ہے۔

نغمہ سرائی کی اس دلکش و دل فریب محفل میں جتنی چیزیں گائی گئی ہیں اُن میں سننے والوں کے مذاق کے تنوع کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور محض غزلوں پر اکتفا نہ کرکے پریوں سے ٹھمری، چھند، بسنت، ہولی، ساون، کافی، بہاگ جیسی ہلکی پھلکی اور عام پسند چیزیں گوائی ہیں۔ کہیں کہیں گانوں کے ساتھ دھنوں کے اشارے بھی ہیں، خاص کر ان سب گیتوں میں جو سبز پری نے سبھا کے آخری حصے میں گائی ہیں۔ امانت نے ہر جگہ گانے والوں کی ہدایت کے لئے "بیچ دھن بھیرویں کے" لکھ دیا ہے۔ ہر گیت 'سبھا' کے درمیانی حصے میں آئے ہیں اُن میں "برج" اور "دیس" کی دُھنیں اختیار کرنے کا اشارہ کیا گیا ہے۔ ابتدائی گیتوں کے ساتھ بہار، کھماچ اور دیس کی دُھنیں لکھی گئی ہیں۔

امانت نے پوری اندرسبھا میں نغمہ کے کیف و سرور کو جو اہمیت دی ہے اس کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ انہوں نے غزلوں کے لئے مترنم بحروں کا انتخاب کیا ہے اور عموماً قافیہ اور ردیف کی ترتیب میں صوتی آہنگ اور جھنکار کو پیش نظر رکھا ہے۔ اندرسبھا کی اس خصوصیت کا اندازہ غزلوں کے مطلعے سن کر لگائیے :۔

محفلِ راجا میں پکھراج پری آتی ہے
سامنے معشوقوں کے سرتاج پری آتی ہے (زبانی راوی)

ہے جلوۂ تن سے در و دیوار بسنتی
پوشاک جو پہنے ہے مرا یار بسنتی

بیداد مجھے یاد ہے واللہ تمہاری
یوسف کی قسم اب نہ کروں چاہ تمہاری

ٹکرا کے سر کو جان نہ دوں میں تو کیا کروں
کب تک فراقِ یار کے صدمے سہا کروں
رفتار کی چلن سے غضب دل لُبھائیے
چھوٹے سے سن میں یار بڑے تم ہو چالیئے

(زبانی پکھراج پری)

سبھا میں آمدِ نیلم پری ہے
سراپا وہ نزاکت سے بھری ہے (زبانی راوی)

حوروں کے ہوش اُڑتے ہیں پریوں کی شان کا
نیلم پری ہے نام مرا آسمان پر
عشق کا خنجر لگا ہے دل پہ کاری ان دنوں
زخم کی صورت ہے خوں آنکھوں سے جاری ان دنوں
دل مرا اسیرِ چمن سے نہ ہوا شاد کبھی
لے گیا باغ میں بھولے سے نہ صیاد کبھی
مزہ وصالِ چمن کا اٹھائے گا پھر کیا
ڈرا جو ہجر سے وہ دل لگائے گا پھر کیا

(زبانی نیلم پری)

سبھا میں لال پری کی سواری آتی ہے
جمانے رنگ اب اندر کی پیاری آتی ہے (زبانی راوی)

انساں کا کام حسن پہ میرے تمام ہے
جوڑا ہے سرخ لال پری میرا نام ہے

دل کو مرغوب ہے جو ٹھنڈی ہوا ساون کی
مانگتا ہوں میں سدا حق سے دعا ساون کی | زبانی لال پری

خیال آتا ہے دل کو شکوۂ بیداد کیا کیجے
خدا سے اے بُتِ کافر تری فریاد کیا کیجے
شبِ فرقت میں نالوں نے جہاں سر پر اٹھایا ہے
زمیں میں زلزلہ ہے آسماں چکر میں آیا ہے

آتی نئے انداز سے اب سبز پری ہے
لب سُرخ ہیں، پر سبز ہیں پوشاک ہری ہے (زبانی راوی)

معمور ہوں شوخی سے شرارت سے بھری ہوں
دھانی مری پوشاک ہے، میں سبز پری ہوں زبانی سبز پری
گھر سے یاں کون خدا کے لئے لایا مجھکو
کس ستم گار نے سوتے سے جگایا مجھکو (زبانی شہزادہ گلفام)
بھولا ہوں میں عالم کو سرشار اسے کہتے ہیں
مستی سے نہیں غافل ہشیار اسے کہتے ہیں

لبِ جاں بخش کی الفت میں لب پر جان آئی ہے
مریضِ عشق مرتا ہے مسیحا کی دُہائی ہے | زبانی سبز پری

مرتا ہوں ترے ہجر میں اے یار خبر لے
اب جان سے جاتا ہے یہ بیمار خبر لے
روح بدن میں ہر پلیاں جی کرتے ہے کل سی بیکلی
جلد خبر لو ہمدمو، جان فراق میں چلی | زبانی جوگن
دل کو چین اک دم ترے چرخ کہن ملتا نہیں
وہ مرا گلفام، وہ گل پیرہن ملتا نہیں

یہ بحث بڑی دلچسپ ہے کہ ان غزلوں میں ادبی اور شاعرانہ نقطۂ نظر سے کیسے کیسے مضامین ہیں اور ان مضامین کو اس خاص محل سے جس پر غزل پڑھی گئی ہے کیا مطابقت ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ دلچسپ اور اہم یہ مطالعہ ہے کہ امانت کی اندر سبھا والی غزلیں لکھنوی انداز اور اس انداز کی خصوصیات میں رچی ہوئی ہیں۔ اس بحث اور مطالعہ کو کسی اگلی صحبت کے لئے اٹھا رکھئے۔ یار زندہ صحبت باقی۔

شاعرِ انقلاب ــــ نذرالاسلام

ابنِ انشا

"اگنی وینا" اور "باغی" کے مصنف کا تصور ایک ہی طرح کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ اس کا آہنگ صحیح معنوں میں آہنگ رجز ہے۔ اس کے سُر بہت اونچے، گونجتے ہوئے سُر اور بول آتشیں بول ہیں جیسے ایک جوالا مکھی جس کے سینہ میں سالہا سال سے گرم اور تند و تیز لاوا کھول رہا ہو دفعتاً بیدار ہو جائے اور گرد و پیش کی سنسان فضا میں ایک تہلکہ پیدا کر دے جیسا کہ نذرالاسلام کی مشہور نظم "قرنا" سے بخوبی ظاہر ہے۔ اس کی آواز واقعی صورِ اسرافیل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ رزم کے ساتھ بزم کا شاعر بھی ہے اور اس کے ساز میں بڑے میٹھے رسیلے مدھر نغمے بھی ہیں۔ اس نے عشق و محبت کے پُر کیف ترانے بھی گائے ہیں اور بے شمار گیت بھی لکھے ہیں جن میں بنگالہ زبان کی قدرتی مٹھاس اور بنگالہ دیس کے باسیوں کی طبیعت کا رس بھی شامل ہے۔ لیکن جو چیز ان کی شخصیت میں سب سے نمایاں ہے۔ اور انہیں ایک منفرد حیثیت عطا کرتی ہے وہ یہی آہنگ رجز ہے جو ان کی بے باک، پرجوش اور ہیجانی فطرت کی حقیقی آدا نہ ہے ـــ رعد اور برق کی آئینہ دار۔ ان کے جذبات اُبلتے ہوئے جذبات ہیں جو براہِ راست دل سے زبان پر آ جاتے ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے گویا یہ ولولہ انگیز جذبات اور شاعر کے بول ایک ساتھ پیدا ہوئے ہیں۔ یہ جذبات اپنی خلقت ہی میں شعلہ بہ پیراہن ہیں اس لئے انہیں کسی لباسِ ظاہری کی ضرورت نہیں۔ جس میں دانستہ سعی و کوشش یا صناعی کو دخل ہو۔ ان کی شاعری ایک سیلِ بے زنہار ہے جو بے اختیار ان کے سینے سے اُمڈ کر پہنائے فضا میں پھیل جاتی ہے۔ اور اس کا بہاؤ ایک آزاد بہاؤ ہے۔

نذرالاسلام اور ان کی شاعری نہ صرف اپنے ملک اور ادب میں ایک نئے شعور کی خبر دیتی ہے بلکہ اس برصغیر میں بیداری کی ایک نئی رَو کی آئینہ دار ہے۔ وہ اس دور کا نمائندہ ہیں جب زندگی اپنے ماحول کی مجبوریوں سے تنگ آ کر بغاوت پر آمادہ ہو رہی تھی اور فضا میں ہر طرف انقلاب ہی انقلاب تھا۔ یہ دور ایک طرف گیر و دار اور دوسری طرف اس کے لازمی ردِ عمل کا دور تھا جس میں ہنگامے۔ نعرے اور شورشیں پرورش پاتی ہیں اور پرشور جذبات اندھا دھند ہنگامہ آرائی میں ظاہر ہوتے ہیں اور نت نئے واقعات سُلگتے ہوئے احساسات کو بے تحاشا ہوا دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ تمام معاشرہ ایک عظیم الشان اگنی کنڈ بن جاتا ہے اور فضا کا ذرہ ذرہ اس کے بے پایاں التہاب سے شعلہ زن ہو جاتا ہے۔ ایسی ہی ہنگامہ آفریں فضا تھی جس میں انیسویں صدی کے اوائل میں شیلے اور بائرن جیسے آتش نفس شاعر پیدا ہوئے تھے اور ایسی ہی فضا میں نذرالاسلام بھی اس برصغیر کے افق پر ایک آتشیں ستارہ بن کر چمکے۔ انہیں اپنے دور کا بائرن کہنا بیجا نہ ہوگا جو للکار للکار کر کہتا ہے ؎

من بہ دمِ صرصرم، من بہ غوِ تندرم

لیکن یہ للکار بائرن کی طرح طاغوتی للکار نہیں۔ ان کی "غوِ تندر" باعثِ آشوب نہیں۔ اور نہ "دمِ صرصر" جہاں سوز ہے بلکہ اس کا ایک رخ تخریب ہے اور دوسرا تعمیر۔ یعنی وہ خرمنِ استعمار کے لئے برقِ تپاں اور قوم کی خوابیدہ قوتوں کو ابھارنے اور نشو و نما دینے کے لئے ابرِ بہار ہے۔ وہ بیک وقت بائرن بھی ہیں اور شیلے بھی۔ انہوں نے ایک آتشیں فضا میں آتشیں طبیعت کے ساتھ جنم لیا۔ وہ پیدائش ہی سے مجاہد تھے اور ان کی آواز ایک باغی کی ولولہ انگیز آواز تھی۔ وہ اپنے ساتھ تلوار کی جھنکار لے کر آئے تھے اسی لئے ان کے کلام میں تلوار کی صفائی بھی ہے اور تراش بھی۔ تیزی بھی ہے، اور کاٹ بھی۔ آب و تاب

بھی ہے اور المہتاب بھی۔ ان کی تخلیق شعلہ و شرار سے ہوئی ہے۔ اس لئے ہم ان کی شاعری میں آگ ہی آگ جلوہ گر پاتے ہیں۔

خیال کیا جاتا ہے کہ نذر الاسلام کے ناسازگار ماحول اور تلخ تجربات نے ان کو انقلاب کا نقیب بنا دیا۔ لیکن یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ شاعر کی والہانہ طبیعت نے انہیں قدرتی طور پر سپاہی بننے کی تحریک دلائی۔ خارجی واقعات کی حیثیت زیادہ تر تنکوں کی تھی جو الاؤ کو اور بھی بھڑکا دیتے ہیں۔ اگر خود نذر الاسلام کا دل ہی آتشکدہ نہ ہوتا تو خار و خس میں یہ تاب کہاں تھی کہ وہ اس کو شعلہ آفریں بنا سکتے؟

نذر الاسلام کی آتش منشی نے بنگلہ شاعری کو ایک نئی روح عطا کی بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اس نے اس کے ایک خاص میلان کو زیادہ اُبھار دیا۔ اس سے پہلے بنگلہ شاعری میں دو لہجے دکھائی دیتے ہیں، ایک دھیما دھیما مدھر لہجہ جس میں راگنی کا رسیلا پن پایا جاتا ہے اور دوسرا زوردار لہجہ جس میں جیالا پن اور ٹھاٹھ ہے، ٹیگور کی شاعری پہلے لہجہ ہی کی سب سے اونچی لہر ہے۔ نذر الاسلام اپنی غنائیہ شاعری میں اسی لہجہ کو چھو کر گذرتے ہیں۔ لیکن شاید پوری طرح سمو نہیں پاتے کیونکہ ان کی طبیعت زیادہ تر دوسرے لہجہ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس زوردار لہجہ کے لئے نذر الاسلام کے پیش رو شاعروں کے چند فن پارے ملاحظہ ہوں:۔

"سمندر کی موجیں اضطراب میں سر پٹک رہی ہیں۔ پہاڑ کانپ رہے ہیں اور ٹھنڈی سانسیں بھر رہے ہیں لرزتی ہوئی دھرتی پر ہر چیز لرز رہی ہے۔ چار دانگ عالم خون میں رنگا نظر آ رہا ہے۔ مچھلیاں پانی سے اچھل اچھل کر خشکی پر آ رہی ہیں۔ پرندے اپنے آشیانوں کو چھوڑ کر پرواز کر رہے ہیں۔"

(محمد خاں)

"میں ایک بپھرے ہوئے سمندر کے ساحل پر کھڑا ہوں۔ میرے ذہن میں آہستہ آہستہ ماضی کے نقوش اُبھرتے آ رہے ہیں! لازوال مسرتیں، خوشیاں، درد و غم اضطراب، قہقہے۔ قطرہ ہائے اشک، گرم گرم سانسیں، جنہیں ایک ایک کر کے ذہن میں بیدار ہو گئیں:"

(کیقباد)

جلے ہوئے تانبے کی طرح بلند آسمان پر آتشیں سورج چمک رہا تھا صحرا کی بنجر جھلسی ہوئی ریتیلی زمین تپ رہی تھی، تب ہی اور بربادی کے ہرکارے ہر سمت منڈلا رہے تھے موت ناگن کی طرح آگ کے حمام میں نہا کر آتشیں کپڑوں میں ملبوس پھنکار رہی تھی۔ اس کے سم قاتل کے اثر سے کائنات پر مردنی طاری تھی، کروڑوں زخمیوں کی چیخیں اور فریادیں فضا میں گونج رہی تھیں زمین اور آسمان جل کر خاکستر بنے جا رہے تھے:"

(شہادت حسین)

گریہ و زاری اور نالہ و فریاد بند کر ہمدم
قدم اٹھا اور آگے بڑھ۔ منزل کی دُھن میں مست مصمم ارادہ
کے ساتھ ... .

اور جس نے اپنی حقیقت، جرأت اور عمل کے ذریعہ
ظاہر کی وہی در اصل بہادر ہے۔ (محمد مزمل حق)

ان فن پاروں میں چند باتیں بہت نمایاں ہیں۔ مثلاً جملوں کی رفتار ایک کے بعد دوسرا چھوٹا مگر تیز فقرہ آتا ہے جس سے رفتار تیز تر ہو جاتی ہے اور ہم بے اختیار اس کی رو میں بہے جاتے ہیں۔ الفاظ میں گھن گرج ہے۔ شاعر زیادہ باریکیوں میں نہیں کھو جاتے بلکہ صاف سیدھے جذبات کو واضح الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔ بعض پاروں میں تو صاف نذر الاسلام کا طنطنہ سنائی دیتا ہے۔ نذر الاسلام کی شاعری فکر سے دور اور جذبات سے قریب ہے۔ اقبال کی سطوت اور گمبھیرتا جو اور قسم کی صلاحیتوں سے اُبھرتی ہے ایک اور قسم کی آتش منشی کی آئینہ دار ہے۔ نذر الاسلام کا میلان زیادہ تر رومانوی جذباتیت کی طرف ہے جس سے خطابت پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے ان میں نظم و ضبط کی گرفت زیادہ مضبوط نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پے در پے فقروں، تشبیہوں اور تمثیلوں سے ایک بے تحاشا کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ ان کے تخیل کی طوفانی شدت کے باعث ترکیبیں اور استعارے امڈے چلے آتے ہیں۔ ان حالات میں بالعموم سلسلۂ بیان کے رک جانے کا اندیشہ ہوتا ہے لیکن نذر الاسلام کی شدتِ جذبات اس نازک مرحلے سے کامیابی کے ساتھ گذر جاتی ہے اس کا اندازہ ان کی مشہور نظم "باغی" سے کیا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

اے بہادر اعلان کر دے
اعلان، میرا سر بلند ہے
مجھے دیکھ کر ہمالیہ کی چوٹی سرنگوں ہو جاتی ہے۔

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

منظوم ڈرامہ

"عشق سراپا دوام"

عبدالعزیز خالد

(۱)

قیس: یہ مہر و ماہ، یہ انجم، سپہرِ نیلی فام
طلسمِ گردشِ لیل و نہار کے مظہر
بلا کشانِ ازل کو پیامِ شورش ہیں
یہ سوز و سازِ طبیعی کے آتشیں پیکر
جہاں میں بو قلموں سحرِ سامری کے اسیر
ابھی خراب تمنا کبھی رہین بلا
برہنہ، تشنہ، گرسنہ، شکستہ، سرگرداں
خرابۂ سحر و شام میں جنوں جولاں
تارہ وار ہمیشہ بھٹکتے رہتے ہیں —
وہ دور خیمۂ لیلیٰ ہے، خیمہ مشکیں!
(دیر تک محویت کے عالم میں دیکھتا رہتا ہے
اور پھر سوچنے لگتا ہے)
یہ آسماں، یہ خیاباں، انہیں خدائے جلیل
دیا جو بہرہ تب و تابِ عشق سے تو نے
انہوں نے لا دیا مجھ پہ اپنا بارِ گراں
اٹھائے پھرتا ہوں میں تیری کائنات کا سوز
غریبِ شہر کے مانند سوختہ ساماں
ہجومِ شوق کی یلغار اے معاذ اللہ!
خمارِ نشۂ حسرت، بلائے بے درماں
دلِ فگار میں برپا ہے محشرِ خاموش
قبائے شب پہ ستارے نہیں شرارے ہیں
جو ڈھیمی آنچ سے شب بھر سلگتے رہتے ہیں
نہ جلتے ہیں نہ بھڑکتے ہیں اور نہ بجھتے ہیں
خدا یگانِ جمال و خلاصۂ خوبی!
کہاں ہیں نقش و نگارِ سوادِ محبوبی؟
غبارِ قافلۂ گل بہائے کوچہ و بام؟
ہوں نالۂ جرسِ کارواں سے خوں آشام
انیسِ خلوتِ غم ہے ورائے اخترِ شام
مجھے جنوں سے ملا تحفۂ غمِ ایام! —
یہ پاس آ گیا خیمہ، یہ محملۂ رنگیں

(۲)

(المہدی سے): میں گھر پہ ٹھہرا مگر آگ بجھ گئی آخر
ہمارے گھر سے ہوا، میہمان، ہمسائے
اٹھا کے لے گئے انبارِ ہیزم و خاشاک

المہدی: میں دیکھتا ہوں ذرا ٹھہر و قیس!
(آواز دیتا ہے) لیلیٰ!

لیلیٰ: (خیمہ سے) جی!

المہدی: تمہارے بھائی کو تیرہ شبِ زمستاں میں
ضرورت آن پڑی چوبِ خشکِ صحرا کی

لیلیٰ: میں اپنے بھائی کو خوش آمدید کہتی ہوں

قیس: میں بنتِ عم کی اس الفت کی قدر کرتا ہوں
خدائے پاک کا الطافِ جاوداں تم پر

لیلیٰ: (خادمہ سے)
اٹھو اٹھو اور ابھی جا کے لکڑیاں لاؤ
(خادمہ چلی جاتی ہے)

قیس وہ آگ لینے گئی ہے درونِ خیمہ سے
مرے جگر میں تو پہلے ہی آتشِ حرماں
مری متاعِ دل و جاں کو کھائے جاتی ہے
وہ ایک شعلہ، جوالہ جس کی حدت سے
مرے حواس جلے اور شباب راکھ ہوا
اس آگ سے بھڑک اٹھیں گے اور انگارے
مگر یہ آگ کی دریوزگی بہا نہ سہی
دلِ بہانہ طلب نے بقیضِ عیاری
جو حسنِ یار کے دیدار کو تراشا ہے
وہ بے نیاز یہ الجھے سے راز کیا جانے
جو مستِ ناز ہو کیفِ نیاز کیا جانے
(لیلیٰ واپس آتی ہے)

لیلیٰ یہ لمحہ زندگی جاوداں سے بہتر ہے
قیس تمہارے دل میں بھی الفت کا شعلہ مضطر ہے
لیلیٰ یہ اپنے جیب و گریباں کے چاک سے پوچھو
جو میرے دل پہ گزرتی ہے میں ہی جانتی ہوں
فسانہ زا ہیں مری بے زبانیاں کیا کیا
نگاہ کہتی ہے دل کی کہانیاں کیا کیا

قیس امینِ راز ہے دردِ نہاں کی دل سوزی
اگرچہ حاصلِ غم کچھ نہیں بجز نالہ
بہائے جنسِ تمنا ہے نقدِ آہ و فغاں
چراغ عشق میں جلتا ہے نفقتِ قلب و جگر
مگر یہ رنجِ گراں کب زمانہ ساز ہوا
مجھے بتاؤ خدارا، یونہی سلگتا رہوں
کہ اپنے جذبِ تگ آور کی کد و کاوش سے
ستارگاں کو بھی فرمان خونچکانی دوں
یہ التہابِ تمنا مجھے جلا دے گا
کہاں ہے رخصتِ اظہار و اذنِ نظارہ
رہے گا ذوقِ طلب وقفِ منزلِ مقصود
کبھی اٹھیں گے حجاباتِ شاہد و مشہود؟
مجھے بتا تو سہی کیا کروں کہاں جاؤں؟

کہاں یہ تشنگیٔ سوز و ساز بجھتی ہے؟
کہاں یہ ہوتی ہے چاکِ جگر کی بخیہ گری؟
کہاں یہ سوزِ دروں سے فراغ ملتا ہے؟

لیلیٰ میں پوچھتی ہوں کہ ریگِ رواں میں سحر ہے کیا
جو تم کو بادِ بیاباں سے یوں لگاؤ ہے
تمہارے شعر میں ذکرِ رمِ غزال ہے کیوں
یہ کس کا راز ہے جو مجھ سے یوں چھپاتے ہو؟
حریمِ ریگِ رواں میں کسے بلاتے ہو؟

قیس جمالِ ریگِ بیاباں تمہارے قدموں سے
غزالِ دشت کی شوخی تمہاری آنکھوں سے
یہی بہت ہے کہ یوں بے قرار رہتا ہوں
(آگ کے شعلے قیس کے دامن کو چھو رہے ہیں)

لیلیٰ (سراسیمہ ہو کر)
یہ خوفناک نظارہ! ذرا ادھر دیکھو

قیس (اپنی دھن میں)
سحر کے پردوں میں تم کو تلاش کرتا رہا
نسیمِ موجۂ گل میں تمہاری خوشبو تھی
لبِ صبا پہ تمہاری حکایتیں تھیں رواں
غزالِ دشت کی آنکھوں میں بار رہا دیکھی
وہ دلنواز چمک جو تمہاری آنکھوں سے
انہوں نے آنکھ بچا کر کہیں چرا لی ہے
اسی چمک میں ہے وہ اذنِ خود فراموشی
جو مجھ پہ کافِ کشش بن کے چھائے جاتا ہے

لیلیٰ یہ آگ تم کو جلا دے گی، پھینک دو لکڑی!

قیس اسی جنوں کی بدولت ہوئی یہ کیفیت
کہ ہو گئی ہے بیاباں کی خاک دامنگیر
بنی ہوائے مغیلاں بھی حلقۂ زنجیر
اسی جنوں نے یہ سوزِ دوام بخشا ہے

لیلیٰ یہ انتہائے جنوں ہے جنوں سے بھی زاید
تمہیں تو بس کوئی احساس ہی نہیں شاید
یہ دیکھو آگ نے ہاتھوں کو سب جھلس ڈالا

قیس — یہ آگ جس سے مرا سارا جسم جلتا ہے
رواں دواں ہے یہ بجلی سی جو رگ و پے میں
تمہارے ہاتھوں نے، لیلیٰ تمہاری آنکھوں نے
تمہارے حسنِ فروزاں نے ہی لگائی ہے!
مرا تمام اثاثہ ہی جل چکا جس وقت
کسی نے زلفِ شکن در شکن کو لہرایا
سمندِ ناز کے جولاں سے ہو چکا برباد
تو ان کو سبزۂ پامال کا خیال آیا
جلا کے ذوقِ تماشا کو آتشِ رُخ سے
چمن میں شاہدِ گل نے جلوس فرمایا
(بیہوشی میں لڑکھڑاتا ہے۔ لیلیٰ بڑھ کر اسے تھامتی ہے)

(۳)

قیس — یہ آسمان و زمیں بے سہاروں کی تسکیں
کسی شہیدِ وفا کو اماں ملی تو یہیں
یہاں پہ گھومتا پھرتا ہوں منہ اندھیرے سے
ہیں میری پلکوں میں سائے گھنے گھنیرے سے
مری حیات سراپا طلسمِ بیداری
مجھے سپرد ہوئی دشت کی نگہداری
نصیب ہے سفر اپنا، سفر نصیب میں ہے
ٹھکانہ اپنا یہیں منزلِ حبیب میں ہے
نشاطِ خلد، خمیرِ بہار تھی لیلےٰ
ازل تا ب، ابدیت تیار تھی لیلےٰ
کہاں پہ چھپ گیا سنگِ مزارِ لیلےٰ کا
ہوا میں اڑتا ہے شاید غبارِ لیلےٰ کا
یہ دشت و راغ، یہ کہسار کتنے سنگیں ہیں!
یہ ابر پارے کسی کے لہو سے رنگیں ہیں
میں اپنی گم شدہ لیلےٰ سے جا ملوں گا آج
اسی مقام پہ اپنا وصال ہوگا

آواز — قیس!!!

قیس — یہاں پہ دشت میں آواز ہے یہ کس کی؟

آواز — قیس!

قیس — یہ کون؟

آواز — قیس!

قیس — مجھے قبر نے پکارا؟

آواز — قیس!

قیس — مجھے لحد سے پکارا ہے میری لیلےٰ نے
شگفتِ غنچۂ دل کی نوید آ پہنچی
دیارِ دوست کی گلگشت لالہ ساماں ہے
فراقِ یار کی گھڑیاں خدا خدا کر کے
دوامِ وصل کی لذت سے ہمکنار ہوئیں
وہ سامنے مری لیلےٰ جمال آرا ہے
سرِ بہ گل پہ عروسِ بہار
(چٹان سے گر کر جان دے دیتا ہے)

آوازیں — لیلےٰ! قیس!
ہمارے ناموں سے صحرا کی وسعتیں گونجیں
نگاہِ اہلِ جہاں پردۂ غیاب و خفا
ہم اب بھی وسعتِ آفاق میں خراماں ہیں
ہم اب بھی حسنِ گل و لالہ سے نمایاں ہیں
حیات بخشی ہے حق نے بیابان سے بھی سوا!

سوغات

آغا بابر

مزنگ کی ایک تیرہ و تار دکان میں چند دوست بیٹھے مچھلی اور نان کھا رہے تھے۔ مرچیں اتنی تھیں کہ بعض چٹخارے لے رہے تھے اور بعض ناک اور آنکھیں پونچھتے جا رہے تھے مگر کھا رہے تھے۔

ایک نے کہا "کیوں ہے نا مچھلی نمبر ایک؟"

دوسرے نے اثبات میں سر ہلا کر کہا "میں بول نہیں سکتا، میری آنکھوں سے پانی بہہ رہا ہے، کانوں سے دھواں نکل رہا ہے!"

"یہ دوکان میری دریافت ہے۔" پہلے نے فخریہ انداز میں کہا اور داد لینے کی خاطر سب کی طرف دیکھا۔

"تمہاری بڑی دریافتیں ہیں شمیم۔ ہم کس کس کا شکریہ ادا کریں؟"

تجمل جو سوکھے نان کا ٹکڑا چبا رہا تھا بولا "اس وقت تمہاری وہ دریافت خانساماں حلوائی کے موتی چور کے لڈو ہوں تو یہ ساری مرچوں کی جلن کافور ہو جائے"

مچھلی کی دکان کا چھوکرا تمام چینی کی تھالیاں مچھلی کے کانٹے اور نان کے بچے کھچے ٹکڑے ایک غلیظ رومال سے اکٹھا کر رہا تھا کہ شمیم نے اسے کہا "پانی رکھ جاؤ اور جھپاک سے ایک پاؤ برفی سامنے والے حلوائی سے لا دو۔"

پانی پیا، برفی کی ایک ایک ٹکڑی کھائی، مرچوں کی جلن کم ہوئی، مگر سب کی رائے یہی تھی کہ اس مچھلی کے بعد خانساماں حلوائی کے موتی چور کے لڈو ہونے چاہئے تھے۔ مگر اس کی دکان بہت دور تھی اسلئے یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔

جمیل نے کہا "بڑی دکان چلتی ہے اس حلوائی کی۔ مٹھائی سب اچھی ہے مگر بہترین چیز موتی چور کا لڈو ہے۔ یہ بات اس نے مخدوم سے کہی جو چند روز کے لئے کراچی سے آیا تھا اور آج یہ لوگ اسے مچھلی کھلانے مزنگ لے آئے تھے۔

بات سے بات نکلنے لگی۔ دوستوں نے مونڈھے پیچھے کھینچ لئے اور سگرٹ سلگا لئے۔ گفتگو کا انداز ہی کچھ ایسا تھا کہ موضوع کھانے پینے کی چیزیں بن گیا۔ جمیل نے کہا "متھرا کے پیڑے، پانی پت کی ملائی اور آگرے کی ریوڑی کے پیچھے بڑی روایات بڑی شہرت اور بڑی محنت تھی۔ وہ چیزیں اب ازسرنو پیدا نہیں ہو سکتیں۔ سنا ہے بعض لوگوں نے جو پیچھے یہ چیزیں بناتے تھے کراچی میں یہ چیزیں بنا کر چار پیسے کمانے کی کوشش کی ہے مگر وہ بات نہیں بن سکی۔"

شمیم بولا "اور یہ بھی ہوا ہے کہ جن کی دکان پر مکھیاں بھنکتی تھیں یہاں ان کی دکان پر گاہکوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ میں نے سنا ہے یہ خانساماں حلوائی جس کے موتی چور کے لڈوؤں نے سب کو چور کر رکھا ہے۔ پہلے محض ایک خانساماں تھا۔ یہ کام اس نے یہاں آکر شروع کیا ہے اور دیکھتے دیکھتے مٹھائی کی مارکٹ کیپچر کر لی ہے۔"

مخدوم نے جو ایک گہری سوچ میں تھا یا اُسے سگرٹ کا لطف آ رہا تھا کہا "ہو سکتا ہے بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ آدمی کو بظاہر بڑے عجیب سے نظر آتے ہیں مگر ہوتے ضرور ہیں کہتے ہیں نپولین کو بعض لڑائیوں میں اس لئے شکست ہوئی کہ اس کا ہاضمہ درست نہ تھا۔ بظاہر یہ بات مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو ہو سکتی ہے اور یہ رائے ماہرین کی ہے۔ چوب مسجد نہ فروختنی نہ سوختنی۔ مجھے یہ تو علم نہیں کہ متھرا کے پیڑے بنانے والوں پر یہاں آکر کیا بجوگ پڑا۔ یا پانی پت کی ملائی یہاں آکر کیوں بد ذائقہ ہو گئی یا آگرے کی ریوڑیاں کیوں سیل گئیں مگر اپنے وطن کا ایک واقعہ یاد ہے جس کی لپیٹ میں آگرہ کے شہرت یافتہ لذیذ پیڑوں کا ذائقہ بری طرح بدمزہ ہوا۔"

سب دوست مخدوم کی طرف توجہ سے دیکھنے لگے جس کی نگاہیں

ماضی کے پردے چاک کر رہی تھیں۔ اس نے کہا "میں اپنے وطن کا قصہ بیان کرتا ہوں۔ تانبے کے تھال میں دودھیا رنگ کے پیڑے رکھ کر سائیں سہ پہر کو نمودار ہوتا۔ تھال کندھے پر رکھا ہوا ہے۔ بازار میں سے گزر گیا جس نے خریدنے چاہے خرید لئے۔ اُسے صدا لگانے کی مہلت ہی نہیں دیتے تھے لوگ۔ کبھی موج میں آتا تو کہتا "یار میرا فضل تیرا۔"

دو تین گھنٹہ میں تھال بھر پیڑے بیچ چکتا۔

معلوم نہیں لوگ اُسے سائیں کیوں کہتے تھے۔ اس کے گلے میں نہ ٹخنوں تک چغہ ہوتا نہ سر پہ لمبے لمبے بال۔ جیسے باقی لوگ ہوتے ہیں ویسے ہی وہ تھا۔ ہاں البتہ اس کی مونچھیں بڑی گھنی تھیں اور کالی بھور۔ سارے شہر میں یہ لذیذ پیڑے 'سائیں کے پیڑے' کے نام سے مشہور تھے۔ بٹالے والے جنہوں نے یہ پیڑے چکھے ہوتے دوسرے شہر کی قلاقند اور پیڑے کھا کر یہی کہتے "صاحب پیڑے سائیں کے کیا بات ہے۔ ایسا خالص کھویا ہوتا ہے کہ بس کمال۔ طبیعت خوش ہو جاتی ہے، روتے بچے بہل جاتے ہیں، روٹھی بیویاں من جاتی ہیں۔"

سائیں جب کبھی ہمارے محلہ سے گزرتا تو پیسہ کا ایک پیڑا لے کر ہم بھی کھا لیتے۔ ہم نے سمجھا یہ سائیں واقعی سائیں ہے۔ عقل کا پیچ ضرور ڈھیلا ہے۔ اسے کیا پڑی ہے کہ اس دکان والے کے پیڑے بیچتا پھرے۔ لوگ کسی کو یونہی تو سائیں نہیں کہتے۔ یہ واقعی سائیں ہے۔

ایک سال بعد جب ہم آٹھویں میں ہوئے تو معلوم ہوا کہ ایک شئے کمشن ہوتی ہے، وہ سائیں لیتا ہے۔ اتنے پیڑے بیچتا ہے تو دکاندار اتنے پیسے دیتا ہے۔ جب ہمیں یہ بات معلوم ہوئی تو سائیں کی گھٹی ہوئی عزت ہماری نظروں میں دوگنی ہو گئی اور ہمیں وہ پہنچا ہوا سائیں معلوم ہونے لگا۔ جب ہائی کلاس میں پہنچے تو اور اونچے قسم کا انکشاف ہوا۔ وہ یہ کہ وہ حلوائی جس کے بنے ہوئے پیڑے شہر بھر میں ہاتھوں ہاتھ بک جاتے ہیں ہمارے سکول کے ساتھ ہی تو اس کی دکان ہے۔

ہم نے کہا "ارے یہ قادر بخش حلوائی!"

دکان کو ذرا غور سے دیکھا کچھ بھی جاذب نظر چیز نہ تھی دکان پر۔ بس ایک دکان تھی۔ جیسے معمولی سی اور بیسیوں دکانیں ہوتی ہیں۔ کڑاہی میں دودھ کڑھ رہا تھا۔ دہی کا آدھا کونڈا پڑا تھا، ایک طرف خالی ولٹوئیاں رکھی تھیں۔ قادر بخش گدی پر بیٹھا کسی سے بات کر رہا تھا۔ اس کا بیٹا فریدا کڑاہی میں آہستہ آہستہ کھرپی پھیر رہا تھا۔ ہم نے تصدیق کرنے کے لئے ایک پیسہ آگے بڑھایا۔ قادر بخش نے ایک گول تھال میں سے جو سائیں کے تھال سے مشابہت رکھتا تھا ایک پیڑا اٹھا کر ہمیں دیدیا۔ چکھا تو وہی سائیں کا پیڑا۔ "اچھا تو یہ بات ہے۔ یہ پیڑے یہاں مینوفیکچر ہوتے ہیں۔" ہم نے دل میں کہا۔

یہ بات کچھ ہم پر ہی نہ کھلی بلکہ یوں جیسے سب کے لئے عام ہو جائے۔ اب لوگ سائیں کے پیڑے نہ کہتے بلکہ قادر بخش کے پیڑے کہتے۔ سب تعریفی جملے قادر بخش کے کھوئے کی شان میں کہے جاتے۔ مگر سائیں کا پھیرا ویسے کا ویسا ہی رہا۔ وہ وضعداری وہ لچکیلی زندگی کب مات کھانے والی تھی۔ تانبے کے گول تھال میں پیڑے رکھے ہوئے کبھی موٹروں کے اڈے پر کبھی تیلی دروازے کے باہر کبھی ایک بازار کبھی دوسرے محلے سائیں دکھائی دے جاتا۔

پھر ہم کالج میں آ گئے۔ چھٹیوں میں بٹالہ جاتے تو سائیں دکھائی دیتا۔ ویسے ہی کالی بھور مونچھیں وہی ناک نقشہ مگر اب وہ شہر میں کم شہر سے باہر زیادہ دکھائی دیتا کیونکہ شہر میں پیڑے کم بکتے۔ اب قادر بخش کی دکان سب جان گئے تھے۔ سیدھا وہیں سے منگا لیتے۔ بہرحال سائیں چہرے پر وہی پرانی مسکراہٹ لئے موٹروں کے اڈے میں پکارتا "کھا فو پیڑا میرا، یا اللہ فضل تیرا۔"

قادر بخش کے پیڑے چار بجے تک تیار ہو جاتے۔ شام تک سب بک جاتے۔ وہ تھال جو کبھی سائیں شام کو خالی لایا کرتا تھا اب خالی نہ ہوتا بلکہ کچھ پیڑے بچ رہتے جو قادر بخش دکان میں رکھ لیتا۔ اگلے دن چار بجے سے پہلے کوئی گاہک آ جاتا تو وہ پیڑے اسے دے دئے جاتے۔ قادر بخش کے پیڑے باسی ہو کر اور بھی لذیذ ہو جاتے۔ ایک اس کے پیڑے کا مزا دوسرے مال روز تازہ بہ تازہ۔ دور تک ان پیڑوں کی شہرت جا پہنچی۔ لاہور، امرتسر سے لوگ آتے تو قادر بخش کے پیڑے سوغات کے طور پر لے جاتے۔ بٹالہ میں شادی بیاہ پر کسی کو پیڑے بنوانا ہوتے تو قادر بخش کو آرڈر دیا جاتا۔

زمانہ اب جنگ کا تھا۔ پیڑے کی قیمت دو پیسے ہو گئی۔ پھر پیڑا آنہ آنہ کا ہو گیا۔ وطن جانا ہوا تو یہ انکشاف ہوا کہ قادر بخش کے بیٹے نے اپنی دکان الگ کھول لی ہے۔ پیڑے بناتا ہے مگر وہ باپ والی بات نہیں ہے۔ باپ نے میٹھا ملانے کا گُر نہیں بتایا اس وجہ سے فریدا مار کھا جاتا ہے۔ ورنہ دودھ تو وہ انہیں گوالوں سے لیتا ہے جن سے

(باقی صفحہ ۵۳ پر)

افسانہ

افتاد!

ابوالفضل صدیقی

بڑے قادر انداز اور ٹھنڈے شکاری تھے، ایسے کہ جب تک سو فیصدی بھرا پڑنے کا یقین نہ ہو فیر نہ کریں اور پھر قانون پیشہ، ایسے محتاط طبیعت کہ اگر ایک معمولی سے دستخط کرنا ہوں تو چار مرتبہ کاغذ کو الٹیں پلٹیں، قلم لے کر کاغذ پر آہستہ آہستہ حرکت دیتے رہیں پھر کاغذ پر نب ٹیک کر ایک مرتبہ اوپر سے نیچے تک تحریر کو پڑھیں جانچیں پڑتالیں تو کہیں دستخط کریں، اور دستخط کرنے کے بعد پھر ایک مرتبہ اوپر سے نیچے تک نظر پھینکیں، ہائی کورٹ کے مشہور بیرسٹر، ایک لاکھ روپیہ سالانہ کی آمدنی پر انکم ٹیکس ادا کرنے والے اور ڈیڑھ ہزار روپیہ یومیہ محنتانہ لینے والے، ہمارے ایک دیوانی کے بڑے مقدمہ میں پیروی کرنے دو مرتبہ آ چکے تھے، اور تیسری مرتبہ پھر آنے والے تھے، خالص انگریزی النسل تھے بیسویں صدی میں وضع داری اور اصول پسندی کا یہ عالم تھا کہ جب دوسری پیشی پر آئے تو سفر خرچ نہ لیا اور تیسری پیشی پر محنتانہ نصف کر دیا اور لطف یہ کہ ہماری جانب سے بغیر کسی تحریک کے، بڑے شوقین شکاری تھے، مگر شدید مصروف قسم کے انسان، میں نے دونوں مرتبہ جب وہ مقدمہ میں آئے شکار کا پروگرام بنایا مگر وہ ایک دن نہ نکال سکے، لیکن اس مرتبہ مقدمہ کی پیشی گڈ فرائی ڈے کی تعطیل سے عین پیشتر پڑی تھی اور اس طرح شنبہ اور اتوار ملا کر پورے ایک ہفتہ کی تعطیل پڑ جاتی تھی۔ اور اس مرتبہ انہوں نے قبل ہی لکھ دیا تھا کہ مقدمہ کے بعد پورا ہفتہ شکار میں گذاریں گا نیز ایک بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ میم صاحبہ ساتھ ہوں گی اور یہ پروگرام انہیں کے لئے ارینج کیجئے۔ تین ماہ پیشتر پچھلی ہائی کورٹ کی تعطیل ہی میں تو صاحب شادی کرنے انگلستان گئے تھے اور یوں بھی یہ زمانہ کچھ صاحب کا دور غسل جیسا تھا، میم صاحبہ شکار کی بے حد شوقین اور یورپ کے رائفل کلبوں کی ہیرو نشانہ باز تھیں، مقررہ وقت پر صاحب پہنچے، اسٹیشن پر میم صاحبہ سے تعارف کرایا۔ دبلی پتلی، نازک اندام سی معلوم ہوتی تھیں مگر چال ڈھال میں بجلی کی سی پھرتی، اور جسم میں فولاد کی سی لچک، بڑی جلدی بے تکلف ہو گئیں، شکار کے شوق میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ افریقہ اور انڈونیشیا کے شکاریوں کے تجربات کی سب کتابیں چاٹ چکی تھیں اور شیر کے شکار کی بے حد شوقین تھیں، صاحب کے نام ضمنی مراسلت میں کرتا تھا اس کو اس وجہ سے بڑے شوق سے پڑھتی رہتی تھیں کہ اس میں شکار کے پروگرام کا تذکرہ ہوتا تھا۔ اور مجھ سے غائبانہ متعارف ہو چکی تھیں۔ اسٹیشن پر غیر معمولی گرم جوشی سے ملیں اور جب میں نے جائے قیام پر پہنچ کر کہا کہ ہمارے اس پروگرام کی ہیرو آپ رہیں گی اور اب کی مرتبہ ہم نے صرف آپ کے لئے ارینج کیا ہے اور سو فیصدی یقینی ہے تو خوشی کے مارے چہچہا ہی سی پڑیں اور صاحب بھی بڑے خوش ہوئے، اور میری جانب بڑے احسان مندانہ تیوروں سے دیکھا اور میم صاحبہ نے پروگرام کی تفاصیل پوچھیں، تو میں نے کہا کہ دو شیر آپ کے لئے بندھے ہوئے ہیں۔

"یقینی بندھے ہوئے کیا؟" انہوں نے بڑے اشتیاق کے ساتھ دریافت کیا۔

"آپ دیکھ ہی جوئینگی۔ یہ ہم کیوں بتائیں" میں نے میم صاحبہ کے اشتیاق کو تیز تر کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں آخر بتائیے نا"

"بس آپ سمجھ لیجئے کہ ٹائیگر اور ٹائیگریس آپ کے انتظار میں پورے چھ ہفتے سے چشم براہ ہیں" میں نے مسکرا کر کہا اور صاحب بولے" ارے صاحب یہ لوگ پشتینی شکاری ہیں بقول شخصے اگر کہیں عدالت میں بیان دیتے اپنا پیشہ بتائیں تو شکار، اور مجھے تو پانچ

سال کی مدت ملاقات میں ان کے ساتھ شکار جانے کا موقع نصیب نہ ہوا مگر میں نے سنا ہے کہ شکار کے اصول اور قاعدے ان کے اپنے تجربوں کے مطابق خود ساختہ اور ذاتی ہیں اور یہ مذاق کی بات نہیں ہے مجھے یقین ہے کہ انہوں نے رسی ڈال کر ایک شیر باندھ لئے ہوں گے آپ کے پروگرام کے لئے۔"

میں مسکرایا اور بیگم صاحبہ نے پُراشتیاق اور استفساریہ انداز میں پروگرام کی تفصیل دریافت کرنے کے لئے میری جانب دیکھا، اور میں نے کہا کہ ہمارا جنگل کا قطعہ دس میل چوڑا اور بارہ میل لمبا ہے جس کے تین طرف گورنمنٹ فارسٹ لگا ہوا ہے اور اسی پر گورنمنٹ سے مقدمہ بازی ہو رہی ہے جس کے سلسلہ میں بیرسٹر صاحب پیروی کر رہے ہیں، کچھ حدود کے متعلق فارسٹ ڈیپارٹمنٹ اور ہمارے درمیان جھگڑا ہے۔ اس کے علاوہ سرکاری جنگل میں شکار پر پابندیاں ہیں اور اسی قسم کی پابندیاں ہمارے قطعے میں عائد کرنے پر ہم کو مجبور کرنا چاہتے ہیں کیونکہ دونوں جگہ کے جنگلی جانور ایک ہیں اور ہم لوگ بارہ مہینے کے شکار کھیلنے والے اور دوستوں کو کھلانے والے ہیں اور اپنی مرضی کے مطابق پابندیاں لگاتے ہیں مثلاً سرکاری جنگل میں جھانک، چیتل، ہرن اور نیل کا شکار مارچ تا ستمبر ممنوع رہتا ہے مگر ہم خوب مارتے ہیں۔ اور قاعدے کے مطابق یہی موسم ان کے شکار کے لئے مناسب خیال کرتے ہیں۔ اور بیگم صاحبہ نے میری بات کاٹ کر کہا "خیر آپ تو مقدمہ سا سمجھانے لگے، وہ بات بتائیے کہ شیر قید کیسے کئے ہیں"۔

اور میں نے کہا "ہاں عرض کرتا ہوں، دیکھئے ان کے یہاں شیر کا شکار تقریباً بند ہے، بڑی مشکل سے پچھلے سال تین پاس ایشو ہوئے تھے، اور ان کے یہاں سے اب سے دو ماہ پیشتر ایک شکار پارٹی کا بھگایا ہوا ایک جوڑا ہمارے جنگل میں چلا آیا، خیر ہم بہت پہلے چٹ کر چکے ہوتے مگر ہمیں تو اسے آپ کے لئے رکھنا تھا، اور آپ جانتی ہیں کہ شیر کو اپنا ماحول بڑا عزیز ہوتا ہے، دس پانچ روز میں خطرہ کا احساس بھول کر پھر چلا جاتا مگر چھ ہفتہ سے ہم نے اس کو ایسا قید کیا ہے کہ مجال کیا جو میل بھر بھی ادھر ادھر چلا جائے، پہلی چیز تو یہ کہ ہم نے اپنے حدود میں ایک دھماکا بھی نہ ہونے دیا اور یوں تو شیر کے مطلب کا شکار ہمارے قطعے میں بہتیرا ہے مگر یہ دونوں ہمارے مہمان ہیں لہذا مہینہ بھر سے دعوت کر رہا ہوں، ان کی جائے قیام کے قریب ان چھ ہفتہ میں تقریباً روزانہ دو بکرے یا ایک بھینسا صرف اس لئے چپکے سے چھوڑ رہا ہوں کہ شکار کی تلاش میں زیادہ دور نہ جانا پڑے اور کہیں اپنے اصلی جنگل کی طرف منہ اٹھ جائے۔ فکر معاش سے یوں مستغنی ہو گئے، اور کچھار سے باہر جگہ جگہ گڑھوں میں ندی سے اٹھوا کر پانی بھروا دیا ہے، اور تیسرے چوتھے روز سرکاری جنگل کی سرحدوں پر رات کو ایک آدھ دھماکا کرا دیتے ہیں تاکہ ادھر جانے میں خطرہ محسوس کریں، اور ٹھنڈ کے اعتبار سے ہمارا جنگل سرکاری جنگل سے اچھی پناہ گاہ ہے، روزانہ شام کو باہر آتے ہیں اور کچھار کے ادھر ادھر کہیں اپنا اپنا بکرا یا بھینسا پا لیتے ہیں، کھایا پیا، تھوڑی دیر غرائے کھیلے کودے اور پھر آرام گاہ میں داخل۔ اور آج تک ہمارے بھیل اور پاسی شکاری ان کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے دونوں کی روز اطلاع پہنچاتے رہے ہیں، اور کل ہمارا کیمپ جنگل میں پہنچ گیا اب اور آج کے بعد کل دونوں بکرے کا یہ مقررہ چارہ نہیں چھوڑا جائے گا تاکہ وہ بھوک میں تھوڑا بہت جنگل میں گھومیں پھریں اور پھر چار کِل باندھے جائیں گے خاص خاص موقع پر تاکہ ان میں سے دو ایک کِل آسانی کے ساتھ کر سکیں۔"

"اچھا تو آپ کا جنگل کس گروتھ کا ہے یعنی سی پی کے جنگلات سے مشابہ ہے یا اودھ فارسٹ سے" بیگم صاحبہ نے کہا۔ اور میں نے مسکرا کر کہا "آپ کل دیکھ ہی لیں گی، ہمالیہ کی تلی پر ایک بڑا لمبا چوڑا علاقہ ترائی بھابھر کہلاتا ہے، یہ علاقہ بارش کی زیادتی اور بارش کی زیادتی کے علاوہ پہاڑ سے بارہ مہینہ بکثرت پانی ندیاں نالے وغیرہ بہنے کی وجہ سے انتہائی مرطوب ہے اور نینی تال کے ضلع میں واقع ہے۔ اس کی گروتھ بہت کچھ استوائی مقامات جیسی ہے اور ملایا کے جنگلات سے مشابہ ہے زیادہ تر حصہ پر سال اور شیشم کے دیو پیکر درخت ہیں ایک ایک پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ فیٹ بلند اور نیچے کچھ حصہ پر جھاڑیاں ہیں بڑی گھنی، دن دہاڑے اندھیرا معلوم پڑے اور بڑے حصہ پر بید کی بیل پھیلی ہوئی ہے پیچ در پیچ ایک ایک جڑ ایک ایک میل سے زیادہ لمبی تو میرے تجربہ میں آئی ہے۔ الجھی ہوئی لپٹی لپٹی اوپر تلے، نیچے نم زمین اوپر سخت کانٹے دار اور نہایت سرسبز بیل کے الجھے ہوئے سلسلہ کا پانچ چھ فیٹ بلند ڈھیر میلوں شیطان کی آنت کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ اس کے اندر اور تو کوئی چوپایہ نہیں آتا، اور آئے بھی کیونکہ سختی اور لپیٹ کا یہ عالم ہے کہ

اگر ہاتھی بھی آکر پھنس جائے تو مکڑی کے جالے کی مکھی کی طرح جکڑ جائے مگر اس کی سبز چھت کے تلے موٹی خشک سی جڑوں میں شیر پڑے آرام سے رہتا ہے، اوپر سال کے درختوں کی بلند چھتریاں اور اس کے نیچے بید کی بیل کی سر سبز چھت، نیچے نم ٹھنڈی زمین اور اس سے بہتر شیر کے لئے دن کے وقت اور کون سی آرام گاہ ہو سکتی ہے، اور بس اسی بید کے قطعہ کے ارد گرد ہم بکرے بھینسے چھوڑ چھوڑ کر کھلاتے رہے کچھ حصہ جنگل کا ایسا ہے جس میں سال اور شیشم کے بڑے بڑے درختوں تلے مختلف قسم کی جھاڑیاں ہیں اور ان میں نرم بیلیں پونٹریں ہوئی ہیں، یہ چیتل، جھانک، ہرن، بارہ سنگھے، پاڑے، سانبھر، نیل اور سور وغیرہ چرندوں کی پناہ گاہ بھی ہے اور ان کی زیادہ تر غذا بھی یہی قطعہ پوری کر دیتا ہے اگرچہ میلوں تک دھاوے مار مار کر راتوں رات کاشتہ علاقوں پر بھی جا پڑتے ہیں، آپ کے چرندے کا ہر قسم کا شکار اس میں بکثرت ملے گا، اور تیتروں، مرغوں، اور چکوروں موروں کی تو شمار ہی نہیں کہ کس حصے میں کتنے ہیں، ہزاروں کے جھرمٹ ملینگے اور تیتر اور مرغ تنگ بنا بنا کر آپ کو یہیں اڑتے نظر آئینگے اور خرگوشوں کا تو پوچھنا ہی بیکار ہے۔"

"مگر پہلے ہم شیر کا پروگرام رکھینگے" میم صاحبہ نے کہا۔

"ارے صاحب پہلے اور پیچھے کیا، بس شیر کا ہی پروگرام ہے۔ اور اگر شروع میں شیر کا موقع ہو گیا اور پھر دونوں آرام کرنے کو مل گئے اور جنگل میں کوئی اور شیر نہ ہوا تو پھر ایک دن چڑیوں کا رہیگا اور ایک دن چرندوں کا"

"ہوں، ہوں، بالکل، اور تعطیل تو پورے نو دن کی ہے" میم صاحبہ نے کہا۔

"اور انتظام بھی ایسا ہے کہ پہلے ہی روز دھرے سے شیر اٹھالاؤ اور پھر دو دن آرام کر کے فرصت ہی فرصت ہے اور شکار ہی شکار، ہم نے تو جب سے آپ کی آمد کی خبر سنی ہے قسم لے لیجیے جو شکار کھیلنا تو درکنار جنگل کی طرف رخ بھی کیا ہو، تین مہینہ کا سکھایا ہوا شکار ہے اور یہ شیر کا جوڑا آپ کی تقدیر سے اللہ میاں نے بھیجدیا۔"

اور میم صاحبہ کی خوشی اور دلچسپی دیکھ کر صاحب پھولے نہ سماتے تھے، اور بار بار ہماری تواضع اور میم صاحبہ کی جانب زیادہ توجہ پر ہماری جانب بڑے احسان مندانہ تیوروں سے دیکھتے اور میم صاحبہ سے ہماری تواضع اور خلوص کی داد سی طلب کرتے معلوم ہوتے۔

اور میم صاحبہ کا شوق اور صاحب کا اظہار تشکر سا دیکھ کر ہم نے بھی اتنا انہماک اور ایسی سرگرمی اپنی مدت العمر میں نہ دکھائی تھی جتنی اس ٹرپ میں دکھائی۔ اپنی مخصوص پارٹی جمع کی، بڑی آسائش کا کیمپ لگوایا، اور ہماری پارٹی میں شیر پر تو کسی کو چانس ملنے کا سوال ہی نہ تھا مگر پھر اور شکار کا بھی پروگرام تھا جس میں اپنے موقر مہمانوں کے دوش بدوش ہم سب کو بھی دل کھول کر اپنے اپنے جوہر دکھانے کے مواقع تھے۔

جنگل میں پہنچکر اور کیمپ کے انتظامات اور شکار کی خبر رسانی کے ذرائع دیکھ کر بیرسٹر صاحب بہت ہی خوش ہوئے، اصل شکار تو میم صاحبہ کا تھا، اور ہماری بارہ آدمیوں کی میزبان قسم کی پارٹی تو تقریباً عضو معطل کی طرح ساتھ تھی۔ آداب کے مطابق مہمان کے زخمی شکار پر پیچھا کرنے کے لئے اور پھر اگر مہمانوں کے سامنے سے بچ کر نکلتا ہوا اور بالکل ہی ہاتھ سے نکلا جاتا ہو تو موقع سے ایک آدھ ہاتھ مار دیں۔

خیر ادھر ہم نے ایک دن اور ایک رات آرام کیا، ادھر چار کل موقع موقع سے باندھ دیئے گئے تھے اور دوسرے ہی روز ہمارے بھیل شکاری قلیوں نے علی الصبح چار کے وقت سے بھی پیشتر مژدہ سنا دیا کہ چار کلوں میں سے دو کل ہو گئے۔ ساتھ ہی ساتھ شیر اور شیرنی کے "کلوں" کی جاء وقوع بتائی اور ہم نے تو خود ہی جا کر بھینسے بندھوائے تھے، تمام کیمپ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، خاموشی کے ساتھ میم صاحبہ نے دونوں موقع جا کر دیکھے۔ شیر اور شیرنی کی پہچان کھوجوں سے ہوتی ہے دونوں جگہ آدھا آدھا بھینسا کھایا ہوا پڑا تھا جس کو آج شام کو کھانے کے لئے آنا یقینی تھا۔

ہم نے تجویز پیش کی کہ شیر کے چانس پر بیرسٹر صاحب کا مچان رہے اور شیرنی کے کل پر میم صاحبہ کا، مگر صاحب پہلے میم صاحبہ کو چانس دینا چاہتے تھے لہذا ان دونوں نے مل کر ایک چانس لینا پسند کیا۔ ورنہ علیحدہ علیحدہ بیٹھنے میں یہ تیقن نہیں ہو سکتا تھا کہ پہلے میم صاحبہ کے سامنے آئے یا بیرسٹر صاحب کے، اور جس کے سامنے پہلے آجاتا اسی کا ہاتھ رہتا اور ساتھ ساتھ ایک ہی مچان پر بیٹھنے میں میم صاحبہ کا چانس یقینی ہو جاتا تھا اور شیر کے کل پر ایک مناسب ڈبل مچان صاحب اور میم صاحبہ کے لئے باندھ دیا گیا۔ شیرنی کا چانس خالی ہمارا تھا کیونکہ مہمانِ خاص صاحب اور میم صاحبہ تھیں اور انہوں نے ایک ہی،

چانس لینا پسند کیا تھا لہٰذا اب جنگل میں پہلا فیر قاعدہ کی رو سے انہیں کا ہونا چاہیئے تھا اور ایک فیر کے بعد دور دور تک چانس ملنا ناممکن ہو جاتا ہے، اور دونوں کل قریب قریب ایک میل کے اندر ہوئے تھے اور ایک دھما کا دوسرے چانس کو ختم کر دینے کے لئے بہت کافی تھا۔

تیسرے پہر کے وقت میں نے خود جاکر دیکھا، مچان نہایت قاعدے میں دونوں کلوں پر بندھے ہوئے، اگرچہ چانس انہیں دو جگہوں پہ تھا اور ہماری پوری پارٹی ساتھ تھی اور ہم میں سے کسی کو چانس نہ ہو سکتا تھا تاہم فرائض میزبانی ادا کرنے کے طور پر ہم میں سے اکثر نے اپنے لئے مچان بندھوائے تھے اور خود میری نشست کا مچان صاحب اور میم صاحبہ کے مچان سے تیس چالیس گز ہٹا ہوا ایک جانب کو تھا جہاں سے اگر شیر زخمی ہو کر بھاگے تو ریپیٹ کرنے کا چانس ہو سکتا تھا شیرنی والے مچان پر صاحب کے جونیر وکیل صاحب بیٹھے ہوئے تھے مگر اس شرط پہ کہ جب صاحب چانس لے چکیں اور اس کے بعد انہیں چانس ملے تو فیر کریں ورنہ نہیں جس کا کوئی امکان نہ تھا غرض پوری پارٹی میں بجز صاحب اور میم صاحبہ کے بقیہ سب مدِ فاضل تھے کیونکہ ان کے فیر کے بعد کسی کو کہیں پہ کیسے ہی چانس کا امکان ہی نہ رہتا تھا کیونکہ فیر تو بڑی چیز ہے شیر کے کان اتنے تیز ہوتے ہیں کہ میلوں سے کھانسی کی آواز سن کر احساس کر لیتا ہے۔

اور بہار کی صحرائی شام کیسی بھیانک تھی، سورج غروب ہوتے ہوتے صاحب اور میم صاحبہ زری کی سیڑھی کے ذریعہ مچان پر چڑھا دیئے اور سیڑھی اوپر لپیٹ دی گئی مچان کے شکار کے تمام لوازمات پہنچا دیئے اور قریب مغرب کے چڑھے صاحب اور میم صاحبہ کو ساری رات گذر گئی میری بھی آنکھیں پتھرا گئیں، کیونکہ میں تو میزبانی کی بیگار میں پکڑا گیا تھا ورنہ چانس مجکو بھی کوئی نہ تھا، چاندنی خوب عروج پہ تھی اور چاند پورا تھا۔ اور مشرق سے ابھر کر موسم بہار کی سیمیں کرنوں والا ماہتاب مغرب میں جا لٹکا، اور مجھے حیرت تھی کہ آدھا بھینسا کل شام کھا کر بقیہ آدھا آج کھانے کیوں نہیں آیا مگر میرا ماتھا شروع شب میں ہی ٹھنک گیا تھا جب ایک دو مرتبہ میم صاحبہ کو ہلکی کھانسی آئی تھی اگرچہ وہ بیچاری موہنہ پر رومال رکھ کر نہایت ہی احتیاط کے ساتھ کھانسی تھیں، میں اپنے مچان پہ بیٹھا بیٹھا رات کے ہر حصے میں صاحب کے سامنے شیر آنے کا انتظار کرتا رہا۔ شروع شب میں چاندنی اور درختوں کے لمبے لمبے سائے پورب سے پچھم کو پڑے، پھر چاند ذرا ترچھا ترچھا سر پر آگیا تو لمبے لمبے سائے کالے اور سفید چھوٹے بڑے پٹوں میں جھاڑیوں اور درختوں کے نیچے کی زمین، پگڈنڈی اور جگہ جگہ بید کی بیل پر پڑنے لگے۔ شام کی خشک خنکی صبح کی نمناک ٹھنڈ سے جا ملی ضرور شیر میم صاحبہ کی کھانسی کی آواز پر چونک کر ہٹ گیا ورنہ میرے پچیس سالہ تجربہ میں یہ پہلا موقع تھا کہ شیر دوسرے روز اسی وقت کے اور گرد کل پر نہ آئے میں نے رائے قائم کی لیکن بقیہ تمام رات تو صاحب کے مچان سے سانس کی آواز بھی نہ سنائی دی تھی آہستہ آہستہ سال کے دبیز چوڑے چوڑے پتے ٹپکے گئے تمام رات مختلف زاویوں سے پڑتی ہوئی چاندنی کی کرنیں اداس اداس سی ہو کر عمیدی سی ہو گئیں۔ میں نے اوپر نگاہ اٹھائی۔ آسمان پہ ایک خطِ نور مشرق سے مغرب تک کھنچا چلا گیا اور صبح کاذب کے آثار پیدا ہو گئے۔ دور سے صبح خیز کوؤں کی آوازیں کان میں پڑیں اور قریب کے درختوں سے کہیں کہیں ایک آدھ جنگلی مرغ نے بانگ دی۔ ایک پہلو پہ بیٹھے بیٹھے میں سن سا ہو گیا تھا۔ ناامیدی کے ساتھ میں نے پہلو بدلا، دو جماہیاں لیں، اور دل میں کہا افسوس! کیسا مکمل اور یقینی چانس آج خالی نکل گیا اور صاحب اور میم صاحبہ کو کتنی ناامیدی ہوگی۔ بیچاری میم صاحبہ کتنی خوش تھیں اور کیسے جوش میں تھیں، اور میں دوسرے پروگرام کا منصوبہ باندھ رہا تھا مگر کوئی ترکیب آج کی ناکامی کے بعد دماغ میں نہ آتی تھی، اور پتہ نہیں کہ شروع رات میں کھانسی آنے کا احساس میم صاحبہ کو ہے بھی یا نہیں، ورنہ میں تو یہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ان کی اس غلطی کا ان کے سامنے کیمپ پہنچ کر ان کے سامنے اظہار بھی کر سکوں، خدا کرے انہیں یا صاحب کو خود ہی احساس ہو گیا ہو تعجب ہے کہ شیر کمبخت کو سانپ سونگھ گیا۔ اور ذرا سی کھانسی کی آواز پر کل کا کل چھوڑ گیا۔ اور دونوں کا سکھایا ہوا شیر جس کے کان میں مہینوں سے خطرہ کی آواز بھی نہیں پڑی ہے، کب سے نقل و حرکت پر نظر رکھی، اور کل کے بعد دوسرے روز تو شیر اندھا کے سیدھا آتا ہے کڑی کمان کے تیر کی طرح اپنے رکھے ہوئے کھانے پر۔ اور صبح کے دوسرے نقیب تیتروں نے بھی جھاڑیوں میں سے پٹاپٹ آوازیں لگا دیں، لیجیے صبح ہو گئی، اور تم نہ آئے، نامراد منتظر عاشق کی طرح میں نے دل میں کہا اور آج کے چانس نہ ملنے کا مجکو بڑا ہی افسوس تھا۔ اتنے دنوں سے امید لگائی، اور کل کے کل دیکھ کر تو مجھے بڑی

امید بندھ گئی تھی اور یہ تو آج شیر کی جبلت کے بالکل خلاف ہوا کمبخت یکل چھوڑ گیا اور شیر تو ایسا کبھی بڑی ہی مشکل سے کرتا ہے نہایت نمایاں خطرہ محسوس کر کے، میں دل میں حیرت اور افسوس کرتا رہا تھا۔

اور میں ناامید ہو کر ایک انگڑائی لینے کا ارادہ کر رہا تھا کہ میں نے صاحب کے مچان کے سامنے کی جھاڑیوں میں حرکت دیکھی اور غیر معمولی سبک رفتاری کے ساتھ بید کی بیل کی چھت تلے سے شیر برآمد ہوا جائزہ سا لیتا کھسکتا رینگتا سا، بڑا چوکنا چوکنا، اور ایک ہلکی سی غوں کر کے اپنے پس خوردہ سے لپٹ گیا، میں جہاں کا تہاں چپکا رہا۔ میم صاحبہ نے بڑے فنکارانہ انداز میں اپنا دونالا میگنم رائفل اٹھایا اور بڑی اچھی طرح شست لے کر گولی لگائی، بڑی کاری چوٹ پڑی اور شیر جیسے جہاں کا تہاں دھرا رہ گیا۔ ایک پلٹا بھی نہ کھایا اور ختم! بڑی صاف گولی چپکائی! اور میں نے ذرا پست آواز میں کہا "ویل شاٹ!" اور اب ذرا خاموشی ہوئی۔ یوں تو صبح کی روشنی پھوٹ چکی تھی، مگر نیچے تو خاصہ اندھیرا سا تھا، صاحب نے ٹارچ ڈال کر پڑتالا مجھ سے زیادہ دور نہ تھا۔ مگر میں نے دوربین اٹھا کر دیکھا، شیر مردہ پڑا تھا، اور گولی ایسی کاری پڑی تھی کہ بھیجے کا گوشت تک جبڑوں میں جہاں کا تہاں رکھا رہ گیا تھا، اور میں نے دوربین سے غور کیا کہ گولی گردن پر پڑی ہے ایسی کہ بڑی جلد ختم کرتی چلی گئی، تڑپنے پھڑکنے بھی نہ دیا۔ گردن سے خون جاری تھا اور دکھاتے میں جس پہلو بیٹھا تھا اسی پہلو پسر کر رہ گیا تھا، میں نے قاعدہ کے مطابق ذرا انتظار کیا کہ کب دوسری گولی لگائیں گی ورنہ چابکدست شکاری تو ایک ہی نشانہ پر "دن، دن" دونوں گولیاں لگا کر دیکھتے ہیں کہ کیا بنی، اور اگر دیکھتے ہیں کہ گولیاں اچھی نہیں پڑیں تو دوسرا رائفل اٹھا کر دو گولیاں اور مارتے ہیں، مگر میم صاحبہ نے تو دوسرا فیر بھی نہ کیا اور صاحب اور وہ ٹارچ سے پڑتالنے لگیں تو مجھے تعجب سا ہوا، تقریباً چار پانچ منٹ انتظار کے بعد میں نے شیر کے شکار کے آداب کے مطابق مخصوص اصطلاح میں ان سے دوسری گولی لگانے کی ہدایت کی مگر میم صاحبہ نے کہا "نہیں نہیں چمڑا اور ریکارڈ دونوں خراب ہوں گے۔" میں نے کہا "نہیں چمڑا خراب نہیں ہوا کرتا، چاہے کتنے سوراخ ہوں، اور دوسرا فیر ڈیو ہے۔ قاعدہ کی رو سے یہی ریکارڈ کا معیار ہے۔"

"مگر اس کی تو گردن پر گولی پڑی ہے بڑی کاری، وہ تو ختم ہو گیا"

میم صاحبہ نے جواب دیا۔

"لیکن قاعدہ کے مطابق تو آپ کو دوسری گولی لگانا ہی ہے" میں نے اصرار سا کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں بیکار، جان نکل گئی۔ تو میں کیوں ریکارڈ خراب کروں" انہوں نے مخصوص عورت والے انداز میں کہا۔

"کیا اس نے دم پٹخ دی زمین پر؟" میں نے شیر کے شکار میں شیر کے مرنے کی مخصوص نشانی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اور میم صاحبہ کچھ مکدر سی ہو کر بولیں "بیکار بات، وہ تو فوراً مر گیا" اور پھر ٹارچ ڈالی، تو واقعی شیر مردہ پڑا ہوا تھا۔ آنکھیں بند، کان لٹکے، مونہہ کھلا ہوا، دم بل کھائی ہوئی، اور میم صاحبہ ٹارچ ڈال کر محظوظ ہوتی رہیں اور بار بار چہچہا سی پڑتی تھیں، بیرسٹر صاحب ان کے ساتھ محظوظ ہوتے رہے اور چند منٹ بعد جھولے میں سے فیتہ نکال کر بیرسٹر صاحب نے نیچے اترنے کی طیاری کی، اور شکاری تلیوں کو بلانے کی سیٹی دے دی، سیڑھی جو سمیٹ کر مچان کے ساتھ جکی ہوئی تھی نیچے لٹکا دی، رائفل کندھے پر لٹکا اور فیتہ جیب میں ڈال کر سیڑھی سے اترنے لگے اور کہیں کسی قریب کے درخت سے کسی بھیل شکاری تلی نے سیٹی کا جواب دیا، بیرسٹر صاحب کے منہ میں سیٹی دبی ہوئی تھی، انہوں نے پھر بلانے کی آواز نکالی، صاحب نیچے پہنچ گئے اور میم صاحبہ اوپر اچھل اچھل کر تالیاں بجاتی رہیں، چہچہاتی رہیں، اور قریب کے درخت سے بھیل شکاری اپنی بھرتو بندوق سنبھالے آہستہ آہستہ بڑھا، اور اب تو تیزی کے ساتھ صبح کی روشنی کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے جنگل کے تاریک گوشوں میں بھی ایک عجیب نور سا پھیلا دیا تھا۔ صاحب سیڑھی کے اخیر ڈنڈے پر لٹک کر تقریباً پانچ چھ فیٹ اوپر سے زمین پر پھاند پڑے۔ سامنے شیر درخت کی جڑ سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر پڑا ہوا تھا، قاعدے کے مطابق صاحب نے نیچے پہنچ کر کندھے پر سے بڑی خوبصورتی کے ساتھ رائفل اتار کر سیدھا کیا، دو ایک منٹ ٹھٹکے اور پھر خراماں خراماں کھو لنے کی طرح رائفل سیدھا کئے بڑھے، ان کے داہنے ہاتھ سے بھیل شکاری اپنی بندوق تانے بڑھا مگر ان سے بہت زیادہ ٹھٹکتا، رکتا اور ڈرتا ڈرتا سا، اور میں نے صاحب کے ہاتھ میں تنا ہوا سا رائفل دیکھ کر ایک مرتبہ اور تجویز پیش کی "آپ ریپیٹ کر لیں۔" اور میری تجویز پر میم صاحبہ نے جواب دیا

"کیوں؟! بیکار" اس دفعہ مرتبہ میم صاحبہ کے لہجے میں قدرے درشتی سی تھی۔ ورنہ صاحب تو میرے کہتے ہی اک ساعت ٹھہر کر کچھ تیار سے ہوئے تھے۔ اور میں نے دوربین سے دیکھتے ہوئے اندازہ کیا ٹھیک ہی کہتی ہیں میم صاحبہ، واقعی ختم ہی ہوگیا۔ کیا فائدہ کھال میں سوراخ کرنے سے، اور شیر تو درحقیقت مردہ ہی ہے، اور یہ بھی شکاریوں نے بیکار اصول مقرر کر لئے ہیں، مرے کو ماریں شاہ مدار" بھیل شکاری کی رفتار بھی سست تھی، اپنی شاخ پر سے چلا بھی بعد کو تھا اور شست بھی بنسبت صاحب کے زیادہ دور تھی۔ اور صاحب شیر کے پاس اس سے پہلے پہنچ گئے اور وہ بھی چالیس پچاس قدم ادھر ہی تھا شیر کو قریب سے بڑے اشتیاق کے ساتھ دیکھا اور پلٹ کر میم صاحبہ سے کوئی مذاق کا لفظ کہا اور دونوں نے ایک قہقہہ لگایا، صاحب نے بڑے اطمینان کے ساتھ رائفل پھر کندھے پر ٹانگ لیا، جیب سے ناپنے کے لئے فیتہ نکالا، منہ میں سیٹی دباتے ہی دبائے سامنے سے بڑھتے ہوئے بھیل شکاری کو تیز چلنے کی ہدایت کی تاکہ ناپ کرنے میں فیتہ پکڑا سکے اگرچہ دم سیدھی پھیلی ہوئی نہیں تھی مگر میں نے وہیں بیٹھے ہی بیٹھے تخمینہ لگایا کہ پورا سوا دس فیٹ بیٹھے گا، بڑا پرانا ٹائیگر ہے۔ سیدھی جانب سے بھیل بڑھا اور صاحب کو بالکل شیر کے قریب دیکھ کر اس کی رفتار بھی ذرا تیز ہوگئی، صاحب نے فیتہ چکر سے باہر نکالا، کچھ بڑبڑائے اور پرے سے میم صاحبہ شاما کی طرح چہچہائیں اور صاحب نے بڑی پیار بھری نگاہوں سے اوپر دیکھا، بھیل اور قریب آگیا اور صاحب نے شیر کو ناپنے کے لئے ٹیڑھی میڑھی دم اپنے جوتے کی نوک سے سیدھی کرنے کی کوشش کی، اور بمشکل دم کا ایک بل نکال پائے ہوں گے کہ شیر مونچھ کے بالوں کی نوک سے دُم کے سرے تک بجلی کی طرح تڑپ اٹھا، "غاوں غپ" ایک غیض میں بھری آواز بلند ہوئی اور پورا شیر صاحب پر آپڑا۔ میری دوربین آنکھوں سے گر پڑی، اور میں نے صاحب کو شیر کے دونوں پنجوں کے درمیان بجلی کی تیزی کے ساتھ زیر و زبر دیکھا، شیر کا وہ پنجہ جو مشہور بات ہے کہ ایک چپت میں پانچ سیر گوشت اڑا لاتا ہے، اور دونوں پنجوں کے درمیان نیم ایستادہ سا شیر صاحب کو پنج پچھاڑ رہا تھا، نہ معلوم کتنے پیہم جھٹکے ایک منٹ سے کم مدت میں دئے گئے اور نہ معلوم کتنی پٹخنیاں اوپر نیچے دائیں بائیں آگے پیچھے لگا کر غیض میں دانتوں سے گردن دبا کر بڑے زور سے جھنجھوڑا، اور ساتھ ہی پنجے کے دھڑ پر دونوں پنجوں سے طمانچے اور دھپلے لگاتار رہا اور بمشکل منٹ دو لگے دھجیاں ہی اڑا دی، اور میرے کان میں شیر کی پہلی غراں کے ساتھ مچان پر سے میم صاحبہ کی ایک دل دوز چیخ پہنچی تھی اور جب اس خونیں منظر کے درمیان ایک مرتبہ میری نگاہ ان کی جانب گئی تو میں نے انہیں رائفل سنبھالتے سا دیکھا تھا، مگر صاحب کی روح تو پہلے ہی حملہ میں پرواز کر گئی ہوگی، اور دوسرے منٹ کوئی جوڑ بند جڑا نہ رہ گیا تھا مگر دوسرا منٹ ختم نہ ہونے پایا تھا کہ مچان سے فیر ہوا اور شیر چاروں شانے چت جا رہا۔ اب میں نے اپنے حواس مجتمع کرنے کی کوشش کرتے ہوئے جائزہ لیا، اور تقریباً دس بارہ گز چوڑے لمبے اکھاڑہ میں صاحب کے پارچے اور چیتھڑے نم مٹی پر پھیلے ہوئے تھے اور دور دور تک جھاڑیوں پر خون بٹا ہوا تھا، اور پرے سے دیکھ کر کسی چیتھڑے کا یہ اندازہ نہ ہوتا تھا کہ یہ کون سا جسم کا حصہ تھا۔ رائفل دور جا پڑا تھا، نم مٹی پر تازہ خون کے بڑے بڑے دھبے تھے اور چپائی ہوئی کھوپڑی اور گردن گوشت کے ایک بڑے سے تودے میں چیتھڑوں سے اٹکی ہوئی تھی اور ادھر ادھر آنتیں رسیوں کی طرح پھیلی ہوئی تھیں، مچان پر نظر کی تو میم صاحبہ فیر کر کے جو انہیں اصول کے مطابق شیر کے شکار کے آداب میں صاحب کے اترنے سے پیشتر کرنا چاہئے تھا، بیہوش تھیں، بھیل شکاری لنگور کی سی جست لگا کر ایک درخت کی شاخ پر جا ٹنگا تھا، میں نے ذرا حواس مجتمع کر کے پھر دوربین لگائی، ریپیٹ کرنے میں میم صاحبہ نے بڑی قادر اندازی دکھلائی تھی یعنی شیر دانتوں میں پکڑ کر صاحب کو جھنجھوڑ رہا تھا اور اسی حالت میں انہوں نے شیر کے سر پر صاحب کو بچاتے ہوئے ایسی کامیاب گولی لگائی تھی کہ کھوپڑی پاش پاش ہوگئی تھی اور بھیجا بہ بہ کر نکل رہا تھا۔

کچھ کہنے سننے کا وقت اور موقع نہ تھا، گردن کی چوٹ اوچھی تھی جس نے شیر کو بیہوش کر دیا تھا ہم سب سمجھ ہی گئے، تھوڑی دیر میں کیمپ سے خبر پا کر ڈاکٹر دوڑا ہوا آیا تو چارپائی پر کچھ گوشت کے تودے جمع کر کے رکھے، بڑی مشکل سے بیہوش میم صاحبہ کو اتارا، تیلیوں نے لکڑیوں میں شیر ٹانگا اور شکاری اور شکار دونوں شکار ہو کر کیمپ کو پلٹ آئے!

○

شہرِ فرہاد

عبدالحمید عدمؔ

آنسوؤ اور بہو، اور بہو، اور بہو!
میں نے اک عمر تمہیں روکا ہے آگاہ ہوں میں
کیونکہ آنکھوں کے جزیروں کا شہنشاہ ہوں میں
آج لیکن یہ شہنشاہ بھی افسردہ ہے
ایک ٹوٹے ہوئے ناوک کی طرح مردہ ہے
ایک شمشیر ہے خود دار توکل کا وقار
ایک تبسم ہی تو ہے نقطۂ آغازِ بہار
میں نے سوچا تھا کہ اشکوں سے بھرم جاتا ہے
پانی پڑ جائے تو شمشیر کا دم جاتا ہے
آج شمشیر تہ آب مگر آ ہی گئی
اس کی دلدوز نظر روح کو تڑپا ہی گئی
عشق کا سویا ہوا چشمۂ غم جاگ اٹھا
دل میں اک آہوئے دیرینہ کا رم جاگ اٹھا

آنسوؤ اور بہو، اور بہو، اور بہو!
میں نے اک عمر بچائی ہے تمہاری عزت
دل کے پردے میں چھپائی ہے تمہاری عزت
آج تم بھی ذرا یوں سیل نما ہو جاؤ
میرے حالات کی بھیگی سی ردا ہو جاؤ
میری تصویر پہ اک پردۂ آبی آ جائے
طفلِ جذبات کو اک سکرِ گلابی آ جائے
میری گردن میں وہ باہیں جو حمائل کر دے
اور مجھے لغزشِ اظہار پہ مائل کر دے
سیلِ گریہ کے سوا کچھ بھی نظر آ نہ سکے
آنکھ اُس کی مری دُکھتی ہوئی رگ پا نہ سکے
عشق ہو رحم کے قابل مجھے منظور نہیں
شہرِ فرہاد میں ایسا کوئی دستور نہیں

یقینِ بے گماں

جگن ناتھ آزاد

مجھے ماحول نے تم سے جُدا تو کر دیا لیکن تمہاری یاد دل میں لے رہی ہے چٹکیاں اب بھی
نشاط آمیز لمحوں کے فسانے اب بھی تازہ ہیں ہیں دل میں جادہ پیما درد و غم کے کارواں اب بھی
نگاہوں میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے مگر دل میں
تجلّی پھر رہی ہے کارواں در کارواں اب بھی
مرے شعروں میں ہے اب بھی تمہارے درد کا پرتو تمہاری ضو سے تاباں ہے مرا حُسنِ بیاں اب بھی
تمہارے ذکر میں اب بھی وہی اک بات پنہاں ہے جسے محسوس کرتی ہے مری طبعِ رواں اب بھی
تصوّر لے کے پہنچا ہے نظام الدین[1] تک اکثر جہاں کے سنگریزے ہیں حریر و پرنیاں اب بھی
وہ "انڈرہل" سڑک ہے آج بھی مرکز نگاہوں کا جہاں کا ذرّہ ذرّہ ہے حریفِ کہکشاں اب بھی
ضیافت وہ نئی دہلی میں اک مہماں کے آنے پر
مرے احساس میں رقصاں ہیں پیہم بجلیاں اب بھی
عیاں دیکھا نہ جن کو ایک لحظہ چشمِ گردوں نے وہ منظر ہیں حجاباتِ تصوّر میں نہاں اب بھی
حقائق کا تسلسل نامکمل رہ گیا، تاہم زبانِ اہلِ دل پر ہے ہماری داستاں اب بھی
کسی کو کیا خبر ہیں کس قدر بیتاب ملنے کو تمہاری جاگتی قسمت مرا بختِ جواں اب بھی
ملا دے گا کبھی دونوں کو پھر جذبِ دروں اپنا
مجھے ہے اس حقیقت کا یقینِ بے گماں اب بھی

[1] بستی نظام الدین دہلی

بے نیازانِ ازل

عبدالعزیز فطرت

مجلسِ شعر رہے گرم، چلے دورِ غزل
وقت کے تازہ تقاضوں پہ نظر کون کرے
اے شبِ تار! تمنائے سحر کون کرے
کون دیکھے — کہ ہیں کھولے ہوئے آغوش اجل

آتش آلود فضا ہے۔ تو ہمیں کیا پروا
بادۂ سرخ کا اک ساغرِ زرکار ملے
محفلِ رقص میں اک ساعتِ سرشار ملے
رقص اگر سیلِ فنا ہے۔ تو ہمیں کیا پروا

ہم کو گفتار سے ہے کام، کہ ہم شاعر ہیں
چھوڑیئے عرصۂ پیکار کے افسانوں کو
گرمیٔ بادہ سے گرمایئے ایمانوں کو
کیوں غمِ گردشِ ایام۔ کہ ہم شاعر ہیں

خون آلود سہی خاکِ وطن، جام اٹھیں
برق کی زد میں سہی شاخِ چمن، جام اٹھیں

آخرِ شب

عبدالباقی بلوچ

ڈھل چکی رات، پرفشاں ہے سحر
ذرّے ذرّے پہ سحرِ خاموشی
چار جانب فسونِ مدہوشی
بادلوں کے سفید گالوں سے
چھن کے آتی ہے چاندنی ایسے
جیسے سرما میں نور کی کرنیں
بیکراں منجمد سمندر پر
برف پاروں کو آ کے پگھلائیں
اک روپہلی سی دھند پھیلائیں
یخ زدہ چاند اس کے گرداگرد
ایسا لگتا ہے آتشیں جوہان*
جیسے شعلوں میں جل رہا ہے چاند
بادلوں کی سفید کشتی پر
کروٹیں مضمحل سی لے لے کر
بہتا جاتا ہے کیسے دھیرے سے
جاتے جاتے یہ کہتا جاتا ہے
ہو گئی ہے سحر تو کیا غم ہے
جلنے والے ہیں زندۂ جاوید
جلنے والے فنا نہیں ہوتے!

* چاند کے گرد جو ایک سفید حلقہ ہوتا ہے اس کو بلوچی میں 'جوہان' کہتے ہیں۔

کُنجِ مُحبّت

خلیل الرحمٰن اعظمی

یہ سنسان راتیں، یہ ٹھنڈی ہوائیں، یہ پھیلی ہوئی تیری یادوں کی خوشبو
یہ چپ چاپ سے پیڑ، یہ غم کے سائے، یہ دل کی کسک، یہ محبت کا جادو

یہ سب جاگتے ہیں، یہ سب سوچتے ہیں، یہ سب کروٹیں لیتے ہیں آہ بھرتے
نئی منزلوں سے، نئے راستوں سے، نئے موڑ سے سب کے سب ہیں گزرتے

ہر اک موڑ پر جیسے کوئی کھڑا ہو، اشاروں اشاروں میں کچھ کہہ رہا ہو
سمجھ میں نہ آئے کوئی بات اس کی، مگر جیسے چشمہ سا اک بہہ رہا ہو

کوئی جیسے میٹھے مدھر گیت کے بول مدھم سروں میں یونہی گنگنائے
کوئی جیسے طوفاں دبائے ہو دل میں، کسی سے مگر پھر بھی کچھ کہہ نہ پائے

کچھ الفاظ ایسے جو یوں دیکھنے میں پرانے سے ہیں اور کتنے ہی انساں
انہیں کے سہارے سے کہتے رہے ہیں دلوں کی مرادیں جوانی کے ارماں

یہ ارمان، یہ آرزوئیں ہماری، یہ کچھ کسمساتے ہوئے پھول جیسے
جگائیں جنہیں آ کے جھونکے ہوا کے جنہیں گدگدا جائیں آ آ کے بھونرے

خزاں کی ہواؤں کے چلنے سے پہلے ٹپکتے ہوئے پھول کے رس میں ڈوبا
کوئی گیت ساون بیلے ہے بہاروں نے، گاتے ہیں اب بھی جسے باغ و صحرا

جو کنجِ محبت میں پیڑوں کی چھنتی ہوئی چاندنی کی زباں سے ہے کہتا
کہو آج کی رات کیسے گزاری؟ کوئی آج کی رات ملنے بھی آیا!

○

غزل

باقی صدیقی

ہے روایاتِ محبت کا امیں
تیرے ٹوٹے ہوئے وعدے کا یقیں

سرسری ربط کی امید ہی کیا
اس پہ یہ ظلم کہ ایسا بھی نہیں

کتنے اونچے تھے جہاں سے گویا
آسماں تھی ترے کوچے کی زمیں

تنگ آ کر مری خاموشی سے
چیخ اٹھیں نہ در و بام کہیں

حادثہ ہے کوئی ہونے والا
دل کی مانند دھڑکتی ہے زمیں

دیکھ کر رنگ تری محفل کا
ہم نے غیروں کی طرح باتیں کیں

چھڑ گیا میرا فسانہ باقیؔ
اور پھر اٹھی نگاہیں نہ اٹھیں

غزل

تابشؔ دہلوی

کچھ کرشمہ کم نگاہی کا تماشا ہی نہیں
دیکھنا یہ ہے کہ اب تک اس نے دیکھا ہی نہیں

نامُرادی یہ کہ جیسے ہم نہ تھے اہلِ مُراد
بیدلی ایسی کہ گویا دل کبھی تھا ہی نہیں

موت ہے اک اک تمنّا، پھر تمنّا کیا ضرور؟
دشمنِ جاں دل بھی ہے، کچھ شوق تنہا ہی نہیں

گفتنی حالِ دلِ محزوں رہا ناگفتنی
یہ گِلا کس مُنہ سے کیجے اُس نے پوچھا ہی نہیں

بے مُرادی کا سبب ہے حوصلہ مندی مری
یوں تمنّا کی کہ اب کوئی تمنّا ہی نہیں

ہوں بہار آسودہ، دل کی داغداری سے مگر
ہائے وہ داغِ محبّت جو کہ پیدا ہی نہیں

دیدۂ و دل ہیں ہمہ حیرت، ہمہ نظّارگی
ہر تجلّی کا وہ عالم ہے کہ دیکھا ہی نہیں

لُطفِ ناکامی کی منزل دُور ہے تابشؔ ابھی
دل مرا شائستۂ ذوقِ تمنّا ہی نہیں

غزل

احسان دانش

خرد کے مدعی اس انجمن میں جس قدر آئے
سبھی دو چار دن کے بعد دیوانے نظر آئے

میں فطرت کی طرف سے عصمتِ گل کا محافظ ہوں
اجازت لے کے مجھ سے شام رخصت ہو سحر آئے

کوئی دعویٰ کرے کیا تیری خلوت آشنائی کا
ترے جلوے بھی مجھ کو مجھ سے بیگانہ نظر آئے

نہ جانے خاک کے پردوں میں کیا گذری ہے پھولوں پر
یہ رنگ و بو کے شہزادے سبھی با چشمِ تر آئے

نمک خوارانِ گلشن غیر کے ممنون کیوں ہوتے
قفس کے بال و پر بابِ قفس پر پھینک کر آئے

نشاطِ دوستی کچھ ہو، مآلِ دوستی یہ ہے
کسی نے جب انھیں پوچھا، ہمارے اشک بھر آئے!

نظر میری بھی تھی بیتابِ جلوہ دربدر لیکن
ترے جلوے بھی بعض اوقات بیتابِ نظر آئے

ترے جلوے رہے اول سے مسجودِ نظر ورنہ
ہزاروں آستاں گذرے، ہزاروں سنگِ در آئے

ابھی دنیا ہمیں اشک و تبسم تک سمجھتی ہے
مگر ہم اس فریبِ شبنم و گل سے گذر آئے

جہاں احباب خوش رکھتے ہیں، دشمن رنج دیتے ہیں
ہم اب احسانؔ اس احساسِ ہستی سے گذر آئے

غزل

حامد اللہ افسر

کام لیں گر نالۂ بیباک سے
ٹوٹ کر تارے گریں افلاک سے

ہو اگر پیدا مغانِ کارواں
شعلہ تو دے گا رگِ ہر تاک سے

تو نے ساقی میری توبہ کا ضمیر
پھونک ڈالا شعلۂ نمناک سے

پھوٹ نکلے آسماں سے رودِ نور
رخنہ کر دے نالۂ بیباک سے

ایک حالت پر یہ رہ سکتی نہیں
ڈر گیا کیوں گردشِ افلاک سے

منعکس کیونکر ہوں اسرارِ حیات
زنگ پہلے دور کر ادراک سے

اللہ اللہ یہ تصرف عشق کا
حشر اٹھا ایک مشتِ خاک سے

پھول بکھرے تھے چمن میں جا بجا
تو نے دامن بھر لیا خاشاک سے

سوزِ دل سے پہلے خود کو پھونک لے
خود کو پیدا کر پھر اپنی خاک سے

اک چمن میں ہو گیا تو گوشہ گیر
تو نے یہ حاصل کیا لولاک سے

پھر مصیبت میں ہے دنیا خضرِ راہ
پھر اٹھے گا ایشیا کی خاک سے

ہے خرد افروز افسرؔ کا جنوں
ڈر نہ جانا اس گریباں چاک سے

عزت مآب جناب غلام محمد
گورنر جنرل پاکستان نے
کوٹری بیراج کا افتتاح فرمایا
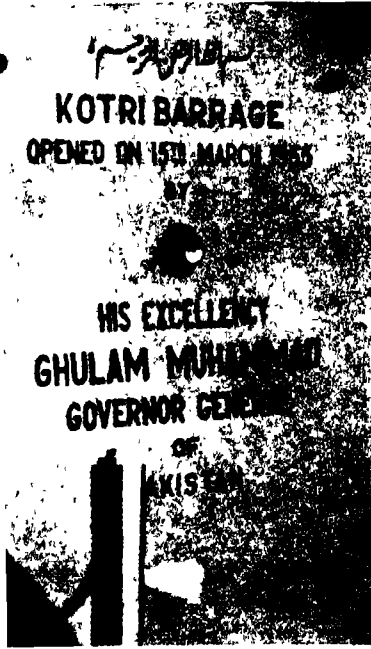
کوٹری بیراج، جس کو
''غلام محمد بیراج'' کے نام سے
موسوم کیا گیا ہے

پاکستان کا پہلا میزانیہ پیش
کرنے سے پہلے عزت مآب
چودھری محمد علی وزیر مالیات
کا اخبار نویسوں سے خطاب
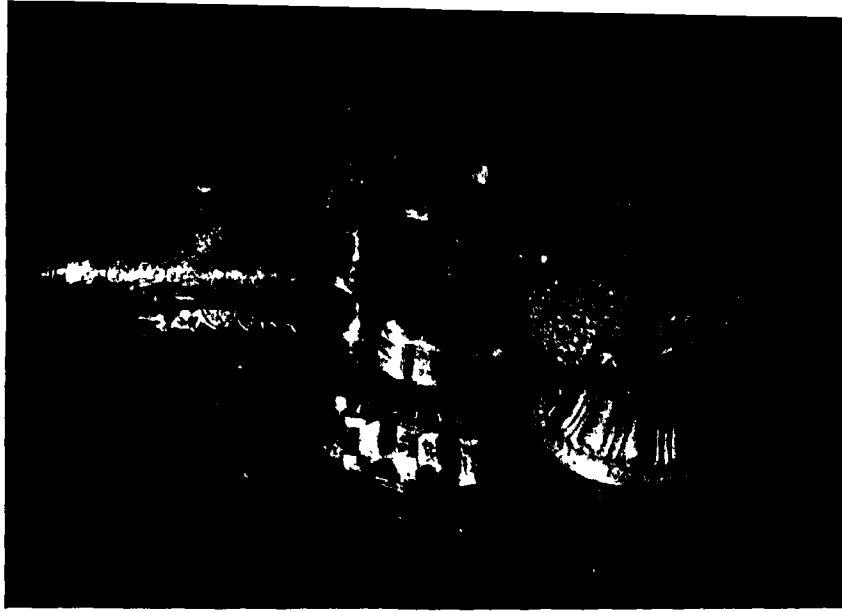
پاکستان کی صناعی کے نمونے
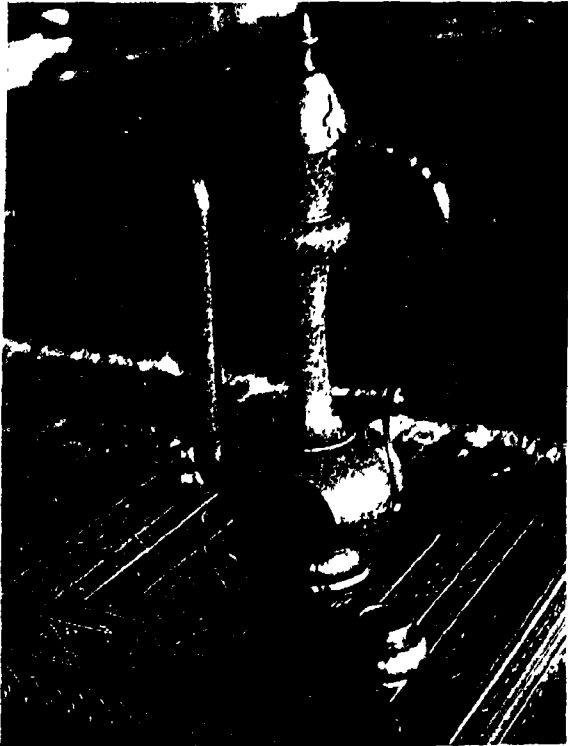
پاکستانی فنون اور عالمی تمدّن

گلبرٹ بروکس

کوئی شخص پاکستان میں رہتے ہوئے ان خطرات سے بے خبر نہیں ہو سکتا جو اس نوزائیدہ مملکت کو بحیثیت ایک ملک اور قومی وجود کے کسی عالمی تمدن، جیسا کہ اسے عام طور پر سمجھا جاتا ہے، سے دوچار ہونے کی صورت میں لاحق ہو سکتے ہیں۔ یہ خیال کہ عالمی تمدن ممکن ہے یا اسے ہونا چاہئیے یا اس کا ہونا ایک طبعی بات ہے، میری رائے میں صحیح نہیں۔ میری دانست میں اس تمدن کا صحیح تصور وہ ہوگا جو نام نہاد عالمی تمدن کے اس تصور کو باطل قرار دے جس سے ارباب فکر و نظر گھبرا اٹھتے ہیں اور ساتھ ہی اس امر کو یقینی بنا دے کہ جس قسم کے قومی تمدن سے پاکستان بلاشبہ بہرہ ور ہے وہ نمو پذیر ہو کر وسیع تر عالمی تمدن کی توانائی اور معنویت میں قابلِ قدر اضافہ کرے گا۔

اس سلسلہ میں میں نے اپنے خیالات ایک مضمون "نئے عالمی تمدن کا نظریہ" میں بالتفصیل پیش کئے ہیں[1]۔

مجھے تسلیم ہے کہ ہمیں کائنات کے اس پیچیدہ مطالعہ کو جو طبیعی علم و حکمت کے نام سے موسوم ہے اور اپنے آلات و مصنوعات کے ساتھ خاص و عام تک پہنچ چکا ہے، عالمی تمدن کا لازمی جزو قرار دینا پڑے گا۔ مگر ایک حقیقی تمدن کے طور پر اپنا فرض کماحقہٗ انجام دینے کے لئے اسے بھی دیگر عناصر کی طرح عوامی فنون اور روایاتی تمدنوں کے ساتھ گھل مل جانا پڑے گا۔ جن کی مدد سے ہمارے عہد کا بیدار مغز طبقہ ——— جڑ سے اکھڑا ہوا، ہلکی گرفت کا مالک احساس ——— جدید روح کی فہم و ادراک اور ترجمانی کو بار آور کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ عالمی تمدن میں ایک حرکی روح کا کارفرما ہونا لازم ہے۔

تاکہ کوئی جماعت دوسری جماعتوں پر غلبہ حاصل نہ کر سکے۔ یہ بات سابقہ نام نہاد تمدنوں کے لئے بھی خطرہ کا باعث رہی ہے اور آج بھی ایک علانیہ خطرہ ہے۔

جو قومیں اقتصادی حیثیت سے کم ترقی یافتہ ہیں انہیں دوسروں کی نقالی سے باز رکھنا چاہئیے اور قدیم تمدنوں کو ملیامیٹ کرنے کی بجائے ان کا مطالعہ کر کے نمو پذیر ذرائع کے طور پر کام میں لانا چاہئیے۔ لہٰذا ایسے تمدن کو جو حقیقی معنوں میں عالمی ہو مختلف گوناگوں تمدنوں کا ایک خوش آہنگ مجموعہ ہونا چاہئیے جس کا رخ زیادہ تر ایک ہی سمت میں ہو۔ یہ سمت نوعِ انسان کی افتادِ طبع ہی سے بخوبی ظاہر ہو جائے گی لیکن اس کی طرز و روش کو بالتفصیل واضح کرنے کے لئے ہمیں لازماً غیر معمولی ذہین و فطین انسانوں کی اپج کو خاص اہمیت دینی پڑے گی۔ اس کے بغیر تمدن بالکل یکساں اور سپاٹ چیز بن جائے گا۔ جس کا ارباب فہم کو اندیشہ ہے۔

ظاہر ہے کہ جو تجویز میں پیش کرنا چاہتا ہوں اس میں بیدار مغز طبقہ کافی حصہ لے گا۔ میرے خیال میں یہ طبقہ اپنی نااستواری اور بے جگہی کی نوعیت کے باعث جدید تمدن کا بہتر حامل بن سکتا ہے۔ اس کے افراد ہمارے زمانہ میں وہی کام کر سکتے ہیں جو نیند اور دن نے سابقہ زیادہ ثباتِ تمدنوں کے سلسلہ میں کیا۔ بات یہ ہے کہ بیدار مغز طبقہ کی اصطلاحی تعریف سے ابتدا میں ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ خیالی دنیا میں بالکل کھویا ہوا ہے۔ اس کا یہ نقص جدید حالات میں ایک نمایاں خوبی بن گیا ہے۔ پہلے تو وہ ایک طرح کی روحانی خلوت یا یوں کہئیے "بادلوں اور کولوں کی سرمست دنیا"

[1] مطبوعہ جرنل آف دی یونیورسٹی آف پشاور ۱۹۵۳ء

میں مذاق تھا جس کا یونانی بزمیہ نگار ارسٹوفینز نے آج سے ۲۳ سو برس پہلے مضحکہ اڑایا تھا۔ اب یہ ڈبلیو۔ ایچ۔ آڈن کے مشہور الفاظ میں اہم سرگرمیوں کا کلیدی مرکز اور انکشافِ حقائق کی تجربہ گاہ" بن گیا ہے۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جدید موسیقی اور دورِ جدید کے مخصوص فنی و ثقافتی مظاہر مثلاً بیلے (رقص)، ناول اور فلم جو گذشتہ سو سال میں بڑے کام آئے ہیں۔ روشن خیال دنیا یعنی دنیا کے ثقافتی مرکزوں کے بڑے بڑے ترقی یافتہ سلسلوں (فن کے لحاظ سے پیرس، اوپیرا کے لحاظ سے برلن، میلان، لندن اور نیویارک، فلموں کے لحاظ سے وینس اور تمام فنونِ لطیفہ کی ہر سال نکاسی کے لحاظ سے ایڈنبرا) کے کس قدر رہینِ احسان ہیں، تو ہم بجا طور پر اس تنبیہہ سے آغازِ کلام کر سکتے ہیں کہ بیدار مغز طبقہ کی عدم موجودگی کا نتیجہ کیا ہوگا۔

اس طرح بیدار مغز طبقہ ایک ایسے ضروری اور عالمگیر محافظ کی صورت اختیار کر لیتا ہے جس کی فہم و فراست کے چشمۂ فیض میں حقیقی عوامی ثقافت کے تمام گہر ہائے گرانمایہ شامل کئے جا سکتے ہیں۔ جن سے میری مراد محض اقوامِ کہن کی تحقیقات ہی نہیں بلکہ ان میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ جیسے اقتصادی حیثیت سے ترقی یافتہ ملکوں کی تخلیقات بھی شامل ہیں۔ جن کے ماہرین حتی الامکان سفید قوموں کے عوامی تمدن کو محفوظ کرنے میں شب و روز سرگرم ہیں قبل اس کے کہ یہ ناپید ہو جائیں۔ یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے اور ہونا چاہئے کہ خواہ قدیم تمدن ہوں یا جدید بہر صورت توانا تخلیقی صلاحیتیں جہاں بھی پائی جائیں ان کو اپنایا اور کام میں لایا جائے۔ محض کسی فرسودہ و ناکارہ تمدنی تکنیک کی تزئین و آرائش کے لئے نہیں بلکہ کسی وسیع پیمانہ پر تخلیقی تحریک کو نئی روح عطا کرنے کے لئے۔ بعد ازاں اس تخلیقی تحریک سے، جیسا کہ گذشتہ پچاس سال کے یورپی تجربہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے، ایسے تخلیقی فنکار پیدا ہوں گے جن کے سابقہ روابط قدرتی طور پر انہیں فوراً قدیم اور بے نام و نشان عوامی فنکاروں کی روح سے قبولِ اثر پر آمادہ کریں گے۔ جب بیدار مغز طبقہ اس طرح محافظت اور رہنمائی کے منصب پر فائز ہو جائے گا تو پاکستان جیسے نسبتاً کم ترقی یافتہ ملک کا مسئلہ سمٹ سمٹا کر صرف اتنا ہی رہ جائے گا کہ عوام اور ان کے تمدن کی نوعیت کیا ہے۔ اور عظیم بیدار مغز فنکار کا عوام کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ یہ عوام ہی ہیں جن کی بدولت عالمی تمدن میں پاکستانی عنصر صورت پذیر ہوگا۔ باقی رہی پاکستان کی مختلف فنی شعبوں میں کما حقہٗ نمائندگی تو اس کا دار و مدار تمام تر فن پر ہے۔

پاکستان کے عوامی فن کی خصوصیات کیا ہیں؟ سب سے پہلے اس میں اور اُس تمدن میں جسے میں جدید عالمی تمدن تصور کرتا ہوں یہ بات مشترک ہے کہ یہ تمام تر ایک متحرک تمدن کی پیداوار ہے، اُن نسبتاً سکونی یا محض یادگار کی حیثیت رکھنے والے تمدنوں کے برعکس جنہوں نے انسانی تمدن کو وہ استقامت عطا کی ہے جو اس کے لئے بعض حالات میں اشد ضروری ہوتی ہے۔ یہ بات ایسے دور میں بے حد اہمیت رکھتی ہے جس میں تمام روابط کو اضافیت کی بنا پر ساکن کی بجائے متحرک خیال کیا جاتا ہے۔ جس کا ہوائی جہاز میں ملک ملک سفر کرنے والا انسان مابہ الامتیاز بھی خیال کیا جاتا ہے اور علامت بھی۔ جہاں تک پاکستان کے عوامی تمدن کا تعلق ہے اس کی بڑی ہی واضح علامتیں جو فوراً ہی پہچانی جا سکتی ہیں۔ شامیانے اور ڈاک بنگلہ ہے۔ نہ کہ مغربی یورپ کے بڑے بڑے جاگیرداروں کے پرشکوہ ایوان، بھاری بھرکم سر بفلک گرجے، اور کسانوں کے ہزار سالہ پرانے گھر۔ خواہ شامیانے یا ڈاک بنگلے کسی دورہ کرنے والے افسر کے ہر رات بدلنے والے ٹھکانے ہوں یا گورنمنٹ ہاؤس یا عہدِ ماضی کے کارواں سالاروں یعنی مغل شہنشاہوں کے وہ شاہی محلات جو اس برصغیر کے گوشہ گوشہ میں بکھرے اور غیر آباد پڑے ہیں۔ ان سب کی روح ایک ہی ہے۔ یہاں تک کہ اس ملک کے بڑے بڑے امراء و رؤسا کی حویلیوں میں بھی ناپائیداری کے احساس کی جھلک نظر آتی ہے۔

پاکستانی تمدن کی نمایاں علامات مجسمے، وسیع آرائشی کینوس یا جداری نمادیر نہیں۔ جن کے مقابلے میں یورپ کی مثالیں ڈرامے اور رزمیہ کی بڑی مشکل اصناف ہیں بلکہ خانہ بدوشوں کی خود ساختہ چیزیں ہیں یا زیورات، پردے۔ شالیں۔ غالیچے اور گھریلو برتن، یا پھر ناچ گانا، حفظ کی ہوئی یا فی البدیہہ غزلیں اور نظمیں اور مقدس رسم الخط جن سب کو گویا رات بھر کے لئے گاڑے ہوئے خیمے میں گڈمڈ پھینک دیا جاتا ہے۔ ان باتوں کو مستثنیٰ کرتے ہوئے جو ہر نئے نئے نظامِ آبپاشی کے ساتھ ابھرتے اور مٹ جاتے ہیں۔ ہر چیز حسن کی الگ تھلگ

صورت معلوم ہوتی ہے، کسی تشفی بخش تعمیری ہیئت کا جزو، کسی کیمیا تصویر یا زندگی کے نمایاں اور محسوس سانچے کے لئے بنائی ہوئی معلوم نہیں ہوتی۔ وحدت ہوتی ہے لیکن کہیں اور سے بھارت کے رسوم و شعائر میں۔ خارجی فنی تخلیقات کی حیثیت سے، جو ہماری مساجد یقیناً نہیں ہیں، ان کے بہترین نمونے اپنی غیر ارضی خوبصورتی کے ساتھ اس دنیا کی چیز معلوم نہیں ہوتے جس کی مثال شامیانے ہیں، بلکہ یہ اسی وقت درجہ کمال کو پہنچتے ہیں جب یہ خالی خولی گھری ہوئی جگہ کے مثالی تصور سے ذرا بھی منحرف نہ ہوں۔ میں پاکستان کے فن کا ذکر اس حیثیت سے کر رہا ہوں کہ یہ ایک زندہ اور متحرک چیز ہے۔ نہ کہ عجائب گھروں کی زینت۔ پاکستانی رسائل و جرائد میں زیادہ تر مغربی اسالیب مصوری ہی کی تقلید غالب نظر آتی ہے، ضرورت یہ ہے کہ پاکستان کے خالص بنیادی اسالیب ہی کو نمایاں کیا جائے۔ میرا اشارہ اس قسم کے فنون کی طرف ہے: بھاولپور کے گلی اور نقشین ظروف، پنجاب کے کامدار جوتے، سرحد کے پلنگوں کے مرصع پائے ڈھاکہ کی طرحدار ٹائلیں اور چاندی کے کام اور دھاتوں پر بوقلموں قسم کی میناکاری، انہی میں سوات کے دھاریدار رنگین ٹپوا بتوں کی پُرکار چپلیں اور پٹھانی چاقو اور ملتان کے پُرکار روغنی ظروف کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ جن کا مٹیالا سرخ رنگ کھلایا ہوا پیازی رنگ اور کلیوں جیسا شوخ نیلا رنگ اپنے حسن ترتیب میں صریحاً مغلوں کی جداری آرائش سے ماخوذ ہیں۔ ان تمام چیزوں میں دنیائے اسلام کی فنی روایات کی سختی سے پیروی کی گئی ہے یعنی فنی صلاحیتوں کو روزمرہ کے استعمال کی اشیاء پر صرف کیا گیا ہے۔

اگر دیہاتی کاریگروں کے طبعی ذوق کو آزادی سے کارفرما ہونے دیا جائے اور اسے جدیدیت کی مصنوعی صورتوں کے ادنیٰ اثرات سے بچایا جائے تو ان کا فن بہت بلند رہتا ہے۔ یورپ کے جدید فنی رجحانات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی بڑا فنکار عوامی تمدن سے فیضان حاصل کرتا ہے تو وہ کیا کچھ کر سکتا ہے۔ یہ رائے ماضی کے فنون پر بھی صادق آتی ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں برتنوں اور پیالوں کو پھولوں اور بیلوں سے آراستہ کرنے اور ان پر نگینے جڑنے کا دستور قدیم سے ہے۔ بھاولپور میں بھی یہی حال ہے جہاں کے ظروف پر بہت ہی خوبصورت اور دلربا میناکاری کی جاتی ہے۔ یہ ظروف بہت ہی نفیس اور کاغذ کی طرح ہلکے پھلکے مگر مضبوط ہوتے ہیں۔ چنانچہ بعض پیالے صرف آدھی چھٹانک وزن رکھتے ہیں مگر ان میں آدھا سیر پانی آ جاتا ہے۔ ڈیرہ اسمٰعیل خاں کی نفیس چوبی چیزوں، آئینوں اور بناؤ سنگھار کی چیزوں کا بھی یہی حال ہے جن پر روغنی کام اس نفاست سے کیا جاتا ہے کہ نہایت ہی باریک جزئیات کے باوجود رنگوں کے ایک سادہ اور متحد تاثر کا احساس غالب رہتا ہے۔ اہل ہنزہ کا کارچوبی کام جو عورتوں کا عام آرٹ ہے بہت اعلیٰ درجہ رکھتا ہے۔ پھر بھی یہ محض ان کی روزمرہ کی ضروریات ہی پوری کرتا ہے۔ جو عوامی فن کی نمایاں علامت ہے۔

سنگت رقص (میلے یا رہس) ایک ایسا فن ہے جس نے دیگر تمام فنون سے بڑھ چڑھ کر عوامی فن اور بین الاقوامی طور پر مقبول اسالیب اظہار میں، جو یورپ نے گزشتہ دو سال سے زائد عرصہ میں تیار کئے ہیں، ربط پیدا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے جدید تمدن میں مرکزی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اسلئے یہ موسیقی، رقص اور پلاسٹک رنگ میں تجربات کا مرکز و محور بن گیا ہے اور حق یہ ہے کہ بہترین رقاصوں کے ہاتھ میں یہ اس جدید بیدار مغز طبقہ کے تمدن کا مکمل وسیلۂ اظہار بن گیا ہے جس کی میں حمایت کر رہا ہوں۔ پاکستان میں اس مرکب اور کلیدی آرٹ کے لئے کافی سامان موجود ہے۔ رہس کی جڑیں تو بڑی مضبوطی کے ساتھ عوام میں گڑی ہیں اور حقیقی سنگت رقص میں ہمیشہ وہ نٹ کھٹ، قدرے شرمیلا، ہٹیلا چنچل بلکہ الھڑ انداز پایا جاتا ہے جو سچے عوامی رقص سے ہمیشہ قریب رہا ہے۔ لہذا جب میرے دوست مجھے یہ بتاتے ہیں کہ کتھک ناچ میں جس قسم کی موسیقی برتی جاتی ہے اور خود ناچ بھی اس قدر پارینہ اور غیر دلکش ہیں کہ انہیں فن قرار نہیں دیا جا سکتا تو میں نے ہمیشہ اصرار کیا ہے کہ یہی خصوصیات اور گانے والوں کا بے تکلف اور بے پروا انداز ہی ہے جو اس کی روح رواں اور اہم ترین جزو ہے۔ انگلستان کے عوامی ناچوں میں، جو خبر نہیں کتنے ہی گم کردہ راہ ریکارڈ کرنے والوں کے زوال آفریں اثرات کا شکار ہو چکے ہیں، یہ سُروں کی کم شگفتہ ترتیب اور اٹھان ہی ہے جس کے اختیار کرنے سے ہمارے موسیقار سب سے زیادہ حظ پاتے ہیں۔

پاکستان میں عوامی فن کا دخل پہلے پہل مرحوم بلبل چودھری اور افروزہ کے ناچوں میں دکھائی دیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مسٹر چودھری نے خود سنگت رقص کو مغربی وضع عطا کرنے یا ہندوستانی طرز پر کلاسیکل ذوق عطا کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ ایسے لوگوں کو زیر اثر لاسکے جن کا مذاق پہلے ہی مقرر اور راسخ ہو چکا تھا۔ لہذا اس نے بڑی احتیاط برتی کہ کہیں تماشائیوں کو یکدم اس غرابت سے دوچار نہ کردے جو ہم مقامی ناچوں میں مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس پاکستانی رقص کے متعلق "سنڈے ٹائمز" میں ایک مدت تک بڑے زور شور سے بحث جاری رہی، اس کے حامی کہتے تھے کہ اس کی تکنیک کی بنیاد کتھک پر ہے یعنی مضمون نگار مس مارجری اسٹمپ کے الفاظ میں "یہ شمالی ہندوستان کا ایک ناچ تھا جس پر مغلوں نے گہرا اثر ڈالا اور یہ مذہبی کی بجائے درباری فن بن گیا۔ سنگت رقص میں یہی بنیادی اسلوب اور اس کے ساتھ ہی ساتھ پنجاب، سرحد کے پہاڑی علاقوں اور مشرقی بنگال کی تکنیک کا بہت سا عنصر بھی برتا گیا ہے"۔ "پاکستان ریویو" کے ایک مضمون نگار کی رائے میں بلبل چودھری نے ہاتھوں کی روایتی حرکات سے اجتناب کرتے ہوئے، جو ہندو مذہبی روش کی آئینہ دار رہی ہے اور جس کی عدم موجودگی اس انگریز نقاد کی کلفت خاطر کا باعث ہوئی تھی جسے مس اسٹمپ نے ہدف تنقید بنایا تھا، مغربی یورپ کی اظہاریت خصوصاً جدید جرمن مدرسہ رقص کو اپنایا تھا اور یہ کہ پاؤں کی حرکات کی رسمی انداز سے آزادی غالباً سویڈن کے ایک خاص قسم کے بیلے کا اثر ظاہر کرتی ہیں! یہ رائے صحیح ہو یا غلط تاہم اس سے ایک اہم نکتہ ضرور ظاہر ہو جاتا ہے جس کی طرف توجہ دلانے کی میں کوشش کر رہا ہوں۔ بہت افسوس کی بات ہوگی اگر اس صنف کو جسے خالص پاکستانی ہونا چاہیئے مغربی بنانے کی خواہش ان جنگی ناچوں کی توانائی پر پردہ ڈال دے جنہیں عام طور پر کھٹک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے لیکن جو درحقیقت مختلف قسم کے منفرد ناچوں پر مشتمل ہیں۔ جیسا کہ مسٹر شاہ محمد عباسی نے "پاکستان ریویو" ہی میں تحریر کیا ہے۔ "یہ ناچ قدم اٹھانے اور پگ دھرنے، ہاتھوں، پاؤں، اور سروں کی حرکات اور سرعت رفتار میں نہایت مردانہ اور دلکش ہے"۔

وہ مغربی فن کار جنہوں نے اپنی ملی روایت سے اعتنا کرتے ہوئے سلامت روی پیدا کی ہے اور آفاقی شہرت کے مالک بنے ہیں، پاکستان فنکاروں کے لئے ایک پیغام رکھتے ہیں۔ زیادہ ضرورت ان تخلیق کاروں کی ہے جو ایک پر زور باطنی تحریک سے اپنی تخلیقی قوتیں ظاہر کریں مستقبل میں اہم نتائج کی توقع کرنے سے پہلے یہ دیکھنا لازم ہے کہ کونسی روش عملی طور پر مفید ہو سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے اہم مناسب مواد کی ذخیرہ اندوزی ہے۔ خواہ یہ عجائب خانوں سے حاصل ہو یا دستاویزی طور پر۔ یہ کام ہمیں فوراً سر انجام دے لینا چاہیئے قبل اس کے کہ عوامی فنون کے آثار ناپید ہو جائیں فنون کو گھریلو صنعتوں کے طور پر محفوظ کرنا چاہیئے تاکہ ان کی انفرادیت برقرار رہے۔ صرف اسی طرح عوام تصنع، ٹیپ ٹاپ اور طرحداری کی طرف مائل ہونے سے محفوظ رہ سکیں گے۔

(تلخیص و ترجمہ)

ہماری نئی پیش کش

عبداللہ

(بنگالی ناول)

قاضی امدادالحق — مترجمہ: ابوالفرح محمد عبدالحق

یہ ناول بنگالی زبان کے مقبول ترین ناولوں میں سے ہے جسے پہلی مرتبہ اردو میں براہ راست بنگالی سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ ناول ایک عبوری دور کے معاشرہ کی جیتی جاگتی تصویر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے جس میں نئی زندگی پرانی زندگی کے ساتھ محو کشمکش ہے اور آخر کار نئے تقاضے حیات کا رخ بدل دیتے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کے دونوں حصوں کا تاریخی ارتقا کس طرح ایک ہی نہج پر ہوا اور ہم ایک دوسرے سے کس قدر قریب ہیں۔ ۔ ۔۴۰۰ صفحات۔ نفیس دیدہ زیب سرورق

مجلد (سادہ چار روپے) مجلد (پارچہ) طلائی لوح ساڑھے چار روپے

ادارۂ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی
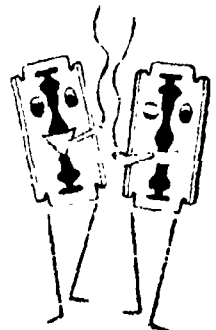
پاکستان کی کیمیاوی تجربہ گاہیں

اللہ بخش راجپوت

عین اس وقت جب ۱۹۴۷ء میں ساون بھادوں کی برساتیں اپنے پورے زور پر تھیں اس برصغیر کی تقسیم عمل میں آئی اور پاکستان کی آزاد مملکت پیدا ہوئی۔ اس کے قائم ہوتے ہی مسلمان مہاجرین کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوا جس کی تاریخ میں کوئی مثال دنیا نہیں ہوتی۔ اور اس کے نتیجہ میں کتنے ہی مہتم بالشان مسائل رونما ہوئے۔ تقریباً پچاس لاکھ بے دست و پا مہاجرین میں سے جنہوں نے پہلے ہی پانچ ماہ میں پاکستان میں پناہ لی۔ ۲۵ لاکھ سے زیادہ مہاجروں کو دور دراز علاقوں سے لمبی لمبی مسافتیں طے کر کے، بعض اوقات سینکڑوں کوس پیدل چل کر سیلاب زدہ کھیتوں اور سڑکوں سے گرتے پڑتے، بھوکے پیاسے کسی پناہ یا ڈاکٹری مدد کے بغیر پاکستان آنا پڑا۔ ہزاروں راستے ہی میں پیاس تکان اور بیماری کا شکار ہو گئے۔ اور جو اپنی جان بچا کر جوں توں پاکستان میں پہنچے ان کی حالت بھی کچھ ایسی اچھی نہ تھی۔ مہاجروں کے قافلوں پر قافلے پاپیادہ چلتے ہوئے آتے اور اپنے ساتھ ہیضے کے مریض لاتے۔ پناہ گزینوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی گاڑیوں پر گاڑیاں خطرناک بیماریوں کے مریض لئے پاکستان میں وارد ہوتیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حفظان صحت کے منتظمین کو ہیضے کی روک تھام کے لئے جو بڑے وسیع پیمانے پر پھوٹ پڑا تھا، اور ایک وقت اندیشہ تھا کہ کہیں وہ سارے پنجاب، بہاولپور، بلکہ سندھ پر بھی نہ چھا جائے، نہایت جانفشانی سے جد وجہد کرنی پڑی۔ یہ صورت حالات اور بھی خراب ہو گئی کیونکہ ملک میں ہیضے کے ٹیکوں کا کوئی بھی سامان نہیں رہا تھا۔ اور نہ پاکستان میں کوئی ایسی لیبارٹریاں تھیں جہاں یہ ٹیکے تیار کئے جا سکیں۔ اس لئے ویکسین دوسرے ملکوں سے ہوائی جہازوں کے ذریعے درآمد کرنی پڑی۔

تقسیم کے وقت اس برصغیر میں بہت سی پرانی لیبارٹریاں موجود تھیں جن سے پاکستان ساز و سامان کے مناسب حصہ لینے کا حقدار تھا، مگر وہ اس سے محروم ہی رہا۔ مجبوراً پاکستان کو دوائیں تیار کرنے کے لئے فی الفور دوسرے ذرائع تلاش کرنے پڑے۔ بنا بریں ۱۴ جنوری ۱۹۴۸ء کراچی میں "بیورو آف لیبارٹریز" کا قیام عمل میں آیا۔ اور اس کے ایک شعبے کو فی الفور ویکسین تیار کرنے اور مختلف ہسپتالوں کے بھیجے ہوئے مواد کا معائنہ کرنے کا کام سپرد کیا گیا۔ چونکہ کالرا ویکسین دیگر ممالک سے وسیع پیمانہ پر درآمد کی جا رہی تھی اس لئے پہلے ٹی اے بی یعنی ملے جلے ٹائیفائڈ اور پیراٹائیفائڈ کے ٹیکے تیار کرنے کا کام شروع کیا گیا چنانچہ ان ٹیکوں کی پہلی قسط اپریل ۱۹۴۸ء کے شروع میں تیار ہو گئی اور پہلے ہی سال لیبارٹریوں نے اوسطاً ۲۰ ہزار سی سی اینٹی کالرا ویکسین، ۱۰ ہزار سی سی ٹی۔ اے۔ بی اور ۵ ہزار سی سی اینٹی ریبک ویکسین فی ہفتہ تیار کی۔ ابتدائی منصوبہ کے مطابق لیبارٹریوں کو ان چار مرحلوں سے گذرنا تھا:

(۱) ٹی۔ اے۔ بی، اینٹی ریبک، کالرا اور ہو سکے تو پلیگ کے ٹیکوں کی تیاری۔

(۲) اینٹی وینائن اور اینٹی ٹیٹنس سیرموں کی تیاری اور سیرالوجی اور الرجیکالوجی کے شعبہ کا قیام

(۳) غذائیات اور خوراک، پانی وغیرہ نیز ادویہ اور آتش گیر مادے کے تجزیہ سے متعلق شعبوں کا قیام

(۴) میڈیکل آفیسروں کو حفظان صحت کی تربیت دینے کے لئے

مدافعتی طب اور حفظانِ صحت کے شعبہ کا قیام

اب تک پہلا اور ایک حد تک دوسرا مرحلہ طے ہو چکا ہے ۔ ان میں ٹی۔ اے۔ بی، کالرا، اینٹی ریبک، پلیگ اور دوسرے معالجاتی ویکسین، اینٹی وینم (دافع سمیات) اور ڈپتھیریا (دافع خناق) ٹیکے شامل ہیں۔ ان کے علاوہ خون کے دھبوں کی شناخت کے لئے ایک سیرالوجیکل شعبہ بھی قائم ہوا ہے جو بڑے زور شور سے کام کر رہا ہے۔ یہ تجربہ گاہیں اب تک حسب ذیل سامان تیار کر کے پاکستان کے سول اور ملٹری ہسپتالوں کو بہم پہنچا چکی ہیں:۔

اینٹی کالرا ویکسین ۳۲ لاکھ سی سی، ٹی اے۔ بی ویکسین: ۴۶ لاکھ سی سی،
اینٹی ریبک ویکسین: ۲۹ لاکھ سی سی، اینٹی پلیگ ویکسین: ایک لاکھ سی سی،
دیگر ویکسین: ۱۳ ہزار سی سی، اینٹی وینم سیرم: ۲ لاکھ سی سی،

ان لیبارٹریوں میں جو ڈپتھیریا اینٹی ٹوکسن تیار کیا گیا ہے وہ ابھی مہیا نہیں کیا گیا۔

اہتمام کیا جا رہا ہے کہ ایک شعبہ ٹیٹنس اینٹی ٹوکسن، اینٹی گیس گنگرین سیرم اور اینٹی انتھریکس سیرم کی تیاری کے لئے قائم کیا جائے۔ امید ہے کہ یہ شعبہ بہت جلد ان سیرموں اور ٹاکسائڈز کو تیار کرنا شروع کر دے گا۔

اینٹی وینم سیرم تیار کرنے کا سلسلہ ۱۹۴۸ء میں شروع ہوا جب پاکستان کے محکمۂ ریلوے نے اطلاع دی کہ ہزاروں لوگ سانپ کے کاٹے کا شکار ہوتے ہیں اور ان کے علاج کے لئے اینٹی وینم سیرم کے فوری بندوبست کی درخواست کی۔ پاکستانی فوج اور وزارت امور کشمیر نے بھی اس کے فی الفور بہم پہنچانے کی فرمائش کی۔ چنانچہ بھارت سے التماس کی گئی کہ وہ مطلوبہ سیرم مہیا کرے یا کم از کم سانپ کا زہر ہی مہیا کر دے تاکہ یہ سیرم پاکستان کی اپنی لیبارٹریوں ہی میں تیار کر لیا جائے مگر بھارت نے یہ درخواست قبول نہیں کی۔ اس لئے سانپ بنگال سے ۵۵ روپے فی سانپ کے حساب سے ہوائی جہازوں میں منگوائے گئے۔ بعد میں مقامی سپیروں کی طرف رجوع کیا گیا اور انہوں نے پندرہ روپے فی سانپ اور دس روپے فی کوبرا کے حساب سے سانپ مہیا کئے۔ یہ دونوں پاکستان کے سب سے اہم زہریلے سانپ ہیں۔ ان کے لئے لیبارٹریوں میں رہائش کا خاص بندوبست کیا گیا ہے اور ان کی نگرانی کے لئے تربیت یافتہ آدمی مقرر کئے گئے ہیں۔ ہفتہ میں ایک بار ان کا زہر نچوڑا جاتا ہے اور اسی وقت ان کو خوراک بھی دی جاتی ہے۔ ہر سانپ کو ایک وقت ایک انڈہ اور آدھا سیر دودھ دیا جاتا ہے۔ سانپ کو گلے سے پکڑ کر شیشہ کے گلاس میں زہر نچوڑ لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد زہر کو ایک خاص برتن میں جسے ڈے سکیٹر کہتے ہیں، سکھا لیا جاتا ہے۔ خشک ہو کر زہر گلتا سڑتا نہیں۔ اور اس کی سمیت غیر معین مدت تک برقرار رہتی ہے۔ اس کے بعد زہر کو پچکاریوں کے ذریعے گھوڑوں میں داخل کر دیا جاتا ہے جنہیں اینٹی وینم سیرم تیار کرنے کے لئے رکھا گیا ہے۔ شروع شروع میں بہت تھوڑی مقدار میں زہر داخل کیا جاتا ہے اور پھر اس کو بتدریج بڑھایا جاتا ہے۔ تقریباً چھ مہینوں میں گھوڑے سو ملیگرام زہر سہار سکتے ہیں۔ یعنی ابتدائی مقدار سے پانچ ہزار گنا زیادہ۔ اگر یہ تجربہ تسلی بخش ثابت ہو تو خون کا وہ خاص جزو جسے مصنوعی گلوبیولن کہتے ہیں اور جس میں زہر مار عنصر ہوتا ہے، ایک خاص طریقے سے الگ کر کے بوتل میں بند کر دیا جاتا ہے۔ یہ تریاق سانپ کے ہر قسم زہر کے لئے موثر ہے۔ اور ۱۰ سی سی، کی مقدار میں مریض کو بالکل تندرست کر دیتا ہے۔

کچھ عرصہ ہوا سانپ کے زہر میں جراثیم پائے گئے۔ یہ بات سب سے پہلے پاکستانی لیبارٹریوں ہی میں مشاہدہ کی گئی۔ سانپ بالخصوص کوڑیالا کے کاٹنے کے بعد اگر اثرات دیر سے ظاہر ہوں تو ادارہ کے ماہرین کی رائے میں اس کا سبب یہی جراثیم ہوتے ہیں نہ کہ زہر۔ ان کا ایسے مریضوں کے علاج سے گہرا تعلق ہے کیونکہ اس صورت میں علاج زہر باد کا ہونا چاہیئے نہ کہ زہر کا۔ اس سلسلہ میں جو تحقیقات ہوئی ہے اس کی روداد "پاکستان جرنل آف ہیلتھ" میں شائع ہو چکی ہے۔

یہ کیمیاوی تجربہ گاہیں ۱۲ ایکڑ زمین پر پھیلی ہوئی ہیں، اور جدید ترین ترقی یافتہ ساز و سامان اور آلات سے آراستہ ہیں۔ یہ تجربہ گاہیں معیاری ویکسینوں، سیرموں اور اینٹی ٹوکسن کو اتنی مقدار میں تیار کرنے کے علاوہ کہ انہیں برآمد کیا جا سکے، ایسے سامان سے بھی آراستہ ہیں جس سے امراض، انسانی خون کی شناخت، زچگی کا معائنہ، خوراک کی بنیادی تقابلی شرحوں، کلچروں، اور راو ٹو ویکسین وغیرہ کا کام بھی سرانجام دیا جا سکتا ہے۔ دیگر امور کے علاوہ صوبائی
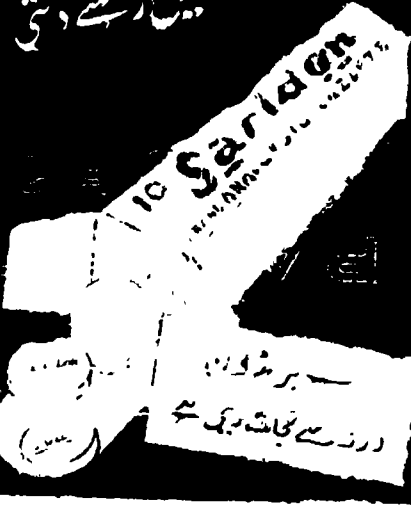
کیمیکل ایگزامینر ہر سال خون کی شناخت کے پندرہ سو سے سترہ سو تک قانونی طبی کیس بھی لیبارٹریوں کو بھیجتے ہیں۔ ان تجربہ گاہوں کے کام کے معیار اور حسن کارکردگی کا اظہار ان سے بہتر الفاظ میں نہیں کیا جا سکتا جو پنسلین کے موجد سر الیگزنڈر فلیمنگ نے پاکستان میں اپنے حالیہ دورہ میں استعمال کئے تھے۔ وہ فرماتے ہیں: "مجھے لیبارٹریوں کے کام کا جو طویل تجربہ حاصل ہے اس کی بنا پر میں ضمنی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے گذشتہ دس سال میں اس سے بہتر ساز و سامان سے آراستہ اور خوش اسلوبی سے کام کرنے والی لیبارٹریاں نہیں دیکھیں۔ مجھے پاکستان میں ایسی لیبارٹریاں دیکھنے کی توقع نہ تھی۔ تحقیقاتی کام کے لئے ایک مرکز قائم کیا جا چکا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے سامنے ایک شاندار مستقبل ہے جس بات سے میں خاص طور پر متاثر ہوا ہوں وہ یہ ہے کہ کس طرح پیچیدہ اور قیمتی سامان کی ضرورت خود ساختہ، سیدھی سادی سستی، اور نہایت کارآمد چیزوں سے پوری کی گئی ہے۔ میں اس کی اس لئے زیادہ قدر کرتا ہوں کہ مجھے بھی بسا اوقات ایسی ہی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اور میں نے ان کا حل سوجھ بوجھ ہی سے دریافت کیا ہے"۔

سر الیگزانڈر فلیمنگ کی تشریف آوری کے بعد ساز و سامان میں اور بھی اضافہ کیا گیا ہے اور کولمبو پلان اور ریڈ فیسک کے حسن توسل سے اور بھی سامان وسیع پیمانہ پر آ رہا ہے۔ پاکستان کی یہ تجربہ گاہیں اب ایسی حالت میں ہیں کہ مختلف اشیاء کو وسیع مقدار میں تیار کریں اور انہیں دیگر ممالک کو مقابلۃً ارزاں قیمتوں پر بھیج سکیں۔

ارادہ یہ تھا کہ یہ تجربہ گاہیں مذکورہ بالا چار مرحلوں سے گزر کر درجہ تکمیل تک پہنچیں لیکن متعدد وجوہ کے باعث سال ۱۹۵۴ء تک صرف پہلے دو ابتدائی مراحل ہی طے کئے جا سکے۔ تاہم امید کی جاتی ہے کہ جب یہ تجربہ گاہیں پایۂ تکمیل کو پہنچ جائیں گی تو یہ اپنے گوناگوں مقاصد کے اعتبار سے مشرق میں ایک منفرد حیثیت کی مالک ہوں گی۔

> "ماہِ نو" میں مطبوعہ مضامین نظم و نثر دوسرے جرائد میں نقل کئے جا سکتے ہیں بشرطیکہ "ماہِ نو" کا حوالہ دیا جائے۔
>
> (ادارہ)

"خیاباں خیاباں ارم"

(مغربی پاکستان کے عوامی گیت)

بگنتی

زیرِ شمشیر کریں رقص چلو
کھا کے ہم تیر کریں رقص چلو
توڑیں زنجیر کریں رقص چلو

آؤ ہاں رقص کریں موت کا رقص
جس کو سب لوگ کہیں موت کا رقص
دیکھ کر غیر ڈریں موت کا رقص

رقص وہ جس سے زمیں ہل جائے
خاک میں اپنا عدو مل جائے
جس سے زخموں کا دہن سل جائے

رقص آزادیٔ اقوام کا رقص
رقص ہر اک نئے پیغام کا رقص
جیسے میخانے میں ہر جام کا رقص

لنڈئی

آئی بہار آئی
خوشبوؤں کی پریوں نے ڈیرے ڈال دیئے
آئی بہار آئی
لوگ مسرت لے چلے جھولیاں بھر بھر کر
آئی بہار آئی
جھوم اٹھی تیراہ کی وادی جھوم اٹھی
آئی بہار آئی

دوشیزائیں رقص میں ہیں حوروں کی طرح
آئی بہار آئی
بیبو اور اطلس کے پیار کی دھوم مچی
آئی بہار آئی
دونوں یوں عاشق تھے جیسے چاند چکور
آئی بہار آئی
بیبو گاؤں کے مکھیا کی لڑکی تھی
آئی بہار آئی
اور اطلس مکھیا کا ادنیٰ نوکر تھا
آئی بہار آئی
بوڑھے اسلم خاں نے دیکھ کے بیبو کو
آئی بہار آئی
بھاری بولی دے کر اس کو جیت لیا
آئی بہار آئی

ٹپے

نفرت سے نہ منہ موڑو
بے چارے غریبوں پہ اتنا نہ ستم توڑو
نفرت ہے یہ کیوں طاری
عاشق ہیں ترے آخر سائل تو نہیں بیاری
اے لختِ جگر غازی
آنکھوں بلاتی ہیں کوہ پر کی حسینائیں

دشمن سے غزا کرنا
میں بیچ کے زیور کو، بارود خریدونگی

بیدار خدائی ہے
آزادی کی دلہن کا ہر شخص فدائی ہے

آزادی کی محبوبہ
کہتی ہے نہیں دوں گی بوسہ میں غلاموں کو

میداں سے نہ لوٹ آنا
میں گاؤں کے لوگوں کے طعنے نہ سنوں پیارے!

ہمراہ مجھے لے چل
تو جنگ کرے گا میں، بارود سنبھالوں گی

اٹھ صبح ہوئی مالی
کل رات سے پیاسی ہے گلشن کی ہر اک ڈالی

یہ میرا وطن کیسا ہے
ہر گوشے میں اس کے ۔ جنت کا نظارا ہے

میداں سے جو لوٹ آئے
زخموں کو سیونگی میں، ان زلفوں کی تاروں سے

(سرحد)

گوری چلی نہانے کو — شکر کیا دریاؤں نے
گوری نے بالوں کو جھٹکا — جیسے تارے ہوں سونے کے!
گوری اپنے بدن کو پونچھے — گلزاروں کو آگ لگے!
گوری نہا دھو کر بیٹھی — دریا سوچ میں ڈوب گئے!

انور[1] موڑ مہار رے ۔ تیری حاجت آج ہمیں
ترے ہوتے یار رے ۔ ہمیں لوٹا چوروں نے!

[1] غازی انور پاشا

ماہیئے

ماہی چاند کا ٹکڑا ہے — دل لے کر مکر گیا — کتنا دل کا کھوٹا ہے!
دو پتے اناروں کے — جل بجھ گیا سب جیون — رہے ڈھیر انگاروں کے!
کیکر کے پھول اُگے — تیری میری ایک ہی جاں — ہم کبھی نہ بچھڑیں گے!
کوٹھے پر آ کاگا — چوری کوٹ کے تجھے کھلاؤں — ماہی کا سندیسہ لا!
کوٹھے پر آ ماہی — اک بات مری سن لے — اپنا حال سنا ماہی!
یہ زیست نرالی ہے — دو چار سخن سن لے — گاڑی چلنے والی ہے
چھاؤں ٹھنڈی نیم کی ہے — اک تو نے جلایا مجھے — کچھ سڑے ہیں لیکھ مرے!
پھیرا ڈال کبھی ماہی — صدقے میں جوانی کے — دکھلا دے چھب نیاری
کبھی آ کر مل ماہی — آنکھیں روتی ہیں اوروں کی — مرا رونا ہے دل ماہی
اک جوڑی بیلوں کی — پکڑیں تنے کو زور سے ہم — کیا ٹیک پھنگوں کی!
دھاگے ہیں کھیسوں کے — پنچھی پڑے پر جھاڑیں — بیگانے دیسوں کے

(قدیم)

کھیتوں میں اُگے پودے | جب کونپلیں پھوٹ جائیں | تب دلوں کے ہوں سویرے
آباد ہوئے سارے | جیون ہے، جوانی ہے | پھر کیوں نہ ملیں پیارے؟
روئی کی دو کلیاں | دل اُجلے یاروں کے | اور سینوں کی کلیاں
آزاد ہیں دل اپنے | آ، اونچی فضاؤں میں | پرکھوں کے اُڑ جائیں
ان اونچی فضاؤں کی | حد بست نہیں کوئی | پرواز ہو دو رانی
آ اڑن کھٹولوں میں | طیاروں کے اڑا کر | افلاک کو زیر کریں!

(جدید)

ترنجن میں

ننھے منے چرخے کی گھوں گھوں اس قدر پیاری — کات کات مٹیاری، کات کات مٹیاری
ننھے منے چرخے کی گھوں گھوں اس قدر پیاری
مرا چرخہ رنگ رنگیلا ہے — مرا چرخہ رنگ کا نیلا ہے
مرے چرخے کی سج دھج ہے نیاری — کات کات مٹیاری کات کات مٹیاری
ننھے منے چرخے کی گھوں گھوں اس قدر پیاری
تیری پونی ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہے — آواز انوکھی آتی ہے
ترے دل میں ہے یہ دُکھن ساری — کات کات مٹیاری، کات کات مٹیاری
ننھے منے چرخے کی گھوں گھوں اس قدر پیاری

(پنجاب)

رت کا گیت

پکیں نئی چاول کی فصلیں — دی ہے مبارک سب یاروں نے
لاڑ[1] کے باسی لے کے درانتی — کرنے چلے فصلوں کی کٹائی
بالیاں کاٹ کے ڈھیر بنائیں
پکیں نئی چاول کی فصلیں
ڈھیر لگا اور ڈوری[2] گھومے — جی چاہے پگ[3] ان کے چومے
بھر بھر مٹکے یار نہ بھیجیں
پکیں نئی چاول کی فصلیں
لاڑ والوں کے پریم فسانے — یاد کریں اُترادی[4] سارے
میٹھے خط لکھے ماندونے
پکیں نئی چاول کی فصلیں

(سندھ)

[1] زیریں سندھ
[2] غلّے کو گاہنے والی بیلوں کی جوڑی
[3] پاؤں
[4] بالائی سندھ کے لوگ

شاعرِ انقلاب — نذرالاسلام :

———بقیہ صفحہ ۲۷

اے بہادر اعلان کر دے
کہہ دے : قعرِ کائنات کے پردوں کو چاک کر کے
آسمان رس مقاصد کو پھلانگ جا
زمین، سمندر اور پہنائے آسمان بلکہ ربِّ جلیل کی کرسیٔ جلال کو پارہ
پارہ کر دے

——ایک، دو، تین!

. . . .

میں جنوں ہوں طوفان ہوں طاعون ہوں ہیجان ہوں
قانون کو ٹھکرا دینے والا، بے قرار، سرگرم!

اے بہادر اعلان کر دے۔

یہ ساری نظم ایک نعرہ ہے جس میں شہری سے زیادہ لشکری کی شان ہے۔ ایک اندھا دھند مجذوبیت۔ شاعری سپہ گری کے سامنے دب گئی ہے۔ جملے نہایت مختصر اور جچے تلے ہیں تخیل صرف اس حد تک ہے کہ جذبات کو اچھال دے۔ شاعر ان کو ظاہر کرنے کے لئے الفاظ کا انتظار نہیں کرتا۔ اس نے خود ہی اپنے جذبۂ بے اختیار کو "جنون" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

"ایک۔ دو۔ تین" ! میں بعینہٖ سپاہیانہ انداز ہے۔ یعنی شاعر جو الفاظ بھی زبان پر آجائیں ادا کر دیتا ہے۔ جہاں تک موضوع کا تعلق ہے۔ اس نظم کی مشابہت شیلے کی مشہور نظم "اوڈ ٹو دی ویسٹ ونڈ" سے ظاہر ہے۔ نذرالاسلام کی نظم میں طوفان کا ذکر بھی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ شیلے کی نظم میں عمل بادِ مغرب سے منسوب ہے اور یہاں بہادر سے۔ شیلے کی نظم میں لمبائی کے ساتھ تیزی اور رسادت ہے اور تخیل کی رنگ آمیزی سے بہت وسعت اور گمبھیرتا پیدا کی گئی ہے۔ نذرالاسلام طوفان کہکر اس سے ایسی ہی سرعت کے ساتھ گذر جاتے ہیں، دونوں شاعروں کے فیضان کا محرک تقریباً ایک ہی تھا۔ شیلے کی نظم میں بادِ مغرب کا طوفانی کردار کارفرما ہے اور نذرالاسلام کی نظم میں بنگال کا تند و تیز طوفان۔ بنگلہ شاعری کی دُھن فوجی مارچ کی دھن ہے اور اس کے بول فوجی بول ہیں غرض شیلے اور نذرالاسلام کے پیکر میں ایک ہی روح ہے۔

اور بسا اوقات ان کے الفاظ ایک جیسے ہوتے ہیں۔ مثلاً :

اوپر، آسمان پر طبل گونجتے ہیں
نیچے، بےچین دھرتی چیت لیتی ہے
نئے طلوع ہونے والے دور کے نوجوان پکارتے ہیں :

بڑھے چلو، بڑھے چلو، بڑھے چلو!
صبح صادق کے دروازے کھٹکھٹاتے ہوئے
ہم ایک زیادہ نورانی سحر کا آغاز کریں گے
ہم اندھیرے کی پرچھائیوں کو پارہ پارہ کریں گے
اور بندھیاچل کے حدود کو بھی پاش پاش کریں گے

اندرونی ہیجان کو اس طرح زوردار پیرائے میں پیش کر دینا کہ وہ محض چھچھلتا ہوا ابال معلوم نہ ہو یا کلام میں دکھائی میکانیت، طمطراق اور اکھڑی اکھڑی بے ربطی پیدا نہ ہو بہت دشوار ہے لیکن نذرالاسلام کی جذباتی صداقت ان خرابیوں کا بڑی کامیابی سے سدّباب کر دیتی ہے۔ چنانچہ "باغی" کے ہر ہر جملے سے ایک طوفانی قوت کا احساس ہوتا ہے۔ گویا ایک بے پناہ طوفان شاہ بلوط کے اونچے اونچے تناور درختوں کو اپنی جناتی قوت سے دوہرا کئے دیتا ہے۔

ان تمام امور سے ظاہر ہے کہ نذرالاسلام نے بنگلہ شاعری کو ایک نئی امنگ، ایک نئی ترنگ اور نیا آہنگ عطا کیا ہے۔ ان سے پہلے بنگلہ کو صرف غنائیہ شاعری کے لئے ہی موزوں سمجھا جاتا تھا۔ نذرالاسلام نے یہ ثابت کر دکھایا کہ یہ زبان مارچ کی دھنوں کے لئے اسی طرح موزوں ہے جس طرح گیتوں کے لئے۔ یہ ایک بہت بڑا انقلاب تھا۔ جس نے بنگلہ کی نئی صلاحیتیں آشکار کیں اور اس کی شاعری کا رخ ہی بدل دیا۔

وہ ذہن جو کلکتہ کے دبستان یعنی ہیم چندر، نوین چندر، مائیکل مادھوسودن دت کیقباد اور ٹیگور کی نرم و لطیف شاعری کے عادی ہو چکے تھے نذرالاسلام نے ان کا تصور ہی بدل دیا۔ یہ تغیر اسقدر ہمہ گیر تھا کہ اس کو ایک زبردست انقلاب قرار دینا زیادہ مناسب

ہوگا۔ نذرالاسلام کی حقیقی عظمت اسی سے نمایاں ہوتی ہے۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کی نہ تو کوئی زبان تھی اور نہ کوئی ادبی روایت۔ متعصب حلقوں نے اس خیال کو تقویت دی جس کے سبب اصلی حقیقت نظروں سے بالکل مستور ہو گئی۔ دراصل بنگال کی دیہاتی آبادی زیادہ تر مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ شروع ہی سے بنگال کے عوامی شاعر رہے ہیں۔ اور ان کے موضوعات اسلامی تاریخ اور روایات سے متعلق ہیں۔ چنانچہ "پوتھی ادب" ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا بیّن ثبوت ہے۔ جب جدید سیاسی حالات کے باعث سرمایہ دار حلقوں کو غلبہ حاصل ہوا تو قدرتی طور پر مشرقی پاکستان کے یہ سیدھے سادے عوامی شاعر خاموش ہو گئے۔

مشرقی پاکستان پر ہندوؤں اور بودھوں کے زمانہ ہی میں اسلامی اثرات طاری ہونا شروع ہو گئے تھے جس کا زبان پر گہرا اثر پڑا اور یہاں کی ان گھڑ پراکرت میں کتنے ہی عربی الفاظ داخل ہو گئے۔ اس طرح یہاں کی بنگلہ پراکرت اور اسلامی زبانوں کا ملغوبہ بن گئی جس میں "مہاکال"۔ "رودرا" اور "تاندو"۔ "ساقی"۔ "جام" اور "شراب" جیسے الفاظ بھی دکھائی دیتے ہیں۔ یہی اس علاقہ کی اصلی زبان تھی۔ انگریزوں کے زمانہ میں ہندو سیاسی حیثیت سے آگے بڑھ گئے، اس لئے زبان اور ادب میں بھی انہی کا سکہ چلنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے پراکرت کو اپنی زبان بنا لیا اور اسی کو ترقی دینے لگے۔ ان کی زبان شہری زبان تھی جس میں سنسکرت کے سینکڑوں الفاظ شامل کر لئے گئے تھے۔ اس طرح ادب اور عوام میں ایک وسیع خلیج حائل ہو گئی۔ چنانچہ دیہات کے ہندو آج بھی مسلمانوں کی بولی سے ملتی جلتی بولی بولتے ہیں۔

رفتہ رفتہ ادب کا ایک نیا دبستان قائم ہوا جو کلکتہ کا دبستان کہلاتا ہے، اس کے نمائندہ تمام تر ہندو تھے۔ یہ لوگ زبان اور ادب پر اسقدر چھا گئے کہ ان ہی کی زبان کو بنگلہ زبان خیال کیا جانے لگا۔ مسلمان قدرتی طور پر اس حلقہ سے خارج رہے۔ ان کے لئے کامیابی کا راستہ یہی تھا کہ وہ بھی یہی زبان برتیں۔ اور کلکتہ کے ہندو دبستان میں شامل ہو جائیں۔ چنانچہ متعدد شعرا جن میں کیقباد سب سے نمایاں ہے نے یہی روش اختیار کی۔

یہ صورت حالات تھی جب قاضی نذرالاسلام میدان میں آئے۔ اپنے مسلم پیشروؤں کی طرح انہیں بھی سنسکرت، پراکرت اور رائج بنگلہ پر پورا پورا عبور تھا۔ یہی دسترس انہیں اسلامی زبانوں، ان کے ادب اور ان کی روایات پر بھی حاصل تھی۔ نذرالاسلام نے ان دونوں کو سمو کر ایک نہایت خوشگوار امتزاج پیدا کیا اور ان سے متعلق نئے نئے موضوعات پر طبع آزمائی کا کام لیا۔ انہوں نے نئے دبستان سے ماقبل عوامی شعرا کے طرز کو درجۂ کمال تک پہنچایا جو خاص و عام میں یکساں مقبول ہے۔ نذرالاسلام نے فوراً محسوس کیا کہ قدیم متروک زبان میں کسقدر قوت ہے۔ انہوں نے اسے گوشۂ گمنامی سے باہر نکالا اور اس کو اس قدر جلا دی کہ اس کو ایک باوقار زبان کا درجہ حاصل ہو گیا۔ یہاں تک کہ کلکتہ کے دبستان کو بھی اسے تسلیم کرنا پڑا۔ یہ تبدیلی اس آنے والے انقلاب کا پیش خیمہ تھی جو پاکستان کی شکل میں ظاہر ہوا۔ نذرالاسلام نے مسلم بنگلہ کو دوبارہ زندگی بخش کر مسلمانوں کو بھی نئی زندگی عطا کی۔ اور یہ پاکستان کی شاہراہ پر پہلی اور نہایت اہم منزل تھی۔ اس نے مسلمانوں کے شعور کو پھر سے بیدار کیا اور ان میں جداگانہ قومی وجود کا دھندلا سا تصور پیدا ہوا جو ترقی کرتے کرتے حقیقی شکل اختیار کر گیا۔ نذرالاسلام مسلمانوں کی زبردست نشاۃ الثانیہ کا باعث ہوئے۔ اس طرح حالات کا دھارا بدلنے میں نذرالاسلام کی بے انتہا اہمیت ہے۔ ان کے بعد ہماری ادبی و قومی تحریک نے ایک باقاعدہ شکل اختیار کر لی اور جب تک اس تاریخی تبدیلی کی اہمیت باقی ہے نذرالاسلام کا نام کبھی فراموش نہیں ہو سکتا۔

سوغات ــــــ بقیہ ص ۳۲

بقیہ ص ۳۲

قادر بخش لیتا تھا۔ ہم نے فریدے کے پیڑے بھی چکھے مگر قادر بخش کے پیڑے والی بات نہ تھی۔

قادر بخش نے پہلے اپنے پرانے مکان کو پختہ بنوایا پھر اس کے ساتھ والی زمین خرید لی۔ بڑے بازار میں دو دکانوں کا بیعنامہ کرا لیا۔ سال بعد مکان کے ساتھ والی سفید زمین پر نیا مکان کھڑا کر لیا سب تبدیلیاں ہوئیں مگر ہمیں سائیں میں کوئی تبدیلی نظر نہ آئی۔ اس کے چہرے سے بڑھاپے نے منہ نکال کر ذرا نہ جھانکا۔ وہی پھرتیلا پن تیز تیز نگاہیں۔ کالی بھونرا مونچھوں کا ایک بال تک سفید نہ ہوا۔ آواز میں وہی لٹکا، وہی نوک جھونک: "کھا دُ پیڑا میرا، یا اللہ فضل تیرا"

کسی یار باش نے کہا "آج جیب خالی ہے۔ پیسے کل لے لینا سائیں"

تو اس نے جھٹ سے کہا "مفت کھا دُ پیڑا، فٹے منہ تیرا"

بٹالہ والوں کا خیال تھا کہ گورداسپور کا ضلع یقیناً پاکستان میں آئے گا۔ جب ملک تقسیم ہوا تو ان لوگوں پر بڑی بپتا پڑی اور آناً فاناً پڑی۔ بہت جلدی میں بھاگے۔ کوئی کچھ لا سکا کوئی بالکل اللہ توکل نکل پڑا۔

سائیں دوسرے قافلہ کے ساتھ اور قادر بخش تیسرے کے ساتھ لاہور پہنچ گئے۔ سائیں دو سال بعد مر گیا۔

قادر بخش لائلپور میں اب حلوائی کی دکان کرتا ہے۔ وہاں کی عمدہ سے عمدہ بھینسوں کا دودھ منگا کر اس نے دوگنی محنت سے کھویا تیار کیا۔ پیڑے بنائے مگر وہ پیڑا تو اب تیار ہی نہیں ہو پاتا جو کبھی اس کے ہاتھوں سے فخریہ انداز میں بن بن کر تانبے کے تھال میں ایک پر دوسرا لڑھکتا جاتا تھا۔

ــــــ آج اس کی دکان پر مکھیاں بھنکتی ہیں۔ لوگ دودھ دہی تو لے جاتے ہیں مگر پیڑوں کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ مگر وہ یہ سوغات بناتا ضرور رہے گا۔

محلی کی دکان والا اونگھ رہا تھا۔ بازار کی دکانیں کبھی کی بند ہو چکی تھیں۔ دوستوں کو ایسے معلوم ہوا جیسے زندگی اونگھ رہی ہے!

جون سنہ ۱۹۵۵ء

غلام عباس — قیوم نظر
سید وقار عظیم — حفیظ ہوشیارپوری
اشرف صبوحی — ضمیر جعفری
فراق گورکھپوری — ناصر کاظمی

کوہ مری

(مغربی پاکستان کا دلکش پہاڑ اور مشہور صحت افزا مقام)

صاف رہ گزار

بازار

مکانات کا نظارہ

جلد ۸ شمارہ ۳

جون ۱۹۵۵ء

مدیر: رفیق خاور

نائب مدیر: ظفر قریشی

چندہ سالانہ: پانچ روپے آٹھ آنے (پاکستان میں) سات روپے (ہندوستان میں) فی کاپی آٹھ آنے (پاکستان میں) دس آنے (ہندوستان میں)

آپس کی باتیں

می گذرد خیالِ من از مہ و مہر و مشتری
تو بہ کمیں چہ خفتۂ صید کن ایں غزالہ را (اقبالؔ)

اقبالؔ کی شاعری میں ایک جہانِ معنی ہے جس کا مطالعہ دلچسپ بھی ہے اور بصیرت افروز بھی — اور ابھی تک بہت کچھ توجہ کا محتاج ہے۔ اس سلسلہ میں انفرادی کوششیں ہی کافی نہیں۔ اس کے لئے ایک مستقل ادارہ کی ضرورت تھی جو اس کام کو منظم طور پر سرانجام دے سکے۔ "اقبال اکیڈمی" اسی احساس کا نتیجہ ہے جس کے قیام کی تجویز پاکستان کی مجلسِ قانون ساز نے ایک ایکٹ کے ذریعے ۱۹۵۱ء میں منظور کی تھی۔ لیکن یہ ادارہ دراصل پچھلے سال جنوری میں وجود پذیر ہوا۔

اکیڈمی کا مقصد اولیٰ اقبالؔ کی تعلیمات کی تفہیم اور ان میں دلچسپی پیدا کرنا ہے۔ ہمارے اس مایۂ ناز شاعر و مفکر کے ارشادات اور کارناموں کو تمام دنیا سے روشناس کرانا ضروری ہے۔ یہ ایسا کام ہے جو اہلِ پاکستان پر ایک اخلاقی فرض کے طور پر عائد ہوتا ہے اور اس سے کماحقہٗ عہدہ برآ ہونے کے لئے اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا ہے۔

ایک سال کے عرصہ میں اکیڈمی نے اپنے لائحۂ عمل کے علاوہ اقبال کے متعلق منصوبوں کا ایک خاکہ بھی مرتب کر لیا ہے اور ان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بڑی تیزی سے آگے قدم بڑھا رہی ہے۔ پچھلے مہینے اس نے یومِ اقبالؔ کے سلسہ میں اپنا پہلا جلسہ منعقد کیا۔ جو اکیڈمی کے مقاصد اور آئندہ تجاویز کے پیشِ نظر خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس اجتماع میں اقبالؔ کے افکار و خیالات کے متعلق چند بہت اچھے محققانہ مقالے پڑھے گئے جنہیں اکیڈمی ایک کتاب کی شکل میں شائع کر رہی ہے۔ ساتھ ہی "اقبالیات کا تنقیدی جائزہ" کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب بھی پیش کی گئی جو ایک اچھے کام کا اچھا آغاز ہے۔ ظاہر ہے کہ اکیڈمی کی کامیابی ذہین افراد کے پُرخلوص تعاون ہی پر موقوف ہے جن کی اعلیٰ صلاحیتیں ایک ہی مقصد کے لئے وقف ہو جائیں۔ خواہ یہ صلاحیتیں اہلِ مشرق کی ہوں یا اہلِ مغرب کی۔

ڈھاکہ میں بھی یومِ اقبال کی تقریب کچھ کم دلچسپ اور بارونق نہیں رہی۔ اور یہ اقبال کے مشرقی و مغربی پاکستان میں یکساں طور پر مقبول ہونے کی بین علامت ہے۔ اس کا ایک جاذبِ نظر پہلو ایک تمثیلی مشاعرہ تھا۔ جو یونیورسٹی کے طلبا نے بڑے اہتمام سے منعقد کیا اور جس میں اردو کے نامور اساتذہ مع علامہ اقبالؔ ہم صحبت و ہم مجلس نظر آئے۔ اس کے علاوہ چند اور جلسے اور مشاعرے بھی ہوئے جن میں اہلِ شہر اور دور سے آئے ہوئے مقرروں اور شاعروں نے شرکت کی۔ علامہ اقبال کی نظموں کے بنگالی تراجم، کلام خوانی اور اہلِ قرب کی سامعہ نوازی نہایت مقبول رہی۔ ہم ان تقریبات کی چند تصاویر اس شمارہ میں پیش کر رہے ہیں۔

بعض اوقات ادبی کارنامے جو اچھی خاصی فنی اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ شہرت حاصل نہیں کرنے پاتے جن کے وہ مستحق تھے۔ اس کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں یوں بھی اہلِ ادب کو ہمیشہ ابنائے زمانہ کی بے توجہی کی شکایت رہی ہے۔ ایسے ادبی شاہکاروں کو ڈھونڈ نکالنا اور منظرِ عام پر لانا بڑی اچھی ادبی خدمت ہے۔ اردو میں کئی ناول ایسے ہیں جن کو اس زمرہ میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے نامور افسانہ نگار غلام عباس صاحب نے ان مٹے ہوئے نقوش کو اجاگر کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اس شمارہ میں انہوں نے حکیم سید علی حسین کے ناول "افتادِ جوانی" پر روشنی ڈالی ہے۔ اور آئندہ وقتاً فوقتاً دوسرے ناولوں کو بھی اسی طرح اندھیرے سے اجالے میں لاتے رہیں گے۔ امید ہے "ماہِ نو" کے پڑھنے والے اس سلسلے کو پسند کریں گے۔

جواں سال رقاص بلبل چودھری آناً فاناً نمودار بھی ہوئے اور رخصت بھی ہو گئے! لیکن اس تھوڑی سی مدت میں بھی انہوں نے اپنے کمالِ فن سے سب کے دلوں میں جگہ پیدا کر لی۔ اور اب ان کی یادگار کے طور پر ڈھاکہ میں "بلبل اکیڈمی آف فائن آرٹس" کا وجود عمل میں آیا ہے جس سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہیں! امید ہے اکیڈمی فن میں روح پیدا کرے گی جو اس یادگار کو حقیقی معنوں میں کامیاب بنا دے۔

اردو کا ایک غیر معروف ناول — "اقتادِ جوانی"

غلام عباس

اردو ناول کی ابتدا انیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں ہوئی۔ اس سے پہلے کے اردو ادب میں قصے کہانیاں اور داستانیں تو ملتی ہیں۔ مگر ناول نہیں، ناول بلاشبہ مغربی چیز ہے۔ اور انگریزی کی وساطت سے اردو میں آیا ہے۔ خوش قسمتی سے پہلے پہل جن مصنفین نے اس صنفِ ادب پر طبع آزمائی کی وہ انگریزی جاننے کے ساتھ ساتھ اپنی زبان اور طرزِ بیان پر بھی پوری پوری قدرت رکھتے تھے۔ میری مراد پنڈت رتن ناتھ سرشار، مولوی عبدالحلیم شرر، منشی سجاد حسین اور نواب سید محمد آزاد مصنف "نوابی دربار" سے ہے۔ ان لوگوں نے انگریزی طرزِ فکر ہی کا تتبع نہیں کیا۔ بلکہ انگریزی انشاپردازی کے اسلوب کو بھی اردو میں بنھایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک نئی قسم کی نثر کی بنیاد پڑی۔ اور اردو میں ناول نگاری نے جلد ہی ایک اہم صنفِ ادب کا درجہ حاصل کر لیا۔

اردو میں ناول کا ورود بڑے ڈرامائی انداز میں ہوا یعنی نہ تو ان ناول نگاروں کے لئے ناشرانِ کتب کی جستجو کا مسئلہ درپیش رہا جس کے اس زمانے کے مصنفین شاکی تھے، اور نہ پڑھنے والے خریداروں ہی کو ڈھونڈنے کی ضرورت پڑی جن کی اس زمانے میں سخت قلت تھی۔ اور تو اور خود ناول نگار کے لئے اشاعت سے پہلے ناول کی تکمیل بھی ضروری نہیں سمجھی گئی، اس کے باوجود دو تین برس ہی کی قلیل مدت میں سارے ملک میں اس نئی صنفِ ادب کی دھوم مچ گئی۔

بات یہ تھی کہ شروع شروع میں یہ ناول کتابی صورت میں نہیں بلکہ اخباروں میں بطورِ ضمیمہ قسط وار چھپا کرتے تھے۔ لوگوں کو انہیں خریدنا نہیں پڑتا تھا بلکہ اخبار کے ساتھ یہ ایک طرح سے مفت ہی دستیاب ہو جاتے تھے۔ چنانچہ جن کو نہ پڑھنا تھا انہوں نے بھی انہیں پڑھا۔ اور ایسے محظوظ ہوئے کہ ہر ہفتے بے تابی کے ساتھ اگلی قسط کے منتظر رہنے لگے۔ ان لوگوں کی دلچسپی کا باعث یہ تھا کہ ان نئی طرز کے قصوں میں انہیں جنوں، پریوں اور شہزادوں کی محیر العقول داستانوں کے بجائے اصلی زندگی کی جھلک دکھائی دی۔ اپنے ہی جیسے انسان چلتے پھرتے نظر آئے۔ جھوٹ، سچ معلوم ہونے لگا، اور وہ بے اختیار ان کے گرویدہ ہو گئے۔

یہاں سے اردو میں ناول کی ترقی کا دور شروع ہوتا ہے۔ دلی میں مولوی نذیر احمد اپنے اصلاحی ناولوں سے اس صنفِ ادب کو پہلے ہی فروغ دے چکے تھے۔ ادھر لکھنؤ میں ان ناول نویسوں نے جن کا اوپر تذکرہ ہو چکا ہے تھوڑے سے ہی عرصے میں متعدد ناول لکھ ڈالے۔ رفتہ رفتہ ناول نے اس قدر قبولِ عام حاصل کر لیا۔ کہ ملک میں ہر طرف ان کی مانگ بڑھ گئی۔ بیسیوں نئے پبلشر پیدا ہو گئے اور روپے لے کر ناولوں کے مسودوں کے لئے مصنفوں کے پیچھے پیچھے دوڑتے پھرنے لگے۔ ہر مہینے درجنوں نئے ناول شائع ہونے جنہیں لوگ ہاتھوں ہاتھ خرید لیتے۔ بعض مصنفوں نے خود اپنے رسالے جاری کر دیئے۔ اور ان میں سلسلہ وار ناول شائع کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ ناولوں نے اس قدر مقبولیت حاصل کر لی۔ کہ ناول لکھنا ایک طرح کا فیشن ہو گیا۔ لوگ طبعزاد بھی لکھتے تھے اور انگریزی کی وساطت سے دوسری زبانوں کے ناولوں کا ترجمہ بھی کرتے تھے۔ اور تو اور ناول کی یہ روز افزوں ترقی اردو کے بعض ممتاز شعرا کو بھی، جنہوں نے غزل گوئی کے دائرے سے باہر قدم نہیں رکھا تھا اس کوچے میں کھینچ لائی، اور انہیں اس صنفِ ادب پر طبع آزمائی کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس زمرے میں شاد عظیم آبادی اور ریاض خیرآبادی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

اردو ناول کی ترقی کا یہ دور پہلی جنگ عظیم تک برابر جاری رہا۔ تیس چالیس سال کے اس عرصے میں خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ہزاروں ہی ناول چھپے بکے اور پڑھے گئے ہونگے۔ مگر ذرا اس دور کی تاریخ ادب پر نظر ڈالئے تو آپ کو پچھلے ناول نویسوں میں صرف دو تین ناموں ہی کا اضافہ نظر آئے گا۔ ان میں ایک تو "امراؤ جان ادا" کے مصنف مرزا رسوا ہیں۔ دوسرے مرزا محمد سعید دہلوی جنہوں نے بزمانہ طالب علمی "خوابِ ہستی" اور "یاسمین" کے نام سے دو قابل قدر ناول لکھے، اور تیسرا نام اگر آپ چاہیں تو ہر دوئی والے حکیم محمد علی المتخلص بہ طبیب کا شامل کر لیجئے اور بس۔ کیا اس سے یہ سمجھ لیا جائے کہ ان دو تین مصنفوں کی کتابوں کو چھوڑ کر باقی جو کچھ لکھا گیا وہ محض رطب و یابس تھا؟ یہ کہنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ ناولوں کے یہ ذخیرے اب قریب قریب ناپید ہو چکے ہیں، اور ان کی اچھائی برائی کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ بدقسمتی سے جس زمانے میں یہ شائع ہوئے تھے نہ تو رسالوں کی وہ کثرت تھی جو آج ہے۔ اور نہ لکھنے اور پڑھنے والوں میں تنقید کا وہ شعور ہی تھا جو موجودہ زمانے میں نظر آتا ہے۔ ناول بعض اچھے اچھے بھی لکھے گئے ہونگے مگر کسی نے نوٹس ہی نہیں لیا۔ اور وہ وقتی طور پر مقبولیت حاصل کر کے رفتہ رفتہ یاد سے محو ہو گئے۔ ایسا ہی ایک ناول "افتادِ جوانی" ہے جس کا میں اس مضمون میں تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔

"افتادِ جوانی" کے مصنف کوئی حکیم سید علی حسین خاں عرف بتن صاحب ہیں۔ ان کے حالات باوجود کوشش کے مجھے معلوم نہ ہو سکے۔ کتاب کے ناشر سید علی محسن خاں اَبر لکھنوی ہیں۔ جو لکھنؤ سے "گلدستۂ معیار" نکالا کرتے تھے۔ بتن صاحب کا یہ مختصر ناول پہلے اسی رسالے کی جلد دوم و سوم میں بالاقساط شائع ہوتا رہا تھا، بعد میں اسے کتابی صورت میں چھاپا گیا۔ اور یہی کتاب اس وقت میرے سامنے ہے یہ ۲۲×۱۸ کے ایک سو دس (۱۱۰) صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ کتاب میں سنہ نہیں دیا گیا اور نہ کوئی ایسی تحریر موجود ہے جس سے معلوم ہو کہ یہ ناول کب لکھا گیا اور کب چھپا۔ البتہ ٹائیٹل کے چوتھے ورق پر "گلدستۂ معیار" کا جو اشتہار دیا گیا ہے۔ اس سے رسالے کے اغراض و مقاصد کے ساتھ ساتھ اس زمانے کے لکھنؤ کی ادبی سرگرمیوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔

یہ گلدستہ ہر انگریزی مہینے لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے۔ طرح کے ساتھ چند قوافی مختص کر دئے جاتے ہیں۔ انہیں قوافی میں شعرا کا کلام منتخب ہو کر بحساب حروف تہجی ہر قافیہ کے تحت میں درج ہوتا ہے جس سے بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے۔ کہ اس قافیہ میں میدان کس شاعر نازک خیال کے ہاتھ رہا۔ ابھی صرف تیسرا ہی سال ہوا ہے اس گلدستے کو نکلتے ہوئے مگر کہاں ہیں وہ حشرات الارض شعرا۔ اب ہم اُس طوفان بے تمیزی کی چہل پہل شاعری کی دنیا میں نہیں دیکھتے جو اس کے پہلے تھی۔ نہ اب گلی گلی مشاعروں کا طفلانہ ہنگامہ سنائی دیتا ہے......

"یہ پرچہ دو جزو پر نکلتا ہے۔ کم بیش ۱۶ صفحہ میں خاص خاص شعرائے لکھنؤ کا بہ تقابل قوافی ہم طرح کلام درج ہوتا ہے۔ ۸ صفحہ میں آج کل کے تعلیم کے مواقق کوئی علمی مضمون نثر کا ہوتا ہے۔ اور ۸ صفحہ میں لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کا اخلاقی نتیجہ خیز دلچسپ ناول ہوتا ہے۔"

بتن صاحب نے کتاب کے خاتمے پر چند سطور بطور عرض حال بھی لکھی ہیں جن میں وہ فرماتے ہیں:-

"میرا پہلا ناول اگرچہ ناول کیا اور میں کیا میں ایک طبیب پیشہ آدمی۔ میرے مشاغل کے دون مرتبہ ہے ناول نگاری مگر بعض احباب کی فرمائش سے لکھنؤ کے شاہی زمانے کے سوشل حالات جو وقتاً فوقتاً میری نظر سے گزرے یا قابل اطمینان دوستوں سے سنے ہوئے تھے۔ اس کو اسی وقت کی زبان اور محاورات کو ملحوظ کر کے ایک سلسلہ میں ایک ضخیم کتاب کے طور پر لکھا تھا۔ مگر یہ سب کچھ عالم بیکاری میں ہوا تھا۔ ملازم ہو جانے کی وجہ سے اس کا کچھ بھی تھل بیڑا نہ ہوا۔ اسی کتاب کا یہ ایک ادنیٰ نمونہ سجاد کا قصہ بطور کے ایک ناول کے پبلک میں پیش کیا گیا ہے۔ اگر ملک قدر کرے گا تو اور اسی قسم کے بہت سے ٹکڑے اسی دلچسپ کتاب سے نکال کے شائع کئے جائیں گے۔"

قیاس چاہتا ہے کہ ملک نے اس کی قدر نہیں کی ہوگی، ادھر حکیم صاحب نے بھی جو ناول نگاری کے پیشے کو طبابت کے پیشے سے گھٹیا سمجھتے تھے، اس کی کچھ زیادہ پروا نہ کی ہوگی، اور انہوں نے اپنے طبیبانہ مشاغل میں مگن رہ کر اس کوچے میں دوبارہ قدم نہیں

دھرا ہوگا۔ کیونکہ ان کی کوئی اور کتاب باوجود تلاش کے میری نظر سے نہیں گزری۔

"افتادِ جوانی" کئی وجوہ کی بنا پر اردو کے بہترین ناولوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔ اوّل تو یہ کہ پچاس ساٹھ یا شاید اس سے بھی زیادہ برس اسے لکھے ہوئے ہو چکے ہیں مگر اس کی تازگی میں فرق نہیں آیا۔ دوسرے مصنف نے جس ڈھب سے اسے لکھا ہے، وہ ناول نگاری کی جدید ٹیکنیک کے قریب ہے۔ اور اگر اس کے بعض غیر ضروری حصوں کو نکال دیا جائے تو اسے موجودہ دور کے کامیاب ترین افسانوں کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ مصنف قصے کے مقامی رنگ، ماحول اور کرداروں سے گہری واقفیت رکھتا ہے۔ اس میں ایک سماجی مسئلے پر ترقی پسندانہ انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ مقصد اصلاحِ معاشرت ہے۔ مگر پند و نصائح کی خشکی قصے کی شگفتگی پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ اس میں ایک نوجوان عورت کا نفسیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے اور ایک ایسے زمانہ میں جبکہ لوگ نفسیات کے معنی بھی پورے طور پر نہیں سمجھتے تھے۔ مصنف کا طرزِ نگارش دلچسپ اور شگفتہ ہے اور اس میں شروع سے لے کر آخر تک ایک دبا دبا سا طنز پایا جاتا ہے جس سے کتاب کا مجموعی تاثر بڑھ گیا ہے۔ قصے کا مرکزی خیال شروع سے آخر تک ایک ہی رہتا ہے۔ اور جوں جوں قصہ آگے بڑھتا جاتا ہے پڑھنے والے کی دلچسپی بھی بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ مصنف بڑی چابک دستی سے دھیرے دھیرے قصے کو نقطۂ عروج پر پہنچا دیتا ہے۔ اور خاتمہ ایک ایسے ڈرامائی انداز میں ہوتا ہے کہ پڑھنے والا کتاب ختم کر کے ایک استہزا آمیز تحیر محسوس کرتا ہے۔

ناول میں ان خوبیوں کے ساتھ کچھ عیب بھی ہیں۔ اس میں اکثر غیر ضروری عبارتیں ہیں جنہیں اگر نکال دیا جائے تو قصہ زیادہ دلچسپ بن سکتا ہے۔ مصنف نے کرداروں کے اوصاف بیان کرنے میں اکثر شاعرانہ مبالغے سے کام لیا ہے۔ اس نے بار بار اصرار کیا ہے کہ یہ واقعہ سچا ہے چنانچہ اسی جوش میں اس نے ایسی باتیں بتا دی ہیں جو نہیں بتانی چاہئیں۔ یعنی قصے کے بیان میں جس رازداری، ضبط و تحمل کی توقع مصنف سے کی جاتی ہے وہ اسے پورا نہیں کرتا۔ لیکن اس کے باوجود یہ ناول مجموعی اعتبار سے اس قدر کامیاب ہے کہ یہ خامیاں آسانی سے نظر انداز کی جا سکتی ہیں۔

ناول کے شروع میں کسی قدر طویل تمہید درج کی گئی ہے، جو اس وقت کی مروجہ انشا پردازی کا بہت اچھا نمونہ پیش کرتی ہے۔ علاوہ ازیں اس سے مصنف کے طرزِ نگارش کا بھی بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہ تمہید اس طرح شروع ہوتی ہے:۔

"ہر انسان کی عمر کے تین حصے ہوتے ہیں۔ بچپنا، جوانی، بڑھاپا۔ اور ان ہی تین حصوں میں سے دو حالتیں اور نکلتی ہیں یعنی بچپنے اور جوانی کے درمیان جو حالت ہوتی ہے۔ اس حالت والے کو کم سن کہتے ہیں۔ اسی طرح جوانی و پیری کے زمانۂ وسط والے عمر کے شخص کو ادھیڑ کہتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہوتا ہے کہ شمعِ جوانی کی روشنی ضیائے صبحِ پیری سے ماند ہوتی جاتی ہے۔ پیشانی کا فرش پُر شکن ہوا۔ رخسار کے آئینوں کی قلعی جاتی رہی۔ زلف کی لٹ زمانہ کی پیچیدگیاں دیکھ دیکھ کے بل کھی نہیں لیتی، بالکل سیدھی ہو گئی۔ اب نہ وہ چتونیں ہیں نہ وہ دزدیدہ نظریں جیسے نظروں کے ترکش تیروں سے خالی ہو گئے۔ ابرو کی کمان کا چلّہ اتر گیا۔ دونوں حدقہ کاسں پر بیکار پڑے ہیں۔ دانتوں کے موتیوں کی آب جواب دے گئی۔ ناک کی خود بینی تشریف لے گئی۔ اب نہ وہ گل شبو رہی نہ وہ بو۔ چند روز میں دولت آباد کے قلعے کی مُہری معلوم ہوگی۔ ہاتھ پاؤں کی نزاکت بھاری بھر کم ہو گئی۔ کلائیوں اور بازوؤں کی گولائی ہارسنگھار کی شاخ کی طرح چپل ہو کے رہ گئی اگرچہ لچک اور دہری ہوئی جاتی تھی کہ ہر دفعہ ٹوٹ جانے کا گمان ہوتا تھا۔ ۔۔ وہ لچک تو درکنار فقط چلک کے قصور پر پائل کی لاتیں کھانے میں ثابت رہنے کی امید دلاتی ہے۔"

ناول میں صرف تین بڑے کردار ہیں۔ سجاد حسین ہیرو۔ افتخار بہو، سجاد کی بیوی ہیروئن اور مرزا فدا حسین ہیرو کا باپ۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی افراد اس قصے میں نظر آتے ہیں مگر ان کی حیثیت ضمنی رہتی ہے۔ اور قصے کے محور مندرجہ بالا تینوں بڑے کردار ہی رہتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد اب میں ناول "افتادِ جوانی" کو قریب قریب اس کے مصنف کے الفاظ ہی میں پیش کرتا ہوں:۔

قصہ آخر آخر عہدِ امجد علی شاہ سے تعلق رکھتا ہے۔ کنگنی سو کل کا تالاب، یہ محلہ اس زمانے میں بہت کچھ آباد تھا۔ روسا شرفا بلکہ اکثر خاندانِ شاہی کے لوگ یہاں رہتے تھے۔ اسی محلے میں میر فدا حسین کا بھی مکان تھا۔ میر فدا حسین اپنے وقت کے بہت بڑے نامی شریف خصلت بانکے تھے۔ ہمیشہ

تلوار ہی کی روٹی کھائی۔ اور تلوار ہی کے ذریعے سے شہر میں عزت آبرو حاصل کی۔ روپیہ اس قدر کمایا کہ جائیدادیں مول لیں۔ ساری عمر میں جناب باری نے خاندان بھر کا چشم و چراغ ایک ہی بیٹا عنایت کیا تھا جو عصائے پیری اور حاصل زندگی تھا۔ سولہ ہی برس کی عمر میں اس نے خانہ جنگیاں لڑ لڑکے اپنے کو میر فدا حسین سے شیر دل بہادر باپ کا بیٹا ثابت کر دکھایا تھا۔ جہاں چار پانچ لکھنؤ کے بے فکرے جمع ہو جاتے تھے وہاں ممکن نہ تھا۔ کہ اس کی کسی لڑائی کا تذکرہ نہ نکل آئے۔ جو لوگ خود بہادر اور بہادر دوست تھے وہ اس کے نام پر جان دیتے تھے۔ جو لوگ بزدل تھے یا کبھی اس کے ہاتھ سے صدمہ اٹھا چکے تھے اور نر و مادہ ہو کر جان بچاتے تھے وہ خار کھاتے تھے ہمیشہ۔ اسی فکر میں رہا کرتے تھے۔ کہ کسی طرح اسے نیچا دکھائیں۔

حسن کے اس کے یہ حال تھا۔ کہ جس طرف نکل جاتا تھا ہزاروں نظریں اور سینکڑوں دل اس کے ساتھ نکل جاتے تھے۔ بڑے بڑے اونچے گھروں والی رنڈیاں مکانوں کے دالانوں اور کھڑکیوں کے کونوں میں بیٹھنے کی آرزو کرتی تھیں۔ سب کی سب حسرتِ پاکدامنی رکھتی تھیں۔ ہرجائی پن بھول کے ایک ہی سفاک کو اپنا قاتل قرار دے کر خود رسنگار ہوا چاہتی تھیں۔ اگر یہ کسی کی خوبیٔ قسمت اور بلند طالعی سے کوٹھے پر چڑھ جاتا تھا تو وہ شاہد بازاری اپنی آنکھیں فرشِ قدم کرتی، خاطر، ارات کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتا تھا۔

اس کا نام اس کے باپ مرزا فدا حسین صاحب نے مرزا سجاد حسین رکھا تھا۔ اور عین اٹھتی جوانی میں جبکہ وہ جملہ فنون سپہ گری سے ماہر و باکر ہو گیا تو برسوں سے ڈھونڈی ہوئی اور کمسنی کی تجویز کی ہوئی ایک غنچۂ دلستانِ چمنِ حسن و نزاکت سے جو مرزا صاحب کی عزیز بھی ہوتی تھی، اس کا عقد کر دیا۔ مرزا فدا حسین نے اپنی بہو کو افتخار بہو خطاب دیا۔ جب سے انکی زوجہ کا انتقال ہوا ان کے گھر میں کوئی صاحب خانہ عورت نہ ہونے کی وجہ سے امورات خانہ داری میں ایک بدانتظامی واقع تھی۔ بہو کے آتے ہی انہوں نے سب گھر داری اس کے حوالے کی۔ سجاد اور افتخار بہو دونوں عاشق و معشوق الفت و محبت کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگے۔

جب کبھی سجاد حسین گھر سے کہیں باہر جاتا تھا اس کی نازک مزاجی اور چھچھلے پن سے افتخار بہو کو اس بات کا یقین رہتا تھا کہ کسی نہ کسی سے ضرور جھگڑا بکھیڑا پیدا ہو جائے گا۔ وہ سمجھتی تھی کہ خدا ہی ہے جو یہ زندہ گھر پھر آئے۔ سب دنیا کے کام چھوڑ چھاڑ دعا و تسبیح و نماز سے کام رکھتی تھی۔

"خداوندا۔ تو ہی اس سڑی سودائی کو گھر میں اصل خیر سے پھیر کے لائے گا۔ وہ جنونی تو زخمی ہونے پر بھی گھر نہیں پلٹا۔ باؤلوں کی طرح دشمن کو ڈھونڈتا ہی پڑا پھرتا ہے۔ مالک میرے تو ہی ہر وقت بچانے والا اور مجھ بے بس لاچار کا راج سہاگ قائم رکھنے والا ہے۔"

افتخار بہو کے زمانۂ الحاح و زاری ہی میں اکثر سجاد حسین گھر آ جاتا تھا بس صورت دیکھتے ہی اس کی جان میں جان آ جاتی تھی۔ پھر گھر کے کاروبار میں مصروف ہو جاتی۔ جب تک سجاد اپنی بی بی کی اس حرکت دیوانگی سے واقف نہ تھا دل میں کہتا تھا یہ کیا بات ہے کہ یہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہتی ہیں۔ اکثر جس ضروری کام کے سرانجام کو کہہ جاتا ہوں، تاکید کر جاتا ہوں وہ اسی طرح پڑا رہ جاتا ہے۔ ایک آدھ دفعہ اس نے تہدید بھی کی اور سبب تو ہزاروں دفعہ پوچھا ہو گا۔ مگر اس نے اصلی سبب اس تصدیق و تعطل کا نہ بتلایا۔ البتہ جب اور عورتوں سے یہ واقعہ کھلا تو سجاد حسین نے بڑی خفت اٹھائی اور اپنے ہر دفعہ کے غصے سے دل میں پشیمان ہوا:۔

"یہ کون حرکت ہے جو تم سے واقع ہوتی ہے۔ اب میں کیا ایسا موم کا ہوں کہ راستے میں کہیں پگھل جاؤں گا۔ حلوا ہوں جو پائے گا وہ مجھکو کھا جائے گا؟"

افتخار بہو کیا جواب دیتی۔ ڈر کے دبی زبان سے یہ اظہار کیا:۔

"میں خود اپنی اس بات کو بیجا سمجھتی ہوں اور شرماتی ہوں۔ زیادہ کر کے اس دن سے جب سے تم نے سن لیا ہے۔"

افتخار بہو سجاد سے اپنی حالت کو اب کچھ پہلے سے زیادہ چھپانے لگی مگر وہ حالت کسی طرح نہ بدلی۔ ہزار کوششیں، سینکڑوں تدبیریں دل کو دیوانہ اور اس خیال کو وہم سمجھ کے کی جاتیں، بلکہ دل سے ہر وقت بحث مقابلہ و مجادلہ رہتی، مگر نہ تو دل ہی نے مانا اور نہ وہ وہم ہی کم ہوا۔ آخر کار اس کے توہمات کی یہ حد پہنچی کہ کوئی رات ایسی نہ ہوتی تھی۔ کہ سوتے سوتے چیخ مار کے اچھل نہ پڑتی ہو حتیٰ کہ سونے سے بھی ڈرنے لگی۔

جس وقت سجاد ہتھیار لگا کے باہر جاتا۔ بس یہ دیکھتی رہ جاتی حتی المقدور پہلے سے ایسی تدبیریں کرتی۔ کہ وہ گھر میں الجھا رہے۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کے وہ کام نکال دیتی۔ کہ جس کے الجھاؤ میں گھر سے باہر نکلنے اور سیر و تفریح کے لئے کہیں جانے کا وقت گزر جائے یا تنگ رہ جائے۔ اکثر وہ اپنی

کوششوں میں کامیاب بھی ہو جاتی۔ مگر ہر روز کی بات کوئی کہاں تک روک سکے ہمیشہ کی عادت کس طرح مٹ سکے۔ اور سجاد سے زندہ دل اور آشنا پرست آدمی کو یوں بھلا کوئی کیا روک سکتا تھا۔ کہ وہ گھر ہی میں رہے کسی وقت باہر نہ نکلے۔ دو گھڑی دن بھی دوستوں کے ساتھ دل نہ بہلائے چوک میں خراماں خراماں ادھر سے اُدھر اُدھر سے اِدھر دو ایک پھیرے نہ کرے۔ خصوصاً بیچ کی سرا والے پھاٹک کے سامنے یارانِ ہم مذاق کے ساتھ ہنس بول نہ لے۔

اس زمانے میں سارے شہر کے بانکوں کا گویا بانا تھا۔ کہ اِدھر اُدھر سے پھیر پھرا کر بیچ کی سرا والے تنبولی کی دکان پر ٹھیک کھاتے تھے۔ ایک آدھ بیڑا پان کا کھایا اور رساتی کا حقہ پیا۔ دو گھڑی دن سے چار گھڑی رات تک اس تنبولی کی دکان پر بانکوں کا مجمع اس طرح رہتا تھا۔ کہ دو چلے گئے چار اور آگئے۔ جو فساد اٹھتا تھا اکثر یہیں سے اٹھتا تھا مگر ایسا ویسا یعنی کرٹک بانکا ذرا وہاں جانے میں کنیاتا تھا۔ بھلا سجاد سے یہ کہاں ممکن کہ وہ گھر میں یوں بند ہو کے بیٹھے کہ اس کی بنکیہتی کو زنگ لگ جائے۔

ایک دن افتخار بہو کا دل معمول سے کچھ زیادہ ہی دھڑکتا رہا تھا۔ یوں تو کوئی رات ایسی نہ ہوتی تھی کہ اس کا خیال اس کو ایک نہ ایک خواب دکھا دیتا ہو۔ مگر پچھلی رات اُس نے جو خواب دیکھا تھا اس کے واقعے اس غضب کے تھے کہ سارا دن اس کی ہیبت رہی۔ تمام اعضا میں ایک نئی طرح کا تلاطم برپا تھا۔ کہ جس کی وجہ سے اس کے ہوش اڑے جاتے تھے۔ بار بار ایک عجب نظرِ حسرت سے میاں کی صورت دیکھتی تھی۔ ہزار حیلوں سے چاہتی تھی۔ کہ آج وہ گھر سے باہر نہ جائے۔ لیکن کوئی فقرہ پیش نہ جاتا تھا۔ آخر اپنی جان پر کھیل جانے پر آمادہ ہو گئی، اور سجاد ایسے شیر کے سامنے بے خوف ہاتھ باندھ کے قدموں پر سر رکھ دیا۔

سجاد نے اس کے سر کو اپنے قدموں سے اٹھا کر سیدھا کر دیا۔ اور اس کے چہرے کو بہ ہیئت مجموعی ایک نئی قسم سے اداس ہی نہیں پایا بلکہ اس جسارت کو بھی اس کی پیشانی پر چمکتے پایا جو کسی نوجوان بانکے کی عالی خاندان زوجہ کو اپنے شوہر کے سامنے کم ہوتی ہے۔

سجاد: (ذرا مسکرا کے) یہ آج کیا تم بالکل اپنے آپے سے گزر گئی ہو آخر ہے کیا، کچھ کہو تو سہی۔

افتخار بہو: للہ مجھ پہ رحم کرو۔ آج میرے قلب کی پھڑک کچھ نرالی ہے۔ کبھی جو بات نہ ہوئی تھی وہ آج مجھ پہ گزر رہی ہے۔ خدا کے واسطے آج گھر سے باہر نہ نکلو، کہیں نہ جاؤ۔

سجاد حسین سے عصمت دوست بہادر کا دل بھی بھر آیا۔ اس نے اپنی بی بی کی طرف سے ایک دوسرے انداز سے منہ پھیر لیا۔ اور بہت جلد اپنی چشمہائے نمناک کو صاف کر کے پھر مخاطب ہوا۔ اور نہایت پیار تشفی و تسلی کے کلمات سے اس کے دکھتے ہوئے دل کو سنبھالا۔ اور اقرار کر لیا کہ میں نہ جاؤں گا۔ دیر تک اسی کی تیمارداری میں مصروف رہا یہاں تک کہ طبیعت اس غریب کی سنبھل گئی۔ اسی میں شام ہو گئی۔ سیر سپاٹے کا وقت بھی اب نکل گیا تھا اس وجہ سے اور بھی بیوی کو اطمینان ہو گیا۔ کہ اب واقعی یہ نہ جائیں گے۔ گرمیوں کے دن تھے آٹھ بجتے بجے بیوی نے کھانے کا تقاضا شروع کر دیا اور خواستہ ناخواستہ دسترخوان بچھا ہی دیا۔ چلئے اب اور بھی اطمینان ہو گیا۔ کیونکہ جب کھانا کھا لیا اب ان کو کوئی مار کے نکالے تب بھی یہ گھر سے قدم نہ نکالیں بلکہ پلنگ سے نیچے قدم نہ اتاریں چہ جائیکہ سیر سپاٹا اور دوستوں کی ملاقات!

آج سویرے سے دونوں میاں بیوی پلنگ پر لیٹے ہوئے ہیں پیاری پیاری اخلاص و محبت کی باتیں ہو رہی ہیں۔ میاں کا بانہا بیوی کے سر کے نیچے ہے جس پر سر کے ساتھ وہ مشکیں و عطر آگیں چوٹی بھی مثلِ مارِ سیاہ کے چمکتی ہوئی پڑی ہے۔ دلی جذبات طرفین سے ہجوم کئے ہوئے ہیں۔ اس قدر کثرت ہے کہ جو نکلتا ہے لڑکھڑاتا ہوا نکلتا ہے۔ نہ بیوی کو اس وقت اپنے وہم و خفقان کا کچھ خیال ہے اور نہ میاں کو کسی دوست آشنا کا یا کسی جلسہ و صحبت کا ہوش ہے۔ کہ یکا یک ڈیوڑھی پر سے کوئی شخص میرزا سجاد حسین پکارتا ہوا سنائی دیا؛

(باقی پھر)

اندرسبھا کی غزلیں اور گیت

وقار عظیم

اندرسبھا کا مطالعہ کرتے وقت اور اس کے مطالعہ کے بعد جس چیز سے پڑھنے والا سب سے زیادہ متاثر ہوتا ہے وہ اس کے گانے ہیں۔ اندرسبھا کی شکل سے ۲۷، ۲۸ صفحوں کی ضخامت میں ۳۱ گانے ہیں۔ ۱۷ غزلیں اور ۱۴ گیت۔ ان کے علاوہ سبز پری اور گلفام کے وہ ۵۰ شعر الگ ہیں جو انہوں نے مختلف حصوں میں گائے ہیں۔ اور اس طرح قصّے کے اشعار کی مجموعی تعداد میں سے راوی، راجا اندر، کالے دیو اور لال دیو کی زبان سے نکلے ہوئے اشعار الگ کر لئے جائیں تو پتہ چلتا ہے کہ اندرسبھا کے تقریباً ۹۰ فی صدی شعر صرف گانے کے لئے ہیں۔ اور مصنف نے اندرسبھا میں دوستوں کی خوشنودی اور سامعین کی تفریحِ طبع کا سامان گانوں ہی سے مہیا کیا ہے۔

اندرسبھا کے مطالعہ کے بعد جب یہ بدیہی بات نظر کے سامنے آجاتی ہے تو پڑھنے والا ان گانوں کے مختلف پہلوؤں کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور وہ جو واضح اور صریح نتیجے نکالتا ہے ان کا انداز کچھ اس طرح کا ہوتا ہے:

(۱) ان گانوں میں مصنف نے غزلوں کو دوسری طرح کے گانوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔
(۲) غزلوں کا انداز مجموعی حیثیت سے اس عہد کے لکھنوی مذاقِ شعری سے مطابقت رکھتا ہے۔
(۳) غزلوں کے لئے بحروں کا انتخاب کرنے وقت [illegible] نے ان کے غنائی پہلو کو پیشِ نظر رکھا ہے۔
(۴) غزلوں کے [illegible] اکثر جگہ دھنوں کے اشارے موجود ہیں۔
(۵) غزلوں اور گیتوں کے مضامین عموماً اس محفل کے مطابق [illegible] وہ گائے گئے ہیں اور اکثر اوقات گانے والے کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔
(۶) گیتوں میں غزلوں کے مقابلہ میں زیادہ رس اور مٹھاس ہے اور وہ غزلوں کے مصنوعی اندازِ اظہار سے متاثر نہیں ہوئے۔

ان بدیہی نتائج میں سے بعض تو اتنے واضح ہیں کہ وہ کسی طرح کی تشریح اور تبصرے کے محتاج نہیں۔ مثلاً یہ بات کہ ان گانوں میں غزلوں کو دوسرے گیتوں سے زیادہ اہمیت دی ہے یا غزلوں کے ساتھ اکثر جگہ دھنوں کے اشارے موجود ہیں لیکن بعض نتائج تشریح طلب بھی ہیں اور ان کی تشریح و توضیح لطف سے بھی خالی نہیں، اس لئے میں نے انہیں بیان کا موضوع بنایا ہے۔

جن مختلف باتوں کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا ان میں سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ اندرسبھا کی غزلیں ایک خاص عہد، یعنی واجد علی شاہی دور کے مذاقِ شعری کی ترجمان ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل اندرسبھا کی سب غزلوں میں موجود ہے۔ سب غزلیں پڑھ لیجئے، ان میں کم و بیش ایک ہی طرح کی شاعرانہ خصوصیات ملیں گی۔ اس نظر سے دو مکمل غزلوں کا مطالعہ کر کے دیکھئے، ایک غزل پکھراج پری نے گائی ہے اور اس کا مطلع ہے ؎

رفتار کی چلن سے غضب دل لبھالئے
چھوٹے سے سن میں یار بڑے تم ہو چالئے

دوسری غزل لال پری کی زبانی ہے۔ اس کا مطلع ہے ؎

انساں کا کام حسن پہ میرے تمام ہے
شہرہ ہے سرخ لال پری میرا نام ہے

پہلی غزل میں مطلع سے مقطع تک نو شعر ہیں۔ اور دوسری میں سات۔ اب ذرا ان دونوں غزلوں پر نظر ڈال کر ان کا تجزیہ

'' شاد آباد کنارے ''

عکس : زبیدہ آغا

کرنے کی کوشش کیجئے۔ پہلے پکھراج پری والی غزل لیجئے ؎

رفتار کی چلن سے غضب دل لبھا لئے
چھوٹے سے سن میں یار بڑے تم ہو چالئے
بوسہ جو مانگا چشم کا کیا قہر ہو گیا
مجھ پر نہ عین بزم میں آنکھیں نکالئے
جانے نہ دوں گا آپ کو سننے کا میں نہیں
باتیں بنا کے وصل کا وعدہ نہ ٹالئے
اک بوسہ پہ یہ گالیاں، اللہ کی پناہ
کچھ میں بھی اب کہوں گا زباں کو سنبھالئے
درگذرا میں ملاپ سے ہٹئے کہاں کا پیار
پھیلا کے ہاتھ پاؤں گلے میں نہ ڈالئے
نظارہ روئے صاف کا منظور ہے ہمیں
دکھلا کے زلف کو نہ بلا سر کی ٹالئے
عاشق کو زہر غیر کو مصری کی ہو ڈلی
اس طرح کی نہ بات زباں سے نکالئے
نامحرموں کی آنکھ نہ انگیا پہ جا پڑے
سینہ کھلا ہوا ہے ذرا پٹہ سنبھالئے
خوش چشم سب جہاں کے امانتؔ میں بے وفا
جی چاہتا ہے آنکھ کسی پر نہ ڈالئے

غزل مضمون اور اسلوب کے اعتبار سے پوری طرح لکھنوی مذاق کی حامل ہے۔ غزل میں شروع سے آخر تک لفظی رعایتوں کا التزام، عاشق کا محبوب سے ایک ایسے انداز میں تخاطب جس سے محبوب کے بازاری ہونے کا احتمال پیدا ہوتا ہے، غزل میں وصل، بوسہ اور انگیا اور سینۂ صاف جیسی چیزوں کا بے باکانہ ذکر، محبت کے رشتہ میں جسم کا غلبہ، عشق میں قدم قدم پہ رقیب، غیر اور نامحرم کے وجود کا نمایاں احساس اس طرح کی چیزیں ہیں جو اس دور کے شاعروں کی نمایاں خصوصیات سمجھی جاتی ہیں۔ امانتؔ کی غزلوں پر اس مذاق عام کا جو گہرا اثر تو ہے اس میں رعایت لفظی کی حیثیت سب سے نمایاں ہے، مضمون کسی طرح کا بھی ہو کہنے والا اسے تجنیس و ایہام کے دام کا اسیر بنا دیتا ہے۔

اب دوسری غزل دیکھئے:

انساں کا کام حسن پہ میرے تمام ہے
جوڑا ہے سرخ، لال پری میرا نام ہے
یاقوت زر خرید ہے سرمہ کا رکا مری
نوکر عقیق، لعل بدخشاں غلام ہے
عاشق کو قتل کرتی ہوں ابرو کی تیغ سے
دن رات مجھ کو خون بہانے سے کام ہے
پوشاک میری سرخ ہے مکھڑا ہے چاند سا
دیکھو شفق میں رات کو ماہ تمام ہے
شوخی پہ میری ہوتے ہیں مرغ چمن حلال
ہر گل کو زیست باغ جہاں میں حرام ہے
مریخ مجھ سے ہوتا ہے ہر دم جو دو بدو
کرتا لہو لگا کے شہیدوں میں نام ہے
استاد انجمن میں رہیں سرخرو سدا
اللہ سے دعا یہ مری صبح و شام ہے

یہ غزل لال پری کی زبانی ہے اور اس لئے غزل کے ساتوں شعروں میں شاعر نے کسی نہ کسی طرح سرخ رنگ کا التزام پیدا کیا ہے اور ہر جگہ اس میں ایک طرح کا تصنع ہے۔ اس غزل میں خیالات کا اظہار عاشق کے بجائے لال پری کی زبان سے ہوا ہے، جسے شاعرانہ اصطلاح میں محبوب کا نمائندہ سمجھنا چاہیئے۔ اس اہم تبدیلی کا نتیجہ یہ ہے کہ غزل میں وصل، ہجر اور رقیب کے مضامین نظم نہیں ہوئے۔ لیکن لال پری نے اپنے ناز و انداز اور کاروبار عاشقی میں اپنے "حسن عمل" کا ذکر جس طرز خاص سے کیا ہے اس سے اسی طرح کے محبوب کا تصور قائم ہوتا ہے، جس کا ذکر عاشق نے "نکالئے" "سنبھالئے" اور جو سچ پوچھئے تو اندرسبھا کی سب غزلوں کی زینت ہے۔

مثال کے طور پر میں نے اندرسبھا کی جو دو غزلیں پیش کی ہیں ان کے مجموعی انداز کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان غزلوں میں جس محبت کا ذکر کیا گیا ہے وہ بازاریت اور سوقیت کی حامل ہے چنانچہ اس کے سارے رشتے اور سارے عناصر اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ ان غزلوں کا محبوب بھی ایک ایسا محبوب ہے جس میں ظاہری حسن و زیبائی اور کشش کی تو کمی نہیں لیکن وہ ہر طرح کی عظمت سے خالی ہے۔ اس محبوب کی پوری شخصیت پر اس کا جسم اور اس

جسم کے دِل رُبا انداز چھائے ہوئے ہیں۔ شاعر کا تخیل ہر طرح کے خلوص سے محروم ہے۔ اس میں عموماً تکلف اور تصنع کو دخل ہے۔ اس کی تشبیہوں، استعاروں اور اسلوب اظہار میں بھی آمد کی جگہ آورد کا غلبہ ہے۔ رعایت لفظی اس پُر تصنع اور پُر تکلف اسلوب کا سب سے نمایاں پہلو ہے۔

ان چیزوں کی وضاحت کے لئے اندر سبھا کی باقی غزلوں پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔

'جائے' 'ڈھائے' والی غزل میں محبوب سے عاشق کے تخاطب کا جو انداز ہے اسے دیکھ کر پڑھنے والے نہ عاشق کے متعلق کوئی اچھی رائے قائم کرتے ہیں نہ محبوب کے متعلق یہی صورت اندر سبھا کی باقی غزلوں میں بھی ہے ان غزلوں کے چند ایسے شعر سنئے، جن میں عاشق محبوب سے مخاطب ہے ؎

منہ زرد دوپٹے کے نہ آنچل سے چھپاؤ
ہو جائے نہ رنگِ گلِ رخسار بسنتی

بیداد مجھے یاد ہے واللہ تمہاری
یوسف کی قسم اب نہ کروں چاہ تمہاری
للہ قدم شرم کے کوچے سے نکالو
بازار میں ہم دیکھتے ہیں راہ تمہاری
عاشق کی مراد آئے، رقیبوں کو الم ہو
جائے جو سواری کبھی درگاہ تمہاری
بُت بن گئے محفل میں رقیبوں سے نہ بولے
کیا بات ہے، خالق کی قسم، واہ تمہاری

بھولی بھالی شکل پر یہ دل تڑپتا ہے صنم
کیا ہی صورت ہو گئی ہے پیاری پیاری ان دنوں

زندہ جب تک ہیں ہم اے جان جفائیں کر لو
یوں سجے گا نہ تمہاری کوئی بیداد کبھی
ستم ایجاد تمہیں ہم نے بنایا جانی
اس طرح دل سے ستم ہوتے تھے ایجاد کبھی

ہوئے ہو تیز ہم پر سنگدل تم گالیاں دے کر
زباں کی تیغ کو خوب آپ نے پتھر چٹایا ہے

ان اشعار میں عاشق و محبوب میں جس بے تکلفی اور بے ساختگی ہے اس میں نہ کسی قسم کی پردہ داری ملحوظ ہے، نہ احترام۔ عاشق کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اس کی محبت لین دین کی کاروباری محبت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ محبوب کے ساتھ اس کا رشتۂ محبت کسی ابدی تعلق کی بنا پر استوار نہیں۔ ایک عارضی لذت اور دل لگی اس کا مقصود ہے۔ اور اس لئے وہ ہمیشہ اس سے اس طرح مخاطب ہوتا ہے، جیسے محبوب سے محبت کر کے اس نے اس پر کوئی احسان کیا ہے۔ اس کے لہجہ میں طنز اور تمسخر بھی اسی بنا پر ہے۔ وہ محبوب سے کوئی مذاق کی بات بھی کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسے محبوب کی کمتری کا پورا پورا احساس ہے۔ محبوب سے یہ کہنا کہ واللہ اب میں تم سے چاہ نہ کروں گا یا یہ کہ جب تک ہم زندہ ہیں ہم پر جفائیں کر لو، پھر تمہیں ہم جیسا عاشق نصیب نہ ہوگا اور یا یہ کہ اے جان! تمہیں ستم ایجاد بنانے کا سہرا ہمارے سر ہے کسی ایسے ہی عاشق کا شیوہ ہو سکتا ہے جو عشق کو زندگی کی پست سطح کی ایک چیز سمجھتا ہے۔ ایسا ہی عشق ہے جو عاشق سے یہ کہلواتا ہے کہ اے جان! شرم کے کوچے سے قدم نکالو، ہم بازار میں بیٹھے تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں یا ہم اس دن کے منتظر ہیں جب تمہاری سواری حضرت عباس کی درگاہ جائے۔ اس دن ہماری مراد بر آئے گی اور رقیبوں کو الم ہوگا۔

محبوب سے عاشق کے اس انداز تخاطب سے محبوب کی شخصیت کا جو پست معیار نظر کے سامنے آتا ہے اسے اندر سبھا کی غزلوں کے دوسرے اشعار سے اور زیادہ تقویت پہنچتی ہے۔ مثلاً یہ شعر دیکھئے:

کل گھر سے جو وہ نکلا اک حشر ہوا برپا
دل پس گئے عالم کے رفتار اسے کہتے ہیں

میں مر گیا تو رو کے یہ کہنے لگا وہ شوخ
کس کو سناؤں گالیاں، کس پر جفا کروں

ہیں قیامت تُبتِ بے شرم و حیا کی باتیں
کبھی کہتا ہے امانت کبھی استاد مجھے

ان تین شعروں میں سے پہلے سے تو ہمارے سامنے ایک ایسے منظر کا تصور آتا ہے جس میں محبوب باندازِ دلربائی گلی کوچوں اور بازاروں میں مصروفِ خرام ہے اور ہر دیکھنے والا رفتار کی شوخی پہ جان نثار کر رہا ہے۔ دوسرے شعر میں محبوب کی یہ حسرت ہمارے سامنے آتی ہے کہ اب وہ اپنے شیوۂ جفا کی آزمائش کس پر کرے گا اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ گالیاں کسے سنائے گا کتنی عجیب و غریب حسرت ہے! اور آخری شعر تو گویا خود شاعر کی (یا عاشق کی) زبان سے محبوب کی شخصیت اور کردار کا خلاصہ ہے۔ع

ہیں قیامت بتِ بے شرم و حیا کی باتیں

محبوب خود اپنی گفتار و رفتار سے "بے شرمی و بے حیائی" کا جو مجسمہ پیش کرتا ہے اس پر شاعر (یا عاشق) نے "بتِ بے شرم و حیا" کی مہر ثبت کر کے اسے نقشِ دوام عطا کیا ہے۔

محبوب کی بازاریت، اور عشق کی پستی کا یہ انداز غزلوں کے ان شعروں میں بھی جھلکتا ہے جن میں عاشق نے بات کہنے کا ایک ایسا لہجہ اختیار کیا ہے جو تخیل اور اظہار دونوں حیثیتوں سے پستی کا مظہر ہے مثلاً ان شعروں میں ؎

پلکیں جھپکانے کا قاتل کو ہوا ہے تازہ شوق
چل رہی ہے دل پہ عاشق کے کٹاری ان دنوں

لہو بہتا ہے غیروں کا ہمارا دم نکلتا ہے
گلے پر پھیرتا خنجر نہیں، جلاد کیا کیجے

مدتوں ہم نے نکالا وصل میں دل کا بخار
فرقتِ دلدار میں ہے تپ کی باری ان دنوں

یہی چیز ان شعروں میں خاص کر نمایاں ہے جن میں شاعر نے بوسہ کے مضامین بڑی بے تکلفی، بے باکی اور بے حجابی سے نظم کئے ہیں ؎

بوسے جو طلب میں نے کئے ہنس کے وہ بولے
سرکار سے موقوف ہے تنخواہ تمہاری

بوسے جو طلب میں نے کئے ہنس کے وہ بولے
کیا ہم کو جھنکاتی ہے کنوئیں چاہ تمہاری

لوں بوسہ زلف کا تو دبائے گلا اجل
پھانسی ملے مجھے جو خطن میں خطا کروں

اک بوسہ پہ یہ گالیاں اللہ کی پناہ
کچھ میں بھی اب کہوں گا زباں کو سنبھالئے

شب گزری سحر آئی، بک بک کے تھکا عاشق
بوسہ نہ دیا اس نے تکرار اسے کہتے ہیں

لیا ہے ابر وئے قاتل کا بوسہ عین غصہ میں
جگر دیکھو ہمارا منہ پہ کیا تلوار کھائی ہے

مکرر بوسہ لینے سے مزا ملتا ہے دنیا کا
لبِ شیریں جاناں قند کی گویا مٹھائی ہے

رُخِ رنگیں کے بوسے غیر کی غیبت میں لیتا ہوں
اڑا ہے باغ سے میا دہلبل کی بن آئی ہے

بوسہ کے ان مضامین میں محبت کے اس رشتۂ خاص کی جس کے مصور امانت (اور ان کے دوسرے ہم عصر) ہیں پوری داستان منظوم و مرقوم ہے۔ اس داستان کے کرداروں کی شخصیتیں بھی ان اشعار کے آئینہ میں صاف اپنا جلوہ دکھاتی ہیں۔ بوسہ اس داستانِ محبت اور حیاتِ معاشقہ کا ایسا معمول ہے جس کی طلب و حصول کے راستے میں شخصی یا اجتماعی اخلاق کی کوئی قدر حائل نہیں ہوتی۔ عاشق اور رقیب اس قندِ مکرر کی حلاوت میں برابر کے شریک اور حقدار ہیں۔ یہاں تک کہ عاشق انتہائی رواداری اور فراخ دلی سے رقیب کے اس حق کو مسلّم جان کر اس کے ذکر میں کسی طرح کے تکلف سے کام لینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ اس معمول میں محبوب کی شرکت بھی بکمال فیاضی ہے۔ وہ عاشقوں کو یہ جنسِ گراں مایہ بے طلب دیتا ہے اور اس طرح دیتا ہے جیسے کسی سرکار دربار کے حلقہ بگوشوں کو وظیفے دئے جاتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہزار بار طلب کرنے پر بھی کام و دہن اس چشمۂ حیات کی حلاوت سے محروم رہتے ہیں، اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ عاشق کی جرأتِ رندانہ محبوب کی مرضی

عشق ہو بن کے رنگ لایا ہے
فراق نے قتل کا بیڑا اٹھایا ہے

گلوری لئے مجھے کیا تکتا ہے
فقیروں کا منہ کون کیل سکتا ہے

باؤلی ہوں بحر الفت میں زلیخا کی طرح
یوسف گم گشتہ کا چاہِ ذقن ملتا نہیں

شکل طاؤس گلستاں ہوں سراپا داغ دار
گل بدن پر کھائے ہیں وہ گل بدن ملتا نہیں
صورتِ فرہاد میں نے چھان مارے سب پہاڑ
پر کوئی استاد سا شیریں سخن ملتا نہیں

ان چند اشعار میں خط کشیدہ الفاظ پر نظر ڈال کر یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ ان سب اشعار میں خیال اور بیان دونوں پر تصنع کا غلبہ ہے اور اس لئے ان میں نہ کوئی شاعرانہ لطف ہے نہ جذباتی کشش کہیں کہیں رعایت لفظی میں محاوروں کا صرف البتہ اتنی بے تکلفی سے ہوا ہے کہ پڑھنے والا شاعر کی قدرتِ بیان کی داد دئے بغیر نہیں رہتا۔

اندر سبھا میں خیال، و اظہار کا عام انداز یہی ہے۔ کہیں کہیں البتہ ایسے شعر بھی آجاتے ہیں جن میں بیان کی سادگی، بے تکلفی اور شوخی نے لطف پیدا کیا ہے۔ اس طرح کے چند شعر سن لیجئے ؎

اے بت ترے سوا نہیں کونین کی ہوس
اللہ سے کروں تو تری التجا کروں
جی چاہتا ہے صنعتِ صانع پہ ہوں نثار
تجھ کو بٹھا کے سامنے یادِ خدا کروں
ہر چند چاہتا ہوں میں بولوں نہ یار سے
قابو میں اپنے دل کو نہ پاؤں تو کیا کروں
ایسے مزے اٹھائے ہیں آزارِ عشق میں
آئیں مسیح بھی تو نہ اپنی دوا کروں
بے عشق کچھ جہاں میں نہیں زیست کا مزا
دل یار کو نہ دوں میں امانت تو کیا کروں

خوش چشم سب جہاں کے امانت ہیں بے وفا
جی چاہتا ہے آنکھ کسی پر نہ ڈالئے

بلبلو کس کو دکھاتی ہو عروجِ پرواز
ہم بھی اس باغ میں تھے قید سے آزاد کبھی

کسی کی زلف کی جانب جو کھنچ رہا ہے دل
بلائے تازہ مرے سر پہ لائے گا پھر کیا

ابر بھاگا ہوا جاتا ہے خدا خیر کرے
آج بدلی نظر آتی ہے ہوا ساون کی

نہیں بے وجہ پیہم ہچکیاں آتی ہیں فرقت میں
کسی محبوب کو تو اے امانت یاد آیا ہے

اتنا بھی نہیں چاہئے عاشق سے تغافل
سو بار اگر ٹال دے، اک بار خبر لے
آغازِ محبت میں نہیں زیست کی امید
مرتا ہے ترا تازہ گرفتار خبر لے

اوپر کے اشعار میں کہیں کہیں خلوص اور سچائی کی جو جھلک ہے اس نے اشعار کے اسلوب کو متاثر کیا ہے اور مجموعی حیثیت سے پڑھنے والے کے لئے ان میں ایک جذباتی کشش اور شاعرانہ لطف پیدا ہو گیا ہے اس طرح کی کشش اور یہ لطف غزل کے شعروں میں کم ہونے کی سب سے بڑی وجہ بظاہر یہی ہے کہ لکھنوی انداز شاعری میں لفظی رعایتوں کی جو طرف خاص توجہ ہے، اس نے شاعری کو تصنع اور آورد کا مرقع بنا دیا ہے۔ یہ بات کہ جہاں یہ تصنع اور آورد نہ ہو وہاں شاعری مختلف حیثیتوں سے پرکشش اور جاذب ہوتی ہے ان گیتوں کو دیکھ کر اور زیادہ واضح ہوتی ہے جو اندر سبھا میں راجا اندر کی محفلوں میں گائے گئے ہیں۔ ان گیتوں میں ہندی شاعری کی روایات کا گہرا اثر ہے اور ان روایات میں سب سے اہم یہ ہے کہ اظہار محبت ہر جگہ عورت کی زبان

ے رچا ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جذبات و احساسات میں ایک طرح
ں نزاکت اور نرمی پیدا ہو گئی ہے۔ اور جذبہ اور احساس کی نزاکت اور
رمی نے بیان میں نرمی اور رگھلاوٹ پیدا کی ہے۔ پھر شاعر کو ان گیتوں
بں الفاظ کے ترف اور تشبیہوں کے استعمال میں بھی بھاشا کی اس
روایت کی پابندی کرنی پڑی ہے، جو تصنع سے زیادہ سادگی کی طرف
ائل ہے۔ غزلوں کے مقابلہ میں گیتوں میں یہ نزاکت، نرمی اور رگھلاوٹ
لس کس طرح جاگزیں ہے، اس کا اندازہ کچھ مثالوں سے کیجئے۔ پہلے
پکھراج پری کی گائی ہوئی ایک ٹھمری سنئے:

آئی ہوں سبھا میں چھانڈ[1] کے گھر
کاہو کی نہیں مجھے آج کھبر[2]
تیری ہوں تیری راجا اندر
رکھنا دن رین دیا کی نجر[3]
سونے کا برا جے سیش مکٹ[4]
روپے کے تکھت پر بیٹھ نڈر
چاروں کونوں پر لال لٹیں
داتا کا کرم رہے آٹھ پہر
سایہ رہے پیر پیمبر کا
مولا کی سدا رہے نیک نجر

ٹھمری کے ان بولوں میں کتنی سادگی اور کتنی سچائی ہے۔ سیدھے سادے خیالات ہیں
اور سیدھے سادے لفظوں میں ادا ہوئے ہیں اور سننے والے کے دل میں گھر کرتے ہیں۔

پکھراج پری اس دعائیہ ٹھمری کے بعد بہار کی دھن میں ایک
بسنت گاتی ہے ؎

رُت آئی بسنت عجب بہار
کھلے جرد[5] پھول برون[6] کی ڈار
چٹکی کسم، کھلے لاگی[7] سرسوں
پھیلت چلت[8] گیندن کے ہار
ہر کے دوارے مالی کا چھورا
گر[9] ڈارت[10] گیندن کے ہار

ٹیسو پھولے، انبا بورائے[11]
چنپا کے رُکھ[12] کلین کی بہار
گرو والے استاد کے دوارے
چلو سب سکھین کر کر سنگار

بسنت رت کی کتنی سچی، سادہ لیکن رنگین اور دلکش تصویر ہے۔
درختوں پر ہر طرف زرد پھول کھلے ہوئے ہیں۔ کسم چٹک رہی ہے سرسوں
کے پھول کھلنے لگے۔ گیندے کے ہار ہر طرف بکھرے پڑے ہیں۔ مالی کا لڑکا
مندر کے دروازے پر گلوں میں گیندے کے ہار ڈال رہا ہے۔ ٹیسو
پھول رہا ہے اور آم میں بور نکل رہے ہیں۔ چنپا کے پودوں پر کلیاں
بہار دکھا رہی ہیں۔ ایسے میں سب سکھیوں کا جی چاہتا ہے کہ سنگار کر کے
استاد کے دروازے پر جا پہنچیں۔ اس بے لوث تصویر میں کتنی رنگینی کتنی
بہار اور سادہ جذبات میں کتنی سچائی اور کتنا خلوص ہے۔ اب ذرا ساون
اور ہولی کی بہاریں بھی دیکھ لیجئے۔ پہلے لال پری کی زبان سے ایک ساون سنئے:

بن پیا گھٹا نہیں بھاوے
رہ رہ دل روند صوآوے ۔ بجری کی چمک چمکاوے ڈراوے
بن پیا گھٹا نہیں بھاوے
رُت برکھا کی آئی ری گئیاں   آج جیا کو کل نہیں آوے
موری اور ہے یا دن بیجنی   کوئی جائے اس کو سمجھاوے
بن پیا گھٹا نہیں بھاوے
امنڈ گھمنڈ کاری بدریا   موہے ناحک ستاوے
کوئی پون بیر دائی سے جا کہہ   اور ملک برساوے جاوے
بن پیا گھٹا نہیں بھاوے
کا سے کہوں اس مینہ بوندیاں ما   لکھ پتیاں جو پٹھاوے
پیتم کو کوڈ بھری برکھا میں   دئی مارسے سے ملاوے لاوے
بن پیا گھٹا نہیں بھاوے
بھیجت ہوں آنسوؤں کی بوندن ما   میگھا جھڑ نہ لگاوے
پیر استاد کو مان کے اپنے   بن پربت پر جاوے جاوے
بن پیا گھٹا نہیں بھاوے

---

[1] چھوڑ کے [2] خبر [3] نظر [4] پہنے [5] سر [6] تاج [7] زرد [8] درختوں کی شاخیں [9] کھلنے لگی [10] پھیلتی چلتی ہے [11] گردن
[12] ڈالتا ہے [13] آموں میں بور پھوٹا ہے [14] درخت

ساون کا موسم ہے۔ اس موسم میں پیا سے بچھڑی ہوئی ایک سہاگن کے دل کا جو حال ہے اسے شاعر نے اسی کی زبان سے بیان کیا ہے اور اس طرح بیان کیا ہے کہ جی کی بات سیدھے سیدھے لفظوں میں ادا ہو جائے۔ گھٹا چھائی ہوئی ہے، لیکن پیا کے بغیر اس گھٹا میں کوئی لطف نہیں۔ گھٹا آسمان پر آتی ہے تو رہ رہ کر دل روندھا جاتا ہے، بجری چمکتی ہے اور جی دہل جاتا ہے تو پیا کی یاد اور بھی ستاتی ہے، اور دکھ کی ماری اپنی سکھی سے کہتی ہے کہ "اے گئیاں، آج میرے جی کو ذرا بھی چین نہیں۔ آج کوئی میری طرف جا کر پیا کو سمجھاوے اور اسے میرے پاس لائے ——— کہ میرے جی کو اس کے بغیر کل نہیں پڑتی — کالے بادل امنڈ گھمنڈ کر کیوں آتے ہیں، اور کیوں ناحق مجھے ستاتے ہیں۔ کوئی جا کر پروائی ہوا سے کہہ دو کہ ان بادلوں کو کسی اور دیس میں جا کر برسا دے اس لئے کہ مجھے یہ بادل پیا کے بغیر ذرا بھی اچھے نہیں لگتے۔ میں اس بوندا باندی میں کس سے کہوں کہ خط لکھ کر پیا کے پاس بھیجے اور اس بھری برسات میں مجھ برہ کی ماری سے اسے لا کر ملا دے — میں آنسوؤں کی بوندوں میں بھیگ رہی ہوں۔ بادل سے کہہ دو کہ وہ جھڑی نہ لگائے اور اپنا ڈیرہ بن اور پربت میں جا کر جمائے — مجھے پیا کے بغیر گھٹا ذرا بھی نہیں بھاتی۔

اس پورے جذباتی تجزیہ کا مقابلہ اندر سبھا کی غزلوں سے کیجئے تو زمین آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے — سچ اور جھوٹ، سادگی اور تکلف، خلوص اور تصنع میں جو فرق ہے وہی فرق اس ساون اور اندر سبھا کی غزل میں ہے۔ صداقت، سادگی اور خلوص کی یہ صفات جن سے اندر سبھا کی غزلیں قطعی ناآشنا ہیں، ان سب گیتوں کی جان ہیں خواہ وہ ٹھمری ہو، خواہ ہولی ہو، خواہ ساون، خواہ دادرا۔ لالہ بہاری لال کی دھن میں سندھوڑا کافی کے طرز پر ایک ہولی گائی ہے اس میں جذبات کا یہ تلون اور ہیجان ایک دوسرے انداز سے ظاہر ہوتی ہے۔ ہولی کے بول یہ ہیں:

لاج رکھو بنسی بجیا ہماری میں چیری ہوں تمہاری
حرا دے سبھ کے گاری[1]
عبیر گلال نہ ماکھ پہ ڈارو نہ مارو پچکاری
آدمی دیکھت[2] سب دیکھیں گی[3] ساڑی بھیگے نہ ساری

کہیں سگے لوگ منوہاری
تم چاتر[4] ہولی کے کھلیٹا[5] ہم ڈرپوک اناری
تاک جھانک لگا مت موہن جاؤں تورے بلہار[6] ری
نہ کر مورے جان سے عاری
لاکھ کہی تم ایک نہ مانی بنتی[7] کر کے ہاری
یاہی گھڑی تسادے جا کر کہیو حقیقت ساری
کہاں جاؤ گے گردھاری

عورت کے جذبات ہیں۔ اسے اپنی کمتری اور مرد کی (خصوصاً شیام یا گردھاری جیسے مرد کی) برتری کا پورا اندازہ اور احساس ہے۔ یہی اندازہ اور احساس اس کے دل میں جو جذبات پیدا کرتا ہے انہیں وہ بڑے بے لوث انداز سے بیان کر دیتی ہے۔ ہولی کے الفاظ شروع سے آخر تک عاجزی، خوشامد[9] اور لجاجت کے جس لہجہ میں ڈوبے ہوئے ہیں ان سے پوری ہولی میں ایک دلکش فضا پیدا ہو گئی ہے اور پڑھنے والا اپنے تصور کی مدد سے اس پورے واقعہ کی چلتی پھرتی تصویر بنا لیتا ہے اس میں پُرخلوص رومان کی کسک بھی ہے اور رس اور مٹھاس بھی یہی کسک اور یہی رس اور مٹھاس ہے جس کی تلاش پڑھنے والا غزلوں میں (یعنی اندر سبھا کی غزلوں میں) ناحق کرتا ہے۔

غزلیں اور دوسرے گیت شاعرانہ مذاق اور اسلوب اظہار کے اعتبار سے ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہیں کہ پڑھنے اور سننے والے کو اس فرق پر حیرت ہو سکتی ہے۔ حالانکہ غور کیا جائے تو یہ فرق لازمی طور پر اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ غزل اور ٹھمری یا ہولی کے مزاج میں ایک بنیادی فرق ہے۔ دونوں مختلف ماحولوں اور فضاؤں کی چیزیں ہیں اور ماحول اور فضا کے اس اختلاف نے دونوں کے مجموعی انداز پر اثر ڈالا ہے۔ اور دونوں کی جذباتی سطح اور فنی ساخت ایک دوسرے سے اتنی الگ دکھائی دیتی ہے۔ حقیقت میں دونوں کا یہی بنیادی فرق ہے جس کی بنا پر امانت نے اندر سبھا کی تشکیل و ترتیب میں دونوں پر برابر کی جگہ دی ہے۔ اندر سبھا میں شہزادہ گلفام کے علاوہ چار گانے والے کردار ہیں۔ یہ چاروں اسٹیج پر آتے ہیں تو ان کے گانوں میں غزلوں اور دوسرے گیتوں کا توازن تقریباً ایک سا رہتا ہے، مثلاً پکھراج پری نے جو چھ گانے

۱؎ ذرا ۲؎ گالی ۳؎ جسم ۴؎ دکھائی دے گی ۵؎ مت بھگونا ۶؎ ہوشیار ۷؎ کھیلنے والے ۸؎ قربان ۹؎ خوشامد۔

گائے ہیں ان میں تین غزلیں ہیں، ایک ٹھمری، ایک بسنت اور ایک ہولی۔ نیلم پری کے پانچ گانوں میں تین غزلیں ہیں، ایک ٹھمری اور ایک ہولی۔ لال پری کے چھ گانوں میں ۳ غزلیں ہیں اور تین دوسرے گیت۔ اسی طرح سبز پری کے بارہ گانوں میں سے ۶ غزلیں ہیں اور چھ دوسرے گانے ۔ پانچ ٹھمریاں اور ایک ہولی۔ یہ برابر کی تقسیم ظاہر ہے کہ ارادی ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ جب اندر سبھا اسٹیج پر پیش کی جائے تو مختلف مذاق کے دیکھنے والوں کے لئے دلچسپی اور تفریح کا سامان مہیا ہو سکے ۔

اندر سبھا کی پوری ساخت میں یہی جذبہ کام کر رہا ہے کہ دیکھنے والوں کو مختلف مذاق کے گیت سنا کر اور ان کی پسندیدہ دھنوں اور طرزوں میں سنا کر محظوظ کیا جائے ۔ یہی وجہ ہے کہ امانت نے غزلوں اور گیتوں کے ساتھ عموماً دھنوں اور کبھی کبھی راگ راگنیوں کے اشارے کئے ہیں۔ غزلوں میں برابر یہ بات پیش نظر رکھی ہے کہ ان کی بحریں ایسی ہوں جنہیں آسانی سے ترنم کے پسندیدہ سانچوں میں ڈھالا جاسکے، یہی صورت دوسرے گیتوں کے معاملہ میں بھی ہے ۔ چاروں پریوں نے مل کر جو گیت گائے ہیں ان میں ٹھمری، ہولی، بسنت اور ساون جیسی چیزیں شامل ہیں، لیکن ان چودہ گیتوں میں سے آٹھ ٹھمریاں ہیں، اس لئے کہ ٹھمری ان سب طرح کے گیتوں میں ہر لحاظ سے سب سے زیادہ پسندیدہ سمجھی جاتی ہے ۔ یہ بات ایک اور طرح بھی ہمارے سامنے آتی ہے ۔ جن چار پریوں نے اندر کی محفل میں آکر دادِ نغمہ سرودی ہے ان میں سب سے نمایاں حیثیت سبز پری کی ہے ۔ وہ قصہ کی ہیروئن بھی ہے اور یقین ہے کہ اس پارٹ کے لئے جس گانے والی کو چنا جائے گا وہ ہر لحاظ سے دوسری گانے والیوں میں ممتاز ہوگی۔ اس امتیاز کی ایک واضح دلیل تو یہ ہے کہ سبز پری نے محفل میں آکر ۱۲ گانے گائے ہیں، دوسری پریوں نے اس کے مقابلہ میں ۶، ۵، اور ۵ ۔ ان بارہ گانوں میں سے چھ غزلیں ہیں اور چھ گیت اور چھ گیتوں میں پانچ ٹھمریاں ہیں ۔ یوں گویا امانت کے سامنے جہاں ایک طرف یہ بات ہے کہ انہوں نے رقص و موسیقی کو اندر سبھا کی دلچسپی کی بنیاد بنایا ہے وہاں دوسری طرف یہ بات بھی برابر پیش نظر رکھی ہے کہ اندر سبھا کے گانوں کی ترتیب شروع سے آخر تک ایسی ہو کہ ہر طرح کے دیکھنے اور سننے والے ان سے محظوظ اور لطف اندوز ہو سکیں ۔ غزلوں اور گیتوں کے باہمی توازن اور ان کی جذباتی اور ذہنی سطح کے نمایاں فرق اور دونوں کے مزاج کی فنی خصوصیتوں کے اختلاف نے امانت کے اس مقصد کو کامیاب بننے میں مدد دی ہے ۔ اس لئے اندر سبھا کی موسیقی کا تجزیہ کرتے وقت اس واضح حقیقت کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ۔ یہ واضح حقیقت اندر سبھا کے فن کا ایک نمایاں پہلو ہے ۔ اور اس سے ہمارا ذہن خود بخود اس مقبول عام قصے کے دوسرے فنی پہلوؤں کی طرف منتقل ہوتا ہے ۔

○

غزل

فراق گورکھپوری

اے وائے وہ بانیِ جفا ہو
جو ٹوٹے دلوں کا آسرا ہو

ہوتا ہے یہاں وہی جو چاہو
معلوم ہوا کہ تم خدا ہو

جو دل میں خوشی کی انتہا ہے
غم کی شاید وہ ابتدا ہو

کیا کیا نہ سنا تمہاری خاطر
شاید تم نے بھی کچھ سنا ہو

پھر پایا تیری چاہ کر کے
اب دل میں جو کوئی مدعا ہو

یہ ننگِ عشق ابتدا میں
کیا جانیے کچھ دنوں میں کیا ہو

ایسا بھی ہے کوئی فتنۂ دور
چالوں سے نہ تیری جو اٹھا ہو

دامن میں غبارِ عشق رکھ لے
شاید کہ یہ خاک کیمیا ہو

لذت جو گناہِ عشق میں ہے
کیا جانو تم اس کو بیگناہو

جمہور کا دور آ رہا ہے
سن لو دنیا کے بادشاہو

اچھا ہوا عشق تھا اکیلا
کیا کیا نہ جنوں میں کہہ گیا ہو

وہ غم دل پر گراں ہے کتنا
جس غم کو سہارا بھی لیا ہو

آتے ہیں گناہگارِ الفت
اب اے درِ خلد تو بھی وا ہو

ہاں ہم بھی دوسرے کو چاہیں
دنیا میں جو کوئی دوسرا ہو

بدلے نظر آئے تیور اس کے
اب اے دل بیقرار کیا ہو

تجھکو رسوا کیا ہے میں نے؟
تیرا جو نام بھی لیا ہو

ہم لوگ فقیرِ عشق ٹھہرے
اس نے جو کچھ بھی دے دیا ہو

باتوں سے مری وہ بدگماں ہے
دل نے بھی نہ کچھ کہا سنا ہو

گنتا نہیں عشق آج تارے
جیسے سرِ شام سو گیا ہو

جس کو انکار ہو وہ کافر
اے حضرتِ عشق تم خدا ہو

اک بات کہیں فراق تم سے
اب عشق کیا ہے تو نبھا ہو

افسانہ

یادِ ایّامے

(۱)

ابوالفضل صدیقی

تایا، پُرانے پُرانے باپ اور چچا قسم کے شکاریوں کے بھی تایا تھے۔

کرکٹ، ہاکی، فٹ بال وغیرہ کھیل کے میدان میں جس طرح بھانت بھانت کی آواز گونجتی ہے اور عام طور پر انگریزی میں "ویل ڈن"، "ویری گڈ"، "ویل شاٹ"، "فائن" اور "بیوٹی فل"، وغیرہ الفاظ سے نوازا جاتا ہے اور کسی کسی وقت بہت اچھے! کیا کہنے! کے نعرہائے تحسین گونجتے ہیں، اسی طرح شکار میں بھی ہوتا ہے، اور خاص طور پر مرغابی، چہے اور تیتر کے شکار میں جس میں ایک حد تک ٹیم جیسے کھیل کا نظم و نسق سامنے رہتا ہے، بالعموم ہر شکاری کا ایک دوسرے کو بک اپ کرنے کا نعرہ اپنا مخصوص ہوتا ہے، اور تایا نہایت "وسیع الصوتی" کے ساتھ اپنی شیریں لہجہ والی آواز کو جوشیلا سا بنا کر اپنے ہر ساتھی کو "اے واہ میری جان!" کے پیارے خلوص بھرے نعرہ سے تحسین و آفریں کرتے۔ اور نہایت دریا دلی کے ساتھ سچی اسپورٹنگ سپرٹ میں نوازا کرتے۔ "مری جان!" کی ترکیب روہیلکھنڈ سے باہر کچھ نامانوس ہے اور ممکن ہے کہ بعض مواقع پر چونکا دینے والی اور کچھ سوقیانہ سی معلوم ہوتی ہو لیکن روہیلکھنڈ کے قصباتی اور شہری آدابِ تکلم میں پرانے لوگ مری جان، پیارے، پیارے صاحب، جانی، میاں میرے، بھئے، چاند، مٹھو وغیرہ شیریں الفاظ سے تخاطب کرتے ہیں اور کچھ شکار پر ہی منحصر نہ تھا تایا یوں بھی روزمرہ کی بول چال میں "اے واہ مری جان" تکیہ کلام کی طرح استعمال کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ شروع سے اپنے تربیتی ماحول کے اثر سے تخاطب میں "مری جان" استعمال کرتے ہوں اور شکار کے میدان میں یہ "اے واہ" لگ کر "اے واہ مری جان" بن گیا ہو، اور پھر شکار سے "اے واہ مری جان" روزمرہ کی گفتگو میں تکیہ کلام بن کر پلٹ آیا ہو اور تایا کی روزمرہ کی گفتگو بھی تو بجز شکار کے اور کسی موضوع پر شاذ و نادر ہی ہوا کرتی تھی اور تایا نے ساری عمر بجز شکار کے اور کچھ کیا بھی نہ تھا حتیٰ کہ شادی بھی، لہٰذا ان کے تمام تر معمولات

کو صرف شکار ہی سے ایسی مناسبت تھی جیسے ہماری مجلسی زندگی سے ہوتی ہے، مگر عجیب بات یہ تھی جس طرح تایا ایک ایک لفظ چُن چُن کر اور توڑ توڑ کر بولنے کے عادی تھے اسی لہجہ میں نہایت واضح طور پر اپنا تکیہ کلام بھی ادا کرتے تھے۔ "اے واہ" ذرا جھٹکے کے ساتھ ایک جانب کو گردن آہستہ سے ہلا کر اور "مری جان" ذرا ترچھے ترچھے انداز میں چہرہ کو اثبات میں حرکت دے کر ورنہ عام طور پر تکیہ کلام کے عادی لوگ بولتے وقت مہمل سی آواز کی صورت ذرا تیزی کے ساتھ گفتگو کی روانی میں اپنا تکیہ کلام ادا کرتے ہیں۔

اگرچہ پوری صدی کے پیٹے میں پہنچ چکے تھے مگر تایا کے بڑھاپے پر اب بھی سو جوانیاں نثار تھیں، اور ہم جیسے نوجوانوں کو ان کی پیرانہ سالی پر رشک سا آجاتا جس پر کسی پہلو ضعیف العمری کا اطلاق نہ تھا، لمبی چوڑی ہڈیوں کا ڈھانچہ، جیسے پرانے قلعے کے کھنڈر، چوڑے چکلے ہاڑوں پر اب بھی سرخ سپید کھال کی چنتوں میں پیچ در پیچ آہنی اعصاب کی ڈھیلی ڈھالی رسیوں کی پوٹیں سی بھری تھیں۔ جو شکار کے وقت فولادی سلاخوں کی طرح تن کر بدن پر لپٹ سی جاتیں۔ سفید براق ریشمیں داڑھی جس کو نہایت اہتمام کے ساتھ چڑھایا کرتے اور چڑھا کر نکلتے تو رکھ رکھاؤ کا اتنا خیال رکھتے کہ اگر ہوا سامنے سے ذرا تیز چلتی ہوتی تو لاگ بچاتے ہوئے چہرہ ترچھا ترچھا کر کے چلتے کہ کہیں بال منتشر ہو کر داڑھی اتر نہ جائے اور اس طرح اکڑی ہوئی سی گردن کے ساتھ چلتے ہوئے چال میں عجیب بانکپن سا نظر آتا۔ پیشانی پر نوے سال کی پیہم رگڑ کا نمازی گٹا جو تایا کے جھری دار نورانی چہرہ پر صبح کے ستارے کی طرح چمکتا۔ سفید بھوؤں کے سایہ میں آسودہ آسودہ سی متجسس آنکھیں جن میں شکار کے وقت عقاب کی سی چمک تڑپ اٹھتی، گھٹے سر پر کڑی بندش کا خاکی صافہ، بدن پر بند کالر کا نیچا خاکی کوٹ اور چست برجس کاٹ خاکی پاجامہ، شکار میں کمر پر پٹکے کی طرح خاکی تہمد کسے رہتے جس کا شکار کے بعد پاجامہ اتار کر باندھ

لیتے، پنڈلیوں پر پٹیاں کسی ہوتیں، اور پانوؤں میں دیسی چمڑے کا دیہاتی ساخت والا ہندوستانی جوتا جو پتھر سے زیادہ سخت ہوتا مگر سال کے سال خریدنے کے بعد چالیس دن مٹھا اور کڑوا تیل بھر کر بھنتے اور چالیس دن میں پانوؤں اور جوتے میں تیل کی چکناہٹ اور مٹھے کی نمی کی مدد سے دھینگا مشتی کرا کر صلح کرا ہی دیتے اور منزل مارنے کے قابل رواں ہو جاتا اور جنگل میں اپنی چودہ پندرہ پونڈ وزنی بندوق ہلکے پھلکے کھلونے کی طرح اٹھائے تند گام نظر آتے۔

اللہ جانے تایا کی جوانی میں جوش اور جفاکشی کا کیا عالم رہا ہوگا۔ اور رنگ روپ کس غضب کا ہوگا۔ اسّی نوّے برس کے شکاروں کی سخت کوشیوں اور شدید موسموں کے جھیلنے بگاڑنے کے باوجود اب بھی یہ کیفیت تھی کہ ساتھیوں کے اچھے فیر پر جس وقت بے ساختگی اور جوش کے ساتھ مونہہ سے "اے واہ میری جان!" نکلتا تو چہرہ گل انار ہو جاتا کنپٹیاں پھڑکنے لگتیں، سینہ دہک اٹھتا، اور کسی ساتھی کے اچھے ہاتھ پر آنکھیں تراشے ہوئے ہیرے کی طرح چھوٹ پھینکنے لگتیں اور جھریاں برابر ہو کر چہرہ آئینہ کی طرح دمک اٹھتا اور اپنے مخصوص پیار بھرے انداز میں شیریں آواز بلند کرتے رہتے "اے واہ مری جان! — اے واہ مری جان!!" اپنے بھرے فیر سے زیادہ ساتھیوں کے اچھے ہاتھ پر خوش نظر آتے، اور اپنے آپ تو ایک استادانہ ہاتھ مار کر جیسے یکدم دو مٹھی بلند ہو جاتے، دو چار قدم اٹھارہ سالہ لڑکے کی طرح جھومتے ادھر سے اُدھر ڈالتے، بار بار تمام جسم پر ایک لپک سی لہرا جاتی۔ یوں بھی شکار کے علاوہ چال ڈھال میں تایا بوڑھے کم اور جوان زیادہ نظر آتے، صرف نماز کے وقت ذرا اپنی اصلی عمر میں دکھائی پڑتے، داڑھی بھی وضو کے بعد نم اور اتری ہوئی ہوتی اور جسم بھی بوڑھا بوڑھا ڈھیلا ڈھیلا، شکار کے شوق کا یہ عالم کہ کہتے ہیں آج جبکہ تایا ننانوے کے قریب تھے، وہی بالیدگی اور جوش موجود تھا جو نو کی عمر میں پہلی مرتبہ بندوق پکڑتے وقت پیدا ہوا تھا۔ اور شکار کے میدان میں پہنچ کر تو تایا دس جوانوں کے ایک کنگرہ جوان دکھائی پڑتے، سج دھج اور تیوروں میں شیر ببر والے انداز جھلکنے لگتے۔ اور اتنے شدید قسم کے شکاری ہی شکاری ہونے کے باوجود انتہائی نرم مزاج اور نستعلیق، انداز تکلم ایسا کہ مونہہ سے پھول سے جھڑیں، اور ایک گونہ نسائیت کی حد تک شیریں۔ اور انداز تکلم سے زیادہ طرز تخاطب پیارا پیارا موہ لینے والا۔ حالانکہ نئی ہوئی بات ہے کہ تایا نے ان کی گود چھوٹنے کے بعد صنف نازک کا مس تو درکنار کبھی بو بھی نہ سونگھی تھی، اور تندرستی کا

یہ عالم کہ بخار آنا تو درکنار تایا کو اپنے ہوش میں کبھی زکام ہوتا بھی یاد نہ تھا۔ اور مزاج تو مزاج بڑھاپے کی خشکی کا اثر آواز پر بھی نہ ہوا تھا۔ ساری عمر شکار جیسے ارفع اسپورٹ میں کٹی تھی اور شکار کے اپنے مخصوص نعرہ تحسین "اے واہ مری جان!" کو روزمرہ کی بول چال میں تکیہ کلام کی طرح استعمال کرتے وقت بڑے پُر لطف معلوم ہوتے۔

تایا غریب شکاری تھے، اور اپنے زمانہ میں تو نہ معلوم کیا حال رہا ہوگا، ہمارے زمانہ میں بھی جبکہ آلاتِ ہلاکت ہائڈروجن بم تک پہنچ گئے ہیں اپنی بھرتو بندوق سے بلا کے مارتے خاں قسم کے شکاری، اور اپنے استاد کے تجربوں اور روایتوں کی پوری کتاب تھے، ایسے کامیاب اسپورٹ مین کہ اچھے اچھے سائنٹیفک اصولوں سے بہترین ہتھیاروں کے ساتھ شکار کھیلنے والے شکاری تایا کی مار کا ریکارڈ دیکھ کر دنگ رہ جاتے، اور استاد ماننا ہی پڑتا۔ تایا کو اپنی علم سینہ والے بابری نسخہ کی بارود پر بہت ناز تھا، اور اپنی رام پوری ساخت کی بھرتو بندوق پر بڑا بھروسہ۔ اور بحث و تمحیص کے وقت تایا نہایت دلیری کے ساتھ ہماری لانگ رینج بندوقوں اور ہائی ولاسٹی رائفلوں کے ذکر میں اپنی بندوق کا ذکر کر دیتے، اور بہرحال ہمیں ان کی کامیابی کے سبب ان کی بارود کی طاقت اور بندوق کا لوہا ماننا ہی پڑتا۔ کیونکہ پارٹی میں بالعموم آدھا شکار تایا کی رام پوری بھرتو بندوق اور بابری نسخہ والی خانہ ساز بارود کا مارا ہوا ہوتا اور بقیہ نصف کل پارٹی کا جس میں پانچ چھ چابک دست اور نقاد رانداز شکاری شامل تھے۔ تایا کی بارود خانہ ساز ہوتی۔ اور ہماری کارڈائٹ اور ڈائمنڈ پاوڈر کے تذکرہ کے ساتھ تایا اپنی بارود کے ذکر میں "خانہ ساز" کچھ ایسے پُر اعتماد لہجہ میں لگاتے جیسے کوئی حکیم کسی معجون کے متعلق خانہ ساز کہہ کر اس کے خواص کو دہ چند ظاہر کرتا ہے، اور بارود تو بارود تایا کی گولیاں گراپ اور چھرہ تک "خانہ ساز" کا سند یافتہ ہوتا تھا۔ برسات ختم ہونے پر تایا سال تمام کے خرچ کے قابل سامان طیار کر کے رکھ لیتے جبکہ ہم لوگ عین اسی زمانہ میں اپنے امونیشن کے آرڈر دیا کرتے۔

بابری نسخہ بارود کے اکثر اجزاء تو تایا قصبہ کے اردگرد ہی جمع کر لیتے، بسونٹھے کی جڑ کا کوئلہ، لہسن کا عرق، وغیرہ تو معمولی چیزیں تھیں، تایا تو پرانے کھنڈروں اور ٹیلوں پر سے لونی مٹی کھرچوا کھرچوا کر اور پکا پکا کر دھڑیوں شورہ قلمی تک طیار کر لیتے اور انہیں اپنی میگزین کی طیاری میں بارود کے نسخہ کے لئے صرف گندھک اور گولی چھرہ کے لئے سیسہ خریدنے بازار جانا

حکیم آئن سٹائن

۱۸۷۹ء – ۱۹۵۵ء

پڑتا۔ تایا اپنی بارود کا نسخہ جو انہیں ان کے استاد سے پہنچا تھا، اس کی آجکل کے شکاریوں میں ناقدر شناسی دیکھکر قبر میں ساتھ لے گئے۔ کہتے ہیں کہ یہ چند بیش بہا تاریخی نسخے ان کے دادا استاد کو شہنشاہ بابر کے مشہور توپچی کے خاندان سے ہاتھ آئے تھے۔ البتہ گولیاں چھرے نہایت سیدھے سادے عام فہم طریقہ سے بنا لیتے، دھڑیوں سیسہ بازار سے خریدتے۔ اور پگھلا کر مختلف سائز کے سوراخوں کی چھلنیوں میں چھان چھان کر قاز مرغابی، تیتر وغیرہ کے چھوٹے بڑے چھرے بنا لیتے، ارنڈ کی شاخوں کے نلوں میں پگھلا ہوا سیسہ بھر بھر مختلف موٹائی کی سلاخیں ڈھالتے سروتے سے ایک برابر ٹکڑے کاٹتے، پھر چکی میں ان ٹکڑوں کو آہستہ آہستہ دل کر گول کرتے، اور اس کے بعد تھوڑے تھوڑے کڑھائی میں ڈال ڈال کر جوتے کے تلے سے ہاتھ گھما گھما کر رگڑ لیتے اور اس طرح فنش کر کے تین چار مختلف سائز کا گراپ بنا لیتے، جن میں بعض سائز، جوان کی چکی کے پاٹوں اور کڑاہی اور جوتے کے تلے کے درمیان اچھا فٹ ہوا ہوتا ایسا سڈول بنتا کہ ولایتی ساخت کے گراپ کا مقابلہ کرجاتا۔ بہت بڑے گراپ اور گولیاں بنانے کے لئے چکنی مٹی کی گھریاں بنلتے اور ڈھال لیتے انہیں اپنی بندوق کے "بھرت" یعنی لوڈ پر بڑا ناز تھا۔ وہ سیسہ کے وزن اور بارود کی طاقت کے پورے محرم تھے، اور "بھرت" میں بارود کی قوت اور گولی کے وزن کو اعتدال پر رکھنے میں بڑے ماہر تھے۔ تایا آٹھ بور کی ایک اٹھارہویں صدی والی بندوق کے مالک تھے، جسے کسی دیسی کاریگر نے بندوق اور قرابین کے درمیان کی کوئی چیز بنایا تھا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو چھٹانک بھر بابری نسخہ والی خانہ ساز بارود اور ڈیڑھ پاؤ "گھر کتو" چھرے کی خوراک پڑا کرتی۔ سنتے ہیں کہ تایا کی بندوق اپنے "پچھلے جنم" میں توڑے دار تھی، اور جب "پتھر کلے" کا رواج ہوا تو اس میں چقماق دار گھوڑا لگوایا۔ مگر کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ چقماق صحیح چنگاری نہ پھینکتا اور بارود آگ نہ لیتی اور بندوق چلنے سے قاصر رہ جاتی۔ تو تایا بیان کرتے ہیں کہ جب ایک روز شکار میں ایسا ہوا تو وہ غصے کے مارے جنگل سے سیدھے فولاد خاں کاریگر کے یہاں پہنچے کہ چقماق کا گھوڑا اکھیڑ کر وہی پرانی توڑے دار والی کٹوری پھر سے فٹ کردے، دو قازیں اور پانچ مرغابیاں کاریگر کے لئے تحفہ میں لیتے گئے تھے جنہیں کھا کر فولاد خاں کاریگر ایسے خوش ہوئے کہ تایا کی بندوق کو بجائے سو برس پیچھے ہٹانے کے پچاس برس آگے بڑھا دیا۔

اور دوسرے روز جب تایا بندوق لینے پہنچے تو انہوں نے نہایت کاریگری کے ساتھ ٹوپی دار نپل لگی ہوئی بندوق فخریہ انداز میں پیش کی، اس امید میں کہ تایا یہ تجدید دیکھ کر خوش ہوں گے، لیکن تایا اپنی بندوق کو ترقی یافتہ چولے میں دیکھ کر بدمزہ سے ہو گئے کیونکہ اس میں بازار سے ٹوپیاں خریدنے کی مزید تیح لگ گئی تھی لیکن خیر تھوڑی سہولت بھی ہو گئی۔ ہاں، توڑے اور فلیتے کے کھڑاگ سے نجات ہو گئی تھی۔ کندھے پر جما کر بس لبلبی پر ایک انگلی کے اشارہ کا کام رہ جاتا تھا۔

یوں تو تایا کی بندوق کی پشت پر تاریخی روایات کا پورا ایک جنگل کھڑا تھا لیکن اس میں شک نہیں کہ ہمیشہ اس کی چوٹ ہماری کارتوسی بندوقوں کے فیروں کے مقابلہ پر "ایک لوہار کی" ہوا کرتی تھی۔ تایا شکار کے صبح سے شام تک کے پروگرام میں بالعموم ایک اور کبھی دو چوٹیں چلایا کرتے۔ بارود کی پوری خوراک ڈال کر اوپر سے نال میں آہنی گز سے اپلے کی مضبوط ڈاٹ ٹھونکتے، اس کے بعد چھرہ ڈال کر چیتھڑے کی ڈاٹ لگاتے اور بندوق طیار کر کے، زیر لب "یا پیر جنگلی"! بڑبڑاتے۔ یوں تو تایا شکار کو شیر کی طرح اکیلے جانے کے قائل تھے اور روزمرّہ کے شکاریوں کی پارٹی نصیب بھی کہاں ہوسکتی ہے۔ اور اصولی طور پر بھی شکار میں پارٹی کے ساتھ جانے میں انہیں گریز تھا لیکن ہماری مخصوص پارٹی میں کبھی کبھار جب پھنس جاتے تو بخوشی حصہ لیتے، یوں بھی نہ ہر شکاری کا تایا کے ساتھ اور تایا کا ہر شکاری کے ساتھ گذر ہوسکتا تھا اس لئے کہ تایا بارہ ماسی اور سدا بہار قسم کے پیدائشی شکاری تھے۔ آدم کم شکاری زیادہ، کسی شکار پر بند نہ تھے، مگر اپنے مخصوص طریقہ سے پانی کی چڑیا کے زیادہ شوقین تھے، بٹیر کے شکار میں جال سے کام لیتے، چوپایوں کے شکار میں بھی بندوق سے زیادہ جال کے قائل تھے، باریک دھاگے سے لیکر موٹی موٹی رسیوں تک کے جال اپنے ہاتھ سے بنتے، اور بٹیر سے لے کر ہرن چیتل نیل گائے تک پھانستے، اور شکار میں گوشت کے لالچ میں درجنوں دیہاتی تایا کے ساتھ ہو لیتے اور ہانکے میں مدد معاون ہوتے۔ شکار کے مخصوص سیزن میں جب ستمبر تا مارچ ہزاروں قسم کی مائیگریٹ کر کے آئی ہوئی مرغابی اور قاز سے جھیلیں اور تالاب پر ہوتے ہیں تایا بڑی سرگرمی دکھاتے، یہ شکار کا سیزن کہلاتا ہے بڑی بڑی جھیلوں سے لے کر چھوٹے چھوٹے تالاب تک مرغابیوں سے پٹے ہوتے ہیں، کہیں پر چپہ بھر پانی نظر نہیں آتا جھیل کی سطح پر تاحدِ نظر مرغابیوں کے سر ہی سر دکھائی دیتے ہیں، فضا میں مسلسل

ایسی آواز گونجتی ہے جیسے فیکٹری چل رہی ہے اور درمیانی طول و عرض کی جھیل پر شکاری ٹیم لگ جاتی ہے۔ ذرا ترتیب اور ضابطہ کی صورت پیدا ہو جاتی ہے، ہر شکاری اپنی ڈیوٹی لیتا ہے اور ہر ایک کی کمانڈ کا تعین ہوتا ہے۔ کسی کی پوسٹ خشکی میں کنارے پر ہوتی ہے، کوئی کمر کمر پانی میں اور کوئی منچلا گھاس اور دلدل میں جس کے اندر جونکیں بچا بچا کر پاؤں سے لیکر پنڈلیوں تک کا خون چوستی جاتی ہیں، اور ہم ایسی پارٹی میں تایا کو ہمیشہ پہلے فیر پر متعین کرتے، تایا کو اپنی ڈیوٹی معلوم تھی، اور تایا بڑے شریف شکاری تھے، جب تک پوری پارٹی موقع کے مطابق پروگرام سیٹ کر کے اپنی ڈیوٹیوں پر پہنچتی اور سب سے اخیر والا شکاری اپنی پوسٹ پر پہنچ کر اشارہ دیتا اتنی دیر میں تایا اپنا موقع ٹٹول کر کبھی کنارے کنارے لمبی گھاس میں سے سانپ کی طرح سرکتے اور کبھی اونچی اونچی نالیوں اور چھوٹے بڑے گڑھوں میں پیٹ اور سینہ کے بل رڑھک کر پاؤں اور گھٹنوں سے گھسٹ کر کسی مرغابی کے آسودہ اور بے خبر تنگ کے قریب جا پہنچتے۔ اور تایا کی گھات بہترین قسم کی مرغابی کے تنگ پر ہوتی، نہایت چالاک اور بلند پرواز جو اور اقسام کے مقابلہ پر کمیاب بھی ہوتی ہیں، اور جب ہر پہلو ٹٹول کر بجا کر اطمینان کر لیتے تو نہایت سہولت کے ساتھ شست لے کر بندوق داغ دیتے۔

اور تایا کی بندوق کی آواز پر جھیل کی سطح سے اوپر کو گڑگڑاتا ہوا طوفان سا اٹھتا۔ ہزارہا مرغابیاں ٹڈی دل کی طرح فضا پر چھا جاتیں، پہلی پرواز پر دھوپ چھپ جاتی اور ایسی سنسناہٹ ہوتی جیسے یکدم دس بارہ ریلیں چل رہی ہوں۔ اور ہم سب اپنی اپنی ٹھائیں، ٹھوئیں، ٹھس میں دیوانے ہو جاتے، ہر شکاری اپنے اپنے "فلائنگ شاٹ" کے جوہر دکھاتا۔ اور نہایت ہی ضابطہ کے انداز میں ٹیم کے کھیل کا سماں پیدا ہو جاتا۔ فضا میں اڑتی ہوئی مرغابیاں پر کٹ کٹ کر قلابازیاں کھاتی، ناچتی، پتاتی اور کبھی پتھر کی طرح چوٹ کھا کھا کر گرتیں، اور "برڈ پکر" مزدور پکڑنے اور جمع کرنے میں مشین کی طرح مصروف ہو جاتے، اور جب تایا کی خانہ ساز کالی بلبد کا بدبودار دھواں پانی کی سطح سے ذرا صاف ہوتا تو تایا کے ایک ہی فیر میں تیس چالیس اعلیٰ قسم کی مرغابیاں کھیت رہی ہوتیں۔ کچھ بے حس و حرکت پڑی ہوتیں، کچھ چت پڑی ٹانگیں چلاتی ہوتیں۔ بعض بعض نہایت خوبصورتی کے ساتھ ناچتی ہوتیں، اور کوئی کوئی جہاں کی تہاں پھڑکتی ہوتیں، اور کچھ مرغابیاں جو ذرا کم زخمی ہوتیں نہایت تیزی کے ساتھ گھنی گھاس اور پانی کی سطح پر لوٹتی ہوئی پیچ در پیچ بیلوں میں کو رینگتی ہوتیں، تایا مرغابی کے شکار میں اپنے لئے "برڈ پکر" کے قائل نہ تھے، جھیل کے کنارے پہنچ کر بدن پر کڑوا تیل اچھی طرح مالش کر لیتے تھے۔ تاکہ جھیل کی خارش زا گھاس میں اور دلدل کی جونکیں جلد پر اثر انداز نہ ہو سکیں۔ اپنے فیر کا دھواں صاف ہوتے ہی تایا ایک نظر اپنا زخمی شکار پر تاپتے اور بندوق پیٹھ پر لاد کر اور تھیلا اونچا کر کے اسپنیل کتے سے زیادہ جوش اور تیزی کے ساتھ تلوار کی دھار کی طرح کاٹتے ہوئے ٹھنڈے پانی میں جست لگا دیتے۔ اور پکڑ دھکڑ میں مصروف ہو جاتے، ہم لوگ تایا کو ایک مرتبہ "ایکسیلنٹ" کہنے کیلئے! واہ استاد! پکار کر ایک دوسرے کے فیروں پر "ویل شاٹ - گڈ" بہت اچھے! بہت اچھے" کے نعروں سے آپس میں تحسین و مرحبا پکارتے جاتے، اور تایا اس وقت اپنا شکار بٹورنے میں سرگرم کار ہوتے۔ پہلے تو تایا اپنا فیر ہی خوب دیکھ بھال کر ایسے تنگ پر کرتے جو اچھے موقع پر بیٹھا ہو اور شکار کے بعد نکالنے پکڑنے میں دقت نہ ہو، پھر اپنے زخمی شکار پر جا پہنچنے میں غضب کی پھرتی اور مستعدی دکھاتے، پہلے تو جلدی جلدی ان مرغابیوں کو پکڑ کر دونوں بازوؤں کو ایک دوسرے کے ساتھ بل دیکر گدی چڑھا دیتے، جو کم زخمی ہوتیں اور گھنی گھاس اور پیچ در پیچ بیل میں کو پناہ کے لئے تیزی کے ساتھ تیرتی ہوتیں۔ اور خطرہ کا احساس کرتے غوطہ مار مار کر بھاگ نکلنے کی کوشش کرتی ہوتیں۔ انہیں باندھنے کے بعد تایا بڑی تیزی سے "پیش قبض" (مخصوص پرانی ساخت کا شکاری چاقو) کھول کر ذبح کرنے پر پل پڑتے۔ اور اس کار خیر میں بڑی پھرتی دکھلاتے کیونکہ اپنے عقیدہ میں ہر جانور جو ذبح کرتے وہ خود حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی سنت کا ثواب پاتے اور جانور جنت کی خاک ہو جاتا لہٰذا اگر کوئی شکار ذبح ہونے سے پہلے بندوق کی چوٹ کے صدمہ سے مر جاتا تو وہ غریب تو جنت کی خاک بننے کی سعادت سے اور تایا سنت ابراہیمی کے ثواب سے محروم ہو جاتے اور پھر حرام ہو کر کھانے کا بھی تو نہ رہتا۔ لہٰذا کم زخمی مرغابیوں کی گدی چڑھا کر زندہ بندھا چھوڑ کے تایا تیزی کے ساتھ ساکت پڑی ہوئی شدید زخمی مرغابیوں کی جانب رجوع ہوتے۔ ہر ایک کی گردن جلدی سے پیچھے کو الٹ کر چاقو کی ایک رگڑ دیتے اور پھر دیکھتے کہ چاقو کی دھار خون میں شرعی مسئلہ کے مطابق ایک چہارم کے بقدر رنگی یا نہیں، اگر دھار نہ رنگتی تو اس مرغابی کا ایک ناخن کاٹ دیتے تاکہ پہچان رہے کہ حرام ہو گئی ہے۔ کم زخمیوں کو زندہ گدی چڑھی چھوڑ کر اور زیادہ زخمیوں کو جنت کی خاک بنا کر سنت ابراہیمی کا ثواب لینے

کے بعد تایا فوراً اطمینان کے ساتھ قلابازیاں کھاتی، تڑپتی اور خوبصورتی کے ساتھ ناچتی مرغابیوں کی جانب بڑھتے۔ اور ذبح کرتے، اور شروع سے آخر تک زبان پر "بسم اللہ، اللہ اکبر" کا ورد جاری رہتا۔ ذبح کرتے وقت تایا کے انہماک اور شوق سے اندازہ ہوتا کہ شاید بندوق چلانے سے کم لطف انہیں چاقو چلانے میں بھی نہیں آرہا ہے، ذبح کرنے کے بعد ایک گونہ سکون کے انداز میں اپنا چاروں طرف بکھرا ہوا شکار ایک نظر پر تالتے، پھر گڈی چڑھی ہوئی مرغابیوں کی بڑی احتیاط کے ساتھ گویا نبض دیکھتے، ایک ایک کو اٹھا اٹھا کر آنکھوں کی کیفیت اور چونچ پنجوں کی رنگت کا معائنہ کرتے کہ کہیں مر تو نہیں رہی ہے، اور اگر کسی کے متعلق ذرا سا بھی شبہ ہوتا تو فوراً ذبح کر لیتے۔

لیکن اس شدید اور اہم مصروفیت میں بھی تایا کی اسپورٹنگ اسپرٹ قائم رہتی، اپنا شکار ٹٹولتے بھی جاتے، ذبح بھی کرتے جاتے اور تسمیہ کا ورد زبان پر رکھتے ہوئے نہایت فراخدلی کے ساتھ ساتھیوں کو اچھے ہاتھ پر "اے واہ مری جان!" کے نعرۂ تحسین سے نوازتے بھی جاتے اور سب کچھ کرتے ہوئے بھی دور اور قریب کے ساتھیوں کا کھیل دیکھتے جاتے، مجال کیا جو کسی ساتھی کا اچھا فیر پڑے اور تایا کی نگاہ سے چوک سکے اور پھر وہ ساتھی تایا کے "اے واہ مری جان" سے محروم رہ سکے۔ اور جب فارغ ہو کر اور اپنا شکار لٹکا کر تایا اطمینان کے ساتھ کنارے پر آ بیٹھتے تو تایا کو بجز "اے واہ مری جان!" کے اور کوئی کام ہی نہ رہ جاتا اور کسی کسی دو "اے واہ مری جان!" کے درمیان ایک استادانہ قسم کی ہدایت بھی سنائی پڑتی، جس سے اندازہ ہوتا کہ تایا ہمارے شکار کے قواعد و ضوابط اور حسن و قبح کے بھی پورے محرم ہیں، اور اگر ہمارے طریقہ سے بھی شکار کھیلیں تو بھی ہم سے زیادہ کامیاب رہیں۔

پارٹی کے سب اراکین کے مؤثر نعروں، بندوق کے پیہم دھماکوں اور پروں کی مسلسل سنسناہٹ کے درمیان تایا کی "اے واہ مری جان!" اپنی علیحدہ انفرادی شان کے ساتھ گونجتی۔ پارٹی مرغابی کے شکار کے تمام و کمال جدید آداب برت کر شکار کھیلتی ـــــ اڑان کی رفتار کا اندازہ، ہوا کا رخ، پرواز کا صحیح زاویہ اور اس کے مطابق نشانہ لیتے ہوئے بندوق کا زاویہ، بلندیٔ پرواز کے لحاظ سے شست لیتے وقت مارجن وغیرہ وغیرہ قواعد کے مطابق سائنٹیفک شکار ہوتا، جیسے ہوائی جہاز کے قواعد پر عمل ہو رہا ہے۔ حسب معمول دھماکوں اور سناٹوں کے درمیان تایا کی "اے واہ مری جان!" سب سے زیادہ ہمت بندھاتی آواز میں گونجتی رہتی۔ لیکن انہیں اصولی طور پر ہمارے اس پیہم دھماکوں والے کھیل سے اختلاف تھا۔ ویسے تایا کسی نہ کسی وقت اپنے "فلائی انگ شاٹ" کا بھی نرالا کمال دکھا دیتے، جب کسی اچھی قسم کی مرغابی کا بڑا تنگ ایک خاص انداز کے ساتھ ترچھی ترچھی پرواز میں "ٹکوہتی" سی بناتا ان کے موقع پر اڑتا ہوا پلٹتا ہوتا تو تایا ایک خاص زاویہ پر بندوق لگاتے، جس کے نتیجہ میں ایسا معلوم ہوتا کہ تایا نے اپنے فیر کے ایک ایک چھرے کی قیمت وصول کر لی ہے ـ اڑتی ہوئی مرغابیاں آندھی کے آموں کی طرح جھڑ پڑتیں۔ ہمارے مونہہ حیرت سے کھلے رہ جاتے۔ یہاں تو قاعدہ میں ایک فیر میں ایک اڑتی ہوئی مرغابی ماری جاتی ہے اور کسی کا بڑا سنہرا ریکارڈ دو تین تک کا ہو جاتا ہے اور تایا کے ایک "فلائی انگ شاٹ" میں پندرہ بیس گر پڑتیں۔

"فلائی انگ شاٹ" کے قاعدہ میں ایک فیر میں ایک اڑتی ہوئی مرغابی مارنا آیا ہے اور خیر کسی خوش نصیب چابک دست کے فیر میں دو تین لپٹ جائیں اور چار پانچ سے زیادہ تو کسی کا ریکارڈ ہی نہیں ہوتا مگر تایا کی اینٹی ایئرکرافٹ گن کی چوٹ میں تو جیسے پورا تنگ درہم برہم ہو جاتا اور مرغابیوں کی بارش ہونے لگتی۔ یہاں تک کہ لنچ ٹائم آجاتا۔ صبح کی پٹتی مرغابی بہت چوکنی ہو جاتی۔ زد سے بچ کر اڑنے کی جبلت اختیار کرنے لگتی، اور مرتے رہنے کے باوجود جھیل پر وہ دسترخوان کی مکھی کی طرح ٹوٹنے کا انداز بدل دیتی، موروثی قسم کی مرغابیاں تنگ بنا کر بہت بلند پرواز کرنے لگتیں، کچھ جھیل چھوڑ کر کوچ کا رخ بنانے لگتیں ـــــ غرض شکار اور شکاری دونوں کو سکون کی ضرورت ہوتی۔ ہم سب اپنی اپنی پوسٹ چھوڑ کر کنارے کے قریب کسی مناسب جگہ کھانے کے لئے جمع ہوتے۔ کھانے سے پہلے ایک ایک کے شکار کی گنتی ہوتی، مرغابیوں کی قسم پر بحث ہوتی۔ پھر ہر ایک کے فیروں کی تعداد گنی جاتی اور اوسط لگا کر ہر ایک کا ریکارڈ قائم کیا جاتا، اول تو بالعموم گنتی کے اعتبار سے ہی تایا کا تھیلا سب سے زیادہ بھاری ہوتا اور ان کی بندوق کے نامۂ اعمال میں فیر تو ایک یا دو ہی ہوتے لہٰذا ریکارڈ اور اوسط میں ان کا مقابلہ کون کر سکتا تھا۔

اور جس وقت پوری ٹیم کھانے میں منہمک ہوتی تایا اس وقت کھاتے بھی جاتے اور چاروں سمت فضا میں نظر کی کمندیں پھینک پھینک کر سکون کے بعد نئی مرغابی کی آمد پر بھی غور کرتے جاتے اور

ان کے بیٹھنے کی جگہ بھی بھانپتے جاتے اور اسی وقت اپنے لئے گھات بھی دل ہی دل میں طے کر لیتے۔ تقریباً دو ڈھائی گھنٹہ جھیل پر سکون رہتا، مرغابی صبح سے دوپہر تک کی بے بھاؤ مار بھول چکی ہوتی۔ شہد کی مکھیوں جیسے چھتے کے انداز میں جھیل کی سطح پر جمع ہو جاتی اور تایا اپنی عقاب سی آنکھوں سے جھیل پر بیٹھے ہوئے شکار کے چپہ چپہ کا اندازہ کر کے قطعی طور پر ہر پہلو سے اپنے لئے بہترین موقع تلاش کر چکے ہوتے صبح سے دوپہر تک کی مار دھاڑ کی گپ شپ ختم ہو چکی ہوتی اور کھانا کھا کر کہیں گھاس یا مٹی پر ہم لوگ ایک آدھ لوٹ لگا کر اور کوئی سگریٹ جلا کر "سہ پہر کے شکار" کے لئے چل پڑتے، تھوڑے بہت ردوبدل کے ساتھ اپنی اپنی صبح والی جگہوں پر جا لگتے۔ اور تایا پیٹ اور سینہ کے بل رینگ کر، یا گھٹنوں اور کولہوں کے سہارے گھسٹ کر، یا پیٹھ اور سر اور کہنیوں کے بل رڑھکتے اپنے داؤ پر جا لگتے اور پھر ایک لوہار والی چوٹ چلاتے اور صبح والے حادثہ کی پھر تکرار ہوتی۔ اور پھر شام تک کے لئے تایا کو "اے واہ مری جان! اے واہ مری جان!" پکارنے اور کسی کسی وقت زریں ہدایت دینے کے سوا اور کوئی کام نہ رہ جاتا۔ البتہ اپنے "فلائی انگ شاٹ" کے موقع پر تاک میں رہتے اور شام تک کسی نہ کسی وقت وہ بھی ان کے ہاتھ آ ہی جاتا۔ اور تایا اپنا "فلائی انگ شاٹ" کر کے اپنے دو فیروں کو ایک اور ایک گیارہ بنا ہی لیتے اور اپنے ریکارڈ کو گیارہ سو گنا زیادہ۔

ہرن، نیل گائے، چیتل وغیرہ کے شکاریں اور سب ساتھی "میڈیم بور رائفل" اور طرح طرح کی پھٹنے والی گولیوں کے کارتوس لے کر جاتے، اور تایا کی تو وہی بھرتو قرابین ہوتی اور وہی اس کا تایا چرندوں کی جبلت سے زیادہ چوپایوں کی جبلت کے محرم تھے۔ یہاں اور سب ساتھیوں کو پہلے چانس ملتا اور تایا کو بعد کو۔ پارٹی اپنی اسکیم کے مطابق شکار کی تنظیم کر لیتی تو تایا نہایت ہی مسکین انداز میں خاموشی کے ساتھ کسی عجیب جگہ پر جھاڑی یا گڑھے میں دبک جاتے، اور ہم لوگ کہتے کہ تایا شگون ڈال لیتے ہیں یا عزرائیل سے تایا کا یارانہ ہے جو انہیں پہلے سے قضا کا مقام معلوم ہو جاتا ہے اور تایا کی گھات کے قریب سے ساتھیوں کے فیروں سے بھڑکی ہوئی ڈار کی ڈار گذرتی اور تایا "کلوز رینج" سے گراپ کا فیر مارتے اور بالعموم ایسا بھرپور "کنپٹی سہلاؤ" رسید کرتے کہ ایک ہی فیر میں پانچ سات جانور لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ اور اکثر ایسا ہوتا کہ تایا کے فیر کی آواز پر جو جانوروں کو ہمیشہ غیر متوقع سمت سے سنائی پڑا کرتی تھی ایسے بدحواس ہوتے کہ بعض خوش نصیب ساتھیوں کی سمت آنکھیں بند ہی کئے بے تحاشا بھاگتے چلے جاتے اور انہیں بہترین چانس پر چانس خلاف امید مہیا ہو جاتے اور اس وقت تایا "اے واہ میری جان اے واہ میری جان!!" کے نعرۂ تحسین سے نواز کر گویا اپنے فیر کی داد خود ہی دیتے۔

غرض عمر بھر چوپایوں کے شکار میں بھی تایا کا ریکارڈ بہت بڑھا ہی رہا، اور ریگ کا یہ عالم رہا کہ ایک پلے میں سب پارٹی کا شکار اور دوسرے میں اکیلے تایا کا رکھا گیا تو بھی بالعموم تایا کا پلہ بھاری ہی رہا۔ اور اعداد و شمار کے وقت تایا نہایت سینہ نکال کر اور گردن اکڑا کر اپنا شکار پیش کرتے، اور فیروں کی گنتی کے وقت تمسخرانہ عجز کے انداز میں اپنی بابری نسخہ والی بارود کی پڑیا کا ایک خالی کاغذ دکھا کر چپکے کھڑے ہو جاتے اور یاروں کی بندوقوں کے ریکارڈ میٹر سیکڑوں فیر بولتے ہوتے۔ اور خالی کارتوسوں سے تھیلوں کی جھولیاں بھری ہوتیں۔

سہرا تو ہر ایک کو پہلے ہی معلوم ہوتا کہ تایا ہی کے سفید سر پر بندھے گا مگر تایا اتنی بڑی کامیابی کے باوجود اپنے شکار کے بعد اپنا تذکرہ بہت کم کرتے، البتہ بقیہ ساتھیوں کے اچھے فیروں کا فرداً فرداً داد دے دے کر "اے واہ مری جان" کے تکیہ کلام کے ساتھ تعریف کرتے جاتے۔

(باقی آئندہ)

بادِ مغرب

شیلے
مترجمہ: رفیق خاور

تندمغرب کی ہوا، اے نفسِ فصلِ خزاں
جس کی پیدائی نادیدہ سے مردہ پتے
جھلسے زرد اُڑے ہوئے پیلے، بھبوکا تپ سے
اس طرح بھاگے چلے جاتے ہیں افتاں خیزاں
جس طرح ساحرِ مشاق کے آگے روحیں!
ایک بیماری کا مارا ہوا انبوہِ عظیم،
اے کہ تو بال کشا بیجوں کے سیاہ ہجوم
ہانک کر زور تموج سے لئے جاتی ہے
تیرہ و تار زمستانی شبستانوں میں
جن میں سُن ہوکے وہ چت لیٹے رہیں گے مدہوش
جس طرح گوشۂ مرقد میں فسردہ لاشیں
جب تلک تیری بہاراں کی بہن سبز قبا
آن کر صورِ نہ پھونکے گی سرافیل نما
بہ سرِ خاکِ فرو رفتۂ خوابِ سنگیں
اور بھر دے گی کہستانوں کو، میدانوں کو
(ہانک کر رس بھری کلیوں کے مچلتے گلّے
لہلہاتے چمنوں میں کہ یہ نو زادہ وہاں
کیف و رنگینی کے گہوارے میں پروان چڑھیں)
تازہ خوشبوؤں، نئے رنگوں کی نیرنگی سے
روحِ آشفتہ جو ہر سمت جنوں جولاں ہے
ہمہ تن ذوقِ خرابی، ہمہ ذوقِ تعمیر
سُن مری روحِ نوا سنج کی گفتار کو سن!
اے کہ در غلغلۂ گنبدِ گردانِ سپہر
تیرے دھارے پہ گرانڈیل، پریشاں بادل
خاک کے مردہ سسکتے ہوئے پتوں کی طرح
عرش اور فرش کی آپس میں گتھی شاخوں سے
جھڑ کے گرتے ہیں۔ گرجتے ہوئے طوفانوں کے،
رعد و برق کی آمد کے، دھنواں دھار نقیب!
سطحِ نیلی پہ تری سیلِ ہوائی کی وہ دیکھ
گرد گرداتے ہوئے طوفاں کی گھنگھور جٹا
دھندلے دھندلے سے کنارِ افقی سے لے کر
تا بہ معراجِ سراپردۂ علیائے سپہر

ہو بہو رندِ سیہ مست کی بدمست لٹوں

تند، شوریدہ و براق لٹوں کی مانند

بے تماشا، ہمہ تن تف، غلطاں پیچاں ہے

سربسر نوحۂ سالِ گذراں جس کے لئے

آج کی ڈھلتی ہوئی رات کا پہنائے عظیم

گنبدِ مقبرۂ حشر بدامن ہوگا

ایک تعمیرِ بپا کردۂ مجموعِ بخور

جس کی سنگین، کڑی ہیئتِ بے پایاں سے

قیرگوں دھار، اگن، ژالے برس جائیں گے

سن، سماعِ ابدی سن، مری للکار کو سن!

نیلگوں روم کے ساگر کو جگانے والی

دفعتہً خوابِ بہاراں سے جھنجھوڑے دے کر

وہ جو تھا نیند میں گم بائیا کے ٹاپو میں

ایک چقماق سے[1] مورِ جزیرے کے قریب

اپنی سیماب نما ندیوں سے پانی کی پری

لوریاں دیتی، تھپکتی ہوئی جل باہنوں کی

جھومتی کیف درِ آغوشِ فسوں کاری سے

اور موجوں کے اُجالے میں جو دن کو شرمائے

جھومتے دیکھتی تھی طرفہ ہیولوں[2] کے طلسم

محل پارینہ، پراچین کلس کا اُپ مینار

جن پہ چھائے تھے دھنواں دھار گھٹاؤں کی طرح

ڈل پہ ڈل کائی کے، سرشار مہکتے ہوئے پھول

اتنے بھینے کہ سرِ دران کا بیاں کرتے ہوئے

ایک دم مبدءِ فیضان کو غش آجائے

اے کہ تیرے لئے امواجِ زبر دست بجوِ

ان کے ہموار قویٰ کی متبحر شوکت

ٹوٹ کر کرتی ہے پیدا کئی گمبھیر دراڑ

اور نیچے کہیں اس عالمِ سیمابی سے

تہ میں روئیدہ شگوفوں کا پرن زار ہجوم

بن کے بن، سبز نگر پھیلے ہوئے گدگدے پھول

کھاری پانی کے کنول جن میں نہ زہر[3] ہے نہ نبات

جب تری صاعقہ کردار صدا سنتے ہیں

ہوش اڑ جاتے ہیں یوں خوف کے مارے ان کے

بیدوش لرزہ براندام ہوئے جاتے ہیں

چہروں پر اڑتے ہیں مہتاب ہی مہتاب ان کے

ٹوٹ کر گرتے ہیں اشجارِ عظیم الشان سے

ڈھیر کے ڈھیر بردبار، لچکتی شاخیں

سن مرے نطق کے آہنگِ شرربار کو سن!

گر میں اک برگِ شجر ہوتا تو اے بادِ مہیب!

تو اچک کر مجھے پنجے میں اڑا لے جاتی

---

[1] سمندر کی تہ میں غیر معمولی روشنی دکھائی دیتی ہے۔

[2] سمندر کی تہ میں عجیب و غریب اشکال بھی دکھائی دیتی ہیں۔

[3] کھاری پانی کے پودے میں آیوڈین پائی جاتی ہے جس سے وہ فوراً ٹوٹ جاتے ہیں۔

لکۂ ابرِ رواں ہوتا تو اڑتا ترے ساتھ
موج ہوتا ترے پُرہول طمانچے سہتا
تجھ سے کچھ کم ہی سہی شیوۂ آزادی میں
پھر بھی کس بل کا ترے شائبہ پیدا کرتا
اے کہ سطوت تری پابستۂ زنجیر نہیں
ضبط تیرے دلِ آزاد سے مقہورِ دوام
مجھ میں گر ہوتی لڑکپن کی سی برنائی بھی
اور میں تیری تگ و دو میں بروئے افلاک
عہدِ طفلی کی طرح سازِ شراکت کرتا
جب تری تیزیٔ رفتار کو پیغامِ شکست
ایک بازیچۂ اطفال نظر آتا تھا
اک تصور کہ تھا یک لمحۂ سیمابی میں
فرصتِ چشم زدن ہی میں پذیرائے حصول
پھر میں یوں اپنی زبیں گیر زبوں حالی میں
سامنے تیرے نہ پھیلاتا کبھی دستِ نیاز
تجھ سے کرتا نہ گدایانہ کبھی عرضِ سوال
آ اٹھا لے مجھے اک موجِ رواں، برگِ خزاں
روئے افلاک پہ اک ابرِ رواں کی صورت
خارزاروں سے مری زیست کا دامن الجھا
زخم ہی زخم ہے دل، خون ہی خوں! اے وائے!
پا بہ زنجیر ہوا، خستہ و مجبور ہوا
موج بر موج حوادث کی گراں باری سے
وہ جواں روح، وہ دل آشفتہ کہ تھا تیری طرح
تند، شوریدہ، سبک، سرکش و خودبیں، بےباک

ہاں بنا لے مجھے تو بن کی طرح اپنا رباب
اس کے مانند مرے برگ بھی ریزاں ہیں تو کیا
تیرے آہنگِ جلالی کا گرجتا ہیجان
دونوں سازوں سے نیا کیف و نمو پائے گا
وہ نوا درد میں ڈوبی ہوئی گمبھیر، اتھاہ
دل سے نکلی ہوئی پُرسوز خزاں کی آواز
غم کی تلخی میں بھی اک طرفہ حلاوت کی امیں
روحِ آشفتہ و کرار مری روح ہو تو
تندخو، تند منش تو ہمہ تن میں بن جا
مردہ پتوں کی طرح خفتہ خیالات مرے
شش جہت عالمِ امکاں میں پریشاں کر دے
کہ نئے رنگ سے ہو عالمِ ہستی کی نمود
اور ان نغموں کے ہنگامۂ طوفانی سے
نوعِ انساں میں مرے بول پریشاں ہو جائیں
جس طرح گلخنِ افسردہ سے برجستہ شرار
میرے ہونٹوں سے کہ ہیں مضطرب و بےتاب دوام
تو جہاں کے لئے شہنائے بشارت بن جا
غم نہیں گر ہے زمانے میں زمستاں کا عمل
گر خزاں آئی تو کیا موسمِ گل دور نہیں

اجنبی سرزمین میں

(فاتح لشکر کے ایک سپاہی کے محسوسات)

ضمیر جعفری

نگارانِ عجم کے گیسوئے شاداب بھی دیکھے
غزالانِ ختن، نادیدہ و نایاب بھی دیکھے
مرے رستوں میں کتنے شعلہ ہائے رنگ بھی تڑپے
مری آنکھوں نے کتنے اجنبی مہتاب بھی دیکھے
طلب نے اپنے آئینوں سے جو پیکر تراشے تھے
ہوس نے چاندنی کے وہ مجسم خواب بھی دیکھے

طلسمی ساحلوں نے اجنبی رنگوں کو لہرایا
مدھر گیتوں نے اپنا دل مرے سینے میں دھڑکایا
جواں راتوں کی روشن فرصتوں کے سامنے اکثر
شگفتہ جنتوں نے اپنا دامن آپ پھیلایا
زمیں کی ناچشیدہ لذتوں کے ارمغاں لیکر
مسافر کو، کشادہ منزلوں نے یاد فرمایا

ہزاروں پھول خوابوں میں پرو لینے کو جی چاہا
کئی کانٹے اگِ جاں میں چبھو لینے کو جی چاہا
کبھی نغموں کی شیرینی میں کھو جانے کو دل تڑپا
کبھی ابریشمی سایوں میں سو لینے کو جی چاہا
کسی "وابستگی" سے مسکرا دینے کو لب ترسے
کسی "آسودگی" کے ساتھ رو لینے کو جی چاہا

مگر وہ شب "وداعِ یار" کی شب ساتھ ہے میرے
تری چشمِ ستارہ بار کی شب ساتھ ہے میرے
مری یادوں کے دامن پر فروزاں ہیں ترے آنسو
ترے اندیشۂ بیدار کی شب ساتھ ہے میرے
بہا جس کا یہ میری زندگی بھی ہو نہیں سکتی
وہ تیرے غم، وہ تیرے پیار کی شب ساتھ ہے میرے

یہاں بھی تیری زلفوں کی صبا آتی رہی مجھکو
یہاں بھی تیری خوشبوئے وفا آتی رہی مجھکو
یہاں بھی میری راتیں تیرے رخساروں سے روشن تھیں
یہاں بھی ان ستاروں کی ضیا آتی رہی مجھکو
یہاں بھی تیری دھڑکن کی صدا سنتا رہا ہوں میں
یہاں بھی تیرے دامن کی ہوا آتی رہی مجھکو

(ملایا سے)

تہمت

قیوم نظر

تو نے ہی دکھایا تھا
الفاظِ ستم زا کا جلتا ہوا اک بجرا
دوری کے سمندر میں بہتا ہوا آیا تھا
اور دھیان پہ چھایا تھا

اب کس لئے حیراں ہے
میں دردِ نہایت سے تو حسن حکایت ہے
پہنچے ہیں جہاں جینا مر رہنے کا ارماں ہے
ہر رنگ میں عریاں ہے

محرومیٔ حاصل نے
ہر شے کو حسیں دیکھا چاہت کا نگیں دیکھا
رو کا نہ کسی عنواں ویرانیٔ منزل نے
افسردگیٔ دل نے

شہر سے دُور

ضمیر اظہر

جانے کیا دل میں خلش تھی کہ سکوں کی خاطر
شہر سے دور، بہت دور نکل آیا ہوں
کوئی خواہش، نہ تمنا، نہ ارادہ، نہ خیال
غم کے ہاتھوں یونہی مجبور نکل آیا ہوں
رہ گزر اک جادۂ گمنام ہے، خاموش و طویل
سبز کھیتوں سے جو دامن کو ہے سرکائے ہوئے
شام کے سائے میں نادار حسینہ کی طرح
پیشِ ایوانِ اُفق ہاتھ ہے پھیلائے ہوئے
دھندلی دھندلی سی فضاؤں کے حسیں حلقے میں
مثلِ شہ کار مقید ہے سہانی بستی
بڑھتے جاتے ہیں قدم وقت کی رفتار کے ساتھ
کھبتی جاتی ہے دل و جاں میں نرالی بستی
دودھیا بھیڑوں کے ہمراہ سجیلے دہقاں
گاؤں کی سمت چلے آتے ہیں اِٹھلاتے ہوئے
نے کی پُر سوز و سبک لے سے کنہیا کی طرح
سحر ہی سحر ہر اک گام پہ چھڈکاتے ہوئے
چھم چھما چھم کے بہاؤ میں خراماں، رقصاں
گوریاں گاؤں کی پنگھٹ کو رواں ہیں ایسے
محوِ گلگشت ہیں کچھ پریاں برائے تفریح
الف لیلیٰ کے فسانوں سے نکل کر جیسے
ہائے پُر کیف ہے کیا گاؤں کی بے لوث فضا!
زندگی اپنے حسیں روپ میں ہے رقص کناں
پھول کھلتے ہیں مسرت کے جو اس بستی میں!
ایسی خوشبو ہے بھلا شہر کے پھولوں میں کہاں!

غزل

حفیظ ہوشیارپوری

گرچہ ہر ہر گام پہ ماہ و سال گذرتے جاتے ہیں
راہِ طلب سے تیرے پریشاں حال گذرتے جاتے ہیں

راہیں اُن کی منزلِ اُن کی میخانے کی راہ سے جو
رگ رگ میں بھر کے برقِ سیّال گذرتے جاتے ہیں

راہبری اب راہزنی ہے اور منزل کے دیوانے
راہ سے بے پروائے جان و مال گذرتے جاتے ہیں

جن سے ملاقاتوں کی راتیں بھولے بسرے خواب ہوئیں
اُن کی جُدائی کے دن بھی ہر حال گذرتے جاتے ہیں

دُھندلی سی کچھ تصویریں ہیں دل کے آئینہ خانے میں
نظروں سے موہوم سے خدّ و خال گذرتے جاتے ہیں

کون کسی کا پُرساں ہے اس گونگی بہری دُنیا میں
دل میں لئے سب حسرتِ عرضِ حال گذرتے جاتے ہیں

عشق ہے ایسی راہ کہ جس میں کوئی کسی کا ساتھ نہ دے
ہم بھی دیکھ کے ہم سفروں کی چال گذرتے جاتے ہیں

اپنے نقشِ پا سے حفیظ اپنی اک راہ نکالیں گے
چھوڑ کے پیچھے ہر راہِ پامال گذرتے جاتے ہیں

غزل

جعفر طاہر

غمِ دوراں، غمِ جاناں، غمِ جاں ہے کہ نہیں / داستاں سلسلۂ غمزدگاں ہے کہ نہیں

ہر نفس بزمِ گلستاں میں غزل خواں تھا کبھی / ہر نفس نالہ کشاں، نوحہ کناں ہے کہ نہیں

ہر نظر نغمہ سرا، انجمن آرا تھی کبھی / ہر نظر حیرتیٔ رنگِ جہاں ہے کہ نہیں

ہر زباں پر تھا کبھی تذکرۂ لطفِ بہار / ہر زباں شکوہ گرِ جورِ خزاں ہے کہ نہیں

مے چکاں، بادہ فشاں تھے لبِ گلرنگ کبھی / لبِ گلرنگ پہ زخموں کا گماں ہے کہ نہیں

ہر قدم جانبِ گلزار کبھی اٹھتا تھا / ہر قدم دشت نوردی میں گراں ہے کہ نہیں

قافلے جانے گھٹاؤں کے کہاں اتریں گے / ہر خمِ زلف بحسرت نگراں ہے کہ نہیں

سرمۂ چشمِ عنایت کی حکایت چھوڑو / آج ہر آنکھ میں آہوں کا دھواں ہے کہ نہیں

دشتِ وحشت سے نہیں کم یہ جہانِ گل و بو / صورتِ ریگِ رواں، عمرِ رواں ہے کہ نہیں

یوں اسے بادِ بہاری کا ترانہ کہہ لو / ورنہ یہ قافلۂ گل کی فغاں ہے کہ نہیں

یہ بہاریں بھی نئی ہیں، یہ نظارے بھی نئے / صحنِ گلشن پہ بیاباں کا گماں ہے کہ نہیں

نہ تو بلبل کی نوا ہے نہ صدائے طاؤس / صحنِ گلزار میں اب امن و اماں ہے کہ نہیں

بادۂ سنگ سہی تیغِ ستمگر نہ سہی / کچھ علاجِ غمِ آشفتہ سراں ہے کہ نہیں

مجھ سے کیا پوچھتے ہو کون یہاں تک پہنچا / سرخیٔ خارِ بیاباں سے عیاں ہے کہ نہیں

یہ لہو تشنہ لبوں کا ہے لہو اے ساقی / چشمۂ آبِ بقا بن کے رواں ہے کہ نہیں

کوئی تاریک نہیں تیرہ شبوں کی راتیں / دل کے داغوں سے چراغاں کا سماں ہے کہ نہیں

زندگی کچھ بھی سہی پھر بھی بڑی دولت ہے / موت سی شئے بھی یہاں جنسِ گراں ہے کہ نہیں

صورتِ لطف و کرم یہ ہو تو دل کیوں نہ جلے / آگ پتھر کے بھی سینے میں نہاں ہے کہ نہیں

غمِ یاراں میں بظاہر تو یہ اک آنسو ہے / دوستو تم ہی کہو لعلِ گراں ہے کہ نہیں

کعبۂ دل بھی لٹا شہرِ وفا کی صورت / دشمنِ امن و اماں حسنِ بتاں ہے کہ نہیں

ظلم چپ چاپ سہے جاؤ گے آخر کب تک / اے اسیرانِ قفس منہ میں زباں ہے کہ نہیں

یہ ادب گاہِ محبت ہے جو چپ ہوں طاہر
ورنہ یاں کون سا اندازِ بیاں ہے کہ نہیں

غزل

ناصر کاظمی

کس کے جلووں کی دھوپ برسی ہے
آج تو شام بھی سحر سی ہے

دیکھیں اب کے کسے ڈبوئیں گی
ہیئت آنکھوں کی ابرِ تر سی ہے

ہم بھی جی بھر کے آج روئے ہیں
اور گھٹا بھی تو کھل کے برسی ہے

دل میں اب کیا رہا ہے تیرے بعد
ایک سنسان رہگذر سی ہے

اہلِ غم ہیں کہ صبح کی تصویر
دل بجھا سا ہے آنکھ ترسی ہے

آنکھیں ہر وقت کیوں نہ بند رہیں
دل کی حالت ہی اب دگر سی ہے

کیا کہیں کتنے زخم کھائے ہیں
جیبِ دل ہم نے عمر بھر سی ہے

بے ثمر ہی رہی ہے شاخِ مراد
برف پگھلی تو آگ برسی ہے

کہہ رہی ہیں جلی ہوئی شاخیں
پھول کی زندگی شرر سی ہے

بڑھتی جاتی ہے شوق کی روداد
آپ سن لیں تو مختصر سی ہے

کیوں نہ کھینچے دلوں کو ویرانہ
اس کی صورت بھی اپنے گھر سی ہے

صبح تک ہم نہ سو سکے ناصر
رات بھر کتنی اوس برسی ہے

غزل

محشر بدایونی

پھر جاگ اٹھی نیم شب کی فریاد
پھر آئی وہ زلف تا کمر یاد

اک رنگ میں شب گذر رہی ہے
اب کس کو ہے فتنۂ سحر یاد

اے لمحۂ عشرتِ گریزاں
ہم تجھ کو کریں گے عمر بھر یاد

مسکن میں افق کے چاند ڈوبا
اور آیا ہمیں سفر میں گھر یاد

ہم نے تو بہت بہت بھلایا
آئے وہ گھڑی گھڑی مگر یاد

اک جنبشِ لب نے کچھ کہا تھا
کچھ تجھ کو ہے عشقِ معتبر یاد!

یہ شوقِ سفر کی انتہا ہے
منزل ہی رہی نہ رہگذر یاد

عرصہ ہوا لیکن آج تک ہے
اک رنجشِ دورِ مختصر یاد

سو بار ملے گا بڑھ کے محشر
تو پیار سے ایک بار کر یاد

رپورتاژ

کاف تا کاف

(۱)

ابوسعید قریشی

"کاف تا کاف"! یہ عنوان مجھے "ماہِ نو" کی طرف سے ملا ہے۔ اس کے تحت مجھے کشمیر سے کراچی تک پاکستان کے فنِ تعمیر کا جائزہ لینا ہے۔ اس کام کے لئے تو کسی آرل سٹائین، کزنز، براؤن یا مارشل کی ضرورت تھی جو بنیادوں، ستونوں، محرابوں ...... اور گنبدوں کے مقابلے اور موازنے کرتا۔ پتھروں کی ساخت اور تراش خراش، بت تراشوں کے تیشوں، خطوط کے خم و پیچ، پچی کاری کے نقوش اور روغنی اینٹوں کے رنگوں کے امتزاج کی خبر دیتا ــــ مگر بیس پچیس منٹ میں پچاس صدیوں کی سیاحت کے تصور سے شاید فنِ تعمیر کا بڑے سے بڑا ماہر بھی کسی پرانے مقبرے کی بھول بھلیوں میں چھپ جاتا۔ غالباً اسی لئے اس مہم پر ایک افسانہ نگار کو مامور کیا گیا ہے کہ خیالات کے تانے بانے سے کچھ تو بنا لے گا۔ ماہرین کو اس تذکرے میں جو سقم نظر آئیں گے ان کا ذمہ دار "ماہِ نو" کا ادارہ ہے ــــ میں نہ ماہرِ آثارِ قدیمہ ہوں۔ نہ مورخ نہ معمار!

تو صاحبو! پشاور چھاؤنی کے ریلوے سٹیشن کے قریب، رمیس خانہ کے پیچھے۔ گورنمنٹ ہاؤس کی جنوب مشرقی دیوار کے سامنے برجیوں والی ایک عمارت ہے۔ ان چھتریوں کے مینار۔ اگر اونچے ہو جاتے تو دور سے شاید کسی مسجد کا شبہ ہوتا۔ لیکن پشاور کے زائرین کو اس دھوکے سے بچانے کے لئے عمارت کے بیرونی دروازے پر "عجائب خانہ" کا بورڈ لگا دیا گیا ہے۔ یہ عمارت کسی زمانے میں انگریزوں کی رقص گاہ تھی۔

پشاور کا عجائب خانہ اس صنعتِ صنم تراشی کا مندر ہے جسے "گندھارا آرٹ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہاں سینکڑوں چھوٹے بڑے بت پناہ گزیں ہیں۔ پاکستان میں جہاں سکھوں اور ہندوؤں کے گوردوارے اور مندر محفوظ ہیں وہاں ان اقلیتوں کا بھی احترام کیا جاتا ہے۔ چنانچہ حکومت کی طرف سے ایک تنخواہ دار افسر ان کی دیکھ بھال کے لئے مقرر ہے جو کیوریٹر کے نام سے مشہور ہے۔

کیوریٹر کی فولادی الماری میں تانبے دغیرہ کی بنی ہوئی ایک ڈبیہ ہے جو تاریخی نوادر کی دنیا میں کنشک کی ڈبیہ کے نام سے مشہور ہے۔ ڈھکنے کے اوپر مہاتما بدھ کی مورتی ہے۔ اس کے دائیں بائیں "دو بودھستو" ہیں۔ ڈھکنے کے بالائی حصے پر باہر کی طرف ابھری ہوئی مرغابیاں اڑ رہی ہیں، ڈھکنے کے اوپر خروشتی رسم الخط میں مہاراجہ کنشک کا نام آتا ہے۔ اس ڈبیہ کے اندر بلور کی ایک ہشت پہلو ڈبیہ یا شیشی تھی۔ اس پر مہاراجہ کنشک کی مہر لگی ہوئی تھی۔ بلور کی اس ڈبیہ میں مہاتما بدھ کی ہڈیوں کے تین چھوٹے چھوٹے ٹکڑے موجود تھے جنہیں بطور تحفۂ خیر سگالی انگریزوں نے غالباً برما بھیج دیا تھا۔

یہ مقدس ڈبیہ گنج دروازہ پشاور کے باہر ایک پرانی عمارت سے برآمد ہوئی تھی جو کنشک کے بدھ مت کے حلقہ بگوش ہونے کی تقریب پر بطور یادگار تعمیر کی گئی۔ اور "شاہ جی کی ڈھیری" کہلاتی ہے۔ پاکستان میں بودھوں کی ایسی بہت سی یادگاریں ہیں، انہیں اصطلاحاً ٹوپ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن ٹھہرئیے۔ شاہ جی کی ڈھیری ــــ توبہ! اس "یادگار" کے سامنے یہ اجنبی کون کھڑا ہے؟ ــــ یہ ہیون سیانگ ہے۔ حکیم کنفیوشس کا ہم وطن ــــ سال ۶۳۰ء ہے۔ ہیون سیانگ کچھ کہہ رہا ہے:ــ

"اس یادگار کی بلندی ۵۵۰ فٹ ہے۔ کلس اس کے علاوہ ہے۔ یہ تانبے کے پچیس تھالوں کا بنا ہوا ہے۔ دیکھئے کیسے آس پاس کر رہے ہیں۔ آنکھ نہیں ٹھہرتی" یہی طرزِ تعمیر بودھوں کی خانقاہوں، عبادت گاہوں اور یادگاروں کا پیشرو ہے۔ آئندہ جہاں بھی اس شکل و صورت کی

عمارت نظر آئے گی اسے بلا سوچے سمجھے بدھ مت کی تاریخ سے منسوب کر دیا جائے گا۔

بدھ مت کی اکثر یادگاریں اسی قسم کی ہیں۔ ہمارا چینی دوست کہتا ہے کہ گنج دروازے کے باہر کنشک کی یادگار پانچ چبوتروں پر مبنی ہے۔ سب سے نیچے ایک بڑا چبوترا ہے۔ اس کے اوپر اس سے چھوٹا۔ حتیٰ کہ پانچویں چبوترے تک پہنچ جائیے۔ یہاں سے اصل ٹوپ شروع ہوتا ہے۔ اس کا سب سے زیریں چبوترہ ۱۸۲ فٹ کا ہے۔ عمارت کی دیواریں پتھر کی ہیں۔ یہاں روغنی اینٹیں بھی لگی ہیں جن میں ایک پر خروشتی رسم الخط میں کچھ لکھا ہے۔ شاید سنگ بنیاد ہو۔ ممکن ہے مہاتما بدھ کے احکام میں سے کوئی حکم ہو۔ نجات، نروان یا مکتی کا کوئی اصول ہو — کون جانے کب ہوگی آدمی کی نجات؟ — ممکن ہے ایٹم کا سینہ اور ہائیڈروجن کا دل چیرنے والے اس کا جواب دے سکیں —— مگر یہ اشلوکوں کی آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ ہاں یہ بدھ بھکشو ہیں جن کے حجرے کہیں قریب ہی ہونے چاہئیں۔ یہ ناممکن ہے کہ صدر عمارت کے اندر تو مہاتما بدھ کے باقیات پڑے ہوں اور کنشک کے راج میں ان کی حفاظت کا کوئی انتظام نہ ہو —— وہ دیکھئے نجات کے متلاشی پانچ چبوتروں کی سیڑھیاں چڑھتے اوپر آ رہے ہیں۔ مرکزی عمارت میں جگہ جگہ ستونوں پر مہاتما بدھ کے مجسمے ان کا استقبال کر رہے ہیں۔ یہ مجسمے چونے سے بنائے گئے ہیں۔ ان کے ہونٹوں پر سکون آمیز مسکراہٹ کھیل رہی ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ جس طرح میں نے اپنے آپ کو پا لیا ہے۔ اسی طرح تم بھی وہ روشنی حاصل کر سکتے ہو۔ جو آدمی کا نصب العین ہے —— کنشک کی یہ یادگار آج اینٹ پتھر کا ایک ڈھیر ہے جس کے باقیات عجائب خانے کی زینت ہیں۔

پشاور کے عجائب خانے کے مرکزی دروازے کے سامنے شیشے کی الماری میں تخت بائی کے کھنڈروں کا ایک ماڈل پڑا ہے — مردان سے دس میل شمال مشرق کی طرف۔ تخت بائی کی خانقاہ بدھ مذہب کے عروج کی کہانی کہہ رہی ہے —— یہ عمارتیں میدان کی سطح سے کوئی پانچ سو فٹ بلند ایک پہاڑی پر واقع ہیں۔ نجات کے ان متلاشیوں کو شاید دنیا کے ہنگاموں سے دور کسی گوشۂ عافیت کی ضرورت ہے۔ صدر ٹوپ ایک بڑے سے صحن میں واقع ہے۔ آئیے پتھر کی ان سیڑھیوں کے ذریعے ہم دوسرے صحن میں چلیں، یہاں اسی قسم کی اور چھوٹی چھوٹی عمارتیں دیکھ رہے ہیں آپ؟ اور یہ زینہ جو آپ کے سامنے ہے اس مستطیل صحن کو جاتا ہے۔ جہاں بھکشوؤں کے حجرے ہیں، جن میں دیویوں اور کنیاؤں کے لئے دو دو طاقچے بھی موجود ہیں۔

اور اس مستطیل کے مغرب میں یہ جو مربع نما ایوان ہے نا، بھکشوؤں اور مہاتما بدھ کے دوسرے پیروؤں کی جلسہ گاہ ہے۔ شاید اس وقت کوئی اہم مسئلہ درپیش ہے۔ بہت ممکن ہے ان لوگوں کے بارے میں غور ہو رہا ہے جن سے دنیا کے امن کو خطرہ لاحق ہے —— مگر صحن در صحن اور قطار اندر قطار یہ کون لوگ ہیں؟ کچھ کھڑے ہیں، کچھ آلتی پالتی مارے۔ ان کے ملبوسات کے خطوط دریا کی لہروں کی طرح بہتے چلے جا رہے ہیں۔ اور بعض بعض خطوط کو دیکھ کر تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ یہاں نہیں کسی اور دنیا میں جا کر ملیں گے۔ وجود و عدم کے دوراہے پر جہاں صرف نور ہوتا ہے، وہ نور جو انسانوں کے گرد ہالہ بن جاتا ہے —— یہ مہاتما بدھ کے مجسمے ہیں۔ کالے پتھر میں بدھ کے عقیدت مندوں کی محبت کا ثبوت —— اور ان مجسموں کو دیکھئے۔ پیدائش سے لے کر نروان تک مہاتما بدھ کی زندگی کی پوری کہانی کہہ رہے ہیں۔ باندیوں اور مہارانیوں، سیوکوں اور راجاؤں کے لباس اور زیورات دیکھئے —— اور ان مورتیوں کو دیکھ رہے ہیں آپ؟ یہ محلوں اور مندروں کے بوجھ کو اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں۔ یہ دروازوں اور شہ نشینوں کے جزو ہیں یہاں وہ قوسیں اب تک نہیں آئیں جنہیں مسلمانوں نے رواج دیا چنانچہ یہ دہلیز اور چوکھٹے زیادہ دیر تک عمارت کا وزن نہیں اٹھا سکیں گے۔ عمارتیں ڈھے جائیں گی، چھتیں زمین پر آ رہیں گی۔ اور یہ مجسمے ہواؤں کو اپنی کہانیاں سنائیں گے۔

بُدھ کی یہ یادگاریں صوبہ سرحد کے کونے کونے میں بکھری پڑی ہیں — یہ سحری بہلول ہے۔ ہم تخت بائی سے کوئی تین میل جنوب مغرب کی طرف پہونچ چکے ہیں۔ تیس فٹ لمبوتری سی ڈھیری۔ شاید دوسری یا تیسری صدی عیسوی میں یہاں خوب چہل پہل ہوگی۔ بہت ممکن ہے کہ یہاں بھی مذہب کے بال کی کھال اتاری جاتی ہو۔ اور لوگ بدھ مت کی روح کو بھول کر اس کے خول کے نقش و نگار پر سر دھن رہے ہوں۔ یہ کشان خاندان کے زمانے کا کوئی قصبہ ہے۔ شہر پناہ کے ٹکڑے اب بھی موجود ہیں۔ اس ڈھیری کو کھودا جائے تو شاید اس کی تاریخ کے بارے میں بھی کچھ پتہ چل جائے۔ لیکن ہمارے بڑے بڑے شہروں میں ہمارے اپنے رہنے سہنے کی عمارتیں بھی تو تیزی سے آثارِ قدیمہ کی صورت اختیار کر رہی ہیں۔ ایسے

ںہیں دوسری تہذیبوں کے آثارِ قدیمہ کی طرف رجوع کرنے کی کیا
رورت ہے۔

سحری بہلول کے میدان میں اور بھی ایسی بہت سی ڈھیریاں اور
مدنا ہب کی خانقاہیں ملیں گی۔ ان پر کیا گذری ہوگی، اس کا تصور کرنے
ے لئے ادھر جنوب کی طرف چلئے۔ یہی کوئی ہزار ایک گز چلنا ہوگا۔
یل سترہ سو ساٹھ گز کا ہوتا ہے)۔ یہاں بھی بودھوں کی ایک خانقاہ
ہی۔ کچھ کچھ ایسی ہی جیسی کہ آپ تخت بائی میں دیکھ چکے ہیں۔ مرکز میں
پ آس پاس بھکشوؤں کے حجرے جن کے اوپر گنبد نظر آرہے ہیں۔ اد
رِستوروں کے ساڑھے چار چار فٹ اونچے مجسمے۔ خیال ہے کہ شاید
س خانقاہ کو تاتاریوں نے تاخت و تاراج کرکے نذرِ آتش کردیا تھا۔
مانقاہ کی مرکزی عمارت کا بنیادی چبوترا چونے اور پتھر کا تھا اور آگ
سے بچ گیا۔ اس ڈھیری کا وجود اس حقیقت کا اعلان کر رہا ہے کہ نیکی کو
بدی کی طاقتوں سے بچانے کے لئے طاقت ضروری ہے۔ یہ جملہ معترضہ
تاریخ کا ایک سبق تھا جسے کبھی کبھی دوہرا لینا چاہئے!

صوبہ سرحد کا چپہ چپہ اس سبق کو دوہرا رہا ہے۔ پشاور سے شمال
مشرق کی طرف چلئے۔ یہاں راستے میں قدم قدم پر ندیاں نظر آئیں گی۔
مغربی پاکستان کی ساری ہریاول یہاں جمع ہوگئی ہے خیبر کی برہنہ و بےرحم چٹانیں
دیکھنے والوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا کہ صوبہ سرحد کا کوئی حصہ
اتنا زرخیز ہوسکتا ہے۔ کہ پاکستانی ادیب ان کا تصور ہی کرسکتا ہے۔ یہ چارسدہ
کا علاقہ ہے۔ پشاور سے ۱۸ میل کے فاصلے پر یہ قصبہ گندھارا راجیہ کی
راجدھانی تھا اور "پسکلاوتی" کے نام سے مشہور تھا۔ سر آرل شائین نے
جب سکندرِ اعظم کے قدموں کا کھوج نکالا تو معلوم ہوا کہ یہ یونانی ڈاکو اس راستے
سے مار دھاڑ کرتا آیا تھا اور تیس دن کے محاصرے کے بعد اس شہر کو ہار ماننا پڑی
اس کے بعد یہاں کیا گذری، اس کا راز ان ڈھیریوں میں دفن ہے۔ کھیتوں
میں ہل چلاتے وقت "چارسدہ" کے علاقے سے اکثر نوادر دستیاب ہوتے رہتے
ہیں۔ پتھر کے چھوٹے بڑے بت، کانچ کے منکے۔ آئینوں کے ٹکڑے برآمد ہو
سکے۔ ایک خان زادے نے مجھے بھی ایک چھوٹا سا مجسمہ بطور تحفہ دیا ہے۔
اس میں کوئی راجہ گھوڑے پر سوار ہے۔ ان ڈھیریوں کے اکثر نوادر، خاص طور
پر مجسمے کسانوں کی دستبرد کی نذر ہوجاتے ہیں۔

بڑی ستم ظریفی ہے کہ یہ علاقہ جہاں بدھ مت اپنے عروج کو پہونچا،
جہاں چپہ چپہ پر گوتم کی یادگاریں اور نشانیاں موجود ہیں، خونریزی کے
لئے اپنی مثال آپ ہو!

خیر، خانقاہوں کا سلسلہ اتنا طویل ہے کہ اس کا صحیح جائزہ لینے
کے لئے مدتیں درکار ہیں۔ تو آیئے بزدان کی ان یادگاروں کو چھوڑ کر ان
لوگوں کا فنِ تعمیر دیکھیں جو بزدان کے بجائے صرف دو وقت کی روٹی چاہتے
ہیں۔ اس علاقے کے دیہات اور قصبوں کے لوگ عام طور پر کچے مکانوں
میں رہتے ہیں۔ یہاں بھٹہ کی پکی ہوئی اینٹوں اور سمنٹ وغیرہ کا استعمال
بہت کم ہے۔ درۂ کوہاٹ میں مکان پتھر کے ہوتے ہیں۔ دوسری جگہوں
پر بالعموم آن گھڑے چھوٹے بڑے بٹوں اور گارے کی مدد سے دیوار کھڑی
کردی جاتی ہے۔ چھتیں لکڑی کے شہتیروں سے بنتی ہیں۔ غریب گھرانوں
میں انہیں جوکور کرنے کی استطاعت بھی نہیں ہوتی۔ شہتیروں کے
اوپر سرکنڈے ڈال دئے جاتے ہیں اور چھت کو مٹی سے لیپ دیا جاتا ہے۔
گھروں میں غسلخانے، باورچی خانے اور بیت الخلا نہیں ہوتے۔ البتہ شہری
طرز پر جو مکان کہیں کہیں بن رہے ہیں وہاں ان ضروریات کا خیال رکھا
جاتا ہے۔ اس علاقے کے طرزِ تعمیر کی سب سے بڑی خصوصیت یہاں
کے دیہاتی مکانوں اور محلوں کی مورچہ بندی ہے۔ مکان کے اندر چاہے
کچھ بھی ہو، فصیل ضروری ہے۔ ورنہ دشمنوں کو انتقام کا موقع مل سکتا
ہے۔ یہاں ہر شخص رائفل یا ریوالور سے مسلح ہے۔ چنانچہ فصیل یہاں
کے فنِ تعمیر کا جزوِ اعظم ہے۔ فصیل کی طرح مورچہ بندی کے لئے گاؤں
کے ملک کے گھر میں ایک برج بھی ضروری ہے جہاں سے اڑوس
پڑوس کے علاقے کا جائزہ لیا جاسکے اور حملہ آوروں پر گولیوں کی
بوچھاڑ کی جاسکے۔

حجرے کو پٹھانوں کے دیہات اور سماجی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل
ہے۔ بھکشوؤں کے حجروں میں روشن دان تھے، کتابوں اور دیوں کے لئے
طاقچے تھے، اکثر چھتوں پر گنبد تھے۔ اندر حجرے پکے تھے۔ لیکن پٹھانوں کے
حجروں کی چھتیں سپاٹ ہیں۔ اکثر و بیشتر کچے ہیں، ہر بڑے خاندان کے لئے
ایک حجرہ ضروری ہے۔ ہر ملک کے گھر کے ساتھ حجرہ لازمی ہے۔ یہاں مرد
شام کو گپ ہانکتے ہیں، اپنے مسائل پر گفت و شنید کرتے ہیں، رباب پر اپنے
قبیلے کی شجاعت کی داستانیں سناتے ہیں۔ جہاں جہاں بجلی پہونچ چکی ہے
وہاں ریڈیو پاکستان کے پروگرام اور فلمی گانے سنتے ہیں، خبروں پر
تبصرہ کرتے ہیں اور پشاور ریڈیو کے جواب رساں کو پروگراموں کے
بارے میں اپنے خیالات سے آگاہ کرتے ہیں۔ حجرہ دیہات کی زندگی میں

کلب، سینما، تھیٹر اور کانفرنس ہال، یہاں وقت سبھی کچھ ہے۔ مگر اس کی چھت اسقدر سیاہ کیوں ہے اور دیواروں پر سفیدی کیوں نہیں؟ خالی مٹی کا لیپ کیوں ہے؟ کمرے کے وسط میں یہ جو لپا پُتا چبوترہ ہے، سردیوں میں یہاں آگ جلائی جاتی ہے — لکڑی یا پیال، لیکن سوائے ایک آدھ چھوٹے سے روشن دان کے جو دیوار کے کسی کونے میں سوراخ کی طرح نظر آتا ہے، یہاں کوئی چمنی یا دودکش موجود نہیں۔ چنانچہ سارا دھواں چھت سے چمٹ جاتا ہے۔ سردیوں کی لمبی راتوں میں یہاں دیر گئے تک محفلیں جمتی ہیں — خاندان کے غیر شادی شدہ لڑکے یہیں سوتے ہیں۔ سردی سے بچنے کے لئے فرش پر چٹائیوں کے نیچے پیال بچھائی جاتی ہیں۔ کھاتے پیتے گھروں میں چٹائیوں کے اوپر قالینوں کا فرش ہوتا ہے۔ پیال کے دھوئیں کے علاوہ خشک کڑوے تمباکو کا دھواں حجرے کی خاص خوشبو میں ہے
—— اف دم گھٹنے لگا، آئیے باہر چلیں۔

ہمارا سفر پشاور سے شروع ہوا تھا۔ اب ہم پھر وہیں پہونچ گئے ہیں۔ مہابت خاں کی مسجد کے مینار سارے شہر پر چھائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اور نمازیوں کو دعوت دے رہے ہیں۔ ان میناروں کے سامنے قلعہ بالاحصار کی بلندی بھی پست معلوم ہوتی ہے۔ مہابت خاں کی مسجد مغل طرز تعمیر کا ایک معمولی نمونہ ہے۔ اس میں ہیبت تو ہے لیکن وہ نفاست اور بانکپن نہیں جو مغل صنعت تعمیر کی خصوصیت ہے۔ غیر ماہر ہاتھ مرمت کی کوشش میں اس کی رہی سہی نفاست کو بھی غرق کر رہے ہیں۔ آرٹ کی یہ مرمت ہوتی آپ سے نہیں دیکھی جائے گی۔ تو آئیے شہر کی سیر کریں۔

پشاور کے پرانے مکان "اب گرا چاہتے ہیں" کا تاثر پیدا کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ بڑے سخت جان ہیں۔ لکڑی کے فریم انہیں سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان چوکھٹوں میں اکثر کچی اینٹیں جڑ دی جاتی ہیں اور گھروں کی دیواریں بن جاتی ہیں۔ بعض مکانوں کی بالائی منزلوں میں اب صرف لکڑی کے ڈھانچے باقی رہ گئے ہیں۔ اینٹیں ایک ایک کر کے گر چکی ہیں۔ بعض لوگ اس طرز تعمیر کی ایجاد کو زلزلے کے جھٹکوں سے منسوب کرتے ہیں۔ بھونچال کے ہلکے ہلکے ہلکورے یہاں صدیوں سے آ رہے ہیں۔ اس کا ذکر آپ نے دربار اکبری میں بھی پڑھا ہوگا۔ کچھ لوگ کچی اینٹوں کے بکثرت استعمال کو (یہاں پرانی کوٹھیاں بھی کچی اینٹوں کی بنی ہیں) یہاں کی شدید گرمی کا توڑ بتاتے ہیں۔ لیکن یہ دیکھئے یہاں پکی اینٹوں کی حویلیاں بھی موجود ہیں۔ مگر ان میں بھی اکثر وبیشتر وہی چوکھٹوں کے اصول سے کام لیا گیا ہے۔ قریب قریب ہر بڑی حویلی میں تہ خانہ بھی ہے۔ باہر سے یہ پرانی دو منزلہ اور سہ منزلہ حویلیاں بالکل آسیب زدہ معلوم ہوتی ہیں، لیکن صدر دروازے سے اندر جائیے تو کشادہ صحن ملیں گے۔ کہیں کہیں حوض اور فوارے بھی نظر آ جائیں گے۔ یہاں بھی مردانے زنانے کا الگ الگ انتظام ہے۔ دیوان خانوں کی چھتوں پر یہ نقش و نگار کیسے ہیں؟ یہ نقوش، یہ سنہرے نیلے پیلے، دھانی، گلابی رنگوں کا عجیب و غریب امتزاج، پھول پتیوں کی شکل میں قوسِ قزح کے یہ ٹکڑے آپ نے کاغذ سے بنی ہوئی کشمیری ڈبیوں، قلمدانوں اور کتابوں کی جلدوں وغیرہ پر دیکھے ہوں گے ؎

"کشمیر" کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

مرزا غالبؔ کشمیر نہ گئے ورنہ کلکتے کو بھول جاتے اور اقبالؔ کی آواز سے آواز ملاتے:-

ع رخت بہ کاشمر کشا، کوہ و تل و دمن نگر

پشاور سے کشمیر کے راستے اور بھی ہیں لیکن دشوار گذار۔ تو آئیے، راولپنڈی چلیں۔ لیکن اٹک میں یہ ستون کیسے نظر آ رہے ہیں؟ کوئی کہہ رہا ہے کہ مغلوں کے عہد میں یہاں پل ہوا کرتا تھا۔ اور یہ تعمیر کیسی ہے؟ یہ قلعہ؟ مگر ہمیں رکنے کی مہلت نہیں۔ ہمارے سامنے کئی صدیوں کی مسافت پڑی ہے۔ اور ہم سے پہلے گذرنے والے سیاحوں کا بیان ہے کہ راستے میں ایسے ایسے پڑاؤ آتے ہیں کہ آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ وقت کبھی رک جاتا ہے اور کبھی ماضی کی طرف لوٹ جاتا ہے — ایک ایسی ہی منزل ہمارا راستہ روکے کھڑی ہے — ٹیکسلا!

سال ۳۲۶ ق.م ہے۔ یونانی قزاق جسے دنیا سکندر اعظم کے نام سے پکارتی ہے، ایران کے سینکڑوں ستونوں والے دارالسلطنت کو جلا کر اپنی بربریت کا خراج وصول کرتا ہوا، اب دریائے سندھ کے اس طرف پہونچ چکا ہے اور ٹیکسلا کے راجہ کے ایلچی کو شرف باریابی بخش رہا ہے۔ ایلچی کوئی سو من چاندی اور جانے کتنے گھوڑے، ہاتھی بطور نذرانہ اور اپنے آقا کی التجائے اطاعت لے کر آیا ہے — سکندر سوچ رہا ہے کہ دیوتا جانیں راجہ کی راجدھانی کتنی عظیم الشان ہوگی لیکن راجاؤں اور بادشاہوں کی دولت اور شان و شوکت سے فوراً ہی رعیت کی حالت کا اندازہ غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔ بہت ممکن ہے بلکہ اغلب یہی ہے کہ ہم

آثار کہن (مغربی پاکستان)

مقبرہ آصف جاہ ۔ لاہور

مقبرہ شاہ تراب، نزد ٹھٹھہ (سندھ)

قلعہ لاہور ۔ صدر دروازہ

قلعہ خیر پور

قلعہ بالا حصار ۔ پشاور (سرحد)

اسٹیج کے
چند مناظر

ادھیراج کے ماتھے کا ٹیکا اور ان کی انگشتری کا لعل رعایا کے خون کی مرہونِ منت ہو۔ سکندر کے جلوس میں چلے آیئے۔ یہیں شاید وہ کچھ نہیں کہے گا۔ بلکہ بہت ممکن ہے اپنے تبسم سے بھی نواز دے۔ کیونکہ ہم سکندر کے استاد کے اساتذہ کے گن گا رہے ہیں اور فلسفہ یونان کو اپنے لئے مشعل راہ بنا رہے ہیں۔ مگر شعلوں کی روشنی میں یہ ڈربے کیسے دکھائی دے رہے ہیں؟ —— جی یہی ٹیکسلا ہے —— ٹیکسلا کا پہلا شہر یہ دوسرا اور تیسرے بلکہ چوتھے ٹیکسلا کے نیچے دفن ہو جائے گا۔ ان بستیوں کی سیر کے لئے آپ کو انتظار کرنا ہوگا۔ تو سکندر کے جلوس کے پیچھے پیچھے چلے آیئے۔ تو یہ کتنی تنگ گلیاں ہیں! کچی، اتنی بھی توفیق نہیں کہ راستے میں پتھروں کا فرش بچھا دیں۔ فاتح اعظم کے استقبال کے لئے۔ خاک اڑ رہی ہے، گھوڑوں کے سموں سے صبر کیجئے۔ ابھی تو اس پوری تہذیب کی خاک اڑے گی جو ٹیکسلا کے نام سے منسوب ہے۔ مگر ان مکانوں کو دیکھ رہے ہیں، اب کم از کم سفیدی کی کوچی ہی پھیر دی ہوتی کہ بادشاہوں کے بادشاہ سکندر اعظم کو آنا ہے۔ گھروں کے اندر اندھیرا پڑا ہے تو کیا ہوا چھتوں میں "گمھ" موجود ہیں۔ دن کو سورج اور رات کو چاند تاروں کی روشنی اندر آ سکتی ہے —— ہوں! یہ دیوار مٹی کی بنی ہے! اور یہ پتھر جو نظر آ رہے ہیں مٹی کے اندر؟ اور یہ تو کسی امیر آدمی کا مکان ہے مگر شاید یہاں کے معمار پتھروں کو گھڑنا اور چوکور بنانا نہیں جانتے۔ یہ مکان دوسروں کی بہ نسبت کچھ بہتر دکھائی دے رہا ہے۔ یہ صحن ملاحظہ فرمایئے اور یہ ادھر تو اچھا خاصا ہال ہے۔ شاید کسی منتری کا مکان ہے جہاں اس کی پارٹی کے اجلاس منعقد ہوتے ہیں۔ اس کی چھت کو سنبھالنے کے لئے یہ تین کھمبے سے بھی کھڑے کر رکھے ہیں۔ ان کا نیچے کا حصہ پتھروں اور مٹی چونے کا بنا ہوا معلوم ہوتا ہے ..... اور اس دوسرے مکان کے باہر یہ گیرو دار رنگ نظر آ رہا ہے۔

مگر ٹیکسلا کے اس پہلے شہر کو سکندر کے جلوس کے سوا سوا سو سال بعد دیکھئے —— یہ تیسرا ٹیکسلا ہے۔ اس کے گرد سات گز چوڑی پتھر کی فصیل پہرہ دے رہی ہے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر مستطیل اور کونوں پر پہل دار برج بنے ہیں۔ زیریں شہر کا نقشہ پہلے ٹیکسلا سے مختلف ہے۔ یہاں سڑکیں اور گلیاں پہلے کی طرح بے ڈھنگی نہیں بلکہ مستطیل کی ترتیب نظر آ رہی ہے۔ بازاروں کے دو رویہ نیچی نیچی دوکانیں نظر آ رہی ہیں، دوکانوں کے پیچھے مکان ہیں جن کی دیواریں ساجھی ہیں۔ بعض بعض مکانوں میں صحن بھی موجود ہیں —— ذرا دیکھ کر چلئے گا۔ آپ کے قدموں کے نیچے تہ خانے کا زینہ ہے۔ گویا گرمی سے بچنے کا پورا انتظام ہے۔ مگر زمانہ آگے بڑھ رہا ہے۔

مسیح کی وفات کو نصف صدی گذر چکی ہے۔ ٹیکسلا میں وہی ٹوپ نما عمارتیں نظر آ رہی ہیں۔ مہاتما بدھ کی وہی یادگاریں، بھکشوؤں کے حجرے ہیں جنہیں آپ دیکھتے ہی پہچان جائیں گے۔ یہاں مورتیاں چونے کی ہیں، یہاں مہاتما بدھ کا چونے کا حسین ترین بت موجود ہے۔ یہ بودھوں کے مندر ہیں یہیں ایک کمرے میں بے شمار سونا چاندی اور جواہرات ہیں جو مندر کی ملکیت ہیں۔

ٹیکسلا کا چوتھا شہر سرسکھ کے نام سے مشہور ہے، تیسرے ٹیکسلا سے ذرا دور کنشک کے عہد کے کچھ ہی عرصہ بعد ہارو کے میدان پر ابھرا۔ اس کی فصیل تغلق آباد کی فصیل کی یاد دلاتی ہے۔ اس کی چوڑائی کوئی ساڑھے چھ گز کے قریب ہے۔ اس کو پانی کے کٹاؤ سے بچانے کے لئے بنیادیں گول کر دی گئی ہیں۔ اس کے برج ساسانی طرز تعمیر کی یاد دلاتے ہیں۔ بودھوں کی خانقاہوں اور مندروں کے علاوہ یہاں یونان کے کلاسیکی طرز کا ایک معبد بھی موجود ہے۔ اس کے سامنے دو ستون ہیں۔ اس میں اور یونانی طرز تعمیر میں فرق ہے تو صرف اتنا کہ جہاں یونانی عمارتوں میں یہ ستون چاروں طرف قطار اندر قطار نظر آتے ہیں یہاں ان کی بجائے دیواریں ہیں اور دریچہ نما سوراخ دکھائی دے رہے ہیں۔ لیکن یہاں یونان کے کسی دیوتا کا بت موجود نہیں۔ دیوتاؤں کی شہ نشینوں کے بجائے ایک چبوترہ ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ یہ عمارت غالباً زرتشت کے پیروؤں کا معبد تھا۔ یہاں کوئی آتشکدہ بھی ضرور ہوگا۔ اس کی آگ ملبے کے ڈھیروں کے نیچے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سرد ہو گئی۔ اور آج ان کے دیوتا، چاند اور سورج اس پر ہر وقت چمکتے رہتے ہیں۔

(باقی آئندہ)

"ماہ نو" اشاعت مئی ۱۹۵۵ء میں صفحہ ۱۵۳ اور ۴۵ پر "خیاباں خیاباں ارم" کے زیر عنوان جو تراجم شائع ہوئے ہیں ان میں پشتو تراجم رضا ہمدانی صاحب نے کئے ہیں۔ سہواً ان کا نام درج ہونے سے رہ گیا ہے۔ قارئین تصحیح فرمالیں۔ (ادارہ)

عوامی ناٹک

(مشرقی پاکستان)

سجّاد حسین

بنگال کے عوامی ناٹکوں کو بالعموم "جاترا" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس لفظ کے ٹھیک ٹھیک معنی بیان کرنا تو شاید دشوار ہو کیونکہ اس کا من وعن ترجمہ ممکن نہیں۔ اور سچ پوچھئے تو ایسی اصطلاح کا کوئی مترادف ہوتا بھی نہیں۔ اس کی تعریف تو کچھ اس طرح کی جاسکتی ہے کہ "جاترا" بنگلہ دیس کا ایک بڑا چہیتا اور مقبول عام ڈرامائی کھیل ہے۔ ویسے اس کے لفظی معنی ہیں "سفر" یا پھر اس کے پرانے معنی لئے جائیں تو اس کو "ارتقا" کہہ سکتے ہیں۔ اس کے باوجود جہاں تک "جاترا" کے حقیقی معنوں کا تعلق ہے ہم اس سے کوسوں دور رہیں گے۔

"جاترا" بنگال کی اپنی خود رو اور بڑی من بھاتی پیداوار ہے اور اس نے ایک ایسی روایت سے جنم لیا ہے جو یہاں کے عوام الناس میں صدہا سال سے قائم ہے۔ اگر ہم یہاں سے بہت دور انگلستان کے ڈرامے پر نظر ڈالیں تو ہمیں اس کے نمونے وہاں کے کراماتی اور دھارمک ناٹکوں اور "انٹر لوڈ" یا پھر یونانی ڈرامے کے ابتدائی نمونوں میں دکھائی دیں گے۔ میرا مطلب اُن ڈرامائی کھیلوں سے ہے جو "ایسکلس" اور "سوفاکلیز" سے پہلے کھیلے جاتے تھے۔ ہم ان بنگلہ ناٹکوں کو نہ تو پوری طرح واضح اور کٹی سدھی ٹریجڈی کہہ سکتے ہیں نہ کومیڈی۔ ان کھیلوں میں کوئی مشہور کہانی اسٹیج پر پیش کی جاتی ہے۔ بالعموم کھلی فضا میں۔ اور کہانی بھی ایسی جس میں کوئی نصیحت کی بات ہو۔ عام طور پر یہ کہانیاں مقبول عام داستانوں یا خیالی قصّے کہانیوں سے ماخوذ ہوتی ہیں۔ ان کا سب سے بڑا مقصد تو ظاہر ا کھیل تماشہ ہی ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ کوئی تعلیم یا اخلاقی سبق بھی دیا جاتا ہے۔ بات چیت عموماً صاف سیدھی نثر ہی میں ہوتی ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی نظم بھی برتی جاتی ہے اور گانے بجانے سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ ناٹک میں کئی ایسے موقعے آتے ہیں جہاں مختلف مقاصد کے لئے کافی کچھ گایا بجایا بھی جاتا ہے۔

جیسے یہ عوامی ناٹک سیدھے سادے ہیں اسی طرح ان کا سازو سامان بھی ہے۔ لیکن کوشش یہ کی جاتی ہے کہ مناظر سے خوب دھوم دھام پیدا ہو۔ چنانچہ جب کبھی ضرورت پیش آتی ہے بھڑکدار پوشاکیں اور رنگین پردے بھی کام میں لائے جاتے ہیں۔

جاترا دو باتوں میں یونانی ڈراموں سے بہت ملتا جلتا ہے۔ اور یہ ایسی چیزیں ہیں جن کا خاص طور پر مطالعہ لازم ہے۔ ایک تو یہ کہ ان ناٹکوں میں کورس بھی حصّہ لیتا ہے۔ دوسرے شروع سے لیکر آخر تک ایک ہی واقعہ لگاتار پیش کیا جاتا ہے۔ اسٹیج کسی وقت بھی خالی نہیں رہتا اور بالعموم کوئی پردہ بھی استعمال نہیں کیا جاتا۔

اگر جاترا میں الگ الگ منظر قائم نہیں کئے جاتے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ان ناٹکوں میں تینوں "وحدتوں" کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان وحدتوں کا بری طرح ستیاناس کیا جاتا ہے اور دیکھنے والے اِس بے پروائی کو قبول بھی کر لیتے ہیں۔ ناظرین ایسے مسئلوں کی ذرا بھی پروا نہیں کرتے، انہیں تو صرف اس بات سے غرض ہوتی ہے کہ کوئی ایسی کہانی جس میں تھوڑا بہت ربط ہو ڈرامائی طور پر پیش کر دی جائے۔ تاوقتیکہ کہانی کا سلسلہ ٹھیک ہو آپ جو منظر چاہیں ڈرامہ میں لا سکتے ہیں۔

آپ پوچھیں گے ایسے ناٹک لکھتا کون ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کے لکھنے والے کوئی جانے پہچانے آدمی نہیں ہوتے، یہ تو عوامی ناٹک ہیں اور انہیں کوئی ایک شخص نہیں لکھتا۔ یہ تو خود بخود بنتے چلے جاتے ہیں یعنی جہاں تہاں سے تھوڑی تھوڑی باتیں مل جل کر ناٹک کا روپ دھار لیتی ہیں۔ یہ کیسے ہوتا ہے، اس کو سمجھنے کے لئے قدیم

داستانوں پر غور کرنا چاہیے جن سے بالآخر رزمیہ داستانیں اُبھرتی ہیں۔ انہی کی طرح جاترا بھی آن جانے ہر دلعزیز گیتوں اور "باروں" ہی سے اُبھرتے ہیں۔ یوں تصور کر لیجیے کہ گیتوں کی ایک لڑی سی ہوتی ہے جس کو "پال" کہتے ہیں۔ یہ پال درحقیقت "باروں" کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ جب یہ "بارہیں" حرکات و سکنات کی شکل اختیار کر لیتی ہیں تو یہ "جاترا" بن جاتی ہیں۔

یہاں اس بات پر زور دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم جاترا کا تصور اسٹیج کے بغیر کر ہی نہیں سکتے۔ "پال" گویا مکالمے ہوتے ہیں جو اسٹیج پر پہنچکر "جاترا" بن جاتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں پہلے جس چیز کا تصور کرنا پڑتا ہے وہ یہی "پال" ہیں۔ یہ "آلہا اُودل" قسم کی باروں کے سلسلہ سے ترتیب پاتے ہیں۔ یہ سلسلہ برابر زبانی طور پر جاری رہتا ہے یہاں تک کہ اس کی تمام ڈرامائی صلاحیتیں اُجاگر ہو جاتی ہیں۔ پھر کوئی بڑا زمیندار یا دیہاتی منڈلی اس کو اسٹیج پر پیش کرنے کا اہتمام کرتی ہے، ضروری سامان بہم پہنچایا جاتا ہے، اسٹیج کھڑا ہوتا ہے اور پارٹ ادا کرنے والے چُنے جاتے ہیں۔

جب یہ مرحلے طے ہو جاتے ہیں تو جاترا بڑی تیزی سے روپ دھارنے لگتا ہے۔ اداکار اپنا اپنا مکالمہ تیار کر لیتے ہیں اور یہ طے پاتا ہے کہ وہ اسٹیج پر کونسا پارٹ ادا کریں گے۔ ان باتوں کے لئے بہت منجھے ہوئے ذوق، قوتِ فیصلہ اور سلیقہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ جن باروں پر ناٹک کی بنیاد ہو اُن سے غیر ضروری باتوں کی کاٹ چھانٹ بہت ٹیڑھا معاملہ ہے۔ یہ بھی دھیان رکھنا پڑتا ہے کہ کوئی ایسا گیت نہ سمو لیا جائے جو دیکھنے والوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچائے۔

آپ پوچھیں گے کہ کوئی جاترا جو کسی ہر دلعزیز داستان پر مبنی ہو کیسے جذبات کو ٹھیس پہنچا سکتا ہے؟ اس کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ سیدھے سادے دیہاتی داستانوں کو بڑی سنجیدہ چیز خیال کرتے ہیں اور یہ پسند نہیں کرتے کہ کسی ہیرو کو غلط پیرائے میں پیش کیا جائے۔ دوسرے بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہمارے اپنے عہد کے واقعات اور مقامی باتیں بھی گیتوں میں شامل کر لی جاتی ہیں۔ اگر کسی ایسے واقعہ پر تبصرہ یا چوٹ کی جائے مثلاً گاؤں کی کسی لڑکی کا فرار، تو قدرتی طور پر جذبات فی الفور برانگیختہ ہو جاتے ہیں۔ ایسی چوٹوں یا چہ میگوئیوں کو حذف کر دینا ہی مناسب ہے۔ کیونکہ گاؤں کا سماج اپنی لاج کی بڑی شدت سے حفاظت کرتا ہے۔ اور اس پر کسی حملہ کو برداشت نہیں کرتا۔

جب کھیل مکمل ہو جاتا ہے تو ایک طرح کا یہ ریہرسل ہوتا ہے۔ پھر کھیل دکھانے کی تاریخ مقرر ہو جاتی ہے۔ بزرگ آدمی ایسے کھیلوں پر بہت ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ لیکن نوجوان اور زندہ دل لوگ ان کو جان دیتے ہیں اور ساری ساری رات انٹ شنٹ اسٹیج بنانے ہی میں گذار دیتے ہیں اور ایسا ہونا لازمی بھی ہے کیونکہ جاترا بڑی آہستہ آہستہ تیار ہونے والی چیز ہے جس پر بیحد وقت صرف ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا اہتمام بھی تو یونہی سرسری سا ہوتا ہے۔ تماشائی گھنٹوں گپیں ہانکتے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسٹیج کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ پھر کہیں جا کر کھیل شروع ہوتا ہے۔ کھیل شروع ہوتے ہی سناٹا چھا جاتا ہے۔ کوئی اداکار یا اداکارہ سامنے آتی ہے (اداکارہ ہمیشہ مرد ہی ہوتا ہے جو عورت کا پارٹ ادا کرتا ہے)۔ ابتدائی گیت گایا جاتا ہے اور کوئی پارٹ ادا ہوتا ہے۔ پھر یہ اداکار یا اداکارہ پرے ہٹ جاتی ہے یا دوسرے اداکاروں کا انتظار ہوتا ہے۔ تاکہ وہ اسکے ساتھ آ کر شامل ہو جائیں۔

کھیل میں یہ پروا نہیں کی جاتی کہ جو کچھ ہو، اصلیت کے مطابق ہو۔ بعض اداکار اثر بڑھانے کے لئے خول بھی پہن لیتے ہیں۔ زبان خواہ نظم ہو یا نثر بڑی اونچی آوازیں ادا کی جاتی ہے تاکہ اس سے ہنگامہ پیدا ہو۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ایسی بناوٹی زبان برتنے کی دانستہ کوشش کی جاتی ہے۔ اسی طرح الفاظ اور حرکات و سکنات سے بھی جان بوجھ کر اثر پیدا کیا جاتا ہے۔ تماشائی تھوڑی دیر کے لئے ایک غیر حقیقی شاعرانہ فضا ہی میں کھو جانا چاہتے ہیں۔ جہاں بڑے بڑے عظیم الشان واقعات رونما ہوتے ہیں۔ ایسے واقعات جو عام زندگی کی روکھی پھیکی وضع سے بہت دُور ہوں۔

کھیل کے دوران سنجیدہ یا جذباتی موقعوں پر گیت بھی گائے جاتے ہیں۔ گانا عموماً سنگت ہی میں ہوتا ہے جس میں اداکار بھی حصہ لے سکتے ہیں۔ اگر کوئی گاؤں یا وہ شخص جس نے کھیل کا بندوبست کیا ہے۔ ناچ وغیرہ کا شوقین ہو تو کھیل میں یہ عنصر بھی شامل کر لیا جاتا ہے۔

کھیل عموماً رات کے دو تین بجے ختم ہوتا ہے۔ تماشائی خوشی خوشی گھر واپس آتے ہیں کہ انہوں نے اپنی زندگی کے کچھ لمحے ہنسی خوشی میں گذار دئے۔

اسلامی دور سے پہلے بنگال کے بیشتر جاترا ہندو اتہاسوں یعنی راماین اور مہابھارت کے بہادروں سے وابستہ تھے جب سے

مسلمان یہاں آئے ہیں اسلامی موضوعات پر بھی مقبول عام ناٹکوں کا اچھا خاصا ذخیرہ فراہم ہوگیا ہے۔ ان میں سے ایک نہایت ہی مقبول ناٹک کسی ولی "نظام الدین" سے متعلق ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح گناہ میں مستغرق رہنے کے بعد انہوں نے توبہ کی اور ساری عمر عبادت الٰہی میں گذار دی۔ ایک اور ایسے ہی مقبول ناٹک میں دو بھائیوں کالو اور غازی کا ذکر ہے جو بعد میں اولیا بن گئے۔ حال میں گیتوں کا ایک "پال" بہت دلچسپی کا باعث ہوا جس میں ایک مسلمان لڑکی "گن بنی" کی دردناک داستان پیش کی گئی ہے۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح اس کے چچا نے اس کی جائیداد چھین لی۔

ان ناٹکوں میں جو دلکشی پائی جاتی ہے اس کی طرف ادبی حلقوں نے بھی توجہ دی ہے۔ اور کوشش کی ہے کہ کبھی کبھار ان کے انداز میں کوئی ادبی ڈرامہ تیار کیا جائے چنانچہ انیسویں صدی کے شروع میں کچھ عرصہ جاترا ناٹکوں کو کلکتہ میں کافی فروغ حاصل ہوا۔ اب مشرقی پاکستان کے شہری علاقوں میں بھی اس صنف کے ڈرامائی امکانات نے اہلِ نظر کی توجہ اپنی طرف منعطف کی ہے۔

(ترجمہ: شجاع احمد زیبا)

فکاہیہ

دوستی ناداں کی ہے......"

اشرف صبوحی

نبّو بھشتی کہنے کو سقہ تھا اور اصل نسل سے سقہ مگر نہایت خوش چلن بڑا میاں آدمی۔ شہر میں جب نل جاری ہوئے، گلی گلی محلّے محلّے جمنا کے پانی کی سوتیں جاری ہوگئیں تو سقوں کی روزی میں فرق آیا اور ان غریبوں نے مشکیں چھوڑ دوسرے روزگار تلاش کیے۔ کوئی کنجڑا بن گیا، کسی نے ٹوکری اٹھائی، کسی نے نوکری کرلی۔ نبّو کچھ روز تک ادھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا۔ گزر کا کوئی ڈھنگ نہ نکلا۔ پڑوس میں شبّو رنگریز کا مکان تھا۔ شبّو کی اپنی تو وہی رنگائی کی دکان تھی لیکن اس کے چار بیٹے لکھ پڑھ کر بابو بن گئے تھے۔ کوئی کسی دفتر میں کوئی کمیٹی میں۔ چنانچہ منجھلا کچہری میں اہلمد تھا۔

میاں نبّو اور شبّو ساتھ کے کھیلے ہوئے، بچپن کے یار تھے۔ شبّو نے نبّو کو جو پریشان دیکھا تو ایک دن کہا یار تم تو ہمت ہی ہار بیٹھے۔ آخر تمہاری برادری کے اور لوگ بھی تو ہیں۔ نل لگ گئے تو کیا ہوا۔ بیسیوں گھروں میں اب بھی سقّے ہی پانی بھر رہے ہیں۔ نبّو بولا "ہاں بھر رہے ہیں، پر وہ عزت کہاں۔ پہلے ہمیں بڑے بڑے میاں 'بھشتی' کہتے تھے اور اب ذرا ذرا سے لڑکے 'ابے سقے!' 'ارے پکھالی' کہہ کر پکارتے ہیں۔"

"تو پھر پان چھالیہ کی دوکان ہی کر بیٹھو۔"

"اتنی عمر چودھراہٹ کی۔ دوکانداری میں محلّے بھر کی جورو بن کر رہ نہیں جائے گا۔"

"اچھا نوکری تو کرلو گے؟"

"ایرے غیرے کی ٹہل تو مجھ سے ہوگی نہیں۔ ہاں کسی دفتر میں مل جائے تو کیا ڈر ہے۔"

"کہو تو ننّھن سے ذکر کروں۔ وہ صاحب کا بہت منہ چڑھا ہے۔ شاید خدا کردے اور وہ چپراسیوں میں کہیں لگوا دے۔"

رات کو شبّو نے اپنے بیٹے جمال خاں عرف جمّن سے کہا اور آٹھویں روز نبّو گلے میں چپراس ڈالے عدالت خفیفہ کے دروازے پر "تعمیل جیارام حاضر ہے" آواز لگا رہے تھے۔ اب کیا تھا سارے دلدّر دور ہوگئے۔ دو چار ہی مہینے سارے گھر پر رونق آگئی۔ بیٹا تو کوئی تھا نہیں۔ چار بیٹیوں میں ایک نواسہ تھا۔ پہلے کا طور طریق ہوتا تو شاید اس کی محبت کچھ رنگ لاتی لیکن اب پڑھے لکھوں میں اٹھنا بیٹھنا تھا، اسے مدرسے میں داخل کردیا۔ زمانے کی یہی عادت ہے کہ بنے ہوئے بگڑتے ہیں اور بگڑے ہوئے بنتے ہیں۔ پلک جھپکتے دس برس گزر گئے اور نبّو بھشتی کے نواسے نے میٹرک پاس کرلیا۔ نبّو کی رسائی اور [illegible] کمّو کی پیردوڑی نے کمال خاں بنا کر کرسی پر بٹھا دیا۔ چھٹتے ہی چالیس روپے کی نوکری مل گئی۔

کچہری کا چپراسی اور پھر جس کا نواسہ مسل خواں ہو اس کا پوچھنا ہی کیا۔ صورت بدلی، حالت بدلی۔ اور تھوڑے دن میں ذات بھی بدل گئی۔ روپے کے زور میں چاہا کہ کسی اچھے گھرانے میں کمّو کی ناخن بندی کرکے کھرے کھرے نجیب اور شریف بھی بن جائیں اور یہ کوئی نئی بات بھی نہ تھی۔ غدر کے بعد شہر والوں کی شرافت کا معیار ہی دولت ہوگیا تھا۔ ہڈیوں کے پرکھنے والے رہے نہیں۔ چنانچہ نبّو کی یہ آرزو پوری ہوگئی۔ شیخ بہاؤالدین نقشبندی کے مشہور خاندان میں کمّو کی شادی بڑی دھوم سے ہوئی۔ پیرزادوں کا خاندان تھا اور ٹوٹا ہوا۔ شرافت تھی گھسی ہوئی، چلن تھے بگڑے ہوئے۔ عورتیں پھوہڑ، بدسلیقہ ساتھ ہی مشیخت پر نازاں۔ اس لئے میاں کمّو کچھ خوش نہ تھے۔ سیرت نہ ہو تو صورت کو لے کے کیا چاٹے۔

میاں کمّو اب کمال خاں تھے۔ انہیں دنیا میں ترقی کرنی تھی اور آج کل ترقی بیوی کی اندرونی یا بیرونی امداد کے بغیر بہت دشوار ہے۔ گھونگھٹ اٹھنے تک تو وہ دلہن کی حقیقت کو ایک معمہ سمجھتے رہے۔ ادھر خاطر داریاں اور ادھر شرم، کچھ نہیں کھل سکا کہ عورت کے لباس میں گھر کی برکت ہے یا ڈرگت۔ لیکن

چند روز کے بعد اور خاص کر جب دوسرے ہی سال اماں اور ابا کی بیماری میں بڑے بوڑھوں سے گھر خالی ہو گیا تو دلہن کے جوہر کھلنے لگے۔ بات بات پر جھگڑے کھانے پینے میں بے سلیقگی۔ بابو جی کا ناک میں دم آ گیا۔ وہ تو خیریت تھی کہ باوجود بد سلیقہ اور غیر منظم ہونے کے سسر کمال احتیاط اور جوئی کی دقت شعار، جنس کم اور خاوند کا منہ دیکھ کر جینے والی تھی۔ علاوہ ازیں اس کا پیرا کچھ ایسا بھاگوان ہوا تھا کہ میاں کمو کا طوطی بولنے لگا۔ شادی کے آٹھویں دن ہیڈ کلرک ہو گئے اور ابھی ایک سال نہیں گزرا تھا کہ منصفی میں نام منظور ہو گیا۔ کیا داؤں ہوا، کیا واقعات تھے، اس سے بحث نہیں۔ بہرحال ادھر پہلوٹھی کا بچہ ہوا اور ادھر میاں کمو نے جس عدالت میں مسل خوانی شروع کی تھی وہیں منصف بن کر کرسی پر جا بیٹھے۔

ان حالات میں آپ ہی فرمائیے کہ میاں کمو دلہن بی کی نا اہلیت کے زہر کو شہد کی طرح کیوں نہ پیتے۔ تاہم یہ خیال انہیں ضرور تھا کہ اب میں بڑا آدمی ہو گیا ہوں۔ بڑے لوگوں سے میل جول ہو گا۔ اگر تحصیلدار صاحب یا کسی دوسرے جج کی بیوی بہن بی ہمارے ہاں آئی اور اس نے بیگم صاحبہ سے ملنا چاہا یا اپنے ہاں بلایا تو کیا ہو گا۔ وہ لوگ اپٹوڈیٹ اور یہ دقیانوس کے وقت کی سڑیلی عورت جس کے نہ ہاتھ پاؤں قابو میں نہ زبان۔ جیسے بکری کی طرح پان چبانے اور نوکروں پر جھنجھلانے کے سوا کسی کام میں کمد رکھتی ہیں۔ چنانچہ اس جذبے کے ماتحت میاں کمو نے ان کی تعلیم و تربیت شروع کی۔ کچہری سے آ کر سارا وقت ان کے ساتھ مغز پچی کرتے، امورِ خانہ داری کے متعلق اچھی اچھی کتابیں منگا کر پڑھاتے، معاشرت کے قانون بتاتے، ساڑھی باندھنا، بال بنانا، پوڈر ملنا سکھاتے۔

اسی اثنا میں اتفاق کی بات کہ ان کا ایک ہم جماعت تحصیلدار ہو کر آیا۔ ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی پر دونوں کی ملاقات ہوئی۔ مدت کے بچھڑے ہوئے ملے تھے۔ تعلقات کو مضبوط کرنے کے خیال سے تحصیلدار صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ اگر آپ کو کوئی حرج نہ ہو تو کل اتوار کو میں اپنے گھر کے لوگوں سمیت دولت خانے پر حاضر ہوں۔ میری بیوی یہاں بالکل اجنبی ہیں۔ ان کی بڑی آرزو ہے کہ کسی شریف گھرانے سے راہ و رسم ہو۔ کمال خاں کو یہ کہنے کے سوا چارہ کیا تھا کہ بسر و چشم! میں اور میری بیوی آپ کی اس کرم فرمائی کے بے حد ممنون ہوں گے۔

بات طے ہو گئی۔ مگر منصف صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ صاحب کی ملاقات دوبھر ہو گئی۔ چاہتے تھے کہ کسی طرح جلد گھر پہنچیں اور بیگم صاحبہ کو کل کے لئے سبق پڑھائیں۔

جلدی جلدی گھر پہنچے اور صحن میں قدم رکھتے ہی "اے بی کہاں ہو؟ ادھر تو آؤ۔" کوٹھڑی میں سے آواز آئی "یہاں ہوں، ننھے کو سلا کر آتی ہوں۔"

"ہائیں! کوٹھڑی میں سلانے کے کیا معنی؟"

"تمہارے لالو نے ستا مارا ہے۔ جہاں میں بچے کو لے کر باہر بیٹھی اور یہ آیا۔"

"بی تم بھی تماشے کی ہو۔ باندھ دیا کرو۔ کتے کا کھلا ہوا پھرنا ویسے بھی اچھا نہیں۔"

"کل تم کہو گے کہ گھر کی ماماؤں کو بھی باندھ دو۔ کوئی زردہ مانگنے آ جاتی تو کوئی اپنا دکھڑا رونے بیٹھ جاتی ہے۔"

"خیر یہ تو ہوتا رہے گا۔ اب تم جلدی باہر آؤ۔ نہایت ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

بچہ ابھی سویا نہ تھا، اسے کندھے سے لگائے لگائے دلہن بیگم باہر آئیں۔ "مجھے تم نے خدا کا بیوقوف سمجھ رکھا ہے۔ آج کیا جاتی دنیا دیکھی کہ مجھ سے صلاح کرنے آئے ہو؟"

"بات یہ ہے کہ کل تحصیلدار صاحب اور ان کی بیوی ہمارے ہاں مہمان آئیں گے۔ باہر کا تو خیر میں انتظام کر لوں گا مگر اندر کا فکر ہے۔"

"فکر کا ہے کا۔ تم نے مجھے سمجھا کیا ہے؟ اور یہ کیا کہا کہ باہر کا میں انتظام کر لوں گا؟"

منصف صاحب سمجھے کہ شاید اتنے دنوں کی تربیت سے دلہن میں سلیقہ پیدا ہو گیا ہے۔ کیونکہ دو چار مہینے سے وہ دیکھ رہے تھے کہ گھر کی ہر چیز میں سگھڑاپا نظر آتا ہے اور یہ بھول گئے تھے کہ بیس روپے مہینے کی جو مغلانی رکھی ہے یہ سارا ظہور اس کا ہے۔ بولے "تو کیا تم سب بندوبست کر لو گی؟"

"تم نے مجھ سے کبھی کام بھی لیا۔ تم نے تو ہمیشہ مجھے پیر کی جوتی سمجھا۔ کچھ کہتے اور وہ نہ ہوتا تو بات بھی تھی۔"

"بیگم تم تو لڑنے لگتی ہو۔ تم اگر بیگموں کی طرح گھر کو سنبھالو تو مجھے اور چاہئے کیا؟"

"تو گویا اب میں لونڈیوں کی طرح گھر کر رہی ہوں۔ واہ صاحب واہ! خوب قدردانی کی!!"

"اچھا تو بی پھر جھگڑا کیا ہے؟ میں نے تو ایک بات کہی تھی۔"

"کیوں کہی؟ سر کا وارث ہی جب ہمیں چھوڑ بیٹھے تو اور رہا ہی کیا۔"

"یونہی منہ سے نکل گیا، خطا ہوئی قصور ہوا، دوسرے یہ بھی خیال تھا کہ تم اکیلی دو دو جگہ کا دھیان کیوں کر رکھ سکو گی"

"بڑی براتیں اترتی ہیں ناکہ مجھ بندی پر مصیبت آجائے گی۔ چار مہمان ہوں گے، ان کی دیکھ بھال کیا"

"بس تو میں اطمینان رکھوں۔ باہر کا انتظام بھی تمہارے ذمہ ہے"

"میں کہتی ہوں تمہیں میرے چڑانے سے کوئی تمغہ مل جائے گا۔ ایک دفعہ کہہ دیا کہ ہاں ہاں تم خاطر جمع رکھو۔ کہو تو اسٹامپ لکھ دوں"

"صبح کو غالباً وہ اول وقت آئیں گے۔ پہلے چار دپانی ہوگی۔ آج ہی سے سب سامان ٹھیک ٹھاک کر لو"

"جی چاہتا ہے سر پھوڑ لوں۔ مجھے بدنام کرنا ہے تو ویسے کہہ دو۔ خدا کے لئے اب تم جاؤ"

منصف صاحب مسکراتے ہوئے جانے لگے کہ بیگم صاحبہ بولیں "سنو تو، تحصیلدار صاحب تمہارے دفتر کے کمرے میں بیٹھیں گے نا؟"

"اور کیا، وہی ایک کمرہ بیٹھنے کے قابل ہے"

"تو پھر اس کی صفائی ستھرائی نوکروں کے ہاتھوں میں نہ دینا میں خود اپنے ہاتھ سے ٹھیک ٹھاک کروں گی"

"نہیں، تمہیں اتنی تکلیف کی ضرورت نہیں، وہ تقریباً درست ہے"

"اگر کوئی فی نکل آئی تو ناک میری کٹے گی یا تمہاری؟ سب یہی کہیں گے کہ گھر والی بے سلیقہ ہے"

"خیر بی تمہاری مرضی" کہتے ہوئے منصف صاحب تو تشریف لے گئے اور بیگم صاحب نے انتظام شروع کیا۔

"امانی! امانی! کیا کان پھوٹ گئے؟ باورچی خانہ کیا ہے شہر خموشاں ہے۔ میں کہتی ہوں روٹی چھوڑ دے پہلے ادھر آ۔ نجبن کو دیکھو، کیسی ڈھیٹ بنی ہوئی پوتڑے دھوتی جاتی ہے، مجھے کتیا سمجھ لیا ہے۔ کب سے بھونک رہی ہوں اور مردار سنتی نہیں۔ یہ جمیا کہاں غارت ہوئی اور کلو کدھر غائب ہے۔ توبہ ہے مغلانی، دھوبن کو کپڑے دینے کا بھی یہی وقت ہے۔ یہاں تو تحصیلدار صاحب کی بیوی کل آنے والی ہیں اور تم نے میرے ستانے کے لئے ایکا کر لیا ہے"

اتنے میں سب ماما ئیں چھوکرے جمع ہو گئے "میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو؟ ارے کل تحصیلدار کی بیوی آئیں گی۔ سارا گھر بھاڑ سا پڑا ہے۔ تمہارا کیا بگڑیگا؟ سب مجھے نام دھریں گے" مغلانی بولیں "بیگم آپ اتنی پریشان کیوں ہوتی ہیں؟ مکان تو ماشاء اللہ آپ نے سجایا ہے۔ صبح کو قالین اور بچھا لیں گے" دلہن بیگم کو پتہ اب کہاں تھی کہ کوئی ان کی حرکات کو بے معنی بتاتا یا ان کے خیال کی تردید کرتا، بگڑ گئیں اور کہنے لگیں "تو، بینڈکی کو بھی نکام ہوا، تم ٹکے کی نوکری کرنے والی مہمانوں کی قدر کیا جانو؟ میں جو کبھی کسی کام میں عیب نہیں نکالتی تو ہنے تئیں سلیقے والی سمجھنے لگیں۔ اب دیکھنا سلیقہ کسے کہتے ہیں۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی!

ہاں امانی! شالیش، نکال ڈالو سارا سامان۔ نجبن! دیکھوں تو کیسی پھرتی دکھاتی ہے۔ جمیا بوا! تو ہمت کر کے زمین سے چاروں مسہریاں باہر پکڑ وا دے۔ دیکھنا اندر باہر کا سب فرش بدلا جائے گا"

گھر میں سامان کی انتہا نہ تھی۔ بڑی بڑی مسہریاں، قد آدم آئینے، کوچیں، میزیں، اٹرم سٹرم ہزاروں چیزیں تھیں۔ اٹھاتے اٹھاتے آندھی آ گئی۔ جاڑے کے چھوٹے دن، شام ہو چلی۔ صحن کباڑ خانہ بن گیا اور نئے سرے سے سامان کو آراستہ کرنا اور بھی پورا انگڑ کھنگڑ ابھی نکلا بھی نہ تھا۔ بیگم صاحبہ کو گھبراہٹ، کبھی کمرے میں کبھی دالان میں تو کبھی انگنائی میں "ہماری کمبختو! ہاتھ کیوں نہیں چلتے۔ پیروں میں بیڑیاں پڑ گئیں؟ رات ہونے کو آئی۔ ہے ہے مردار نے الماری کا شیشہ توڑ دیا! ہائے بدنصیب! یہ میز کو کیا ہو گیا؟ لاؤ میں ہاتھ لگا دوں، جوانا مرگ کھڑا دیکھ رہا ہے۔ میرا پاؤں کچل دیا۔ اے میرے دوپٹے کے لبیرے لگ گئے! یہ مغلانی تو دیکھنے کی ہیں، اتنا نہ ہوا کہ کونچ سے میرا پلا ہی نکال دیتیں"

اتنے میں منصف صاحب آ گئے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ مکان میں نیلام گھر کا سا سماں ہے اور دلہن بیگم ہانپ ہانپ کر رنگ برنگ کی بولیاں بول رہی ہیں۔ ششدر کہ یہ کیا تماشہ ہے۔ اس صورت میں تو آج روٹی نصیب ہوتی نظر نہیں آتی۔ نہ رات کو سونے کا ٹھکانہ ہے۔ آخر صبر نہ آیا۔ بولے "بیگم یہ تم نے کیا کیا؟ ایسا ہی تھا تو صدر دالان کو اپنے مذاق کے مطابق درست کر لیا ہوتا"

"اور جو وہ باہر کے دالان میں نہ بیٹھتیں اندر کے دالان میں بیٹھتیں یا کمرے میں بیٹھنا چاہیں پھر کیا ہوگا؟ میں تمہاری طرح بیوقوف تھوڑی ہوں"

"مگر یہ سامان اب اپنی اپنی جگہ کس طرح لگے گا"

"دیکھتے رہو۔ جب تک ساری درستی نہ ہو جائے گی سونا حرام ہے"

"بیگم! ہماری سمجھ میں تو تمہاری یہ کارستانی آئی نہیں۔ اللہ ہی ہے جو صبح تک ایک دالان بھی مہمانداری کے قابل ہو"

"تمہاری سمجھ میں تو آج تک میں ہی نہیں آئی میرا کوئی کام کیا سمجھ میں آئیگا۔ سدا یہی کہتے رہے۔ کوئی اور ہوتی تو مزہ آجاتا۔"

"یہ میں کب کہتا ہوں کہ تم کچھ کرتی نہیں لیکن تمہارے کاموں میں ڈھنگ نہیں۔ اسی لئے مغلانی رکھی ہے۔ گھر کی دیکھ بھال کا کام اس سے تم نے کیوں نہ لیا؟"

"خوب! وہ چار ٹکے کی عورت کیا جانے، کیسے مہمانوں کے لئے بیٹھنے اٹھنے کی جگہ کھانے پینے کا سامان کیسا ہوتا ہے۔"

"اچھا بی۔ تم تو ہر وقت بحث پر تیار رہتی ہو۔ لیکن اب تم باہر کا خیال نہ کرنا۔ وہاں کی دیکھ بھال میں کر لوں گا۔"

"یہ کیوں؟ اب رہا ہی کیا ہے؟ بس یہ سامان لگوایا اور باہر آئی۔ دیکھو خبردار، جو تم نے کسی نوکر کو ہاتھ لگانے دیا۔ آج اپنی بیوی کا بھی تو سلیقہ دیکھ لو۔"

منصف صاحب عجب شش و پنج میں پڑ گئے۔ صبح کو تحصیلدار اور تحصیلدارنی آنے والی تھیں۔ ڈر تھا کہ اگر زیادہ حجت کرتے ہیں تو ضد میں بیوی کچھ اور رنگ نہ لائے۔ منہ بنا کر چپ ہو گئے اور بات ٹالنے کے طور پر کہنے لگے۔ "آج خلاف معمول بھوک معلوم ہوتی ہے۔ کھانا تیار ہو تو آؤ پہلے کھا لیں۔"

"اے لو میں تو سامان کی دیکھ بھال میں رہی کھانا کس نے پکوایا ہوگا؟ اماں تمہارا نوکری کرنے کو جی نہیں چاہتا ہے تو نہ کرو۔ ایک ذرا سا نیا کام نکل آیا کہ ہنڈیا ڈوئی کو ہی استعفا دے دیا۔ میاں کھانا مانگ رہے ہیں اب کیا تمہاری بوٹیاں کاٹ کر دوں؟ غضب خدا کا جس کے ہاں چار چار مشٹنڈیاں نوکر ہوں وہ جب تک خود چولھے میں نہ جھونکے روٹی میسر نہ آئے۔ ارے یہ باورچی خانے میں کون ہے؟ کس کے پیٹ میں آگ لگی؟ مغلانی ہیں اب بغیر میرے پوچھے جو جی چاہتا ہے کرنے لگتی ہیں۔ گھر کی بیگم ہی کیوں نہیں بن جاتیں؟"

منصف صاحب نے کہا "بی پھر حرج کیا ہوا؟ آخر وہ نوکر کس بات کی ہے؟ اس نے دیکھا بیگم صاحبہ ادھر مصروف ہیں، پکانے والی کو خدا جانے کب فرصت ملے، آخر بیچاری خود چولہا جھونکنے بیٹھ گئی۔"

"مجھ کو نوکروں کی ایسی طرفداری اچھی نہیں لگتی۔ وہ ہوتی کون تھی بنا میری اجازت کے کچھ کرنے والی؟"

"بیگم! یہ تو کوئی خفا ہونے کی بات ہے نہیں۔ ایسی ہٹ دھرمی بھی کس کام کی؟ اگر وہ کھانا نہ پکاتی تو انصاف سے کہو رات کو کیا کھایا جاتا۔"

"اچھن میاں، ذرا دیکھنا تو مغلانی کیا پکا رہی ہے؟"

"انڈے تلے ہیں اور پراٹھے پکائے ہیں۔"

"بس، ہاں مفت دل بے رحم۔ ڈلیا بھری ہوئی انڈوں کی اور آدھا کنستر گھی کا آپ کی سگھڑ نے ختم کر دیا ہوگا۔"

"پھر کیا ہوا؟ آج گھر والوں کی دعوت سہی۔ خوب پراٹھے اور انڈے اڑاؤ۔"

"کھاؤ گے تو مزہ آئے گا۔ ہمارے ہاں کی اصل مغلانیوں کو دیکھتے تو آنکھیں کھلتیں۔ اس غریب کو تو نہ سینا آتا ہے نہ ٹانکنا۔ ایک ایک ٹانکے پر ٹوکتی رہتی ہوں۔ پکانا رندھنا وہ کیا جانے۔ جیسے نمک مرچ کی اٹکل نہ ہو۔ پراٹھے پکائے گی۔ انڈے تلے گی۔"

بیگم صاحب اپنی شیخی بگھارتی رہیں اور منصف صاحب نے حکم دیا اور تو کہیں بیٹھنے کو جگہ نہیں، باورچی خانے ہی میں میز لگا دی جائے۔ چنانچہ وہیں کھانا کھایا۔ جب تک کھانا ختم نہیں ہوا، مغلانی پر آفت تھی، پراٹھوں میں نقص نکالے، انڈوں کے تلنے کی ترکیب غلط بتائی۔ اور کہا "تم نے تو میرے ہاتھ کے کھانے کئی دفعہ کھائے ہیں۔ بھول گئے؟ آج تک زبان چٹخارے لیتی ہوگی مگر تم تو جلانے والے ٹھہرے۔ منہ سے کب کہو گے، کل پھر کھا لینا۔ اللہ چاہے تو ایسی چیزیں کھلاؤں کہ عمر بھر یاد کرو۔ تحصیلدار کی تو سات پشتوں میں بھی وہ کھانے نہ کھائے ہوں گے جن کا نام کھانا ہے۔" کھانا کھا کر چلنے لگے تو فرمایا "اب تم چھوٹے کمرے میں بیٹھنا میں دو ایک پان کھا لوں تو آتی ہوں۔"

"اور کیا یہ گھر کی چیزیں یونہی تتر بتر رہیں گی؟ باہر آنے کی آپ تکلیف نہ کریں۔ وہاں کی میں دیکھ لوں گا۔ آپ ذرا اس کاٹھ کباڑ کو ٹھکانے سے لگانے کی کوشش کیجئے۔"

"میرا تو کتے کا مغز نہیں ہے کہ تمہارے ساتھ بھونکتے جاؤں۔ ایک دفعہ کہہ دیا، لاکھ دفعہ کہہ دیا اس معاملہ میں تم دخل نہ دو۔"

تھوڑی دیر تک بیگم صاحبہ نے اوپر تلے کئی پان کھائے، خوب پیکیں تھوکیں۔ اتنے میں نوکریں چاکریں بھی کھانے والے سے نچنت ہو گئیں۔ چھوٹے کمرے سے کہا "جا میاں سے کہہ دے بیگم صاحبہ آ رہی ہیں۔ آپ چھوٹے کمرے میں تشریف لے جائیں۔" ساتھ ہی ماماؤں کو حکم دیا "لو! دیکھو، شاباش۔ اب تو تن تازہ ہو گیا ہے۔ ذرا پھرتی سے سب چیزوں کو سنگوالو۔ کہنے کو میاں منصف ہیں لیکن نوکر سارے بدتمیز۔ میرے آنے تک ان چیزوں کو جھاڑ پونچھ تو ڈالو۔ پھر میں چٹکی بجاتے سب کا ٹھکانا نہ کر دوں گی۔ مردانے کے دونوں کمرے بیگم صاحبہ کے

دیکھے ہوئے تھے مگر جب سے میاں کو منصفی ملی تھی انہیں اس میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اب جو چلمن اٹھا کر اندر قدم رکھا تو طاقوں پر کتابیں، الماریوں میں کاغذوں کے مٹھے کے مٹھے ہی نظر آئے۔ میز پر نگاہ پڑی تو کونے کونے کاغذوں کا ڈھیر۔ ایک بڑے گھنٹے اور دو چار انگریزی تصویروں کے علاوہ آرائش سے بالکل خالی، میز اور کرسیوں کے نیچے چھوٹے چھوٹے قالین بچھے ہوئے۔ "لو صاحب اس کمرہ کو کہتے تھے کہ ٹھیک ہے۔ اور ان مردوں کی متیں ہی اوندھی ہیں۔ یہ دروازے پر پردہ کیوں ڈال رکھا ہے؟ کیا یہاں عورتیں بیٹھتی ہیں؟ واہ واہ! پاٹ بھی دونوں الگ۔ جوڑنا بھی نصیب نہیں ہوا۔ خدا کے دیئے اگالدان، سلفچیاں سب ہی گھر میں موجود ہیں۔ پھر یہ نگوڑی ٹوکریاں کیسی رکھی ہیں؟ ان میں کوئی کیوں کر پیک تھوکتا ہوگا؟ گلاس پیالے اچھے سے اچھے آجاتے۔ پانی پینے کو میسر بھی آیا ہے تو کیسا بدصورت برتن جو نہ گلاس معلوم ہوتا ہے نہ پیالہ۔ اور موئی یہ لٹھ جلد کرسی ہے۔ اس پر وہ بیٹھتے کیوں کر ہوں گے؟ کیا کریں، انہیں تو یہی ناچتی ہوئی کرسی میراث میں ملی ہے۔ آج میں نے اس کو آگ نہ لگائی ہو تو بات کیا۔ ردی چیز پھینکنے کی تو عادت ہی نہیں، کوڑے کو سینتے چلے جاتے ہیں۔ لکھ لکھ کر کاغذوں کا ڈھیر لگا دیا ہے، نہ کارے نہ مصلے۔ کوئی پوچھے کہ یہ مکانوں کے قبالے ہیں یا نوٹ۔ مجھے تو دیکھ کر ہی خفقان ہوتا ہے۔ خیر اب میں یہاں آئی ہوں تو اس کوڑے کرکٹ کو بھی ہٹانا ہی پڑیگا۔"

بیگم صاحبہ نے اب کمرے کی ایک ایک چیز کا جائزہ لینا شروع کیا۔ دروازے کا پردہ نوچا اور ایسے بھونڈے پنے سے اس کو کھینچا کہ بریکٹ سمیت نیچے آرہا۔ قالین اٹھائے کہ "موئے کیسے ٹیڑھے ترچھے بچھے ہوئے ہیں۔" ردی کاغذوں کی ٹوکریاں اور چاروں طرف پھرتی ہوئی کرسی برآمدے میں پٹخیں۔ کوڑے کا غذ چھوڑ کر جتنی میز پر مسلیں وغیرہ تھیں سب اٹھا کر باہر ڈال دیں۔ الماری میں سے پرانی پرانی نقلیں کئی اہم دستاویزیں اور بہت سی قانونی تحریریں چھانٹ چھانٹ کر نکالیں، کہ ایک جگہ اکٹھا کر کے آگ لگا دیں تاکہ اس کوڑے سے ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے۔ لیکن اتفاق سے دیا سلائی کا بکس نہیں ملا۔ دوسرے سارے دن کی تھکی ہوئی، رات کا ایک بجنے کو آیا۔ جماہیاں اور انگڑائیاں برابر آرہی تھیں۔ ذرا کمر سیدھی کرنے کو آرام کرسی پر لیٹ گئیں۔ ٹھنڈ جو معلوم ہوئی، پردہ اوڑھ لیا۔ گرمائی پہنچی، ل دیتی کہ نیند آگئی۔ اور خدا نے بڑی خیر کی۔ ورنہ بیگم صاحبہ کی حماقت کے ساتھ منصف صاحب کی قسمت کا افسانہ بھی ختم ہو جاتا۔ خدا نیکی دے بی منولانی کو، بیگم صاحبہ کے مردانے میں آتے ہی وہ کمر باندھ کر کھڑی ہوگئی اور دو گھنٹے میں مکان کو فرش و فروش سے آراستہ کر دیا۔ صبح کو منصف صاحب نے جو کمرے کو دیکھا تو سر پکڑ لیا۔ جلدی جلدی مسلیں اور سرکاری کاغذات سمیٹ کر میز پر رکھے۔ نوکروں سے تاکید کی کہ میں اندر جاتا ہوں۔ واپس آکر ہر چیز اپنے قرینے پر دیکھوں۔ گھر میں گئے تو بیوی کو مصلے پر دیکھا، بیٹھی ہوں ہوں کر رہی ہیں۔ لیکن حیرت یہ تھی کہ مکان پوری ترتیب کے ساتھ آراستہ تھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ رات بھر میں کیا جادو ہوا۔ بیگم کے قبضے میں کوئی موکل تو نہیں جس نے یہ سارے کام کر دیئے۔ اتنے میں بیگم صاحبہ بھی مناجات سے فارغ ہو کر مسکراتی ہوئی کھڑی ہوئیں اور کہنے لگیں "دیکھتے کیا ہو، ابھی میں نے ناشتے کا سارا سامان کیا۔ وہ تو رات کو ایسی کچھ غنودگی آئی کہ کیا بتاؤں نہیں تو اندھیرے سے سب چیزیں میز پر لگی ہوئی پاتے۔ یہ نگوڑا تم نے میز پر کیا کھانا پینا نکالا ہے۔ میں تو نیچے دسترخوان بچھاؤں گی۔ دسترخوان بھی وہ بچھاؤں کہ تحصیلداری کے فرشتوں نے نہ دیکھا ہو۔"

"نہیں، عورتوں کے لئے میز کی کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت کی تو نہ کہو۔ آج کل کا فیشن ہے۔ چاہے میز کی آراستگی کراؤ۔ مگر نہیں میں تو فرش کا سلیقہ دکھانا چاہتی ہوں۔"

"تمہیں اختیار ہے، چائے ذرا اچھی بنانا۔ اور کیا کیا چیزیں ہوں گی؟"

"دو تین قسم کے انڈے، میٹھے ٹکڑے، گاجر کا حلوا، حلوا سوہن اب اور کیا کیا بتاؤں۔ میں جب کرنے بیٹھوں گی تو دسترخوان بھر دوں گی۔"

"گاجر کا حلوا اور حلوا سوہن تو بازار سے منگایا ہوگا۔ حلوا سوہن سب طرح کا ہونا چاہیئے۔"

"پھر تم نے میرے چڑانے کی باتیں کیں۔ بازار سے کیوں منگاتی؟ کیا مجھے یہ چیزیں بنانی نہیں آتیں؟"

"بے فائدہ اتنا جھگڑا مول لیتی ہو۔ بازار میں اچھے سے اچھا ملتا ہے۔"

"صدقے کئے تھے موئے بازار کے حلوے گندے آخور۔" اچھا تو میں باہر جاتا ہوں۔ شاید نو بجے تک مہمان آجائیں۔ اب

"تم تیاری کرو۔"

منصف صاحب کا باہر جانا تھا کہ بیگم صاحب نے پکارنا شروع کیا "امانی! ارے کہاں مر گئی؟ اوئی بہن! بدذات چائے کے برتن بھی نکال چھوڑ دو لڑکے جا دیکھیو، کلن خاں ابھی تک دودھ نہیں لایا۔ اچھا لو!! تم میرا منہ تکنے لگیں۔ تمہاری خطا نہیں، میرا ماتھا ہی ایسا ہے۔ تم اور تمہارا نوکر نکھٹو ری ہو۔ کام کی نہ کاج کی دشمن اناج کی۔ شاباش ہے تمہارے گھر والوں کو! خیر کوئی کام نہ کرو قسم ہے تم کو اب اگر تم نے کسی کام کو ہاتھ لگایا۔ میں خود سارے کام کر لوں گی۔ تم سے پیچھا تو چھوٹ جائے گا" یہ کہتی ہوئی بیگم باورچی خانے میں پہنچیں۔ چولھے پر گرم پانی کی گھڑیا رکھی تھی۔ چمٹے سے جو اتارنے لگیں تو سارا پانی اوندھ گیا۔ آگ بجھ کر رہ گئی "بدذاتوں کی شرارت دیکھی، گھڑیا کو ایسا رکھا کہ ہاتھ لگتے ہی نیچے آ رہی"۔ چولھے کا پانی سونت کر پھر آگ جلانی چاہی، لکڑیاں بھیگ گئی تھیں، جلتیں کیوں کر۔ دوسری لکڑیاں رکھیں۔ روٹی کی ٹوکری توڑ مروڑ کر رکھ دی۔ دیا سلائی کا پورا بکس پھونک دیا۔ آخر خدا خدا کر کے آگ سلگی۔ "ارے مردار! نعمت خانے میں سے ڈبل روٹیاں تو نکال دے موا آنکھوں کا اندھا کیسی بری لایا ہے۔ چھری تو دے"۔ بسم اللہ کر کے جو چھری پھیرتی ہیں تو انگلی پر چرکا بیٹھا۔ دھل دھل خون جانے لگا۔ ساری روٹی لال ہو گئی۔ "اُف! اللہ تو غارت ہی نہ ہو۔ ارے نامراد چھری کے بدلے میاں کا استرا اٹھا لایا ہے ستے! کیسے بے درد لوگ ہیں، اتنا نہیں ہوتا کہ کوئی دھجی ہی جلا کر باندھ دیں۔ لڑکی شاباش! ایسا بھی خون سفید کیا۔ پان چبا کر تو لا"۔ پان چبا کر انگلی پر باندھا گیا گھاؤ گہرا تھا اور اتفاق سے سارے کی ساری کو پچکا کر باندھا تھا، مرچیں جو لگیں تو بیگم صاحبہ کے رہے سہے حواس بھی جاتے رہے۔

"ارے اب بھی کسی کو ترس آئے گا یا نہیں؟ کم بختو! انہیں کچھ نہیں آتا بلا سے نہ آئے۔ جیسا میں کہوں ویسا تو کرتی جاؤ۔ میرا ہاتھ تو اب بند ہو گیا۔ دیکھو چائے کا پانی کھول گیا۔ خوب کھد رہا ہے۔ چائے کا ڈبہ اور چائے دانی میرے پاس لا۔ توبہ! ایسے پاگلوں سے واسطہ پڑے۔ ارے دوسری بھی تو لا"

"بیگم صاحبہ چائے کا ڈبہ کہاں ہے؟"

"میری گود میں یا میاں کی جیب میں۔ موئی دیدے پھٹم، چائے کا ڈبہ بھی نہیں ملتا"

"بیگم خدا کی قسم! مجھے تو نہیں ملتا"

"اگر نہیں لے آئی تو بتا تیرا کیا علاج؟ دیکھو یہ کیا ہے؟ کس نے سگھڑاپا دکھانے کو میری الماری میں رکھ دیا تھا"

مغلانی جو بیٹھی بیٹھی دل میں کڑھ رہی تھیں بولیں "بیگم صاحب! یہ چائے کا ڈبہ نہیں ہے، اس میں تو لکھنؤ سے آیا ہوا پتی کا تمباکو ہے" بیگم صاحب آئیں تو جائیں کہاں۔ ان کی حماقت کے شیشے کو ٹھیس لگی اور وہ خاموش رہیں۔ بیچاری مغلانی کے لتے لے ڈالے۔ "لو اس بڑ بولی کی باتیں دیکھو۔ مجھے اندھا بناتی ہے، میں تو پتہ جانتی ہی نہیں۔ نئی چھوکری ہوں! میں نے نہ کبھی چائے دیکھی ہے نہ زردہ کھایا ہے۔ میاں کہیں جنگل سے پکڑ لائے ہیں۔ ان کے ابا تو لکھنؤ میں زردہ بنایا کرتے تھے۔ پہچان تو ان کو ہے۔ آئیں کہیں سے مغلانی بن کر"

مغلانی غریب کو آج یہ نئی صلواتیں نہیں سنائی گئی تھیں۔ چوتھے پانچویں دن ضرور اس پر زبان صاف ہوتی رہتی تھی مگر وہ بھی کچھ ایسے ٹھنڈے خمیر اور شریف مٹی کی بنی ہوئی تھی کہ خدا کی بندی نے بے ایمان کر کبھی جواب نہیں دیا۔ بلکہ ان کی ہر بیوقوفی چھپاتی رہتی۔ میاں سے کبھی شکایت نہیں کی، اپنے کام سے کام رکھا۔ غرضیکہ بیگم صاحب نے چٹکے بھر بھر کے تمباکو چائے دانیوں میں ڈالا اور چائے پتیاں چڑھا دیں۔ "لو چائے سے تو فرصت ملی۔ اب لاؤ انڈے دو۔ اچھا پہلے نان پاؤ دودھ میں پکا لوں۔ پھر شیرے میں ڈال کر تلے جائیں گے۔ اماں جان تو اسی ترکیب سے پکاتی تھیں۔ نانی اماں نے دوسری ترکیب سکھائی تھی۔ نگوڑی انگلی کو بھی آج ہی کٹنا تھا۔ ٹیسوں کے مارے جی بے چین ہوا جاتا ہے"

یہاں ابھی صرف چائے بنی تھی۔ وہ بھی لکھنؤ کے خوشبودار تمباکو کا جوشاندہ۔ نہ انڈوں کے اقسام تیار ہوئے تھے نہ گاجر کی تری۔ اور حلوا سوہن کا کھان چڑھایا کہ نو بج گئے۔ باہر سے اطلاع آئی کہ تحصیلدار صاحب تو آ گئے ہیں۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر زنانی سواریاں بھی آ جائیں گی۔

"لو صاحب وہ تو جیسے ادھار ہی کھائے بیٹھی تھیں۔ اور مردوں کو دیکھو کچہری کا چپراسی بن کر ان سے بھی پہلے آ دھمکے۔ رات سے ہی نہ آ گئے۔ کوئی ایسے ویسے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا چلو آج سارا ٹبر منصف صاحب کے ہاں تھپیا دے۔ ایسی بھی کیا کھانے کی

آپ نے سنا ہوگا کہ منصف صاحب کی بیوی پرانے خاندان کی خوب کھانے کھلانے والی ہیں، بس پھر کیا تھا۔ اندھیرے سے آموجود ہوئے۔ عجب نہیں کہ کل سے بھوکے ہوں۔ لو سچے ہیں! پھر کیا ہوا! لو اگر سورج نکلنے سے پہلے ہی پہنچ جائیں۔ ان کو اتنا تو سمجھنا چاہیئے۔ پرائے گھر جانا ہے، جاڑے کے دن ہیں، دعوت کا سامان ہوتے ہی ہوتے ہوگا۔ اب بھلا بتاؤ میں کیا کروں؟ میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ مغلانی، اے بی مغلانی، کہاں ہو؟ کبھی تو کوئی کام کر دیا کرو۔ چا میں نے تیار کر دی ہے، دودھ ابل رہا ہے، رہ کیا گیا؟ مجھے کپڑے بدلنے دو۔"

یہ کہتی ہوئی بیگم صاحب تو غسلخانے میں گھس گئیں۔ مغلانی نے آ کر سارا کام سمیٹا اور بڑے اطمینان کے ساتھ کشتیوں میں ناشتہ لگا خوان پوش ڈھانک رکھ دیا۔ مہمان آئے تو بیگم صاحب ندارد! ایک ماما غسلخانے کے پاس جا کر کہتی ہے "بیگم صاحب مہمان اکیلے بیٹھے ہیں" دوسری جاتی ہے "بیگم صاحب مہمان یاد کر رہے ہیں" بیگم صاحب ہیں کہ ان کا نہانا ہی ختم نہیں ہو چکتا۔ آخر مغلانی آئیں۔ "بیگم صاحب آنیوالی بیویاں بیٹھے بیٹھے اکتا گئیں۔ وہ تو آپ سے ملنے آئی ہیں۔ ایسا بھی کیا ہے۔ بس نکل آیئے۔" بیگم صاحب جھلا کر بولیں "جدا ہی وہ کہیں بازار میں بیٹھی ہیں۔ آپ تو بن ٹھن کر آ گئیں اور منصف صاحب کی بیوی یونہی فقیرنی بنی رہے۔ توبہ بوا! میں ایسے میل جول سے باز آئی کھلی مل چکی ہوں، بدن سارے بنڈے پر بھرا ہوا ہے، آؤں گی۔ کہہ دو ذرا چھری کے نیچے ہیں۔"

بڑی منت خوشامد کے بعد بیگم صاحب غسلخانے سے نکلیں تو عجب شان سے۔ گلے میں الٹا جمپر، ساڑھی ایک طرف سے نیچی ایک طرف سے اونچی، گردن اور کان میں صابن کے دھبے، جلدی میں آڑی مانگ نکال تو لی لیکن سیدھی جانب وہ بھی لہراتی ہوئی۔ گھبراہٹ میں ذرا تیزی سے قدم اٹھائے تو پاؤں سے ایک سلیپر نکل گیا۔ "نجمن! تیرا ستیا ناس ہو! یہ کون سا سلیپر دے دیا؟ اری ولایت سے جو منصف صاحب نے منگایا ہے وہ کیا اپنی کسی ہوتی سوتی کے لئے رکھا ہے؟" مہمان حیران کہ منصف صاحب کی بیوی اور یہ زبان! دو نوجوان بیویاں مسکرائیں بھی لیکن تحصیلدارنی نے اشارے سے منع کیا اور بیگم سے مخاطب ہو کر بولیں "بہن آپ کا پائچہ تو ماشاءاللہ بہت بھاری ہے!"

"ہاں بوا! کیا بتاؤں، ایک نادار سو بیمار، ایک میں اکیلی اور سارے گھر کا دھندا۔ آپ کو انتظار کی تکلیف تو ضرور ہوئی ہوگی مگر میں کیا کرتی؟ کسی کے واسطے اپنا نہانا دھونا تو نہیں چھوڑ دیتی؟ ان مغلانی بوا کا تو یہ ہے۔ صبح آ دیکھ رہی ہو کہ میرا ہاتھ کالا سب ننگا ہے کبھی تو اپنی تنگ حالی دکھائی ہوتی۔ خدا کا دیا اتنا زیور ہے۔ میں نے صرف ایک ہیرے کے بندے میرا منہ دیکھ لو، ذرا کر لے آؤ۔" تحصیلدار کی بیوی مسکرا کر بولیں "بہن تمہاری تو سادگی ہی لاکھ بناؤ ہیں۔ یہ پیاری صورت ایمان کی پوچھو تو یونہی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ تمہیں میری جان کی قسم گہنا نہ پہننا کسی نے خوب کہا ہے ؎

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی
کہ دیکھو خوشنما لگتا ہے کیسا چاند بے گہنے"

"یہی شعر منصف صاحب بھی پڑھا کرتے ہیں اور اسی لئے مجھے بھی گہنے سے کچھ نفرت سی ہو گئی ہے۔ امانی، امانی! نگوڑی ناشتہ لا۔ ادھر ادھر کیا مکان کے جالے لیتی پھرتی ہے۔ دسترخوان بچھا، اور چائے پر سفید چھینٹ اکھڑے سے اٹھا لائی؟ وہ اطلس کا پلنگ پوش کہاں ہے جس پر گوٹ لگی ہوئی ہے، مغلانی سے پوچھ۔"

"بہن ناشتہ کی تکلیف نہ کیجئے، ہم تو ناشتہ کر کے آئے ہیں۔ صرف آپ سے نیاز حاصل کرنا تھا۔ خدا جانتا ہے آپ سے مل کر بہت جی خوش ہوا۔ ایسی خاندانی اور سلیقہ کی بیویاں اب کہاں؟"

"ناشتہ تو کرنا ہوگا۔ میرے ہاں سے تو کوئی فقیر بھی خالی نہیں جاتا۔ مغلانی منہ کیا دیکھ رہی ہو! اچھا بہن بس نخرے نہیں کرتی، کھاؤ نہیں ذرا سا چکھ ہی لو۔ دیکھئے بہن تو کچھ حرج نہیں۔ میں نے ہر چیز اپنے ہاتھ سے تیار کی ہے۔ یہ مامائیں تو دیکھنے ہی دیکھنے کی ہیں اور یہ مغلانی بالکل ہی کاٹھ کا الو۔"

"ہاں بہن کیوں نہیں۔ آپ بڑے گھر کی بیٹی ہیں۔ ریچھ کے سے، میں تو کہتی ہوں کہ منصف صاحب کے بھاگ کھل گئے۔"

"اے وہ منصف ہے کس کے صدقے میں ہیں؟"

"ماشاءاللہ، تو پھر بہن رخصت دیجئے۔ دل نہیں چاہتا ہے کہ آپ کی صورت دیکھا کروں لیکن گھر یونہی چھوڑ کر چلی آئی تھی۔ زندگی ہے تو پھر حاضر ہوں گی۔ آپ بھی کبھی ہمارے ہاں آیئے۔"

"میں کیوں نہ آؤں گی؟ آپ بلائیں اور میں نہ آؤں؟"

مہمانوں کے رخصت ہوتے ہی منصف صاحب اندر آئے۔ "کہو بی کیسی نبھی؟ باہر تو کسی نے ناشتہ وغیرہ کیا نہیں۔ تحصیلدار صاحب کو

زبردستی ایک پیالی پلائی۔ ان کی بیوی سے ملیں جنہیں بھی تو ساتھ تھیں۔ سنا ہے بڑی فیشن ایبل تعلیم یافتہ عورتیں ہیں۔" خاک! ویسے تو خیر کوئی برائی نہیں۔ صورتیں بھی نہ بہت اچھی ہیں نہ کڑکھائی، پوڈر اپنا ڈسنگار کر کے آئی تھیں مگر مجھے تو ذرا پہ ذالی سی نظر آئیں۔ میری ایک ایک چیز کو دیکھ کر تحصیلدارنی کے تو دیدے پھٹے جاتے تھے، مارے تو ریف کے منہ خشک ہوا جاتا تھا، ندیدوں کی طرح سے مجھے برابر گھورے جاتی تھیں۔"

"کچھ کھلایا پلایا بھی؟"

"وہ بیچاری چھوٹے گھر کی عورتیں ہمارے دسترخوان پر کیا منہ لے کر بیٹھتیں؟ میں نے جو ناشتہ چنوایا، ان کے ہوش اڑ گئے۔ ڈر گئیں کہ کہیں بھرم نہ کھل جائے۔ اس لئے انہوں نے کھا کر آنے کو بہانہ کر دیا۔ بھلا کسی کے ہاں آتے ہیں تو کھا کر آتے ہیں۔ بات بنا دی۔"

"بیگم آج تو تم نے کمال کر دیا۔ اور تو میں نے کوئی چیز لھائی نہیں صرف گاجر کی تری چکھی تھی۔ میں تو جانتا ہوں کہ حبش خاں کے ہاں سے منگائی ہوگی۔ بڑی ہی نفیس اور لذیذ تھی۔"

"پھر تم نے میرے جلانے کی باتیں کیں۔ گویا میں کچھ جانتی ہی نہیں۔ بازار سے بازاری عورتیں منگایا کرتی ہیں۔ میرے نانا جان ایسی چیزوں کے استاد تھے۔ سارے شہر میں ان کی دھوم تھی، بڑے بڑے امیر رئیس ان سے فرمائشیں کر کے کھانے پکواتے تھے۔ انہوں نے اپنی ساری املاک چولہے میں جھونک دی۔ ان کا سا دسترخوان کسی کا ہو تو لے۔ نذیری میں امیری کر گئے۔"

"میرا مطلب یہ ہے کہ اگر تمہاری رائے ہو تو سب چیزوں میں سے تھوڑا تھوڑا صاحب کی میم کو بھیج دوں۔ وہ بھی تو سمجھیں کہ یہاں کی بیگمات کیا کھاتی ہیں۔"

"ایسا غضب بھی نہ کرنا۔ تم تو سرخ رو ہو جاؤ گے اور مجھ پر عذاب آ جائے گا۔"

"یہ کیوں کر؟"

"یہ اس طرح کہ پھر ان کی رات دن فرمائشیں ہوں گی اور میں بس اسی کی ہو رہی۔ ایک آج ہی کی تو ائی میں میری انگلی کٹ گئی۔ الغاروں خون نکل گیا۔"

"افوہ! انگلی کٹ گئی۔ بیگم بی تم بھی بڑی وہ ہو۔ ڈاکٹر کو کیوں نہ بلا لیا؟ کچھ زیادہ گہرا تو زخم نہیں۔"

"تمہارے تو ٹھنڈک پڑ گئی۔ تمہارا کام تو ہو گیا۔ انگلی کٹی یا ہاتھ کٹ جاتا۔ تمہاری آبرو پر تو کوئی حرف نہ آنے دیا۔"

منصف صاحب واقعات سے بے خبر کہ کیا ہوا کیوں کر ہوا اور کس نے کیا۔ خوش خوش بیگم کی شیخیوں سے متاثر باہر چلے گئے۔ اور مدتوں اس مغالطے میں رہے کہ جیسا میں لائق منصف ہوں ایسی ہی گھر کے معاملات میں میری بیوی قابل ہے۔

آئین سٹائن

رضی الدین صدیقی

آئین سٹائین ایک نہایت مذہبی شخص ہے۔ ان معنوں میں نہیں کہ وہ بہت عبادت گذار اور مذہب کے ظاہری شعائر کا پابند ہے بلکہ ان عمیق معنوں میں کہ وہ اس ذات کبریائی کا قائل ہے جسے انائے مطلق کہتے ہیں اور ایک ایسے نفسِ کل کا جو تمام کائنات کا مسبب الاسباب ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں جو کام سرانجام دیا ہے اس سے بڑی حد تک یہی بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ ۱۹ ویں صدی کے ملحدانہ اور مادی عقائد جو نیوٹن کے کلاسیکی نظریوں پر مبنی تھے اب قابلِ اعتبار نہیں رہے بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ آئین سٹائن ہی تھا جس نے بے دینی کی بے پناہ یلغار کو روک دیا اور مادیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو پیچھے ہٹا دیا۔

قبل اس کے کہ ہم آئین سٹائن کے اس نظریہ کا بسیط جائزہ لیں جس نے سرے سے کائنات کا تصور ہی بدل ڈالا، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کی زندگی کا ایک سرسری خاکہ پیش کر دیا جائے جو بلاشبہ ہمارے عہد کا سب سے بڑا سائنسدان اور نہایت محترم اور ہر دلعزیز انسان ہے۔

آئین شٹائن ۱۸۷۹ء میں جنوبی جرمنی کی ریاست بویریا کے پایۂ تخت میں پیدا ہوا۔ وہ دیکھنے میں بڑا سنجیدہ معلوم ہوتا تھا لیکن کچھ ایسا ذہین نہ تھا اور اس میں غیر معمولی قابلیت کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ وہ سوئٹزرلینڈ کے شہر زیورچ کے دفتر اندراج ایجادات میں ملازم ہو گیا اور وہیں اس کو جدید طبعیات سے لگاؤ پیدا ہوا۔ ۱۹۰۵ء میں جب وہ ۲۶ سال کا تھا اس نے نظریۂ کوانٹم اور نظریۂ اضافیت میں عہد آفریں اضافے کئے۔ اس نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی جس کی بنا پر وہ پراگ یونیورسٹی میں پروفیسری کے عہدہ پر فائز ہوا لیکن وہ زیادہ دیر وہاں نہیں رہا۔ اس کی شہرت اتنی تیزی سے پھیلی کہ اسے برلن آنے کی دعوت دی گئی اور یونیورسٹی میں سینیئر پروفیسر ہونے کے علاوہ پرشا کی اکاڈیمی آف سائنسیز کا رکن مقرر ہوا، جو جرمنی میں کسی سائنسداں کے لئے سب سے بڑا اعزاز خیال کیا جاتا تھا۔ آئین شٹائن نے برلن میں ۲۰ سال زندگی بسر کی اور اپنے کام میں منہمک رہا۔ پھر جب نازیوں کو عروج حاصل ہوا تو وہ ۱۹۳۳ء میں ترک وطن کر کے امریکہ چلا گیا۔ کوئی پندرہ سال تک وہ پرنسٹن کی "انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ سٹڈی" کا ڈائرکٹر رہا اور ایٹم بم کے موجد ڈاکٹر رابرٹ اوپن ہیمر کے حق میں اس عہدہ سے سبکدوش ہوا۔ اس کے بعد وہ آخری وقت تک ایک عام پروفیسر کی حیثیت سے زندگی بسر کرتا رہا۔ یہاں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے زمانہ میں آئین سٹائن نے پریذیڈنٹ روزویلٹ کی توجہ ایٹم بم کے ایجاد ہو سکنے کی طرف منعطف کی اور اسی سے وہ تمام سلسلہ شروع ہوا جو بالآخر اس خیال کے موجد کے لئے بھی سوہانِ روح ثابت ہوا۔ لیکن آئین سٹائن نے ایٹم بم کے ایجاد ہونے کے امکان پر اس لئے زور دیا کہ وہ جانتا تھا کہ جرمن بڑے زور شور سے اس سلسلہ میں تجربے کر رہے ہیں اور وہ ڈرتا تھا کہ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تو تمام دنیا کو اپنا غلام بنا لیں گے۔ آئین سٹائن ایٹمی ہتھیاروں بلکہ جنگ وجدل کا سخت دشمن تھا اور فوجوں اور فوجی روح سے نفرت کرتا تھا، وہ اس شخص کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا جو بینڈ کی گت پر دستے بنا کر چلنے میں بڑی لذت محسوس کرتا ہو۔

آئین سٹائن نے بار بار اپنے آپ سے زندگی کے معنی پوچھے ہیں اور وہ کہتا ہے کہ اس سوال کا جواب دینا ہی مذہبی شعور رکھ

آئینہ دار ہے۔ جو شخص اپنی اور اپنے ہم جنسوں کی زندگی کو بے معنی خیال کرتا ہے اس کی نظروں میں نہ صرف بدبخت ہے بلکہ زندگی بسر کرنے کے لائق ہی نہیں۔ اس کا عقیدہ ہے کہ ہر انسان نہ صرف بیرونی جبر کے تحت کام کرتا ہے بلکہ ایک اندرونی تقاضے کے مطابق بھی عمل کرتا ہے۔

شوپنہار کا یہ قول کہ "انسان جیسا چاہے کر سکتا ہے لیکن من مانی نہیں کر سکتا" ایام جوانی ہی سے اس کے لئے ایک الہامی اثر کا حامل رہا۔ اس نے کبھی راحت و آرام کو مقصود بالذات نہیں سمجھا۔ وہ تصورات جنہوں نے اس کو راہ حیات میں روشنی بخشی ہے اور اسے زندگی کا بڑی خندہ پیشانی سے سامنا کرنے کی ہمت دلائی ہے وہ حق، نیکی اور حسن ہیں۔ وہ یہ صحیح خیال کرتا ہے کہ وہی لوگ انسانوں کو زیادہ محبوب ہونے چاہئیں جنہوں نے انسانی نسل اور زندگی کے ارتقاء میں سب سے زیادہ حصہ لیا ہے۔ وہ بڑی سنجیدگی سے خیال کرتا ہے کہ اگر کوئی شخص دوسرے انسانوں کو اعلیٰ کام دے کر انہیں بلندی کی طرف مائل کرتا ہے تو وہ ان کی بہترین خدمت سرانجام دیتا ہے۔ آئین سٹائن یہودی ہونے سے شرمندہ نہیں بلکہ جب جرمنی میں ان پر جبر و تشدد کا دور دورہ ہوا تو اس نے ان کی بڑی شدّومد سے حمایت کی۔ اگرچہ ایسی سرگرمیوں سے اسے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اپنی شدید مصروفیتوں کے باوجود وہ فلسطین کی یہودی یونیورسٹی میں پہنچا اور مختلف موضوعات پر لیکچر دئے۔

اب میں سرسری طور پر یہ بیان کروں گا کہ آئین سٹائن نے کس طرح پہلے عظیم سائنسدانوں اور پھر ان کے ذریعے عام انسانوں میں مذہبی روح کے زندہ کرنے میں مدد دی ہے۔ اس کے لئے ہمیں تھوڑی دیر نیوٹن کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جس کے افکار نے نظری و عملی سائنس پر بیحد اثر ڈالا ہے۔ اس کے میکانیات کا لازمی و فوری نتیجہ جبر تھا جس نے مذہبی، فلسفیانہ اور معاشری افکار پر گہرا اثر ڈالا۔ اس میکانیات میں یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ مادہ اور قوت ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ اور اگر اس نظام کی موجودہ صورت معلوم ہو تو اس کی سابقہ و آئندہ تمام حالتیں پوری طرح متعین کی جا سکتی ہیں اس سے مادی فلسفہ کا آغاز ہوا اور اٹھارویں اور انیسویں صدی میں الحاد تیزی سے پھیل گیا۔ ملحدین اور مادیین کا سب سے بڑا دعوی یہ تھا کہ معلول اور علت میں ربط و تعلق لازمی ہے اس لئے یہ دنیائے آب و گل جو مادی ہے اس خدا کی تخلیق نہیں ہو سکتی جسے غیر مادی خیال کیا جاتا ہے

لیکن آئین سٹائن نے اس استدلال کو پارہ پارہ کر دیا محض فلسفیانہ دلائل سے نہیں بلکہ حقیقی مشاہدات اور ریاضیاتی استنتاج سے۔ اس نے نیوٹن کے اس بنیادی نظریہ کی تردید کی کہ مادّہ اور قوت دو علیحدہ چیزیں ہیں اور اپنے نظریۂ اضافیت کی مدد سے واضح کیا کہ یہ دونوں ایک ہی چیز دو رخ ہیں جس طرح برف اور بھاپ ایک ہی عنصر کی دو شکلیں ہیں۔ اس نے ایک فارمولا ثابت کیا جس سے مادّہ کی کمیت اور قوت کی مقدار میں تناسب ظاہر ہوتا ہے۔ جبکہ انہیں ایک دوسرے میں منتقل کیا جائے۔ آئین سٹائن کے اس دعوے کو تجربہ گاہوں میں پرکھا اور ثابت کیا گیا اور اس کے درست ہونے میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔

اب اگر آپ مادیین کے اس دعوے کو پیش نظر رکھیں کہ ایک غیر مادی خدا مادی کائنات کا خالق نہیں ہو سکتا تو آپ صاف طور پر محسوس کریں گے کہ مادیین کا استدلال اپنا وزن کھو چکا ہے۔ اگر خدا زمینوں اور آسمانوں کا نور ہے جیسا کہ قرآن مجید میں کہا گیا ہے تو چونکہ نور قوت ہے اور قوت مادّہ کی ایک شکل ہے تو خدا بلا شبہ اس کائنات کو تخلیق کر سکتا تھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آئین سٹائن کے نظریہ نے خدا کا وجود ثابت کر دیا ہے مگر میں اتنا ضرور کہوں گا کہ نفی ذات باری کے سلسلہ میں منکرین حق کا جو زیادہ وزن دار استدلال تھا اس کی ضرور تردید ہو گئی ہے۔ اس طرح مذہبی احیا کی راہ میں جو سب سے بڑی رکاوٹ تھی وہ دور ہو گئی ہے۔ اب انسانوں کے لئے راستہ صاف ہو گیا ہے کہ وہ ایک نفس کل کی موجودگی کے لزوم کی طرف مائل ہوں، جو تمام واقعات دہر کا محرک اولیٰ ہے۔

آئین سٹائن کا تصور مذہب عام انسانوں کے سیدھے سادے تصور سے بہت مختلف ہے۔ چونکہ بہت قدیم اور غیر ترقی یافتہ قومیں ایسے عقائد کی حامل ہیں جن کی بنیاد خوف پر ہے — وحشی جانوروں، بیماری اور موت کا خوف۔ عناصر کی طاقت اور قدرتی قوتیں ان پر اس بری طرح چھا جاتی ہیں کہ وہ ان طاغوتی قوتوں کو راضی کرنے کیلئے ان کی پرستش کرتی ہیں۔

مذہب کے وجود میں آنے کا ایک اور باعث ہدایت، محبت اور مدد حاصل کرنے کا جذبہ ہے۔ جو انسانوں کو خدا کا معاشری یا اخلاقی تصور قائم کرنے کی ترغیب دلاتا ہے۔ یہ تمام عقائد تجسیمی ہیں۔ صرف غیر معمولی

صلاحیتیں رکھنے والے افراد اور بالغ نظر قومیں ہیں جو اس سطح سے فی الحقیقت بلند ہو جاتی ہیں لیکن مذہبی احساس کی ایک اور صورت ہے جو ان سب میں مشترک ہے اور جسے کائناتی مذہبی احساس قرار دیا جا سکتا ہے۔ آئین شٹائن اس کا قائل ہے۔ وہ انسانی خواہشات اور مقاصد کی پستی کو محسوس کرتا ہے۔ اور اس عظمت اور حیرت انگیز نظام کی بلندی کو جو دنیائے فطرت و خیال میں آشکار ہوتا ہے، وہ انفرادی زندگی کو ایک قسم کا زنداں خیال کرتے ہوئے کائنات کا بحیثیت ایک واحد پُر معنی کل کے احاطہ کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رائے میں آرٹ اور سائنس کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ وہ کائناتی مذہبی احساس کو بیدار کرے اور اسے ان لوگوں کے سینوں میں زندہ رکھے جو اس کی صلاحیت رکھتے ہیں دوسری طرف اس کا دعویٰ ہے کہ کائناتی مذہبی احساس سائنسی تحقیقات کا قوی ترین اور اعلیٰ ترین محرک ہے۔ وہ اس کی تشریح آپ کرتا ہے کہ صرف وہی لوگ جو اس غیر معمولی جد و جہد اور اس سے بھی زیادہ اس جذبہ و شوق کو محسوس کرتے ہیں جس کی نظری سائنس متقاضی ہے۔ اس احساس کی قوت کو محسوس کر سکتے ہیں جس سے یہ کام انجام پاتا ہے۔ وہ کائنات کو پُر معنی خیال کرنے کے یقین اور اس کو سمجھنے کی اس آرزو کی تعریف کرتا ہے جس سے کیپلر اور نیوٹن یقیناً بہرہ ور تھے اور جس نے انہیں سالہا سال تن تنہا مصروف کار ہو کر افلاکی میکانیات کے اصولوں کی تحقیق کی تحریک دلائی۔ وہ اس بات پر بہت زور دیتا ہے کہ جن لوگوں نے سائنسی تحقیقات کو اپنا مطمح نظر نہیں بنایا وہ کبھی سچے محققوں کی ذہنیت کو نہیں سمجھ سکتے۔ صرف وہی شخص جس نے اپنی زندگی ایسے ہی مقاصد کیلئے وقف کی ہو اس الہامی جذبہ کا اندازہ کر سکتا ہے جس سے یہ لوگ سرشار ہوتے ہیں اور جو انہیں بے شمار ناکامیوں کے باوجود اپنے مقاصد سے وفادار رہنے کی ہمت عطا کرتا ہے۔ اسے یقین ہے کہ یہ کائناتی مذہبی احساس ہی ہے جو انسان کو اس قسم کا حوصلہ عطا کرتا ہے اور ہمارے موجودہ مادی دور میں سنجیدہ سائنسی محقق ہی ہیں جو حقیقی معنوں میں اس والہانہ مذہبی احساس سے سرشار ہیں:

(ترجمہ: جمیل نقوی)

(بہ شکریہ ریڈیو پاکستان، کراچی)

ر۔ خ

نقد و نظر

اردو میں تنقید

از ڈاکٹر محمد احسن فاروقی
صفحات ۱۸۲، قیمت دو روپے چار آنے
ناشر:۔ ادارۂ فروغ اردو ۳۲ امین آباد پارک لکھنؤ

ڈاکٹر فاروقی ان لوگوں میں ہیں جن کی عمر دشتِ تنقید کی سیاحی میں گذری ہے۔ اور وہ سیاح بھی کافی جہاں گرد قسم کے ہیں کیونکہ انہوں نے مشرقی ادبیات کے علاوہ مغربی ادبیات کا بھی کافی بسیط اور غائر مطالعہ کیا ہے۔ جس کے نتائج ان کی تنقیدات سے جا بجا ظاہر ہوتے ہیں۔ ایسی تنقیدات جو بارہا علمی و ادبی رسائل و جرائد میں تنقیدی محاربات کا روپ دھار چکی ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب میں ایک نہایت اہم موضوع پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ جس پر تفصیلی نظر ڈالنے کی اشد ضرورت تھی اور ہے یعنی اردو کے سرمایۂ تنقید کا ناقدانہ جائزہ جس سے معلوم ہو سکے کہ یہ فن ہمارے یہاں کس حد تک ترقی کر چکا ہے اور اس میں ابھی کن پہلوؤں کی گنجائش ہے۔ اس سلسلہ میں مصنف نے صرف عہد آفریں شخصیتوں اور ان کے تنقیدی کارناموں ہی کو پیش نظر رکھا ہے۔

صاحب موصوف کی اکثر آراء بہت پُرمغز اور خیال انگیز ہیں۔ انہی سے ہم نقد و ادب کے نئے نئے چراغ جلا سکتے ہیں اور ترقی کی نئی نئی راہیں تلاش کر سکتے ہیں مگر بعض جگہ دیگر اہل نظر (ان اہل نظر کے خلاف معلمی و طالبعلمی کا وہ الزام عائد کرنا دشوار ہوگا جس کا کتاب میں شدید ردِ عمل پیدا کرنے کی حد تک ذکر کیا گیا ہے) کا ان سے متصادم ہونا ناگزیر ہے مثلاً "آب حیات" کے سلسلہ میں مصنف کا بڑی کاوش سے یہ ثابت کرنا کہ اس کا 'ماڈل' تذکرے ہیں کیونکہ آزاد نے خود اس کو "تذکرۂ آبِ حیات" ہی قرار دیا ہے۔ پھر تمہید سے قطع نظر "آبِ حیات" کے نام ہی سے اس کا مقصد بھی ظاہر کر دیا گیا ہے یعنی قدیم شعرا اور ان کے عہد کو جو ہماری نظروں سے محو ہو چکے ہیں آبِ حیات کے جرعے پلا کر دوبارہ زندہ کرنا۔ آزاد دورِ جدید میں دورِ قدیم کے باسی تھے اور ان کا ذہنی وطن زیادہ تر عہد کہن ہی تھا۔ چنانچہ ان کی تصانیف "قصص ہند" "دربار اکبری" "سخندان پارس" یہاں تک کہ "اردو قاعدے" سے بھی یہی خصوصیت نمایاں ہے۔ وہ عہد کہن کے مصوّر تھے۔ اس لئے "آبِ حیات" میں انہوں نے اس عہد کو اپنے مخصوص انداز ہی میں بقائے دوام کا خلعت پہنایا ہے۔ تنقید میں وہ خود غالب کی طرح "بہتے دریا" تھے۔ اسی لئے ان کی تنقیدی صلاحیتوں پر شدت سے لے دے کرنا خود نقادی کی طرف عود کر آتا ہے۔

اتفاق سے وہ تمام خط و کتابت جو "آبِ حیات" کے سلسلہ میں آزاد اور ان کے معاصرین کے مابین ہوئی تھی دستیاب ہو چکی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکے گا کہ انہوں نے فی الحقیقت حالات میں کس حد تک تصرف کیا۔ اس سلسلہ میں پروفیسر شیرانی مرحوم اور دیگر محققین کی توضیحات بھی ہمارے لئے شمع راہ ہیں۔

یہی کیفیت "مقدمہ شعر و شاعری" کی ہے۔ یہ حالی کے دیوان کا "مقدمہ" ہے۔ کیونکہ ان اضطراری حالات میں جو ۱۸۵۷ء کے انقلاب عظیم سے رونما ہوئے تھے حالی نے بھی اضطراراً زندگی اور ادب میں بالکل ویسے ہی انقلاب کی ضرورت محسوس کی تھی۔ اور "مقدمہ" ایک ذاتی یا ادبی و تنقیدی ڈائری کے طور پر لکھا تھا تاکہ تمام سابقہ و موجودہ حالات کا سنجیدگی سے جائزہ لینے کے بعد کوئی نیا قدم اٹھایا جائے، اسی پر اس کی اہمیت موقوف ہے ہمیں ڈاکٹر فاروقی کا ممنون ہونا چاہیئے کہ انہوں نے بعض نہایت اہم باتیں سجھائی ہیں۔

سرگذشت

از مولانا عبدالمجید سالک
صفحات ۵۳۵، قیمت چھ روپے
ناشر:۔ قومی کتب خانہ، ریلوے روڈ۔ لاہور

آپ بیتی اور جگ بیتی کا یہ مجموعہ بڑی دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ کیونکہ یہ ایک ایسے صحافی کی روداد ہے جس کی چشمِ جہاں بیں نے دنیا کے کتنے ہی اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں۔ اور جو "راہ و رسمِ منزلہا" سے پوری طرح باخبر ہے۔ اس لئے اس کی زندگی کا دائرہ اپنے عہد کی ساری زندگی سے ہمکنار رہا ہے۔ وہ محض تماشائی ہی نہیں رہا بلکہ اپنے عہد کے ہنگاموں میں شد و مد سے حصہ بھی لیتا رہا ہے۔ اس کی سرگذشت کے وسیع پہنا کا تصور اسی صورت میں کیا جا سکتا ہے جب ہم یاد رکھیں کہ اس کی ابتداء حالی و شبلی کے زمانہ

سے ہوئی اور انتہا دورِ حاضر پر۔

ایک طرف کتاب کا موضوع فی نفسہ دلچسپ اور پھر وہ خوش بیانی جس سے دل کے کنول خود بخود کھل جائیں، وہ بذلہ سنجی جو دل میں بشاشت کی لہر دوڑا دے، سونے پر سہاگے کا کام دیتی ہے۔ جہاں جہاں زندہ دل مزاح نگار کی شوخیٔ طبع کی چھوٹ پڑتی ہے عبارت کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ یہی لطافتِ بیان ہے جو اس طویل سرگذشت کو بھی ایک رنگین داستان بنا دیتی ہے۔ اس دلچسپ مرقع میں کہیں بھی زیادہ شوخ رنگ نہیں برتے گئے۔ جن سے زیبِ داستاں کا احساس پیدا ہو۔ ایسی بے تکلفی اور سنجیدہ بیانی صرف ایک منجھے ہوئے صحافی ہی میں پیدا ہو سکتی تھی۔ جو ساتھ ہی باذوق ادیب اور سلیم الطبع انسان بھی ہو۔

از سید امجد حسین

جملۂ معترضہ

صفحات ۲۲۳، قیمت تین روپے

ناشر:۔ اردو بک اسٹال لوہاری دروازہ لاہور

دیکھنے میں نہ وہ شوخ ہے نہ شریر، بالکل خاموش اور اپنے آپ کو لئے دیئے ہوئے لیکن آپ اس کی سادگی پر نہ جایئے۔ وہ کھلاڑی اور پوشیدہ کافر ہے۔ اس کے خاموش ہونٹوں میں ایک دبی دبی مسکراہٹ ہے۔ بڑی شوخ اور تیکھی، گہری تہہ سے ابھرتی ہوئی اور ابوالہول کی پُر اسرار مسکان کی سی گہرائی لئے ہوئے۔ اس کی مسکراہٹ کھلے طنز سے زیادہ گہری کاٹ کرتی ہے۔ اور اس کا وار قہقہوں سے زیادہ بھرپور اور تباہ کن ہے۔ اس نوجوان مزاح نگار کی بذلہ سنجی کا سرچشمہ ایک سنکی، چڑچڑی، جلی بھنی، بیمار، طبیعت نہیں۔ بلکہ ایک بشاش طبیعت سے ابھرنے والی خوش طبعی کی بے ساختہ لہر ہے۔ نہایت بے تکلف اور زندہ دست ایسے مزاح کو تھارن ٹن وائیلڈ کے الفاظ میں "ویدر آف دی سول" یعنی طبیعت کی موج ہی کہنا مناسب ہے۔ جو ہر چیز سے سامانِ تفنن پیدا کر لیتی ہے۔ اور بڑے سلجھے، رچے ہوئے گمبھیر انداز میں یہ خوش طبعی اس بارِ خاطر "مکس پن" کے خلاف کھلی بغاوت ہے۔ جس کے ہم لوگ عادی ہو چکے ہیں۔ بلاشبہ اس قسم کی انشائے لطیف جو ادبی و ذوقی حیثیت سے ایک بلند سطح برقرار رکھتی ہے۔ ہمارے فکاہی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ یہ اس "خاص قسم کی صحافیانہ طنز اور مزاحیہ شاعری" اور فکاہی ادب سے ممیز ہے "جس میں ملک کے سیاسی، سماجی، اقتصادی، سرکاری غرضیکہ اجتماعی زندگی کے عام حالات کا خاکہ اڑایا گیا ہو۔"

از ڈاکٹر گیان چند جین

اردو کی نثری داستانیں

(انیسویں صدی تک)

صفحات ۶۰۹، قیمت نو روپے

ناشر:۔ انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی

اردو نظم و نثر میں داستانوں کا ایک وسیع سرمایہ ہے جس کا سلسلہ بہت دور پہنچتا ہے۔ اس وقت تک جب کہ اردو نے اپنی ابتدائی حالت سے ابھر کر دکنی کی شکل اختیار کی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ سرمایہ کس قدر متنوع اور لخت لخت ہے۔ اور اس پر مجموعی حیثیت سے نظر ڈالنا کس قدر دشوار ہے تاوقتیکہ ان کی شیرازہ بندی نہ کی جائے۔ جہاں تک نثری داستانوں کا تعلق ہے ڈاکٹر گیان چند جین نے ان کی شیرازہ بندی کا بیڑا اٹھایا۔ اور ایک تحقیقی مقالہ تحریر کیا جس کی بنا پر انہیں الہ آباد یونیورسٹی کی طرف سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند حاصل ہوئی۔ انجمن ترقی اردو نے اس مقالہ کو مطبوعہ شکل میں پیش کر کے ایک اہم خدمت سرانجام دی ہے۔

یہ کتاب محض داستانوں کی فہرست ہی نہیں بلکہ ان کا پورا پورا تعارف بھی ہے۔ ابتدا میں فاضل مصنف نے فن قصہ گوئی کے آغاز پر روشنی ڈالی ہے اور پھر اردو کی نثری داستانوں کے ارتقا کا خاکہ کھینچا ہے۔ ابتدائی حصہ کی حیثیت ایک مقدمہ کی ہے جس میں قصہ گوئی کے محرکات اور اجزائے ترکیبی پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ جو ہمیں اردو کی نثری داستانوں پر ناقدانہ نظر ڈالنے میں مدد دیتی ہے۔ مصنف نے ۱۸۷۰ء تک جتنی داستانیں اردو میں لکھی گئی ہیں (بہ استثنائے چند، جو بعد میں لکھی گئیں) نہ صرف ان کے محاسن و معائب پر بحث کی ہے بلکہ ان کے مآخذ (سنسکرت، عربی، فارسی وغیرہ) پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جس میں داستانوں کے مافوق الفطرت عناصر اور کردار نگاری وغیرہ پر تحقیق کی گئی ہے۔ علاوہ بریں مصنف نے کافی مقدار میں نیا مواد فراہم کر کے ہماری ادبی تاریخ کے متعدد گوشے بے نقاب کئے ہیں۔ اور بہت سی داستانوں کا سراغ لگایا ہے جن کے نام بہت کم سننے میں آتے ہیں مگر تاریخی اعتبار سے ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

ڈاکٹر جین کا یہ مقالہ اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ اور ایسا نقطۂ سفر مہیا کرتا ہے جس سے اردو داستانوں کے مطالعہ کو بہت آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔

●

استقلال نمبر **ماہِ نو** اگست ۱۹۵۵ء

پاکستان کا قیام ایک تاریخی واقعہ ہے اسی طرح اس کے آٹھویں جشنِ استقلال پر یہ شمارۂ خاص

ادب، فن اور ثقافت کے مایۂ ناز شاہکار پیش کرنے میں

ایک تاریخی حیثیت کا مالک ہوگا

پاک و ہند کے مقبول اہل قلم کے تصورات و افکار کا یہ مجموعہ متعدد صوری و معنوی خوبیوں کا حامل ہوگا اور امید ہے کہ اس سال کی بہترین ادبی پیشکش تسلیم کیا جائے گا۔

ہمارے چند متوقع لکھنے والے

ڈاکٹر مولوی عبدالحق	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	انتظار حسین	شوکت صدیقی	ردکشش صدیقی	تابش دہلوی
ڈاکٹر سید عبداللہ	الطاف گوہر	شفیق الرحمن	اشرف صبوحی	سید عبدالحمید عدم	صفیہ شمیم
محمد حسن عسکری	ضمیر جعفری	ابن سعید	•	ابن انشا	زہرہ نگاہ
ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری	•	ابوالفضل صدیقی	جگر مراد آبادی	قیوم نظر	احمد فراز
سید ہاشمی فرید آبادی	غلام عباس	اشفاق احمد	ابوالاثر حفیظ	ناصر کاظمی	حامد حسن قادری
عبدالرحمن چغتائی	حجاب امتیاز علی	آغا بابر	فراق گورکھپوری	شیر افضل جعفری	شان الحق حقی
سید وقار عظیم	شکیلہ اختر	ابوسعید قریشی	حفیظ ہوشیارپوری	ضمیر اظہر	جلیل قدوائی
ڈاکٹر عبادت بریلوی	قدرت اللہ شہاب	یزدانی ملک	احسان دانش	سراج الدین ظفر	قتیل شفائی

ضخامت: عام اشاعتوں سے دوگنی

سرورق: نیا دیدہ زیب سرورق

رنگین تصاویر: ملک کے نامور مصوروں کے متعدد شاہکار

سادہ تصاویر: جدید حالات اور تاریخی و تہذیبی ورثہ کی آئینہ دار

مستقل خریداروں کو یہ سالنامہ بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔ عام قیمت ۱۲؎ فی کاپی (پاکستان میں) ۱۲؎ (ہندوستان میں)

ایجنٹ حضرات: خاص نمبر کی مطلوبہ تعداد سے فوراً مطلع فرمائیں۔

ادارۂ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس ۱۸۳ ــ کراچی

REGD NO S 1085

MAH-E NAU, KARACHI, JUNE, 1955

ہماری مطبوعات

ثقافت پاکستان

اگرچہ ہمارا ملک سیاسی طور پر ایک نوزائیدہ مملکت ہے لیکن ثقافتی اعتبار سے اس کی ادبی اقدار تاریخ عہد کی گہرائیوں تک پہنچتی ہیں - فی الحقیقت پاکستان تہذیب ، علم اور تمدن کا قدیم ترین گہوارہ ہے اور تقسیم ملک کے بعد اس برصغیر کے بہترین تہذیبی ورثہ کا جزو اعظم پاکستان ہی کے حصہ میں آیا ہے - " ثقافت پاکستان " ایک مبسوط کتاب ہے جس میں پاکستان کے ثقافتی ورثہ کا مکمل جائزہ لیا گیا ہے - اس کتاب کی تدوین میں ملک کے نامور مفکرین اور اہل قلم نے حصہ لیا ہے -

دیدہ زیب مصور سرورق - مجلد پارچہ ، طلائی لوح ، ۱۶ تصویری صفحات ، متن ساڑھے تین سو صفحات - قیمت ساڑھے چار روپے

انتخاب کلام - مسلم شعرائے بنگال

پچھلے چھ سو سال میں مشرقی پاکستان کے مسلمان شعرا نے بنگالی ادب میں جو بیش بہا اضافے کئے ہیں ان کا ایک مختصر مگر سیر حاصل انتخاب عہد قدیم سے لیکر معاصر شعرا تک پیش کیا گیا ہے ، یہ ترجمے پروفیسر احسن احمد "اشک" اور یونس احمر نے براہ راست بنگالی سے اردو میں کئے ہیں -

۲۰۵ صفحات مجلد (پارچہ) ، طلائی لوح ، ساڑھے چار روپے - سادہ مجلد - چار روپے

عبداللہ

یہ بنگالی زبان کا ناول ہے جو اردو میں منتقل کیا گیا ہے - یہ ناول عبوری دور کے ... کی ایک تصویر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے - جس میں نئی زندگی پرانی زندگی ... اور آخر کار نئے تقاضے حیات کا رخ بدل دیتے ہیں -

ناول کا پس منظر بنگال کا ہے - مگر اس کی کہانی ہم سب کی اپنی کہانی ہے - اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کے دونوں حصوں کا تاریخی ارتقا کس طرح ایک ہی نہج پر ہوا اور ہم ایک دوسرے سے کس قدر قریب ہیں -

... صفحات - مجلد ... دیدہ زیب سرورق ، قیمت سادہ جلد چار روپے ، طلائی جلد ساڑھے چار روپے

مشرقی بنگال کا پوتھی ادب

مسلم بنگال کی عوامی زبان اور ادب اسلامی افکار و علوم سے مالامال رہا ہے - مسلم ادبا و شعرا نے اس زبان کو دیوی دیوتاؤں کے تصور سے نجات دلا کر انسان اور زندگی کو موضوع بنایا اور اپنے تاثرات کو ایسے سانچے میں ڈھالا کہ ان کا ادب مذہب ، تصوف ، تاریخ ... روایات اور قومی داستانوں کا لازوال سرچشمہ بن گیا - اسے وہ پوتھی ادب کہتے ہیں - یہ کتاب ... بنگال کے اس ادب کا مکمل تعارف ہے - اس کے ذریعے آپ بنگال کے مسلم عوام کی روح تک پہنچ سکتے ہیں - قیمت صرف ۱۲ آنے -

ادارہ مطبوعات پاکستان - پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ - کراچی ،

ماہِ نو

۱۹۵۵ء

سید وقار عظیم — ابوسعید قریشی

فضل احمد کریم فضلی

جلد ۸۔ شمارہ ۴　　جولائی ۱۹۵۵ء

مدیر: رفیق خاور
نائب مدیر: ظفر قریشی

چندہ سالانہ: پانچ روپے آٹھ آنے (پاکستان میں) سات روپے (ہندوستان میں) فی کاپی آٹھ آنے (پاکستان میں) دس آنے (ہندوستان میں)

آپس کی باتیں

پچھلے دنوں کراچی اور ڈھاکہ دونوں جگہ یومِ نذرالاسلام بڑے اہتمام سے منایا گیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد سے یہ تقریب ہر سال برابر ہو رہی ہے۔ نذرالاسلام بنگلا شاعری میں ایک نئی تحریک کے بانی ہوئے۔ جس میں اسلامی آہنگ برابر اُبھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس میلان کو فروغ دینے میں تنہا اُن کی ذات کا بڑا حصہ ہے۔ اُن کی شاعری مشرقی پاکستان ہی کے ماحول میں پروان چڑھی اور اسی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ لیکن اسکی آواز تمام پاکستان کی آواز ہے۔ "یومِ نذرل" کی تقریب رقص و موسیقی کے رنگا رنگ مظاہروں سے مزین ہوتی ہے۔ ہم اس شمارہ میں کراچی کی تقریب کے چند مناظر پیش کر رہے ہیں۔

اُردو ڈرامے کا پہلا نقش "اندر سبھا" ہمیشہ دلچسپی کا حامل رہیگا۔ کیونکہ یہ اردو ادب میں ایک نئے سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ آج اس کا موضوع کتنا ہی فرسودہ اور تکنیک کتنی ہی پارینہ کیوں نہ معلوم ہو لیکن یہ باتیں اس کی دلچسپی اور اہمیت کو گھٹا نہیں سکتیں۔ اس کے کئی پہلو ناقدانِ فن کو غور و مطالعہ کی دعوت دیتے رہیں گے۔ ہمارے فاضل نقاد سید وقار عظیم نے اس کو خصوصی مطالعہ کا موضوع بنایا ہے۔ اور اس کے بعض دقیع پہلو اجاگر کئے ہیں۔ یہ سلسلۂ مضامین ایک اہم ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ جس کی افادیت محتاج بیان نہیں۔

اردو کا یہ پہلا ناٹک ایسے زمانہ میں تصنیف ہوا جب نئے مادی اسباب نے نقل و حرکت، میل جول اور زندگی میں ہنگامہ آرائی کے نئے مواقع پیدا کر دئے تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں باطن کی بجائے خارج کی طرف توجہ بڑھ گئی تھی۔ ناٹک، مرثیہ، نظیر اکبرآبادی کی تمدنی و مجلسی شاعری، غزل میں خارجیت کا غلبہ، ریختی کی ایجاد، ان سب چیزوں میں ایک مشترک رجحان ملتا ہے۔ اور پھر سید انشا کا مصحفی کا سوانگ بھرنا اور جلوس نکالنا۔ کیا یہ سچ مچ ناٹک ہی جیسا کھیل نہیں تھا؟ بلاشبہ اس دور کی مجلسی زندگی ڈرامے کی متقاضی تھی۔ اس کے برخلاف ڈرامے کا فقدان کسی نہ کسی حد تک معاشرے میں انفرادیت کے رجحان کو ظاہر کرتا ہے۔ خصوصاً جبکہ لوگوں کی اجتماعی جبلت نے مجالست اور اشتراکِ عمل کی کوئی ایسی راہ نہ ڈھونڈی ہو جو ڈرامے کا جواب ہو سکے۔

مغربی پاکستان میں جہاں قدرتی وحدت نمایاں ہے وہاں تمدنی وحدت بھی کچھ کم نمایاں نہیں اس سے قبل ایک مضمون "وادئ سندھ کی میراث" میں اس مسلسل وحدت پر روشنی ڈالی گئی تھی جس کی شہادت تاریخ بہم پہنچاتی ہے۔ اسی شہادت کے آثار ان بوقلموں عمارات میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ جو مغربی پاکستان کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک بکھری پڑی ہیں۔ کسی لطیف طبع شخص نے عمارات کو "منجمد موسیقی" بتایا ہے۔ یہ موسیقی کیا ہے؟ ہمارے افسانہ نگار ابوسعید قریشی نے اپنے رپورتاژ "کاف تا کاف" میں اسکی کیفیت بیان کی ہے۔ اس رپورتاژ کی دوسری قسط زیرِ نظر شمارہ میں پیش کی جا رہی ہے۔

"ماہِ نو" کا اگلا شمارہ "استقلال نمبر" یعنی ہمارا سالنامہ ہوگا۔ اس کی ترتیب شروع ہو چکی ہے اور اہلِ قلم کے تعاون سے نظم و نثر کے اتنے مضامین حاصل ہو گئے ہیں کہ اکثر صورتوں میں انتخاب دشوار ہے۔ اب تک بفضلہ "ماہِ نو" کا ہر شمارہ سابقہ شماروں پر فائق رہا ہے اور ہمیں امید ہے کہ ہم ترقی کی اس روایت کو قائم رکھ سکیں گے۔ تصاویر کا انتخاب بھی خاص توجہ سے کیا گیا ہے۔ ان میں قدیم و جدید نقاشی کے بعض نادر نمونے شامل ہیں۔

"ماہِ نو" ایک ادبی رسالہ ہے جس کا مقصد پاکستان کی ادبی و ثقافتی روایات کو تازہ رکھنا اور اہلِ ذوق کو ملک کے ادب و فن، تہذیب و آثار، مشاغل و افکار، مسائل اور جدّ و جہد سے آگاہ کرنا ہے۔ رسالہ کے مضامین نظم و نثر کی ترتیب و ہیئت کے بارے میں ہم اپنے پڑھنے والوں کے مشاہدات اور ان کی آراء کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ ہمارے مدِ نظر ترقی و بہتری ہے۔ لہٰذا رسالہ کے مختلف پہلوؤں پر مخلصانہ اظہارِ خیال ہمیشہ موجبِ تشکر ہوگا۔

اردو کے غیر معروف ناول۔ "اُفتادِ جوانی"

(۲)

غلام عباس

پچھلے مہینے کے "ماہِ نو" میں آپ حکیم سید علی حسین خاں عرف بنّن صاحب کے ناول "افتادِ جوانی" کا ابتدائی حصہ پڑھ چکے ہیں۔ اور مصنف ہی کے الفاظ میں ناول کے تین بڑے کرداروں یعنی سجاد (ہیرو) افتخار بہو (ہیروئن) اور سجاد کے باپ مرزا فدا حسین سے، جو اپنے زمانے میں نامی گرامی بانکے رہ چکے تھے، متعارف ہو چکے ہیں۔

اس زمانے میں آدمی کا مار ڈالنا کچھ بڑی بات نہ تھی۔ بڑے بڑے اُمراء کتّے، بلّی کی طرح سر بازار مار ڈالے جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ لوگ شہر کے عمدہ عمدہ بانکوں کو اپنے ہمراہ رکھتے تھے۔ ان کے ناز اُٹھاتے اور جا و بیجا ان کی سختیاں سہتے تھے۔ اس زمانے میں جہاں کوئی نوجوان اُنیس بیس برس کا ہو کر سپاہ گری کے فنون میں ماہر اور ڈنڈ مگدر کر کے تیار ہوتا بس اسی دن سے سینکڑوں اُمراء کے پیام آنے لگتے۔ یہاں تک کہ جس قدر مشاہرہ پر وہ یا اس کے والدین راضی ہوتے تھے، اپنا ملازم کر کے اپنے ساتھ رکھ لیتے تھے۔ ایک ایک جوان چار چار جگہ نوکر ہوتا تھا۔ اور ہر جگہ اپنے وقتِ معین پر پہنچتا تھا۔ اور اظہار کر دیتا تھا کہ مَیں فلاں فلاں رئیس کا بھی ملازم ہوں۔ اگر ان اُمراء میں کوئی فساد اُٹھ کھڑا ہوتا تو حتی المقدور اصلاح میں کوشش کر کے رفعِ شر کرا دیتا۔ ورنہ اپنے معین وقت پر جس کسی کے ہمراہ ہوتا، یا جس کسی کا زیادہ زیرِ بارِ احسان و قدر دانی ہوتا، اصل تلوار کی طرح اسی کا کام دیتا۔ اور جان دیکے یا جان لے کے حقِ نمک ادا کرتا تھا۔

سجاد بھی اسی طرح نواب مکرم الدولہ کے ہاں ملازم ہو گیا تھا۔ جس رات کا پہلے مذکور ہو چکا ہے۔ افتخار بہو نے اپنے ایک توہم کی وجہ سے بڑی منت خوشامد کر کے، شوہر کو راضی کر لیا تھا کہ وہ اس رات گھر سے باہر نہ نکلے۔ مگر آدھی رات کو یکبارگی اس کی طلبی ہوتی ہے، نواب مکرم الدولہ اپنی سواری کا خاص سبزہ بھیج کر اسے بلواتا ہے۔ اور سجاد بیوی کو روتا دھوتا چھوڑ کر نواب کی ڈیوڑھی کی طرف چل دیتا ہے۔ ابھی وہاں پہونچنے نہیں پاتا کہ راستے میں اس کی مڈبھیڑ دو آدمیوں سے ہوتی ہے جو بدحواسی کے عالم میں اندھیرے میں چھپتے چھپاتے چلے جا رہے ہیں۔ سجاد للکار کر انہیں ٹھہراتا ہے۔ ان میں ایک تو شہر کا ایک نواب ہے جس کی سجاد سے بھی صاحب سلامت ہے اور دوسرا اس کا خدمت گار۔ وہ ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں۔ نواب کو اس وقت جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں کیونکہ دشمن اس کے عقب میں ہے۔

قصہ یوں ہے کہ یہ نواب جاوی نامی ایک رنڈی کے ہاں جو کسی دوسرے رئیس نثار علی خاں کی تنخواہ دار تھی، چھپ چھپ کے جایا کرتا تھا۔ ایک دن اُس رئیس کو پتہ چل جاتا ہے اور وہ بیس، پچیس آدمیوں کو لا کر جاوی کے مکان کو گھیر لیتا ہے۔ نواب ایک سپاہی کو رشوت دیکے بمشکل تمام مکان سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ مگر نثار علی خاں کے سپاہی برابر اس کے تعاقب میں لگے ہوتے ہیں۔

سجاد یہ واقعہ سُن کر نواب کو ملامت کرتا ہے۔ کہ آخر انصاف بھی کوئی چیز ہے، ایک آدمی ہزاروں روپے دے، آئے دن کی فرمائشیں پوری کرے۔ اور رنڈی دوسرے پر مفت جان دے۔ خیر یہ تو اس کا فعل ہے مگر تم کو کیا ضرور تھا کہ تم وہاں جا کے پھنسو۔

نواب اپنا قصور تسلیم کرتا ہے، اور قسم کھاتا ہے کہ وہاں پھر کبھی نہیں جاؤں گا۔ اس پر سجاد اسے اپنی حفاظت میں لے کر اس کے گھر پہنچانے جاتا ہے۔ راستے میں اس کا مقابلہ نثار علی خاں کے بانکوں سے ہوتا ہے۔

دو تین نامی گرامی بلنگے کھیت رہتے ہیں اور باقی بھاگ جاتے ہیں۔

جس وقت سجاد نواب کو صحیح سلامت اس کے گھر پہنچا کر اکیلا واپس آ رہا ہوتا ہے۔ تو نثار علی خاں بذاتِ خود ایک جمعیت لے کر اور تیغ و تفنگ سے لیس ہو اس پر دھاوا بول دیتا ہے۔ اس لڑائی میں نثار علی خاں اور اس کے کئی بہادر سجاد کے ہاتھ سے مارے جاتے ہیں سجاد خود بھی زخموں سے چور ہوتا ہے۔ مگر وہ دشمن کے باقی آدمیوں سے برابر لڑے جاتا ہے۔ یہاں تک ایک دفعہ پینترا بدلنے میں اس کا پاؤں تربوز کے ایک چھلکے پر پڑتا ہے اور وہ پھسل کر گر پڑتا ہے۔ اس پر دشمن کے سپاہی پے در پے تلواریں مار کر چشمِ زدن میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے ہیں۔

سجاد کی نعش گھر پہنچتی ہے تو محلے بھر میں ایک کہرام بپا ہو جاتا ہے بوڑھے مرزا کی کمر ٹوٹ جاتی ہے اور نوجوان افتخار بہو کی یہ حالت ہوتی ہے کہ:

"نہ تو اس کی آنکھیں روتی ہیں، اور نہ اس کی زبان کچھ بین کرتی ہے
بس سفید پتھر کی مورت ہے کہ جہاں ہے وہیں ہے۔ نہ کچھ سنتی ہے
نہ کچھ دیکھتی ہے۔ نہ منہ سے کچھ کہتی ہے۔"

سجاد کی برسی کے بعد جب اس کا ماتم کسی قدر پرانا ہو گیا تو ایک روز مرزا فدا حسین نے بہو کو پاس بلا کے کہا:

مرزا: سنو بیٹا جو کچھ میں اس وقت تم سے کہتا ہوں اسے غور سے سنو اور سوچ سمجھ کے جواب دو۔ تم جانتی ہو کہ سجاد کے مرجانے سے میں ایسا تنہا ہو گیا کہ کوئی بھی میرا وارث نہ رہا۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ تم کو اب بہو نہ سمجھوں بلکہ بیٹی بنا کے رکھوں۔

بہو:۔ مجھ کو آپ کے حکم سے کیا انکار ہو سکتا ہے۔ مجھ کو تو ہر طرح آپ کی لونڈی گری کرنے سے غرض ہے خواہ بہو بن کے کروں خواہ بیٹی بن کے۔

مرزا:۔ بس تم میری بیٹی ہو تو اب مجھ کو چاہیئے کہ میں تمہارا نکاح بھی دوسرا کروں اسی طرح سے کہ جس طرح میری بیٹی ہوتی اور میں کرتا۔

بس یہ کلام سننا تھا کہ وہ تھر تھر کانپنے لگی۔ قریب تھا کہ مارے غم و غصہ کے غش آ جائے۔ مرزا نے جو یہ حالت دیکھی تو یہ کہتے ہوئے ٹال کے اٹھ گئے کہ دیکھو اس کا جواب بہت سمجھ بوجھ کے مجھ کو دینا۔

مرزا کے جانے کے بعد بہو کی یہ حالت ہوئی کہ وہ دن اور ساری رات اسے روتے ہی گزر گئی۔ اور تین دن تک نہ تو کچھ کھایا اور نہ کسی سے بات ہی کی۔ جب سے سجاد مارے گئے تھے وہ رانڈوں کی طرح کچھ روکھا سوکھا کھا لیا کرتی تھی۔ شب کو کھانا بالکل ترک کر دیا تھا۔ سادے سیدھے کپڑے پہنتی۔ پان کھانا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ ایک گوشے میں رات اور دن بسر کرتی۔ نہ کہیں آنا نہ جانا۔ روزہ نماز، احادیث قرآن ہی میں اوقات گزارتی تھی۔ بس سسر کے اس پیغام دینے سے اس کو خیال گزرا کہ کونسی بات انہوں نے میری ایسی دیکھی جو ان کو میری جانب ایسا شک پیدا ہوا۔ مگر کوئی بات اس کے ذہن میں نہ آتی تھی۔ یہاں تک کہ پندرہ بیس دن اسی طرح رونے پیٹنے میں اس کو گزر گئے۔ مگر کوئی فی وہ اپنے چال چلن میں نہ نکال سکی۔

جب مرزا صاحب نے دیکھا کہ اب اس فرمائش کے صدمے کا اثر اس کے دل سے جاتا رہا۔ تو پھر ایک دن اسی طرح اپنے قریب بلا کر وہی خواہش ظاہر کی۔ اب کی دفعہ اس پر پہلا سا اثر تو نہ ہوا۔ مگر اتنا اب بھی ہوا کہ غصے کے مارے منہ سرخ ہو گیا۔ اور کوئی جواب نہ دے سکی۔ مرزا پھر اس کے پاس سے اٹھ گئے اور یہ اسی طرح غیظ و غضب میں آلودہ رہی جس کا اثر اب کی دفعہ سات آٹھ دن رہا۔

جب پھر مرزا نے دیکھا کہ یہ اپنی اصل حالت پر آ گئی۔ پھر اسی طرح اسے بلا کر اسی امر کا اظہار کیا اور اب کی دفعہ بہت تیوریاں چڑھا کر کہا کہ:۔

"مجھ کو تم نے کچھ دیوانہ سمجھ لیا ہے جو میری بات کو اس کان سن اس کان اڑا دیتی ہو"

کیا تم کو میری بیٹی بننا منظور نہیں؟

بہو: (غصہ کو دبا کر) بہت اچھا۔ میں اس کا جواب آپ کو دونگی لیکن ذرا سوچنے کے لئے مہلت کی خواستگار ہوں"۔

مرزا: "اچھا کیا مضائقہ ہے" کہتے ہوئے وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ افتخار بہو نے اپنے منصوبے پر کمر باندھنے کی فکر نہایت پختگی سے شروع کر دی۔ اور وہ منصوبہ یہ تھا کہ بڑے میاں نے میری بڑی بے عزتی کی ہے بس اب یہی بہتر ہے کہ اپنی جان دیدوں اور سجاد سے جا ملوں۔

شام کو جب مرزا گھر میں آئے تو ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ سجاد کی کھلائی بے تحاشا قدموں سے لپٹ گئی۔ چیخیں مار مار کے رونا شروع کر دیا۔

"مرزا: ارے کم بختو آخر کچھ منہ سے تو بولو کہ کیا غضب ٹوٹا ہے۔
ایک عورت: مرزا صاحب کیا کہا جائے۔ کچھ کہنے کی بات نہیں ہے۔
بہو صاحب نے افیم کھا لی ہے۔
مرزا: ہائیں! افیم کھا لی۔ سچ بتاؤ کیونکر کھائی اور کس بات پر کھائی۔
وہی عورت: میاں وہی جو آپ اُن پہ خفا ہوئے تھے اُس پر کھا لی۔
مرزا: ارے تو یہ افیم اس کو لا کے کس نے دی۔
وہی عورت: میاں آنکھوں کی دوا کے واسطے ایک آنے کی منگائی تھی اور منگایا ہی کرتی تھیں۔
مرزا: (زانو پیٹ کے) ہائے غضب ایک آنے کی کھا لی چلو بس خاتمہ ہے۔

یہ واقعہ سُن کر مرزا کے ہوش اُڑ گئے۔ اور اُلٹے پاؤں باہر بھاگے۔ اور تھوڑی دیر میں ایک حکیم صاحب کو لئے ہوئے آئے۔ پردہ کرا کے بہو کی نبض دکھائی۔ حکیم صاحب نے تشفی کی۔ کہ حالت زیادہ خراب نہیں ہے عجب نہیں جو یہ اچھی ہو جائیں۔

حکیم صاحب نے پے در پے قے اور دوائیں استعمال کرائیں جس کی وجہ سے صبح کے چار بجتے بجتے ہوش آ گیا۔ دوسرے دن شام کو بالکل صحت ہو گئی لیکن شرمندگی کی وجہ سے پندرہ بیس روز سسر کا سامنا نہیں کیا۔

بالآخر ایک دن مرزا صاحب نے خود ہی پھر اپنے سامنے بلایا۔ اور کہا:—

مرزا- بیٹا میں جو اس معاملے میں زور دیتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت تک کئی پشتیں ہماری اس شہر میں گزریں لیکن بفضلہٖ شروع سے جو تلوار کی روٹی کھائی تو اب تک کھائی۔ اس وقت تک باپ دادا کی عزت میں فرق آنے نہیں دیا۔ آج تک کسی نے ہماری عورتوں کا سراپا دیکھنا تو کیسا آواز تک نہیں سنی۔ دودھ پیتی لڑکی تک باہر نہیں نکلی بس اگر تمہاری وجہ سے ایک ایسے خاندان پر حرف آ جائے تو تم ہی کہو کہ پھر کیا کیا جائے؟

بہو: (ڈرتے ڈرتے) ابا جان کیا اس عورت کم بخت کی کچھ سزا بھی رکھی گئی ہے۔ جو ایسے پاک خاندان کی عزت مٹا دے؟ کیا وہ خاندان کسی کفارہ سے پاک بھی ہو سکتا ہے؟

مرزا- ہاں کیوں نہیں۔ اگر وہ قتل کر ڈالی جائے تو اس خاندان کی عزت بچ سکتی ہے۔

بہو- (تھر تھر کانپتی ہوئی ہاتھوں کو جوڑ کے) تو بس ابا جان للہ آپ یہی کیجیئے گا۔ اگر میرا قدم کبھی ڈگمگائے تو آپ اُسی وقت مجھ کو مار ڈالیئے گا۔ اور اپنی عزت بچا لیجئے گا لیکن واسطہ خدا اور رسول کا یہ ظلم مجھ پر نہ کیجیئے۔ ورنہ میں اپنی جان دے دوں گی۔ یہ بے وفائی مجھ سے کبھی نہ ہو گی۔ کہ ان کے مقام پر کسی دوسرے کو قبول کروں۔

مرزا: خیر اب میں اپنی رائے بدلے لیتا ہوں۔ مگر یاد رکھو جس دن مجھ کو تمہارے چال چلن تمہاری وضع میں فرق ظاہر ہوا۔ اُس دن رحم مجھے تم پر نہ آئے گا۔ اُسی دن تمہیں قتل کر ڈالوں گا۔

بس یہ سننا تھا کہ سسر کے قدموں سے لگ گئی۔ مرزا نے بھی بہو کے سر کو سینے سے لگا کے رونا شروع کیا۔ اس دن غمِ سجاد پھر تازہ ہو گیا۔

اب کسی قدر اطمینان سے افتخار بہو کی بسر ہونے لگی۔ مگر مرزا نے یہ انتظام کیا کہ رفتہ رفتہ سب گھر کی عورتوں کو نکال دیا۔ صرف ایک پکانے والی عورت کو رہنے دیا جس نے سجاد کے پوتڑے دھوئے تھے اور جو بہو کی نمک پروردہ نمک حلال عورت تھی۔ پھر اتنے بڑے مکان میں بہو کا نیچے رہنا مناسب نہیں تھا لہٰذا اسے کوٹھے پر اٹھا لے گئے۔ کوٹھے پر دو بُرج تھے، ایک میں خود رہا کرتے تھے۔ دوسرے میں بہو کا پلنگ بچھوا دیا تھا۔ اس بُرج کا وہ دروازہ جو سڑک کی طرف تھا اس پر لوہے کے سیخچے لگے ہوئے تھے۔ دن اور رات یہ دروازہ بند رہتا تھا۔ کبھی کبھی برسات میں جب برج ہی میں سونا ہوتا تھا، تو اُس کی وجہ سے رات کی رات وہ دروازہ کھول دیا جاتا تھا۔ کُل ضروریات وہیں کوٹھے ہی پر موجود رہتی تھیں۔ بہو مہینوں نیچے نہیں اُترتی تھی، بجز حوائج ضروری سے فارغ ہونے کے یا نہلانے کے۔

اسی طرح پانچ برس گزر گئے۔ اس عرصے میں یہ ہوا۔ کہ محلے میں ایک شخص مسمّٰی میر عسکری حسین عرف میرن صاحب ایک امیر کی بیٹی پر عاشق ہوئے۔ اور اُن کے عشق نے یہاں تک سر کھینچا۔ کہ بالآخر ناکامی کے ساتھ جان دے دینا پڑی۔ اُن بیچارے کا امر ایسا طشت از بام ہوا۔ کہ شہر بھر میں شاید ہی کوئی مقام ایسا ہو گا۔ جہاں جنون حسرت

افسوس کے ساتھ یہ حادثہ دہرایا نہ جاتا ہو۔ جو لوگ عاشق تن تھے اس واقعہ کو سُن کر آٹھ آٹھ آنسو روتے تھے۔ بیسیوں پردہ نشین باحیا عورتیں جنہوں نے محبت کا مزہ تو کیسا ہنوز مفہوم تک نہیں سمجھا تھا۔ اُن کے دلوں میں اس کی وجہ سے مادہ عشق و عاشقی پیدا ہوگیا۔ صدہا پرانی محبتیں پھر تازہ ہوگئیں۔ بیسیوں مُردہ دل، مردہ مینڈکوں کی طرح پھر جی اٹھے۔

مرزا فدا حسین نے بہت کچھ اس بات کی کوشش کی تھی۔ کہ اس قسم کے تذکرے گھر میں نہ ہونے پائیں۔ وہ ہوتے ہی کیونکر اور کرتا ہی کون! اُن کی دُور اندیشیوں نے تمام گھر خالی کرا دیا تھا۔ ایک اِنی گنی سجاد کی کھلائی گھر بھر میں رہ گئی تھی۔ اوّل تو وہ خود ہوشیار بڑھیا تھی۔ پھر مرزا کی سکھائی پڑھائی ہوئی۔ بھلا وہ کیا ایسے ذکر کرے گی۔ مگر اس کو کیا کیجیئے کہ یہ واقعہ خاص ان ہی کے محلّے میں ہوا تھا۔ میرن صاحب کی ماں کے بین، اُن کی تڑپ، کنبہ بھر کا شور و ماتم آس پاس کے کوٹھوں کی آوازیں، اہلو پہلو کے سوز و گداز، راہ چلتوں کی سرد آہیں، دن رات افتخار بہو کے کانوں تک آ پہنچتیں۔ سڑک پر لڑکے یہی کھیل کھیلتے اور ہر کسی سے بے پوچھے گچھے خود بخود بیان کرنے لگتے:۔

"آپ نے سنا ایک میرن صاحب تھے وہ جوان پر عاشق تھے جو محلے میں آیا کرتی تھیں۔ جی ہاں انہیں پر عاشق تھے۔ ڈوب کے مرگئے۔ واللہ پوچھ لیجیئے جس سے چاہے پوچھ لیجیئے۔ میں جھوٹ تھوڑی کہتا ہوں۔ اچھا چلیے چلیے ہم بڑا آئی سے پوچھوا دیں"

بھلا جہاں اس غضب کی تشہیر و تعمیم ہو۔ جس کو در و دیوار پکارے وہ ایک متجسس طبیعت سے کیونکر چھپ سکتا ہے۔ یہ باتیں مہینوں اس کے کانوں میں پڑا کیں۔ اور اس کی وجہ سے اس کے امنگ بھرے انئی جوانی کے مالک دل میں چپکے چپکے ایک لاگ پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن وہ کچھ ایسے نرالے انداز کی تھی۔ جسے وہ خود بھی نہ سمجھتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کی راتوں کی نیند اڑگئی تھی۔ ہر وقت کا سوچ بڑھ گیا تھا۔ غذا ترک سی ہوگئی تھی۔

ایک رات کا ذکر ہے۔ کہ اپنے پلنگ پر پڑی ہوئی کچھ سوتی اور کچھ جاگتی تھی کہ یکایک اس غضب کی دل پکڑ لینے والی ایک آواز سڑک کی طرف سے آئی۔ کہ دل بے چین ہوگیا۔ از سرتاپا پسینہ آگیا۔ سارے بدن کا خون گرم ہوگیا۔ تڑپ کے اُٹھ بیٹھی۔ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ حیران حیران ہر طرف دیکھنے لگی۔ کہ کس آسیب کی یہ جادو بھری آواز ہے جس نے میری یہ حالت کر دی۔ قریب تھا کہ دروازہ کھول کے دیکھے۔ مگر یکایک رک گئی۔ اور لاحول پڑھنے لگی۔ ادھر آواز بھی بند ہوگئی۔ تھوڑی دیر نہ گزری تھی۔ کہ وہی آواز پھر پیدا ہوئی۔ اور اب الفاظ بھی سُنائی دینے لگے۔ کوئی گا رہا تھا۔ پھر تو اس نے کان لگا دیئے اور ساری دُنیا سے غافل ہو کے سننے لگی۔

صبح کے چار بج گئے تھے۔ سفیدی پھیلتی جاتی تھی۔ اس کو یہ بھی خیال نہ تھا کہ نماز کا وقت قریب آگیا ہے۔ اٹھے اور وضو کا اہتمام کرے۔ یا یہ کہ بڑے میاں اب اٹھا چاہتے ہیں۔ مجھکو خلاف عادت اس وقت تک پڑا ہوا دیکھیں گے تو ٹوکیں گے۔ اگر وجہ معقول نہ ہوئی، تو شاید کچھ شک کریں۔ اس کی مطلق پروا نہیں۔ بس جہاں تک ہے اسی آواز کا خیال ہے۔ گلنے والا گا رہا ہے:۔

"تو رے آئے ہیں طلبگار چھوڑ دو نگری"۔

حضرات! کدو کی مرد نگ اور نیبو کا مجیرا اور بالم کھیرے کا ناچ، اس بے سامانی کی محفلِ رقص پر اس کا دل ہے کہ پس رہا ہے۔ دل سے کہہ رہی ہے کہ کیا سچ مچ اس پکار پکار کے کہنے والے کو میں اپنا طلبگار ہی سمجھ لوں۔ اور چھوڑ دوں اس اُجڑی نگری کو۔ پھر کہتی ہے کہ ہائے نہیں معلوم وہ کس کے فراق میں اس وقت بے تاب ہو کے نکلا ہے۔ اور کس کو سنا رہا ہے۔ تو ہے کہ اپنی طرف لئے جاتی ہے۔ کاش یہ معلوم ہو جائے کہ اس کی نیت کیا ہے۔ وہ کس کو چاہتا ہے۔ کس کو بُلاتا ہے!

وہ تو اس سوچ بچار میں تھی اندر ادھر مرزا اٹھے۔ وضو کیا نماز پڑھی۔ مگر اس کو خاک خبر نہ ہوئی۔ نماز سے فارغ ہو چکے تو انہوں نے پلٹ کر بہو کو دیکھا۔ جو برج کے بند دروازے کی طرف کروٹ لئے بے خبر پڑی تھی۔

مرزا صاحب: ہائیں بیٹا۔ کیا آج نماز نہ پڑھو گی۔ اٹھو جلدی اٹھو۔ ابھی وقت ہے جلدی سے وضو کر ڈالو۔

بہو یہ الفاظ سنتے ہی اچھل پڑی۔ قریب بدحواسی کے حالت ہوگی، مگر اپنے کو سنبھالا۔ اور عذر بے خوابیٔ شب کرتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ اور جلدی جلدی وضو کر کے کمرے کے اندر نماز پڑھنے کھڑی ہوگئی۔

اگرچہ نماز کی برکات نے کسی قدر اس کے دل کی کثافت کم کی۔ نیز اس کے بلک بلک کے رونے نے اور حفظِ آبرو کی دعا مانگنے نے بہت کچھ اس کو سنبھالا، مگر آنکھ پر وحشت سی آگئی۔ سر پر اس کے جو ایک بھوت سوار

ہو گیا تھا اس کی گرانی و الم نے کسی طرح ساتھ نہ چھوڑا جس سے دن بھر یہ پریشان رہی۔ جملہ حرکات و سکنات میں فرق آ گیا۔ نہ بھوک لگتی تھی نہ پیاس معلوم ہوتی تھی۔ نہ سینے پرونے میں جی لگتا تھا۔ نہ کسی کتاب سے مطلب نکلتا تھا۔ نہ قرآن پڑھے پڑھا جاتا تھا۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ مرزا دن بھر گھر نہ رہے اور آئے بھی تو سرِ شام سے نہ آئے جیسا کہ معمول تھا ورنہ صورت دیکھتے ہی کھٹک جاتے۔

بہو چونکہ شب کو کھانا بہ سبب روانڈ ہونے کے نہیں کھاتی تھی، اس لئے نماز سے جوں توں فارغ ہو کے دیر سے اپنے پلنگ پر دراز تھی۔ سجاد کی کھلائی بڑے میاں کو کھانا کھلا کے اپنے مقام پہ جا کے پڑ رہی۔ مرزا صاحب کا حال معلوم نہیں کہ سو گئے یا ہنوز جاگتے ہیں لیکن یہاں یہ حال ہے کہ پلنگ پر پڑے پڑے دل سے باتیں ہو رہی ہیں کہ کیوں خداوندا۔ وہ کل کی آواز کون آواز تھی، کیا کسی بشر کی آواز تھی۔ نہیں ہرگز نہیں ضرور وہ کسی فرشتے کی آواز تھی جو ملک الموت سے اجازت لیکر میری جان لینے کو آئی تھی۔ ہائے پھر وہ چلی کیوں گئی؟ مجھ کو لیتی کیوں نہ گئی؟ خداوندا کس آفت میں بیٹھے بٹھائے میں پڑ گئی۔ مجھے کیا ہو گیا؟

اختار بہو اسی ادھیڑبن میں تھی۔ کہ صبح کے چار بجے پھر وہی قیامت خیز وقت آ گیا۔ اور وہی جادو بھری آواز دور سے سنائی دی کلیجہ دھک سے ہو گیا، گھبرا کے اٹھ بیٹھی۔ دل کی الجھن کا دورہ شروع ہو گیا۔ اور وہ دردناک آواز دور ہی سے لپک لپک کے موج ہوا پر اس کی طرف آنے لگی:

"آن پڑے ہم بیچ ساگر میں پت راکھو پت کے رکھوالو"

یہ ٹھمری رام کلی کی دھن میں تھی۔ اس نے خدا معلوم کس غضب کا سحر کیا۔ کہ وہ آپ سے باہر ہو گئی۔ بے تحاشا دروازہ کھول کے اس قیامت کی ملک سے سڑک کی طرف دیکھا کہ جس کو ہمارا قلم ہرگز آپ لوگوں پر حالی نہیں کر سکتا۔ اگر اس دروازے میں لوہے کی مضبوط سلاخیں نہ ہوتیں تو یقیناً وہ اپنے کو سڑک پر گرا دیتی لیکن ہائے افسوس دروازہ کھول کے اب جو دیکھتی ہے تو ایک حلال خور ہے جو سڑک پر جھاڑو دے رہا ہے۔ اور وہی ٹھمری اپنے نور کے گلے سے گا رہا ہے:

"آن پڑے ہم بیچ ساگر میں پت راکھو پت کے رکھوالو"

ناظرین آپ سمجھ سکتے ہوں گے کہ اس کے دل میں مہتر کو دیکھ کے کیا تغیر ہوا ہوگا۔ جو اس امر کا مقتضی تھا۔ کہ کیسی ہی وہ آواز نور کی آواز ہوتی لیکن اس کو نفرت ہو جاتی۔ پھر لوٹ کے نہ دیکھتی۔ دروازہ بند کر کے اپنے دل پر ہزار نفرین کرتی۔ اپنے عصمت کے تحفظ پر سو سو سجدے کرتی۔ مگر افسوس

اس کے حلال خور ہونے نے ایک ذرا بھی ضرر نہ کیا۔ بلکہ جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ ارے یہ تو حلال خور ہے اچھا ہے ایک ذرا یونہی سی جھجک ہوا۔ لمحہ کے لمحہ سکوت ہوا۔ پھر فوراً ہی اس کے نفس نے اپیل کی۔ کہ اس کا حلال خور ہونا تو تیرے واسطے بہت ہی خوب ہے اس لئے کہ اگر کوئی شریف آدمی ہوتا تو شاید تیری اس طرح کی ہلولی کو پسند نہ کرتا۔ بلکہ نفرت کرتا۔ بھی تیرا ہاتھ نہ دیتا۔ بس اب دیکھتی کیا ہے۔ چل اور گھر سے نکل کے اس کے ساتھ ہو لے۔ ابھی کسی قدر سیاہی شب باقی ہے جو تیری روسیاہی کو چھپانے کی دیر نہ بڑھا۔ ابھی چاہتا ہے پھر کچھ نہ ہو سکے گا۔ یونہی کل کی طرح آج بھی تڑپ تڑپ کے رہ جائے گی۔ علاوہ اس کے یہی کب یقین ہو سکتا ہے کہ کل پھر یہ اس سڑک پہ جھاڑو دینے آئے گا۔ ممکن ہے کسی دوسری طرف چلا جائے۔ اس نے کہیں پہلے کبھی اس کی آواز نہیں سنی تھی۔

غرض دل سے یہ فیصلہ کر کے اس نے آہستہ سے برج کے دروازے کو بند کیا۔ اور چپکے سے گرگابی پہن کے اٹھی۔ اور دبے پاؤں ایک لوٹا لیتی ہوئی زینے کی طرف چلی۔ پیچھے مڑ مڑ کے دیکھتی جاتی تھی کہ کہیں بڑے میاں تو نہیں اٹھ بیٹھے۔ آخر زینے تک پہنچ گئی۔ اور نیچے اتر گئی۔ صحن میں پہنچ کر چاہتی تھی کہ لوٹے کو وہیں پٹکے اور دروازہ کھول کے سڑک کا راستہ لے۔ کہ دفعتاً مرزا کی آنکھ کھل گئی۔ اور وہ اٹھ بیٹھے۔ اب جو سامنے آنکھ اٹھا کے دیکھتے ہیں۔ تو بہو کا پلنگ خالی۔ اور بہو ندارد۔ سمجھے کہ شاید نماز کو اٹھی ہو گی۔ یہ سوچ کے وضو کرنے کو اپنے برج سے نکلے۔ اور پانی لینے کی غرض سے گھڑوں اور ٹھلیوں کی طرف بڑھے۔ اب جو نظر پڑتی ہے تو کیا دیکھتے ہیں کہ بہو صحن میں لوٹا لئے ششدر کھڑی ہیں۔

مرزا: ہائیں اس وقت تم نیچے کیوں گئیں؟

بہو: ذرا رک کے) جی۔ دیر سے میں بے چین تھی۔ پیٹ میں درد تھا آخر نہ رہا گیا۔ گھبراہٹ میں جلدی کے مارے اکیلے ہی چلی آئی۔

مرزا: کیا کھلائی مر گئی تھی یا سانپ سونگھ گیا تھا جو تم نے آواز نہ دی؟

بہو: کہتی تو ہوں کہ آواز میں نے دی تھی مگر جلدی کے مارے ان کا انتظار نہ کر سکی۔

مرزا: تو پھر تم وہاں کھڑی کیا کر رہی تھیں!

بہو: جی کچھ نہیں۔ میں نے دیکھا کہ آپ وضو کے لئے اٹھے ہیں۔ اس وجہ سے میں یہیں کھڑی ہو رہی۔ کہ آپ نماز شروع کر لیں تو میں

بھی آکے وضو کر دوں۔

مرزا: خیر بہت اچھا۔ اب اوپر آکر وضو کرنا ہو تو کرلو۔

یہ کہہ کے مرزا صاحب تو وضو کرکے نماز کے لئے برج میں آگئے۔ اور نماز شروع کردی۔ اب بہو کی سنئے۔ وہ اوپر آئی۔ لوٹے کو تو وہیں پھینکا۔ اور سسر کے برج میں آکر پلنگ کے سرہانے والے مونڈھے پر جو ہتھیار رکھے ہوئے تھے ان میں سے تلوار لیکر کھینچ لی۔ اور مرزا کی پشت پر جھکے کھڑی ہو رہی۔

مرزا نے سلام پھیرا۔ اب جو دیکھتے ہیں تو واہ واہ بہو صاحب تلوار بکف سرپر کھڑی ہیں۔

مرزا: (تلوار کی زد سے جست کرکے) او ناشدنی یہ کیا حرکت ہے؟ کیا تو مجھے مارا چاہتی ہے؟

بہو: استغفر اللہ۔ جل جائیں وہ ہاتھ جو آپ پر اٹھیں۔ یہ تلوار میں اپنی ہی سزایابی کے لئے کھینچے کھڑی ہوں۔

یہ سن کے مرزا صاحب کو ایک گونہ اطمینان ہوا اور بہو کے ہاتھ سے تلوار لے لی۔ بہو نے فوراً ہی سر جھکا دیا۔ کہ لیجئے بسم اللہ کیجئے میں خون اپنا معاف کرتی ہوں۔

مرزا: جب تک اصل واقعہ معلوم نہ ہوگا۔ مجھ سے تمہارا مار ڈالنا ویسا ہی ناممکن ہے۔ جیسا کہ بعد تحقیق کسی فعل ناجائز کے تمہارا میرے ہاتھ سے بچ جانا۔ لہٰذا خاطر جمع رکھو اور پہلے سارا حال بیان کرو۔

بہو: یہ تو محال ہے کہ میں اصل واقعہ پورے طور سے آپ کے سامنے بیان کردوں۔ لیکن اس قدر ضرور ظاہر کرنا چاہتی ہوں کہ ابھی تک میں اپنے طریقہ خاندانی پر پوری پوری قائم ہوں۔ خدا کے فضل سے ابھی تک کوئی دھبا نہیں لگا ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی کہے دیتی ہوں کہ میرے خیالات ایک خاص وجہ سے کچھ ایسے پریشان اور فاسد ہوگئے ہیں کہ مجھے خوف ہے شاید میرے ثبات قدم میں فرق آجائے۔ لہٰذا آپ مجھے قتل کرکے اس دغدغے سے فراغت حاصل کیجئے۔ ورنہ آپ پچھتایئے گا پھر نہ کہیئے گا کہ مجھے دھوکا دیا۔

مرزا: بے شک یہ بہت درست ہے۔ مگر وقوع واقعہ سے قبل صرف خیالِ جرم پر کسی کا خون کر ڈالنا یہ کون عمدہ بات ہے جو میں اس پر عمل کروں۔

بہو: دیکھئے ابا جان آپ نہیں مانتے۔ خیر اگر آپ مجھے نہیں مار ڈالتے تو للہ اس خدا کے مارے کو جو زیر دیوار گا رہا ہے ابھی ابھی جا کے مار آئیے نہیں میں کہے دیتی ہوں کہ خدا کی قسم بہت پچھتایئے گا۔

یہ کلام سنتا تھا کہ مرزا کے ہوش اڑ گئے۔ بہو کے تیور دیکھ کے سمجھ گئے کہ معلوم نہیں کیا آفت برپا ہونے والی ہے۔ چپ چاپ وہی تلوار لئے ہوئے نیچے اتر گئے۔ دروازہ کھول کے سڑک پر پہنچے اتنی دیر میں وہ سڑک بھی سڑک اسی طرح جھاڑتا بہارتا اور گاتا ہوا دور تین کھبت جا چکا تھا۔ یہ بھی اس کی آواز پر وہیں پہنچے۔ اور پہنچتے ہی تلوار کے ایک ہاتھ میں اس کا سر اڑا دیا۔ پھر تلوار وہیں کی مٹی سے پونچھ میان میں کی۔ اور اپنے اس ظالمانہ بزدلانہ اور وحشیانہ حرکت پر افسوس کرتے ہوئے گھر کو لوٹے۔

مرزا: لو بیٹا میں نے تمہاری فرمائش کے مطابق بے چارے بے دست و پا کو مار ڈالا یہی ایک ایسی حرکت مجھ سے ہوئی جو تمام عمر نہ ہوئی تھی۔ اب اگر مناسب ہو تو بتادو کہ کیا مصلحت تھی۔

بہو: ابا جان کیا عرض کروں۔ بس کہہ تو چکی ہوں کہ اس کو کچھ نہ پوچھئے۔ باقی اس کو جو آپ نے قتل کیا گویا مجھ کو زندہ کرلیا۔ اب میں پھر آپ کو اپنی طرف سے ہر طرح کا اطمینان دلاتی ہوں۔ اور خدا سے امیدوار ہوں کہ وہ میری نیت اور ارادے میں برکت دے۔

اگر اس واقعہ کے تھوڑے ہی دن بعد مرزا کا انتقال نہ ہو جاتا تو اکی دفعہ بغیر نکاح کئے نہ چھوڑتے۔ ان کے مرتے ہی وہی بے چارے نواب جن کو بچا کے سجاد نے اپنی جان دی تھی۔ ان کو اپنے گھر اٹھا لے گئے۔ اور وہاں جاکے بڑے بڑے رشتے جوڑے گئے۔ کوئی خالہ کہنے لگا۔ کوئی پھوپھی کہہ کر پکارنے لگا۔ کسی کی ماں بن گئیں۔ وہی گل بکاؤلی والا فقرہ کہ ماموں جی جوہار۔ دیو نے کہا۔ کہ اب تجھے کیا کھاؤں خاک کھاؤں بھلا کسی ماموں نے اپنے بھانجے کو کھالیا ہو تو میں تجھے کھالوں۔ یہاں بھی بہی دیوار آڑے آگئی۔ زبردستی گھر بھر کی بزرگ بن گئیں۔ اور اس طرح بات رہ گئی۔

اس ناول کی ہیروئین ابھی تک اپنی کتاب زندگی کا ایک ایک ورق الٹ رہی ہے۔ یہ ایک لمبے قد کی عورت ہیں۔ کتابی چہرہ۔ دبلے دبلے ہاتھ پاؤں ہیں۔ آنکھوں میں نزول الماء ہوگیا ہے۔ جس سے کہ قدح کرانے پر بھی قطع نظر نہ ہو سکے۔ ہر وقت بے چاری آتشی شیشوں کی عینک لگائے رہتی ہیں۔ دانت بھی بے وفائی کر گئے۔ لیکن اوپر نیچے کی پانچ چار ڈاڑھیں ابھی تک ساتھ

(باقی صفحہ ۵۴ پر)
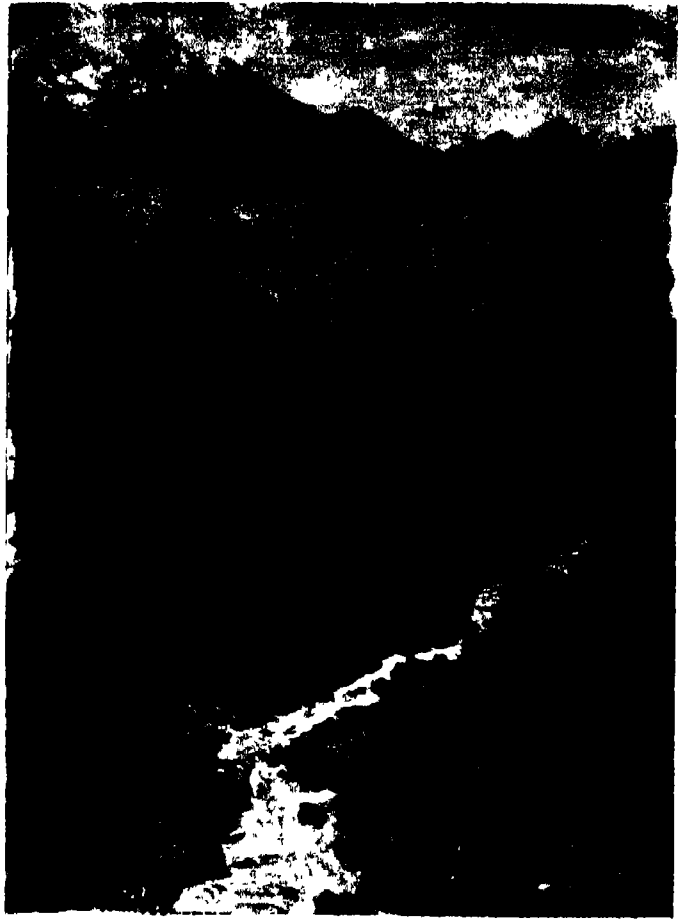
وادیٔ کشمیر
عمل: پروفیسر ایس، ایچ، عسکری

رخت بہ کاشمر کشا کوہ و تل و دمن نگر
سبزہ جہاں جہاں ببین لالہ چمن چمن نگر

تا نہ فتد بہ زینتش چشم سپہر فتنہ باز
بستہ بچہرۂ زمین برقع نسترن نگر

لالہ ز خاک بردمید موج بہ آبجو تپید
خاک شرر شرر ببین آب شکن شکن نگر

اقبال

"اندر سبھا" کا فنّی پہلو

وقار عظیم

اندر سبھا بلاشبہ اردو کے ڈرامائی ادب کی سب سے اہم تصنیف ہے۔ ہمارے ڈرامے کی فنی روایت کی ابتدا اسی اہم تصنیف سے ہوتی ہے اور اس روایت کے گوناگوں پہلو ڈرامے کی تاریخ کی تقریباً نصف صدی پر اس طرح چھائے ہوئے ہیں کہ ڈرامے کی ابتدا اور ارتقا کا کوئی جائزہ اندر سبھا کے جائزہ کے بغیر مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اندر سبھا کو نظر انداز کر کے اردو ڈرامے کے متعلق کسی طرح کی گفتگو کی کوشش ایک طرح کی ناانصافی بھی ہے اور زبردستی بھی۔ لیکن جب اندر سبھا کو پڑھنے والا اس کتاب پر طالب علمانہ نظر ڈالتا اور اس کے فنی پہلوؤں یا دوسرے الفاظ میں اس کی فنی روایت کی جستجو کرنے لگتا ہے تو فن کے نقطۂ نظر سے اس کے سامنے بہت سی باتیں آتی اور اس کے ذہن میں طرح طرح کے سوال پیدا کرتی ہیں۔

اندر سبھا کے بالکل ابتدائی حصوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ہی کم از کم یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ اندر سبھا ایک خاص طرح کی محفل میں پیش کرنے کے خیال سے لکھی گئی تھی اور اس محفل میں شریک ہونے والوں کی دلچسپی، تفریحِ طبع اور نشاطِ خاطر کا جو سامان فراہم کیا گیا تھا اس میں نمایاں اہمیت موسیقی کو دی گئی تھی۔ گانے اور ناچنے کے زیادہ سے زیادہ موقعے پیدا کرنے اور ان میں کسی نہ کسی طرح کا ربط و آہنگ پیدا کرنے کے لئے قصّہ کو بھی "سبھا" میں ایک جگہ دی گئی ہے، لیکن یہ جگہ محض ثانوی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اندر سبھا کے مصنّف نے ناچ گانے کی جو محفل ترتیب دی ہے اس کا انداز کیا تھا۔ اسی انداز کا دوسرا نام "فن" ہے۔ فن کے نقطۂ نظر سے سب سے پہلا سوال یہی ہے کہ اندر سبھا کی محفل کا انداز و قرینہ کیا تھا۔ فن کے دوسرے پہلو اس سوال کے ساتھ منسلک اور وابستہ ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اندر سبھا کے سرسری مطالعے سے اس سوال کا کوئی جواب ملتا ہے یا نہیں۔ یا یہ کہ اگر اس سوال کا جواب نہیں ملتا تو کیا یہ سرسری مطالعہ ہمیں کچھ ایسے نتائج اخذ کرنے میں مدد دیتا ہے جو فن کے مطالبات کی وضاحت و صراحت کرتے ہیں۔

"اندر سبھا" ایک مخصوص انداز کی بزم آرائی ہے جسے ہم اپنی آسانی کے لئے ایک خاص انداز کے اسٹیج کی ترتیب بھی کہہ سکتے ہیں۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ اندر سبھا پر شروع سے آخر تک ایک نظر ڈال کر یہ نتیجہ نکالیں کہ اندر سبھا جیسی کچھ بھی ہمارے سامنے موجود ہے اس سے اسٹیج کی کیا شکل بنتی ہے اور اس شکل کو دیکھ کر ہم فنی نقطۂ نظر سے کن کن الجھنوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔

آیئے، اس "سبھا" کی سیر اس خاص نظر سے کریں۔

سبھا کا آغاز سات شعر کی اس غزل سے ہوتا ہے جس کا مطلع ہے ؎

سبھا میں دوستو اندر کی آمد آمد ہے
پری جمالوں کے افسر کی آمد آمد ہے

یہ الفاظ ظاہر ہے کہ راوی کے ہیں، جو محفل میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو اندر کی آمد کی خبر دے رہا ہے۔ اس خبر میں آگے چل کر یہ نویدِ جاں فزا بھی سنائی گئی ہے کہ ع

زمیں پہ آئیں گی راجہ کے ساتھ سب پریاں

اور یہ کہ ان پریوں کا گانا غضب کا اور ناچ قیامت کا ہے ع

غضب کا گانا ہے اور ناچ ہے قیامت کا

اس ابتدائی تعارف کا ایک مصرع اہلِ بزم کے اندازِ نشست کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے۔ راوی راجہ کی مختصر سی مدح کے بعد سامعین سے کہتا ہے کہ ع

دو زانو بیٹھو قرینے کے ساتھ محفل میں

اس ابتدائی غزل سے اسٹیج کی جو مُبہم سی تصویر نظر کے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک فرشی نشست آراستہ ہے، جس میں اندر اور اس کی پریاں کے مشتاق ناچ دیکھنے اور گانا سننے کے منتظر بیٹھے ہیں۔ محفل میں نہ جانے کدھر سے ایک شخص آ جاتا ہے اور انہیں راجا اندر اور اس کی پریوں کے آنے کی خوش خبری دیتا ہے۔ یہ شخص جسے ہم راوی کہہ سکتے ہیں محفل میں کدھر سے آیا، کدھر سے نہیں، اس کا اندر سبھا پڑھنے والے کو کوئی علم نہیں ہوتا۔

جن لوگوں نے نوٹنکی اور رہس کے اسٹیج دیکھے ہیں اور جنہیں معلوم ہے کہ اندر سبھا اسی علاقہ کی ایک پیہر ہے جہاں نوٹنکیاں اور رہس گاؤں اور شہر میں بہت عام اور خاص سے مقبول تھے اور محلہ ٹولے والے اپنے گھروں سے کچھ تخت اور چوکیاں لا کر اور ان کے نیچے اینٹیں اور روڑے لگا کر ایک ایسی ہموار سطح بنا لیتے تھے جس پر نوٹنکی اور رہس کے کردار اور سامعین و ناظرین ایک گھیرا سا بنا کر بیٹھ جاتے تھے اور راوی کے تعارف کے بعد جس کردار کی باری ہوتی تھی وہ وہیں سے کھڑا ہو کر اپنا پارٹ ادا کرتا تھا اور پھر وہیں بیٹھ جاتا تھا۔ اندر سبھا کی یہ ابتدائی غزل پڑھ کر بھی نوٹنکی اور رہس کے اسی ابتدائی اسٹیج کا نقشہ نظر کے سامنے آتا ہے، اس میں ایک طرح کے قرینے اور خوش سلیقگی کی جھلک البتہ دکھائی دیتی ہے۔

راوی اپنا کام ختم کر چکتا ہے تو راجا اندر سامعین کے سامنے آتا ہے اور اپنے حسب حال چند شعر پڑھتا ہے۔ راوی اپنی بات کہہ کر کدھر گیا اور اندر کدھر سے آیا، اس کا اندازہ اندر سبھا کے مطالعہ سے نہیں ہوتا۔ راجا اندر کے شعروں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ دیووں سے محفل سجانے کو کہتا ہے، اور پھر اپنی اس خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ میں آج یہاں جلسہ کروں گا ــــ جاؤ، پریوں کو جلدی سے بلا کر لاؤ۔

راجا اندر کے اس حکم پر دیو کیا کرتے ہیں، کیا نہیں کرتے، کہاں جاتے ہیں، کدھر سے جاتے ہیں ــــ اس کا کوئی اشارہ اندر سبھا میں موجود نہیں ــــ بس جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ راجا کے اس حکم کے ساتھ ہی پریاں آئیں اور محفل میں مجرا کریں، راوی پھر محفل میں آ جاتا ہے اور پکھراج پری کی آمد کی خبر اس طرح سناتا ہے ع

محفلِ راجہ میں پکھراج پری آتی ہے

جن چار شعروں میں پکھراج پری کی آمد کی خبر سنائی گئی ہے۔ ان میں اس کے حسن و ناز کی طرف بھی بعض اشارے ہیں۔ اس کے فوراً بعد پکھراج پری سامنے آ جاتی ہے اور اپنی تعریف میں نو شعر پڑھتی ہے اور راجہ کو دعا دے کر گانا شروع کر دیتی ہے ــــ پہلے ایک ٹھمری گاتی ہے، پھر ایک بسنت، پھر غزل بسنت اور اس کے بعد علی الترتیب ایک ہولی اور تین غزلیں۔ پکھراج پری یہ سات چیزیں گا چکتی ہے تو راجا اندر اس کی تعریف کرتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ تو آ کر میرے پہلو میں بیٹھ جا۔

اب نیلم پری کی باری ہے۔ ظاہر ہے کہ پکھراج پری نے اس حکم کی تعمیل کی ہوگی، لیکن اندر سبھا میں ایسا کوئی اشارہ نہیں جس سے اس قیاس پر یقین کی مُہر ثبت کی جا سکے۔ محفل کا یہ انداز یوں ہی جاری رہتا ہے۔ پکھراج پری کے بعد نیلم پری آتی ہے، پھر لال پری اور پھر سبز پری۔ نیلم پری اور لال پری کا تعارف راوی اسی طرح کراتا ہے، جس طرح پکھراج پری کا تعارف ہوا ہوتا ہے، دونوں پریاں محفل میں آتی ہیں تو خود اپنے حسب حال کچھ شعر پڑھ کر کئی کئی چیزیں گاتی ہیں اور اپنی اپنی باری پر ناچنے گانے کے بعد راجہ اندر کی خواہش پر اس کے پاس جا کر بیٹھ جاتی ہیں۔

لال پری کے بعد سبز پری محفل میں آتی ہے۔ اس کا تعارف ہوتا ہے، خود اپنے حسب حال وہ کچھ شعر پڑھتی ہے لیکن اس دوران میں راجہ کو نیند آ جاتی ہے، اس پر سبز پری کہتی ہے ؎

راجہ جی تو سو گئے دیا نہ کچھ انعام
جاتی ہوں میں باغ میں یاں میرا کیا کام

دوسرے مصرعے کے بعد کیا ہوا، کیا نہیں ہوا، سبز پری باغ میں گئی یا نہیں گئی۔ اس کا اندازہ کسی بات سے نہیں ہوتا، البتہ اس شعر کے فوراً بعد ہی قصہ کا آغاز ہو جاتا ہے۔

سبز پری کالے دیو سے کہتی ہے کہ میں جب راجہ کے پاس آ رہی تھی تو میں نے ایک بام پر ایک شہزادے کو سوتے دیکھا۔ اس کا "جوبن" دیکھ کر میری جان نکل گئی۔ میں کلیجے پر تیر کھا کر نیچے اتری۔ اسکی صورت دیکھ کر میرا دل بے قرار ہو گیا اور میں نے اس کے منہ پر منہ رکھ کر خوب پیار کیا ــــــــ

اب میرا حال یہ ہے کہ میرا جی محفل میں بالکل نہیں لگتا، اس لئے تو اگر شاہزادہ کو اٹھا لائے تو میں تیری لونڈی

ہو جاؤں [1]

اس پر کالا دیو سبز پری سے شہزادے کا اتا پتا پوچھتا ہے، وہ اُسے پتا سمجھاتی ہے۔

سبز پری اور کالے دیو کا یہ مکالمہ ادبی حیثیت سے بڑا معمولی ہے۔ مصرعوں میں نہ الفاظ کا انتخاب بہت اچھا ہے اور نہ ان کی ترتیب درست ہے لیکن جو چیز پڑھنے والے کو سب سے زیادہ کھٹکتی ہے یہ ہے کہ سبز پری کے کالے دیو کو شہزادہ کا پتا بتانے اور کالے دیو کے شہزادے کو لے کر آجانے میں ایک لمحہ کا وقفہ بھی نہیں ——— یعنی ہماری داستانوں اور معمولی قصّوں کی طرح اندرسبھا بھی زمان و مکان کے تصور سے قطعی عاری و ناآشنا ہے۔ اس اعتراف کے باوجود کہ دیو اور پریاں غیر معمولی فوق الفطرت قوتوں کے حامل ہیں اور زمان و مکان کا فعل ان کی ان قوتوں کی بدولت بالکل بے حقیقت اور بے معنی بن کر رہ جاتا ہے، پڑھنے والا یہ کسی طرح بھی یقین نہیں کرسکتا کہ کالا دیو سبز پری کے منہ سے آخری بول سُنتے ہی پرستان سے سنگل دیپ (اختر نگر) پہنچ جاتا ہے اور شہزادہ کو تلاش کرکے آن کی آن میں سبز پری کے پاس لے آتا ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ کالے دیو کو شہزادہ تک پہنچنے اور اُسے اٹھا کر لانے میں کچھ دیر ضرور لگی ہوگی ——— سوال یہ ہے کہ اس وقفہ میں سبھا یا محفل میں (یا یوں کہہ لیجئے کہ اسٹیج پر) کیا ہوتا رہا؛ یہ ایک معمہ ہے۔ بہرحال اب اور آگے چلئے۔

کالا دیو شہزادے کو سبز پری کے پاس پہنچا دیتا ہے اور سبز پری کہتی ہے کہ ہاں "میری جان اور میرا دلدار یہی ہے"۔

اس کے بعد سے اندرسبھا میں جتنے عنوان آتے ہیں اُن میں ہر جگہ ہلکے ہلکے اشارے ایسے موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف نے حرکات و سکنات کے سلسلہ میں ان کی رہنمائی کی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ کردار جو کچھ کریں یا جو کچھ کہیں اس سے اُن کے جذبات کا بھی اندازہ ہو اور دیکھنے والوں کے لئے کسی نہ کسی تاثر کے حاصل کرنے کا موقع بھی فراہم ہو۔ اس مقام کے بعد جتنے عنوان آتے ہیں اُن پر ایک نظر ڈال لیجئے تو اس بات کی وضاحت ہو جائے جو میں کہہ رہا ہوں: ———

۱۔ جگانا سبز پری کا، شہزادہ کو شٹ نہ بلا کر
۲۔ جاگنا شہزادہ کا، عالمِ حیرت میں بے تاب ہوکر
۳۔ گانا شہزادہ کا، عالمِ حیرت میں بے تاب ہوکر
۴۔ کہنا سبز پری کا لال دیو سے، عالمِ یاس میں
۵۔ پوچھنا راجہ اندر کا لال دیو سے غضب ناک ہوکر
۶۔ جانا لال دیو کا پاس گلفام کے اور پوچھنا طیش کھا کر
۷۔ لانا لال دیو کا گلفام کو کھینچ کر
۸۔ عرض کرنا گلفام کا راجہ اندر سے عالمِ ہراس میں
۹۔ عرض کرنا سبز پری کا راجہ اندر سے اور نادم کرنا گلفام کو اور رونا گلے لپٹا کر
۱۰۔ نکالنا سبز پری کو اکھاڑے سے پر نوچ کر
۱۱۔ جواب جوگن کا طرف کالے دیو کے اور طعن آمیز لگاوٹ کرنا بعد اس کے۔

ان سب مثالوں سے یہ بات صاف طور پر سامنے آتی ہے کہ مصنف چاہتا ہے کہ محفل میں (یا اسٹیج پر) کردار جو کچھ کہیں یا کریں اس میں اُن کے جذبات و احساسات کی کیفیت نمایاں ہو اور اس کیفیت کا اظہار حرکات و سکنات سے ہوتا ہے۔ اسٹیج پر حرکات و سکنات کی جو اہمیت ہے، اگر مصنف کو اس کا احساس نہ ہوتا تو وہ عنوانات میں اس طرح

---

[1] اندرسبھا میں یہ سب باتیں اس طرح ادا ہوئی ہیں ؎

سن رے کالے دیو سے تو اک میری بات — آئی تھی راجہ کے گھر میں جو میں آج کی رات
شہزادہ اک بام پر سوتا تھا نادان — جوبن اس کا دیکھ کر نکلی میری جان
اتری اپنے تخت سے تیر کلیجہ کھا — سوتا وہ بے خبر تھا ہاتھ پاؤں پھیلا
صورت اس کی دیکھ کر دل سے گیا قرار — منہ پہ منہ میں نے رکھا، خوب سا کیا پیار
دل میرا لگتا نہیں محفل کے درمیان — قالب میرا ہے یہاں، واں ہے میری جان
اُس کو گر تو لا اٹھا جلدی جا کر یار — لونڈی میں ہو جاؤں گی تیری بے تکرار

کے اشارے دینے کو ضروری نہ جانتا۔ اندر سبھا کے عنوانات میں ان اشاروں کی موجودگی کو اردو ڈرامے میں اسٹیج کی ایک ضروری اور ناگزیر روایت کا آغاز سمجھنا چاہیئے۔

اندر سبھا میں جس جگہ سے قصہ شروع ہوتا ہے بعض باتیں اور بھی ایسی آتی ہیں جنہیں ڈرامے کے فن کے ضروری اجزا سمجھا جاتا ہے —— اور اندر سبھا کے مصنف نے ان باتوں کو اردو میں برت کر انہیں اردو ڈرامے کی روایت کا جزو بنایا۔

اس سلسلہ کی پہلی بات تو یہ ہے کہ کہانی کے کردار آپس میں جو باتیں کرتے ہیں ان سے کہانی سننے اور دیکھنے والے کو بعض ایسی چیزوں کا علم ہوتا رہتا ہے جن کی مدد سے کہانی ان کے لئے دلچسپ بھی بنتی ہے اور آہستہ آہستہ آگے بھی بڑھتی ہے۔ ان مکالموں میں کبھی کبھی ایسی چیزیں بھی آجاتی ہیں جن سے سامع اور ناظر کا اشتیاق بڑھتا ہے اور وہ سوچتا ہے کہ دیکھئے اب کیا ہو —— شہزادہ گلفام اور سبز پری کی گفتگو اور ان کے سوال جواب اسی انداز کے ہیں۔

دوسری بات جو ڈرامائی نقطۂ نظر سے کسی طرح پہلی بات سے کم اہم نہیں یہ ہے کہ کردار مختلف موقعوں پر جو گانے گاتے ہیں وہ مجموعی حیثیت سے کردار کے جذبات اور دلی کیفیات کے ترجمان بھی ہوتے ہیں اور ایک خاص طرح کے ماحول سے ذہنی و جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنے میں سامع و ناظر کے لئے مد ثابت ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر شہزادہ گلفام کا وہ گانا پیش کیا جا سکتا ہے جو اس نے بقول مصنف "حالت اضطرار میں" گایا تھا۔

ایک تیسری بات جو پڑھنے والے کو واضح طور پر محسوس ہوتی ہے یہ ہے کہ اندر سبھا کا مصنف مثنوی کی عام مقبولیت سے متاثر ہے اور خصوصاً مثنوی میر حسن کے قبول عام نے اسے اس بات پر مجبور کیا ہے کہ وہ جب سبز پری کو جوگن کا بھیس دے تو اس کا رنگ روپ مثنوی میر حسن والی جوگن سے ملتا جلتا ہو۔ گلفام کو چاہِ قاف میں قید کرنے کا تصور بھی قیاس کہتا ہے کہ مثنوی گلزارِ نسیم کے اس حصہ سے لیا گیا ہے جس میں بکاؤلی کے قید ہونے کا مذکور ہے۔ اس طرح دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اندر سبھا کی محفل آراستہ کرنے اور اس میں قصے کے اجزا شامل کرتے وقت امانت کے سامنے مثنوی کا فنی تصور موجود تھا۔ اور یوں گویا ایک طرف مثنوی اور دوسری طرف رہس اور نوٹنکی دو ایسی چیزیں ہیں جنہوں نے امانت کو ایک ایسی کہانی کا خاکہ مرتب کرنے میں مدد دی جو پڑھنے کے لئے نہیں بلکہ محفل میں (یا اسٹیج پر) پیش کرنے کے لئے ہو۔ اور جب ذہن میں یہ تصور قائم ہو گیا کہ جو لکھا جا رہا ہے وہ پڑھنے کے لئے نہیں بلکہ اسٹیج پر پیش کرنے کے لئے ہے تو اس سے وہ چند باتیں پیدا ہوئیں جن کی طرف ابھی اشارہ کیا گیا ہے اور جنہیں اردو کے اسٹیج ڈرامے کی روایت کے بنیادی عناصر سمجھنا چاہیئے —— اگر ان کہی ہوئی باتوں کو دہرانے میں کوئی مضائقہ نہ ہو تو یوں سمجھئے کہ مکالمے کے ذریعے جذبہ اور احساس کا اظہار، مکالمہ کی مدد سے قصہ کے بعض اجزا کی وضاحت قصہ کو آگے بڑھانا، دیکھنے والوں کے اشتیاق کا سامان پیدا کرنا اور عنوانات میں کرداروں کو یہ بتانا کہ وہ اپنی حرکات و سکنات سے اپنے جذبات و احساسات کا کس طرح اظہار کریں اور کس طرح داخلی کیفیت اور خارجی اظہار کو ہم آہنگ بنائیں اس روایت کی کڑیاں ہیں۔

اندر سبھا کا مطالعہ ہمیں فن کی حیثیت سے اس سے آگے نہیں لے جاتا۔ نہ وہ اسٹیج کی ظاہری صورت کا کوئی واضح تصور قائم کرنے میں ہماری کوئی رہنمائی نہیں کرتا، زمان و مکان کے وقفوں کی پیچیدگیوں کو حل کرنے کے بجائے وہ انہیں اور زیادہ الجھا دیتا ہے۔ کرداروں کے لباس اور وضع قطع کے بارے میں بھی اس میں صرف چند مبہم اشارے ہیں اور اس لئے اندر سبھا کو اردو کے اسٹیج ڈرامے کی روایت کا پہلا غیر فانی نقش کہنے والا شاعرانہ مبالغہ کا مجرم ٹھہرتا ہے۔ لیکن یہ ساری مشکلیں خود امانت نے حل کر دی ہیں۔ اندر سبھا کی تصنیف کے ساتھ ساتھ انہوں نے "شرح اندر سبھا" کے نام سے ایک رسالہ بھی تصنیف کیا تھا اور اندر سبھا کے پہلے ایڈیشن کے ساتھ سنہ ۱۲۷۰ھ میں یہ بھی شائع ہوا تھا۔ "شرح اندر سبھا" میں امانت نے اندر سبھا کی تصنیف اور اس کے اسٹیج کئے جانے کے سلسلہ میں اتنی تفصیلی بحث کی ہے کہ جو فنی سوالات اندر سبھا کے متعلق پڑھنے والے کے سامنے آتے ہیں، اور جو الجھنیں اندر سبھا پڑھ چکنے کے بعد اس کے فن کے متعلق ذہن میں پیدا ہوتی ہیں، شرح اندر سبھا کے مطالعے سے ان سب کا جواب اور حل مل جاتا ہے۔

"شرح" کے ابتدائی حصہ میں حمد، نعت، منقبت اور بادشاہِ وقت کی مدح کے بعد اندر سبھا کا سبب تالیف بیان کیا ہے اور ہمیں بتایا ہے کہ یہ کتاب انہوں نے اپنے ایک دوست مرزا عابد علی عبادت کے کہنے سے لکھی۔ شوال کی چودھویں تاریخ ۱۲۶۸ھ کو اندر سبھا کی تصنیف

شروع ہوئی اور اس کی تکمیل میں ڈیڑھ برس لگا [1]

اس تمہید کے بعد "شرح اندر سبھا" شروع ہوتی ہے۔ یوں تو اندر سبھا کے سمجھنے، اس کے فنی مرتبہ کا اندازہ لگانے اور اسے اسٹیج کرنے کے لئے شرح کا ایک ایک لفظ پڑھنا ضروری ہے اور اس کے مکمل مطالعہ کے بغیر اندر سبھا کی صحیح حیثیت کا اندازہ لگانا ناممکن ہے لیکن اس کا ابتدائی حصہ خاص طور پر اہم اور دلچسپ ہے۔ ابتدائی حصہ کی عبارت ملاحظہ کیجیے:

"جب ساری محفل لوگوں سے بھر جاتی ہے اور آدھی رات آتی ہے، ہر شخص قرینے سے پیچھے ہٹایا جاتا ہے۔ آگے کرسیاں رکھی جاتی ہیں، تخت بچھایا جاتا ہے .... سازندے محفل میں آکر کھڑے ہوتے ہیں۔ ساز ملا کر دوربینوں کے ہوش کھوتے ہیں۔ سُرخ پردہ زرنار مثل لکۂ شفق گلنار محفل میں تانا جاتا ہے۔ راجا اندر پردے کے پیچھے آکر ٹھہر ٹھہر کر گھنگھرو بجاتا ہے۔ سارنگی چکارے سے ملائی جاتی ہے۔ اور اس طرح گائی جاتی ہے ؎

سبھا میں دوستو اندر کی آمد آمد ہے
پری جمالوں کے افسر کی آمد آمد ہے

جب آمد تمام ہوتی ہے، پردہ اٹھتا ہے، مہتاب چھٹتی ہے۔ راجا اندر خلعتِ فاخرہ زیب بدن کلاہِ زریں برسر، کمر میں دوپٹہ زرتار یا رومال آنچل دار باندھے ہوئے، دو دیو راس و چپ بشکل عجیب، چہرے مہیب، دہانے کھلے ہوئے، دانت بڑے بڑے، چپٹی ناک، ہاتھوں میں گرز، بدن میں تنگ پوشاک، محفل پر ہیبت کی نگاہ، ایک کا رنگ سُرخ، ایک کا سیاہ، راجا ہمراہ لے کر محفل میں آتا ہے، جو بول اپنے حسب حال گاتا ہے، ناچ کا انداز دکھاتا ہے، گھنگھرو تال پر بجاتا پھر صاحبِ محفل کو سلام کر کے تخت پر بیٹھ جاتا ہے۔ پکھراج پری کو یاد فرماتا ہے۔ ایک دیو پیچھے کھڑا رہتا ہے، دوسرا پری کے لینے کو جاتا ہے۔ پھر پردہ تنتا ہے، ساز ملائے جاتے ہیں آمد کے شعر اس طرح گائے جاتے ہیں ؎

محفل راجہ میں پکھراج پری آتی ہے

....

جب آمد گائی جا چکتی ہے، پردہ اٹھتا ہے، مہتاب چھٹتی ہے۔ پکھراج پری، ناز کی بھری اس انداز سے گت ناچتی ہوئی نکلتی ہے کہ عاشق مزاجوں کی بُری گت بنتی ہے ...... چمپئی جوڑا بھاری بیل، گوکھرو کرن کی تیاری اس چمک دمک کی، اس کے پَرمیں ہے کہ چکا چوند ستاروں کی نظر میں ہے۔ زردوزی پر اس طرح تیاری کے سانچے میں ڈھلے ہیں کہ بازو اڑ چلے ہیں۔ گاتی کا دوپٹہ چمک میں برق ہے، کلاہ زریں بالائے فرق ہے .... جب سنہری پشواز کا دامن توڑوں کے چکر میں ہل جاتا ہے، گویا محفل میں گیندے کا تختہ کھل جاتا ہے۔ سازندوں میں کھڑے ہو کے، ایک پاؤں ناز سے آگے دھرتی ہے، اس طرح اپنے حسب حال شعر خوانی کرتی ہے ؎

گاتی ہوں میں اور ناچ سدا کام ہے میرا
آفاق میں پکھراج پری نام ہے میرا

شعر خوانی تمام کر کے چھند کہتی ہے، چھند کے بعد ٹھمری گاتی ہے، ٹھمری کے بعد ہولی کی فصل میں ہولی، نہیں تو غزلیں گاتی ہے۔

---

[1] جن الفاظ میں عابد علی عبادت نے امانت کو اندر سبھا لکھنے پر آمادہ کیا وہ یہ ہیں:

"بیکار بیٹھے بیٹھے گھبرانا عبث ہے۔ ایسا کوئی جلسہ کے طور پر طبع زاد نظم کیا چاہیئے کہ دو چار گھڑی دل لگی کی صورت ہووے اور خلق میں مقبولیت ہووے۔"

اس عبارت میں جلسہ کا لفظ قابل توجہ ہے ــــ امانت نے اس جلسہ کی تالیف و تکمیل کے سلسلہ میں شرح میں جو الفاظ لکھے ہیں وہ یہ ہیں:

"چودھویں تاریخ شوال کی ۱۲۶۸ھ میں اندر سبھا اس جلسہ کا نام رکھ کر بجائے چہار باب چار پریاں قرار دے کر شروع کیا۔ ڈیڑھ برس میں جلسہ تیار ہوا۔"

لفظ جلسہ بظاہر ناٹک کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

ناچ کا رنگ دکھاتی ہے، محفل کو وجد میں لاتی ہے۔ راجہ اندر محظوظ
ہو کر کچھ فقرے زبان پر لاتا ہے، پکھراج پری کو اپنے پاس بلاتا ہے
پہلو میں بٹھاتا ہے۔ نیلم پری کو یاد فرماتا ہے۔ دیو لیٹنے کو جاتا ہے۔"

شرح اندر سبھا کے اس ابتدائی حصہ سے اندر سبھا کی اسٹیج کی ایک
واضح تصویر بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے اور اس کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے
کہ اسٹیج کی جو ہدایات امانت نے اندر سبھا کے عنوانات میں اشاروں کی صورت
میں دی ہیں ان کی تکمیل شرح کی تفصیلات کے ذریعہ ہوتی ہے۔ ابتدائی
حصہ کے الفاظ پڑھ کر اسٹیج کی ظاہری ہیئت کے متعلق ہم آسانی سے
مندرجہ ذیل نتیجے نکالتے ہیں:

(۱) اندر سبھا کا یہ جلسہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ لکھنؤ کے امرا
کی محفلِ رقص یا مجرے سے ملتا جلتا ہے کسی کشادہ جگہ میں محل سرا کے
اندر یا باہر مکلف فرش بچھایا جاتا ہے۔ چاروں طرف گاؤ تکیے لگا دیئے
جاتے ہیں اور اہل محفل ان تکیوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ مجرا
شروع ہونے سے پہلے سازندے محفل کے درمیان میں آتے ہیں۔ مجرا
شروع ہونے سے پہلے ساز ملائے جاتے ہیں اور پھر رقاصہ اپنے
انداز خاص سے رقص و سرود کا کمال دکھاتی ہے ـــ بالکل یہی صورت
اس جلسہ کی ہے۔ یہاں بھی اہل محفل کے بیٹھنے کا انداز اور ترتیب
وہی ہے جو رقص و سرور کی محفلوں میں ہوتا ہے ـــــ امانت کے
تخیل اور تصور نے اس میں بعض رنگ البتہ نئے شامل کئے ہیں محفل میں
کرسیاں رکھی جاتی ہیں اور تخت بچھایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ انتظام
اندر اور اس کی پریوں کے لئے ہے۔ دوسری خاص چیز پردہ کا ذکر
ہے۔ سُرخ پردہ تانا جاتا ہے اور آمد کے ختم ہوتے ہی اٹھتا ہے اور
مہتاب چھٹتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں اندر سبھا کے جلسہ کو محفل اور اسٹیج
کے درمیان کی ایک چیز بنا دیتی ہیں۔

(۲) راجہ اندر اور پکھراج پری کے لباس کی جو تفصیلات شرح میں
بیان کی گئی ہیں وہ اتنی واضح ہیں کہ انہیں اسٹیج پر لانے سے پہلے اس لباس
میں ملبوس کرنا آسان ہے۔

(۳) دیووں کے متعلق اندر سبھا کے ابتدائی حصہ میں جو باتیں کہی
گئی ہیں وہ اس قدر غیر واضح ہیں کہ انہیں اسٹیج پر لانے کے لئے ہدایت کار
کو اپنی ذہانت تصور اور تخیل کے سوا اور کسی چیز سے مدد نہیں ملتی شرح میں
ان کا حلیہ بھی اچھی طرح بیان کیا گیا ہے اور ان کی جگہیں بھی صحیح طریقہ
پر متعین کی گئی ہیں۔ یہ بات بھی صاف کر دی گئی ہے کہ دیووں کی تقسیم کار
کیا ہوگی، کون راجہ کی سبھا میں موجود رہے گا اور کون راجہ کے حکم پر پری
کو بلانے جائے گا۔

(۴) امانت نے اپنے واضح اشاروں کی مدد سے محفل، سبھا یا جلسہ کا
سماں پیش کرنے کو بھی خاص اہمیت دی ہے۔ رقص کرنے والی پری کے انداز
سے جو ظاہری تصویر بنتی ہے اس کے علاوہ وہ نقش بھی نظر کے سامنے لائے
ہیں جس میں سامعین اور ناظرین کے تاثرات کا رنگ شامل ہے۔ مثلاً
ان چند سطروں میں بین طور پر یہ دونوں خصوصیتیں موجود ہیں۔

"شائقوں کے دل میں درد ہے۔ غرض اپنے عالم میں فرد ہے، جب
شہری پشواز کا دامن توڑوں کے چکر میں ہل جاتا ہے، گویا محفل میں
گیندے کا تختہ کھل جاتا ہے۔ سازندوں میں کھڑے ہو کے ایک پاؤں
ناز سے آگے دھرتی ہے اور اس طرح اپنے حسب حال شعر خوانی
کرتی ہے ؎

گاتی ہوں میں ...."

اندر سبھا میں اسی انداز سے چار پریوں کا ناچ گانا ہوتا ہے۔
شرح اندر سبھا میں ہر پری کی آمد کا حال اسی تفصیل سے لکھا گیا ہے
نیلم پری، لال پری اور سبز پری ہر ایک کی آمد سے پہلے سُرخ پردہ تانا
جاتا ہے، اور آمد گائی جاتی ہے۔ آمد کے بعد پردہ اُٹھتا ہے، اور
مہتاب چھٹتی ہے۔ اس کے بعد ہر پری کے لباس اور اس کے انداز کا
ذکر اسی تفصیل سے کیا گیا ہے جیسے پکھراج پری کا۔ بالآخر سبز پری کے
سبھا میں آتے ہی راجہ کو نیند آجاتی ہے اور دیو پاؤں دبانے
لگتا ہے۔

دیو کا پاؤں دبانا اندر سبھا میں نہیں ـــــ دیو کا یہ فعل اس خلا کو
پورا کرتا ہے جو راجہ کے سو جانے کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔

اس کے بعد شرح میں ایک ایسے باب کی تفصیل ہے جو اندر سبھا
میں قطعی ندارد ہے اور جس کا حال ہمیں صرف ان تین چار شعروں سے
معلوم ہوتا ہے جو ہم سبز پری کی زبان سے سنتے ہیں۔ یہ بات سبز پری
کے اپنے گھر سے روانہ ہونے اور راجا کی محفل میں پہنچنے کے درمیان
کے واقعات سے متعلق ہے۔ اس کے بیان میں امانت نے ایسا کمال
دکھایا ہے کہ پڑھنے والے کے سامنے واقعات کی تفصیل کچھ اس طرح
آجاتی ہے جیسے وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ شرح

اندرسبھا کا یہ حصہ خاصا طویل لیکن فنی حیثیت سے اور اپنی محاکاتی خوبیوں کے اعتبار سے بڑا اہم ہے اس لئے پورا نقل کئے بغیر چارہ نہیں۔ امانت اس باب کو اس طرح شروع کرتے ہیں کہ ادھر کا حال تو ادھر دیکھو۔ اُدھر کا ماجرا سنو۔ اب سنئے کہ اُدھر کا ماجرا کیا ہے:۔

"سبزپری...... سولہ سنگار کر کے جو اپنے باغ سے اڑی، تو چاندنی کی کیفیت دیکھتی ہوئی ہندوستان کی طرف مُڑی۔ عجب چاندنی کا وفور تھا کہ زمانہ پُر نور تھا ؎

ہر اک شے پہ تھا ماہ پرتو فگن
عجب رات تھی وہ بقولِ حسن
وہ چھٹکی ہوئی چاندنی جابجا
وہ جاڑے کی آمد وہ ٹھنڈی ہوا
وہ نکھرا فلک اور مہ کا ظہور
دگا شام سے صبح تک وقتِ نور[1]

سیر کرتی چلی جاتی تھی کہ پرتوِ ماہ سے روئے زمین پر ایک ستارہ سا چمکتا نظر آیا۔ دل اس کا آتشِ عشق نے جلایا۔ راہ الفت میں سر دست قدم مارا۔ اپنے تئیں آہستہ آہستہ ہوا سے نیچے اُتارا۔ زمین کے قریب پہنچا کیا دیکھتی ہے کہ ایک باغ مرسبز ہے۔ اس کے بیچ میں ایسی ایک لال بارہ دری ہے کہ ہم مسلک یاقوت ہے، مرجان سے کھری ہے اس کے کوٹھے پر تخت سے اتر کر کیا عالم نظر آیا کہ سب در دیوار دو شالہ،

---

[1] اس جگہ ان اشعار کی موجودگی مثنوی میرحسن کے اثر کی شاہد ہے ـــ اسی داستان میں جب سبزپری شہزادے کی انگلی میں چھلا پہنا کر رخصت ہوتی ہے تو میرحسن کا یہ شعر پڑھتی ہے ؎

کرم مجھ پہ رکھیو سدا میری جاں
میں دل چھوڑے جاتی ہوں اپنا نشاں

شرح اندرسبھا میں آگے چل کر ہمیں موقعے اور ایسے آتے ہیں جہاں مثنوی میرحسن کے شعر دہرائے جاتے ہیں۔ ایک موقع وہ ہے جب راجا شہزادہ کو غصہ سے دیکھتا ہے اس کا ذکر امانت نے یوں کیا ہے:

"راجا نے غصہ سے شہزادے کی طرف دیکھا اور بقولِ حسن ؎

اسے دیکھ غصہ میں وہ ڈر گیا
کہے تو کہ جیتے ہی جی مر گیا

دوسرا موقع وہ ہے جب سبزپری جوگن کا بھیس بھر کر شہزادہ کی یاد میں اِدھر اُدھر پھرتی ہے۔ اس جگہ امانت نے مثنوی میرحسن کے سات شعر نقل کئے ہیں ؎

خوش آیا اسے جوگ کا یہ مرن
کہ غش کر گئی وہ بقولِ حسن

....

اور آگے چل کر جوگن کے جسم پر بھبوت دیکھ کر امانت کو میرحسن کا یہ شعر یاد آتا ہے ؎

کرے حسن کو کس طرح کوئی ماند
چھپے ہے کہیں خاک ڈالے سے چاند

اور آخری موقع وہ ہے جب گلفام کو کنوئیں سے نکالا گیا ہے، اس جگہ شرح اندرسبھا میں یہ اشعار درج ہیں ؎

کنوئیں سے جو نکلا وہ گل پیرہن
کہوں حال کیا میں بقولِ حسن (وغیرہ)

ہیں، نیند کے نشے سے بے ہوش ہیں۔ پچھلا پہر، نورِ قمر، ہوا کی سنک سنک، گھڑیال کی کھنک۔ درختوں کی پتیوں کا موجِ نسیم سے آہستہ آہستہ کھڑکنا، جگنوؤں کا چاندنی میں ہوا پر چمکنا، سکتے ہیں در و دیوار، سوئے سنسار، جاگے پاک پروردگار، چاندنی کہتی تھی کہ آج نکل کے کبھی نہ لکاؤں گی۔ یہ حال دیکھ کر حیران ہوگئی۔ آگے جو بڑھی تو سفید چاندنی کا فرش پایا کہ چشمِ انصاف نے چاندنی چاندنی کو داغ لگایا۔ ایسا فرش صاف بروئے زمیں ہے کہ خواب میں بھی نہیں ہے یہی جی چاہتا ہے کہ ہاتھ پاؤں پھیلا کے سو رہئے ——— ایک طرف کیا دیکھتی ہے کہ چاندی کی صراحیاں اور کوری کوری جھجریاں، سفید بہین بھیگے ہوئے کپڑے سے لپٹی ہوئی۔ ٹھنڈے پانی سے بھری ہوئی دھری ہیں۔ قریب اس کے چوکی پر لوٹا، لٹیا تھالی جوڑ چاندی کا دھرا ہوا ہے۔ ایک گلاس بلوری الماس تراش اس میں لگا ہوا رکھا ہے۔ آگے بڑھی تو کیا دیکھا کہ فرش کے کنارے پر پلنگڑی ایک چاندی کی بچھی ہوئی ہے، محمودی کی چادر کھنچی ہوئی ہے۔ پلنگڑی کے آگے ایک سفید قالیچہ لگا ہوا ہے تکیے بدستور رکھے ہوئے ہیں۔ پلنگ کے پاس ایک نازنین خواص سفید جوڑا پہنے ہوئے، چاندی کا پاندان کھول کے پان لگا رہی ہے نیند جو آئی تو ایک ہاتھ میں پان، پٹی پر سر رکھ کے سو گئی یہ دیکھ کے پلنگ پر جو پاؤں رکھا تو ہک دک ہوگئی۔ دیکھا کہ ایک شہزادہ، چاند سے نور میں زیادہ، تیرہ چودہ برس کا سن، عروجِ حسن کے دن، اس طرح متوالا نیند میں سو رہا ہے کہ گردن تکیے سے گری ہوئی ہے، مچھلی بازو کی ابھری ہوئی ہے۔ پان دہنِ نازک میں دبے ہوئے ہیں۔ ہار ستانے کے تلے دبے ہوئے ہیں پھولوں کی ہر رگ رخسارِ نازک میں گڑ دی ہوئی۔ لٹ زلفِ عنبر بو کی چہرے پر پڑی ہوئی ایک ہاتھ سینے پر، ایک ہاتھ تکیے کے نیچے رکھے بے خبر سو رہا ہے . . . . . .

دو خواصیں باریاں ارنیاں . . . . . ساقِ بلوریں پر ہاتھ رکھے ہوئے، ڈر دل سے نکالے ہوئے، سرگھٹنوں میں ڈالے بیٹھے سو رہی ہیں . . . . . . یہ حال دیکھ کے سبز پری کو تاب نہ رہی بے تاب ہو کر شہزادے کے منہ پر منہ رکھ دیا۔ چہرۂ صاف کا جلوہ دیکھ کر نشۂ عشق کا چڑھا۔ آسمان کی طرف مخاطب ہو کر یہ شعر امانت کا پڑھا ؎

فلک یہ تو ہی بتا دے کہ حسن خوبی میں
زیادہ تر ہے ترا چاند یا ہمارا چاند

یہ کہہ کے شہزادے کے دونوں رخسارے دستِ نازک سے دبا کر، ہونٹوں کو سمٹا کر بوسہ لبِ دنداں کا لیا اور خوب گلے لپٹایا۔ جب شہزادہ نیند میں کسمسایا تو اس نے زمرد کا چھلا اپنے ہاتھ سے اتار آہستہ شہزادے کی انگلی میں پہنایا اور الگ ہٹ کر یہ شعر حسن کا سنایا ؎

کرم مجھ پہ رکھیو سدا میری جاں
میں دل چھوڑے جاتی ہوں نیا نشاں

یہ کہہ کے سر سے پاؤں تک شہزادے کی بلائیں لے کے خدا کی پناہ میں دے کے، ہونٹ دانتوں میں دبائے ہوئے، صبح ہونے کے ڈر سے، خیالِ راجہ اندر سے تخت پر بیٹھ کر اکھاڑے کی طرف روانہ ہوئی۔"

شرح اندر سبھا کے اندر اقتباس کی ڈرامائی حیثیت اور اہمیت واضح ہے۔ امانت نے بڑی تفصیل سے واقعہ کی وہ ساری جزئیات بیان کی ہیں، جن سے مختلف کرداروں کو اپنی حرکات و سکنات کے متعلق واضح اشارے مل جاتے ہیں اور شہزادہ، کنیزیں پری سب کو بغیر کسی شبہ کے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک کو اسٹیج پر کیا کیا کرنا ہے اور کس کس طرح کرنا ہے ———

اس ڈرامائی حیثیت کے علاوہ مندرجہ بالا اقتباس کی ایک نمایاں معاشرتی اہمیت بھی ہے۔ پورا منظر لکھنؤ کے نوابوں کی زندگی کے ایک خاص پہلو کی بڑی صحیح اور دلکش تصویر ہے۔

اندر سبھا میں فنی نقطۂ نظر سے ایسے اشاروں کی خاصی کمی ہے، جن سے کرداروں کے لباس، اس کی ظاہری قطع اور ان کے عمل اور حرکات و سکنات کی جزئیات کی وضاحت ہوتی ہو اور جس سے "جلسہ" یا "سبھا" کے ہدایت کار کو کوئی مدد ملے۔ شرح کی تفصیلات نے یہ فنی کمی بڑی خوبی سے پوری کی ہے۔ اندر سبھا کی دوسری کمی یعنی اس میں معاشرتی رنگ کا فقدان اس کی ایک اور نمایاں خرابی ہے۔ اندر سبھا کے آخر میں شرح کا اضافہ اس کی اس خرابی کو بدرجۂ اتم پورا کرتا ہے ——— پھر اندر سبھا میں زمان و مکان کے فنی تصورات کے اعتبار سے جا بجا جو خلا محسوس

ہوتا ہے اور اندر سبھا پڑھنے والے کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اسٹیج پر یا جلسہ میں یہ خلا کس طرح دور کیا جاتا ہوگا اور یہ وقفے کس طرح دور کئے جاتے ہوں گے، وہ بھی شرح کی موجودگی میں باقی نہیں رہتا۔

اندر سبھا میں کرداروں کی حرکات و سکنات کے متعلق بعض ہلکے ہلکے اشارے ہیں، شرح میں ان اشارات کو جزئیات کے بیان سے زیادہ مکمل کر دیا گیا ہے اور کرداروں کو یہ اندازہ کرنے میں ذرا بھی دقت پیش نہیں آتی کہ انہیں کسی خاص موقعے پر اسٹیج پر کیا کرنا ہے۔ مثلاً جب کالا دیو شہزادے کو سبز پری کے پاس لاتا ہے اور پری اسکا نشہ ہلاکر اُسے جگاتی ہے تو وہ بقول امانت "عالم حیرت میں بیتاب ہو کر جاگتا ہے" ؎

اس حیرت اور بے تابی کی جزئیات شرح میں اس طرح بیان کی گئی ہیں:

"شہزادہ جب نیند سے چونک کر ہوش میں آتا ہے۔ اُٹھتا ہے، گرتا ہے، چاروں طرف بھاگتا پھرتا ہے، ٹھوکریں کھاتا ہے، سر ٹکراتا ہے۔ کوٹھا اپنا ڈھونڈھتا ہے۔ لوگوں کو یاد کرتا ہے، عزیزوں کا دم بھرتا ہے۔ زیست سے تنگ آتا ہے۔ گھبراتا ہے۔ پھر صدائے پُر درد سے بہاگ کی چیز زبان پر لاتا ہے۔"

ان تفصیلات کے علاوہ شہزادہ اور پری کی گفتگو کی جزئیات بیان کرتے امانت نے یہ داستان ان الفاظ پر ختم کی ہے"۔ غرضکہ شعر خوانی ہیں باہم دیر تک رکاوٹ اور لگاوٹ کی باتیں ہوئیں معشوق کا انکار، عاشق کا اصرار، عجب لطف کی صحبت ہوئی۔"

اس کے بعد جوں جوں قصہ آگے بڑھتا ہے اندر سبھا کے عنوانات میں ایک نہ ایک لفظ ایسا مل جاتا ہے جس سے مختلف کرداروں کی جذباتی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے اور انھیں (یا جلسہ کے ہدایت کار کو) کرداروں کی برمحل موزوں حرکات و سکنات کے لئے اشارے مل جاتے ہیں۔ شرح اندر سبھا کے بیان میں ان اشاروں میں موزوں جزئیات شامل کر کے امانت نے ان کی فنّی حیثیت کو زیادہ واضح کر دیا ہے ـــــ مثلاً جب راجا اندر گلفام سے پرستان میں داخل ہونے کا سبب پوچھتا ہے اور گلفام اس کا جواب دیتا ہے تو اندر سبھا کا مصنف گلفام کے جواب کا عنوان اس طرح درج کرتا ہے:

"عرض کرنا گلفام کا راجہ اندر سے، عالم ہراس میں ہاتھ جوڑ کر"

شرح میں یہی بات ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

"شہزادے نے نزاکت سے ہانپ کر، بید کی طرح کانپ کر، جی چھوڑ کر، ہاتھ جوڑ کر راجہ کو جواب دیا۔"

ذرا آگے چل کر ایک عنوان ہے:

"عرض کرنا سبز پری کا راجہ اندر سے نادم ہو کر، رونا گلفام کو گلے لپٹا کر۔"

شرح میں اس کی مزید وضاحت یوں ہوئی ہے:

"سبز پری نے خوف سے تھرا کر، حیا سے سر جھکا کر، اشک سرخ آنکھوں سے بہا کر اس طرح راجہ سے عرض کی ؎

جفا و ستم کی سزاوار ہوں
حقیقت میں تیری گنہگار ہوں

پھر شہزادے کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگی ؎

ارے کیوں! میں تجھ سے نہ کہتی تھی کیا
نہ مانا مرا ہائے تو نے کہا
بلا میں پڑا آپ بھی بے خطا
مجھے بھی اکھاڑے میں رسوا کیا
کہاں پھینکے اب دیکھئے راجہ تجھے
خدا کو مری جان سونپا تجھے

پھر بھری سبھا میں شہزادہ سے لپٹ کر کہنے لگی ؎

جو جیتے ہیں تو پھر بھی مل جائیں گے
نہیں تو کئے کی سزا پائیں گے

یہاں عنوان کی وضاحت میں امانت نے مختلف شعروں کے بعد بتایا ہے کہ سبز پری کو کب کیا کرنا ہے ـــــ اسٹیج کی اتنی مکمل ہدایات کی موجودگی اندر سبھا کو ہدایات کے نقطۂ نظر سے فنی کمال کا مظہر بناتی ہے۔

اندر سبھا میں اور آگے چل کر ایک عنوان آتا ہے "آنا سبز پری کا جوگن بن کے پرستان میں اور آمد کا نا لوگوں کا" ـــــ یہ منظر اندر سبھا

؎: اس جگہ اندر سبھا میں پورا عنوان ہے "جاگنا شہزادہ کا عالم حیرت میں بے تاب ہو کر۔"

میں بڑا دلکش منظر ہے لیکن محض عنوان ہدایت کار کو کچھ زیادہ مدد نہیں دیتا۔ شرح کی وضاحت البتہ اس کی اہمیت اور دلکشی کو نمایاں کرتی ہے۔ اس جگہ شرح کے الفاظ یہ ہیں:

"جب شہزادہ کنوئیں میں بند ہوا، سبز پری کا عشق وہ چند ہوا۔ جنگل کی خاک اڑانے لگی، بن بن ٹھوکریں کھانے لگی۔ جب فراقِ گلفام سے تنگ آئی، طبیعت سے نیا سوانگ لائی۔ دل کو جوگ پر آمادہ کیا۔ فقیری کا ارادہ کیا۔ جب یہ ملال دل سے سرزد ہوئی شہزادہ کی یاد میں بات بنائی ؎

جوش آیا اسے جوگ کا یہ بن ٹھن
کہ غش کر گئی وہ بلبل حسن

. . . .

. . . .

نہ سدھ بدھ کی لی اور نہ منگل کی لی
نکل گھر سے بس راہ جنگل کی لی

--

اس تمہید کے بعد وہ دلکش منظر شروع ہوتا ہے جس کی طرف ابھی اشارہ کیا گیا:

"پھر سرخ چادر محفل میں لگائی جاتی ہے جوگن کی آمد اس طرح گائی جاتی ہے ؎

جوگن آتی ہے پری بن کے پرستان کے بیچ
شمع ہاتھوں میں، مہِ چرخ ہے آسمان کے بیچ

. . . .

. . . .

آمد کے بعد نقاب پردے کا اٹھنا، جوگن کا فقیرانہ انداز سے محفل میں آنا جوگ کا جوبن دکھانا، نظارہ بہارت ہے۔ یہ حال دیکھ کر مہتاب چرخ نیا سوانگ لایا کہ ستاروں کی افشاں چن کر صبح کا سفیدہ منہ پر مل کر جوگی کا بھیس بدل کر جوگن کے مقابل میں آیا۔ مگر آپ کو اس کے ناخنِ پا کے برابر نہ پایا۔ خجالت سے خونِ جگر کھا کر دامن شفق میں منہ چھپایا۔ سبحان اللہ کیا لطف کا عالم ہے کہ وہ عالم ہے۔ صبح کا وقت، ٹھنڈی ہوا، ستاروں کا جھلملانا، شفق کا رنگت کھانا جانوروں کا درختوں پر چہچہانا، لوگوں کا چاروں طرف سے سمٹ کر محفل میں آنا۔ فرش میں چرسیں پڑیں، شمعیں خاموش کھڑیں، مشعلوں کا رخصت ہونا، خفتہ بختوں کا بیٹھے بیٹھے سونا۔ تماشائیوں کا جوگن پر جان دینا، حسینوں کا نیند سے جمائیاں لینا۔ گل رخوں کے حسن کی تازہ بہار، لوگوں کے ہاتھوں میں باسی ہار، اسی مجمع میں ایک کا ایک سے انگڑائی لے کر کہنا کہ اب تو لوگ اوپر گرے پڑتے ہیں، گھر چلو، طرف ثانی کا فوراً جواب دینا کہ ابھی بیٹھے رہو۔ جوگن کا سماں بھی دیکھ لو۔ جوبن کی بہار ہے، آنکھوں میں نیند کا خمار ہے یہ جلسہ بھی یادگار رہے۔ یہاں بیٹھو گے تو لطف اٹھاؤ گے، گھر جا کے کیا آگ لگاؤ گے ——— ادھر تو یہ گفتگو، یہ چھیڑ چھاڑ ہے، ادھر کا عالم سنو کہ سازوں کی بھینی بھینی آواز، بھیرویں کا شہانا انداز، تانی کی بھرمال، سروں کا خیال، طبلے کی گمک، جوڑی کی کھڑک، ہر لہرا انوکھا، ہر گت نرالی۔ چکاروں کی آواز منیڑو کے نشے ہرن کرنے والی۔ جوگن کا سازندوں میں کھڑے ہونا، محفل کا ہوش کھونا، براگ کی صورت، بھرتری کی مورت، آنکھیں الفت میں لال، شہزادہ گلفام کا خیال۔ آنسو آنکھوں میں ڈبڈبائے ہوئے، لٹیں چھٹکائے ہوئے، بھبوت رمائے ہوئے۔ جتنا چہرہ آپ کو راکھ میں چھپاتا ہے، اتنا جوبن اور جلوے دکھاتا ہے اس وقت شعر حسن کا یاد آتا ہے ؎

کرے حسن کو کس طرح کوئی ماند
چھپے ہے کہیں خاک ڈالے سے چاند

روپ کے ستارے ملے دلے بھبوت کے تلے یوں نظر آتے ہیں جس طرح صبح کے وقت ابر سفید میں آسمان پر تارے چمک جاتے ہیں۔ زلف دلا خوش نما کلغی سمیت اس طرح سر کے بالوں میں رکھا ہے جیسے کہ جٹا دھاری سانپ سنبلستان میں کنڈلی مارے بیٹھا ہے۔ حسن بے باک ہر رنگ میں مشتاقوں کا قتل کرنے والا ہے۔ پوشاک سبز ہے، دوپٹہ سرخ کفنی بنا کر گلے میں ڈالا ہے۔ گت ناچنے کو ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ پاؤں نکا ہیں۔ حرکتیں نئی ہیں، توڑے نرالے ہیں۔ وجد میں دیکھنے والے ہیں۔ سماں بندی ہے، محفل کا دل لگا ہے۔ دنیا کے مزے فراموش ہیں۔ کن رس ہمہ تن گوش ہیں۔ جاہل باتیں کرتے ہیں۔ عاقل خاموش ہیں۔ زندہ دل گھنگھرو کی آواز پہ مرتے ہیں۔ شیریں دہن ہر تال پہ سم کھانے کا ارادہ کرتے ہیں۔ جوگن جب یہ ٹھمری گاتی ہے ؎

میں تو شہزادے کو ڈھونڈن چلیاں

محفل کو تڑپاتی ہے۔ بعد اس کے یہ غزل گاتی ہے ؎

مرتا ہوں ترے ہجر میں اے یار خبر لے۔"

یہ تصویر ہر لحاظ سے اتنی مکمل ہے کہ اس پر کسی تبصرہ کی گنجائش نہیں لیکن اشارتاً یہ کہنے میں کوئی ہرج بھی نہیں کہ اس بیان میں اسٹیج (یا محفل) کے ظاہری رنگ اور اس کی سجاوٹ کا جو تصور پیش کیا گیا ہے اس کے علاوہ ایکٹروں اور ہدایت کاروں کے لئے بھی بڑے واضح اشارے موجود ہیں۔ محفل میں جوگن کس طرح داخل ہوگی، اس کا رنگ روپ اور لباس کیسا ہوگا، وہ اسٹیج پر کہاں کھڑی ہوگی، اس کے گانے اور ناچنے کا انداز کیا ہوگا اور اس کے ساتھ کون کون سے ساز بجائے جائیں گے، جوگن کو اپنے چہرے اور اداؤں سے اپنی جذباتی کیفیتوں کا اظہار کس طرح کرنا ہوگا ــــ یہ سب چیزیں اسٹیج کی ہدایات اور اس لحاظ سے اندرسبھا کے فنی پہلو کا ایک اہم عنصر ہیں۔ اور یہی چیزیں ہیں جن کی بنا پر ہم اندرسبھا کے فنی مرتبہ کا تعین کرتے وقت اس بدیہی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اندرسبھا ہمارے ڈرامائی فن کی بنیاد اور اس کا ایک اہم سنگ میل ہے۔ اندرسبھا اور اس سے بھی زیادہ شرح اندرسبھا نے اسٹیج کی جن روایات اور ہدایات کو اردو کے ڈرامائی فن کا پیش خیمہ بنایا ہے وہ اس اہم کتاب کی تصنیف کے ایک صدی بعد بھی اردو ڈرامے کے ناگزیر اجزا ہیں۔ اندرسبھا اور شرح اندرسبھا کے بنائے ہوئے نقوش اردو ڈرامے کے فن کی پوری روایت پر چھائے ہوئے ہیں اور ہمارے مشہور ڈرامے میں کہیں نہ کہیں اس روایت کی جھلک ضرور نظر آتی ہے ۞

ابریق مے مرا شکستی ربی
بر من در عیش را ببستی ربی
بر خاک ریختی مے ناب مرا
خاکم بدہن مگر تو مستی ربی

(خیام)

پیالہ مری مے نوشی کا توڑا یارب
اک ٹھیکرا مٹی کا نہ چھوڑا یارب
مٹی میں مے ناب مرے منہ میں خاک
کچھ مست نہیں تو بھی تو تھوڑا یارب

(ناداں دہلوی مرحوم)

کیوں مے کی صراحی مری توڑی تو نے؟
کیوں عیش منغض کیا میرا تو نے ؟
اب مجھ سے یہ بدمستیاں، توبہ توبہ
کیا تجھ کو نشا ہے، خاک منہ میں میرے

(آغا شاعر قزلباش مرحوم)

دل سرِ حیات را کماہی دانست
در مرگ ہم اسرار الٰہی دانست
امروز کہ با خودی ندانستی ہیچ
فردا کہ ز خود روی چہ خواہی دانست

(خیام)

دل راز ازل تو نے بھلا ہی جانا
مرنے میں بھی کچھ بھید چھپا ہی جانا
زندہ ہے تو اور آج نہیں جانتا کچھ
کل مر کے فنا ہو کے تو کیا ہی جانا

(ناداں دہلوی مرحوم)

دل زیست کی لم سے بھی ہے واقف پورا
اور موت کا بھی بھید خدا کا سمجھا
پر آج جو ہے ہوش میں اتنا بے ہوش
کل ہوش نہیں ہوگا تو کیا جانے گا ؟

(آغا شاعر قزلباش مرحوم)

رات

عبدالحمید عدمؔ

رات بربطِ سکوں — بنتِ غمزہ وفسوں
اے غزالِ نرم رو — کاکلِ طرب کی غمو
کس لئے اداس ہے؟ — کیوں سیہ لباس ہے؟

چاند اگر نہیں چڑھا — اس سے فرقِ خاص کیا
چاند اگر غروب ہے — یہ تو اور خوب ہے
یہ حسین تیرگی — ہے سرشتِ زندگی
زندگی بھی رات ہے — حادثے کی بات ہے
حادثہ شعور ہے — اس میں اتنا نور ہے
جس کا انتساب کیا — ماہ و آفتاب کیا

چاند عارضی ضیا — تیرا حسن دیرپا
تو ہے ایک کیفیت — لازوال تمکنت
چاند اک دروغ ہے — موسمی فروغ ہے

یہ لباس ماتمی — یہ اتھاہ تیرگی
ماہتاب کے لئے — ایک خواب کے لئے
خواب بے اساس ہے — وہم بے قیاس ہے
جانِ من نظر تو کر — کتنے غمزدہ بشر

کتنے تپ زدہ جگر — کتنے نامراد گھر
ڈھونڈتے ہیں رات کو — راحتِ حیات کو

اے سیاہ نازنیں! — اے تکدرِ حسیں!
کس لئے ملول ہے — تو تو ایک پھول ہے
نازنیں ترے لئے — صد ہزار سلسلے
دیکھ یہ ترے نگیں — نجمہائے مہ جبیں
نور کے امام ہیں — باوفا غلام ہیں
چاند ہو نہ ہو مگر — یہ ہیں تیرے ہم سفر

بس اسی طرح مری — نامراد زندگی
ہے رواں سوئے ابد — نعرہ ہائے "المدد!"
گونجتے ہیں دم بدم — دشت دشت یم بہ یم
اور نجوم خم نشیں — مثلِ مہ وشانِ چیں
لے کے بادۂ طرب — چشم چشم لب بہ لب
چومتے ہیں رات کو — ظلمتِ حیات کو
رات ہی برات ہے — محرمِ ثبات ہے
رات کے ضمیر ہیں — جاگتی لکیر ہیں
پاک و مصر و روم ہیں — مستقل نجوم ہیں!

نواساز

صفیہ شمیم

ہاں ساز اٹھا ساز خوش آواز مغنی
برسات کی بھیگی ہوئی یہ رات سحابی
آفاق طربناک ہے، عالم ہے شبابی
مانا کہ پسِ پردہ بھڑکتے ہیں شرارے
گل پھر بھی ہیں بدست، ہوائیں ہیں شرابی
ہنستے ہوئے پھولوں پہ چھلکتی ہوئی شبنم
کلیوں کو ستاروں نے بنایا ہے شہابی
اس منظرِ پرکیف کا ہو لطف دوبالا
بس دیر نہ کر تو بھی نوازن ہو شتابی

بیتاب ہیں قلب خس و خاشاک میں ارماں
پیغام چلے آتے ہیں کانٹوں کی زبانی
یہ محفل احباب، یہ اوقاتِ فراغت
آئے گی نہ پھر ایسی کوئی رات سہانی

یوں نغمہ سرا ہو کہ یہ عالم ہی بدل جائے
افسوں ترا بے دردِ حوادث پہ بھی چل جائے
گرتا ہوا انسان پھر اک بار سنبھل جائے
ہر اشک میں طوفان تبسم کا مچل جائے
پیشانیِ حسرت پہ بشاشت دمک اٹھے
کانٹا سا ہر اک روح کے سینے سے نکل جائے
مہتابِ مسرت ہو نمایاں شبِ غم سے
ہر ایک فغاں قالبِ نغمات میں ڈھل جائے

ساحل پہ پپیہے کی صدا جھوم رہی ہے
کونین ہیں سرشار فضا جھوم رہی ہے
گلزار میں پھولوں نے نیا رنگ جمایا
اشجار کے سائے میں ہوا جھوم رہی ہے
یہ موجِ ترنم، یہ ترانے یہ ملاریں
ہر چیز بصد ناز و ادا جھوم رہی ہے
ہے رنگِ مسرت میں شرابور زمانہ
ساغر میں مئے ہوش ربا جھوم رہی ہے

اے مطربِ گل بار فضاؤں کو ہنسا دے
نغموں سے بیاباں کی خوشی کو جگا دے
منہ دیکھ کے رہ جائے یہ بے مہریِ دوراں
اے موجِ طرب رنگ حوادث کا اڑا دے
ہر تان پہ لا راہ پہ بھٹکے ہوئے دل کو
وہ گیت سنا عظمتِ ہستی جو بڑھا دے
کونین کی افسردہ تمنائیں تڑپ جائیں
طوفانِ ترنم میں زمانے کو بہا دے

ہر گام پہ مڑتا ہوا، گاتا ہوا پانی
موجوں کا مسلسل یہ ترنم، یہ روانی
گلشن پہ ہیں چھائی ہوئی گھنگھور گھٹائیں
ہر پھول فسانہ ہے تو ہر غنچہ کہانی

ہاں ساز اٹھا ....

رہائی

ریاض قادر

محبت جہاں ڈس گئی تھی،
کبھی دل جہاں تھا،
جہاں حجرۂ سیمگوں روشنی کا
لرزتا ہوا رہ گیا تھا!
وہیں رہ گیا ہے
ہیولیٰ کسی سایۂ زرفشاں کا،
یہاں ایک احساس جاری رہا ہے
رگِ جاں میں خونِ مئے زندگی بن کے جاری رہا ہے
اک احساس عنوانِ نو کا،
زمانے کی رفتار لمحوں کی رَو کا،
یہاں کھڑکھڑاتی ہوئی ہڈیوں سے
اجل کے محیطِ شبِ بے اماں سے
بہاروں کے رنگوں کو، پھولوں کو
ان کی چمک کو،
اماں مل گئی ہے!
فنا کی بھی آواز سنگیت میں جا ملی ہے!!

غزل

روشن صدیقی

حرفِ آساں لب آشنا نہ ہوا
میں زمانے کا ہم نوا نہ ہوا
اس کے وعدے نے بات تو رکھ لی
لاکھ شرمندۂ وفا نہ ہوا
ہائے مفہومِ اشتیاق نہاں
نگہِ شوق سے ادا نہ ہوا
ہم تو امید و یاس سے گزرے
کیا ہوا عاشقی میں کیا نہ ہوا
جامِ لبریز و چشمِ اشک آلود
رند کیا ہے جو پارسا نہ ہوا
تجھ سے ہو کر جدا یہ دل اے دوست!
پھر کسی حال میں جدا نہ ہوا
رہِ کعبہ کہاں کہ ہم سے روشؔ
دَیر کا بھی تو حق ادا نہ ہوا

غزل

فضل احمد کریم فضلی

اپنا کہیں جسے نہ پرایا کہیں جسے
دل ہے وہ طرفہ چیز تماشا کہیں جسے

ان کی اداؤں میں ہے عجب شوخئ حیا
وہ شوخئ حیا کہ تقاضا کہیں جسے

میری نظر نے ان کی نگاہوں میں دیکھ لی
درپردہ اک نگاہ اشارا کہیں جسے

دل کو کسی کی نیم نگاہی نے بخش دی
وہ بامزا خلش کہ تمنا کہیں جسے

میرا دلِ غریب بھی کیا خوب چیز ہے
اُمیدوارِ وعدۂ فردا کہیں جسے

اے عشق! تجھ پہ دولتِ ہوش و خرد نثار
وہ بن گئے ہیں ہم کہ تماشا کہیں جسے

دیوانگانِ شوق کا ہے کب سے منتظر
ویرانۂ حیات کہ صحرا کہیں جسے

ہے زندگی جو زہر تو ہاں زہر ہی سہی
لیکن یہ زہر وہ ہے گوارا کہیں جسے

اچھا بُرا ہزار کہے غیر ہم کو کیا
اچھا تو بس وہی ہے وہ اچھا کہیں جسے

یوں تو بھری ہوئی ہے خدا کی زمیں مگر
ایسا کوئی نہیں کہ ہم اپنا کہیں جسے

اپنے بھی اب تو مصلحت اندیش ہو گئے
فضلی یہی وہ چیز ہے دنیا کہیں جسے

غزل

سراج الدین ظفر

سنبل کدۂ زلف کہ سرمایۂ کف تھا
کیا کیا نہ مرے شوق فراواں کا ہدف تھا

شب خلوتِ میخانہ میں ہر شاہدِ نوخیز
رخنہ زنِ اسباب تھا برہم زنِ صف تھا

جرأت نہ ہوئی گردشِ دوراں کو سرِ بزم
آتی جو مقابل تو میں پیمانہ بکف تھا

پہنچی نہ کسی تک مری خلوت کی کوئی بات
گل تھا کہ سبو ہر کوئی پابندِ حلف تھا

کرتی تھی جو یارانِ شبانہ کی حکایت
روئے سخن بادِ سحر میری طرف تھا

کل صبح چلی بادِ صبا جب طرفِ گل
پیغامِ سحر میں مرا پیغام بھی لف تھا

گو پردۂ اسرار میں تھا شاہدِ مقصود
لیکن مری آوارہ نگاہی کا ہدف تھا

کیا جستِ غزالاں میں تھا کل رات کا آہنگ
بسمل تہِ پا زمزمۂ بربط و دف تھا

اب تک ہیں بہاریں مرے دامن میں کہ مجھکو
نوعمریٔ غنچہ فروشاں سے شغف تھا

دم پے جو رہے سنبل و ریحاں کے قدح خوار
شاید یہ کنایہ ترے گیسو کی طرف تھا

کیا مجھکو زمانے سے ظفر کوئی سروکار
اس تنگ نظر کو مرا گوہر بھی خزف تھا

غزل

شان الحق حقی

ہم نے سینے میں رکھا غم کو دل وجاں کی طرح
پاسِ دشمن بھی کیا خاطرِ خوباں کی طرح

بزمِ دنیا ہے صنم خانۂ ویراں کی طرح
آدمی دہر میں نایاب ہے یزداں کی طرح

کوئی گردش ہے تو تقدیر سے میری ورنہ
سست ہے دورِ زماں بھی ترے پیماں کی طرح

شکوۂ دوست نہ کر شرطِ محبت یہ ہے
حوصلہ ہو تو اٹھا ناز بھی احساں کی طرح

تھی بس اک برقِ تبسم کہ تکلم نہ بنی
جنبشِ لب تھی مگر جنبشِ مژگاں کی طرح

پھونک دو خارِ نشیمن کہ یہ کانٹے دل میں
چبھ رہے ہیں کسی بھولے ہوئے ارماں کی طرح

کم نہیں اب بھی تمناؤں کا سینے میں ہجوم
خانۂ دل یونہی آباد ہے زنداں کی طرح

نالۂ غم بھی نہیں شورِ طرب کا کیا ذکر
شہر کے شہر ہیں سنسان بیاباں کی طرح

اک سہارا ہے جسے دامنِ حسرت کہئے
ہر قدم ساتھ مگر عمرِ گریزاں کی طرح

دوستو ڈھونڈئے کیا مشربِ باقی کا نشاں
ہے کوئی بزمِ خیالی دلِ ویراں کی طرح

مجھ کو تسلیم نہیں دل کے بھی دعوے حقی
میں نے رکھی ہے اسی کفر پہ ایماں کی طرح

غزل

جمیل واسطی

جو میری باتیں ہیں بہکی بہکی تو راز تحت الشعور کیا ہے
بیاں مرا کچھ بیاں نہیں ہے، بیانِ بین السطور کیا ہے

جوانیاں سر پہ چھا رہی ہیں۔ بہار قربان ہر قدم پر
نہیں اگر اُن کا حُسنِ صہبا تو میرے سر میں سُرور کیا ہے

نہ توڑ ڈالوں طلسمِ صد تمکنت کو تیرے کہیں جنوں میں
نہیں اگر خواہشِ محبت تو یہ ادائے غرور کیا ہے

زمانہ حاسد سہی محبت کا تجھ پہ ہی اعتبار ہوتا
بھلا تصور میں بھی یہ اخفائے راز تیرے حضور کیا ہے

بلند تہذیب کے نمونے ہیں یہ مزاروں کے بیل بوٹے
مگر فضا میں گرج ہے کیسی فغانِ زیرِ قبور کیا ہے

کراہتی آرزوئیں مدفونِ ضبط ہو کر جنوں بنی ہیں
جو اذنِ اظہار سے یہ لاشے اُٹھیں تو یوم النشور کیا ہے

مقدس اعجاز سے ہے آراستہ جہانِ ورائے دانش
یہ گلشنِ آتشِ خلیل اور برقِ بالائے طور کیا ہے

کنارِ مہتاب سے نگاہوں میں خواب ترتیب پا رہے ہیں
فرازِ افلاک سے تعلق ترا دلِ ناصبور کیا ہے

نہ مہرباں تم نہ دوست دنیا نہ نیک قسمت نہ دل پہ قابو
جو واسطی کا قصور یہ بھی ہو تو واسطی کا قصور کیا ہے

غزل

احمد فراز

اس ادا سے کبھی آ کر گذرو
دل کے صحرا کو بسا کر گذرو

سنگِ خارا ہے زمانے کی نظر
دل کے آئینے بچا کر گذرو

روشنی رہبر بھی رہزن بھی تو ہے
راہرو! شمعیں بجھا کر گذرو

کون جانے کہ یہ پتھر ہیں کہ لوگ
دشتِ غربت میں صدا کر گذرو

کوئی کانٹا ہو کہ شبنم ہو کہ پھول
سب کو آنکھوں سے لگا کر گذرو

چڑھتے سورج کے پجاری نہ بنو
اپنے سائے میں سما کر گذرو

وقت ہر آن بدل جاتا ہے
جی میں جو آئے سدا کر گذرو

سفرِ شوق ہو یا منزلِ غم
کوئی ہنگامہ اٹھا کر گذرو

ایک پل ٹھہرو بگولوں کی طرح
اور پھر خاک اڑا کر گذرو

توسنِ وقت کی رفتار کے ساتھ
برق کے پنکھ لگا کر گذرو

دل عجب شہر ہے ہنگاموں کا
کبھی اس سمت بھی آ کر گذرو

یا تو موجوں کے شناسا نہ بنو
یا کناروں کو بہا کر گذرو

فکر و ادراک کے دروں پہ فراز
مشعلِ طبع جلا کر گذرو

غزل

جلیل قدوائی

دل کو دزدیدہ نگاہوں سے لبھاتے کیوں ہو
غیر ہوں میں تو مجھے اپنا بناتے کیوں ہو

مجھ کو معلوم ہے جو کچھ ہے تمہارے دل میں
شرمگیں آنکھ سے بیکار چھپاتے کیوں ہو

جو بھی کہنا ہے مرے حق میں اسے صاف کہو
بات کرتے ہو تو ہونٹوں کو چباتے کیوں ہو

ہمہ تن شرم نظر آتے ہو بے شک لیکن
دل میں آتے ہو تو اک دھوم مچاتے کیوں ہو

اک حسیں شعلۂ بیتاب نہ کیوں بن جاؤ
عشق کی آگ سے دامن کو بچاتے کیوں ہو

پاس رہنا ہے تو پھر مجھ سے یہ دوری کیسی؟
دور رہنا ہے تو آنکھوں میں سماتے کیوں ہو

جذبۂ دل کی تمہارے ہی کمی ہو نہ جلیل
اُن پہ غفلت کا تم الزام لگاتے کیوں ہو؟

غزل

مجاز دہلوی

تری محفل سے اٹھ کر جو بھی آئے کامگار آئے
خمستاں در نظر آئے گلستاں در کنار آئے

رگ و پے میں تری نظروں نے ایسی بجلیاں بھر دیں
نہ اِس پہلو قرار آئے نہ اِس پہلو قرار آئے

حقیقت میں وہی سرمایۂ عمر گرامی ہیں
جو لمحات حسیں ہم ان کی محفل میں گذار آئے

جہاں اور جس طرف دیکھا ترا جلوہ نظر آیا
یہ ممکن ہی نہیں اہل بصیرت کو قرار آئے

نہ پہنچا کارواں کوئی سلامت اپنی منزل تک
دلیل راہ پر آئے تو کیوں کر اعتبار آئے

فریب حسن سے آگاہ ہو جائے نظر میری
کہیں ایسا نہ ہو یہ ساعتِ ناخوشگوار آئے

مجاز اس درجہ مستقبل سے مایوسی نہیں اچھی
یہ کیا کم ہے کہ تم حالات کے گیسو سنوار آئے

رپورتاژ

کاف تا کاف

(۲)

ابوسعید قریشی

برِعظیم پاکستان و ہند میں یہ مندر اپنی وضع کا واحد مندر ہے۔ اس جگہ کے علاوہ "سرسکھ" کی سب سے اہم عمارت دھرم راجکا نام کا ٹوپ ہے۔ یہ عمارت ٹیکسلا کے تیسرے شہر سرکپ کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔ اس کی مرکزی عمارت تین سے لے کر پانچ فٹ تک چوڑی دیواروں پر مشتمل ہے۔ صدر ٹوپ چوتھے چبوترے پر بنایا گیا ہے — اس کے اردگرد دو درجن تک کئی ٹوپ اور کئی خانقاہیں نظر آتی ہیں۔ ٹیکسلا کی یونیورسٹی کے مختلف کالج شاید انہی عمارتوں پر مشتمل ہیں۔ یہ حجرے شاید طلبا کے ہوسٹل ہیں اور یہ ایوان ان کے لیکچر ہال۔

آج ٹیکسلا پتھر چونے، اینٹوں کے ٹکڑوں، ٹوپوں کے کھنڈروں اور بودھ تہذیب کا ایک ڈھیر ہے — ماہرین کا خیال ہے کہ غریب آدمی کے گھر اس زمانے میں کچے ہوتے تھے۔ غریب کا گھر آج بھی اسی روایت کا حامل ہے۔ تہذیب کا تسلسل ٹوٹنا نہیں چاہئے۔

مگر اب ہم راولپنڈی آپہونچے ہیں۔ یہاں سے کشمیر کو پکی سڑک جاتی ہے۔ مگر آپ کا ویزا کہاں ہے؟ جی ہاں اپنے وطن میں ویزا! کیوں؟ — اس کا جواب آپ جانتے ہیں۔ میں تو محض آپ کا ہم سفر ہوں۔ چلئے گائیڈ کہہ لیجئے۔ مگر ذرا مجھے اپنے خیالات کے بکھرے ہوئے تانے بانے کو سمیٹ لینے دیجئے۔ کشمیر کے نام سے میرے ذہن میں بے شمار یادیں خلط ملط ہو گئی ہیں...... یہ سال ۱۹۳۷ء ہے میں، میرا چھوٹا بھائی اور میرا چچیرا بھائی۔ ہم تینوں کشمیر کے لئے رختِ سفر باندھے ہوئے ہیں۔ اب کے ہم جموں کے راستے جا رہے ہیں۔ راستے میں بٹوت پڑتا ہے (منٹو مرحوم کی بیگو کی بستی) مگر ہمیں ابھی پیر پنجال کی سرنگ سے گذرنا ہے، اس کے اس طرف وہ حسین وادی ہے جس کی تعریف میں شاعر شعر کہتا نہیں تھکا اور جس کی کشش جہانگیر کو لاہور چھوڑنے پر مجبور کرتی ہے۔ پیر پنجال سے اس طرف وہ منظر ہے کہ انسان بہک جاتا ہے اور اسے جنت سے نکالے جانے کا کوئی غم نہیں رہتا — وہ دیکھئے ویری ناگ، دریائے جہلم کا منبع — جہلم جس کے کنارے سری نگر آباد ہے۔ میں شکارے کی سیر کر رہا ہوں۔ سال ۱۹۳۳ء ہے۔ میں نے نیا نیا پائپ پینا سیکھا ہے۔ لیکن تمباکو تیز ہے چنانچہ کشتی درون دریا دریا درون کشتی کی کیفیت ہے۔ شکارا بہے چلا جا رہا ہے دریا کے دونوں طرف لکڑی کے مکان میرے اوپر جھکے پڑتے ہیں۔ ہر چیز خلط ملط ہو رہی ہے لیجئے یہ پل آگیا۔ خدا معلوم کیا تھا اس تمباکو میں۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ پل ابھی میرے اوپر آرہے گا۔ ہم نے تو لوہے کے شہتیر دیکھے میں پلوں پر مگر یہاں سب لکڑی ہے — سب لکڑی ہے۔ درختوں کے درخت کاٹ کر انہیں کچھ اس طرح رکھا گیا ہے کہ سارا بوجھ تقسیم ہو جاتا ہے۔ کشمیر میں صدیوں سے اس طرح پل بناتے جا رہے ہیں۔ شاید اس لئے کہ یہاں لکڑی کثرت سے ہوتی ہے۔ اور شاید اسی لئے مکان بھی لکڑی کے ہیں — لکڑی کے چوکھٹوں پر تختے جڑ دیئے گئے ہیں۔ امرا کے مکانوں میں البتہ اینٹیں اور بعض اوقات روغنی اینٹیں بھی لگا دی جاتی ہیں۔ اس طرح مکان کے اندر خود بخود الماریاں سی بن جاتی ہیں— — لیکن شکارا رک گیا۔ مانجھی کہہ رہا ہے کہ شاہ ہمدان کی مسجد آگئی۔ میرا پائپ بجھ چکا ہے۔ ماحول کے نقوش اب واضح ہو رہے ہیں۔ دریائے جہلم کے دائیں جانب شاہ ہمدان کی مسجد اپنا اہرام نما مینار اٹھائے فنِ تعمیر کے ماہروں کو دعوتِ نظارہ دے رہی ہے کچھ عجیب مندر نما مینار ہے۔ اس تصور کے ساتھ ساتھ میرے ذہن میں مشرقِ بعید کے معبدوں "پگوڈاؤں" کے کلس بھی خلط ملط ہو رہے ہیں — — "اللہ اکبر اللہ اکبر..." موذن اپنے خاص کشمیری لہجہ میں مسجد کی مینار سے نمازِ عصر کا اعلان کر رہا ہے۔ یہ مینار جسکے اوپر سرما کی برف اور گرمیوں کی بارش کے بہاؤ کے لئے ڈھلوان مثلثیں سی

نظر آ رہی ہیں، مسجد کے وسط میں واقع ہے۔ یہاں بھی چھتیں اسی قسم کی ہیں۔۔ برآمدوں کو چھوڑ کر مسجد کا چبوترہ (جو مربع ہے) ۴۹۰۰ مربع فٹ ہے۔ عمارت دو منزلہ ہے۔ اور فرش سے لے کر مینار کی نوک تک اس کی بلندی ۱۲۵ فٹ ہے۔ مسجد کا اندرونی ایوان ۶۳ x ۴۳ فٹ ہے۔ باقی جگہ میں حجرے سے بنا دئے گئے ہیں جن کی دیواریں لکڑی کے منقش تختوں سے بنی ہیں۔ امام کی محراب ہشت پہلو ہے۔ چھتوں پر پھول پتوں کے رنگ چمک رہے ہیں۔ یہ نقوش نیچے قالینوں کے تانے بانے میں اپنے عکس ڈالتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ——— یہ مسجد کشمیری فن کا اہم نمونہ ہے۔ لیکن کشمیر کے چوبی فن تعمیر کی سب سے نادر مثال، سری نگر کی جامع مسجد ہے۔ اس کی بنا ۱۴۰۰ء میں سکندر بت شکن نے رکھی۔ سکندر کے فرزند شاہ زین العابدین نے اس کی توسیع کی۔ تین صدیاں بعد مغل شہنشاہ اورنگ زیب اس کی مرمت کی طرف متوجہ ہوا۔ عالمگیر کے وقت میں اس کا بہت سا حصہ نذر آتش ہو چکا تھا، لیکن اس نے اس کے بنیادی نقشے میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں کی جس سے اس کی شکل بدل جاتی۔ جامع مسجد میں لکڑی کے استعمال کے وہی اصول نظر آتے ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ مگر نقشے کے اعتبار سے یہ مسجد ایک لحاظ سے میدانی علاقے کی مسجدوں سے ملتی جلتی ہے۔ اس کا مربع نما صحن جس میں درخت بھی لگے ہیں، اوپر سے کھلا ہے اور اس کا حاشیہ ۲۴۰ فٹ بنا ہے۔ صحن چاروں طرف بے شمار ستون نمازیوں کی طرح کھڑے ہیں۔ بیرونی حاشیہ ۲۸۵ فٹ ہے۔ بیرونی دیوار تیس فٹ اونچی سادہ گلکاری پر مبنی ہے۔ اس مسجد کے ستونوں کی تعداد بڑے بڑے ریاضی دانوں کا محاسبہ کرتی ہے۔ ہمت والے لوگوں نے ان کی تعداد ۳۷۸ بتائی ہے۔ یہ ستون درختوں کے پورے تنے ہیں کچھ سے پچاس فٹ کے دیوداروں کو جنگلوں سے اکھاڑ کر تراش خراش کر سیدھا یہاں گاڑ دیا گیا ہے۔ یہ "درخت" ہشت پہلو معلوم ہو رہے ہیں۔ ان ستونوں کو دیکھ کر جو پورے پورے درختوں پر مشتمل ہیں مجھے یہ احساس ہوتا ہے جیسے "منگل میں جنگل" ہو گیا ہے۔ انسان کی طباعی پر شاید قدرت کو بھی رشک آتا ہوگا —— ... جامع مسجد کے تین دروازے ہیں —— ڈیوڑھیاں۔ ہم اب جنوبی دروازے کے باہر کھڑے ہیں۔ نمازیوں کی ٹولیاں آ رہی ہیں۔ ان کے ماتھے کے گٹے ان کی دعاؤں، ان کے صبر کا اعلان کر رہے ہیں۔ وہ ابھی مایوس نہیں ہوئے۔ انہیں اب بھی امید ہے کہ ان کا نصیب ایک دن ضرور جاگے گا جب وہ ڈوگرے اور اس کے سرپرستوں کی غلامی کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکیں گے اور اسے ڈل اور وُلر کی تہوں میں غرق کر دیں گے۔ دیکھیں ہمالہ کے چشمے کب ابلتے ہیں۔ اتنے آئیے۔ ڈل گیٹ سے شکارا لے کر شالامار اور نسیم باغ بھی دیکھتے آئیں۔۔

شالامار کے تختے ہمارے سامنے بہشت کی منزلوں کی طرح پھیلتے چلے جا رہے ہیں۔ گھاس کا سبز مخملی فرش جس کے بیچوں بیچ چاندی سی نہر بہہ رہی ہے اور فوارے موتی اچھال رہے ہیں۔ عقب میں سنگ سیاہ کی بارہ دری ان موتیوں کو جلا بخش رہی ہے۔ نور و ظلمت کا یہ حسین امتزاج مغلوں کے سوا اور کیسے سوجھ سکتا ہے۔ اور یہ ستون اور چھت تو ملاحظہ فرمائیے —— ٹھیریئے ذرا تصویر اتارتے ہیں۔ آج سے اٹھارہ بیس سال بعد، جب یہاں آنے کے لئے "ویزا" کا سوال ہوگا اور "ویزا" نہیں ملے گا لہٰذا اس تصویر کو دیکھ کر اپنی حسرتوں کا دل بہلایا کریں گے —— مگر میں جذباتی ہو گیا۔ ہاں تو کشمیر کے فن تعمیر کی بات ہو رہی تھی۔ مغلوں نے پری محل کی نشاط گاہ اور ہری پربت پر ملا شاہ کی مسجد اور اس نوع کی کچھ اور عمارتیں بھی کشمیر میں بنائیں۔ لیکن ان کے لئے کاریگر میدانوں سے ہی منگوانے پڑے۔ لکڑی کی عمارتوں کے عادی پتھر سے سمجھوتہ نہ کر سکے۔ آج پری محل ویران پڑا ہے اور یہاں بھوتوں کا مسکن ہے اور کشمیر کا گھریلو فن تعمیر اس کی ان گنت نیازیں ہیں۔ یا جھونپڑے جن میں چالیس لاکھ بندگان خدا اپنی زندگی کے دن بسر کر رہے ہیں ——

اب ہم پھر جرنیلی سڑک پر پہنچ چکے ہیں۔ یہ ہرے بھرے کھیت جہلم اور چناب کا خطہ ہیں۔ یہاں گاؤں کے گرد چار دیواری دکھائی نہیں دیتی۔ زندگی محفوظ ہے۔ مٹی کے مکان، کھلے کھلے صحن، جوہڑ، رہٹ، نہریں.... بھیڑ بکریاں، گائے بھینس، بیلوں کی جوڑیاں سرو سی بانکی عورتیں، شیشم ایسے تناور مرد —— مگر سامنے یہ مینار کیسے ہیں؟ یہ شاہدرہ ہے۔ ہم لاہور کے مضافات میں پہونچ گئے۔ یہ جہانگیر کا مقبرہ ہے۔ لاہور کے لوگ اسے صرف مقبرہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مقبرے کا باغ ۱۵۰۰ مربع فٹ جگہ گھیرے ہوئے ہے۔ مورخوں کا کہنا ہے کہ یہ ملکہ نورجہاں کا باغ تھا۔ جہانگیر نے وصیت کی تھی اسے یہیں دفن کیا جائے۔ اور بعض مورخین کا کہنا ہے کہ نورجہاں نے اپنے محبوب کا مزار اپنی نگرانی میں بنوایا۔ باغ کے گرد چار دیواری کا پردہ ہے۔ سامنے پھولوں کے سولہ تختے ہیں اور ہر تختے میں الگ رنگ کے پھول ہیں۔ تختوں کے درمیان فوارے اچھل رہے ہیں۔ مقبرے کی صدر عمارت کے باہر، جن میں میناروں کا زیریں حصہ بھی شامل ہے، سنگ سرخ نظر آ رہا ہے جس کی برہنگی کو چھپانے کے لئے جگہ جگہ مرمر کے مختلف الہیئت کتبے لگا دیئے گئے ہیں۔ سنگ مرمر کی زمین پر کہیں گلدانوں کے نقوش چمک رہے ہیں

بی پاکستان میں
م طرز تعمیر کے
چند نمونے

لاہور:

مسجد وزیر خان کا صدر دروازہ

مقبرہ حضرت شمس تبریز رحمۃ اللہ علیہ (ملتان)

٨

سندھ کے تالپور حکمرانوں کے مقبرے (حیدرآباد)

قلعہ حیدرآباد

اور کہیں خطوط کا تنالا اور حسین امتزاج صناعوں کے کمال کی داد طلب کر رہا ہے۔ مقبرے کے مینار پنج منزلہ ہیں۔ تیسری منزل تک ان میں بھی سفید اور رنگدار پتھر کی لہراتی ہوئی دھاریوں سے آراستہ کر دیا گیا ہے۔ مقبرے کی چھت پر سنگ مرمر لگا تھا لیکن "سکھا شاہی" کی بھینٹ چڑھ گیا۔ مرکز میں ایک چھتر اور اس کے گرد سنگِ مرمر کا جالی دار کٹہرا تھا۔ اس کا بھی وہی حشر ہوا۔ چھتر کے سائے میں، نیچے لوحِ مزار کو روشن کرنے کے لئے ایک روشندان ہے ــــ مگر نیچے کیوں نہ چلیں۔ مزار کے اردگرد بہت سی غلام گردشیں یا جو کچھ بھی انہیں کہہ لیجئے قدم قدم پر آپ سے داد طلب کر رہی ہیں۔ ان کے گنبدوں کی شہد کے چھتوں کی شکل و صورت کی ساخت، دیواروں کے سنگ مرمر میں کندے ہوئے نقش و نگار جن میں رنگدار پتھروں کو کاٹ کاٹ کر جوڑ جوڑ کر ایسے ایسے گل بوٹے بنائے گئے ہیں کہ جوہری رشک کریں۔ اور ذرا اپنے قدموں کی طرف بھی نگاہ ڈالیے۔ یہ پانی نہیں پتھر ہے۔ بلور سا چمکتا جس کے سینے میں سنگتراشی کے کملات منعکس ہو رہے ہیں ــــ مگر یہ تلاوت کی آواز کہاں سے آ رہی ہے! آیئے دیکھیں ــــ سنگِ مرمر کی جالی کے پیچھے مزار کے سرہانے (جس کے مرمریں تعویذ پر اللہ کی ننانوے صفات اب بھی پتھروں میں کھدی ہوئی ہیں، ممکن ہے کسی زمانے میں ان کی جگہ جواہرات ہونگے۔) جہانگیر کی تربت کے سرہانے یہ سیاہ پوش کون ہے! اس کے چہرے پر نقاب ہے۔ ہونٹ ہل رہے ہیں، اب اس نے فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھائے ــــ یہ وہی نورجہاں ہے جو جہانگیر کے پردے میں مغلِ اعظم کی سلطنت پر حکومت کرتی تھی۔ مگر اب گوشہ نشین ہے۔ اور موت کی دعائیں مانگ رہی ہے۔ ایک طرف ہو جایئے اس غلام گردش کی اوٹ میں ہر چند کہ اس کے عروج کا زمانہ ختم ہو چکا لیکن آخر وہ نورجہاں ہے۔ سیاہ لباس نے اسے اور بھی حسین بنا دیا ہے اور آنکھیں رکھنے والوں کی نظر میں اس کا وقار اب پہلے سے بھی دونا ہے ــــ ملکہ کہاں جا رہی ہے! کہاں چلی گئی؟ آنکھ جھپکنے میں کہاں غائب ہو گئی؟ ــــ نہیں وہ ملکہ نہیں تھی۔ اس کا تصور تھا۔ وہ تو اپنے شوہر کے مقبرے کے مغرب میں اپنی آخری آرام گاہ میں ابدی نیند سو رہی ہے۔

نورجہاں کا مقبرہ ریلوے لائن کے اس طرف واقع ہے۔ اینٹوں کا برہنہ ڈھانچہ۔ اس کا سنگِ مرمر سکھوں کی تعمیرات کی نذر ہو گیا۔ اب صرف دو تعویذ باقی ہیں۔ ایک ملکہ کی قبر کا نشان ہے اور دوسری اس کی بیٹی لاڈلی بیگم کا سنگِ مزار۔ مقبرے کے تہ خانے میں ان تعویذوں کے عین نیچے، ماں بیٹی کے تابوت اس زمانے تک معلق تھے جو پنجاب کی تاریخ میں "سکھا شاہی" کے نام سے مشہور ہے۔ ان لوگوں نے مقبروں تک کو برہنہ کر دیا... جب میں ان تابوتوں کی بے حرمتی کا تصور کرتا ہوں تو مجھے منٹو کے "ٹھنڈا گوشت" کے ہیرو ایشر سنگھ کے کردار پر بھی شک گذرنے لگتا ہے کہ آیا اس کی انسانیت واقعی زندہ تھی۔ لیکن پانچوں انگلیاں ایک سی نہیں ہوتیں جذبات کی رو میں بہ کر ہمیں تعصب سے کام نہیں لینا چاہیئے ــــ مگر طبیعت اداس ہو گئی تو آیئے چلیں۔ تاریخ کی کس قدر ستم ظریفی ہے کہ اپنے عہد کی حسین ترین عورت کی آخری آرامگاہ اسقدر اجاڑ ہو۔

اب ہم راوی کے اس پار پہونچ چکے ہیں۔ زمانے کے ساتھ ساتھ دریا بھی بدلتے رہتے ہیں۔ مغلوں کو دریا کا قرب ہمیشہ پسند رہا ہے۔ لاہور کا قلعہ بھی دریا کے کنارے واقع تھا۔ اسی راوی کے کنارے۔ اب قلعہ تو وہیں ہے دریا اس کا پہلو چھوڑ چکا ہے۔ اس کے بجائے اب بوڑھے راوی کا گندا نالا باقی رہ گیا ہے۔ لیجئے ٹکسالی دروازہ آ گیا۔ ظاہر ہے یہاں کبھی ٹکسال ہوگی مگر دریاؤں اور حکومتوں کے ساتھ ساتھ سکّے بھی تو بدلتے رہتے ہیں۔ جو سکہ کل کھرا تھا آج کھوٹا ہے جو آج کھرا ہے کل کھوٹا ہوگا۔ ان کی قیمتیں بدلتی رہتی ہیں۔ مسجد عالمگیری پر اس زمانے میں پانچ لاکھ روپے خرچ ہوئے تھے۔ آجکل کے حساب سے شاید یہ کام ایک کروڑ میں ہو جائے۔ بہت ممکن ہے دس بیس تیس لاکھ روپے اور بھی ہو جائیں آخر ٹھیکہ داروں اور متعلقہ لوگوں کو بھی تو کچھ فائدہ ہونا چاہیئے۔ مگر جہاں تک دیکھئے مسجد ہی مسجد دکھائی دیتی ہے۔ سنگ سرخ کی دیواروں پر سنگِ مرمر کے گنبد۔ اور یہ مینار تو دیکھئے۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ دستاروں کا زمانہ نہیں رہا ورنہ تھامنا پڑ جاتی ــــ اس کا صدر دروازہ مثمنی شکل کا ہے جس کے چاروں کونوں پر چھوٹے چھوٹے مینار ہیں۔ سامنے ۵۳۰ مربع فٹ کا صحن ہے۔ بیچ میں حوض۔ سامنے مسجد کی صدر عمارت میں بارہ در ہیں۔ مسجد کے صدر مینار جن کی تعداد چار ہے کوئی ۱۴۵ فٹ بلند ہیں صحن کے گرد دیوار ہے جس کے ساتھ حجرے بنے ہوئے ہیں۔ آیئے اب واپس چلیں۔ لیجئے پھر صدر دروازہ آ گیا۔ لاہور کے کچھ خاندان اسے خونی دروازہ بھی کہتے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد جب پہلی عید آئی تو نماز کے بعد جلدی سے گھر پہنچنے کی کوشش میں ہجوم کا ریلا جو آیا تو کئی بندگانِ خدا کچلے گئے۔

عالمگیری مسجد کے صدر دروازے سے باہر نکلئے تو دائیں ہاتھ اس مردِ قلندر کی بارگاہ ہے جس نے ہمیں خودی کا سبق دیا اور سب سے پہلے

پاکستان کا خواب دیکھا۔ سنگِ سرخ کی یہ مختصر سی خانقاہ یوں تو اپنے ماحول سے خاصی ہم آہنگ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے قلندر کی خانقاہ کسی کھلے میدان میں کسی اونچے بہت ہی اونچے چبوترے پر واقع ہونی چاہیئے تھی مجھے اقبال کی قبر کا تعویذ بھی یاد آگیا۔ اتنے بڑے تعویذ کے لیئے اس سے چوگنی جگہ درکار تھی۔ اب کے یوم اقبال پہ آپ اگر فاتحہ خوانی کو جائیں تو میری اس رائے پہ غور کیجیئے گا ——

جی ہاں یہ حضوری باغ ہے۔ اور یہ بارہ دری رنجیت سنگھ نے مسلمانوں کے مقبرے کے اینٹ پتھر سے بنوائی تھی۔ اور یہ سامنے بابِ عالمگیری۔ قلعۂ لاہور کا دروازہ۔ یہاں یہ بتانا شاید بے محل نہ ہوگا کہ چند سال ہوئے کچھ بزرگوں نے مل کر اس کا نام بدلنے کی کوشش کی تھی لیکن خوش قسمتی سے رائے عامہ نے ان کے ارادوں کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ ورنہ تاریخ کے بہت سے اندراجات غلط ہو جاتے۔ ہمیں پرانی تاریخیں بھی بدلنا پڑتیں جو ہمیں قلعہ لاہور کی کہانی بتاتی ہیں —— خیر ...... ملے بخیر گذشت!

تو صاحب یہ ہے قلعۂ لاہور —— قلعے، حرم سرائیں، خوابگاہیں حمام، مسجدیں اور مقبرے —— مغلوں کا سارا فن تعمیر انہی عمارتوں پر ختم ہو جاتا ہے۔ انہی سے ان کی جدت و اختراع کا پتہ چلتا ہے۔

شاہجہاں کی مسجد دیکھنے والوں کو اس کے پوتے کی مسجد دیکھ کر ممکن ہے مایوسی ہوئی ہوگی۔ اگلے وقتوں کے مطلق العنان بادشاہ فنونِ لطیفہ کے سرپرست ہی نہیں مقنن بھی تھے۔ فتح پور سیکری میں اکبر کی ایجادیں اور روضۂ تاج اور لال قلعہ میں شاہجہاں کی سحر طرازیاں آپ نے دیکھی ہوں گی۔ مہابلی اکبر مذہب کے معاملے میں آزاد خیال آدمی تھا۔ اس کے حرم میں راجپوت سرداروں کی لڑکیاں تھیں۔ اس کی رانیاں۔ اس نے ہندوؤں کے طرز تعمیر کو معمولی تبدیلیوں کے ساتھ ایران کے فن میں شامل کر دیا۔ جودھا بائی کے محل اور سیکری کی دوسری عمارتوں میں دروازوں اور ستونوں کو دیکھیئے۔ پھندنے سے لٹکتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں ستونوں کی بالائی شاخیں جو چھتوں کو سنبھالے ہوئے۔ وزنی ہیں اور گرانی کا احساس ہوتا ہے جیسے یہ عمارت آپ کو کچل دے گی۔ اس کے برعکس شاہجہاں کو دیکھیئے۔ اس کے مذہبی خیالات اکبر سے مختلف ہیں، اس کے مزاج میں اپنے دادا کی بہ نسبت زیادہ نفاست موجود ہے۔ اکبر ہندوستان کے تخت پر تیسرا، بلکہ ایک لحاظ سے دوسرا بادشاہ تھا۔ شاہجہاں اس طویل عریض سلطنت کا پانچواں شہنشاہ ہے۔ وہ آس پاس کی چکا چوند سے جلدی مرعوب نہیں ہوتا۔ اس کا جمالیاتی ذوق غیر ضروری چیزوں کو بلا تاسف رد کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس کی تعمیرات میں بوجھل پن نہیں ملتا۔ اچھے شعر کی طرح ان میں کوئی لفظ زائد نہیں ملتا ——

—— اب اس کے بیٹے عالمگیر کو لیجیئے۔ جہاں اُسکے پردادا نے اپنی آزادہ روی اور سیاسی مصلحتوں سے ایک نیا مذہب گھڑ مارا، وہاں عالمگیر مذہب کے معاملے میں دین اسلام کی پہلی سادگی کا قائل تھا۔ ایسے ہی اس سے اس آرائش کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی جو شاہجہاں کی عمارتوں کی خبر دیتی ہے یہی وجہ ہے کہ لاہور کی مسجد عالمگیری میں جمال کی بجائے جلال کا رنگ نمایاں ہے۔ اس تاریخی پردے پر اب قلعہ لاہور کو دیکھتے چلیئے۔ اس کی تعمیر میں اکبر سے لے کر عالمگیر تک سبھوں کا ہاتھ ہے —— آج قلعہ ہی کی حالت خاصی غیر ہے اور بیشتر عمارتیں کھنڈروں میں تبدیل ہو رہی ہیں۔

دیوانِ عام کے شمال مغربی کونے کا ایک صحن اکبر اور جہانگیر کے ہاتھ کا اعلان کر رہا ہے۔ یہ پہلا دور ہے۔ دوسرے دور کے "ہاتھی پول" محل کے خصوصی دروازے کی ایک تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شاہجہاں کا دور ہے۔ تیسرا دور مغربی دروازے اور حضوری باغ یعنی عالمگیر کا دورِ تعمیر ہے۔ پہلے دور میں متھرا کا پتھر اور اینٹیں استعمال کی گئی ہیں اور ہندو طرز تعمیر و آرائش کا پتہ چلتا ہے۔ اس میں دیواروں پر جانوروں کی تصویریں بھی نظر آتی ہیں —— جنوبی علاقے کی عمارتیں اب ڈھے چکی ہیں۔ یہاں شہنشاہ جھروکہ درشن دیتے تھے۔ تخت کے کمرے میں سنگ مرمر کا چھپر تھا۔ تخت کے عقبی علاقے میں جہانگیر کا برج ہے —— وہ دیکھیئے۔ اس شہ نشین میں۔ رومانوں کا ماتا شہزادگی کے عالم میں راوی کا نظارہ کر رہا ہے۔ صحن میں باغ بھی ہے۔ اکبر کا بیٹا باغوں کا عاشق ہے۔ یہاں حوض کے گرد فوارے اچھل رہے ہیں۔ اپنی توزک میں وہ نئی عمارتوں کی تکمیل کا ذکر کرتا ہے "جو حسن و نزاکت کا نمونہ ہیں اور مصوری کے اساتذہ فن کے کمالات سے مزین ہیں" —— خیال رہے کہ انصاف اور محبت کے علاوہ تیسرا فن جو جہانگیر سے منسوب ہے مصوری ہے۔ "مغل سکول آف آرٹ" کا عروج اس کی سرپرستی کا مرہون منت ہے —— یہ عمارتیں استاد عبدالکریم کے فن کا نمونہ ہیں۔ شاہجہاں کے ہاتھی دروازے پر بھی استاد کا نام آتا ہے۔ معمور خاں (عبدالکریم)

شاہی معمار ہے۔ اُستاد احمد لاہوری (معمارِ تاج) پر ابھی کسی کی نظر نہیں پڑی۔ تخت کے آگے چالیس ستونوں والا دیوانِ عام بھی شاہجہاں کے حکم سے بنایا گیا۔ لیکن تباہ ہوگیا۔ اس کی جگہ اب جدید قوسوں والی ایک بھونڈی اور بھدی عمارت کھڑی ہے۔ ستون البتہ وہی ہیں۔ لیکن اس عمارت کو دیکھ کر شاہجہاں یقیناً خودکشی کرلیتا۔ شاہ برج کی عمارتیں بھی شاہ جہاں کی نگرانی میں مکمل ہوئیں ـــ یہ شاہجہاں کی جوانی کا زمانہ معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ فن میں روایت سے باغی ہے وہ معمول کے خلاف عجیب و غریب تصویریں بنوا رہا ہے۔ یہ تصویریں پتھر میں کھودی گئی ہیں۔ اور ایشیا میں اپنی مثال آپ ہیں (یہ ماہرین کی رائے ہے)۔ یہ تصویریں ایرانی صنعت گری کا پتہ دے رہی ہیں۔

اب ہم قلعے کے شمال مغربی کونے میں کھڑے ہیں ـــ یہ شیش محل ہے۔ اس کے سامنے دوہرے ستون چھت کو سنبھالے کھڑے ہیں۔ اور ذرا قوسیں تو دیکھئے۔ ہلال کی قوسیں ہیں۔ ابروؤں کی کمانیں جو ایک دوسرے کے ساتھ ملتی چلی گئی ہیں۔ ہر محراب ۱۴ کمانوں پر مشتمل ہے۔ ستون جو دوازدہ پہلو ہیں، ساتھ ساتھ نہیں بلکہ آگے پیچھے کھڑے ہیں۔ پائے منقش ہیں اور سر میں کنول کی پتیاں ہیں۔ دونوں ستونوں پر تین متوازی قوسیں نظر آ رہی ہیں۔ دیواروں کا زیریں حصہ سنگِ مرمر کا ہے۔ اوپر شیشوں کے ٹکڑے جڑے ہیں۔ گذشتہ صدی میں اس عمارت کا حلیہ بگاڑنے کی کافی کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ سکھوں اور انگریزوں نے ریشم میں جہاں جہاں ٹاٹ کے پیوند لگائے ہیں وہ صاف آنکھوں میں کھٹک رہے ہیں۔

شیش محل کے مغربی صحن میں یہ جو سنگِ مرمر کی کھلونا سی عمارت نظر آ رہی ہے "نولکھا" کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں بھی سنگِ مرمر کو کھود کر اس میں رنگ رنگ کے پتھر نگینوں کی طرح جڑ دیئے گئے ہیں۔ اس کی چھتری تو دیکھئے جیسے نئے چاند آڑے کرکے چھجے کی جگہ لگا دئے ہوں۔ روشنی ان سے یوں پھسلتی ہے جیسے چاندی کا مینہ برسے۔

اور شاہ جہاں کی یہ چھوٹی خواب گاہ بھی دیکھتے چلئے۔ آج کوئی خواجہ سرا ہمیں نہیں روکے گا۔ کچھ لوگ اس عمارت کو دیوانِ خاص سے بھی منسوب کرتے ہیں۔ میری بھی یہی رائے ہے۔ خواب گاہ میں کچھ زیادہ تخلیہ کی ضرورت ہونی چاہئے اور خدا معلوم یہاں کتنی خوابگاہیں ہوں گی۔ لیکن جہاں ان خواب گاہوں کے اجالے خاک میں جا چھپے وہاں یہ خواب گاہیں کیوں باقی رہتیں۔ وہ لوگ جو تابوتوں تک کا احترام نہیں کرسکے تھے، انہوں نے ان خلوت کدوں کے پتھروں کو بھی اپنی زبانوں سے چاٹ لیا ہوگا ــــ

مگر آئیے اب چلیں۔ کب تک ان کھنڈروں میں مُردوں سے باتیں کیجئے گا۔ لاہور، زندہ و پائندہ لاہور آپ کو بلا رہا ہے۔ لاہور کے بے فکروں کے چہچہے۔ لاہور کی وزیر خاں کی مسجد جس میں ایرانی عنصر غالب ہے اور جس کی کاشی کاری دیکھ کر آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔ لاہور کا شالامار جس کی نشاط گاہیں اب ویران پڑی ہیں۔ مجھے وہ مغلیہ تصویر آج بھی یاد ہے جس میں جہانگیر شالامار کے حوض کے درمیانی چبوترے پر جلوہ فگن ہے۔ حوض میں فوارے اچھل رہے ہیں اور کنیزیں جل پریوں کی طرح تیر رہی ہیں۔ نیلے نیلے پانی کی شفاف لہروں کے نیچے اُن کے کندن سے بدن ساون کی بدلیوں میں بجلی کی طرح لہرا رہے ہیں۔ عابد علی عابد نے اس تصویر سے متاثر ہوکر ایک نظم بھی کہی تھی۔ اس کا ایک مصرع مجھے یاد ہے۔ آپ بھی سن لیجے ع جہانگیر آج شالامار میں ساون مناتا ہے ــــ کہتے ہیں اب وہ برساتیں ہی نہیں ہوتیں ــ تو چلئے ــــ

ــــ لیکن کہاں؟ لاہور کا ذرہ ذرہ ہوشربا ہے۔ یہاں ہزاروں کہانیاں دفن ہیں۔ تو قبل اس کے کہ آپ بھی لاہور زدہ ہو جائیں اسکے طلسم سے بچ کر نکل چلئے۔ ورنہ آپ یہیں کے ہو رہیں گے۔

روغنی اینٹیں آپ نے مقبروں اور محلوں میں دیکھی ہوں گی۔ ریلوے سٹیشنوں پر ان کا کیا کام؛ مگر یہ ملتان کا ریلوے سٹیشن ہے۔ یہ "گرد و گرما گدا و گورستان" کے تحفوں کا شہر ہے۔ یہاں کی کاشی کاری مشہور زمانہ تھی۔ یہ نیلی روغنی اینٹیں جو آپ کو ریلوے سٹیشن کی پیشانی پر دکھائی دے رہی ہیں۔ مقامی صنعت کا نمونہ ہیں۔ اب یہ زوال پذیر ہے۔ یہ زوال پذیر ہونا بھی خوب چیز ہے۔ کس کا زوال کب اور کیوں شروع ہوا! یہ تاریخ کا ایک بہت بڑا سوال ہے۔ خیر یہ جملۂ معترضہ ہے۔ گرد و گرما کا اندازہ تو آپ کو ہوگیا ہوگا۔ شہر چلئے تو گداؤں سے بھی ملاقات ہو جائیگی۔ اس کے علاوہ شہر آئے ہیں تو مقبروں پر بھی نظر ڈالتے چلئے جن سے آپ کو یہاں کے فن تعمیر کا اندازہ ہو جائے گا جو ہماری سیاحت کا اصل مقصد ہے مغلوں سے پہلے کے پانچ مقبروں میں سب سے پرانا شاہ یوسف گردیزی کا روغنی اینٹوں والا مقبرہ ہے۔ لمبوترا سا، چھت سپاٹ۔ ۱۱۵۲ء میں بھی لوگ بیسویں صدی کی طرح سپاٹ چیزوں کے قائل تھے۔ پسند

اپنی اپنی۔ اس کی ایک دیوار میں محراب بھی نظر آرہی ہے ـــــ اور یہ بہاء الحق کا مزار ہے۔ سال؛ ۱۲۶۲ھ۔ اس کی دیواریں ڈھلوان ہیں، اور روشنی کے لئے کھڑکیاں لگی ہیں۔ پاکستان و ہند میں ایرانی طرز کا سب سے پرانا نمونہ بھی یہیں ملتان میں واقع ہے۔ یہاں شیخ رکنِ عالم دفن ہیں جو اپنے زمانے کے مشہور بزرگ تھے۔ دلی کے سلطان غیاث الدین تغلق کو ان سے بہت عقیدت تھی۔ چنانچہ وہ مقبرہ جو اس نے اپنے لئے بنوایا تھا اس نے شیخ کے لاشے کی نذر کر دیا۔ اس مقبرے کی بلندی ۱۱۵ فٹ ہے۔ مینار آٹھ اور برجیاں نو (گنبد کی مرکزی برجی بھی اس میں شامل ہے)۔ باہر گہری نیلی، سفید اور آسمانی روغنی اینٹیں چمک رہی ہیں۔ مگر جون کے مہینے میں یہ ملتان کی سیر کی کیا سوجھی ہے۔ خدارا بھاگ چلئے یہاں سے۔ کہتے ہیں اس شہر پر کسی مجذوب کی بد دعا معلق ہے۔ روایت ہے کہ مجذوب کے جسم کی کھال یا تو کسی حاکم نے اتار دی تھی یا شاید اس نے خود ہی کھینچ ڈالی تھی۔ اور وہ اسی حالت میں گھومتا پھرتا تھا۔ کوئی اسے مچھلی بھوننے کے لئے آگ کا انگارہ تک دینے کا روادار نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے دعا کی اور سورج نیچے اتر آیا۔ جس کی آگ میں اس نے اپنی مچھلی بھون لی۔ سورج اپنا یہ کام آج تک نہیں بھولا اور گرمیوں میں نیچے اتر آتا ہے۔ یہ بھی غنیمت گذری کہ بد دعا دینے اور سورج کو نیچے اتارنے کی طاقت ہر ایک کو نہیں ملی ورنہ فضائے بسیط میں ہماری تہذیب کی راکھ بھی گم ہو چکی ہوتی اور دوسرے ستاروں کی مخلوق اس سے قیاس آرائیاں کرتی کہ یہ کرۂ ارض کی خاک ہے، انسانی تہذیب کی خاک جہاں نیک انسانوں کی کوششوں کے باوجود آدمیت کا لفظ کبھی شرمندۂ احسان نہ ہوا اور تعصب سے باز نہیں آیا۔

اب ہم سندھ کے ریگستان میں ہیں۔ مقام "ٹھٹھہ" ہے۔ کیفیت وہی ملتان کی۔ گداؤں کو چھوڑ کے۔ خیرات دینے اور لینے والے سبھی پیوند خاک ہو چکے ہیں۔ اندازہ ہے کہ یہاں کے گورستان کی آبادی دس لاکھ کے لگ بھگ تو ضرور ہوگی۔ حکمرانوں اور دنیوی جاہ و جلال سے بے نیاز بزرگوں کے مقبرے اور روضے عوام کی قبروں سے بلند اور حسین ہیں۔ گرمی سے بچنے کے لئے ان کے گرداگرد دیواریں ہیں اور اوپر گنبد اور چھتیں۔ لیکن دوسری قبریں ننگی ہیں۔ اگر وہ جیتے جی دھوپ اور لو برداشت کر سکتے ہیں تو اب بھی ان کے لئے موسم کی شدت معمولی بات ہے۔ بلکہ ایک لحاظ سے وہ مزے میں ہیں۔ نہ کسی دیوار کے بیٹھنے کا ڈر ہے نہ گنبد کے گرنے کا "دھڑکا"۔ "ٹھٹھہ" کے گورستان سے روغنی اینٹوں کے رواج کا پتہ چلتا ہے۔ حیدرآباد سے تیس میل کے فاصلے پر "ہالہ" میں یہ صنعت جو کبھی خوب چمک رہی تھی، اب ہچکیاں لے رہی ہے ـــــ روغنی اینٹوں کا کمال دیکھنا ہو تو ٹھٹھہ کی جامع مسجدوں میں دیکھئے۔ یہ خالص ایرانی طرزِ تعمیر کا نمونہ ہے۔ اس کے اندر ایرانی کاشی کاری کو دیکھکر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ چنگیز کے خاندان کے کسی نیک سیرت بزرگ نے ۱۵۸۸ء میں بنوائی تھی۔ دوسری جامع مسجد شاہجہاں کے حکم سے تعمیر ہوئی۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب جہانگیر اس سے ناراض تھا۔ اس کی بنیادیں پتھر کی ہیں لیکن باقی عمارت پختہ اینٹوں کی ہے۔ اس حجم آدمی کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ درمیانی صحن، جو کھلا ہے، ۱۶۴ × ۷ ۹ فٹ ہے۔ اسکے اردگرد گنبدوں والے حجرے ہیں۔ ان گنبدوں کے اوپر کلس یا مینار نہیں ہیں۔ چھوٹے بڑے گنبدوں کی تعداد ۹۳ ہوتی ہے ـــــ انہیں دیکھ کر کیا آپ کو یہ نہیں محسوس ہو رہا جیسے صحرا کے سینے سے بلبلے اٹھ رہے ہوں۔ شاہجہاں کو جو سوجھتی تھی نئی سوجھتی تھی۔

اب کوئی ساڑھے چار ہزار سال پیچھے چلئے۔ وقت کے لحاظ سے سفر لمبا ہے۔ لیکن فن تعمیر سے دلچسپی رکھنے والوں کی معلومات میں اضافہ ہوگا ـــ ـــ ـــ مقام موہنجوڈارو ہے۔ وادیٔ سندھ کی تہذیب کا سب سے پرانا مرکز۔ کچھ لوگ اسے تہذیب کا پہلا گہوارہ بھی گردانتے ہیں۔ لیکن تقدم و تاخر کے جھگڑوں سے ہمارا کیا علاقہ ـــ تو یہ ہے موہنجوڈارو! آپ کو سرحد کی ڈھیریاں یاد ہوں گی۔ شاہ جی کی ڈھیری۔ چارسدّہ کی ڈھیریاں ...... سندھی زبان میں "ڈارو" اسی "ڈھیری" کا ہم معنی ہے۔ یعنی ٹیلہ۔ کبھی یہ ڈھیریاں اور ڈارو آبادیاں تھیں۔ موہنجوڈارو کا مطلب ہے مردوں کی ڈھیری۔ اس ڈھیری کی کھدائی تہذیب کی کہانی کو پانچ ہزار سال پیچھے لے گئی ہے۔ اس تہذیب کے دوسرے مظاہر سے اس وقت ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ ہمارا موضوع فنِ تعمیر ہے۔ اس زمانے میں یہ فن کس حالت میں تھا اس کا اندازہ بس اس سے لگا لیجئے کہ یہاں سے کروڑوں پکی اینٹیں دبی ہوئی نکلی ہیں۔ یہاں گھروں کی دیواریں سادی تھیں۔ حمام تھے۔ کنوئیں تھے۔ غسلخانے تھے۔ گندے پانی کی نکاسی کے لئے نالیاں، موریاں اور بدروئیں موجود ہیں۔ سیلاب سے بچاؤ کے لئے بند بندھا ہے۔ مگر ـــ یہ "مگر" قابلِ غور ہے ـــ مگر یہاں کی حکومت یا اسے جو کچھ بھی کہہ لیجئے، کچھ ایسی زیادہ انفرادیت

(باقی صفحہ ۵۴ پر)

افسانہ

یادِ ایّامے

(۲)

ابوالفضل صدیقی

تایا کے خمیر میں کارتوسی بندوق سے کچھ غدر ۱۸۵۷ء کے مجاہدوں جیسی عصبیت تھی اور اپنی بگڑی ہوئی زبان میں "برچ لوڈ" کو "برج لوٹ" کہتے تھے۔ خاص طور پر اس میں یہ عیب بتاتے تھے کہ یہ جلدی جلدی بھری جا سکتی ہے اور اس سے شکار میں بے تکے فیر اور فضول دھماکے زیادہ ہوتے ہیں، اور ان کے نزدیک جتنا شکار زیادہ دھماکوں سے خراب ہوتا ہے اتنا مارنے سے نہیں ہوتا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ "برج لوٹ" کے دھماکے جتنا شکار مار نہیں سکتے اس سے کہیں زیادہ خراب کر دیتے ہیں، اور اس حد تک انتشار پیدا کرتے ہیں کہ جانوروں کی نسل تک منقطع کرنے کے باعث ہیں۔ سنگھ بابو ہماری پارٹی کا سب سے زیادہ چلتا پرزہ، اور بے پناہ شکاری تھا اور تایا کی استادی کا ان کے سامنے تو خیر معترف تھے مگر پیچھے ان کے تذکرہ پر ان کی تعریف میں حصہ نہ لیتے تھے اور یوں تایا کا بہت احترام کرتے تھے۔ ایک روز تایا کی موجودگی میں بولے کہ "تایا کا شکار کچھ "اَن سپورٹنگ" قسم کا ہے۔ اور میں تایا کے حضور میں ذرا بیباک تھا۔ میں نے تایا سے کہا کہ "تایا ہمارے سنگھ بابو کا خیال ہے، کہ آپ کا شکار شکاری جیسا نہیں بلکہ کچھ قصائی پن سا ہے"۔ مشہور بات تھی کہ تایا کو کبھی غصہ نہ آتا تھا، اگر شکار میں فیر خالی چلا جاتا تو آزردگی کے مارے دو دو وقت کھانا چھوڑ دیتے تھے، مگر یہ تنقید سن کر تایا کا چہرہ سرخ ہو گیا اور براہِ راست سنگھ بابو سے مخاطب ہوئے اور نہایت طنزیہ تیوروں اور مدھم انداز میں بولے "اے واہ میری جان! کس معنی کر، ٹھاکر جی، یعنی اے واہ میری جان آپ جنٹلمین برج لوٹ والوں کی کیا کسوٹی ہے، اے واہ میری جان بولو نا، یہی کہ کم سے کم فیروں میں زیادہ سے زیادہ شکار مار کر دکھاؤ۔ ہاں تو اے واہ میری جان اب رہا طریقۂ شکار کا سوال تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ جس طریقہ میں کم سے کم دھماکوں میں زیادہ سے زیادہ شکار ہاتھ آ سکے وہی طریقہ سب سے بہتر ہے اور آپ کے نئے طریقہ سے ہمارا پُرانا طریقہ اچھا ہے"۔

تایا نے مختصر سے جملوں میں بات نہایت منظم قسم کی کہہ دی تھی لیکن سنگھ بابو نے کہا "مگر تایا جانور کو جب تک بچنے کا موقع نہ دیا جائے، اس وقت تک شکار کا کیا لطف اور ہمارے شکار کے اعلیٰ و ادنیٰ ہونے کا معیار یہی ہے کہ جو جانور سب سے کم یاب اور زیادہ سے زیادہ چوکنا ہو اسی کا شکار اونچی قسم کا مانا جاتا ہے"۔

"لیکن اے واہ میری جان! آپ شکار میں زیادہ سے زیادہ مارنے کو آتے ہو یا زیادہ سے زیادہ بھڑکا کر بھگانے کو، اے واہ میری جان، تم لوگ مارتے بہت کم ہو اور اے واہ میری جان بھڑکاتے زیادہ ہو، ٹھائیں ٹھائیں ٹھس ایک مارا اور ہزار خراب کیے۔ اور اس حد تک اے واہ میری جان کہ بھڑک کر بھاگتے بھاگتے اے واہ میری جان نسل ہی منقطع ہوئی جا رہی ہے اور شکار ناممکن ہوتا جاتا ہے"۔ لیکن تایا بھڑکے ہوئے شکار کے مارنے میں لطف ہی کچھ اور ہے"۔

"اے واہ میری جان! جس وقت جنگل کے ہانکے میں تمہاری اس ٹھائیں ٹھائیں سے بھڑک کر کوئی پاڑہ تایا کے داؤ پر سے گذرتی ہے، تو تایا کو بھی یہ مزہ آ جاتا ہے جس کا تم ذکر کر رہے ہو۔ اور جس وقت تمہاری ٹیم کے بے تکے انگریزی فیروں سے کوئی کوئی اچھی قسم کی مرغابیوں کے بڑے بڑے تنگ بدحواس ہو کر اے واہ میری جان تایا کے سر پر کو ہو دبیتے آتے ہیں تو بھی تایا اپنا ہاتھ دکھا دیتے ہیں کہ اے واہ میری جان تمہاری آنکھیں پھٹی رہ جاتی ہیں، بس فرق اتنا ہے کہ تم دھماکوں سے بھڑکا کر بھگاتے زیادہ ہو اور تایا مارتے زیادہ ہیں۔ سمجھ لو کہ اے واہ میری جان زیادہ دھماکے کرنا کوئی کمال نہیں ہے، خالی دھماکا اے واہ میری جان گھر بیٹھے بھی کر سکتے ہو، زیادہ مارنا کمال ہے اے واہ میری جان، شکاری چڑیں، چوپایوں کو قدرت نے یہ سبق دیا ہے اور اپنی اپنی داؤ گھات سب

کرتے ہیں اور سب خاموشی سے شکار کرتے ہیں، چیخ چنگھاڑ کر تو اے واہ
میری جان شیر بھی نہیں مارتا اور اے واہ میری جان تمہارا شکار تو قانون قدرت
کے خلاف ہے۔ اور اے واہ میری جان تایا جنگل میں دھماکے کرنے نہیں
آتے شکار کھیلنے آتے ہیں اور اللہ نے تمہارے کانوں کو یہ توفیق دے دی
ہے کہ دھماکے اچھے معلوم پڑتے ہیں بے پیرے بے مرشدے اول تو کوئی
تمہارا استاد ہی نہیں اور اگر کوئی استاد ہے تو غلط ہے۔ تایا تو تمہارے
بے تکے فیر دیکھتے ہیں اور ہنستے ہیں۔ اے واہ میری جان! آتش بازی کا شوق
ہے تو گھر بیٹھ کر پٹاخے چھوڑو۔ اے واہ میری جان بے زبان جانوروں کو
کیوں ہلکان کرتے ہو، اے واہ میری جان! اور تایا کی منطق کا ہمارے
پاس جواب نہ تھا۔ اور ہم لوگوں کو تایا کے شکار سے زیادہ ان کے تکیہ کلام میں
لطف آتا۔ تایا فصلی شکاری تو تھے نہیں، بارہ ماسی قسم کے شکاری، اور
بندوق اور جالیوں تک ہی ان کا شکار نہ ہوتا تھا۔ تایا کو غلیل چلانے میں
ید طولیٰ حاصل تھا۔ موٹے موٹے بانسوں کو چھیل چھیل کر اور رگیت رگیت کر
بڑی نازک غلیلیں بناتے تھے اور سانبھر کے مضبوط پٹھوں کی تانت
بٹ چکنی مٹی میں پرانی روئی اور ستلی سٹرا سٹرا کر بڑے سخت اور بھاری
غلے بناتے۔ غلیل کے نشانہ کی پریکٹس کا یہ عالم تھا کہ فضا میں ایک غلہ چلا کر
اس میں دوسرا مار دیتے اور پھر تیسرا چوتھا نہ معلوم یکے بعد دیگرے کتنے
غلے ٹکرا دیتے۔ اور پھر ستم بالائے ستم یہ تھا کہ ان کی غلیل بازی بچکانہ
کھیل جیسی نہ تھی۔ اڑتے ہوئے تیتر جیسے اہم اسپورٹ میں وہ اپنی
غلیل سے بالکل وہی کام لے کر دکھاتے جو اور سب پارٹی بندوقوں سے
لیتی۔ اڑتے ہوئے تیتر پر ہم نمبر ۸ اور نمبر ۹ کے چھرہ کے فیر کرتے جس کے
ایک کارتوس میں سات سو اور پانچ سو دانے بھرے جاتے ہیں۔ اور تایا اپنے
سامنے سے اڑتے تیتر پر غلہ رسید کرتے اور اوٹ میں ہمارے لگ بھگ رہتے
اور سب شکاریوں کے پیچھے ایک ایک مزدور دوسری بندوق اور کارتوسوں کا
بیگ لئے چلتا اور فیر ہونے کے بعد خالی بندوق ہاتھ سے لے لیتا اور بھری
دے دیتا مگر تایا اپنے غلوں کا تھیلا گلے میں ڈالے اپنے چوڑے چکلے ہاتھ
میں سات غلے بھرے آٹومیٹک رائفل کی طرح تیزی سے غلے چلاتے جاتے
اور ایک مرتبہ تو تایا کی غلیل بازی اور تکیہ کلام دونوں نے دھاک بٹھا دی۔
ہمارے ایک انگریز دوست اگریکلچر انجنیر اور ان کے کچھ مہمان تیتر کے
شکار کو ہمارے یہاں مدعو ہوئے، تایا پہلے تو گریز کرتے رہے، کیونکہ شکار
پارٹی میں انگریز اور تین چار میمیں تھیں مگر ہم نے تبرکاً انہیں ساتھ رکھ ہی لیا تو

کسی صورت کارتوسی بندوق لے کر پارٹی کے ساتھ باقاعدہ شکار پر
تیار نہ ہوئے اور اپنی غلیل ہی لے کر چلے، پہلے تو انگریز مہمان خاص طور پر
لیڈیز نے بہت کان کھڑے کئے۔ تیتر کے شکار میں پارٹی ایک محاذ
میں گھاس کے اندر چلتی ہے اور مخصوص طریقہ سے "بیٹ" کی جاتی ہے
اور شکاریوں کے سامنے سے تیتر اپنی مخصوص تڑپ کے گولے جیسی تند
اڑان اڑتا ہے اور جیسے پلک مارتے فیر کیا جاتا ہے سب پارٹی آٹھ
اور چھ نمبر کے چھرہ کے کارتوس استعمال کر رہی تھی اور تایا مٹھی میں سات غلے
بھرے اپنی مخصوص تیزی کے ساتھ اپنا اکیلا غلہ، اور اس پارٹی میں تو ہر
اعتبار سے تایا نے مہمانوں کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ خاص طور پر ان کے
تکیہ کلام نے جو شکار میں ان کا نعرۂ تحسین بن جاتا تھا سب پارٹی کو بہت
محظوظ کیا اور مس صاحبہ جن کا نام "میری جون" تھا شروع میں تایا کی
آوازوں پہ یہ سمجھتی رہیں کہ خاص طور پر ان کا نام پکار کر انہیں کو "چیئر اپ"
کر رہے ہیں۔ مگر جب انہوں نے اندازہ کیا کہ تایا ہر شکاری کو انہیں کا نام لے کر
"چیئر اپ" کر رہے ہیں تو مس میری جون نے بہت کان کھڑے کئے، اور
نگاہیں تو پہلے ہی سے سب پارٹی کی تایا کی بزرگی دیکھ کر ہی تایا کی جانب
اٹھ گئی تھیں باوجودیکہ تعارف کے وقت عملاً تایا کی خصوصیات بتائی
گئی تھیں لیکن ایسی پارٹی میں اس ہیئت کذائی کے ساتھ جو شکاری تیتر کے
شکار میں غلیل لے کر میدان میں اترے اسے کون سمجھے گا کہ وہ جوکر یا بھانڈ
نہیں ہے، مگر جب اپنی انگریزی کارخانوں کی اسپیشل آرڈر کے ذریعہ وزن،
تعداد اور ہاتھوں کے ناپ کے مطابق سائنٹفک اصولوں پر تیار کی ہوئی
بندوقوں کے دوش بدوش تایا کی بانس کی غلیل اور مٹی کے شیر قسم کے غلوں
کے جوہر دیکھے تو حیرت سے آنکھیں پھٹی رہ گئیں اور تایا کی ہر نقل و حرکت
بڑے غور سے دیکھنے لگے اور اپنے شکار سے زیادہ تایا کے شکار میں
لطف لینے لگے۔

شروع میں ہمیں اندیشہ ہوا کہ ہماری غیر ملکی مہمان خاتون مس میری جون
اس بے تکلفی اور دریدہ دہنی کے ساتھ تایا کے منہ سے اپنا نام سن کر
کہیں برا نہ مان جائیں اور اگر ہمیں پہلے سے علم ہو جاتا کہ ایک خاتون ٹھیک
تایا کے تکیہ کلام کے مطابق تشریف لا رہی ہیں تو ہم تایا کو مدعو ہی نہ کرتے
اور وہ تو وقت کے وقت تعارف پر معلوم ہوا لیکن اب بے سود تھا،
ہرچہ بادا باد جس قدر محال یہ چیز تھی کہ "میری جان" اپنا نام بدل بھی لیں
اور فراموش بھی کر دیں، اس سے کم یہ بھی نہ تھی کہ تایا اپنا تکیہ کلام چھوڑ سکیں،

ہم لوگوں میں رائے زنی ہوئی کہ بعد کے کسی ناخوشگوار نتیجہ کے ظہور سے پیشتر بہتر ہے کہ مس صاحبہ کو پہلے سے متنبہ کر دینا چاہیئے کہ تایا کا یہ تکیہ کلام ہے آپ "مائنڈ" نہ کریں مگر استاد رضا خاں نے کہا اس لئے کہ اگر وہ نہ بھی سُن سکیں تو بھی ضرور نہیں۔ لہٰذا یہ طے رہا کہ یوں ہی چھوڑا جائے اور پہلے سے خواہ مخواہ ہمیں متنبہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

مگر مس میری جون" جتنی ستھری شکل کی لڑکی تھی اتنی ہی شگفتہ اسپورٹنگ اسپرٹ والی ہنسوڑ اور ملنسار قسم کی۔ شروع میں تو تایا کے اس مخصوص کرم اور توجہ خاص پر بہت خوش ہوئیں۔ لیکن ذرا دیر بعد جب اندازہ کیا کہ پارٹی بھر میں کسی کا بھی اچھا فیر پڑے، بڑے میاں صرف انہیں کا نام لے کر ایک خاص انداز میں چیئر اپ کرتے ہیں تو وہ کچھ گومگو میں پڑ گئیں اور تایا کی آوازوں پر کان زیادہ گہرے لگا دیئے۔ پہلی "بیٹ" کے بعد ناشتہ پر جمع ہوئے تو ہر مہمان ساتھی تایا کی غلیل بازی سے حد درجہ مرعوب تھا۔ اور سب تایا کو ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی مافوق البشر مخلوق ہیں۔

مس میری جان نے نہایت ادب کے ساتھ تایا سے کچھ استفسار کی اجازت چاہی جس پر تایا نے جیسے اُچھل کر کہا "اے واہ میری جان! فرماؤ فرماؤ، کیا فرماتی ہو آپ، اے واہ میری جان"۔

جواب پر مس میری جان بیچاری کچھ حیرت کے ساتھ استفساریہ انداز میں تایا کو بڑے غور سے دیکھنے لگیں، پھر ذرا سنبھل کر آواز صاف کرتے ہوئے کہا "ہوں، دیکھئے تو آپ تمام شکار میں مجھ ہی کو کیوں بڑھاتے رہے اور ہر ایک کے اچھے فیر پر میرا ہی نام لے کر کیوں چیئر اپ کیا"۔

تایا نے نہایت معصومیت کے انداز میں جواب دیا "اے واہ میری جان بڑا خوبصورت ہاتھ ہے آپ کا۔ اے واہ میری جان۔ اور ایک آپ ہی پر کیا منحصر اے واہ میری جان آپ سب کے سب بڑے نفیس ہاتھ ڈالتے ہو، طبیعت خوش ہوگئی کیا کہنے ماشاء اللہ صاحب فن ہو، اے واہ میری جان!"

جن نئے ساتھیوں کو تایا کے اس تکیہ کلام کا علم نہ تھا تو وہ ہنس پڑے اور جب لیڈیز کے علم میں آیا کہ یہ تایا کا تکیہ کلام ہے اور اردو زبان میں رومانی اظہار کے بطور بھی بولا جاتا ہے تو وہ بہت محظوظ ہوئیں اور خاص طور پر مس میری جان ایسے عجیب قسم کے شکاری کے تکیہ کلام کی معنویت پر بڑی خوش ہوئیں۔ اور تایا سے بہت عقیدت اور انسیت کا اظہار کیا۔ بار بار بات کرکے تکیہ کلام اور اس کی معنویت کے مزے لئے اور یوں تو سبھی بے حد محظوظ ہوئے مگر لیڈیز کا ہنستے ہنستے برا حال ہوگیا۔

تایا کے فوٹو اور آٹوگراف لئے، گروپ میں تایا کو بیچوں بیچ میں غلیل بلند کئے بٹھایا اور ان کے شکار کئے ہوئے تیتروں کا ڈھیر سامنے لگا دیا۔ یوں تو تایا اس پارٹی میں اپنی وضع قطع اور پھر شکار کے نادر طریقہ کے سبب بھی ساتھیوں کے کھلونا سے بن گئے تھے، مگر خواتین بہت زیادہ محظوظ ہوئیں اور مس میری جان تو خوشی میں جھکی جھکی سی پڑتی تھیں اور اپنے نام اور تایا کے تکیہ کلام کی مناسبت بھرے محفوظ نعرۂ تحسین کی اتفاقیہ مناسبت پر جامے میں پھولی نہ سماتی تھیں۔ سب نے آٹوگراف لئے تایا بیچارے کو عمر میں اتنے دستخط کرنے کا موقع شاید اسی وقت ہوا تھا۔ مس میری جان نے صرف دستخطوں پر اکتفا نہ کیا اور اصرار کرکے تایا سے اپنی آٹوگراف بک پر لکھوایا:-

"اے واہ میری جان"

اور اس کے نیچے تایا نے خوب ہاتھ روک کر اپنے دستخط کئے:-

العبد

"تایا لفنگ خاں شکاری۔ ولد دادا اکمال خاں حولدار قوم روہیلہ پٹھان، بقلم خود"

اور تایا کبھی ڈینگ نہ مارتے تھے لیکن اس کے بعد کبھی کبھی فخریہ کہنے سنانے پڑنے لگے "اے واہ مری جان ملکہ وکٹوریہ تک پہونچ چکا ہے تایا لفنگ خاں کی غلیل کا شہرہ اے میری جان!"

(۲)

یوں تو تایا "فنا فی الشکار" قسم کے ہمہ وقت شکاری ہی شکاری تھے شکاری پہلے اور آدمی پیچھے، لیکن پرانے توہمات کے مطابق جمعرات کے روز شکار کھیلنے سے محترز رہتے تھے مگر اس مرتبہ تایا ہماری "بے پیری بے مریدی" قسم کی چکڑی میں پھنس گئے تھے، اور جمعرات کے دن کا پروگرام بن چکا تھا۔ اگرچہ تایا نے ہر چند ہم کو بھی روکا اور اپنی گلو خلاصی کرنی چاہی اور بہتیرا ڈرایا کہ جمعرات کو شکار جاؤ تو اجر "ان ہٹ" ہوئے نہیں بچتی ہے۔ پھر جمعرات کو ہزاروں بدروحیں اور بھوت پریت، چڑیل جانوروں کے روپ بھر لیتے ہیں لہٰذا ملتوی کر دیا جائے اور جب ہم نہ مانے تو اپنے استاد اور دادا اُستاد پر بیتی ہوئی کئی محیر العقول روائتیں سنائیں، مگر پھر چلنا ہی پڑا۔ آج کے شکار میں ہمیں ریل پر روہیلکھنڈ کی حدود سے باہر جہاں بلند شہر اور علی گڑھ کی سرحدیں بدایوں کی سرحد سے ملتی ہیں پہنچنا تھا۔ پچیس میل کے فاصلہ پر ایک جنگل کے اسٹیشن پر اترنا تھا جو بلند شہر کے ضلع میں واقع ہے۔

صبح کا وقت اور بہار کا موسم تھا، آسمان نیلا شفاف بے داغ تھا، دھوپ کی تمازت بہاریں ہوا کی خنکی اور نرم روی کے سبب دبی ہوئی تھی۔ ہر لہر کچھ اس قدر بعد جنگلی پھولوں کی ایک نئی خوشبو سے شامہ کو نوازتی چلتی تھی۔ گنگا کی نمناک سلونی وادی ننھے ننھے پھولوں سے اس حد تک پُر تھی کہ کہیں پر چپہ بھر زمین نظر نہ آتی تھی، جدھر نگاہ اُٹھتی ایک نئی رنگین مسکراہٹ سے آنکھیں دوچار ہوتی چلتیں، تیتر کے شکار کا پروگرام تھا اور یہ تیتر کی مستی کا زمانہ ہوتا ہے، جھاڑیوں، ٹیلوں، اور گھاس کے تختوں میں رومان لڑتے رہتے ہیں، سنہری تیتریاں صبح سے دوپہر تک اور سہ پہر سے شام تک اپنی سریلی آوازوں میں دعوتِ وصل دیتی ہیں اور مخمور تیتر پوٹے تان تان کر گردن اٹھا اٹھا کر صدائے لبیک دیتے ہیں، جگہ جگہ میدانوں میں کسی مابہ النزاع تیتری کے قبضہ کا فیصلہ ڈوول لڑ لڑ کرتے نظر آتے ہیں اور گنگا کی نمناکیوں اور بہار کی حرارتوں کا پیارا امتزاج تیتر تو تیتر تیتر کے شکاریوں میں بھی نشہ دستی سی دوڑا دیتا ہے اور چال میں مستی تھی، آنکھوں میں سرور تھا اور خون میں بھرپور روانی۔ — گنگا کے کنارے کنارے دھار کے ساتھ ساتھ جھاڑیوں اور گھاس کے نامحدود قطعہ میں ہماری مختصر پارٹی سرگرم کار تھی۔ کبھی ہم دھار کے خلاف چلنے لگتے۔ کبھی اسی رخ کو کسی وقت دریا ہمارے داہنے ہاتھ پر ہوتا اور کسی وقت بائیں پر اور کبھی پشت ہو جاتی۔ تیتروں کی مست آوازیں ماحول پر محیط تھیں۔ اور ان کے ساتھ رودِ گنگ کے بربط کا شیریں نغمہ، بہاریں ہوا کی جانفزا خنکی، جنگلی پھولوں کی روح پرور خوشبو ابھرتے سورج کی رومانٹک تابناکی حیات کو صبح صبح فردوسی زندگی سے آشنا کر رہی تھیں۔ ایک جانب کمر کمر بلند جھاؤ کی سدابہار جھاڑیوں اور مخملیں گھاس کا تاحدِ نظر فرش تھا، دوسری جانب گنگا کی شفاف آئینہ سی چھاتی تھرتھرا رہی تھی۔ بہار کے سورج کی کرنوں کے طفیل ہمالیہ کے نئے برف کی پگھلی ہوئی کوری چادر رواں دواں تھی، سلامت روی کی چال جس کی رفتار میں سرعت کے باوجود سکون تھا، اور آواز میں شیریں نغمہ، نہ ساون بھادوں والی دیوانگی بدمست تندی تھی اور نہ ماگھ پوس والی تلوار کی دھار کی طرح کاٹتی سی برودت۔ آئینہ تابناک اور مجلا تھا، ٹھنڈا، دیکھنے سے دیکھتے ہی میں دل کا داغ مٹانے والا جون کا توں برف ملا چلا آ رہا تھا، گھونٹ بھر پی لو تو رونگٹے رونگٹے میں سرور سما جائے۔ اور جس وقت ہم ریل سے اتر کر گنگا کنارے پہنچے تو نرمل صبح کے

شیتل پھاٹ پر صبح کی شفق نے بڑی دریا دلی کے ساتھ اپنا سیندور اور سونا بکھیرا تھا جس کے انعکاس سے صبح کے ہلکے ہلکے ذرات بھی طلائی کی شہابی بگولوں کی طرح دھار کے خلاف سمت چلتے نظر آ رہے تھے۔ نیچے سے اوپر تک گنگا کی لطیف فضا رنگین تابناکیوں سے متحرک تھی۔ دھار کی سطح پر جگہ جگہ بلوریں چلکیاں سی گھمر گھمر کر رہی تھیں۔ دھار سے اوپر سونے اور گلال کے بغارے سے لوٹ رہے تھے۔ بہار کی مخصوص سنسناہٹ اور خوشبو زمین سے لے کر آسمان تک رچی ہوئی تھی، اور مسلسل شور کے باوجود ماحول پر پیارا پیارا سکون سا طاری تھا، جیسے نیند میں آنکھیں بوجھل سی ہوئی جا رہی ہوں۔

ہم لوگ صبح چھ بجے سے قبل جنگل میں پہونچ گئے تھے۔ تیتر کے شکار کا خاص وقت، دوپہر تک مصروف رہے۔ شکار بہتیرا اٹھا، لیکن "بیٹ" کا انتظام نہ تھا۔ پارٹی اگرچہ مختصر تھی پھر بھی قاعدہ کے مطابق منسلک زنجیر جیسے انداز میں گھاس کے اندر نہ بڑھ سکے۔ غرض ٹیم والا نظم و نسق جو تیتر کے شکار میں ضروری ہوتا ہے قائم نہ رہ سکا، اور شکار خراب ہو گیا۔ کم ہاتھ آیا، جو مارا اس میں لطف بہت کم آیا۔

گنگا کنارے کے شکار میں ناشتہ مقدار میں زیادہ رکھنا پڑتا ہے اور جتنا رکھوا تنا سب کھانے کے بعد بھی پیٹ خالی رہتے ہیں۔ یوں بھی شکار کے ناشتے بھاری اور ثقیل طیار کئے جاتے ہیں، اور گنگا جل کے مشتہی اور ہاضم اثرات کے تحت گنگا کنارے کے شکار کا ناشتہ ثقیل ترین ہوتا ہے۔ ہم سب صبح سے دوپہر تک چلتے رہے، اپنے اپنے تھیلوں میں پڑے، کیلے، خستہ کچوریاں، اخروٹ کشمش اور گرم چنے ساتھ تھے، پاؤں بھی پیہم چلتے رہے، اور منہ تو مسلسل چلتا رہا۔ دو گھونٹ گنگا کا پانی پیٹ کے وزن کا ازالہ کرتا رہا اور دو جھونکے گنگا کی ہوا کے پاؤں کے بھاری پن دور کرتے رہے، کھاتے رہے، چلتے رہے، مارتے رہے اور دوپہر کو ریل کے پل کے نیچے سایہ میں ریت پر جمع ہو گئے۔ خوب ڈٹ کر کھانا کھایا۔ بار بار گنگا کی خاص بڑی دھار کا امرت جل پیا۔ ٹھنڈے ٹھنڈے ریت پر لوٹیں لگائیں، سنگھ بابو اور مسلم ذرا زیادہ گرمی مان گئے تھے۔ لہٰذا ہم خرما و ہم ثواب اور سنگھ بابو پاپ تو خیر کیا دُھلتے، شاید گرمی دھونے کو گنگا اشنان کرنے لگے۔ مسلم نے غوطہ لگانے میں تائید کی۔ اور دونوں بیچ دھار میں گھس کر خوب نہائے۔ گھنٹہ بھر بعد جب نہا کر نکلے تو بھوک تیز لگ گئی تھی ناشتہ وافر تھا۔ ان کی تحریک پر دوسری سروس ہونے لگی، اور سب بار بار گنگا جل پی چکے تھے، بھلا کب رہ جانے والے تھے اور جتنا ابھی دو گھنٹہ

بشیر کھایا تھا اس سے سوایا کھا کر پھر نرم نرم ٹھنڈے ٹھنڈے ریتے پر اینڈنے لگے۔ گنگا جل پیتے رہے، اور سہ پہر کے شکار کو جس وقت اٹھے تو ناشتہ کی اخیر قسط جھاڑ کر پیٹ میں ڈال لی۔ اور خوب مضبوط ہو کر مونچھوں کو تاؤ دئیے شکار میں مصروف ہو گئے۔

اور آج تو صبح ہی سے "آن بیٹ" تھی شکار شام کا بھی اچھا نہ رہا اگرچہ دوپہر میں باقاعدہ اسکیم بنا کر چلے تھے۔ ۵½ بجے شام کی ٹرین سے ہمیں پلٹنا تھا مگر اسٹیشن پہونچتے ہی ٹرین چھوٹ گئی اور ہم سوار نہ ہو سکے۔ میں نے کہا "اب رات والی گاڑی سے چلیں گے"۔

شکار کم اور خفت زیادہ ہوئی تھی۔ تایا کو غلیل بازی کے اچھے جوہر دکھانے کے موقع نہ ہوئے تھے۔ البتہ ہنٹیں اور "بیٹ" کرانے کی گھاتیں آج کے چکر میں اچھی طرح بھانپ لی تھیں۔ بھوک زور کی لگی ہوئی تھی اور یہ کچھ گنگا جل کے خواص کا اثر نہ تھا بلکہ پرانی بات ؟ شکار میں ناکامیابی کے بعد ٹھکانے پر پہنچو تو بھوک بڑی زور کی لگتی ہے اور خالی ہاتھ گھر پہنچ کر شکاری بھنگ پئے ہوئے نشہ باز کی طرح سیروں کھا جاتا ہے۔ جیسے کھسیا نپٹ میں کھانے سے چبا چبا کر انتقام لے رہا ہے۔ سب کی رائے ہوئی کہ آج کی شب اسٹیشن کی سرائے میں قیام کیا جائے اور کل صبح سے شام تک پھر پروگرام رہے۔

میں چونک سا پڑا "ایں اس اسٹیشن پر سرائے ہے ؟"

"اے واہ مری جان بڑی اچھی سرائے، شاہی زمانہ کی اے واہ میری جان، نہایت وسیع پرانی"۔

مگر یہاں سرائے کی شانِ نزول کیا ہے جنگل میں ؟"

اور سید نے کہا "قصبہ چپا دہی پرانی منڈی ہے جو یہاں سے بیس میل کچے راستہ پر واقع ہے اور یہاں ریل پر چڑھنے اترنے والے مسافر ٹھہرتے ہیں، مال لادنے والے ٹٹو خچر اور بیل گاڑیاں پڑاؤ کرتی ہیں، روزانہ شام کو سرائے بھر جاتی ہے، باہر اسٹیشن کے سہارے لگی دکانیں چمک اٹھتی ہیں، اور تمام دن دھول اڑتی ہے،" مگر یار ٹھہرو گے کیسے، بستر کہاں ہیں، اور کھانا؟ ـــــ بھئی ہماری رائے میں رات کی ٹرین سے چلے چلو اور صبح تین والی سے کل پھر آ دھمکو" میں نے کہا۔

اور تایا بول پڑے "اے واہ میری جان کیا کہنے، قربان جائیے آپ کی عقل پر یعنی بارہ بجے گھر پہنچو اور دو بجے پھر اسٹیشن کو چل دو۔ ساری رات ریل میں چڑھتے اترتے کاٹ دو، اے واہ میری جان"۔

"مگر تایا یہ تو بتاؤ کہ بستر کہاں ملیں گے اور کھانا کہاں ملے گا ؟"

"اے واہ میری جان، ابھی تو ماشاء اللہ نوجوان ہو، ہماری عمر میں پہنچو گے تو کیا بنے گا، سپاہی بچہ ہو کر ایسی باتیں کرتے ہو، شکار کھیلنے نکلے ہو کہ بستر اور کھانا توڑنے، اے واہ میری جان، مثل مشہور ہے اے واہ میری جان تن تکیہ من بسرام، چارپائیاں مل ہی جائیں گی، آج بستر نہ سہی اے واہ میری جان اور کھانا۔ یہ تیتر موجود ہی ہیں، سید اور استاد رضا خاں ذرا دیر میں قورمہ پکا لیں گے۔ اے واہ مری جان اور بس کل صبح دہ مار رہے گی کہ اللہ دے بندہ لے اے واہ مری جان۔ گھر والے سمجھ لیں گے کہ شکاری اور بھکاری کا کیا ٹھیک کہیں پڑ رہے ہوں گے۔ اے واہ مری جان"۔

اور ہم باتیں کرتے اسٹیشن کے ادھر جا پہونچے۔ سامنے سرائے کا بلند پھاٹک تھا جس کے ارد گرد چھپروں میں گڑ، چنے، نمک مرچ اور دودھ مٹھائی کی دکانیں تھیں۔ استاد رضا خاں نے عین پھاٹک کے بازو والی دکان سے ڈھائی پاؤ گھی اور مسالے وغیرہ خریدے، اندر پہنچے تو میں نے غور کیا کہ در حقیقت شاہی زمانہ ہی کی قدیم سرائے ہے، مگر عمارت میں کوئی حصہ پرانا باقی نہیں رہ گیا ہے، صرف پھاٹک اور جگہ جگہ چار دیواری کی ٹوٹی ہوئی چھوٹی قسم کی اینٹیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کبھی یہاں قدیم سرائے رہی ہوگی۔ اور اب تو چاروں رخ سے نیچی نیچی کچی کوٹھریوں کی قطاریں بنی ہوئی تھیں، انتہائی میلی غلیظ جن میں بارہ بجے دن کے بھی شام ہی رہتی ہوگی۔ اور چاروں کونوں پر چار گوشہ محل، اور درمیان میں لق و دق مربع صحن، جس میں اس وقت اودھم سا مچا ہوا تھا۔ بچے، بوڑھے، جوان، عورتیں، مرد، کتے، بلیاں، بکریاں، ٹٹو، خچر بیں سب گھال میل، جگہ جگہ کوڑے کے ڈھیر، اور دھوئیں کے انبار سے اور بیک وقت بھانت بھانت کی صدائیں، اور میں نے ذرا غائر نگاہ سے پرتا لا، جگہ جگہ بیلوں، ٹٹوؤں اور خچروں کے تھان تھے جن کے نیچے ہوا کے رخ پر لید اور پیشاب میں ڈوبی ہوئی گھاس کے الاؤ سلگ رہے تھے جن سے بدبودار گاڑھا گاڑھا دھواں اٹھ اٹھ کر جانوروں سے پسوؤں اور ڈانسوں کو بھگانے میں ڈی۔ ڈی۔ ٹی اور فلٹ کا کام انجام دے رہا تھا اور ہیرا دم سا گھونٹ رہا تھا، ایک گوشہ میں ایک بھڑبھونجا اپنا بھاڑ گرم کئے ہوئے تھا اور چیاں بھون بھون کر مسافروں کو دے رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد بھنے چنے اور جو کی سوندھی سوندھی خوشبو نے بھیگے لید اور پیشاب کے الاؤں سے سلگتے ہوئے دھوئیں کی بدبو کے ساتھ مل کر ایک عجیب مثبت منفی احساس سے شامہ کو آشنا کرتے تھے، صحن میں جس کو زیادہ صحیح لفظوں میں میدان یا

چوک کہا جائے جگہ جگہ نیم اور پیپل برگد کے دیو پیکر درخت ایستادہ تھے، جو بظاہر سرائے کی پہلی تعمیر سے بھی سو برس پرانے معلوم ہوتے تھے، جنکے تلے جہاں تہاں بنجاروں اور بیوپاریوں کی ٹولیاں حقوں کے دھوئیں اڑا رہی تھیں اور اپنی اپنی مخصوص زبان اور لہجے میں راس المال، اور سیاست مدن، اور تجارت و مالیات کے باریک نکات اور رازدنیا نہ چیخ چیخ کر حل کر رہی تھیں ہمیں دیکھ کر چند کھجوڑے کتے استقبال کو بڑھے مگر جس طرح سرائے کے شریف النفس کتے معمول کے مطابق اندر آنے والے ہر چوپڑ داکوتک کا دم ہلا کر استقبال کرتے ہیں اس طرح نہیں بلکہ ہماری نامانوس اور اجنبی وضع قطع دیکھ کر اپنی ہیئت کبھی جبلت کے مطابق ہم پر پہلی نظر میں بھونک پڑے، سرائے کی چند مالکاؤں نے کتوں کو ڈپٹا، اور پھر ہماری جانب کچھ مشتبہ نگاہوں سے دیکھنے لگیں مگر غالباً ہمارے ہاتھوں میں شکار لٹکا ہوا دیکھ کر سمجھ گئیں کہ نہ ٹلنے والے ملنگے ہیں اور نہ کتھیل والے برق انداز بلکہ امن پسند شہری جنگل کے شکاری ہیں۔

ہم ایک جانب کو ایک نیم کے درخت کے نیچے جا کر اس گول چبوترے پر بیٹھ گئے جو کھردرے نئے کو حلقہ کئے ہوئے زمین سے گز بھر اونچا بنایا گیا تھا۔ اور بیک وقت میلی کچیلی، کانی کھتری دس بارہ بھٹیاریوں کی دو تین پارٹیوں نے ہمیں گھیر لیا، اور ہر پارٹی اپنی کوٹھریوں اور باورچی خانہ کی دعوت دینے لگی جیسے ہوٹلوں کے ایجنٹ بڑے بڑے شہروں کے اسٹیشنوں پر کنویسنگ کرتے ہیں، ساتھ ہی ساتھ اپنی مخصوص جبلت کے مطابق ایک پارٹی دوسری پارٹی کی کوٹھریوں کے کھٹملوں، اور پسوؤں اور جوؤں کی "مقدار" پر روشنی ڈالنے لگی۔ اور سب ایک ساتھ بولتی رہیں اور ایک دوسری کو فصیح کوسنے اور بلیغ گالیاں دیتی گئیں۔ جب ذرا زبانیں تھمیں تو استاد رضا خاں بولے "ارے شیطان کی خالاؤ چپ رہو ہمیں کوٹھری نہیں چاہئیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہمیں چھ چارپائیاں چاہئیں اور بس جس کی حد میں اس وقت آکر بیٹھ گئے، اسی کے یہاں ٹھہرینگے اور اسی نیم تلے چارپائیاں پڑیں گی یہیں پر نہ اہ نخواہ حرام زادیوں نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ غدر مچا دیا ہے۔"

"اور کوٹھری نہیں میاں؟" اس بھٹیارن نے کہا جس کے حدود میں استاد نے ابھی قیام کرنا پسند فرمایا تھا۔

"نہیں، بس چھ چارپائیاں" استاد نے گردن جھنجھلا کر جھٹکتے ہوئے کہا:

اور میں نے کہا "اور ہاں بی بھٹیارن یہ دیکھ لینا کہ چارپائیاں ذرا صاف ہوں، کھٹمل نہ ہوں۔"

"اے ہے میاں نگوڑی کھٹیوں اور جوان مرے کھٹملوں کا تو ساتھ ہے ہاں ہماری کوٹھریوں میں البتہ کھٹمل تو کھٹمل دیوالوں پہ مکڑی چیونٹی بھی رینگتی نہ ملے گی، ابھی سنے نئے پنڈول سے پتی ہیں، اور ان خصم پٹیوں کی کوٹھریوں کی دیواروں میں تو کھٹملوں کے چھتے اور کھٹیوں میں جوؤں کی بھنڈیں ہیں۔"

"اچھا چل چل ظالمہ باتیں نہ بنا، کان چاٹ گئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لی یہاں کوٹھری نہیں چاہیئے، نہ ان حرام زادیوں کی اور نہ تیری، چارپائیاں لا خوب کسی ہوئی، ذرا لمبی والی" استاد رضا خاں نے شاید اپنے قد کی مناسبت سے کہا اور بھٹیارن ذرا درست ہو کر اپنائیت اور خلوص کے انداز میں بولی "اور ہاں میاں کھانا؟ کھانے کو کیا؟ چنے کی دال اور بڑیاں پکی ہیں، بڑی ہی، چٹ پٹی انٹینل ہیں، اور گجی کی روٹی ہے۔ ادھم ادھا کے گیہوں کی، کٹے جو کی گھاٹ والی۔"

سید بولے "نہیں بی بھٹیاری، کچھ نہیں، سالن ہم خود اپنا پکا لیں گے بس تم ذرا ایک قلعی دار دیگچی دے دینا مانجھ کے، ہمیں اور یہیں پر ایک اٹھاؤ چولہا جلا دینا۔ اور آٹا بھی ہم اپنا باہر دکان پر سے لادیں گے، روٹی ڈال دینا۔"

"اے ہے میاں میرے، بڑی چٹ پٹی دال بڑیاں ہیں، دو پیسہ پیالا، تر تراتی، اور میاں پیسے چپاتی، گرم گرم لوٹ دونگی، تم بھلا کہاں پاکھنڈ کرتے پھروگے نگوڑی ہنڈیا چولہے کا؟"

"اچھا چل چل جلدی چل زبان دراز ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ولاّلہ تمام خدائی کی" — استاد رضا خاں نے درشت لہجے میں کہا اور پھر مسالہ کی پوٹ بڑھا کر بولے "یہ مسالہ تو پیس لا ذرا" اور وہ مسالہ لے کر چلنے لگی تو بولے اری سنتی ہے، ہر چیز الگ الگ باریک پیس کر لے آ، ملا کے مت پیسنا سمجھی"۔ اور جب وہ مسالہ لے کر بڑھی تو بولے دیکھ بھٹیاریا ٹھیک لا نا ری پیس کر جو کہیں پھر سب وہیں رکھ آئے۔ اور دیگچی اور چولہا لیتی آنا" "اور ہاں تھوڑا ایندھن بھی۔ پیسے دے دینگے سمجھی نیک بخت"۔ سید نے لقمہ دیا۔

اور میں نے کہا "خیر وہ ہانڈی تو تینتر وں کے قورمہ کی ہو گئی اور روٹی اگر ان نیک بخت کے مطبخ کی پیسہ والی کھائی تو سمجھ لو کہ سب کو پیچش ہو جائے گی، گجی کی تو اپنی زبان سے تعریف کرتے ہوئے بتا رہی ہیں،

کھڑے ہو گئی ہوگی۔"

"نہیں جی ہم آٹا لے آئیں گے باہر دکان سے دیکھ کر پرانے گیہوں کا وہ پکا لائیگی"۔ سید نے کہا جو جلدی جلدی تیتروں کے پر نوچ کر صاف کر رہے تھے۔ اور سنگھ بابو نے کہا۔ "کیا ضرورت ہے باہر پھاٹک کے برابر ایک نان بائی کی دکان میں نان لگ رہے ہیں۔ خمیر والے، گرم گرم، چھ سات آ جائینگے سالن تیار ہو جائے بس۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے" سب نے کہا، اور اتنی دیر میں بھٹیارن کی لونڈیا چار پائیاں ڈال گئی اور دیگچی اور چولہا رکھ کر آگ جوڑ گئی۔ ہم سب چبوترے سے اتر کر چار پائیوں پر بیٹھ گئے۔ اور سید اور مسلم تیتر صاف کرتے رہے اور تایا بدستور چبوترے پر بیٹھے رہے، جب لونڈیا اخیر چارپائی ڈال کر چلنے لگی تو تایا نے اس سے کہا "اے واہ مری جان۔ ذرا حقّہ تو بھر لا۔ آگ دھر کر اے واہ مری جان۔" پندرہ سولہ سال کی قصباتی بھٹیارن لونڈیا۔ کالا کالا، مٹیالا مٹیالا دھبے دار کہیں کہیں کھترا چہرہ، کڑوے تیل میں ذرا کھری تلی ہوئی کچوری سے گال، خوب ابھری ہوئی پیشانی ننھی ننھی چمکدار آنکھیں، جیسے ریتہ میں کسی نے ٹھوک دیا ہے۔ پچکی ہوئی گول مٹول ناک اور موٹے ہونٹ جن میں باوجود مونہہ بند کر لینے کے بھی درمیان میں سوراخ رہ جاتا ہے کی چونچ کی طرح سخت اور چھوٹے بال، ذرا گداز جسم، گردن پشت، سینہ، پیٹ، رانیں اور کولہے بلکہ پنڈلیوں تک ہر جگہ جیسے ایک برابر موٹائی میں قدگم جیسے گیس کے سلنڈر پر میلا کپڑا لپیٹ دیا ہے، کثیف، ملگجا، دوپٹہ اور اسی نسل کا موٹا کرتا، پانوں میں چست آڑا پائجامہ جس میں پنڈلیوں پر خوب کے ڈورے پڑے ہوئے اور گھٹنے سے لے کر ایڑی تک پنڈلی کی ایک برابر موٹائی ظاہر کرتے ہوئے۔ ذرا دیر میں مونجھ کے بان کا بنا ہوا کھڑیا حقّہ بھر کر لے آئی، مگر نہ معلوم کیوں اپنا آپا ذرا سنبھالتی، اور سینہ اور سر کو دوپٹہ میں چھپاتی آئی اور نگاہیں بھی ذرا جھکی جھکی تھیں اور تایا حقّہ لے کر بولے "اے واہ مری جان جیتی رہو۔ ذرا وضو کو پانی تو لا دو، ہوں، آں اور یہ حقّہ اے واہ مری جان تازہ بھی کرتی لاتیں اے واہ مری جان، تو پھر کیسی بات رہتی۔"

اور کسی نے غور نہ کیا مگر میں نے اندازہ کیا کہ لونڈیا تایا کے تکیہ کلام پر دونوں مرتبہ کٹ گئی اور کنکھیوں سے دیکھتی جیسے کچھ بڑبڑاتی سی پانی کے مٹکوں پر پہنچکر ٹین کے لوٹے میں پانی بھرنے لگی۔ اتنے میں اس کی ماں مسالہ کے لئے پانی لینے باورچی خانہ سے نکلی تو اس کی جانب لوٹا بڑھا کر شاید یہ کہا کہ "تم پانی دے آؤ، بڈھا چھیڑ رہا ہے" اور بس بھٹیارن کے تیور بگڑ گئے ایک تو خیر کانی کچی سی تھی اور دوسری جو کنیڑی کنیڑی پون آنکھ باقی تھی خوب چمک کر ابھر گئی۔ سوکھا لکڑی ساقد پورا تن گیا۔ باچھوں پر دونوں جانب بہتی ہوئی پان کی پیک پونچھی، مونہہ کے اندر دبا ہوا تمام دن کے پان کا گلا بڑے زور سے چبایا اور میلا پھٹا دوپٹہ سنبھال کر اوڑھا، اور کڑوے کمان کے تیر کی طرح پانی کا لوٹا لے کر بڑھی، ادھر لونڈیا دو ایک اور بھٹیارنوں سے بات کرنے لگی، اور میری نگاہ اتنی چوکی ہوگی کہ سید نے دیگچی میں بگھار کر کے چھن سے گوشت بھوننے کے لئے ڈالا ہے۔ اور مسلم نے دو تین ہاتھ کفگیر کے بھوننے کے لئے چلائے ہیں۔ کہ ادھر سے وضو شروع کرتے ہوئے تایا کی آواز کان میں پڑی۔ "اے واہ مری جان ذرا کعبہ تو بتاؤ کدھر کو ہے تمہارے یہاں۔ اے واہ مری جان!"

اور جیسے یکدم باورچی خانہ سے لے کر تایا کے جا نماز تک سیکڑوں کتیاں یکدم بھونک پڑیں۔ اور ہماری لینڈ لیڈیاں اور ان کی تمام معزز معاصرین جو ابھی تک ذرا دیر پیشتر کمپیٹیشن کر رہی تھیں ایک آواز برس رہی تھیں۔ جان ہوئے گی تیری میا! جان ہوئے گی تیری بھینا! جان ہوئے گی تیری لونڈیا! جان ہوئے گی تیری جوروآ! جان ہوئے گی تیری دھریا مہوریا!"

اور میں نے جب نظر کی تو باورچی خانہ سے جا نماز تک بھٹیارنوں کی قطار ایک آواز چلا رہی ہے اور تایا غریب پر بلے بھاؤ پڑ رہی ہیں، ہم سب حیرت سے دیکھنے لگے کہ کیا ماجرا ہے۔ تایا وضو آدھا بھی نہ کر پائے تھے کہ بھونچال آ گیا۔ تمام سرائے میں بھاگڑ سی پڑ گئی، چاروں طرف سے سب جمع ہو گئے اور سرائے کے سب کتّے دوڑ کر بھونک پڑے، ہم سب متحیر اور تایا غریب ہتھیارے سے آدھا وضو کئے جا نماز پر بیٹھے کہ یہ شیطانی حرکت ہو گئی۔ بھٹیارے جو دور ایک گوشہ میں برگد کے پیڑ کے تلے بیٹھے ہوئے ارہر کی لکڑیوں کی ڈلیاں بن رہے تھے زیادہ متوجہ نہ ہوئے، کیونکہ سرائے کی بھٹیارنیں اور کتیاں دن رات ایک آواز بھونکتی ہی رہا کرتی تھیں، سمجھے کہ یا تو حسب معمول جیسا کہ شام کے وقت ہر مسافر کی آمد پر ہوا کرتا تھا کہ مالکاؤں کی مختلف پارٹیاں معاصرانہ چشمک اور "بزنس کمپیٹیشن" میں بات چیت کرتی ہی رہا کرتی ہیں، یا کسی مسافر سے کرایہ اور کھانے کے نرخ پر بات چیت طے ہوتی تھی، یا پھر مالکاؤں کے آپس کے راز و نیاز ہوا کرتے تھے یا دوسری مالکاؤں سے صحن کے حدود، پانی آگ اور کوڑے کے

ڈھیر وغیرہ کسی اہم مسئلہ پر ہر گھنٹہ دو گھنٹہ بعد تبادلہ خیال اور جد و جہد ہوتی ہی رہتی تھی۔ بھٹیاروں نے پہلے شور پر تو کام سے سر بھی اوپر نہ اٹھایا مگر جب اس قسم کی آوازیں کان میں پہنچیں کہ "اے ہے نگوڑے بڈھے تیرے زور کی، دن دہاڑے پکڑے لیتا تھا۔"

"واہ رے کرارے بڈھے تیری جھپٹ! بڑا لمبری ہے سالا!" کوئی مسافر بول پڑا اور بھٹیارنیں پھر ایک آواز چیخنا پڑیں، "ہے ہے نگوڑے، یہ داڑھی یہ کرتوت، ہٹا لچا، بدمعاش، جانی کار، خدائی خوار، گدھے سوار ——— مونڈی کاٹا، جوان مرا۔"

"دیکھ تو تیری پر پوتی نواسی برابر!!" اور یہ شتبہ آوازیں سن کر بھٹیارے کام چھوڑ چھوڑ کر اور بہنگے کے بانس سنبھال سنبھال کر دوڑ پڑے، اور اب بات بھٹیارنوں اور تایا کے درمیان سے نکل کر اور تایا کی مرحومہ والدہ، اور ہمشیرہ اور خیالی جُرو اور لونڈیا کی جان کے بجائے تایا کی جان پر آبنی اور بھٹیاروں کے پہنچتے ہی اک ذرا سکون ہوا اور صرف ایک منظم آواز بھٹیاریوں کے غول کی جانب سے ہی چڑ چڑاتی سنائی دیتی رہی تو تایا مصلے پر کھڑے بھٹیارنوں کی جانب ہاتھ اٹھا اٹھا کر کہتے سنائی دیتے: "اے واہ مری جان! کیوں اتنا بگڑتی ہے، ایسا میں نے کیا کہہ دیا ہے، اے واہ مری جان جو تم اتنا بگڑتی ہو۔" تو بھٹیارنیں پھر ایک آواز "جان" کے ساتھ تایا کی والدہ، ہمشیرہ، بیوی اور بیٹی کے ساتھ پیارے والے القاب لگا کر چیخ پڑیں۔ ایک نوجوان بھٹیارہ کو ذرا زیادہ تاؤ آگیا اور بانس تان کر تایا کی جانب بڑھا بڑبڑاتا ہوا: "آج تیری جان نکالوں گا!" اور یکدم سنگھ بابو ڈپٹ کر بندوق تانے درمیان میں آگئے: "بس کمین نمک حرام! سالے ابھی چت کر دوں گا!" اور ٹھاکر کی ڈانٹ ہی بھٹیارے کو بہت کافی تھی، پھر تنی ہوئی بندوق کے ساتھ، اور معاملے نازک مقام پر پہونچ جانے کے احساس سے ہم نے بھی اپنی اپنی بندوقیں اور تھیلے سنبھال لئے۔ سنگھ بابو کے شدید دم خم اور بندوق ہاتھ میں لئے ترچھے ترچھے انداز دیکھ کر خدائی فوجدار انہوائی بجز حیث قسم کے لاٹھی مختد ـــ تو تماشہ کے سین سے ہٹ گئے۔ زور دار نوجوان بھٹیارے بغلیں سی جھانکنے اور آنکھ پڑنے لگے اور ایک بڑھے بھٹیارے عاجزی کے ساتھ کھکھیائے دانت نکالے ایک قدم بڑھے اور جانمانہ پر آدبے دبنوں میں تر کھڑے تایا کی جانب اشارہ کرکے سنگھ بابو سے بولے: "اور کنور جی، آپ تو خفا ہو گئے۔ میاں کو دھوکا ہو گیا، آپ کے شہروں کی سرایوں میں بھٹیارنیں بیٹھ کرتی ہیں، اور یہ ہیں آپ کی دیہاتی بھٹیارنیں، بھلا یہ کیا جانیں، یہ بچاریں تو دن رات محنت کر کے کھاتی ہیں۔ اور ہیں، ہاں۔ آں۔ او۔ وہ، میاں شہر کے دھوکے میں رہے، وہ بات یہاں نہیں ہوتی۔"

اور پیشتر اس کے کہ سنگھ بابو کچھ جواب دیں، تایا پیشانی ٹھونک کر بول پڑے، "میرے اللہ! اے واہ مری جان! یعنی دھوکا ہم کو ہو گیا۔" اور پھر اپنے مخصوص انداز میں آستین چڑھے، ہاتھ لمبے کر کے بھٹیارنوں کے غول کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سلسلہ کلام جاری کیا: "اے واہ مری جان تم کو؟ ایں؟!"

اور پھر اسی تخاطب کو اپنی جانب سن کر بھٹیارنیں گلگیوں کی طرح یکدم چڑ چڑا پڑیں: "چل چل! چل ہٹ، دور ہو مردوے!، جان ہوئے گی تیری میا، بارہ تالی، جان ہوئے گی تیری جُرُوا، رنڈیا، جان ہوئے گی تیری بہنیا بیسوا، جان ہوئے گی تیری دھریا رنڈی۔"

اور بھٹیاروں میں پھر کھلبلی مچ گئی۔ اور کئی نوجوان، دل چلے لونڈے وفور غیرت سے اچھل کر جا پڑے، سنگھ بابو نے اپنی بندوق پھر سیف چڑھا کر ترچھی ترچھی تان لی، ہم سب نے اپنی اپنی بندوقیں مضبوط پکڑ لیں، جہاں دیدہ استاد رضا خاں نے معاملہ کی نزاکت پھر انتہائی پوائنٹ پر پہنچنے کا احساس کیا اور کہا "کیسا ..... غدر مچایا ہے! بہت ہوئی بس چلو، چلو! اور بی بھٹیارن تم ہیں تو معاف کرو اور بڑے میاں کی تو یہ عادت ہے، کوئی اور ذاوں، وہ بات نہیں جو تم سمجھیں۔"

اور ہم سب چل دیئے، تایا کو دس بھری ہوئی نالوں کے زیر سایہ ناک، کان سلامت لئے، سرائے سے باہر آگئے، تیتروں کی چھن چھن کرتی ہانڈی جس کی نوں چڑھی چڑھائی چھوڑ کر، اور بھانت بھانت کی آوازیں جہاں کی تہاں گونجتی چھوڑ کر "جو ڈھمیں سدی ہے جو ڈھمیں!"

"اور پھر ایسا نمازی!"

"بجے داڑھی بجے کرتوت!"

"برا بخت ہے گیا ہے یا برا بخت۔ دھنو کرتا جائے ہے اور لونڈیا کو پٹیاتا جائے ہے!"

"بڑا لمبری ہے سالا، بڈھا کھرانٹ!"

"سوا سو برس تو نکل گیا گدھے کی طرح!"

"حد ہے تیج پن کی، ماں بیٹی دونوں کو پٹاتا تھا، شیطان مصلے پہ بیٹھ کر دیکھو تو!"

(باقی صفحہ ۵۴ پر)

افسانہ

آدم، درخانئی

(رومانِ غم انجام)

رضا ہمدانی

سوات کی فراخ و جوان وادی، سرسبز و شاداب چراگاہیں، اور زرگسوں سے معمور کھیت، آدم خاں کے ملکوتی نغموں میں ڈوبے ہوئے کھوئے ہوئے کسی جنت گم گشتہ کے حصے معلوم ہوتے جب آدم خاں کی راگ بھری انگلیاں رباب کے تاروں سے مس ہوتیں تو ساکت و خاموش تاروں میں جیسے ہزاروں حوریں گانے لگتیں، سینکڑوں کوئلیں اور پپیہے، ہجر و فراق کی داستانیں سنا سنا کر گلستانوں میں آگ لگا دیتے جس سے سوات کی چراگاہیں افسردہ ہو جاتیں اور شاداب وادیوں کی جوانی جھلس کے رہ جاتی پنگھٹ پہ جاتی ہوئی الھڑ دوشیزائیں راستہ چلنا بھول جاتیں، ان کے قدم رک رک جاتے، اور اکثر کے سروں اور کولھوں پر رکھے ہوئے پانی کے گھڑے زمین پر گر کر ان کے ارمانوں کی طرح چور چور ہو جاتے۔ ان کی رگ رگ میں رومانی گیتوں کا الاپ گدگدی کرنے لگتا، ان کی امنگیں زخمی پنچھیوں کی طرح "رقصِ بسمل" میں مگن ہو جاتیں۔

آدم خاں کے رس بھرے نغموں کے ساتھ اس کی بھرپور جوانی اور صدف ایسی آنکھوں کی چمک دمک، کھلتا ہوا گندمی رنگ، کتابی چہرے کے دلکش نقوش اور شمشاد ایسے قد کی رعنائی کا شہرہ "بازدرۂ بالا" کی حدود سے نکل کر سارے سوات میں پھیل چکا تھا۔ سارا سوات اس گاؤں کی قسمت پر رشک کرنے لگا، لوگ کہتے:۔

حسن خاں ملک کتنا خوش نصیب ہے کہ اللہ نے اسے مال و دولت کے ساتھ ساتھ، آدم خاں ایسا بیٹا بھی عطا کیا ہے۔ قبیلے کی آنکھ کا تارا! آدم خاں۔ گاؤں کی ہر لڑکی کا محبوب۔ سینکڑوں کنواریوں کے دل اس کے رباب کے تاروں میں الجھے رہتے۔ لیکن آدم کو کسی سے بھی عشق نہ تھا۔ وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ اسے اگر عشق تھا تو اپنے رباب سے وہ رباب کے تاروں کے ساتھ باتیں کرتا، نئی نئی باتیں، انوکھے انوکھے راز و نیاز، اس کی انگلیاں ہر لحظہ تاروں کے ساتھ کھیلتی رہتیں، اس کی آواز ہر وقت کسی ابدی نغمے کے سراغ میں بھٹکتی رہتیں۔ وہ آنکھیں بند کئے ہر وقت نغمے کے پُر شور سمندر میں بہے چلا جاتا، اپنی منزل متعین کئے بغیر، کشتی، ساحل اور ناخدا سے بے نیاز، ایسی جل پری کی تلاش میں جو نغمے سے زیادہ دلکش اور زہرہ و مشتری سے زیادہ حسین و جمیل ہو۔ اس کے ذہن و تخیل پر ایک ایسی تصویر مرتسم ہو چکی تھی جسے وہ اپنے دل کی ملکہ بنانا چاہتا تھا۔ یہ راز اس کے دل کے حجلے میں پل رہا تھا، وہ اپنے دل کی بات کس سے کہتا؟ اسے کوئی راز دار نہیں ملتا تھا، وہ ہر لحظہ اس تخیلی پیکر کو نغموں کے خواب زاروں میں محوِ گلگشت دیکھتا، اسے خواب میں بھی اسی کا خیال آتا۔

ماں باپ، اپنے اکلوتے بیٹے کو دیکھ دیکھ کر جیتے۔ وہ اس کی شہرت اور تعریف سن کر اللہ کا شکر بجا لاتے، اب ان کے دل میں ایک آرزو تھی۔ آدم خاں کی شادی، لیکن آدم خاں کی شادی اس پیکرِ تخیل کے سوا کسی دوسرے کے ساتھ ناممکن تھی۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ ماں باپ کو سخت صدمہ ہوا، وہ آدم خاں کے انکار کے پس منظر سے بے خبر تھے، انہیں آدم کے خیالی عشق کی خبر نہ تھی، اور جب آدم کے دو راز دار دوستوں نے انہیں اس راز سے آگاہ کیا کہ وہ تو اپنے خوابوں کی ملکہ کے ساتھ ہی شادی کریگا تو انہوں نے اس کو بڑے تعجب سے سنا۔ وہ سمجھے شاید آدم کو رباب نوازی کے بے پناہ شوق نے پاگل بنا دیا ہے۔

ایک دن جب آدم خاں رباب کے ساتھ راز و نیاز میں مصروف تھا، کہ اس کے کانوں میں کچھ ایسی آوازیں پڑیں جیسے کسی نے رس گھول دیا ہو۔ جب وہ ہمہ تن متوجہ ہو گیا۔ پڑوس کے گاؤں "بازدرۂ پایاں" سے آئی ہوئی مہمان بڑھیا اپنے گاؤں کی ایک لڑکی

کا ذکر کر رہی تھی۔ وہ طاؤس خاں کی اکلوتی مہ جبین لڑکی "درخانئی" کے حسن و جمال کی تعریف میں محو تھی، آدم کو دیارِ محبوب سے آئی ہوئی ہستی سے ایک گونہ انس پیدا ہو گیا، اسے یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہ تمام باتیں اسی کی محبوبہ کی ہو سکتی ہیں۔ اور پھر آدم نے بڑھیا کے سامنے "درخانئی" کے خدوخال بیان کرنا شروع کئے۔ جب اس نے بائیں رخسار کے تل اور پیشانی کے دلکش نشان زخم کا پتہ دیا تو بڑھیا نے قسم کھا کر کہا: آدم بیٹا! تم نے درخانئی کو ضرور دیکھا ہے" لیکن آدم نے کہا: خالہ میرا خواب سچا ہے۔ میری محبت ازلی و ابدی ہے۔ میرا عشق پاکیزہ ہے۔"

بڑھیا نے آہ سرد کھینچ کر کہا: لیکن بیٹا! یہ سب کچھ بے سود ہے۔ درخانئی کی منگنی تو ایک خان پایاؤ کے ساتھ ہو چکی ہے۔ بڑھیا کے ان الفاظ نے آدم کی دنیا تہ و بالا کر دی، اس پر دیوانگی نے اپنا سایہ ڈال دیا، رباب کے ساتھ اس کا انس بڑھ گیا، اب تو اس نے رباب کے تاروں کو زبان دے دی تھی!

کہتے ہیں عشق کی آگ دونوں طرف سلگتی ہے، بڑھیا واپس اپنے گاؤں گئی تو اس نے درخانئی سے آدم خاں کے خوابوں اور اس کی بے پناہ محبت و شیفتگی کا ذکر کیا۔ اور اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب درخانئی نے بھی جواباً بڑھیا کے سامنے اپنے خواب بیان کئے، آدم خاں کی شکل و شبیہ بتائی۔ اور اس کے رباب کے آتش ریز نغموں کا ذکر کیا۔

درخانئی ہر رات خوابوں کی سرسبز و شاداب وادی میں آدم کو کسی ندی کے کنارے رباب بدست دیکھتی۔ اور جب رباب کے نغمات اپنے عروج پر ہوتے تو درخانئی کسی اپسرا کی طرح آسمانی ناچ ناچتی ہوئی رباب کے ملکوتی نغموں میں گھل جاتی، اور جب آدم خاں رباب کے تاروں سے مضراب الگ کر لیتا۔ تو درخانئی اس میٹھے اور بہشتی خواب سے ایک دم بیدار ہو جاتی اور پھر اس کے کانوں میں آدم کے ٹپوں کا الاپ اور نغمے پہروں گونجتے رہتے۔

جب آدم کو درخانئی کی محبت کا علم ہوا تو اس کے سمندِ شوق پر تازیانہ لگا۔ وہ وارفتگی کے عالم میں ہر لمحہ رباب بدست رہنے لگا۔ بڑھیا نے درخانئی کا پیغام محبت اور پھولوں کا تحفہ آدم خاں کو دیا، اور یہ خوشخبری بھی سنائی کہ وہ عنقریب ایک شادی کی تقریب پر یہاں آنے والی ہے۔

اور پھر شادی کی تقریب پر آدم نے اپنے فن نہیں بلکہ اپنے پرخلوص عشق، اپنے شوق و محبت اور سوز و گداز کا مظاہرہ کیا۔ ساری محفل پر جیسے کسی نے جادو کر دیا ہو۔ آدم و درخانئی کے خلوص و محبت کا جادو! —— اور جب درخانئی پر آدم کی نظر پڑی تو اس کے خواب و خیال کی شہزادی عالم ہوش و بیداری میں اور بھی نکھری ہوئی معلوم ہوئی۔ آدم کے جذبات شوق نے رباب کے تاروں میں جان ڈال دی —— اور اس نے محبوب کا گیت محبوب کے حضور بصد شوق و نیاز پیش کیا۔

درخانئی کو ایک نظر دیکھ لینے کے بعد آدم کی حالت روز بروز غیر ہوتی گئی، اب اس کا علاج درخانئی کے پاس ہی تھا۔ اس کے رازدار دوستوں میرو اور بالو سے اپنے دوست کی یہ حالت نہ دیکھی جا سکی۔ اور انہوں نے کسی نہ کسی طرح آدم کو دیارِ محبوب میں پہنچا دیا۔ پھر ایک رات۔ تاروں بھری رات میں۔ محبت کے یہ دو پیکر اکٹھے ہوئے، دونوں نے ایک دوسرے کا استقبال آنسوؤں کے موتیوں اور اشکوں کے ہاروں سے کیا، ٹھنڈی آہوں کے گیتوں سے ایک نے دوسرے کو خوش آمدید کہی اور ایک لمحے تک دونوں کی خاموشی نے ایک دوسرے کو خراج محبت پیش کیا جب آہوں کے بادل چھٹے، اشکوں کا مینہ تھما، تو عشق و محبت کے یہ دونوں افق مسکرائے:۔

میرے خوابوں کی شہزادی، تو آخر کب تک میرے خیالوں کی طرح آوارہ پھرتی رہیگی؟ اور نغموں کی طرح میرے رباب کے تاروں میں ڈھل جا! مضراب کی طرح میری انگلیوں کے پوروں میں پیوست ہو جا! اب جدائی برداشت نہیں ہو سکتی"

—— "میرے مغنی محبوب! میں تیرے نغموں کی دنیا میں کھو جانے کیلئے بیتاب ہوں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر مکمل نہیں، رباب اور نغمے کی طرح، مضراب اور تاروں کی طرح ——— اے میرے چاند! دنیا میرے لئے تاریک رات کی مانند ہے۔ میں چکور کی طرح تجھے ہر طرف تلاش کرتی رہتی ہوں لیکن ہر قدم پر دام بکھرے ہوئے ہیں۔"

—— "لیکن درخو پیاری! تیری منگنی؟ تیرا بیاہ؟ کیا مجھ سے میرا رباب چھین لیا جائے گا؟ میرا گلا گھونٹ کر میرے ٹپوں اور الاپوں کو موت کی نیند سلا دیا جائیگا؟ کیا میرے نغمے بے سوز کر دیئے جائیں گے؟ کیا میرا رباب کسی جلاد کے حوالے کر دیا جائے گا؟ کیا یہ سچ ہے درخانئی؟ پیاری درخو؟"

——— میرے مغنی محبوب! بے سُرے نغمے گانے بند کر دے، کیا تجھے اپنے رباب پر اعتماد نہیں رہا؟ رباب کے ساتھ ساتھ تمہارے پاس بندوق بھی تو ہے۔ جب مضراب سے کام نہ چل سکے تو اس کی

بڑ کا دلوں سے لیتے ہیں۔ یہی ایک یوسف زئی پٹھان کی جرأت و ہمت کا
قاضا ہے، ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے ہیں۔ مجھے تم سے کوئی
ہیں چھین سکتا۔ رباب ٹوٹ سکتا ہے لیکن اناڑی انگلیوں سے سر نہیں
یا جا سکتا۔"

ستاروں کی گردش نے ہوا کے جھونکے کی طرح تاروں بھری رات
ے رومان کو درہم برہم کر دیا! دو دلوں نے ابھی راز و نیاز ختم بھی نہ کئے
ھے کہ مرغ سحر نے اذان دی۔ درخانئ کے گھر کے صحن میں بندھی ہوئی
ھیڑوں نے ممیانا شروع کر دیا۔ اور یہ دونوں متوالے ایک دم جیسے
ہری نیند سے چونک اٹھے۔ درخانئ کے دل سے بھیڑوں کے لئے
د دعا نکلی:-

"اے میرے باپ کی بھیڑو! تمہارے گلے میں ناسور پڑ جائے تم نے
یرے محبوب کو مجھ سے جدا کر دیا!"

دونوں نے آپس میں انگوٹھیوں کا تبادلہ کیا اور چاند سورج کی طرح
یک دوسرے سے جدا ہو گئے!

اب تو یہ آگ دونوں طرف بھڑک اٹھی تھی، اس کے شعلے آسمان گیر
چکے تھے۔ درخانئ جیسے بیمار پڑ کر چارپائی پر پڑ گئی اس کا خیال تھا شاید
طرح شادی کی بلا ٹل جائے گی۔ لیکن بڑی بوڑھیوں کا خیال تھا کہ
ادی ہونے سے درخانئ صحت یاب ہو جائے گی۔ اس طرح جس تیر سے
س نے شکار کرنا چاہا تھا وہ اس کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ ڈھول
ر سرنا کی چیخم دھاڑ میں درخانئ کی ڈولی دوشیزگی کی لاش اور جوانی
ے ارمان جنازہ تھا، وہ پر کٹی کونج اور زخمی مرغابی کی طرح ڈولی میں پڑی
راہ رہی تھی۔

نئے قفس میں جا کر وہ سچ مچ بیمار پڑ گئی۔ اور نادان طبیبوں نے سمجھا
اسے تپ دق ہو گئی ہے۔ درخانئ خوب جانتی تھی کہ یہ روگ دوا دارو سے
ہیں ٹلے گا۔ وہ دل ہی دل میں طبیبوں کی عقل پر ہنستی اور کہتی:
ٹھیک ہی تو کہتے ہیں طبیب، تپ دق ہی تو ہے، لیکن عشق کی تپ دق
س کا علاج ان کے بس کی بات نہیں۔ اور جب علاج معالجے نے کوئی
ثر نہ کیا تو اسے میکے واپس بھیج دیا گیا۔

"درخانئ رقیب کے گھر جا چکی ہے۔" اس خبر نے آدم کے ہوش و حواس
و برہم کر کے دیوانگی کی آغوش میں دے دیا تھا۔ اس کا رباب چھین گیا تھا،
س کا مضراب چرا لیا گیا تھا، اس کی غیرت پر حملہ کر دیا گیا تھا۔ اس کے
جذبات کو بری طرح جھنجھوڑا گیا تھا۔

"درخانئ سخت بیمار ہو کر میکے واپس آ گئی ہے۔ وہ چند گھڑیوں کی مہمان ہے!" اس دوسری خبر نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ آدم خاں کا بدنصیب باپ بیٹے کی حالتِ زار پر رات دن کڑھتا۔ آخر اس نے اپنے ایک قریبی دوست میر مائی کے ساتھ مشورہ کیا اور طے پایا کہ درخانئ کو زبردستی حاصل کیا جائے۔ میر مائی اور حسن خاں نے ایک مسلح جمعیت کے ساتھ طاؤس خاں کے مکان پر حملہ کر دیا۔ بڑے کشت و خون کے ساتھ تدبیر کارگر ہوئی۔ اور آدم کو گوہر مراد ہاتھ آ گیا لیکن تقدیر کھڑی مسکرا رہی تھی، اسے کچھ اور ہی منظور تھا، وہ نہیں چاہتی تھی کہ دو دل مل بیٹھیں۔

جب طاؤس اور پایاؤ نے دیکھا کہ جنگ و جدل کے ساتھ درخانئ واپس نہیں مل سکتی، تو انہوں نے مال و زر کا جال پھیلانا شروع کر دیا اور میر مائی باوجود امیر و زردار ہونے کے مایا کے جال میں پھنس گیا۔ اس نے سال ہا سال کی دوستی کو دولت پر قربان کر دیا، اس نے گویا آدم خاں کو اپنے ہاتھ سے ذبح کر ڈالا اور اس طرح درخانئ پھر واپس اسی رنگین قفس میں قید ہو گئی، اس کی بیماری بڑھ گئی، وہ ہر لمحہ آنسوؤں کے شیش محل بناتی جو دوسرے لمحے چکنا چور ہو جاتے۔ لیکن ان کے ٹوٹنے کی آواز کوئی بھی نہ سنتا!

آدم خاں کا رباب گم گشتہ ملنے کے بعد پھر کھو گیا، اور اب اس کی تلاش بے سود تھی۔ اگر وہ دوبارہ مل بھی جاتا تو محبت کی کوئل کو ذبح کرنے کے بعد اس سے گیت سننے کی کوشش اور افسردہ راکھ سے شعلۂ جوالہ کی تلاش کے مترادف تھا لیکن آدم خاں کے ساتھی میرو اور بالو نے رباب گم گشتہ کو پھر تلاش کرنے کی ٹھانی، انہیں آدم کی زندگی بڑی عزیز تھی، انہیں اعتماد تھا کہ درخانئ، آدم کے آغوش میں ضرور آ جائیگی۔ اور اس طرح آدم کا ساکت و خاموش رباب ایک بار پھر سوات کے کہستانوں کو ملکوتی داستانیں سنائے گا، شاداب چراگاہوں میں پھر سے سحر نغمہ راج کرے گا، ندیوں کی گنگناتی ہوئی روانی تھم جائے گی۔ اور ترنم ریز چکورا اور دراج رباب کے تاروں کے دام میں اسیر ہو جائیں گے۔

دوسرے دن، میرو، بالو اور آدم خاں ملنگوں کا روپ دھار کر دیار محبوب میں جا پہنچے۔ گاؤں کے باہر شہید کے مزار پر سارے دھونی مار کر بیٹھ گئے۔ آن کی آن میں نئے درویشوں کی خبر جنگل کی آگ بن کر سارے

گاؤں میں پھیل گئی۔ مزار پر ایک میلہ سا لگ گیا۔ بیسیوں نامراد اور حاجتمندوں نے درویشوں سے دعائیں کرائیں، تعویذ گنڈے لئے اور نامرادِ محبت آدم خاں نے سب کے لئے دعائیں کیں، ہر ایک کی ڈھارس بندھائی لیکن اس کے اپنے آنسوؤں کے تار کوئی روکنے والا نہ تھا! اس کی ڈھارس بندھانے والا کوئی نہ تھا! اسے کسی نے ایسا عمل نہ بتایا جس سے اس کی محبت کا خاموش رباب چھک اٹھتا، لیکن اس کی رازدار بڑھیا نے اسے تسلی دی: آدم خاں! پختون ہو، جوان ہو، ہمت سے کام لو، درخانئی تمہاری ہی ہے، وہ ضرور تمہیں ملے گی!"

درویشوں اور ملنگوں کی آمد اور کرامات کا شہرہ طاؤس خاں تک بھی پہنچا۔ بڑھیا نے طاؤس خاں سے کہا: "خان! خدا اور اس کے درویشوں کے پاس بہت کچھ ہے۔ کہتے ہیں یہ درویش بڑے پہنچے ہوئے ہیں! شاید ان کی دعا سے ہماری پھولوں کی ڈالی جیسی بچی پر اللہ رحم کرے وہ تو مردوں کو زندہ کر دیتا ہے!"

جب طاؤس خاں راضی ہو گیا تو بڑھیا نے درخانئی کو خوشخبری سنائی: "بیٹیا! تمہارے آدم کا گلاب کا پھول ابھی تمہارے ہاتھ آنا چاہتا ہے۔ اسے ہوشیاری سے اپنے بالوں میں سنوار لینا۔ بڑے زور کی آندھی چل رہی ہے۔ اگر یہ پھول گر گیا، تو آئندہ کبھی اس کی ایک پتی بھی نہ پا سکو گی!"

دھڑکتے ہوئے دل اور لرزتے ہوئے قدموں کے ساتھ آدم خاں ہزاروں عقیدتیں لئے۔ در محبوب کی طرف روانہ ہو گیا، اس وقت اس کا انگ انگ نغموں بھرا رباب بنا محبت کے گیت الاپ رہا تھا، وہ سبزے کو روندتا، پھولوں کو مسلتا، جھومتا جھامتا، منزلِ شوق طے کر کے درخانئی کے سامنے جا پہنچا!

درخانئی، نرگستانِ سوات کی نرگسِ بیمار، پژمردہ کلی، کملایا ہوا پھول، خزاں گزیدہ پتی، مرجھائی ہوئی ڈال، بستر پہ پڑی تھی! جب دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو انہوں نے ایک دوسرے کو آنسوؤں کے ہیروں کا ہدیہ پیش کیا، محبت کے چمکتے ہوئے ہیرے، پیار کے آبگینے اور ان آنسوؤں نے خموشی میں ایک دوسرے کو ہزاروں داستانیں سنا ڈالیں! درخانئی کی پھول ایسی جوانی آدم خاں کی روح میں کانٹا بن کر پیوست ہو گئی، اس کے دل میں ایک تیر لگا۔ معاً اس کا ہاتھ سینے کی طرف بڑھا اور اس نے اپنے دل کو تھام لیا۔ اس کی زبان نے اس کے دل کا ساتھ دیا، اور ایک دلدوز چیخ کے ساتھ وہ بے ہوش ہو گیا۔ طاؤس خاں کی دوررس نگاہیں معاملے کی تہ تک پہنچ گئیں، پہلے تو اس نے چاہا کہ تلوار کے ایک ہی وار میں آدم خاں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے لیکن بڑھیا نے ایسا کرنے سے روک دیا۔ اور کہا: "دانشمندی کا تقاضا ہے کہ اس بات کو اسی جگہ دبا دیا جائے! اور ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے!"

آدم خاں کے حواس بجا ہوئے تو وہ ایک تاریک کوٹھڑی میں پڑا تھا، طاؤس خاں شمشیر برہنہ ہاتھ میں لئے گرج رہا تھا: "لڑکے! اسی وقت میرے گاؤں سے نکل جا!" آدم خاں کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے جنت سے نکل جانے کا حکم دیدیا ہو، ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا سے پیاسا لوٹ جانے پہ مجبور کیا ہو، بھرے گلزار سے اس نے اپنی پگڑی پر سجانے کے لئے ایک پھول توڑنا چاہا ہو لیکن اس کے ہاتھ توڑ دئے گئے! اور وہ اپنے گاؤں واپس آ گیا، بلکہ وہاں لایا گیا۔ آدم خاں نہیں بلکہ اس کا قالب بے جان! اس کی روح دیارِ محبوب میں نغمے کی طرح آوارہ پھرتی رہ گئی، اور جسم بے نغمہ رباب کی مانند حسن خاں کے گھر۔

اب اسے دنیا کی ہر چیز سے نفرت ہو چکی تھی، خوبصورت دنیا کی ہر رعنائی و زیبائی سے۔ حتیٰ کہ اپنے رباب سے بھی، اس کے نغموں سے بھی! اور جب ایک دن اچانک اس کی نظر رباب پہ پڑی تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا، وہ اسے اپنا ترکِ دشمن سمجھنے لگا۔ اور فرطِ غیظ سے کلہاڑی کے ساتھ رباب کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

آدم کی حالت روز بروز غیر ہوتی گئی۔ ماں باپ کی محبت نے یہ دکھ برداشت نہ کیا، لاکھ تدبیریں کیں، علاج معالجہ کرایا، گنڈے تعویذ سے کام لیا، لیکن آدم خاں کا مرض بیکراں ہوتا گیا۔ جب حسن خاں کو یقین ہو گیا کہ اس کا اکلوتا بیٹا، اس کا حقیقی وارث اور اس کے قبیلے کا نگہبان ہاتھ سے جا رہا ہے تو وہ بہت مضطرب ہوا، اور یہ طے پایا کہ کسی نہ کسی طرح آدم خاں کو گاؤں کی حسین ترین لڑکی گلناز دکھائی جائے۔ ممکن ہے سوکھی ندی میں پانی آ جائے، آدم کے عشق کا بھڑکتا ہوا الاؤ ٹھنڈا پڑ جائے اور وہ درخانئی کو بھول جائے!

پنگھٹ کے رومانی ماحول میں نقرئی قہقہوں کے سنگیت کا

سرحد کا خٹک ناچ

عکس : انوارالحق

ہجوم تھا، چوڑیوں کے مدھر نغمات میں کائنات ٹھہری ہوئی معلوم ہوتی تھی، سرخ و سفید باہوں کی کہکشائیں، مست، الھڑ لڑکیوں کا جھرمٹ اور اسمیں گلناز کا مرمریں پیکر۔ جیسے نرگستان سوات کی شہزادی گھڑی دو گھڑی کے لئے نرگس کے شبستاں سے باہر ٹہلنے آگئی ہو، لانبی لانبی، پتلی پتلی گندھی ہوئی سیاہ بالوں کی مینڈیاں، دھڑکتے ہوئے دل کی طرح لرزتا ہوا سونے کا پیزوان، دلکش اور زلف پر سجے ہوئے خود رو پھول، جس نے دیکھا مبہوت ہوگیا! لیکن آدم خاں کو گلناز کے جلال حسن نے بالکل متاثر نہ کیا۔ اس کا معیار حسن و محبت بہت اونچا تھا۔ فرشتوں کے تقدس اور حوروں کی صباحت سے بھی اونچا!

گلناز کے خدوخال اس کے جسم کے خطوط کی شوخ صحرا میں اس کے تیکھے نقوش کی ایمان ربائی کوئی چیز بھی آدم کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکی اس نے جیسے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ اس کی محویت، خاموشی اور خود فراموشی کی دنیا میں کوئی انقلاب نہ آیا۔ نرگس کی ہر آنکھ میں اسے درخانئی ہی کی تصویر نظر آئی، لالۂ صحرائی کے احمریں پیالے میں درخو کھڑی اسے بلا رہی تھی، وہ ہر بار اس تخیلی پیکر کی طرف لپکتا اور وہ ہاتھ پھیلا کر رہ جاتا درخانئی فضا میں تحلیل ہو جاتی اور آدم کے سینے پر داغ چھوڑ جاتی۔ اور فضا کا ہر ذرہ نرگس کی آنکھ سے آدم کی دیوانگی کا تماشا کرتا۔

ہجر و فراق کے طویل لمحے طویل تر ہوتے گئے، آدم خان کی دیوانگی کا رنگ پختہ تر ہوتا گیا۔ آخر ایک دن بازدرہ میں اس خبر نے کہرام مچا دیا کہ "آدم خان مرگیا"!

کسی نے کہا "ہمارا مغنی مرگیا"۔ کسی نے "عاشق صادق مرگیا" اور کسی نے "شہزادی درخانئی کا رباب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا! اب کون نغمے سنائے گا؟"

بازدرہ میں نغمے مرگئے، اور بین زندہ ہوگئے! درخانئی رنگین پایوں والے پلنگ پر دراز، روئیں روئیں میں آدم خاں کو بسائے ہر لحظہ اسی کے خواب دیکھتی رہتی، بڑھیا اس کے سرہانے بیٹھی رہتی، اپنے باپ طاؤس خاں کی بھری بستی میں یہی ایک اس کی ہمدرد اور اس کے دکھ درد کو جاننے والی تھی، لیکن غریب بڑھیا کی کوئی سننے والا نہیں تھا، اس کے کہنے پر کوئی کان ہی نہ دھرتا تھا۔ درخانئی کے لئے تو اس کی ماں کی ممتا بھی مرچکی تھی۔ اس کے سینے میں دل کی جگہ پتھر کا ٹکڑا تھا۔ ماں کی ممتا پر باپ کے شملے کی غیرت اور قبیلے کی روایتی عزت غالب آچکی تھی، اب درخانئی کا آخری سہارا اس کے خواب ہی تھے! اس نے خواب میں دیکھا:-

ایک بے حد خوبصورت باغ ہے جہاں وہ سہیلیوں کے ساتھ سیر کر رہی ہے۔ یکایک باغ کے ایک گوشے سے رباب کے نغمے ابھرنے لگے، جب درخو نے اس طرف رخ کیا تو سرو و شمشاد کے ہجوم میں ایک بڑے تالاب کے بیچ، چاندی کی کشتی میں آدم خاں بیٹھا رباب پر درخو کے گیت گاتا دکھائی دیا، اس نے درخو کو دیکھ کر اپنی آغوش وا کردی اور درخانئی جل پری کی طرح پانی کی لہروں پر چلتی ہوئی آدم کے آغوش میں کھوگئی۔ آدم نے کہا "بس درخو، اب میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا، ہم اسی کشتی میں رہیں گے، یہیں اپنے لئے نیا گاؤں بسائیں گے" اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے تالاب ایک سمندر میں تبدیل ہوگیا، ایک خوفناک طوفان آیا، اور کشتی الٹنے لگی۔ درخانئی نے ایک چیخ ماری اور جب اس کی آنکھ کھلی، تو اپنے سرہانے بڑھیا کو پایا جو اسے تسلی دے رہی تھی۔ وہ بڑھیا سے لپٹ کر رونے لگی "میرا آدم کہاں ہے خالہ؟ اس کی کشتی ڈوبی تو نہیں؟"

بڑھیا نے کہا "درخانئی بیٹا! آدم خان، تمہارے ماں اور باپ کی ضد پر قربان ہوگیا! وہ اس دنیا سے چلا گیا! آدم نے تیرے فراق میں تڑپ تڑپ کر جان دیدی۔ درخو بیٹی!" اور جیسے درخانئی کا کسی نے گلا گھونٹ دیا، اس کے منہ سے صرف "آدم خان" نکلا۔ اس نے اپنا سر تکیے میں چھپا لیا! ایک طویل لمحے تک جب اس نے سر نہ اٹھایا۔ تو بڑھیا کو فکر لاحق ہوئی۔ جب اس نے اسے جھنجھوڑا تو وہ آدم خاں کے پاس جاچکی تھی!!

کہتے ہیں جب درخانئی کو قبر میں اتارا گیا تو تھوڑی دیر بعد یوں محسوس ہوا گویا قبر میں دو لاشیں جمع ہوگئی ہیں! جب دوسری لاش کے منہ سے کفن ہٹایا گیا تو وہ آدم خان کی لاش تھی!!

آدم خان اور درخانئی کا مزار آج بھی مرجع عوام ہے۔ آدم کے مزار کے درخت کی لکڑی کا مضراب نغمہ و موسیقی کے ہر شائق کی انگلیوں میں جادو بھر دیتا ہے۔ عشق و نغمہ کے ان شہیدوں کی یہ کرامت ہے!

استقلال نمبر — ماہِ نو — اگست ۱۹۵۵ء

پاکستان کا قیام ایک تاریخی واقعہ ہے اسی طرح اس کے آٹھویں جشنِ استقلال پر یہ شمارۂ خاص

ادب، فن اور ثقافت کے مایۂ ناز شاہکار پیش کرنے میں

ایک تاریخی حیثیت کا مالک ہوگا

پاک و ہند کے مقبول اہلِ قلم کے تصورات و افکار کا یہ مجموعہ متعدد صوری و معنوی خوبیوں کا حامل ہوگا اور امید ہے کہ اس سال کی بہترین ادبی پیشکش تسلیم کیا جائے گا

ہمارے چند متوقع لکھنے والے

ڈاکٹر مولوی عبدالحق	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	انتظار حسین	شوکت صدیقی	روش صدیقی	تابش دہلوی
ڈاکٹر سید عبداللہ	الطاف گوہر	شفیق الرحمٰن	اشرف صبوحی	سید عبدالحمید عدم	صفیہ شمیم
محمد حسن عسکری	ضمیر جعفری	ابن سعید		ابن انشا	زہرہ نگاہ
ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری		ابوالفضل صدیقی	جگر مرادآبادی	قیوم نظر	احمد فراز
سید ہاشمی فریدآبادی	غلام عباس	اشفاق احمد	ابوالاثر حفیظ	ناصر کاظمی	حامد حسن قادری
عبدالرحمٰن چغتائی	حجاب امتیاز علی	آغا بابر	فراق گورکھپوری	شیر افضل جعفری	شان الحق حقی
سید وقار عظیم	شکیلہ اختر	ابوسعید قریشی	حفیظ ہوشیارپوری	ضمیر اظہر	جلیل قدوائی
ڈاکٹر عبادت بریلوی	قدرت اللہ شہاب	یزدانی ملک	احسان دانش	سراج الدین ظفر	قتیل شفائی

ضخامت: عام اشاعتوں سے دوگنی

سرورق: نیا دیدہ زیب سرورق

رنگین تصاویر: ملک کے نامور مصوروں کے متعدد شاہکار

سادہ تصاویر: جدید حالات اور تاریخی و تہذیبی ورثہ کی آئینہ دار

مستقل خریداروں کو یہ سالنامہ بلاقیمت پیش کیا جائے گا۔ عام قیمت ۱؍ فی کاپی (پاکستان میں) ۱۲؍ (ہندوستان میں)

ایجنٹ حضرات:۔ خاص نمبر کی مطلوبہ تعداد سے فوراً مطلع فرمائیں۔

ادارۂ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس ۱۸۳ ۔ کراچی

افسانہ

گوہرِ مراد

انور عنایت اللہ

"مجھے سخت افسوس ہے مودی" نجمہ نے جواب دیا اور کھٹ سے تیسری مرتبہ ریسیور رکھ دیا اور میں نے جھنجھلا کر ریسیور کو گھورا مجھے سخت کوفت ہو رہی تھی۔ صبح سے میں تین دوانیاں محکمۂ ڈاک اور تار کی نذر کر چکا تھا اور بات اب تک کچھ نہیں بنی تھی۔ بادلِ ناخواستہ چوتھی چمکتی ہوئی دوانی نکالی حسرت بھری نظروں سے اس کا جائزہ لیا اور ایک بار پھر نجمہ کا نمبر ملایا۔

"ہیلو ـــــ آ!! دوسری طرف سے نجمہ کی آواز آئی۔

"خدا کے لئے سنو نجمہ ـــــ میں نے پکچر کے ٹکٹ خرید لئے ہیں۔ بہترین پکچر ـــــ !!"

ابھی میں یہی کہنے پایا تھا کہ وہ جلدی سے بولی،

"مجھے پتہ ہے پکچر بہترین ہے اور بہترین سینما ہال میں چل رہی ہے۔ لیکن میں نے کہہ دیا نا مودی، میں آج کی شام مصروف ہوں"۔

"مجھے پتہ ہے تمہاری مصروفیتیں کیا ہوں گی ـــــ ریڈیو سے فرمائش سننی ہوگی"۔

"جی نہیں"۔

"سر دھونا ہوگا؟"

"جی نہیں"۔

"تو پھر کسی نئی سہیلی کی دعوت ہوگی"۔

"نہیں ـــــ نہیں ـــــ نہیں"۔

"تو کسی کے ساتھ کہیں جانا ہوگا"۔

"ہاں ـــــ ہاں ـــــ ہاں"۔

"یہ ابھی تم نے زیرِ لب کس کا نام لیا تھا؟ ـــــ اسلم کا؟" میں نے چالاکی سے حقیقت جاننے کی کوشش کی۔

"جی نہیں۔ میں نے کسی کا نام نہیں لیا تھا لیکن اگر آپ جاننا چاہتے ہیں تو سن لیجئے۔ میں بدر کے ساتھ پکچر جا رہی ہوں ـــــ خدا حافظ"۔

چوتھی مرتبہ کھٹ سے ٹیلیفون کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ مجھے اپنی قوتِ سماعت پر یقین نہیں آیا اور میں نے غور سے ریسیور کا جائزہ لیا۔ مجھے آج معلوم ہوا تھا کہ کوئی معقول لڑکی بدر بڈلی کے ساتھ پکچر بھی دیکھ سکتی ہے۔

شام تو کافی ہاؤس میں گذر گئی۔ دوسرے دن موسم بے حد خوشگوار تھا۔ سوچا آج گاندھی گارڈن کی سیر کی جائے۔ میں نے ایک بار پھر ڈاکخانہ کا رخ کیا۔ جیب سے دوانی نکالی اور اب کے رضیہ کو فون کیا۔ ـــــ رضیہ آج موسم بے حد خوشگوار ہے۔ سنا ہے گاندھی گارڈن میں افریقہ سے بہت سارے غیر معمولی بندر آئے ہیں ـــــ چلو آج دوپہر وہیں گذاریں"۔

"معاف کرنا مودی۔ آج میں مصروف ہوں ـــــ پھر کسی اتوار کو سہی۔ آج میں ہاکس بے جا رہی ہوں"۔ جواب ملا۔

"ہاکس بے جا رہی ہو؟ ـــــ زماں نے مجھے نہیں بتلایا؟"

"ہم زماں کے ساتھ نہیں جا رہے ہیں ـــــ در اصل آج بدر صاحب نے ہم سب کو مدعو کیا ہے"۔

رضیہ نے جواب دیا اور میں نے بے اختیار سر تھام لیا۔

"یعنی کہ بڈلی نے تمہیں مدعو کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں ـــــ آپ کو کچھ اعتراض ہے؟" اس نے جل کر پوچھا۔

"جی نہیں ـــــ بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ شوق سے جاؤ۔ خدا حافظ"۔

اب کے میں نے جل کر ریسیور رکھ دیا اور چند لمحے سوچتا رہا: الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ آخر نکایک بدر بڈلی میں ایسے کون سے سرخاب کے پر لگ گئے کہ شہر کی ساری معقول لڑکیاں، اس کی دیوانی ہو رہی ہیں؟ سارا دن میں نے گاندھی گارڈن میں گذار دیا۔ شام کو گھر واپس آ رہا

ہتھ کہ وکٹوریا روڈ پر رضیہ کی نئی کار زمین سے گذر گئی۔ گاڑی رضیہ چلا رہی تھی اور اس سے قریب یتیم صورت بنائے منڈلی بیٹھا تھا!!۔

میں نے ایک بجلی کے کھمبے کا سہارا لے کر غور کیا ــــ قوت سماعت کے ساتھ ساتھ کہیں میری بینائی بھی میرا ساتھ تو نہیں چھوڑ رہی ہے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ یکایک منڈلی کی اس حد تک مقبولیت کا راز میری سمجھ سے باہر تھا۔ دوستوں کے حلقے میں وہ احمق مشہور تھا اور اکثر لوگوں کا خیال تھا اس کی اوپر کی منزل "شئے لطیف" سے خالی تھی۔ حالات اب خطرناک حد تک نازک ہوگئے تھے۔ پانی بڑی تیزی سے سر سے گزر رہا تھا۔

میں نے فوراً چند دوائیاں اور خرچ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ سب سے پہلے میں نے زماں کو ٹیلیفون کیا۔

"بھیا۔ آج رات کو سات بجے میرے یہاں گول میز کانفرنس ہے جس میں ایک اہم مسئلہ پر ــــ !!"

"بھئی معاف کرنا۔ آج میں بے حد مصروف ہوں!" اس نے جلدی سے جواب دیا "آج رات میں نے منڈلی کو کھانے پر بلایا ہے"

"کیا کہا؟ منڈلی کو بلایا ہے؟ یعنی کہ ہمارے منڈلی کو؟" میں بے اختیار چیخ پڑا۔

"بھئی۔ چیخ کیوں رہے ہو؟ کہہ تو دیا نا۔ بدر آرہا ہے۔ کانفرنس کسی اور دن رکھو ــــ خدا حافظ"

سلسلہ منقطع ہوگیا اور میں نے دیکھا پوسٹ ماسٹر صاحب کے علاوہ، دو ڈاکیے، تین خواتین، کئی عدد بچے اور ایک چھوٹا سا کتا مجھے گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ میں نے سٹ پٹا کر جلدی سے ریسیور رکھ دیا اور اگلے ڈاکخانے کا رخ کیا۔

اب کی میں نے اسلم کا نمبر ملایا۔

"ــــ آج رات کو؟ نہیں بھیا۔ معاف کرنا۔ کل یا پرسوں ہوسکتا ہے۔ لیکن آج نہیں۔ آج تو چاندنی رات میں کلفٹن کا پروگرام ہے ــــ کوئی دس بجے منڈلی آرہا ہے!!"

یا میرے اللہ ــــ پھر منڈلی؟ میں نے جھنجھلا کر ریسیور رکھ دیا اور منڈلی کو ایک موٹی سی گالی دیتا ہوا گھر لوٹ آیا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ یا تو میں پاگل ہوگیا ہوں یا دنیا پاگل ہوگئی ہے۔ اگلے دو دن میں گھر ہی میں گوشہ نشین رہا اور غور کرتا رہا کہ یکایک منڈلی کی اس ناقابل یقین ہردلعزیزی کے پس پردہ آخر کون سا راز تھا؟

تیسرے دن میں شام کو گھر سے باہر نکلا۔ صدر میں آوارہ گردی کے بعد رات گئے جب میں گھر پہنچا تو تاریک برآمدے میں مجھے ایک سایہ نظر آیا۔ میں نے روشنی کی تو منڈلی نے حسب عادت احمقانہ انداز میں سلام کیا۔

"منڈلی؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"جی ہاں بھائی جان ــــ بندہ منڈلی ــــ کیا میں اندر چل سکتا ہوں؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں" میں نے کمرے کا تالا کھولا اور ہم اندر داخل ہوئے۔

"مجھے دیکھ کر تمہیں کچھ زیادہ خوشی نہیں ہوئی" اس نے آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تمہارا خیال درست ہے۔ کچھ زیادہ خوشی نہیں ہوئی" میں نے روکھائی سے جواب دیا۔

"حیرت ہے ــــ آج کی رات تمہارا مجھے ہاکس بے لے جانے کا تو کوئی پروگرام نہیں؟" اس نے پوچھا۔

"جی نہیں"

"یا میری خاطر کل فردوس میں دعوت کا؟"

"جی مطلق نہیں"

"پرسوں مجھے پکچر لے جانے کا؟"

"جی بالکل نہیں"

"حیرت ہے ــــ لیکن یا اللہ تیرا شکر ہے" اس نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ٹائی کی گرہ ڈھیلی کی اور کرسی پر آرام سے بیٹھ گیا۔ میں نے سگریٹ پیش کیا تو لے لیا۔ ہم دونوں نے سگریٹ سلگائے تو میں نے پوچھا۔

"بات کیا ہے منڈلی؟ ــــ تم نے آتے ہی ایسے عجیب سے سوالات کیوں کر ڈالے؟"

"میں پارٹیوں سے تنگ آگیا ہوں محمود بھیا ــــ صبح پارٹی۔ دوپہر پارٹی۔ شام کو پارٹی۔ رات کو پارٹی ــــ میرے پاس رات کو سونے تک کے لئے وقت نہیں تو دیکھو ــــ یہ دیکھو"

اس نے جیب سے ڈائری نکالی "آج تک میں نے ڈائری نہیں خریدی تھی۔ لیکن اب مجبوراً خریدنی پڑی ــــ خود پڑھ لو۔ اگلے

پچیس دنوں کا تفصیلی پروگرام۔" اس نے ڈائری میرے حوالے کر دی۔ جس کے صفحے کے صفحے بھرے پڑے تھے۔

"آخر بات کیا ہے مڈلی؟" میں نے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

"بات کچھ بھی نہیں۔ اللہ میاں کو جو مذاق سوجھا تو انہوں نے مجھے ایک عدد کوٹھی بخش دی — چھوٹی سی کوٹھی ہے چار کمروں کی۔"

"کیا کہا؟ کوٹھی بخش دی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "تمہارے پاس تو ایک فلیٹ تھا؟"

"جی ہاں۔ اب ایک کوٹھی بھی میرے قبضے میں ہے۔ میرے ایک چچا ہیں۔ انہوں نے ہاؤسنگ سوسائٹی میں ایک خوبصورت کوٹھی بنوائی۔ کوٹھی تیار ہوگئی تو وہ بیمار پڑ گئے۔ ڈاکٹروں نے صاف صاف کہہ دیا کہ کراچی میں ان کے لئے خطرہ ہے۔ اگر وہ یہاں رہے تو جلد مر جائیں گے۔ مجبوراً وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لاہور منتقل ہوگئے اور جاتے ہوئے کوٹھی میرے حوالے کر گئے اور کہہ دیا کہ جب تک میں ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ کرایہ ادا کرتا رہوں یہ کوٹھی میری ہے۔"

"کون سے چچا ہیں؟ تمہارے چچا نعیم تو نہیں؟ — ان کا ذرا پتہ تو لکھواؤ۔" میں نے جیب سے ڈائری نکالتے ہوئے پوچھا۔

"یار مارو گولی چچا نعیم کو — میں تو اس گھڑی کو کوس رہا ہوں جب میں نے نہ صرف یہ کوٹھی بخوشی قبول کرلی بلکہ بڑی سادگی سے ایک خاتون سے کہہ دیا کہ میں یہ کوٹھی بغیر پیشگی کرایہ لئے کسی دیانت دار دوست کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔ یہ کہنا تھا کہ یہ خبر آگ کی طرح شہر میں پھیل گئی اور اب پچھلے سات دنوں سے دعوتیں کھاتے کھاتے میرا ہاضمہ خراب ہوگیا ہے۔ کراچی کے آس پاس کا ایسا کوئی بھی خطہ نہیں جہاں میرے اعزاز میں پارٹیاں نہ ہوئی ہوں۔ اگلے پچیس دن تک میرا تمام وقت دوستوں کے لئے وقف ہے — آج بڑی مشکل سے جان بچا کر تمہارے پاس پناہ کے لئے آیا ہوں۔"

"کیا واقعی تمہارا ارادہ یہ کوٹھی کرائے پر دینے کا ہے؟ — بغیر پیشگی لئے؟" میں نے ذرا دلچسپی سے پوچھا۔

"ہاں ہاں بابا — ساری مصیبت اسی کوٹھی نے کھڑی کر رکھی ہے۔ کراچی میں کم از کم تین سال کا پیشگی کرایہ لئے بغیر مکان ملتا کہاں ہے۔ شہر کی آدھی شادیاں اسی لئے رکی ہوئی ہیں کہ یہاں مکان نہیں ملتا — مودی بھیا! میری ایک بات مانو گے — خدارا مجھے کسی نہ کسی طرح اس جنجال سے بچاؤ۔ خدا میں خودکشی کر لوں گا اور میرا خون ان تمام دوستوں کی گردن پر ہوگا جو سیلے تحاشا میرے تعاقب میں ہیں۔" اس نے التجا کی۔

"اب گھبراؤ نہیں مڈلی۔ اب تم میری پناہ میں ہو۔ میں کسی کو تمہارے قریب تک آنے نہیں دوں گا — مطمئن رہو۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"سچ؟ — خدا کی قسم میں زندگی بھر تمہارا ممنون رہونگا۔" اس نے ایک پرسکون طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ وہ بڑی عقیدت سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔

"یار — تم انسان نہیں فرشتہ ہو۔ ایسی بے لوث دوستی ان دنوں عنقا ہے۔" اس نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

"خدا کی قسم۔ آرام کی نیند سوئے ہوئے ایک ہفتہ ہوگیا — اچھا بھیا — خدا حافظ۔ میں یہیں آرام کرسی پر سو جاؤں گا۔ تم میرے لئے زحمت نہ کرو — خدا حافظ۔" نیند سے اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

"ہاں ہاں — ضرور سو جاؤ۔ یہ گھر آج سے تمہارا ہے — میں ذرا ریکس ٹیلیفون کر لوں۔" میں اٹھا۔

"ریکس؟" مڈلی نے چونک کر اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ہاں۔ میں ابھی لوٹ آؤں گا۔ اب جب ہمیں ساتھ رہنا ہے تو پھر مجھے تمہاری سیر و تفریح کا بھی خیال رکھنا ہوگا۔ کل شام پکچر کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟"

"کیا کہا؟ — پکچر؟ تم بھی مودی — تم بھی؟"

— اور وہ دھڑ سے فرش پر آ رہا۔

اردو کے غیر معروف ناول۔ افتاد جوانی :۔ بقیہ صـ۱۲

ے ہوئے ہیں۔ لباس اگرچہ سادہ و کم قیمت ہوتا ہے لیکن پابندی
م و صلوٰۃ اور نیز صفائی طبیعت کی وجہ سے اجلا اور شفاف رہتا ہے'
ارت، کا شک ضرورت سے زیادہ بڑھا ہوا ہے۔ جب بھی کہیں مہمان
ل میں، لوگ ان کو آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ بوڑھا اور جوان ہر شخص ان سے
راضی رہتا ہے۔ اگر ان کے شکیات کی دقت نہ ہو تو مہینوں اور برسوں
لوگ ان کو نہ چھوڑیں۔ علاوہ ان سب باتوں کے، ایک عزت اور وقار
کی نظر سے وہ قوم میں دیکھی جاتی ہیں ؛

کاف تا کاف ۔—— بقیہ صـ۳۶

ور لوگوں کی ذاتی پسند و ناپسند کی قائل نہیں معلوم ہوتی۔ مکانوں
ور گلیوں کی یکسانیت طبیعت پر گراں گذرنے لگتی ہے —— مگر
احب مردوں، مقبروں، محلوں اور ویران مسجدوں سے جی اکتا گیا
—— چلئے کراچی چلیں۔

مگر کراچی کے سلسلے میں ریلوے لائن کے کنارے کنارے، ابدہ
ور سمندر کے سنگم، بابائے ملت کے مزار کے سامنے، لالوکھیت، ناظم آباد
ور ڈرگ روڈ پر یہ کونسا فن تعمیر نظر آ رہا ہے؟ ہم کوئی ڈیڑھ دو ہزار میل
کے سفر سے آ رہے ہیں۔ ہم نے پچاس صدیوں کا فن تعمیر دیکھا ہے لیکن یہ
ت کہیں دیکھنے میں نہیں آئی۔ آٹھ دس بانس لئے، کچھ زمین میں گاڑے
کچھ رسیوں سے باندھے —— چار چھ چٹائیاں اور بوریاں وغیرہ لیں اور
مکان بن گیا —— یہ ان لوگوں کا فن تعمیر ہے، جو ہر ہفتے کھوکھرا
پار کر کے آتے رہتے ہیں اور جنہیں اصطلاح عام میں "پناہ گیر" اور
"تباہی" کہا جاتا ہے۔ ان "عمارتوں" کے عقب میں کراچی کی لوہے اور
اینٹ کی اونچی اونچی عمارتیں تیزی سے ابھر رہی ہیں۔ یہاں کبوتر خانوں
کی طرح کے فلیٹ بھی ہیں اور کھلے کھلے ایوانوں والے بنگلے بھی ....
لیکن ان سب نئی نویلی عمارتوں اور ان کے جدید ترین فن تعمیر کے باوجود
مجھے کراچی کوڑے کے ڈھیر کے کیڑوں کی طرح محسوس ہوتا ہے ——
یہ میری ذاتی رائے ہے ؛

یاد آیا ہے :—— بقیہ صـ۴۴

اور گور میں پاؤں لٹکے ہیں ..... "بڑا المبری نکلا"
اور سرائے سے باہر پہنچا ہی یہ آوازیں ایک مبہم شور سا سنائی دینے
یں اور میاں ..... پھر چند قدم پیچھے کر تایا نے کہا "اے واہ مری جان!
حول ولا قوۃ! اور میرا تہمد اور جوتیاں تو اندر رہ گئیں۔ اے واہ مری جان!"
ر میں نے تایا کے برجستہ کاٹ پائجامہ میں منڈھی ٹانگوں کی جانب دیکھتے
ہوئے بے ساختہ کہا "یعنی تہمد! تہمد آپ باندھے ہوئے نہ تھے!" اور
یا نے اپنی کمر کے گرد ہاتھ پھیرتے ہوئے اتنی ہی سادگی سے جواب
"اے واہ مری جان کہاں! وہ پٹکا کھول کر ذرا نماز کے لئے بچھایا
تھا کہ یہ شیطان طوفان بیچ میں آ پڑا! اے واہ مری جان۔ نماز تو نماز
وضو بھی پورا نہ ہو پایا" اور نیم داڑھی میں خلال کر کے سلسلہ کلام جاری رکھا۔
"اے واہ مری جان، مقدر کی بات ہے! وقت بھی تنگ ہو گیا اے
واہ مری جان!!"

لو سنگھو بابو کچھ بیزار ہو کر بولے "تایا جان یہ آپ کی جان ہماری جان
لے کر ٹلے گی کسی دن، ہم سمجھتے ہیں!"

تایا نے سنگھو بابو کی جانب گھور کر دیکھا اور شکایتی لہجہ میں کہا۔
"اے واہ مری جان! یعنی آپ بھی بلند شہر کی بھٹیارنوں کی سی باتیں کرتے
ہو! اے واہ مری جان! اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا!"

ڈراما:

دادی امّاں

اشرف صبوحی

بیگم: اے امانی خانم! میں انتظار کر رہی ہوں اور تم یہاں بیٹھی زردہ کھا رہی ہو۔ پیر جی کے ہاں ہو آئیں؟

امانی خانم: نماز پڑھتے ہی چلی گئی تھی۔ تم جانو چھوٹے میاں کے دشمن پڑے ہوں اور اتنا بندی کو چین آئے! زردے کی طلب کے مارے لق لق کرنے لگی۔ اب پان کا ٹکڑا منہ میں ڈالا ہے تو اوسان درست ہوئے ہیں۔

بیگم: ان سے سب حال تو کہہ دیا نا؟

امانی خانم: تو کیا بیگم صاحب اُن کا منہ دیکھنے گئی تھی۔

بیگم: پھر انہوں نے کچھ دیا؟ کیا بتایا؟

امانی خانم: تعویذ بھی دیا ہے۔ جلانے کو فلیتے بھی دئے اور کہہ دیا ہے کہ روز رکا بیان لکھوا کرے جایا کرو۔ اللہ میاں سب بلا ٹال دیں گے۔

بیگم: دیر بڑی لگائی ہیں تو کب سے جانے کو تیار بیٹھی ہوں۔

امانی خانم: بڑی بیگم میرے تو ناؤں کو لگی ہوئی تھی۔ میں کیوں دیر لگاتی۔ مگر وہاں مجھ سے پہلے کی اتنی عورتیں آئی ہوئی تھیں کہ بڑی مشکل سے میری باری آئی ہے۔ بڑی بیگم، پیر جی تو بڑے پہنچے ہوئے ہیں۔ کوئی کہہ رہی تھی کہ میرے میاں لڑائی پر گئے ہوئے ہیں ایسا تعویذ دو جو انہیں گولی نہ لگے۔ کسی کا بیٹا شفا خانے میں تھا۔ ڈاکٹر اسکا پیٹ چیرنے کو کہتے تھے۔ پیر جی نے کہا، خبردار پیٹ نہ کٹوانا۔ ہمارا دم کیا ہوا پانی آٹھ دن پلاؤ، اچھا ہو جائے گا، ایک عورت کی نواسی کو ہیضہ ہو گیا تھا.......

بیگم: چھائیں پھوئیں۔ ارے بی تمہاری اتنی عمر ہونے کو آئی اور بھرے گھر میں نبادے کا نام لیتی ہو۔

امانی خانم: توبہ توبہ۔ بیگم صاحب مجھ نگوڑی کے اوسان کہاں درست ہیں۔ منہ سے نکل گیا۔

بیگم: اچھا پھر پیر جی کیا بولے؟

امانی خانم: کہنے لگے ڈاکٹر حکیم کی دوا نہ کرنا۔ یہ ایک طرح کی ڈائن ہے اسکا علاج جھاڑ پھونک کے سوا دوسرا نہیں۔ میں تعویذ دونگا اسے بدن سے چھوا کر آگ میں ڈال دو اور بس۔

بیگم: ہاں بُوا سنا تو میں نے بھی بڑوں سے یہی ہے۔ اچھا اب ستو سے ڈولی لانے کو کہہ دو۔ دن زیادہ چڑھ جائے گا، تو ڈولی تندور ہو جائے گی۔ گو جانا بھی تو پاس نہیں۔ پرئیدوانہ جانا ہے۔ چلتے چلتے آندھ آجاتی ہے۔

(بڑی بیگم ایک اچھے کھاتے پیتے گھرانے کی اگلے وقتوں والی عورت تھیں۔ ان کے کئی بیٹوں میں سے ایک کی شادی موری دروازے ہوئی تھی۔ اور وہ اپنی سسرال ہی میں رہتا تھا۔ اس کے چار بچے تھے۔ بڑے کی عمر کوئی اٹھارہ برس کی ہو گی۔ خدا جانے لوٹی یا تخمہ ہوا۔ دوپہر کو اچھا گھر آیا۔ آتے ہی قے کی اور ایسا بے سدھ ہو کر پڑا کہ بیسیوں حکیم ڈاکٹر آ گئے۔ اسے ہوش نہ آیا۔ آج تیسرے دن خدا خدا کر کے اس نے ذرا آنکھ کھولی تو گھر والوں نے بھی اطمینان کا سانس لیا اور سب سے پہلے دادی اماں کو پوتے کی بیماری کی اطلاع کی۔ چنانچہ دادی اماں نے اپنے اعتقاد کے بموجب پہلے تو پیر جی سے تعویذ گنڈے منگائے اور اب پوتے کی خیر سلّا کو جا رہی ہیں)

بیگم: اے امانی خانم دیکھو تو کلو کہاں جا کر مر گیا۔ اتنی دیر ہو گئی اور

ڈولی نہیں لایا۔

امانی خانم: بڑی بیگم ڈولی تو کب کی آگئی ہے۔ شہرانن نے آپ سے نہیں کہا۔

بیگم: وہ پونڈا مونڈی تو اب اس گھر میں رہنے کے قابل نہیں رہی نہ جانے اس کے دل میں کیا ہے۔ بھلا مجھے خبر ہوتی اور میں سوار نہ ہو جاتی۔ ذرا ہو آؤں تو نشتر کو کھڑے کھڑے نکالتی ہوں۔ او ذرا پردہ تو دیکھ آؤ پھٹا پرانا تو نہیں۔ پھٹا ہوا ہو، تو چادر بندھوا دو۔ اور تاکید کر دینا کہ سنبھال کر آہستہ آہستہ لے جائیں۔ کوئی نواتی تو نہیں ہے۔ مجھ میں اتنا دم کہاں کہ وہ جامنو کی طرح ہلائیں اور میں ہچکولے کھاتی رہوں۔

امانی خانم: سمجھو کیا نہیں جانتا وہ پہلے ہی دیکھ کر لایا ہوگا۔ دوسرے ویسے ہی اُمس پڑ رہی ہے چادر بندھنے سے بالکل گھٹس ہو جائیگی۔

بیگم: اب گھٹس ہو یا کچھ ہو۔ بازار میں ننگی تو جانے سے رہی۔ تم دیکھ لو پردہ ورنہ ٹھیک ہے نا۔

امانی خانم: بیگم صاحب! آپ وہم نہ کریں۔ چیلوں کے کوچے کی ساری ڈولیاں اچھی ہیں۔

بیگم: اگر تم یہیں سے بھیگی بلی بتائے جاؤ گی۔ تو ج کوئی ایسا بھی کام چور ہو جائے۔ اچھا سوزنی اٹھاؤ۔۔۔ تعویذ فلیتہ میری چاندی کی ڈبیہ میں رکھ کر ڈبیہ میری بنگی کے کینے کے اندر رکھ (دینا)۔

اب بڑی بی نے دوپٹہ اوڑھا۔ رومال ہاتھ میں لیا۔ اور بھکی بھکی ڈیوڑھی میں پہنچیں۔ امانی خانم سوزنی بچھا رہی تھیں۔۔

بیگم: (ڈولی کو غور سے دیکھ کر) اے امانی خانم۔ کلو یہ ٹوٹا ہوا ہنڈولا کہاں سے لے آیا۔ کھٹولی ہے تو جھلنگا چھپری ٹیڑھی پردہ تو ذرا دیکھو۔ لاحول ولا قوۃ کلو کی آنکھ تو بہہ ہی ہو گیا۔

امانی خانم: (کواڑوں کے پاس جاکر) کلو بیگم صاحب کہتی ہیں یہ کون سے زرغل کہاروں کی ڈولی لے آئے۔ اس میں بھلا وہ اتنی دور جائیں گی۔

کلو: چیلوں کے کوچے کے اڈے پر تو کوئی ڈولی تھی نہیں۔ چاندنی محل سے لایا ہوں۔ وہاں بھی ایک یہی تھی۔

بیگم: تھاما اس کے منہ کو۔ خیر اب مجھے یہاں دوپہر تو کرنی نہیں۔ چادر لاکر باندھو۔

چادر باندھی گئی۔ بڑی بی پیٹلا آگے رکھ کر بیٹھیں۔ کہاروں نے ڈولی اٹھائی۔ اور سواری چلی۔ چیلوں کے کوچے سے موری دروازہ آنت کی آنت راستہ۔ جانب کا کہار نہیں۔ بڑی بی کا ہچکولوں کے مارے برا حال ہوگیا۔ خدا خدا کرکے سمدھیانے کی ڈیوڑھی پر پہنچیں۔ اندر اطلاع ہوئی کہ چیلوں کے کوچے سے سواری آئی ہے۔ مامائیں اصیلیں دوڑیں اتروایا۔ دادی اماں منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتی، رومال سے آنکھیں پونچھتی جہاں پوتے کی چارپائی تھی پہلے سیدھی وہاں پہنچیں۔ سمدھن پاس کھڑی ہیں۔ بہو انتظار میں کہ مجھے گلے لگائیں گی پوتیاں آگے بڑھ بڑھ کر سلام کر رہی ہیں لیکن وہ کسی طرف نہیں دیکھتیں بیمار کی طرف نظر جمی ہوئی ہے۔

دادی اماں: (بیمار کے منہ پر چھو کرکے سمدھن سے) بہن کیا ہوا تھا۔ دو دن کے بعد مجھے خبر کی۔ مجھ کو کچھ سمجھا ہی نہیں۔ میرے بچے کا یہ حال کر دیا۔

سمدھن: بہن یہاں ہوش کس کو تھا۔ ایکا ایکی قے ہوئی اور قے کے بعد دشمن بے ہوش ہوگئے۔ سارا گھر ڈاکٹروں اور حکیموں کے لانے میں لگا رہا۔ اتنی فرصت نہ تھی کہ آپ کو خبر کراتی۔ رات کو جب ذرا آنکھ کھولی تو اوسان آئے اور رحمت کو آپ کے ہاں دوڑایا۔

(جس کمرے میں مریض کی چارپائی تھی وہ اتفاق سے ڈیوڑھی کے قریب تھا۔ اتنے میں بازار سے ایک شور کی آواز آئی۔ ماماؤں اور کہاروں میں جھگڑا ہونے لگا۔ وہ غل کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دے۔ مریض نے جس کی ذرا آنکھ لگی تھی آنکھیں کھول دیں)

دادی اماں: اے سمدھن ڈیوڑھی پر یہ دہائی کیسی مچ رہی ہے۔ بیمار کا کچھ خیال نہیں (پوتے سے) کیوں میاں اب طبیعت کیسی ہے؟ بیٹا دیکھنا بڑھاپے میں دادی بندی کو داغ نہ دینا۔

سمدھن: کہاروں سے تکرار ہو رہی ہے۔ بھئی جو مانگتے ہیں دیدو۔ ان جوانا مرگوں نے ساری ڈیوڑھی سر پر اٹھالی۔

بھتو: (دادی اماں کے پاس آکر) اماں جان ڈولی والوں سے کیا کرایہ ٹھہرا تھا؟

دادی اماں: (ناک بھوں چڑھا کر) دلہن ہوش کی باتیں کرو۔ میں او

گرا یہ ٹھہراتی۔ میرا ایسا دیدہ دلیر نہیں کہ موئے گنواروں سے بات کروں نہ ہمارے ہاں کا یہ دستور ہے۔ ڈولی منگائی جہاں جانا ہوا چلے گئے۔ دینے والے جانیں اور کہار۔

دلہن اپنا سا منہ لے کر چلی گئیں اور کہار منہ مانگی مزدوری لے کر ٹلے۔ اب پھر دادی اماں پوتے کی طرف متوجہ ہوئیں۔ "بیٹا آنکھ نہیں کھولتے۔ دیکھو یہ کون بیٹھا ہے۔ رات بھر تسبیح پڑھ پڑھ کر دعائیں مانگی ہیں۔"

پوتا :۔ (آنکھ کھول کر) آداب۔

دادی اماں :۔ جیتے رہو۔ سونے کے سہرے سے بیاہ ہو۔ چاند سی دلہن لاؤ۔

پوتا :۔ آپ کی دعا چاہیئے۔

دادی اماں :۔ دلہن سو بندی کا تو دیکھ دیکھ کر کلیجہ کانپا جاتا ہے۔ ہائے دو دن میں کیا حال ہو گیا۔ بدن میں خون کا نام نہیں۔ آواز ایسی نکل رہی ہے جیسے کنوئیں میں سے کوئی بولتا ہے۔ آنکھوں میں حلقے پڑ گئے ہیں بیٹی صدقہ بھی دیا۔ کوئی منت بھی مانی ہے؟ ابھی اچھا نہ سمجھ لینا۔ اٹھ کھڑا ہو جب سمجھو کہ دشمن بچ گئے۔

بہو :۔ اماں جان سب ہی کچھ کیا۔ اور کیوں نہ کرتے سارے گھر کا چراغ ہے۔ اس کے سوا مجھے کس کی ماننا ہو سکتی ہے۔

دادی اماں : میرے تو جگر کا ٹکڑا ہے۔ میں بھی صدقے کے لئے بکرا لانے کو کہہ آئی ہوں۔ پیر جی کے پاس صبح ہی کو امانی خانم کو دوڑایا۔ انہوں نے تعویذ بھی دئے ہیں اور دھونی کے لئے فلیتے بھی۔ اللہ نے چاہا تو کوئی ڈر نہیں۔ تم اپنا دل میلا نہ کرو۔ دیکھو بیمار کے سامنے رویا نہیں کرتے۔

مگر پھر بڑی بی خود بھی دو چار آنسو نکال کر بھرائی ہوئی آواز میں فرمانے لگیں "دلہن تمہارا کچھ دیا لیا آگے آگیا۔ خدا ہمیشہ ہمیشہ کو تمہارا کلیجہ ٹھنڈا رکھے۔ پوتے پوتی کھلانے نصیب ہوں۔ بیماری تو بڑی بری تھی۔ ابھی پچھلے جمعہ کا ذکر ہے ہمارے محلہ میں اے بھلا ہی سا نام ہے تم نے دیکھا ہوگا وہ جو کپڑا بیچنے آیا کرتی ہیں ان کا جوان جہان کتنا بیٹا (مریض کی طرف اشارہ کر کے) اس کی جان سے دور، سات قرآن درمیان کہتی یوں ہو جائے۔ بس اسی بیماری میں دیکھتے دیکھتے ایک ہی دن کے اندر چٹ پٹ ہو گیا۔

سبحان اللہ! کس قدر بے تکلفی کے ساتھ مامتا کو بھڑکایا گیا۔

ایک اور تارا ٹوٹا

یہ شمارہ تقریباً طبع ہو چکا تھا کہ اُردو کے نامور صحافی اور مزاح نگار مولانا چراغ حسن حسرت کے سانحۂ ارتحال کی خبر موصول ہوئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ مرحوم کہنہ مشق لکھنے والے اور نہایت شگفتہ ذوق کے مالک تھے۔ "لاہور کا جغرافیہ" ان کے شگفتہ طنز کا مثالی نمونہ ہے۔ اہلِ ذوق ان کے "حرف و حکایت" کی لطیف نثریت کو مدتوں فراموش نہ کر سکیں گے۔

مرحوم کچھ عرصہ تک "ماہِ نو" کی ادارت میں بھی شریک رہے اور یہ رسالہ ان کی دقیع خدمات سے مستفید ہوا۔ ہم مرحوم کے پسماندگان سے اس سانحہ پر دلی ہمدردی محسوس کرتے ہیں۔ جو در اصل اردو زبان و ادب کے لئے بھی اتنا ہی عظیم ہے ؎

فروغِ شمع جواب ہے رہے گا صبحِ محشر تک
مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے!

(ادارہ)

بیمار اچھا ہونے ہوتے پھر سمجھے کہ آخری سانس ہیں۔ کیونکہ دادی اماں نے ثبوت بھی بہم پہنچا دیا کہ ان کے محلہ میں اسی بیماری سے ایک موت بھی واقع ہو چکی ہے۔

ان کو کھانے کی ایسی آ پڑی تھی، مرنا ہو یا جینا عموماً جاتی اسی لئے تھیں کہ خاطریں ہوں گی۔ اچھے اچھے کھانے کھانے میں آئیں گے۔ چنانچہ دادی اماں بیٹھی تو بیمار پوتے کے پاس تھیں مگر دل میں برابر یہ خیال آ رہے تھے کہ دیکھوں میرے لئے کیا کیا پکایا جاتا ہے۔ خدا کرے میرے من بھاتی چیزیں ہوں۔ بہو تو آخر انجان نہیں۔ کچھ دیر تو چپ بیٹھی رہیں کہ شاید کان میں کوئی آواز پڑے۔ جب دیکھا کہ کھانا پکانے والی ماما سے کسی نے کچھ نہیں کہا تو کب تک صبر کرتیں۔ مہمان آئی ہیں تو میزبانی کے فرائض کیوں نہ ادا کرائے جائیں۔ بہو کو ٹھوک کر کہنے لگیں "دلہن! اے سنتی ہو۔ زیادہ تکلف نہ کرنا۔ میرا تو گھر ہے۔ ایک دن کا آنا تو نہیں، ہزار دفعہ آؤں گی۔ بچے کا جی اللہ رکھے اچھا ہو جائے پھر جو کھلاؤ گی کھاؤں گی۔ میں بھی پچھلے دنوں بیماری سے اٹھی ہوں۔ حکیم صاحب کی دوا آج بھی

(باقی صفحہ ۵۹ پر)

ماہِ نو
استقلال نمبر ۱۹۵۵ء

مغربی پاکستان کی

چند نفیس دستکاریاں

ماہِ نو

جلد ۸ شمارہ ۵ اگست ۱۹۵۵ء

استقلال نمبر

مدیر : رفیق خاور
نائب مدیر : ظفر قریشی

چندہ سالانہ: پانچ روپے آٹھ آنے (پاکستان میں) سات روپے (ہندوستان میں) فی کاپی سوا روپیہ (پاکستان میں) ڈیڑھ روپیہ (ہندوستان میں)

اپس کی باتیں

ماہ نو کی روایات میں سے ایک روایت یہ بھی رہی ہے کہ اس کا ہر سالنامہ گزشتہ سالناموں سے بازی لیتا ہوا نکلا۔ ہم نے اس بار بھی اس التزام کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ہمارا سالنامہ یوم استقلال سے منسوب ہوتا ہے جو ہماری قوم کے دور رواں کا سب سے یادگار دن ہونے کی بنا پر اس ادبی ضیافت کے لئے بھی سب سے موزوں تقریب ہے۔ ماہ نو پاکستان کے ادب و ثقافت کے ساتھ ساتھ، عمومی تہذیب و ترقی کا بھی کسی نہ کسی حد تک آئینہ دار رہا ہے۔ اس طرح اس نے ادب کو قومی زندگی سے قریب تر رکھنے کی بہت اچھی مثال قائم کی ہے۔ اس کے صفحات میں آپ رفتار ادب اور ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ بعض خوشگوار مادی تبدیلیوں کا عکس بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اس نے ادیبوں کے ذہنی کارناموں کو بھی اپنے دامن میں سمیٹنے کی کوشش کی اور دوسرے گوناگوں مشاغل کو بھی حسب توفیق نظر انداز نہیں کیا۔ اس نے روشن کارناموں، بدیہی ترقیوں، حوصلہ افزا منصوبوں اور ابھرتی ہوئی تعمیروں کے ساتھ ساتھ قوم کے دشوار مسائل کو بھی زیر غور لانے کی کوشش کی، قومی مسرتوں اور قومی آلام کو کھلے دل سے منایا اور اپنی بساط کے مطابق ملک کے ذی فکر طبقے کے لئے جد و جہد کی رفتار کا ایک جامع اور متوازن مرقع بننے کی کوشش کی۔ یہی ہمارے مقاصد ہیں۔ چونکہ ذہنی افزائش ویسے بھی معاشرتی ترقی پر سبقت رکھتی ہے، لہٰذا آپ ماہ نو کو جو پاکستان کا ادبی و ثقافتی مجلہ ہے، قوم کی عمومی ترقی کا آئینہ خیال کر سکتے ہیں۔ اس آئینے میں جو ذہنی اور مادی مرقعے آپ کو نظر آئیں گے، ہمارے احساس تشنگی کے باوجود، یقین ہے کہ حوصلہ شکن نہ ہوں گے۔

اس شمارے میں قوم کی ہر جہتی رفتار ترقی کا ایک مختصر جائزہ بھی شامل ہے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ یہ چند صفحات اس بیان کے لئے بہت ہی ناکافی رہے اور بہت سی اہم توسیعات و اصلاحات کا نام بھی نہ لیا جا سکا، جو بہرحال اپنے اپنے دائرے میں بڑی اہم تھیں۔ اس کمی کو ہمارے ادارے کی بعض دوسری مطبوعات بڑی حد تک پورا کرتی ہیں۔ تاہم امید ہے کہ ناظرین ماہ نو پاکستان کے آٹھویں سال کے اختتام پر اس مضمون کو دلچسپ اور مفید پائیں گے۔

ذہنی و قلبی احساسات کا عکس اس شمارے کی طویل اور مختصر نظموں میں دیکھئے جو بعض بڑے گہرے اور سچے تاثرات کی حامل ہیں۔ صنف ادب ہونے کی حیثیت سے ماہ نو صداقت اور وسعت نظر کا قائل ہے۔ خام جذبات یا ناواجب باتوں کو سراہنا ہمارا مقصد نہیں، نہ یہ باتیں دیدہ وروں سے داد لے سکتی ہیں۔ یقیناً ہمارے شاعروں کے جذبات میں کہیں کچھ تلخی اور درد کی کسک بھی موجود ہے لیکن یوم آزادی پر ان کی یہ بھرپور آمد، بدیہی خلوص کلام اور یقین و خود اعتمادی کی پھوٹتی ہوئی کرنیں آنکھوں کو روشن کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اسی قومی دردمندی اور احساس مقاصد کو ہم اپنا حاصل ترقی اور خلاصہ کائنات سمجھتے ہیں۔

پاکستانی ثقافت کے سلسلے میں "صہبائے پاک" کے زیر عنوان ایک بڑقلموں انتخاب کلام پیش کیا جا رہا ہے جس میں مغربی پاکستان کے مختلف کلاسیکی افسانوں کے منظوم اقتباسات شامل ہیں۔ اہل نظر سے یہ بات چھپی نہ رہے گی کہ قدیم تمدنی اور جغرافیائی وحدت ہونے کی بنا پر مغربی پاکستان کی مقامی زبانوں کے ادب کی روح اور لہجہ کس قدر مماثل ہیں۔ اب جبکہ اس محکم و مسلم وحدت کے درمیان سے عارضی علاقائی بندشیں اٹھائی جا رہی ہیں، اور مغربی پاکستان ایک واقعی و لازمی وحدت ہونے کے ساتھ ساتھ، آئینی وحدت بھی تسلیم کیا جا رہا ہے، علاقائی ادب کا یہ گلدستہ امید ہے پسند کیا جائیگا۔

ادبی مضامین میں، ڈاکٹر سید عبداللہ کا مقالہ "غالب پیشرو اقبال" سرفہرست ہے جس میں انہوں نے ان دونوں کے روحانی رابطے کو خوب واضح کیا۔ یہ ان میں سے ایک کے دم کیساتھ فارسی شاعری کا ایک دفتر ختم اور دوسرے کی ذات سے ایک نیا فلک آغاز ہوتا ہے۔ یہ موضوع بہت ضروری تھا۔ اور یہ مضمون قدر کے قابل ہے۔

کسی مصنف کا مرنے کے بعد غلو آمیز خراج تحسین پانا تعجب کی بات نہیں۔ خصوصاً جبکہ مرنے والا منٹو جیسا مقبول اور زنلغانہ انداز مصنف ہو۔ رفتہ رفتہ رائے اعتدال پر آجاتی ہے۔ الطاف گوہر نے "ایک اور صنم" میں منٹو کا صحیح مقام بتانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے مضمون سے بہت لوگوں کو اختلاف ہوگا اور ہمیں بھی ہے۔ ہمارا کہنا ہے کہ، ع عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو، ہمیں مضمون کا یہ پہلو تشنہ نظر آیا تاہم اہل نقد کے لئے الطاف گوہر کا نقطہ نظر دلچسپ ہوگا۔ جسے انہوں نے بڑی کاوش سے ایک تجزیے کے طور پر مرتب کیا ہے ؎

غنائیہ

سرودِ باقی

رفیق خاور

"غلغلوں سے جس کے لذت گیر ابتک گوش ہے
وہ جرس کیا اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے؟"

ایک آواز:۔

"سرودِ رفتہ" میں اک دلربائی تھی   نوائے دلستاں میں ساحری تھی
وہ کیف اسکے بہاریں غلغلوں میں   کہ جذبے رقص پیرا ہوں دلوں میں
سرودِ رفتہ میں شانِ جلالی   سرودِ رفتہ آہنگِ مثالی
سرودِ رفتہ میں اک گھن گرج تھی   ترنم میں حیات افروز لے تھی
سرودِ رفتہ آہنگِ رجز تھا   پیامِ جاوداں سوزِ تپش کا
نہاں نغموں میں شانِ کبریائی   مسیحائی کا کیفِ دلربائی
سرودِ رفتہ تھا نیرنگِ نیرنگ   سرودِ رفتہ تھا طوفان آہنگ
صدا اس کی صدائے قم باذنی   تکلم میں ادائے روح الامیں کی
جہاں در جہاں اعجاز اس میں   فضائے قدس کا انداز اس میں
سرودِ اولیں کون و بیاں کا   سرودِ جاوداں سیارگاں کا
قیامت آفریں صورِ سرافیل   تلاطم کی جلال آمیز تمثیل
سرودِ رفتہ کیا، آہنگِ دریا تھا   دمادم گونج کا رمز آشنا تھا؛

سرودِ رفتہ اک مدت سے مستور
جہانِ آب و گل سے اس قدر دور
کہاں آوازاسکی پائیں گے ہم   دل و جاں سوز سے گرمائینگے ہم
سرودِ رفتہ پھر بھی آئے گا کیا!
جہانِ زیست پہ چھا جائے گا کیا؟

دوسری آواز:۔

یہ گردوپیش آہنگِ مسلسل   ہے یکسانی سے جسکی سامعہ شل
خدا جانے یہ کیسا شور و شر ہے
بلائے ہوش جس کا غلغلہ ہے

کسی کل کے مہیبِ ہول پرور   ہلاکت خیز دندانوں کا منظر
تو اتراں کی صوتِ جانگزا کا   کہ دیووں کے خشن کلّوں کا غوغا
یہی ڈر ہے کہ یہ ہوں آفریں شور   مثالِ موجِ دریا تند و پرزور
نہ کر دے جذب پہنائے جہاں کو   طبق ہائے زمین و آسماں کو
سرودِ رفتہ بھی اس میں نہ بہہ جائے   فلک کے دام میں پھنس کر نہ رہ جائے
یہ شورِ بیکراں، نغمے لگاتار   فضا ان کی صداؤں سے دھنواں دھار!
قطاریں جیسے ہرتی جوہروں کی   بلائے بیہوشیا، ناگا ساکی ...

آنات:۔

صبحِ ازل سے، شامِ ابد تک، اپنی اک رفتار
فرشِ زمیں سے بامِ فلک تک طوفانی یلغار
نقطے ہی نقطے جیسے رواں ہوں سب کے سب جاں دار
ایک قطار اور ایک آہنگ۔۔ اک لشکرِ بے زنہار!
اک یورش ہے، ایک لپک، اک حرکت سلسلہ وار

حلقہ بہ حلقہ اک زنجیر ہے مہرِ مبیں تا ماہی
جیتے جاگتے جوہروں کا اک سلسلہ لامتناہی
ہم کو آن اور لمحے کہنا بینش کی کوتاہی
ہم باقی ہیں، لافانی ہیں، باقی ہر شے راہی
اپنی لہریں سب جگ پھیلیں، سب پہ اپنی شاہی

اپنے من پہ نقش ابھاریں، اور پھر ان کو مٹائیں
ببلے، لہریں سامنے لائیں، اور پھر آپ ہٹائیں

---

[1] کرخت

ایسے سینوں ہی سے اُبھریں یہ بدمست گھٹائیں
اپنے شانوں پر جیون نے پھیلائی ہیں جٹائیں
ہم ہی بڑھائیں جس کو بڑھائیں، ہم ہی سب کو گھٹائیں!

رنگ و بو کے یہ سب دھارے، اپنی سیں کے دھاگے
برقے ہوا، یا چاند اور سورج، اپنی گگن کے تارے
اپنی ہے یہ پھیلی دھرتی، قدرت کے نظّارے
اپنے ہی دامن گل دھرتی کے لہرانے گہوارے
اپنی برقِ نفس کے آگے کون ہے جو دم مارے!

مٹ جائے گا اپنی اگن سے چھوٹا بڑا ہر کوئی
داناؤں کی مایا بھی اپنے سیلاب میں کھوئی
بڑے بڑوں کی قسمت اپنے قبرستان میں سوئی
کس کی آنکھ ہے جو نہیں آخر اپنے بھنور میں روئی
ہر ہر قبر کی تختی اپنے طوفانوں نے دھوئی.....

دوسری آواز۔

سنی یہ جو ہونے فاخرانہ — یہ گفتارِ کرخت و قاہرانہ؟
گرفت آنات کی ہو گر ہمہ گیر — قوی ہے پنجۂ گیرائے تقدیر
تو پھر انسان کیا اس کی بساط کیا
سرودِ رفتہ ناموسِ فنا کیا
اجل کا تیر، تیرِ بے خطا ہے
تب و تابِ دوام اک سیمیا ہے
یہ کیا، تیرے لبوں پر مسکراہٹ
اُدھر، اس سمت طوفانِ نمیاد کھو۔

پہلی آواز۔

جلوہ بہ جلوہ شعشعے
مہر بہ مہر ضو فشاں
قہقہہ ہائے بے کراں
دستہ بہ دستہ موجِ نور
سلسلے طور طور۔ طورا

جلوۂ روئے قدسیاں
تابشِ بالِ نوریاں
عکسِ جمالِ حوریاں
جیسے طلسمِ سیمیا!

دوش بہ دوشِ موجِ نور
سیل بہ سیل زمزمے
ساز بہ ساز ہمہمے
کوہ بہ کوہ غلغلے
نغمگیٔ بہشتِ گوش
تا بہ فرازِ کبریا
طنطنے دور۔ دور۔ دورا

آسماں شق گشت و حورے پاک زاد

یہ پیکر نیا کس نئے آب و گل سے اٹھا ہے؟
نیا معجزہ کن عناصر سے مل کر بنا ہے؟
نیا شعبدہ کس انوکھی اگن میں ڈھلا ہے؟

ہوا کس تجلی کدے سے یہ حسن آشکارا؟
طلسمی جواہر کو قدرت کے کس نے ابھارا؟
یہ کس نے جِلا دے کے اس مورتی کو سنوارا؟

یہ ہے کون جادو بھری نازنیں حور پیکر؟
یہ ہے کون شانِ تجمل میں زہرہ سے برتر؟
یہ ہے کون جس کی اداؤں میں اندازِ محشر؟

یہ وہ حور ہے جو محبت کی لو میں ڈھلی ہے
یہ وہ ساحرہ ہے جو اعجاز لو سے بنی ہے
پلی ہو جو آغوشِ جاں میں، وہ نازک پری ہے

تب و تاب میں ہر روش اس کا روئے درخشاں

بلندی میں کیواں ہے اس کا ہلالِ فروزاں
چمک میں ہے روشن تر از قطب سیمائے تاباں

محبت میں اس کی دل و جان سب کچھ لٹا دیں
اشارے پہ ہر مست آنکھوں کے دنیا ہلا دیں
بصد شوق خونِ حیات اس کی رہ میں بہا دیں

کہ جب اس کی تابش سے روشن فضائے جہاں ہو
زمیں اس کے جلووں سے غیرت دہ آسماں ہو
تو اپنی محبت کی تنویر اس کے رخ سے عیاں ہو

صدائے غیب:-

اک نئی زیست کا در باز ہوا
نئے خورشید کا سامانِ سفر
کچھ محبت نے دیا تازہ جنم
تازہ طغیانِ جنوں، تازہ نوا
ذوقِ بے تابِ ازل نغمہ سرا!
"نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
زمانے کے انداز بدلے گئے"۔

سالِ آغاز:-

اوّلیں نغمۂ بہاروں میں — حسن کی شانِ آشکاروں میں
رت نئی ہے، نئی ترنگیں ہیں — تلملاتی ہوئی ترنگیں ہیں
نونہالوں کا سبز گوں پرچم — نور کی دھار جیسے ساتھ ہی ضم
ابھی کلیوں نے آنکھ کھولی ہے — روشنی جسم میں سمولی ہے
تازہ تازہ پھوار پھولوں پر — پیارا پیارا نکھار کونپلوں پر
نت نئی کونپلیں ابھرتی ہیں — دم بدم اور بھی سنورتی ہیں
ڈالیاں ہمکنار ہوتی ہیں — ساتھیوں پر نثار ہوتی ہیں
سینۂ ارض سے ابھرتا ہوا — یہ سہانا، نیا نیا نقشہ۔۔
تازہ کردار ہائے نورانی — کتنی روشن ہے ان کی پیشانی!
یوں چمکتا ہے چہرۂ سیمیں — جیسے براق جامِ بلوریں۔

اور پر سب دنیا سے بالا
بوڑھا عظیم الشان ہمالہ،
نیچے لئے اک رس کا پیالہ
جادو بھرا، شیریں بنگالہ،
خیبر کی صف بستہ چٹانیں —
سرحد کا طوفانی لشکر،
سندھ کی وادی، ہندستاں میں
پہلی مسلمانوں کی بستی،
دشتِ عرب کی آئینہ دار،
اور پنجاب وہ دیس سہانا
وہ رومانوں کا گہوارہ!

صدائے غیب:-

یہ بستی، یہ سوادِ اعظم نور — جو شرق و غرب میں پھیلا ہے تا دور
نہاں ہیں خاک میں اسکی وہ جوہر — کچھ ایسی بجلیاں سینے میں مضمر
کرے گی اور بھی پیدا تب و تاب
حریفِ جلوۂ خورشید و مہتاب

اٹھواں زمزمہ ہوں زمزمۂ ہشت آہنگ
ان گنت راگنیوں، راگوں کا سنجوگ ہوا
کتنی جولانیاں مصروفِ تگ و تاز ہوئیں
پھر کہیں جا کے مکمل ہوا اعجاز مرا
میری ترکیب میں آمیز ہیں صد رنگ فسوں۔
وہ بلمپت میں الاپ اور وہ درت لے میں بڑھت
اک عجب طرح کی گمبھیرتا، سمپورن راگ
سُروں اور سرتیوں کا اک آخری، نادر آہنگ
جیسے وہ ناچ رہے ہوں کوئی طوفانی ناچ
ایک پیراہنِ سیال، لچکتا سرگم
جس میں دو ڈورے ہوں سجل، نرم سنہری ریشے
کہیں بل کھاتے ہوں سیماب نما تار پہ تار
سادہ پُرکار اداؤں کا دلآویز طلسم
مینڈیں اور گمگیں، وہ کھرج اور گرج کی سنگت

کہیں ندیوں کی مدھ ریلے، کہیں بجلی کا دھمال
آٹھواں زمزمہ ہوں، شعبدۂ صد نیرنگ

ندی (مشرقی پاکستان) :-

تصویر روانی ہوں میں
رمتا ہوا پانی ہوں میں
میرا سیّال آئینہ
اس کے ہر ہر پارے میں
دھرتی کے نظارے جھلکیں
یہ دھانی دھانی پودے
یہ بان، یہ تاڑ کے جھرمٹ
وہ بور آموں پر آیا
وہ سیتا پھل گدرایا
جھوم اٹھے سنہری ریشے
گونج اٹھی سیٹی ریل کی
ہر سمت وہ اک ہلچل سی
دھرتی نے چولا بدلا
جیون کی کایا پلٹی
گھنگھور گھٹائیں چھائیں
طوفانی برکھا لائیں
موجوں کی وحشی دوڑیں
جو اپنی سرمستی میں
گھر گھاٹ جو چاہیں روندیں
یہی ان کے من میں بسی ہے
ہم دوڑ میں کیسے جیتیں
موجوں کو اُمنگ جو آئی
وہ کیسے جوت جگائیں
بجلی کے روپ میں آئیں،
گھر گھر ہے جانا میرا
ہر اک در ہے میرا رستہ
شمپان وہ بیڑا بیڑا
ہر جا سب ڈگمگ ڈولیں

وہ کشتیاں بڑی دُخانی
اُن کی ہر سو جولانی
وہ گھوڑوں کی مست روانی
وہ کہیں پُر شور جوانی
گیتوں کا جادو جاگا
نس نس میں امرس گھولا
کیا جانئے اک ساحر نے
ہے کیسا افسوں پھونکا
اس دیس کی شوبھا بدلی
یہ دیس رسیلا پیارا
اس ساحر کے جادو سے
اب جانے کیا ہو جائے!

سرحد :-

بہار راغلے
بہار راغلے
ڈال ڈال پات پات
پرند چہچہا اٹھے
چٹانیں سخت و آہنیں
ازل سے محوِ خواب تھیں
یکایک ایسے جاگ اٹھیں
کہ جیسے جاتے جاتے کوئی ساحرِ ہزار فن
غنودہ سنگلاخ بستیوں پہ سحر کر گیا
بلند و پست پر اُٹھا ہے حشر خیز غلغلہ
بہار راغلے
بہار راغلے
وہ زندگی کی بادِ نو
جو کوہ اور دن میں تھی
احاطۂ چمن میں تھی
وہ اب ہے زیب کاخ و کو

ف مشرقی پاکستان میں کم سن لڑکے عموماً گھوڑوں پر تیر کر اسکول آتے جاتے ہیں۔

حیات آب و گل میں ہے
حیات سب کے دل میں ہے
بہار را فلے
بہار را فلے

کاریز (بلوچستان) :۔

زمیں دوز رستوں پہ نظروں سے اوجھل مسلسل رواں ہوں، کہیں[1] رواں
گواں، پردہ در پردہ ظلمات کے خولِ سنگیں میں ہے آبجیوں نہاں
طلسم آفریں ہے یہ تاریکئ بےکراں میں اندھا دھند مخفی روانی
ہو جس طرح پردے میں شب کے کسی لشکرِ بےمحابا نے شبخون کی ٹھانی
چٹانوں چٹانوں رواں ہوں دواں ہوں کبھی آشکارا کبھی بےنشاں ہوں
مری آمد و شد ہے رستہ برستہ، محبت کی مشاطۂ جاوداں ہوں
ملاتی ہوں چپ چاپ رشتے ہی رشتے، ادھر سے اُدھر ندیوں کو ملا کر
رگِ جاں جاموں کو سیراب کرتی ہوں شیرِ مصفا کے جرعے پلا کر
ازل سے ابد تک یہی سلسلہ ہے، یہی رشتۂ باہمی دوستی کا
اُبھر کر کبھی دیکھ لیتی ہوں منظر محبت کی مشاق جادوگری کا
یہ ہے سحر کاری کا روشن کرشمہ کہ نادیدہ اعجازِ صنعت گری ہے
کہ اس سنگِ خارا کے ماحول میں بھی نئی دلبری ہے، نئی زندگی ہے
نئے شعر رہائے فروزاں کی تابش سے ہے کاف تا کاف آفاق روشن
نفِ برقِ خود ساختہ سے منور ہے مانند سینا پہاڑوں کا دامن

پنجاب :۔

جینا ہے بیلوں میں
ہم بیلی کیسا جانیں۔ کیا موج ہے میلوں میں
کھیتوں میں اُگے پودے
جب کوٹھیاں پُر ہو جائیں۔ تب دلوں کے ہوں سودے
آباد ہوئے سارے
جیون ہے، جوانی ہے۔ پھر کیوں نہ ملیں پیارے؟
گلیں سیٹیاں دیتے بلیں
کھیتوں میں کھیل چکے۔ اب آؤ شہر چلیں
روئی کی دو کلیاں
دل اُجلے یاروں کے۔ اور سینوں کی گلیاں

آزاد ہیں دل اپنے
آ، اونچی فضاؤں میں۔ پر کھول کے اُڑ جائیں
ان اونچی فضاؤں کی
حد لبست نہیں کوئی۔ پروا نہ ہو دور اپنی
آ اڑن کھٹولوں میں
طیاروں کے اُڑ اُڑ کر۔ افلاک کو زیر کریں

جہازراں (کراچی) :۔

لبِ ساحل اک شاہزادی ہے جسکی نگاہِ فسوں کار برق آفریں ہے
یہی ہے یہی جسکے سحرِ محبت سے موجِ نفس شعلۂ احمریں ہے
ادھر دو قطبین تک گرم جولاں جہاں یخ سے ہوں منجمد خوں کی لہریں
ادھر آتشیں منطقوں تک نگاپو جہاں ندیاں خشک ہو ہو کے ٹھہریں
یہ جو ہمارے یہ بازو ہمارے، طنابیں ہوں اک امِ گیتی ستاں کی
عنا گیر ہفت آب تہار وجابر ہمارے جہازوں کا پیکِ حجازی
جو طوفان چھائیں فضا پر تو کیا ہے، حدِ آخری تک سمندر کی جائیں
ہماری رسائی کراں تا کراں ہو، جہاں جہاں شوق کی انتہائیں
سمندر کی بپھری ہوئی تند موجوں کے سینے پہ اپنا سفینہ رواں ہو
یونہی یہ تھپیڑوں پہ سنگیں تھپیڑے، یہ یہی آہنیں کشمکش جاوداں ہو

سندھ :۔

دشتر پاک لبوں پر آئی، اب کوئی سر نہ من کو بھائے
اور یہی دھن اب من میں سمائی، اور لگن نہ کائی
اب ہے یہی چھیتی وائی، کسی سے من نہ لاگے
دل نے چین کی منزل پائی، کچھ نہیں اور سہائے
دور سے ساجن ملنے آئے، آنگن میں سُن گن پائی
گلے لگاؤں میں سو وائی، ورد ی پریت کی ماری

آبشار (کشمیر) :۔

ہمالہ کے برفانی آئینہ خانے جو ہیں شیش محلوں سے بڑھ کر فروزاں
جہاں خوش تراشیدہ الواحِ سیمیں کے براق پیکر ہیں تنویر افشاں

---

[1] شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے سُر سوہنی، سُر سستی، سُر سینی، سُر امین وغیرہ کے عنوان سے کئی نظمیں لکھی ہیں جن میں ایک خاص صنف وائی کے بیشمار نمونے ہیں۔ اس صنف میں قافیہ کہیں بھی واقع ہو سکتا ہے، جیسا کہ خط کشیدہ الفاظ سے ظاہر ہے۔

"انوار سہیلی" کی ایک جھلک
(شہنشاہ اکبر کے زمانے کے ایک مصور نسخہ سے)

جہاں ان گنت آئینے دیو قامت، چکا چوند جن کی چمک سے نگاہیں
پریشاں ہوں جیسے صنم خانۂ آذری میں بتوں کی درخشاں شبیہیں
فضاؤں میں جس کی پرستاں کا عالم، پس و پیش ہر سو چھما چھم چھما چھم
ہیں نادیدہ شفاف پاؤں میں پازیب جیسے دمادم ہے جن سے چھما چھم
پرافشاں ہواؤں میں سرگشتہ طائر کے مانند مبہوت حیرانیاں ہیں
جہاں آفتابی شعاعوں کو بھی کپکپاتی اجل کی پریشانیاں ہیں
یہی کوہساروں کے پاکیزہ آغوش میں میری سرشار دوشیزگی ہے
یہی، ہاں یہی برف زاروں میں میرا سدا موج سرچشمۂ زندگی ہے
میں تختہ بہ تختہ تھرکتی تھرکتی، جھلکتی جھلکتی، دھمکتی دھمکتی
کبھی گودیوں کھیلتی وادیوں کی، کبھی ٹوٹتی سیخ وش گھاٹیوں پر
کبھی گوپیوں کی سی بوچھار سہتی، کبھی چھٹتے سینے پہ گوروں کے پتھر[1]
مرا ناچ خنجر بکف، سینہ وا موت[2] کا ناچ ہے وحشیانہ
کہ میرا حوادث کے طوفان سے کشمکش کا ہے ہنگامہ غازیانہ
بلندی سے مستانہ بھر کر بناتی ہوں چھچلی ہوئی جھاگ کے نوپارے
وہ شفاف فوارے گنبد نما، وہ سفید ابرپاروں کے مانند گھونگھے
جھلکتے ہوئے تیرتے بادلوں کے کنارے کنارے کبھی برقِ مضطر
دمِ رقص دوشیزۂ کاشمیری کا پیراہن اُجلا، چمکدار جھالر
وہ اک سیم تن اپنے چاندی سے پاؤں کو لٹکائے جیسے روپہلی پری
جنہیں ان گنت مست لہروں کے ہونٹوں سے چھوتی ہوئی صد کیف دیتی
وہ شاخِ صنوبر مری سمت کیسے، نزاکت سے جھکتی ہوئی آ رہی ہے
کہ جیسے کوئی ہستیٔ آسمانی بسیط ابر زاروں میں لہرا رہی ہے
جو مکھڑا دکھاتی ہے وہ حور جیسا فضاؤں کی رنگیلی چنری اُٹھا کر
تو رک جاتی ہوں یک بیک چلتے چلتے تنِ نرم و نازک سی سکتے میں آکر
بہت سیدھی سادی ہے، معصوم ہے یہ جو فردوس زادوں میں پلی ہے
یہ پاکیزہ حورِ جناں ہے کہ پیکر کوئی اوس کی بوندیوں میں ڈھلا ہے
یہ اک جلوۂ سیمیائی ہے یا جھاگ میری ہی مدّوں سے اُچھلا ہوا ہے
یہ خود چاندنی بن کے نیلے پہاڑوں کی اونچائیوں میں چکور آ گیا ہے
کہ چمکیلے سینوں کا آئینہ ہوتی ہے جو بن کے بُرّاق مور آ گیا ہے
کھڑی ہے کچھ اس طرح جنت نما وادیٔ گل زمیں کے بہاریں طلب میں
کہ ساری خدائی کا جوبن سمٹ کر کھڑا ہو سویرے ہی جس طرح کو میں
وہ بادام، اخروٹ، سیبوں، تریلوں[1] کے رکھا وہ جنگل کے جنگل خیاباں
وہ اونچے شجر سبز شوشوں[2] کے معدن سپیدار[3] قدرت کے محلوں کے دربان
وہ جھیلیں، شکارے، وہ بھیڑوں کے گلے، وہ شالیں، وہ میٹھی مہک کانگڑی کی
ادھر شالامار اور نشاط اور ان میں وہ سرو و صنوبر کا انبوہ شاہی
ادھر بیسے اور اُدھر موجۂ خون بہشت اور دوزخ بہم جلوہ ساماں
وہ جنت کا پس منظر قوس قزحی عذر و خال حورت کے جس سے نمایاں
انہیں دیکھتی جاؤں مڑ مڑ کے ہر دم چٹانوں کے رخ سے پھسلتے پھسلتے
جھلکتے رہیں میری لہروں کے آئینہ پارہ پارہ میں جنت جو دل ہے
کہ میں خود بھی بیٹی ہوں اس سرزمیں کی، میں ہوں لاڈلی اس کی گودوں پلی ہوں
اگرچہ ہر اک گام پر ڈگمگاتی، میں ہر لحظہ پردیس کو جا رہی ہوں
یہ اونچے پہاڑوں کے منڈل جہاں گھاٹیوں گھاٹیاں جھانکتی ہیں صدائیں
جہاں کھائیوں کھائیوں گونجتی ہیں چٹانوں سے ٹکرا کے رمتی ہوائیں
وہاں گنگناتی ہوئی اپنے من بھاتے نغموں کو میں چھوڑتی جا رہی ہوں
اب تک جوان کوہساروں میں گونجیں وہ جادو بھرے بول بکھرا رہی ہوں
کہ نغمے ہیں میرے محبت کے نغمے ترانے محبت کے شیریں ترانے
کبھی بزم کی سحر زا داستانیں، کبھی رزم کے روح پرور فسانے

مجھے یاد آئیں گے خوابوں میں اکثر
اٹھائے نمک[3] اپنے شانوں پہ راہی
اور ان سے زیادہ غزائے وطن میں
دل و جاں فدا کرنے والے سپاہی!
غزائے وطن میں ..... دل و جاں
..... فدا کرنے والے سپاہی!

پہلی آواز :۔

اُدھر اُس سمت
طوفانِ ضیا ـــــ
دیکھو!

---

[1] پہاڑوں پر پتھروں کا لڑھکنا ایک عام منظر ہے [2] بعض وحشی قبائل میں قہرت، وہ عورت خنجر ہاتھ میں لے کر موت کا ناچ ناچتی ہے۔ اور بالآخر خنجر کو اپنے برہنہ سینے میں پیوست کر لیتی ہے۔

[1] سیب سے ملتا جلتا چھوٹا سا پھل [2] چیل کے درخت کے باریک لانبے لانبے پتوں کی طرف اشارہ ہے [3] دور سے آنے والے کشمیری مسافر سے عموماً اپنے شانوں پہ نمک اٹھائے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

رازداں

(ایک تصور)

عبدالحمید عدم

فضا پیما پرندوں ہی کو ہے معلوم اے ہمدم!
کہ دریا پار اس گنجان جنگل کی فضاؤں میں
سرود آگیں بہاروں میں طرب افزا ہواؤں میں
طیورِ عام ناآگاہ کی شیریں نواؤں میں
جنہیں کہتے ہیں حورانِ جناں ان فاختاؤں میں
غزالوں کے لباسوں میں، درختوں کی قباؤں میں
اندھیری رات کے خلق ملائم کی ضیاؤں میں
خلوصِ نکہتِ معصوم کی سادہ دعاؤں میں
مقدس جگنوؤں کی جاگتی سوتی اداؤں میں
وہ ہستی کون ہے جس کا عمل بیدار ہوتا ہے،
یہ اس کے یار ہوتے ہیں، وہ ان کا یار ہوتا ہے

یہ دھرتی کے سفیروں ہی کو ہے معلوم اے ہمدم!
یہ اُڑتے رنگ، پاکستان کے پرچم کی صورت ہیں
یہ افسانوں کے خالق ہیں، یہ معمارِ حقیقت ہیں
یہ سیاحانِ دشتِ دوجہاں، اذنِ مشیت ہیں
یہ موسیقی کے داتا ہیں، یہ رنگوں کی کرامت ہیں
یہ بنجارے عظیم الشان خوابوں کی ملاوت ہیں
یہ پیغاموں کے دفتر ہیں، یہ الہاموں کی آیت ہیں
سبک اندام ہیں، خوش صورت ہیں، رنگِ لطافت ہیں
یہ سرتاپا قلندر ہیں، یہ سرتاپا طہارت ہیں
انہیں بخشا گیا ہے فرض ہر گلشن میں جلنے کا
اور ان کی رسم ہوتی ہے باغوں کے احوال لانے کا

فضائی شہسواروں ہی کو ہے معلوم اے ہمدم!
تجھے یا مجھ کو اس کی واقفیت ہو نہیں سکتی
ہماری آگہی میں اتنی وسعت ہو نہیں سکتی
تری کشتی پر پروازِ نکہت ہو نہیں سکتی
مری ہستی میں وہ شانِ جسارت ہو نہیں سکتی
نظر اوج آشنائے بامِ رفعت ہو نہیں سکتی
زمیں کی سوچ گردوں کی فراست ہو نہیں سکتی
ہماری عقل میں اتنی بصیرت ہو نہیں سکتی
ہوائے شوق، مانوسِ اقامت ہو نہیں سکتی
سعادت اُڑنے والی قوتوں کا ساتھ دیتی ہے
محبت بجلیوں کے ہاتھ اپنا ہاتھ دیتی ہے

یہ ان روشن ضمیروں ہی کو ہے معلوم اے ہمدم!
یہ طائر کلفت و راحت میں صبح و شام کرتے ہیں
سحر پر تولتے ہیں، رات کو آرام کرتے ہیں
سخن سنتے ہیں، سر دھنتے ہیں استفہام کرتے ہیں
پیامی ہیں، اکٹھے نامہ و پیغام کرتے ہیں
تمیز ہر زہ و افسانہ و الہام کرتے ہیں
پرندے ہیں جو صیادوں کو زیرِ دام کرتے ہیں
مسیحا ہیں، یہ جبریلِ امیں کا کام کرتے ہیں
یہ نورانی پیمبر روشنی کو عام کرتے ہیں
عیاں ہے ان کی آنکھوں پر کہ سب قوموں کی تقدیریں
ہیں کس کی دانشِ بیدار کی دھندلی سی تصویریں

یہ ان براق روحوں ہی کو ہے معلوم اے ہمدم!
یتیموں، عاجزوں، بیواؤں کو کس نے ابھارا ہے؟
شعورِ زندگی کی زلف کو کس نے سنوارا ہے؟
وہ طوفاں کون ہے جو ہر سفینے کا سہارا ہے؟
وہ تنکا جس کی ہیبت سے ہمالہ پارا پارا ہے؟
جو عزمِ ایزدی کا نو تراشیدہ ستارا ہے
جو رستہ ہے، جو منزل ہے، جو کشتی ہے، جو دھارا ہے
وہ مردِ راہ اس کردار کا روشن شرارا ہے
جسے تاریخ کے گہرے اندھیروں نے پکارا ہے
مٹا کر اس نے خود کو قوم کو جینا سکھایا ہے
شکستہ استخواں ملاح نے ساحل دکھایا ہے

یہ ان زندہ شراروں ہی کو ہے معلوم اے ہمدم!
کہ کس کس ملک کی سچی دعائیں اڑ کے آتی ہیں؟
کہ کس کس باغ کی ٹھنڈی ہوائیں اڑ کے آتی ہیں؟
گھٹائیں اڑ کے آتی ہیں، نوائیں اڑ کے آتی ہیں
ادب کے پھول لیکر التجائیں اڑ کے آتی ہیں
عقیدت کے نگاروں کی قبائیں اڑ کے آتی ہیں
خموشی کے جھروکے سے صدائیں اڑ کے آتی ہیں
محبت کی تڑپتی مامتائیں اڑ کے آتی ہیں
سویرے سجدہ کرتے ہیں ضیائیں اڑ کے آتی ہیں
کہ صرف اک دم کی خاطر زندۂ جاوید ہو جائیں
اجازت لیکے اس درگاہ کے خورشید ہو جائیں

یہ ان گردش شعاروں ہی کو ہے معلوم اے ہمدم!
کہ دنیا کے عوام الناس کیا محسوس کرتے ہیں؟
اکابر کس بشر کو رہنما محسوس کرتے ہیں؟
قلندر کس غنی کو کبریا محسوس کرتے ہیں؟
ستارے کس کو لافانی ضیا محسوس کرتے ہیں؟
کسے اہلِ نظر ظلِّ ہما محسوس کرتے ہیں؟
کسے اہلِ خرد لاانتہا محسوس کرتے ہیں؟
حدودِ آب و گل سے ماورا محسوس کرتے ہیں؟
عروجِ آدمیت کا دیا محسوس کرتے ہیں؟
گل و لالہ ہیں قرباں کس کے سانسوں کی طلاوت پر؟
سمندر بوسہ زن ہے کس کے خوابوں کی صداقت پر؟

یہ ان روشن ستاروں ہی کو ہے معلوم اے ہمدم!
کہ قریہ قریہ، بستی بستی کس کا ذکر جاری ہے؟
کہاں عہدِ کہولت ہے، کہاں فصلِ بہاری ہے؟
کہاں شاداب کاری ہے، کہاں سینہ فگاری ہے؟
کہاں انسانیت کے عدل کا افسون طاری ہے؟
محبت شادکامی ہے، تعصب خام کاری ہے
زمیں بنجر بھی ہو تو خلق، روحِ آبیاری ہے
محبت کی شریعت کتنی روشن کتنی پیاری ہے
ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ سب دنیا ہماری ہے
ہمارے بازوؤں نے اک نیا سنسار ڈھالا ہے
جہاں کی صبحِ اوّل آدمیت کا اجالا ہے

فضا کے تاجداروں ہی کو ہے معلوم اے ہمدم!
کہ پاکستاں کے بانی مردمانِ پاک ہیں کتنے
جنونِ عشقِ ملت سے گریباں چاک ہیں کتنے
زبوں فرعون ان سے اور نخلِ سفاک ہیں کتنے
جنوں آشفتہ و آتش زن و ادراک ہیں کتنے
یہ مردانِ مشیت در بغل بے باک ہیں کتنے
بھڑک اٹھیں تو پروانے قیامت ناک ہیں کتنے
تجھے کیا علم ان کے پاؤں میں افلاک ہیں کتنے
فلک کو روندنے والے بزیرِ خاک ہیں کتنے
مزارِ قائدِ اعظمؒ ہر اک ملت کی دولت ہے
کہ اس زرخیز مٹی میں خمیرِ آدمیت ہے

قافلۂ بیدار

محشر بدایونی

اُٹھی اُفق سے شعاعِ حسیں سنورتی ہوئی
نگارِ صبحِ وطن کو سلام کرتی ہوئی

ہوئی شب اپنے اندھیرے سمیٹ کر رخصت
طلوعِ مہر کی شعلہ وری سے ڈرتی ہوئی

سحر نے وقت کے آئین ہی بدل ڈالے
وہ رسمیں اُٹھ گئیں سب تھیں جو شب کی برتی ہوئی

عجب قرینے سے آئی عروسِ صبحِ طرب
خود اپنے حسن، خود اپنی ادا پہ مرتی ہوئی

چمن میں چلنے لگی بادِ سلسبیل خرام
قدم قدم پہ سنبھلتی ہوئی ٹھہرتی ہوئی

گذر رہی ہے صبا پھول پھول کو چھوکر
طلب کی آتشِ سوزاں کو تیز کرتی ہوئی

حریفِ جلوۂ بامِ فلک ہے ارضِ حیات
فروغِ روشنی وقت سے نکھرتی ہوئی

نصیب سبزۂ پامال کو جگانے لگی
سرشتِ موسمِ نامہرباں سنورتی ہوئی

بڑھی شباب میں ڈھل کر سحر کی رقاصہ
فضا میں نغمگی و رنگ و نور بھرتی ہوئی

نظر فروزِ تخیل نکھار ہے کتنی
شفق کی دھوپ سرِ شاخسار اترتی ہوئی

سمیٹے لیتے ہیں دامن میں تشنگانِ بہار
متاعِ جلوہ سرِ گلستاں بکھرتی ہوئی

وصال و ہجر کی لذت سے کر رہی ہے قریب
بہار آتی ہوئی اور خزاں گذرتی ہوئی

جواں لہو رگِ ہر گل کو کر رہی ہے عطا
روش روش سے نئی زندگی اُبھرتی ہوئی

رواں دواں کن ارادوں سے ہے کسے معلوم
گلوں کے سائے میں دیوانگی بپھرتی ہوئی

جو دورِ شب تھا وہ تا ختمِ شب فنا نہ ہوا
سحر ہوئی کہ ادھر قافلہ روانہ ہوا

دلوں میں برق صفت حوصلے مچلنے لگے
کہ جسم و روح بھی سوزِ طلب سے جلنے لگے

جنوں کی راہ گزاروں میں عشق کے راہی
ہر ایک پیچ و خم راہ پر سنبھلنے لگے

نئی اُمید کی منزل سے روشنی اُبھری
اندھیرے یاس کے اب تک جو تھے وہ ڈھلنے لگے

نفس نفس میں لئے جوشِ اہلِ شوق بڑھے
یہ دیکھتے ہی ہواؤں کے رُخ بدلنے لگے

نظامِ نو کے افق سے نئی کرن پھوٹی
پرانے جادوں سے جادے نئے نکلنے لگے

حق آشناؤں کی شعلہ فشاں صداؤں سے
ستمگروں کے بھی سنگین دل پگھلنے لگے

بیاد رفتگاں

سعادت حسن منٹو

چراغ حسن حسرت

کیسے کیسے لوگ !

استاد بندو خاں

بلبل چودھری

قومی تحریک کے چند اکابر

اقبال

قائد اعظم

سید احمد خاں

محسن الملک

لیاقت علی خاں

مولانا حالی

مولانا شوکت علی

حکیم اجمل خاں

مولانا محمد علی

بہادر یار جنگ

سید حسین بلگرامی

شیخ عبدالقادر

ہے زندگی ہمہ رعنائی و ہمہ جلوہ — فضا نے روپ اُبھارا غبار ڈھلنے لگے
گدازِ عزم و یقیں نے اثر کیا ایسا — تمام حلقۂ زنجیرِ ظلم گلنے لگے
ہزار کانٹوں میں اُلجھے تھے لیکن اہلِ سفر — مسرتِ سفرِ شوق سے بہلنے لگے
یہ سوچ کر کہ قریب آ رہی ہے اب منزل — جو سرنگوں تھے وہی سر اٹھا کے چلنے لگے
کچھ ایسی تیز ہوئیں سرخرو تمنائیں — رگوں میں جیسے جوانی کا خوں اچھلنے لگے
مسافروں کو جو دیکھا بہ شوق بڑھتے ہوئے — تو ذرے خاک کے تابانیاں اگلنے لگے
کچھ اس فروغ سے آیا خیال منزل کا — سیاہ خانے میں جیسے چراغ جلنے لگے
وہ وقت آیا کہ خود قافلے کی راہوں سے — مصائب و غم و آلام بچ کے چلنے لگے

تمام حادثے پیچھے کو ہٹتے جاتے ہیں
طویل فاصلے خود ہی سمٹتے جاتے ہیں

بجا کہ دشت و چمن ان کے اختیار میں ہیں — ابھی یہ راہی کسی اور انتظار میں ہیں
انہیں بھی کرنا ہے اک روز آشکارِ چمن — کئی چھپے ہوئے جلوے ابھی بہار میں ہیں
ابھی بہت ہیں مرادوں کے نو بنو عالم — جو سامنے نہیں اور چشمِ اعتبار میں ہیں
بہت سی منزلیں معلوم ہو چکی ہیں مگر — بہت سی منزلیں پنہاں ابھی غبار میں ہیں
ابھی تو سیکڑوں رعنائیاں بہشت نگاہ — حجابِ پیرہنِ صبحِ زرنگار میں ہیں
مہ و نجوم سے بڑھ کر بھی ہیں بہت انوار — مہ و نجوم کے انوار کس شمار میں ہیں
ان الجھنوں میں جو ہیں کچھ انہیں کا دل جانے — کس آرزو و تمنا کے خارزار میں ہیں
ہزار آفتِ دوراں سے بے نیاز سہی — بہت کچھ اُلجھے ہوئے فکرِ روزگار میں ہیں
کبھی کبھی تو یہ عالم بھی ان پہ گذرا ہے — نہ گھر نہ دشت نہ منزل نہ رہگزار میں ہیں
بس ایک دھن میں چلے جا رہے ہیں دیوانے — کہاں یہ ہوش ہے ان کو کہ کس دیار میں ہیں
نہیں ہے کچھ انہیں ہستی و نیستی کا خطر — یہ اک مقامِ جنونِ خرد شکار میں ہیں
یہ اور بات کہ غم کا اثر نہ لیں دل پر — یہ واقعہ ہے کہ دورِ غم آشکار میں ہیں
گزرنا ہوگا ابھی کتنے عرصۂ غم سے — غلط ہے یہ کہ ابھی دورِ خوشگوار میں ہیں
یہ بے قراری ہی عینِ قرار ہے ان کو — نہ ہوں گے اور نہ ابھی منزلِ قرار میں ہیں

ابھی تو راہ کی گرد آن کے رخ کا غازہ ہے
ابھی مذاقِ غمِ عشق تازہ تازہ ہے

طلوعِ صبحِ بہار

مترجمہ مقبول احمد سعید

کشمیر کے نامور شاعر مہجور کی مشہور نظم "طلوعِ صبحِ بہار" نے تحریکِ آزادی کی جدوجہد میں، محبانِ قوم کے سینے کی حرارت کو شعلہ زن رکھنے میں بڑی مدد کی ہے۔ (مدیر)

سیاہی شبِ ہجراں کا زور ٹوٹ گیا
افق سے جھانک رہی ہے نگارِ صبحِ وصال
قدم قدم پہ ہیں لالے کی مشعلیں روشن
نظر نظر سے عیاں ہے سکون و صبر و قرار
چمن کا دامنِ صد رنگ ہے بہارِ نظر!

★

روش روش پہ کھلے ہیں کنول محبت کے
سنا ہے سیرِ گل و لالہ کے بہانے سے
ہماری دید کو آئے گی وہ بہارِ خیال!
مہک اٹھی ہے ہجومِ بوئے وفا سے وادیٔ دل

★

مٹا چکے ہیں دلوں سے غبارِ جورِ خزاں
فسانۂ شبِ ہجراں بھی لوگ بھول گئے
کچھ اس طرح سے ہوئی ہے طلوعِ صبحِ بہار

منزل بمنزل

کسی غیر معمولی شکست و ریخت کے بعد سیاسی و تہذیبی میلانات کہیں برسوں میں جاکر واضح صورت اختیار کرتے ہیں۔ جبکہ زندگی ایک نئے، ان دیکھے راستے پر رواں ہو، نہیں کہا جا سکتا کہ وہ آخر کیا رُخ اختیار کرے گی۔ ہر طرح کے خارجی و داخلی عوامل اس پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں اور زندگی آہستہ آہستہ کسی نئے سانچے میں ڈھلتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ نمایاں خد و خال پیدا کر لیتی ہے۔

اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ پاکستان کا قیام دورِ جدید کی تاریخ کا ایک مہتم بالشان واقعہ ہے جس نے برصغیر کی تاریخ کا رخ ہی بدل دیا۔ قدرتی طور پر ابتدا میں قومی زندگی کا کوئی پہلو بھی واضح نہ تھا۔ کیونکہ ابھی تو محض اس کی داغ بیل ہی پڑی تھی۔ اس کا آئین، اس کا سیاسی مسلک، اس کی تہذیبی ہیئت کیا ہوگی! ان کے متعلق زیادہ سے زیادہ قیاس آرائی ہی کی جا سکتی تھی۔ اس کے ذہنی میلانات و عواطف کا مرتب ہونا تمام تر مستقبل پر موقوف تھا، جس کی ہم کچھ جھلکیاں ہی دیکھ سکتے تھے۔ جو کچھ ہمارے پیش نظر تھا وہ محض دھندلے دھندلے امکانات تھے۔ ان کا بدیہی طور پر جلوہ گر ہونا حالات پر موقوف تھا۔ بلکہ پاکستان کی تو پیدائش ہی طوفانوں کے سایہ میں ہوئی تھی۔ اور سب سے یہ کہنا ہی مشکل تھا کہ یہ نوزائیدہ مملکت طوفانِ حوادث اور زمانے کی بے پناہ چیرہ دستیوں کے ہاتھوں جاں بر بھی ہو سکے گی یا نہیں۔ لیکن وہ زبردست روح جو پاکستان کے وجود میں آنے کا باعث ہوئی تھی، اس کی بقائے دوام کا باعث بھی ہوئی۔ اور یہ ہماری تو غیر ملت کی جبلّی توانائی اور جد و جہد ہی کا نتیجہ ہے کہ آج بھی (شہید ملت لیاقت علی خاں مرحوم کے الفاظ میں) مملکتِ پاکستان چٹان کی طرح مضبوط ہے اور ہم نہ صرف آزاد ہیں، بلکہ اپنے راستے پر پہلے سے زیادہ مضبوطی سے قدم جمائے ہوئے ہیں۔

ہماری بقا کا حقیقی اعتبار اس روح یا نصب العین کی بقا سے ہے جس کے ہم علمبردار ہیں اور جس کے لئے پاکستان وجود میں آیا۔ اگر یہ روح، یہ نصب العین زندہ ہے اور ہماری زندگی میں پوری طرح کارفرما ہے تو پاکستان کے زندہ رہنے میں کوئی شبہ نہیں۔ یہی بات ہمارے لئے سب سے زیادہ موجبِ تشفی ہے کہ مشرقی پاکستان ہو یا مغربی پاکستان، اس سرودِ باقی کا زیر و بم ہمیں ہر کہیں سنائی دیتا ہے۔

بیدار قومیں کبھی اپنے کارناموں سے مطمئن نہیں ہوتیں۔ اکثر صورتوں میں ایسی طمانیت کوتاہ نظری کی دلیل ہوتی ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم اپنی ہشت سالہ رفتارِ ترقی سے مطمئن ہیں۔ ہمارے بہت سے ولولے ابھی تشنۂ تکمیل ہیں۔ اور ہمیں اپنی آزادی کی آٹھویں سالگرہ مناتے وقت ایک طرح کا احساسِ ناتمامی بھی ہے لیکن یہی ایک واقعہ کہ ہم آج یہ دن منا رہے ہیں اور آئندہ ایسے بیشمار دن منانے کا یقین رکھتے ہیں، کچھ معنی ضرور رکھتا ہے۔ ہمارے دوست اور دشمن یکساں اس بات کے معترف ہیں کہ آج پاکستان پہلے سے کہیں زیادہ استوار ہے۔ ہماری دفاعی قوتیں بفضلِ خدا برابر فروغ پذیر ہی ہیں۔ ہماری ہوائی فوج اپنی تنظیم اور معیارِ تربیت کے لحاظ سے دنیا کی بہترین ہوائی فوجوں کی ہم دوش ہے۔ ہمارا بحریہ گزشتہ دنوں اپنے طویل دورہ میں کئی دوستانہ ممالک سے خراجِ تحسین لے چکا ہے۔ اور ہماری بری فوجوں نے اپنی کارکردگی کے مظاہروں میں دوسرے ملکوں کے ماہرین کی موجودگی میں اپنے اعلیٰ معیار کا سکہ بٹھا دیا۔

پاکستان بنیادی طور پر ایک زراعتی ملک تھا۔ مگر چند ہی سال کی صنعتی ترقی کی بنا پر ایک صنعتی ملک شمار ہونے لگا ہے۔ صنعتی ترقی کے لئے وسیع تجربہ، وافر سرمایہ، شبانہ روز محنت، بین الاقوامی تعاون، تفصیلی منصوبہ بندی۔ غرض کتنے ہی لوازم تھے جن کا بیک وقت میسر آنا اس نوزائیدہ مملکت کے لئے اس افراتفری کے زمانہ میں محال نظر آتا تھا، اس نے اپنی صنعتی نشو و نما کا آغاز ایک وسیع خلا میں محض حوصلے کی مدد سے کیا۔ آج جب ہم گزشتہ آٹھ سال کے مجموعی نتائج پر نظر

ڈالتے ہیں تو ہمیں صنعتی نشو و نما کا نہایت دلکش منظر دکھائی دیتا ہے جو روز بروز وسعت پذیر ہے۔

اس وقت ہماری صنعتی ترقی کی مجمل کیفیت یہ ہے کہ پاکستان موٹے اور درمیانی درجے کے سوتی پارچات میں بڑی تیزی سے خودکفیل بنتا جا رہا ہے۔ جہاں ۱۹۴۸ء میں صرف تقریباً دو لاکھ تکلے اور ۵ ہزار کرگھے نصب تھے، وہاں آج تقریباً ۱۲ لاکھ ۶۱ ہزار تکلے اور ۲۲ ہزار کرگھے نصب ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اعلیٰ درجے کے کپڑے، رنگائی اور چھپائی پر بھی بیش از بیش توجہ دی جا رہی ہے۔ اعلیٰ قسم کے پٹ سن کی ۷۰ فیصدی پیداوار پاکستان ہی میں ہوتی ہے۔ مگر تقسیم کے وقت پاکستان میں ایک جیوٹ مل بھی نہ تھی۔ اس وقت آٹھ ملیں زور شور سے کام کر رہی ہیں۔ ششش سالہ ترقیاتی منصوبہ (جولائی ۵۱ء لغایت جون ۵۷ء) کے مطابق ۶ سال کے اندر اندر ۶۰۰۰ کرگھوں کا نصب کرنا طے پایا تھا لیکن یہ مرحلہ ۲½ سال پہلے ہی طے ہو گیا۔ یہ کرگھے پٹ سن کی ۲ لاکھ ٹن کی مصنوعات تیار کرتے ہیں جن کی قیمت ۲۲ کروڑ روپے ہے۔ ۵۰۰۰، مزید کرگھوں کے اضافہ کا منصوبہ تقریباً مکمل ہو چکا ہے۔ پاکستان انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن کو بطور خاص جیوٹ انڈسٹری کو ترقی دینے کا کام سپرد کیا گیا ہے اور وہ اس پر اپنی پوری توجہ مبذول کر رہی ہے۔ اس وقت پاکستان اپنی ضروریات سے ۴۰ ہزار ٹن زیادہ مال تیار کر رہا ہے، جس کی قیمت ۴ کروڑ روپے ہے، اور اس کو بیرونی ممالک میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۵۴ء میں پٹ سن کی ۱۱ ہزار ٹن مصنوعات برآمد کی گئیں۔

پاکستان میں اون کی پیداوار بھی کافی کثیر ہے۔ اور ہم اونی کپڑے کی پیداوار میں بھی بہ آسانی خودکفیل ہو سکتے ہیں۔ اس وقت موٹے قسم کا اونی کپڑا لائق ضرورت پیدا ہو رہا ہے۔ اس سلسلہ میں جو تدابیر اختیار کی گئی ہیں ان کے پوری طرح عمل میں آنے پر امید ہے کہ ہم اعلیٰ قسم کا اونی سامان بھی حسب ضرورت پیدا کر سکیں گے۔

کاغذ کی مختلف اقسام کی تیاری ایک اور دلپذیر کارنامہ ہے۔ کرنافلی پیپر ملز کی بدولت آج پاکستان کاغذ کی اکثر اقسام میں خودکفیل ہو چکا ہے، جس سے بیرونی زرمبادلہ میں ۳ کروڑ روپے سالانہ کے بقدر بچت ہو گئی ہے۔ نوشہرہ اور راہوالی میں بھی گتے اور دفتی کے کارخانے قائم کئے گئے ہیں جو جاری ہونے پر پاکستان کو کاغذ کی کم بیش جملہ ضروریات میں خودکفیل بنا دینگے۔ اخباری کاغذ تیار کرنے کے سلسلہ میں بھی تحقیق جاری ہے اور بعض اہم اقدامات کئے گئے ہیں۔

جہاں تک شکر سازی کا تعلق ہے۔ مردان، جوہرآباد اور لیہ کے کارخانوں کا نام لے دینا ہی کافی ہے۔ اب چارسدہ (سرحد) اور رنگ پور (مشرقی پاکستان) میں بھی کارخانے قائم کئے جا رہے ہیں۔ اور ٹنڈو آدم (سندھ) میں گنے کی پیداوار بڑھانے کے لئے وسیع فارم بنائے جا رہے ہیں۔

سیمنٹ میں ہم فی الحال خودکفیل نہیں۔ لیکن حیدرآباد اور داؤد خیل کی سیمنٹ فیکٹریوں کے مکمل ہونے پر صورت حال بہت بہتر ہو جائے گی۔

جہاز سازی کا اہتمام ایک اور بڑا کارنامہ ہے۔ پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی نے جہازوں کی مرمت اور تعمیر کے لئے کراچی میں گودیاں بنانے کا کام جاری کیا ہے جو اس سال کے آخر تک امید ہے مکمل ہو جائے گا۔ اس سے نہ صرف زرمبادلہ میں بچت ہوگی، بلکہ کافی آمدنی بھی ہو سکے گی۔ اُدھر کھلنا میں بھی جہازوں کی مرمت کے لئے ایک گودی تعمیر کرنے کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔

ہماری صنعتی ترقی کی حکایت اتنی لذیذ ہے کہ اسے دراز تر کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن ان چند اوراق میں جملہ صنعتوں کا نام گنوانا بھی محال ہے۔ انہی چند صنعتوں پر اکتفا کرتے ہوئے ہم اس عظیم الشان صنعتی ادارے کی طرف رجوع کرتے ہیں جس کو ہمارے صنعتی دور کا پیش خیمہ کہنا چاہئے یعنی "پاکستان انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن"۔ اس ادارہ نے جنوری ۱۹۵۲ء میں اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا تھا، اور اس وقت ۳۰ صنعتی منصوبوں کی تکمیل میں لگا ہوا ہے، جن پر تقریباً ۸۸ کروڑ ۲۰ لاکھ روپے صرف آئیں گے۔ یہ ۳۰ منصوبے ۱۹۵۵ء کے اختتام تک مکمل ہو جائیں گے ان سے بیرونی زرمبادلہ میں ۴۰ کروڑ روپے کی بچت ہوگی اور ایک لاکھ لوگوں کو روزگار ملیگا۔ اب تک کارپوریشن کے پندرہ منصوبے مکمل ہو چکے ہیں۔

اس حوصلہ افزا کامیابی کے بعد کارپوریشن نے سترہ اور صنعتی منصوبے، جن پر ۶۵ کروڑ روپے کی لاگت آئے گی، اپنے پروگرام میں شامل کر لئے ہیں، جن میں سوئی گیس کی توسیع بھی ہے۔ ان منصوبوں کی تکمیل کا کام ۱۹۵۵ء میں جاری ہو جائے گا۔ حکومت نے کارپوریشن کے متنوع کاموں کے لئے ۵۶-۱۹۵۵ء کے میزانیہ میں ۱۵ کروڑ روپے سے زیادہ رقم دینی منظور کی ہے۔

عمومی ترقیاتی منصوبوں کی داستان بھی کچھ کم دلچسپ نہیں۔ تقسیم کے وقت زندگی کے تقریباً ہر شعبہ میں نئے سرے سے آغاز سفر کی ضرورت تھی۔ اب بجلی اور پن بجلی پہلے سے کئی گنا زیادہ مقدار میں مہیا کی جا رہی ہے۔

ابتدا میں ہمارے یہاں کل گرم آبی (تھرمل) قوت تقریباً ۷۶ ہزار کلوواٹ تھی آج اس کی مقدار ۲ لاکھ کلوواٹ ہے۔ برق آبی قوت پہلے ۱۰ ہزار کلوواٹ تھی اور وہ بھی صرف مالاکنڈ میں؛ اب یہ ۶۲ ہزار کلوواٹ ہے اور ابھی ان نئے منصوبوں کی بدولت غیر معمولی اضافہ ہونے والا ہے۔ سوئی (بلوچستان) میں گیس کے ذخیرے

کی دریافت ایک نہایت اہم واقعہ ہے جس کا پاکستان کی اقتصادیات پر دور رس اثر پڑے گا۔ بلوچستان سے لے کر کراچی تک تمام علاقے میں صنعتی ضروریات کے علاوہ ارزاں نرخ پر خانگی ضروریات بھی پوری ہو سکیں گی۔ یہ ذخیرہ اتنا وسیع ہے کہ اس سے ساٹھ سال تک دس کروڑ مکعب فٹ گیس روزانہ بہم پہنچائی جا سکے گی۔ اب تک آبپاشی کے کوئی پندرہ اہم منصوبے اختیار کئے گئے ہیں۔ ان میں سے "غلام محمد بیراج" مکمل ہو چکا ہے اور نہروں کی کھدائی جاری ہے۔ بقیہ منصوبے تکمیل کے مختلف مدارج میں ہیں۔ ان میں تھل پروجیکٹ، تونسہ پروجیکٹ، خرم گڑھی ویئر، وارسک گندو بیراج "سیلابہ" اور گنگا کا بوڈ ک شامل ہیں۔ ان منصوبوں پر ۵۷۶ کروڑ روپے کی لاگت کا اندازہ ہے۔ اور جو نہریں جاری ہوں گی ان سے ۱۰۷ کروڑ ایکڑ زمین سیراب ہوگی۔ بلوچستان کے دو منصوبے بھی پایۂ تکمیل تک پہنچ چکے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں ایک اور عظیم الشان منصوبہ "تستا بیراج" بھی زیر نظر ہے جس پر ۹ کروڑ دس لاکھ روپے خرچ آئیں گے۔ دس لاکھ ایکڑ سے زیادہ رقبہ سیراب ہوگا اور ۱/۲ ۳ لاکھ ٹن اناج پیدا ہوگا۔

رسل و رسائل میں جہاں ریلوں، شاہراہوں، سڑکوں، دریائی راستوں اور بندرگاہوں میں نمایاں ترقیاں ہوئی ہیں، وہاں شہری پرواز میں بھی غیر معمولی ترقی ہوئی ہے۔ اس سلسلہ میں ہماری پہلی قومی ہوائی سروس "پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز" کا ذکر لازمی ہے۔ یہ سروس ۱۹۵۴ء میں قائم ہوئی اور اس کا شمار دنیا کی بہترین ہوائی سروسوں میں ہے۔

مہاجرین کی بحالی ایک ضروری مگر بہت کڑا کام تھا اور آج بھی ایک صبر آزما مسئلہ ہے۔ کیونکہ پاکستان کی تقریباً ۱/۱۰ آبادی مہاجرین پر مشتمل ہے۔ کاشتکاروں اور کاریگروں کو بحال کرنے کے لئے مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے مالی اعانت، الاٹمنٹوں، نئی بستیوں اور متروکہ جائیداد منقولہ و غیر منقولہ کے سلسلہ میں آئینی امداد کی شکل میں متعدد تدبیریں کی ہیں۔ اس سلسلہ میں "ریفیوجیز ری ہیبلیٹیشن فنانس کارپوریشن" کی کارگزاری ایک مثالی حیثیت رکھتی ہے۔

پاکستان نے گزشتہ آٹھ سالوں کی مختصر مدت میں دیگر سرکردہ ممالک سے بالعموم اور دنیائے اسلام کے ساتھ بالخصوص جو قریبی روابط پیدا کئے ہیں وہ ہمارے عہدِ نامہ کی مختصر تاریخ کا ایک روشن باب ہیں۔ کراچی میں ممالک اسلامی کے نوجوانوں کی کانفرنس ایک بارونق اور مفید تقریب تھی۔ اس وقت دنیا کے متعدد ممالک کے ساتھ پاکستان کے سفارتی تعلقات قائم ہیں۔ بین الاقوامی کانفرنسوں میں ہمارے ملک نے نمایاں طور سے شرکت کی اور اہم مذاکرات میں حصہ لیا۔ حالیہ بانڈونگ کانفرنس میں وزیر اعظم محمد علی صاحب کے تجویز کردہ امن عالم کے سات اصول بالاتفاق منظور ہوئے، اور دنیا کے پریس میں ان کو سراہا گیا۔ ان اصول کا تسلیم کیا جانا بڑی نیک فال ہے، امید ہے ہمارے بعض الجھے ہوئے مسائل کا حل بھی آسان ہو جاتا ہے۔

کشمیر کا سوال ہماری قومی ناموس اور انسانیت کے بنیادی حقوق کا سوال ہے۔ ہم نے اس کے لئے برابر اخلاقی و آئینی ہر طرح سے جد و جہد کی ہے اور برابر کوشاں رہیں گے۔ حتّٰی کہ ہمارے کشمیری بھائی اپنا فطری حق خود اختیاری حاصل کر لیں۔ اس سلسلہ میں پاکستان کی تحریک اور کوشش سے چند مذاکرات ہوئے اور عنقریب پھر ہمارے اور انڈیا کے وزرائے اعلیٰ کی ملاقات کی توقع ہے۔ وزیر اعظم محمد علی صاحب نے اپنی نشری تقریر میں اعلان فرمایا کہ اگر متوقع مذاکرات کا حسب دلخواہ نتیجہ نہ نکلا تو پھر پاکستان کو پُر امن تصفیہ کے لئے اور ذرائع ڈھونڈنے پڑیں گے۔ پاکستان نے ایک طرف "سیاٹو" اور دوسری طرف ترکی و عراق کے عہد ناموں میں شریک ہو کر اپنی دفاعی حیثیت کو اور مضبوط کر لیا ہے اور اس سے بین الاقوامی مشترک دفاع کو بھی یقیناً بڑی تقویت پہنچی ہے۔ اس بات کا اعتراف بھی شرط ہے کہ ہم نے اپنے ہمدرد ممالک سے اپنی مادی ترقی کے سلسلہ میں وافر امداد حاصل کی۔ یہ ہماری سلامت روی مخلصانہ تعاون اور حسنِ تدبیر ہی کی بدولت ممکن ہو سکا۔

۱۹۵۴ء میں وفاقی پایۂ تخت کراچی کی یونیورسٹی قائم ہوئی جو پاکستان کی چھٹی یونیورسٹی ہے۔ پشاور یونیورسٹی نے بھی اس اثنا میں نمایاں ترقی کی اور اب وہاں ایک نہایت عمدہ سائنس کا شعبہ قائم ہو گیا ہے۔ شہروں کے علاوہ حکومت نے بلوچستان اور قبائلی علاقہ کی تعلیم پر بھی خاص طور سے زور دیا، جہاں بیسیوں نئے سکول قائم کئے گئے۔

آثارِ قدیمہ کی دریافت کے سلسلہ میں مینامتی (مشرقی بنگال) کی تازہ ترین کھدائیاں اور بلوچستان، سندھ، خیرپور، بہاولپور اور نواح کراچی کا جائزہ جو غیر ملکی ماہرین کی معیت میں مکمل کیا گیا، نہایت نتیجہ خیز ثابت ہوا۔

یہ ہماری ہمہ جہتی ترقی کے جستہ جستہ پہلو ہیں لیکن ان سے بھی اہم تر وہ پہلو ہے جو پاکستان کی سالمیت سے تعلق رکھتا ہے۔ ہمارا اشارہ اس فیصلہ کی طرف ہے کہ مغربی پاکستان کی عارضی حد بندیاں دور کر کے اس کو ایک وحدت بنا دیا جائے۔ ہم نے ایک ہی قوم کی حیثیت سے پرچم آزادی بلند کیا تھا اور آج بھی وحدت کے پرستار ہیں۔ ہماری نظر جو کل پاکستان کو ایک وحدت شمار کرتی ہے،

ایک خطہ میں مختلف وحدتوں کو قدرتاً تسلیم نہیں کرسکتی۔ تمام علاقائی امتیازات اور مقامی تفریقات سے ماورا یگانگت، جو کشمیر کی فلک بوس چوٹیوں سے لیکر سندھ کے ریگزاروں اور ساحلِ کراچی کی سرمست موجوں تک تمام خطے میں پائی جاتی ہے، یعنی سندھ کی وادیٔ کبیر، جو پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان وغیرہ میں خفیف امتیازات کے باوجود ایک ہی رنگ اور ایک ہی روپ رکھتی ہے اور جس کی زبانوں، باشندوں، سرگرمیوں، ہنگاموں، داستانوں اور مجموعی زندگی میں ایک بنیادی ہم آہنگی کارفرما ہے۔ اب ایک ہی صوبائی حکومت کے زیر اہتمام آجائے گی۔ یہ وحدت پہلے ہمارے شعور میں ایک زیریں احساس کے طور پر جاگزیں تھی، آج آٹھ سال کے طویل تجربہ کے بعد یہ ہمارے شعور کی سطح پر اُبھر آئی ہے اور ہم پورے ذوق و شوق اور غیر متزلزل عزم کے ساتھ اس کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں۔ یہ ہماری ہشت سالہ زندگی کا ایک اہم واقعہ اور ایک نئی ترقی کا نقطۂ آغاز ثابت ہوگا۔ ہمارا آٹھواں جشنِ استقلال اس لئے اور بھی مبارک ہے کہ یہ ہمیں اس وحدت کے ایک عملی حقیقت بننے کی نوید دے رہا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے اس ارشاد پر عمل کرتے ہوئے کہ ؎

بتانِ رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ ایرانی رہے باقی نہ تورانی نہ افغانی

ہم پنجابی، سندھی، پٹھان اور بلوچی کی تفریق کو مٹا کر ایک رشتہ میں منسلک ہونے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ اس طرح ہماری سالمیت کو اندرونی یا بیرونی ریشہ دوانیوں سے کوئی اندیشہ نہیں رہے گا۔ نیز پورے خطے کے مجموعی وسائل کو ملا کر ترقی کی رفتار تیز کی جا سکے گی۔

اس عرصہ میں اس لطیف عالمِ معنی — ادب و فن کی کیا کیفیت رہی؟

آجکل ادبی جمود کا بہت چرچا ہے۔ دراصل ادب دنیا کے کسی دور میں بھی بہت تیز گام نہیں رہا۔ ہر عہد کی یادگار صرف چند چوٹی کے کارنامے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں تعلیم ابھی تک محدود ہے۔ اور اسے خاطر خواہ وسعت دینے کیلئے برسوں کی محنت، بے اندازہ صرفہ، ساز و سامان، عمارات، کتابوں اور استادوں کی ضرورت ہے۔ جو رفتہ رفتہ ہی پوری ہوسکتی ہے۔ ان سب کوتاہیوں کے باوجود یہ کہنا غلط ہوگا کہ پاکستان نے کسی ذوقِ ادب کا ثبوت نہیں دیا۔ شیخ سعدی کا وہ مقولہ کہ "یاراں فراموش کردند عشق" یہاں صادق نہیں آتا۔ اگرچہ ہم نے خشک سالی، سیلاب، آفات، حتٰی کہ آشوبِ قیامت تک دیکھ لئے۔

یہاں ہمارا مقصد ادبی جائزہ پیش کرنا نہیں۔ دراصل اس کا حق آئندہ نسلیں ہی ادا کرسکیں گی، البتہ اس عمومی جائزہ کے ساتھ کچھ ثقافتی سرگرمیوں کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ملک میں فنونِ لطیفہ کے جو ادارے سرگرمِ عمل ہیں ان میں آرٹ کونسل لاہور، میو سکول آف آرٹس، لاہور، ڈھاکہ آرٹ سکول، آرٹ کونسل ڈھاکہ اور فوٹوگرافک سوسائٹی آف پاکستان کے علاوہ اب بلبل اکاڈمی آف فائن آرٹس کا بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ ان کی بدولت ملک میں فنونِ لطیفہ کا چرچا پہلے سے بڑھ گیا ہے۔ مصوروں کی تعداد اور ان کے اسالیب نہ صرف مشرق و مغرب کے جدید ترین فنی مشربوں کے جامع ہیں، بلکہ ان میں نئے نئے تجربوں اور ترکیبوں کا میلان نمایاں ہے۔ ڈھاکے کی عظیم الشان نقاشی کی نمائش کے علاوہ مختلف مصوروں کے انفرادی کام کی نمائشیں وقتاً فوقتاً منعقد ہوتی رہیں، جن میں تازہ ترین، کراچی میں زبیدہ آغا کی نمائش تھی جو جولائی ۱۹۵۵ء میں منعقد ہوئی۔ بعض پاکستانیوں نے بین الاقوامی مقابلوں میں انعامات بھی حاصل کئے۔ بلبل چودھری مرحوم کا فنِ رقص میں نئی روح پھونکنا، فوٹوگرافک سوسائٹی آف پاکستان کے کارنامے، فلموں کی طرف رجوع۔ یہ سب ایک حرکت اور بڑھتے ہوئے ذوق کی علامات ہیں۔ رفیق غزنوی نے سازینوں اور تعبیری یعنی (REPRESENTATIONAL) موسیقی کے جو نمونے پیش کئے ہیں، مثلاً "سناٹا" وہ اس فن میں ایک نئے تجرباتی میلان کی خبر دیتے ہیں۔ گویا ہم مشرقی و مغربی موسیقی کو آپس میں سمو کر اسے ایک نئی طرح دے رہے ہیں اور ترقی کا ایک نیا راستہ کھول رہے ہیں۔ ڈھاکہ میں رقص و موسیقی کا بین الاقوامی میلہ، جس میں متعدد قوموں کے نمائندوں نے شرکت کی، وسیع پیمانہ پر ثقافتی اختلاط کی تمہید ہے۔ مغربی پاکستان میں بھی یہی عمل جاری ہے۔ اور کچھ عجب نہیں کہ یہ خطہ مختلف تہذیبوں اور تمدنوں کی آماجگاہ ہونے کا روایتی منصب پھر ادا کرے۔ اور پہلے سے کہیں زیادہ وسیع پیمانہ پر۔

شعر و ادب اور صحافت بھی اس میلان سے بیگانہ نہیں رہے۔ انجمن ترقی اردو پاکستان، حلقۂ اربابِ ذوق، اکاڈمی پنجاب، اقبال اکاڈمی، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور اور سندھ ادبی بورڈ سب اپنے اپنے طور پر علم و ادب میں توسیع و ترقی کے نئے نئے طریقے اختیار کرنے میں سرگرم رہے ہیں۔ خصوصاً ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ نے اسلامی افکار کو نئے تحقیقی زاویۂ نگاہ سے پیش کر کے ایک نئی بصیرت پیدا کی ہے اور اخلاقی تصورات کو بہت کچھ اجالا ہے۔ انجمن ترقی اردو میں بابائے اردو مولوی عبدالحق اردو

لغات کے مسودات پر نظر ثانی کرنے میں مصروف ہیں جو اُن کے زیر نگرانی تیار کی گئی تھی۔ دوسرے اشاعتی اداروں نے بھی ادب و فن کی ترویج میں کسی نہ کسی حد تک حصہ لیا ہے۔ اخبارات، رسائل اور تصانیف کی تعداد روز افزوں ہے اور کاغذ سے بندشیں اٹھ جانے کے بعد اس میں بیش از بیش اضافے کی توقع ہے۔ بعض رسائل نے خاص خاص موضوعات پر ضخیم شمارے شائع کر کے بڑی مستحسن مثال قائم کی۔ بعض اداروں نے عکسی طباعت کے ذریعہ دلکش مصور جریدے شائع کرنے میں پیش قدمی کی ہے۔

ایک اہم اقدام جو قومی ثقافت سے گہرا تعلق رکھتا ہے، قومی ترانے کے نغمے اور نظم کا منظور کیا جانا تھا۔ ان دونوں سے اثر پذیر ہونے کے لئے عقیدت شرط ہے لیکن انہوں نے قدر داں دلوں کو فنی حیثیت سے مایوس نہیں کیا اور جوں جوں کان ان سے مانوس ہو رہے ہیں۔ ان کی مقبولیت بڑھتی جا رہی ہے۔

غنائیوں کی ترویج، طویل نظموں سے لگاؤ اور منظوم ڈراموں (پابند و آزاد) کا بڑھتا ہوا ذوق "دور پاکستان" کی امتیازی خصوصیت ہے۔ اس نئی راہ میں ترقی کا امکان بے پایاں ہے۔ ڈراموں کا شوق خصوصیت سے ترقی کر رہا ہے۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ان نظموں اور ڈراموں میں تکنیک، ہیئت اور محاکات کے نہایت وسیع تجربے کئے گئے ہیں۔ غزل نے بھی اپنی حدود میں، ترقی کی طرف قدم بڑھایا ہے۔

قیام پاکستان کا ایک لازمی نتیجہ یہ تھا کہ پاکستانی علاقے، ان کی زبانیں، ادب، قصص و حکایات اور رسم و رواج آپس میں اور شیر و شکر ہوں اور اردو نے بے تکلف علاقائی زبانوں کے الفاظ اور روایات کو جذب کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس اختلاط نے ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی ہے۔ جس کو ادارۂ مطبوعات پاکستان کی گوناگوں مطبوعات جن میں متعدد علاقائی اور بیرونی زبانوں کے رسائل بھی ہیں، کے ذریعے کافی فروغ ہوا۔ مستقل تصانیف میں علاقائی زبانوں کی مختصر تاریخیں بھی شامل ہیں، جن سے ان کی امتیازی خصوصیات کافی حد تک متعارف ہو جاتی ہیں۔ ایک طویل بنگلا ناول "عبداللہ" کا ترجمہ اردو میں کیا گیا ہے اور ڈاکٹر نذیر احمد کے مشہور ناول "توبۃ النصوح" کا ترجمہ بنگلا میں شائع ہو چکا ہے۔

مشرق و مغرب کی دوسری زبانوں سے شغف بھی بڑھ رہا ہے۔ محمد حسن عسکری، مسٹر ہادی حسین، اور دیگر مترجمین نے انگریزی سے جو تراجم کئے ہیں، وہ ہمیں نئے نئے تصورات سے روشناس کر رہے ہیں۔

افسانوں کی پیداوار کثیر ہے اور بہتر افسانے بھی کمتر سہی مگر نایاب نہیں۔ رپورتاژ خاص طور پر مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔

تنقید میں بھی نئے احساس، نئے نظریوں اور نئے طریقوں کو اپنانے کی کوشش جاری رہی ہے۔ محمد حسن عسکری خواہ ادب کی رفتار سے کتنے ہی مایوس ہوں، خود ان کی تحریروں نے ادبی شعور کو بیدار کرنے میں بڑا کام کیا اور ادبی مسائل کی طرف مفید طور پر توجہ دلائی۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے ایک مبسوط کتاب میں مقدمہ شعر و شاعری کو زیر بحث لا کر نئے سے حقائق کو اجالا ہے۔ تنقید کا ایک خالص پاکستانی نظریہ "مذاکروں" کی ترویج ہے جن میں ترقی کی بہت ضرورت اور گنجائش ہے۔

مغربی ادب کی تقلید کے ساتھ، اپنے کلاسکی ادب کی طرف بھی خصوصی رجحان نمایاں ہے۔ گزشتہ چند سال میں بعض شاعروں نے میرؔ کا دلچسپ طور پر تتبع کیا۔ غالبؔ کے فارسی کلام سے رغبت بڑھ رہی ہے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی تازہ تصنیف "افکار غالب" اس کی مسلسل جاذبیت کا تازہ ترین ثبوت ہے۔ کلام اقبال سے یورپی، ایرانی اور مصری اہل ادب نے جس تازہ شغف کا اظہار کیا وہ ان کی مقبولیت کے ایک نئے دور کا آغاز ہے۔ اس سلسلے میں کرنل ایسا ندرو بوزانی، پروفیسر آربری، آغائے سعید نفیسی اور ڈاکٹر عبدالوہاب عزام بے وغیرہ کا ذکر لازم ہے۔ اندرون ملک بھی اقبال پر نئی مفید تصانیف رونما ہوئیں۔ مثلاً "اقبالیات کا تنقیدی جائزہ"، منظوم ترجمہ "اسرار خودی" اور "انٹروڈکشن ٹو اقبال" وغیرہ۔ ادارۂ مطبوعات پاکستان کے زیر اہتمام پشتو اور سندھی میں "اسرار و رموز" دونوں اور بنگلا میں "رموز بیخودی" کے منظوم ترجمے بھی شائع ہوئے۔ اقبال اکاڈمی نے بھی اقبال کے متعلق تحقیق اور اشاعت کا کام شروع کر دیا ہے۔ اور اس سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔

اس سرسری جائزہ سے ظاہر ہے کہ ہماری زندگی اور ادب میں ترقی کی کتنی صلاحیت ہے۔ ابھی ہماری آنکھیں افق کی طرف لگی ہوئی ہیں۔

●

غالب پیشرو اقبال

سید عبداللہ

بلحاظ زمانہ غالب کا پیش رو اقبال ہونا تو حقیقت ہے۔ مگر کیا بلحاظ فکر بھی وہ ان کے پیش رو تھے؟ اس قیاس کی جانچ کی جاسکتی ہے مگر کوئی پوچھ سکتا ہے کہ صرف غالب ہی کو اس مطالعہ کے لئے کیوں مخصوص کرلیا جائے؟ یوں تو بے شمار دوسرے شعرا بھی اقبال کے پیش رو تھے۔ مگر صحیح معنوں میں پیشروی جبھی ثابت ہوئی کہ متقدم فنکار بعد میں آنے والے کسی عظیم تر فنکار کے انداز فکر اور انداز فن کی سمت نمائی کرے، ان بادلوں کی طرح جو بارش کی جھڑی لگنے سے پہلے آسمان پر چھا جاتے ہیں۔ افکار انسانی کی فضائے لطیف میں بھی اسی طرح کی ہوائیں چلتی رہتی ہیں جن سے آنے والے طوفانوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ فکر انسانی اور تہذیب اجتماعی کے اُفق پر بھی ایسی علامتیں اکثر نمودار ہوتی رہتی ہیں جو ایک نئے دور کا اعلان کرتی ہیں۔

فکر و فن کی دنیا کا یہ عام واقعہ ہے کہ بعض سماجی اور سیاسی عوامل ایک خاص دور میں بحران و طغیان کی حدوں سے گزر کر کسی نئی روش کی داغ بیل ڈالتے ہیں تو یہ عمل اچانک نہیں بلکہ آہستہ آہستہ ظہور میں آتا ہے، مدتوں کے داخلی عمل و ردعمل کے بعد ایک نئے قسم کا شعور آنکھیں کھولتا ہے۔ اگرچہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان میں جتنی مماثلت ہوتی ہے اتنا ہی اختلاف بھی ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ محسوس بھی نہیں ہوتا کہ آنے والے نے اپنے پیش رو سے کچھ لیا بھی ہے یا نہیں —— اور بعض دفعہ تو قدرت کچھ اس طریق سے کام کرتی ہے کہ پیش رو اور فیض یاب دونوں اپنی اپنی جگہ ایک طرح کے معلوم ہوتے ہیں۔ —— یعنی ان کی آواز وقت کی ایک ایسی عام آواز ہوتی ہے جس سے ایک متاثر ہوتا ہے تو دوسرا بھی۔

جب غالب نے یہ کہا تھا۔ ع کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا تو یہ ایک لحاظ سے میر کی محض اس پیش روی کا اعتراف تھا جس کے متعلق کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ عمرانی لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو میر و غالب میں اتنا بُعد نہیں جتنا مثلاً ولی اور غالب میں ہے، کیونکہ یہ دونوں تہذیب کے سماجی عنصر کے دو نشان راہ ہیں۔ محمد شاہ کے زمانے میں (جسے ضعف احساسات کا زمانہ کہا جاسکتا ہے) ضعف احساس کی جو لہر اٹھی تھی۔ اس سے میر اور غالب دونوں ہی متاثر ہوئے۔ میر پہلے، غالب بعد میں۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں کی نوا کے بعض پہلو ایک دوسرے کے خاصے قریب ہیں۔

بہر صورت سوال ذہنی مماثلتوں کا ہے جو اتفاقی بھی ہوسکتی ہیں مگر سماجی عوامل کے اثرات یقینی ہیں۔ یہ مماثلتیں غالب اور اقبال میں بھی ہیں۔ میر و غالب کی باہمی مماثلتوں سے بہت زیادہ۔ غالب، میر سے اتنے قریب نہیں ہیں، جتنے اقبال، غالب کے قریب ہیں۔ اول تو اقبال اور غالب کا زمانہ بہت قریب تھا۔ اقبال نے جن ادبی روایات میں تربیت پائی۔ وہ غالب کے زمانے کی پروردہ تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ زمانے کے لحاظ سے اقبال، شبلی، حالی اور اکبر کے بھی زیادہ قریب تھے اور بعض سماجی اور قومی احساسات میں ان کے ہم خیال بھی تھے مگر ان تینوں بزرگوں کو اپنے عصر کا نمائندۂ خاص نہیں کہا جاسکتا۔ یہ تو چند متفرق آوازوں کے آئینہ دار تھے۔ پورے زمانے کی روح ان کے فن میں منعکس نہیں ہوئی۔ اور پھر یہ ان نوابغ میں سے بھی نہ تھے جن کا فن زمان و مکان کی حدوں کو پھاند کر آفاق کی وسعتوں پر چھا جایا کرتا ہے۔ یہ تو دراصل وہ متفرق اجزا تھے جن کی شخصیتوں اور قابلیتوں کے مجموعی مواد سے اقبال کی منفرد اور نابغہ شخصیت وجود میں آئی۔ اس عہد کی نابغہ شخصیتیں دو اور صرف ا

دوستیں۔ اقبال اور غالب۔

مولانا حالی۔ اور مولانا حالی کیا، خود زمانے کے نئے تقاضوں نے غالب کے انتقال کے بہت بعد، غالب شناسی کے ایک نئے مکتب کی بنیاد رکھدی تھی، جدید تعلیم اور جدید اندازِ نظر نے غالب کو وہ قبولِ عام بخشا کہ اس کا مطالعہ اور اس سے استفادہ وقت کا مقبول ترین ادبی فیشن بن گیا تھا اسی ترقی پذیر غالب پرستی کے زمانے میں اقبال کی شاعری نے پہلی انگڑائی لی۔ اور ادبی ذوق و شوق کی اسی ابتدائی حالت میں اقبال کو غالب کی شاعری میں معنی کے بڑے بڑے طلسمات نظر آئے۔ اسکا اظہار ان کی نظم" مرزا غالب" (مطبوعہ "بانگِ درا") سے ہوتا ہے جس کے ہر ہر شعر سے اقبال کی غالب شناسی اور غالب پسندی کا واضح ثبوت مہیا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اقبال کے دل میں غالب کے افکار کی عزت کسی رسم عام یا روشِ عام کی بنا پر نہ تھی بلکہ اس سبب سے تھی کہ انہیں غالب کی شاعری میں ایک ایسا بڑا فن کار نظر آیا جس کے فن کے بعض پہلو خود ان کے اپنے رجحانات کے ہم رنگ تھے۔ انہیں مرزا غالب کی شخصیت اور ان کے فن میں اپنی ہی طبعی اور ذہنی خصوصیات کی جھلک نظر آئی

سے

به آب جو نگرم خویش را نظاره کنم
بایں بہانہ مگر روئے مہرے بینم

مذکورہ بالا نظم میں اقبال نے یہ واضح کیا ہے کہ مرزا غالب کو خالق نے وہ تخیل عطا فرمایا تھا جس پر فکرِ انسانی متحیر ہے۔ اقبال کے نزدیک غالب اس حسنِ مطلق کے متلاشی تھے جو سوزِ زندگی بن کر کائنات کے ذرے ذرے میں پوشیدہ رہتا ہے۔ (یہاں اقبال نے سوزِ زندگی اور حسن کو اپنی اصل اور منتہا کے لحاظ سے ایک ہی شے قرار دیا ہے)، اس کے علاوہ اقبال کی نظر غالب کی شوخیٔ تحریر پر بھی پڑی ہے جو زندگی بخش اور حیات افزا ہے۔ اس شوخیٔ تحریر سے ایک ایسا اسلوب پیدا ہوا ہے جس پر عرفی اور سعدی و حافظ بھی رشک کر سکتے ہیں سے

شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دلی گلِ شیراز پر

سعدی، حافظ اور عرفی تینوں فارسی کے بہت بڑے شاعر تھے اور تینوں کا وطن شیراز تھا ان میں سے اقبال کا اشارہ کس کی طرف ہے، یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا مگر اقبال کی اپنی پسند اور غالب کے بعض اقوال کو ملحوظ رکھا جائے تو عرفی ہی ان کے مدنظر معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال اقبال، غالب کے اندازِ بیان کے دلدادہ ہیں اور یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ شیرازیوں کی شاعری تو غالب کے کلام کا مقابلہ نہیں کر سکتی البتہ گوئٹے جرمن میں ہم خواب ایک دوسرا خوش فکر و بلند مرتبہ شاعر گوئٹے ضرور ایسا ہے جو غالب کا ہمنوا و ہمسر بن سکتا ہے۔ کیونکہ یہ وہ شاعر ہے جسکی شاعری میں تخیل و تعقل دونوں اپنی اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔

سے

آہ تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہمنوا خوابیدہ ہے

اس نظم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی اہمیت اقبال کی نظر میں اس لئے بھی ہے کہ غالب ایک تہذیب کا نمائندہ، اور ایک عظیم فکری و ادبی روایت کا وارث و ترجمان بلکہ آخری وارث و ترجمان تھا جس کے بعد جہاں آباد یعنی دلی کے بام و در "سراپا نالۂ خاموش" بن گئے۔ گویا غالب کی قدر و قیمت اسلئے بھی ہے کہ وہ ان تہذیبی و فکری قدروں کا شناسا و معیار شناس تھا جن کی معیار شناسی خود اقبال کے فکر و فن کا امتیاز خاص ہے۔ گویا اقبال کی نظر میں وہ ایک شخص تھا جو ان سے پہلے انہی راستوں اور شاہراہوں کا سراغ لگا چکا تھا جن کی نشان دہی بعد میں انہوں نے کی۔

ان سب تصریحات کا مقصود یہ ہے کہ اقبال جن رجحانات و اقدار کے نمائندہ سمجھے جاتے ہیں ان میں سے بعض نمایاں رجحانات و اقدار غالب کے یہاں بھی ہیں۔ مگر اس سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے کہ اقبال کی سب اقدار و خصائص غالب میں ہیں۔ بعض اقدار و خصائص جو ان دونوں شاعروں میں مشترک معلوم ہوتے ہیں ان کی مختصر فہرست یوں پیش کی جا سکتی ہے:-

۱۔ برجستہ اور جوش انگیز اسلوبِ بیان
۲۔ ارتقائے حیات کے لئے سخت کوشی اور خارا شگافی (جس کو اقبال کے مضامین کی اصطلاح میں "ستیز" کہا جا سکتا ہے)
۳۔ جذبہ و تفکر کا اجتماع
۴۔ جنون و آشفتگی کا ایک خاص انداز
۵۔ خودی کا شعور۔

باایں ہمہ غالب کی پیش روی افکار و نظریات کے منظم سلسلوں میں اتنی نمایاں نہیں جتنی بعض شخصی و نفسی کوائف میں ہے یا پھر بعض

اسالیب بیان میں جن کی نفسی روح اقبال کے ذہن و نفس اور نظریہ و تاثر کے بہت قریب ہے، غالب ایک برجستہ اسلوب اور فکر آفریں ذہانت کے مالک تھے جس کی نُدرت اور طرفگی تجربہ و تخیل کے نئے میدانوں اور وادیوں کے انکشافات کے ساتھ ساتھ سرور و نشاط بھی پیدا کرتی ہے۔ غالب کی آواز میں بھی افکار کی خصوصیات کے اعتبار سے نہیں بلکہ لہجہ و صوت کی حد تک، اقبال کی آواز کا سا رعب و طنطنہ پایا جاتا ہے۔ اردو شاعری کے لہجے میں مدتوں سے بعض سماجی اثرات کے ماتحت جو نسوانیت سی پیدا ہو گئی تھی، اس کو غالب نے بہت بڑی حد تک دور کیا اور اس کو ایک توانا لہجہ بخشا۔ ان کی فارسی شاعری تو مردانہ اور قاہرانہ لب و لہجہ کے لئے امتیاز خاص رکھتی ہے۔ غالب کے ہاں اظہار کے یہ پُرجلال پیرائے جن کے آہنگ میں ہی نشاطِ زندگی کے ساتھ ساتھ ولولہ نشاط بھی ہے، اقبال کے ہنگامہ خیز اسالیب کے نقوش اولیں معلوم ہوتے ہیں۔ اسکا واضح ثبوت اقبال و غالب کی ان غزلیات کے تقابلی مطالعہ سے بہم ہو سکتا ہے جو ایک ہی بحر و زمین میں ہیں مثلاً ذیل کی غزلیات جن کے چیدہ چیدہ اشعار یہاں درج کئے جاتے ہیں:-

غالب	اقبال
سوخت جگر تا کجا رنج چکیدن دہیم	شرر، شرر ذرہ را تن بہ تپیدن دہیم
رنگ شو اے خونِ گرم تا بہ پریدن دہیم	تن بہ تپیدن دہیم بال پریدن دہیم
عرصۂ شوقِ ترا مشتِ غباریم ما	سوزِ نوایم نگر ریزۂ الماس را
تن چہ بریزد زہم ہم بہ تپیدن دہیم	قطرۂ شبنم کنم خوئے چکیدن دہیم
جلوہ فادکردہ اندرخ بگشا تا زمہر	چوں ز مقامِ نمود نغمۂ شیریں دہیم
ذرہ و پروانہ را مژدۂ دیدن دہیم	نیم شبی صبح را میلِ دمیدن دہیم
بر اثرِ کوہکن نالہ فرستادہ ایم	یوسفِ گم گشتہ را باز کشودیم نقاب
تا جگرِ سنگ را ذوقِ دریدن دہیم	تا بہ تنک مایگاں ذوقِ خریدن دہیم
شیوۂ تسلیم ما بودہ تواضع طلب	عشقِ شکیب آزما خاک زخود رفتہ
در خمِ محرابِ تیغ تن بہ خمیدن دہیم	چشم تہی از نظر من لذتِ دیدن دہیم
غالب از اوراقِ ما نقشِ ظہوری دمید	
سرمۂ حیرت کشیم دیدہ بہ دیدن دہیم	

ان دونوں غزلیات کا پُرجلال لہجہ اور رقص آفریں آہنگ و صوت اور اقبال کے یہاں "دہیم" کی بجائے "دہم" کی پُرافتادہ ردیف کے

سبب کچھ زیادہ نمایاں ہے) ان دونوں شاعروں کے مزاج کے داخلی اشتراک و اتحاد کا صاف صاف اعلان کر رہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اقبال کی طرح غالب بھی ہندوستان کے متاخرین شعرائے فارسی کے فیضان کے شرمندۂ احسان ہیں۔ خصوصاً عرفی و نظیری کے۔ مگر اقبال و غالب کے شخصی نفسیاتی خصائص کا اشتراک بھی ان دونوں کو ہمجنس شاعر قرار دیتا ہے کیونکہ عرفی و نظیری کی نفسی کیفیتیں بہت سے امور میں غالب سے بالکل مختلف ہیں۔ عرفی کا جوشِ بیان بے شک غالب کے جوشِ بیان کے مماثل ہے اور ان کے شخصی خصائص بھی غالب، بلکہ اقبال کے بھی قریب ہیں۔ مگر اس سے انکار نہ کیا جائے گا کہ غالب کے جوشِ بیان اور نوائے گرم میں جو سچے جذباتی اور عمرانی تعلقے کار فرما ہیں۔ وہ عرفی وغیرہ کے یہاں نہیں۔ بہرحال وہ پُرجلال، مردانہ اور قاہرانہ آواز جس کو اقبال نے "بانگِ درا" اور غوغائے جرس بنا کر اجتماعی مقاصد کیلئے استعمال کیا، غالب کے یہاں بھی واضح صورت میں موجود ہے۔ ان کے قصائد میں تو ایک طنطنہ ہے ہی مگر ان کی عام غزلوں میں بھی بڑی توانائی اور قوت پائی جاتی ہے۔ اس موقعے پر زیادہ مثالیں پیش نہیں کی جا سکتیں، صرف ذیل کی چند غزلوں سے ہی اسکا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو سکے گا۔ ۵

خیز و بے راہ روے را بسر راہے دریاب

سحر دمیدہ و گل در دمیدن است مخسپ

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم

رفتم کہ کہنگی ز تماشا برافگنم

نشاطِ معنویاں از شراب خانۂ تست

یہ سب غزلیں ان کے جوشِ بیان کے عمدہ نمونے پیش کرتی ہیں۔ غزلیات کو امر و نہی کے صیغوں میں شروع کرنے اور ردیفوں میں امر و نہی کی کثرت سے ان کے ولولہ و جوش کا اظہار ہوتا ہے۔ عرفی کی طرح ہیجان خیز استعارات، معمولات و مسلمات کے خلاف طنز و شوخی اور احتجاج و

انحراف ان سب وسائل اظہار سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ
غالب نے ایک اسلوب تخلیق کیا جس میں وہ خیالات بھی بڑی حد تک سما
سکتے ہیں جو اقبال کی شاعری میں موجود ہیں۔ غالب کے یہاں وہ افکار
ہوں یا نہ ہوں جو اقبال سے منسوب ہیں، مگر ان کا اسلوب بیان اقبال
کے اسلوب بیان سے اشتراک کے خاصے پہلو رکھتا ہے۔

غالب کے یہاں جو تندی و تیز لہجہ پایا جاتا ہے وہ جوش زندگی اور
نشاط آرزو کی پیداوار ہے، وہ ایک ایسی شخصیت کے سرچشمہ ہائے
باطن سے نمودار ہوا ہے جس کے نزدیک زندگی کی تڑپ اور زندگی
کی آگ ہی وہ متاع گراں مایہ ہے جو لذت درد اور لذت ادراک دونوں
کی بیک وقت امین اور سرمایہ دار ہے۔ اقبال کی نفسی ساخت میں بھی
یہی تب و تاب اور اضطراب دائم ایک مستقل عنصر کی حیثیت رکھتا
ہے۔ البتہ اقبال نے اضطراب کی ان پر سوز کیفیتوں کو اجتماعی
آرزوؤں اور تمناؤں میں ڈھال لیا ہے۔ غالب کا سوز درد عموماً
انفرادی ہے، یا زیادہ سے زیادہ اس بلند تر انسانی نوعیت کا ہے، جو
صوفیانہ انداز نظر نے انہیں عطا کیا ہے۔ اور جس کی غایت یہ ہے کہ
جزو پھر کل سے ہم آغوش ہو جائے۔ کلیت کا یہ وہ عارفانہ تصور ہے
جو زندگی کی عقلی و مادی بنیادوں پر قائم نہیں بلکہ ایسے ماورائی تصور پر
قائم ہے جس کا تعقل دشوار ہے۔ بایں ہمہ غالب و اقبال دونوں کا
درد و سوز اپنی اصل و حقیقت کے اعتبار سے ایک ہی ہے یعنی ولولۂ
آرزو اور اضطراب شوق دونوں کے نفس کا ایک عنصر مشترک ہے۔

اقبال، غالب دونوں کے یہاں عقلی نظریات اور جذبات و
تاثرات کی خلط ملط صورتیں موجود ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اقبال کے
جذبات و تاثرات عقلی تنظیم کے تابع رہتے ہیں۔ اقبال نے افکار
ہی کو جذبے کی سطح پر لا کر ان کی خشکی یا سرد تجریدیت کو کم کر دیا
ہے۔ مگر اقبال کے اس ساختہ کا وہ عنصر بڑے نام ہے جس کی عقلی
توجیہہ ممکن نہ ہو۔ اقبال کی شاعرانہ فطرت اور حکیمانہ طبیعت میں کچھ
اس طرح کا امتزاج پیدا ہو گیا ہے کہ ان کے افکار جذبات اور
ان کے جذبات افکار معلوم ہوتے ہیں۔

غالب کی شاعرانہ فطرت اور حکیمانہ طبیعت کے مابین اس قسم کا
توازن پیدا نہیں ہوا۔ ان کے یہاں جذبہ و تعقل کے درمیان تضادات
پائے جاتے ہیں۔ مجموعی لحاظ سے غالب کی فطرت شاعرانہ زیادہ اور
حکیمانہ کم تھی۔ پھر بھی وہ تعقل و تفکر میں اعتدال رکھتے ہیں۔ تعقل میں ان کا
بھی ایک نظام فکر ہے مگر نامربوط اور ڈھیلا ڈھالا سا۔ ان کا تعقل زیادہ سے
زیادہ ان آزاد خیال صوفیوں کا تعقل ہے جو شرع کے ظواہر کے خلاف
آزادئ عقل اور شوخیٔ اندیشہ کی مدد سے تنقید کی جرأت کر لیتے ہیں۔
مگر ان کا نظام فکر کسی عقلی تنقید کی تاب نہیں لا سکتا۔ غالب کے تعقل کی بھی
کسی حد تک یہی کیفیت ہے۔

یہ عجب اتفاق ہے کہ اقبال جن کی شاعری میں ایک مربوط
عقلی نظام موجود ہے خود اپنی دعوت کے اعتبار سے "عقل" کی کارفرمائی
اور کمال کے بہت بڑے منکر اور ناقد ہیں۔ اور غالب جن کے یہاں
عقلی نظریات کی حیثیت بھی زیادہ سے زیادہ جذباتی طرز ادراک کی حد
تک پہنچ سکتی ہے، خود کو عقل و خرد کا بہت بڑا معتقد سمجھتے ہیں
اور نظری طور پر عقل کو جذبے کے برابر بلکہ اس سے بھی زیادہ اہمیت
دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنے اردو اور فارسی کلام میں اندیشہ، عقل، خرد،
دانش، آگاہی کی اصطلاحیں جابجا استعمال کی ہیں، اکثر موقعوں پر ہم
معنی الفاظ کے طور پر، بعض موقعوں پر الگ الگ جداگانہ مفہوم میں۔
مگر ان سب حوالوں کو یکجا رکھ کر دیکھنے سے یہ گمان گزرتا ہے کہ غالب
کے نزدیک عقل کی حیثیت وجدان سے کسی طرح کم نہیں۔ وہ جذبے
کی طرح کی ایک شے ہے، غالب نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے، کہ
عقل میں بھی مستی اور نشے کی کیفیت ہوتی ہے:

؎ بہ مستی خرد رہنمائے خود است
رود گر ز خود ہم بجائے خود است
ازیں بادہ ہر کس کہ سرمست شد
بافشاندن گنج تر دست شد

غالب کے نزدیک عقل سے بصیرت پیدا ہوتی ہے عقل نفس کی
اصلاح و تہذیب کرتی ہے، عقل سے سیرتوں میں توازن پیدا ہوتا
ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ عقل کے یہ وظائف قابل تسلیم اور درست ہیں اور
یہ بھی اصولاً درست ہے کہ ؎

سخن گرچہ پیغام راز آورد
سرود ار چہ در اہتزاز آورد
خرد داند ایں گوہریں در کشاد
ز مغز سخن گنج گوہر کشاد

خرد دانا، آں پردہ بر ساز بست
بدامش طلسمے بر آواز بست

مگر غالب کا یہ خیال خاصہ توجہ طلب ہے کہ خرد میں بھی ایک قسم کی مستی ہوتی ہے، ان کے اس خیال کی اصلیت کیا ہے؟ یہ تو آگے آتا ہے مگر یہ سُن لیجئے کہ اقبال کے نزدیک بھی علم و عقل میں سرور کی کیفیت ہوتی ہے مگر اس میں مستی کی کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی ؎

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں
علم میں بھی سرور ہے لیکن
یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں

غالب اور اقبال کے نظریۂ عقل میں یہ تفاوت کیوں ہے؟ یعنی اقبال کے یہاں تعقل کی خالص اور منظم و مربوط صورتوں کے باوجود تعقل کی ستائش کم ہے اور وجدان پر زور دیا گیا ہے۔ مگر غالب کے یہاں تعقل کی ستائش کم ہے، اور وجدان پر زور دیا گیا ہے، مگر غالب کے یہاں تعقل کے نظام کی سستی کے باوجود عقل و تعقل کی اتنی تعریف کیوں کی گئی ہے؟ جہاں تک میں غور کر سکا ہوں یہ فرق مذاقِ زمانہ کے سبب سے ہے۔ غالب کے زمانے میں عقل پسندی کی تحریک کی ابھی ابتدا تھی۔ اس میں معقولات کا شوق، بلندیٔ فکر کا ثبوت سمجھا جاتا تھا اور اس وقت تک عقلیت اور وجدان کے باہمی تصادم کے وہ اثرات منکشف نہ ہوئے تھے جن سے وجدان اور روحانی تصورات کی ساری عمارت ڈھے سکتی تھی۔ اس لئے غالب اپنی خرد پرستی کا بڑا چرچا کرتے ہیں مگر اقبال عقل پسندی کے تمام نتائج سے پوری طرح باخبر تھے۔ ان کے زمانے میں تعقل کے جدید مرکزوں میں بھی نری عقلیت کے متعلق تشکک پیدا ہو چکا تھا اسلئے اقبال کے یہاں عقل کے مقابلے میں وجدان کے حق میں زبردست ردِّعمل پایا جاتا ہے۔

یہاں یہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ غالب کے یہاں سخن یعنی ادبی تخلیق عقل سے الگ ایک سلسلۂ عمل ہے جس کو وہ عقل سے بلند تر نہ سہی اس کے برابر درجہ عطا کرتے ہیں ؎

سخن گرچہ گنجینۂ گوہر است
خرد را دے تابشِ دیگر است

ان کا عقیدہ ہے کہ سخن کی صحیح قدر و قیمت بھی فکری عنصر کے طفیل ہوتی ہے تاہم ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ سخن خود بھی ایک متاعِ گراں بہا ہے، جو ہمیں اپنے دل و جگر کی طرح عزیز ہے ؎

گفتمش چیست جہاں گفت سراپردۂ ماز
گفتمش چیست سخن گفت جگر گوشۂ ماست

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ غالب تعقل کے مداح و معترف ہیں اور ان کی شاعری میں ایک فکری لہر بھی پائی جاتی ہے، وہ جذبات کے فکری تجزیہ کی بھی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور کبھی ان کی فکری نوعیت اور حقیقت سے بھی سروکار رکھتے ہیں۔ مگر یہ بھی صحیح ہے کہ ان کی سوچ جذباتی انداز کی ہے، وہ جذبات پر افکار کا ملمع چڑھانے کے عادی ہیں۔ حقیقی افکار ان کے یہاں بہت کم ہیں۔ ان کے کلام میں علمی حقائق بھی پائے جاتے ہیں مگر ان کے پاس کوئی مربوط سلسلہ نہ حکمت کا ہے نہ عقل کا۔ وہ صوفی ہیں بھی اور نہیں بھی، وہ حقائق آگاہ ہیں بھی اور نہیں بھی۔ البتہ ایک بات ایسی ہے جس کی "میں" مسلّم ہے۔ مگر جس کی "نہیں" کا پہلو موجود ہی نہیں۔ وہ ان کا ایک "آرزومند شاعر اور فنکار" ہونا ہے۔ اور یہ وہ مرکز ہے جس کے اردگرد ان کی ساری نفسیات شناسی، ان کا سارا تعقل گھومتا ہے۔ وہ "دلِ گداختہ" کے مالک ایک عظیم شاعر ہیں۔ ان کی یہ حیثیت مسلّم ہے۔ غالب کچھ بھی ہوں حکیم نہیں۔ ان کا تعقل جذبہ پرستی ہی کا دوسرا نام ہے۔ وہ تعقل کے دعوے کے باوجود "یک رُخ" ہیں وہ اندیشۂ بلند کے باوجود اپنے وجدان اور اپنے قلب ہی کے پرستار ہیں۔ دھواں ساتویں آسمان تک بھی پہونچ جائے، تب بھی یہ اسی آگ کا دھواں ہے جو تن میں لگی ہوئی ہے۔ اقبال کے یہاں تعقل کی مخالفت کے باوجود بلند تعقل پایا جاتا ہے۔ انہوں نے تاثر و تعقل کی آمیزش اس طرح کی ہے کہ شعر و حکمت اور علیم و حکیم یک جان ہو گئے ہیں۔

غالب اور اقبال دونوں کے یہاں پُر جوش آرزومندی پائی جاتی ہے مگر یہاں بھی اصول اور سیرتوں کا فرق واضح ہے۔ اقبال نے اپنی آرزومندی کو انسان کی اجتماعی آرزوؤں اور امنگوں کی صورت دیدی ہے کیونکہ اقبال کا غم انسانیت کی تکمیل کے لئے ہے۔ یہ غم کسی سے ملنے اور اس میں ڈوب کر محو ہو جانے اور خود کو فراموش کر دینے کی آرزو نہیں بلکہ تسخیر، توسیع اور چھا جانے کی وہ آرزو ہے جس کی کوئی حد و انتہا نہیں۔

غالب کی آرزومندی بھی شدید ہے مگر اس سے مختلف۔ ان کی
نوعیت خالصتاً انسانی اور زیادہ قابلِ فہم ہے۔ اس میں شوق کی لگن اور
محبت کا درد ہے۔ وہ زندگی کی سچائیوں سے زیادہ قریب ہے۔
کیونکہ اصولاً شخصی و ذاتی ہے۔ ان کا غم ناآسودگی سے بھی ابھرا ہے
اور احساسِ ناتمامی سے بھی۔ ان کی بعض آرزوئیں آسودہ ہو کر بھی آسودہ
نہیں۔ ان میں سے بعض آرزوؤں کی نوعیت حد درجہ غیر معقول بھی ہے
جن کی کوئی عقلی توجیہہ نہیں کی جا سکتی مگر ایک دل ہے اور ہزار آرزوئیں:

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو

ان سب باتوں کے باوجود غالب کو اپنے غم سے لذت
حاصل ہوتی ہے مگر یہ وہ لذت نہیں جس سے دل بیٹھ جاتا ہے بلکہ
وہ لذت اور طلب اور بےتابی ہے جس سے لذتِ آرزو نکلتی ہے۔
تاہم جو غم احساسِ ناتمامی اور احساسِ ضعف و زوال کا نتیجہ ہے۔ اس کا رخ
انفعالیت کی طرف ہے۔ البتہ جو غم ناآسودگی سے نکلا ہے اس میں
طلب و امید کا اثباتی رخ پایا جاتا ہے ؎

بہ فیضِ بےدلی نومیدیٔ جاوید آساں ہے
کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا
نہ لائی شوخیٔ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی
کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

یہ تو مسلّم ہے کہ ہر انسان، فن کار یا غیر فن کار کی زندگی میں کچھ ایسے
خلا ہوتے ہیں جو کبھی پُر نہیں ہو سکتے۔ دل کے ان داغوں کو کوئی مٹانا
بھی چاہے تو مٹا نہیں سکتا کیونکہ زخمِ دل کی لکیر پتھر کی لکیر سے زیادہ مستقل
ہوتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس کے پیچھے کوئی بہت بڑا حادثہ ہی ہو۔
محض معمولی سی بات بھی گہرے زخم لگا سکتی ہے کیونکہ احساس کی دنیا
میں سوچ کے انداز نرالے ہوتے ہیں۔

غالب کے یہاں ہر قسم کے غم پائے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری
کے ایک حصے میں ضعفِ حیات اور زوالِ عمر کا ماتم پایا جاتا ہے، ایک
حصے میں اس کا غم و الم کہ نفسِ انسانی میں یہ حوصلہ ہی نہیں کہ بقدرِ شوق دادِ
عیش دے سکے۔ اور پھر اس کا بھی کہ جتنا غم مطلوب ہے زمانہ اس سے
بھی اس سبب سے محروم رکھ رہا ہے کہ اہلِ کمال کے حصے میں محرومی ہی محرومی
لکھی ہے۔

بہرحال یہ طلسم کدۂ آرزو ہے جس کے غم و نشاط کے شعبدے
شاعر کے نزدیک سکون بھی ہیں اور وجہِ اضطراب بھی! وہ بالکل قدرتی
انداز میں ان غموں کا طالب بھی ہے اور ان کا شاکی بھی۔ مگر طلب و
شکایت کی اس دو عملی میں اس کو بڑی لذت ملتی ہے جس کا خمار اسے
اکثر مضطرب رکھتا ہے۔ شوق و درد کی ان لذتوں میں وہ لذت بھی شامل
ہے جسے لذتِ ادراک اور لذتِ تخلیق سے تعبیر کیا جا سکتا ہے صوفیا
کے نزدیک لذتِ ادراک "جنون" کی ایک بڑی غایت ہے۔ ان کا عقیدہ
یہ ہے کہ وحشت اور جنون سے صوفی کو دو فائدے حاصل ہوتے ہیں،
اول سرور و مستی کی کیفیت، دوم کشف و ادراک کی تجلی۔ اسی سبب
سے صوفیوں نے، یہاں تک کہ عیسائی صوفیوں نے بھی جن کے عقائد کی
عمدہ تشریح پروفیسر نیو بلا نے اپنی کتاب میں کی ہے، ان دونوں غایتوں کو
برحق قرار دیا ہے۔ غالب بھی جنون کو ایک "لذت بخش" اور "ادراک
بخش" عامل خیال کرتے ہیں ؎

یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا
جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا
کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں
ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا

مگر لذتِ ادراک کوئی ایسی ارزاں شے نہیں کہ اسے اور بازار سے خرید
لائے۔ اس کے لیے نفس کو ایک جنون و آشفتگی کی کیفیت سے
تکلیف کرنا پڑتا ہے اور دل و جگر میں وہ گرمی پیدا کرنی پڑتی ہے
جس کا ذکر غالب نے اس شعر میں کیا ہے ؎

عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

یا اس شعر میں کہ ؎

دل از تابِ بلا بگداز و خوں کن
ز دانش کار نکشاید جنوں کن

یہ بہت بڑی حد تک وہ اندازِ نظر ہے جو دانش و جنوں کے متعلق اقبال
کے افکار میں بھی ملتا ہے۔ اقبال و غالب کے خیالات کا اسالیب
کے ماسوا، کوئی دوسرا پہلو ایسا نہیں جو باہم اتنی مماثلت رکھتا ہو۔
اقبال نے دانشِ رسمی کے مقابلے میں، جس کو غالب "دانشِ سرد" کی
اصطلاح سے یاد کرتے ہیں۔ جذب و جنوں اور حکیم کے مقابلے میں کلیم
اور رازی کے مقابلے میں رومی کو جو اہمیت دی ہے وہ اتنی مسلّم

ہے کہ اس کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ غالب کی طرح اقبال کے نظریہ میں بھی جنون آشفتگی کی بڑی تقدیس پائی جاتی ہے۔ صرف فرق یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کا مجنوں آشفتگی کے باوجود غالب کے مجنوں سے زیادہ با اصول ہے۔ غالب کے مجنوں کی دیوانگی عاشقانہ دیوانگی ہے، مجذوبانہ دیوانگی نہیں۔ مثلاً ذیل کے اشعار میں ؎

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سائے سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے
خدا کے واسطے داد اس جنونِ شوق کی دینا
کہ اسکے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

ظاہر ہے کہ یہ کردار کلیم کے کردار سے مختلف قسم کا کردار ہے جس کی حلیہ نگاری اقبال نے جابجا کی ہے

غالب کے ہاں غم عشق کے ساتھ وہ غم بھی ہے جسے غم تخلیق کہا جاسکتا ہے۔

نشاط زمزمہ و لذت جگر خواری

یہ وہ غم ہے جس سے فنکار کو ایک تکلیف دہ لذت ملتی ہے یا ایک لذت بخش تکلیف۔ ایک فنکار تخلیق سے پہلے اپنے تجربے کو اپنی شخصیت میں جذب کرتا ہے اور پھر جسم کے ہر ہر رونگٹے سے اس طریق سے باہر لاتا ہے کہ "جگر خواری" کے باوجود اس میں نشاط زمزمہ کی کیفیت پیدا ہو۔ اسکا حال وہی لوگ جان سکتے ہیں جن کو غم تخلیق سے کبھی سابقہ پڑا ہو۔

بینم از گدازِ دل در جگر آتشے چو سیل
غالب اگر دم سخن رہ بہ ضمیر من بری

آتش چکد ز بہر تنِ مویم اگر بفرض
ذوقم بخود قرار فغانِ گلستاں دہد

گریہ را در دل نشاطے دیگر است
خندہ برلب ہائے خنداں می زنم

اب اقبال و غالب کی بعض دوسری مماثلتوں کا ذکر آتا ہے۔ غالب کی انا اور اقبال کے فلسفۂ خودی میں بظاہر کوئی علمی یا فکری رابطہ نہیں۔ مگر ان دونوں شاعروں کے ان افکار کے پس پردہ جو شخصی احساس اور نفسی رجحان کار فرما ہے اس کے درمیان ایک رابطہ ضرور قائم کیا جاسکتا ہے۔ انا کی انفرادیت اور اس کا شعور کمال یا آرزوئے کمال "خودی" کے انفرادی و اجتماعی تصورات سے کچھ نہ کچھ رابطہ ضرور رکھتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ غالب کی انا یا شعور خود کا دائرہ بظاہر محدود ہے کیونکہ اس کی وسعت "شخص" کے نفسی ممکنات سے ماورا معلوم نہیں ہوتی مگر حقیقت میں اس شخصی انا کا علاقۂ اثر بھی کافی وسیع ہے۔ اور اس کا تعلق ذات شخص کے علاوہ ساری انسانی نوع سے بھی ہے جس کا شعور خود اس کو روحانی ارتقا کی بلند ترین معراج پر پہنچانے کا ذمہ دار ہے اور جب غالب یہ کہتا ہے کہ ؎

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

تو اس سے مراد غالب کی ذات واحد نہیں بلکہ وہ ساری نوع ہے جس کا وہ ترجمان ہے صوفیوں کے شعور خود (عرفانِ نفس) کی یہی تشریح ہے اور غالب کا شعور خود بھی عام طور سے صوفیوں کے اس تصور سے جدا نہیں۔ اقبال کے شعور خود میں روحانی اور مادی دونوں قسم کی نمائشیں موجود ہیں، مگر صوفیوں کے شعور خود کا تعلق محض روحانی ارتقا سے ہے۔ غالب اور اقبال کی بے خودی میں بھی یہی فرق ہے۔ بعض لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اقبال صرف خودی کے ترجمان ہیں۔ حالانکہ اقبال جتنے خودی کے مبلغ ہیں اسی قدر بے خودی کے بھی شارح ہیں۔ اگر چہ غالب کی خودی و بے خودی اور اقبال کی خودی و بے خودی میں مفہوم اور دائرۂ اثر کے اعتبار سے خاصا فرق ہے، پھر بھی ان کے ڈانڈے کئی جگہ باہم مل جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح حقیقت اور مجاز میں معناً واضح فرق بھی ہو، تب بھی ان کے کئی رخ ہم شکل ہوتے ہیں۔ کم از کم شکلوں اور صورتوں، طریقوں اور وسیلوں میں ہم رنگ ہونے کے کئی وجوہ نکل آتے ہیں، مثلاً اظہار و بیان ہی کو لیجئے۔ غالب کے یہاں جو شدید احساس انا ہے (انفرادی اور نوعی) اس کے پیرایہ ہائے اظہار بڑی آسانی سے اقبال کے شعور انا کے ترجمان بن سکتے ہیں۔ اگرچہ عملی تشریح و تعبیر میں جدا ہی کیوں نہ ہوں۔

غالب کی انا کا عارفانہ رنگ تو وہی ہے جو عام صوفیوں کا ہے مگر ان کی انا کا خالص شخصی رخ بھی نہایت نمایاں ہے۔ ان کے

شعور خودی کی انتہا یہ ہے کہ عالم انفس و آفاق میں روحانی، اور ذہنی بلندی کا کوئی درجہ ایسا نہیں جو ان کو حاصل نہ ہو۔ منصور، موسیٰ فرہاد، زلیخا، مجنوں۔ غرض عاشقی اور روحانیت کی دنیا کا کوئی مشہور فرد ایسا نہیں جس کا کمال ان کے نزدیک عیب دار اور ناقص نہ ہو ـــــ کوہکن؟ وہ تو رسوم و قیود کا بندہ تھا، اناڑی تھا، بے حوصلہ اور پیشہ ور قسم کا آدمی تھا وہ تو یہ سمجھتا تھا کہ پتھروں سے سر پھوڑنے اور پہاڑوں کو کاٹنے سے کوئی شخص کسی کی محبت کو "جیت" سکتا ہے ؎

کوہکن نقاش یک تمثال شیریں تھا اسد
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

مجنوں؟ جو "تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا" ـــــ جذبۂ عشق سے خالی تھا، اگر ایسا نہ ہوتا تو لیلیٰ گھر کی سب پابندیوں کو توڑ تاڑ کر صحرا میں کیوں نہ بھاگی آتی! ـــ مجنوں، ہوسو ان کی "تنگ ظرفی" پر تو غالب کے علاوہ بعض دوسرے "عالی ظرفوں" نے بھی بڑی لے دے کی ہے! یہ سب کیا ہے؟ وہی شعور ذات اور احساس خود جس کے کمال کے سامنے کسی اور کا کمال نظر میں جچتا ہی نہیں۔ یہ سب خودی کی تجلیات ہیں۔ جو کلام اقبال میں ایک بصیرت افروز فلسفے کی صورت میں آفتاب بن کر ظاہر ہوئی۔

اقبال کے ہاں تسخیر و ستیز کا فلسفہ بھی خودی سے مربوط ہے۔ زندگی، جو خودی کی نمود ہے، دائمی جدل و پیکار سے تشکیل پاتی ہے۔ اسی پیکار سے زندگی ارتقا پذیر ہو کر اس منزل کمال کی طرف بڑھتی جاتی ہے جو زندگی کے مقدر میں ہے۔ تسخیر و ستیز اور جدل و پیکار کی معمولی اور ابتدائی علامت ہے قوت ارادی کی مضبوطی اور ان نامقبول اثرات کو تسلیم نہ کرنا جو 'خود' کو ضعیف کرنے والے ہوں۔ طلب دائم، مقاومت دائم، جارحانہ پیشقدمی (جس میں خود کا اثبات پایا جاتا ہے) اس تسخیر و پیکار کا مسلم حربہ ہے۔ یہ حربہ تسخیر کے شخصی، ذہنی، اور اجتماعی سب میدانوں کے لئے ضروری ہے۔ عشق کی ہر صورت اور شوق کے ہر مرحلے میں اسی سے کام چلتا ہے۔ طلب کے ہر سفر میں اسی سے ساز و براق مہیا ہوتا ہے۔

اقبال کی شاعری میں تسخیر کائنات اور کشود حیات کی جو صورتیں پائی جاتی ہیں، وہ تو ظاہر ہی ہیں۔ غالب کے کلام میں بھی ستیز، جارحانہ پیشقدمی اور اثبات خود کی صورتیں کچھ کم ہیں۔ جوہے اس سے نا آسودگی اور ایک نئی زندگی کی تخلیق و تشکیل، اور اس کے لئے جارحانہ، اور انقلاب آفریں انداز فکر، غالب کی کئی غزلیات میں ملتا ہے مثلاً اس غزل میں جس کا مطلع یہ ہے ؎

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا بہ گردش رطل گراں بگردانیم

اور مقطع یہ ؎

بمن وصال تو باور نمی کند غالب
بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم

اہتمام کی یہ حالت ہے کہ ؎

اگر ز شحنہ بود گیر و دار نندیشیم
وگر ز شاہ رسد ارمغاں بگردانیم
اگر کلیم شود ہم زباں سخن نکنیم
وگر خلیل شود میہماں بگردانیم

یا مثلاً اس غزل میں جس کا مطلع یہ ہے ؎

رفتم کہ کہنگی ز تماشا برافگنم
در بزم رنگ و بو نمطے دیگر افگنم

اسی غزل میں وہ مشہور شعر بھی ہے جو اقبال کے محبوب اشعار میں شامل ہے ؎

تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

غالب کا یہ مخصوص احساس ان کی ساری شاعری پر چھایا ہوا ہے۔ اور "ظ

دامن کو آج اس کے حریفانہ کھینچئے

کی منزل سے لے کر

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم

تک طلب وسعی اور تگ و تاز کے ہزاروں مرحلے آتے ہیں جن میں یہی آرزوئے استیلا اور عزم تسخیر نظر آتا ہے۔ اسی انداز فکر اور طرز احساس نے غالب کو اقبال کی طرح عمل و توانائی کا شاعر بنا دیا ہے۔ سخت کوشی و خارا شگافی ان کے افکار کی ایک تہ موج ہے جس میں تمام

نظامِ فلکی کو درہم برہم کر دینے کی خواہش ہے۔ ؎

لئے پھرتا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

—— ایک نئی دنیا آباد کرنے کا عزم اور اس کے لئے جہاد و جاہدہ کا ارادہ بھی پورا پورا موجود ہے۔ غالب کا عشق بھی اپنی رجحانات و خصوصیات کا آئینہ دار ہے اور ان کا ارتقائے روحانی بھی اپنی منزلوں کی نشان دہی کرتا ہے تسلیم و رضا کا شیوہ، جو حافظ اور ان کے ہمنوا صوفیوں کا مسلک خاص ہے۔ غالب کے یہاں ذرا مشکل ہی سے ملے گا۔ ان کے یہاں تو احتجاج و شکایت کی حس جس نے ان کے اسلوبِ بیان میں شوخی و طنز کے زہرناک نشتر بھر دیئے ہیں اتنی تند و تیز ہے کہ اس کی بنا پر بعض نے ان کے تشکک کو لادینی کے مترادف قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے ذہن میں کفر و ایمان کے متضاد تصورات پائے جاتے ہیں جو ان کے لئے بڑی کشاکش کا باعث ہوتے ہیں۔ ؎

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر

گر و اصل یہ سب "شوخیِ اندیشہ" ہے۔ غالب کے افکار میں زندگی کی مادی اقدار اور جسم و صورت کے تقاضوں کو جو اہمیت ملی ہے اس کے لحاظ سے بھی غالب بیسویں صدی کے پیش رو معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں ؎

گر بہ معنی نہ رسی جلوۂ صورت چہ کم است

کی صلا بے مقصد نہیں۔ ان کے احساس پر آنے والی صدی کی "صورت پسندی اور مادیت کی پرچھائیں پڑ گئی تھی۔ اور یہ مصرع اسی رجحان کی خبر دیتا ہے:

شہرتِ شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

خلاصہ یہ کہ توانائی، جدل، پیکار، قوت، احتجاج، اثبات خودی، جارحانہ اقدام، اور طلبِ دوام و تب و تابِ جاوداں کے اعتبار سے بھی اور ان افکار کے لحاظ سے بھی جن کے لئے پُرجوش اسالیبِ بیان کی ضرورت ہوتی ہے۔ غالب کی شاعری کو اقبال کی شاعری کی منزلِ اوّل قرار دیا جا سکتا ہے۔ جاوید نامہ میں اقبال نے غالب کو طاہرہ اور منصور کے ساتھ فلکِ مشتری میں دکھایا ہے اور ان کی شخصیت پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے ؎

غالبؔ و حلاجؔ و خاتونِ عجم   شورہا افگندہ در جانِ حرم

ایں نواہا روح را بخشد ثبات   گرمیٔ او از درونِ کائنات

غالب کی نوا کی یہی گرمی ان کو اقبال کے سلسلے کا شاعر قرار دیتی ہے۔ غالب و اقبال کی نفسی مماثلتیں بھی کچھ کم قابلِ توجہ نہیں ان کے ذہن و فکر کے رخ بھی عام طور پہ ایک ہی ہیں۔ ان کے ادبی ارتقا کے بعض واقعات، مثلاً اردو سے زیادہ فارسی سے اعتنا اور اپنے افکار کے لئے نئے اسالیب و تراکیب کی اختراع وغیرہ بھی ان کی ذہنی وحدت کا پتہ دیتے ہیں۔ دونوں کی ذہنی و ادبی تربیت کے سرچشمے بھی ایک خاص حد تک مشترک ہیں شعرائے عہدِ اکبری و جہانگیری کے کلام اور مغلیہ عہد کی روایات سے یہ دونوں شاعر یکساں طور پر مستفید ہوئے ہیں۔ غرض یہ اور اس قسم کے کئی اور وجوہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ غالب کی شاعری کو اقبال کی شاعری سے وہی نسبت ہے جو نمودِ سحر کو طلوعِ آفتاب سے ہوتی ہے۔ غالب کی دوسری پیشگوئیوں کی طرح ان کی یہ پیشگوئی بھی صحیح ثابت ہوئی ؎

خارہا از اثرِ گرمیٔ رفتارم سوخت
منّتے بر قدمِ راہروان است مرا

کتنے جوہر ہیں غربت میں ویراں ابھی
کتنے ٹکڑے ہیں دل کے پریشاں ابھی
درد کتنے ہیں محتاجِ درماں ابھی
دور کتنا ہے انساں سے انساں ابھی
کتنے لب قطرۂ علم سے دور ہیں
کتنے دیدے ہیں یارب کہ بے نور ہیں
تجھ کو اس کورِ دنیا میں رہنا نہیں
گر دکھانا ہے کچھ صرف کہنا نہیں

(تقی)

ایک اور صنم

الطاف گوہر

ہر نسل اپنے لئے نئے دیوتا تراشتی ہے، پرستش میں چونکہ سوچ بچار کی زحمت بچ جاتی ہے اسلئے کم از کم وقتی طور پر اطمینان میسر رہتا ہے۔ ان دیوتاؤں میں ہر نسل کی بصیرت اور مذاق کے مطابق بڑی، چھوٹی، کھری کھوٹی سبھی قسم کی شخصیتیں ہوتی ہیں۔

آزادی کے وقت ادبی اصنام بھی بانٹے گئے، چھوٹے بڑے ہر طرح کے افسانہ نگار علی الترتیب قریب قریب سب ہندوستان میں جم رہے، البتہ سعادت حسن منٹو بمبئی سے مغربی پاکستان ہجرت کر آئے۔ عصمت چغتائی کے کہنے کے مطابق اس ہجرت کا باعث منٹو کا یہ خیال تھا کہ "پاکستان میں حسین مستقبل ہے.... وہاں ہم ہی ہم ہونگے، بہت جلد ترقی کر جائیں گے۔" اس میں بہت کچھ محض زیب داستاں بھی ہو سکتا ہے، مگر اس میں شک نہیں کہ منٹو نے پاکستان آکر افسانہ نگاری کے علاوہ ایک برف فیکٹری بھی اپنے نام الاٹ کروالی۔ بہر حال منٹو کے آنے سے قومی ادب کے قدردانوں کی ڈھارس بندھ گئی۔ منٹو نے فسادات کے موضوع پر دو چار نہ دردار افسانے لکھے، تو لوگوں پر ان کے نئے افسانوی دیوتا کا روپ اجاگر ہونے لگا۔ منٹو نے بھی کھلے بندوں کہنا شروع کر دیا کہ پاکستان میں اس کی ٹکر کا کوئی افسانہ نگار نہیں، جلسوں اور محفلوں میں اگر کوئی اس کے افسانوں کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا تو وہ فوراً پوچھتا "تم افسانہ نگاری کے متعلق جانتے کیا ہو؟" سڑک پر جاتے جاتے اگر کسی گڑھے کی وجہ سے اس کا تانگہ رک جاتا تو وہ چلاتا کہ اگر میں اس گڑھے میں گر پڑتا تو پاکستان کا سب سے بڑا افسانہ نگار ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتا۔ معاملہ پاگل خانے تک پہنچا۔ صحت بگڑتی گئی، خبر آئی ہسپتال میں ہیں۔ حالت بہت خراب ہے، ڈاکٹروں نے موت کے منہ سے بچا لیا، پھر وہی حال ہو گیا اور آخر ایک دن چل بسے۔

"ہتک" اور "بابو گوپی ناتھ" کے مصنف کی موت کی خبر سنکر کسے دکھ نہ ہوا ہوگا، مگر لوگ تو شاید اس کی موت کے انتظار میں تھے، ادھر اس نے دم توڑا اور ادھر بت تراشوں نے اس کے مجسمے کی نقاب کشائی کی اور کہنا شروع کیا "یہ اس دور کا دیوتا ہے، آؤ ہم سب مل کر اس کی پوجا کریں!"

محمد حسن عسکری نے فیصلہ دیا "میں منٹو کو اردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار کہتا ہوں"۔ عبادت بریلوی نے کہا "منٹو اردو کا سب سے بڑا نہیں تو بہت بڑا افسانہ نگار ضرور ہے"۔ ممتاز شیریں نے یہ رائے دی کہ منٹو نہ صرف ایک فطری فن کار ہے، بلکہ بڑا ہی شعوری فن کار ہے۔ اس قسم کے جملے پچھلے دو چار مہینوں میں اتنی بار دہرائے گئے ہیں کہ مجھے یہ خوف محسوس ہونے لگا ہے کہ کچھ عرصے تک اب یہ پود محض اس دیوتا کی پرستش میں لگی رہے گی اور اس کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش آئندہ پر ملتوی کر دی جائیگی۔ پڑھے لکھے اہل قلم جب اس قسم کی باتیں کرنے لگیں تو یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں، ادبی تنقید کے طور پر نہیں کہہ رہے، بلکہ خواہش کے زیر اثر کہہ رہے ہیں۔ منٹو کے معاملہ میں یہ خواہش قومی ادب کی خدمت کا خیال ہے، خدمت کا یہ جذبہ قابل ستائش ہے، مگر اس جذبہ کے ساتھ تنقیدی توازن برقرار رکھنا بھی لازم ہے۔

یہاں تک پڑھ چکنے کے بعد آپ سوچینگے کہ میں یہ مضمون منٹو کے خلاف لکھ رہا ہوں اور منٹو کو ایک نہایت ادنیٰ اور معمولی افسانہ نگار ثابت کرنے کے لئے میں نے یہ تمہید باندھی ہے۔ ممکن ہے آپ میں سے بعض کو یہ خیال بھی گزرے کہ مجھے منٹو سے کوئی ذاتی عناد ہوگا جس کا بدلہ میں اس کی موت کے بعد لے رہا ہوں، اور منٹو کے پرستار تو یہ ضرور کہیں گے کہ لیجئے صاحب بمشکل سے ایک افسانہ نگار ملا تھا، یہ دشمن قوم اس میں بھی کیڑے ڈالنے لگے۔ میں یہ عرض کر دوں کہ بدقسمتی سے مجھے منٹو سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا، البتہ اس کے افسانوں اور دوسری تحریروں کا میں نے نہایت احتیاط اور صدق دل سے مطالعہ کیا ہے۔ اس پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بھی جہاں تک ممکن ہو سکا ہے۔ میں نے نہایت غور سے پڑھا ہے۔ اس لئے نہیں کہ منٹو اردو کا سب سے اچھا یا برا افسانہ نگار ہے۔ اس لئے کہ مجھے اس کی تحریر اور شخصیت دونوں سے

دلچسپی ہے۔ اچھے یا برے کی بحث ادبی تنقید میں ایک عدالتی رنگ پیدا کردیتی ہے جس سے تنقید ذاتی سی ہو جاتی ہے اور پھر یہ فیصلہ دینے کے لئے کہ کوئی ادیب اچھا یا برا ہے۔ یہ بھی تو ضروری ہے کہ اس کی تخلیقات اور اس کی شخصیت کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ان کا ادبی اور فنی تجزیہ کیا جائے، تنقید میں میری دلچسپی تجزیہ کی حد تک ہے، فیصلہ دینے کی ذمہ داری قبول کرنے سے میں نے ہمیشہ احتراز کیا ہے۔ اس مضمون کی نوعیت تجزیاتی ہے مگر اس تجزیہ کی اہمیت ایک ذاتی تاثر کی سی ہے، ممکن ہے یہ تاثر ادھورا ہو اور منٹو کی ساری شخصیت کا آئینہ دار نہ ہو، مگر اس تاثر کی بنیاد ان شواہد پر ہے جو مجھے منٹو کی تحریروں اور منٹو کو جاننے والوں کے مقالوں سے ملے۔ ان شواہد کے انتخاب میں میں نے صرف انہی باتوں کو اہمیت دی ہے جو منٹو کی زندگی اور اس کی تحریروں سے بار بار ظاہر ہوتی رہی ہیں اور جن کا تعلق کسی مخصوص وقت سے نہیں بلکہ منٹو کی ساری زندگی سے تھا۔

منٹو کی ادبی شخصیت ایک مستقل بحث کی صورت اختیار کر چکی ہے، اس بحث میں گالی گلوچ، پارٹی بندی، مقدمے بازی سبھی کچھ ہوتا رہا ہے۔ منٹو کے بیشتر نقاد دشمنوں اور دوستوں کی طرح صف آرا ہیں۔ ذاتی تعلقات ہمیشہ تنقید کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو خاص طور پر ادبی تنقید ذاتی تعلقات ہی کے محور پر گھومتی رہی ہے، کسی شاعر سے آپ کے دیرینہ مراسم ہیں تو ظاہر ہے کہ آپ اس کے دیوان کا مقدمہ لکھیں گے۔ اور جب مراسم دیرینہ ہیں تو مقدمے میں آخر کہاں تک سچ بولیں گے۔

کسی افسانہ نگار سے آپ کی کسی محفل میں چل گئی تو اس کے بعد وہ جو کچھ لکھے گا اس میں وہ پہلی سی بات کہاں رہے گی۔ منٹو کو شاید اتنے نقاد نصیب نہیں ہوئے جتنے دوست اور دشمن۔ دشمنوں نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی اور دوستوں نے اپنا حق ادا کیا۔ جب سے منٹو کا انتقال ہوا ہے بڑے زور شور سے عقیدت مندی کا اظہار ہو رہا ہے، منٹو کے انتخاب اور منٹو نمبر چھاپے جا رہے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ منٹو کہیں اس عقیدت مندی کے بوجھ تلے سچ مچ دفن ہو کر نہ رہ جائے۔ فن کار کی موت کا اس کی فنی اہمیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اور نہ فن کار کی موت اس بات کا جواز ہو سکتی ہے کہ اس کے فنی محاسن پر بحث کرتے ہوئے عقیدت کا لہجہ اختیار کر لیا جائے۔ منٹو نے میراجی کی وفات کے بعد ان پر ایک مضمون "تین گولے" لکھا، ایک صاحب نے احتجاج کیا کہ "دنیا کے ہر مہذب ملک اور ہر مہذب سماج میں یہ اصول مروج ہے کہ مرنے کے بعد خواہ دشمن ہی کیوں نہ ہو، اسے اچھے الفاظ کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔" اس کے جواب میں منٹو نے اپنے مخصوص تلخ لہجے میں کہا کہ میں ایسے مہذب سماج پر ہزار لعنت بھیجتا ہوں، جہاں یہ اصول مروج ہو کہ مرنے کے بعد ہر شخص کا کردار، دُھلی دُھلائی لانڈری میں بھیج دیا جائے جہاں سے وہ دُھل دُھلا کر آئے اور رحمۃ اللہ علیہ کی کھونٹی پر لٹکا دیا جائے۔" منٹو کو ایک عظیم افسانہ نگار کا مرتبہ دے کر فرط جذب سے آنکھیں جھکا لینا اس مرحوم فن کار پر بڑا ظلم ہوگا۔

منٹو کی تحریروں سے فن کار کی جو شخصیت ذہن میں ابھرتی ہے، اس کے کئی پہلو ہیں جن میں سے بیشتر آپس میں الجھے ہوئے ہیں۔ اس شخصیت کے پس منظر میں جو جذبات کار فرما تھے ان میں سب سے اہم تحسین و ستائش کا جذبہ تھا۔ حامد جلال نے اپنے مضمون میں بیان کیا ہے کہ منٹو کی عمر تین برس کی تھی جب اس نے اسی جذبے کی تسکین کی خاطر ایک شعبدہ گر کے کہنے پر دہکتے ہوئے انگاروں پر برہنہ پا چلنا گوارا کر لیا، اور بقول حامد جلال کے منٹو کو اس واقعہ کے بعد یہ خیال ہو گیا کہ "ایک مصنف اور منفرد شخصیت کی حیثیت سے آگ پر چلنا بھی ان کی زندگی کا حصہ ہے اور غیر شعوری طور پر وہ سمجھنے لگے کہ اگر وہ ایسے کرتب نہ دکھائیں جو اتنے ہی غیر معمولی اور خطرناک ہوں جتنا آگ پر چلنا، تو کوئی ان کی تعریف نہ کرے گا" طرح طرح کی افواہیں پھیلا کر لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے رہنا اسی جذبے کے اظہار کی ایک اور صورت تھی۔ منٹو اپنے پڑھنے والوں کو بار بار یقین دلاتا ہے کہ وہ جو کچھ کہتا یا کرتا ہے، کوئی آسان کام نہیں۔ خود اپنے متعلق اس نے لکھا ہے "وہ ایک ایسا انسان ہے جو صاف اور سیدھی سڑک پر نہیں چلتا بلکہ تنے ہوئے رسّے پر چلتا ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ اب گرا اب گرا لیکن وہ کمبخت آج تک کبھی نہیں گرا۔" اسی جذبے نے منٹو کو لیڈری کی طرف مائل کیا۔ آپ کو یہ لیڈری والی بات عجیب سی معلوم ہوگی، مگر منٹو کی تحریروں میں جابجا ایسے واضح اشارے ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بڑی خواہش تھی کہ لوگ اسے ایک مصلح قوم اور لیڈر کی حیثیت سے قبول کر لیں، اس کی ایک مثال تو حامد جلال کے مضمون سے ملتی ہے جہاں انہوں نے یہ کہا ہے کہ منٹو امرتسر کے نوجوان دانشوروں کے ایک گروہ کا لیڈر تھا۔ اس کی اپنی تحریروں میں کئی بیانات ایسے ہیں جن سے اس نظریہ کو تقویت پہونچتی ہے، مثال کے طور پر "کرچیں اور کرچیاں" کا یہ مکالمہ

> "ہندوستان کے مشہور نیتا کے داخلے پر کشمیر میں پابندی کر دی گئی ہے اور یہ طرفہ تماشہ ہے کہ یہ مشہور اور نڈر لیڈر خود کشمیری ہیں، سعادت حسن منٹو بھی کشمیری ہے"......

"ہندوستان کے مشہور راور نڈر نیتا جو کشمیری ہیں"

"زندہ باد"

"سعادت حسن منٹو"

اپنے آپ کو مصلح قوم سمجھنے کی خواہش اس مختصر سے مکالمے سے ظاہر ہے

"یہ کون ہے؟"

"منٹو"

"نہیں شیخ سعدی، جو اپنے وقت کا منٹو تھا"

("اوپر نیچے درمیان")

"پس منظر میں منٹو نے اپنے اصلاحی جذبے کا اظہار یوں کیا ہے:

"معلوم نہیں کم بخت کو ایسے گرے ہوئے انسانوں کو اٹھانے میں کیا مزا آتا ہے۔ ساری دنیا انہیں ذلیل اور حقیر سمجھتی ہے مگر وہ ان کو سینے سے لگاتا، ان کو پیار کرتا ہے۔"

سیاسی لیڈری میں منٹو کی دلچسپی اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ افسانوں اور مضامین میں جا بجا جلیانوالہ باغ کے حادثے کا بڑے ہی جذباتی انداز میں ذکر آتا ہے۔ اس کی سب سے واضح مثال منٹو کا افسانہ "۱۹۱۹ کی بات" ہے۔ اپنے ایک اور افسانہ "سوراج کے لئے" میں منٹو نے اپنے اس سیاسی جذبہ کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔ "میرا حال بھی ان دنوں بہت دگرگوں تھا۔ جی چاہتا تھا کہیں سے پستول ہاتھ آ جائیں تو ایک دہشت پسند پارٹی بنائی جائے۔" افسانے کے ہیرو کا ذکر جس انداز سے منٹو نے کیا ہے اس سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ ہیرو اس کے سیاسی آدرش کا آئینہ دار ہو۔ ہیرو جلیانوالہ باغ میں تقریر کر رہا تھا اور منٹو کا ردعمل یہ تھا: "تقریباً ایک گھنٹہ تک وہ بولتا رہا۔ اس دوران میں کئی بار میرے رونگٹے کھڑے ہوئے اور ایک دو دفعہ تو میرے جسم میں بڑی شدت سے یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں بم کی طرح پھٹ جاؤں ......"

ابوسعید قریشی، منٹو کو طالب علمی کے زمانے سے جانتے تھے، ان کے مضمون "رحمدل دہشت پسند" میں، منٹو کی طبیعت کے اس رجحان کی طرف یہ اشارہ ملتا ہے "متحرک تصویروں کی کہانیوں پر بحث کرنے کے بجائے انگریزوں کو ملک سے نکالنے کے پلاٹ سوچتے، دہشت پسندی کی داستانوں میں ہمیں لطف آتا تھا۔ جابر حکمرانوں کا تختہ الٹنے والوں کے آئینوں میں بھی ہمیں اپنا عکس نظر آنے لگا۔ ہم نے اپنی چشم تصور میں امرتسر کے گلی کوچوں کی ناکہ بندی کی اور انقلاب زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے انگریزوں پر ٹوٹ پڑے۔" انہی منصوبوں کے کھلونوں کا ذکر خود منٹو نے اپنے مضمون "باری صاحب" میں ان الفاظ میں کیا ہے۔ "ہمارے خلیفہ صاحب یعنی باری صاحب اگر بزدل نہ ہوتے تو یقیناً ہم چاروں اس زمانے میں ان کھلونوں سے اپنا جی بہلانے کے جرم میں پھانسی پا گئے ہوتے اور امرتسر کی خونیں تاریخ میں ایسے شہیدوں کے نام کا اضافہ ہو گیا ہوتا جو اب خلوص دل سے کہہ سکتے ہیں کہ ان کو اس وقت اپنے اس جوش کے رخ کا بھی صحیح علم نہ تھا۔

منٹو کی باغیانہ طبیعت پر بحث کرتے ہوئے ابوسعید نے یہ کہا ہے "لیکن بغاوت کی وہ چنگاری جو سعادت کے سینے میں سلگ رہی تھی، دبی نہ رہ سکی، باپ کی بے رخی، بھائیوں کی بے اعتنائی اور عزیزوں کی ستم ظریفی سے جو شعلہ بھڑکا تھا زمانے کے حوادث نے اسے ہوا دی اور وہ معاشرے کے دیمک خوردہ شہتیروں کو چاٹنے لگا، اس کے قلم کی روشنائی لاوا بنکر بہہ نکلی، جن لوگوں کے گھر اس کے راستے میں آئے وہ چیخ اٹھے، انہوں نے قانون کو مدد کے لئے پکارا، مذہب اور اخلاق کے فائر بریگیڈ کو حرکت میں لائے لیکن لاوا نہ رکا، آگ نہ بجھی۔"

اس جذبہ کے سارے نفسیاتی پہلوؤں کا صحیح طور پر مطالعہ اور تجزیہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ منٹو کی زندگی کی پوری تفصیلات مہیا کی جائیں مگر جو اقتباسات میں نے پیش کئے ہیں ان سے یہ ضرور واضح ہو جاتا ہے کہ اس جذبے کی منٹو کی زندگی میں بڑی گہری اہمیت تھی۔ اس جذبے کے زیر اثر منٹو آخر تک سیاسی قسم کے مضامین اور خاکے لکھتا رہا چچا سام کے نام اس کے خط اسی جذبے کی آخری جھلک تھے۔ ظاہر ہے کہ اس جذبے نے منٹو کے فکر اور اسلوب دونوں پر اپنا اثر چھوڑا ہوگا۔ یہ اثر دہشت پسندی اور ذاتی شہرت افزائی کی شکل میں منٹو کی تحریروں میں جا بجا ملتا ہے۔

آگے چل کر سیاسی لیڈری اور مصلح قوم بننے کے جذبے نے جو روپ دھارے اور جس طرح یہ جذبہ منٹو کے تخلیقی عمل پر اثر انداز ہوا، اس کا ذکر میں بعد میں کروں گا۔ فی الحال ان شواہد کی مدد سے اس جذبے کی اصلیت اور نوعیت واضح کرنا مقصود ہے۔ ایک دفعہ منٹو نے ہندو مسلم فسادات پر ایک اشک آور اپیل شائع کر دی جس میں نہایت سستے لیڈرانہ انداز میں یہ کہا کہ "قصر آزادی کی تعمیر فرقہ وارانہ فسادات کے شکار انسانوں کے لہو اور خود غرض لیڈروں کے نمائشی پروپیگنڈے سے نہیں ہو سکتی۔" اس سستے لیڈرانہ انداز کی

ایک اور مثال منٹو کے مضمون "مجھے شکایت ہے" میں ملتی ہے۔ اس مضمون میں یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ ادیبوں کو ان کی تحریروں کا مناسب معاوضہ ملنا چاہیئے، مطالبہ کا انداز یہ ہے۔

"آؤ ہم اپنا ایک محاذ بنائیں، سب اکٹھے ہو جائیں، اگر ہم سب اپنے قلم ایک جگہ پر رکھ دیں تو ایک پہاڑ کھڑا ہو سکتا ہے، کیوں نہ ہم تعاون سے اس بدعت کے خلاف آواز بلند کریں جو ہمارے وقار پر ایک بدنما دھبہ ہے، حضرات حالات بہت نازک ہو گئے ہیں..... میں کہتا ہوں اٹھو، اپنے سوئے ہوئے بھائیوں کو جھنجھوڑ دو، ان کے کانوں تک میرا پیغام پہنچاؤ، ایک جھنڈے تلے جمع ہو جاؤ......"

منٹو نے اپنے ادبی رفیقوں اور سیاسی کارکنوں کو جو پیغام دیئے ان کا کوئی اثر نہ ہوا، وہ نہ کوئی ادبی جماعت بنا سکا اور نہ کسی سیاسی تحریک کی رہنمائی کر سکا، اس کی وجہ یہ تھی کہ منٹو کے پاس کوئی ایسا نظام فکر نہ تھا جو کسی سیاسی یا ادبی تحریک کا باعث بن سکتا، منٹو نے جتنے علمی قسم کے مضامین لکھے ان میں ایک جذباتی رنگ تو ضرور ہے مگر خیال اور فکر کی قطعی کوئی گہرائی نہیں۔ "تجدید اسلحہ"۔ "عصمت فروشی" "گناہ کی بیٹیاں، گناہ کے باپ" اور اس قسم کے کتنے ہی اور مضامین جو منٹو نے لکھے ان کی علمی سطح بہت ہی پست ہے۔ ان مضامین کو پڑھ کر کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ مصنف نے اپنے موضوع کا گہرا مطالعہ کیا ہے، یہی حال منٹو کے طنزیہ اور فکاہیہ مکالموں اور خاکوں کا ہے۔

میں نے ابھی یہ عرض کیا کہ منٹو کے پاس کوئی انفرادی نظام فکر نہ تھا، اور اسی کمی کی وجہ سے منٹو کی شخصیت کے ایک اہم مطالبے کی تسکین نہ ہو سکی، اس ٹھیس نے مطالبے کی نوعیت بدل دی اور اب منٹو نے اپنے آپ کو مطعون کر وا کر مرکز توجہ بنانا چاہا۔ بقول حامد جلال، اپنے افسانوں کے پہلے مجموعے کے متعلق منٹو نے ناشر کو یہ ہدایت خاص طور پر دی کہ گرد پوش اس کا خاکہ ایسا بنایا جائے کہ لوگ مشتعل ہو کر گالیاں دینے لگیں، اس میں جب اسے کامیابی ہوئی تو منٹو نے اپنے آپ کو ایک ایسی شخصیت تصور کر لیا جو سماجی نظام کو درہم برہم کرنے پر مصر ہو، اپنی تحریروں میں اس نے یہ ظاہر کرنا شروع کیا کہ اس کا مقصد روایتی کڑیوں کو توڑنا، روایتی رنگوں کو مٹانا، اور ذہن کو روایتی بندھنوں سے آزاد کرنا ہے۔ منٹو نے خوش ہو کر یہ بات دہرائی کہ "عصمت" نے اس کے متعلق کچھ ٹھیک ہی کہا تھا کہ منٹو کو عجیب و غریب تہلکہ ڈال دینے والی اور سوتوں کو چونکا دینے والی چیزوں سے بڑی رغبت ہے، وہ سوچتا ہے اگر بہت سے لوگ سفید کپڑے پہنے بیٹھے ہوں اور کوئی کیچڑ مل کر وہاں چلا جائے تو سب ہکا بکا رہ جائیں گے۔ سب لوگ رو پیٹ رہے ہوں، وہاں ایک اونچا قہقہہ لگا دو تو سب دم سادھ کر تکر تکر منہ دیکھنے لگیں گے۔ بس دھاک بیٹھ جائے گی، سکہ جم جائے گا"۔ جذبے کی اس کیفیت کا منٹو کے افسانوں اور ان کے اسلوب بیان پر بڑا گہرا اثر پڑا، اور اسی کی مدد سے منٹو نے اپنی فکری زندگی میں ایک قدر پیدا کر لی۔ وہ قدر یہ تھی کہ دیکھنے میں جو چیزیں بھلی معلوم ہوتی ہیں ان کی تہ میں کوئی نہ کوئی برائی ضرور ہوتی ہے اور جو چیزیں عام طور پر بری سمجھی جاتی ہیں ان میں کوئی نہ کوئی خوبی نہاں ہوتی ہے۔ اپنے متعلق ممتاز حسین کی یہ رائے بھی منٹو کو پسند آئی کہ "وہ نیکی کی تلاش میں نکلتا ہے اور اس کی ایک کرن ایسے انسان کے پیٹ سے نکالتا ہے جس کے بارے میں آپ اس قسم کی کوئی توقع ہی نہیں رکھتے"۔ فکری نقطۂ نظر سے یہ قدر بھی ایک روایتی سی بات ہے، منٹو نے اس قدر کی ترجمانی میں بیان اور اظہار کے کچھ نئے اور موثر طریقے ضرور نکالے ہیں، مگر خیال اور فکر کے اعتبار سے اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ اس کی بنیادی وجہ شاید یہ تھی کہ طبعاً منٹو ایک بھلے مانس قسم کا انسان تھا، جس کی شخصیت میں روایتی قدریں اور روایتی مطالبے کارفرما تھے اور محض شخصی امتیاز کی خاطر اس نے اپنی تحریک میں روایتی قدروں اور روایتی مطالبوں کے خلاف احتجاج کرنا شروع کر دیا۔ ان روایتی قدروں اور مطالبوں کی جگہ پُر کرنے کے لیے منٹو اگر کوئی نیا نظام فکر یا نئی قدر پیش کر سکتا تو اس کی تحریر میں نہ تلخی رہتی اور نہ شخصی امتیاز حاصل کرنے کی ناقابل ضبط خواہش اس کی ساری شخصیت کو تڑپائے رکھتی۔ انانیت اور شخصی امتیاز کی خواہش نے منٹو کی زندگی میں آخری دم تک شور و غوغا برپا کئے رکھا۔ منٹو کی زندگی کے اس پہلو پر سب سے دلچسپ مضمون اپندرناتھ اشک کا "منٹو میرا دشمن" ہے۔ اس مضمون میں اشک نے ایک جگہ کہا ہے "پارٹی ہو، میٹنگ ہو، فارمل یا انفارمل منٹو ہمیشہ پیش پیش رہنا پسند کرتا تھا۔ اگر کسی پارٹی یا محفل میں کوئی دوسرا آدمی لوگوں کی توجہ مبذول کرلے تو وہ بڑی خاموشی سے بغیر کسی کو بتائے کھسک جاتا تھا"۔

منٹو کی ذہنی اور فکری شخصیت کے یہ پہلو میں نے کسی قدر وضاحت سے اس لیے پیش کئے ہیں کہ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے ان پر بحث کرتے ہوئے اس کے تخلیقی عمل کے مختلف عناصر کا صحیح طور پر جائزہ لیا جا سکے۔ منٹو نے ڈھائی تین سو افسانے اور خاکے لکھے ہوں گے، ان میں سے بیشتر مختلف مجموعوں میں شامل ہیں۔ ان میں سے کئی ایسے ہیں جو محض صحافتی اور

کاروباری نقطۂ نظر سے لکھے گئے۔ خصوصاً مزاحیہ خاکے جن میں طنز اور مزاح کا معیار عام اخباری سا ہے، مثلاً "ملو بیٹے کی بلا"۔ "دیواروں پر لکھا"۔ "تین بلائے جان" "ناک کی تشبیہیں"۔ ان کے علاوہ وہ آخری دور کے وہ افسانے بھی ہیں جو منٹو نے بلا سوچے سمجھے محض روپیہ حاصل کرنے کی خاطر لکھے۔ اس دور میں منٹو نے ایک ہی افسانے کو مختلف عنوانات دے کر یا اپنے کسی ڈرامے کو افسانے کی شکل دے کر ناشروں کا مضحکہ بھی اڑایا اور ڈاکٹر محمد اسد اللہ نے اپنی کتاب "منٹو میرا دوست" میں جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح ہے تو منٹو نے اور لوگوں کے افسانے بھی اپنے نام سے ناشروں کے ہاتھ بیچے۔ اس کے ریڈیائی ڈراموں کے متعلق تو کئی لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ ادھر اُدھر کے انگریزی رسالوں میں چھپے ہوئے ڈراموں اور افسانوں کا چربہ ہیں، مگر یہ بات ابھی تحقیق طلب ہے، ان سب باتوں کے باوجود اس میں شک نہیں کہ منٹو نے جو کچھ بھی لکھا اس میں ایک انفرادی رنگ ضرور ہے۔

موضوع کے اعتبار سے منٹو کے افسانے ان چار قسموں میں تقسیم ہو سکتے ہیں:

(الف) وہ افسانے جن کا تعلق کسی علمی یا نظریاتی موضوع سے ہے۔

(ب) فسادات سے متعلق افسانے

(ج) خالص جنسی افسانے

(د) ایک مخصوص ماحول اور کردار کے افسانے

پہلی قسم کے افسانوں میں قابل ذکر "سرکنڈوں کے پیچھے" ہے۔ افسانے میں چار کردار ہیں، سردار، اس کی بیٹی نواب، ہیبت خاں اور وہ عورت شاہینہ جو کہتی ہے "میرا نام ہلاکت ہے"۔ نواب کا کردار ایک ایسی فاحشہ عورت کا ہے جس کو اس امر کا قطعاً احساس نہ تھا کہ وہ گناہ کی زندگی بسر کر رہی ہے ...... "اس کے جسم میں خلوص تھا، وہ ہر مرد کو جو اس کے پاس ہفتہ، ڈیڑھ ہفتے کے بعد طویل مسافت طے کر کے آتا تھا، اپنا آپ سپرد کر دیتی تھی۔ اس لئے کہ وہ یہ سمجھتی تھی کہ ہر عورت کا یہی کام ہے اور وہ اس مرد کی ہر آسائش، اس کے ہر آرام کا خیال رکھتی تھی"۔ ہیبت خاں کیلئے نواب ایک بے پناہ کشش تھی، مگر ہیبت خاں کو ایک خوف سا لگا رہتا تھا، افسانے کا بیشتر حصہ نواب اور ہیبت خاں کے تعلق کے بارے میں ہے۔ آخر میں افسانہ یک لخت پلٹا کھاتا ہے اور ہیبت خاں ایک ہفتے تک غائب رہنے کے بعد جب نواب سے ملنے آتا ہے تو اس کے ساتھ ایک نوجوان اور خوبصورت عورت ہے، یہ عورت آتے ہی افسانے کے سارے ماحول پر چھا جاتی ہے اور دراصل اس خوف کی علامت ہے جو ہر وقت ہیبت خاں کو لگا رہتا تھا۔ وہ سردار اور ہیبت خاں دونوں کو باہر نکال دیتی ہے اور نہایت اطمینان سے نواب کو مار کر اس کا گوشت اس کی ماں کو پکانے کے لئے دے دیتی ہے۔ ہیبت خاں یہ سب کچھ چپ چاپ برداشت کر لیتا ہے۔ محض اس لئے کہ یہ عورت "اس کی زندگی کی سب سے پہلی عورت تھی"۔ وہ اس کے تحکم کے نیچے شاید اس لئے دب کے رہ گیا تھا کہ "وہ بالکل اناڑی تھا"۔ ہیبت خاں جب زور سے چلا کر یہ کہتا کہ تم نے یہ کیا کیا، تو وہ مسکرا کر جواب دیتی ہے "جان من یہ پہلی مرتبہ نہیں۔ دوسری مرتبہ ہے، میرا خاوند، اللہ اسے جنت نصیب کرے، تمہاری طرح ہی بے وفا تھا، میں نے خود اس کو اپنے ہاتھوں سے مارا تھا اور اس کا گوشت پکا کر چیلوں اور کوؤں کو کھلایا تھا، تم سے مجھے پیار ہے، اس لئے میں نے تمہارے بجائے ......"

نواب کا کردار افسانہ نگار نے اپنے ایک پسندیدہ نظریہ کے مطابق ڈھالا ہے اور وہ نظریہ یہ ہے کہ وہ لڑکیاں جو طوائفوں کے ماحول میں پلتی ہیں ان کے دل میں اپنی زندگی کے بارے میں کوئی گناہ کا احساس نہیں ہوتا، نواب چونکہ سرکنڈوں کے اس پار کی دنیا سے ناواقف ہے، اس لئے وہ اپنی دنیا کو بغیر کسی جھجک کے قبول کر لیتی ہے۔ ہیبت خاں، جس کا قد چھ فٹ ہے، اس لئے دبکا رہتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کی سب سے پہلی عورت کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتا، شاہینہ وہ روایتی عورت ہے جو رقابت کے جذبے کے زیر اثر قتل کرنے سے بھی گریز نہیں کرتی۔ افسانہ میں یہ تین کردار، جو مختلف نظریوں کے حامل ہیں، علیحدہ علیحدہ رہتے ہیں اور کہیں بھی ان کے آپس میں ملنے سے کوئی ایسی کیفیت پیدا نہیں ہوتی جسے افسانے کا مرکزی نقطہ کہا جا سکے اور نہ ان تینوں میں سے کوئی اپنے نظریے کی ایسی ترجمانی کرتا ہے کہ پڑھنے والے کو اس کی سچائی کا یقین آ سکے۔ ممتاز شیریں نے اس افسانے کے نسوانی کرداروں پر بڑی طویل بحث کی ہے اور ان کے رشتے افسانوی ادب کے بعض معروف کرداروں سے ملائے ہیں، مگر اس بات کا اعتراف انہوں نے بھی کیا ہے کہ افسانہ کا انجام میلوڈراماٹی اور تاثر کے لحاظ سے ناکام ہے۔

اس طرح کے دوسرے افسانوں میں بھی جہاں کہیں منٹو نے کسی مخصوص نظریئے کی ترجمانی کے لئے کرداروں کو علامتوں کے طور پر استعمال کیا ہے وہاں نہ تو کردار ہی قائم ہو سکے ہیں اور نہ نظریئے کی وضاحت ہوئی ہے۔ ایسے افسانوں کا انجام عموماً میلوڈراماٹی انداز سے ہوا، "فرشتہ"، "اولاد"، "خالد میاں"، "پڑھیے کلمہ"، "حسن کی تخلیق" اور "بادشاہت کا خاتمہ" اس کی مثالیں ہیں۔ "حسن کی تخلیق" میں شاہدہ

اور شاید احساس حسن اور خود پسندی کی علامتیں ہیں۔ ان دونوں کی شادی سے جو بچہ ہوا اس کے سر پہ سینگ اور ماتھے پر ایک آنکھ تھی۔ "بادشاہت کا خاتمہ" ایک ایسے کردار کی کہانی ہے جس کی زندگی کی حسرت عورت کی محبت تھی۔ ٹیلیفون پر ایک اجنبی عورت اس سے اظہار محبت کرتی ہے، ٹیلیفون پر بڑی دلچسپ گفتگو ہوتی رہتی ہے، مگر افسانہ نگار محبت کی بھوک کے نظریئے کے ترجمان کردار سے جب کوئی خاطر خواہ افسانوی صورت حال پیدا نہیں کر سکتا تو اسے ٹیلیفون کے پاس ہی اوندھے منہ گرا کر ختم کر دیتا ہے۔

بعض جنسی موضوع بھی منٹو نے جب ایک فکری معیار پر لاکر اپنے افسانوں میں پیش کئے تو ان کا انجام بھی میلوڈرامائی ہوکر رہ گیا۔ اس کی سب سے واضح مثال "ننگی آوازیں" ہے۔ افسانہ ایک نفسیاتی الجھن کے متعلق ہے۔ یہ الجھن افسانے کے مرکزی کردار کے ذہن میں رات کے اندھیرے میں آس پاس چارپائیوں پر پڑے ہوئے لوگوں کی آوازیں سن کر پیدا ہوتی ہے، وہ آوازیں "جو فوراً تصویر بن کر اسکی آنکھوں کے سامنے سے گذر جاتی تھیں"۔ اس الجھن میں پھنس کر یہ کردار اپنی جنسی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے۔ یہاں تک تو بات سمجھ میں آ سکتی ہے مگر افسانہ نگار نے اختتام پر جو قطعی غیر ضروری میلوڈرامائی کیفیت پیدا کردی ہے اس سے افسانے کے مرکزی نظریئے کا کوئی تعلق نہیں۔ بھولو کو جب پتہ چلا کہ اس کے بھائی اور بھاوج کو اس کی حالت کا علم ہو چکا ہے تو وہ "اٹھا اور کوٹھے پر چڑھ کر جتنے ٹاٹ لگے تھے اکھاڑنے شروع کر دیئے، کھٹ کھٹ پھٹ پھٹ سن کر لوگ جمع ہو گئے انہوں نے اس کو روکنے کی کوشش کی تو وہ لڑنے لگا، بات بڑھ گئی، کلن نے بانس اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا، بھولو چکرا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا، جب ہوش آیا تو اس کا دماغ چل چکا تھا، اب وہ الف ننگا بازاروں میں گھومتا پھرتا ہے، کہیں ٹاٹ لٹکا دیکھتا ہے تو اس کو اتار کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے"۔

یہاں منٹو کے ایک میلوڈراما "اس منجدھار میں" کا ذکر بے محل نہ ہوگا اس ڈرامے کے متعلق ممتاز شیریں کی یہ رائے ہے کہ "اگر کوئی اس منجدھار میں کی گہرائیوں کو سمجھ سکے تو اسے یہ احساس ہوگا کہ اس میں منٹو نے منفی عناصر کو، جن میں زندگی کی قوت نہیں، عدم اور فنا کی طرف جاتے ہوئے دکھایا ہے اور ان اثباتی عناصر کو آپس میں ملایا ہے جن سے حیات کی تجدید ہوتی ہے اور زندگی آگے بڑھتی ہے" منٹو کا یہ میلوڈراما زندگی کی ایک ایسی کیفیت کو پیش کرتا ہے جو پہلے بھی مختلف صورتوں میں ادبی اظہار کا باعث بن چکی ہے۔ ایک حسین بیوی، اس کا مفلوج شوہر، شوہر کا تندرست بھائی جو بیوی کے لئے ذریعہ نجات بنتا ہے، اور ایک بدصورت خادمہ جو مفلوج مرد کا ساتھ دیتی ہے۔ یہ ہیں وہ چار کردار جن پر منٹو نے اپنے میلوڈراما کی بنیادیں رکھی ہیں۔ ممتاز شیریں نے مفلوج شوہر اور خادمہ کو منفی عناصر قرار دیا ہے، جو فنا ہو جاتے ہیں اور حسین بیوی اور بھائی کو اثباتی عناصر کہا ہے جن سے حیات کی تجدید ہوتی ہے۔ مرکزی سوال منفی اور مثبت عناصر کی کشمکش نہیں ہے، ایک مفلوج شوہر کی نفسیاتی الجھن کا حل کرنا ہے۔ ڈرامہ میں اثباتی عناصر یعنی مجید اور سعیدہ ساتویں منظر کے آخر میں ایک لمحے کے لئے اکٹھے دکھائی دیتے ہیں۔ مجید چاہتا ہے کہ جب تک اس کا بھائی زندہ ہے وہ کہیں اور چلا جائے، مگر سعیدہ "ایسا نہ کہو مجید۔ اتنے ظالم مت بنو" کہکر اسے روک لیتی ہے۔ ان دونوں کے بڑھتے ہوئے تعلقات ڈرامہ میں دوسرے کرداروں کے ذریعے واضح کئے گئے ہیں۔ ڈرامہ نگار نے کہیں ان دو کرداروں کو وہ اہمیت نہیں دی جس سے یہ احساس ہو کہ وہ اثباتی عناصر کو تجدید حیات کا باعث بنا کر پیش کر رہا ہے، خاص طور پر سعیدہ کا کردار تو محض اس کے مفلوج شوہر کی بے چارگی کو اور زیادہ پُر درد بنانے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ چوتھے منظر کے آخر میں جب امجد، سعیدہ سے کہتا ہے کہ وہ محض بہلا دے کے طور پر اس کے پاس لیٹ جائے تو سعیدہ اس پر رحم کھا کر اس کی یہ درخواست قبول کر لیتی ہے۔ سعیدہ کے رویہ سے کہیں یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ امجد کے مسئلہ میں اس کی ذات بھی شریک ہے۔ وہ تمام ڈرامہ میں ایک حسین اجنبی کی طرح دور دور رہتی ہے ڈرامہ نگار کو دراصل سعیدہ کے مسئلے کا نہ کوئی گہرا احساس تھا اور نہ اس سے ہمدردی ہی تھی، لہٰذا وہ سعیدہ کے رویئے کو قابل نفرین بنا کر امجد کو اس کی خادمہ اصغری کی طرف ڈھکیل دیتا ہے۔ چوتھے منظر کی بہ نسبت آٹھویں منظر کا وہ حصہ جس میں امجد اور اصغری ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں کہیں زیادہ ہمدردی اور احتیاط سے لکھا گیا ہے، ڈرامہ کا انجام یہ ہوتا ہے کہ امجد اور اصغری کھڑکی سے اندھیرے میں کود کر خودکشی کر لیتے ہیں اور امجد یہ کہتے ہوئے "میری پہاڑیاں میری پیاری پہاڑیاں میری پیاری اصغری"! جان دے دیتا ہے۔ ڈرامہ کا انجام ہی یہ بتاتا ہے کہ جو مسئلہ اس نے انتخاب کیا، منٹو کے پاس اس کا کوئی حل نہ تھا۔ ڈرامہ میں اصغری، امجد کی ذہنی اذیت کا باعث بن جاتی ہے اور خود اس کا اپنا کردار نامکمل رہ جاتا ہے۔ ڈرامہ میں کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ اثباتی عناصر تحریک میں

اگر کسی خاص مقصد کو اپنانا چاہتے ہیں مجید اور سعیدہ دونوں جامد کردار ہیں جن کے بے جان ہونے کا پورا احساس ڈرامے کو اسٹیج پر دیکھ کر ہی ہو سکتا ہے۔

نکاری یا نظریاتی تحریروں میں منٹو کی سب سے اثر انگیز اس کا افسانہ "نیا قانون" ہے۔ اس میں فکر یا نظریہ کی کوئی گہرائی تو نہیں۔ مگر جس جذبہ کا اظہار کیا گیا ہے وہ ایک خاص ماحول کا آئینہ دار ہے۔ ایک ایسا ماحول جس سے منٹو جس کی روح میں جلیانوالہ باغ کی یاد تازہ تھی، پوری طرح آشنا تھا اور جس کو درہم برہم کرنے کے لئے وہ مدتوں تڑپتا رہا۔ استاد منگو جب گورے کو دھڑا دھڑ پیٹ کر رکھ دیتا ہے، تو اس سے منٹو کے دل میں جو انتقام کی خواہش برسوں سے پل رہی تھی، اس کی شدت کا پتہ چلتا ہے۔

فسادات کے موضوع پر منٹو نے "ایک اشک آلود اپیل" کے علاوہ بہت کچھ لکھا۔ جہاں کہیں نظریہ اور خیال کو چھوڑ کر منٹو نے کوئی سیدھا سادا واقعہ بیان کیا ہے وہ ضرور اپنا اثر چھوڑ گیا ہے۔ فسادات کے افسانوں میں "رام کھلاون"، "سہائے" اور "شاردا" کئی بڑا افسانے ہیں۔ ہیروئن کی ذات کو ایک نظریاتی رنگ میں پیش کرنے کے لیے افسانہ نگار کو میلوڈراما کا سہارا لینا پڑا۔ افسانہ دراصل وہیں ختم ہو جاتا ہے جہاں ہیروئن کچھ دیر گم سم کھڑی رہنے کے بعد دروازہ کھول کر باہر چلی جاتی ہے۔ اس کے بعد افسانہ اور "س" میں اس کی ذات کے متعلق جو مزید گفتگو ہوتی ہے، وہ غیر ضروری ہے اور اسی گفتگو کے دوران میں افسانہ نگار ہمیں یہ بھی اطلاع دیتا ہے کہ وہ عورت جب چلی گئی تو اس کی موٹر سے کوئی حادثہ پیش آیا اور وہ مر گئی۔

"سیاہ حاشیے" کے دیباچہ میں محمد حسن عسکری نے لکھا ہے: "فسادات کے متعلق جتنے بھی افسانے لکھے گئے ہیں، ان میں منٹو کے یہ چھوٹے چھوٹے لطیفے سب سے زیادہ ہولناک اور سب سے زیادہ رجائیت آمیز ہیں۔ منٹو کی دہشت اور منٹو کی رجائیت سیاسی لوگوں یا انسانیت کے نیک دل خادموں کی دہشت اور رجائیت نہیں ہے، بلکہ ایک فن کار کی دہشت اور رجائیت ہے۔ اس کا تعلق بحث و تمحیص یا تفکر سے نہیں ہے بلکہ ٹھوس تخلیقی تجربے سے۔" یہی منٹو کے ان افسانوں کا واحد امتیاز ہے۔ "سیاہ حاشیے" کے افسانوں اور لطیفوں میں منٹو کا مشاہدہ ذاتی اور بلا واسطہ تھا، جسے منٹو نے خام مواد کی طرح بغیر کوئی جذباتی یا نظریاتی رنگ دیئے پیش کر دیا۔

فسادات کے افسانوں میں "ٹوبہ ٹیک سنگھ" ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، اس لئے کہ اس افسانہ میں منٹو ایک معمولی سے واقعہ کو ایک ایسا رنگ دے دیتا ہے کہ انسان ایک لمحہ کے لئے پھر سے وہ ذہنی توازن حاصل کر لیتا ہے جو فسادات کے زمانے میں جذباتیت کی بنا پر مفقود ہو چکا تھا۔ منٹو کے افسانے "کھول دو" پر بڑی لے دے ہوئی، اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ منٹو نے جو کردار پیش کیا تھا اسے قبول کرنے کو ذہن تیار نہ تھا، یہ کردار فسادات کا نہایت ہی عام سا کردار تھا جس کی مظلومیت اور معصومیت دونوں مسلمہ تھیں۔ البتہ افسانہ نگار نے کہانی کو کچھ اس طرح ختم کیا کہ لوگ بنیادی جذبے کو چھوڑ کر محض ان دو الفاظ "کھول دو" سے چونک کر رہ گئے۔ یہ کہانی منٹو کی دہشت پسندی کی نذر ہو گئی۔ افسانہ نگار کردار کی طرف توجہ دینے کے بجائے سارا وقت ان دو الفاظ کے استعمال کے لئے زمین تیار کرنے میں لگا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ تو چونک اٹھے مگر کہانی کا خیال اور مرکزی کردار دونوں سطحی اور دھندلے دھندلے سے ہو کر رہ گئے۔

جہاں تک عام پڑھنے والوں کا تعلق ہے، وہ منٹو کو اس کے جنسی افسانوں کی وجہ سے جانتے ہیں۔ انہی افسانوں کی وجہ سے منٹو مشہور بھی ہوا اور انہی کی وجہ سے اس کی زندگی میں مصیبتیں بھی آئیں۔ "بو"، "دھواں"، "کالی شلوار"، "ٹھنڈا گوشت" ان افسانوں میں سے ہیں جن پر وقتاً فوقتاً فحاشی کا الزام لگتا رہا ہے۔ ان میں سے پہلے تین "لذتِ سنگ" میں ہیں اور اسی مجموعے میں منٹو کے وہ مضامین بھی ہیں جو اس نے جنسی ادب اور فحاشی کے متعلق لکھے۔ "ٹھنڈا گوشت" پر منٹو نے بڑی تفصیل سے بحث کی ہے جو "رحمتِ مہرِ درخشاں" کے عنوان سے اس کے افسانوں کے مجموعے "ٹھنڈا گوشت" میں شامل ہے۔ فحاشی کے مسئلے پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ میری رائے میں فحاشی کا مسئلہ ایک اخلاقی مسئلہ ہے، ادب کا تعلق اظہار اور ذوق سے ہے اور ادب کی قدروں کو کسی مخصوص اخلاقی قدر کے پابند یا ماتحت نہیں کہا جا سکتا۔ ایک ادبی شاہکار کی جانچ پرکھ، اظہار اور ذوق ہی کے معیار پر کی جا سکتی ہے۔ کسی زمانے کے ذوق اور اظہار کی اقدار میں بالواسطہ اخلاقی اقدار کے بعض عناصر بھی شامل ہوتے ہیں، گو ان عناصر کی ان اقدار میں اہمیت متعین کرنا آسان نہیں۔ خالص ادبی اور فنی اصولوں کے علاوہ تاریخی اور سماجی شعور، اخلاقی احساس، اور ذہنی مطالبوں کی گونج سب مل جل کر ایک خاص زمانے کے ذوق اور اظہار کی اقدار کی تربیت دیتے ہیں۔ اس امتزاج میں یہ سب عناصر کچھ ایسے گھل مل جاتے ہیں کہ ان کو علیحدہ کرنا اور انفرادی حیثیت سے پرکھنا ممکن نہیں رہتا۔ اعلیٰ ذوق میں ان عناصر کی ترتیب ایسی متوازن ہوتی ہے کہ وہ اپنے وقت کی صحیح اور مکمل ترجمانی کر سکتا ہے، ادنیٰ یا پست ذوق میں کوئی خاص عنصر دوسروں پر

اس طرح حاوی ہو جاتا ہے کہ ترتیب غیر متوازن اور اس کا دائرہ محدود ہو جاتا ہے۔ ایک ادبی تخلیق کو صحیح طور پر ذوق اور اظہار کی اقدار کے مطابق ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ ان اقدار میں حسن اور سچائی کی اقدار شامل ہوتی ہے لیکن کسی ادبی تخلیق کو اگر سچائی کے اصولوں پر ہی پرکھا جائے تو ظاہر ہے کہ اس تخلیق کے ساتھ پورے طور پر انصاف نہیں ہوگا۔ اس کے برعکس ایک تاریخی مقالے کی صحیح وقعت سچائی ہی کے اصولوں کے مطابق قائم کی جا سکے گی۔ اس طرح کسی ادبی تخلیق کو کسی مخصوص اخلاقی قدر کی روشنی میں جانچنا یا اس قدر میں اس تخلیق کا جواز ڈھونڈنا مناسب ادبی تنقید قرار نہیں دیا جا سکتا۔

منٹو کے جنسی افسانوں پر عام طور پر جو اعتراض کئے جاتے ہیں انکی نوعیت اخلاقی ہے۔ ان اعتراضات کے جو جواب منٹو نے دیئے وہ بھی اخلاقی ہیں معترضین کی طرف سے کہا گیا کہ افسانوں میں مرد اور عورت کے رشتے کو جس طرح بیان کیا گیا ہے اس سے ذہن پر غیر اخلاقی اثر پڑتا ہے۔ اس کا جواب منٹو نے یہ دیا کہ اس کے افسانے تندرست اور صحت مند لوگوں کے لئے ہیں، اگر انہیں اچھی طرح پڑھا جائے تو ان سے ان کے اخلاق پر یقیناً اچھا اثر پڑے گا۔ "ٹھنڈا گوشت" کے سلسلے میں منٹو نے اخلاقی جواز پیش کیا ہے کہ "افسانے کو پڑھنے کے بعد ہمیں انسانیت کی وہ رمق دکھائی دیتی ہے جو ایشر سنگھ کے سیاہ قلب میں خود اس کا مکروہ فعل پیدا کرتا ہے۔ اور یہ ایک صحت مند چیز ہے کہ اس افسانہ کا مصنف انسانوں اور انسانیت سے مایوس نہیں ہوا۔ اگر مصنف نے ایشر سنگھ کے دل و دماغ پر نفسیاتی ردعمل پیدا نہ کیا ہوتا تو یقیناً "ٹھنڈا گوشت" ایک نہایت ہی مہمل چیز ہوتی۔" اس بیان سے ظاہر ہے کہ افسانہ نگار نے اپنی ایک تخلیق کا جواز ایک مخصوص ذہنی کیفیت میں ڈھونڈا ہے، اور یہ مخصوص ذہنی کیفیت چونکہ اسے موجودہ اخلاقی اقدار کے مطابق صحت مند معلوم ہوتی ہے، لہٰذا وہ افسانے کو کامیاب سمجھتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ان حالات میں اگر ایشر سنگھ کا ردعمل اس مخصوص ردعمل کے علاوہ کچھ اور ہوتا تو افسانہ بے معنی اور مہمل ہو کر رہ جاتا۔ ادبی اقدار کے مطابق یہ نقطۂ نظر صحیح نہیں سمجھا جا سکتا، اس لئے کہ ان حالات میں ایک انسان کے ردعمل کی ہزار نفسیاتی صورتیں ہو سکتی ہیں، افسانہ نگار اپنے مشاہدے اور تجربے کے مطابق کسی ایک صورت کو تخلیق کی آنچ دیکر روشن کر سکتا ہے۔

اپنے جنسی افسانوں کی وجہ سے منٹو کے ذاتی امتیاز حاصل کرنے کی خواہش تو پوری ہو گئی، مگر اس کے مصلح وقت بننے کے جذبے کو کچوکے لگتے رہے۔

بنیادی طور پر چونکہ وہ سیدھا سادا روایتی قسم کا انسان تھا۔ لہٰذا فحاشی کے الزام سن کر اسے ذہنی طور پر ضرور کوفت ہوئی ہوگی۔ اسی لئے اس نے لوگوں کو یقین دلانا چاہا کہ منٹو ایک "طہارت پسند" انسان ہے اور اپنے متعلق یہ بیان دیا کہ "میں ایک شریف خاندان کا فرد ہوں، اتفاق سے میرا پیشہ تصنیف و تالیف ہے، اپنی فطرت اور جو تعلیم و تربیت مجھے ملی ہے، اس کی بدولت میں نے آج تک سستا اور سوقیانہ ادب پیش نہیں کیا" آخر میں اس لعن طعن سے گھبرا کر اس نے یہ کہنا شروع کیا کہ اگر میں ناجائز شراب کشید نہیں کرتا، الاٹمنٹ نہیں کراتا، بلیک نہیں کرتا تو مجھے حق پہنچتا ہے کہ میں فحش افسانے لکھوں، لکھنا چھوڑ دوں یا احتساب سے قطعاً بے پروا ہو کر قلم زنی کرتا رہوں، سچ پوچھئے تو طبیعت اس قدر کھٹی ہو گئی تھی کہ جی چاہتا تھا کہ کوئی چیز الاٹ ہو جائے تو آرام سے کسی کونے میں بیٹھ کر چند برس قلم اور دوات سے دور رہوں، دماغ میں خیالات پیدا ہوں تو ایسی پھانسی کے تختے پر لٹکا دوں، الاٹمنٹ میسر نہ ہو تو بلیک مارکٹنگ شروع کر دوں یا ناجائز طور پر شراب کشید کرنے لگوں۔"

اس فحاشی کی بحث میں ایک نقصان یہ بھی ہوا کہ منٹو کے جنسی افسانوں کے متعلق ادبی اور فنی نقطۂ نظر سے بہت کم سوچا گیا، فیض احمد فیض نے "ٹھنڈا گوشت" کے متعلق بیان دیتے ہوئے کہا کہ "اس افسانے کے مصنف نے فحش نگاری نہیں کی، لیکن ادب کے اعلیٰ تقاضوں کو بھی پورا نہیں کیا۔" خود منٹو کو اس بات کا افسوس تھا کہ اس کی اس تصنیف پر مقدمے کے دوران میں کوئی ادبی تنقید نہیں ہوئی، مجھے اس سے غرض نہیں کہ یہ افسانہ اخلاقی نقطۂ نظر سے فحش ہے یا نہیں۔ ادبی سوال یہ ہے کہ افسانہ کا مرکزی جذبہ مناسب الفاظ اور موزوں انداز میں پیش کیا گیا ہے یا نہیں؟ کیا پڑھنے والے کا ذہن طریق اظہار سے مرکزی جذبے کو اپنانے میں کامیاب ہوتا ہے یا نہیں؟ افسانے کی ادبی کامیابی کا انحصار اسی سوال کے جواب پر ہے۔ مرکزی جذبہ یہ ہے کہ ایک انسان جو انتہائی بے رحمی سے قتل و غارت اور لوٹ مار میں حصہ لے رہا ہے جب ایک مردہ لڑکی سے جنسی فعل کا مرتکب ہونے لگتا ہے تو اس کا ردعمل اس قدر شدید ہوتا ہے کہ وہ اپنی جنسی خواہش ہمیشہ کے لئے کھو بیٹھتا ہے۔ ایشر سنگھ افسانے میں ایک ایسے نفسیاتی مریض کی حیثیت سے داخل ہوتا ہے جب پر پورا واقعہ گزر چکا ہے اور جس کی یاد نے اسے دیوانہ سا کر دیا ہے۔ وہ ایک دفعہ پہلے اپنی بیوی کے پاس آ کر ناکام جا چکا ہے اور اب کئی دنوں کے بعد پھر لوٹ کر آیا ہے، افسانے کے

خورد شدہ مسئلہ میں ایشر سنگھ کی ذہنی کیفیت کے متعلق اشارے موجود ہیں، مگر بیان میں جا بجا ایسے مقام آتے ہیں جہاں ذہن بنیادی جذبے سے ہٹ کر اور خیالوں کی طرف نکل جاتا ہے۔ پہلے چند جملوں ہی میں ایسے لفظ نکل آتے ہیں جو ایک خاص جنسی پہلو لئے ہوئے ہیں۔ "کلونت کور کو تھوڑی دیر کے بعد اپنا آسن پسند نہ آیا اور دونوں ٹانگیں پلنگ سے نیچے لٹکا کر ہلانے لگی" ذرا آگے چل کر جب افسانہ نگار ایشر سنگھ اور کلونت کور کے قرب کا منظر پیش کرتا ہے تو اس میں جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ کسی طرح بھی ایک نفسیاتی مریض کے ذہن کا پرتو نہیں ہو سکتے، وہ جنسی منظر افسانہ نگار بالکل اس طرح پیش کرتا ہے جیسے مرد اور عورت دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک دوسرے میں گم ہوئے جا رہے ہوں۔ "ایشر سنگھ ہونٹوں سے آج ظلم کہکر مزید ظلم ڈھانے لگتا ہے اور کلونت کور تیز آنچ پر چڑھی ہوئی ہانڈی کی طرح ابلنے لگتی ہے۔" اس منظر کے بیان میں افسانہ نگار نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں وہ قاری کے ذہن کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ ایشر سنگھ کے نفسیاتی مسئلے کو بھول کر منظر کے خالصاً جنسی پہلو کو قبول کرے، اسی لئے منظر کے اختتام پر افسانہ نگار جب یہ کہتا ہے کہ "ایشر سنگھ ان تمام حیلوں کے باوجود خود میں حرارت پیدا نہ کر سکا" تو ذہن کو یہ بات کچھ جھوٹی سی لگتی ہے، افسانہ نگار چند لمحوں کے لئے مرکزی تجربہ کو چھوڑ کر ایک ایسا جنسی منظر بیان کرنے لگتا ہے، جو قاری کے ذہن کو تجربے سے دور لے جاتا ہے۔ یہی خامی "دھواں" میں ہے۔ اس افسانے کے متعلق منٹو نے کہا ہے "دھواں میں شروع سے لے کر ایک کیفیت، ایک جذبے، ایک تحریک کا نہایت ہی ہموار نفسیاتی بیان ہے، اس میں ہمیں کہیں بھی ایسی ترغیب نظر نہیں آتی جو قارئین کو شہوانی لذتوں کے دائرے میں لے جائے" پہلی بات تو یہ ہے کہ اس افسانے میں ایک جذبے کا بیان نہیں ہے بلکہ دو جذبوں کا بیان ہے۔ ایک وہ گمنام غیر شعوری احساس جو مسعود کیلئے لذت کا سامان پیدا کرتا ہے اور دوسرا لذت کا وہ شعوری احساس جو کلثوم کو اکساتا ہے، انہی دو جذبوں کی وجہ سے کہانی کا توازن برقرار نہیں رہتا، اس لئے کہ افسانہ نگار کا مقصد تو محض مسعود کی غیر شعوری جنسی بیداری کا اظہار کرنا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ افسانہ نگار نے مسعود کی ذہنی کیفیت کا اظہار نہایت ہی پُراثر اور بقول منٹو کے "نہایت درجہ محتاط" انداز میں کیا ہے، منٹو کو اس بات کا احساس تھا کہ اگر اس نے مسعود کے دماغ میں شہوانی خیالات کی موجودگی کا ذکر کیا تو "ایسی لغزش افسانے کا ستیاناس کر دیگی مگر افسانہ نگار نے اپنی تمام تر توجہ مسعود پر صرف کر دی اور کلثوم افسانے میں شروع سے آخر تک بڑی آزادی سے جنسی تسکین کے ذرائع نکالتی رہی۔ منٹو کو یہ خیال تھا کہ اس نے "اس بے نام سی لذت میں جو مسعود کو محسوس ہو رہی تھی خود کو یا قارئین کو شریک نہیں کیا" مگر اسے اس بات کا احساس نہیں تھا کہ اس نے اپنے انداز بیان سے پڑھنے والے کو اس لذت میں شریک ہونے کا موقع دیا جو کلثوم محسوس کر رہی تھی: "مسعود کے وزن کے نیچے کلثوم کی چوڑی چکلی کمر میں خفیف سا جھکاؤ پیدا ہو گیا، جب اس نے پیروں سے دبانا شروع کیا، ٹھیک اسی طرح جس طرح مزدور مٹی گوندھتے ہیں، تو کلثوم نے مزا لینے کی خاطر ہولے ہولے ہائے ہائے کرنا شروع کیا۔"

اس "ہولے ہولے ہائے ہائے" کرنے میں جو لذت ہے اس میں افسانہ نگار اور قاری دونوں شریک ہیں۔ اس کے بعد کی گفتگو کا جو رنگ ہے اس میں بہن بھائی کا تعلق قریب قریب ختم ہو جاتا ہے۔ لڑکی کہتی ہے "میرے گدگدی ہوتی ہے تم وحشیوں کی طرح دباتے ہو" لڑکا کہتا ہے "اب کی دفعہ میں پورا بوجھ آپ پہ نہیں ڈالوں گا" قاری کا ذہن لڑکی کے جسم کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور افسانہ کا مرکزی خیال پس منظر میں چلا جاتا ہے۔

منٹو کے جنسی افسانوں میں اگر بنیادی جذبے اور اظہار بیان میں پوری مطابقت ہوتی تو نہ صرف یہ افسانے ادبی لحاظ سے کامیاب ہوتے، بلکہ ان پر اخلاقی نقطۂ نظر سے جو اعتراض ہوتے رہے ہیں، ان کی شدت بھی شاید بہت کم ہوتی۔

ہم نے شروع میں عرض کیا تھا کہ منٹو کی شخصیت کا سب سے بڑا مطالبہ نام پیدا کرنے کا تھا، اسی دھن میں اس نے رہبر قوم اور مصلح ملت بننے کی بھی بڑی کوشش کی، مگر اس لئے کہ اس کے پاس کوئی علمی، فکری نصب العین یا پیغام نہیں تھا، وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا، اس کا نام تو اس نے پیدا کر لیا، مگر اسے اس بات کا احساس ضرور رہا کہ اس کے اصلاحی عمل کو لوگ صحیح طور پر سمجھ نہیں پائے، اس نفسیاتی مسئلے کی مختلف کیفیتیں میں نے ان کے مضامین اور مختلف قسم کے افسانوں سے اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

اب منٹو کے افسانوں اور خاکوں کی وہ قسم رہ گئی ہے جس میں نفسیاتی الجھنوں سے کسی حد تک آزاد ہو کر منٹو کے جوہر کو اظہار کا موقع ملا۔ یہ افسانے اور خاکے وہ ہیں جن میں منٹو نے ایک خاص ماحول اور اس ماحول میں چلتے پھرتے کئی ایک زندہ جاوید کردار پیش کئے ہیں۔

اس گروہ میں فلمی دنیا کی وہ کہانیاں بھی شامل ہیں جو منٹو نے اپنے

''کائنات'' (تجریدی آرٹ کا ایک نمونہ)　　　عمل : احمد پرویز

جاننے والوں کے متعلق لکھیں۔ ماحول اور کردار کی کہانیوں اور افسانوں کا معیار تاثر کے اعتبار سے منٹو کی دوسری تحریروں سے بلند تر ہے، مگر ان میں بھی جا بجا منٹو کی انانیت اور دہشت پسندی کی مثالیں ملتی ہیں۔ "میرا نام رادھا ہے" اور "موذیل" دونوں کا اختتام میلوڈرامائی انداز سے ہوتا ہے۔ "میرا نام رادھا ہے" میں راجہ جب نیلم کے قابو میں آ جاتا ہے تو اس منظر کے بیان میں افسانہ نگار نے انتہائی گہرے اور شوخ رنگ استعمال کئے ہیں۔ "وہ سی سی کرتا رہا، لیکن جب میں نے اس کے ہونٹوں سے اپنے لہو بھرے ہونٹ پیوست کئے اور اسے ایک خطرناک جلتا ہوا بوسہ دیا تو وہ انجام رسیدہ عورت کی طرح ٹھنڈا ہو گیا، میں اٹھ کھڑی ہوئی ...... مجھے اس سے ایک دم نفرت پیدا ہو گئی ..... میں نے پورے قد سے اس کی طرف نیچے دیکھا ...... اس کے خوبصورت بدن پر میرے ہونٹ اور لپ اسٹک کی سرخی نے بہت ہی بدنما بیل بوٹے بنا دیئے تھے۔ اسی طرح موذیل کے ایثار کی کہانی بھی افسانہ نگار کی دہشت پسندی کی وجہ سے غیر متوازن ہو گئی ہے۔ موذیل جب کرپال کور کو بچانے کے لئے اپنی جان کی قربانی پیش کر دیتی ہے تو اس کے بعد اس کی موت کی گھناؤنی تفصیلات درج کرنے سے افسانہ کو کوئی تقویت نہیں پہنچتی، مگر منٹو فطری انجام سے کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ موذیل سیڑھیوں سے گر پڑتی ہے۔ "اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا، کانوں کے رستے بھی خون نکل رہا تھا۔ وہ جو دروازہ توڑنے آئے تھے اردگرد جمع ہو گئے۔ کسی نے بھی نہ پوچھا کیا ہوا ہے۔ سب خاموش تھے اور موذیل کے ننگے اور گورے جسم کو دیکھ رہے تھے جس پر جا بجا خراشیں پڑی تھیں۔"

"موذیل"، "ممی" اور "جانکی"، ایک ہی کردار کے مختلف روپ ہیں۔ اس کردار کا بنیادی تقاضا ایثار کا ہے، ان میں جانکی نسبتاً زیادہ سپاٹ کردار ہے، اسلئے کہ کسی واقعے کے اثر سے بھی اس کی خود سپردگی کا جذبہ برہم نہیں ہوتا، موذیل میں ایک لاابالی پن ہے جو اسے ایک انفرادیت بخش دیتا ہے اور "ممی" میں یہ جرأت ہے کہ وہ ان کو دھتکار دے جو اس کی زندگی کا سہارا ہیں۔

میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ اپنی فکری زندگی کے لئے منٹو نے جو قدر اپنائی تھی وہ یہ تھی کہ جو چیزیں عام طور پر بری سمجھی جاتی ہیں ان میں ضرور کوئی نہ کوئی خوبی ہوتی ہے۔ اسی قدر کی وضاحت کے لئے منٹو نے ایک مخصوص افسانوی ماحول کو زندہ کیا، اس ماحول میں پیشہ ور داشتائیں، کسبیاں، طوائفیں اور ان کے گرد ان کے دلال اور چاہنے والے سب کے سب چلتے پھرتے، کاروبار کرتے نظر آتے ہیں، اور ان میں شاید ہی کوئی کردار ایسا ہو جس میں زندگی کی کوئی نہ کوئی جھلک موجود نہ ہو۔ اس ماحول کے دو افسانے خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں: "ہتک" اور "بابو گوپی ناتھ"۔ "ہتک" میں تجربہ مکمل ہے اور اس کا اظہار متوازن اور انتہائی پُر اثر ہے۔ منٹو نے جتنے کردار بھی پیش کئے ہیں ان میں سے شاید کوئی بھی اس قدر زندہ اور قابلِ قبول نہیں جتنا کہ سوگندھی کا کردار ہے۔ اس کردار میں ایک فرد کی پوری نفسیاتی تاریخ ہے۔ سوگندھی انتہائی مجبور اور لاچار ہونے کے باوجود زندہ اور آزاد ہے اور اس میں زندگی کا پوری طرح مقابلہ کرنے کی اہلیت ہے۔ ایک سیٹھ جب اسے یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے "دس روپے اور یہ عورت۔ خچر کیا بری ہے ......" تو سوگندھی کے سر سے پاؤں تک گرم لہریں دوڑنے لگتی ہیں، وہ چاہتی ہے کہ سیٹھ ایک بار اس کے سامنے آ جائے تو وہ اندھا دھند اپنے دونوں پنجوں سے اس کا منہ نوچنا شروع کر دے، مگر پھر وہ سوچتی ہے "منہ آئے، بلا سے۔ میں اپنی جان کیوں بیکار ہلکان کروں۔ گھر چلتے ہیں اور آرام سے لمبی تان کر سوتے ہیں ..... سیٹھ اور اس موٹر کی ایسی تیسی۔" پھر بھی اسے چین نہیں آتا، انتقام کے نئے نئے طریقے اس کے ذہن میں آتے ہیں۔ اتنے میں مادھو آ جاتا ہے جو محبت کے نام پر اس سے اپنا ہر کام نکالا کرتا ہے۔ سوگندھی اپنا سارا انتقام مادھو سے لیتی ہے، مادھو کو طرح طرح کچوکے لگا کر جب وہ اس کی محبت کے فریب کا مضحکہ اڑا چکتی ہے تو کہتی ہے "سوگندھی کے بچے تو آیا کس لئے ہے یہاں؟ تیری ماں رہتی ہے اس جگہ جو تجھے پچاس روپے دے گی؟ یا تو کوئی ایسا گبرو جوان ہے جس پر میں عاشق ہو گئی ہوں ......"

مادھو دبے ہوئے لہجے میں صرف اس قدر پوچھ سکتا ہے "سوگندھی تجھے کیا ہو گیا ہے؟" "تیری ماں کا سر۔ تو ہوتا کون ہے مجھ سے ایسے سوال کرنے والا۔ بھاگ یہاں سے ورنہ" سوگندھی کی بلند آواز سن کر اس کا خارش زدہ کتا جو سوکھے ہوئے چپلوں پر منہ رکھے سو رہا تھا، ہڑبڑا کر اٹھا اور مادھو کی طرف منہ اٹھا کر بھونکنا شروع کر دیا۔

مگر سوگندھی کا انتقام پورا اس وقت ہوتا ہے جب وہ مادھو اور اس کے ساتھ دوسرے سب انسانوں کو اپنے گھر سے نکال کر اپنے خارش زدہ کتے کو ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اپنے پہلو میں لٹا کر سو جاتی ہے۔

بابو گوپی ناتھ کا کردار سوگندھی کی طرح بھرپور اور قابلِ قبول نہ سہی، دلکش ضرور ہے۔ توازن اور تاثر کے اعتبار سے اس افسانے کو بھی ایک منفرد حیثیت حاصل ہے۔ بابو گوپی ناتھ کا مسلک شاید آپ کو

(باقی صفحہ ۲۹ پر)

اُردُو ادب اور نفسیات

ابواللیث صدیقی
ممتاز مفتی
سجّاد علی تہر

تنقید (ابواللیث صدیقی)

ماہرینِ نفسیات کے خیال میں ہر فن پارے کی تخلیق میں قبل شعور، شعور اور لاشعور کارفرما رہتے ہیں اور جب تک کسی فنکار کے ذہنی عوامل کا پورا مطالعہ نہ کیا جائے، فن پارے کی حقیقت آشکار نہیں ہوسکتی۔ ظاہر ہے کہ اس نقطۂ نظر سے فنکار کی انفرادیت اور شخصیت کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے اور فن پارے کے مطالعے یا تفہیم میں فنکار کے مطالعے کا عنصر شامل ہو جاتا ہے۔ نفسیاتی تنقید کا یہ سب سے نمایاں میدان ہے جس سے اردو کے پرانے تذکرے، تاریخیں اور تنقیدیں بڑی حد تک محروم ہیں۔ تذکرہ نگار تو شاعر کے ذاتی حالات کو بالکل غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ مثلاً میر کے کلام پر بڑا شدید ... ان کی بد دماغی اور مزاج کی نازکی کا ذکر تو سبھی نے کیا ہے لیکن ان کے اسباب کا تجزیہ ہمیں صرف جدید کے تنقید نگاروں میں ملتا ہے۔ میر کے کلام کا مطالعہ ان کی آپ بیتی "ذکرِ میر" کی روشنی ہی میں کیا جاسکتا ہے، مگر اس میں بھی میر نے سب کچھ نہیں کہہ دیا، بہت سی "سخن ہائے ناگفتنی" اس میں چھپائی گئی ہیں۔ ان کا کھوج لگانے کے لئے ہمارے پاس صرف میر کا کلام رہ گیا ہے۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ میر کے الفاظ اور خیالات ان کے شعور، قبل شعور اور لاشعور کی کن کیفیتوں کے غماز ہیں۔

نفسِ انسانی انفرادی ہونے کے باوجود اجتماعی بھی ہے۔ محرکات خارجی دنیا سے بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ بہت سے تجربات قبل شعور میں سماجی ورثے کے طور پر ملتے ہیں۔ لاشعور میں چلے جانے والے حالات اور کیفیات بھی خارجی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں، اسلئے نفس کے مطالعے کو ماحول کے آئینے میں دیکھنا پڑے گا۔ نفسیاتی تنقید میں خاندان، سماج اور سیاسی و معاشی حالات پس منظر کے طور پر کام میں لائے جاتے ہیں۔ اردو کے جدید نقاد ان میلانات اور رجحانات کی وضاحت جو قدیم اردو ادب میں نمایاں ہیں، ان ملکی، معاشرتی اور تہذیبی حالات کے مطالعے سے کرتے ہیں جو اس برصغیر میں اورنگ زیب کی وفات اور سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے باعث انتشار کی صورت میں ظاہر ہو رہے تھے۔ اس طرح ادبی اور تنقیدی مطالعے کے لئے ملک کی تحریکوں کا مطالعہ ناگزیر ہو گیا ہے۔ اب نقادوں کی توجہ ہیئت اور بیان پر اسی حد تک مرکوز ہے جہاں تک ان خارجی عناصر سے فنکار کی ذہنیت یعنی شخصیت اور انفرادیت کا سراغ لگانے میں مدد ملتی ہے۔ لیکن ان کا اصلی موضوع اب فنکار کے ذہنی واردات ہیں۔

نفسیاتی مطالعے نے جنسی نفسیات کے نازک موضوع کو بڑی اہمیت دی ہے، بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ فرائڈ کے نظریات کا وہی حصہ اب سب سے زیادہ اثر انداز ہو رہا ہے جس کا تعلق جنسی نفسیات سے ہے۔ شعری اور فنی تخلیقات میں جنس کا جذبہ کہیں نہ کہیں بنیادی طور پر کارفرما ہے۔ چنانچہ تنقید نگار فنکاروں کی جذباتی کیفیات، جنسی الجھاؤ اور جنسی بھوک کے مسائل سے مفر نہیں پاتا۔ یہ اور بات ہے کہ بعض نقاد خود لذت پرستی کا شکار ہو جاتے ہیں اور اس موضوع کو چھوڑ کر جنسی بیماریوں کی تشریح و تجزیہ میں پھنس جاتے ہیں۔

آج اردو کے اکثر نقاد جو نئی نسل سے تعلق رکھتے ہیں، نفسیاتی تنقید کی طرف مائل ہیں۔ جیسے جیسے اس ملک میں نفسیات کے مطالعے اور علم تجزیۂ نفسی کو فروغ ہوگا، اردو تنقید میں نئے افکار اور نئے پہلو پیدا ہوں گے۔ اور اقلیدس کا یہ فرضی "نقطہ" ایک وسیع دائرہ نظر آنے لگے گا۔

افسانہ (ممتاز مفتی)

نفسیات نے افسانے کی تکنیک یا ہیئت کو نہیں بدلا، اس کا مرکزی خیال اور

وحدت تاثر جوں کے توں قائم رہے ہیں لیکن اس کے موضوع اور تفاصیل میں بعید اضافہ اور تنوع سا پیدا ہوگیا ہے۔

واقعاتی افسانے کے دور میں افسانے کا موضوع قتل ہوتا تھا، اب قاتل ہوتا ہے۔ تب افسانے میں مظالم اور مصائب کا تذکرہ پایا جاتا تھا، اب ظالم اور مظلوم نے ان کی جگہ لے لی ہے۔ تب مشکلات بیان کی جاتی تھیں، اب مشکلات کے بیان نے ذہنی کشمکش کے اظہار کی صورت اختیار کر لی ہے یعنی سینما کی اصطلاح میں پہلے بعید درمیانی شاٹ میں واقعہ پیش کیا جاتا تھا، اب واقعہ کی اہمیت کو نظر انداز کر کے اس کے نتائج دکھانے کے لئے کردار کا "کلوز اپ" یعنی قریبی عکس پیش کیا جاتا ہے۔ غرض اب افسانے میں پیشکش کا زاویہ بدل گیا ہے۔ اور انسان کے محسوسات نے اہمیت اختیار کر لی ہے۔

اس تبدیلی کے باعث ایسے افسانے وجود میں آئے جیسے کرشن چندر کا "دو فرلانگ لمبی سڑک" جس میں معمولی روزمرہ کے مناظر سے تاثر پیدا کیا گیا ہے۔ منٹو کا افسانہ "ہتک" جس میں ایک گاہک کے اظہارِ ناپسندیدگی پر طوائف شدید ردِ عمل محسوس کرتے ہوئے بنی نوعِ انسان سے انتقام لینے کی خاطر ایک کتے سے پیار کرتی ہے لیکن نفسیاتی زاویۂ نگاہ صرف اسی صورت میں مناسب تاثر پیدا کرتا ہے۔ جبکہ افسانے کا مرکزی خیال اس سے ہم آہنگ ہو۔ جبکہ مرکزی خیال کا تقاضا ہو کہ اسے نفسیاتی زاویۂ نگاہ سے پیش کیا جائے، نفسیاتی زاویۂ نگاہ کو زبردستی ٹھونسنے سے کوئی خوبی پیدا نہیں ہو سکتی۔ نفسیاتی افسانوں کے دور میں فروعی نفسیات کا ایک سیلاب اُمڈ آیا ہے۔ جس سے قارئین اکتائے جا رہے ہیں اور ان میں از سرِ نو یہ خواہش پیدا ہو رہی ہے کہ افسانے میں کچھ سیدھے سادے واقعات کا ذکر ہو۔ نفسیات کے دور میں بھی ایسے خارجی افسانے لکھے گئے ہیں۔ جو زبردستی کی نفسیات سے پاک ہیں مثلاً غلام عباس کی "آنندی"۔

پرانے دور میں محبت صرف محبت سمجھی جاتی تھی، اور وہ پاک ہوتی تھی یا ناپاک۔ اب نفسیاتی نقطۂ نظر سے محبت پڑوس کی سازش ہو سکتی ہے، جذبۂ انتقام کا ایک روپ ہو سکتی ہے، ضد ہو سکتی ہے، جذبۂ کمتری کو چھپانے کا پردہ ہو سکتی ہے۔ اب محبت خالص محبت نہیں رہی، مفرد کی بجائے وہ ایک مرکب جذبہ بن چکی ہو۔ اس طرح قربانی، ماتا، وفا اور ایسے دیگر جذبات جن کے مفہوم سکہ بند اور یکسانی حیثیت اختیار کر چکے تھے، تحلیلِ نفسی کے دور میں از سرِ نو زیرِ تحقیق ہیں اور انسانی نفس کے نئے اور انوکھے پہلوؤں سے واقف ہو رہا ہے۔۔ ایسے پہلو جو واقعاتی افسانے کے دور میں پیش نہ کئے جا سکتے تھے۔

ناول (سجاد علی قہر)

خارجی واقعات کے رخ سے نقاب اُٹھ جانے کے ساتھ ساتھ ناول نے انسانی شعور و لاشعور کی تہیں بھی کھولنی شروع کر دی ہیں چنانچہ ناول نگار واقعات کی دنیا سے "محشرِ خیال" کی طرف متوجہ ہو گیا ہے۔ اگر پہلے ناول نگار زیادہ تر "پھر کیا ہوا؟" سے سروکار رکھتا تھا، تو اب "کیوں ہوا؟" اور "کیونکر ہوا؟" سے بحث کرنے لگا ہے۔ خارجی واقعات اور انسانی تعلقات کے عمل کی بجائے اب داخلی کیفیات کا زیادہ جائزہ لیا جانے لگا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اردو کے ابتدائی ناول محض خارجی واقعات کی پوٹ تھے۔ اور ان میں کردار کی ذہنی کشمکش یا اس کے نفسی عمل کا جائزہ بالکل مفقود تھا بہ شمار کا "فرجی" نذیر احمد کا "مرزا ظاہر دار بیگ" مرزا رسوا کی "امراؤ جان ادا" اور پریم چند کے دیہاتی کردار اردو ناولوں کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں اور ان کے ذریعہ نفسیاتِ انسانی کے نہایت دلچسپ انکشافات کئے گئے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ نفسیاتی مطالعہ دورِ جدید کا کارنامہ ہے اور اس کی مدد سے انسانی نفس کے وہ پہلو بھی پیش کئے جا سکتے ہیں جن کا اس سے پہلے امکان نہ تھا۔

جدید ترین نفسیاتی رجحانات کے ماتحت اردو ناولوں میں جو ناول سرفہرست رکھے جاتے ہیں۔ وہ قاضی عبدالغفار کے ناول "لیلیٰ کے خطوط" اور "مجنوں کی ڈائری" عصمت کا ناول "ٹیڑھی لکیر" کرشن چندر کا "شکست" اور عزیز احمد کا "گریز" اور "ہوس" ہیں۔

"لیلیٰ کے خطوط" میں پورا ناول ایک کردار کے گرد گھومتا ہے، یا پھر دوسرا کردار وہ ہے جس کے نام یہ خطوط لکھے گئے ہیں لیکن یہ دوسرا کردار محض پس منظر کا کام دیتا ہے پیش منظر میں لیلیٰ ہی نظر آتی ہے، جو سر تا سر اپنی ذات میں گم ہے۔ وہ کسی شخص میں دلچسپی ہی نہیں لے سکتی۔ اس کے خطوط اس بات کا ثبوت نہیں ہیں کہ اسے مکتوب الیہ سے کوئی دلچسپی ہے، بلکہ ان کے لکھنے کا مقصد محض اپنی ذات کا تذکرہ ہے۔ اس کی آواز میں طوائف کے کچلے ہوئے وجود کی بیچارگی نہیں، بلکہ ایسا استہزا ہے جو ساری دنیا پر قہقہہ لگا سکتا ہے۔ "لیلیٰ کے خطوط" انسانی فطرت کو سمجھنے میں تحلیلِ نفسی کا کام دیتے ہیں۔ ان میں بڑی تلخی اور طنز بھرا ہوا ہے۔ لیلیٰ شدت سے انفرادیت پسند ہے اور خود میں اسیر، اپنے دکھوں کی پرورش کرتی ہے۔ اس میں خود بینی کی عادت ہے، جیسے وہ خود بھی تسلیم کرتی ہے۔ اسے اپنے زخموں کو کریدنے سے فرصت نہیں ملتی "لیلیٰ کے خطوط" میں خارجی واقعات کے برعکس ذہنی کیفیات کا عکس ہے۔

عصمت چغتائی کی "ٹیڑھی لکیر" درحقیقت اردو ادب میں اپنی طرز کا پہلا ناول ہے جس میں تحلیلِ نفسی کو بہت سلیقے سے برتا گیا ہے۔ یہ ناول ایک اچھے گھرانے کی تعلیم یافتہ آزاد خیال اور آزاد روش لڑکی شمشاد یا شمن کی کہانی ہو۔

(باقی صفحہ ۱۲۸ پر)

چراغ حسن حسرت مرحوم

عبد المجید سالک

چراغ حسن حسرت کا انتقال بلاشبہ اردو ادب و صحافت کا نقصان عظیم ہے، اور فطرت اتنی فیاض واقع نہیں ہوئی کہ عظیم نقصانات کی تلافی جلد تر کر دے۔ حسرت ایک شیوا بیان شاعر، ایک مقبول عام مزاح نویس، ایک عالی پایہ اخبار نویس اور ایک وسیع المعلومات ادیب تھا۔ غرض اس ہیرے کے مختلف پہلو اپنی اپنی مخصوص چمک دمک رکھتے تھے، جس سے بڑے بڑوں کی نگاہیں خیرہ ہو جاتی تھیں۔ ان کے شعر کا ذخیرہ کم ہے، لیکن انہوں نے جو کچھ کہا ہے اس سے کہنہ مشقی اور استادی کے تمام جوہر نمایاں ہوتے ہیں۔ ان کا رنگ سخن زیادہ تر حسرت شاد عظیم آبادی سے متاثر ہے۔ ظریفانہ کالم لکھنے میں کوئی ان کا شریک و سہیم نہ تھا، وہ بات میں سے بات پیدا کرنے اور پڑھنے والا دفعتہً ان کی ذہانت، پنچ اور تلاش سے بھونچکا سا رہ جاتا۔ میرے نزدیک ان کی اردو دانی اور اردو نویسی عدیم المثال تھی۔ جن لوگوں کی مادری زبان اردو نہیں ان میں حسرت سے بڑا بامحاورہ اور ٹکسالی اور باغ و بہار اردو لکھنے والا اب تک پیدا نہیں ہوا۔ علم و فضل اور وسعت معلومات کے اعتبار سے ہمارے ادیبوں اور انشاپردازوں میں شاید بہت ہی کم لوگ حسرت کا مقابلہ کر سکتے تھے۔

میرے ساتھ حسرت کے نہایت گہرے مخلصانہ تعلقات اٹھائیس برس سے چلے آتے تھے۔ اس دوران میں وہ تعلقات روز افزوں ہی ہوتے چلے گئے، کبھی ایک لمحے کے لئے بھی ان میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ بے انتہا مخلص دوست اور ایثار پیشہ اور وفادار ساتھی تھے۔ ان کا دل آئینے کی طرح صاف تھا۔ دوست تو دوست کسی دشمن کی طرف سے بھی ان کے قلب میں تکدر جاگزیں نہ ہو سکتا یعنی تکدر پیدا ہونا گو طبعی ہے۔ لیکن حسرت اس کو چند لمحوں کے اندر جھٹک دیتے اور ان کے قلب کی وسعت دشمن کو بھی گلے لگانے پر بھی تیار ہو جاتی تھی۔

حسرت کی نظم و نثر اس کی انشاپردازی اور اس کے علم و فضل پر اظہار خیالات کرنے کے لئے عمر پڑی ہے۔ رسائل و اخبارات، ادبی انجمنیں، ریڈیو، حکام، عوام سبھی حسرت کے علم و فن کو خراج تحسین پیش کریں گے، لیکن میں تو فی الحال اس محبت کی تصویر، اس وضعداری کے پیکر، اس خلوص کے مجسمے کو یاد کرتا ہوں اور اس کی یاد میں آنسو بہاتا ہوں، جسکو چراغ حسن حسرت کہتے ہیں اور جس کا مثیل و نظیر معاشرے کے موجودہ دور میں شاید ہی کبھی پیدا ہو سکے۔ شمع اردو تو روشن ہے۔ چراغ محبت بھی جل رہا ہے۔ لیکن محفل پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے۔ تاجور، باری، بزمی، تاثیر، منٹو اور اب حسرت۔

ع اک دیا اور بجھا، اور بڑھی تاریکی!

(بہ شکریہ ریڈیو پاکستان لاہور)

وفات حسرت آیات

چراغِ محفل افسوس بجھ گیا سرِ شام
بیادِ حسرت مغموم اب ہیں سب احباب

نہ شوقِ نغمہ اب ہے نہ ذوقِ بادہ و جام
وفاتِ حسرت آیات مرگِ بے ہنگام (حفیظ ہوشیارپوری)

۱۹۵۵ء ۱۹۵۵ء

وہی لاہور ——!

ابوالاثر حفیظ

میں ہوں ابتک اسیرِ دانہ و دام　　جو رہا ہو چکے ہیں انکو سلام
ہو گیا گل چراغِ حسرت بھی　　کر لیا آرزو نے کام تمام
ایک آغازِ نو کا وقت آیا　　دوستو اب قریب ہے انجام
نگہِ واپسیں ہے خوں آلود　　آفتاب آ چکا ہے بر لبِ بام
مرگِ تاثیر دے چکی ہے پیام
ہے خموشی ہی انتہائے کلام

دوستی، دوست، یار، یارانے　　جب ترانے تھے اب ہیں افسانے
جو قیامت اٹھائے پھرتے تھے　　سو رہے ہیں وہ طبیاں تانے
سخنِ رنگ رنگ سے لبریز　　آج ٹوٹے پڑے ہیں پیمانے
اک زیارتگہِ خرد ہے جہاں　　مل کے بیٹھے تھے چند دیوانے
بن پئے بھی تھے مست مستانے
ہائے لاہور کے وہ میخانے

عارضی سی شکست و ریخت کیتھا　　چل رہا ہے وہی قدیم نظام
شجرِ شاخ ہے کہ برگ و ثمر　　اپنے معمول پر ہیں پختہ و خام
ہاں پرانی ترقیِ معکوس　　اور بھی ہو گئی ہے تیز خرام
بعدِ تخریب پھر وہی تعمیر　　خودکشی کی طرف وہی اقدام
خامیاں پختہ ہوتی جاتی ہیں　　ویرانے بنتے جاتے ہیں استقام
وائے بر حالِ فن و شعر و ادب　　ہائے ذوقِ عوام کا انعام
علم شئے پر ہے جہلِ شئے غالب　　ہر اناڑی ہے اپنے فن کا امام
صورتوں پر جما لیا ہے رنگ　　سیرتوں کا سڑا لبسا ہے قوام
دسترس ہو تو سب حلال حلال　　جسپہ قابو نہ ہو حرام، حرام
فرش کو عرش کی نہیں پروا　　پستیاں ہیں بہت بلند مقام
گھٹ گئی ہے تسلیِ محکوم　　بڑھ گئی ہے تعلیِ حکام
دوستانِ قدیم، عصرِ جدید　　دوستی کو ہے موت کا پیغام

وہی لاہور ہے، وہی در و بام　　وہی ہنگامۂ خواص و عوام
زلزلے آگ، آندھیاں سیلاب　　لائے تشریف چل دئیے ناکام
نفسی نفسی کا شور و ہنگامہ
زندگی ہے تو زندگی کو سلام

پھر کیا؟

تصدق حسین خالد

نہیں جو میرے مقدر میں آستانۂ دوست،
رہی جو زندگیِ مستعار غم آلود،
جو لب پہ آ نہ سکا حرفِ مدعا
پھر کیا؟

نگاہ اٹھی ہر اک سمت، نامراد آئی
نہ چارہ گر نہ کوئی غمگسارِ تنہائی
خیالِ بےکسیِ عشق، رنجِ نومیدی
جہانِ زیست کو پامال کر گئے
پھر کیا؟

جنوں گرفتہ سمجھتے ہیں مجھ کو میرے جلیس
وہ یوں گزرتے ہیں مجھ سے کہ آشنا ہی نہیں
ستارہ ایک فلک کی جبیں پہ چمکا تھا
کہ ہمرہوں کی کشاکش نے اپنے محور سے
اٹھا کے پھینک دیا بیکراں گپھاؤں میں
نہ کہکشاں، نہ ثریا، نہ خوشۂ عنبیٔ
نہ ہو اگر مجھے اب اذنِ واپسی
پھر کیا؟

کہ طرفہ کاریِ اندازِ دلربائیِ دوست
کرشمہ سنج ہے دنیا کے گوشے گوشے میں
سنہری دھوپ میں پھولوں کا ابتسامِ جمیل
ہوا کا سبزے کے آنچل سے شوخیاں کرنا
فضا میں چڑیوں، ممولوں، بیوں، چہوں کی اڑان
جواں دلوں میں شجاعت کا گرم و تیز لہو
حریمِ ناز کی زینت، وہ پاسبانِ بہار
وفا و مہر و محبت کی داستانِ خموش،
زمیں کے سینہ سے ہر لحظہ زندگی کی نمود
جلو میں حسن و مسرت، خلوص آزادی،
نہ ہو اگر مجھے اب اذنِ واپسی
پھر کیا؟

معرکۂ نظم و غزل

فضل احمد کریم فضلی

حضرتِ جوشؔ تھے کل رونقِ بزمِ احباب
کیسے چھڑتا نہ وہاں معرکۂ نظم و غزل
بحث پُرجوش تھی، پُرمغز تھی، پُرلطف بھی تھی
خوب آپس میں دلائل کا ہوا ردّ و بدل
نکتۂ نغز اُٹھے لے کے جگن ناتھ آزاد
ایسا نکتہ جو کرے عقدۂ دشوار کو حل
"ہے یہ توہینِ غزل گر ہو غزل نظم صفت
اور یہ نظم کی معراج کہ ہو مثلِ غزل"
جوشؔ باوصفِ تخلص بھی ہیں مردِ معقول
سُن کے یوں کھل پڑے جس طرح کہ کھلتے ہیں کنول
ان کے انکار سے اقرار کا پہلو تھا عیاں
جیسے انکارِ محبت کرے کوئی چنچل
بات کی سچ ہے مجھے ورنہ حقیقت یہ ہے
گونجتا ہے مری نظموں میں بھی گلبانگِ غزل
مسکراتے ہوئے فضلیؔ نے یہ اک شعر پڑھا
جس کو احباب نے ٹھہرا دیا قولِ فیصل
غمِ دوراں میں کہاں بات غمِ جاناں کی
نظم ہے اپنی جگہ خوب، مگر ہائے غزل!

رُباعیات

روشؔن صدیقی

●

رہزن کوئی، نہ خضرِ منزل میرا
دشمن طوفاں، نہ دوست ساحل میرا
کیا کم ہے یہی کہ اس بھری دنیا میں
میں دل کا شریکِ حال ہوں دل میرا

●

کونین سے دور جا کے دیکھا ہے تجھے
شمعِ امکاں بجھا کے دیکھا ہے تجھے
کیا ذکر یہاں نگاہ و دل کا اے دوست
میں نے تجھ سے چھپا کے دیکھا ہے تجھے

●

خوابِ شبِ ہجر بھول جانے دے مجھے
اب حسرتِ دید کو جگانے دے مجھے
فردا نے پہن لیا لباسِ امروز
اے حسنِ ازل نقاب اٹھانے دے مجھے

●

سب نقشِ قدم چھپا دئیے ہیں میں نے
سجدوں کے نشاں مٹا دئیے ہیں میں نے
جب سے دیکھا لباسِ آدم میں تجھے
لاکھوں پردے گرا دئیے ہیں میں نے

●

کیا مرگ ہے کیا حیات، میں کیا جانوں
کیا ہے پسِ کائنات، میں کیا جانوں
اے حلقۂ زلفِ دوست، عمر تو دراز
کہتے ہیں کسے نجات، میں کیا جانوں

دو گیت

قیوم نظر

گھٹا گھنگھور چھائی ہے
یہ چہکاریں، یہ جھنکاریں، دہائی ہے، دہائی ہے
گھٹا گھنگھور چھائی ہے

ہوا کے مدھ بھرے جھونکے یہاں گھومیں، وہاں گھومیں
کبھی پتوں میں چھپ جائیں کبھی پھولوں کا منہ چومیں
کبھی پیڑوں کو دے ماریں، دہائی ہے دہائی ہے
گھٹا گھنگھور چھائی ہے

اندھیرا ہو رہا ہے ہول آتا ہے اکیلے میں
چمکتی ہے ذرا بجلی تو جی ڈرتا ہے بیلے میں
جھما جھم جھام کی دھاریں، دہائی ہے، دہائی ہے
گھٹا گھنگھور چھائی ہے

یہ ناگن بن کے ڈسنے کو بنی ہے رس بھری رجنی
یہ برہن کس سے ملنے کو دلھن کی بنی سجنی
یہ پل پل اس کی جھنکاریں، دہائی ہے دہائی ہے
گھٹا گھنگھور چھائی ہے

ضمیر اظہر

پھر شام سلونی آئی
دن ڈوبا، آکاش پہ پھیلے رنگ رنگیلے سائے
اودے، نیلے، پیلے آنچل پربت پر لہرائے
پھوٹ بہا جھرنوں کا جوبن جونہی چلی پروائی
پھر شام سلونی آئی

لوٹے میدانوں سے گڈریے، باغوں سے رکھوالے
سپنا بن کر اڑتے جائیں شرمیلے اجیالے
بچھڑے سب سے واپس آئے جوگی کی شہنائی
پھر شام سلونی آئی

تن میں لئے سندر آشائیں، نینوں میں پھلواری
پنگھٹ پر جل بھرنے چلی ہے گاؤں کی پنہاری
ڈگ ڈگ ڈولے مست جوانی، پگ پگ لے انگڑائی
پھر شام سلونی آئی

جلنے لگے ہیں پل پل دیپک، گھر گھر ہے دیوالی
جوت جگا کر کرتے ہیں جگنو کھیتوں کی رکھوالی
چلی برات دلہن کے دوارے، چھوٹی مرغ ہوائی
پھر شام سلونی آئی

جانے شام میں ہے کیا جادو، شام میں کیا سنگیت بھرا
شام سے پہلے من کو ڈھونڈک کھڑا اس کا پریت بھرا
چپکے چپکے، دھیرے دھیرے، ہنسی اور مسکائی
پھر شام سلونی آئی

ہمارے چند لکھنے والے

پروفیسر گوتی

ابوالاثر حفیظ

عبدالمجید سالک

ا. رحمن صدیقی

ابواللیث صدیقی

تصدق حسین خالد

صفیہ شمیم

رضا ہمدانی

یوسف ظفر

جعفر طاہر

سید افضل جعفری

دُلہن

(۱۷ویں صدی کے مشہور بنگالی شاعر علاؤل کی نظم کا ترجمہ)

ابن انشا

تری نیند مجھ کو ستاتی تو
ترے فتنے بس میں بجھے ہوئے!

اے دلاری دُلھن! میری پیاری دُلھن! — تجھے ڈھونڈ مری

بڑی صبح تھی جب گئی جمنا پہ تو — کیا بات ہوئی!

گیا دن بھی گزر، ہوئی شام بسر — اب رات ہوئی

اے دلاری دُلھن! سب کو پیاری دُلھن — کہاں دیر کری!

۔ ۔ ۔ اٹھی نیند سے میں تو چمن میں دیکھا — مجھے ایک کمل

چلی اس کی طرف، اک بھڑ گئی ڈس — گئی جان نکل

ملا پھول کی چاہ کے کانٹوں سے بس — مجھے اتنا ہی پھل!

نیچے تال کے اب ہوا ایسا غضب — میری چوڑی گری

اور اسے ڈھونڈنے، اس کمل کے کنے — میں جو نیچے گئی

سرمہ آنکھوں کا، ماتھے کے سیندور کی — ساری سرخی دُھلی

نرملوں کے طمانچوں کو سہتے ہوئے — دیہہ میری دُکھی

سارے گھر کی تھی نور ہو شان ہو — اے دلاری دُلھن!

روپ کی کان، ماگن کی تم جان ہو — اے دلاری دُلھن!

جان تم پہ علاؤل کی قربان ہو — میری پیاری دُلھن!
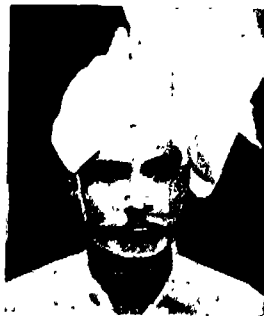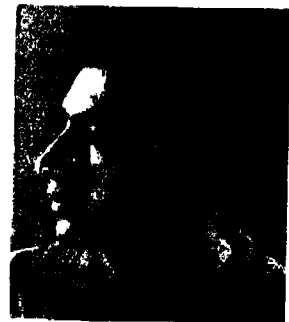
حسنِ بے خبر

شیر افضل جعفری

لالہ و گل سے کھلنے والے
مہر و مہ بھی ہیں تیرے متوالے
آسماں نے رواں دواں فتنے
تیری پلکوں کی چھاؤں میں پالے
بجلیوں نے تڑپ کے ڈال دیئے
تیرے کانوں میں دو میں بالے
تیرا ماتھا بہار کا سورج
تیرے رخسار نور کے ہالے
تیرا قامت گلاب کی ٹہنی
تیرے قدموں میں جھومتے لالے
تیری آنکھوں میں لاج کی سرخی
دل میں معصومیت کے اُجیالے
تیری داسی یہ باغ باغ زمیں
سات آکاش تیرے رکھوالے
تجھ پہ قربان چودھویں کا سماں
تیرے ستنوں میں آسماں ڈھلے

خدایانِ کہن

جعفر طاہر

یہ خود لطور و خود کام و خود بیں و خود سر خداوندگارانِ اقلیمِ یوناں
ہوسناکیوں، بزم آرائیوں، عیش فرمائیوں کے نشے میں خروشاں
کبھی کوئی وینس سے آنکھیں لڑائے، نئی آتما کے ہمراہ دھومیں مچائے
کوئی ایک لارل[1] کی پھیلی ہوئی ٹہنیوں کے تلے لاکھ آنسو بہائے

ہوا یہ کہ اک روز ننھے کیوپڈ میاں کے اپالو نے ہتھیار دیکھے
سرو دوش پھولوں میں لپٹی ہوئی وہ کماں، وہ طلاکار سوفار دیکھے
وہ سوفار جن سے یہ ننھا شکاری بڑی تمکنت سے نشانے لگائے
شب و روز پیوستہ رگ دیویوں، دیوتاؤں کے دل چھید کر مسکرائے

اپالو نے باتوں ہی باتوں میں اتنا کہا یہ جوانوں کو زیبا ہیں ساماں
یہ تیر و کماں چھوڑ دو اور شہرِ خدایاں کے بچوں سے کھیلو مری جاں
ابھی خیر سے عمر ہی کیا ہے، پھر مشغلے ہیں کئی اور بھی کمسنی کے
مگر یہ جگر آزماؤں کے ہتھیار، دل میں یہ ارمان صید افگنی کے

کیوپڈ بھی آتش بجاں ہو کے بولا کہ سرکار ملنے چلے ہیں شکاری
جوانِ جگر آزما مفت میں بن گئے۔ عمر بھر ایک چڑیا نہ ماری
یہ کہتے ہوئے اس خدائے محبت نے ننھی کماں میں کوئی تیر جوڑا
اپالو کے دل کا نشانہ لیا، کھینچ کر تیر مارا، سبھی مان توڑا

اپالو نے آنکھیں اٹھائیں تو آئی نظر پینیئس کی جواں سال بیٹی
خداوندِ قلزم کی ماہ رو جبیں دخترِ نازنیں اور مقدر کی بیٹی

اپالو نے کچھ سوچ کر ساحلِ زرفشاں کی طرف اپنا گھوڑا بھگایا
وہ لہروں کی الماس گوں سیج پر کسمساتی ہوئی ڈافنے کو جگایا

محبو! نہ پوچھو جو اس کعبۂ رہرواں نے شب و روز بانگیں سنائیں
نہ پوچھو جو اعیانِ بزمِ فلک نے اپالو کی جانب سے کیں التجائیں
کبھی اس غزالِ ستارہ قدم کی طلب میں شب و روز جانیں جلائیں
کبھی اپنے تختِ سحر سے اتر کر سمندر کے ساحل پہ آنکھیں بچھائیں

وہ طوطی نوایانِ گلزارِ گردوں، شناسندگانِ رسومِ محبت
وہ جادوگرانِ کہن مشق، وہ رازدارانِ اسرار و آدابِ الفت
اپالو کے ہجر و مصیبت کی آ کر سناتے رہے پینیئس کو کہانی
مگر صاحبزادیِ پینیئس نے کہا بھی تو کوئی نہ اس شوخ نے بات مانی

اپالو نے غصے میں اک روز رستے میں جاتی ہوئی ڈافنے کو بلایا
مگر وہ ڈری، ڈر کے دوڑی، ادھر دیوتا نے جو پیچھا کیا جا دبایا
اسی کشمکش میں حسیں ڈافنے نے دعا کے لیے دستِ نازک اٹھائے
اپالو نے دیکھا تو اب ایک لارل کھڑا تھا وہیں ڈافنے کی بجائے

ادھر یہ جگر آزما نرم شاخوں کے سائے تلے لاکھ آنسو بہائے
اُدھر ایک ننھا شکاری ذرا فاصلے پر کھڑا زیرِ لب مسکرائے
وہ ننھا شکاری جو وینس کے پہلوئے سیمیں میں کاری نشانے لگائے
کہ دیوی کسی پیکرِ آب و گل کی محبت میں سرشار دھرتی پہ آئے

---

[1] ایک درخت

وہ نوشابۂ آسماں، وہ نگارِ فلک، وہ سرو برگِ بستانِ گردوں
وہ سرتاجِ سدرہ نشینانِ خوبی، وہ سلطانۂ شہرِ الہام و افسوں

وہ دیوی کہ جس کے سنہری رتھوں کو حسیں قمریاں، کوکتی فاختائیں
نشیلی ہواؤں، سنہری خلاؤں، طلسمی فضاؤں میں ہر سو اڑائیں
وہ دیوی کہ جس کے جلو میں بہاروں کی معصوم پریاں خراماں خراماں
وہ چوپنکھوں میں سورج مکھی کے طلائی کرن پھول تھامے ہوئے مور پرّاں

کبھی اپنی زلفوں کے رقصاں اندھیروں سے بے خواب آنکھوں کو تسکین بخشے
کبھی ایک بوسہ اڈونس کا لے اور تشکر کے انداز میں تین بخشے
وہ البیلی صبحوں کا روشن جزیرہ، وہ جھل جھل جھمکتا ہوا شوخ سینہ
جزیرہ کہ جس کے حسیں ساحلوں پر نہ اترا کوئی سینیوں کا سفینہ

وہ دو سرزمینیں کہ جن کے طلائی مضافات میں رقص فرما سویرے
وہ دو ملک جن پر نہ لہرائے اب تک کسی تاجدارِ جہاں کے پھریرے
وہ دو شہر جن کی طلب اور تسخیر میں دیوتاؤں نے عمریں لٹا دیں
وہ دو محلے کہ جن کی بلندی نے یارانِ عرش آشیاں کی بھی نیندیں اڑا دیں

وہ آنکھیں صنم خانۂ آذر آبادگانِ وفا کے مقدس پیامی
وہ پاکیزہ پلکوں کے پردے میں لپٹے ہوئے معبدِ عاشقاں کے سلامی
سفیرانِ ملکِ حیا، بارگاہِ جنون و محبت کے مخلص پجاری
اڈونس کے پاؤں پہ جب سر جھکائیں تو دم سادھ جائیں زمیں کے حواری

وہ پیشانیٔ ناز، وہ مسکراتی ہوئی چاندنی کا نشیمن درخشاں
وہ کتنے سویروں کا محور، وہ کتنے حسیں آفتابوں کی لوحِ زر افشاں
وہ شرمیلی صبحوں کا مامن، جوانی کے پُرنور لمحات کا آشیانہ
وہ قبلہ گہہ اہلِ دل، زخم خوردہ تمناؤں کا مرمریں آستانہ

وہ عارض، وہ جامِ جگر تاب، وہ آتشِ سامری کے چھلکتے تپاے
پیالے کہ جن کی حسیں جھلکیوں سے امیدوں کے ہونٹوں پہ زریں اجالے

سحر ساز کرنوں، شفق تاب جلووں، نظر سوز شعلوں کی آرام گاہیں
وہ روشن چتائیں کہ جن پر ستی ہو گئیں مسکرا کر ہزاروں نگاہیں

وہ قد جیسے دشمن کی لاشوں کے انبار میں کوئی سالارِ لشکر کھڑا ہو
بصد کر و فر خاک زادوں کے انبوہ میں جیسے اک دیو پیکر کھڑا ہو
کبھی کاخِ سیمیں مرمر سے جو اترے سنہری لٹیں نرم شانوں پہ ڈالے
افق تا افق لہلہانے لگیں ان کشیدہ کمانوں کے پُرنور ہالے

اڈونس کی بے خواب آنکھوں کو چومے کبھی چومتے چومتے ہچکیاں لے
وہ اک موجۂ نرم رو جو کہ شرما کے ساحل کی آغوش میں سسکیاں لے
تھی آب تاروں کے پھیلے ہوئے بیکراں ریگ زاروں کی زخمی غزالہ
اڈونس نے ہی جس کے نازک کلیجے میں اٹکا ہوا کوئی پیکاں نکالا

اڈونس وہ نوخیز و ناتجربہ کار سا اک جواں، ایک البڑ شکاری
وہ جس نے سحر کی تمنا میں یہ آخری رات بھی جاگتے ہی گزاری
یہی شوق جنگل میں یاروں کے ہمراہ جائے تو جاتے ہی نخچیر مارے
کیوپڈ کے تیروں سے بڑھ کر کسی صیدِ وحشی کے سینے میں وہ تیر مارے

جواں سال محبوب کی بارگہ میں محبت کی دیوی نے کیں التجائیں
مگر وہ ستمگر نہ مانا تو پھر مانگتی رہ گئی اس کے حق میں دعائیں
جو وہ کھیل کھیلا وہاں بے محابا تو جاتے ہی تقدیر نے مار ڈالا
یہ وینس کی الفت کا انجام — دھرتی پہ جمتے ہوئے خون کا سرخ تھالا!

ہواؤں میں اک چیخ سن کر ڈری، آنِ واحد میں دیوی سرِ لاش آئی
ادھر زندگی کی سسکتی لکیروں کا نوحہ ادھر الفتوں کی دہائی
چمن در چمن اپنے محبوب کی یاد میں پھر "گلانِ جوانی" اگائے
شقیقہ کے وہ پھول جنکو اڈونس کی تربت جوانی پہ ہی مرجھائے

ہوا اس طرح دیوتاؤں میں اور خاک زادوں میں قربت کا احساس پیدا
ملاقات کا سلسلہ نہ رہا گو دلوں میں ہوئے لاکھ وسواس پیدا

افسانہ

بحران

غلام عباس

جب سے سرکار نے لوگوں کو مکان بنوانے کے لئے زمین اور قرضہ دینے شروع کئے ہیں شہر کی کایا ہی پلٹ گئی ہے۔ اطرافِ شہر کے وہ علاقے جو میلوں تک ویران پڑے تھے، اب ان میں جگہ جگہ کھدائیاں ہو رہی ہیں۔ ان گنت راج مزدور، مستری اور ٹھیکہ دار ایک بے چینی کی سی کیفیت کے ساتھ کام کرتے اور ادھر ادھر دوڑتے بھاگتے نظر آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آثارِ قدیمہ کا کوئی بہت ہی بڑا محکمہ اپنے پورے لاؤلشکر کے ساتھ پرانے زمانے کے کسی بھرے پرے شہر کو، جو کسی آفتِ ناگہانی کے سبب زمین میں دھنس گیا تھا، جوں کا توں باہر نکالنے میں کوشاں ہے۔

مکان بنوانے کی آرزو انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ یہ وہ آرزو ہے جو بچپن ہی سے، جب وہ گھروندے بنا بنا کر کھیلتا ہے، اس کے دل میں نشو و نما پاتی ہے، اور پھر عمر بھر کبھی ابھرتی کبھی دبتی رہتی ہے۔ زندگی کے کسی دور میں بھی جب کبھی انسان کو ذرا سی بھی خوش حالی نصیب ہوئی، اس نے اپنی اس دیرینہ خواہش کو پورا کرنے کی ضرور کوشش کی۔ اور صاحبِ جائیداد کہلانے کا فخر حاصل کر لیا۔

حکومت کی اس امداد کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو کوئی تھوڑی سی بھی مقدرت رکھتا تھا، کچھ زیادہ سوچے سمجھے بغیر مکان بنوانے پر کمربستہ ہو گیا۔ بہت سے لوگ بیٹھے بٹھائے ہی کسی لطیفۂ غیبی کے بھروسے پر [illegible] کے منصوبے باندھنے لگے۔

سہیل ایک کالج میں فلسفے کا پروفیسر تھا۔ وہ دبلا پتلا، کم آمیز اور خاموش طبع انسان تھا۔ اور شہر کے اندر ایک کمرے کے فلیٹ میں اپنی بیوی اور دو بچیوں کے ساتھ رہتا تھا۔ جب تک بچے چھوٹے چھوٹے تھے جیسے تیسے گزر ہوتی جاتی تھی، مگر جب لڑکیاں بڑی بڑی ہو گئیں، تو ایک کمرے میں سب کے ساتھ رہنے میں قباحتیں پیدا ہونے لگیں۔ آخر پروفیسر سہیل نے ایک سوسائٹی کی وساطت سے چھ سو مربع گز زمین شہر کے باہر ایک کھلے علاقے میں خرید لی۔ پندرہ ہزار روپیہ حکومت سے قرض مل گیا۔ کوئی تین ہزار روپیہ پاس تھا۔ کالج سے دو مہینے کی چھٹی لی۔ اور مکان بنوانے میں مصروف ہو گیا۔

ناتجربہ کاری کی وجہ سے بسم اللہ ہی غلط ثابت ہوئی۔ جس ٹھیکہ دار کو مکان بنانے کا ٹھیکہ دیا گیا۔ وہ دو ایک روز پلاٹ پر آیا اور زمین پر کچھ نشانات وغیرہ لگائے۔ یہ کام ایک رسم کی صورت میں جس کے دوران میں آس پاس کے مستریوں اور مزدوروں میں شیرینی بانٹی گئی عمل میں لایا گیا۔ اس سے فارغ ہو کر اس نے پروفیسر سے پانچ سو روپے پیشگی مانگے جو اسی وقت دے دیئے گئے۔ دوسرے روز ٹھیکہ دار کچھ ایسا گم ہوا کہ شہر ہی سے روپوش ہو گیا۔ پروفیسر کی بیوی نے یہ سنا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ دیر تک آنسو بہاتی رہی۔ آخر یہ تجویز پائی کہ آئندہ کام ٹھیکے پر نہیں بلکہ امانی پر کرایا جائے۔

چاند خاں کسی دفتر میں چپراسی تھا۔ وہ تھا تو ادھیڑ عمر کا مگر اس کا جسم خوب گٹھا ہوا تھا۔ دن بھر سائیکل چلا چلا کے اس کی ٹانگیں خوب مضبوط ہو گئی تھیں گو رنگ کالا پڑ گیا تھا۔ وہ اپنی بڑھیا ماں، بیوی، دو بیٹوں اور ایک بیٹی کے ساتھ جھونپڑیوں میں رہا کرتا تھا۔ بڑا بیٹا علی الصباح اخبار بانٹتا تھا۔ چھوٹا بیٹا اسکول جاتا۔ بیٹی پڑوس کے ایک بابو کے گھر میں دس روپے ماہوار اور ایک وقت کے کھانے پر برتن مانجھنے جایا کرتی تھی۔ چاند خاں کو ستر مربع گز زمین

سا لگڑ ا اور چھ سو روپیہ قرض ملا۔ اس کی بیوی نے اپنے چاندی کے کڑے اور پازیبیں اتار کر میاں کو دیں۔ کہ انہیں بیچ کر مکان پر لگا دو وہ کانوں سے چاندی کی بالیاں بھی اتارنا چاہتی تھی، مگر میاں نے روک دیا۔ کہ ان کے تو کوئی بارہ آنے بھی نہیں دے گا۔ شام کو چاند خاں کی بیوی نے محلے کے گوالے سے، جو سائیکل پر دودھ بیچنے جایا کرتا تھا۔ کہا " تمہارے بھیا مکان بنوا رہے ہیں۔ پیچھے دو کمرے آگے دالان کوئی کرایہ دار ہو تو ذرا دھیان رکھنا۔"

ایک فوجی افسر کو، جس کی لمبی لمبی اکڑی ہوئی مونچھیں تھیں، ایک ہزار گز مربع زمین ملی۔ وہ ہر روز ڈیوٹی سے فارغ ہوتے ہی، وردی سمیت ٹرک پر سیدھا اپنے زیر تعمیر مکان پر پہنچ جاتا۔ اور پیٹی میں پستول لٹکائے گھنٹوں کڑی دھوپ میں راجوں اور مزدوروں کے درمیان پھرتا رہتا۔ کبھی کبھی وہ ان سے اپنے جنگ عظیم کے کارنامے بھی بیان کرتا۔ اس کے پاس جو پستول تھا وہ اس نے بقول خود ایک جرمن سپاہی کو قتل کر کے چھینا تھا۔

پروفیسر سہیل کے مکان کی نیو کھد چکی تھی، اور اب لوہے کے سریے کھڑے کئے جا رہے تھے کیونکہ اس نے پلر سٹائل کو پسند کیا تھا۔ وہ ہر روز اپنے ہاتھ سے ایک کتاب میں مستریوں اور مزدوروں کی حاضری درج کرتا، اور ہفتے کے ہفتے سب کا حساب چکتا کر دیتا۔ ایک مستری کو جو شکل صورت سے بڑا تجربہ کار معلوم ہوتا تھا، اس کی روزانہ اجرت کے علاوہ پچاس روپے ماہوار زائد دینا مقرر کیا تھا تاکہ وہ کام کی نگرانی بھی کرتا رہے۔ یہ اس لئے کہ اوّل تو پروفیسر تعمیری کام سے کچھ واقفیت نہیں رکھتا تھا، دوسرے وہ ہر وقت وہاں موجود بھی نہیں رہ سکتا تھا، مگر اس مستری کی نگرانی کے باوجود کام بہت دھیرے دھیرے ہو رہا تھا۔ اس سلسلے میں جو اطلاعات ٹھیکیداروں اور دوسرے ذریعوں سے اس کے کانوں تک پہنچیں، ان کا خلاصہ یہ تھا:

یہ مستری خود اپنے ہاتھ سے کوئی کام نہیں کرتا، اور ہر ایک پر بڑی دھونس جماتا ہے۔

یہ صرف ان ہی کاری گروں اور مزدوروں کو رکھتا ہے جو اپنی اجرت سے ایک خاص رقم بطور کمیشن اسے دینا منظور کرتے ہیں۔ مزدوروں کو چونکہ پوری مزدوری نہیں ملتی اس لئے وہ دل لگا کے کام نہیں کرتے۔

علاوہ ازیں آئے دن جھگڑے بھی ہوتے رہتے۔ اور سیمنٹ کی بوریوں کی گنتی میں تو ہر روز ہی کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہو جاتی۔ سہیل سب کچھ دیکھتا، سنتا مگر زبان سے کچھ نہ کہتا۔

ایک دن شام کو جب سب راج مزدور چھٹی کر گئے اور چوکیدار نماز پڑھنے میں مشغول ہو گیا، تو پروفیسر کا ایک ہمسایہ جس کا مکان کوئی دو سو گز ادھر بن رہا تھا، اس کے پلاٹ پر آیا، اور کہنے لگا:۔

"کیا آپ سچ مچ اپنا سیمنٹ بیچنا چاہتے ہیں؟"

"نہیں تو۔ کیوں کیا بات ہے؟"

"کل آپ کا مستری دو مزدوروں کی پیٹھ پر دو بوریاں اٹھوائے میرے پاس آیا تھا اور میرے ہاتھ فروخت کرنا چاہتا تھا، مگر میں نے لینے سے انکار کر دیا۔ اس پر وہ مزدوروں کو لئے ہوئے کسی اور طرف چل دیا۔"

پروفیسر سہیل نے مستری کو موقوف کر دیا، اس کے ساتھ ہی کام رک گیا۔ نئے مستری کی جستجو میں کئی دن لگ گئے اور کام بند پڑا رہا۔

چاند خاں چپراسی نے ایک مستری سے دوستی گانٹھی۔ وہ سگرٹ بیڑی اور چائے سے اس کی تواضع کرتا۔ اور اس کو خوش کرنے کے لئے بڑی چاپلوسی کی باتیں کرتا۔ اور بڑے بڑے افسروں کی گھریلو زندگی کے واقعات مزے لے لے کر بیان کرتا۔ دونوں کی خوب گاڑھی چھننے لگی جس دن دفتر میں چھٹی ہوتی، چاند خاں اور اس کے بیٹے خود مزدوروں کی جگہ کام کرتے۔

اس کے گھر کی دیواریں کھڑی ہو چکی تھیں۔ اور دروازوں اور کھڑکیوں کی چوکھٹیں بھی چنائی میں لے لی گئی تھیں۔ مگر چھت تک پہنچتے پہنچتے اچانک اس کے پاس دام ختم ہو گئے۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو جو کسی دوسرے شہر میں آڑھت کی دوکان کرتا تھا، خط لکھا کہ میں سخت بیماری کی حالت میں ہسپتال میں پڑا ہوں۔ روپے کی سخت تنگی ہے، جیسے بھی ہو دو سو روپے فوراً بھیج دو۔ دو ہفتے گزر گئے، مگر ادھر سے کوئی جواب نہ آیا۔ چاند خاں نے بھائی کو بھاری بھاری مغلظات جو چاند خاں ہی سنا سکتا تھا، سنائیں، اور سود پر قرض دینے والے پٹھانوں کی تلاش شروع کر دی۔

ایک دن ایک برقع پوش عورت جہاں جہاں مدد لگ رہی تھی

جاتی ہوئی دیکھی گئی۔ وہ لوگوں کو اس طرح خطاب کرتی تھی:۔

"اے مسلمان بھائیو میں بیوہ ہوں۔ میرا خاوند مکان بنوا رہا تھا کہ اچانک مر گیا۔ میں بے یار و مددگار ہوں۔ اللہ میرے یتیم بچوں پر ترس کھاؤ۔ ان کے لئے کوئی ایماندار اور نیک مستری دلوا دو۔"

سب مستری اور راج مزدور اپنا اپنا کام چھوڑ کر بڑے غور سے اس کی بات سنتے۔ اور جب وہ اپنا مدعا کہہ چکتی تو اسے کوئی جواب دیئے بغیر پھر اپنے اپنے کام میں مصروف ہو جاتے۔

دو باپ بیٹے اپنی نگرانی میں مکان بنوا رہے تھے۔ باپ کو تعمیر کے کام کی خاص سوجھ بوجھ تھی۔ بیٹا حساب کتاب اور لین دین میں بڑا ہوشیار تھا۔ لوہا بندھ چکا، سنٹرنگ ہو چکی۔ اور ایک خاص دن چھت ڈالنے کے لئے مقرر کر لیا گیا۔ مگر اس دن نہ تو مستری ہی پہنچا اور نہ مزدور والے ہی آئے۔ آخر باپ بیٹوں نے ادھر اُدھر سے دو چار مزدور اکٹھے کئے۔ اور خود ہی چھت ڈالنے پر تل گئے۔ کہتے ہیں کہ یہ چھت آٹھ روز میں جا کے پڑی۔ ایک ایک کمرے پر دو دو دن خرچ ہوئے۔ اس واقعے کا اس نواح میں کئی روز بڑا چرچا رہا۔

ایک وکیل صاحب نے زمین کا ٹکڑا تو خاصا بڑا خرید لیا تھا، مگر مکان بنانے کی استطاعت نہ تھی۔ انہوں نے صرف ایک کمرہ اور ایک باورچی خانہ بنوایا، اور دیواروں پر پلستر، سفیدی یا رنگ روغن کرائے بغیر باقاعدہ رہنا شروع کر دیا۔ ان کا کنبہ خاصا بڑا تھا۔ رات کو یہ لوگ لالٹین جلاتے۔ چونکہ یہ پلاٹ سرِ راہ تھا جس پر راہ چلتے کی نظر پڑتی تھی اس لئے انہوں نے کچا ڈنڈ کی دیوار کی جگہ بڑی محنت سے جنتر کی باڑھ اگا دی تھی جس سے خاصا پردہ ہو گیا تھا۔ مگر جب کبھی مٹی ڈھونے والوں کے گدھے اس طرف سے گزرتے تو وہ اس ہریالی پر بری طرح ٹوٹ پڑتے، اور دیکھتے ہی دیکھتے جنتر کے درجنوں پودے چر جاتے۔ اس پر گھر کے سب لوگ جو زن و مرد اور بچوں سمیت تعداد میں دس تھے۔ شور مچاتے ہوئے باہر نکل آتے۔ اور ڈنڈے اور پتھر مار مار کر گدھوں کو بدحواس کر دیتے۔

پروفیسر سہیل کے ہاں تعمیر کا کام شروع ہو گیا تھا۔ اپنے پچھلے تلخ تجربے کے بعد جس میں اس کی نصف سے زیادہ پونجی ڈوب چکی ضائع ہو چکی تھی اس نے ٹھان لی تھی۔ کہ وہ مستریوں اور مزدوروں کی بے ایمانیوں پر چشم پوشی کرے گا۔ اور ان سے کچھ تعرض نہیں کرے گا۔ وہ دیکھتا کہ بعض کاریگر دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد اپنے ٹفن کے خالی ڈبوں کو سیمنٹ سے بھر لیتے ہیں۔ وہ دیکھتا کہ لوہار لوہا باندھنے والے تار کے پونڈ کے پونڈ غائب کر دیتا ہے۔ وہ دیکھتا کہ بڑھئی پیمائش کر کے اس سے جتنی لکڑی منگواتا ہے اس سے آدھے دروازے اور کھڑکیاں بھی نہیں تیار کر پاتا۔ اور ہر روز شام کو وہ سیمنٹ کی خالی بوری میں لکڑی کے کئی کارآمد ٹکڑے برادے کے ساتھ بھر کر سائیکل کے پیچھے باندھ لے جاتا ہے۔ وہ دیکھتا کہ چوکیدار مستریوں کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ اور وہ سب مل کر اسے لوٹ رہے ہیں۔ رات کو وہ اپنی بیوی سے ان لوگوں کی دغابازیاں بیان کرتا۔ وہ سنتی اور چپکے چپکے آنسو بہاتی رہتی۔

اس کی دو مہینے کی چھٹی ختم ہو گئی۔ اور وہ پھر کالج جانے لگا۔ مگر اس کا دل پڑھانے میں مطلق نہ لگتا۔ اس کا دوپہر کا کھانا بالکل چھوٹ گیا تھا، کالج سے گھر جانے کے بجائے وہ اپنے پلاٹ کا رخ کرتا۔ اور وہاں سے شام کو بڑی دیر میں گھر پہنچتا۔

غضب یہ ہوا کہ ابھی مکان کا بہت سا کام باقی تھا۔ کہ مستریوں کی بے ایمانیوں، عمارتی سامان کی نایابی اور بلیک مارکٹ کے باعث اس کا سرمایہ ختم ہو گیا۔ رفتہ رفتہ بیوی کے زیورات، ریڈیو، بائیسکل، کپڑا سینے کی مشین، کیمرا، اور کئی دوسری مفید چیزیں مکان کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ اس کے پاس نایاب کتابوں، قلمی تصویروں اور پرانے بادشاہوں کے سکوں کا بہت قیمتی ذخیرہ تھا۔ وہ سب کوڑیوں کے مول بک گیا۔ اس کی آدھی سے زیادہ تنخواہ مکان پر اٹھ جاتی۔ اس نے سگرٹ پینا چھوڑ دیا۔ گھر میں دونوں وقت دال بھاجی پکنے لگی۔ گھر میں کسی کے پاس پہننے کو کوئی کام کا کپڑا نہ رہا۔ کالج میں پرنسپل سمیت کوئی پروفیسر یا لکچرار ایسا نہ تھا جس کا وہ سو پچاس کا مقروض نہ ہو۔ وہ شب و روز غموں اور فکروں میں گھلنے لگا۔ اس کی صحت جواب دینے لگی۔

جس علاقے میں پروفیسر سہیل کا مکان بن رہا تھا، اس کے قریب ہی چار سو گز کے پلاٹ میں ایک دفتر کے سپرنٹنڈنٹ کا مکان بھی زیر تعمیر تھا۔ سپرنٹنڈنٹ نے اپنے اثر و رسوخ سے ہر کام سستے داموں کرایا تھا۔ پھر بھی مکان تیار ہونے میں چار پانچ ہزار روپے کی کسر رہ گئی۔ یہ رقم اس نے ایک انجینیر سے دو سال کے پیشگی کرائے کے طور پر حاصل کرلی۔ جب مکان بن کر تیار ہوا تو سپرنٹنڈنٹ کی بیوی جو مصری وضع کا برقع پہنے تھی اپنے نصف درجن بچوں کو لیکر اس پر قابض ہوگئی۔ انجینیر یہ دیکھ کر بہت سٹپٹایا۔ مگر سپرنٹنڈنٹ نے اس سے درخواست کی۔ کہ چند روز میرے بیوی بچوں کو نئے مکان کا چاؤ پورا کرلینے دو۔ پھر ہم اسے خالی کر دیں گے۔

مگر یہ چند روز رفتہ رفتہ ہفتوں میں تبدیل ہو گئے۔
اب سپرنٹنڈنٹ نے انجینیر کی خوشامد کی۔ کہ ہمیں اسی مکان میں رہنے دیا جائے۔ ہمارے پاس رہنے کو کوئی جگہ نہیں۔ میں آپکا روپیہ ماہانہ قسطوں کی صورت میں ادا کر دوں گا

اس پر انجینیر نے وکیل کے ذریعے اسے نوٹس دیا۔ اور قانونی چارہ جوئی کرنے کی دھمکی دی۔ آخر میں سپرنٹنڈنٹ نے مکان خالی کر دینے ہی میں مصلحت سمجھی۔ جس وقت اس کی بیوی گھر سے نکلی تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر بھر آ رہے تھے۔

ایک اونچے عہدہ دار نے دو ہزار مربع گز زمین پر ایک عالی شان کوٹھی تعمیر کی۔ اور اس میں ایک خوش نما باغیچہ بھی لگوایا۔ جب کوٹھی تیار ہوئی تو اس کا نام "نشیمن" تجویز ہوا۔ ایک دوست نے مشورہ دیا۔ کہ اس پر "ھٰذا مِن فَضلِ رَبّی" بھی لکھوا دیا جائے۔ عہدہ دار نے اس رائے کو پسند کیا۔ اور جلی خط نسخ میں یہ الفاظ کوٹھی کی پیشانی پر کندہ کرا دیئے۔ دو ہفتے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ یہ کوٹھی جس پر کوئی نوے ہزار روپے کے قریب لاگت آئی تھی، ڈیڑھ لاکھ میں بک گئی۔

چاند خاں کو بالآخر ایک کرایہ دار مل گیا۔ جس نے حامی بھرلی۔ کہ میں تمہارے ادھورے مکان کو مکمل کرا دوں گا بشرطیکہ تم مجھے اس میں ابھی سے بس جانے دو۔ چاند خاں کو مجبوراً اس کی یہ شرط منظور کرنی پڑی۔ اس کی بیوی نے اس خوشی میں پورے من بھر دودھ کی کھیر پکوائی اور سارے جھونپڑیوں کے رہنے والوں کا منہ میٹھا کرایا۔

خدا خدا کرکے پروفیسر سہیل کا مکان تکمیل کو پہنچا۔ مگر وہ اس قدر خراب بنا تھا۔ کہ اس کے اندر جاتے ہوئے پروفیسر کا دم گھٹتا تھا۔ دیواروں میں کوب، کھڑکیاں اور دروازے ٹیڑھے بینکے۔ برآمدہ بے ڈھنگا ایک طرف سے چھوٹا ایک طرف سے بڑا۔ فرشوں پر ابھی سے دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ پھر اسے یہ بھی یقین نہ تھا۔ کہ اس کی تعمیر میں مستریوں نے لوہا اور سیمنٹ پوری مقدار میں خرچ کیا ہوگا۔

کئی دن تک وہ مکان خالی پڑا رہا۔ آخر ایک دوست کے کہنے پر اسے کرائے پر اٹھانے کے لئے ایک اخبار میں اشتہار دیا۔ دو روز میں اسے کوئی پندرہ بیس خطوط وصول ہوئے جن میں نصف کے قریب غیر ملکیوں کے تھے۔ یہ لوگ سفارت خانوں یا تجارتی فرموں سے تعلق رکھتے تھے۔ اور مکان نہ ملنے کے باعث ہوٹلوں میں بھاری کرائے ادا کر رہے تھے۔

اس نے تین چار اچھی اچھی اسامیوں کو منتخب کیا، اور مکان دکھانے کے لئے بلوایا۔ اس کے اچنبھے اور خوشی کی حد نہ رہی جب ان لوگوں میں سے کسی نے بھی ان نقائص کو محسوس تک نہ کیا جو وہ اپنی دانست میں اپنے مکان میں پاتا تھا۔ آخر ایک شخص کو اس نے مکان کرائے پر دیدیا۔ اس سے اسے اتنی رقم پیشگی کرائے کے طور پر مل گئی، جس سے اس کی آدھی کے قریب مکان کی لاگت وصول ہو جاتی تھی۔

اس کاروبار کو یوں خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دینے کے بعد وہ خوشی خوشی گھر پہنچا۔ اور بیوی سے کہنے لگا:۔

"اچھا ہی ہوا کہ ہم خود اس مکان میں نہیں گئے۔ کیونکہ اس کی بناوٹ بڑی ناقص ہے۔ مگر اب مجھے مکان بنوانے کا بخوبی تجربہ ہوگیا ہے۔ ابکے میں انتہائی احتیاط سے کام لوں گا۔ اور ایسا مکان بنواؤں گا جو بے عیب ہوگا۔ اور کوئی چاہے کتنا ہی کرایہ دے میں منظور نہیں کروں گا۔ وہ مکان ہمارے اپنے رہنے کے لئے ہوگا۔ کیونکہ لڑکیاں بڑی بڑی ہوگئی ہیں۔ اور ہم سب کا ایک کمرے میں رہنا ٹھیک نہیں۔"

اس نے اخبار اٹھایا، اور اس کا وہ کالم بڑے غور سے پڑھنے لگا جس میں زمینوں کی خرید و فروخت کے اشتہار دیئے ہوئے تھے۔

افسانہ:

گلاب خاص

ابوالفضل صدیقی

آموں کے پنج سالہ تاریخی مقابلہ کی تیاریاں بڑے زور شور سے ہو رہی تھیں، اور حسن اتفاق سے امسال فصل بڑی اچھی تھی اور بور لگنے ہی سے موسم سازگار چلا آرہا تھا، اودھ اور روہیلکھنڈ کے باغ اور نرسری رکھنے والے زمیندار حسب معمول پانچ سال سے تیاریاں کر رہے تھے، اور ہمیشہ کی طرح اس سال کے شروع سے ہی سرگرمیوں میں شدت پیدا ہو گئی تھی۔ آموں کی نمائش تو ہر سال ہوا کرتی تھی، مگر نئے آموں کی ایجاد اور ترقی کا مقابلہ پانچ سال بعد اسی نمائش کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ یہ پانچوں سال اپنی اپنی تیاریوں اور مقابل کی تیاریوں کے راز معلوم کرنے کی کوشش میں گزرتے تھے، اس سلسلہ میں بڑی بڑی سازشیں ہوتیں، ایک دوسرے کے نوکر اور مزدور لالچ دے کر توڑے جاتے، ندیوں میں بیٹھ کر اسکیمیں بنتیں، پھر گھر گھر کے زمینداروں کی قبیلہ داری قسم کی لاگ ڈانٹ کے ساتھ ساتھ اودھ روہیلکھنڈ کی تاریخی چشمک بھی بروئے کار رہتی۔ "شمالی ہند" اور "جنوبی ہند"، "بنگال بہار" اور "یو۔پی"، "مرشد آباد، دربھنگہ" اور "اودھ روہیلکھنڈ" لڑا کرتے، بڑی بڑی دھڑے بندیاں ہوتیں۔ مرشد آباد اور دربھنگہ والے اودھ والوں کی سیادت تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے، وہ ہر مقابلہ میں دو چار ایسے آم پیش کرتے کہ اودھ اور اودھ کے ساتھ اودھ کے حلیف روہیلکھنڈ کی آنکھیں پھٹی رہ جاتیں، لیکن روہیلکھنڈ والے اودھ والوں کی سیادت منہ سے تسلیم نہ کریں مگر دل سے لوہا مانے ہوئے تھے، اور خوب سمجھتے تھے کہ اودھ والوں میں آم کی تجدید اور جستجو کا فن ہم سے بڑھا ہوا ہے۔

مقابلہ تو ہمیشہ بڑا کرارا رہتا تھا اور اودھ کے ہاتھ میدان میں زیادہ چلا آرہا تھا کہ اودھ کے گھر گھر سے دو چار نئے آم پانچویں سال ایجاد ہو کر نکلتے تھے اور روہیلکھنڈ، بہار، بنگال وغیرہ میں یہ شوق اتنی عمومیت پائے ہوئے نہ تھا لیکن امسال شہرت تھی کہ مقابلہ بڑے زور کا رہے گا۔ اور بھانت بھانت کی افواہیں بنگال سے لے کر اودھ روہیلکھنڈ تک گشت کر رہی تھیں، اور مشہور تھا کہ روہیلکھنڈ والے بڑی تیاریوں کے ساتھ آرہے ہیں۔ اس میدان میں ویسے تو ایک سے ایک بڑھ کر "بادن گزا" ہی اترتا تھا اور یہ مقابلہ ساونتی دور کی یادگار تھا، مگر روہیلکھنڈ کے خمیر میں مخصوص طرز کی ساونتی روایات کے ساتھ ساتھ روہیلوں کے دور حکومت سے کچھ تاریخی قسم کی جمہوریت کا رجحان پایا جاتا ہے۔ انہوں نے چھوٹے چھوٹے زمینداروں اور کسانوں کی عوامی قسم کی طاقت کے زور پر اٹھارہویں صدی کے تاریک دور میں نواب اودھ، وارن ہیسٹنگز، نواب بنگش اور شہنشاہ دہلی سب کو ایک آواز چیلنج کیا تھا، اور حافظ رحمت خاں کی بے وقت شہادت کے بعد روہیلکھنڈ فتح ہو جانے پر بھی ایک قسم کا جمہوری مزاج تمام روہیلکھنڈ کے جاگیردار طبقہ میں پایا جاتا تھا، لہٰذا مقابلہ میں کبھی کبھی اپنے یہاں کے معمولی کاشتکاروں کی بھی دو ایک ایجادیں لے آیا کرتے تھے۔ اگرچہ وہ کبھی معیار پر پوری نہ اتر سکیں۔

ویسے آموں کے مقابلہ کے علاوہ یوں بھی مندیلے کے بانکے چودھری، ملیح آباد کے افغان صورت پٹھان، اور شاہجہانپور، بریلی، رام پور کے اکھڑ روہیلے، شاہ آباد کے جلالی سید، جنہوں نے اپنی اپنی ایجادوں سے دنیا بھر کو آم کی کاشت کا کلچر دیا تھا جس وقت اپنے اپنے خانگی جھگڑوں میں بگڑ بیٹھتے تھے تو ہاتھی مارنے کی بندوقیں درمیان میں آکر فیصلہ کیا کرتیں اور اپنوں کے سینوں پر چاندماری کے بورڈ کی طرح گولیاں برسائے تھے۔ لیکن آموں کے مقابلہ میں اپنے اپنے علاقہ کی کامیابی اور

فتح کی کوشش میں ایک نظر آتے۔ اور باہر والوں کے ساتھ مہمان نوازی میں ایسے نرم کہ ریشم کے رومال سے کلائیاں باندھ باندھ کر اور ہاتھ جوڑ کر اور پاؤں پر ٹوپی ڈال کر مہمان کو ٹھہرانے کا اصرار کریں اور دوستوں اور مہمانوں کا بیت المقدس سے بڑھ کر احترام کریں۔ کھانے اور کھلانے والے ایسے زوردار روا ُتی کہ آم کی فصل میں اشتہار عام دیدیں کہ "لوٹ عام ہے" اور جو کوئی خواہ ہمارا شناسا ہو یا نہ ہو، ہمارے نام پیسے کے کارڈ پر فرمائش بھیجے گا۔ اس کے نام تحفہ میں پارسل پہنچے گا۔ ادنیٰ پٹواری سے لے کر وائسرائے تک اور فقیر سے لے کر امیر تک یکساں دریا دلی کے ساتھ آم کھلاتے۔ اور خود کھانے بیٹھتے تو صبح سے شام اور شام سے صبح تک مُنہ چلتا ہی رہتا۔ اور بقول شخصے کہ رس نتھنوں سے بہنے لگتا اور مُنہ سے آم نہ چھوٹتا۔ اور پھر جب آم کے نشہ سے دھت ہو کر اور برف دودھ کے گلاس چڑھا کر سونے پر آئیں تو سولہ سولہ گھنٹہ کی خبر لائیں اور دوپہر کے سوئے کہیں کسی روز آدھی رات آنکھ کھل جائے تو آم کھانے کی ہُوک میں آموں لیا کی ترنگ لگا کر بستر سے اُٹھیں، اور ساون بھادوں کی اندھیری رات میں سیدھے باغ کا رخ کریں اور سنسناتی لپکتی پروائی میں بجلی کی چمک کے سہارے گھنے درختوں کے نیچے آم ٹٹولتے نظر پڑیں، اور لہراتے پھنکارتے سانپوں کا ڈر بھی دھیان میں نہ لائیں۔ غرض پوری فصل آم کھانے اور آم کھلانے، آم بھیجنے اور آم منگانے کے سوا کوئی مشغلہ نہ ہوتا۔ دنیا آم ہی آم ہوتی اور زندگی نام آم کا ہوتا جاگتے میں آم پر بحث، اور سوتے میں آم کے خواب، اور جب آنکھ کھلتی تو غنودگی میں بستر کی چادر اور تکیہ پر ایسا محسوس ہوتا کہ تین تین انچ رس اور گودے کی تہہ جمی ہے۔

ہر سال آموں کی نمائش کی تیاری تو عید سے زیادہ سرگرمی کے ساتھ ہوتی اور پنج سالہ مقابلہ میں تو عسکری اہمیت کا سماں باندھ دیتے اور اپنے متعلقین میں چھوٹے بڑے کی توجہ اسی پر مرکوز کر دیتے آموں کے مقابلہ میں تو مرشد آباد، بہار، بنگال اور آسام تک کے آم رکھے جاتے۔ یو۔ پی کے پچھمی اضلاع اور وسط ہند کی بھی ایک آدھ ایجاد پیش ہوتی، لیکن اصلی مقابلہ اودھ روہیلکھنڈ اور مرشد آباد کے ہی درمیان ہوتا اور تقریباً ہمیشہ میدان اودھ کے ہاتھ رہتا، لیکن ہر مرتبہ دس پانچ نئے پھل روہیلکھنڈ اور مرشد آباد والے بھی نمائش اور مقابلہ میں ایسے پیش کر دیتے کہ اودھ والے چکرا جاتے۔ جب کبھی مرشد آباد والے بڑھتے معلوم ہوتے تو پورب اور پچھم لڑ جاتی۔ اور بنگال اور یو۔ پی کا سوال آ پڑتا اور اودھ اور روہیلکھنڈ والے مبصرین متفق ہو کر کثرت رائے سے مرشد آباد کو شکست دے دیتے مگر ایجاد کا لوہا تو دل میں ماننا ہی پڑتا اس وقت انعام نمبر ایک اور دو چپکے سے قرعہ اندازی کے ذریعہ اودھ اور روہیلکھنڈ آپس میں تقسیم کر لیتے۔

آغا صاحب کا بڑا باغ تھا اور بڑے پیمانہ کی نرسری اور خان صاحب کا اس سے بڑا باغ تھا مگر نرسری کا انتظام اتنا معقول نہ تھا جتنا آغا صاحب کے یہاں تھا، ویسے نرسری بھی باغ کے رقبہ کے مطابق تھی۔ دونوں کا اعلان تھا کہ ہم صرف پتہ فروشی کرتے ہیں اور گٹھلی فروشی کو عار خیال کرتے ہیں۔ دونوں اکبر الہ آبادی کے اس شعر پر عامل تھے کہ؎

ایسا نہ ہو کہ آپ لکھیں یہ جواب میں
تعمیل ہو گی پہلے مگر دام بھیجئے

ان کے باغوں کے ہزاروں اقسام کے لاکھوں آم فصل پر مفت تقسیم ہو جاتے اور سارے ملک میں نرسری کی قلمیں بکتیں، اور آموں کی مفت تقسیم میں ساونتی فیاضی سے زیادہ تجارتی اشتہار بازی کو دخل تھا۔ اس طرح مفت آم کھلا کھلا کر پودوں کا نمونہ دکھا کر اشتہار دیا کرتے۔ اور جاگیردارانہ فیاضی اور تواضع کی آڑ میں تاجرانہ پروپگنڈا ہوتا۔ ہر سال ہزاروں پودوں کے آرڈر آتے اور آم کی اقسام کے لحاظ سے پودوں کی قیمت ہوتی، ویسے گھٹیا بڑھیا ہر آم کی قلم تیار کرنے میں لاگت تو وہی ۳ر فی پودا آتی مگر لنگڑا، بمبئی، سفیدا، دسہری مالدہ، فجری وغیرہ عام دستیاب ہونے والے اقسام کے پودوں کی قیمت ایک روپیہ فی قلم رکھی تھی اور جتنی تجدیدیں کرتے گئے اور نئے نئے آم پیدا کرتے گئے اتنی ہی ان کے پھلوں کی اعلیٰ خصوصیات اور کمیابی کے سبب پودوں کی قیمت کا تعین کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ملیح آباد والوں نے "شمس الاثمار" کی قیمت چار سو روپیہ فی پودا قائم کی اور شاہ آباد والوں نے "مئے بے خودی" کی قیمت پانچ روپیہ فی پودا رکھی اور ملیح آباد والوں نے "ثمر بہشت چونسہ" کا نام "کھجری کمال" رکھ کر اس کی قیمت سو روپیہ رکھی۔ بڑی زبردست معاصرانہ چشمکیں چلتیں۔ سال کے سال بورڈ کے سامنے بے ضوابطیوں کی شکائتیں گذرتیں، داد رسی ہوتی، تادیبیں ہوتیں اور کارخانوں کی لسٹوں میں بورڈ کے فیصلوں کے مطابق ترمیمیں، تنسیخیں ہوتیں اور یہ نرسری مین قسم کے خاندانی زمیندار عجیب قسم کی مخنث صفتی تاجرانہ اور جاگیردارانہ ذہنیتوں کے حامل بن کر رہ گئے تھے۔

آموں کی نمائش کے لیے یہ جگہ مخصوص تھی! یہاں پر روہیلکھنڈ اور اودھ کی سرحدیں ملتی تھیں، ویسے خالص دیہاتی علاقہ تھا مگر زمینداروں کی توجہ خاص کا مرکز رہا تھا۔ میلوں لمبے لمبے چوڑے علاقہ میں باغ ہی باغ نصب تھے، زمینداروں نے اپنے کئی کئی گاؤں کے رقبوں کو ملا کر باغ لگائے تھے اور چونکہ اور کاشت نہ تھی لہٰذا دیہاتی مزدور چھوٹی اجرت پر دستیاب ہو جاتے تھے، دیہاتی اسٹیشن سے پودوں اور پھلوں کا لدان بہت آسانی سے ہو جاتا تھا۔ اور کہتے یہ تھے کہ اس علاقہ کی زمین آم کی پیداوار کے لئے بہت سازگار ہے۔ اگرچہ اس میں بجز تاجرانہ مصلحت کے اور کوئی بات نہ تھی۔ یو۔پی کے پورے صوبہ کی زمین کا چپہ چپہ آم کے لئے نہایت سازگار ہے۔

آموں کے مقابلہ کی بڑی شہرت تھی۔ نمائش کا سالانہ انتظام اور پانچ سال بعد مقابلہ کا انتظام، خاں صاحب اور آغا صاحب کے سر رہتا تھا۔ پچھلے مقابلہ میں ثمر بہشت، ہوش ربا اور آمن ابراہیم پورہ اول اور دوم انعامات دے گئے تھے۔ یہ دونوں آم خاں صاحب کے تھے اور خاں صاحب کو فکر تھی کہ کہیں اس مرتبہ کوئی آم ان کے آموں سے بڑھ نہ جائے، ویسے انہوں نے بھی چند نہایت نفیس آم ان پانچ سال میں پیدا کئے تھے۔ وہ دن رات اس فکر میں تھے کہ انہیں کسی صورت سے آغا صاحب کے یہاں کا وہ خاص آم جو اس مرتبہ مقابلہ میں پیش کرنے والے ہیں، مل جائے تاکہ وہ پہلے سے اس کی خوبیوں سے آگاہ ہو جائیں اور پھر اپنے دونوں پچھلے جیتے ہوئے آموں اور نئے تیار کئے ہوئے آموں سے اس کا تقابل کر کے فیصلہ کر سکیں کہ انہیں اس مرتبہ میدان میں نیا آم اتارنا چاہیئے یا وہی پرانے آم رکھنا چاہئیں۔ پانچ سال سے آغا صاحب کے نئے پیدا کئے ہوئے آموں کی شہرت اور خوبیاں سن سن کر خاں صاحب ڈر رہے تھے کہ کہیں تین پشت کی بنی بنائی ساکھ گرد نہ ہو جائے۔ جوں جوں مقابلہ کا وقت قریب آتا گیا، خاں صاحب کے جذبات شدت پکڑتے گئے۔ اور سات پشت سے یہی ہندوستانی، اگلی نسل سے تو خان بچہ تھے ہی؛ اپنی آن پر مٹ پڑے اور جس آن کو پانے کے لئے وہ پانچ سال سے سرگرداں تھے اس کے حصول کی آخری اور انتہائی اقدام کر بیٹھے۔ رات تو بڑے غضب کی تھی اور ایسے اقدامات کو پکار پکار کر دعوت دیتی ہوئی، اساڑھ کی بھیانک رات، جب آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوتے ہیں اور زمین کالی کیچڑ بنی ہوتی ہے۔ اور انہیں آغا صاحب کے چند نوکروں کی سازش سے مقابلہ میں آنے والے آموں کے درختوں کی بابت تو معلوم ہی ہو گئی تھی۔ اس مطلب کے چند مخصوص دل جلوں کو اشارہ کیا، اور یہ جانباز جان ہتھیلی پر رکھ کر آغا صاحب کے باغ میں داخل ہو گئے اور مقابلہ میں آنے والے آموں کے چند دانے اور دو پودے لے کر چلے آئے۔ محافظوں پر برسات کی پروائی کا نشہ، آم کے رس کا نشہ اور ارمان کا نشہ ہوا تھا کہ تھے بھی سوئے پڑے رہے، صبح تک کسی کو خبر نہ ہوئی، مگر آغا صاحب تو روزانہ آکر معائنہ کرتے تھے، صبح کو درخت پر پہلی نظر ڈالتے ہی بھانپ لیا کہ رات آم چوری ہو گئے اور پھر پودوں کے گملے بھی کم پائے، آپے سے باہر ہو گئے، پہلا تو محافظوں سے مطالبہ کیا لیکن سختی نہ کی، اور سراغ رسی میں مشغول ہو گئے اور صبح ہی صبح برسات میں سراغ رسی تو بڑی آسان تھی۔ زمین نم اور نرم تھی اور آغا صاحب کے باغ سے خاں صاحب کے باغ تک چوروں کے نشانات قدم بنے چلے گئے تھے۔

آغا صاحب ایرانی نژاد تھے اور مغل دور میں یہاں کے جاگیردار ہوئے تھے اگر خاں صاحب کو دس پانچ آدمی رات میں اپنی مطلب برآری کے لئے مل گئے تو آغا صاحب تو یہاں کے سات اور سات چودہ پشت کے بسے ہوئے تھے، اپنا پانچ سال کا راز اس طرح فاش ہوتے دیکھ کر مارنے مرنے اور سب کچھ الٹ پھینکنے پر تل گئے اور خاں صاحب نے تو خیر شبخون مارا تھا۔ آغا صاحب نے اپنے ہوا خواہ، کاشتکار، اور نوکر چاکر، مزدور جمع کر کے دن دہاڑے خاں صاحب کے باغ پر حملہ کر دیا اور ان کے محافظوں کو مار بھگایا۔ خاں صاحب کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ جواب میں آغا صاحب دن دہاڑے اتنی بڑی ہمت کا مظاہرہ کریں گے۔ خیر اس باغ پر تو بات زیادہ بگڑی ہوئی تھی۔ خاں صاحب نے لام بندی کر کے آغا صاحب کے ایک اور بڑے باغ پر قبضہ کر لیا۔

دونوں زمیندار قسم کے جتھہ بند زمیندار تھے، اور بانکے زمیندار عدالت میں نالش کرنا اپنی توہین خیال کرتے ہیں۔ آغا صاحب علاقہ کے اندر خاں صاحب کی نسبت زیادہ اثر رکھتے تھے۔ انہوں نے ذرا بڑی جتھہ بندی کی اور خاں صاحب کے بڑے باغ پر [illegible] لیا۔

اللہ خاں صاحب اپنی پوری طاقت کے ساتھ اپنے باغ پر مدافعت کے لئے تیار تھے کہ ڈنڈا بجنے کا پورا پورا امکان ہوگیا یوں تو قبضہ اور زمین کے معاملات میں زمینداروں کے جھگڑوں میں پولیس دخل نہیں دیتی ہے اور کبھی کبھی وراثت کے جھگڑوں کے سلسلہ میں قبضہ اور دخل کے لئے فریقین لام بندیاں کرکے فوجداریاں لڑتے رہتے ہیں اور متعلقہ پولیس خاموش بیٹھی دیکھتی رہتی ہے اور انہیں جبریہ قبضوں کی بنا پر مال کی عدالتیں داخل خارج کے مقدمات طے کرتی ہیں لیکن نہ تو یہ وراثت کا جھگڑا تھا اور نہ اس کی تہ میں کوئی داخل خارج کا مقدمہ چل رہا تھا، بلکہ بنیادی طور پر یہ تمام جھگڑا چوری اور مداخلت بے جا کے جرائم سے بنا تھا۔ لہٰذا سرکاری حکام نے بروقت مداخلت کی اور بلوہ بچایا، اور باغات نیلامی کو حسب دفعہ ۱۴۵ ضابطہ فوجداری قرق کرکے اپنے قبضہ میں لے لیا۔

اور تمام ملک میں ہلچل پڑ گئی۔ نمائش اور آموں کے مقابلے کے وقت نمائش ملتوی کرنا پڑتا اس فساد میں پڑ گئے اور یہاں سیکڑوں شائقین اور پانچ سال سے اس مبارک وقت کے منتظر بیٹھے تھے، سب نے مداخلت کی۔ اعلیٰ حکام چونکہ تحفہ میں نت نئے آم ہر دو فریقین سے پاتے رہتے تھے اور دونوں جانب سے یکساں تواضع کے ساتھ نوازے جاتے تھے لہٰذا اپنے قلم سے کوئی چیز طے کرنا مناسب خیال نہ کرتے تھے۔ انہیں یہ مداخلت بڑی غنیمت معلوم ہوئی۔ اپنے سر سے ٹالی اور فریقین اور درمیان والوں کی متفقہ مرضی سے معاملہ ثالثی میں دے دیا اور بالاتفاق رائے ہر دو فریقین نے فاروقی صاحب کو ثالث منظور کر لیا۔

جھگڑا چونکہ اودھ والوں کا آپس کا تھا اور اودھ میں ہر حیثیت اور ہر طبقہ میں کسی نہ کسی جانب دلچسپی رکھتا تھا لہٰذا فاروقی صاحب سے مناسب ثالث کوئی نہ ہو سکتا تھا۔ فاروقی صاحب ردولی ضلع بارہ بنکی کے مشہور خلیفہ [illegible] سے تھے اور ولایت سے تعلیم یافتہ سائنٹفک [illegible] تھے۔ باپ درمیانی حیثیت کے زمیندار تھے۔ تھوڑا بہت نرسری کا کام کرتے تھے۔ فاروقی صاحب کو باقاعدہ بوٹنی کی تعلیم دلوائی اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان بھیجا۔ وہاں سے تین سال میں فارغ ہو کر آئے تو اپنی سائنٹفک معلومات اور یورپ کے تجربات سے [illegible] باپ کے کام میں ایک اور ایک [illegible] کے اعتبار سے بھی [illegible] تھے۔

نرسری کے کام کے ساتھ اپنی اعلیٰ تعلیم اور وسیع تجربہ کی بنا پر فن باغبانی پر "رموز باغبانی" کے نام سے بڑی پُرمغز کتاب لکھی جس نے اس حلقہ کے اندر انہیں سارے ملک میں مشہور کر دیا۔ پختہ کار نوجوان تھے گھر پر کل وقت فنی معلومات کو عملی تجربات سے ہم آغوش کرنے میں گذرتا۔

ردولی ملکیت والوں کو جب معلوم ہوا کہ اودھ والوں کا بڑا جھگڑا چکانے کے لئے گورنمنٹ اور فریقین نے ثالث مقرر کیا ہے، تو سب کو بڑی خوشی ہوئی اور بڑے جوش کے ساتھ رخصت کیا۔

فاروقی صاحب بڑے تجربہ کار قسم کے ماہر نہ تھے۔ پھر خاندانی تربیت اور تجربات کے ساتھ اعلیٰ تعلیم ہر اعتبار سے خوب جلا پا چکے ہوئے تھے۔ انہیں سرخہ آم پیدا کرنے کا شوق بچپن سے وراثت میں ملا تھا۔ نرسری میں حسن آرا، برائٹ آف ایشیا [illegible] فرنگن سینڈریہ جیسے سرخے انہیں کے پیدا کئے ہوئے تھے۔ باوجود سائنٹسٹ ہونے کے مزاج میں تھوڑی سی شعریت اور رومان پسندی تھی، اور آم میں تو ماہر خاص تھے۔ اندھیری رات میں پتہ ہاتھ میں دے دو تو آم کی قسم بتا دیں اور درخت کی عمر دور سے دیکھ کر پہچان لیں۔ ہزاروں قسم کے نئے آم جو تمام ملک کے نرسری مینوں نے پیدا کئے ہیں۔ ان سب کی اصل نسل کے پورے محرم تھے۔ اور آم کے زیر نظر آم کی فصل کے متعلق نجومیوں کی طرح پیشگوئی کرنے والے ماہر تھے اور ملک کے ہر خطہ کی زمین اور آم کے درخت کے تعلق سے پورے شناور [illegible] ہیں، خاں صاحب اور آغا صاحب کا جھگڑا چکانے پہنچے جس سے تمام ملک کے شائقین کیا نیم اور چھوٹے بڑے نرسری مین متاثر ہو رہے تھے۔

فاروقی صاحب نے پہلے سرکاری مسل حاصل کی، پھر فریقین کے درمیان پہنچ کر مصالحت کرانی چاہی لیکن جب اس میں کامیاب نہ ہوئے تو ضابطہ کی کارروائی شروع کی۔ باقاعدہ خاں صاحب اور آغا صاحب کے بیانات لئے اور تحریری ثبوت ملکیت اور قبضہ کا مانگا۔ اور باغ کے درختوں کے نقشے لئے اور باغات کا معائنہ کیا۔ اور نقشوں کے مطابق درخت درخت کو جانچا۔ اور اسی سلسلہ میں ایک روز تنہا قطار قطار [illegible] خاں صاحب کے ایک باغ کی سرحد تک پہنچ گئے جس کے برابر ہی آغا صاحب کا باغ تھا [illegible] پہنچا کچھ دور پر آغا صاحب کے باغ کے درخت

نظر آئے اور جب ذرا نظر ادھر ادھر کو ڈالی تو دونوں باغوں کے درمیان ایک پٹی جیسے مستطیل ٹکڑے میں ایک سبز قطعہ نظر آیا۔ ان کے اور اس قطعہ کے درمیان باڑ کی کٹیلی باڑھ تھی ورنہ وہ ایک قدم بڑھا کر پہنچ جاتے اور انہوں نے قطعہ کے بیچوں بیچ ایک کنیا دیکھی جو نیچے سے اوپر تک شاداب بیل سے اتنی مکمل ڈھکی ہوئی تھی کہ کہیں پر دیوار یا چھپر نظر نہ آتا تھا۔ انہوں نے خلاف امید آم کے دو بڑے باغوں کے درمیان یہ عجیب سا قطعہ دیکھ کر تعجب سا کیا اور غور سے جائزہ لیا تو دیسی گلاب کی کاشت نظر آئی نہایت سلیقہ سے گلاب ہی گلاب تپلی لمبی پٹی میں کھڑا ہوا تھا اور جب غور کیا تو کنیا بھی گلاب کی بیل میں چھپی ہوئی تھی اور قطعہ کے اندر بالکل سکون تھا، اور سامنے کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا لیکن دوسری تیسری تیسانہ نگاہ میں انہوں نے ایک مالی کو ایک گوشہ میں ملیچھے لئے کام کرتے دیکھ لیا، مالی کی ادھر کو پشت تھی اور گوڑائی کر رہا تھا۔ یہ اطمینان کے ساتھ جائزہ لیتے رہے، اور اندازہ کر لیا کہ قطعہ کی ترتیب میں کاشت کا انتظام ہے۔ اور چمن والی صورت نہیں ہے۔ دونوں باغوں کے درمیان لمبی پٹی چوکور قطعوں میں کٹی ہوئی ہے اور دونوں باغوں کے محاذ میں مربع گلاب کے پودوں کے ٹکڑے چلے گئے ہیں: "مگر اس گلاب کے قطعہ کا نہ تو فریقین کے بیانات ہی میں ذکر آیا اور نہ نقشہ میں ہی دکھلایا گیا ہے!" انہوں نے دل میں خیال کیا اور پھر وہ تو گلاب کے عاشق تھے چپہ چپہ اور پتہ پتہ پر بڑی گہری نگاہ ڈالی تو کنیا کے چاروں کونوں پر گلاب کی چار جھاڑیاں سی نظر آئیں، تمام کی تمام پھولوں سے ڈھکی ہوئی، ایسی کہ گلابی ہی گلابی نظر پڑیں، کہیں سبز پتی دکھائی نہ دے۔ "گلاب کی بہار کا موسم تو ہے نہیں، پھر یہ کون سا خاص گلاب ہے، جو برسات میں اتنے زور سے کھل رہا ہے؟" انہوں نے دل میں کہا اور جب غور کیا تو آنکھیں کھل گئیں: "ارے یہ تو آم کے پودے ہیں:" چار پانچ فیٹ بلند اور بڑے تناسب پر دوان چڑھے ہوئے جیسے چار گنبد، ایک دوسرے کا جواب، یکساں قطریں پھیلے ہوئے، گویا تراش کر رکھ دئے ہیں۔ سرخ سرخ آموں سے اس درجہ لدے ہوئے کہ کہیں پہ سبزی کی جھلک نظر نہ آتی تھی۔ درختوں کی ہیئت پر ہر ایک کی نظر جم کر رہ جاتی اور پھر فاروقی صاحب کو تو سرخہ آموں سے خاص شغف تھا اور وہ بہترین سرخوں کے موجد تھے۔ بے اختیار منہ سے نکلا "سبحان اللہ!" اور ایک جست لگا کر باغ کی کٹیلی باڑھ پھاند کر ادھر جا گرے "کیسا عجیب سرخہ ہے۔ باغ کی دلہن، اگر کھٹا بھی ہو تو بھی وہ باغ باغ نہیں جس میں اس کا پورا ایک قطعہ نصب نہ ہو!" انہوں نے دل میں کہا اور قریب جا کر دیکھنے لگے۔ "درختوں کی نمو اعلیٰ داشت اور توجہ کا پتہ دیتی ہے۔ پورب رخ کے آم جو ذرا گدرائے ہوئے ہیں ان پر وہ روپ ہے جو کسی حسین دوشیزہ کے بدن پر نوجوانی کی پہلی سنناہٹ پر پیدا ہوتا ہے۔ اور کچی کینڑیاں کیا ہیں ننھی کنوار یاں نوجوانی کی سرحد میں قدم رکھنے سے ذرا پیشتر، اور درخت کیا ہیں کہ لال پریاں!" — اور فاروقی صاحب حسن فطرت کے نظارے میں کھو گئے اور آدمی شاعر مزاج تھے، اور سیاحی قربت اور انگلستان کے قیام نے کچھ حسن پرست اور نقاد بھی بنا دیا تھا اور وہ تو سرخہ آموں میں فرانس اور انگلستان کی دوشیزاؤں سے لے کر لالہ رخ سیما کے دہکتے رخساروں کے نظارے کر لیا کرتے تھے اور بڑے شوق کے ساتھ چوسا کرتے تھے اور اس وقت کچھ تو موسم اور وقت کی فسوں کاری، ماحول کا حسن انتظام اور پھر ان چار پودوں کی بہار، وہ خود فراموشی کے عالم میں کھو گئے، نگاہیں ہٹائے نہ ہٹتی تھیں کہ مالی کے سلام کی آواز پر چونکے اور مالی ادب کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے سوال کیا "یہ پھلوار؟ — یہ کس کی ہے؟ آغا صاحب کی یا خاں صاحب کی؟"

اور مالی آغا صاحب اور خاں صاحب کے نام سن کر سہم سا گیا۔ سب کو ان کے جھگڑوں کے متعلق علم تھا، اور یہ بھی علم تھا کہ ریٹائرمنٹ کے ایک صاحب بہادر تصفیہ کے لئے آئے ہیں اور مالی تو فاروقی صاحب کو دیکھ بھی چکا تھا اور پہچانتا تھا۔ نہایت ادب سے ذرا گردن جھکا کر جواب دیا "سرکار۔ یہ پھلوار آپ ہی کی ہے!" اور رک کر کہا "اور سرکار ہم تو سب کے نمک خوار ہیں آغا صاحب ہوں، خاں صاحب، یا خواجہ صاحب ہوں کہ شیخ صاحب!" اور فاروقی صاحب نے اندازہ کیا کہ مالی نہایت نستعلیق ہے۔

"اچھا تو یہ تمہاری اپنی ہے مگر ان دونوں باغوں کے درمیان آغا صاحب اور خاں صاحب کے بیچوں بیچ بڑے عجیب موقع پر ہے!"

اور مالی کچھ گھگھیا سا گیا اور دانت نکال کر عاجزی کے ساتھ بولا: "ہاں سرکار اور غلام تو سب کا ہی ہے، اور بڑوں بڑوں کے جھگڑے میں چھوٹے ہاتھ ڈالنے والے نہیں۔ بڑوں کے معاملہ میں بڑے ہی پڑ سکتے ہیں — ارے بھئی میرا مطلب یہ ہے کہ یہ چھوٹا سا قطعہ

ن دو بڑے باغوں کے درمیان تمہارا کیا ہے؟"

اور مالی ادب آمیز عاجزی کے ساتھ ہاتھ جوڑ کر بولا "سرکار ہاتھی
، ہاتھی سے ٹکر ہے، اور مجھے معلوم ہے آپ فیصلہ کرانے اور تحقیقات
ینے آئے ہیں۔ میں کوئی بیان نہیں دوں گا۔ غریب آدمی سب کا نمکخوار"
دیکھو مالی میں تمہارا بیان نہیں لے رہا ہوں، صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں
اس علاقہ میں بس چار زمیندار ہیں۔ خاں صاحب، آغا صاحب، اور
ن کے نواسے اور داماد۔ ان چاروں میں سے یہ اراضی جو تمہاری
ب کی کاشت میں ہے، کس کی زمینداری میں ہے؟"

خیر جب سرکار بیان نہیں لکھ رہے ہیں تو بتاتا ہوں۔ کاغذ تو مجھے
یھنا نہیں آتا مگر پٹواری سے معلوم ہوا تھا کہ آدھی آدھی خاں صاحب
ور آغا صاحب دونوں کے محالوں میں پڑتی ہے اور سرکار مجھ کو ملی بھی
ونوں سرکاروں سے ہے، اور سرکار دیکھ سکتے ہیں بھلا اتنے بڑے
و باغوں کے مینڈھوں کے درمیان یہ تپلی پٹی، بھلا زمین کس کام کی
گی دو طرفہ "چھینٹہ" کسی پیداوار کے تو لائق تھی نہیں، پھر سرکار
میندار وں کا انعام بڑی چیز ہوتا ہے، اور سرکار پشتوں سے انہیں
رکاروں کا نمک کھاتا چلا آرہا ہوں۔ اور راجکنواروں اور راجکنواریوں کے
پنے سہرے سے پار لگاتا چلا آرہا ہوں۔ سو سرکار آغا صاحب کے
ڑکے کے صاحبزادہ کی شادی کی تاریخ مقرر ہوئی۔ چوٹ پر خاں صاحب
ے بھی وہی تاریخ ڈالی، پہلے تو ذرا تنی۔ پھر دونوں جانب کے مہانوں
ے تصفیہ کرا دیا۔ غلام دونوں ڈیوڑھیوں کا خادم۔ دونوں سہرے گوندھے،
ونوں سرکاروں سے ایک ایک گنی، ایک ایک جوڑا، ایک ایک
لعن اور یہ ایک ایک ایکڑ بھر زمین بے لگانی کاشت معافی خدمتی انعام
ں ملی۔ سو سرکار میں نے بھی کنگھن اور گنیاں اسی میں لگا دیں، اور یہ
اب ہرا کر لیا۔ اور سرکار ہم مالی لوگ رئیسوں کے کھلونے آپ کو پھول
سنگھا کر اپنا پیٹ بھرتے ہیں اور سرکار نے کہیں مالی ہل پھاوڑا
اتے بھی دیکھے۔ پھر میں تو جب تک پانچوں میں دم رہا، بہت
تار ہا، اور یہ پھلوار کا سہارا تو اب کر لیا ہے بڑھاپے میں آکر۔
آم کے سب باغ میرے ہی لگائے ہوئے ہیں اور ساری سبزی
نہی ہاتھوں کی دکھائی پڑتی ہے۔ ثمر بہشت چونسہ میں نے تیار کیا اور
بہشتی علی باغ میں نے نکالا۔ خاص الخاص شاہ آباد، فردوسیہ،
لس، بے نظیر، شیر و شکر، دلربا۔ سب انہیں ہاتھوں کے بنے ہوئے
آم ہیں۔ اور حضور رعنا بی گولہ جو مبیا کہ میں ہی مدپر آجاتا ہے اور زمینداروں
کو کھلانے کو مل جاتا ہے میں نے ہی نکالا۔ اور اس کے بعد جیٹھ میں زرد آلو
مدپر آجاتا ہے اور سرکار زرد آلو بھی میرا ہی تیار کیا ہوا ہے۔ اور سرکار
آمن رٹول مظفر نگر سے میں لے ہی منگوا کر دی۔ معرکتہ الآرا، سرخہ
، برہا، سیب ہند اور آمن حسن آرا اور سرکار آمن ابراہیم پور اور شمس الاثمار
میں ہی لایا۔ راتوں رات سر ہتھیلی پہ رکھ کر چودھری صاحب کے
باغ سے بنگلہ والی قلم منزل مار کر میں لایا اور خواجہ صاحب کے
ذخیرہ سے مئے بے خودی لایا، جن کے کتے رات کو باغ میں شیر کی
طرح پہرہ دیتے ہیں اور اب سرکار ایک لڑکی ہے پرایا دھن، آج
نہیں تو کل دوسرے کی ہوئیگی اور غلام تو اسی پھلوار کے سہارے
یہیں پر کاٹ جائے گا۔ جب اپنے لگائے باغوں پر نگاہ ڈالتا
ہوں تو جی کو تسلی ہو جاتی ہے۔ مجھ سے پہلے تو یہاں سب تخمی باغ
تھے اور کہیں کہیں لنگڑا، بمبئی، سپیدہ، فجری، اور کہیں کہیں دسہری
کے پرانی چال کے قلمی پیڑ تھے اور جب ان اپنی پیدا کی ہوئی اور پالی
ہوئی نئی نئی قلموں کے باغ دیکھتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے
کہ میرے بیٹوں کی فوج کھڑی ہے۔ پھر یہ کیسی بات ہے کہ جتنی قلمیں
بنگال، بہار، حیدر آباد سے آئی ہیں وہ بھی میں نے پروان چڑھائیں
اور ان سے ہزاروں قلمیں تیار کیں۔ اب یہ آ تو لے سے شربتی بگرین اور
مرشد آباد سے کالا پہاڑ مرشد آبادی کوہ طور مرشد آبادی، کیلوا، چمپا،
ایک ایک قلم آئی، اور دربھنگہ سے ہاتھی جھول، لنگڑا دربھنگہ، اور رونا
ہو کر آئے اور شاہ آباد سے کھجری کمال آیا، اور ناگپور سے کشن بھوگ
موہن بھوگ آئے اور سب کی قلمیں انہیں ہاتھوں سے تیار کر کے ہزاروں
درخت پروان چڑھا دیا۔ یہاں کے سب سرخے اور آمنیں بھی میری
باندھی اور پالی ہوئی ہیں اور اب تو آخر عمر ہے فصل پر آم بھی نہیں
کھایا جاتا سرکار جی بھر گیا بس درخت دیکھ کر دل ہرا رہتا ہے۔
اور روپیوں کی گذر اس پھلوار سے ہو جاتی ہے ویسے شہر جا کر
ہاروں کا روزگار کر دوں تو شام کو اتنے پیسے مل جایا کریں جتنے یہاں
مہینے بھر میں ملتے ہیں۔ پھر سرکار ان باغوں کی محبت نہیں چھوڑتی۔"
مالی نے دور دور تک زمینداروں کے پھیلے ہوئے باغوں پر پیار بھری نظر
ڈال کر کہا۔

"لیکن یہ تو بہت پھول اترتا ہوگا۔ اتنے گلاب کا یہاں دیہات میں کیا کرتے ہو؟"

تھے سرکار، یہ تو گلاب ہے سوکھا بھی بک جاتا ہے۔ عطار دل کے ہاتھ فصل پہ بھپکے والے آجاتے ہیں، عرق کھینچ کر لے جاتے ہیں، سرکار کی کرپا سے روٹی چلے جاتی ہے اور جی لگ گیا ہے۔

اور فاروقی صاحب نے غور کیا کہ مالی سب ہی آموں کا ذکر کر گیا اور نہ کیا تو اس سرخہ کا جو اس کی کٹیا کے چاروں کونوں پر لدا کھڑا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ گریز کر رہا ہے۔ انہوں نے خود ہی کہا "اور یہ سرخہ؟ یہ کیا ہے، یہ کوئی نئی چیز بابا جی؟ یہ تو بڑے زور کا سرخہ ہے"۔ اور مالی پھر کچھ سٹ پٹا سا گیا، کہ ایک زمیندار کے علم میں یہ چیز آگئی۔ اسے یوپی ٹیننسی ایکٹ کی اس دفعہ کا خوب علم تھا جس کی بنا پر کسی کاشتکار کو اپنی آراضی پر آم کا درخت نصب کرنے کا حق نہیں تھا اور آم نصب کر کے تو کاشتکار برا پھنستا ہے۔ اگر درخت ایستادہ رکھے گا تو بیدخل ہو جائے اور بیدخلی کے خوف میں کاٹ دے گا تو قید ہو جائے گی۔ مگر مالی کی تو ساری عمر رئیسوں میں ہی کٹی تھی بہت ہی ہلکی بات کرتے ہوئے بولا۔ "ہوں سرکار یہ ایک پپیا جم اٹھا تھا، وہ دیکھئے وہاں پر منڈیر سے میں"۔ اور مالی نے پھلوار کے کنارے پر کھڑے ہوئے ایک ذرا بڑے درخت کی جانب اشارہ کیا، کوا نہ معلوم کہاں سے گٹھلی کھا کر ڈال گیا، یہ اس کا اصلی تخمی ہے اور سرکار یہ بھی جلدی پروان چڑھ گیا، ویسے تو منڈیر سے میں تھا اور گلاب کی باڑھ میں پھنسا ہوا۔ مگر میری سندریا اس وقت پانچ چھ برس کی تھی، آپ کی لونڈی، اس کی نگاہ پڑ گئی اور اور بچے تو اکھیڑ کر اور پپیا بنا کر بجا لیتے۔ مگر اس کی جنی اس نے تو پروان چڑھانا شروع کیا، اور کھیل کھیل میں اس کے پاس ڈیڑھ ہاتھ گہرا کنواں کھود لیا اور ہاتھ بھر لکڑی کی رہٹ لگا کر اور دیوالی کی ٹھلیوں میں ڈوری باندھ کر اسے پانی دیتی اور کنوئیں کو نہر پر سے پانی لا لا کر بھرتی اور سرکار ایسے ہی مذاق ہی مذاق میں کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ بارہواں سال، مگر پانچ ہی سال بعد پپیا پیڑ بن گیا اور سرکار میرے جو پھل لایا تو سرخہ! اور بڑا اور دار رنگین سرخہ نکلا! اور دیکھا تو سرکار بس میں گھوم گیا اور سندریا دس بارہ برس کی ہو گئی تھی، اور آپ جانیں مچھلی کے بچے کو تیرنا کون سکھلائے۔ اس نے ہوش سنبھال کر دن رات گلاب دیکھے تھے مگر نہ معلوم قلم باندھنا کیسے سیکھ گئی اور میں نے تو دیکھا بھی نہیں اس نے چپکے سے چار قلمیں باندھ لیں اور وہ چاروں یہ ہیں۔" مالی نے کٹیا کے کونوں پر کھڑے چاروں درختوں پر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اور فاروقی صاحب نے سرخ آموں کے لدے پودوں پر پیار بھری نگاہ ڈالی۔ اور مالی نے سلسلہ کلام جاری کیا "سو سرکار اندر مہاراج کی کرپا۔ یہ تین ہی سال میں اس کے ہاتھوں کی سیوا سے پروان ہو کر پھل گئے اور تیسرے برس پھل لینا ٹھیک نہیں ہوتا۔ آپ جانتے ہی ہیں، میں نے بور جھاڑ دیا، پچھلے سال بھی پہلے تھوڑے بہت پھل لگائے اور اس سال بھرپور فصل لے آئے۔ قلم میں پھل بھی بہت بڑھ گیا اور مزہ مٹھاس بھی چڑھ گئی، گٹھلی گھٹ گئی، رس بڑھ گیا، ریشہ غائب ہو گیا۔ اب دیکھئے نا" مالی نے پھر اصل درخت کی جانب اشارہ کیا جس پر چھوٹے چھوٹے آم لدے ہوئے تھے "کتنا بڑھ گیا! بس سرکار یہ سب اسی کے ننھے منے ہاتھوں کا کرشمہ ہے۔ اور اب سرکار ایک پھانک ذرا چکھ کر دیکھیں"۔ اور یہ کہہ کر آواز دی "اری سندریا ذرا سرکار کو ایک آم تو چکھا"۔ اور سبز کٹیا کے اندر سے لال پری نکلی، سندریا باہر آئی، الحفیظ والاماں! جیسے ساری پھلوار پھول اٹھی! اور درختوں پر لدے ہوئے آم کا دانہ دانہ شرما گیا، سارے جہاں کے گلابوں کا رنگ اور دنیا بھر کے سرخوں کی ملاحت اسی میں سمٹ کر آگئی ہے۔ پہلی بے ساختہ نگاہ پر فاروقی صاحب بھونچکا سے رہ گئے، بھڑکتا ہوا شعلہ قد آدم سامنے تھا۔ پھر کچھ سنبھلے اور حلق میں پھنستی ہوئی آواز میں بولے "اچھا، یہ، سندریا تمہاری لڑکی ہے؟" اور پھر سندریا کے سندر روپ میں کھو گئے۔ مالی نے پھر کہا "اری ذرا سرکار کو تو اپنے پیڑ کا آم چکھا، ذرا سرکار بھی دیکھیں ہم غریبوں کا پروان چڑھایا ہوا ایک پھل، اور سرکار میں نے بھی یوں رہنے دیا کہ فصل پر جی چاہے، تو کیوں کسی زمیندار کے باغ میں جا کر ہاتھ پھیلانا پڑے؟"

اور سندریا نے پاس کے درخت پر سے چند پسندیدہ دانے توڑے اور توڑتے وقت فاروقی صاحب اس کی گلرنگ باہوں کے نیچے کا مرمریں حصہ دیکھ کر چکا چوند سے ہو گئے۔ یوں تو زمیندار گھرانے کے تھے اور پھر ولایت پلٹ، کسی ادنیٰ طبقہ کے فرد کی اس قسم کی تواضع پر شاید توجہ نہ دیتے، مگر تواضع پر توجہ دینے کا انہیں ہوش کب تھا۔ گلابی انگلیوں میں دبی ہوئی گلابی قاش نہ معلوم انہوں نے کس وقت لے لی، اور پہلی قاش کچھ باوجود مصر ہونے کے انہیں کھاتے وقت آم کے حسن و قبح پر رکھنے کا ہوش نہ رہا اور جب دوسری گلابی قاش نازک مخروطی انگلیوں میں بڑھتی دکھائی دی تو انہوں نے سنبھل کر چکھی اور پھر تحسین و آفریں کرتی ہوئی نگاہیں اوپر اٹھیں تو داد طلب نرگسی انکھڑیوں سے چار

ہوئیں اور پھر سر سے پاؤں تک داد مانگتی لڑکی پر نگاہ ڈالی۔ یورپ کی سوسائٹیوں میں بھی کبھی یہ موقع نصیب نہ ہوا تھا کہ کوئی فنکار اپنی انگلیوں کی تخلیق ان کے سامنے اس طرح داد طلب انداز میں پیش کرتا اور سندریا نے اپنے ہاتھ کے بنائے ہوئے آم کی تیسری چوتھی، پانچویں، چھٹی قاش پیش کی، اور آم والی کے ساتھ فاروقی صاحب نے آم کی بھی ایک ایک خوبی پرکھ لی۔ اور بے ساختہ منہ سے نکلا۔ آم ہے کہ پھل کی معراج۔ اور پھر غضب کا حسین و جمیل۔ اور سندریا تو بچپن سے زمینداروں کے گھروں میں پھول مہندی لے کر جایا کرتی تھی، بڑی بھولی اور آزاد تھی۔ تعریفی الفاظ سن کر گلاب کی طرح کھل اٹھی اور بڑی شیریں آواز میں بولی" اور سرکار پتہ نہیں کہ آپ ڈال پسند کرتے ہیں کہ پال۔ اور اس کی کچی کینڑی پال اٹھ جاتی ہے، ایسی کچی کہ جالی بھی نہ پڑی ہو جیسے، بیا کھ میں پال لگا دو اور اٹھ جائے گی۔"

"ہوں، خوب! فاروقی صاحب نے ہونٹ چاٹتے چاٹتے کہا اور سرکار ہیں تو معلوم ہوتی نہیں یوں کہ ہماری ناک میں تو ہر وقت گلاب ہی گلاب لبا رہتا ہے مگر جنہیں ایک دو رات کا لبا ہوا کھلایا وہ کہتے ہیں کہ اس میں لس کر گلاب کی خوشبو پیدا ہو جاتی ہے۔" مالی نے کہا اور پھر لڑکی سے مخاطب ہوا۔" دیکھ تو کوئی ہے لبا ہوا۔ لا تو نکال کے، سرکار ذرا آزما کر دیکھیں کہ گلاب کی خوشبو پیدا ہو جاتی ہے کہ ایسی ہی بادہوائی بات ہے۔"

اور لڑکی کٹیا کے اندر سے چار دانہ نکال کر لائی، اور پانی سے دھوئے اور پہلے دو آم لے کر کاٹے اور قاش کھا کر فاروقی صاحب بولے" ہوں، ضرور، گلاب کی خوشبو دے جاتا ہے۔"

"اچھا سرکار تو یہ تو ایک رات کے بسے ہوئے تھے" اور لڑکی نے بقیہ دو آم کاٹے اور فاروقی صاحب نے قاش چکھ کر کہا" ہوں ہوں بالکل بالکل۔ نہایت نمایاں گلاب کی خوشبو ہے۔" تو بس سرکار یہ دو رات کے بسے ہوئے ہیں اور یہ خوشبو آخر تک رہتی ہے چاہے آم سڑ ہی کیوں نہ جائے۔" لڑکی نے کہا اور مالی نے کہا" اور سرکار یہ سڑتا نہیں ہے بلکہ پکنے کے بعد خشک ہو جاتا ہے۔" ثالثی کا کام یوں بھی حکومت کی جانب سے فاروقی صاحب کو تفویض ہوا تھا۔ پھر نمائش اور مقابلے کے انعقاد کا دار و مدار اسی کی کامیابی پر تھا۔ کل برِ عظیم کی آنکھیں انہیں کی نگا لگی ہوئی تھیں اور انہیں یہ کام کچھ تاریخی اہمیت کا حامل معلوم ہو رہا تھا۔ لہٰذا بڑی خاص توجہ دی اور پوری احتیاط سے کام لے کر اور ساری ذمہ داریاں اپنے سر دھر کر خاں صاحب اور آغا صاحب میں سمجھوتہ کرا دیا اور دل نہ سہی ہاتھ تو ملوا ہی دیئے اور آموں کی نمائش کے لئے راستہ صاف کر لیا۔ اسی میں اور آموں کی نمائش اور مقابلہ کا ہفتہ آلگا۔ بڑی زبردست تیاریاں تھیں، اور تیاریوں میں چار چاند یوں لگ گئے کہ اس مرتبہ جنرل سکریٹری اور منیجر کا اعزاز فاروقی صاحب کو بخشا گیا تھا۔ ہفتہ بھر پہلے جھڑی لگنے کے بعد بھی بادل صاف نہ ہوا تھا اور نمائش کے خاص ہفتہ کے بیچوں بیچ تو ساون بھادوں کے گلے ملنے کا دن آپڑا تھا جو آم کے شوقینوں کا نوروز کہلاتا ہے۔ ہلکی ہلکی سی چال پر دائی لہک رہی تھی۔ بھیگی بھیگی، بھاری بھاری، پانی کی پوٹیں سی بھرے، اودی اودی گھٹائیں امنڈ رہی تھیں۔ دنیا نم تھی، سبز ہی سبز، زمین کی چھاتی پر تھی۔ فضا میں آم کی خوشبو بھری ہوئی تھی۔ ماحول میں نشیلا متوالا رس ہی رس رچا ہوا تھا۔ بار بار کالے کالے بادلوں میں اندر مہاراج کا ہنٹر تڑپ کر چمک اٹھتا تھا۔ اور گرج پر گھمبیر سے باغوں میں مورچیخ پڑتے تھے، اور باغوں میں تو اندھیریاں سی پڑی ہوئی تھیں، نمی اور پھلوں کے بوجھ سے ڈالیاں سبز گھاس کے فرش پر لوٹ رہی تھیں اور پھلوں سے لدے ہوئے درخت دماغ کو مستی اور دلوں کو الہامی کیفیت سے آشنا کر رہے تھے۔ اس مرتبہ علاقہ کے لودھے باغ کی شادی تھی اور اسی میں نمائش کا انتظام کیا گیا تھا اور باغ کا پویلین نمائش اور مقابلہ کے لئے منتخب کیا گیا تھا اور یہ اندر رن میلکینڈ کے تو قصبہ قصبہ قریہ قریہ کے نئے آم نمائش میں آئے تھے اور ملک کے طول و عرض سے ہر خطہ کا آم جمع تھا۔ مرشد آباد اور دربھنگہ کا گروپ، بمبئی اور کلکتہ کے آم، ڈھاکہ اور آسام کی تجدیدیں، اور حیدر آباد کے گروپ کے ساتھ وسط ہند کے چند آم کچھ پارسل کے ذریعہ آئے ہوئے تھے اور بعض بعض کو نمائندے لے کر آئے تھے اور دعوت عام تھی، جس کے لئے اس علاقہ کے زمینداروں نے اعلیٰ سے اعلیٰ آم اپنے اپنے باغوں سے لاکر جمع کئے تھے۔ باغ میں تاحدِ نظر آموں کا فرش تھا۔ آموں کے ڈھیر تھے، آموں کے ٹیلے تھے، آموں کے پہاڑ تھے، آموں کے تودے تھے، رنگ برنگے، بھانت بھانت کے، ملے جلے گڈمڈ، اور کہیں تنہا ایک قسم کے، اوپر آم، نیچے آم، دائیں آم، بائیں آم، آگے آم، پیچھے آم، آم ہی آم سے دنیا بسی ہوئی تھی۔ درختوں تلے جوبن ہی جوبن تھا، مہک ہی مہک تھی، رس ہی رس تھا۔ مہمانوں کی آنکھوں میں نیچے

آم کا رس شراب کی طرح چھلک رہا تھا۔ دعوت عام تھی، اور اسی باغ کے آم گویا کم تھے اور دوسرے باغوں سے چھکڑوں اور ٹوکروں میں بھرے چلے آرہے تھے۔ خاص خاص مہمانوں کے لئے لگنیں اور ناندوں میں پولین کے نیچے نشست پر انتظام تھا اور آئس کریم تیار ہورہی تھی۔ عام مہمانوں کے لئے دودھ برف کی سلیں لگی ہوئی تھیں۔ دور دیہات اور قصبات میں عام دعوت کا اعلان تھا اور ٹولیاں کی ٹولیاں مزدوروں، کسانوں کی چلی آرہی تھیں ہر زمیندار اپنے باغ کے کل آموں سمیت میزبان بنا ہوا تھا۔ لنگڑا، بمبئی، سپیدا، دسہری، فجری، مقبول عام آموں کے ڈھیروں کا تو شمار نہ تھا۔ بہت سے زمیندار نئے نئے آموں کی لذت سے عوام کو آشنا کرکے شہرت حاصل کرنے کے لئے ثمر بہشت چونسہ، خاص الخاص شاہ باد، ثمر بہشتی علی باغ، حسن آرا، برائٹ آف رشیا، آمن ابراہیم پور، حامد پسند، شاہ پسند، نئے بے خوندی، شیر دشکر اور شارع نہات وغیرہ کے چھکڑے بھر کر لائے تھے اور دوسرے جن سے ان سے ذرا نوک جھوک رہتی تھی مقابلہ پر شربتی گرین، دل رُبا، سیب بند نیلم، کلاس، گولہ بصیر باغ، ہاتھی جھول، قوس قزح، کوٹھی حیدرآباد اور نایاب وغیرہ جیسے غیر معروف آم لے کر آئے تھے اور ہر حیثیت کے لوگوں کو تواضع کے ساتھ کھلا رہے تھے، چار روز تک آنے جانے کھانے پینے کا اسی طرح بازار گرم رہا، پانچویں دن پیٹوں کے ساتھ کچھ نیتیں بھی سیر ہوئیں اور شاید کچھ منہ بھی تھکے۔ مجمع بھی قدرے گھٹا۔ اگرچہ آم برستا ہی رہا اور اب ٹولیاں کی ٹولیاں آم کھانے کے بجائے اپنی اپنی فکر و استعداد کے مطابق آموں کی خصوصیات اور اقسام پر تبصرہ کرنے لگیں، نمائش کے آموں پر بحث ہونے لگی، اور مقابلہ میں آئے ہوئے آموں کے متعلق افواہیں سنائی جانے لگیں، کھانے والے نمائش کے آموں کو دیکھنے میں زیادہ دلچسپی لینے لگے۔ دو دن اسی میں گذرے۔

اور تیسرے دن سہ پہر کو آموں کا مقابلہ تھا تیاری صبح سے ہی شروع ہوگئی تھی۔ فاروقی صاحب بہت معروف تھے۔ دوپہر تک فاروقی صاحب نے مقابلہ میں شریک ہونے والوں کی فہرست بنا کر ججوں کی بورڈ کے سامنے پیش کردی۔ اور سب سے نیچے سندیا دختر امبکا پرشاد مالی نام دیکھ کر ججوں کا ماتھا ٹھنکا، اور رفتہ رفتہ بات باہر پہونچی۔ زمینداروں میں آزردگی کی لہر دوڑ گئی اور ان کی پارٹیوں میں جگہ جگہ چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں۔

"یہ اچھے نئے سکریٹری بنائے، مقابلہ پر مالی کھڑا کردیا!"

"ایسی تو پشتوں سے نہ ہوئی تھی"۔

"بھلا کسان، چمار شریفوں کے مقابلہ پر!۔ کونسی بھلمنسائت ہے!"

"بھلا یہ بھی کوئی شرافت کی بات ہوئی؟"

"بُرا زمانہ آگیا، وضع داری اور شرافت دنیا سے ختم ہوگئی، کہلاتے تو یہ بھی شریف زادہ ہی ہیں"

جی ہاں ان کی خاندانی وضعداری اور شرافت کے بھروسہ پر انہیں پہلے ثالث بنایا اور پھر اس نمائش کا سکریٹری بھی بنا دیا۔"

"ہوں بس، اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی"

یہ روہیلکھنڈی، یہ تو تاریخی کمین پرور ہیں۔ انہوں نے تو اپنے تخت پہ جاٹ کسان بٹھائے ہیں!"

"اور اودھ والوں سے تو کبھی بنا کر چلے ہی نہیں!"

خیر روہیلے پٹھان تو پھر غنیمت ہیں، بھڑ بھڑیا ہیں، غصیلے ہیں ذرا کھرے ہیں، مگر یہ شیخ! روہیلکھنڈی شیخ! الاماں، بڑے فطرتی! پورے شیخ، دیکھی اس فاروقی کی حرکت؟" لیکن انتظام تو اودھ والوں نے ہی ان انگریز منش صاحبزادہ کے ہاتھ میں دیدیا۔ سب پٹھانوں اور ٹھاکروں کی آبرو ریزی کرادی، روہیلکھنڈ ہی والے کے ہاتھ میں دینا تھا تو رام پور، شاہجہاں پور، بریلی، مراد آباد کے کسی ڈھنگ کے روہیلے پٹھان کے ہاتھ میں دیتے، جسے کم سے کم شرفا کی عزت کا تو پاس ہوتا!"

"وہ کیا کرتا! ارے بھئی تاریخ اٹھا کر پڑھ لو، انہوں نے کب نہیں کیا ایسا، شاہ اودھ شہنشاہ دہلی نواب بنگش اور ملکہ وکٹوریہ سب کے مقابلہ پر یہ جاٹوں، کسانوں، چماروں کی فوجیں لے کر آئے۔ اور آج دیکھئے وہی دن پھر کھڑا ہے، ایک ادنیٰ مالی اودھ کے شہزادوں راجکماروں کے مقابلہ پر لے آئے!"

"سب ملے ہوئے ہیں، اور پہلے سے سازش معلوم ہوتی ہے کہ انکے اندرونی جھگڑے میں ہاتھ ڈال کر میاں کا جوتا میاں کا سر کے مصداق کردو۔"

"بالکل صحیح، پوری سازش ہے، معلوم ہوا ہے کہ پہلے یہاں سے بھی مقابلہ میں رکھنے کے لئے فاروقی صاحب نے آموں کی ٹوکریاں منگائی تھیں۔ مگر جب شکست دینے کے لئے یہ مالی ہاتھ آگیا تو وہ آم مقابلہ پر نہیں رکھے اور چپکے سے نمائش میں رکھ دئے۔"

"ہوں! تو اب کی مرتبہ کوئی رو ہیلکھنڈی آم مقابلہ میں شریک ہی نہیں ہوگا۔ ہوں! ٹھیک ہے!"

"کیوں شریک ہوگا؟ وہ تو ہم تو چاول خور اور پتلی دال کھانے والے علاقے کے پوربیوں کی پگڑی نیچی کرنا تھی سازش کرکے اب نتیجہ تو اللہ کے ہاتھ میں، لیکن مقابلہ پر تو لا کر کھڑا کر ہی دیا۔"

"بڑا زمانہ آگیا، بھائیو شرفا کی عزت کا اللہ ہی بیلی ہے اور یہ نہیں دیکھتے کہ اس مرتبہ دعوت کتنی بڑھا دی۔ ویسے ہر مرتبہ تھوڑے بہت آجاتے تھے مگر اس دفعہ تو دنیا بھر کے گنوار جمع کر لئے۔ اور ہزاروں من آم برباد کرا دیا۔"

اور باہر تو جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔ اندر بھی ججوں نے دبی زبان سے فاروقی صاحب سے کہا کہ وہ اس پر ایک مرتبہ اور غور کریں، کہ اس مرتبہ وہ مقابلہ میں ایک ایسے عنصر کو شرکت کی اجازت دے رہے ہیں جو روایات کے خلاف ہے۔ مگر انہوں نے کہا کہ مقابلہ تو عام ہے اور قواعد میں کوئی ایسی شرط نہیں ہے کہ چھوٹی حیثیت کا آدمی اپنا آم مقابلہ میں نہیں لا سکتا، اور پھر ہمیں تو یہ طے کرنا ہے کہ ملک میں پانچ سال کے اندر بہترین آم کون سا پیدا ہوا اور یہ آموں کا کھلا ہوا مقابلہ ہے۔ نہ کہ آم پیدا کرنے والوں کا۔ اگر کوئی بہترین آم مقابلہ میں آنے سے رہ گیا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ آپ کی پانچ سالہ ریسرچ ناقص رہ گئی۔ جج اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔ اور بحیثیت سکریٹری یہ چیز تو فاروقی صاحب ہی کے طے کرنے کی تھی کہ مقابلہ میں آم پیدا کرنے والے کی سماجی حیثیت کا لحاظ ضروری ہے یا نہیں۔

○

مقابلہ کے آم پہلے ایک مخصوص کمرہ میں جمع کرکے رکھ لئے گئے تھے اور پھر نام وار ہر موجود اپنا آم لے کر ججوں کی بورڈ کے سامنے طلب کیا جاتا۔ جن صاحبوں نے بغیر کسی نمائندہ کے باہر سے بذریعۂ پارسل مقابلہ کے لئے آم بھیجے تھے ان کو سکریٹری اپنے انتظام سے رکھواتا اور خود ہی پیش کرتا تھا۔ مقابلہ شروع ہونے سے چند گھنٹہ پیشتر سب لے اپنے اپنے آم پہنچا دیئے تھے، اور عین وقت کے وقت مقابلہ شروع ہونے سے ذرا دیر قبل ستندریا پہونچی۔ ماحول اور حالات سے بے خبر، اسی معصومیت اور بیباکی کے ساتھ جیسے زمینداروں کی حویلیوں میں پھول مہندی کی پڑیاں لے کر عید، بقر عید، ہولی، دیوالی پہنچا کرتی تھی زمینداروں

سہ شنبہ کاروں کے اتنے بڑے مجمع میں چلی آئی تو آگے آگے امبکا پرشاد مالی پیچھے پیچھے ستندریا۔ دھلی ہوئی ساڑھی میں ملبوس، آموں کی سر پر ڈلیا لئے اور گلرنگ بانہیں اوپر اٹھائے دونوں جانب سے پکڑے ہوئے، نگاہیں نیچی کئے عوام کے مجمع سے چپ چاپ گذرتی پویلین تک پہنچی۔ اور پویلین کی پہلی سیڑھی سے ساتویں سیڑھی تک چڑھتے ہوئے ادھر ادھر سے بیسیوں زمینداروں کی بھویں ملیں، آپس میں آنکھیں مریں، پر معنی مسکراہٹیں الٹ پلٹ ہوئیں۔ منچلے نوجوان ٹھنڈی سانسیں بھر کر رہ گئے۔ دل چلے جوان لوٹ پوٹ سے ہو کر رہ گئے اور جھک سفید تائب بوڑھوں تک کے جھری دار چہرے ہموار ہو گئے، اپنا زمانہ یاد آگیا اور اندر ہی اندر ہو کے کھو کھلے سینے گنگنا سے پڑے اور سرگوشیاں ہونے لگیں اور ساتویں سیڑھی پر پہنچتے پہنچتے چودھویں نئی تبصرے ہوئے۔

"لو ٹھیا ہے کہ آمن انگوری!"

"نہیں یار آمن فرنگن کہو"

"آمن حسن آرا کہو آمن حسن آرا!" ایک نے کہا گیا کہتے ہوئے برانڈ آف رشیا" نہیں کہتے" دوسرے نے لقمہ دیا۔

اور کسی نے پہچان کر کہا "ارے ستندریا! امبکا پرشاد مالی کی ستندریا! اللہ بچائے کافر نے کیسے رنگین پر پرزے نکالے ہیں، چیت کی تتلی کی طرح۔"

"قوس قزح ہو رہی ہے"

"ارے یہ تو خود ہی نمائش میں رکھنے کی ہے"

"بھلا اس سے مقابلہ میں کون جیتے گا! بچیئے میرے مالک!"

اور نگاہوں ہی نگاہوں میں گذرتی، مخصوص متوالی چال چلتی معصومیت کے ساتھ، ماحول سے بے خبر ستندریا ساتویں سیڑھی چڑھ کر پویلین کے برآمدے میں سے مقابلہ کے آموں کے کمرے میں داخل ہوگئی اور فاروقی صاحب کی نگرانی میں مقابلہ شروع ہوا۔ کسی نے اپنا نام حسب نسب لکھ کر چاندی کے طشت میں پیش کیا اور راجس کی چھری سے کاٹ کر ججوں کو چکھایا، کسی نے اپنی آمن صندل اور آبنوس کی کشتی میں پیش کرکے مقابلہ پر رکھ لی، کوئی روئی کے پہلوؤں میں نہایت نفاست کے ساتھ سامنے لایا۔ اور کسی نے اپنا سرمہ برف کی سل توڑ کر نکالا، اور اس طرح سرد بلوریں خاکے کی رو بانک زیبائش میں پیش کیا۔ جج خارجی و داخلی خصوصیات دیکھ دیکھ کر اور چکھ چکھ کر پرکھتے رہے۔ حسب نسب سنتے رہے اور نمبر دیتے رہے، اور سب سے آخر میں ستندریا کی باری آئی۔ کیلے کے پتے سے ڈھکی ہوئی

ٹوکری پوری کی پوری یوں ہی لے بڑھ گئی، اور سامنے لے جاکر رکھ دی۔ ججوں نے موجد کا نام پوچھا تو آہستہ سے بولی سندریا۔ اور فاروقی صاحب نے لقمہ دیا "دختر امبیکا پرشاد مالی"۔ ججوں نے آم کا نام پوچھا، تو لاچاری کھڑی جھینپ گئی۔ فاروقی صاحب بھی اصرار کرکے مقابلہ میں تو لوا لائے تھے۔ یہ خاص چیز گزہ کر بتانا بھول ہی گئے تھے۔ لونڈیا تو چپ رہی مگر فاروقی صاحب نے ایک گھونٹ لے کر بے ساختہ کہا "جی آم؟ آم کا نام؟ گلاب خاص"۔ اب حسب نسب کا سوال ہوا تو فاروقی صاحب بیچارے بھی چپکے ہو گئے ککڑے کی کھائی گٹھلی کا حسب نسب کیا معلوم! مجبوراً حسب نسب کی معلومات والے نمبروں میں ججوں نے صفر دیا۔ اب جو سندریا نے ٹوکری کا پتہ اوپر سے ہٹایا تو ججوں کو قدرت پروردگار نظر آئی۔ آموں کی بھری ٹوکری تھی کہ گلاب کے پھولوں کی لبریز کنڈی! اور دوسری ہی سانس پر گلاب کی روح پرور خوشبو نے شامہ نوازی کی۔ رنگ، روپ، صورت شکل اور بو باس کے پورے نمبر چپکے ہی رکھ دیئے۔ اب کاٹ کر چکھنے کا نمبر آیا، سندریا نے سلیقہ سے کاٹ کر ایک ایک قاش پیش کی۔ "سبحان اللہ اللہ

حسن آرا اور انداز رشہبا کے رنگ کے ساتھ آمن فرنگن کا روپ اور لطافت اثمر بہشت چولسہ کی شیرینی کے ساتھ خاص الخاص شاہ آباد اور انفانسو کا کیف ہے"۔ ایک جج نے کہا۔

"شیرینی تو ثمر بہشت چولسہ سے بھی زیادہ تیز اور صاف ہے"۔ دوسرے نے اظہار خیال کیا۔

"اور مغز کی لطافت میں تو دسہری گردہے اور شادابی میں شربتی گرین کو مات کرتا ہے"۔

"پوست کتنا باریک اور مضبوط ہے"۔
"گٹھلی کیسی چھوٹی اور بے ریشہ ہے"۔

"اور خوشبو؟ خوشبو؟!" ایک جج نے ذرا جوش کے ساتھ کہا اور بقیہ چاروں یکدم بول پڑے۔ "یہ خوشبو تو آج تک کسی آم میں پائی ہی نہیں گئی۔ گلاب خاص تو خاص گلاب ہی ہے"۔

اور پھر چند دانہ ہاتھ میں لے کر ڈنٹھل دیکھا اور کہا "ڈنٹھل کا بڑا مضبوط ہے ہوا سے گرتا نہیں ہے نا؟" سندریا سے سوال کیا۔ سندریا نے آہستہ سے جواب دیا "جی ایک دانہ نہیں گرتا، پھر پودا بھی نیچا ہوتا ہے جو زیادہ ستا بھی نہیں پاتی"۔

"کیسا آم ہے، پھل کیسا ہے"؟ ایک جج نے سندریا سے سوال کیا اور سندریا نے کہا "درخت پر آم ہی آم دکھائی پڑتا ہے پتہ نظر نہیں آتا چل کر دیکھ سکتے ہیں، بالکل سپیدہ ملیح آبادی کے ڈھنگ سے لاتا ہے"۔

ججوں نے ایک گہری سانس لی، سیکڑوں سال کی روایات گرد ہو گئیں۔ نتیجہ ظاہر تھا، ہر پہلے سے گلاب خاص مکمل آم ثابت ہوا، اور آموں کی ملکہ قرار دیا گیا اور ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ ظاہری و داخلی دونوں معیاروں پر اس حد تک پورا اترا کہ نقرئی کپ اور طلائی تمغہ دونوں کے نمبر اسی کے نام پر پڑے۔

اعلان ہوتے ہی کسانوں، اور مالیوں مزدوروں کے منہ تو حیرت سے کھلے رہ گئے کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔ بڑے بڑے انعام اور اعزاز کے ٹھیکیدار زمینداروں پر مرانی سی پڑ گئی اور جب سندریا نقرئی پیالہ اور طلائی تمغہ لے کر نکلی تو باہر مجمع میں کہرام سا پڑ گیا، خائف اور متحیر کسان طبقہ بھی تحسین و آفریں کا نعرہ لگا بیٹھا، زمیندار عزا عزا کر بل کھا کھا کر رہ گئے۔

فاروقی صاحب سہرا فتح کا اودھ ہی کے سر باندھ آئے، مگر حادثہ کی ستم ظریفی کو رنگین تر بنا کر اپنی ناتجربہ کاری سے بہت ہی چھوٹے سرپرست اور آئے تو تھے ثالثی کا خشک کام انجام دینے کو، مگر یہاں بھی کچھ ویسی ہی صورت سے دوچار ہو گئے۔ ولایت پلٹ نوجوان تھے، شباب کے ابتدائی سالوں سے ہی مخلوط سوسائٹی کی سطحی رنگینیوں میں دلچسپی لینے کے عادی تھے، بڑے رومان پسند شاعر مزاج اور محتاط قسم کے حسن پرست نوجوان، گھر پہنچ کر اور کچھ نہیں تو سرخہ آموں کے پیدا کرنے میں ہی دلچسپی لے کر اپنی رنگین مزاجی کو برقرار رکھا تھا۔ پھر چچا کی لڑکی سے منگنی کر دی گئی تھی لہٰذا ساری عمر حسن پرستی اور حسن گری میں ہی کٹی تھی اور رنگین مزاجی کا سلسلہ کبھی نہ ٹوٹا تھا۔ چھ سات ہفتہ کے لئے یہاں جو آئے تو یہاں بھی قدرت نے سامان پیدا کر دیا اور قطعی طور پر ان کی دلبستگی کے لئے تاریک مٹی سے گلاب کا پھول اُگا دیا۔ سندریا اور اس کے ہاتھ میں گلاب خاص، ان کی رنگین اور ہنگامہ پسند طبیعت کے لئے ایک اور ایک گیارہ ذریعہ بن کر ان کے ہاتھ میں آ گیا۔ اور کچھ نہیں، صرف اپنی سطحی اور عینی دلبستگی اور وہ بھی وقتی طور پر ایام گذاری کے مشغلہ کے طور پر، اور اس کے ساتھ ساتھ لڑکپن کی کچھ غیر سنجیدہ ستم ظریفی اس کے ہاتھ سے گلاب خاص کو بڑے بڑے اونچے اونچے آموں کے مقابلہ میں رکھوا دیا اور یہ نہ سمجھے کہ اس غریب کے رخساروں کی سرخی اور پھر گلاب خاص کی

سرخی اور ان سرخیوں پر زرد پیلے کپ اور سنہرے تمغہ کی چمک کا انعکاس اس کے سر پر دھواں بن کر سوار ہو جائے گا۔ وہ تو وقتی تفریح کر کے اور اپنے کیمرے میں یہاں کے قیام اور سندریا کے ساتھ چند رنگین لمحوں کی یادگار کچھ تصویریں محفوظ کئے چلے گئے اور یہاں کا بقیہ سب یہیں چھوڑ گئے۔ مگر سارے علاقہ میں شور اٹھا کہ کیسی آگ سی بھڑکی ہے یہ! اور ہر گلا سندریا کو ہار بنا کر پہن لینے کی آرزو میں کٹنے لگا۔

ویسے خاں صاحب بڑے بوڑھے کہلاتے تھے۔ لیکن ان کے ہوا خواہ ساٹھا سو پاٹھا کی ضرب المثل کا حوالہ دینے لگے۔ بیچارے دائمی قبض کے پرانے مریض تھے، جوں جوں عمر بڑھتی گئی تھی، قبض بھی بڑھتا گیا تھا۔ حکیموں نے ہمیشہ گلقند آفتابی نسخہ میں لکھا تھا اور ہمیشہ سے اس کم بخت قبض کی شکایت کے سبب خاں صاحب کے دل میں گلاب کا پھول دیکھ کر مسلسل گلقند بنا غٹ سے نگل جانے کی شدید خواہش پیدا ہوتی تھی اور بات الٹی کی جتنی عمر بڑھی اور خاں صاحب ظاہری صورت میں ڈھیلے پڑے اتنے اندرونی اعتبار سے کستے گئے اور اب ساٹھ پینسٹھ کی عمر میں تو یہ عالم ہو گیا تھا کہ یہ گلقند کم بخت ان کی دوا سے بڑھ کر غذا میں شامل ہو گیا تھا اور بغیر اس کے روٹی ہضم نہ ہو سکتی تھی اور آج تو انہوں نے اپنی غذا کے لئے جنگلی گلاب کا ایک شاداب تر و تازہ پھول دیکھ پایا تھا۔

اور آغا صاحب تو ایرانی نژاد تھے، رنگین سیبوں اور ہیدانہ اناروں کے دیس کے لوگ، یہاں آکر پشتوں سے ایرانی پھل تو نصیب نہ ہوئے تھے لہٰذا سرخہ آموں اور سیندوریہ آموں کے قطعے رکھنے کا شوق ورثے میں چلا آرہا تھا ہر دو اقسام کے پھلوں کے پشتینی اور پرانے شوقین تھے۔

اپنے علاقہ کے چھوڑ دور دور کے سرخہ آم اور سیندوریاں آمیں ان کا جائز اور فطری حق تھیں اور اب تو خیر منہ میں دانت بھی باقی نہ رہا تھا، جب بتیسوں برقرار تھے جب بھی سرخے آم اور سیندوریہ آمیں چوس کر ہی کھانے کے قائل تھے اور سندریا میں سرخہ بر ہما، گلاب خاص، حسن آرا اور آمن فرنگن کے کل رنگ و ملاحتیں اور ساری شیرینیاں و حلاوتیں بھری تھیں۔۔۔۔۔۔۔ اور وہ ان کی نرم شاداب شیریں اور رنگین غذا تھی۔ اور وہ تو دونوں تجربہ کار ٹھنڈے بزرگ تھے اور اتنا بڑا قصنہ کا جھگڑا فاروقی صاحب کو

درمیان میں ڈال کر طے کر لیا تو یہ بھی آپس میں طے کر لیتے، اور پھر ان کے طبقہ کی روایات میں اس قسم کے لین دین کی رواداری چلی ہی آئی تھی، اور مل بانٹ کر کھانے کے عادی تھے۔ آگے پیچھے کی ایک ذراسی بات تھی، سو اس معاملہ میں شیر شاہ کی بڑی کہ سلیم شاہ کی بڑی کہ یہ بزرگ زیادہ قائل بھی نہ تھے اور سیندوریاں سرخے ادھر سے ادھر تحفہ میں ہر فصل پہنچتے ہی رہتے تھے، چپ چاپ بانٹ ہی لیتے کوئی بات نہ تھی ایک دو دن آگے پیچھے کی مگر بیچارے دونوں عجیب چکنم میں پڑ گئے اور نا خلفاً ولاً کے ہاتھوں ہمیشہ شریف آدمیوں کو ایسی الجھنوں کا سامنا ہوتا چلا آیا ہے۔
آغا صاحب کے بھانجے جن کے سر دامادی کا بھی سہرا تھا اور خاں صاحب کے نواسے جن کا پچھلے ہی سال مونچھوں کا کونڈا ہوا تھا۔ نئی عمر، گرم خون پھر ہمیشہ کے دوست، اور شریکِ کار دونوں نے سندریا کو اپنی اپنی جائداد منقولہ کی فہرست میں شامل کر لیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
باہر تو بچپن کے دوستوں، دوستوں میں چلی اور گھروں میں خسر، داماد اور نانا نواسے میں ٹھن گئی اور بزرگوں کو اپنے اپنے لڑکوں کے خراب ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ لڑکے دونوں اپنے اپنے گھر کے زمیندار اور خود مختار تھے۔ نگرانی خاص رکھنے کے لئے مصلحتاً آغا صاحب نے اپنے دیوان خانہ کے پاس باغ میں اور خانصاحب نے اپنی بارہ دری کے چمن میں امبکا پرشاد مالی کو اپنی زریں خدمات منتقل کرنے کا حکم دیا اور بالکل یہی ادھر دونوں لڑکوں نے امبکا پرشاد کے اعلیٰ فنی شعور کے زیرِ نظر پیش کیا کیونکہ انھیں اپنی نئی وضع کی تعمیر شدہ کوٹھیوں میں جدید طرز کی چمن بندی کے لئے ایک ایک تجربہ کار مالی کی سخت ضرورت پیش آگئی تھی مگر امبکا پرشاد نے چاروں سرکاروں سے معذوری ظاہر کی تو صاحبزادوں کے درمیان تو اپنی اپنی ٹیمیں رسہ کشی کے لئے تن گئیں، لیکن معاملہ ٹل سا گیا اور دونوں نے ایک دوسرے کی چوٹ پر مدافعانہ شکل اختیار کر کے اور رسے کو ڈھیل دے کر اپنی جانب کھینچنے کی اسکیم بنائی۔ لیکن خاں صاحب اور آغا صاحب دونوں پرانے اکھاڑے کے پکے پیت تھے۔ اپنے اپنے لقمئہ خسرے کی جانچ کی اور جب کاغذات کے معائنہ سے پتہ چلا کہ امبکا پرشاد مالی کی پھلواری کی کاشت نصف نصف دونوں کی زمینداری میں پڑتی ہے اور اس پر دونوں کے ایک برابر قانونی حقوق ہیں اور اس نے اس میں بغیر حصولِ اجازت نامہ و بلا ادائے نذرانہ آم کے درخت نصب کرنے

ہیں لہٰذا قابلِ بے دخلی ہے چنانچہ دونوں نے اپنے جائز حقوق کی بنا پر بیدخلی کا ہشت کا نوٹس دیدیا کہ "چونکہ تم نے اپنی مقبوضہ اراضی ذیلی کاری میں بلا اجازت ہمارے آم کے درخت نصب کرلئے ہیں۔ لہٰذا وجہ ظاہر کرو کہ کیوں نہ تم کو حسب دفعہ ۵۹ قانون قبضہ آراضی ممالک متحدہ آگرہ واودھ بیدخل کیا جائے۔ نیز یہ بھی لکھا کہ اگر بعد تعمیل نوٹس ہٰذا تم درختوں کو کاٹ دو گے تو تم پر فوجداری کا مقدمہ چلایا جائے گا" امبکا پرشاد مالی ہزاروں آم کے جدید درختوں کا خالق، اور بیسیوں نئے باغوں کا پروان چڑھانے والا آج چار آم کے درخت پیدا کرنے کے جرم میں کسا ہوا تھا۔ مگر وہ ادنیٰ شودر ہونے کے ساتھ ساتھ ان راجپوتوں کی نفسیات کا پورا محرم تھا اور وہ تو وہ اس کی سدھی معصوم سندریا تک سمجھ رہی تھی کہ وہ گلاب خاص آم کے درخت پیدا کرنیکے جرم میں ماخوذ نہیں ہے بلکہ گلابی رنگ کی لڑکی پیدا کرنے کے حسین تصور میں باندھا جا رہا ہے۔ اب اس کے سامنے دو راستے کھلے ہوئے تھے۔ پہلا تو یہ کہ پھلوار، اور سندریا دونوں سے ہاتھ دھو کر ان چاروں میں سے کسی ایک کا ہو رہے اور دوسرا یہ تھا کہ فرار کا راستہ اختیار کرے۔ پہلے پر گامزن ہونے کا تو سوال ہی نہ تھا، اور اس کا تعزلت سامنے تھا۔ دوسرے میں کچھ امید کی کرن نظر آئی اور بیشتر اس کے کہ گلاب خاص کے شائقین کوئی عملی اقدام کرنے پائیں ایک اندھیری رات میں امبکا پرشاد مالی جس کے ہاتھ میں پشتوں سے پلچہ ہی رہا تھا۔ کلہاڑا لئے نظر آیا اور سیدھا گلاب خاص کے اصلی تخمی درخت پر جھپٹا اور ۔۔۔ اور ۔۔۔ اسے جڑ سے کاٹ کر پھینک دیا۔ سندریا سسکتی رہی، اور خائف خائف نگاہوں سے اپنے چار ان "نو دمے" قلمیوں کو دیکھتی رہی مگر جب وہ کلہاڑا لئے کر قلمی پودوں پر پھیلا تو پہلی ضرب پر سندریا کی چیخ نکل گئی جیسے کلہاڑا اسی کے سر پر پڑا۔ مگر امبکا پرشاد مالی نے سنی بھی نہیں اور ذرا دیر میں چاروں رنگین شاداب لہرے پھلے "نو دمے" کاٹ کر اپنی سندریا کی بارہ سالہ محنت اور شوق مٹی میں ملا دیا۔ اور گلاب خاص کے چاروں قلمی درخت جن کے اندر سندریا کا مشکبو پسینہ عرق بن کر دوڑتا تھا الٹ کر مردہ لکڑی کا ڈھیر ہو گئے اور مرجھائے گلاب خاص جن میں سندریا کی جوانی کی شراب جھلکتی تھی اور عارضوں کا رنگ جھلکتا تھا چاروں طرف دانہ دانہ بکھر گئے۔ اب امبکا پرشاد مالی گملوں کی اس قطار کی جانب رجوع ہوا، جس میں گلاب خاص کی ایک سالہ قلمیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک ایک کر کے اکھیڑتا چلا آیا۔ سندریا سسکیوں سے رو رہی تھی اور حسرت بھری نگاہوں سے گلاب خاص کے ڈھیر کو دیکھ رہی تھی۔ جب نئی قلمیں نوچتا ہوا امبکا پرشاد مالی، اخیر کے دو گملوں پر پہنچا تو سندریا بڑے پیار کے ساتھ جھپٹی اور دونوں گملوں سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ ان میں اس کے ہاتھ کی تیار کی ہوئی اسی سال کی دو تندرست ہونہار قلمیں ایستادہ تھیں۔ امبکا پرشاد مالی ذرا ٹھٹکا اور ان دو گملوں کے قریب آکر ٹھہر گیا، اور چاروں طرف برباد ڈھیروں پر نگاہ ڈال کر ذرا اطمینان کا سانس لیا۔ رات اندھیری تھی، بھادوں کی اماوس والی سال کی تاریک ترین رات، جب کل کائنات ہی "اندھیاری" ہوا کرتی ہے۔

"چلو بیٹی" اس نے ذرا پُراطمینان لہجہ میں کہا، اور سندریا نے دونوں گملے اس طرح بغل میں دبائے جیسے گھونگھٹ سے دو بھرے ہوئے گمڑے۔

کوئی اثاث البیت تو لینا ہی نہ تھا اور وہ دونوں بیک بینی و دوگوش نکل پڑے! امبکا پرشاد مالی کا ہر قدم ملکِ خدا تنگ نیست پائے مرا لنگ نیست سا کہتا ہوا، اور سندریا بغیر یہ سوچے کہ ؎

"منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی"

گملے بغل میں دبائے چل پڑی۔ پھلوار کے پھاٹک پر پہنچ کر دونوں نے گردن موڑ کر کچھ دیکھنے کی کوشش کی۔ امبکا پرشاد مالی نے نہ معلوم کیا ۔۔۔۔۔ اور سندریا نے شاید اس ویران کٹیا کو جس میں وہ پیدا ہو کر پروان چڑھی تھی اور غالباً گلاب خاص کے درختوں کے اس ڈھیر کو جو اس نے پیدا کرکے پروان چڑھائے تھے۔ مگر بلا کی تاریکی تھی، کچھ نظر نہ آیا اور وہاں تو کچھ بھی نہ تھا۔

امبکا پرشاد مالی نے میدان میں پہنچ کر ایک لمبی سانس لی۔ ماحول کو پرتالا، دور و نزدیک کالے کالے باغ سنسنا رہے تھے، جن کی زمین کے چپّہ چپّہ پر اس کے اعلیٰ فن اور شدید محنت کی مہریں ثبت تھیں۔ مگر آج اسے پتہ چلا کہ اس نے تیری میری زمین پر دودھ اور شہد کی نہریں کھود دی تھیں، اور ہر آم کو پیدا کرتے وقت خام خیالی سے اپنا بیٹا تصور کیا تھا اور پرورش ہونے کے بعد تو اس کے ہر بیٹے پر دوسروں کی ملکیت درج ہو گئی تھی۔ آگے پیچھے دائیں بائیں باغ ہی باغ تھے۔ اس کے پیدا کئے ہوئے پروان چڑھائے ہوئے اور اس کے تاریک تصور میں دور دور تک شاداب، تندرست، تنومند، چھتری دار،

(باقی صفحہ ۱۲۳ پر)

دہلیز

انتظار حسین

کوٹھری کی دہلیز اس کے نزدیک اندھیر دیس کی سرحد تھی۔ مٹی میں اٹی چوکھٹ لانگتے ہوئے دل دھیرے دھیرے دھڑکنے لگتا، اور اندر جاتے جاتے وہ پلٹ پڑتی۔ اس کوٹھری سے اس کا رشتہ کئی دفعہ بدلا تھا۔ آگے وہ اک مانوس بستی تھی، مانوس میٹھے اندھیرے کی بستی۔ گلی آنگن کی جلتی بلتی دھوپ میں کھیلتے کھیلتے کوٹھری میں کواڑوں کے پیچھے یا میلی بے قلعی دیگ کے برابر کونے میں جا چھپنا، پھنکتے ہوئے بدن میں آنکھوں میں اندھیرا ٹھنڈک بن کر اترنے لگتا، اور ننگے پیروں تلے کی مٹی کی ٹھنڈی ٹھنڈی نرمی تلوؤں سے اوپر چڑھنے لگتی۔ اماں جی ابھی جیتی تھیں، کوٹھری میں نکلتے بڑھتے دیکھتیں تو چلانے لگتیں: "ڈوبی تو کہاڑن ہے کہ کاٹ کباڑ میں گھسی پھرے ہے۔ اندھیرے میں کیڑے کانٹے نے کاٹ لیا تو......" بچپن اور اماں جی کے ساتھ اندھیرا بھی جدا ہو گیا۔ کوٹھری کا وجود دھندلے یاد سے ایسا محو ہوا کہ یہ تک خیال نہ آتا کہ گھر میں کمروں، دالانوں، چھتوں اور آنگن کے سوا اک کوٹھری بھی ہے۔ برسوں سے بند پڑی تھی۔ کبھی کبھار کھلتی موسم بدلنے پر جبکہ جاتے موسم کا ٹنڈیرا اندر رکھا جاتا اور آنے موسم کا سامان باہر نکالا جاتا، یا کبھی کوئی ٹوٹی پنڈی کوئی انجر پنجر چارپائی اندر ڈالنے کے لئے کوئی پیندا نکلا لوٹا، کوئی جوڑ کھلی بالٹی مرمت کی نیت سے نکالنے کے لئے۔ اب کی گرمیاں آنے پہ کوٹھری پھر کھلی تھی، اور اس کے ساتھ کوٹھری سے رشتہ اسکا پھر بدل گیا۔ لحاف گدے ٹانڈ پر سنگوا کر نیچے اترتے اترتے سامنے والی کھونٹی پہ کالا چٹیلنا ننگا دیکھ کے اسے اپنے چٹیلنے کا خیال آیا کہ میلا چیکٹ ہو گیا تھا اور سوچنے لگی کہ یہ چٹیلنا اس سے تو اجلا ہوگا ہی، اسے اتار لے چلو کہ اتنے میں نیچے نظر گئی، جہاں گرد میں زمین پہ، جسے جانے کن برسوں سے جھاڑو نہیں لگی تھی، ایک موٹی لکیر کونے میں رکھے ہوئے برتنوں والے ریت میں اٹے بڑے صندوق کے پاس سے چل کر لہراتی ہوئی سی دروازے کے قریب کے کونے میں رکھی ہوئی تانبے کی میلی بے قلعی دیگ کے نیچے گم ہوتی دکھائی دی۔ کچھ اچنبھے سے کچھ ڈر سے اسے غور سے اس نے دیکھا۔ شک پڑا۔ جی میں آئی کہ آپا جی کو دکھائے۔ مگر اودوان کھلے جھلنگے کو دیکھ کر اپنا شک اسے لغو معلوم ہوا اور گمان کیا کہ اودوان کا نشان ہے۔

دالان اور کمروں میں جھاڑو دیتے دیتے کوٹھری کے آس پاس پہنچتی تو کوٹھری کے کچے فرش کا اسے خیال آجاتا۔ جہاں گٹوں گٹوں مٹی تھی کہ ننگے پیر چلتی تو پورا پنجہ اس پہ ابھر آتا، اور جھاڑو دلا کر دیتے بجٹے مگر ریت اتنی کی اتنی ہی۔ اور وہ لہریا نشان کہ برتنوں کے بڑے صندوق کے نیچے سے نکل کر تانبے کی میلی بے قلعی دیگ تک گیا تھا۔ اس کے سامنے تصویر سی آتی اور وہ اسے دفع کر دیتی۔ مگر تھوڑی دیر میں اس کے ارادے میں ضعف آجاتا اور اندھیری مٹی میں بل کھاتا نشان پھر تصور میں ابھرتا اور ماضی کے اندھیرے میں لہر لیتا دور تک رینگتا چلا جاتا......

"ناہو نام مرتے لے" اماں جی نے ٹوکا۔ "اس کے کان بڑے بڑے ہوئے ہیں، اور اپنا نام تو بڑی جلدی سنے ہے۔ ایک دفعہ کیا ہوا کہ میں جو پچھلے پہرے اٹھی، جوتی پاؤں میں ڈالی، سامنے آنگن میں کیا دیکھوں کہ موا ادھ موا پڑا ہے۔ میں نے تیرے میاں کو آواز دی۔ مجھ کال کھانی نے جو اس کا نام لیا تو وہ تو سرسراتا ہوا یہ جا وہ جا۔"

آپا جی گم سم۔ ٹھوڑی گھٹنے پہ رکھی ہوئی اور نظریں اماں جی کے

چہرے پہ۔ اماں جی پھر شروع ہوئیں "گھر ہے بہت پرانا۔ ہم تو جب سے اس گھر میں آئے اس کا ذکر سنا۔ اللہ بخشے ہماری ساس کی ایسی عادت تھی کہ جہاں کسی چیز کا لینے کی ضرورت ہوئی چراغ بتی بغیر کوٹھری میں گھس گئیں کئی دفعہ ایسا ہوا کہ آہٹ سی اور سرسر کرتا صندوق کے پیچھے بیچاری کو کم دکھتا تھا۔ اٹکل سے چلتی پھرتی تھیں۔ ایک دفعے تو بال بال بچیں، اندر جو گئیں تو بڑبڑانے لگیں کہ اے لو چیلنا زمین پر کس نے پھینک دیا ہے۔ ہاتھ جو ڈالیں تو اے میّا وہ تو رسّی......"

آپا جی گم متفکر بیٹھی تھیں۔ پھر پھریری لے کے بولیں "یہی بات ہے ہمیں تو کبھی شک بھی نہیں پڑا تھا۔ آپ کے بیٹے کے ساتھ ایک دفعہ ہوئی۔ دوپہری کا وقت، میں نے سوچا کہ آج مسہری نکال کے کھول ڈالوں۔ نواڑ بہت مٹی میں اٹ گئی ہے۔ پیچھے پیچھے تمہارے بیٹے آگئے۔ میں تو مسہری نکال رہی تھی، وہ بڑبڑانے لگے۔ کہ چھڑی کس نے زمین میں پھینکی ہے یعنی تال سے اس مشکل سے منگائی ہے، ٹوٹ گئی تو بس گئی۔ وہ ہاتھ ڈالنے کو تھے کہ لے اماں جی وہ تو لہرکھا کے سٹک سے غائب"

اماں جی نے تائید کی "ایسے ہی غائب ہووے ہے ابھی دکھائی دیا، ابھی غائب ...... بس خدا ہر بلا سے بچاتا ہی رکھے"

آپا جی سوچ میں بہہ گئی تھیں۔ پھر پھریری لے کے واپس آئیں "ہاں خدا ہر بلا سے بچائے۔ اور اس موذی کے نام سے تو میری جان جاتی ہے۔"

"مگر بی بی اپنے اپنے نصیبے کی بات ہے" اماں جی بولیں "جنہیں فیض پہنچنا ہووے ہے، دشمن سے پہنچ جاوے ہے اللہ بخشے ہماری ساس ایک کہانی سنایا کریں تھیں کہ ایک شہزادے سے سسرالیوں نے ساکا کیا اور شہزادی کی بجائے ایک بڈھی ٹھڈی لونڈی کو ڈولے میں بٹھا دیا۔ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ چمڑی چمرخ، چونڈا چٹا۔ عروسی کی رات مسہری پہ بیٹھی، لال جوڑے میں لپٹی تھر تھر کانپے، کہ شہزادہ آوے گا اور گھونگھٹ اٹھاوے گا تو قیامت مچاوے گا۔ اتنے میں کیا دیکھے ہے کہ کڑیوں سے کالی رسی لٹکی ہے۔ دُم اوپر سر نیچے، منہ کھلا ہوا، نیچے کھسکا، اور نیچے کھسکا اور اس کا منہ آس کے چونڈے پہ۔ اس کمبختی ماری کی بُری حالت ہوئی تو بدن میں لہو نہیں۔ تو بی بی کیا ہوا کہ اس نے ایک بال منہ میں لیا اور چھوڑ دیا۔ وہ کالا پڑ گیا اور یہ لمبا کہ کولھے سے نیچے پہنچے۔ ایک بال منہ میں لیا، دوسرا بال منہ میں لیا، تیسرا، چوتھا، اے بی بی دیکھتے دیکھتے سارے بال کالے ہوگئے اور یہ لمبے کہ چٹیا کولھے سے نیچے بل کھاوے۔ شہزادہ جو داخل ہوا تو ششدر۔ سمجھا کہ عروسی کے کمرے میں مسہری نہیں بچھی، پری کا کھٹولا اترا ہے۔ دلہن ہے کہ پری۔ چندے آفتاب، چندے ماہتاب بدن میدے کی لوئی، ناگن سی لہراتی زلفیں۔ وہ تو دل و جان سے زلفیہ ہوگیا۔!!"

آپا جی اماں جی کا منہ تکیں۔ خود وہ حیران تھی کہ لونڈی شہزادی کیسے بن گئی۔

"اماں جی وہ شہزادی کیسے بن گئی؟" وہ پوچھنے لگی۔

"بیٹی جب تقدیر پلٹا کھاوے ہے تو جون بھی بدل جاوے ہے۔"

"مگر اماں جی ایسی بھی کیا جون بدلنی ہوئی" آپا جی تعجب سے بولیں۔

اماں جی کی تیوری پہ بل پڑ گئے۔ "اری مجھے کیا جھوٹ بول کے اپنی عاقبت بگاڑنی رہی ہے۔ عذاب ثواب کہنے والے پہ، ہم نے تو یوں ہی سنی تھی۔ بی بی بات یہ ہے کہ اپنا اپنا نصیب ہے نہیں تو وہ آدمی کو کسی کل چین ہی نہیں دیتا۔ کلوا، زہری جان کا بیری۔ اور خود ایسا ڈھیٹ کہ نہ بیاری ستاوے نہ موت آوے"

"اے اماں جی کیا کہہ رہی ہو؟" آپا جی نے بہت ضبط کیا مگر پھر منہ سے حیرت کا کلمہ نکل گیا۔

"اے لو پھر وہی شک، اری اس کی تو یہ حالت ہے کہ ہزار دو سال میں جا کے کہیں بوڑھا ہووے ہے۔ سو کینچلی اتاری، اور پھر ویسا ہی جوان۔ اپنی موت تو وہ مرتا نہیں ہے، کوئی سر کچل دے تو الگ بات ہے"

"اماں جی" وہ سوچتے ہوئے بولی "وہ مرتا کیوں نہیں ہے؟"

"بیٹی اس نے بوٹی کھائی ہے" اماں جی چل پڑیں۔

"اب سے دور بابل میں ایک بادشاہ تھا۔ اب اسے بھی

عوث بجا دو، اس کا تھا اک وزیر ملا کا پہا در۔ دونوں نے مل کے
ح کے خوب ڈنکے بجائے۔ ہوا کیا کہ وزیر بیمار ہو کے مرگیا۔ بادشا
، کمر ٹوٹ گئی۔ مگر وہ ہمت ہارنے والا کہاں تھا۔ بیڑا اٹھایا کہ موت
بتح پائے گا۔ ہر ج مرج کھینچتا، پاپڑ بیلتا، دن سفر، رات سفر
ن بدن کا ہوش، نہ کھانے پینے کی سُدھ۔ سات سمندر پار اک
ندر پہ پہنچا کر ایک پہنچے ہوئے فقیر نے اسکا پتہ دیا تھا۔ اور غوطہ
ا کے اس کی تلی سے بوٹی لایا، جسے کھا لیتا تو موت کے جھنجھٹ
ں سے چھٹکارا مل جاتا۔ ڈوبے کی قسمت کہ واپس ہونے لگا
رستے میں ندی پڑی۔ میلوں کے سفر سے تھکا ماندہ تو تھا ہی
ا تھا، جی میں آئی کہ نہالوں، پنڈا ٹھنڈا کروں۔ کپڑے اتار
ڑاپ سے ندی میں۔ اے بی بی اس نے ڈبکی لگائی اور ادھر
ب کیڑا بوٹی کو منہ میں دبا۔ یہ جا وہ جا۔ بادشاہ ندی سے ننگا
ں پیچھے بھاگا۔ سارا جنگل تلپٹ کر دیا۔ ایک ایک درخت کو
مانا۔ ایک ایک کھوہ کو ٹٹولا۔ مگر بی وہ تو آن کی آن میں
مُو ہوگیا"

دم کے دم میں ظاہر ہونا اور غائب ہو جانا۔ بجلی آنکھوں
ے آگے کوندی اور اندھیرا۔ چیزوں کا یہ چھلاوا پن اس کے لئے
رت کا مستقل سامان تھا۔ اسے بھو یاد آجاتا جو روز کیا صبح کیا
ام، کھڑی دوپہریوں میں اور چاندنی راتوں میں اس کے ساتھ
ھلتا رہتا اور گھومتا پھرتا اور پھر ایسا گم ہوتا کہ کہیں نظر نہ آتا۔ وہ
پہریاں اور وہ چاندنی راتیں اس کے لئے اب خواب تھیں، چور
ہی کھیلتے کھیلتے کوٹھری میں اسکا جا چھپنا۔ کونے میں رکھی ہوئی
ل بے قلعی دیگ، برتنوں کا بڑا صندوق، بے لوٹا کی ننگی مسہری،
بر میں الٹی کھڑی چارپائی جسکے بان بیچ میں سے تو بالکل ہی غائب
گئے تھے۔ اندھیرے میں دھیرے دھیرے ساری چیزیں دکھائی
ینے لگتیں، نہ دکھائی دیتا تو بھو۔ یا اللہ کہاں چھو ہو گیا۔ کس کھوہ
، جا چھپا۔ زمین میں سما گیا کہ آسمان نے کھا لیا اور اتنے میں برتنوں
ے صندوق کے پیچھے سے کالا کالا سر ذرا سا ابھرتا اور وہ لپک کر
ٹ سے پکڑ لیتی "ہا چور پکڑا گیا" کبھی آنکھ مچولی میں دونوں
ٹھے کوٹھری میں جا چھپتے۔ اندھیرے کونے میں کھڑے کھڑے
ہو جاتی اور اندھیرا اپنا عمل شروع کر دیتا۔ اندھیرا جسموں میں اترنے
لگتا، اندھیرا جسموں سے نکلنے لگتا۔ اندر اور باہر میں ایک رشتہ
پیدا ہو جاتا۔ لگتا کہ آوازوں اور اجالوں کی بستی بہت پیچھے رہ گئی
ہے۔ اندھیرے کا جہان شروع ہے۔ کالے کوسوں کا سفر بے نشان،
بے منزل، ہر دالان میں آہٹ ہوئے پہ اندھیرے کا جہان پھر سمٹنے
لگتا۔ چور ڈھونڈتا ڈھونڈتا انہیں ڈھونڈ نکالتا۔ کبھی جب بھو اندھا
بھینا بنتا تو کوٹھری میں اس اطمینان سے داخل ہوتا جیسے اسے سب
کچھ دکھتا ہے اور دیگ کے پاس آکر کمٹ سے اس پہ ہاتھ ڈال دیتا
اور اس زور سے چٹیا کھینچتا کہ اس کی چیخ نکل جاتی۔

چٹیا میں چٹیلنا وہ اب باندھنے لگی تھی۔ آگے بال اتنے لمبے
تھے کہ جنجال لگتے۔ کالے چمکیلے لمبے لمبے بال کہ چٹیا موٹا سونٹا سی
بنتی اور گوری گردن سے نیچے کمر پہ ناگن سی لہراتی۔ کولھوں سے
نیچے پہنچتی، اور جب نہانے سے پہلے چوکی پہ بیٹھ کے لپے ہوئے بھیگے
ریٹھوں سے دھونے کو بال کھولتی تو کالی لٹیں گیلی زمین کو جا چھوتیں
سر کے بال اس کے سرسام میں گئے۔ مرض آندھی دھاندی آیا، اور
تین دن تک یہ عالم کہ آپے کا ہوش نہ یہ خبر کہ کہاں ہے۔ ان تین دنوں کا
اب خیال آتا تو لگتا کہ اندھیرے میں سفر کر رہی ہے۔ اس سفر میں وہ کتنی
دور نکل گئی تھی۔ کالی اندھیری سرحد تک، جہاں آگے اندھیرے سے اندھیرا
پھوٹتا تھا اور اندھیرے کی کالی راجدھانی شروع تھی۔ سرحد کو چھوتے
چھوتے وہ پلٹی اور پھر آوازوں اور اجالوں کی دنیا میں واپس آگئی۔ پر
لمبے کالے کوسوں والے دہشت بھرے سفر کے اثر آثار جسم پر ظاہر
تھے کہ جھٹک گیا تھا، اور بالوں پر کہ چھدرے اور چھوٹے ہو گئے تھے۔
اور چمکیلا پن اُن کا مدھم پڑ گیا تھا۔ اب چٹیا چٹیلنے کے وسیلے سے کولھوں
تک پہنچتی تھی۔

دالان سے گزرتے گزرتے اس کے قدم کوٹھری کی طرف
اُٹھتے اور پلٹ پڑتے۔ سوچتی کہ چٹیلنا میلا چیکٹ جانے کن برسوں کا
کھونٹی پہ ٹنگا ہے۔ اس قابل کب ہے کہ چٹیا میں ڈالا جائے؟ اور
اسے کھونٹی سے اتارنے کی نیت توڑ توڑ دی۔ مگر پھر بے دھیانی
میں کوٹھری دیکھ کر چٹیلنے کا خیال آجاتا اور اس کے قدم اس طرف
اٹھتے۔ دہلیز تک پہنچتے پہنچتے پھر رکتے اور الٹے پھر آتے۔
ہاں تصور کی لکیر پھیلنے لگتی، لمبی ہونے لگتی۔ اور پیچ کھاتی جیتے دنوں
کے کونوں، کھدروں میں جا نکلتی . . . . .

اماں جی تیل تو اچھا خاصا تھا۔ میں نے سوتے وقت لالٹین ہلا کے دیکھا ہے۔ میں جانوں کہ بتی گر گئی۔"

"تو بہو، بتی اتنی کم کیوں کی تھی؟" اماں جی بولیں "دن خراب ہیں۔ جانیں کیا وقت ہے کیا موقع، لالٹین بالکل گل نہیں کرنی چاہیئے۔ مجھ دکھیا کی سمجھ میں کچھ نہ آوے کہ کیا کروں۔ اندھیرا گھپ، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ سرسر سرسرا سو جانوں کہ کیا چیز ہے۔ ٹنک پڑا کر رہتی۔ پھر سوچوں کہ شاید میرا وسوسہ ہو کہ اتنے میں دڑبے میں مرغیاں چیخنے لگیں۔ دڑبے کی طرف جو دیکھوں تو بہو تجھے یقین نہ آئے گا، یہ لمبا ...... میرا تو دم نکل گیا۔ حلق سے آواز نہ نکلے۔ پھر میں نے ہمت کر کے تجھے پکارا۔ بہادر بہو۔"

"اماں جی، مجھے تو ذرا ہوش نہیں کہ آپ نے کب آواز دی تھی۔"

"بی بی تیری نیند تو بیہوشی کی ہے۔ گھر میں قیامت آجاوے تیرے کان پہ نقارے بجیں پہ تجھے پتہ نہ چلے۔ مرا سوتا برابر مگر ایسی نیند بھی کیا۔ تو پھر میں نے نعیمن کو پکارا۔ اری نعیمن...... او نعیمن! مگر اس بخت ماری کو بھی سانپ سونگھ گیا تھا۔ اب کیا کروں۔ بی۔ بی ساری رات پتھر سی بیٹھی رہی اور آیتیں پڑھتی رہی۔ دھڑکا یہ کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تو سو جاؤں اور بچانے پیشاب کے لئے کوئی اٹھے اور ...... صفیہ کی تو ایسی بری عادت ہے کہ آدھی سوتی آدھی جاگتی چارپائی سے اترے گی اور ننگے پیر نالی پہ۔ بس اسی دھڑکے میں تڑکا ہو گیا تو ذرا ذرا اجالا ہوا اور......"

"اری صفیہ کیا کر رہی ہے بی بی۔" باورچی خانے سے آپا جی کی آواز آئی اور صفیہ بڑبڑائی، اور تصور کی لکیر شاک سے غائب۔ پھر وہ کام دھندے میں ایسی جٹتی کہ تن بدن کا ہوش نہ رہتا۔ جوٹھے باسن پھیلائے اور برابر میں رکھی تھالی سے بھر بھر مٹھی راکھ ہر برتن میں ڈالی، اور بانوں کے جونے سے اتنا رگڑتی اتنا رگڑتی کہ نل کے پانی سے تریڑے دیکر جب وہ دیگچیوں، پتیلیوں، مٹی کی ہانڈیوں کو، پیتل کے لوٹوں، تانبے کی قلعی کی ہوئی سینی اور بھرت کے تسلے کو، ایلومونیم کے ناشتے دان، سلور کے بڑے بادیے اور بے جھلجل کرتے مراد آبادی گلاس کو کھر سنجے والی چوتری پہ دھوپ میں چنتی تو وہ شیشہ سے چمکتے اور لگتا کہ مانجھے نہیں گئے ہیں قلعی ہوئی ہے۔ میلی راکھ میں تھڑے ہاتھ بھی نل کے تریڑوں سے کہ کلائی میں بھری ہوئی آسمانی چوڑیوں میں میٹھا میٹھا شور پیدا کرنے

ایک نئی تازگی پاتے، اور گورے پوروؤں سے لے کر اجلی کلائی تک اور اجلی کلائی سے کہنی تک اجالے کی ایک کرن دوڑنے لگتی لیکن تھوڑی ہی دیر میں وہ اجلی انگلیاں اور ہتھیلیاں بھیگتے آٹے میں سن جاتیں، اور لگاتار مکوں سے کونڈا بجنے لگتا، اور گیلا آٹا کلائیاں چھوڑ آگے کی ایک دو چوڑیوں تک کو سان لیتا۔ صفیہ آٹا کمال و چیار گوندھتی تھی کہ کوا چونچ مارے تو چیک کرید جائے۔ پھر توے پہ بڑی بڑی ورق سی روٹیاں ڈالنا، گھی میں سینکنا اور ڈلیا میں تھئی کی تھئی جما دینا۔ کبھی کبھی جب شام کے اندھیرے میں توا چولھے سے اتار کر الٹا کرتی، تو سرخ سرخ ننھے ان گنت تارے توے کی کالونس میں تیرتے ہلکورے لیتے نظر آتے۔

"آپا جی توا ہنس رہا ہے۔"

"توے کا ہنسنا اچھا نہیں ہوتا۔" آپا جی متفکرانہ لہجہ میں جواب دیتیں۔ "اس پہ راکھ ڈال دے۔"

کام کاج کی اس مصروفیت میں بھی ذہن جسم سے الگ بھٹکتا تھا کبھی دالان میں جھاڑو دیتے دیتے، کبھی چارپائی کی ادوان کستے کستے کبھی ریشم کی نیلی پیلی لچھیاں کھولتے سلجھاتے، اس کے جسم کی نقل و حرکت سے الگ تصور کی گتھی کھلنے لگتی اور لہریا لکیر بھولے لبرے بیتے دنوں کے اندھیرے میں رینگنے لگتی۔ اماں جی یاد آتیں، اماں جی کی باتیں اور کہانیاں، کسی سادہ سی بات، پہ ان کا چونک اٹھنا اور چونکا دینے والی باتوں پر سادگی سے بات کرنا اور گذر جانا۔ کوٹھری کے کونے میں رکھی ہوئی دیگ کو صاف کرتے کرتے جب اماں جی کے ہاتھ میں کیچلی آگئی تھی تو کس سادگی سے انہوں نے اٹھایا اور یہ کہتے ہوئے الگ احتیاط سے رکھ دیا کہ بشیرن کی لونڈیا کو کالی کھانسی ہے، اسے بھجوا دینگے۔" اور ایک صبح کو جب کابک کے خانے سے سفید کبوتری لکڑی کی طرح سوکھی مرنڈ نکلی تھی تو اماں جی کو فوراً یاد آیا کہ رات انہوں نے کابک کے برابر پھنکار سنی تھی۔ اماں جی پہ اسے کتنا رشک آتا تھا کہ غائب چیزیں ان کے لئے حاضر تھیں اور ایک وہ تھی کہ نشانات اور آثار بچپن سے قدم قدم پہ دیکھتی چلی آرہی تھی لیکن اصلی چیز ہمیشہ نگاہوں سے اوجھل رہی۔ پرچھائیں ہر موڑ پہ رستہ کاٹتی، لیکن پرچھائیں والا کہاں ہے کبھی کبھی نشان کو دیکھ کر لگتا کہ گذرنے والا ابھی گذرا ہے اور دو قدم ماریں تو اسے جا پکڑیں۔ اس خیال سے

ٹری داؤد

کٹری نوشہرہ

مینامتی

اسکا دل دھڑکنے لگتا، اور جھرجھری آجاتی، اور پاؤں سو سو من کے ہو جاتے۔ مینہ پڑے پہ جب ایک دن صبح ہی صبح وہ اور تبو بیر بہٹیاں پکڑنے گھر سے نکلے تھے تو کالے آموں والے باغ کے کنارے بھیگی زمین پہ پانی میں تربتر نیم کا پیڑ گرا پڑا تھا، یہ لمبا اژدہا سا، تنہ کالا بھجنگ، جا بجا چھال اڑ جانے سے سفید چربی سی نکلی ہوئی جیسے ابھی کسی نے کلہاڑی چلائی ہے۔ دونوں حیرت سے کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔

"رات بجلی گری تھی۔"

"بجلی؟"

"پتہ نہیں ہے رات مینہ برستے برستے کتنی زور سے بجلی تڑخی تھی۔" تبو کہنے لگا "ایسا کہ ہماری چھت پہ گری ہے ۔۔۔۔۔۔ یاں گری تھی۔۔۔۔" وہ بڑبڑانے لگا "اس کی کھکھل میں کالا سانپ رہتا تھا بہت پرانا تھا۔ رات نکلا ہوگا۔ بجلی کالی چیز پہ گرے ہے۔"

"کہاں گیا وہ پھر؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا

"کہاں گیا" وہ اس کی بیوقوفی پہ ہنس دیا۔ "بجلی نے اسکے بجّل اڑا دیئے۔"

سوچتے سوچتے اس میں یہ خواہش شدت سے جاگتی، کہ وہ زمانہ پھر پلٹ آئے، اور بدرنسا کے کوزیالے کو منہ سے چٹکی میں کوئی پکڑے اور اسمار و آثار کا وہ گم ہوتا جلوس جاتے جاتے پھر پلٹ پڑے۔ اماں جی سے اسی طرح کہانیاں، حکائتیں اور نصیحتیں سنی جائیں اور پھر ان سنی کر کے بارش ہونے پہ منہ اندھیرے بے ہاتھ منہ دھوئے ننگے پیر، پانی میں چھپ چھپ کرتے بیر بہٹیاں پکڑنے جنگل نکل جائیں۔ بیر بہٹیاں نہیں تو پپیئے اور پپیئے نہیں تو سانپ کی چھتریاں، دالان کے ماتھے پہ جھکا ہوا وہ لکڑی کا چھجا اتنا پرانا ہو گیا تھا کہ لکڑی گل گلا کر بالکل کالی پڑ گئی تھی، اور برسات میں تو اسکا رنگ اور بھی کالا پڑ جاتا تھا۔ دو چار بارشیں ہوئیں اور اس کی جڑوں اور دراڑوں اور ناؤدیوں میں سفیدی پھوٹنی شروع ہوئی پھر دیکھتے دیکھتے سفید گالا سی چھتریاں تن جائیں، چونا سے ٹوپ بن جاتے، اور کسی کسی چھتری پہ کہیں کہیں کالی چتی، سرمئی دھاریاں۔ انہیں توڑنا بھی اک مرحلہ تھا۔ چھجے کے اوپر اگی ہوئی سانپ کی چھتریاں تو اس کی اور تبو کی دونوں کی دسترس میں تھیں، لیکن وہ بڑے بڑے ڈھیر ٹوپ جو چھجے کے نیچے دیوار کے برابر پھولتے تھے، ان تک اسکا تو کیا تبو کا بھی کبھی ہاتھ نہ پہونچ سکا۔ حالانکہ ایک دفعہ تو وہ جنگلے کے سہارے، پھر طاق پہ پیر رکھ کر اتنا اونچا پہونچ گیا تھا کہ چھجے کی کڑی کو جا چھوا تھا۔ سانپ کی چھتری پھر بھی اس سے پرے رہی۔ لیکن کوئی بات اس کی پہونچ سے کتنی ہی پرے کیوں نہ ہو، ایک مرتبہ وہ ہمت ضرور باندھتا تھا۔ کالے آموں والے باغ کو جاتے ہوئے جو کالی کوئیا پڑتی تھی اور جس پہ پھیلا ہوا بڑ کا درخت اتنا گھنا تھا کہ جب تک وہ بہت جھک کر تکتا تار نہ دیکھتی، بالکل یقین نہ آتا کہ اس میں پانی بھی ہے، اس پہ پہنچ کر تبو بڑ پہ چڑھتا اور عین کوئیا کے اوپر پھیلے ہوئے گدّے پر پہنچ کر اعلان کرتا کہ "کودتا ہوں"۔ اور اس کے پیروں تلے کی زمین نکل جاتی اور گڑگڑا کے کہتی "نئیں تبو نئیں" تبو کے تیوروں سے لگتا کہ اس کی گڑگڑاہٹ کی اسے ذرہ برابر پروا نہیں، اور اس نے اب چھلانگ لگائی۔ مگر پھر آپ ہی آپ وہ ارادہ ترک کر دیتا اور گدّوں سے پھسلتا پھسلاتا تنے پہ آجاتا۔ اور نیچے اتر پڑتا۔ مگر آج اس نے چھلانگ لگا ہی دی۔ چھلانگ لگائی تھی یا گر پڑا تھا، یا کیا ہوا تھا، اسے تو پتہ نہیں۔ اس روز وہ اکیلا ہی گیا تھا، اس نے تو بس اک شور سا سنا۔ شراتی سقہ بھاگا بھاگا آیا اور تبو کے گھر کے کواڑ پیٹ ڈالے۔ تبو کے ابا گھبرائے ہوئے نکلے اور جس حال میں تھے اسی حال میں حیران و پریشان سٹ پٹ کرتے کالی کوئیا کو ہولئے۔ ان کے پیچھے پیچھے محلے کے اور لوگ۔ جو نہیں گئے تھے وہ جا بجا ٹولیاں بنائے ششدر کھڑے تھے۔

"کون؟ تبو؟"

"گر پڑا کالی کوئیا میں؟ بھلا کیسے؟"

"اللہ جانے۔"

"ارے صاحب وہ لونڈا تو نرا وحشی ہے وحشی۔"

آپا جی کہہ رہی تھیں۔ "اجی لونڈا تھا بھی بہت نڈر۔ یاں آتا تھا سو کبھی چھجے پہ لٹک رہا ہے، کبھی کوٹھے والی منڈیر پہ۔ میرا دل کانپ کانپ جاوے تھا۔ ہزاروں دفعے ڈانٹا بھی کہ بیا گھر جا کے ماں کو یہ نٹ کا تماشا دکھا اور صفیہ کو بھی مارا کہ اس کے ساتھ تو کیوں باؤلی بنے ہے۔ مگر بابا اس پہ تو جن سوار تھا، ایک نہیں سنتا تھا کسی کی۔"

اماں جی بولیں "ارے غریب کا ایک ہی بچہ ہے اللہ رحم کرے۔"

"ہاں اللہ رحم کرے"۔ اور پھر آپا جی کا لہجہ بدلا۔ "اللہ اسے بچائے مگر ہم اب صاف کہہ دینگے کہ بابا جھنڈیلا میلا رہے یا جائے ہماری بیٹی اسے نہیں جائے گی۔ ابھی ایسے لونڈے کا کیا اعتبار، کیا گل کھلادے"۔

"ابھی یہ تو بعد کی بات ہے"۔ اماں جی نے پھر ٹھنڈا سانس لیا۔ "اللہ رحم کرے غریب پہ۔ یہ کالی کونیا بڑی کمبخت ہے۔ ہر برس بھینٹ لیکے رہے"۔

شام پہنچے وگ لے چارپائی پہ ڈال کے لائے۔ کپڑے پانی میں شرابور، بال چہرے پہ چپکے ہوئے، چہرہ پیلا ہلدی، جسم نڈھال، بیہوشی طاری۔ تھوڑی دیر کے لئے گلی میں سناٹا چھا گیا۔ سناٹا جس نے سالوں بعد اس گلی میں ایک بار پھر عود کیا تھا اور ننھو ہی کے حوالے سے۔ جب ننھو کا تار آیا تھا۔ ننھو کے جانے کیا جی میں سمائی کہ گھر میں بے کہے سنے فوج میں بھرتی، ہو محاذ پہ لدگیا تھا۔ سال ڈیڑھ سال اسکا کوئی اتا پتا ہی نہ ملا، اور جب اتا پتا ملا تو سناونی کے ساتھ۔

"اری بیا ننھو کا تار آیا ہے"۔

"ننھو کا تار؟"

"اللہ رحم کرے"۔

آپا جی نے روٹیاں پکاتے پکاتے توا الٹ دیا، چولھے کی آگ بجھادی گئی۔

گلی میں تھوڑی دیر تک بالکل سناٹا رہا۔ آنکھوں آنکھوں میں بات کرتی ہوئی ششدر ٹولیاں۔ ننھو کے ابا کے ہاتھ تار پڑھتے پڑھتے کانپنے لگے اور بغیر نگاہ اٹھائے اسی طرح تار لئے سر جھکائے ہلتے کانپتے اندر چلے گئے۔ . . . .

وہ جھرجھری لیکر ہوش میں آگئی۔ کٹورے میں بھیگے ریٹھے دھوپ میں چوکی پہ رکھے رکھے بہت دیر ہوئی، پھول گئے تھے۔ جلدی جلدی چٹیا کھولی کہ چکٹ گئی تھی اور الجھے ہوئے بال بدرنگ ہوگئے تھے۔ بھیگے ریٹھوں کا کٹورا لے کر جب وہ غسل خانے میں پہنچی اور کھلے ہوئے بالوں میں لے لے کے اشانہ میلے میلے سفید جھاگوں سے بال کچھ اور بدرنگ ہوگئے۔

غسل خانے سے نہا دھو کر واپس ہوتے ہوتے وہ گھڑی بھر کے لئے ڈھلتی دھوپ میں چوکی کے پاس رکی۔ بالوں کو دو تین جھٹکے دے اندر کمرے میں گئی اور آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ دھل دھلا کر ان میں ہلکی سی شادابی اور نرمی ضرور پیدا ہوگئی تھی مگر وہ کیفیت کہاں، کہ کھلتے تو گھٹا سی گھر کر آتی اور جوڑا باندھتی تو سر کے پیچھے ایک سیاہ چمکتا طشت معلق نظر آتا۔ اماں جی گھنٹہ گھنٹہ بھر تک بالوں کو کریدتیں اور جوئیں اور ڈھکیں اور لیکھیں بینتی رہتیں، کنگھی کرتیں، سلجھاتیں، پٹیاں باندھتیں اور جھڑے ہوئے بالوں کا لچھا سا گچھا لپیٹ کر اس پہ تھو تھو کرتیں اور گڑیا انیٹوں والی دیوار کی کسی دراز میں اڑس دیتیں۔

روکھے چھدرے مرے مرے سے بال، نہ جوئیں، نہ ڈھکیں، نہ لیکھیں نہ اماں جی کی کنگھی، نہ ان کی مشاق انگلیاں کہ ایک ایک لٹ کو ریشم کے لچھے کی طرح سلجھاتیں اور سنوارتیں۔ بالوں سے ہٹ کر اس کی نگاہ چہرے پہ گئی، جسکی دمک خوشبو بن کر اڑتی جارہی تھی بلکہ پورے بدن میں جو آگے اک آنچ تھی مندی ہوچلی تھی۔ اسے خالہ جان کی وہ کھسر پھسر یاد آگئی جب وہ پچھلے دنوں آئی تھیں اور آپا جی کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھی تھیں۔

"آپا جی کب تک اسے کوٹھے سے لگائے بیٹھی رہوگی۔ عمر اور زیادہ ہوگئی تو لونڈیا تھک جاوے گی"۔

"بؤ مجھے کوئی شوق ہے کہ جوان لونڈیا کو گھر میں سنگوائے بیٹھی رہوں اور اب عمر اس کی بیٹھنے کی نہیں ہے، مگر کروں کیا؟"

"آپا جی میں تو جانوں جیسا کیسا بھی ملے دو بول پڑھوا کے ہاتھ میں ہاتھ پکڑادو"۔

اس نے پھر اک جھرجھری لی اور ذرا سرگرمی سے بالوں میں کنگھا کرنا شروع کردیا۔ انگلیوں سے بالوں کی لٹیں سنوارتے سنوارتے اس نے محسوس کیا کہ تیل لگنے پر بھی بال اس کے کچھ روکھے روکھے ہیں۔ روکھے بال کہ چھدرے بھی ہیں اور پھیکے بھی۔ ان کی وہ چمک اب کتنی مدھم پڑگئی تھی۔

چٹیا باندھتے باندھتے جب اس نے چٹیلنا اٹھایا تو وہ بالوں سے بھی زیادہ روکھا اور روکھے سے زیادہ چکٹا اور میلا نظر آیا۔ چٹیلنا وہیں رکھ چٹیا ادھ بندھی چھوڑ وہ کمرے سے نکلی، دالان میں آئی، دالان سے مڑی، کوٹھری کی طرف چلی۔ کھوئی کھوئی جانو خواب میں چل رہی ہے، یا کسی نے جادو میں باندھا ہے۔ دہلیز پہ قدم رکھ کے کنڈی کھولی۔ کواڑوں کو ہلکا سا جھٹکا دے کر دھکا دیا۔ داخل ہوتے ہوتے وہ ذرا چونکی، احساس ہوا کہ اندھیرے کی حد شروع ہے۔ اس لہریا لکیر کا خیال آیا، جو بڑے صندوق کے پاس سے چمکتی ہوئی دیگ کے برابر تک پہونچی تھی اس کا دل آہستہ آہستہ دھڑکنے لگا۔

(باقی صفحہ ۱۳۲ پر)

خزاں نے لوٹ لیا

حجاب امتیاز علی

بیگم تجمل کے سالانہ جشنِ رقص و محفل سرود سے لوٹتے ہوئے رستے میں مجھے خزاں کی تیز رفتار آندھی نے آلیا۔ خیال آیا آج زلفی کی شادی کی پانچویں سالگرہ ہے، جب تک آندھی تھمے اسے مبارکباد ہی دے آؤں۔

اپنی ناکام عشقیہ شادی کے بعد اس نے اپنی تمام سہیلیوں سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ البتہ اس سے کبھی کبھی سرراہے مختصر ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔

آج کئی دنوں کے بعد اپنی سہیلی کی اقامت گاہ پر پہونچ کر میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ زلفی نے دروازہ کھول دیا۔ مجھے دیکھتے ہی آنکھیں پھاڑ کر بولی "تم روحی! ——— رستہ بھول کر آئی ہو؟"۔

اس کے طنزیہ فقرے کو سنکر میں نے ضبط کر لیا، پھر بولی "دراصل مجھے کسی کی خلوت میں مخل ہونا ناپسند ہے۔ آج تمہیں شادی کی سالگرہ پر مبارکباد دینے چلی آئی"۔

"آندھی کے شور میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی، اندر آؤ نا ———" وہ مجھے اندر لیجا کر لکھنے کی میز کے پاس ایک مومی شمع کے مقابل بٹھاتے ہوئے بولی "خزاں کی رات ہے"۔

"ہاں بہار کب کی گذر چکی! مگر ہم سب کا خیال تھا کہ آج ہمارے ہاں کچھ نہ کچھ اہتمام ضرور ہوگا۔ شادی کی سالگرہ کا دن ہے"۔

"تم سب کا خیال تھا! ———" وہ ایک پھیکی ہنسی ہنس پڑی۔ پھر ذرا سے توقف کے بعد بات ٹالنے کے انداز میں پوچھنے لگی "آ، کہاں سے رہی ہو؟"۔

"بیگم تجمل کے جشنِ سرود سے" میں نے اپنی زردی شال شانوں پر سے گرا دی اور اعصاب کے سکون کے لئے اوڈی کلون سونگھنے لگی۔

"آہ بیگم تجمل کے سالانہ جشن سرود سے!" اس نے بے قابو لہجے میں کہا، پھر درد انگیز طریق پر مسکرا کر بولی، "نجانے ان کے یہ سالانہ جشن کتنوں کی زندگی کی محفلیں برہم کریں گے! وہاں میرا تو کوئی ذکر نہیں آیا؟"

"چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں"۔

"کہ میں نے غلط شادی کی؟"

"اور اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی ماری"۔

"زبانِ خلق کو کون روک سکتا ہے روحی؟"

"صرف انسانی کردار زلفی!"

اس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے خاموشی طاری ہو گئی۔ وہ ایشیائی خزاں کی رات تھی، بے حد ویران اور بہت ہی کالی۔ آندھی کا خوفناک شور ساحلوں پر واویلا کر رہا تھا۔ چیلیں چیخ چیخ کر رو رہی تھیں خشک پتے زندگی کی فنا کی یاد تازہ کر رہے تھے۔ فضا کی اس پراگندگی نے مجھ پر مالیخولیا کی سی کیفیت طاری کر دی۔ میں نے اپنے دستی بٹوے میں سے نکال کر برومائڈ کی ایک گولی نگلی اور غمگین آواز میں پوچھا: "فیروز اب کیسے ہیں؟"

دو لمحے وہ چپ رہی۔ پھر بولی: "ویسے ہی! ایک لمحہ ڈوبتے ابھرتے تنکے کی طرح! شراب نے ان کے دل و دماغ و جگر کو دیمک کی طرح چاٹ کر کھوکھلا کر دیا ہے۔ فن کا وہ پرستار اب زندگی کا منکر ہو رہا ہے۔ بعض وقت تو روحی! میرا پیمانۂ صبر لبریز ہو جاتا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں فیروز سے بیزار ہو گئی ہوں"۔

"اور کیا مطلب ہے؟ جب تم بیزار نہیں ہو تو تمہیں یہ کہنے کی ضرورت ہی کیا آپڑی ہے کہ تم اس سے بیزار نہیں ہو؟"۔ میں نے فکرمندی سے کہا، پھر بولی:

"پانچ سال پہلے کی بہاریں یاد کرو زلفی! وہ قہقہے، وہ چہچہے، وہ

بےفکریاں، وہ محفلیں اور وہ شرارتیں ۔۔۔" میں عہدِ ماضی کی سیر کرتے کرتے افسردہ سی ہوگئی۔

اس نے تڑپ کر آنکھیں بند کرلیں گویا کہہ رہی تھی کہ

"خزاں کو دیکھ رہے ہیں بہار دیکھ چکے"

لیکن اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ تھوڑی دیر بعد اپنے آپ کو سنبھال کر اگر کہا تو اتنا کہا "خزاں میں بہاروں کا ذکر نہ کرو روشی! میں انہیں بھول جانا چاہتی ہوں"۔

میں یاس انگیز لہجے میں بولی" انہیں بھولنا اور بھلانا تو تمہارے اختیار میں ہے نہ میرے قابو میں، کسی ٹھوس حقیقت سے گریز کا فائدہ بھی کیا تنقی؟ یہ واقعہ ہے کہ آج سے پانچ سال پہلے کی خزاؤں نے تمہاری بہاریں لوٹ لیں۔ یاد ہے، وہ بالکل ایک ایسی ہی خزاں کی پرشور رات تھی؟"

وہ کانپ کر بولی" اور بیگم نجم کے ہاں محفل سرود منعقد تھی! اسی محفل نے مری زندگی کی محفل ہمیشہ کے لئے درہم برہم کر دی۔ وہاں میں نے آبِ حیات کے دھوکے میں زہرِ ہلاہل پی لیا، مگر توبہ! میں بھی کیسی باتیں کر رہی ہوں!! تم سب کے نقطۂ نظر سے میں نے کیسی ہی عظیم غلطی کی ہو مجھے اس کا مطلقاً افسوس نہیں روشی! کیونکہ مجھے فیروز سے محبت ہے!"

میں نے ایک ترحم آمیز نگاہ اس پر ڈالی " تم بار بار اپنی محبت کا اقرار کر کر کے اپنی مخالفت آپ کر رہی ہو۔ میں نے تو کوئی شبہ ظاہر نہیں کیا تھا"۔

وہ بگڑ کر بولی" کون کہہ سکتا ہے کہ مجھے فیروز سے محبت نہیں؟ مانا کہ وہ شرابی ہے، مگر مجھے آج بھی اس سے اتنی ہی محبت ہے جتنی پہلے دن تھی" یہ کہتے کہتے اس نے غصے کی بے دھیانی میں مشغلے کے طور پر سامنے رکھا ہوا کاغذ کاٹنے کا چاقو، جس کی شکل بالکل تلوار جیسی تھی، ہاتھ میں اٹھا لیا اور گھمانا شروع کر دیا۔

میری نظر اس تلوار سے ٹکرائی " ہوں! میں انسان کو اس کی زبان سے نہیں، اس کی بے اختیارانہ حرکات اور اس کے کردار سے پہچاننے کی عادی ہوں زیبی! تم ہوا سے کیوں لڑتی ہو؟ آدمی سے لڑنا سیکھو"۔

رات گہری ہوتی گئی، اور سمندر کے تلاطم کا شور کسی وحشی درندے کی آواز کی طرح سنائی دینے لگا۔

میرا ذہن آج سے پانچ سال قبل کے ماضی کی ایک رات کی تصویر کشی میں محو ہوگیا۔ خزاں کی پرشور رات تھی۔ مگر بیگم نجم کے وسیع ایوانوں میں سالانہ جشن رقص و سرود منعقد تھا۔ موسیقی کی درد انگیز تانیں کلاسکی رقص کے تھمے ہوئے وقفوں میں جذبات میں ایک ارتعاش سا پیدا کر کے قلب کی عجیب کیفیت کر دیتی تھیں۔ خوش باش اور زندہ دل مہمان قہقہے لگاتے ایوان کے بیچوں بیچ، ہاتھ میں آبِ خوشرنگ کے چھلکتے ہوئے جام تھامے کھڑے تھے اور اپنے رفیقوں اور محبوبوں سے سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ کچھ اہلِ جنوں ایسے بھی تھے جو ان سے الگ تھلگ، کناروں پر دریچوں کے سہارے بیٹھے یا کھڑے ہوئے موسیقی کی دلدوزی پر بے قابو ہو کر سر دھن رہے تھے۔ اور چشم نیم باز سے انسانوں کے اس جیتے جاگتے سمندر کی بیتاب امواج کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ انہی کی صف میں ایک میں بھی تھی، جو ایک پرانی درد انگیز غزل کو سن کر متاثر ہوگئی تھی اور ایک قدِ آدم فانوس کے پاس تصویر بنی کھڑی تھی کہ دو نوجوان خواتین کے مکالمے نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"یہ پیازی رنگ کی پوشاک میں کون لڑکی ہے جس سے وہ اس انہماک سے باتیں کر رہا ہے؟ وہ تو سنبل کے عشق میں دیوانہ ہو رہا تھا ابھی اگست کے مہینے کی بات ہے"۔

"یہ ستمبر ہے" دوسری نے جواب دیا" اگست کے مہینے کے رومان کو ستمبر تک زندہ رکھنا دقیانوسی پن ہے"۔

دوسری طرف ایک معمر خاتون اپنی دستی دوربین میں سے پیازی پوشاک والی لڑکی کو بغور دیکھ کر فرمانے لگیں" خدا کی پناہ، آجکل کی عورتیں یہ نہیں دیکھتیں کہ انسان کا باطن کس قسم کا ہے۔ جہاں کسی خوب صورت مرد نے اپنے کوٹ کے کاج میں کارنیشن کی مہکتی ہوئی کلی اٹکائی اور مسکرا کر ان کو کرسی پیش کی، یا ان کے لئے آئس کریم کی طشتری کہیں سے اٹھا لایا۔ وہ سمجھیں کہ ہم پر جان دینے لگا ہے۔ اپنے زمانے میں ہم کتنی محتاط ہوتی تھیں۔ کیوں عائشہ؟"

"بے حد محتاط" ان کی بوڑھی سہیلی نے جواب دیا" مگر پھر بھی ترچھی نظروں کی گھائل فوراً ہو جاتی تھیں۔ یاد ہے نواب فرخ کی برقِ تبسم نے تمہارے خرمنِ آرزو پر کس زور کی بجلی ۔۔۔۔"

"وہ اور بات تھی ۔۔۔ بالکل اور ۔۔۔ ہم میں اور آجکل کے چھچھورپن میں بڑا فرق ہے۔ عائشہ! ہم محتاط ہوتے ہوئے گھائل

ہوجاتی تھیں۔ مگر آجکل کی عورتیں بے احتیاط ہو کر گھائل ہوتی ہیں ۔" یہ فرق بتا کر انہوں نے فخر سے اپنے سنہرے دامن سمیٹے، اور مطمئن ہو کر بیٹھ گئیں۔

میں نے سر اٹھا کر دیکھا کہ کس کے متعلق چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ سامنے زلفی تھی۔ شگفتہ پیازی رنگ کے ریشم میں ملبوس۔ سیاہ زلفیں شانوں پر بکھیرے بڑے انہماک سے سر جوڑ کر، ایک سجیلے ڈان جان سے مصروف کلام تھی۔ دونوں بے حد جاذبِ نظر معلوم ہو رہے تھے جیسے ہنس کا حسین جوڑا پانی کی لہروں پر تیر رہا ہو! ان کی گفتگو کی طوالت اور ان کی یکجائی نوجوانوں کو پریشان اور متنفر اور بوڑھوں کو طنز و استہزا پر مجبور کر رہی تھی۔

چند منٹوں کے بعد بیگم نجم میرے قریب سے گذریں "یہ کون شخص ہے نجمہ؟" میں نے پوچھا۔

"ارے! مشہور مصور فیروز کو نہیں جانتیں؟ خود تصویرِ حسن معلوم ہو رہا ہے نا!؟" بیگم نجم نے جواب دیا۔

"ہاں بالکل" میں نے کہا "زلفی کے اُن سے پرانے تعلقات ہیں؟"

وہ ہنس کر بولیں "پرانے ہوتے تو ان میں ایسی شیرینی کہاں سے آتی؟"

"ہاں ایسی لگاوٹ ہمیشہ نئے تعارف کی علامت ہوتی ہے مزید برآں زیں نے ابھی ابھی اس سلسلے میں اس باکمال مصور کی تعریف سُنی تھی کہ دوستی کے متعلق اُن کے خیالات نہایت وسیع ہیں۔ اور نئی دوستی کو ہمیشہ پرانی پر ترجیح دیتے ہیں" میں نے کہا۔

بیگم نجم مسکرائیں "یہ خوش مذاقی کی علامت ہے ---- ایسے ہی لوگ تو رونقِ محفل ہوتے ہیں اور ہر ہنگامے میں مدعو کئے جاتے ہیں۔"

"بے شک۔ رونق کے لئے کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا" میں نے جواب دیا۔

ستمبر اور اکتوبر کے مہینے ان دو وارفتگانِ محبت نے دریائے عشق کی غواصی میں بسر کر دئے۔ اور خزاؤں میں بہاروں کا مزہ لوٹا۔ اور حسبِ توقع کے مطابق دقیانوسی دماغ کے مخلص دوستوں نے خلل اندازی شروع کر دی۔ اور اپنے وعظ میں زلفی کو محبت کی اس ڈھلوان چٹان کی قلابازی سے بہت روکا۔ دشتِ محبت کے خاروں سے ڈرایا۔ اس پُرخطر رستے کے نشیب و فراز سے آگاہ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زلفی نے ان مخلص بے وقوفوں سے ہمیشہ کے لئے قطع تعلق کر لیا۔ اور اسی زمانے کی بیاہ میں دونوں نے شادی سے فراغت بھی پا لی۔ شادی کے چند ہی مہینوں بعد مصور کی جدت ابھر آئی۔ چنانچہ اس نے پرانی تصویر سے بیزاری اور نئی سے دلچسپی کا اظہار شروع کر دیا۔ پرانی تصویر ردی کی ٹوکری کے حوالے کر دی۔ زلفی کی بہاروں پر خزاں نے تسلط جما لیا۔

کچھ دیر بعد میں چونک پڑی۔ ماضی کی وادیوں میں بھٹکتے بھٹکتے افسردہ ہو کر میں نے کہا "نجانے تم پر کیا افتاد پڑی تھی کہ خطرے کی گھنٹیاں بجتی رہیں اور تم پناہ لینے کی بجائے سینہ تان کر کھڑی ہو گئیں۔ اس رات فیروز کا حسن اور بانکپن قیامت خیز ضرور تھا۔ مگر اس کے ہاتھ میں شرابِ ارغوانی کا جام بھی تو چھلک رہا تھا! جس میں نجانے کتنی زندگیاں غرق ہو چکی تھیں! اس وقت وہ مخمور تھا، قدم مرتعش تھے اور ہاتھ لرزاں۔ پھر بھی تم اس کے دامِ محبت میں گرفتار ہو گئیں!"

اس کا غصہ رفع ہو گیا تھا۔ اب وہ ایک شکستہ پر پرندے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ بے بسی کے انداز میں بولی "پھر کیا کرتی روحی؛ سُنا نہیں آتشِ عشق کے متعلق کیا کہا گیا ہے کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے؛ حسن آمادۂ پیکار ہو تو عشق ہتھیار پھینک دیتا ہے۔"

ایک لمحہ کے لئے میں متاثر ہو گئی، پھر اپنے آپ کو سنبھال کر کہا "کیا بکتی ہو زلفی؛ اس قسم کا جذباتی اندھاپن مردوں کی ذہنیت ہوتی ہے۔ جذبات کے سیلاب میں ایک حقیر تنکے کی طرح بہہ جانا، مگر عورتیں ان معاملات میں دل سے نہیں ہمیشہ دماغ سے سوچنے کی عادی ہوتی ہیں" میں برافروختہ ہو کر بولی۔

"میں اب محسوس کرتی ہوں کہ عقل اور جذبے کے کیا مدارج ہوتے ہیں ----"

"اب محسوس کر رہی ہو! نادان روح! آج سے پانچ سال پہلے تمہارے خیر خواہوں اور دوستوں نے تمہیں کتنا روکا! کتنی اونچ نیچ دکھائی۔ مگر تم ایک ہی وار میں کسی زخمی پرند کی طرح پھڑپھڑاتی ہوئی زمین پر گر چکی تھیں۔ مجبور اور بے بس! میں سوچتی ہوں۔ اس میں بھلا تمہارا بھی کیا قصور؟ تم فطرتاً اذیت میں لذت جو محسوس کرنے کی عادی ہو۔ بعض وقت تم مجھے اسی مدرسۂ فکر کی طالبِ علم معلوم ہوتی ہو جس سے بعض پرانے یونانی فلسفی وابستہ تھے۔ جن کا نظریہ قنوطیت تھا۔ مگر میرا خیال ہے ان پانچ سالوں میں تم اذیت کا خوب

زیب، لطف اٹھاتی ہوئی بولی۔ آخر اب اور کیا چاہتی ہو؟"

"بس اب یہی چاہتی ہوں کہ فیروز کی بجائے مجھے موت آجائے۔"

"کیا تمہیں اپنے الفاظ پر یقین ہے؟ مری پیاری! ممکن ہے تم بالکل اس کے برعکس چاہتی ہو، کیونکہ ہم جو کچھ چاہتے ہیں صاف دلی سے اس کا اظہار شاذ ہی کرتے ہیں۔ البتہ جو نہیں چاہتے اسے طشت از بام کرتے رہتے ہیں، حالانکہ اپنے اس فعل سے ہم باخبر نہیں ہوتے۔"

میرا جملہ ختم ہی ہوا تھا کہ سمندر کی گرج اور بجلی کی کڑک نے دفعتًا فضا میں ایک دھماکا سا پیدا کر دیا، جسے میں نے تو نہیں مگر زلفی نے فوراً محسوس کر لیا اور لرز کر بولی "سنتی ہو، روحی! سمندر کا تلاطم اور طوفان کا زور؟"

میں نے اسے بغور دیکھ کر کہا "ہاں سنتی اور محسوس کرتی ہوں زلفی، مگر کس طوفان کا؟"

"کس طوفان کا!! کیا مطلب؟" وہ اداس ہو کر بولی "خزاں کی پریشان رات ہے روحی! یوں فلسفیوں کی سی سنجیدہ گفتگو مت کرو، دم گھٹتا ہے۔ میں نے برا کیا یا اچھا کیا۔ غلطی کی یا نہیں کی۔ جو کچھ بھی کیا اب تو صبر کی سل سینے پر دھر لی ہے۔"

"میں صبر کی سلوں کی اسلئے مخالف ہوں کہ ان سے انسان کی قوت مقابلہ کمزور ثابت ہوتی ہے۔ صبر آسان اور مقابلہ مشکل ہوتا ہے۔ جو شخص ڈٹ کر کسی مصیبت یا ظلم کا مقابلہ کرتا ہے، اسے کسی سل پتھر کی ضرورت نہیں ہوتی مگر تم نے اب تک اپنا عقیدہ اور ایمان پرانے مذاہب کی تلقین پر استوار کر رکھا ہے کہ ایذا برداشت کرنا ہی انسانیت کا جوہر اور اس کی معراج ہے۔ صبر و شکر سے ہر وار پر گردن خم کر دینا ہی گویا زندگی کا مقصد ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آخر کیوں، انسان اس چار دن کی زندگی میں تختۂ مشق بنا رہے؟"

"ٹھیک کہتی ہو۔ اس بات کا مجھے بھی احساس ہے کہ آج سے پانچ سال پہلے بیگم نجم کی محفل سرود میں جس شخص نے مجھے ایک لہلہاتے ہوئے مرغزار سے اٹھا کر ایک لق و دق صحرا میں بے سہارا چھوڑ دیا وہ ہرگز قابل معافی نہیں۔ بلکہ سزا کا مستحق ہے، بہت بڑی اور سنگین سزا کا۔"

طوفان کا زور اور آندھی کا شور بڑھتا ہی گیا اور وہ شدت جذبات سے ہانپنے لگی۔

"بہت بڑی اور سنگین سزا کا!؟ یعنی تمہارے نہاں خانۂ دل کے کسی خفیہ گوشے میں اس کے خلاف غم و غصے کی آگ بھڑک رہی ہے! بھلا بتاؤ میں نے غلط کیا کہا تھا —— اسی لئے تو مجھے تمہاری بات کا یقین کرنے میں تامل تھا، جب تم اس کی بجائے اپنی موت کی دعائیں مانگ رہی تھیں، اسی لئے تو میں نے تم کو ٹوکا تھا۔ اب تم فیروز کو سنگین سزا کا مستحق سمجھ رہی ہو۔ اس قسم کا اجتماع ضدین تمہاری جذباتی نابالغی کا ثبوت ہے۔ فیروز پر تمہارا غصہ غیر فطری نہیں ہے۔ یوں آگ کو پردوں میں چھپاؤ گی تو وہ ایک دن بھڑک کر تمہاری ہستی اور تمہاری کائنات ہی کو خاکستر کر دے گی۔"

وہ بے چین ہو کر بولی "نہیں، نہیں، میں اب بھی دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ ؏

"وہی سوز دل کی ہیں گرمیاں، وہی درد دل کی ہیں شدتیں"،

پانچ سال پہلے محبت کا جو چشمہ پھوٹ پڑا تھا، وہ اب تک ابل رہا ہے۔"

میں بیزار ہو کر بولی "تم ہمیشہ سطح پر تیرتی رہیں۔ تہہ میں جھانک کر دیکھنے کی زحمت کبھی قبول نہیں کی۔ اسی لئے اپنے جوش محبت پر نازاں ہو۔ مگر زلفی! بدقسمتی سے مجھے سطحی اور غیر سطحی چیزوں کے پرکھنے کا جنون ہے۔ میرے اسی جنون نے مجھے سرگوشی میں کہا ہے کہ محبت کے اس حسین اور بظاہر پرسکون سمندر کی تہ میں خونخوار مچھلیاں بھی موجود ہو سکتی ہیں۔ یہ شاعرانہ باتیں نہیں، خالص حقیقتیں ہیں۔ خیر ان باتوں کو اٹھا رکھو۔ یہ بتاؤ معالج کیا کہتا ہے؟"

"مجھے اس سے نفرت ہے۔"

"معالج سے! اس کی کیا وجہ ہے؟" میں حیران ہو کر پوچھنے لگی۔

زلفی میرے اس سوال پر چونک سی پڑی۔ اور دریچے کے باہر اندھیرے میں بجلی زور سے کانپی۔

"وجہ کیا ہوتی! بس ہے نفرت" وہ بے تعلقی سے کہنے لگی۔

"نفرت ہے تو معالج بدل کیوں نہیں دیتیں؟"

لمحہ بھر بعد وہ بولی "معالج کا بدلنا کچھ آسان تھوڑا ہی ہے؟ کئی مجبوریاں ہوتی ہیں۔"

"بہت ماہر معالج ہے؟"

"خاک"

"مفت علاج کرتا ہے؟"

"نہیں"

"تو پھر تامل کس بات کا؟"

"ہاں سوچتی ہوں اسے بدل ہی دوں"

اس کے تذبذب کو میں حیران ہو کر دیکھنے لگی۔ دو لمحے وہ کچھ بے چین سی نظر آئی پھر سرگوشی میں کہنے لگی "تمہیں معلوم ہے اس نے ایک دن مجھ سے کیا کہا تھا؟"

"کیا؟" میں نے بھی سرگوشی میں پوچھا "کہتا تھا۔ بیگم فیروزہ! آپ کا اور آپ کے میاں کا کیا جوڑ! آپ حور، وہ ہر وقت نشے میں چور"

"تو تم نے کیا کہا؟"

"کہتی کیا؟ جواب میں ایک تھپڑ رسید کر دیا" وہ نہایت فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھ کر بولی۔

"ارے تھپڑ!" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ میں اس کی موقع شناسی اور شوہر پرستی کی تعریف کے پل باندھ دوں گی۔ مگر مجھ پر اس کی اس بے ساختہ حرکت کا بالکل اُلٹا اثر پڑا۔ جھنجھلا کر میں نے کہا "جب تمہارا باطن صاف تھا تو تمہیں اپنی اتنی توانائی استعمال کرنے کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی؟ کس جذبے کے خلاف تمہیں اتنی سخت جد وجہد کرنی پڑی؟"

اور اسی وقت دریچے کے باہر تاڑ کے منحوس درخت پر ایک چمگادڑ نے بڑے زور سے اپنے دونوں بازو پھڑپھڑائے "اف! یہ کیا چیز تھی؟"

"میرا ضمیر —— اسی نے تھپڑ لگوایا"

"اب تک ضمیر ضمیر!" میں نے حقارت سے کہا۔

"زمانۂ جاہلیت کا آدمی ضمیر کی آواز پر نازاں ہو کر بلا سوچے سمجھے سرِ تسلیم خم کر دیا کرتا تھا۔ مگر آج کے انسان کو اپنے آپ اور اپنے ضمیر پر حکمرانی کی تمنا ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا قابو میں آجانا انسانی انفرادیت کی توہین ہے۔ اسی لئے تو تمہارے ضمیر نے تم سے مشورہ لئے بغیر تھپڑ لگوا دیا"

"تو اور کرتی بھی کیا؟ تمہاری رائے میں نہیں لگانا چاہیئے تھا تھپڑ؟"۔

"تم نے کبھی سوچا، مجرم اُس وقت اپنے ریوالور یا اپنے کسی ہتھیار کو استعمال کرتا ہے، جب اسے پکڑے جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ تم کو تو پکڑے جانے کا ڈر نہیں تھا۔ تمہارا باطن صاف تھا۔ پھر کس سلسلے میں تم نے اسے تھپڑ لگایا؟ خیر تو اس تھپڑ کے بعد؟"

وہ اس اہم گفتگو کے درمیان یک لخت اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں تمہارے لئے قہوہ تو تیار کر لوں"

"نہیں زلفی! قہوہ نہیں چاہیئے۔ سوچنے کے لئے مواد چاہیئے۔ تو پھر اس تھپڑ کے بعد؟"۔

"اس کی زیادتی تو تم دیکھو ذرا ہی! تھپڑ کے جواب میں اس نے مجھے ایک روز تھیٹر پر مدعو کیا"

"اس کے بعد یہی منزل آتی ہے زلفی! نکتہ رس آدمی معلوم ہوتا ہے، اور گہرائیوں میں جھانکنا جانتا ہے —— پھر؟"

"مجھے اس سے اور بھی نفرت ہو گئی"

"اور بھی نفرت! کتنی؟ ——" میں بے چین ہو کر پوچھنے لگی۔

وہ قدرے حیران ہو کر بولی:" دماغ ٹھکانے ہے؟ میرے پاس نفرت یا محبت ناپنے کا کوئی پیمانہ رکھا ہے؟"

"ان کے لئے دو مختلف پیمانوں کی ضرورت نہیں ہوتی زلفی! یہ دونوں چیزیں ہمیشہ ایک ہی پیمانے سے ناپی جاتی ہیں۔ مگر تم سچ کہتی ہو۔ اس قسم کی جنس کو تولنے کا نہ کوئی پیمانہ ہوتا ہے نہ ترازو۔ تاہم ایک کامل انسان کے لئے نفرت و محبت کے بیوپار میں توازن قائم رکھنا کچھ ایسا جوئے شیر لانا بھی نہیں ——" یہ کہتے کہتے میں کچھ فکر مند سی ہو گئی۔

کمرے پر سکوت طاری ہو گیا۔ میں مومی فانوس کے آگے چپ چاپ بیٹھی قیاس آرائیاں کرتی رہی۔ اور شعلہ بھڑکتا رہا۔ زلفی نہایت جوش وخروش کے ساتھ اپنی نفرت کا اظہار کرتی رہی "جی چاہتا ہے گلا گھونٹ ڈالوں اس بدمعاش ڈاکٹر کا۔ مسکراتا ہے اور سمجھتا ہے میں اس کے برقِ تبسم کی تاب نہ لا سکوں گی"

"بہت زیادہ بدشکل ہے؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔ اور اعصاب کو تسکین پہونچانے کے لئے اوڈی کلون سونگھنے لگی۔

وہ دو لمحے چپ رہی پھر بولی "مجھے کیا معلوم؟ میں نے کبھی اسے اتنی توجہ سے دیکھا ہی نہیں۔ گذشتہ دنوں ایک نرس رکھ لی تھی۔ وہ کہتی تھی ہسپتال میں اپنی شکل و صورت کی وجہ سے بہت مقبول ہو رہا ہے۔ ہوں۔ بیری بلا سے!"

وہ دیر تک پسے شدہ مدہ سے غم و غصے کا اظہار کرتی رہی اور میں خاموشی سے سنتی رہی۔ خزاں کی آندھی کا شور بڑھتا ہی جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے کہا "فیروز شرابی اور کمینہ ضرور ہے۔ مگر میں چاہتی ہوں کہ وہ زندہ رہے۔"

دور سمندر کا تلاطم اس کے فقروں پر قہقہے لگا رہا تھا۔

میں افسردہ لہجے میں بولی: "تم بار بار فیروز کے متعلق یہ کیوں کہتی رہتی ہو کہ اسے زندہ رہنا چاہئے؟ کیا مجھے تمہاری اس آرزو کا تمہارے کہے بغیر یقین نہیں آسکتا؟ یا تم خود اپنے آپکو یقین دلانا چاہتی ہو کہ تم اس کی زندگی کی خواہاں ہو؟"

لمحہ بھر کے لئے آندھی تھمی۔ پھر پہلے سے بھی زیادہ زور و شور کے ساتھ چل پڑی۔

زلفی نے تیز نظروں سے مری طرف دیکھا "تم بعض وقت خارج از عقل باتیں کرنے لگ جاتی ہو زوتی! بھلا تمہارے اس سوال کا کوئی جواب بھی ہو سکتا ہے؟"

میں مسکرائی "ایسے سوال ہمیشہ تشنۂ جواب ہی رہ جاتے ہیں زلفی! مجھے معاف کرو، محبت و نفرت کی یہ پیچیدہ داستانیں لامحدود ہوتی ہیں۔ مجھے خزاں کی ویرانیوں نے مضمحل کر دیا ہے۔ کہو تو تھوڑی دیر آرام ہی کر لوں؟" یہ کہتے کہتے میں ایک کوچ پر نیم دراز سی ہو گئی۔

اس نے کہا "مگر خزاں میں مری نیند جیسے پر لگا کر اڑ جاتی ہے۔ مجھ سے تو لمحہ بھر کو سویا نہیں جاتا۔"

"تو پھر ساری رات بیٹھی رہتی ہو؟" میں نے ایک نیم جماہی لیکر غنودگی کی آواز میں پوچھا۔

"نہیں تو، پریشانی کے باعث جو کام دن بھر میں انجام نہیں دے سکتی، انہیں رات کے سناٹے میں ختم کر لیتی ہوں۔ تم جانو گھر کی بیسیوں مصروفیتیں ہوتی ہیں۔ جو میں نے رات کے لئے مخصوص کر رکھی ہیں۔ کبھی کتاب پڑھتی ہوں، کبھی سلائی لے کر بیٹھ جاتی ہوں، گذشتہ ہفتے نمائش سے میں نے فیروز کے شب خوابی کے لباس کے لئے ایک بڑا خوب صورت دھاری دار ریشم خریدا تھا۔ آج تک اسے بھی نہ سی سکی۔"

کچھ دیر بعد مری آنکھیں بے اختیار بند ہونے لگیں، آندھی ابھی تک چیخیں مار رہی تھی اور سمندر دھاڑیں مار کر رو رہا تھا۔

میں نے نیم وا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اس۔۔۔نے مجھے سوتا سمجھ کر مجھ پر شال ڈال دی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر دریچے کے پاس چپ چاپ سناٹے کے عالم میں یوں کھڑی رہی جیسے اس کی سوجھ بوجھ کی تمام قوتیں مفلوج ہو چکی ہوں۔ اور نہ جانتی ہو کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔

نجانے کیا بات تھی یکلخت اس نے مڑ کر میز کی طرف دیکھا اور تیزی سے وہاں پہونچی، جھک کر قینچی اٹھائی: بالشت بھر لمبی اور نوکدار قینچی! اتنی تیز اتنی خوفناک کہ کپڑا تو کیا انسانی شہ رگ کو بھی آن واحد میں بڑی آسانی سے کاٹ سکتی تھی۔ پھر اس نے قینچی کی زبانیں کچھ اس طرح کھولنی اور بند کرنی شروع کیں جیسے وہ اس بات کا اندازہ لگانا چاہتی تھی کہ وہ تلوار کی دھار کی طرح تیز ہیں یا نہیں!

لمحہ بھر وہ خیالات میں گم ساکت کھڑی رہی۔ پھر تیز گامی سے مریض کے کمرے کی طرف بڑھی اور درمیانی دروازہ زور سے کھول دیا۔ سامنے شرابی مریض بدمست پڑا تھا وہ آہستہ آہستہ اس کی چارپائی کی طرف بڑھی۔ بڑی احتیاط سے قدم جما جما کر ۔۔۔۔ تاکہ اس کی آنکھ نہ کھل جائے!

باہر خزاں کی رات میں کسی جو اصل نے ایک ہولناک چیخ ماری ۔۔۔ دور ندی کے کنارے ایک کتا اپنی منحوس آواز میں زور زور سے رونے لگا ۔۔۔ کمرے میں گھڑیاں کی ٹک ٹک واضح طور پر سنائی دینے لگی۔ ادپر آندھی کا شور بڑھتا گیا۔ وہ ہاتھ میں تیز اور نوکدار قینچی لئے مریض کے سرہانے پہونچ گئی۔

اس کے ہاتھ میں نوکدار قینچی تھی، ہر طرف سناٹا تھا، وہ تیز تیز سانس لے رہی تھی۔ یکلخت وہ مریض پر جھک گئی۔ اس کے کرتے کا گریبان کھول دیا اور بغور دیکھنے لگی ۔۔۔۔ پھر چارپائی سے لگ کر نیچے فرش پر بیٹھ گئی۔ ایک گٹھڑی کھول کر اس میں سے

(باقی صفحہ ۱۲۳ پر)

پیراں نمی پرند..

محمود تیمور (مصری)
مترجمہ اسما طیب حسین

عم متولی، مونگ پھلی اور خربوزے کے بیج اور مٹھائیاں پھیری پر بیچتا تھا۔ حلمیہ کے باشندے اور اس کے قرب و جوار میں رہنے والے اس کو خوب جان گئے تھے۔ وہ ہمیشہ سفید بڑا سا صافہ باندھے رہتا اور سفید جلابیہ میں ملبوس ہوتا۔ اس کے طور طریقے بہت ہی باوضع تھے۔ وہ بچوں کو خاص سوڈانی لہجہ میں پکار پکار کے ان کے ہاتھ سودا بیچتا۔ اس کی آواز میں غربت اور بیماری کی وجہ سے رقت آ گئی تھی۔ لیکن اب بھی ایک تحکمانہ انداز تھا۔

یہ شخص سوڈان میں پلا بڑھا تھا۔ اور مہدی کی فوج میں فوجی دستہ کے کماندار کی حیثیت سے لڑ بھی چکا تھا۔ وہ تمام عمر تنہا ہی رہا۔ نہ اس کی بیوی تھی نہ بچے۔ عبداللہ بے کی گلی میں ایک چھوٹی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں وہ محض ایک صندوق ایک پھٹے ہوئے کمبل اور پرانے بوسیدہ تکیئے اور ایک پھٹی پرانی چٹائی کے سہارے زندگی بسر کرتا تھا۔ لیکن انتہائی غربت کے باوجود وہ خود اور اس کی چیزیں ہمیشہ صاف ستھری ہوتیں۔

وہ اپنے کمرہ میں تھکا ماندہ واپس آتا۔ اور مغرب کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد اپنا بوسیدہ تیل کا لیمپ جلا لیتا۔ اپنے صندوق کے پاس بیٹھ کر اس میں سے ایک پرانی تلوار نکالتا۔ جسے اپنے گھٹنوں پہ رکھ کے وہ ایک گہری اور لمبی سوچ میں غرق ہو جاتا۔ اور پرانی یادوں کو دل ہی دل میں دہراتا، اور جب مہدی کی یاد اس کے دل میں جاگ اٹھتی تو وہ خدا سے دعا مانگتا کہ جلدی رجعت کا وقت قریب آ جائے۔ تاکہ مہدی جلدی سے دوبارہ ظاہر ہوں، جو مذہب کے علمبردار ہیں۔ اور آ کر دنیا کی خرابیوں کو دور کر دیں گے۔ اس کے بعد وہ اپنی غمناک آنکھوں کو نیچے جھکا کے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتا اور اس پرانی تلوار کو نہایت جوش اور عقیدت سے چوم لیتا پھر وہ عشا کی نماز اور رات کے کھانے کے لیے اٹھتا۔ اور اس سے فارغ ہو کے سو جاتا۔ اور بہت جلد گہری لمبی اور پر سکون نیند میں کھو جاتا جس میں وہ اپنے قابل فخر ماضی اور اس آنے والے زمانہ کے خواب دیکھتا جو مہدی کی رجعت سے خوش آئند ہو جائے گا۔ صبح سویرے اٹھ کے وہ فجر کی نماز ادا کرتا، اور سیدی گلشن کی کہی ہوئی نعتیں پڑھتا۔ یہاں تک کہ صبح کے سورج کی شعاعیں اس کی تنگ کھڑکی پر پڑتیں۔ تب وہ اٹھ بیٹھتا اور پشت پر اپنی ٹوکری لاد کر حسب معمول اپنی بندھی ہوئی پھیری پر چل دیتا۔

پندرہ سال ہوئے جب وہ قاہرہ آیا تھا۔ جب سے اس کا یہی معمول تھا۔ اس زندگی کے معمولات میں رتی برابر بھی تبدیلی نہ ہوتی تھی۔ حالانکہ اس عرصہ میں پرانی عمارتیں ٹوٹیں اور ان کی جگہ نئے نئے مکان تعمیر ہوئے سینکڑوں لوگ مرے اور لاکھوں بچے دنیا میں آئے لیکن عم متولی کو قاہرہ اور اس کے گرد و نواح سے ذرا بھی واقفیت نہ پیدا ہوئی۔ سوائے اپنی مقررہ پھیری کے اس نے کسی چیز پر دھیان نہ دیا جس کے دوران میں اس کی آرام لینے اور سستانے کی جگہیں معین تھیں۔ ان میں سے دو خاص طور پر اسے پسند تھیں پہلی تو ایک چھوٹی سی مسجد جس کے دروازے پر بیٹھ کے وہ دن کا کھانا کھاتا۔ کھانا ختم کر کے خدا کا شکر ادا کرتا۔ مسجد کے اندر جا کے ظہر کی نماز پڑھتا اور کچھ دیر میں دوپہر کی نیند لیتا۔ اس کا دوسرا مرغوب ٹھکانہ صوفیہ میں نور الدین بے کا عالی شان مکان تھا۔ جہاں ہر روز عصر کی نماز کے بعد وہ پہنچ جاتا۔ یہاں محل کے دروازے پر آس پاس کے گھروں کے بواب (دربان) اور نور الدین بے کے نوکر چاکر جمع ہو جاتے۔ اور اسلام کی پرانی شان و شوکت اور اس کے موجودہ زوال اور انحطاط

باتیں کرتے اس ذکر پر عم متولی کی آنکھیں چمکنے لگتیں۔ وہ جوش میں آکے کھڑا ہو جاتا اور ان کو مہدی کی رجعت کے متعلق روایات سناتا۔ اس وقت اس کا لہجہ بہت ہی سنجیدہ اور بارعب ہوتا۔ اس کی زبان میں وہ قوت اور بلاغت پیدا ہو جاتی کہ لوگوں کے دلوں کو تسخیر کر لیتی۔ وہ سب نہایت مودب بیٹھ کے بڑے شوق سے اس کی بزرگانہ باتیں سنتے۔ اور جب وہ مہدی کے ظہور، دنیاوی خرابیوں کی بیخ کنی اور اسلام کی قدیم شان کے دوبارہ پلٹ آنے کی باتیں کرتا۔ تو نورالدین بھی اپنی قیمتی چھڑی کا سہارا لئے باہر آجاتا۔ وہ عم متولی کے پاس آکے اسے ادب سے سلام کرتے۔ اس کو کچھ انعام دیتے اور بڑے باوقار انداز میں کھنکارتے ہوئے وہاں سے چلے جاتے۔ ابراہیم یا نورالدین بے کا لڑکا ایک خوش باش اور ہنس مکھ سولہ سالہ نوجوان بھی اکثر عم متولی کے پاس آجاتا اور پوچھتا "کیا تم پھر دین مہدی کی فوج اور لڑائی کے قصے سنا رہے ہو؟"

"ہاں میں سنا رہا ہوں اور نہایت فخر سے سنا رہا ہوں۔ اس زمانہ میں ہزار سپاہیوں کی کمان میرے سپرد تھی۔" ابراہیم ہنسی کے مارے لوٹ جاتا پھر مسخرے پن سے سینہ تان کر اپنی جاکٹ کے بٹن بند کرتا۔ ٹوپی اتار کے دائیں ہاتھ سے اس کو فوجی سلام کرتا۔ اور پھر اپنی جیب سے ایک قرش نکال کے عم متولی کو دیتا اور کہتا "جنرل صاحب لائیے مجھے ایک قرش کی مونگ پھلی اور بیچ تو دیجیے۔"

ایک دن دوپہر کو عم متولی حسب معمول نورالدین بے کے مکان پہ گیا۔ اور دستور کے مطابق ڈیوڑھی پر بیٹھ گیا۔ فوراً ہی سب بچے اس کے گرد مونگ پھلیاں لینے جمع ہو گئے۔ اور چاروں طرف کے نوکروں نے بھی اس کو گھیر لیا۔ سب اس کے گرد بیٹھ گئے۔ عم متولی نے حسب عادت، کھڑے ہو کے اپنا وعظ شروع کیا۔ اور وہ محو ہو کے اس کے مسحور کن الفاظ سنتے رہے۔ عین اس وقت ابراہیم بے باہر آیا اور کہنے لگا "جنرل متولی ....." اس نے اپنی تقریر بند کر دی اور لوگ خفگی اور استعجاب سے اس کھلنڈرے لڑکے کی طرف دیکھنے لگے۔ ابراہیم بے آگے بڑھا اور بات یوں ختم کی کہ "میرے والد آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ آپ میرے ساتھ تشریف لے آئیے۔"

مجمع کو یہ مداخلت پسند نہ آئی۔ عم متولی نے ٹوکری اپنی پیٹھ پر رکھی اور آہستہ سے دروازہ کی طرف بڑھا۔ اس نے اپنے وفادار عقیدت مندوں پر معذرت اور محبت کی نگاہ ڈالی۔ ابراہیم بے کے ساتھ وہ پائیں باغ میں داخل ہوا۔ کچھ دیر تک وہ دونوں ساتھ ساتھ باغ کی روش پر چلتے رہے۔ یہ روش مہمان خانہ تک جاتی تھی جہاں نورالدین بے ایک تخت پر بیٹھے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ نورالدین بے نے اپنے بیٹے کو وہاں سے بھیج دیا، گرمجوشی سے عم متولی کا خیر مقدم کیا اور بوڑھے کو اپنے قریب ہی زمین پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس دوران میں کچھ لمحے خاموشی رہی عم متولی نیچی آواز میں حمد و نعت پڑھتا رہا۔ نورالدین بے نے مختصر سی تمہید کے بعد کہا کہ ان کی والدہ بزرگوار نے اس کی تعریف سنی ہے۔ لہٰذا وہ اس سے ملنا چاہتی ہیں تاکہ اس کی زبانی تاریخ اسلام کی شاندار روایات سنیں۔ عم متولی کا دل خوشی سے بے قابو ہو گیا۔ اب اس کی شہرت گلی کوچوں سے گزر کر چار دیواری کے اندر بیٹھی ہوئی خواتین کے کانوں تک پہنچ چکی تھی۔

نورالدین بے اٹھ کر زنان خانہ کی طرف چلے۔ عم متولی بھی پیچھے پیچھے ہو لیا۔ وہ ایک کشادہ گلی میں سے ہوتے ہوئے مکان کے دروازہ تک پہنچے۔ اور ایک اندھیرے چبوترے کی سیڑھیوں پہ چڑھ کے ایک وسیع ہال میں داخل ہو گئے۔ عم متولی نے جیسے ہی اس عظیم الشان ہال میں قدم رکھا اس کا دل خوف اور حیرت کے مارے دھڑکنے لگا۔ اس نے ایسا ایوان مہدی کے محل میں بھی نہیں دیکھا تھا۔

عم متولی ابھی حیرت میں غرق ہی تھا کہ ایک نحیف نسوانی آواز اس کے کانوں کو سنائی دی۔ وہ اس آواز کی طرف متوجہ ہوا۔ اور اس نے دیکھا کہ مکان کی مالکہ اس کے قریب ہی ایک بڑے تخت پر بیٹھی حقہ پی رہی تھیں۔ وہ ان کی طرف بڑھا کہ ان کو اچھی طرح دیکھ سکے۔ یہ ایک سن رسیدہ لمر جھریاں پڑے ہوئے چہرے کی خاتون تھیں جنہوں نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ اور نازک سنہری فریم کی عینک لگائے ہوئے تھیں۔

عم متولی ان کی طرف بڑھا ان کے دبلے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ اور خوش بختی و درازی عمر کی دعائیں دیں۔ نورالدین بے تعارف کرانے کے بعد وہاں سے چلے گئے۔ خانم نے اس کی آمد پر خوشی ظاہر کی اور کہا کہ وہ اس کی کہانیاں سننا چاہتی ہیں۔ اس نے نگاہیں نیچی کر کے اپنے ذہن میں سب قصے اور قدیم روایات

دہرانی شروع کیں۔ پھر اس نے اپنا سر اٹھایا اور اس روانی اور جوش کے ساتھ اپنا بیان شروع کیا کہ خانم مسحور ہوگئیں۔ جب وہ ختم کرچکا تو انہوں نے اس کو انعام دیا۔ اس قدر بڑی رقم کہ جس کا کبھی اسے خواب و خیال بھی نہ تھا اور اتنی اس کی تعریف اور توصیف کی کہ وہ فکر کے پریشان ہوگیا۔ آخر وہ ان کو اور ان کے خاندان کو دعائیں دیتا ہوا وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ابھی وہ باغ ہی تک پہنچا تھا کہ خادماؤں اور چھوکریوں کے ایک گروہ نے اس کو گھیر لیا، اس کے دامن اور ہاتھوں کو چوما اور اس سے دعائے خیر کی طالب ہوئیں۔ تبرک کے طور پر اس کی مونگ پھلیاں اور بیج وغیرہ خریدنے چاہے۔ وہ خوش خوش زمین پر بیٹھ گیا اور سارا سودا ہاتھوں ہاتھ بیچ ڈالا پھر وہ سیدھا مسجد میں گیا، وہاں جاکے خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں چالیس سجدے شکرانے کے ادا کیے۔

اس دن سے عم متولی اکثر نورالدین بے کے مکان پر جاتا۔ وہاں اس کی خوب آؤ بھگت اور اس پر عنایتوں کی بوچھاڑ ہوتی۔ اس کی حالت تبدیل ہوگئی۔ اب وہ خوب اکڑ کے سیدھا چلتا اور کڑک دار آواز میں بات کرتا۔ اس نے اپنی رہائش کے لئے بھی پہلے سے بہتر کمرہ لے لیا تھا۔ اب وہ پنیر روٹی پیاز اور گاجروں کے بجائے روزانہ چاول اور ترکاری اور ہر ہفتہ میں دو بار گوشت کھانے لگا تھا۔ صافہ بھی زیادہ لمبا ہوگیا تھا۔ جبہ کی آستینیں اور زیادہ چوڑی ہوگئی تھیں۔ وہ کاندھے پر ایک بسنتی سی کشمیری شال ڈالنے لگا تھا۔ گہرے سرخ رنگ کی نئی جوتیاں تھیں۔ کمر پر خوب لمبی جھالر کا ریشمی پٹکا بندھا ہوا ہوتا۔ اس نے رفتہ رفتہ پھیری پر بیچنے کا کام بند کر دیا۔ اس نے اپنی روزانہ کی کوچہ گردی سے نجات حاصل کرلی تھی، اب وہ خوب لمبی تان کر سوتا، غریبوں میں خیرات بانٹتا۔ حاجت مندوں کا سہارا سمجھا جاتا۔ فرصت سے مسجد میں جاتا اور دل لگا کے وعظ سنتا تاکہ بعد میں ان بزرگ خانم یعنی نورالدین کی والدہ کو سنا سکے۔ اس طرح اس کی شہرت گرد و نواح میں پھیل گئی۔ لوگ آپس میں اس کا ذکر کرتے اور اس کی خیر خبر پوچھتے۔ پھیری والا عم متولی اب ایک درویش بن چکا تھا۔

اس کے عقیدت مندوں کا گروہ نورالدین بے کے مکان کے سامنے ایک دن اس کی آمد کا منتظر تھا کہ کسی نے کہا "میرے دوستو! کیا تم عم متولی کو بس ایک حق پرست آدمی سمجھتے ہو جو بڑی فصاحت سے وعظ کہتا ہے؟ دوسرے نے پوچھا۔ تمہارا اپنا کیا خیال ہے؟ اس شخص نے سرگوشی میں جواب دیا۔ وہ خدا کے بڑے برگزیدہ بندوں میں سے ہے۔"

"تمہیں کس نے بتایا؟"

"تم اس کی آنکھوں کو ذرا دیر دیکھو، ان میں سے ایک عجیب نور دکھائی دے گا۔"

"میں تمہیں ایک واقعہ سناؤں لیکن جھجکتا ہوں کہ شاید تم میرا یقین نہ کرو۔ مجمع اس کے نزدیک ہوگیا۔ "بتاؤ۔ بتاؤ....." اس نے کہا میں ایک دن اس کے ساتھ سیدی شارلیش میں چلا جا رہا تھا۔ شام کا وقت تھا اور گلی میں صرف دو مدھم سے چراغ روشن تھے یکا یک ہوا کے تند جھونکے سے وہ دونوں لمپ بھی گل ہوگئے۔ ہم دونوں اب گھپ اندھیرے میں تھے۔ مجھے کچھ خوف سا محسوس ہوا اور میں نے عم متولی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے کہا "ڈرو نہیں ہم خدا کی امان میں ہیں" اتنے ہی میں ایک اور شخص نے کہنا شروع کیا "تمہارا قصہ سن کر مجھے بھی ہمت ہوتی ہے کہ اس برحق بزرگ کے بارہ میں کچھ سناؤں جس سے ہمارا سابقہ اتنی مدت سے ہے لیکن حقیقت سے ہم ابھی تک خاطر خواہ طور پر واقف نہیں"۔ مجمع کی نگاہیں اب اس شخص کی جانب اٹھ گئیں اور سب نے پوچھا "تو بتاؤ تم اس کے بارہ میں کیا جانتے ہو؟ اس شخص نے سہمی ہوئی آواز میں نہایت سنجیدہ چہرہ بنا کر کہا۔ "وہ مہدی ہے"

"مہدی...... مہدیٔ موعود؟" وہ ایک دوسرے کے ساتھ سر جوڑے سرگوشی کرنے لگے۔ "مہدی۔ مہدیٔ موعود؟" وہ بولا میں نے اس کے صندوق میں نبوت کی تلوار دیکھی ہے۔ جس سے چھو کر اس نے میرے بیمار بیٹے کو اچھا کر دیا۔ حالانکہ ڈاکٹر جواب دے چکے تھے"۔ ہر شخص دوسروں سے پہلے سوال کرنے کے لئے بےچین تھا۔ اور یہ شخص بڑی متانت سے سب کا جواب دے رہا تھا۔ ہیجان بڑھتا گیا۔ اس گروہ میں اب کچھ اور لوگ بھی آکے شامل ہوگئے کہ یہ کیا قصہ ہے۔ اور یہ شخص تلوارِ نبوت اور مہدی کا کیا ذکر کر رہا ہے۔ عین اس وقت عم متولی دور سے آتا نظر آیا۔ مجمع نے اسے دیکھ کر جلدی جلدی دو رویہ قطار باندھ لی۔ عم متولی نپے تلے قدموں سے وہاں آیا۔ سنجیدگی اور وقار کے ساتھ۔ اور ارد گرد بیٹھا

استقبال کرنے والوں پر ایک مسکراتی ہوئی نظر ڈالی اور لوگوں نے باادب ہو کر اس کے گرد حلقہ ڈال لیا۔ اس کے دامن کے ہاتھوں اور اس کے پٹکے کو عقیدت سے چومنے لگے۔ جس شخص نے تلوار کو چھوا تھا وہ آگے بڑھا۔

"میرے آقا۔ میرے مالک۔ میرے بیٹے کو موت سے بچانے والے۔ آپ نے خود کو بہت چھپایا مگر ہم آپ کو پہچان گئے۔ آپ ہی خدا کے وہ برگزیدہ بندے ہیں جسے اس نے ہماری ہدایت کے لئے بھیجا ہے۔ آپ رسول کے جانشین ہیں..... آپ مہدی ہیں....."

عم متولی حیران ہو کے اس شخص کی طرف مڑا۔ "تم کیا کہہ رہے ہو! تمہیں ہذیان ہو گیا ہے۔"

"اب آپ اپنی اعلیٰ و ارفع ذات کو ہم سے چھپا نہیں سکتے۔ ہاں ہاں آپ مہدی ہیں۔ رسول کے نائب ہیں۔ خدا نے صداقت کی تلوار آپ کو بخشی ہے۔"

"خاموش رہو، خاموش رہو" اس نے کہا۔ اس لئے کہ مجھے یہ مرتبہ حاصل نہیں۔

"کیا آپ نے میرے بیٹے کو موت سے نہیں بچایا تھا؟"

"میں نے؟"

وہ شخص جس نے اندھیری گلی کا قصہ سنایا تھا آگے بڑھا: "کیا آپ نے اپنے چہرے کے نور سے تیرہ و تار گلی کو روشن نہیں کر دیا تھا؟"

"میرا۔ میں نے؟" پہلے شخص نے کہا "ابوبکر صدیق۔ ان پر خدا کی رحمت ہو میرے خواب میں آئے اور آپ کی اصلیت مجھ پہ انہوں نے ظاہر کی۔" اس نے کچھ دیر خاموشی کا سہارا لیا۔ اور چاروں طرف گھورتا رہا۔ پھر یوں بولا جیسے اپنے آپ سے گویا ہو:

"میرے بچو۔ مہدی تو بہت بڑی قوت والے ہیں۔ مجھ سے کہیں زیادہ قوی اور بزرگ ہیں۔ میں تو ایک خدا کا تابعدار بندہ ہوں۔" وہ ان کے ساتھ زیادہ دیر نہیں بیٹھا۔ اور سوچ میں غرق گھر جلدی واپس آ گیا۔

دوسرے دن صبح کو ابھی وہ جاگا بھی نہیں تھا کہ دروازہ پہ دستک سنائی دی۔ وہ کیا دیکھتا ہے کہ ایک شخص سر پہ پٹی باندھے نحیف اور کمزور بدن روتا گڑگڑاتا چلا آتا ہے اور اس کے دامن کو تھام کر کہنے لگا۔ "مجھے بھی اپنے پاک ہاتھوں سے نبوت کی تلوار چھو جانے دیجئے۔"

"نبوت کی تلوار؟" اس نے حیرت سے کہا۔ وہ بولا "میرے آقا مجھے تکلیف سے نجات دلایئے۔ اس بدبخت پہ رحم کیجئے۔ اے رسول کے نائب! رحم کر۔"

عم متولی اسے اپنے کمرہ میں لے گیا۔ دن بھر اسکی تیمارداری میں مصروف رہا۔ رات کو دعائیں پڑھ کے اس کے اوپر دم کیا۔ اس کی خواہش کے مطابق تلوار اس کے تکیے کے نیچے رکھ دی۔ اور اسے اپنے پہلو میں سلا لیا۔ صبح کو اس بیمار شخص نے اٹھ کر کہا کہ وہ بالکل تندرست ہے بلکہ ایسی تندرستی کا احساس اسے پہلے کبھی نصیب ہی نہ ہوا تھا۔ اس نے عم متولی کے ہاتھوں پہ بوسوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اس کی زبان سے دعاؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔

دن گذرتے گئے عم متولی کا مکان ہر طرف سے آنے والوں کی زیارت گاہ تھا۔ جو اپنے جسمانی روگ یا روحانی آزاروں کا علاج ڈھونڈنے وہاں آتے۔ عم متولی شاذ ہی کبھی باہر جاتا۔ زیادہ تر ایک گہری سوچ میں غرق رہتا۔ کبھی وہ اپنی تلوار نکال لیتا۔ اور اسے گھٹنوں پہ رکھ کے وحشت ناک نظروں سے گھورتا رہتا۔ ایک دن عم متولی نے دیکھا کہ وہ بزرگ خانم نورالدین بے کی والدہ بھی اس کے عقیدت مندوں کے ہجوم میں اس کی زیارت کو تشریف لائی ہیں۔ وہ اسے دیکھتے ہی دوزانو ہو گئیں۔ اس کے دامن کو بوسہ دیا اور کہا "اے نائب رسول یہ کمترین آپ کی خدمت میں حاضر ہوتی ہے آپ کے دیدار کی سعادت حاصل کرنے کے لئے..."

اس دن سے عم متولی نے اپنے کمرہ کے باہر قدم نہیں نکالا۔ کبھی وہ لوگوں کو اندر آ جانے دیتا اور کبھی اندر سے دروازہ کو قفل لگا لیتا اور کسی کو قریب نہ آنے دیتا۔ وہ دیوار سے پیٹھ لگائے ننگا ہی زمین پر گاڑ کے بیٹھ جاتا۔ اور گھنٹوں اسی حالت میں بیٹھا رہتا۔ پھر وہ ایکدم اپنے خواب سے چونک اٹھتا۔ سخت ہیجان اور جوش کے عالم میں جھپٹ کے تلوار اٹھا لیتا۔ کمرہ میں تلوار کے ہوائی ہاتھ چلاتا۔ کودتا۔ چیختا چلاتا۔ ملعونوں کو بھاگ جانے کی دھمکیاں دیتا یہاں تک کہ بیہوش ہو کے زمین پر گر جاتا۔ پڑوسی یہ سب چیخ پکار سنتے اور سمجھتے کہ حق پرست بزرگ پر تنہائی میں

(باقی صفحہ ۱۳۲ پر)

جانثار

قادر جاوید

چار دن سے وہ دکان نہیں آیا تھا اور آج صبح ہی اس کے بیٹے علی اکبر نے آکر اطلاع دی کہ کل رات اس کا انتقال ہو گیا۔ مجھے اور میرے سارے نوکروں کو بے حد تعجب ہوا۔ چند دنوں سے وہ کچھ ملول اور مضمحل سا تھا لیکن ہم یہ گمان بھی نہ کر سکتے تھے کہ وہ یوں یکایک مر جائے گا۔ علی اکبر نے بتایا کہ اسے مسلسل بخار رہنے لگا تھا اور مرنے سے دو دن قبل اس کے ہاتھ اور پیر پر سوجن آگئی تھی۔ میں نے اور دکان کے نوکروں نے اس کے اس چھوٹے سے بچے کی تسلی و تشفی کی اور یہ طے پایا کہ رات میں دکان بند ہونے کے بعد میں اور میری دکان کا ایک پرانا ملازم مرزا جو مرحوم کا بڑا گہرا دوست تھا اس کے مکان جائیں گے اور اس کی بیوی سے مل کر پُرسہ دیں گے۔

علی احمد میری دکان کا منیجر تھا اور میری دکان کے دوسرے نوکر اسے منیجر صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے ہمیشہ اسے اپنی کرسی پر بیٹھے کام کرتے ہوئے یا گاہکوں کو نہایت ہی نرم اور متین لہجے میں عینکوں کے فریم اور ان کے شیشوں کی قیمتیں بتلاتے پایا ہے۔ میرے ابا کہتے تھے کہ وہ دکان کو کبھی دیر سے نہیں آتا اور نہ وقت سے پہلے جاتا ہے۔ دوپہر میں صرف آدھے گھنٹے کے لئے وہ باہر جاتا اور پھر واپس آکر ہم لوگوں کے ساتھ کھانا کھا لیا کرتا۔ وہ ہمارا بہت پرانا نوکر تھا اور میرے ابا مجھ سے زیادہ اس پر اعتماد کیا کرتے تھے۔ دکان کا سارا انتظام اسی کے ذمے تھا۔ وہ دنیا کی ہر مشہور کمپنی کی فہرستیں منگوا کر نئی نئی وضع کے فریموں کا انتخاب کرتا، ان کے لئے آرڈر دیتا اور خود ہی ان کی واجبی قیمتِ فروخت مقرر کرتا۔ گاہک سے وہ انتہائی توجہ کے ساتھ پیش آتا لیکن اس کے چہرے پر خوشامد یا چاپلوسی کے آثار نہ ہوتے۔ وہ بہت ہی شستہ لہجے میں ایک ایک لفظ پر زور دے کر اس انداز سے گاہک سے بات کرتا گویا اپنی بات پر اسے کامل اعتماد ہے اور گاہک کو چاہئے کہ بلا چون و چرا اس کی بات مان لے ۔۔۔ خریدار جب بلا کسی جھجک کے معاملہ طے کرنے پر آمادہ ہو جاتا تو علی احمد کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ جاتی لیکن صرف ایک لمحے کے لئے اور دوسرے ہی لمحے وہ ویسے ہی سنجیدہ ہو جاتا اور گاہک کو بڑے احترام کے ساتھ کرسی پیش کرتا۔ جب کوئی ستانے والا گاہک آتا اور مختلف قسم کی عینکوں کے نمونے دیکھ کر اور شوکیس پر فریموں کا ایک انبار چھوڑ کر چلا جاتا تو اس وقت علی احمد کا تحمل دیکھنے کے لائق ہوتا۔ وہ پتلون کی جیب سے اپنا سفید اور ریشمی ہلکی خوشبو میں بسا ہوا رومال نکال کر چہرے کو بڑی ملائمت سے پونچھتا اور پھر مرزا سے کہتا کہ ہر فریم کو بڑی احتیاط سے اس کی جگہ رکھ دیا جائے۔ گاہک اگر خریداری پر آمادہ ہو جائے تو پھر علی احمد سارے فریم خود ہی ان کی جگہ پر رکھ دیتا ورنہ یہ خدمت مرزا کو انجام دینی پڑتی۔

اسے دکان کی آرائش کا بڑا خیال رہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ عینکوں کی دکان کی سجاوٹ ایسی ہونی چاہئے کہ کمزور بینائی کے لوگ جب اپنی عینک لینے کے لئے اس دکان پر آئیں تو ان کی آنکھیں چکاچوند ہو جائیں۔ وہ اس بات کا ہرگز قائل نہ تھا کہ گاہکوں کی پوزیشن اور ان کی معاشی حالت کا اندازہ لگا کر ایک ہی فریم کی مختلف قیمتیں بتائی جائیں۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح کے چکموں سے ہماری ساکھ بگڑ جائے گی اور وقتی منافع کی خاطر ہمیں بُرے نتائج بھگتنے پڑیں گے۔ دکان کی سجاوٹ کے لئے نئی نئی باتیں سوچا کرتا تاکہ شہر کی دوسری عینک کی دکانوں اور عینک سازوں سے بازی لے جائے۔ دکان کے لئے وہ نئی نئی وضع کے شوکیس بنواتا، ڈیڑھ دو سال کے بعد دکان کی ساری ترتیب بدل ڈالتا، سائن بورڈ خوبصورت وضع اور قوسِ قزح جیسے رنگوں سے لکھواتا، ان پر مختلف زاویوں سے

رنگین روشنی ڈالتا تاکہ شاہراہ پر سے نہ گزرنے والے کی نظر اس پر پڑے اور ہماری دکان کا نام اس کی آنکھوں کی شعاعوں سے گزر کر اس کے تحت الشعور میں جم جائے اور جب بھی اسے عینک کی ضرورت پڑے وہ سیدھا ہماری دکان پر آجائے۔ تین ساڑھے تین ماہ قبل اس نے کلکتہ کی ایک مشہور ایڈورٹائزنگ کمپنی کے ذریعے ہماری دکان کے سائن بورڈ کے اوپر ایک دائیں بائیں اور اوپر نیچے گھومنے والی بڑی سی عینک لگوائی ہے جس پر بے شمار چھوٹے چھوٹے رنگین بلب جلتے بجھتے ہیں اور شام ہی سے ہزاروں راہ گیروں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اس طرح کی نمائش اور اشتہار بازی پر ہر سال وہ کافی خرچ کرتا تھا اور غالباً اسی کا نتیجہ تھا کہ روزانہ سینکڑوں روپوں کا کاروبار ہوتا اور دکان خوب چلتی۔

کہتے ہیں کہ وہ ہماری دکان پر اس وقت ملازم ہوا تھا جب کہ اسکی عمر پچیس چھبیس سال کی ہوگی اور اب مرنے کے وقت وہ پورے باسٹھ سال کا تھا۔ گویا اس کی عمر کے تقریباً ۳۰ سال اسی دکان پر گزرے تھے اور یہی وجہ تھی کہ میرے ساتھ اس کا بڑا امربیانہ رویّہ تھا۔ وہ میرے ساتھ بیٹے یا بھتیجے جیسا برتاؤ کرتا اور سوائے کسی بڑے خرچ کے معاملے کے وہ چھوٹے چھوٹے معاملوں میں میری رائے بھی طلب نہ کرتا۔ میں بھی اس کا بڑا احترام کرتا تھا۔ کیونکہ نہ صرف وہ عمر میں بہت بڑا اور میرے والد کا بااعتماد ملازم تھا بلکہ بہت ایماندار اور کافی منتظم آدمی تھا۔ اسے دکان پر کام کرتے دیکھ کر مجھے بڑا سکون ہوتا اور میرے والد کے انتقال کے بعد اپنی ناتجربہ کاری سے چند دنوں جو پریشانی لاحق ہوگئی تھی وہ اس علی احمد کے باعث پرسکون زندگی میں تبدیل ہوگئی تھی۔ چونکہ مجھے اس پر کافی اعتماد تھا اور اس بات کا بھی یقین تھا کہ میری غیر موجودگی میں بھی کسی گاہک کو کوئی شکایت پیدا نہ ہوگی اس لئے اکثر میں دکان پر دیر سے آتا بلکہ بعض اوقات تو سارا سارا دن دکان سے غائب رہتا لیکن باوجود دکان کا مالک ہونے کے مجھے ڈر لگا رہتا کہ میرے اس طرح غائب رہنے پر کہیں علی احمد خفا نہ ہو جائے۔ میری کوئی بات اسے ناگوار گزرتی تو اکثر و بیشتر وہ مجھ سے ذکر نہ کرتا بلکہ میں خود اس کی حرکات و سکنات اور چہرے کے اتار چڑھاؤ سے پتہ چلا لیتا کہ آج وہ مجھ سے خوش نہیں ہے۔

والد کے انتقال کے چند ماہ بعد مجھے جوئے کی عادت پڑ گئی تھی اور میں کئی کئی دن اور کئی کئی راتیں مسلسل جوا کھیلتے گزار دیتا تھا۔ ہماری بیٹھک نظام الدین کے گھر پر ہوتی تھی اور میں بڑا مطمئن تھا کہ اس کا شاید کسی کو پتہ بھی نہ ہوگا لیکن ایک دن شام کے وقت علی احمد نظام الدین کے گھر پہنچا اور نظام کے چھوٹے بھائی کے ذریعہ مجھے باہر بلوایا۔ میں چہرہ لٹکائے باہر چلا آیا اور دل ہی دل میں کھول رہا تھا کہ نہ جانے اس کم بخت کو کیسے پتہ چل گیا۔ اس نے ایک لفظ کہے بغیر مجھے بازو سے پکڑ کر رکشہ پر لدا دیا۔ اور ہم سیدھے دکان پر پہنچ گئے۔ دکان کے سامنے فٹ پاتھ پر رکشا سے اترتے ہوئے اس نے آہستہ سے میرے کان میں کہا "اقبال میاں! آئندہ ایسی حرکتیں نہ ہوں تو بہتر ہے۔" وہ دن اور آج کا دن میں نے جوا تو جوا تاش کے پتوں کا گھروندا تک نہیں بنایا۔

دکان پر وہ بظاہر اپنے کام میں منہمک رہتا لیکن اس کے کان ہمیشہ میری میز کی طرف لگے رہتے جہاں اکثر میرے دوست احباب مجھ سے ملنے جلنے آتے۔ میرے جن دوستوں کو وہ پسندیدہ نظروں سے دیکھتا تھا ان کے ساتھ اس کا برتاؤ بہت اچھا ہوتا اور جن کے بارے میں اس کی رائے اچھی نہ تھی انہیں ہمیشہ علی احمد کے روکھے سوکھے برتاؤ کی شکایت رہتی۔ نظام سے اسے بڑی کد تھی اور کئی دفعہ باتوں باتوں میں اس نے اس کا اظہار بھی کر دیا تھا کہ اس طرح کے برے لوگوں سے ملنا جلنا ٹھیک نہیں ہے۔ نظام کے بڑے بھائی کافی روپیہ پیسہ چھوڑ کر حال ہی میں مرے تھے اور اسی لئے نظام الدین اپنے بے تکلف دوست احباب کے ساتھ خوب گل چھرے اڑا رہا تھا اور ان سب کے بے حد و بے جا اصرار پر کبھی کبھی مجھے بھی ان کے شوق ذوق میں شریک ہونا پڑتا۔ لیکن ہمیشہ مجھے علی احمد کی ترچھی گھورتی ہوئی نگاہیں نظر آتیں اور میں کوشش کرتا کہ میری مصروفیتوں کا علی احمد کو علم نہ ہو۔ اس کو اتفاق سمجھئے یا علی احمد کی جاسوسی کہ اس کو پتہ لگ گیا کہ میں نظام کی محفلوں میں گاہے ماہے شراب بھی پی لیتا ہوں اور بعض وقت ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہوں کئی دن تک وہ منہ لٹکائے بیٹھا رہا اور مجھ سے سیدھے منہ بات تک نہ کی۔ ایک رات جبکہ ہم سب دکان بند کر چکے تھے اور میں گھر جانے کے لئے اپنی موٹر سیکل اسٹارٹ کر رہا تھا، علی احمد جو دکان بند ہونے کے بعد سے فٹ پاتھ پر کھڑا ہوا تھا۔ میرے قریب آیا اور اپنی سفید پتلون کی جیب میں سے ایک لفافہ نکال کر اس نے میرے ہاتھ پر رکھ دیا، اور کہا "اقبال میاں! گھر پہنچ کر پڑھ لینا۔" اس کی اس عجیب سی حرکت سے میرا ماتھا ٹھنکا کہ اس لفافے میں یا تنخواہ میں اضافہ کرنے کا مطالبہ ہوگا یا پھر کوئی ایسی ہی بیہودہ بات ہوگی جس کو کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ لیکن میری طرح شائد آپ کو بھی انتہائی حیرت ہو کہ اس نے اس لفافے میں سیدھی سادی انگریزی

میں میرے نام چٹھی لکھی تھی اور مجھے خدا اور رسول کا واسطہ دے دے کر اور خاندان کی عزت یاد دلا دلا کر یہ التجا کی تھی کہ میں آئندہ سے شراب کو ہاتھ نہ لگاؤں کیونکہ علی احمد کو یہ خطرہ تھا کہ یہ ام الخبائث نہ صرف میرے کاروبار کو تباہ کر دے گی بلکہ میری صحت کو بھی گھن لگا دے گی۔ تحریر کا انداز اتنا ملتجیانہ تھا کہ گویا میرے ماننے یا نہ ماننے پہ چٹھی لکھنے والے کے کسی بہت بڑے ذاتی معاملے کا انحصار ہو۔ جہاں مجھے علی احمد کی سادہ لوحی اور اس چٹھی لکھنے والی حرکت پہ ہنسی آئی وہیں اس کی محبت اور خیر خواہی نے میری آنکھیں نم کر دیں۔ میں نے اسی وقت اپنے گھر کے ملازم سعید کو سیکل دے کر محلہ قدم رسول بھیجا جہاں علی احمد رہتا تھا کہ اس کو بلا لائے۔ اسکے آنے پر میں نے اس سے حتمی وعدہ کیا کہ آئندہ سے ہرگز شراب نہ پیوں گا۔ جاتے ہوئے اس نے حسب عادت چند ایک کلمے کہے "اقبال میاں! تم نے میری لاج رکھ لی!"۔

اس کی خانگی زندگی کے متعلق نہ مجھے کچھ زیادہ معلوم تھا اور نہ میرے دوسرے ملازمین کو۔ وہ انتہائی کم گو آدمی تھا اور اپنے گھر کے متعلق تو وہ بہت کم باتیں کیا کرتا تھا۔ مجھے صرف اتنا علم تھا کہ اس نے کافی بڑی عمر میں ایک نوجوان بیوہ سے شادی کی جس سے علی اکبر پیدا ہوا جس کی عمر اس وقت پندرہ ایک سال ہوگی۔ علی احمد کی ازدواجی زندگی خوشگوار نہ تھی کیونکہ سننے میں آیا تھا کہ اس کی بیوی بڑی تیز مزاج تھی۔ میں نے علی احمد کی زندگی کے متعلق خود ہی کچھ تصور باندھ رکھے تھے کہ وہ، اسکی بیوی اور اس کا اکلوتا بچہ اچھی زندگی گزارتے ہوں گے کیونکہ میں اسے ماہانہ ڈیڑھ سو روپے دیا کرتا تھا۔ جب میرے والد زندہ تھے اور میں چھوٹا تھا اس وقت علی احمد مجھے اپنے گھر لے جایا کرتا تھا لیکن اس وقت وہ اکیلا زندگی بسر کرتا تھا اور اس کے بیوی بچے نہ تھے۔ ایک طویل عرصے سے میں اس کے گھر نہ گیا تھا اور مجھے علم نہ تھا کہ اس کی ازدواجی زندگی کس نہج کی ہے۔

ارادہ تو تھا کہ رات میں دکان بند کر کے میں اور مرزا اس کے گھر جائیں، لیکن پھر اس خیال سے کہ وہ ہماری دکان کا قدیم ترین ملازم اور منیجر تھا میں نے گیارہ بجے ہی دکان بند کر دی اور وہاں سے مرزا کو اپنی موٹر سیکل پر بٹھا کر سید حا مرحوم کے گھر کی طرف چل پڑا۔

اس کا گھر ایک گلی میں تھا جہاں سڑی گلی نالیاں بہتی تھیں اور ہر طرف غلاظت بکھری پڑی تھی۔ گھر کیا تھا دو کمرے تھے۔ ایک بڑا کمرہ جس میں دو پلنگ بچھے ہوئے تھے اور بازو کا چھوٹا کمرہ بہ یک وقت باورچی خانہ، اسٹور روم اور حمام تھا۔ میرے پہنچنے تک تدفین ہو چکی تھی۔ ہمارے پہنچنے پر اس کی بیوی اور بچہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ میں نے اور مرزا نے بڑی تسلی دی اور میں نے وعدہ کیا کہ میری زندگی تک انہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

ہمارے باہر آنے پر علی احمد کے ایک دوست نے مجھ سے اپنے گھر چلنے کی خواہش کی جو بالکل علی احمد کے گھر سے لگا ہوا تھا۔ چھوٹے سے دروازے میں سے ہم مردانہ بیٹھک کے کمرے میں آ گئے۔ دیواریں گیلی گیلی تھیں اور نیچے پورے فرش پر ایک دری بچھی ہوئی تھی اور طاقچوں میں ٹوٹے پھوٹے ایش ٹرے اور گلاس پڑے تھے۔ میں، مرزا اور وہ صاحب وہیں فرش پر بیٹھ گئے۔ علی احمد کی زندگی کی بہت ساری باتیں یاد آتی گئیں اور باتیں ہوتی رہیں۔ ان صاحب نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا: "سچ پوچھئے تو صاحب ایسا یار باش آدمی بھی کم پیدا ہوتا ہے۔ اسی گھر میں، اسی کمرے میں ہماری محفلیں جمتی تھیں۔ آپ کی دکان بند ہونے کے بعد وہ سیدھا گھر آتا، بیوی سے لڑائی کرتا اور پھر یہاں آ جاتا۔ روز جوا چلتا اور ہم سب تین چار بجے رات تک جاگتے رہتے اور جوا کھیلتے رہتے۔ وہ اکثر ہارتا مگر کبھی دنگا نہ کرتا۔ بڑے رکھ رکھاؤ اور سلیقے کا آدمی تھا۔ شہرے کو اس نے کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ ہر رات پیتا، خوب پیتا مگر وہی عمدہ درجے کی وہسکی۔ اتنی پی جاتا کہ چلنے پھرنے کا ہوش نہ رہتا۔ مگر جوں ہی صبح ہوتی شیو بناتا اور اجلے کپڑے پہن کر رومال میں عطر لگا، آپ کی دکان پہ چلا جاتا۔ اس کی اس شب بیداری اور شراب نوشی نے اس کی صحت کو گھن لگا دیا۔ اسے بخار رہنے لگا اور ڈاکٹروں نے کہا کہ اس کا جگر خراب ہو گیا۔ ہائے کمبخت نے آخری وقت تک سوائے شراب کے دوا کو ہاتھ نہ لگایا۔ علاج کے لئے بیوی جو بھی پیسے لاتی وہ لڑ جھگڑ کر چھین لیتا اور شراب پی لیتا۔ آخری وقت میں اس کے ہاتھ پاؤں پر سوجن آ گئی تھی، اٹھنا بیٹھنا مشکل ہو گیا تھا۔ اسی بری حالت میں اس نے ہم سب کا ساتھ چھوڑ دیا!"

ان بزرگ نے جب رقت آمیز آواز میں اپنی بات ختم کی تو میں نے سر اٹھا کر مرزا کی طرف دیکھا۔ وہ پھٹی پھٹی اور متعجب آنکھوں سے ان کا چہرہ تک رہا تھا۔

لکیروں کی زبان

زین العابدین
ترجمہ: الطاف گوہر

ایک دفعہ مجھے خیال آیا کہ وائلین بجانا سیکھوں۔

کسی کہانی میں میں نے پڑھا تھا کہ ایک فن کار دیوار پر اپنی تصویر لٹکا کر اُسے دیکھ دیکھ کر وائلن بجایا کرتا تھا، یہ ترکیب مجھے بہت پسند آئی۔

ایک ٹُوٹا سا وائلین لیا اور کئی دن تک خوب مشق ہوتی رہی۔

پھر کسی نے صلاح دی: "وائلین سے ستار بہتر ہے، آخر اپنے دیس کا ساز ہے۔"

میں نے سوچا، چلو ستار ہی سہی۔

ستار کے تار سے انگلی کٹی۔

اب کے میں نے "اشتہار" شروع کیا۔

جب وہ بھی دیکھا تو ایک دوست نے سمجھایا "زین العابدین کن باتوں میں پڑے ہو، تمہارا کام ہے مصوری، بس وہی کرو۔"

میں نے سوچا ٹھیک ہی کہتا ہے، مصوری ہی میں میری نجات ہے۔ تصویر کی لکیروں اور رنگوں میں جو کچھ میں کہہ سکتا ہوں اور کسی طرح نہ کہہ سکوں گا۔

یورپ سے لوٹ کر آیا تو جو دیکھا تھا دوستوں کو سناتا رہا۔ تنگ آ کر انہوں نے کہا کہ بھائی جو کچھ کہنا ہے ایک بار لکھ کیوں نہ ڈالو، مگر لکھنا تو فن ہی اور ہے۔ میں تحریر کی زبان ہی سے نا آشنا ہوں، تھوڑی بہت زبان جو میں جانتا ہوں وہ تصویر کی زبان ہے، اسی زبان کا ایک واقعہ سُنئے۔

یہ واقعہ اسپین میں ہوا، اسپین کے گلی کوچوں میں گھومنے پھرنے کی جس چیز نے مجھے ہمت دلائی وہ لکیروں کی زبان تھی جس کی مدد سے میں نے انگریزی جاننے والے لوگوں سے راہ و رسم پیدا کی، اور کھانے پینے، چلنے پھرنے کا ایک انوکھا طریقہ نکالا۔ اسپین کا سارا قصہ کہنا ممکن نہیں۔ طالب علمی ہی کے زمانے سے مجھے اسپین جانے کا شوق تھا، الحمراء اور قرطبہ کی مسجد، کمالِ فن کے وہ نمونے دیکھنے کی مجھے بڑی خواہش تھی۔ لندن پہنچ کر میں نے جاننے والوں سے اسپین کے بارے میں جو معلومات حاصل کیں ان سے آتشِ شوق اور بھڑکی، پیرس پہنچ کر اتنا کچھ سُنا کہ سارا اسپین آنکھوں کے سامنے سے گزر گیا، بس ایک جانا باقی تھا۔ دوستوں نے ہدایات دینے اور پتے بتلانے میں کسر نہ کی، کون سی گیلری کہاں ہے، کون سا عجائب خانہ؟ تصاویر کس طرح کی ہیں؟ اسپین کا انگور سبحان اللہ! تربوز ایسا میٹھا کہ کیا کہنے، جنگلی بھینسوں کا مقابلہ ضرور دیکھنا اور ہسپانوی حسیناؤں کا رقص تو خیر دیکھو گے ہی، وغیرہ وغیرہ۔

پانچ چھ مہینے پیرس میں رہنے کے بعد اسپین کا سفر طے ہوا، اسپین میں جہاں جہاں مجھے جانا تھا، سب کا انتظام ایک ایجنسی کے ذریعے کر لیا۔ کئی دن کی بھاگ دوڑ

کے بعد ریل کا پاس بھی مل گیا۔ "پاس" پر لگانے کے لئے فوٹو درکار تھا۔ "پاس" کیا پورا پاسپورٹ تھا۔ "پاس" کی کتاب ... ہزار کلو میٹر کے سفر کے لئے راستے کے مختلف اسٹیشنوں کے نمبروں سے بھری پڑی تھی، جہاں آپ کو جانا ہو ریل کا افسر پاس پر سے وہ نمبر کاٹ کر آپ کو ایک ٹکٹ دیدے گا، اپنا پاس تھا تھرڈ کلاس کا جس پر قریب قریب ایک سو روپیہ خرچ آیا تھا مگر خیر اس نقشے کو جانے دیجئے۔

یہ سب کچھ ہو چکا تو اطمینان کا سانس لیا۔ مگر ایک خیال آتے ہی جیسے دم سا رک گیا، بات چیت کروں گا کس زبان میں؟ چپ رہوں گا تو آخر کب تک، سنا تھا اسپین میں انگریزی جاننے والے خال خال ہیں، فرانسیسی جاننے والے بہت ہیں مگر ایں جانب والنٹ بیبنج بیبنج کر جس قسم کی فرانسیسی بولتے تھے۔ اس سے کام چلانا ممکن نظر نہ آتا تھا، پیرس میں تو غیر لفظوں سے نہ سہی ہاتھوں کے پرزور اشاروں سے بات بن جاتی تھی مگر اسپین میں تو پہلے کسی ایسے آدمی کو ڈھونڈنا ہو گا جو فرانسیسی جانتا ہو۔

اللہ کا نام لیا اور روانہ ہو گیا، ایک تو گرمی، اس پر بھیڑ، آخری جنگ کے زمانہ میں کلکتے سے گھر آتے ہوئے ریل گاڑی میں جو بھیڑ دیکھا کرتا تھا وہ بھول گیا۔ گاڑی کے برآمدے تک میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی، اس پر بھی لوگ تھے کہ دھڑا دھڑ گھسے چلے آرہے تھے، میں نے سوچا ہجوم میں گھر گیا تو خیریت نہیں ایک کونے میں دبک گیا۔ بیٹھا رہا کہ کھڑا یہ یاد نہیں، ہر لحظہ یہ گمان ہوتا تھا کہ ابھی اب پیٹ ہو جائے گی۔ سروں میں بکسوں اور سوٹ کیسوں کے کونے چبھ رہے تھے اگر کیا مجال کہ آہ تک سنائی دی ہو، میں حیران تھا، جی چاہتا تھا تھوڑی سی کٹ جائے تو اچھا ہے ___ کچھ تو ہو، جو لوگ گاڑی میں گھسے چلے آرہے تھے ان کی طرف گھور گھور کر آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا "خدا کے لئے مت آؤ، جگہ نہیں ہے، اور گاڑی دیکھو ___" مگر منہ سے ایک لفظ نہ نکلا، دل ہی دل میں کڑھتا رہا۔ تھک ہار کر اپنے آپ کو سمجھایا کہ میں نے آخر کوئی گاڑی بھر کا ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا، بعض ایسے بھی تھے جو نچلے درجے میں جگہ نہ پا کر کھسکتے کھسکتے اوپر والے ڈبوں کی طرف بڑھے جارہے تھے، مجھے خیال آیا کہ یہ بھی کچھ ہم لوگوں سے کم استاد نہیں ہیں، یہ سوچ رہا تھا کہ ٹکٹ چیکر نازل ہوا اور میرے ٹکٹ پر دستخط کرنے کے بعد اشارے سے مجھے اپنے ساتھ اوپر والے درجے میں چلنے کو کہا، کچھ سمجھ میں نہ آیا، میں خاموش کھڑا رہا، تھوڑی دیر کے بعد چیکر پھر آیا، اور لگا اپنی تیز کلامی سے رعب جمانے، میں حیران تھا کہ نہ جانے کیا ماجرا ہے، اتنے میں اس نے میرا بکس اٹھایا اور گاڑی کے برآمدے کی طرف بڑھا، اتنی گرمی اور اس قدر بھیڑ، اس پر یہ ایک نیا عذاب آیا، شک ہوا شاید ٹکٹ غلط ہو، بیوقوفوں کی طرح چیکر کے پیچھے پیچھے چلنے لگا، فرانسیسی کے جو دو چار لفظ آتے تھے ان میں سے کوئی بھی صورتِ حال کے اظہار کے لئے موزوں نہ تھا، مجبوراً کہنا شروع کیا "ایکسکیوزے موا، سلو ویلے، ٹوسیے، موسیے" چیکر نے اشاروں میں بڑا تسلی دی کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں مگر یقین نہ آیا۔

نیا شہر، چھوٹا سا گائیڈ بک نکالی، سوچا پہلے محل اور قلعہ دیکھوں گا، کتاب کھولی تو ایک کم خرچ اور بہتر آسائش رہائش گاہ کے پتہ پر نظر پڑی، جہاں میں ٹھیرا ہوا تھا وہ جگہ کچھ ایسی اچھی نہ تھی، میں نے کہا قلعہ دیکھنے سے پہلے کیوں نہ قیام گاہ بدل دوں، مگر سوال یہ تھا کہ کس سے کہوں، کیسے پوچھوں، کسی راہ گیر سے پوچھ کر بیوقوف

بننے کی مجھ میں ہمت نہ تھی، سوچا کسی پولس والے سے پوچھوں گا، لندن میں پولس والا سب کا دوست اور راہبر ہوتا ہے، پیرس میں معاملہ اس کے بالکل برعکس، ذرا سی بات پوچھئے اس قدر تفصیل سے جواب دیتا ہے کہ سنتے سنتے سر چکرا جائے، اب یہ فکر ہوئی کہ معقول صورت کا پولیس والا نظر آئے تو اس سے پوچھوں، تصویر کشی میں انسانی چہرے کے متعلق میں نے جتنا علم حاصل کیا تھا سب صرف کر ڈالا اور ایک نیک پولیس مین کے پاس پہنچا، بہتر سے بہتر ڈھیلے ڈھالے انداز سے آواز میں جس قدر شائستگی ہو سکتی تھی پیدا کی اور انتہائی فرانسیسی لہجہ میں بولا "ایکسکیوزے موا، کیا آپ فرانسیسی جانتے ہیں؟" آواز حلق سے زیادہ ناک سے نکلی، پولیس مین مرعوب ہو کر

میری طرف دیکھنے لگا، اس نے سوچا کہ شاید اس کا واسطہ فرانسیسی زبان کے کسی عالم سے پڑا ہے، بغیر دم لئے ایک جوابی تقریر کرنے لگا، ایک لفظ سمجھ میں نہ آیا، تب میں نے پینترا بدل کر پوچھا "کیا آپ انگریزی جانتے ہیں" اسکے چہرے پر اداسی چھا گئی اور بڑے مغموم طریقے پر سر ہلا کر اس نے کہا "نہیں" اس کے بعد اس نے ہاتھ ہلا ہلا کر طرح طرح کے اشاروں سے میری مدد فرمانی چاہی مگر میں نے کچھ سمجھنے کی کوشش کئے بغیر شکریہ ادا کیا اور کان لپیٹ کر راہگیروں کے ہجوم میں ایک طرف چل دیا۔

مجھے خیال آیا کہ کلکتہ میں ملک ملک کے سیاح کالی گھاٹ کے گیندے کی مالا پہنے ماتھے پر ٹیکا لگا کر آرٹ اسکول کے سامنے جادو گھر دیکھنے آیا کرتے تھے اور ہم لوگ ان کی ہیئت کو دیکھ دیکھ کر ہنسا کرتے تھے مجھے یوں لگا جیسے لوگ اسی طرح مجھ پر ہنس رہے ہوں۔ سخت پشیمان ہوا کہ کیوں نہ فرانسیسی زبان سیکھ لی۔ سیکھ لیتا تو آج یہ حالت نہ ہوتی مگر فرانس کے باہر بھی کچھ تو وہ زبان کام آتی،

اب نہ جانے کہاں کہاں مارے مارے پھرنا پڑے تصویروں کی گیلری میں البتہ چند لمحوں کے لئے زبان کی الجھن میرے دل سے محو ہو جاتی مگر جونہی گیلری سے نکلتا اسی مسئلے کا سامنا ہوتا۔ ابھی تک معاملہ صرف راستہ پوچھنے تک ہی محدود تھا، کھانے کے لئے ریستوراں میں کیا ہوگا؟ یہ خیال آتے ہی دم نکل گیا۔

ایک طریقہ ڈھونڈ نکالا۔ دور سے پہلے ریستوراں کا انداز اور وہاں کے لوگوں کا مزاج بھانپ لیتا اور جب ریستوراں منتخب کر لیتا تو پھر بھی حتی الامکان ریستوراں کے اندر نہ جاتا باہر برآمدے ہی میں جہاں لوگ کم ہوتے کسی خالی میز کے قریب رک جاتا اور پھر چپکے سے وہاں بیٹھ رہتا۔ ہوٹل کے اندر جاتا تو لوگ میرے بادامی رنگ اور ہاتھ کے اشاروں سے مدعائے دل بیان کرنے کے طریقے پر حیران ہوتے۔ ایک دن ایسے ہی ایک ہوٹل کے برآمدے میں ایک میز خالی دیکھ کر بیٹھ گیا، کوئی ویٹر نظر نہ آتا تھا اور کسی کو بلانے کی مجھے تاب نہ تھی۔ اتنے میں دیکھا کہ سامنے کی میز پر ایک صاحب بھنی ہوئی مچھلی سے محظوظ ہو رہے ہیں۔ اب مجھ سے کسی طرح نہ رہا گیا، دھن کی یاد نے اور بھی تڑپایا۔ سوچا ویٹر کے آتے ہی اسے سامنے کی طرف اشارہ کر کے سمجھا دوں گا کہ وہی لے آؤ۔ وہی تو بس کو آنکھیں ترس گئی تھیں۔ مگر ویٹر تھا کہ آنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ وہ صاحب کھا پی، میرے سامنے سے چلے گئے اور مچھلی کی خالی پلیٹ میرا منہ چڑاتی رہی، ایک ویٹر آیا بھی تو خالی برتن اٹھا کر میری طرف توجہ کئے بغیر غائب ہو گیا۔ دس پندرہ منٹ اور گذر گئے تو ایک ویٹر آیا اور میرے سامنے آکر کچھ انداز سے ٹھیر گیا جیسے کہہ رہا ہو "جلدی کہو، کیا چاہتے ہو، اندر بھی بہت سے لوگ ہیں"۔ میں نے ہاتھ اور انگلیوں کے اشاروں سے نجانے کتنی مچھلیاں بنا بنا کر اسے سمجھانا چاہا اور جب اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا تو سامنے والی میز کی طرف ہاتھ کر کے چلایا "موسیو، وہی، وہی"۔

ویٹر میرا منہ دیکھنے لگا، کچھ بولا بھی مگر میری سمجھ میں خاک نہ آیا۔ میری جانفشانی کے باوجود بھی جب یہ مشکل حل ہوتی نظر نہ آئی تو میں نے سوچا دفع بھی کرو مگر ویٹر کہاں چھوڑنے والا تھا، اسے شاید خیال ہوا کہ اگر مجھے کھانے کو نہ ملا تو میرا دل ٹوٹ جائیگا۔

اس نے اشارہ سے مجھے ساتھ چلنے کو کہا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا کہ یہ سب مصیبت چنگڑی کی چاٹ کی وجہ سے نازل ہوئی، بچپن میں جب بہن کے گھر جاتے تو اماں خوب سمجھا بجھا کے بھیجتیں کہ وہاں جا کر انڈا نہ مانگنا، کیلا نہ کھانا مگر یہ نہ بتایا تھا کہ پیرس جا کر چنگڑی نہ مانگ بیٹھنا، مجبوراً چلا ویٹر کے پیچھے پیچھے، وہ مجھے لوگوں کے بیچ میں سے نکالتا ہوا باورچی خانہ میں لے گیا۔

باورچی خانہ دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں، صاف ستھرا اور کشادہ، عورتیں کام کر رہی تھیں، ویٹر ان سے کچھ کہہ رہا تھا اور میں مجرموں کی طرح اس کے پیچھے کھڑا تھا، ویٹر کی بات سن کر عورتیں ہنسنے لگیں، پھر بڑی باقاعدگی سے انہوں نے ایک ایک کر کے مجھے مختلف چیزیں دکھانا شروع کیں اور میں بھی نہایت آرام سے نہیں نہیں کہتا گیا۔

وہ پریشان ہو گئے اور ان کی پریشانی دیکھ کر مجھے سخت شرم آئی، میں نے کئی دفعہ جانا چاہا، مگر وہ جانے بھی تو نہ دیتے تھے جیسے فیصلہ کر چکے ہوں کہ میرے دل کی بات مان کر چھوڑیں گے۔

اتنے میں چنگڑی مچھلی نظر آئی تو میں خوشی کے مارے بے اختیار چلا اٹھا، انہیں کسی قدر حیرت ہوئی مگر پھر وہ بھی خوب ہنسے کہ اتنی سی بات کے لئے اتنا ہنگامہ ہوا، انہیں کیا معلوم کہ اس اتنی سی چیز میں میرے لئے کتنی مسرتیں تھیں۔

سر جھکا کر میں نے ان سب کا شکریہ ادا کیا۔

ویٹر کے ساتھ اپنی میز پر پہنچ کر مجھے یوں لگا جیسے ریسٹورانٹ کے سب

لوگ مجھ پر ہنس رہے ہوں اور شاید کئی دن تک ایک بادامی رنگ کے آدمی کا یہ قصّہ سنا کر ہنستے رہیں گے۔

بیٹھے بیٹھے مجھے خیال آیا کہ باورچی خانے میں عورتیں بھی دل کھول کر ہنس رہی ہوں گی۔ اتنے میں ویٹر پلیٹ میں جھنگر مچھلی کا بھاجا لیکر آیا اور مجھے یوں لگا جیسے جھنگڑی مچھلی بھی ہنس رہی ہو۔

کھاتا جا رہا تھا مگر دل کو یہ خیال ستا رہا تھا کہ رات کے کھانے کا کیا ہوگا؟ اتنے میں ایک ایسی بات ذہن میں آئی جیسے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

میں نے فیصلہ کیا کہ رات کا کھانا بھی اسی ہوٹل میں کھاؤں گا اور لوگوں کے بیچ میں بیٹھ کر۔

رات کے وقت میں جا کر بیٹھا ہی تھا کہ ویٹر میرے پاس آیا۔ دبی دبی ہنسی اس کے ہونٹوں پر پھیل رہی تھی۔

اس کے آتے ہی میں نے اُسے پنسل دکھائی اور پھر میز پر سے اپنا سکیچ پیڈ اٹھایا۔

سادے کاغذ پر ایک طرف میں نے ابلتا ہوا دوسری طرف بھوننے کی تصویر بنائی۔ اور پھر ایک بڑی سی گائے کی تصویر بنا دی۔ ویٹر کی آسانی کے لئے میں نے گائے کی پچھلی ٹانگ کی ران کو تیر کے نشان سے اس تصویر سے ملایا جو چیزوں کو واپس لینے کے لئے بنائی تھی۔ طالب علمی کے زمانے میں میں نے گائے کی بڑی تصویریں بنائی تھیں، کھیتوں میں بھاگتی ہوئی۔ گھر میں بندھی ہوئی۔ کھلیان سے ڈوری چھڑا کر بھاگتی ہوئی۔ مگر ویٹر کے لئے جو گائے میں نے بنائی۔ اس کی بات ہی کچھ اور تھی۔

اس کے بعد ایک ایک کر کے انڈا، مرغی، کوابھی اور جس چیز کی بھی ضرورت تھی۔ اس کی تصویر بناتا گیا۔ میں نے سر اٹھا کر ویٹر کی طرف نہ دیکھا۔ مگر چاروں طرف طرح طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔ لوگ کرسیاں کھینچ کھینچ کر میرے قریب آ رہے تھے، تھوڑی ہی دیر میں میرے گرد جمگھٹا سا لگ گیا۔ سب حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

میں نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور کہا "پاکستان"۔ اتنے میں ہجوم میں کسی نے صاف انگریزی میں کہا "معاف کیجئے۔ کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟" یہ کہہ کر انہوں نے سب لوگوں سے میرا تعارف کرایا اور بڑی شفقت سے مسکراتے رہے۔

کچھ دیر کے بعد ویٹر میرا کھانا لے آیا۔ کھانا منگوانے کے لئے جو تصویریں میں نے بنائی تھیں، وہ لوگ ادھر اُدھر لئے پھر رہے تھے۔

جن صاحب نے ان مردوں سے میرا تعارف کرایا تھا انہوں نے مجھے

(باقی صفحہ ۱۲۹ پر)

قدم بہ قدم
صحت و شادمانی کی طرف
نونہال
اچھی صحت اور اچھی قسمت کی بنیاد بچپن ہی میں رکھی جاتی ہے
اپنے بچے کو غذا کی کمی اور موسمی علالتوں کا شکار نہ ہونے دیجئے۔
بچوں کی صحت کا محافظ
نونہال
ہمدرد

پایاب گھاٹ (مشرقی پاکستان)

عمل: زین العابدین

غزل

جگر مراد آبادی

غنچۂ و گل نہیں، کہ خار نہیں
کیا نہیں ہے مگر بہار نہیں

اب کوئی تیر دل کے پار نہیں
اب مجھے زندگی سے پیار نہیں

اب غمِ عشق نغمہ بار نہیں
اب کوئی شعر شاہکار نہیں

اب کوئی روح کی پکار نہیں
اب کسی کا بھی انتظار نہیں

اب کوئی غم نہیں طرب افزا
اب کوئی درد خوشگوار نہیں

اب تری یاد بھی گریزاں ہے
اب تصور بھی ہم کنار نہیں

دلبری شیوۂ بتاں نہ رہی
عاشقی حشر در کنار نہیں

نگہِ التفات، ایک طرف
کوئی ظالم ستم شعار نہیں

زخم سینے پہ آج بھی ہیں مگر
ناخنِ عشق تازہ کار نہیں

•

عقل، اک تجربہ ہے پیار نہیں
عشق جب تک بروئے کار نہیں

ہیں تو دیوانہ بہار بہت
کوئی دیوانۂ بہار نہیں

زندگی ہے تمام فکر و عمل
زندگی وقت کا شمار نہیں

حسن رہتا نہ اس قدر دلکش
خیر گذری کہ پائدار نہیں

دل کی کلیاں نہ جس سے کھل جائیں
اور کچھ ہو تو ہو بہار نہیں

عشق اپنا پیام خود ہے جگر
عشق مرہونِ اشتہار نہیں

غزل

فراق گورکھپوری

دل وہ گھر، خیر سے شر دست و گریباں ہے یہاں
تو بنو عالمِ ایجاد کا امکاں ہے یہاں

بے جنوں ہاتھ نہ آیا سرِ دامن تیرا
آج معلوم ہوا میرا گریباں ہے یہاں

خاص انداز سے شامل ہے نظر باتوں میں
لے اُڑے گا وہ فسونِ لبِ جاناں ہے یہاں

درد یوں دل میں پکارا ترے بیماروں کے
ڈھونڈتے کیا ہو ہر اک درد کا درماں ہے یہاں

رہ گیا رنگِ پریدہ کا فسانہ باقی
ہم یہی سوچ رہے تھے کہ گلستاں ہے یہاں

دِل نے کس عالمِ ہو میں مجھے لا کر چھوڑا
کوئی زنداں نہ گلستاں نہ بیاباں ہے یہاں

دم بخود ہے لبِ اعجاز مرے بالیں پر
نگہِ ناز نوازش پہ پشیماں ہے یہاں

کبھی فرصت ہو تو کر سیرِ دیارِ دل بھی
عشق ہی عشق ہے اب، کفر نہ ایماں ہے یہاں

میں نے ہر روز کو اک دورِ جدائی پایا
کوئی بھی رات ہو اے دل شبِ ہجراں ہے یہاں

دیکھنا جلوۂ رخ کا ترے مشکل نکلا
آنکھ صاحب نظراں کی بھی تو حیراں ہے یہاں

سر بسر ایک سا ہے عالم تری زیبائی کا
ہر بنِ مو سے عیاں شوخیِ مژگاں ہے یہاں

دیکھ لی آج سرِ بزم تری گردشِ چشم
جس کو کہتا ہے جہاں گردشِ دوراں ہے یہاں

پیچ در پیچ ہیں باتیں ترے سودائی کی
خم بہ خم زلفِ مسلسل بھی پریشاں ہے یہاں

کیوں کہو صرف عناصر سے بنا ہے عالم
دل کو بھی دیکھ چلو عالمِ امکاں ہے یہاں

خود ہی جلتے ہیں تو کیوں شمع کو پگھلائیں فراق
دل کے داغوں ہی سے اک طرفہ چراغاں ہے یہاں

غزل

حفیظ ہوشیارپوری

کہاں کا عشق کہ اب رسم و راہ بھی تو نہیں — جو روز تھی وہ نظر گاہ گاہ بھی تو نہیں
کہاں کی جنبشِ لب، اتنی احتیاط ہے اب — کہ ترجمانِ محبّت نگاہ بھی تو نہیں
عذابِ جاں ہی سہی عشق لیکن اسکے بغیر — غمِ زمانہ سے کوئی پناہ بھی تو نہیں
وہ ایک راہ جو چھوٹی تو پھر کہاں جائیں — نظر کے سامنے اب کوئی راہ بھی تو نہیں
اگر ہے جرم محبت میں سانس لینا بھی — تو دیکھ لو کہ مرے لب پہ آہ بھی تو نہیں
تمیزِ روز و شب و صبح و شام ہجر میں کیا — نظر میں انجم و خورشید و ماہ بھی تو نہیں
گر ابتدائے محبت ہی بس کی بات نہ تھی — تو اہلِ عشق پہ لازم نباہ بھی تو نہیں
قصور وار وہ بدلی ہوئی نگاہ سہی — خود اپنے دل میں وہ پہلی سی چاہ بھی تو نہیں
وفا کا ذکر کریں تو کسے یقیں آئے — ترے سوا کوئی اس کا گواہ بھی تو نہیں
بہر قدم کوئی جیسے پکارتا ہے مجھے — یہ راہ ترکِ محبّت کی راہ بھی تو نہیں
ہزار شکوہ ہے بیدادِ رائیگاں ہی نہیں — کہ اس کے بعد کوئی دادخواہ بھی تو نہیں

حفیظ ترکِ طلب کس قدر مکمّل ہے
اب اُن سے مل کے پریشاں نگاہ بھی تو نہیں

غزل

سراج الدین ظفر

پھر زاویے نئے سرِ میخانہ کھینچیے
تحریرِ بحث پر خطِ پیمانہ کھینچیے

دینا ہے آج معرکۂ شب کو اور طول
شاہد کو زلف سے سرِ میخانہ کھینچیے

گردش میں آسماں ہے مناسب ہے اپنے گرد
شب کو حصارِ شاہد و پیمانہ کھینچیے

اس زلف کی ہو بات تو تشریح کیلئے
روحِ ہمہ حقیقت و افسانہ کھینچیے

پھر لے اڑا ہے شوق سوئے راہِ ناصواب
اب کیا عنانِ مرکبِ شاہانہ کھینچیے

دل میں خیالِ زہد اٹھائے جو سر کبھی
اس پر کمانِ ابروئے جانانہ کھینچیے

ملتی نہ ہو وظائفِ رندانہ کو جو اوٹ
آگے قناتِ سبزۂ بیگانہ کھینچیے

جی چاہتا ہے شب کو کسی شمع رو کے ساتھ
تصویرِ بیقراریِ پروانہ کھینچیے

گرتے ہیں ماہ رو شررِ خستہ کی طرح
آغوش میں اگر انہیں رندانہ کھینچیے

آرامِ جاں ہے ذکرِ غزالاں اسی طرف
دامانِ ہر روائت و افسانہ کھینچیے

یہ شہر بھی ہے سلطنتِ دختِ برہمن
دل تک نشانِ سرحدِ بت خانہ کھینچیے

جس طرح بندِ غنچہ سے آویزشِ نسیم
اس طرح پردۂ رخِ جانانہ کھینچیے

یہ چیز بھی ہے درخورِ تحقیق و تجزیہ
گوشے سے اس قبا کو حکیمانہ کھینچیے

ہاں کچھ تو خیر مقدمِ خوبانِ رہگزار
اک آہِ سرد ہی پئے نذرانہ کھینچیے

ملتی نہ ہو شعور و خبر سے اگر نجات
زنجیرِ قصرِ بانوئے میخانہ کھینچیے

شامل نہ ہو جو شاہدِ میخانہ کی نظر
ہاتھ اپنا ظرفِ بادہ سے شاہانہ کھینچیے

دنبالہ ہائے چشمِ غزالاں ہیں مقتضی
اک خطِ رقص تا درِ میخانہ کھینچیے

پھر ذکر کیجئے مژہ ہائے دراز کا
شمشیر پھر پئے دلِ دیوانہ کھینچیے

خاکِ حرم ملے جو ذرا سی تو اس سے آج
قشقہ بیادِ دخترِ بت خانہ کھینچیے

اس انجمن میں ہم سے بنے اور کیا ظفر
اس کے سوا کہ نعرۂ مستانہ کھینچیے

غزل

شان الحق حقی

بڑے دوستی میں خسارے ہیں یارو
مگر کیا کریں دل کے ہارے ہیں یارو

مہ و نغمہ ہے ماہ پارے ہیں یارو
قیامت کے سامان سارے ہیں یارو

جو اُترے چلے آرہے ہیں زمیں پر
یہ کس آسماں کے ستارے ہیں یارو

کہاں تک یہ اپنے پرائے کا قصہ
سبھی غم ہمارے تمہارے ہیں یارو

جہاں کی تہاں پھر رہی ہیں نگاہیں
جہاں کے جہاں چھان مارے ہیں یارو

نگر سے نگر تک زمینوں کے سر پر
یہی چاند سورج ستارے ہیں یارو

نگاہوں پہ دل کو بھروسا تھا کیا کیا
عجب قول ہستی سے ہارے ہیں یارو

کہاں چھوٹ سکتے ہیں غم زندگی کے
یہ غم زندگی سے بھی پیارے ہیں یارو

میسر کسے دل کے تاروں کو چھونا
بہت نغمہ گر اس میں ہارے ہیں یارو

غزل

یوسف ظفر

ترے نقوش مرے رخ پہ یوں ابھر آئے
کہ جیسے تو مجھے افسردہ دیکھ کر آئے

مرا وجود ہی منزل نہ ہو تری اے دوست!
پلٹ کے راہ سے کیوں میرے ہمسفر آئے

ہنسے ہیں تیرے لئے تیرے ہجر کے مارے
کہ کچھ تو کہنے کو ہو اب جو آنکھ بھر آئے

روش روش ہیں گلوں کی طرح نقوشِ قدم
وہ لوگ کون تھے جو ہم سے پیشتر آئے

تری وفا کے لئے جان ہے عزیز کسے؟
ہم آج مرتے ہیں گر کچھ ہمیں نظر آئے

نثارِ عمرِ شکستہ دلی و محرومی!
جو مسکرا کے گئے تھے بچشمِ تر آئے

ترے خیال پہ الزام تو نہیں لیکن
کئی خیال مرے دل میں رات بھر آئے

تجھے نہ دیکھ کے وہ دل میں کیا نہیں کہتے
فریبِ زیست میں جو تجھ کو دیکھ کر آئے

دل و نظر کو چھپاتا ہوں اہلِ فن سے ظفر
جو میری بات کو سمجھے وہ نکتہ ور آئے

غزل

قتیلؔ شفائی

آئینہ دارِ جمالِ سحر آثار بنے
ہم تجھے دیکھ کے خود مطلعِ انوار بنے

تو وہ جھونکا ہے کہ پھولوں کی مہک ہے جس میں
تو گزر جائے جدھر سے وہیں گلزار بنے

کچھ اُداسی بھی تو لازم ہے ترے لب کیلئے
یہ کلی کھل کے نہ مرجھائے تو تلوار بنے

آبلہ پا ہوں مگر ہائے ری ثابت قدمی!
کوئی منزل ہی مری راہ میں دیوار بنے

مجھ سے کترا کے ترا حسن ہے پھیکا پھیکا
تو مرے ہاتھ جو آ جائے تو شہکار بنے

کفر و ایماں کی کوئی بات نہیں ہے اس میں
راس دنیا نہ جنہیں آئی وہ دیندار بنے

یہ بھی اک طرفہ کرامت ہے اے ملاحو!
تم کنارا جسے کہہ دو وہی منجدھار بنے

جن کو پینے کا سلیقہ ہے وہ پیاسے ہیں قتیلؔ
جتنے کم ظرف تھے اس دور میں میخوار بنے

غزل

صفیہ شمیم

حُسن ہر چند بے پناہ بھی ہے
کچھ مگر شوخیٔ نگاہ بھی ہے

اے صبا رہگزارِ جاناں میں
کچھ نشانِ دلِ تباہ بھی ہے؟

کون مُنکر ہے حُسنِ دلکش کا
اپنی اپنی مگر نگاہ بھی ہے

لاکھ غم دل شکن سہی لیکن
غم ہی سے دل کو رسم و راہ بھی ہے

دیکھ، دُنیا بسانے والے، دیکھ
ایک میرا دلِ تباہ بھی ہے

حُسن یکتا ترا سہی، لیکن
شاملِ حُسن کچھ نگاہ بھی ہے

جلوۂ حُسن ڈھونڈنے والو!
اعتبارِ دل و نگاہ بھی ہے

دل گریزاں بھی غم سے رہتا ہے
دل ہی اے عشق غم پناہ بھی ہے

صہبائے پاک

"سُر سسّی" کی ایک جھلک

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ
مترجمہ: شہاب رفعت

جگ کو کیوں دُکھ اپنا بتائیں؟
پر کیونکر اس دُکھ کو چھپائیں؟
دل میں درد کی ٹیس اُٹھی ہے
لاچاری سی لاچاری ہے!
عشق کے اپنے میخانے سے
میں نے بس دو گھونٹ لیے تھے
لیکن ہیں بیچ بیچ کے شعلے
بہتر عشق کے انگاروں سے
میں تھی میٹھی نیند میں کھوئی
دل میں پریم کی بیل اُگی تھی
ڈالے ہیں کیا کیا گل بیتاں
کونپل کونپل کلیاں کلیاں
ان دُکھ، غم دکھ جانتی تھی میں
لیکن اب وہ طور نہیں ہیں
ایسا درد نے آن لیا ہے
تڑپن، کلپن حد سے سوا ہے
جتنا لوٹوں درد کے مارے
کوئی دارو راس نہ آئے
میں نے نہ کی تھی پریت اس مارے
چاہ کو کر دے دل سے کنارے
آج مرے ہر دسے پر برسی
پریم کی اک برکھا مستانی
اے ساجن! من موہن آجا
دھیان سے کر اس جیو کی رکشا

تھی بلوچوں میں کوئی بات بھلی
جبھی نیند میں ان کی یاد آئی
مرا غم ہے ویسے ہی تازہ
مرا تکیہ آنسوؤں سے بھیگا
ہاں ہاں مرے ہاتھوں پر اب بھی
ہے جاری اک اشکوں کی جھڑی
آ ساجن! مجھ کو یاد میں لا
اے سکھیو! ناش ہے جیو مرا
آنکھوں کو پل بھر خواب نہیں
پھر بھی وہ یونہی بے آب نہیں
افسردہ ہیں پر بے تاب ان میں
ہیں ساجن تیرے خواب ان میں
پچھم سے چلی آندھی
وہ زور وہ زور اس کی
یاں بر میں نہیں کملی
سر پر نہیں چادر بھی
جاڑے نے زور دکھائے
اب جان ہی لے کر جائے
کیا اس کو جھیلیں گے
ہیں جن کے کھلے ڈیرے
اک چھوٹی سی کٹیا
اک مکڑی کا جالا
ٹھٹھرا کر رہ جائے
جب باد کا جھکڑ آئے

کہے زلیخا

مولوی غلام رسول
مترجمہ شہاب رفعت

مولوی غلام رسول کی "یوسف زلیخا" پنجابی کی بہترین منظومات میں شمار ہوتی ہے۔ ذیل میں اسکے ایک حصہ کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس شاہکار کے علاوہ مولوی صاحب اپنی متعدد نظموں کے لئے مشہور ہیں۔ جن سے بے اختیار ٹینی سن کی "اِن میموریم" یاد آتی ہے۔ ——— مدیر

"آج ہے کیسا حال زلیخا؟" یوسف نے فرمایا — کہے زلیخا جو کر بظاہر یوسف تو نے پایا
یوسف پوچھے کہو زلیخا، کیونکر وقت گھلایا — کہے زلیخا جیسے جیسے میں نے تجھے بتایا
یوسف پوچھے کہو زلیخا کہاں گیا وہ جوبن — کہے زلیخا عشق میں تیرے کر دیا قرباں تن من
یوسف پوچھے کہو زلیخا۔ کہاں گئیں وہ زلفیں — کہے زلیخا درد سے تیرے بکھر کے گریں گلیوں میں
یوسف پوچھے کہو زلیخا اور وہ لڑی دانتوں کی؟ — کہے زلیخا تیری ہی مالا جپتے گھس کر ٹوٹی
یوسف پوچھے کہو زلیخا اور وہ قاتل آنکھیں — کہے زلیخا بہ گئیں ہو کر خون تری فرقت میں
یوسف پوچھے کہو زلیخا کھوئے کہاں وہ ناز — کہے زلیخا بچھڑے جب سے بھولے سب انداز
یوسف پوچھے کہو زلیخا، کیوں بھوریں وہ گھاتیں؟ — کہے زلیخا عشق میں دل کو ہو گئیں سو سو باتیں
یوسف پوچھے کہو زلیخا اور وہ شان تمہاری — کہے زلیخا چار ہی دن وہ رہ کر دور سدھاری
یوسف پوچھے کہو زلیخا ہوش سدھائے کیونکر؟ — کہے زلیخا کتنے پتھر آن کے ٹوٹے ان پر
یوسف پوچھے کہو زلیخا کیوں نہیں نور جبیں پر؟ — کہے زلیخا چاند نہ چمکا صبح ہوئی جب سر پر
یوسف پوچھے کہو زلیخا، نین ترے کیوں دکھیں؟ — کہے زلیخا میرے رخ سے گرد دکھوں کی چھوئیں
یوسف پوچھے کیسے زلیخا کھوئے مال خزانے؟ — کہے زلیخا نام پہ تیرے لوٹ لیا دنیا نے
یوسف پوچھے اجڑی زلیخا کیونکر عمارت عالی؟ — کہے زلیخا ہو گئی خاک اب خود ہی عمارت والی
یوسف پوچھے کہو زلیخا کہاں ہے فرش حریری — کہے زلیخا ہجر پلنگ اور فرش مراد گیری
یوسف پوچھے کہو زلیخا، کہاں ہیں زیور تیرے — کہے زلیخا نام نہ ان کا لے تو سامنے میرے
یوسف پوچھے کہو زلیخا، کہاں ہیں تخت سنہری — کہے زلیخا لے گئے لوٹ کے نام پہ تیرے شہری
یوسف پوچھے کہو زلیخا، کہاں ہے دایہ مائی — کہے زلیخا ندیسے میرے دیتی پھرے دہائی
یوسف پوچھے کہو زلیخا آج کہاں سرداری — کہے زلیخا درد نے تیرے لوٹ لی مایا ساری
یوسف پوچھے کہو زلیخا، مجھ پہ ستم کیوں ڈھایا — کہے زلیخا جو بھی کیا تھا سامنے میرے آیا
یوسف پوچھے کہو زلیخا، کیا مشکل پیش آئی — کہے زلیخا عشق نے تیرے من میں آگ لگائی
یوسف پوچھے کہو زلیخا، کیونکر یہ دن بیتے — کہے زلیخا دم دم یوسف زہر کے پیالے پیتے
یوسف پوچھے کہو زلیخا چین پھر آیا کیسے — کہے زلیخا تیرے دکھ پر سکھ کو قرباں کرکے

یوسف پوچھے کہو زلیخا، کیونکر عمر گزاری
کہے زلیخا روتے بنا اک گھڑی نہ گذری واری!

بلوچی

"لیلیٰ مجن"

(عوامی کہانی)

عاصمہ حسین

سہانا ہے کھجور پربت کا دامن
یہاں لے کے جاتی ہے ہر روز لیلیٰ
کہیں بیٹھ جاتی ہے چشمے کے تٹ پہ
گرہ گیر زلفِ رسا کھولتی ہے
بکھرتی ہیں زلفیں کہ جیسے سویرے
وہاں سے وہ اٹھلا کے جانے کا جادو
وہ ننھا سا، بھورا سا، چوکور خیمہ
پھر اک آئنہ کسوتِ دلنشیں سے
وہ ریشمِ حسیں خلد کی حور جیسا
وہ آہستہ سرکانا خیمے کی چلمن
ادھر وہ بچارا، محبت کا مارا
بیاباں بیاباں بھٹکتا بھٹکتا
نکل آیا لیلیٰ کے خیمے کی جانب
محبت سے نظریں اٹھا کر جو دیکھا
"اگر تو مرے دیس کو چھوڑ جائے
کئی اونٹ مضبوط اور گھوڑیاں بھی
یہ سُن کر کہا اس صنم سے مجن نے
مجھے کیا تری تیز پا گھوڑیوں سے
نہ چھوڑوں گا ہرگز ترا دیس پیارا
ہوئی سخت برہم یہ الفاظ سُن کر
کہا اس کی ماں نے غضبناک ہو کر
فریبی ہے یہ، آ اسے آزمائیں
ہوئی جب سحر، خادمہ حسبِ ایما
غٹا غٹ اسے پی گیا ہے محابا
مجھے تو نے بھیجا ہے لسی کا پیالہ

حسین بادلوں کا دل افروز مسکن
وہ مٹی کی پیاری سی، نازک سی ٹھلیا
بھر آبِ شیریں، خنک اور معطر
او راس میں وہ چشمے کا رس گھولتی ہے
چھلکتے ہیں بادل گھنیرے گھنیرے
بھرا چال میں اک زمانے کا جادو
اٹھاتی ہے اس سے چٹائی کا پردہ
اُچکتی ہے وہ اپنے دستِ حسیں سے
چمکتا ہوا شعلۂ طور جیسا
وہ بھرپور جادہ اور وہ چہرہ پرُ تزئین
مجن جو کہ تھا دل کے ہاتھوں سے ہارا
پہاڑوں سے سر کو پٹکتا پٹکتا
محبت کے پُر کیف کعبے کی جانب
پکار اٹھی خیمے سے وہ حور لیلیٰ
تو وعدہ ہے میرا کہ بخشوں گی تجھ کو
کہ کانوں کی نوکیں ہیں جن کی نکیلی"
"نہ لوں گا کبھی اونٹ مضبوط تیرے
کہ تیور رہیں جن کے غضب کے نکیلے
اسے چھوڑنے سے ہے مرنا گوارا"
پہ چہرہ لیلیٰ، وہ حورِ سمن بر
"عجب طرح کا ہے یہ عاشق ستم گر!
اسے زہر کا ایک پیالہ پلائیں"
لئے پاس آئی مجن کے وہ پیالہ
کہا پھر کہ کہنا یہ جا کر کہ لیلیٰ
بس اک اور ایسا ہی جام اے دلآرا!

ہوئی سن کے برہم یہ بات اور لیلیٰ
ادھر اسکی ماں جو سراپا غضب تھی
پکڑ لایا صحرا سے جو ناگ کالا
لئے زہر سا تھا اور کالے کا پھن بھی
مجن نے اسی طرح وہ زہر پی کر
مقدر ہے تیرا مرا ایک ہونا
یہ سُن کر ہوئی اور بھی سوختہ لیلیٰ
دیا حکم اس نے یہ خیل و حشم کو
سحر کے ہاتھوں میں خش آب ہوتی
مجن اپنی منزل پہ آخر کو پہنچا
اسی وقت لیلیٰ نے کتے سے اپنے
خطاب اس کو اپنے سے سمجھا مجن نے
سر دیا پہ اُگ آئیں بیلیں ہی بیلیں
کئی روز بعد آئے پھر اونٹ والے
کوئی لکڑیاں کاٹنے کو سدھارا
لگا کاٹنے پیڑ کنڈے کا سوکھا
نہیں پیڑ سوکھا ہوا، میں مجن ہوں
یہ سُن کر وہ انسان حیران و ششدر
بمشکل کہا اک عجب ماجرا ہے
یہ سُن کر ہوئی اتنی بے تاب لیلیٰ
پرے پھینکی جوتی، چلی پا برہنہ
وہاں دوڑتی دوڑتی آن پہنچی
ہٹائیں شتابی سے چہرے سے بیلیں
یہ جاڑے سے مجھ کو بچاتی رہی ہیں
کرم ان کا مجھ سے زیادہ رہا ہے

تعجب سے دل میں کہا مُنہ سے یہ کیا؟
بُلا لائی اک ماہرِ کار جوگی
معاً اس کا زہر ہلاہل نکالا
وہی خادمہ دوسرے روز چل دی
کہا جا کے کہیو کہ اے یارِ دلبر!
کیا زہر نے عشق مضبوط میرا
بر آشفتہ ماں کا غضب اور بھڑکا
کہ اس مستقر سے ابھی کوچ کر دو
سو اٹھی کہیں جن کی تاروں سے جوتی
کہ شاید قبولے انہیں پیاری لیلیٰ
کہیں کہہ دیا "دور ہو" برہمی سے
وہیں رہ گیا سوکھ کر کاٹھ بن کے!
سرِ آشفتہ جس پر عتاب آ کے ٹھہریں
کئے نصب اس جائے ویراں پہ خیمے
لئے ہاتھ میں ایک تیکھا کلہاڑا
صدا آئی بس بس نہ یہ قہر فرما
محبت کی خاطر اسیرِ محن ہوں
روانہ ہوا سوئے لیلائے خود سر
تمہارا مجن ٹھنٹھ بن کر کھڑا ہے
کہ کپڑے جہاں تھے تنے جھٹ ان کو پہنا
دھڑکتے ہوئے دل کو ہاتھوں سے تھاما
جہاں عشق کی زندہ لاش اک کھڑی تھی
"ہٹانا نہ ان کو" کہا یہ مجن نے
مرا دھوپ سے سر چھپاتی رہی ہیں
یہ وہ پھول ہیں جن میں بُو ئے وفا ہے

کشمیری

گلعذارِ شہرِ عاج

(عوامی رومان)

عاصمہ حسین

دور اک وادی ہے سیم و نور کی — جیسے ہو تصویر کوہِ طور کی
چار جانب برف کا گویا ہے راج — اس لئے کہتے ہیں اس کو "شہرِ عاج"
عاج کے تختے بچھے ہیں ہر طرف — عاج کے ایوان بنے ہیں ہر طرف
عاج ہی کے راستے نرم و گداز — محوِ حیرت جن سے ہوں آئینہ ساز
عاج ہی کا فرش تا حدِ نظر — عاج سے آراستہ کوہ و کمر
راستے، گھر بار ہاتھی دانت کے — برج اور مینار ہاتھی دانت کے
سیکڑوں طائر قطار اندر قطار — جیسے ہاتھی دانت کے دُرّاج و سار
عاج ہی کی بلبلیں اور قمریاں — عاج کی مانند بھیڑیں بکریاں
عاج کے پودے بھی تھے، اشجار بھی — عاج کے تھے پھول بھی، اثمار بھی
عاج کی پھیلی ہوئی وہ کونپلیں — جیسے پھلجھڑیاں ہوں باغ و راغ میں
چلتی پھرتی عاج ہی کی مورتیں — جو نظر آئیں بشر کی صورتیں
یہ چمکتا، اُجلا اُجلا شہرِ عاج — سر پہ تھا وادی کے اک چاندی کا تاج
عاج کی وہ گوری گوری ناریاں — نور کی پھیلی ہوئی گلکاریاں
خلد زارِ روح و نظارہ تھا وہ — حسن کا سرمست گہوارہ تھا وہ
وجد میں کہتے تھے لب بے اختیار — حسن زار! اے حسن زار! اے حسن زار!
یہ فسوں پرور دیارِ مرمریں — اس میں تھی اک شاہزادی نازنیں
ایک زندہ عاج کی مورت تھی وہ — سر سے پا تک صندلی مورت تھی وہ
ہاتھ عاج اور پاؤں عاج اور چہرہ عاج — اس کے زانو عاج، اس کا سینہ عاج

نام اس کافر ادا کا "گلعذار"
شاہدِ سیمیں بر و سیمیں کنار

ناگہاں شہزادۂ بے خانماں — چلتے چلتے ہو گیا وارد وہاں
جس کا تھا اپنا ہی گویا یہ دیار — اک جہانِ مطلعِ نور النہار
اک ندی میں پانی پینے کو جھکا — ہاتھ میں پانی کا اک کاسہ لیا
آئی پانی میں نظر ایسی پری — سر بسر آئینۂ دادِ دلبری
اس نظارے سے وہ حیراں رہ گیا — دست بر دل، شعلہ در جاں رہ گیا

جب نظر اوپر اٹھائی کچھ نہ تھا — وہ طلسمِ سیمیائی کچھ نہ تھا
پھر لیا کاسے میں پانی اک ذرا — پھر نظر آئی وہ شکلِ دلربا
سامنے دیکھا تو تھی اک نازنیں — اک پری وش، زہرۂ ناز آفریں

ہو گیا مدہوش شانِ جلوہ سے
جیسے اس میں سحر کے انداز تھے

ہوش میں آیا تو ساتھی سے کہا — میں نے دیکھا ایک طرفہ ماجرا
اک پری آئی نظر ندی کے پار — دیدہ و دل ہو گئے جس پر نثار
میں نے دیکھا تو وہ صورت موہنی — اک کنول سے اس نے فوراً ڈھانپ لی
دیکھتا تھا میں تو مسکاتے ہوئے — عاج کی ڈبیا نکالی جیب سے
دور سے ڈبیا کو دکھلایا مجھے — ناز کے تیروں سے برمایا مجھے
تب سے میں سرگشتہ و مبہوت ہوں — ہو نہ ہو اس میں تھا اندازِ فسوں
ہو نہ جب تک اس پری وش سے وصال — ہے سکونِ دل مرے حق میں محال
سن کے ساتھی نے کہا تھا ابنِ وزیر — یوں کہا ہو گی یہ حورِ بے نظیر
شاہزادی گلعذارِ شہرِ عاج — حسن عالم جس کو دیتا ہے خراج
کامیابی ہو گی کوشش سے نصیب — فتح و نصرت کد و کاوش سے نصیب
مدتوں شہزادہ سرگرداں رہا — در بدر کی ٹھوکریں کھایا کیا
پر اسے مل کر رہی وہ گلعذار — اپنے کاشانے میں لوٹا کامگار

آج بھی موجود شہرِ عاج ہے
جو کہ خوبی میں جہاں کا تاج ہے

وہ بذاتِ خویش ہے اک گلعذار — حسن میں چشم و چراغِ روزگار
اور اک شہزادۂ بے خانماں — بے سر و سامان و بے تاب و تواں
دل میں رکھتا ہے تمنائے وصال — کھینچتا ہے اس کو افسونِ جمال
ہے مسلسل، بے محابا گرمِ کار — شعلہ زن سینے میں شوقِ گلعذار
گرچہ ہے رستے میں سو سنگِ گراں — یہ تگاپو ہو گی آخر کامراں
امتحاں کے مرحلے دشوار ہیں — دشت رستے میں بہت پُر خار ہیں
اس کو ملنی ہے مرادِ انجامِ کار — منقلب ہو گی ہوائے روزگار

کامیاب و کامراں ہو جائے گا
چشمۂ عشرت رواں ہو جائے گا

پشتو رومان

شمروز غزالہ

احمد فراز

دور ان سُرمئی پہاڑوں سے
مرغزاروں کی سرحدوں سے پرے
ایک سُنسان سا خرابہ ہے
جس کی پھیلی ہوئی خموشی میں
جب کبھی چاندنی بکھرتی ہے
گھنگروؤں کی دبی دبی آواز
ایک نغمے کے روپ میں ڈھل کر
دفعتاً چیخ چیخ اٹھتی ہے
(گھنگروؤں کی چھنک کے ساتھ
پس منظر سے آواز ابھرتی ہے)

آواز : پریت کے دکھ اپنا کر ہم نے
کیا کھویا؟ ——— کیا پایا؟

داستان گو : صبح تک یہ اداس اداس کھنک
رات کی دھڑکنوں میں رہتی ہے
اور پہلی شعاعِ مہر کے ساتھ
پھر وہی سوگوار سناٹے
اس خرابے پہ پھیل جاتے ہیں

———

لوگ کہتے ہیں اک زمانہ ہوا
وہ زمانہ جو اب فسانہ ہوا
پہلے یاں مختصر سی بستی تھی
اور بستی کے آس پاس کہیں
چیڑ کے سربلند پیڑوں کا
سخت گنجان ایک جنگل تھا

اسی جنگل سے کچھ پرے ہٹ کر
تنگ و تاریک جھونپڑے تھے جہاں
چند خانہ بدوش رہتے تھے
یہی خانہ بدوش لوگ کہ جو
منقسم تھے کئی قبیلوں میں
صبح ہوتے ہی چھوڑ کر بستی
اپنے سرداروں کی اعانت میں
پاس کے شہر میں نکل جاتے
اور وہاں رقص و نغمہ ڈفنے سے
اپنے فن کا مظاہرہ کرتے
جس کے بدلے میں کچھ تماشائی
کچھ نہ کچھ حسبِ حال دے دیتے

———

کورس : پلک جھپک کا کھیل
یہ دنیا
پلک جھپک کا کھیل
پل پل بدلے رنگ زمانہ پل پل بدلے راگ
تو بھی میٹھی نیند کے ماتے اب سپنوں سے جاگ

جیون کے دکھ جھیل
یہ دنیا
پلک جھپک کا کھیل
یہ جگ اور اس جگ کے دھندے دو گھڑیوں کے میلے
تو بھی اس بازار میں کچھ دے دے کچھ لے لے

پانی آگ سا میل
یہ دنیا
پلک جھپک کا کھیل
یاں بس کے بے انت ہیں ساگر امرت کے کچھ پیالے
من میں جو کچھ آئے پی لے سوکھے ہونٹوں والے
بس میں رس کو انڈیل
یہ دنیا
پلک جھپک کا کھیل

اس طرح شہر کے گلی کوچے
صبح سے شام کے اندھیرے تک
مست نغموں سے گونجتے رہتے
اور خورشید کے غروب کے ساتھ
ان قبیلوں کے ساتھ نغمے بھی
جنگلوں کی طرف پلٹ جاتے
ان میں ایسا بھی اک قبیلہ تھا
جس کا سردار "داورس" نامی
دن کو شہروں میں کھیل دکھلاتا
اور شب کے گھنے اندھیروں میں
ڈال دیتا کسی جگہ ڈاکہ
پھر مقدر سے ہاتھ جو لگتا
اپنی بستی کی سمت لے اڑتا
ایک دن جبکہ داورس ڈاکو
شہر سے نامراد جانے لگا
ایک کمسن مگر حسین بچی
راستے میں اسے دکھائی دی
موقع پاتے ہی لے اڑا اس کو
اپنے ڈیرے میں ساتھ لے آیا
جس جگہ اس کے دوسرے ساتھی
دیر سے اس کے انتظار میں تھے

زبیل: آؤ سردار خیریت باشد!
آج کیوں اتنی دیر سے آئے
کیا کہیں کوئی واردات ہوئی

داورس: ہاں زبیل اک عجیب بات ہوئی
کوئی معقول سلسلہ نہ ہوا
پھر بھی تم جانو اللہ مالک ہے
(بچی کے رونے کی آواز)

بڑھیا: ہائے میرا ادھر تو دھیان نہ تھا
کون ہے یہ؟ کہاں سے لائے ہو؟
کس کی گودی اجاڑ آئے ہو؟
کس کا لختِ جگر چرایا ہے؟
کس کے گھر کا دیا بجھایا ہے؟
کس دکھی ماں کا جی جلایا ہے؟

داورس: چپ رہو بد زبان مکارہ!
اور بکواس کی اگر تو نے
کھینچ لوں گا زبان گدی سے

زبیل: چھوڑو، سردار! اس کو جانے دو
باؤلی ہو گئی ہے یہ عورت
کہو اس خوش نصیب بچی کو
کس طرح سے یہاں اٹھا لائے؟

داورس: تمہیں معلوم ہے زبیل کہ میں
ایک مدت سے اس تلاش میں تھا
کہ کوئی خوش جمال لڑکی ہو
جس کو میں فنِ رقص و نغمہ میں
ایسا یکتائے روزگار کروں
جس کے فن و جمال کے چرچے
صاف و شفاف چاندنی کی طرح
شہر در شہر پھیلتے جائیں
جس کے بدلے میں ڈھیر دولت کے
میری ان محنتوں کا پھل ہونگے

زبیل: یہ تو سب ٹھیک ہے مگر سردار

اتنی کمسن جمیل بچی کو
کون اِن ذلتوں میں پالے گا؟

داورس: یہی عورت، نمک حرام کنیز

زبیل: اور ہاں اس کا نام کیا ہوگا!

داورس: دیکھو اس ننھی منی گڑیا کی
کس قدر پیاسی پیاری آنکھیں ہیں
جس طرح دشت کے غزالوں کی

زبیل: ٹھیک ہے! نام۔ میں نے سوچ لیا

داورس: کیا؟

زبیل: غزالہ

داورس: بہت ہی خوب رہا!

اس طرح روز و شب گزرتے گئے
داورس کی کنیز عورت نے
یوں غزالہ کو پیار سے رکھا
جس طرح دخترِ حقیقی ہو
اور شب و روز کی ریاضت سے
نغمہ و رقص میں بھی طاق کیا
آخرِ کار وہ گھڑی آئی
داورس جس کے انتظار میں تھا
دس برس کی طویل عمر کے بعد
وہ غزالہ جو تھی کبھی کمسن
اب تھی چودہ برس کی دوشیزہ
نوجواں، کامیاب رقاصہ
جس کے حسن و جمال کی شہرت
چاندنی بن کے ہر طرف پھیلی
جس کی آواز کی کھنک جیسے
آبشاروں سے گیت بہتے ہوں
جس کے بھرپور ناچنے کی ادا
رقصِ طاؤس کو بھی شرمائے
داورس کی امید بر آئی
اب غزالہ کو ساتھ ساتھ لئے
شہر میں دور دور تک جاتا
اور غزالہ کی دلنشیں آواز
رقص کے زاویوں پہ لہرا کر
لوٹ لیتی مت ہر اہلِ نظر

غزالہ:— میں روپ نگر کی شہزادی
اپنی جھولی پھیلاؤں
ناچوں گاؤں — وادی وادی
میں روپ نگر کی شہزادی
امرت سے بھرے یہ نین کنول یہ انگ انگ کا روپ
میں زلفوں کی چھاؤں بیچوں، بیچوں مکھڑے کی دھوپ
میں دور کھڑی مسکاؤں
پاس نہ آؤں — بات بتاؤں
میں روپ نگر کی شہزادی
اس جھوٹے جگ میں کانچ کے ٹکڑے سچے پیار کا مول
تو بھی پگلے نینوں کے موتی مٹی میں مت رول
سب بھید تجھے بتلاؤں
خود نہ پاؤں — میں آزادی
میں روپ نگر کی شہزادی

ایک دن جب قریب بستی میں
تھی غزالہ بہ شوق رقص کناں
اُن تماشائیوں کے حلقے میں
ایک خوش رنگ خوش لباس جواں
نام شمروز — حسن کا پیکر
ہو کے غرقِ جمال نغمہ و رقص
کھو گیا جلوۂ غزالہ میں
اور غزالہ وہ حسن کی دیوی
ایک لمحے کی مسکراہٹ میں
ہو گئی صیدِ الفتِ شمروز
آنکھوں آنکھوں میں کہہ گئے دونوں
زخم خوردہ دلوں کے افسانے

آخرش رقص جب تمام ہوا
اور ماحول کا فسوں ٹوٹا
سب تماشائیوں نے حسب بساط
کچھ نہ کچھ داورس کی نذر کیا
اور شمروز نے بہ عجز و نیاز
کسی حیلے کسی بہانے سے
سب سے چھپ کر بہ احتیاط تمام
مسکرا کر حسیں غزالہ کو
اپنی نادر انگوٹھی دے ڈالی
اور غزالہ کی مست آنکھوں میں
شکریئے کے پیام لہرائے

غزالہ: نام

شمروز: شمروز... اور

غزالہ: غزالہ مرا

شمروز: پھر ملو گی؟

غزالہ: کہاں؟

شمروز: جہاں بھی کہو

غزالہ: آج شب دور وہ کھنڈر ہیں جہاں

داستان گو: داورس کی حریص آنکھوں نے
جب یہ سارا معاملہ دیکھا
فرطِ وحشت سے تھرتھرا اٹھا
لیکن اس وقت مصلحت تھی یہی
کہ خموشی سے زخم سہہ جائے
اس کے مکار ذہن نے سوچا
کہ یہ دل پھینک نوجواں شمروز
کوئی ناداں امیر زادہ ہے
جو غزالہ کی مست آنکھوں پر
اپنا سب کچھ نثار کر دے گا
اس طرح مکر اور فریب کے ساتھ
لا اُبالی امیر زادے سے
خوب دولت وصول کی جائے

شام ہوتے ہی داورس ڈاکو
ساتھ لے کر حسیں غزالہ کو
اپنی بستی کی سمت لوٹ گیا

(قدموں کی چاپ)

بڑھیا: کون؟

داورس: اپنے ہیں

غزالہ: کوئی غیر نہیں

بڑھیا: آؤ بیٹی! میں انتظار میں تھی

داورس: دیکھو بڑھیا! سنبھالو یہ ساماں
اور کچھ ہے تو ناشتہ لاؤ

بڑھیا: اتنی جلدی بھی کیا ہے سستا لو

داورس: مجھے جانا بھی ہے

بڑھیا: کہاں

غزالہ: اس وقت؟

داورس: شہر کچھ کام ہے ذرا جانا!
بڑھیا، جلدی سے ناشتہ لاؤ

بڑھیا: ابھی لاتی ہوں.......
.... لو یہ کچھ پھل ہیں

داورس: اور غزالہ سنو

غزالہ: کہو بابا

داورس: آج شاید میں دیر سے لوٹوں
تم بھی کچھ تھک چکی ہو، سو جاؤ
اچھا لو میں چلا

غزالہ: خدا حافظ!

(داورس چلا جاتا ہے)

بڑھیا: پھیلتی جا رہی ہے تاریکی
تم بھی اب سو رہو مری بیٹی!

غزالہ: نہیں ماں نیند ابھی نہیں آئی
آج کچھ ڈس رہی ہے تنہائی

بڑھیا: دن کی آوارگی سے چور ہو تم
پھر بھی کس درجہ ناصبور ہو تم

(باقی آئندہ)

جدید جاپانی ادب

کیویا ڈوئی

پروفیسر کیویا ڈوئی ٹوکیو یونیورسٹی میں اردو کے استاد ہیں۔ ان کی صاف و شستہ تقریر کی طرح یہ تحریر بھی ان کی زباندانی کا آئینہ ہے۔ (ادارہ)

جدید جاپانی ادب شاہ مے جی کے دور یعنی ۱۸۶۸ء سے شروع ہوتا ہے اس وقت تک جاپان میں نوابی حکومت تھی اور غیر ملکوں سے لین دین منع تھا ۱۸۶۸ء نوابی حکومت کا خاتمہ کر کے جب شاہ مے جی خود حکومت کرنے لگے تو غیر ملکیں سے تجارتی تعلق پیدا کیا اور یورپ کا جدید تمدن سیکھنے لگے۔ جب یورپ کا راستہ کھل گیا تو وہاں کا ترقی یافتہ تمدن دیکھ کر جاپان کے لوگ حیرت رہ گئے اور جلدی جلدی اسے سیکھنا شروع کر دیا۔ شاہ مے جی ۴۵ برس تک تخت پر رہے۔ ہم ان کی حکومت کے زمانے کو دور مے جی کہتے ہیں۔ مے جی کے زمانے میں جاپان نے یورپ کی نئی نئی چیزیں قریب قریب سب سیکھ لیں۔ علم ادب کے بہت سے اصول بھی لے لئے گئے۔

شاہ مے جی کے بعد شاہ تائی شو نے ۱۵ برس تک حکومت کی، اس زمانے کو دور تائی شو کہتے ہیں۔ (۱۹۱۲ء تا ۱۹۲۶ء) اس کے بعد سے آج تک شاہ شووا کا زمانہ ہے۔

اب شووا کا تیسواں سال ہے تائی شو اور شووا کے شروع کا زمانہ سب سے اچھا تھا اور اس میں تمدن اور علم ادب کو بڑی نشو و نما ہوئی شووا کے ساتویں برس میں (۱۹۳۲ء) مانچوریا میں لڑائی شروع ہوئی۔ ہم دور شووا پر زور دے کر جدید علم ادب کا کچھ حال دیکھنا چاہتے ہیں۔

ناول

عہد مے جی کے ابتدائی ۱۸ برس یعنی ۱۸۶۸ء سے ۱۸۸۵ء تک کے زمانے میں اصل علم ادب کو نشو و نما نہیں ہوئی۔ علم ادب کو تعلیم دینے یا لوگوں کو اپنی طرف بنانے کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا اس وقت سیاسی تحریک بڑے زور سے چل رہی تھی اس لئے لوگ اپنا خیال ظاہر کرنے کے لئے ناول لکھتے تھے۔ یورپ کے بعض سیاسی ناولوں کا ترجمہ ہوا اور کچھ سیاسی ناول لکھے بھی گئے۔

عہد مے جی کے ۱۸ برس بعد یعنی ۱۸۸۵ء میں تسوبواُچی شویو نے "روح ناول" نام کی کتاب شائع کی۔ یہ ناول لکھنے کا طریقہ سکھانے کی کتاب تھی۔ اس میں انہوں نے لکھا تھا کہ ناول کا مطلب اس زندگی کا اصلی حال اور لوگوں کے دل کی باتیں لکھنا ہے۔ اس وقت کے ناولوں کی طرح صرف قصہ سے اصلی ناول نہیں لکھا جا سکتا۔ ان میں ذہنیات اور نفسیات کے اصول ناول کا ضروری حصہ قرار دیئے تھے۔ اس وجہ سے اس طرز کو نفسیاتی کہہ سکتے ہیں اور دوسری طرف حالات کو واقعہ کے بموجب لکھنے کی وجہ سے اسے مشاہدہ پرستی کہا جا سکتا ہے۔ یہ طرز سائنٹفک اصول سے بھی ملتا ہے۔ اس کتاب کے بعد جاپانی ادب میں حقیقت پرستی کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔

تسوبواُچی نے اپنے اصولوں کے بموجب ایک ناول بنام "طلباء کا حال" لکھا تھا لیکن اس ناول میں پرانے زمانے کے مذاقیہ ناول کا اثر غالب تھا۔

تسوبواُچی کی تصنیف "روح ناول" سے ایک بڑا مصنف متاثر ہوا۔ وہ روسی علم ادب کا شوقین فوتاباتے شی مے تھا جس نے ۱۸۸۷ء میں "بادل" نامی ناول لکھا۔ یہ اصل معنی میں حقیقت پرستی کا سب سے پہلا ناول ہے۔ اس ناول میں ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ یہ ناول معمولی بول چال کی زبان میں تحریر ہوا ہے۔ اس زمانے میں فوتاباتے اور یماداامیو دو مصنف تحریری زبان کو ترک کر کے بول چال کی زبان میں ناول لکھنے لگے۔ اس کا جدید ناول کی نشو و نما پر بہت بڑا اثر ہوا "بادل" نامی ناول کے بعد کوئی ۱۲ برس تک کے زمانے کو کورہ کا زمانہ کہتے ہیں کیونکہ اس زمانے میں کویو اور روہن سب سے اچھے مصنف سمجھے جاتے تھے۔ کویو اس زمانے کے بہت سے حقیقت پرستی کے مصنفوں میں سب سے بڑا مصنف تھا اور روہان ان لوگوں سے الگ، معیار نگاری کا مصنف تھا۔ اس کے بعد عہد مے جی کے ۲۰ سے ۳۰ برس تک کا زمانہ (۱۸۹۰ء تا ۱۹۰۵ء) رومانیت کا زمانہ ہے اس زمانے میں بہت سی نئی نئی نظمیں لکھی گئیں۔ اس وقت کے شاعر اشیمازاکی توسون کی عشقیہ نظمیں اور دوئی بان سوئی کی قومی نظمیں بہت پسند کی گئیں ۱۹۰۱ء

، یوسانو تیسوکان رسالہ میوجیو نکالنے لگا اور رومانوی شاعری
بہت ترقی ہوئی۔ اُسے دا بن نے مغربی نظموں کا ترجمہ کیا اور بہت اثر ڈالا
ل نگاری میں ازدو می کیوسکا بہت مشہور ہے۔ ان کا ایک ناول "ویا
ڈکا ژشی" ایک پجاری کی کہانی ہے۔ ایک پجاری ملک کے ہر حصہ میں گھومتا
رہتا تھا۔ ایک دن پہاڑ میں ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں آرام کرنا چاہا۔ اس
جھونپڑی میں ایک نہایت خوبصورت عورت تھی جس نے پجاری کی بہت خدمت
وہ عورت اتنی خوبصورت تھی کہ جنگل کے جانور بھی اس کے پاس آیا کرتے
پجاری بھی فریفتہ ہو گیا اور اس جھونپڑی سے باہر نکلنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن
ین کے فرائض کے احساس سے مجبور ہوا اور ہمت کر کے اسی عورت سے
ت ہو کر پہاڑ سے اتر آیا۔ لیکن اس کا دل بے قرار تھا۔ راستہ میں پھر دل نے
رکیا کہ اس کے گھر واپس جائے لیکن ٹھیک اسی وقت ایک آدمی مل گیا
نے بتایا کہ وہ عورت معمولی عورت نہیں ہے۔ جو جانور اس عورت کے پاس آتے
وہ سب پہلے انسان تھے۔ اس عورت کی خوبصورتی میں پھنس کر ایسی صورت
بادکرنی پڑی ہے۔ یہ سن کر پجاری حیران ہو گیا اور اس کے دل کی بے قراری
تم ہو گئی اور وہ صحیح سلامت پہاڑ سے اتر آیا۔

عہد میجی کے آخری چھ برس یعنی ۱۹۰۶ء تا ۱۹۱۲ء فطرت نگاری کا زمانہ تھا۔
مانہ کے مصنفوں میں تایاما کاتائی اور شیمازاکی توسون ماساموینے
وچیو ٹوکوداشیو سے اور مایاما سے کا مشہور ہیں۔

اس وقت ان مصنفوں کے گروہ سے الگ رہنے والے دو بڑے مصنف تھے۔
نا تسومے سوسیکی اور موری اوگائی تھے۔ نا تسومے سوسیکی کا کہنا تھا کہ
ت نگاری کے پرستار زندگی کے گندے پہلو پر زیادہ زور دیتے ہیں اور
ہی باتیں لکھنے میں لگے رہنے سے فرصت نہیں ملتی۔ ہم لوگوں کو فرصت چاہیئے
وری اوگائی ڈاکٹر تھے اور فوج میں علاج معالجے کا کام کرتے کرتے
رجن جنرل ہو گئے تھے۔ لیکن ان کو ابتدا سے علم ادب کا بہت شوق تھا۔ شروع میں
رپ کے ناول اور نظموں کا ترجمہ کرتے رہے اور نکتہ چینی میں اپنا نظریہ رکھتے
۔ بعد کو تاریخی کہانیاں لکھنے لگے۔ ان کی تاریخی کہانیاں بہت اعلیٰ درجے کی ہیں۔

۱۹۱۰ء کے قریب ایک دوسرے اصول سے لکھنے والے دو مصنف پیدا
ہوئے وہ ناگائی کافو اور تانی زاکی جن اچیرو تھے۔ جب فطرت
نگاری کے پرستار زندگی کے خراب پہلو پر زور دیتے تھے تو اس کے خلاف دو گروہ
پیدا ہوئے۔ ایک خوبصورتی پر زیادہ زور دینے والا خوبی نگار تھا۔ دوسرا
معیار نگار۔

ناگائی اور تانی زاکی خوبی نگار تھے۔ ناگائی کافو عہد توکوگاوا
(۱۵۹۶ء تا ۱۹۶۷ء) کے تمدن کے پرستار تھے اور اپنے زمانے کی سب
چیزوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے لیکن ان کی تصنیفوں میں "بوکُو توکیدن دہ"
(دریائے سومیدا کے مشرقی علاقہ کے حصے) "امریکی کی کہانیاں"۔ "فرانس کی کہانیاں"
وغیرہ مشہور ہیں۔ انہوں نے رنڈیوں کی زندگی کی بہت سی کہانیاں لکھی ہیں۔
تانی زاکی ۔۔ غیر معمولی زندگی کے ناول لکھتے ہیں۔

یہ دونوں مصنف آج کل بھی بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ تانی زاکی
نے جاپان کے سب سے پرانے اور مستند ناول گینجی مونوگاتاری کا ترجمہ
آجکل کی زبان میں کیا ہے۔ اور کچھ تاریخی ناول بھی بہت اچھے لکھے ہیں۔
ناگائی اب بھی رنڈیوں کی زندگی کی کہانیاں لکھ رہے ہیں۔

عہد تائی شو یعنی ۱۹۱۲ء تا ۱۹۲۵ء علم ادب کے لحاظ سے
بہت اچھا زمانہ تھا۔ یہ معیار نگاری اور ذہنی ادب کا زمانہ تھا۔ معیار
نگاری کے مصنفین رسالہ "شیرا کابا" میں لکھا کرتے تھے۔ یہ لوگ
شخصیت کا احترام کرتے تھے اور اس کی پوری نشو و نما کے لئے کوشش کرتے
تھے۔ انہوں نے لوگوں کی انفرادی خصوصیت اور دنیا کی ہم آہنگی کو زندگی
کا مقصد قرار دیا۔ زندگی کے روشن پہلو سے بحث کر کے محبت کی زندگی میں
روحانی اطمینان حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان مصنفوں میں موشانوکوجی
سانے آتسو، شیگا ناؤیا، آری شیما تاکے او، ساتومی تون
وغیرہ ہیں۔

مُوشانوکوجی اب بھی بہت لکھتے ہیں۔ لڑائی کے بعد تصنیف شدہ ناولوں
میں "استادشین ری" بہت مشہور ہے۔

۱۹۲۰ء کے قریب سے ذہنی ادب کے پرستار کثرت سے اپنی تصانیف چھپوانے
لگے۔ یہ ایک طرح سے پرانے سب اصولوں کو ملا کر ایک نیا اصول بن گیا۔ اس کی
خصوصیت یہ تھی کہ اصلی زندگی پر بحث کرنے وقت مصنف اپنی خاص رائے رکھتے تھے
اس طرز کے مصنفوں میں کیکوچی کان، اکوتاگاوا ریونوسوکے
گوسے ماساؤ، یاماموتو، یوزو وغیرہ ہیں۔

کیکوچی کان کا ڈرامہ "باپ واپس آیا" بہت مشہور ہے۔ اس کی کہانی یہ ہے
کہ ایک گھر میں ماں، دو نوجوان لڑکے اور ایک لڑکی غریب لیکن بہت آرام سے
رہتے ہیں۔ اس گھر میں باپ نہیں ہے۔ جب بچے چھوٹے تھے باپ بچوں کو چھوڑ کر کسی
دوسری عورت کے ساتھ چلے گئے تھے۔ ایک رات کو وہی باپ واپس آتا ہے۔ دیکھنے
سے معلوم ہوتا ہے کہ اب اس کا حال اچھا نہیں ہے۔ وہ اس گھر میں پناہ مانگتا ہے۔

ماں چھوٹا بھائی اور بہن باپ کے خیر مقدم کرنے کو تیار ہیں لیکن بڑا بھائی کہتا کہ باپ کے چلے جانے کے بعد میں نے چپراسی بن کر پڑھنے کی کوشش کی اور اب سرکاری ملازم بن گیا۔ بہت دکھ اٹھا کر بھائی بہن کو پڑھایا۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ ہم لوگوں کو چھوڑ کر گھر سے چلے گئے تھے۔ جب اس وقت کا دکھ یاد آتا ہے تو باپ کو اس گھر میں واپس آنے نہیں دے سکتا۔ باپ یہ سن کر مایوس ہو کر چلا جاتا ہے۔ لیکن باپ کے چلے جانے کے بعد بڑا بھائی بھی گھبرا جاتا ہے اور چھوٹے بھائی کے ساتھ باپ کو ڈھونڈنے جاتا ہے۔

جنگ کا زمانہ جنگ شروع ہوتے ہی کمیونزم پر دباؤ پڑا اور بہت سے لوگ آسانی سے اپنا اصول چھوڑ کر "فن برائے فن" والوں میں شامل ہو گئے۔ لیکن کچھ لوگ اپنا اصول چھوڑنے میں تامل کرتے تھے اور اس مسئلہ پر ناول لکھتے تھے۔ ان مصنفوں میں شیماکی کین ساکو نامی مصنف بہت مشہور ہیں۔ ان کا ناول "زندگی کی کھوج" نے اس زمانے کے نوجوانوں پر بڑا اثر ڈالا۔

اس زمانہ میں نہ صرف کمیونسٹ بلکہ دوسرے اصول کے مصنفوں پر بھی دباؤ بڑھتا گیا۔ ان مصنفوں کے لئے انسان دوست ادب کے سوا کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ اس زمانے میں بے قراری کی زندگی میں کچھ نہ کچھ امید دکھانے والے مصنف پیدا ہوئے۔ ان میں اشی کاوا تاتسوزو، ہیوا فومیاد وغیرہ تھے۔ لیکن آخر میں ان لوگوں پر بھی دباؤ پڑنے لگا اور سب کے سب مصنفوں کو لڑائی میں مدد کرنی پڑی۔ بہت سے مصنفوں کو فوج میں بھرتی ہو کر میدانِ جنگ میں جانا پڑا کسی کسی کو میدانِ جنگ کے باشندوں کو سمجھانے کا کام سپرد کیا گیا۔ بعض لوگ لڑائی کے حالات لکھنے لگے۔ میدانِ جنگ کے تجربہ سے لکھے گئے ناول یا رپورٹ میں ہی نو آسی ھے کا "گیہوں اور سپاہی"، اشی کاوا تاتسوزو کا "زندہ سپاہی" اور ہیوا فومی او کا "جنگ سمندر" مشہور ہیں۔

جنگِ ثانی کے ثانی کے بعد پرانے زمانے کے بڑے بڑے مصنف جو لڑائی میں مدد دینے کی وجہ سے اپنے کلام چھپوا نہ سکتے تھے بہت شوق سے لکھنے لگے۔ ان میں ناگائی کافو، تانی زاکی جن اچیرو، موشانو کوجی سانے آتسو وغیرہ نے بہت اچھی تصانیف لکھیں۔ ان کے بارے میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ ان میں تانی زاکی کے ناول سامسامے یوکی اور شیو شیو شیگے موتو نو ہاہا" بہت مشہور ہیں۔

وہ مصنف جو لڑائی کے زمانے میں مجبوراً فوج کا کام کرتے تھے بھی بہت سے ناول لکھ رہے ہیں۔ ان میں اشی کاوا تاتسوزو، نیوا فومی او، ساکاگوچی آن گو، تامورا تائی جیرو، کون ھی دے می، آبے متوموجی، ایبو سے ماسوجی وغیرہ ہیں۔

ان لوگوں کی خصوصیت یہ ہے کہ لڑائی کے بعد کی بےزار زندگی سے نفرت کا اظہار کر کے ایسی باتوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور ناامیدی کو بہلانے کے لئے زندگی کے نفسانی پہلو کو خوبصورت بنا کر دکھانا چاہتے ہیں اور اس خیال سے عورت مرد کی جذباتی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے بحث کرتے ہیں۔

ان کے علاوہ لڑائی کے بعد کے لکھنے والے مصنف بھی بہت پیدا ہو گئے ہیں۔ ان میں سب سے مشہور میشیما یوکی او ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ لڑائی کے بعد کے نوجوان دنیا کی بے قراری کے عادی ہو چکے ہیں اور بہت سبق لے چکے ہیں۔ اس لئے ایسی بے قراری اب ان مصنفوں کی تصانیف سے دو ایک اقتباس پیش کرتا ہوں تاکہ آپ لوگ کچھ اندازہ لگا سکیں کہ لڑائی کے بعد کیا حال ہے۔

اشی کاوا تاتسوزو "باپ کی خوشی"۔ اس ناول کا ہیرو ایک دفتر کا معمولی کلرک ہے۔ اس کی بیوی اور چار مہینے کا بچہ ہے۔ وہ لوگ ایک بیوہ کے مکان کے ایک فلیٹ میں رہتے ہیں۔ میاں بیوی ایک دوسرے سے اکتا گئے ہیں۔ شوہر کوئی ایسا شغل چاہتا ہے کہ اس کی بے رنگ زندگی میں کچھ رنگینی پیدا ہو۔ اس خیال سے وہ چھوٹے موٹے کام کرنے لگتا ہے۔ سب سے پہلے وہ دفتر کی کلرک لڑکی سے دوستی کرتا ہے۔ جب اس لڑکی کی شادی کا دن آتا ہے تو لڑکی کو دھمکا کر ۵ روپیہ لے لیتا ہے کہ روپیہ نہ ملنے پر دونوں کا تعلق بتا دے گا۔ جب اس کے فلیٹ کی بیوہ مالکہ فلیٹ خالی کرنے کی درخواست کرتی ہے تو وہ دھوکا دے دھوکا دیتا ہے اور اس سے بھی تعلق پیدا کرتا ہے۔ اس کی پرانی معشوقہ کا شوہر کسی مشکل میں پھنس جاتا ہے۔ وہ عورت پرانے یار کی یعنی ناول کے ہیرو کی مدد مانگتی ہے۔ ہیرو اس عورت کو مدد دے کر پھر پرانا تعلق رکھنا چاہتا ہے۔ ہیرو کا صرف ایک دوست تھا جو مالی مدد دے سکتا تھا۔ جب ہیرو نے اپنے دوست سے مدد مانگی تو اس نے انکار کیا۔ اس پر ناراض ہو کر وہ اپنے اس دوست کو قتل کرتا ہے۔ قتل کرنے کا مقصد روپے کا لالچ نہیں تھا بلکہ اور بھی بڑا پاپ کرنے کا شوق تھا۔ وہ پکڑا جاتا ہے اور اپنے سب کرتوت بیان کر دیتا ہے کیونکہ اس کے سب دوست جنہیں وہ نقصان ہی دیتا رہتا تھا سب بہت ہمدرد تھے اور اس کی مدد کرتے تھے۔ اس ہمدردی کا یہ اثر ہوا کہ اسے گناہ کی زندگی میں بھی دل بہلانا مشکل ہو گیا اور ایسی زندگی کا کوئی مقصد اسے نظر نہ آیا۔

(باقی آئندہ)

آثارِ قدیمہ:

مینامتی

کومیلا سے پانچ میل دور پہاڑیوں کا ایک حسین سلسلہ ہے جس کی ایک چوٹی میناماتی اور دوسری لال ماتی کہی جاتی ہے۔ پچھلی عالمی جنگ میں یہاں فوجی ڈیرے پڑے ہوئے تھے۔ ٹھیکہ داروں نے جگہ جگہ کھدائی کی تو حسن اتفاق سے ان کو ایک ایسی جگہ مل گئی جو بدھ مت کی تہذیب کا مرکز سمجھی جا سکتی ہے۔ پھر تو محکمۂ آثارِ قدیمہ نے ان قطعات کا باقاعدہ جائزہ لیا۔ کھدائی کی گئی، بہت سی نادر چیزیں دستیاب ہوئیں جو محفوظ کر لی گئیں۔ انہیں محفوظ آثار میں سے سلیمان راجہ کا محل بھی ہے جو دائیں پشت چوٹی پر واقع ہے۔

پاکستان کے محکمۂ آثارِ قدیمہ نے ۱۹۵۱ء میں اس علاقہ کی مساحت کا کام شروع کیا۔ اور جنوری ۱۹۵۵ء کے دوسرے ہفتہ میں کھدائی کی داغ بیل ڈال دی۔

مشرقی بنگال پر پال خاندان کی حکومت کے بعد چندر خاندان کی حکومت قائم ہوئی جو ۹۰۰ء سے ڈیڑھ سو برس تک رہی۔ اس وقت روہت گری راج دھانی تھی جو آج لال ماتی ہے۔ یہ چوٹی جنوبی سرے پر ہے، شمالی چوٹی میناماتی کہلاتی ہے۔ چندر خاندان کے لوگ گوتم بدھ کے ماننے والے تھے۔ رسم و رواج ہندوؤں سے ملتے جلتے تھے۔ ۶۳۰ء میں چین کے مشہور سیاح ہوئن سانگ نے اسی علاقہ کا سفر کیا تھا۔ اُن کا بیان ہے کہ اس وقت یہاں بدھ مذہب کے تیس معبد تھے۔

پچھلی عالمگیر جنگ میں فوجی ٹھیکہ داروں کو یہاں بالکل اتفاقیہ طور سے تانبے کی ایک تختی مل گئی تھی جس پر ایک فرمان کھدا ہوا تھا۔ اس شاہی فرمان کے روسے سنہ ۱۲۲۰ء میں پٹی کیرا کے ایک بدھ مندر کو جاگیر عطا ہوئی تھی۔ یہ پٹی کیرا اسی علاقہ کے آس پاس تھا۔ سلیمان راجہ کے محل کی کھدائی قیامِ پاکستان کے بعد آثارِ قدیمہ کی پہلی کھدائی تھی مگر اس کام میں محکمہ کو امید سے زیادہ کامیابی ہوئی۔ کھدائی کے کام میں محکمہ کے ماہرین کے علاوہ پنجاب، ڈھاکہ اور راج شاہی یونیورسٹی کے دس طالب علم تھے اور تقریباً دو سو مزدور شریک تھے۔ کھدائی کے نتیجہ میں بدھ مت کا ایک وسیع معبد برآمد ہوا ہے۔ اور بہت سی ایسی نادر چیزیں ملی ہیں جن کی مدد سے اس زمانہ کی تاریخ و تہذیب کے بارے میں دلچسپ انکشافات ہوتے ہیں۔ آثار اور نوادر آٹھویں صدی عیسوی سے بارھویں صدی عیسوی تک کے ہیں۔

محل کی پائندازِ دہلیزی سڑک ۱۷۴ فٹ چوڑی ہے جس پر اینٹیں بچھی ہوئی ہیں۔ صدر دروازے کا پیش صحن ۴۷ فٹ چوڑا ہے۔ داخلہ کا بڑا ہال ۳۳ فٹ لانبا اور ۳۲ فٹ چوڑا ہے۔ ہال کے دونوں طرف حفاظتی کمرے ہیں، اس کے بعد زینہ، زینہ کے بعد صحن ہے، جس کے آگے ۴ ½ فٹ کا برآمدہ ہے اور پھر چالیس حجروں کا ایک سلسلہ ہے، شمالی فصیل، ۵۵ فٹ برآمد ہو چکی ہے، مغربی فصیل کی کھدائی چار سو فٹ تک پہنچ چکی ہے۔ محل کے اندر ایک مندر بھی ہے اور ایک خانقاہ کے وسیع آثار بھی ملتے ہیں دونوں پختہ اینٹوں کے ہیں اور ابھی تک کافی اچھی حالت میں ہیں۔ تعمیرات ٹھوس اور سنگین ہیں۔ اضافوں اور مرمتوں کے نشان جگہ جگہ ہویدا ہیں۔ معبد کی باہری دیواریں ۱۶ فٹ کے قریب موٹی ہیں فصیل آج بھی ۴ فٹ سے چھ فٹ تک باقی ہے، ماہرین کا اندازہ ہے کہ پوری خانقاہ میں ۱۲۰ حجرے ہوں گے۔ اب تک صرف چالیس حجرے برآمد ہوئے ہیں۔ یہ ساڑھے سولہ ساڑھے دس فٹ کے ہیں۔ پردے کی دیواریں ساڑھے پانچ فٹ دبیز ہیں۔ حجروں میں تکونے طاقچے بنے ہوئے ہیں۔ ان پر اس زمانہ کے پجاری بدھ کی مورتی اور دیا رکھتے ہوں گے بعض حجروں میں چبوترے بھی ہیں جو پوجا پاٹ اور دوسرے تیوہاروں میں کام آتے ہوں گے۔ ہر حجرے میں الگ الگ چولہا ہے۔ غالباً ہر پجاری اپنا اپنا کھانا پکاتا ہوگا، مشترکہ باورچی خانہ کا کوئی نشان نہیں ہے۔ سفالی برتنوں میں پچھلی کا پایا

سینیاں، اور لگنیں زیادہ ہیں۔ پانی کے لئے گھڑے ہیں، پیالے اور مرتبان بھی ہیں مٹی کے چراغ بہت ہیں، حجروں کے سامنے سیڑھیاں اور آگے ساڑھے آٹھ فٹ چوڑا برآمدہ ہے۔ ان حجروں سے بہت سی انمول چیزیں ملی ہیں جیسے چینی کا ایک ڈبہ یا پٹارہ۔ تانبے کی ایک نقشین تختی جس پر ۲۵ سطر کی عبارت درج ہے اور جب پڑھنے والے اسے حل کر لیں گے تو اس معبد کے بہت سے راز روشنی میں آ جائیں گے۔

سکوں میں ایک طلائی اور بارہ نقرئی سکے ملے ہیں، پختہ مٹی کی سرخی مائل بادامی رنگ کی ایک مہر بھی ہاتھ لگی ہے جس پر بدھ مذہب کا ایک مقدس نقش کندہ ہے۔ پدما پانی دیوی کی ایک برنجی مورتی، پختہ مٹی کی اور بہت سی تختیاں ہیں، نقشین اینٹیں ہیں، سادے اور نقشین سفالی برتن بے شمار ہیں۔ کنول کے پھول، مچھلیاں اور جالی والے نقوش اکثر برتنوں پر ہیں۔ تانبے کی منقش تختی ۵ انچ لمبی، آٹھ انچ چوڑی اور ۱/۴ انچ دبیز ہے۔ سامنے والے رخ پر شاہی تاج کا نشان ہے۔ دھرم چکر بنا ہوا ہے اور دو ہرن آمنے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ عبارت کی صرف ایک سطر کندہ ہے۔ تختی کی پشت پر صرف دھرم چکر ہے اور دو تہائی حصہ تحریر سے پُر ہے، باقی صاف ہے۔ تختی پر دو فرمان ہیں۔ پہلا راجہ آنند دیوکا ہے۔ دوسرا اس کے پسر بھاوا دیوکا جو پہلے فرمان کی تصدیق ہے۔ یہ دونوں راجہ مشرقی بنگال میں گزرے ہیں، عبارت کا رسم خط ناگری سے ملتا جلتا ہے۔ اس کا اصطلاحی نام "کا" ہے یہ خط نویں صدی عیسوی میں رائج تھا۔

سونے کا سکہ ویسا ہی ہے جیسا ساتویں اور آٹھویں صدی میں مشرقی بنگال کے اندر رائج تھا۔ چاندی کے بعض سکے ذرا خراب ہو گئے ہیں۔ لیکن نشانات ابھی تک بجنسہ باقی ہیں۔ سامنے والے رخ پر کوہانی بیل بیٹھا ہوا ہے، پشت پر ترسول، چاند اور سورج ہے۔ ایک نقرئی سکہ سب سے الگ تھلگ ہے، اس کی عبارت خط کوفی میں ہے۔ وہ رسم خط جو دورِ عباسیہ میں رائج تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ عرب اور بنگال میں بہت قدیم تجارتی تعلقات تھے۔

پدما پانی کی برنجی مورت بھی نہایت اہم ہے۔ پدما دیوی کنول کے تخت پر براجمان ہیں۔ یہ مورتی ۴ ½ انچ اونچی ہے اور پالا فنون کی آئینہ دار ہے۔ تخت کے پیچھے بدھ مت کا مقدس مقولہ درج ہے، "یے دھرما دہاس ہ مانا" یہی عبارت گوتم بدھ کی ایک اور مورتی پر بھی ملی ہے۔

برنجی ڈبہ یا پٹارہ سوا پانچ انچ اونچا ہے۔ دور ڈھائی انچ کے قریب اور دہانہ ڈیڑھ انچ کے قریب ہے۔ پختہ مٹی کی تختیاں اور اینٹیں اپنی زبان بے زبانی سے اس زمانے کی تہذیب کی داستانیں کہتی ہوئی سنائی دیتی ہیں۔ کھدائی کے دوران میں زمین کی ہر سطح سے مختلف قسم کے سفالی برتن برآمد ہوئے ہیں۔ بعض اصلی حالت میں ہیں اور بعض ٹوٹے پھوٹے لیکن اتنے محفوظ ہیں کہ ان کی ساخت اور سائز کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اکثر برتنوں کے پیندے نقشین ہیں اور بعض کی دیواریں بھی منقش ہیں۔ جہاں ڈبہ پہنا چینی والیوں کی تصویریں ہیں وہاں سفالی برتنوں پر اقلیدسی خطوط اور جالی دار نقوش بنے ہوئے ہیں۔ بہت سے ایسے چھوٹے چھوٹے برتن ہیں جو غالباً خاص خاص تہواروں میں کام آتے ہوں گے۔

ان کے علاوہ روز مرہ کے استعمال کی چیزیں بھی ملی ہیں جیسے لوہے کی کیلیں، زنجیریں، سنیاں، چکیاں، سنگ مالا کے دانے، شیشے کے کنگن، برنجی اور نقرئی انگوٹھیاں، سنسیاں، ٹھیکریاں۔ ان سب سے بھی اس زمانہ کے رہن سہن کا کافی اندازہ ہوتا ہے۔ چکیوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسالے پیسے جاتے تھے۔

ظاہر ہے کہ یہ نشانیاں بدھ مت کی یادگاریں ہیں جن میں اس کے زمانہ عروج کے آخری دور کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ نشانیاں ان آثار سے بڑی حد تک ملتی جلتی ہیں جو آج سے پچیس سال پہلے راج شاہی ضلع کی کھدائی میں پہاڑپور سے برآمد ہوئی ہیں۔ سلیمان راجہ کے محل کی ساخت اور وضع بھی پہاڑپور والے معبد سے بہت مشابہ ہے۔ خاص طور سے پختہ مٹی کی تختیاں قریب قریب ایک ہی سی ہیں۔

قوم کے خادم،

بہادر یار جنگ

بلیغ الدین

۲۵ جون ۱۹۴۴ء کو یکایک حیدرآباد دکن میں یہ خبر گشت کر گئی کہ نواب بہادر یار جنگ کا انتقال ہو گیا۔ لیکن اس خبر کو ماننے میں بڑا تامل ہوتا تھا۔ وہ تو پچھلے ہی دن نہایت ہشاش بشاش، چاق و چوبند تھے۔ پھر یکایک تیرِ قضا کا نشانہ کس طرح بن گئے۔ یہ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ تیزی سے ٹیلیفون گھومے، اخباروں کے لئے بھاگ دوڑ ہوئی تو معلوم ہوا کہ رات جسٹس ہاشم علی خاں کے پاس، جو ان کے بہت اچھے دوستوں میں تھے، کھانے پر مدعو تھے۔ اپنے گھر سے درسِ اقبال ختم کر کے چلے تھے، اس درس کے شرکاء خصوصاً ڈاکٹر رضی الدین مخاطب تھے اور اقبال کے مصرعے:

حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

کے معنی و مفہوم پر گفتگو ہو رہی تھی۔ دسترخوان بچھایا جا رہا تھا کہ کسی نے حقہ ان کے سامنے رکھا! نیچہ ہاتھ میں لیا، نہنال کو ہونٹوں سے لگایا، ایک کش میں چہرہ کا رنگ متغیر ہو گیا۔ ہاتھ پیر بے قابو ہو گئے، نیچہ ہاتھ سے چھوٹ گیا اور گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ لوگوں نے دوڑ کر سنبھالا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی! کیا ہو گیا؟ کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ ایسی اچانک افتاد پر حواس ٹھکانے رہیں، بہت مشکل ہے۔ لب گنگ اور عقل ماؤف تھی۔ کچھ کام کیا تو آنکھوں نے، جن سے آنسو تھمتے ہی نہ تھے۔

نواب مرحوم جو حیدرآباد میں عام طور پر "قائدِ ملت" کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے، ایک رئیس گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ انکے والد نواب نصیب یاور جنگ ثالث بڑے کلے ٹھیرے کے آدمی اور نظام کی بے قاعدہ فوج کے جمعدار تھے۔ جو کرنل کے برابر کا عہدہ ہے، ان کے آبا و اجداد معرکہ آرائیوں کے سلسلہ میں افغانستان سے چلے اور ہندوستان کی چند ایک ریاستوں کی فوجی تنظیم کرتے ہوئے دربارِ دکن پہنچے۔ جہاں وہ نیل کی تجارت کے سلسلہ میں آئے اور اپنی شجاعت اور اعلیٰ فوجی صلاحیتوں کی بنا پر جاگیر اور خطابوں سے نوازے گئے۔ پھر جو ایک بار یہاں رہے تو یہیں کے ہو رہے۔ ان کے جدِ امجد نواب نصیب یاور جنگ اول نے سلطنت کی بقا و استقرار میں بڑی مدد کی اور وفاداران ملک و عمائدینِ سلطنت میں خاص مقام حاصل کیا۔

فروری ۱۹۰۵ء کی کسی تاریخ نواب نصیب یاور جنگ ثالث کے محل میں ایک لڑکا تولد ہوا۔ خلفِ اول، محمد بہادر خاں نام رکھا گیا۔ جاہ و جلال، شان و طمطراق کے تمام مظاہرے ہوئے لیکن ابھی پورے طور پر خوشیاں منائی بھی نہ گئی تھیں کہ چھٹے دن آغوشِ مادری چھوٹ گئی۔ ساس سانسہ کے بعد تربیت کی ذمہ داری ان کی نانی نے سنبھالی۔ جو بڑی خدارسیدہ خاتون تھیں۔ بارہ برس تک انہوں نے اپنی خاص نگرانی میں رکھا۔ یہ پہلا مکتب تھا جہاں فکر و نظر کی صحیح تہذیب ہوئی۔ نواب خود کہا کرتے تھے کہ "مجھ میں جو کچھ ہے وہ انہی بارہ برس کا سرمایہ ہے۔"

عربی فارسی کی تعلیم گھر پر ہوئی پھر وہ دارالعلوم میں شریک کر دئے گئے۔ لیکن والد کی بے وقت موت کی وجہ سے تعلیم ادھوری رہ گئی اور دستاربندی نے آپ کو مسندِ امارت پر کھینچ لیا!

دولت کی اس گھرانے میں کمی تو نہ تھی لیکن خرچ کی زیادتی اور داد و دہش کی عادتیں کہیں زیادہ تھیں۔ چنانچہ جب نصیب یاور جنگ ثالث نے انتقال کیا تو قائدِ ملت کی عمر کوئی اٹھارہ بیس کے لگ بھگ ہوگی۔ وسیع جاگیر کے ساتھ بڑے بھاری قرض کا بوجھ بھی ورثہ میں ملا ــــ رئیسوں کے نقطۂ نظر سے اس بوجھ کو بوجھ نہیں سمجھتے تھے لیکن انہوں نے شب و روز کی تگ و دو سے بہت جلد گرتی ہوئی

عمارت کو سنبھال لیا۔ قرض سے نجات ملی تو اس عمر میں جب رئیسوں کے کھیل کھیلنے کا وقت آتا تھا، جامۂ احرام سر سے باندھا اور دربارِ رسالت مآب میں حاضری دی۔

حج بیت اللہ سے مشرف ہو کر نواب نے پھر بلادِ اسلامیہ کا ایک تفصیلی دورہ کیا۔ عرب، عراق، مصر، ایران، افغانستان اور ترکی کے رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں، مسلمانوں کی عام حالت اور ان کی حیاتِ ملی و سیاسی کا گہرا مشاہدہ کیا۔ وطن لوٹے تو ان کی فکر و نظر میں بڑی گہرائی اور بڑی وسعت پیدا ہو چکی تھی۔ مطالعہ کی عادت تو پرانی تھی لیکن اس مشاہدہ نے اسے جلا دی اور خدمتِ ملک و ملت کا جذبہ نکھر گیا۔

میلاد کی محفلوں سے ان کی عوامی زندگی کا آغاز ہوا۔ دکن میں آریہ سماجی یورش نے تبلیغ اور پھر ملک کی سیاست کی طرف متوجہ کیا۔ انہوں نے نئے سرے سے "انجمن اتحاد المسلمین" کی تنظیم کی۔ ریاستی مسلم لیگ کی بنا ڈالی، مسلم لیگ سے قریب ہوئے اور دن بدن قائدِ اعظم سے ان کی وابستگی بڑھنے لگی۔ شولاپور کے پلیٹ فارم سے پہلی مرتبہ انہوں نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں تقریر کی، اور پھر پٹنہ، الٰہ آباد، مدراس، دہلی، لاہور اور کراچی کا کوئی جلسہ ایسا نہ تھا جس میں نواب صاحب نے شرکت نہ کی ہو۔ وہ ایک دیسی ریاست کے باشندے تھے اس لیے مسلم لیگ کے باضابطہ رکن نہ تھے۔ لیکن قائدِ اعظم کے خصوصی مہمان کی حیثیت سے وہ ہر اجلاس میں شمعِ محفل بنے رہتے۔ ان کی شخصیت کا اثر طلسم بن کر پھیلتا گیا۔ جس نے ان کی تقریر سنی گرویدہ ہو گیا جس نے ان سے ملاقات کی ان کا ہو رہا۔ یہ حاشیہ آرائی نہیں، حقیقت بیانی ہے وہ مائکروفون کے سامنے آتے تو قائدِ اعظم گھڑی اور گھنٹی میز سے اٹھوا دیا کرتے اور پھر قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کا سا شعار رکھنے والا وہ رئیس زادہ ایک گلیم پوش تحفۂ نواز کے صحیح روپ میں جلوہ گر ہوتا۔ یہ میرا اپنا قیاس نہیں، سید سلیمان ندوی مرحوم، عبدالماجد دریابادی، میاں بشیر احمد اور خود قائدِ اعظم نے ان کے بارے میں فرمایا ہے۔

ان کی سیاست میں کرا دو رنگاہوں میں کرسی کا سحر کبھی بھی داخل نہ ہو سکا۔ ایک نہیں کئی مرتبہ انہیں وزارت کی پیشکش ہوئی لیکن ان کے لئے اس میں کوئی جذب و کشش نہ تھی ان کا خیال تھا کہ

"میں کرسی وزارت پر بیٹھ کر مہمات سلطنت پر غور کرنے نہیں بلکہ گردکوچہ و بازار ہنگامۂ قلوب کی دنیا میں طوفان برپا کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہوں۔ اقبالؒ کی زبان میں شاہین زادہ ہوں۔ میرا مقام دامنِ کوہ اور وسعتِ صحرا ہے۔ میں وہ مزدور ہوں جو راستہ تیار کرتا ہے کہ ملتِ اسلامیہ کی گاڑی آسانی سے منزلِ مقصود پر پہنچ جائے۔"

خطاب یافتہ جاگیردار کی حیثیت سے ان پر کچھ پابندیاں تھیں۔ ان کے لئے دو ہی راستے باقی رہ گئے تھے۔ نمائشی وفاداری کے ساتھ دربار سے وابستگی یا جاگیر و مناصب سے محرومی۔ نفس و ضمیر کی کشمکش کے لئے ایک عجیب کٹھن سی منزل تھی لیکن امتحان کی یہ ساعتیں بہت آسان بن گئیں، جب انہوں نے خود آگے بڑھ کر طبل و علم، عماری کٹاری، جاگیر و خطاب حکومت کی بارگاہ میں واپس نذر گذران دیا اور کچھ کہا تو اپنی قوم سے مخاطب ہو کر صرف یہ کہ:

"میرے آقائے مجازی نے میرے لئے دو راستے متعین کئے ہیں، ایک عطا، ایک سزا!! عطا کی تمنا اور سزا کا خوف میرے حسنِ عمل کو رائیگاں کر دیتا ہے۔ ایک طرف جاگیر اور خطاب کی حفاظت اور دوسری طرف ملت کی خدمت۔ مجھ سے زیادہ قابلِ گردن زدنی، تن آسان، بندۂ زر اور نمک حرام کوئی اور نہ ہوگا۔ اگر میں ایسے نازک وقت میں جبکہ ملت کی کشتی طوفان و بھنور میں گھر کر موت و زیست کی آخری کشمکش سے دوچار ہے، چپو کسی اور کے ہاتھ میں تھما دوں اور خود اپنے آشیانے کے لئے تنکا تنکا جوڑتا رہوں۔ الحمد للہ! کہ آج دیوانۂ کوئے محبت جیب و داماں کی فکر سے بھی آزاد ہو گیا۔"

گویا یہ شانِ امارت ایک روک تھی، ملت کی خدمت گذاری میں۔ کوئی اس نظر سے دار و رسن کی طرف دیکھنے لگے تو نگاہ کی بلندیوں کا کیا پوچھنا! فرماتے تھے:

عمر لیست کہ افسانۂ منصور کہن شد
من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

قائدِ اعظمؒ کی ذات سے انہیں بے انتہا عقیدت تھی۔ کوئی اور ہوتا تو مقبولیت کا نشہ سر چڑھ جاتا، قیادت کا جادو بولنے لگتا، لیکن جیسے جیسے ان کی ہر دلعزیزی بڑھتی جا رہی تھی، ان کی شہرت پھیل رہی

تھی، وہ سمٹ سمٹ کر قائد اعظم کی شخصیت سے قریب تر ہو رہے تھے۔ ان کی محبت اور عقیدت کا ایک واقعہ یاد آیا —— جب قائد اعظم پر قاتلانہ حملہ ہوا تو ایسوسی ایٹڈ پریس کے نمائندے نے اس کی اطلاع نواب صاحب کو دی۔ پھر کوئی اس کے بعد کا منظر دیکھتا! ان کی آنکھوں سے آنسو اُمڈ پڑے اور دل درد میں ڈوب گیا۔ وہ رات بھر گریہ وزاری کرتے رہے یا سجدے میں پڑے رہے۔ قریب سحر جب درِ قبول وا ہوتا ہے، انہوں نے دعا مانگی کہ:

"اے خداوندِ قدوس! اے ربِ عزوجل!! حیات و موت کے قادر!!! برصغیر ہند میں تیرے محبوب کی امت کا سراغ مسلم لیگ کے اس بڈھے رہنما کی زندگی کے چراغ سے وابستہ ہے۔ اگر تو نے اسے بھی بجھا دیا تو ملتِ مرحوم کی تباہی پر خون رونے والی ایک آنکھ بھی باقی نہ رہے گی۔ اگر اس خضرِ راہ کی حیات گھٹ گئی ہے تو اے میرے مالک اے ربِ ذوالجلال! میری زندگی کی ساری عرض مدت اس کے مقدر میں جوڑ دے اور حرم کی پاسبانی کے لئے میری زندگی کی یہ قربانی قبول فرما۔"

صبح ہوئی تو وہ پہلی ٹرین سے قائد اعظم سے ملنے بمبئی چلے گئے اور کچھ بہت زیادہ دن نہیں گذرے کہ چالیس سال سے بھی کچھ کم عمر میں یکایک ان کی زندگی کا رشتہ ٹوٹ گیا جو بہادر یار جنگ کو جانتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ وہ کس صدق و صفا کے انسان تھے۔ کیا عجب قدرت نے ان کی یہ دعا قبول کر لی ہو۔

عہدِ حاضر کے خطیبوں میں بہت سے قابلِ ذکر نام آتے ہیں۔ لیکن مرحوم کی شعلہ بیانی اور آتش نوائی اور ہی تھی۔

ان کی تقریروں میں بلا کی ادبی لطافت ہوتی تھی اور اکثر غالب اور اقبال کے اشعار سے مزین ہوتیں۔ تاریخ اسلام پر انہیں کافی عبور تھا۔ حدیث و قرآن کو سمجھ کر پڑھا ہی نہیں تھا بلکہ اس پر عامل تھے۔ دل میں خلوص اور زبان پر صداقت ایسے جوہر تھے کہ وہ نجی محفلوں میں بھی گفتگو کرتے تو جی چاہتا تھا، گھنٹوں سنئے اور سر دھنئے۔

قیادت کا منصب ان کو خوب جچتا تھا۔ سوجھ بوجھ، خوفِ خدا علم اور عمل ہر زاویے سے وہ درست تھے۔ گو وہ انگریزی سے کما حقہٗ بہرہ ور نہ تھے لیکن وقت کے تقاضوں کو خوب سمجھتے تھے۔ نئی نئی

(بقیہ صفحہ ۱۲۹)

مری کی کہانی

کرم حیدری

اس سال مری نے اپنی زندگی کے ایک سو سال ختم کرکے دوسری صدی میں قدم رکھا ہے۔ ۱۸۴۹ء میں جب انگریزوں نے سکھوں کو آخری بار شکست دے کر پنجاب کا الحاق کیا تو یہ دور افتادہ پہاڑیاں بھی قلمرو برطانیہ کا ایک عنصر بن گئیں۔ لیکن اس وقت مری نام کی کوئی جگہ نقشے پر موجود نہ تھی۔ یہاں اس پہاڑی پر جسے آج کل پنڈی پوائنٹ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ایک چھوٹا سا سنگین برج موجود تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ برج سکھوں نے بنوایا تھا۔ یہ برج ایک مختصر سے فوجی دستے کی قیام گاہ تھا۔ جو ایک طرف اردگرد کے کوہستانی دیہات پر اقتدار قائم رکھنے کا ذریعہ تھا، تو دوسری طرف کشمیر کی طرف جانے والے راستے کی نگرانی بھی کرتا تھا۔ اس برج کی طرز کا ایک اور برج راولپنڈی سے پہلے میں مشرق کی طرف پنڈی لاہور ریلوے لائن پر بنا ہوا ہے۔ اور ایک ذرا مختلف ساخت کا برج مری سے تین میل کے فاصلے پر کروڑ نامی گاؤں میں ہے۔ پنڈی پوائنٹ کے برج سے دوربین کے ذریعے ان دونوں برجوں کو آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ پرانے زمانے میں ان مختلف برجوں میں مقیم فوجی دستے آئینے اور جھنڈی کے ذریعے ایک دوسرے سے تعلق قائم رکھتے تھے۔ اور بوقت ضرورت ایک دوسرے کو کمک اور رسد کے لئے پیغام پہنچاتے تھے۔

پنڈی پوائنٹ کے اس برج کے نیچے پتھروں کی ایک گول ڈھیری سی ہے۔ روایت ہے کہ یہ ڈھیری ایک بزرگ عورت کی قبر ہے، جن کا نام بی بی مریاں یا بی بی مریم تھا۔ ان بزرگ عورت کے زمانۂ حیات کے متعلق کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ بی بی مریم خود مریم علیہا السلام تھیں۔ لیکن یہ بات نہ قرینِ قیاس ہے۔ نہ کوئی تاریخی شہادت اس کی تائید کرتی ہے۔ ایسی قبر کو مقامی زبان میں "مڑھی" کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی رعایت سے آج تک مقامی لوگ پنڈی پوائنٹ کو "مڑھی کی گلی" کے نام سے پکارتے ہیں۔ جب انگریز یہاں پہنچے۔ اور انہوں نے مقامی لوگوں سے اس جگہ کا نام دریافت کیا۔ تو انہیں یہی نام بتایا گیا۔ انہوں نے "مڑھی کی گلی" کو مختصر کرکے محض مڑھی کہنا شروع کر دیا۔ لیکن چونکہ انگریزی لب و لہجہ ڑ کی آواز سے ناآشنا ہے۔ اس لئے مڑھی، مری میں تبدیل ہو گیا۔ اور اسی نام سے یہ مختصر سا پہاڑی شہر آباد ہوا۔

انگریزوں نے اس مقام کی آب و ہوا اور قدرتی پیداوار کو دیکھا۔ تو ان کے دل و دماغ میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ گرمائی بارش، سرمائی برفباری سے گھری وادیاں اور ان وادیوں میں بہتی ہوئی صاف شفاف پانی کی ندیاں دیکھ کر ان کے پردۂ تصور پر سکاٹ لینڈ کی پہاڑیاں ابھر آئیں۔ شاہ بلوط اور صنوبر کے اونچے اونچے درخت جو ہندوستان بھر کے میدانی علاقوں میں کہیں نظر نہیں آتے، دیکھ کر انہیں اپنے وطن کے "شیر وڈ" کے جنگلات یاد آ گئے۔ دیارِ غربت میں کسی ہم وطن سے مل کر جو خوشی ہوتی ہے۔ وہی خوشی انگریزوں کو شاہ بلوط، صنوبر اور شمشاد کے درختوں کو دیکھ کر ہوئی۔ قدرتی مناظر کے اعتبار سے یہ مقام ان کے اپنے وطن سے اس قدر مشابہ تھا کہ انہوں نے یہاں ایک شہر بسانے کا فیصلہ کر لیا۔ اتفاق سے کشمیر کو جانے والی سڑک پر یہ ایک اہم مقام بھی تھا۔ اس لئے فوجی نقطۂ نظر سے بھی اسے بڑی اہمیت حاصل تھی۔ چنانچہ ۱۸۵۰ء ہی میں یہاں ایک فوجی چھاؤنی قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ دو تین سال تک ابتدائی تیاریاں ہوتی رہیں۔ اور بالآخر ۱۸۵۴ء میں مری کے نام سے ایک

کوہ مری

مصور : علی امام

نیا شہر صفحۂ ہستی پر اُبھرنے لگا۔

ہر چند کہ انگریز یہاں فاتح کی حیثیت سے آئے تھے اور اس تمام علاقے پر بلا شرکت غیرے انہیں ہر طرح کا تصرف حاصل تھا۔ تاہم ان کی فطری آئین پسندی نے یہ گوارا نہ کیا۔ کہ اُن لوگوں کی رضامندی حاصل کئے بغیر جنہیں پرانے کاغذاتِ مال کی رُو سے مالکانہ حقوق حاصل تھے۔ یہاں تعمیر شہر کا سلسلہ شروع کریں۔ چنانچہ انہوں نے مقامی مالکوں سے زمین حاصل کرنے کے لئے گفت و شنید شروع کی۔ یہ گفت و شنید پانچ سال تک جاری رہی۔ اور آخر ۱۸۵۵ء میں اس کا فیصلہ ہوا۔ موجودہ مری کی حدود پر مضافات کے بارہ دیہات کے مالکانہ حقوق تھے۔ یہ گاؤں مشپازی، ارواڑی، چارہان، رواٹ۔ تیپہ کیر۔ ملوٹ، رکھنی طاق، سندھیاں، دھار جاوا، نمب ٹبیل اور سالی تھے۔ ان بارہ دیہات میں سے گیارہ دیہات کے باشندوں نے اپنے حقوق کے عوض نقد قیمت لینے پر رضامندی کا اظہار کیا۔ لیکن بارھویں گاؤں کے لوگوں نے یکمشت رقم لینے کی بجائے سالانہ رقم لینے پر اصرار کیا۔ ان لوگوں کے مطالبات بالآخر منظور کئے گئے۔ اور مسٹر جے۔ ڈبلیو۔ ڈارلمپل نے ۲۳ رنومبر ۱۸۵۵ء کی ایک چٹھی میں سر جان لارنس چیف کمشنر پنجاب کو آگاہ کیا کہ گورنر جنرل اِن کونسل نے مشپازی کے علاوہ باقی گیارہ دیہات کے لوگوں کو ایک ہزار نو سو پینتیس روپیہ نقد دینے اور ایک سو چودہ روپے چار آنے مالیانے میں سے کم کرنے کی منظوری دے دی ہے۔ مشپازی گاؤں کے لوگوں کو پچاس روپے سالانہ ادا کئے جایا کریں گے۔ یہ رقم ۱۸۵۵ء کی فصل خریف سے لے کر آج تک باقاعدگی سے ادا کی جا رہی ہے ـــ

یہ فیصلہ صاف اور واضح ہے اور حکومت کے کاغذات میں اس کا تمام ریکارڈ موجود ہے۔ اس میں کہیں مری کے پچاس روپے کے عوض بکنے کا ذکر نہیں۔ لیکن نہ معلوم کس طرح مشہور ہو گیا کہ مری والوں نے صرف پچاس روپے میں انگریزوں کے ہاتھ مری کو بیچ دیا تھا۔ یہ افسانہ اتنی شہرت اختیار کر گیا۔ کہ آج بھی جو سیاح یہاں آتے ہیں۔ وہ اسے سنتے ہیں۔ اور اس پر یقین کر کے مری کے لوگوں کی سادہ لوحی پر ہنستے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی جس میں ہندوستان کے آزادی پسندوں نے برطانوی سامراج کے خلاف آخری مسلح جدوجہد کی تھی جو اس دُور افتادہ پہاڑی مقام کو بھی متاثر کر گئی۔ اور یہاں کی مختصر سی آبادی نے بھی ہتھیار اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ پہاڑی قبائل کے سرداروں کا ایک خفیہ اجلاس کسی دور افتادہ مقام پر ہوا۔ جہاں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ایک مقررہ تاریخ کو تمام قبائل مختلف اطراف سے مری میں مقیم برطانوی دستے پر ہلہ بول دیں گے۔ چنانچہ مختلف قبائل اپنی جنگی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ لیکن اس زمانے میں انگریزی اقتدار کا سورج ابھر رہا تھا۔ اور ہندوستان کے دوسرے مقامات کی طرح یہاں بھی اس کے پرستار پیدا ہو گئے تھے۔ انگریز کمانڈر کو قبل از وقت خبردار کر دیا گیا۔ اور اس نے فوراً راولپنڈی سے کمک منگوا کر اس خطرے کا مقابلہ کرنے کی تیاری کر لی۔ مقررہ تاریخ کو جب قبائلی سردار اپنے جوانوں کو لے کر جو توڑے دار بندوقوں، کلہاڑیوں، نیزوں اور لاٹھیوں سے مسلح تھے۔ مری پر چڑھ دوڑے تو انہوں نے انگریزی فوج کے چند دستوں کو استقبال کے لئے تیار پایا۔ ایک مختصر سی لڑائی ہوئی۔ جس میں باقاعدہ اور مسلح برطانوی فوج نے اس بے ترتیب ہجوم کو تتر بتر کر دیا۔ سینکڑوں لوگ مارے گئے۔ اور بیسیوں گرفتار ہو کر قید و بند میں ڈال دئے گئے۔ سر کردہ رہنماؤں کو ملٹری گراؤنڈ میں توپ دم کیا گیا۔ لوگوں نے انسانی اعضا کو روئی کے گالوں کی طرح دُھنتا ڈالا۔ گورے سپاہیوں نے دیوانہ وار مسرت کے قہقہے بلند کئے۔ اور تمام پہاڑ پر درد نالوں میں ڈوب گیا۔ ایک سردار کا سر کلمہ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے میدان سے قریباً ایک فرلانگ نیچے جا گرا۔ جہاں کسی دردمند مسلمان نے اسے ایک کچی قبر میں دفن کر دیا۔ کلفڈن روڈ پر یہ کچی قبر آج بھی عوام کی عقیدت کا مرکز بنی ہوئی ہے۔

آزادی کی اس جنگ کے بعد مری کے لوگ اس حقیقت کو سمجھ گئے۔ کہ تاریخ کا جو دور ختم ہو چکا اس کے لوٹ آنے کی کوئی اُمید نہیں۔ چنانچہ مایوسی کے عالم میں انہوں نے اپنے آپ کو تقدیر کے سپرد کر دیا۔ اور غیر ملکی سامراج کی اطاعت کا جُوا چار و ناچار اپنے کندھوں پر ڈال لیا۔ انگریزوں نے "بغاوت" کی پاداش میں ڈھونڈ قبیلے کے جوانوں پر فوج کا دروازہ بند کر دیا۔ اور ۱۹۱۴ء تک ان پر یہ پابندی عائد رہی۔ حتیٰ کہ پہلی جنگ عظیم میں انہیں سپاہیوں کی ضرورت نے مجبور کیا اور ڈھونڈ قبیلے کے لوگوں کو فوج میں بھرتی

ہونے کی اجازت حاصل ہوئی۔ چنانچہ ان لوگوں کے بیٹے پوتے جو برطانوی سامراج سے ٹکراتے تھے۔ اسی سامراج کی حفاظت کے لئے ہتھیلی پر سر لئے آگے بڑھے۔ اور یورپ اور ایشیا میں مختلف محاذوں پر داد شجاعت دیتے رہے۔

رفتہ رفتہ مری کی آبادی بڑھنے لگی تو کاروباری لوگوں نے بھی ادھر کا رخ کیا۔ یہاں کے کوہستانی لوگ تو کاروبار کی ابجد سے بھی ناواقف تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ راولپنڈی کے ایک قریبی گاؤں سے جس کا نام کوری تھا۔ بہت سے ہندو اور سکھ بنیئے یہاں پہنچے۔ پہاڑ پر تو جیسا دُنیا بن رہی تھی۔ نشیبی حصے ہیں۔ ان لوگوں نے ڈیرے ڈال دیئے۔ لکڑی کی کوئی کمی نہ تھی۔ درخت کٹوا کٹوا کر انہوں نے جھونپڑے بنوا لیئے۔ یہی جھونپڑے ان کے مکان تھے اور یہی دکانیں۔ جب کاروبار میں قدم جم گئے۔ اور مالی حالات مضبوط ہو گئی تو جھونپڑے غائب ہو گئے۔ اور ان کی جگہ پتھر کی پختہ دکانیں اور مکان نظر آنے لگے۔ مری کا یہ قدیم ترین کاروباری بازار گوری بازار کہلانے لگا جو آج تک اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔

بنیوں نے تھوڑے ہی عرصے میں اپنے کاروباری ہتھکنڈوں سے اس علاقے پر پورا پورا اقتصادی غلبہ حاصل کر لیا۔ وہ مقامی پیداوار کوڑیوں کے مول خرید لیتے۔ اور راولپنڈی کی منڈیوں میں لے جا کر مہنگے داموں بیچتے۔ وہاں سے گڑ، شکر، چاول، کپڑا، اور نمک لے کر آتے۔ اور یہاں مہنگے داموں بیچتے۔ آج مری کاروباری لحاظ سے بہت پست ہو گیا ہے۔ لیکن اس زمانے میں یہاں مقامی پیداوار کی بڑی منڈی تھی چنانچہ آج بھی ان بازاروں کو آلو منڈی۔ کنک (گندم) منڈی اور سبزی منڈی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

یہاں اُن دنوں بنکوں کا تصور بھی موجود نہ تھا۔ لوگ چوری چکاری کے ڈر سے روپیہ گھروں میں نہ رکھتے تھے۔ بلکہ انہی مہاجنوں کے پاس جمع کر دیتے تھے۔ یہ مہاجن امانتیں رکھنے پر بھی سود لیتے تھے۔ اور ان امانتوں میں سے قرض دے کر بھی بڑی بھاری شرح سے سود حاصل کیا کرتے تھے۔ پچیس تیس سال کے مختصر سے عرصے میں ان بنیوں نے علاقے کی تمام دولت کو اپنی مٹھی میں لے لیا اور مسلمان ان کے دست نگر بلکہ صحیح معنوں میں اقتصادی طور پر غلام ہو گئے۔ پہاڑ کے لوگ قدرتی طور پر جفاکش اور محنت کے عادی ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ دیس بدیس محنت مزدوری کرتے پھرتے اور ملازمتیں کرتے۔ لیکن اپنا خون پسینہ ایک کر کے جو کچھ بھی کماتے اس کا بڑا حصہ بنیوں کی نذر ہو جاتا۔ دو بڑی جنگوں میں ان لوگوں نے اپنی محنت سے بہت کچھ کمایا۔ لیکن بنئے نے سُود کے تانے بانے سے کچھ ایسا جال پھیلایا تھا کہ یہ اس کے چنگل سے چھٹکارا حاصل کر کے خوشحال نہ ہو سکے۔

مری میں دو سرسبز قدرتی سیر گاہیں ہیں۔ ایک تو وہی پنڈی پوائنٹ جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ اور دوسری کشمیر پوائنٹ۔ یہ دونوں مقام اُس سلسلۂ کہسار کی آخری پہاڑیاں ہیں جن پر مری آباد ہے۔ دونوں کے گرد ایک چکر کی صورت میں سڑکیں گھوم جاتی ہیں۔ کشمیر پوائنٹ کے چکر سے دریائے جہلم کی وادی دُور تک نظر آتی ہے۔ اور اس کے پیچھے کشمیر کے سربفلک پہاڑ دکھائی دیتے ہیں، جن پر ہمیشہ برف جمی رہتی ہے۔ کسی زمانے میں اس پہاڑی پر ایک مشہور ہوٹل تھا۔ جو سٹرابری ہوٹل کہلاتا تھا۔ یہ ہوٹل ۱۹۴۷ء کے فسادات میں جل گیا تھا۔ تین چار سال تک اس پہاڑی پر ویران کھنڈر رہے۔ آخر حکومت کی نظر انتخاب اس پر پڑی۔ اور گورنمنٹ ہاؤس کی تعمیر کے لئے اسے چن لیا گیا۔ پچھلے سال ہی گورنمنٹ ہاؤس مکمل ہوا ہے، جو دُور سے ایک قلعہ نما محل دکھائی دیتا ہے۔

کشمیر پوائنٹ کے قریب "پنج پانڈو پارک" ہے جو سفیدے اور شاہ بلوط کے تناور درختوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ ڈھلانوں پر میونسپل کمیٹی نے کیاریاں بنوا رکھی ہیں۔ جن میں اپریل، مئی اور ستمبر اکتوبر کے مہینوں میں بے شمار پھول کھلتے ہیں۔ اور تمام پہاڑی ایک تختۂ گل دکھائی دیتی ہے۔ پہاڑی کی چوٹی پر ایک چبوترہ بنا ہوا ہے۔ جسے پنج پانڈو کی بیٹھک کہا جاتا ہے۔ ہندوؤں کی ایک روایت کے مطابق پانڈو بھائی کشمیر جاتے ہوئے تھوڑی دیر کے لئے یہاں ٹھہرے تھے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے اس مقام پر ہر پورن ماشی کے روز میلہ لگا کرتا تھا۔ جس میں شہر بھر کے مرد، عورتیں اور بچے شامل ہوا کرتے تھے۔

پنج پانڈو پارک کے قریب ہی پانی کے تالاب ہیں۔ پہلے یہ تالاب سات تھے۔ لیکن پچھلے سال دو تالابوں کو ملا کر ایک کر دیا گیا ہے۔ جس سے ان کی تعداد چھ رہ گئی ہے۔ مری میں مقامی طور پر چشموں کی تعداد بہت کم ہے۔ ابتداءً جب یہ ایک چھوٹی سی جگہ تھی۔ تو انہی مقامی چشموں

کے پانی سے گزارہ ہو جاتا تھا۔ شہر بڑھنے لگا اور ارد گرد جھاڑیاں بننے لگیں۔ تو ان چشموں کا پانی ناکافی ہو گیا۔ چنانچہ ۱۸۹۷ء میں ٹانلے نامی ایک انگریز انجینئر کی نگرانی میں تین تالاب بنائے گئے۔ اور ڈونگا گلی سے جو مری ایبٹ آباد روڈ پر مری سے بیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ پائپ لائن بچھا کر مری تک پانی لایا گیا۔ ۱۹۲۶ء میں تین تالاب اور بنائے گئے۔ آخری اور سب سے بڑا تالاب ۱۹۴۶ء میں تعمیر کیا گیا۔ ان تمام تالابوں میں مجموعی طور پر پچاس لاکھ گیلن پانی ذخیرہ کیا جا سکتا ہے جو موسم گرما میں، جب مری بھرپور ہوتی ہے، تقریباً تین ہفتے کی ضرورت کے لئے کافی ہوتا ہے۔

پانی کی قلت کے مسئلے کو مستقل طور پر حل کرنے کے لئے چند سال ہوئے دریائے جہلم سے پانی درآمد کرنے کا ایک منصوبہ بنایا گیا تھا جس پر قریباً پچاس لاکھ روپے کا خرچ آتا تھا۔ حال ہی میں جوائنٹ واٹر بورڈ نے سولہ لاکھ روپے کے تخمینے سے ڈونگا گلی سے مری تک ڈبل پائپ لائن بچھانے کی ایک سکیم منظور کی ہے۔ توقع ہے کہ اس سکیم کے مکمل ہو جانے سے بہت زیادہ مقدار میں پانی درآمد کیا جا سکے گا۔ اور آئندہ پانی کی قلت کا اندیشہ نہ رہے گا۔

موسم گرما میں یہاں کی بارونق ترین تفریح گاہ مال روڈ کا وہ حصہ ہے جو سکینڈل پوائنٹ اور چوک گرجا گھر کے درمیان واقع ہے۔ چار فرلانگ کے اس ٹکڑے میں لوگ دن بھر چلتے پھرتے رہتے ہیں۔ لیکن سہ پہر کے وقت تو یہاں ایک میلہ سا لگ جاتا ہے۔ شہر کی تمام اطراف سے خلق خدا امڈ امڈ کر یہیں پہنچ جاتی ہے۔ اور بھیڑ بھاڑ کا وہ عالم ہو جاتا ہے کہ تیزی سے گزرنا محال ہوتا ہے۔ رات کے نو دس بجے تک لوگ ادھر سے ادھر گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ جب ذرا تھک جاتے ہیں۔ تو سکینڈل پوائنٹ پر یا چوک گرجا گھر پر کھڑے ہو کر تھوڑی دیر تکان دور کرتے ہیں۔ یا کسی ریستوران میں بیٹھ کر چائے پیتے اور گپ شپ اڑاتے ہیں۔ یہاں آئے ہوئے لوگ چونکہ ہالی ڈے موڈ میں ہوتے ہیں۔ اس لئے موضوع خواہ کتنا ہی سنجیدہ ہو۔ اُن کی گفتگو کا انداز کبھی سنجیدہ نہیں ہوتا۔ ملک کسی ہنگامی صورت حال سے دوچار ہو، بین الاقوامی سیاست میں الجھاؤ پیدا ہو رہے ہوں، ایک اور جنگ کے بادل منڈلا رہے ہوں، دنیا پر قیامت ٹوٹنے والی ہو، یہاں کی فضا کوئی خاص اثر قبول نہیں کرتی۔ اس ماحول پر وہی رنگینی اور بے فکری چھائی رہتی ہے۔ جو اس شہر کے آباد ہونے سے لے کر اب تک چلی آ رہی ہے۔ اور جب تک یہ شہر آباد ہے، قائم رہے گی۔

مری کی تاریخ کا یہ مختصر سا جائزہ نامکمل رہے گا۔ اگر یہاں کے تعلیمی حالات کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ تعلیمی اعتبار سے یہ علاقہ پاکستان کے پس ماندہ ترین علاقوں میں سے رہا ہے۔ یہاں ۱۹۲۶ء سے پہلے کوئی ہائی سکول نہ تھا۔ صرف میونسپل کمیٹی کے زیر انتظام ایک مڈل سکول قائم تھا جسے ۱۹۲۶ء میں گورنمنٹ نے ہائی سکول کا درجہ دے کر اپنی تحویل میں لے لیا۔ ۱۹۳۰ء میں پہلی بار اس سکول سے چار طلباء میٹریکولیشن کے امتحان میں شریک ہوئے۔ اس وقت سے لیکر آج تک اوسطاً بیس پچیس لڑکے ہر سال میٹرک پاس کرتے چلے آتے ہیں۔ ان میں بہت سے وہ بھی ہیں جو تقسیم ہند کے ساتھ واہگہ کے اس پار چلے گئے۔ چنانچہ اس تمام آبادی میں گریجویٹ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔

لڑکیوں کی تعلیم کا حال اور بھی خراب تھا۔ آج سے بیس پچیس سال پہلے شہر میں لڑکیوں کا کوئی سکول نہ تھا۔ ۱۹۳۵ء کے قریب لڑکیوں کے لئے ایک پرائمری سکول کھولا گیا۔ جو رفتہ رفتہ مڈل بنا اور تین چار سال سے ہائی اسکول بنا دیا گیا ہے۔ اس سکول میں سے دو چار لڑکیاں گذشتہ تین سالوں سے میٹرک پاس کر کے نکلتی ہیں۔ دیہات میں چند مڈل سکول ہیں اور کہیں کہیں پرائمری سکول۔ اب تعلیم نسواں کے خلاف لوگوں کا تعصب کم ہو رہا ہے۔ اور لوگ روز بروز لڑکیوں کی تعلیم کی طرف زیادہ توجہ دے رہے ہیں۔ جن دیہات میں لڑکیوں کے علیحدہ سکول نہیں۔ وہاں لڑکوں کے پرائمری سکولوں میں لڑکیاں بھی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ آج سے پندرہ بیس برس پہلے پرائمری درجے میں بھی مخلوط تعلیم کو گوارا نہ کیا جاتا تھا۔ اور یہاں بعض انگریزی سکول بھی بہت کامیابی سے چل رہے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد ان اسکولوں کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ آج کل پاکستان کے تمام حصوں سے بچے داخلہ لینے یہاں آتے ہیں۔ داخل ہونے کے خواہشمندوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ بعض اوقات ایک بچے کو کئی کئی سال تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔ یہ تمام اسکول اقامتی ہیں ۔

پیراں نمی پرند : —— بقیہ صفحہ ۸۴

بقیہ صفحہ ۸۴

معرکہ حق کے اسرار کھل رہے ہیں" وہ اس کے دروازہ کے گرد جمع ہو جاتے اور کان لگا کے ان آوازوں کو سنتے اس وقت ان سب کے دل خوف اور عقیدت سے لبریز ہوتے۔ آخر وہ دن آیا کہ عم متولی جھپٹ کر اپنے کمرہ سے نکلا۔ اس کے بال پریشان تھے اور آنکھیں دہکتے ہوئے انگارہ کی طرح سرخ۔ وہ اپنی تلوار دائیں بائیں گھماتا ہوا قریب کے قہوہ خانہ میں جا گھسا اور وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں پہ بے پناہ وار شروع کر دیئے۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا "بھاگ جاؤ، باغیو، بزدلو، بھاگ جاؤ" خلقت سراسیمہ ہو گئی۔ لوگوں نے ہجوم کر کے اسے پکڑنا چاہا اور کچھ دیر یہی سماں رہا۔ خدا خدا کر کے طوفان ٹھنڈا ہوا اور میں نے اس کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اب اس کی آواز نحیف ہو گئی تھی اور وہ کہہ رہا تھا "خدا کے بزرگ و برتر تیری شان اعلیٰ ہے اور تیرا بول بالا ہے۔ اس عاجز نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ میں مقدس جنگ لڑ چکا....." —— اور پھر اس کا جسم ساکت ہو گیا....!

(عربی سے)

دہلیز : —— (بقیہ صفحہ ۴۲)

(بقیہ صفحہ ۴۲)

وہ اندر اندھیرے میں قدم بڑھا رہی تھی کہ نیچے اتر رہی تھی، زمین میں سما رہی تھی۔ نشے کی ایک اور لہر سی آئی اور اس کے شعور پر چھانے لگی۔ ایک سرشاری کا عالم، ایک مبہم سا ڈر کہ کوئی بہت بڑا مرحلہ پیش آنے والا ہے، دھڑکا کہ جانے کیا ہو جائے۔ اس نے چلتے چلتے اپنے قدموں کے نیچے نرم نرم مٹی محسوس کی۔ مٹی جس پہ کبھی وہ ننگے پیر چلا کرتی تھی اور اس کے پاؤں کے نشان ایک ایک خط کے ساتھ اس پہ ابھر آیا کرتے تھے۔ اس نے قدموں کے قریب کی مٹی کو دیکھا۔ مٹی سے اسے فرض کیا وہ لہر یا لکیر کہاں تھی؟ مٹ گئی، یا کبھی ظاہر ہی نہیں تھی؟ کھونٹی کی طرف ہاتھ بڑھایا، چیلن اتارا۔ گرد میں اٹا ہوا میلا چیکٹ چیلن اس نے اسے پھر کھونٹی پہ ٹانگ دیا۔

کوٹھری سے جب وہ باہر نکل رہی تھی تو دماغ میں بسی ہوئی دلنشیں آندو خوشبو اڑ چکی تھی اور اس کے روکھے پھیکے بالوں جیسی بے رنگی اس پر غبار بن کر چھاتی جا رہی تھی۔

گلاب خاص : —— بقیہ صفحہ ۶۸

بقیہ صفحہ ۶۸

درختوں کی تمام ترقطاریں آتی چلی گئیں جیسے کسی مصنف کے شعور میں اپنی تصنیف کی سطر سطر رچی ہوتی ہے، مگر ان کی تفصیل تو اس کے دماغ سے چھین کر زمینداروں کے نقشوں خسروں میں لکھی ہوئی تھی، اور اس نے اس وقت محسوس کیا کہ وہ اس ماحول کو آج تک چھوڑ کر چلے جانے پر کیوں قادر نہ تھا، اور ذرا سی پھلوار کے سہارے کیوں یہاں پڑا رہا جبکہ شہر کے چوراہوں پر پھولوں کے ہار بیچ کر وہ ایک شام میں اتنا کما سکتا تھا جتنا یہ پھلوار اسے ایک ماہ میں بھی نہیں دے سکتی، اور آج اس علاقہ کو چھوڑتے وقت اسے پتہ چلا کہ ان باغوں کا پودا پودا دراصل اس کا بیٹا تھا اور جیسے وہ آج ہمیشہ کے لئے اپنے جوان تنومند بھاری بیٹوں کی بڑی لمبی چوڑی پھولی پھلی بستی چھوڑ کر تن تنہا جا رہا ہے اور وہ بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ برسات کی نم تاریکی میں اپنا سب کچھ، اپنے اتنے بہت سے نازک پالے دوسروں کے لئے پیچھے چھوڑ کر بیاتی ریلوے اسٹیشن کی جانب پھیلی ہوئی سیاہی میں حل ہو گیا۔ اور پیچھے پیچھے سندریا گلاب خاص کی نوخیز قلمیں بغل میں دبائے، شاید نئی دھرتی کی تلاش میں، جس کی چھاتی سے نیا دودھ پاکر اپنے گلاب خاص کو پروان چڑھا سکے۔

(نوٹ: اس افسانہ کے سب کردار اور مقامات فرضی ہیں)

خزاں نے لوٹ لیا —— بقیہ صفحہ ۸۰

بقیہ صفحہ ۸۰

دھاری دار ریشم نکالا۔ اسے سامنے پھیلا لیا۔ پریشان ہو کر مریض کے گلے کی طرف بار بار دیکھنے لگی۔ پھر منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگی "پہلے اس کا گلا —— گریبان کاٹ لوں ——"

پھر بڑی مہارت اور تیزی سے گریبان کاٹنے لگی۔ مگر قمیص کے گلے کے ساتھ اس کی دو انگلیاں کٹتے کٹتے رہ گئیں۔ اگرچہ بری طرح زخمی ہو گئیں!

خزاں کی آندھی اب تھم گئی تھی!!

جب وقت کی پابندی
اور
کام کی نفاست کا سوال ہو
تو
گولڈن بلاک
کی خدمات حاصل کیجئے
جہاں ہر قسم کے رنگین و سادہ لائن اور ہافٹون بلاکس
ڈیزائن اور سینما سلائڈز تیار کئے جاتے ہیں۔
گولڈن بلاک ورکس۔ ساؤتھ نیپیئر روڈ۔ کراچی

ماہرین فن
برماشیل ٹیکنیکل سروس اعلیٰ درجہ کے تربیت یافتہ اور تجربہ کار عملہ پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ اپنے فن کے ماہر ہیں اور کارخانوں کو کفایت کے ساتھ بہتر طور پر چلانے میں امداد دیتے ہیں۔ یہ لوگ نہ صرف تدہینی ضروریات کا جائزہ لیکر لبریکیشن سروے تیار کرتے ہیں بلکہ تحقیق و تجزیہ کے بعد سائنٹفک اصولوں پر لبریکیشن گائڈ بھی تیار کر کے دیتے ہیں۔ ہماری دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ٹیکنیکل سروس کے وسیع تجربوں کی بدولت یہ لوگ کارخانوں کے ارباب کار سے روزمرہ کے مسائل پر بے تکلفی سے گفتگو کر سکتے ہیں اور مفید مشورے دیتے ہیں۔ برماشیل کو فخر ہے کہ وہ اس طرح ملک کی صنعتی ترقی میں اعانت کر رہی ہے۔
LUBRICATION SYSTEM
برماشیل ترقی پاکستان کا ایک حصہ ہے۔
پاکستان شاہراہ ترقی پر

نئی مطبوعات

ش ۔ ح

افکار غالب

مصنفہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم
صفحات ۵۳۵، قیمت پانچ روپے
ناشر: مکتبہ معین ادب لاہور

غالب کے بارے میں اب تک جو داد تحقیق دی گئی اس کا زور زیادہ تر سوانح اور اشعار کی لفظی شرح پر رہا۔ غالب اہل فکر شاعر تھے اور کائنات و حیات انسانی کے بارے میں ان کا مخصوص طرز نظر اگرچہ یکسر نیا نہ ہو، تاہم فکر انگیز ہے اور جرأت آمیز بھی۔ اس کتاب میں جناب مصنف نے غالب کے اجزائے فکر کو حکیمانہ دقت نظر کے ساتھ پرکھنے اور انہیں ایک مربوط شکل دینے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کا مقدمہ جو ۵۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے، افکار غالب کا ایک مکمل جائزہ پیش کرتا ہے اور غالب کے تنقیدی ادب میں بلاشبہ ایک گرانقدر اضافہ ہے۔

کتاب کے بقیہ ابواب میں غالب کے منتخب اردو اور فارسی اشعار کی علیحدہ علیحدہ شرحیں لکھی گئی ہیں، جن میں لفظی موشگافی کے بجائے سچ مچ معارف کے دفتر کھولے گئے ہیں۔ یہ اشعار بہر صورت تشریح طلب نہ تھے بلکہ ڈاکٹر صاحب نے مبہم اشعار کو دانستہ نظر انداز کیا ہے اور صرف منتخب پُر مغز اشعار کی تشریح پر زور قلم صرف کیا ہے ۔۔۔ یہ شرحیں خاصی طولانی ہو گئی ہیں اور تکرار مطلب کے باعث بعض جگہ درسی کتاب کا سا مزا پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر ان کی افادیت اور کتاب کی مجموعی دلچسپی کا اعتراف شرط ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے علمی تصریحات کے ساتھ ساتھ تنقید شعر کے نہایت اعلیٰ مذاق کا ثبوت دیا ہے اور اس مقولے کے معنی الٹ کر رکھ دیئے ہیں کہ شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد؟ غالب کے فارسی اشعار کے معنی و محاسن کے بیان میں فاضل مصنف نے جو کاوش کی خاص طور پر قابل داد ہے، جو ویسے بھی بے توجہی کا شکار رہا ہے۔

بنگال میں اردو

(با تصویر)

مولفہ وفا راشدی
مکتبہ اشاعت اردو حیدرآباد (سندھ)
۲۹۶ صفحات قیمت (مجلد) پانچ روپے

اردو کے ان نوجوان بنگالی نژاد مصنف نے بنگال کے اردو ادیبوں کا یہ تذکرہ کوٹری (سندھ) میں بیٹھ کر ترتیب دیا ہے، جو خود ہی کچھ کم بات نہیں۔ کتاب کے لئے مسالہ یقیناً بڑی جستجو سے فراہم کیا گیا ہے۔ مصنف کے مآخذ اردو کے متداول تذکروں سے لے کر خانگی بیاضوں تک پہنچتے ہیں۔ کتاب کی ترتیب بڑی معقول اور مفصل ہے۔ اردو کی ابتدائی تاریخ بنگال میں اردو کی ترویج اور فروغ کے مختلف ادوار، (مع فورٹ ولیم کالج، مٹیا برج) بنگال کے ہندو ادیب، اہل قلم خواتین، صحافت، ادبی انجمنیں۔ غرض تمام متعلقہ موضوعات پر علیحدہ ابواب قائم کئے گئے ہیں اور در اصل تالیف کا حق ادا کر دیا ہے۔ مطبوعات کی ایک طویل فہرست بھی مرتب کی ہے۔ کتاب ادبی تنقید کے لحاظ سے امتیاز نہیں رکھتی۔ مگر معلومات کا وافر ذخیرہ مہیا کرتی ہے جو خاصا بصیرت افروز ہے۔ اردو کی اس خانہ خرابی کے وقت میں جبکہ اپنے اور پرائے سبھی اس زبان سے دست کش ہو رہے ہیں، اس کتاب کی اشاعت بہت بر وقت اور بڑی مفید ہے۔ بنگال میں اردو کے فروغ کا یہ کھلا ہوا بیان اس بات کی دلیل ہے کہ اردو کسی خطہ سے مخصوص تھی نہ فرقے سے، بلکہ ایک تہذیب کی ترجمان تھی، اور جہاں جہاں اس تہذیب کے آثار رہے، اس کا چرچا بھی رہا۔ خود مولف کی اردو تحریر بڑی شائستہ مگر ان کے گھر کی زبان بنگالی ہے۔ اگر وہ اس قسم کا کوئی تذکرہ بنگالی میں بھی لکھیں تو مفید ہو گا۔

چاند نگر

مصنفہ ابن انشا
۲۵۶ صفحات ۔ قیمت تین روپے (مجلد)
ناشر: مکتبہ اردو لاہور

یہ ابن انشا کی شاعری کا تازہ مجموعہ ہے جس میں ۱۹۴۷ء سے اب تک کا کلام ہے۔ "انشا جی" اردو کے نوجوان شاعروں میں کوئی ۱۵ سال سے متعارف اور جوہر شناسوں میں مقبول ہیں۔ ان کی نظموں اور غزلوں کا انداز بالکل اپنا اور بڑا دلپذیر ہے۔ دھیما دھیما لہجہ سلجھی سلجھی باتیں۔ انشا کی طبیعت میں بڑا گداز ہے مگر جذبات میں اسی قدر ٹھہراؤ بھی ہے۔ وہ کہیں بھی کھل کر نہیں برستے۔ ان کے دھیمے بولوں میں بڑی حرارت ہے مگر یہ کہیں بھڑکنے نہیں پاتی۔ ایک پر سوز لے ہے مگر کوئی جھنکار نہیں۔ بڑا گہرا احساس اور بڑے تلخ مشاہدات بھی ہیں مگر کوئی غصہ کوئی غوغا کوئی نعرہ نہیں۔

کوئی خیال کوئی یاد آرزو کوئی بڑے بہانے تھے جی کے گداز رکھنے کو

ان کی طبیعت نے ایسے بہت سے بہانے ڈھونڈے۔ ان کے موضوعات میں ان کی مشہور نظموں "بغداد کی رات" اور "شنگھائی سے لیکر" "کانک کا چاند" "ڈھلتی رات" "خزاں کی شام" اور "سیل امروز" تک بہت کچھ ہے جس میں مشاہدات کی ایک خاصی بڑی دنیا سمائی ہوئی ہے۔ مگر انہوں نے اپنی تہہ گدازی کی خوب تعبیر کی ہے۔ ؎

یہ بھی سچ ہے نہ کچھ بات جی کی بنی، سونی راتوں میں دیکھا کئے چاندنی
پھر یہ سودا ہے ہم کو پرانا سجن" اور جینے کا اپنے بہانہ سجن"

یعنی: "کیا کریں اپنی زندگی ہے یہی"۔ شاعر نے اپنے خود نوشت مقدمے میں اپنا اور اپنی شاعری کا بڑے شگفتہ اور فہمیدہ انداز میں ذکر کیا ہے۔ اور اکثر باتیں دل کو لگتی ہوئی ہیں۔ مگر نہ یہ کہ وہ میر کے تتبع میں رواں بحریں اختیار کرتے ہیں۔ ان کی بحروں کی تعریف روانی نہیں بلکہ نرم روی ہے۔ ہمیں اس پر بھی تعجب ہے کہ وہ کہیں کہیں ناموزوں مصرعے کیونکر باندھ جاتے ہیں، جو حروف علت کو بالکل نظر انداز کرکے بھی ٹھیک نہیں بیٹھتے۔ ان شاذ مثالوں سے قطع نظر اس ادبی خزاں گردی میں ہم انشائی، سلونی، دل تک پہنچنے والی شاعری کے اس نئے ستھرے مجموعے کو سر آنکھوں پر رکھنے کے لائق سمجھتے ہیں۔

حدیث عشق

(رباعیات بالتصویر)

۸۴ صفحات۔ اثر خواجہ عبدالحمید عرفانی
کتاب فروشی ابن سینا۔ طہران
قیمت ۱۵ ریال

خواجہ عرفانی کوئی چھ سال طہران میں پاکستانی سفارت خانے کے وابستۂ مطبوعاتی و مشاور فرہنگی رہے۔ ان کا ذوق فارسی ایران کے اکابر اساتذہ سے داد لے چکا ہے ان میں ملک الشعرا بہار مرحوم بھی شامل ہیں جنکی حیات پر عرفانی نے بڑی تحقیق سے ایک مقالہ بھی لکھا ہے۔ زیر نظر مجموعہ میں دکتر ناظم زادہ کرمانی کا تحریر کردہ مقدمہ شامل ہے جس میں ان کی ادبی خدمت کو بھی بہت اچھے الفاظ میں سراہا گیا ہے۔ عرفانی کی ایک اور تصنیف "رومی عصر" بھی علامہ اقبال کو ایرانیوں سے روشناس کرانے میں معاون ہوئی۔ اس مجموعے میں عرفانی کی فارسی رباعیات کے علاوہ چند نظمیں، چند غزلیں بھی ہیں۔ سارے کلام کا رنگ عارفانہ ہے۔ مگر اس کے پہلو بہ پہلو ان تصاویر کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے جن میں بڑی صفائی سے حسن پر عشق کو مچلتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ عرفانی کے کلام میں قند پارسی کی حلاوت کے ساتھ پاکستانی ارادتمندی اور خلوص دل بھی ہے جس نے اہل ایران کو ضرور متاثر کیا ہوگا۔ انہوں نے اپنی نظموں میں جیسے کہ معراج خیال، شیراز، آذربائیجان، ایران کی سرزمین سے اپنی عقیدت کا بڑے پُرخلوص پیرائے میں اظہار کیا ہے۔ عرفانی جدید فارسی میں بڑی عمدہ دستگاہ رکھتے ہیں۔ بقول ناظم زادہ "این شاگرد ہنر جوئے اقبال، قدرسا آہنگ خوش لہجہ دلکش فارسی را بہتر از بسیارے باز شناختہ گاہے شتابان وزمانے افتان وخیزان در رہے کہ گویندگان بزرگوار وسخنسرایان نامدار ما از آن گزشتہ اند، گام نہد وبا زبان شعر باہل دل پیغام می دہد"۔

ماہنامہ ساقی۔ کراچی جوبلی نمبر

۵۰۰ صفحات قیمت ۵ روپے
دفتر رسالہ ساقی کراچی نمبرہ

پچھلے چند مہینوں میں بعض رسائل نے نئے، دلچسپ موضوعات پر بڑی آب وتاب کے مجموعے شائع کئے۔ ساقی کا جوبلی نمبر اس سلسلے کی تازہ ترین اور بڑی وقیع تالیف ہے۔ جسے شاہد احمد کے خاص مددگار خالد حسن قادری نے بلاشبہ بڑی محنت سے مرتب کیا ہے۔ اس شمارے کی خصوصیت خاص پچیس سال کے پچیس تاریخی و تنقیدی جائزے ہیں جن میں "اردو زبان کے پچیس سال" سے لے کر ادب کی معروف اصناف حتٰی کہ صحافت، رسائل اور بچوں کے ادب تک کے "پچیس سال" پر علیحدہ علیحدہ مضامین شامل ہیں۔ ان کے علاوہ پاکستان وہند کی دوسری زبانوں اور عربی، فارسی، روسی، جاپانی، امریکی ادب کے پچیس سالہ جائزے بھی ہیں۔ دو مضامین "مشرق وسطٰی کے پچیس سال" اور "معاشیات کے پچیس سال" بھی شامل اوراق ہیں۔ اس سلسلے کو تا حد قیاس طول دیا جاسکتا تھا لیکن ساقی نے ایک ہی اشاعت میں جتنے کچھ موضوعات سمیٹ لئے وہ بھی بڑے حوصلے کی بات ہے۔ پچیس سال کے پچیس اردو افسانوں کا انتخاب ان پر مستزاد ہے۔ اگرچہ ان میں سے بعض نہ منتخب کہے جا سکتے ہیں نہ افسانے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح ہر موضوع کا حق ادا ہونا ممکن نہ تھا، مگر بیشتر مضامین کسی نہ کسی لحاظ سے مفید یا دلچسپ ہیں۔ اور پورا مجموعہ سچ مچ یادگار کہلانے کا مستحق ہے۔ اس چوتھائی صدی میں ساقی خود ایک انجمن رہا ہے جس سے بہت سے نامور ادیبوں کے نام اور کارنامے وابستہ ہیں۔ یہاں اس کی کا صرف ذکر ہی کرنا ممکن ہے جسے شاہد احمد نے باقی چھوڑ دیا یعنی "ساقی کے پچیس سال"۔ مگر ہم ساقی کو اس کی جوبلی اور جوبلی نمبر دونوں پر مبارکباد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ یہ ایک نئے، زندہ تر دور کا آغاز ہوگا۔

اُردو ادب اور نفسیات : ———— (بقیہ ص ۴۴)

سارا ناول اسی ایک کردار کے گرد گھومتا ہے۔ عصمت نے نہ صرف اس کی خارجی زندگی کی عکاسی کی ہے، بلکہ اس کے دل و دماغ کو بھی ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ کہیں اشاروں کنایوں میں، کہیں چٹکیاں لیکر صاف اور کھلے الفاظ میں چوٹیں کر کے انسانی نفسیات کے چہرے سے جس طرح نقاب اٹھائی ہے اور جس خوبصورتی اور باریکی سے نفسیاتی تجزیہ کی تکنیک کو اپنے آرٹ میں سمویا ہے، وہ ان کے سلیقہ اور کمال کی شاہد ہے۔ عصمت اگر نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کی روح کے اندر گھس کر ان کی فطرت کو بے نقاب نہ کرتیں، جو موجودہ دور کی الجھنوں سے ایک ٹیڑھی لکیر بنگئی ہے، تو شاید ہمارے لئے ایک سیدھا راستہ بنانے میں بہت بڑی دشواری پیش آتی۔

کرشن چندر کا ناول "شکست" بھی انہی جدید ناولوں کے زمرے میں آتا ہے۔ اس میں بھی خارجی واقعات و حقائق کے ساتھ ساتھ داخلی واقعات و کوائف کی بھی عکاسی کی گئی ہے۔ کرشن چندر کو نفسیاتی کیفیات کو بیان کرنے کا ملکہ حاصل ہے۔ اضطراری فعل بھی انسان کی : ماغی اور ذہنی کیفیات ظاہر کرتے ہیں اور کرشن چندر نے جہاں اضطراری افعال کا تذکرہ کیا ہے نفسیاتی حیثیت سے بہت کامیاب ہے۔

نفسیات اور ناول کے متعلق بحث کرتے ہوئے عزیز احمد کے ناول "گریز" کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تحت الشعور کے طوفان میں جنسی اور نفسیاتی ہلچل کی مصوری جس چابکدستی اور بے باکی سے عزیز احمد نے کی ہے، وہ انہی کا حصہ ہے۔ اس ناول میں بھی اور نفسیاتی ناولوں کی طرح کہانی ایک ہی کردار کے گرد گھومتی ہے اور دوسرے کردار پس پشت پڑ جاتے ہیں، یا ابھرتے بھی ہیں تو محض ہیرو کے کرداری نقوش اور ذہنی عوامل کو اجاگر کرنے کے لئے۔ یہ تضاد اور تقابل کا فنکارانہ اسلوب و انداز نفسیاتی حیثیت سے ناول کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ سارا ناول ہیرو نعیم کی ذہنی بے چینی اور اس کی غیر مطمئن زندگی کا غماز ہے۔ نعیم کی زندگی کے واقعات کہیں اس کے احساس کمتری کو نمایاں کرتے ہیں اور کہیں اس کو اس کی سیاسی غلامی کا احساس دلاتے ہیں، اور پھر اس شدت احساس کا ردعمل اور انتقامی جذبہ مختلف واقعات کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ غرضکہ سارا ناول عمل اور ردعمل کی ایک نفسیاتی داستان ہے جس میں قدم قدم پر جنسی کشمکشیں اور ذہنی الجھنیں اپنا رنگ دکھاتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر اور صالحہ عابد حسین نے بھی ایسے ناول لکھے ہیں جن میں تحت الشعور کا انکشاف اور نفسیاتی تجزیہ کا ردعمل ہے۔ دوسرے ناول نگار مثلاً رئیس احمد جعفری، رشیدہ اختر ندوی، اور عادل رشید وغیرہ نے بھی اپنے ناولوں میں نفسیاتی اشارے اور کنائے سے کام لیا ہے۔

غرضکہ اردو ادب میں ایسے نفسیاتی ناولوں کا فقدان نہیں جن میں فطرت انسانی سے نقاب اٹھائی گئی ہو۔ یہ ضرور ہے کہ بعض اچھے لکھنے والوں نے اس صنف سے بے توجہی برتی ہے اور افسانے کے محدود کینوس پر ہی اپنے مشاہدات پیش کرتے رہتے ہیں۔

(تلخیص) بشکریہ ریڈیو پاکستان لاہور و راولپنڈی)

لکیروں کی زبان : ———— (بقیہ صفحہ ۹۱)

اپنے گھر پر دعوت دی۔ وہاں کے دوسرے فنکاروں سے ملانے کے لئے۔

اس کے بعد میرا معمول یہ تھا کہ گھر سے نکلتا تو سکیچ پیڈ اور پنسل ساتھ لیتا۔ ہوٹل میں پہنچ کر تصویروں کی مدد سے کسی انگریزی داں کو ڈھونڈ نکالنا اور پھر اس کی مدد سے فنکاروں اور دوسرے لوگوں سے ملنا۔

اسپین کے سفر میں لکیروں کی زبان ہی میری زبان تھی۔ اور اسی کی مدد سے میں نے سب کام نکال لئے ۔

●

ایک اور صنم: (بقیہ صفحہ ۱۴)

بیوقوف بنا کر دوسروں کو فائدہ پہنچاتا ہے، اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے! "رنڈی کا کوٹھا اور پیر کا مزار بھی دو جگہیں ہیں جہاں میرے دل کو سکون ملتا ہے اور ان دونوں جگہوں پر فرش سے لے کر چھت تک دھوکا ہی دھوکا ہوتا ہے۔ جو آدمی خود کو دھوکا دینا چاہے، اس کے لئے اس سے اچھا مقام کیا ہو سکتا ہے۔" اس فلسفے کے باوجود بابو گوپی ناتھ جو کچھ کرتا ہے سوچ سمجھ اور جان بوجھ کر کرتا ہے۔ شاید اسی لئے بابو گوپی ناتھ کا کردار ایک دلکش رومانوی کردار سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، اس کے فلسفہ میں اس کی زندگی اور اس کے اعمال کا پورا جواز نہیں ملتا۔

یہ ماحول اور اس ماحول کے کردار منٹو کی اصل یادگار رہیں، اور انہی میں منٹو کے جوہر کا ثبوت ملتا ہے۔ منٹو کو دیوتا بنا کر پوجنے والوں کو یہ نہیں بھلانا چاہیئے کہ ابھی اردو اور اردو افسانہ نگاری کو بہت آگے جانا ہے۔ منٹو اور اس کی افسانہ نگاری اس سفر کا ایک ابتدائی مقام ہے، اگر ہم اسی پر مطمئن ہو گئے تو اگلی منازل اور زیادہ دور ہو جائیں گی۔

بہادر یار جنگ: (بقیہ صفحہ ۱۱۵)

تحریکوں کا جیسا اچھا تقابلی مطالعہ انہوں نے کیا تھا اور جیسا تجزیہ وہ کرتے تھے، بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ عربی اور فارسی سے تو خیر اچھی واقفیت تھی ہی لیکن آخر عمر میں انگریزی بھی خاصی سیکھ لی تھی اور اکثر مسلم لیگ کے سالانہ جلسوں میں قائد اعظم کے خطبات کا فی البدیہہ ترجمہ کیا کرتے تھے۔

ان کے اٹھ جانے سے کیا ہندوستان کیا پاکستان ہر جگہ کے مسلمانوں کو نقصان پہنچا۔

PLANNED
PROGRESS
ترقی
کی
بنیاد
صحیح
منصوبہ
کاری
لوہے اور فولاد کے بے شمار استعمال ہیں اور تہذیبِ حاضرہ کی
عمارت بڑی حد تک اسی پر قائم ہے۔
ترقی کی لازمی شرط صحیح منصوبہ کاری ہے۔ فیکٹریوں اور
عمارتوں کی تعمیر کے منصوبوں میں لوہا اور فولاد بڑی اہمیت رکھتا ہے
کسی طرح کی بھی تعمیر کرنی ہو، لوہے اور فولاد کی چیزوں کی ضرورت لازماً
پیش آئے گی۔
ایسے تمام موقعوں کے لئے:
"سندھ اسٹیل کارپوریشن" لوہے اور فولاد کا سامان تیار اور فروخت کرنے میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔
سندھ اسٹیل کارپوریشن
سٹیل ری رولنگ ملس کے مالکان
ہر قسم کے لوہے اور فولاد کا بنا ہوا سامان درآمد کرنے والے
اسٹیل ہاؤس: ویسٹ وارف روڈ۔ کراچی ۲
کیبل کا پتہ: "سندھ اسٹیل" فون ۲۲۱۵۲
("یونائیٹڈ")

RPM
آر۔ پی۔ ایم
کالٹیکس
کی
بابت . . .
موٹر کا وہ واحد تیل جو انجن کو
"لبری کیشن" مہیا کرتا ہے۔
(رجسٹرڈ ٹریڈ مارک)
موٹر کے انجنوں کی ساخت بڑی تیزی سے ترقی کر رہی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ موٹروں کیلئے نئے نئے عمدہ تیل بھی تیار کئے جا رہے ہیں۔ اب جو انجن بن رہے ہیں وہ "اندرونی کمبسچن" قسم کے ہیں۔ یہ انجن بہت طاقتور ہیں اور ان میں زیادہ دباؤ سے گاڑی کی رفتار بھی تیز ہوتی ہے اور وہ کام بھی بہتر دیتی ہے۔ ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بڑھیا قسم کے تیل کی ضرورت ہے۔ کالٹیکس نے پچاس سالہ وسیع تجربات کے بعد "آر۔ پی۔ ایم" تیار کیا ہے جس کے معنی ہیں "بھاری ڈیوٹی دینے والے انجنوں کا بہترین تیل"۔ جو آجکل کے اندرونی کمبسچن والے انجنوں کی ضرورتوں سے بڑھ چڑھ کر کام کرتا ہے چونکہ اس کے تیار کرنے میں اس کڑے سے کڑے کام کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے جو کل کو کہیں زیادہ ترقی یافتہ موٹر انجنوں سے لیا جائے گا۔ اس لئے "آر۔ پی۔ ایم" "کل کا تیل آج" ہے
صرف یہی ایک تیل ایسا ہے جو انجن کو چکنا اور محفوظ کرتا ہے۔
موٹر کے اس حیرت انگیز تیل کی بابت اپنے دوست، کالٹیکس ڈیلر سے دریافت کریں۔
وہ خوب جانتا ہے کہ یہ تیل کس طرح انجن کو
چکنا بھی کرتا ہے اور محفوظ بھی۔
RPM
MOTOR OIL
SAE
CALTEX
PETROLEUM PRODUCTS
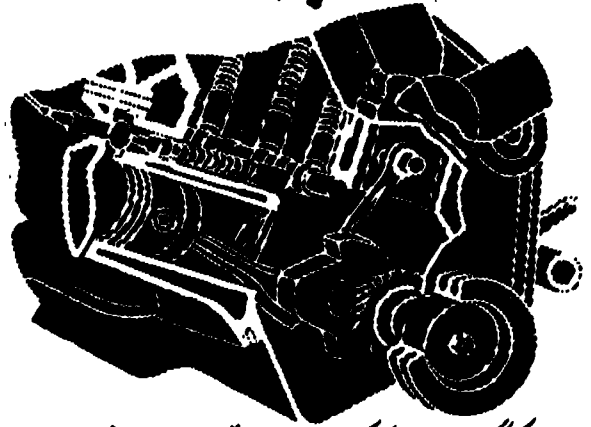
ستمبر ۱۹۵۵ء

رشید ترابی عشرت رحمانی مطلوب الحسن سید رحمٰن مذنب
حفیظ ہوشیارپوری روش صدیقی زیبا ردولوی احمد فراز

کراچی

ماتمی

تعزیات

محرم

جلد ۵ شمارہ ۶ ستمبر ۱۹۵۵ء

مدیر: — رفیق خاور

نائب مدیر: — ظفر قریشی

پاکستان (اور ہندوستان) میں سالانہ چندہ پانچ روپے آٹھ آنے۔ فی کاپی پاکستان (اور ہندوستان) میں آٹھ آنے۔

آپس کی باتیں

ایک یاد، ایک احساس پھر ہمارے دل کے تاروں کو چھیڑتا ہے اور ہم اسی صدائے درد کی بازگشت سنتے ہیں جو آج سے چھ برس پہلے قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کی وفات پر بلند ہوئی تھی، جب ہم نے یہ محسوس کیا تھا کہ قوم کے سر پر ایک حادثۂ عظیم گزر گیا، ایک ایسی عزیز ہستی کا دامن ہم سے چھوٹ گیا جو فی الحقیقت متاعِ کارواں تھی۔ ہم اس بابائے ملت سے محروم ہو گئے جنہوں نے ہمیں آزادی کا فسوں پرور خواب دکھایا تھا، اس کو پورا کرنے کے لئے سرتوڑ کوشش کی تھی اور اس وقت تک دم نہ لیا جب تک ہم ان کی رہنمائی سے قومی امیدوں اور آرزوؤں کی محبوب منزل کو پانے میں کامیاب نہ ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے ہماری قائدِ اعظمؒ کے ساتھ عقیدت بڑھتی جاتی ہے اور ہمارے دلوں پر ان کی عظمت کا نقش اور گہرا ہوتا جاتا ہے۔

قائدِ اعظمؒ نے اس برصغیر کے حالات اور مسائل کو جس سلجھی ہوئی نظر سے دیکھا تھا وہ آج بھی ہمارے لئے بصیرت افروز ہے اور ہر قدم پر ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ ان سے زیادہ اجنبی حکومت کے سیاسی مقاصد کو اور کون جان سکتا تھا جس نے اپنی استعماریت کو مستحکم کرنے کے لئے ہر طرح کی تدابیر اختیار کی تھیں، اور ایسے علاقوں کو بھی جو ہر اعتبار سے ایک تھے، مصنوعی حدبندیوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ یہی حکمتِ عملی تھی جس نے مغربی پاکستان کی وحدت پارہ پارہ کر دی اور صوبائی تعصبات کو ہوا دی۔ قائدِ اعظمؒ ان مصنوعی حدبندیوں اور ان کے مضر اثرات سے پوری طرح باخبر تھے۔ ان کی نظر میں سارا علاقہ ایک تھا۔ یہ محض وقت پر موقوف تھا کہ ان مصنوعی حدبندیوں کو دور کر کے مغربی پاکستان کی حقیقی اور بنیادی وحدت کو نمایاں کر دیا جائے۔ اس سلسلہ میں قائدِ اعظمؒ کے احساسات اور تصورات کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ یہ ایک پائدار ہیئتِ سیاسی کی تشکیل میں ہماری رہنمائی کریں گے۔ کیونکہ ان پر بابائے ملت کی ذاتِ بابرکات اور ان کی نگاہِ پاک بیں کا پرتو ہو گا۔ اس شمارہ میں "قائدِ اعظمؒ اور مغربی پاکستان" کے زیرِ عنوان بعض دلچسپ حقائق بیان کئے گئے ہیں۔

ابھی اردو کے تین نامور اہلِ قلم۔ سعادت حسن منٹو، ڈاکٹر اعظم کریوی اور مولانا چراغ حسن حسرت کا داغِ مفارقت تازہ ہی تھا کہ دو اور ممتاز بزرگوں کی وفات کا سانحہ سہنا پڑا۔ وہ ستارے جو کل ہمارے افقِ ادب پر آب و تاب کے ساتھ جگمگا رہے تھے۔ اس طرح نابود ہو گئے کہ مطلع دفعتہً تاریک معلوم ہونے لگا۔ خواجہ حسن نظامی کی وفات بجائے خود ادب کے لئے کچھ کم سانحہ نہ تھی۔ اسی کے ساتھ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کے انتقال کی خبر بھی سننی پڑی۔ خواجہ صاحب ایک درویش سیرت بزرگ اور کئی حیثیتوں سے اپنے دور کی ایک نمایاں شخصیت تھے۔ لیکن ادب میں ان کی ذات ایک مجتہدانہ حیثیت رکھتی ہے۔ انہوں نے سادہ و سلیس تحریر میں جس خوش اسلوبی سے علم و حکمت کے گوناگوں موتی پروئے اور ادب و فن کے رنگا رنگ پھول کھلائے، وہ انہی کا حصہ ہے۔ اور رہتی دنیا تک یادگار رہیگا۔ انہوں نے اردو زبان کو کیسے سنوارا اور اس کے ادب کو کیونکر مالامال کیا؟ یہ دلچسپ کہانی ہمارے جواں سال ناقد ابوالخیر کشفی کی زبانی سنئے۔

دوسرے بزرگ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی اپنی عالمانہ تحقیق کے لئے علمی و ادبی حلقوں میں معروف و مقبول تھے، السنۂ مشرقیہ پر خاص عبور رکھتے تھے۔ انہوں نے تحقیق کے اس سلسلہ کو بڑی کاوش سے آگے بڑھایا جس کا آغاز مولانا شبلی نے کیا تھا، اور جسے سید سلیمان ندوی، مولانا وحید الدین سلیم اور حافظ محمود شیرانی نے جاری رکھا تھا۔ قاضی صاحب کی تازہ تصنیف "اقبالیات کا تنقیدی جائزہ" "اقبال اکاڈمی" نے حال ہی میں شائع کی ہے۔ افسوس ہے کہ موت نے ہمیں اس مخزنِ علم و حکمت کے فیض سے محروم کر دیا۔

مرثیہ ہمارے ادب کی ایک مقبول اور شائستہ صنف ہے، جو دوسری زبانوں کی کئی اصناف کا جواب سمجھی جا سکتی ہے۔ موضوع اس کا وہ یادگار وقعہ شہادت ہے جو ہر دور کے لئے یکساں بصیرت افروز اور اخلاق آموز ہے۔ ایک جدید مرثیہ اور نیا سلام، جو اس شمارے میں شامل ہیں، یقین ہے کہ ان ایامِ عزا میں خاص پسندیدگی کی نظر سے دیکھے جائیں گے۔

سالارِ قوم

مطلوب الحسن سیّد

ہم میں سے اکثر قائد اعظمؒ کو بہت دور ہی سے جانتے ہیں۔ یہ سچ ہے وہ ہمارے بہت ہی محبوب اور ہر دلعزیز رہنما تھے، ہمیں ان کے دلی محبت تھی، پھر بھی وہ "قائد اعظمؒ" تھے، "بابائے ملت" تھے، دنیا کی سب سے بڑی شخصیت" تھے۔ ان کی ذات میں وہ سطوت، وقار تھا جو ایک عظیم انسان کو کہیں دور ایک پُر جلال اور بعید نگاہ دنیا میں لے جاتا ہے اور عام انسان اس کے قرب اور بے نفسی کو ترستے رہ جاتے ہیں۔ ہمیں رشک آتا ہے کہ عظمت اس طرح ایک انسان کو ہم سے چھین لے اور ہم اس کو یوں دور ہی سے دیکھتے رہ جائیں۔ گویا وہ ایک خنک مجسمہ یا آسمانی ہستی ہو، ایک زندہ انسان نہیں۔ اور ہم میں، اس میں وہ تپاک، وہ گرمجوشی کبھی پیدا نہیں ہو سکتی جو انسانی رگوں میں "چہکتے بولتے لہو" کی نمایاں خصوصیت ہے۔ قائد اعظمؒ کا یوں عظمت و جلال کی تیغ زدہ دنیا میں روپوش ہو جانا ایک عظیم حادثہ ہے کیونکہ وہ ایک بڑی شخصیت ہونے سے پہلے ایک زندہ دل انسان تھے، اس قدر کہ اس حیثیت سے ان کی بڑائی ایک مدبر اور قائد کی بڑائی سے کہیں زیادہ ہے اور ہم ان کو اس حیثیت سے جان کر کہیں بہتر اور ولولہ انگیز اثر محسوس کرتے ہیں، بلکہ میری رائے میں تو قائد اعظمؒ کی غیر معمولی فہم و فراست اور سیاسی حکمت و تدبر کے علاوہ ان کی بے پناہ بذلہ سنجی اور زبردست ندرتِ طبع نے بھی ان کی کامیابی میں نمایاں حصہ لیا۔ قائد اعظمؒ کی شخصیت کے سلسلہ میں ان کی براقیٔ طبع کو نظر انداز کر دینا ایک بڑی غلطی بلکہ ان کے ساتھ بہت بڑی بے انصافی ہوگی اور انگریزی کے مشہور قول کے مطابق "ہیملٹ" کا ڈرامہ، شہزادہ ڈنمارک کے بغیر لکھنے کے مترادف ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں میری کوشش یہ ہوگی کہ میں اس ڈرامہ کو اس اہم کردار کے ساتھ ہی پیش کروں یعنی اس قریبی تعلق کی بنا پر جو مجھے قائد اعظمؒ کے ساتھ حاصل رہا ہے، میں چند ایسے واقعات منظرِ عام پر لاؤں جو ان کی شخصیت کے انسانی پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں۔

بمبئی میں ایک دفعہ قائد اعظمؒ کی طبیعت ناساز ہو گئی۔ میں نے یہ سوچ کر کہ ملک میں اطلاع ہوتے ہی لاکھوں ہاتھ ان کی طبیعت کی بحالی کے لئے اٹھ جائیں گے اخباروں کو اطلاع دینا چاہا۔ مگر میں ٹیلیفون پر یہ خبر نشر کر ہی رہا تھا کہ قائد اعظمؒ نے مجھے بلایا اور پوچھا کہ میں نے بغیر ان کی اجازت کے ان کی بیماری کی خبر کیوں شائع کی۔ اور کہا کہ یہ کوئی بری بات تو نہیں۔ مگر میں نہیں چاہتا کہ ہماری قوم کو فضول تشویش ہو۔ کتنا فرق تھا، ان کے مزاج میں اور بعض اور لیڈروں کے طور طریق میں: جب دوسروں کے متعلق چھوٹی بڑی، معمولی اور غیر معمولی خبریں شائع ہوتی تھیں تو وہ کہا کرتے تھے یہ تو معیار سے گری ہوئی باتیں ہیں۔

۱۹۳۶ء کے اجلاس مسلم لیگ میں جب قائد اعظم لکھنؤ تشریف لائے تو میں نے ان کو پہلی بار قریب سے دیکھا۔ وہ اجلاس کی منتخب کمیٹی کی صدارت کر رہے تھے، اور زیر بحث وہ قرار دادیں تھیں جو دوسرے روز کھلے اجلاس میں پیش ہونے والی تھیں۔ کمیٹی میں اراکین کو جھگڑتا دیکھ کر مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ان میں مفاہمت کی گنجائش ہی نہیں۔ اور میں یہ سمجھا کہ اس کی نشست تو شاید مہینوں بھی ختم نہ ہو۔ مگر قائد اعظمؒ کی طرف جب نگاہ اٹھتی تھی تو میں ان کو نہایت متانت سے بیٹھے سگریٹ پینے میں مشغول پاتا تھا، جیسے کہ کچھ ہو ہی نہ رہا ہو۔ جب مختلف آراء کے لوگ اپنا اپنا نظریہ پیش کر چکتے تھے تو پھر

قائداعظمؒ کھڑے ہوتے تھے۔ اور چند ہی الفاظ میں تمام مقررین کے اعتراضات اور توہمات پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنا نظریہ نہایت ہی مختصر تقریر میں کمیٹی کے سامنے پیش کرکے پوچھتے تھے "کچھ اور کہنا ہے آپ لوگوں کو؟" نشست کے کونے کونے سے آواز آتی "کچھ نہیں"۔ تو پھر وہ کہتے "اچھا تو یہ قرارداد بالاتفاق رائے منظور ہوئی"۔ اور اس طرح وہ کمیٹی وقت مقررہ میں ہی ختم ہوگئی۔

اسی کمیٹی میں ایک قرارداد پر مولانا حسرت موہانی مرحوم اڑ گئے اور انہوں نے اعلان کیا کہ ان کو مجلس کی رائے سے اتفاق نہیں اور خواہش ظاہر کی کہ ان کو لیگ کے کھلے اجلاس میں اس قرارداد کے خلاف بولنے کی اجازت دی جائے۔ قائداعظمؒ کو یقین تھا کہ مولانا مرحوم اس قرارداد کا مطلب اچھی طرح نہیں سمجھے اور اگر کھلے اجلاس میں انہوں نے اس کے خلاف تقریر کی تو اس کے سوا اور کچھ نہ ہوگا کہ لوگ ان کا مذاق اڑائیں۔ کتنی آسان بات تھی قائداعظمؒ کے لئے کہ وہ ان کو اجازت دیدیتے اور مولانا کو خود معلوم ہو جاتا کہ کثرت رائے کیا تھی۔ مگر ساتھ ہی ساتھ مولانا کی دل شکنی اور ان پر کوئی دباؤ ڈالنا بھی منظور نہ تھا۔ اور پھر یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ دوسروں کو کہنے کا موقع ملے کہ مسلم لیگ میں نفاق پیدا ہوگیا۔ چنانچہ وہ کھڑے ہوئے اور ایک نہایت دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ مولانا کو خطاب کرکے کہا کہ مسلم لیگ تو جمہوری حیثیت رکھتی ہے۔ اگر کمیٹی میں مولانا سمجھتے ہیں کہ ان کو شکست ہوگئی ہے تو آئندہ اجلاس کا انتظار کریں اور اس میں فیصلہ کو بدلنے کی کوشش کریں۔ اس دوران میں ان کے پاس کافی وقت ہوگا کہ وہ اراکین کو اپنے نظریہ پر مائل کرسکیں۔ مولانا کی طبیعت چونکہ خود جمہوریت پسند تھی۔ انہوں نے قائداعظمؒ کی اس تجویز کو فوراً منظور کرلیا۔ اور اس سال وہ قرارداد بالاتفاق رائے کھلے اجلاس میں منظور ہوئی۔

مدراس کے اجلاس کے بعد قائداعظمؒ نے ایک دوست کے اصرار سے اوٹاکمنڈ کی پہاڑیوں میں دو ہفتے گذارنے کا فیصلہ کیا۔ وہاں کا خوشگوار موسم، سیاست کے ہنگاموں سے دوری اور ساتھ ہی ساتھ خاموش آرام ان کو موافق آئے اور ان کی صحت درست ہونے لگی۔ قیام کی میعاد ختم ہونے پر وہ بمبئی روانہ ہوئے سا ورطے کیا کہ اوٹاکمنڈ سے میسور تک اسی میل کا فاصلہ بذریعہ موٹر کار طے کیا جائے۔ چنانچہ ہم سب لوگ دو موٹر کاروں میں بیٹھ گئے۔ اگلی کار میں محترمہ مس فاطمہ جناح، قائداعظمؒ اور میں تھے اور پچھلی کار میں ہمارے میزبان اور دو حضرات اور تھے۔ راستے میں تکان محسوس ہوئی اور قائداعظمؒ نے فرمایا کہ کسی جگہ اتر کر ٹہل لیا جائے۔ پھر رائے یہ ہوئی کہ قریب ہی ایک ریلوے اسٹیشن ہے، وہاں چائے پی جائے۔ چند منٹ میں ہم لوگ وہاں پہونچ گئے۔ اور اسٹیشن میں داخل ہوئے۔ محترمہ تو اسٹیشن کے ہوٹل میں چاء کے انتظام میں مشغول ہوگئیں اور میں قائداعظمؒ کے ساتھ پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر بعد لوگوں نے قائداعظمؒ کو پہچان لیا اور اچھی خاصی دھوم سی مچ گئی۔ قائداعظمؒ نے بھی اس کو محسوس کیا اور بولے "اسے کہتے ہیں چاء کی پیالی میں طوفان!"

وہ لوگ جو قائداعظمؒ کو مسلم لیگ کے صدر یا قوم کے زعیم کی حیثیت سے جانتے ہیں یا پھر ان کو ایک بڑے مدبر کی حیثیت سے پہچانتے ہیں۔ بہت کم ایسے ہیں جن کو ان کی ذاتی زندگی سے واسطہ پڑا ہے۔ وہ لوگ جن کو یہ شرف حاصل ہوا ہے بخوبی جانتے ہیں کہ قائداعظمؒ کبھی بھی موقع ملتے جملے چست کئے بغیر نہیں رہتے تھے۔

اوٹاکمنڈ کے سفر کا ہی واقعہ ہے۔ جب ہم میسور کے قریب پہونچے تو ہمارے میزبان کے صاحبزادے کی رائے ہوئی کہ قریب کے گھوڑ دوڑ کلب میں کچھ وقت صرف کیا جائے۔ چنانچہ ان کے اصرار پر یہ طے ہوا کہ قائداعظمؒ اور مس فاطمہ جناح تو میسور کا سفر جاری رکھیں اور میں ان صاحبزادے کے ساتھ کچھ دیر کلب میں ٹھہر جاؤں۔ اس زمانے میں یورپ میں گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی اور جرمن فوجیں ادھر ادھر مار دھاڑ میں مصروف تھیں۔

رات کے وقت ہم لوگ کلب پہونچے۔ وہاں بینڈ کے ساتھ یورپین مرد اور عورتیں رقص کر رہی تھیں۔ میں بھی ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میری طرف ایک بوڑھی عورت آئی اور کہا کہ آج سنیچر کی شام کو تمہارا جیسا نوجوان اس طرح اکیلا بیٹھا اچھا نہیں معلوم ہوتا، ناچ میں شرکت کیوں نہیں کرتے؟ میں نے کہا کہ مجھے تو مغربی ناچ نہیں آتا۔ ہمارے ساتھی کو معلوم نہیں کیا شرارت سوجھی کہ انہوں نے بڑھیا کو شہ دیدی، وہ میرے سر ہوگئی اور زبردستی ناچ کے فرش پر گھسیٹ کرلے گئی۔ بہرحال تھوڑی دیر بعد میں نے اپنا پیچھا چھڑایا اور واپس آیا۔

تقریباً سورج نکلتے وقت ہم میسور پہونچ گئے اور حسب معمول

(باقی صفحہ ۸۵ پر)

قائد اعظم رحمۃاللہ علیہ

قیام پاکستان کے بعد تمام قبائل
سرحد کے پہلے تاریخی جرگے سے
قائد اعظم کا خطاب
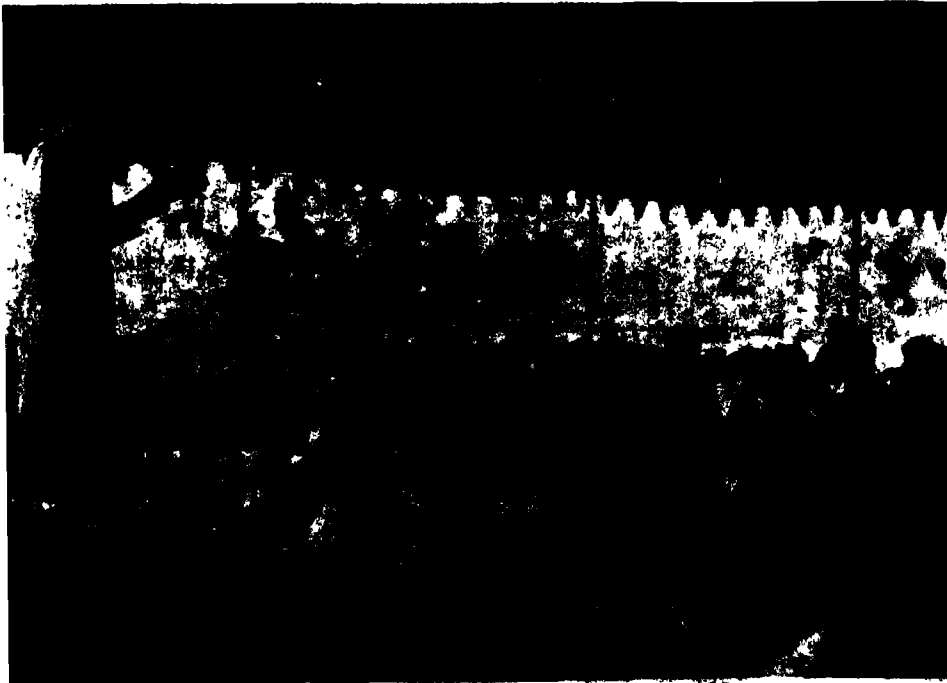
سدا بہار یاد

عبدالعزیز فطرت

جلالِ مہرِ درخشاں، جمالِ ماہِ منیر
مزاجِ سیل خراماں، خیالِ ابرِ مطیر
ضمیرِ نورِ صداقت، شعورِ خیر کثیر
یہی عناصرِ ایماں فزا تھے اسکا خمیر
جہانِ نو کو کیا جس نے زیرِ بے شمشیر

جلالِ مہر تھی اس کی بلندیٔ کردار
ہزار رنگ سے جس کا ہوا کیا اظہار
عظیم قصر ہو جیسے کوئی سرِ کہسار
مخالفوں نے تو چھوڑی نہ کوئی بھی تدبیر
مگر وہ قصر کسی سے نہ ہو سکا تسخیر

کچھ اس کی خو سے کچھ اسکے مزاج سے پائی
جمالِ ماہ نے پاکیزگی و رعنائی
وہی سکون، وہی بیکنار گیرائی
نگاہِ لطف تھی یا کوئی نسخۂ اکسیر
ملی زمانے کو تسکینِ خاطرِ دلگیر

سکوت عظمتِ ساحل کلام سیلِ رواں
نگہ نگاہِ جواں، دیدہ دیدۂ نگراں
خیال محشرِ معنی، عمل دمِ طوفاں
ہوا جو مائلِ گفتار وہ بہم ہمہ گیر
زمانہ شوقِ سماعت میں بن گیا تصویر

اُلجھ اُلجھ کے وہ کانٹوں سے پھول چنتا رہا
ہر ایک خاکۂ نو پر سر اپنا دھنتا رہا
خیالِ عظمتِ ملّت کے خواب بُنتا رہا
اگرچہ ہم میں نہیں آج وہ زعیمِ کبیر
زمانہ دیکھتا ہے اسکے خواب کی تعبیر

ضمیر صدق و صفا نے بغیر خوف و ہراس
ہمیشہ حق پہ ہی رکھی مطالبوں کی اساس
چمن میں اُسکے ریا کی نہ تھی کہیں بو باس
غرض زمانے میں رکھتا نہیں وہ اپنی نظیر
وہ مردِ باعمل و باخلوص و باتدبیر

ہیں آج اسی کے جلال و جمال کی باتیں
اسی کی تاب و تبِ لازوال کی باتیں
اسی کی رہبریٔ بے مثال کی باتیں
کیا سیاستِ عالم کو اس نے ہی تسخیر
کہ ذاتِ قائدِ اعظم تھی قوت ہمہ گیر

قائدِ اعظم اور مغربی پاکستان

منظور عارف

وہ صوبے اور علاقے جن پر آج مغربی پاکستان مشتمل ہے، اور جن میں شروع سے مسلمانوں کی غالب اکثریت رہی ہے، ایک صدسالہ برطانوی دورِ حکومت میں سب سے زیادہ نشانۂ مصائب رہے ہیں۔ چنانچہ جہاں ایک طرف اجنبی استعمار نے ان علاقوں کو جو ہمیشہ سے ایک وحدت چلے آتے تھے، مختلف انتظامی یونٹوں میں تقسیم کرکے ان کی ہم آہنگ ترقی کو مشکل کر دیا، وہاں دوسری طرف ان علاقوں کی غیر مسلم اقلیتوں کو سرکاری ملازمتوں اور نیابتی اداروں میں آبادی سے کہیں زیادہ نمائندگی دے کر انہیں مسلمانوں پر مسلط کر دیا گیا۔ اس "دوگونہ عذاب" کا نتیجہ تھا کہ یہ علاقے جن میں کہ مسلمانوں کی اتنی بھاری اکثریت تھی، برصغیر کے دوسرے حصوں کے مقابلے میں صنعتی، تجارتی اور اقتصادی لحاظ سے اتنے پیچھے رہ گئے۔ مثال کے طور پر سنہ ۱۹۰۱ء تک پنجاب اور صوبہ سرحد ایک تھے، لیکن صوبہ سرحد کو ہر قسم کی دستوری اصلاحات سے محروم رکھنے کے لئے سنہ ۱۹۰۱ء میں پنجاب سے الگ کر دیا گیا اور اس کے بعد جہاں پنجاب میں صوبائی اسمبلی بنی اور نمائندہ حکومت کی طرح ڈالی گئی، وہاں صوبہ سرحد "سرزمینِ بے آئین" بنا رہا اور بڑی جد و جہد کے بعد کہیں سنہ ۱۹۳۲ء میں جا کر اس میں صوبائی اسمبلی وجود میں آسکی۔

دوسری طرف سندھ کو غیر مسلم غالب اکثریت کے ایک بہت بڑے صوبہ بمبئی کے ساتھ ملحق کر دیا گیا تھا، جس کی وجہ سے سندھ کی مسلمان اکثریت بے اثر ہو کر رہ گئی اور سندھ کے اندر زندگی، اور حکومت کے تمام شعبوں پر غیر مسلم چھا گئے۔ خدا خدا کرکے سنہ ۱۹۳۶ء میں سندھ کو بڑی مشکلوں سے بمبئی سے الگ کیا جا سکا لیکن اس سلسلے میں یہ بات ملحوظ رہے کہ گو صوبہ سرحد کو اسمبلی مل گئی، اور سندھ بمبئی سے الگ ہو گیا، پھر بھی ان دونوں صوبوں کی اسمبلیوں میں غیر مسلم اقلیتوں کو آبادی سے کہیں زیادہ نمائندگی دی گئی اور اس طرح ان غالب اکثریت والے مسلمان آبادی کے صوبوں کو غیر مسلموں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔

قائدِ اعظم مرحوم کو مسلم اکثریت کا اس طرح عملی طور پر اقلیت بنایا جانا کسی طرح منظور نہ تھا۔ وہ بڑے جمہوریت پرست تھے اور صحیح جمہوریت کا قیام ان کی زندگی کا ہمیشہ سے نصب العین رہا۔ چنانچہ جس طرح انہیں یہ گوارا نہ تھا کہ عوام کی مرضی کے بغیر ان پر حکومت کی جائے اور ان کی سیاسی جد و جہد کا آغاز اسی عقیدے کے ماتحت ہوا تھا، اسی طرح وہ یہ بھی پسند نہ کرتے تھے کہ جہاں ایک قوم اکثریت میں ہو، اسے عملاً اقلیت بنا دیا جائے۔ قائدِ اعظم کے پیشِ نظر شروع ہی سے یہ دو اصول تھے: ایک عوام کی مرضی سے ان پر حکومت، یعنی پورے برصغیر میں عوام کی نمائندہ حکومتیں قائم ہوں۔ دوسرے جہاں جہاں کسی قوم کی اکثریت ہے، وہ اکثریت بحال اور موثر ہو، اور اس کو کسی طرح اقلیت میں تبدیل نہ کیا جائے۔

اتفاق سے موجودہ مغربی پاکستان کے علاقوں کو متفرق اور دستوری نظامِ حکومت سے محروم رکھنے کے لئے اتفاق سے اجنبی استعمار اور غیر مسلم سیاسی جماعتیں دونوں متحد تھیں، چنانچہ سنہ ۱۹۲۵ء میں جب پہلی دفعہ متحدہ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں صوبہ سرحد کو دستوری اصلاحات دینے کا سوال آیا، تو منتخب شدہ ہندو ارکین اور حکومت کے نامزد کردہ ہندوؤں نے مل کر اس کی سخت مخالفت کی جس کی وجہ سے اس وقت صوبہ سرحد کو دستوری اصلاحات دینے کی تجویز مسترد کر دی گئی۔ اسی طرح بمبئی سے سندھ کو الگ کرنے کی ہندوؤں کی طرف سے

آخری وقت تک مخالفت ہوتی رہی، کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان علاقوں کی مسلم اکثریت یہاں کی حکومت اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں اپنے جائز حقوق سے متمتع ہو۔

۱۹۲۷ء میں ہندوستان کو مزید دستوری اصلاحات دیئے جانے کی تحقیقات کے لئے حکومت برطانیہ نے سائمن کمیشن مقرر کیا تھا۔ اس کمیشن کی، جس کے تمام ممبر انگریز تھے، برصغیر کی تمام سیاسی پارٹیوں نے مخالفت کرنے کا فیصلہ کیا۔ قائد اعظم مرحوم کی قیادت میں مسلم لیگ بھی اس مخالفت میں پیش پیش تھی۔ اسی زمانے میں متحدہ ہندوستان کی تمام پارٹیوں کی طرف سے ملک کے لئے ایک متحدہ آئین تیار کرنے کی بھی کوشش کی گئی۔ چنانچہ ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو دہلی میں ہندوستان کے تمام ممتاز مسلمان رہنما قائد اعظم محمد علی جناح کی زیر صدارت جمع ہوئے اور کئی دن کے غور و خوض کے بعد انہوں نے مسلمانان برصغیر کی طرف سے متحدہ آئین بنانے والوں کے سامنے مندرجہ ذیل مطالبات پیش کئے:۔

(۱) سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر دیا جائے

(۲) صوبہ سرحد کو برصغیر کے دوسرے صوبوں کی طرح دستوری اصلاحات دی جائیں، اور اس میں صوبائی اسمبلی کا قیام عمل میں لایا جائے۔

(۳) بلوچستان میں دستوری اصلاحات نافذ کی جائیں۔ تاکہ یہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے ہمدوش آ جائے۔ اور صوبائی اسمبلی قائم ہو۔

(۴) پنجاب کی اسمبلی میں مسلمانوں کی نمائندگی ان کی آبادی کے مطابق ہو۔

(۵) بنگال کے مسلمانوں کو ان کی آبادی کے مطابق وہاں کی اسمبلی میں نمائندگی دی جائے۔

اگر اس وقت قائد اعظم مرحوم کے یہ مطالبات مان لئے جاتے، اور بنگال کے ساتھ ساتھ مغربی پاکستان کے مختلف صوبوں میں ایک جیسی دستوری اصلاحات کا نفاذ عمل میں آ جاتا اور یہاں کی مسلمان اکثریتیں حکومت کے نظم و نسق اور نیابتی اداروں میں واقعی موثر ہوتیں، تو بعد میں جو الجھنیں پیدا ہوئیں اور بے اندازہ کشت و خون ہوا، اس کے بغیر ہی پاکستان وجود میں آ جاتا۔

قائد اعظمؒ پورے خلوص سے جمہوری نظام کے دلدادہ تھے، اور وہ دیکھ رہے تھے کہ موجودہ مغربی پاکستان کے علاقوں میں اس وقت جو افتراق اور بدنظمی پائی جاتی تھی، اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ ان علاقوں میں صحیح معنوں میں جمہوری نظام برسر کار نہیں، کیونکہ ان میں بلاوجہ پاسنگ دے کر اقلیتوں کو اکثریتوں پر مسلط کر دیا گیا۔ قائد اعظمؒ نے کوشش کی کہ سب سے پہلے تو ان علاقوں کو وہ دستوری اصلاحات دی جائیں جو برصغیر کے دوسرے صوبوں کو حاصل ہیں۔ نیز سندھ کی مسلم اکثریت کو بے اثر کرنے کے لئے اسے جو بمبئی سے ملحق کر دیا گیا ہے، اس کا یہ غیر فطری الحاق ختم کر کے سندھ کو ایک مسلم صوبہ بنایا جائے۔ قائد اعظمؒ کو یقین تھا کہ جب ان علاقوں میں صحیح جمہوریت بروئے کار آ جائے گی اور اس کی وجہ سے یہاں کے عوام حقیقی معنوں میں برسر اقتدار آ جائیں گے، تو چونکہ یہ سب مسلمان ہیں، اور ان کی معاشرت، معشیت، تہذیب اور تاریخی روایات صدیوں سے ایک رہی ہیں، اس لئے اگر انہیں اپنے مستقبل کے فیصلہ کرنے کا حق مل گیا، تو لازماً یہ اکٹھے رہنے کا فیصلہ کریں گے۔ چنانچہ قائد اعظمؒ کی یہ فراست صحیح ثابت ہوئی اور ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو ان کی زیر صدارت برصغیر کے مسلمان زعماء نے دہلی میں جو تاریخی فیصلہ کیا تھا، وہ اب ایک حقیقت واقعی بن رہا ہے۔

انگریزی دور میں موجودہ مغربی پاکستان کو، باوجود اس کے کہ وہ ہمیشہ سے ایک وحدت چلا آتا تھا، صرف اسی بنا پر متفرق رکھا جا سکا کہ اس کے مختلف علاقوں میں مختلف قسم کا نظام حکومت رائج تھا، چنانچہ اگر ایک علاقے میں صوبائی اسمبلی تھی، تو دوسرے علاقے کو اس سے کلیتہً محروم رکھا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ان علاقوں کی مسلم اکثریتوں کو عملاً غیر مسلم اقلیتوں کے زیر اثر کر دیا گیا تھا، لیکن جب ان تمام علاقوں میں ایک سا دستوری نظام حکومت بروئے کار آئے گا، تو پہلے کی طرح مسلم اکثریت اور غیر مسلم اقلیت کا سوال باقی نہیں رہے گا، اور آخر الذکر کو بلاوجہ پاسنگ دے کر اسے اول الذکر پر مسلط کرنے کی کوشش نہیں ہوگی، تو پھر ان علاقوں کے الگ الگ رہنے کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔ قائد اعظمؒ کی دور رس نگاہ تدبر کے سامنے مغربی پاکستان کا یہ مستقبل تھا۔ جس کی طرح مرحوم نے ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء میں ڈالی، اور جو آج "وحدت مغربی پاکستان" کی شکل میں عملی جامہ پہن رہا ہے۔

پروانۂ جانباز

(شہادت حضرت عباسؑ)

زیبا ردولوی

حق ہے ہر شمع کو پروانۂ جانباز ملا — طائرِ نور کو یعنی پرِ پرواز ملا
حامی و ناصر و جرار و سرافراز ملا — بزم در بزم زمانہ میں وہ ممتاز ملا
ہر فسانہ میں بعنوانِ جلی آیا ہے
ہر پیمبر کا مددگار علی آیا ہے

ہاں علی آیا ہے ہر عہدِ نبوت کیلئے — شیث کی شکل میں آدم کی اطاعت کیلئے
سام کے نام سے تھا نوح کی نصرت کیلئے — طرح آصف میں سلیمان کی خدمت کیلئے
دورِ موسیٰ کو اسی شان کا ہارون ملا
موسوی شمع کو فانوس بھی شمعون ملا

پھر محمد کو بھی یہ دولتِ بیدار ملی — محفلِ قدس کی اک شمعِ پُراسرار ملی
ہر پیمبر نے جو پائی تھی وہ تلوار ملی — آپ نصرت میں بھائی کی ہوئی تلوار ملی
جوہروں کا ہر اک انداز رفیقانہ تھا
پرتوِ تیغ میں نورِ دلِ پروانہ تھا

ذوالعشیرہ کی ہو دعوت کہ غزا کے میدان — سر لئے ہاتھوں پہ موجود فدا کرنے کو جان
بسترِ پاکِ محمد پہ دوبالا ہوئی شان — شبِ ہجرت ہوئی جاتی تھی علی پر قربان
نفس کو بیچ کے مرضئ خدا حاصل کی
سو گئے اور پیمبر کی دعا حاصل کی

ہل اتیٰ کی قبا صورتِ زیبائی تھی — انما کی جبا دولتِ رعنائی تھی
قل تعالوا کی ردا زینتِ بالائی تھی — لافتیٰ کی صدا شہرتِ یکتائی تھی
قلبِ کونین سے یوں دادِ دلآرائی لی
یا علی کہہ کے پھر اسلام نے انگڑائی لی

خدمتِ اسلام کی ہر آن بڑی شان سے کی — بعدِ پیغمبر بھی حق کی دل و جان سے کی
کبھی منبر سے کبھی جنگ کے میدان سے کی — جیسی ہوتی ہے رفاقت وہی قرآن سے کی
روز و شب فکر یہی تھی کہ یہ پیغام رہے
اور جو کچھ ہو مگر اصل میں اسلام رہے

صبحِ اسلام کی تابندہ شرافت رہ جائے — نرم اخلاق کی پاکیزہ محبت رہ جائے
قسمتِ انسان کی جاگی ہے اخوت رہ جائے — دشمنوں سے بھی مساوات کی ہمت رہ جائے
چاہتے تھے کہ دلِ انسان کا نورانی ہو
قول سے فعل ہم آہنگ ہو، قرآنی ہو

دوست دشمن کوئی اپنا تھا نہ بیگانہ تھا — نصرتِ حق کا تھا جو فرض بجا لاتا تھا
کبھی کہتا کبھی خاموش ہی رہ جاتا تھا — نورِ ایماں کو ہر اک طرح سے پھیلاتا تھا
مدعا تھا لبِ فطرت کا تبسم رہ جائے
ذہنِ انساں میں شعوروں کا تلاطم رہ جائے

ذمہ داری تھی بڑی بعدِ رسولِ ثقلین — شکلِ اسلام امانت تھے حسنؑ اور حسینؑ
مشورے ہوتے تھے زہرا و علی کے مابین — نہ رہیں فاطمہ زہرا تو گیا قلب کا چین
جو امیدوں کا تھا سورج وہ ستارا نہ رہا
بڑی تسکین تھی جس سے وہ سہارا نہ رہا

پرورش اسلام کی تھی اور علی تنہا تھے — نصرت اسلام کی تھی اور علی تنہا تھے
انتہا کام کی تھی اور علی تنہا تھے — فکر انجام کی تھی اور علی تنہا تھے
سوچتے تھے یہ امانت کسے دیکر جائیں
کارِ تکمیلِ رفاقت کسے دیکر جائیں

یہ بھی معلوم تھا اک ظلم نیا باقی ہے — جو ابھی تک نہ ہوئی تھی وہ جفا باقی ہے
تھی یہ تسکین مگر کرب و بلا باقی ہے — مرضِ کفر کی اکسیر دوا باقی ہے
صبر اور شکر سے ہر رنج اٹھا لے گا حسینؑ
مگر اسلام کو مرنے سے بچا لے گا حسینؑ

خوب واقف تھے کہ اسلام کی خدمت کیلئے — میں نہ ہوں گا تو ہیں سبطین امامت کیلئے
ہوگا شبیر بھی شبر کی اعانت کے لئے — صرف امانت ہی نہیں بلکہ حفاظت کیلئے
بعدِ شبر مگر اسلام پہ ریلا ہوگا
میرا شبیر زمانہ میں اکیلا ہوگا

چاہتے تھے کہ جب اسلام پہ یہ وقت پڑے — آلِ قرآں کو اٹھانا پڑیں صدمات بڑے
جبکہ شبیر پیمبر کی نیابت میں لڑے — عدل و توحید قیامت کی حمایت پہ اڑے
مجھ سے اس وقت بھی دینِ حق کی رفاقت ہو جائے
میرے عباس سے میری بھی نیابت ہو جائے

۱ آیتِ قرآن هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْغَاشِيَةِ
۲ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ (آیۂ تطہیر)
۳ قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا
۴ لا فتیٰ الا علی لا سیف الا ذوالفقار (حدیث)

اسد اللہ کے اس عزمِ صمیم کے نثار اس رفاقت کے فدا، نصرتِ پیہم کے نثار
حامی و ناصرِ پیغمبرِ خاتم کے نثار وہی سامان ہوا اس محسنِ اعظم کے نثار
حسنِ تخلیق نے قدرت کا اشارا پایا
آئے عباسؑ، محبت نے سہارا پایا

آئے جس طرح کہ آئینہ میں جان آتی ہے جس طرح حسنِ خداداد میں شان آتی ہے
جس طرح ایک جواں مرد پہ آن آتی ہے جس طرح صبح کی دنیا میں اذان آتی ہے
اپنے آئینہ میں حیدرؑ نے جو صورت دیکھی
اپنے ہی نور کی پائندہ جلالت دیکھی

بڑھ کے شمشیرِ خدا ہو کے رہے بعد علیؑ سرگروہِ رفقا ہو کے رہے بعد علیؑ
جان و ایمانِ وفا ہو کے رہے بعد علیؑ منفرد نامِ خدا ہو کے رہے بعد علیؑ
جاں نثاروں میں جوانانِ علیؑ یکتا تھے
اُفقِ ماریہ پر بھی قمرِ تنہا تھے

کربلا کے یہ مسلّیٰ[1] اور وہ عباسِ حسینؑ جانِ احمدؐ جو وہ تھے یہ دلِ شبیرؑ کا چین
وہ مددگارِ محمدؐ، یہ مددگارِ حسینؑ خاکِ پا دونوں کی ہے سرمۂ چشمِ کونین
ثبت ہے صفحۂ عالم پہ نگیں دونوں کا
ایک سا ایک جو ہے، مثل نہیں دونوں کا

وہ جو قندیل بنے شمعِ رسالت کیلئے انکی خلقت ہوئی تائیدِ امامت کیلئے
دونوں اسلام کی بے لاگ اعانت کیلئے وہ محمدؐ، یہ محمدؐ کی شریعت کیلئے
اب محمدؐ کوئی ہوگا نہ علیؑ ہوگا کوئی
نہ حسینؑ اور نہ عباسؑ جری ہوگا کوئی

اس جری ابنِ جری کا ہے سراپا مشہور سربلندوں میں ہے اب تک قدِ بالا مشہور
آلِ ہاشم میں ہے یہ چاند سا چہرا مشہور ان پہ ہے سبطِ پیمبرؐ کا بھروسا مشہور
پرورش کر کے انھیں سب میں سرفراز کیا
خانۂ سرورِ کونین میں ممتاز کیا

کارِ آسائش و آرامِ حرم ان کے سپرد اک امامت کے سوا سارے حشم انکے سپرد
جنگ میں احمدِ مرسلؐ کا علم ان کے سپرد یعنی اسلام کے لشکر کا بھرم ان کے سپرد
ان کی جرأت سے رہی حق کی حمایت باقی
بھرم اسلام کا ہے تا بہ قیامت باقی

○

ہر مسلمان پہ ہے فرض محبت ان کی ہر سرافراز کو لازم ہے اطاعت ان کی
پیروی کرنے کے لائق ہے رفاقت ان کی اک نمونہ ہے شجاعت میں سخاوت ان کی
ہر جری یوں تو سخاوت کا دھنی ہوتا ہے
مگر ایسا کہیں اللہ غنی ہوتا ہے

اک سپاہی کی جو دنیا ہے وہ دنیا دیدے اپنی تلوار پہ ہر طرح کا قبضہ دیدے
اپنا دل اپنی نظر، اپنی تمنا دیدے صاحبِ عزمِ قوی اپنا ارادہ دیدے
اپنی ہر سانس میں پابندِ وفا ہو جائے
اپنے مولا پہ دل و جاں سے فدا ہو جائے

یاد کر کر کے سخاوت انھیں روتی ہے ابھی رشتۂ روح میں یہ پھول پروتی ہے ابھی
بذل کے تاج کی زینت یہی موتی ہے ابھی حاضری حضرتِ عباسؑ کی ہوتی ہے ابھی
اس بہانے ہی سہی دل کی کلی کھلتی ہے
سینکڑوں بھوک کے ماروں کو غذا ملتی ہے

کوئی حاتم ہو زمانہ میں تو کیا حاتم ہے ایسا اب تک نہ ہوا ہوگا، خدا عالم ہے
جیسا فیاض یہ سقاءِ بنی ہاشم ہے فیض جاری اسی درگاہ کا اک خادم ہے
دور کر لیتے ہیں تقدیر کی زشتی لاکھوں
اب بھی بنتے ہیں تاسی میں بہشتی لاکھوں

نام یہ وردِ زباں رکھتا ہے بادل بادل موجیں ذکر ان کا کیا کرتی ہیں ساحل ساحل
کہا جاتا ہے مقام یہی منزل منزل ہر طرف جبکہ نظر آتے تھے قاتل قاتل
ظلم و بدعت کے نمائندوں کی اماں ٹھکرا دی
مہِ تاباں نے گھٹاؤں کی اماں ٹھکرا دی[1]

مہلتِ شب کے لئے سعیٔ مسلسل کرنا گردِ خیموں کے طلایہ[2] کبھی پیدل کرنا
خطبۂ شاہ کا دلِ قلب میں ہلچل کرنا وہ شبِ[3] تیغ، وہ تلوار پہ صیقل کرنا
یہ رفاقت کے وہ سورج ہیں جو ڈھلتے ہی نہیں
کارنامے ہیں کہ ذہنوں سے نکلتے ہی نہیں

صلۂ کنبہ سے زیادہ تھا جو حضرتؑ کا خیال ہر گھڑی رکھتے تھے گھر بھر کی ضرورت کا خیال
کس قدر رہتا تھا بہنوں کی محبت کا خیال اللہ اللہ سراپردۂ عصمت کا خیال
دلِ زینبؑ پہ قیامت کا ملال آیا تھا
یہ سپاہی ہیں تو اسیری کا خیال آیا تھا

---

[1] کربلا۔ [2] قمرِ بنی ہاشم کا خطاب حضرتِ عباس کے لئے مخصوص ہے۔

[1] چونکہ جنابِ ام البنین مادرِ حضرت عباس شمر کی ہم قبیلہ تھیں، کوفے سے حضرت کے لئے امان نامہ آیا تھا جسے آپ نے ٹھکرا دیا۔ [2]: پہرہ کی گردش یا پیدل [3]: شبِ عاشور

کون جانے اسے زینب کا جو عالم ہوگا　اپنی ہستی کا گماں ہوگا تو مبہم ہوگا
ہر نفس ایک نیا رنج، نیا غم ہوگا　خشک آنکھوں میں وہ عاشورِ محرم ہوگا
داغ اس تین گھڑی دن میں سہے ہوں گے کتنے
غم کے دریا انہی آنکھوں سے بہے ہوں گے کتنے

اپنی حالت پہ نبی یاد تو آئے ہوں گے　کتنے بھائی تھے ابھی یاد تو آئے ہوں گے
سب سیہ حال تھے یونہی یاد تو آئے ہوں گے　اُنکی رخصت پہ علی یاد تو آئے ہوں گے
دل پہ اک عالمِ فریاد تو چھایا ہوگا
ان کی خلقت کا سبب یاد تو آیا ہوگا

ہوش ہستی انہیں آیا تھا اسی دن کیلئے　انکو حیدر نے بھی پایا تھا اسی دن کیلئے
ہنرِ جنگ سکھایا تھا اسی دن کیلئے　ہر لڑائی سے بچایا تھا اسی دن کیلئے
انکی شب یومِ قیامت سی بہت بھاری تھی
صلحِ شبیر بھی اسی روز کی تیاری تھی

ہاں وصیت[1] میں بھی مرقوم تھا یہ دن ہے وہی　ابھی قولِ شہِ مظلوم تھا یہ دن ہے وہی
کربلا کا بھی یہ مقسوم تھا یہ دن ہے وہی　ملکۂ صبر کو معلوم تھا یہ دن ہے وہی
آج اپنے کسی یاور کو نہیں روکا تھا
روکتیں کیا انہیں اکبر کو نہیں روکا تھا

چلے زینب کی دعاؤں کا خزینہ لے کر　رو دیے سوکھی ہوئی مشکِ سکینہ لے کر
بڑھ گئے رخصتِ سلطانِ مدینہ لے کر　غیظ میں بھی یہ اطاعت کا قرینہ لے کر
حکم کا دھیان رہے مشک تو بھرنا عباس
تا بمقدور مگر جنگ نہ کرنا عباس

رن میں گھوڑے کو اڑائے ہوئے جاتے ہوں گے　علمِ شاہ اٹھائے ہوئے جاتے ہوں گے
مشک چھاتی سے لگائے ہوئے جاتے ہوں گے　دل میں اک حشر دبائے ہوئے جاتے ہوں گے
ولولہ جنگ کا اور جنگ کا امکان نہ تھا
خون پانی سے بدلنا کوئی آسان نہ تھا

کہتے ہوں گے یہی دل سے کہ سنبھل اے مرے دل　چین آجائیگا آنکھوں میں بدل اے مرے دل
صبر کرتا نہیں پہلو سے نکل اے مرے دل　میرا دل ہے تو نہ اتنا بھی مچل اے مرے دل
تجھکو تشویش نے اسوقت عبث گھیرا ہے
شہ کی مرضی پہ جو چلتا ہے وہی میرا ہے

مصلحت ہوگی، مجھے دخل ہی کیا کچھ بھی نہیں　دلِ جانباز نہیں ہے تو وفا کچھ بھی نہیں
قتلِ اعدا تو شجاعت کے سوا کچھ بھی نہیں　کچھ تو تقیید ہی میں ہے ورنہ مزا کچھ بھی نہیں
جنگ کا نام نہ لے، جنگ میں کرنے کا نہیں
فوج یہ چیز ہے کیا، موت سے ڈرنے کا نہیں

ابدی زیست یہی ہے، اسی کوشش میں مروں　پیاس میں خون کے پیاسوں سے میں جنگ کروں
نہر ہاں چھین لوں مشکیزہ بھی پانی سے بھروں　تشنہ لب آؤں مگر دوش پہ قربہ کو دھروں
نرغۂ فوج میں پھر جبکہ میں پیاسا آؤں
وار سے جسم نہیں مشک بچاتا آؤں

یا علی ضبط ہو ایسے میں بشر کا نہیں کام　یا علی آپکی امداد کا طالب ہے غلام
یا علی صبر کا اسوقت عطا کیجئے جام　یا علی آپ ہیں آگاہ جو ہے حکمِ امام
لڑکے مرجانا تو ہے سہل، وفا مشکل ہے
ہر طرح طاعتِ مولا بخدا مشکل ہے

کہہ کے یہ شیر کو تسکین ہوئی تیز بڑھا　دل جو ٹھہرا تو کیا اسپ کو مہمیز بڑھا
سامنے رکھے ہوئے نیزۂ خوں ریز بڑھا　طے کیا دشتِ پر آشوب و بلاخیز، بڑھا
آبِ فولاد میں یوں پیر کے سیدھا آیا
خل کائی کے پرے پھوٹ گئے، دریا آیا

لہریں دیکھیں تو بپا قلب میں طوفان ہوئے　پیاس میں آبِ خنک دیکھ کے حیران ہوئے
پانی چلو میں لیا تھا کہ پشیمان ہوئے　فرض میں کیوں ہوئی یہ دیر پریشان ہوئے
مضطرب قلب میں پھر صبر سمویا فوراً
مشک سوکھی تھی بہت اس کو بھگویا فوراً

حرمِ صاحبِ تطہیر بہت پیاسے ہیں　میرے بچے بھی ہیں دلگیر بہت پیاسے ہیں
الاماں اصغرِ بے شیر بہت پیاسے ہیں　سب تو سب حضرتِ شبیر بہت پیاسے ہیں
روکتا کون، بصد قہر اٹھائے جاتا
حکم ہوتا تو یہ سب نہر اٹھائے جاتا

بھر گئی مشک چلو جلد، بہت دیر ہوئی　جاکے پہنچاؤ سکینہ کو امانت اس کی
کسقدر پیاس سے بیتاب تھی پیاری بچی　شورِ دریا یہ نہیں، فوج قریب آ پہنچی
ہاں قدم جلد اٹھا اسپِ وفادار مرے
توڑ دے پھر یہ صفیں نیزۂ خونخوار مرے

ہٹتے دریا سے نظر جلد ہٹائی نکلے　دوش پر مشک دھری، باگ پھرائی نکلے
ایک ہی جست میں طے کر کے ترائی نکلے　تیر سینہ پہ لئے مشک بچائی نکلے
چھین کر پھینک دیا، تیغ نہ بھالا دیکھا
روندتے آئے نہ پیدل نہ رسالا دیکھا

(باقی صفحہ ۵۵ پر)

---

[1] امام حسن کا وصیت نامہ جو جناب قاسم کے بازو پر بندھا تھا۔

"سحابِ قبلہ"

رشید ترابی

دائرۂ تکوین میں ہر شے اپنی استعداد و صلاحیت کے اعتبار سے ایک مقصد کی حامل ہے اور جو فرائض اُس کے ذمہ ہیں اُن کی تکمیل میں مصروف ہے۔ اسی دائرۂ تکوین میں موالیدِ ثلاثہ کی حدِ آخر پر انسان کی منزل ہے، وہ انسان جو ایک مرضئ آزاد کا بارِ امانت اپنے سر لئے کائنات کی ہر شے کو اپنے قبضہ و تصرف میں رکھنا چاہتا ہے۔ لیکن عالمِ تکوین میں بعض ایسی اشیا بھی موجود ہیں جو اپنی جگہ پر خیر و بہتر ہیں مگر انسان کی مادی یا اخلاقی، طبعی یا روحانی زندگی کے لئے انتہائی مضرت رساں ہیں۔ اس لئے لطفِ الٰہی نے تکوین کے ساتھ تشریع کو بھی اپنے ذمہ لیا اور رحمتِ مطلقہ نے یہ چاہا کہ انسان کی ہدایت کر دی جائے کہ کائنات میں کونسی چیزیں اس کے لئے مفید ہیں اور کون سی مضرت رساں۔

شرافتِ تکوین محمد رسول اللہؐ کی ذاتِ گرامی پر ختم ہوئی اور کمالِ تشریع کے لئے "قرآن حکیم" حرفِ آخر بن کر نازل ہوا۔ چونکہ مقصدِ الٰہی یہ تھا کہ انسان اشرف ترین مخلوق، قُربِ کمال کا جویا رہے اس لئے ایک مکمل ترین انسان کو جو سراپا عقل و نور ہو مقامِ خاتمیت پر فائز کیا گیا کہ نوعِ انسانی کے لئے ایک مثالی نمونہ بن جائے اور لسانِ وحی اس کو بشیر۔ نذیر۔ سراجِ منیر۔ مُزمّل۔ مُدثّر۔ شاہد اور شہید کے مقدس ناموں سے یاد کرے اور جس کا سفرِ حیات اوّل المسلمین سے خاتم النبیین تک تاریخِ رحمت بن جائے۔ یہی وہ حقیقتِ محمدیہؐ ہے جو قرآن کے ساتھ ساتھ باقی ہے اور باقی رہے گی۔

تحفظِ نوعِ بشر کے لئے انبیاؑ نے جو زحمتیں اُٹھائی تھیں وہ ذاتِ ختمی مرتبت میں بدرجۂ کامل پائی جاتی ہیں۔ آپ کی واحد تمنا یہ تھی کہ نوعِ بشر مقصدِ الٰہی کو جان کر تشریع کو نہ ٹھکرائے اور تکوین سے نہ ٹکرائے۔ لیکن فطرتِ انسانی کی تاریکیاں اور ہوسناکیاں جہلِ مرکب کے ساتھ کبھی کبھی اس طرح اُبھر آتی ہیں کہ اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے کر انسان تشریعی قوت کو کمزور کر دینا چاہتا ہے تاکہ وہ دنیا کی جھوٹی لذتوں سے بلا قید و بند لطف اندوز بھی ہوتا رہے اور ادھر نفس کو بھی یہ تسلی دیتا رہے کہ وہ کسی کے سامنے ذمہ دار نہیں ہے۔ فرعونیت، نمرودیت اور یزیدیت ہمیشہ اسی کوشش میں منہمک نظر آتی ہے اور اس طرح نوعِ بشر کا تحفظ و ارتقا خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔

ادھر قدرت موسویؑ، ابراہیمیؑ اور حسینیؑ طاقتوں کی پرورش کرتی ہے کہ وہ بہر قیمت قانونِ تشریعی کی حفاظت کرتے ہوئے باطل کی قوتوں اور طاغوتی مزاحمتوں کا مقابلہ کرتے رہیں۔

سنہ ۶۰ھ میں عرب کی ½ ۱۲ لاکھ مربع میل زمین کا اقتدار جس کے ہاتھ میں آیا وہ اپنی عسکریت، دولت اور شہنشاہیت کے غرور میں شریعتِ محمدی کو ختم کر دینا چاہتا تھا اور چونکہ رعایا بادشاہوں کے اقتدار سے ہمیشہ متاثر رہتی ہے اس لئے اگر یزید کی مبارزت طلبی کے لئے کوئی قوی جواب نہ ہوتا تو شاید دین و آئین کی پھر کوئی جگہ نہ ہوتی۔ اسلئے حسینؑ حقیقتِ محمدی کے واحد سہارے پر یقین رکھتے ہوئے ایک منظم ناخدا ترس دین دشمن طاقت کے مقابل میں اُٹھ کھڑے ہوئے۔

خاست آں سر جلوۂ خیر الامم
چو سحابِ قبلہ باراں در قدم
بر زمینِ کربلا بارید و رفت
لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت (اقبالؒ)

فرزندِ رسول نے جان دیدی سر کٹا دیا، گھر لٹا دیا لیکن ملتِ مسلمہ کے ہر فرد کو یہ سوچنے کا موقع عطا کیا کہ وقتی حکومتیں اور آنی وفانی

اقتدار مقصدِ الٰہی کی تکمیل میں حارج نہیں ہو سکتا۔ قانونِ تشریعی برقرار رہے گا۔ اس عظیم المرتبت شہادت نے ہر دور میں اسلام کے ہر قدر شناس مفکر کو ایک دعوتِ فکر و نظر دی ہے کہ وہ تحفظ شریعت کی راہ میں موت سے کبھی نہ گھبرائے۔ شاعرِ مشرق نے اسی نظریہ کو اپنے الفاظ میں یوں پیش فرمایا تھا۔

مردِ مومن خواہد از یزدان پاک
آں دگر مرگے کہ برگیرد ز خاک
آں دگر مرگ۔ انتہائے راہِ شوق
آخریں تکبیر در جنگاہِ شوق
جنگِ شاہانِ جہاں غارتگری است
جنگِ مومن۔ سنّتِ پیغمبری است
جنگِ مومن چیست ہجرت سوئے دوست
ترکِ عالم۔ اختیارِ کوئے دوست
گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر
مرگِ پورِ مرتضیٰ چیزے دگر
آں کہ حرفِ شوق با اقوام گفت
جنگ را رہبانیِ اسلام گفت
کس نداند جز شہید ایں نکتہ را
کو بہ خونِ خود خرید ایں نکتہ را (جاوید نامہ)

اقوالِ حسینؑ

- ذلت قبول کرنے سے موت بہتر ہے اور جہنم کے مقابل دنیا کی ذلت اچھی۔
- ذلت کی زندگی اور قتل دونوں بری چیزیں ہیں۔ لیکن جب ایک چیز ضروری ہو جائے تو خوبصورتی کے ساتھ مرجانا بہتر ہے۔
- خدایا! میرے پاس جو کچھ ہے وہ دوسروں کا ہے۔ اسے ان چیزوں کے استعمال کا کوئی حق نہیں۔
- سخی وہ ہے جس نے اس سائل کو بھی، یا جس کو توقع نہ تھی
- جس کو خدا نے دیا۔ وہ اوروں کو بھی دے
- حاجت مندوں کا تمہارے پاس آنا فضلِ خداوندی ہے

(ماخوذ از دیباچہ الاخبار و کشف الغمہ)

محبت کے پھول

(بہ نذرِ امامؑ)

رئیس امروہوی

نازاں ہیں رنگ و بو پہ بہت نو دمیدہ پھول — اے قلبِ داغ داغ! دکھا چیدہ چیدہ پھول
کب ہیں بقدرِ شوق یہ دیدہ شنیدہ پھول — یارب! مجھے نصیب ہوں ناآفریدہ پھول
یہ موسمِ بہار ہے یا موسمِ عزا — غنچے ہیں سینہ چاک گریباں دریدہ پھول
خونِ حسینؑ لئے مشیتِ پروردگار نے — اے کربلا کی خاک! ابھرے برگزیدہ پھول
ہیں آج بھی بہارِ گلستانِ عاشقی — گلزارِ فاطمہؑ کے جراحت رسیدہ پھول
نوِ اصغرِ شہید کا اک استعارہ ہے — پھول اپنے رنگ و بو پہ گلِ نو دمیدہ پھول
ہر کس قتیلِ گریہ[1] پہ شبنم ہے، اشک ریز — کس تشنہ لب کی یاد میں ہیں آبدیدہ پھول
گلچیں جو نوچتا ہے گلوں کو تو کیا گلہ؟ — بہتر ہے فصلِ غم میں رہیں سربریدہ پھول
باغِ نبیؐ کا دعویٰ غارتگری یزید! — اتنا نہ اپنے ظلم پہ اے شوخ دیدہ پھول
جب سے ہوا ہے یا نفسِ حسینی خزاں پسند — گلشن میں پڑھ رہے ہیں خزاں کا قصیدہ پھول
گلدستۂ مزارِ شہیداں کے عشق میں — شاخوں سے کیا عجب ہو اگر ہوں کشیدہ پھول
پھولوں پہ اعتماد غلط ہے کہ آخرش — بوئے رمیدہ پھول ہیں، رنگِ پریدہ پھول
کس باغِ بے خزاں کا لیا نام اے صبا! — شاخیں ہیں سرنگوں تو ادب سے خمیدہ پھول
شبنم کی آنکھ سے کوئی دیکھے تو صبحِ دم — کیا ہیں سوائے قطرۂ اشکِ چکیدہ پھول

اللہ رے میرے ذہنِ شگفتہ کی تازگی
کھلتے ہیں اے رئیس برنگِ جدید پھول

[1] انا قتیل العبرۃ۔ (امام حسینؑ)

اُردو اسٹیج اور ڈرامہ

عشرت رحمانی

اردو اسٹیج اور ڈرامہ کی تاریخ برِ صغیر پاکستان و ہند میں کچھ اس طرح پردۂ خفا میں رہی ہے کہ اب جدید تحقیق و تنقید کی روشنی میں جتنی چھان بین کی جائے ہر روز نئے انکشاف ہوتے نظر آتے ہیں۔

اس برِصغیر میں پارسی اسٹیج اور تھیٹر کی تاریخ ۱۸۰۰ء کے لگ بھگ متعین کی جاتی رہی ہے۔ لیکن اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے۔ کہ اس کا آغاز جنگِ آزادی سے بہت پہلے ہو چکا تھا۔ اور جس دور کو آغاز مانا گیا ہے۔ وہ اس کے دوسرے نیم ترقی یافتہ زمانے کی تاریخ ہے۔ بمبئی میں اٹھارھویں صدی میں انگریزی تھیٹر کی تعمیر ہوئی جس کی ابتدا گرانٹ روڈ کے بمبئی تھیٹر سے کی گئی۔ اور ۱۸۴۵ء میں اس عمارت کو "بمبئی تھیٹر جدید" کے نام سے از سرِ نو تعمیر و آراستہ کیا گیا۔ یہ تھیٹر "وکٹوریہ تھیٹر" کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا تھا۔ ۱۸۵۳ء میں ہندو ڈرامیٹک کلب" نے یہاں مرہٹی ڈراما تمثیل کیا۔ یہ ڈراما مذہبی رنگ کا تھا اور اس کا پلاٹ رامائن سے ماخوذ تھا۔ اس سال چند اور ڈرامے بھی اسٹیج کئے گئے۔ مرہٹی ڈراموں کی اس پیش کش کے بعد پارسی حضرات نے بھی اس طرف توجہ کی اور "پارسی ڈرامٹک کور" کے نام سے ایک جماعت میدان میں آ گئی جس نے مئی ۱۸۵۴ء میں "پیدائش سیاؤکس" کے نام سے ایک طویل ناٹک دو حصوں میں اسٹیج کیا۔ اور یہی اردو زبان کا سب سے پہلا نقش مانا جاتا ہے۔ اس کے بعد ۱۸۵۴ء میں علی الترتیب ماہ جون و ستمبر میں دو ڈرامے "حاجی میاں فضل اور کلال خانہ" اور "پٹھان سرفرازا ورگل" اردو زبان میں تمثیل کئے گئے۔ رفتہ رفتہ یہ سلسلہ بڑھتا گیا۔ پانچ سال کے عرصہ میں پارسی سیٹھوں کی بدولت اردو ڈرامے نے پیشہ کی حیثیت سے کافی ترقی کی جتنی کہ ہندو، جو ناٹک کی دنیا میں سب سے آگے تھے، پست نظر آنے لگے۔ اور پارسیوں کا عروج ہوتا گیا۔ ۱۸۶۰ء کے اوائل تک متعدد پارسی ناٹک کمپنیاں منظرِ عام پر تماشے دکھلانے لگیں۔ جن کے ڈراموں کی اکثریت اردو زبان میں تھی۔ گو فن اور ادب کی حیثیت سے ان کا کوئی درجہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اور ان تماشوں میں سے بیشتر اردو ناٹک کے نقش اوّل "اندر سبھا" (امانت) کے انداز پر یا تو خالص نظم یا ملی جلی نثر و نظم میں لکھے گئے تھے۔ تاہم اردو ڈرامہ نگاری کے ابتدائی نمونے ضرور تسلیم کئے جاتے ہیں۔

اس ترتیب سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے۔ کہ اس برِصغیر میں اردو تھیٹر کا آغاز ۱۸۵۲ء اور ۱۸۵۳ء کے دوران میں ہوا۔ اسی عرصہ میں "اندر سبھا" کی اودھ میں دھوم مچی۔ ڈھاکہ (مشرقی بنگال) میں اردو ناٹک کا چرچا ہوا۔ اور یہی دور بمبئی کے پارسی تھیٹر کی ابتدا کا تھا۔ یہ مسئلہ ابھی تک زیرِ غور رہے اور تاریخی بے ترتیبی کے سبب طے نہیں پا سکا کہ اندر سبھا کے بعد سب سے پہلے دوسرا اردو ناٹک کب لکھا گیا۔ وہ کونسا ناٹک تھا اور اس ناٹک کا مصنف کون تھا؟ یہ طے پا چکا ہے کہ بمبئی میں اردو ناٹک کی ابتدا مشرقی بنگال اور اودھ کے بعد ہوئی۔ اودھ مشرقی تمدن و ادب کا گہوارہ اور "اندر سبھا" کا مولد تھا۔ اردو زبان و ادب کے چرچے سب سے زیادہ اس دور میں وہیں رہے۔ اس لئے اردو ناٹک کی اولیت کا فخر اس علاقہ کو نصیب ہوتا قدرتی امر ہے۔ اس کے بعد ڈھاکہ، پھر بمبئی اور بعد ازں پنجاب، علی الترتیب اردو ڈرامے کی تاریخ میں قابلِ ذکر ہیں۔

"اندر سبھا" ایک مدت تک پیش پیش رہا۔ ہر مقام پر پہلے وہی اردو اسٹیج کی رونق بنا اور پھر عرصۂ دراز تک اسی کی نقلیں، نئے رنگ میں پیش کی گئیں۔ ان میں "جشنِ پرستان"، "اندر سبھا" (مداری لال)، "عشرت سبھا" فرخ سبھا، گلشن بہار افزا اور بہارستانِ عشق قابلِ ذکر ہیں۔ جو ایک ہی انداز کے پلاٹ اور طرز و اسلوب پر مختلف مصنفین نے لکھے۔ اور عہد بہ عہد نئے ساز و سامان کے ساتھ تمثیل کئے گئے۔ ان کے بعد بیشتر ڈرامے نئے پلاٹ اور نئی کہانیوں کے ساتھ تصنیف ہوئے۔ مگر مقام، پرستان یا شاہی محلات، اور کردار جن و پری اور سلاطین ہی نظر آتے تھے۔

نائم سے تقریباً تین سال تک کا دور اسی انداز پر قائم رہا۔ پارسی اسٹیج کے عہد
ں کہا جاتا ہے کہ ۱۸۵۳ء سے ۱۸۸۰ء تک کے ڈراما نگار تمام پارسی تھے،
ں میں خانصاحب نوشیرواں جی مہربان جی آرام کا نام پیش پیش رہا ہے۔ ان کے
علاوہ ایک نام اختر بھی آتا ہے، لیکن اختر کا پورا نام اور ان کے ڈراموں کا کوئی
ہ نہیں چلتا۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ اختر بھی کسی پارسی سیٹھ ہی کا تخلص تھا۔ یہ نام
صرف ناٹک "چھل بٹاؤ موہنا رانی" مصنفہ آرام کی ایک ناقص تک بندی میں
س طرح آیا ہے ؂

اختر وہ ہیں، دیکھ یہاں آرام سے بیٹھے
کہیں کہ گرے ہوں گے وہ بوستاں میں تارے

لیکن اس کے سوا کسی تاریخ میں اختر کا نام دیکھنے میں نہیں آتا، نہ اس کی
تصدیق ہوتی ہے کہ یہ ڈرامہ نگار تھے۔ اس لئے یہ قیاس بھی کیا جا سکتا ہے کہ
اختر، کوئی مصنف نہیں بلکہ آرام کے دوست تھے اور اس شعر میں از راہِ
اخلاص یہ نام لیا گیا ہے۔ بہر صورت اختر کا ڈرامہ نگار ہونا ابھی تک مصدقہ
طور پر ثابت نہیں ہو سکا۔

۱۸۸۰ء سے پہلے آرام کے سوا اور کسی پارسی، ہندو یا مسلمان ڈرامہ نگار
کا نام، پارسی اسٹیج کے اس عہد میں، نظر نہیں آتا۔ ۱۸۸۰ء کے بعد آرام کے ساتھ
چند ناموں کا اضافہ شروع ہوا اور پھر یہ سلسلہ ترقی پذیر رہا۔ اس زمانہ میں جن
ڈراما نگاروں کے نام ہمارے سامنے آتے ہیں، وہ یہ ہیں :۔

حباب رام پوری، جوہر بنارسی، نفیس کانپوری، کریم بریلوی، رونق
بنارسی، طالب بنارسی، حسینی میاں ظریف، حافظ محمد عبداللہ بیگ، عبدالعزیز
نظیر بیگ، عبدالوحید قیس، بخش الٰہی ناقی اور فقیر محمد تیغ۔

ان میں سے حباب رام پوری کے ڈراموں کے نام معلوم نہیں ہوئے۔
صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے ابتدائی دور میں متعدد ڈرامے لکھے، جو
اب نایاب ہیں۔ باقی لوگوں کے بہت سے ڈرامے شائع شدہ موجود ہیں۔ گو
ان میں سے بیشتر ڈرامے اب کم یاب بلکہ نایاب ہیں۔ اور اکثر ایسے کہ معمولی
ترمیم تنسیخ کے ساتھ ایک ایک تصنیف کئی کئی حضرات کے ناموں سے الگ
الگ ملتی ہے۔ اس لئے یہ تصدیق دشوار ہے کہ کسی ڈرامہ کا اصل مصنف
کون ہے۔ اس سلسلہ میں چند مصنفین کے ناموں کی متواتر تکرار ایک معمہ ہے۔
مثلاً رونق، طالب، ظریف، کریم، اور عبداللہ بیگ ——— یہاں چند
نکات غور طلب ہیں۔ سب سے پہلے یہ بیان کہ ۱۸۸۰ء سے پہلے پارسی اسٹیج پر
کوئی اردو ڈرامہ غیر پارسی مصنف کا دیکھنے میں نہیں آیا۔ جب ہم اس عہد کے

حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ تمام پارسی نام نہاد ڈرامہ نگار (یعنی جن کو
ڈرامہ نگار کہا جاتا ہے) کسی نہ کسی تھیٹریکل کمپنی کے مالک ہیں اور ان میں سے
ہر ایک کسی مسلمان شاعر و انشاپرداز کا شاگرد رہا ہے۔ ان استادوں میں سے
بیشتر اپنے عہد کے ڈرامہ نگار بھی بتائے جاتے ہیں، لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں
آتی کہ ان مالکانِ کمپنی نے اپنے اساتذہ کے ڈرامے کیوں تمثیل نہیں کئے؟ اور اگر
کئے تو ان کا تذکرہ کیوں نہیں کیا گیا؟ اس نکتہ پر غور کرنے کے بعد اہلِ نظر کیلئے
یہ نتیجہ نکالنا دشوار نہیں کہ جن ڈراموں کو چند پارسی سیٹھوں کی تصانیف بتایا گیا
ہے، ان میں سے اکثر ان کے استادوں اور اس دور کے دوسرے مصنفین کے
لکھے ہوئے تھے۔ جو ان نام نہاد پارسی ڈرامہ نگاروں کے تنخواہ دار ملازم تھے
اور ان تمام سیٹھوں کی دولت نے اصل مصنفین کے کام اور نام کو خرید کر اپنے
نام سے منسوب کر لیا تھا۔ اس لئے ۱۸۸۰ء سے پہلے تک بیشتر ناٹک مختلف
مالکانِ کمپنی کے ناموں سے تمثیل ہو کر مشہور ہوتے رہے۔ آخر تاریخ نے ان کے
اصل مصنفوں کے نام فراموش کر دیئے۔ اور امتدادِ زمانہ نے اصلیت کو
بدل کر کچھ کا کچھ بنا دیا۔ اس کا ایک بین ثبوت یہ بھی ہے کہ بمبئی سے پہلے ڈھاکہ
میں اردو ناٹک کی کافی دھوم دھام تھی اور قمر کانپوری، نفیس کانپوری
— احمد حسین و آفرہ غیرہ کئی ڈرامہ نگار وہاں متعدد ڈرامے لکھ چکے تھے
دورِ اول میں جو ڈرامے آرام کے نام سے تمثیل کئے گئے اور آج تک انہی کے
نام سے مشہور ہیں، ان میں سے بیشتر وہ تھے جو اس عہد سے پہلے ڈھاکہ میں
قمر اور نفیس کانپوری وغیرہ کے اصل نام سے اسٹیج کئے جا چکے تھے۔ ان میں
لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، شکنتلا اور بے نظیر بدر منیر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔
اسی طرح بعض اور ڈرامے بھی ہیں جو بہت عرصہ پہلے ڈھاکہ میں لکھے اور اسٹیج کئے
گئے، لیکن پارسی اسٹیج پر بعد میں دوسرے مصنفین کے نام سے تمثیل ہوئے۔
اس بیان کی تصدیق ذیل کی مختصر تفصیل سے ہوتی ہے :۔

(ا) سیٹھ پسٹن جی سہراب جی المتخلص بہ رنگ، ریڈیو ،
منشی نفیس کانپوری کے شاگرد تھے۔ جب بمبئی میں انہوں نے
۱۸۷۰ء میں اوریجنل تھیٹریکل کمپنی قائم کی۔ اس وقت جو
ڈرامے تمثیل کئے ان میں سے بیشتر منشی نفیس کے ساتھ ڈھاکہ
سے آئے۔

(ب) ڈراما قبل بیمار، جو پارسی عہدِ اول میں تمثیل اور
طبع ہوا، اس کو بہت عرصہ پہلے احمد حسین و آفر نے ڈھاکہ میں
تصنیف کیا اور وہیں یہ سب سے پہلے کھیلا گیا۔

(ج) ناٹک گلشن جانفزا، حکیم حسن مرزا برق نے ۱۸۵۳ء میں ڈھاکہ میں تصنیف کیا اور تمثیل کرایا۔ لیکن یہی ڈراما ۱۸۸۰ء کے بعد حسینی میاں ظریف کی تصنیف کی حیثیت سے اوریجنل تھیٹریکل کمپنی نے "گلشن بہار افزا" کے نام سے اسٹیج کیا۔ یہ دونوں امانت کے اندر سبھا سے ماخوذ ہیں۔

(د) اسی طرح دیگر متعدد ڈرامے نتیجہ عصمت، خدا دوست، چاند بی بی، عشرت سبھا، فرخ سبھا وغیرہ ڈھاکہ میں ۱۹۵۳ء و ۱۸۵۴ء میں اسٹیج ہو چکے تھے۔ اور بہت عرصہ بعد بمبئی پہنچ کر سب کے سب دوسرے مصنفین کے ناموں سے مختلف کمپنیوں نے تمثیل کئے۔

ان حقائق سے ثابت ہوتا ہے کہ پارسی سیٹھوں نے ڈھاکہ سے جو اردو ڈرامے منگوائے۔ ان سب کو یا تو اپنے نام سے پیش کر دیا یا ان کے عہد کے دوسرے منشی صاحبان نے کتر بیونت کر کے اپنے نام سے تمثیل اور شائع کیا۔ یہ امر بعید از قیاس نہیں کہ ۱۸۸۰ء سے پہلے پارسی سیٹھوں نے متعدد پرانے اور نئے ڈرامے خریدے اور اصل مصنفین کی حق تلفی گوارا کی۔ لیکن اس کے بعد اردو اسٹیج نے بمبئی میں باقاعدہ رنگ جمایا، کمپنیوں کی تعداد اور رفتارِ ترقی میں اضافہ ہوا، تصنیف اور مصنفین کا مقابلہ ہونے لگا، بمبئی میں شعر و ادب کے معرکے بھی شروع ہوئے۔ اغلب ہے کہ خود مصنفین نے اپنی حق تلفی اور گمنامی کا احساس کر کے سرمایہ داروں سے احتجاج کیا ہوگا۔ ان تمام وجوہ کی بنا پر مالکانِ کمپنی نے جواب تک بزعم خود ڈرامہ نگار بنے بیٹھے تھے، اپنی تجارتی اغراض اور مصالح کے پیش نظر اصل مصنفوں کو منظر عام پر لانا منظور کر لیا۔ ممکن ہے ابتدا میں دو ایک سیٹھوں نے اپنے استادوں کی شہرت کی خاطر ان کے اصل ناموں کو پردۂ خفا سے باہر لانا مناسب سمجھا ہو، اس کے بعد دوسرے اصحاب اس تقلید پر مجبور ہوئے ہوں یا مصنفوں کی ترغیب و اصرار نے ان کو طوعاً و کرہاً آمادہ کیا ہو۔ بہر حال تصنیف کی حیثیت سے پارسیوں کی نام نہاد اجارہ داری اس دور سے رفتہ رفتہ ختم ہوتی گئی، لیکن اسٹیج اور تھیٹر پر تمام و کمال تسلط و تصرف ملک بھر میں پارسی سیٹھوں ہی کا تھا جو روز افزوں ترقی کر کے آخر دم تک قائم رہا۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خاں صاحب نوشیروان جی مہربان جی آرام پارسی اردو اسٹیج کے بانی تھے۔ ان کو اس عہد کے مطابق اردو شعر و ادب سے بھی کچھ لگاؤ تھا، اس لئے یہ امر خلافِ قیاس نہیں کہ آرام نے گجراتی ڈراموں کو ملی جلی اردو گجراتی نثر و نظم میں لکھا اور پھر اپنے تنخواہ دار ڈراما نویسوں کی مدد سے چند پرانے اردو ڈراموں میں ترمیم و تنسیخ کر کے اپنے نام سے پیش کر دیا۔ آرام کے نام سے جو مطبوعہ ڈرامے یا ان کا تذکرہ ملتا ہے ان میں سے چند ابتدائی ڈراموں کے وہ خود مترجم یا مؤلف ہیں، جو کسی زبان داں شاعر یا انشا پرداز کی معمولی نظر ثانی کے بعد شائع ہوئے۔ بہر صورت ان کا آرام کے نام سے منسوب ہونا بجا و درست ہے، لیکن جو طویل فہرست ان کی تالیفات و تصنیفات کی بتائی گئی ہے، ان کی نسبت تفصیل سے واضح کیا جا چکا ہے کہ ان میں اکثر ان سے پہلے کے مستند مصنفین کی تصانیف ہیں۔ تاہم ان کے نام سے حسب ذیل ڈرامے مشہور ہوئے۔

(۱) باغ و بہار (۲) لعل و گوہر (۳) عالمگیر (۴) گوپی چند (۵) حاتم طائی (۶) گل با صنوبر چہ کرد (۷) جواں بخت (ترجمہ مرچنٹ آف وینس) (۸) گل بکاؤلی (۹) بے نظیر بدر منیر (۱۰) چھل بٹاؤ موہنا رانی (۱۱) پدماوت (۱۲) لیلیٰ مجنوں (۱۳) شکنتلا۔

آرام اور ان کے ساتھیوں دادا بھائی پٹیل اور کنور جی ناظر وغیرہ کے دور کے بعد پارسی اردو اسٹیج کا ترقی یافتہ دور، ۱۸۸۰ء کے بعد، دادا بھائی رتن جی ٹھونٹھی، خورشید جی مہربان جی بالیوالا، ڈحن جی بھائی خورشید جی گھڑیالی، دوسابھائی فریدوں جی مغل اور فرام جی اپو کی تجارتی مساعی کا رہین منت ہے۔ ان تمام سیٹھوں کی شرکت میں گروہے "وکٹوریہ" کے نام سے تھیٹریکل کمپنی قائم ہوئی جو "جاگیرداروں کی کمپنی" کہلاتی تھی۔ یہ کمپنی بعد میں پارسی وکٹوریہ ناٹک منڈلی، یا "پارسی وکٹوریہ تھیٹریکل کمپنی" کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کمپنی کے ڈراما نگار محمود میاں رونق بنارسی تھے جنہوں نے ابتدا سے آخر تک اس کمپنی اور اس کی شاخوں کے لئے متعدد ڈرامے لکھے، لیکن ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جن کی تصنیفی شان ایک معمہ ہے۔ منشی رونق کی نسبت آر دیشر دادا بھائی ٹھونٹھی خلف ارشد دادا بھائی رتن جی ٹھونٹھی، بانی اول پارسی وکٹوریہ ناٹک منڈلی کا خیال تھا کہ انہوں نے ہماری اور دوسری کمپنیوں کے ڈرامے از سر نو لکھ کر اپنے نام سے تمثیل اور طبع کرائے۔ خورشید جی بالیوالا کا بیان ہے کہ منشی رونق دادا بھائی رتن جی ٹھونٹھی ڈائرکٹر و بانی وکٹوریہ ناٹک منڈلی کے حکم سے مختلف ڈراموں میں ترمیم و تنسیخ کرتے تھے۔ حقیقت خواہ کچھ ہو، حالات کا جائزہ لینے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رونق اپنے دور میں متوسط درجہ کے شاعر اور ڈراما نگار ضرور تھے۔ انہوں نے چند طبعزاد ڈرامے لکھے لیکن بعض قدیم ڈراموں میں رد و بدل کر کے، جو مشرقی بنگال اور ابتدائی پارسی دور میں دوسرے مصنفین نے تصنیف کئے تھے۔

ان کو اپنے نام سے بھی منسوب کیا۔ رونق کے تفصیلی حالات نہیں ملتے۔ صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ وہ ۱۸۸۰ء کے اوائل میں پارسی وکٹوریہ ناٹک منڈلی میں ایک اداکار کی حیثیت سے ملازم ہوئے، شاعر اور انشا پرداز تھے، فوراً ہی دوسرے ڈراموں میں رد و بدل کرکے ان کو اپنے نام سے پیش کرایا، چندے بعد اس کمپنی کے ڈرامانویسی کی خدمات بھی ان کے سپرد ہو گئیں۔ غالباً رونق پہلے ڈرامانویس ہیں جنہوں نے نثر کے مکالمہ میں پُر زور شعر خوانی کا آغاز شروع کیا۔ پانچ سال تک کمپنی میں رہے۔ ۱۸۸۳ء میں اسی کمپنی کے اسٹیج پر خودکشی کرکے تمثیل کو حقیقت ثابت کیا اور دنیا کے اسٹیج سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔

سید بادشاہ حسین نے اپنی کتاب "اردو میں ڈرامانگاری" میں ان کے حالات کے بارے میں غیر مصدقہ بیان شائع کیا ہے کہ رونق سب سے پہلے اوریجنل تھیٹریکل کمپنی بمبئی میں سیٹھ پیشن جی کے ملازم ہوئے۔ تحقیق نے اس بیان کو غلط ثابت کر دیا ہے۔

ان کے ڈراموں کی طویل فہرست میں اکثر قدیم تصانیف کے نام بھی پائے جاتے ہیں، اس لئے اس بیان کی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے طبعزاد ڈراموں سے زیادہ پرانے ڈراموں میں قطع و برید کرکے ان پر قبضہ کیا۔

رونق کے بعد ایک نام (غلام حسین) عرف حسینی میاں ظریف کا ہے۔ جو سب سے بڑا معمہ نظر آتا ہے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے بلا تحقیق محض سنی سنائی پر حسینی میاں ظریف کو اپنے زمانہ کا ایک باکمال ڈرامانگار ظاہر کیا ہے اور مبالغہ گوئی سے رائے زنی کی ہے کہ ظریف کی طبیعت میں بلا کا چلبلاپن اور غضب کی روانی تھی۔ انہوں نے ڈرامانگاری میں کمالات کے دریا بہائے ہیں۔ حالانکہ ابتک کی تحقیق سے اس اہم شخصیت کا معمہ اس طرح حل ہوتا ہے کہ ظریف ایک ادنیٰ شاعر اور نقل نویس (منشی) تھے۔

پسٹن جی فرام جی نے پارسی وکٹوریہ کمپنی کے بعد جب بمبئی میں اوریجنل تھیٹریکل کمپنی قائم کی تو ظریف کو اپنی کمپنی میں موجودہ ڈرامے اور ان کے پارٹ نقل کرنے کو ملازم رکھا۔ اسی دوران میں انہوں نے اپنی طبیعت کی جولانی دکھائی اور چند قدیم ڈرامے نقل کرتے ہوئے ان میں ترمیم و تنسیخ کر ڈالی کیونکہ وہ موزوں طبع بھی تھے سیٹھ جی کو اپنی تک بندی سنا کر شاعر ہونے کا بھی یقین دلا دیا اور "مال مسروقہ" کو اپنی تصنیف کہکر یہی ڈرامے اپنے نام سے تمثیل کرا دیئے۔ پارسی سیٹھ، جو اردو زبان سے نابلد تھے، ان کو مستند ڈرامانگار تسلیم کرنے لگے۔ چنانچہ ان کے نام سے متعدد ڈرامے زیور طبع سے آراستہ ہو گئے، لیکن اس میں شک نہیں انہوں نے معدودے چند ڈرامے تصنیف کئے۔

کچھ مدت بعد پارسی سیٹھوں سے کسی بات پر ان بن ہو گئی اور حسینی میاں نے بمبئی کے ناشر کتب جیٹھا جمنا داس بھگوانداس کے ساتھ شریک ہو کر خوب خوب دست درازیاں کیں اور پرانے نئے جو ڈرامے ان کے ہاتھ آئے ان میں معمولی رد و بدل کرکے اپنے نام سے شائع کرانا شروع کر دیئے۔ ان میں سے بعض ڈراموں میں اپنی غزلیں یا دوسروں کی غزلوں میں اپنا تخلص شامل کرکے مال مسروقہ پر اپنی ملکیت کی مہر بھی ثبت کی بعض ڈراموں کے حواشی پر چند بے جوڑ غیر متعلق قطعات اور سہرے اپنی طرف سے چپکا دیئے۔ اس طرح بزعم خود مستند ڈرامانگاروں کی صف میں شریک ہو کر مشہور ہوئے۔

اس دور میں ایک اور مشہور نام حافظ محمد عبداللہ بیگ رئیس فتحپور کا بھی آتا ہے۔ حافظ عبداللہ نے پارسی کمپنیوں کے قیام و عروج کی شہرت سے متاثر ہو کر تھیٹر کی چمکتی ہوئی دنیا میں قدم رکھا، لائٹ آف انڈیا تھیٹریکل کمپنی کے چیف ایکٹر کی حیثیت سے کام کیا اور اپنی کمپنی کے لئے متعدد قدیم ڈراموں میں ترمیم و اصلاح کرکے انہیں اپنے نام سے پیش کرنا شروع کر دیا۔ یہ ڈرامے بعد میں ان کے نام سے شائع ہو کر مشہور ہوئے۔ حافظ عبداللہ بیگ کے ایک شاگرد نظیر بیگ، جو پہلے ان کی کمپنی میں اداکار کی حیثیت سے کام کرتے تھے، بعد ازاں بے نظیر تھیٹریکل کمپنی میں ڈائرکٹر ہو گئے اور ڈرامانگار بھی بن گئے۔ ان کے ڈراموں کا حال بھی اپنے استاد کی مانند تھا کہ دوسروں کی تصانیف پر ہاتھ صاف کرکے چند طبعزاد تصانیف کے مالک ہوئے۔

اس عہد کے آخری دور میں سب سے زیادہ بلند پایہ مصنف منشی ونایک پرشاد طالب بنارسی گزرے ہیں۔ یہ داغ دہلوی کے شاگرد اور پُرگو شاعر و انشا پرداز تھے۔ طالب نے "ڈراما لیل و نہار" لکھ کر اردو ڈرامے کو نئے اسلوب سے روشناس کرایا اور قدیم پامال روش سے ہٹ کر نئے انداز کا آغاز کیا۔ طالب بھی پارسی وکٹوریہ کمپنی کے ڈرامانویس تھے اور از اول تا آخر اسی کمپنی سے متعلق رہے۔ متذکرہ بالا مصنفین کے معاصرین، مگر ان سے مؤخر ڈرامانگاروں میں، کریم الدین کریم بریلوی، منشی بخش الہی نامی، فقیر محمد تیغ اور متاخرین میں عبدالوحید قیس فتحپوری، شماد دہلوی، حکیم نظامی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جو ڈرامے اس دور (۱۸۸۰ء سے ۱۸۸۵ء تک) میں تصنیف اور تمثیل ہوئے ان میں سے بیشتر کے مصنف ایک سے زیادہ تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ بعض ڈراموں کی تفصیل درج ذیل ہے، جس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

اجنبی　　　　ماڈل : فیضی رحمن

۱۔ ڈراما بے نظیر بدر منیر:۔ یہ ڈراما سب سے پہلے اگست ۱۸۷۹ء میں تمثیل کیا گیا اور ۱۸۸۰ء میں طبع ہوا۔ برٹش میوزیم لائبریری کی فہرست کے مطابق پہلا ڈراما رونق بنارسی کا تصنیف کردہ ہے۔ لیکن تاریخ پارسی ناٹک (بزبان گجراتی) مرتبہ ڈاکٹر دھنجی بھائی نسروان جی پٹیل کے مطابق یہ ڈراما آرام نے ۱۸۷۱ء میں پارسی وکٹوریہ کے لئے لکھا اور اسٹیج کیا اور ان کی تصانیف کی فہرست میں بھی اس کا نام ملتا ہے۔ یہ منظوم ڈراما اندر سبھا کے اسلوب پر ہے اور مثنوی بدر منیر (میر حسن) سے جزواً ماخوذ ہے۔ اصل مثنوی کے چند اشعار بھی مکالموں میں شامل ہیں۔ دو غزلوں میں رونق تخلص ہے۔ ایک غزل شاہ ظفر کی ہے۔ ایک فارسی غزل بھی ہے اور ایک غزل کسی نامعلوم شاعر کی ہے۔ رونق کے نام سے جو نسخہ طبع ہوا ہے اس کے اندرونی سرورق پر درج ہے کہ "یہ ناٹک ۱۸۶۷ء کے ۲۵ ویں ایکٹ کے مطابق رجسٹر کیا گیا اور اس کے تمام حقوق وکٹوریہ پارسی ناٹک منڈلی کے مالکوں میسرز خورشید جی بالیوالا دھنجی بھائی خورشید جی گھڑیالی اور دوسا بھائی فریدوں جی مغل کے نام محفوظ ہیں۔ لہٰذا مذکورہ مالکوں کی اجازت لئے بغیر کوئی بھی ناٹک کے کسی حصہ کو چھاپنے یا اسٹیج کرنے کی کوشش نہ کرے۔" مگر بعد ازاں کاپی رائٹ کی پروا کئے بغیر حافظ عبداللہ نے از سر نو لکھ کر اس ڈرامے کا نام "بے نظیر بدر منیر" عرف تماشائے دلپذیر رکھ کر تمثیل کیا اور اپنے نام سے شائع کرایا۔ پھر فقیر محمد شیخ نے اس میں مزید ترمیم و اصلاح کرکے اسی نام سے شائع کر دیا۔

ہمارے اسٹیج اور ڈرامے کی دنیا میں یہ کیفیت شروع سے آخر تک عام دیکھنے میں آتی رہی ہے کہ ایک ڈراما کئی ناموں سے پیش کیا جاتا رہا، کہیں معمولی تبدیلی کرلی گئی اور کہیں نقل مطابق اصل رکھ کر چوری سینہ زوری کو جائز قرار دیا گیا اور یہ حرکت ادنیٰ و اعلیٰ تمام ڈراما نگاروں نے روا رکھی حتیٰ کہ آغا حشر جیسے خاتم فن نے بھی اس کو معیوب نہ سمجھا جب آغا صاحب نے ذاتی کمپنی قائم کی اور ہر روز کھیل دکھانے کی غرض سے نئے نئے ڈراموں کی ضرورت ہوئی تو کئی بازاری ڈراموں میں معمولی رد و بدل کرکے اپنے نام سے اسٹیج کر دیئے۔ غالباً یہی سبب تھا کہ آغا صاحب نے اپنے ڈراموں کو ایم آئیں جوہر اور سہدم وغیرہ کے ناموں سے چھپا ہوا دیکھ کر قانونی چارہ جوئی مناسب نہ سمجھی۔ وہ سمجھتے ہوں گے کہ یہ اس دنیا کی رسم و آئین ہے اور ابتدا سے آخر تک اس قبیل کے سرقہ کے خلاف اصل مصنفین یا مالکان کمپنی نے کاپی رائٹ ایکٹ کے بموجب کبھی قانونی کارروائی روا نہ رکھی۔ یہ رسم کچھ اس طرح رائج رہی ہے کہ بیشتر تصانیف کے بارے میں یہ مختلف فیہ مسئلہ حل نہ کیا جا سکا کہ ان کے اصل مصنف کون ہیں اور کس کس کو نقال تصور کیا جائے۔ افسوس یہ ہے کہ ان قدیم ڈراموں میں سے اکثر نایاب ہیں اور اگر ان میں سے چند دستیاب بھی ہوئے ہیں تو ان کا ایک ایک نسخہ کسی کتاب خانہ میں محفوظ پایا گیا ہے۔ اگر کسی ایک ڈرامے کے چند مختلف مطبوعہ نسخے مل سکتے تو ان کی مطابقت سے یہ مسائل تحقیق کی روشنی میں حل کئے جا سکتے۔ چنانچہ "بے نظیر بدر منیر" مصنفہ آرام کا کوئی نسخہ کسی کتاب خانہ میں موجود نہیں۔

اس سلسلہ میں ایک بات قابلِ ذکر ہے کہ اگر اس قسم کا توارد محض پلاٹ کی حد تک ہو تو چنداں مضائقہ نہیں۔ ہر زبان اور ملک میں اس قسم کا انداز رائج ہے اور ایک پلاٹ یا واقعہ خصوصاً کسی تاریخی واقعہ کو ایک سے زیادہ ڈراما نگاروں نے اپنا بنایا ہے اور اپنے اپنے انداز میں علیحدہ صورت گری کے جوہر دکھا کر الگ شان بخشی ہے، لیکن ان ڈراموں میں قابلِ اعتراض بات یہ نظر آتی ہے کہ صورت گری کا انداز بجنسہٖ رکھا گیا ہے حتیٰ کہ چند گانوں کے رد و بدل کے علاوہ شروع سے آخر تک اصل عبارتوں میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔

۲۔ ستم ہامان عرف فریب عزرائیل:۔ یہ منظوم ڈراما ۱۸۸۰ء میں رونق بنارسی کے نام سے شائع ہوا اور ان کی تصانیف کی فہرست میں درج ہے۔ اس کا پلاٹ گوئٹے کے "فاؤسٹ" سے ماخوذ ہے۔

۱۸۸۰ء میں کریم الدین کریم بریلوی نے گلستانِ خاندان ہامان کے نام سے دوبارہ لکھ کر شائع کرایا۔ تین مطبوعہ نسخے علی الترتیب حافظ عبداللہ، غلام حسین ظریف اور منشی بخش الٰہی ناجی کے نام سے بھی ملتے ہیں۔

۳۔ عاشقِ صادق عرف "ہیر رانجھا":۔ یہ منظوم ڈراما ۱۸۸۰ء میں سب سے پہلے رونق کے نام سے شائع ہوا۔ یہ پہلا اڈیشن ہے اور دوسرا اڈیشن چھ سال بعد ۱۸۸۶ء میں رونق کے انتقال کے بعد انہی کے نام سے شائع ہوا۔ اس میں دو فارسی کی غزلیں بھی شامل ہیں جنہیں "رانجھا" گاتا ہے۔ ان غزلوں میں رونق تخلص ہے۔ اس سے ایک امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ رونق اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے کیونکہ اس ڈرامے کے علاوہ ان کے کئی اور ڈراموں میں بھی فارسی اشعار اور غزلیں ملتی ہیں۔ اس ڈرامے کے دو اور نسخے حافظ عبداللہ اور عبدالعزیز کے نام سے بھی شائع ہوئے جن میں کچھ اضافے اور تبدیلیاں پائی جاتی ہیں۔

ان ڈراموں کے علاوہ حسب ذیل ڈرامے کئی مصنفین کے نام سے

علیحدہ علیحدہ ملتے ہیں۔

ا:۔ انجام الفت عرف ہمایوں ناصر مصنفہ رونق، بعد ازاں غلام حسین ظریف از نقیر محمد مکی۔

ب:۔ پورن بھگت مصنفہ رونق (۲) حافظ عبداللہ (۳) غلام حسین ظریف (۴) بخش الٰہی نامی۔

ج:۔ سیف سلیمانی عرف تحفۂ معصومہ از (۱) رونق (۲) حافظ عبداللہ (۳) غلام حسین ظریف۔

د:۔ فسانۂ عجائب از (۱) رونق تمثیل شدہ ۲۵ اپریل ۱۸۸۳ء یہ ڈراما منظوم ہے اور اس میں بھی کئی جگہ فارسی اشعار ہیں (۲) مطبوعہ ۱۸۹۶ء نام مصنف و ناشر نامعلوم (۳) مطبوعہ ۱۸۸۵ء منصفہ محمد نبی گو ہر مراد آبادی اس میں مطبوعہ نام بدل کر جان عالم و انجمن آرا چھاپا گیا ہے۔ ان کے علاوہ (۴) حافظ عبداللہ (۵) نظیر بیگ۔ موخر الذکر ہر دو مصنفین کے ناموں سے جو ڈرامے شائع ہوئے ہیں ان میں نثر کے مکالموں کا اضافہ ہے۔

ہ:۔ انصاف محمود شاہ عرف ظلم عمران روسیاہ: یہ ڈراما زیادہ تر منظوم ہے لیکن کچھ حصہ نثر کے مکالموں کا بھی ہے۔ برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کے کتاب خانوں میں جو نسخے ہیں ان پر تاریخ اشاعت ۱۸۸۲ء درج ہے اور رونق بنارسی کی تصنیف ہے۔ ایک نسخہ ۱۸۸۵ء میں شائع ہوا ہے جس کے سرورق پر ظریف کا نام درج ہے لیکن پانچ غزلوں میں رونق تخلص موجود ہے اور ایک شعر ظریف کا اس طرح درج ہے ؎

نالک ہم اے ظریف تراشے نئے نئے
لیکے قدیم ہیں یہ تماشے نئے نئے

اسی ڈراما کا ایک نسخہ ڈاکٹر عبدالعلیم نامی (بمبئی) کے کتاب خانہ میں موجود ہے اور ڈاکٹر صاحب موصوف کے بیان کے مطابق اس میں چار جگہ رونق تخلص آیا ہے۔ اس کے سرورق پر یہ قطعہ درج ہے ؎

کھیل محمود شاہ غزنوی کا | چھاپا اس کو بہ دل ظریف زار
رشک نوشیروانِ عادل ہے | جس کا نواباں ہر ایک عادل ہے

نیز ذیل کی عبارت بھی ہے:۔

"المشتہر حسینی میاں ظریف۔ تاریخ ۱۱ ذیقعد ۱۳۰۵ھ در مطبع اسٹیم پریس طبع شد۔"

ڈاکٹر صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ اس نسخے کو اگرچہ جیتا جمنا داس بھگوان نے شائع کیا ہے، لیکن پبلشر کی حیثیت سے اس کا نام کہیں درج نہیں ہے۔ صفحہ آخر پر ان کتب فروشوں کے نام تحریر ہیں جہاں سے یہ کتاب دستیاب ہو سکتی ہے۔ ان ہی میں سے ایک نام جیتا جمنا داس بھگوانداس بھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ قانونی چارہ جوئیوں سے بچنے کے لئے کیا گیا ہے۔

یہ بیان ایک حد تک مبہم ہے، جس کی مزید تشریح کی ضرورت ہے۔ اگر پبلشر کی حیثیت سے کسی کا نام درج نہیں تو یہ کیوں کر ظاہر ہوا کہ جیتا جمنا داس بھگوان داس نے شائع کیا، واللہ اعلم، جہاں تک ظریف کے مذکورہ بالا شعر "نالک ہم اے ظریف الخ" کا تعلق ہے یہ ان متعدد ڈراموں پر بھی درج ملتا ہے، جو ظریف کی تالیف کی حیثیت سے شائع کئے گئے اور ان میں سے اکثر کے پبلشر کا نام سرورق پر "جیتا جمنا داس بھگوانداس بمبئی" چھپا ہے۔

خاص طور پر حسینی میاں ظریف کے نام کا مسئلہ اس طرح طے پا جاتا ہے کہ جن چند ڈراموں کے سرورق پر حسینی میاں ظریف یا غلام حسین ظریف "مصنف" کی حیثیت سے درج ہے۔ ان کے بارے میں یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ ان کے لکھے ہوئے ہیں باقی جن پر ان کا نام "مولف" کی حیثیت سے تحریر ہے وہ سب کے سب قینچی کی تراش اور سرقہ ہیں اور یہ شعر ان پر صادق آتا ہے کہ "نالک ہم اے ظریف تراشے نئے نئے"

میاں ظریف نے امانت کے "اندر سبھا" پر بھی ہاتھ صاف کئے بغیر نہ چھوڑا اور اسے "گلشن بہار افزا عرف نئی دربائی اندر سبھا" کے نام سے ۱۳۰۲ھ میں اپنے نام سے شائع کرایا۔ اس کے اندرونی سرورق پر نام کے بعد یہ عبارت درج ہے:۔

"نالک دو باپ کا — تالیف کیا ہوا حسینی میاں ظریف صاحب، استاد امانت کی اندر سبھا سے انتخاب کر کے اور چھاپ کے اظہار کیا واسطے شوقین خاص و عام کے جیتا جمنا داس بھگوانداس کی کمپنی نے"۔ اس کے بعد وہی شعر حسب معمول درج ہے۔ پھر تحریر ہے "یہ قصہ ۱۸۶۷ء کے ۲۵ ویں قاعدہ کے مطابق داخل رجسٹر ہوا ہے۔ اور اس کے تمام حقوق جیتا جمنا داس بھگوانداس کی کمپنی نے اپنے قبضہ میں کئے ہیں۔ اس لئے ان کی اجازت کے سوا کسی نے اس قصہ کو چھاپنا نہیں۔ قیمت بمبئی ادھی آنے ۱۳۰۲ھ مقدس —"

اصل اندر سبھا میں معمولی رد و بدل اور ترمیم و تنسیخ اس طرح کی ہے کہ کرداروں میں دیو اور پری کی جگہ شروع میں حبشی اور حبشن کر دیا ہے اور اختصار کی غرض سے چند کردار کم کئے ہیں۔ آغاز میں تبدیلی کر کے ابتدا اس گانے سے کی گئی ہے:۔

عشق کو پیدا کیا جس روز سے پروردگار | مجھ سے ساری خدائی عشق میں ہیں دل ونہار

خاک سے کیا کیا ہے عشق نے رنگینیاں غنچۂ گل، برگ و ثمر، نخلِ چمن، بادِ بہار
عشق سے خالی نہ دیکھا کوئی شئی ہم نے ظریفؔ محور ارض و سما، ذی روح حیوان مور کا

یہ اشعار اصل اندر سبھا کے متن کے مقابلہ میں نہایت ادنیٰ درجے کے ہیں اور عیب سے خالی نہیں۔ اسی طرح درمیان میں کئی جگہوں پر گفتہا اضافے نظر آتے ہیں۔ اور بیشتر اصل کی نقل ہے، اصل کرداروں میں گلفام، اندر راجہ، سبز پری وغیرہ سب موجود ہیں۔ اور ڈراما اصل کے مطابق آخری نغمۂ شادیٔ جلوۂ گلفام مبارک ہوئے" پر اختتام پاتا ہے۔ بعد ازاں تحریر ہے "خاتمہ بالخیر ہوا" اور پھر ایک قصیدہ طبعزاد ظریف درج ہے جس کا عنوان حسب ذیل ہے:-

"قصیدہ تاریخ جلوس مہاراجہ سیاجی مہاراج والیٔ بڑودہ من طبعزاد غلام حسین عرف حسینی میاں تخلص ظریف بہوری دادر بندر بمبئی" قصیدہ کا آغاز اس مطلع سے ہوتا ہے ؎

سر پہ چرخ پر رونق فزا بجاہ و جلال بسانِ شمس منور رہو نیرِ اقبال

کل ۴۴ اشعار ہیں، مقطع میں تخلص ہے۔

سن جلوس سیاجی بہادر روزی جاہ ظریف گفت مبارک این تخت و تاج و مال

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ڈراما ۱۸۵۱ء میں کھیلا گیا ہوگا اور اسی سال شائع ہوا۔ قصیدہ کے بعد ایک سہرا اپنے شاگرد رشید نور محمد میمن متخلص بہ عاشق و بدنام کی شادی کی تقریب پر تصنیف کیا ہوا درج ہے۔ اور آخر میں "جہتا جناداس بھگوانداس پبولیر بمبئی" کی جانب سے "اشتہار واجب الاظہار" کے عنوان سے اردو اور گجراتی زبان کے چند ڈراموں کی فہرست دی گئی ہے۔

اس طرح متعدد ڈرامے ظریف کی "قلمی قینچی کی تراش" ہیں، جو ان کی تصانیف کی طویل فہرست میں شامل ہیں۔ ان میں ڈراما (منظوم) "نیرنگ عشق" عرف گلزار عصمت" ظریف کی تصنیف معلوم ہوتا ہے۔ یہ تین ایکٹ کا ڈراما ہے، جس میں تمام غزلوں اور گانوں میں ظریف کا تخلص موجود ہے۔ مقام ملک ختن و یمن ہے اور پلاٹ حسن و عشق کی داستان پر مبنی ہے۔ آخر میں سن تصنیف اس طرح تحریر ہے:-

"ماہ دستگیر گیارہ کو ابتدا کیا اور پچیس کو انجام پایا ۱۲۶۶ھ اور آخری سین میں اپنے عہد کے عام ڈراموں کی طرح نغمۂ شادمانی گایا جاتا ہے:-

ہر اک مۂ نشاط سے سرشار ہوگیا دربار شاہ خانۂ خمار ہوگیا

مقطع اس طرح ہے ؎

نیرنگِ عشق کو یہاں اتمام کر ظریفؔ یہ کھیل وہ نہیں جو کبھی بار ہوگیا

اس شعر کا انداز بھی ظاہر کرتا ہے کہ ظریف نے دوسرے قدیم ڈراموں کو اب تک جس طرح "چوری سینہ زوری" سے اپنایا۔ "نیرنگ عشق" ان سے مختلف تھا۔ اور خود تصنیف کیا۔ یہ ڈراما تمام تر نظم میں لکھا گیا ہے، جس میں رباعی، قطعہ بند کی طرز میں مکالمے اور غزل، مرثیہ، مسدس اور ترجیع بند کے انداز میں گانے ہیں۔ گانوں میں مکالموں کا انداز ہے۔ نظم نہایت ادنیٰ پایہ کی ہے۔ مثلاً

ماہ تاباں:-

اے بدبخت موذی تو بکتا ہے نکل رو برو سے میرے بے حیا
وہ مادر جو تیری گئی بد گہر اسی کے گلے سے لپٹ پیار کر
وہی تیری دلبر ہے اے بے شعور میں جاتی ہوں اس سے لپٹ جا ضرور

شہزادہ:-

گئی مار کے مجھکو تو بھاگ اب میں مادر کو جا کے کہوں گا یہ سب
بغیر از سزا کے نہ ہو مجھکو کب ابھی دیکھو لاتا ہوں کیسا غضب
اسی طرح روتا ہوا جاؤں گا ابھی مار کھلوا کے رلواؤں گا

ایک نقل گرو اور چیلے کی کومک کے طور پر شریک ہے، جو ہندی آمیز نثر میں ہے۔ آغاز سے انجام تک ایک سیدھی سادی سپاٹ کہانی ہے جس میں ڈرامائی عمل اور حرکت کہیں نام کو نہیں۔ پلاٹ میں بھی کہیں پیچیدگی یا نقطۂ عروج کا نشان نہیں ملتا۔ اس دور (۱۸۵۵ء) کا عام انداز یہی ہے کہ اور نثر کی نقل شامل کر کے اس کو ڈراما بنانے کی کوشش کی ہے۔ ورنہ ڈراما کے فنی نکات بہت کم ملتے ہیں:

پشتو رومان

شہرو اور غزالہ

(۲)

احمد فراز

کچھ پریشاں سی کچھ اُداس سی ہو
آج کچھ بے کلی سی ہے تم کو

غزالہ: کچھ نہیں.... کوئی خاص بات نہیں
دیکھ.... کیا... آج چاند رات نہیں
کیا بتاؤں ...... بتا نہیں سکتی
کیا چھپاؤں.... چھپا نہیں سکتی

بڑھیا: جانتی ہوں کہ یہ شباب کے دن
فتنہ ساماں ہیں کس قدر لیکن
زندگی پر کچھ اختیار تو ہو
یاں کسی شے پہ اعتبار تو ہو
جس ستمگر نے تجھ کو قید کیا
ہاں اسی نے مجھے بھی صید کیا
ایک ہی غم سے دل فگار ہیں ہم
ایک ہی تیر کے شکار ہیں ہم

غزالہ: میں تری بات ماں نہیں سمجھی
کیا کہا تو نے؟ ہاں نہیں سمجھی
کیا یہ بستی یہ گھر نہیں اپنا
یہ فضا یہ نگر نہیں اپنا
ماں تو خاموش کیوں ہے؟ بول بھی کچھ
ان معمّوں کے پیچ کھول بھی کچھ
دادرس کون ہے بتا تو سہی
میرا قصہ مجھے سنا تو سہی
اور تُو... تُو کہاں سے آئی ہے؟
کیا یہ شیطان کی خدائی ہے؟

....

تُو تو رونے لگی ہے، بات ہے کیا؟
آخر ایسی بھی واردات ہے کیا؟

بڑھیا: کچھ نہیں جانے بک گئی کیا کیا
بے سبب ہی بہک گئی کیا کیا
یہ ضعیفی بھی اک قیامت ہے
اور رونا تو میری عادت ہے
چھوڑو ان دُکھ بھرے فسانوں کو
کون لایا گئے زمانوں کو

غزالہ: ماں بس اب سارے راز جان گئی
ہر نشیب و فراز جان گئی

بڑھیا: جاؤ، اب تم سکوں سے سو جاؤ
کہیں تم بھی دُکھی نہ ہو جاؤ

غزالہ: اُڑ چکی نیند اب قرار کہاں
اب تو آنکھوں پہ چھا گیا ہے دھواں

بڑھیا: جاؤ، باہر ذرا ٹہل آؤ
چاندنی شب ہے جی کو بہلاؤ
اس سے پہلے کہ داورِ آ جائے
موت کا سا سکوت چھا جائے
لوٹ آنا ہنسی خوشی گھر میں
سینکڑوں رنج ہیں مقدر میں

(دور آواز گونجتی ہے)

تیرے نگر میں آئیں مسافر
پگ پگ ٹھوکر کھائیں
گھور اندھیروں کی دنیا میں
تیرا کھوج نہ پائیں

●

(غزالہ چونک پڑتی ہے اور باہر نکلتی ہے۔ پائل کی جھنک ہر قدم کا فاصلہ ظاہر کرتی ہے)

غزالہ: آ گئے تم؟ میں انتظار میں تھی
شمروز: زندگی تیرے اختیار میں تھی
کتنی مشکل سے آج رات ہوئی
جانے کیا ایسی خاص بات ہوئی
غزالہ: وجہ آشفتگی نہیں معلوم
شمروز: یہ تو خود مجھ کو بھی نہیں معلوم
غزالہ: دل دھڑکنے لگا تھا شام سے آج
شمروز: بیکلی تھی ترے پیام سے آج
غزالہ: یوں لویں دے رہے ہیں دل کے کنول
جس طرح جل رہے ہوں خواب محل
شمروز: پھول کھلنے لگے ہیں راہوں میں
ٹھنڈکیں بس گئیں نگاہوں میں
غزالہ: آہ لیکن یہ پیار کے سپنے
ٹوٹ جائیں کہیں نہ دل اپنے!
وقت تریاق بھی ہے زہر بھی ہے
موج راحت بھی غم کی لہر بھی ہے
کون جانے یہ زندگی کے سراب
دل یہاں ٹوٹتے ہیں مثل حباب
میں کہ خود اپنی دسترس میں نہیں
تمہیں اپنا ڈل، میرے بس میں نہیں
ایسی حالت میں سوچ تو شمروز
تم مرا دھیان چھوڑ دو شمروز
شمروز: کتنی مایوس وقت سے تم ہو
جانے تم کس خیال میں گم ہو
میری ہستی ہو، میری جان ہو تم
میری دنیا، مرا جہان ہو تم
آج سے تم —— مری غزالہ ہو
تم مری روح کا اُجالا ہو
غزالہ: تم نہیں جانتے مرے شمروز!
کس قدر واقعات ہیں دلدوز
کیا کہوں کس قفس کی قید میں ہوں
جب سے میں داورس کی قید میں ہوں
شمروز: داورس؟ کون؟ وہ مہیب انساں
جس کی صورت پہ دیو کا ہو گماں
غزالہ: ہاں وہی راہزن، وہی مکار
ظلم پرور، لٹیرا، بدکردار
جس کے نزدیک پاپ پاپ نہیں
شمروز: ہاں تو کیا وہ تمہارا باپ نہیں
غزالہ: آہ وہ میرا کچھ نہیں ہے۔ بھی
میں نے سب کلفتیں سہیں پھر بھی
کون ہوں میں؟ کہاں سے لائی گئی؟
کیسے دنیا مری لٹائی گئی؟
مجھ کو معلوم ہی نہیں شمروز!
یاد کی شمعیں بجھ چکیں شمروز!
مجھے اپنی فضا سے نفرت ہے
شمروز: میں سمجھتا ہوں یہ حقیقت ہے
داورس چور ہے، لٹیرا ہے
اس جگہ ڈاکوؤں کا ڈیرا ہے
تم مرے ساتھ کیوں نہیں چلتیں؟
عمر بھر مشعلیں نہیں جلتیں
غزالہ: نہیں شمروز کچھ تو سوچو تم
اپنی جاں سے مجھے عزیز ہو تم
داورس سنگدل ہے، قاتل ہے
اس سے ٹکرانا سخت مشکل ہے

تم بہادر سہی، جواں بھی سہی
جذبۂ عشق سا مراں بھی سہی
پھر بھی وہ اپنی چالبازی سے
مجھے خدشہ ہے تم کو مار نہ دے

شمروز: تم نہ پروا کرو حیات مری
صرف تم سے ہے کائنات مری
تم ہو گر تو غمِ نفس کیا ہے
موت کیا شے ہے داورس کیا ہے

(گھوڑے کی ٹاپ سُنائی دیتی ہے)

غزالہ: سنو! آواز آرہی ہے یہ کیا
شمروز: داورس واپس آرہا ہوگا
غزالہ: ہو چکی نصف شب، خدا حافظ!
اچھا شمروز اب.... خدا حافظ!
شمروز: کل ملوگی یہیں، غزالہ مری؟
غزالہ: ہاں اگر داورس سے جان بچی

(پائل کی چھنک سے غزالہ کے
قدموں کا تاثر پیدا ہوتا ہے)

داورس: کون؟
غزالہ: میں ہوں
داورس: کہاں سے آئی ہو؟
کس سے اس وقت مل کے آئی ہو؟
کون ہے وہ اجل نصیب بتا؟
کون ہے موت کا رقیب بتا؟
بولتی کیوں نہیں ہے سچ ذلیل؟
یہ خموشی تو جرم کی ہے دلیل
بول اس گھر میں کوئی غیر نہیں
پھوٹ کچھ منہ سے ورنہ خیر نہیں

(بڑھیا جاگ اُٹھتی ہے)

بڑھیا: کیا ہوا؟ اُف یہ ماجرا کیا ہے؟
کچھ تو معلوم ہو.... ہوا کیا ہے؟
اُف یہ غصہ، یہ برہمی، یہ عتاب!
میری بچی پہ اتنا ظلم و عذاب!
آخر ایسا بھی کیا گناہ ہوا؟
کیوں تمہیں یہ جنون آہ ہوا؟

داورس: چپ بھی رہ بدمعاش بے غیرت!
کتنی بنتی ہے بے حیا عورت!
میں ترے ہر چلن سے واقف ہوں
تیرے اوباش پن سے واقف ہوں
مکر کے رنگ چھپ نہیں سکتے
اب ترے ڈھنگ چھپ نہیں سکتے
مجھے سچ سچ بتا یہ بھید ہے کیا
ورنہ میں تیرا خون پی لوں گا
کیا غزالہ کسی سے ملتی ہے؟
بول! کس اجنبی سے ملتی ہے؟

بڑھیا: جھوٹ ہے، افترا ہے، وہم ہے سب
اس قدر بدظنی خدا کا غضب!
خود ہی جو ذلتوں میں رہتا ہے
دوسروں کو ذلیل کہتا ہے

داورس: ہوں! اب اتنے بڑھے مزاج ترے
ٹکڑے کرتا ہوں دیکھ آج ترے
ہے صلہ موت چالبازی کا
لے مزہ چکھ زباں درازی کا

(داورس بڑھیا کے چھرا بھونک دیتا
ہے، بڑھیا چیخ مار کر گر جاتی ہے)

بڑھیا: (کراہتے ہوئے) آہ خونخوار بھیڑیئے تو نے
کتنے آباد گھر کئے سُونے
یاد رکھ تو بھی یوں دکھی ہوگا
تیرا.... انجام بھی.... یہی ہوگا!

غزالہ: (روتے ہوئے) ماں!

بڑھیا: نہ رو میری بے نوا بیٹی
اس درندے سے جاں بچا بیٹی!
مر رہی ہوں پہ ہے خیال ترا
اب خدا کے سپرد حال ترا

(بڑھیا دم توڑ دیتی ہے)

داورس: دور ہٹ یہ پلید لاش نہ چھو
جل سکے گی نہ اب کسی سے تُو
سُن، مری بات کان کھول کے سُن!
گر نہ بدلی ترے مزاج کی دھن
اپنی ہستی تباہ دیکھے گی
موت تیری بھی راہ دیکھے گی

غزالہ: میں یہاں اور رہ نہیں سکتی
اب کسی طور رہ نہیں سکتی
موت بہتر ہے جی جلانے سے
قبر اچھی ہے اس ٹھکانے سے
جس کے نزدیک قتل پاپ نہیں
وہ لٹیرا ہے، میرا باپ نہیں

داورس: ہاں، یہ سب سچ ہے تیرا دوش نہیں
کچھ مجھے بھی تو اپنا ہوش نہیں
تجھ کو شاید خبر نہیں ہے یہ
کہ ترا اپنا گھر نہیں ہے یہ
دس برس کی طویل مدت تک
میں نے برداشت کی ہے ذلت تک
میں نے سب کچھ کیا ہے تیرے لئے
تیری خاطر تمام پاپ کئے
خود تو سو زخم ہر نفس کھائے
تجھ کو پھولوں کے ہار پہنائے
جتنی دولت تھی وار دی تم پہ
اپنی ہستی نثار کی تم پہ
کیا یہی اب صلہ ہے خدمت کا؟
سچ زمانہ نہیں مروت کا

غزالہ: میرا گھر کر چکے ہو تم ویراں
اور جتانے لگے ہو اب احساں؟
تم نے میرے ہی ناچ گانے سے
دھن کمایا ہے سب زمانے سے
مانگتے کیا ہو اب صلہ اپنا؟
لے چکے ہو معاوضہ اپنا
پیار سے جس نے مجھ کو پالا ہے
کیوں اُسے تُو نے مار ڈالا ہے
تم تو بے رحم ہو جنونی ہو
سانپ ہو، بھیڑیئے ہو، خونی ہو
اب میں پل بھر یہاں نہ ٹھہروں گی
کچھ بھی ہو جائے، ہاں نہ ٹھہروں گی

داورس: سوچ لے سوچ لے مآل اپنا
بے خبر کچھ تو کر خیال اپنا
اس سے پہلے کہ تو چلی جائے
سوچ لے پھر کہیں نہ پچھتائے
ٹھیک ہے تو مری نژاد نہیں
تو دکھی ہو، مری مراد نہیں
لیکن اب تُو مرا سہارا ہے
تیرے دھن پر مرا گزارا ہے
کس طرح جی سکوں گا تیرے بغیر
تُو مری جاں ہے تیرے حُسن کی خیر

غزالہ: تم اگر سچے دل سے چاہو تو
اور اپنا وچن نبا ہو تو
مجھ سے وعدہ کرو کہ جب تم کو
اتنی دولت اگر میسّر ہو
کہ سکوں سے تمہاری زیست کٹے
اور تمہیں کوئی فکر و غم نہ رہے
پھر مجھے تم کبھی نہ ٹوکو گے
جس طرف جاؤں تم نہ روکو گے

داورس: ٹھیک ہے وعدہ کر لیا میں نے
تمہیں اپنا وچن دیا میں نے
پہلے میری مراد بر لاؤ
پھر جہاں جی کہے چلی جاؤ
داورس کے فریب میں آ کر
پھر غزالہ وہیں اسیر رہی

(باقی آئندہ)

ڈرامہ

جبرو

رحمان مذنب

کردار

جبرو . . . . . . علاقے کا نامی گرامی غنڈہ
تاجاں . . . . اس کی بیوی
لطیفہ . . . . . . نیا سرکش غنڈہ
جیناں . . . . اس کی بیوی
بوٹی سائیں . . . . . . تائب غنڈہ۔ بوڑھا مگر توانا
گلو . . . . . . جبرو کا وفادار ساتھی۔ ادھیڑ عمر کا آدمی
خالہ . . . . بڑھیا مگر توانا
صابر علی . . . . خوش پوش۔ مالدار آدمی

پہلا منظر

ایک تنگ و تاریک گلی جہاں منزلہ ڈیڑھ منزلہ شکستہ نیم شکستہ مکان ہیں۔ انہی میں ایک مکان سب سے زیادہ مشہور اور علاقے کی سب سے بڑی شخصیت۔۔۔ جبرو کا گھر ہے۔ اس وقت وہ گھر پر نہیں۔ اس کی جوان اور خوبرو بیوی ــــ تاجاں موجود ہے۔ تیور بگڑے بگڑے ہیں۔ چارپائی پر بیٹھی ہے۔ پاس ریشمی بنیائین، قمیص اور شلوار کا کپڑا، دوپٹہ، زری کی جوتی اور کچھ آرائش کی چیزیں رکھی ہیں۔

گلو کھڑا سگرٹ پی رہا ہے۔

تاجاں اٹھتی اور کولھے پر ہاتھ رکھ کر گلو کے قریب آتی ہے۔

تاجاں: کتنے کی ہیں یہ سب چیزیں؟ (گلو کو چپ دیکھ کر سے پنکھے سے پیٹتی ہے) بولتا مرتا کیوں نہیں؟ منہ کیوں سل گیا ہے؟

گلو: بولتا ہوں، بولتا ہوں، بی بی! تو تو کچھ سوچنے ہی نہیں دیتی۔

تاجاں: سوچنے کے بچے! بول!

گلو:۔ نشہ بھی کتنی بری بلا ہے کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔ پر خیر، سن بی بی، دوپٹہ تیس کا، قمیص اور شلوار کا کپڑا ستر کا، جوتی پچیس کی، باقی چیزیں کوئی کوئی پندرہ بیس کی ہوں گی۔

تاجاں:۔ ہوا نہ کوئی سو سوا سو کا مال؟

گلو:۔ (سر ہلا کر) ہاں ہاں، بس اتنے کا ہے، اتنے کا۔

تاجاں:۔ روپیہ کہاں سے آیا؟

گلو:۔ روپیہ؟ واہ، بی بی تجھے آج تک پتہ نہ چلا کہاں سے روپیہ آتا ہے۔ بھلا، یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات۔ جبرو کے لئے سو رستے ہیں پیسہ آنے کے۔ صابر علی سینکڑوں تھما جاتا ہے، شاگرد پیشہ دے جاتے ہیں، جواری رقمیں ہار جاتے ہیں۔ خدا کی قسم اسبابرو بڑی کمائی کرتا ہے۔

تاجاں:۔ ہے جری کہیں کا! پوچھو کچھ بتاتا کچھ ہے۔ میں کہتی ہوں کہیں اس سوکن نے تو رقم نہیں دی۔

گلو:۔ اس سوکن نے؟

تاجاں:۔ ہاں، اس سوکن نے۔ میں اس کی ٹنگڑی توڑ دوں گی۔

گلو:۔ بڑی بری عورت ہے وہ!

تاجاں:۔ ضرور اسی نے روپیہ دیا ہوگا۔

گلو:۔ بی بی! ایک دم پانسو کہاں سے دیا ہوگا؟

تاجاں:۔ پانسو تھے اس کے پاس؟

گلو:۔ دھوتی کی گانٹھ کھولی تھی، تو اس میں سو سو کے پانچ نوٹ دیکھے تھے میں نے۔

تاجاں:۔ کسی کی جیب تو نہیں کاٹی؟

گلو:۔ خبر نہیں۔

تاجاں:۔ تو بڑا بنی مان ہے۔ تجھے سب خبر ہے۔ جان بوجھ کر چھپاتا ہے۔

گلُّو:۔ تجھے تو یقین ہی نہیں آتا۔ اب میں تجھ سے کیا کہوں؟

تاجاں:۔ مجھ سے کیا کہے گا؟ تو تو اس چیٹی چھپکلی سے ملا ہوا ہے نا۔ تم دونوں اس کے یہاں آتے جاتے ہو۔ اس سے روپیہ اینٹھتے ہو۔ تبھی تو تم دونوں مجھے کچھ نہیں بتاتے۔

گلُّو:۔ قسم ہے گیارہویں والے کی! آج تک اس سے کھوٹا پیسہ تک نہیں لیا۔ میری لے جوتی۔ میں، تجھ سے نہیں لے سکتا! جبر دستی نہیں لے سکتا؟

تاجاں:۔ چل چل باتیں نہ بنا! میں دودھ پیتی بچی نہیں، جو تمہاری چار سو بیس نہ سمجھوں۔ بیٹا! ہر بات سمجھتی ہوں۔ میرا بس نہیں چلتا ورنہ تمہارا بھیجا پھوڑ کر رکھ دوں۔

گلُّو:۔ بی بی! تجھے کیسے یقین دلاؤں، کیسے تیرا وہم دور کروں؟ تو تو کسی طرح مانتی ہی نہیں۔

تاجاں:۔ بس بس رہنے دے! تم سب آپس میں ملے ہوئے ہو۔ میرے تو تم دونوں دشمن ہو۔

گلُّو:۔ توبہ کر، توبہ کر! بی بی! دشمن پر خدا کی پھٹکار! ہم تو تیرے غلام ہیں۔

تاجاں:۔ پھر تو بتاتا کیوں نہیں؟

گلُّو:۔ کیا؟

تاجاں:۔ یہی کہ روپیہ کہاں سے آتا ہے؟

گلُّو:۔ قسم ہے پاک پروردگار کی، داتا کے دربار کی! کوڑھ چلے، مرتے دم کلمہ نصیب نہ ہو۔ جو مجھے ذرا بھی خبر ہو۔

تاجاں:۔ دور دفعان! کالا منہ نیلے ہاتھ پیر! ہر وقت سائے کی طرح ساتھ ساتھ پھرتا ہے اور خبر نہیں رکھتا ذرا بھی۔

گلُّو:۔ (ہنس کر) آج تو میں سوٹا لگا کے دن بھر تکیے میں پڑا رہا۔

تاجاں:۔ لعنت ہو تجھ پر خدا کی!

گلُّو:۔ مجھے تو وہ کہیں دوپہر کے بعد جا کر ملا ہے۔

تاجاں:۔ اسے یہ کپڑے لینے کی کیا سوجھی؟

گلُّو:۔ بس.... یونہی.... بیٹھے بٹھائے سوجھ گئی۔ چھنوں پان والے کے اڈے پر بیٹھا تھا۔ من میں لہر اٹھی۔ بولا "چل بیٹا گلُّو! زر کو آگ لگائیں"۔

تاجاں:۔ زر کو کیا، وہ تو مجھے آگ لگائے گا۔ مجھے جلائے گا۔

گلُّو:۔ خدا نہ کرے جو ایسا ہو۔

تاجاں:۔ کیا نہ ہو، ہو رہا ہے۔ پہلے وہ بیچاری سکینہ تھی، بے زبان اور بھولی بھالی لڑکی۔ غریب نے کتنے ظلم سہے ہیں لیکن کبھی بھول کر شکایت نہیں کی۔ اس کا ہمیشہ یہی چلن رہا کہ دوسری عورتوں سے میل ملاپ رکھتا اور اپنی عورت کو جلاتا۔ جب پانی سر سے گزر گیا اور وہ صدمے سہتے سہتے تھک گئی تو غریب نے دم دے دیا۔

گلُّو:۔ مولا جانے، تیری بہن بڑی صبر والی تھی۔ اس پر اس نے بڑے ظلم توڑے ہیں۔

تاجاں:۔ اب مجھ پر کچھ کم ظلم توڑ رہا ہے۔ بیاہ سے پہلے کیا کیا صفائیاں پیش کی ہیں، کیا معصوم اور بھولا بھالا بنا ہے اور اب.... وہ گل کھلا رہا ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ وہ سسری کیا ملی کہ گھر بار کو بھلا ہی بیٹھا۔

گلُّو:۔ ایسا مت کہہ بی بی! گھر بار کا خیال نہ ہوتا تو یہ سامان کیوں بھیجتا۔

تاجاں:۔ بس بس، بک بک نہ کر! بڑا آیا اس کا حمایتی۔ میں سکینہ نہیں۔ سب چالیں سمجھتی ہوں۔ وہ اس مارے خاطر کرتا ہے کہ اس کی طرف سے دل میلا نہ کروں۔ (چمک کر) گلُّو! مجھے یہ حرکتیں پسند نہیں۔ مجھے یہ چیزیں اچھی نہیں لگتیں۔ یہ سب چیزیں لے جا اور اس کمینی کے حوالے کر آ۔ وہ سمجھتا ہے، میں دودھ پیتی بچی ہوں، نادان ہوں، ان چیزوں سے بہل جاؤں گی، ان بے جان چیزوں سے۔ (چیزیں اٹھا کر ادھر ادھر پھینکتی ہے) خود تو ادھر ادھر مارا مارا پھرے اور مجھے ان مردار چیزوں پر ٹرخائے۔ ہونہہ، لے جا نہیں! مجھے ان کی ضرورت نہیں۔ جب وہ خود مجھ سے دور دور رہتا ہے پھر یہ چیزیں بھی کیوں بھیجتا ہے۔ گلُّو! میں سکینہ نہیں۔ لال مرچ ہوں، لال مرچ۔ میں اسے یونہی نہیں پھرنے دوں گی۔ اگر وہ باز نہ آیا تو میں اسے وہ مزا چکھاؤں گی، وہ مزا چکھاؤں گی کہ یاد ہی رکھے گا۔ میں بھی نیچے قصائی کی لڑکی ہوں، ہاں جس طرح میرا باپ جلاد تھا اسی طرح میں بھی جلاد ہوں۔

گلُّو:۔ بی بی! طیش میں مت آ!

تاجاں:۔ کیوں طیش میں نہ آؤں؟ میں کسی سے ڈرتی ہوں؟ کسی کی چوری کی ہے میں نے؟

گلُّو:۔ غصہ اچھا نہیں۔

تاجاں:- چل بزدل کہیں کا! میں کسی سے دبتی نہیں۔ نتھے قصائی کی لڑکی ہوں، ایسے ویسے کی نہیں۔

گلّو:- بی بی! خدا کے لئے غصّہ تھوک دے! کوئی نئی آفت نہ کھڑی ہو جائے۔ وہ آرہا ہے۔

تاجاں:- جا جا۔ مجھے نہ ڈرا! آرہا ہے، تو آنے دے۔ آج فیصلہ ہو کر رہیگا۔ یہ روز روز کی بک بک جھک جھک اچھی نہیں۔ جان عذاب میں ہے۔

(جبرو آتا ہے)

جبرو:- واہ بھئی واہ۔ کیا تماشا بنا رکھا ہے؟ اتنی مہنگی چیزیں دھول میں پھینک دیں۔ میری جان! میرا مال حرام کا تو نہیں اور یہ بھی تو محنت کئے بغیر کب ملتا ہے۔ میری سوہنی! روپے بوٹوں سے نہیں لگتے۔ بڑے ہیر پھیر، حیلے بہانے کے بعد ملتے ہیں۔ جیسے مچھلی کا شکار کرتے ہیں نا، مچھلی کا شکار کرو۔ نہ ملے تو دن بھر میں زیرہ بھی نہ ملے، الٹا کانٹا بھی گنوانا پڑے اور ملنے پہ آئے تو دیکھتے دیکھتے یہ ڈھیر کا ڈھیر لگ جائے۔ بس اسی طرح مال ہاتھ لگتا ہے۔ اتنی بدمزاجی اچھی نہیں۔ میں تو جان کھپاتا ہوں اور تجھے کچھ قدر ہی نہیں۔

تاجاں:- کون کہتا ہے جان کھپانے کو۔

جبرو:- پھر کیا گھاس کھودوں؟

تاجاں:- کیا جیب ہی کترنا اور جوا ہی کھیلنا چاہیئے؟ اور بھی جینے کے ڈھنگ ہیں۔

جبرو:- بڑے آئے ڈھنگ جینے کے۔

تاجاں:- ہاں، ہاں۔ پتہ ہے مجھے۔ منہ کو لگی چھٹتی نہیں۔

جبرو:- چل یہی سمجھ لے!

تاجاں:- آوارہ گردی میں کچھ نہیں رکھا۔ اس سے کچھ نہیں ملے گا۔

جبرو:- کیوں نہیں ملے گا؟

تاجاں:- نہیں ملے گا۔

جبرو:- رہنے دے اپنی نصیحت! اس پر عمل کروں تو بھوکا مروں۔

تاجاں:- یہ ساری دنیا جوا نہیں کھیلتی، جیبیں نہیں کاٹتی تو بھوکی ہی مرتی ہوگی؟

جبرو:- کیا ہے دنیا؟ میں دنیا کو کیا سمجھتا ہوں؟ دنیا کونسی میری سجن ہے؟

تاجاں:- ہاں، تو دنیا کو کیوں کچھ سمجھنے لگا؟ تجھے دنیا سے کیا؟ دنیا کیوں تیری سجن ہونے لگی۔ تیری سجن تو بس وہ چڑیل ہے۔

جبرو:- تاجاں! ہوش کی بات کر!

تاجاں: اس کی بات آئی اور چمکنے لگا، اتنا چمکتا کیوں ہے؟

جبرو:- میری چمکتی ہے جوتی، میری وہ کیا لگتی ہے؟

تاجاں:- ہاں، وہ تو تیری کچھ لگتی ہی نہیں۔ تو بھلا کیوں اقرار کرنے لگا؟ تیرے ساتھ بھاگنے کی فکر میں ہے وہ تو۔

جبرو:- ہونہہ، تاجاں! تیری عقل چرنے گئی ہے۔ پگلی! وہ لطیفہ، میرا ہی پٹھا ہے۔ مجھی سے اس نے سارا ہنر سیکھا اور اب مجھی سے بگڑ گیا ہے۔ علاقے میں بدمعاشی کرتا ہے اور تو تو جانتی ہے، مجھے حقہ بخرہ دئے بغیر کوئی شخص میرے علاقے میں کام نہیں کر سکتا۔ لطیفہ ایسا وہ ہے جس نے حقہ بخرہ دینا ہی بند نہیں کیا بلکہ میرا دشمن بن گیا ہے۔ کیا بڑھ بڑھ کر باتیں کرتا ہے۔ بھلا اس کی بیوی مجھ سے بات کرنے کی بھی روادار ہوگی؟

تاجاں:- ہوگی ہوگی کیا، تجھ سے ملتی جلتی ہے۔ اب اور زبان نہ کھلوا، کچا چٹھا کھول کے رکھ دوں گی۔

جبرو:- کھول دے کچا چٹھا!

تاجاں:- تو تو بڑا پارسا بنتا ہے لیکن میں بے وقوف نہیں۔ سب کچھ سمجھتی ہوں۔ لطیفہ پر پرزے نکال رہا ہے نا؟ اس کا اڈہ بھی خوب ترقی پر ہے۔ بڑی بڑی اسامیاں اسی کے یہاں جا کر جوا کھیلتی ہیں۔ علاقے کے لڑکے اس سے دبنے لگے ہیں۔ وہ تیرے مقابل آرہا ہے، اور یہ تجھے برا لگتا ہے۔ ہے نا؟ تو اسے نیچا دکھانا چاہتا ہے۔ اور تو کسی طرح نیچا دکھا نہیں سکا تو نے دوسرا حیلہ ڈھونڈا۔ اس کی کمزور رگ پکڑ لی، جیناں کو اپنے جال میں پھانس لیا۔

جبرو:- میں اسے ضرور نیچا دکھانا چاہتا ہوں۔ اس نے حقہ بخرہ دینا بند کر دیا ہے۔

تاجاں:- پھر تو نے یہ سوچا ہے کہ اس کی بیوی کو حصّے بخرے میں دھر لے۔

جبرو:- میں اپنے علاقے کا مالک ہوں۔ جو کوئی میرے منہ آئے گا منہ کی کھائے گا۔

تاجاں:- پھر جتنی جینکی کی بات تم ہی ہوئی نا؟

جبرو:۔ تو تو جل ککڑ ہے۔ بات تو سمجھتی نہیں۔ تیری کسی طرح تسلی ہی نہیں ہوتی۔

تاجاں:۔ تسلی کیسے ہو؟ تو اس کم ذات سے ملتا ہے اور میری چھاتی پہ مونگ دلتا ہے۔

جبرو:۔ وہم کا کیا علاج؟ بے چارہ نقصان نہ کر سکا، جبرو کس کھیت کی مولی ہے؟

تاجاں:۔ ابھی ابھی اقرار کیا تھا اور اب مکرنے بھی لگا۔

جبرو:۔ یہ میری پال سی ہے، پال سی۔ میری پال سی کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

تاجاں:۔ ہاں، تیری پال سی کیوں کوئی سمجھنے لگا؟ محلے بھر میں چرچا ہے۔ بچے بچے کی زبان پر تم دونوں کی کہانیاں ہیں اور تو کہتا ہے، تیری پال سی کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا۔ تیرے خیال میں تو ساری دنیا پاگل اور جھوٹی ہے۔

جبرو:۔ (تنک کر) دنیا، دنیا، دنیا۔ میں دنیا کی کیا پروا کرتا ہوں۔ میرے سامنے تو کوئی زبان کھولے۔ ہاں مجھ سے آگے لوگ قصے کہانیاں کہہ جاتے ہیں۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟

تاجاں:۔ تو کیا کر سکتا ہے۔ اپنی چلائے جا، گلچھرے اڑائے جا!

جبرو:۔ بچوں کی سی باتیں مت کر! کہیں دماغ تو خراب نہیں ہوا؟ احمق! تیرے سوا میرا کسی سے واسطہ نہیں۔ خدا نے جب مجھے اتنی اچھی بیوی دی ہو تو میں ادھر ادھر کیوں جھک ماروں۔

تاجاں:۔ کیسی اور کہ بے وقوف بنا! میرا دماغ ٹھیک ہے۔ میں احمق نہیں۔ تو اس نگوڑی کو تانگے میں لئے لئے پھرتا ہے۔ اسے سینما میں لے جاتا ہے۔ شالامار اور مقبرے کی سیر کرواتا ہے۔

جبرو:۔ کیوں بے پر کی ہانکتی ہے۔ گھر میں بیٹھے بیٹھے کاغذی گھوڑے دوڑاتی ہے۔

تاجاں:۔ ہائے اللہ، اب آنکھوں دیکھی باتیں بھی جھوٹی ہو گئیں۔ ایک تو چوری دوسرے سینہ زوری۔ اسے لئے لئے پھرتا ہے اور کہو تو مانتا نہیں۔

جبرو:۔ گلو، ذرا بی بی کو سمجھا! یہ ہوش میں نہیں ہے۔

تاجاں:۔ گلو سے کیا کہتا ہے۔ گلو کیا سمجھائے؟ تیری نیت میں فتور ہے۔

جبرو:۔ پھر تیری کیا نیت ہے؟

تاجاں:۔ میری نیت یہ ہے کہ تو نے اس فاحشہ کا پیچھا نہ چھوڑا تو میں، میں تجھے چین سے بیٹھنے نہ دوں گی۔ آسمان سر پر اٹھاؤں گی۔

جبرو:۔ ارے ارے ایسا غضب نہ کرنا!

تاجاں:۔ مجھے تیرے لچھن پسند نہیں۔ پہلے سکینہ کو ملا اور اب مجھے برباد کرنا ہے۔

جبرو:۔ اب گڑے مردے تو نہ اکھاڑ!

تاجاں:۔ تو اپنی حرکتوں سے باز جو نہیں آتا۔

جبرو:۔ یہ میری سیاست ہے۔ میری چال ہے۔ یہ میرا کام ہے، میرا معاملہ ہے۔ تجھے اس میں دخل نہ دینا چاہیئے۔ تجھے اس سے کیا؟ دھندا چلانے کے لئے مردوں کو جانے کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔ ان کا کام وہی جانیں۔ گھر والیوں کو دخل نہ دینا چاہیئے۔ انہیں تو بس گھر کے کام سے کام رکھنا چاہیئے۔

تاجاں:۔ ہاں، ہاں۔ تو تو کہتا ہے، میں آنکھیں بند کر لوں اور تجھے کھلی چھٹی دے دوں۔ جو جی میں آئے کرے۔

جبرو:۔ گوری! یہ بڑی پیچیدہ اور لمبی چوڑی باتیں ہیں۔ تو ان میں نہ پڑ، خواہ مخواہ دماغ خراب ہوگا۔ موج میلہ کئے جا۔ اور میں، میں آخر تیرا خاوند ہوں۔ تیرے سب حقوق پورے کرتا ہوں۔ مجھ پر بھروسہ رکھ!

تاجاں:۔ خاک بھروسہ رکھوں، ہمیشہ جھانسے دیتا ہے۔

جبرو:۔ (جھلا کر) اگر تو میری زبان پر اعتبار نہیں کرتی تو مت کر! جا، میں یونہی جھانسے دیتا رہوں گا۔

تاجاں:۔ کیسے کیسے جھانسے دیتا رہے گا؟ میں فیصلہ کر کے رہوں گی۔

جبرو:۔ تاجاں! میں نے کہاں سے کھپ کھپا کر، تھک ہار کر آیا ہوں اور تو نے آتے ہی فساد شروع کر دیا۔ ذرا آرام کرنے دے۔ دم لینے دے! خدا رسول کے لئے یہ وانتا کل کل بند کر!

تاجاں:۔ کیوں بند کروں؟ میں سکینہ نہیں جو منہ میں گھنگھنیاں ڈالے رہوں۔ خیرے کی نہیں، نجے قصائی کی بیٹی ہوں۔

جبرو:۔ تو جبرو کی عورت ہے اور جبرو سے زبان درازی نہیں کر سکتی۔

تاجاں:۔ یہ آنکھیں لال پیلی کر کے کسے دکھاتا ہے؟

جبرو:۔ آنکھوں کی بچی! بک بک جھک جھک بند کر!

تاجاں:۔ تو اس چھچھوندر سے ملنا جلنا بند کر!

جبرو:۔ تو مجھے زن مرید سمجھتی ہے جو یوں حکم سناتی ہے؟ میں مرد ہوں، علاقے کا مالک ہوں، جو چاہے کروں۔ تجھے کیا؟

تاجاں:۔ میں تجھے من مانی نہیں کرنے دوں گی۔

جبرو:۔ تو میری ہٹ سے واقف نہیں۔

تاجاں:۔ میں بھی کسی سے کم ہٹیلی نہیں۔

جبرو:۔ میں جیبیاں سے بات تک نہ کرتا لیکن تو ضد دکھاتی ہے تو میں بھی باپ کا نہیں جو اس سے بات نہ کر کے دکھاؤں۔ پھر تو یونہی تکا کیا۔

تاجاں:۔ دیکھوں گی، کیسے بات کرتا ہے۔

جبرو:۔ میں اسے اس گھر میں لاؤں گا۔

تاجاں:۔ مجھے بھی تجھے قصائی کی نہیں کسی بھنگی کی بیٹی کہنا جو میں نے اس مردار کے گلے پر چھری نہ پھیری اور اس کا خون نہ پیا۔

جبرو:۔ میں کہتا ہوں، میں رات بھر کا جاگا ہوا ہوں۔ مجھے تنگ نہ کر، آرام کرنے دے! یہ دنگا فساد بند کر!

تاجاں:۔ نہیں بند کرتی۔

جبرو:۔ کیسے بند نہیں کرتی؟ (چپت مارتا ہے)

تاجاں:۔ مارا اور مار! رک کیوں گیا؟ کلیجہ ٹھنڈا ہوگا۔

بوٹی سائیں کھانستا کھنکھارتا آتا ہے۔ داڑھی اور سر کے بال سفید ہیں لیکن صحت اچھی ہے۔ ہاتھ میں موٹا ڈنڈا پکڑے ہے۔

بوٹی سائیں:۔ جبرو! او میرے یار، یہ کیا کیا؟ عورت پہ ہاتھ اٹھایا تو نے؟ کچھ شرم کر!

جبرو:۔ بوٹی سائیں! تاجاں کو سمجھا! اتنی دیر سے جھگڑ رہی ہے۔

بوٹی سائیں:۔ بھائی! یوں مارکٹائی سے تو جھگڑا نہیں نمٹے گا۔

تاجاں:۔ بوٹی سائیں! جھگڑا کیسے نہ کروں، یہ جیناں سے ملتا ہے۔ منع کرتی ہوں تو مانتا نہیں۔ الٹا اسے یہاں لانے کی دھمکی دیتا ہے۔

بوٹی سائیں:۔ ٹھیر ٹھیر، تاجاں! حوصلے سے کام لے! جلد بازی نہ کر! کہیں اور کپٹ نہ پڑ جائے۔ حوصلے سے کام لے، حوصلے سے!

جبرو:۔ بوٹی سائیں! یہ بڑی جھگڑالو عورت ہے۔

تاجاں:۔ تو تو جیسے کبھی جھگڑتا ہی نہیں۔

بوٹی سائیں:۔ میں کہتا ہوں، بھلے مانسو! دوسرے کی بھی سنو!

جبرو:۔ بوٹی سائیں! یہ دیکھ! قبلے کی طرف منہ ہے۔ کافر ہو جس نے کسی عورت کو میلی نظر سے دیکھا ہو۔

تاجاں:۔ تو تو ابھی جیناں کو یہاں لانے کی بات کر رہا تھا۔

جبرو:۔ تو میری پالسی نہیں سمجھتی۔ میری پالسی میں ہی سمجھ سکتا ہوں۔ یہ میرے دھندے کی بات ہے۔ اپنی عزت کی خاطر جانے کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔ تجھے میرے دھندے کا کیا پتہ۔

تاجاں:۔ ہاں، ہاں۔ میں بے سمجھ جو ٹھیری۔

بوٹی سائیں:۔ سنو، سنو! احمقو! تاجاں! تجھ جیسی عورتیں ہیں جو بیٹھے بٹھلائے گھر بار برباد کر لیتی ہیں اور پھر روتی پچھتاتی ہیں۔ تو بھی سن لے جبرو! یہ قصہ عمر بھر طے نہ ہوگا۔

جبرو:۔ بوٹی سائیں! میں کیا کرتا ہوں؟

بوٹی سائیں:۔ یہی کہ میری نہیں سنتا۔

جبرو:۔ اب بوٹی سائیں تو تو کہتا ہے میں اپنا پیشہ چھوڑ دوں۔

بوٹی سائیں:۔ خدا کے بندے! بدماشی کا پھل اچھا نہیں۔ تو مجھ سے بڑا غنڈہ تو نہیں۔ جا پولس کا ریکارٹ دیکھ! کچہری کی مسلیں دیکھ! اپنے زمانے میں بڑے بڑے کام کئے ہیں۔ بیٹا! خطرے کو تو کبھی خاطر ہی میں نہیں لائے۔ ڈاکے ڈالے۔ اغوا کئے۔ لڑائیاں لڑیں۔ خون خرابے کئے۔ سر پھاڑے پھڑوائے۔ چاقو چھریاں چلائیں۔ شریفوں کی پگڑیاں اچھالیں۔ نشے کئے۔ قیدیں کاٹیں۔ نام پیدا کیا۔ دس نمبری بنے لیکن لیکن زندگی برباد گئی۔ بربادی کے سوا کچھ پلے نہ پڑا۔

جبرو:۔ بوٹی سائیں! زندگی تو برباد ہی جانے کے لئے ہے۔

بوٹی سائیں:۔ پاگل نہ بن! جبرو! تیرا کام بہت برا ہے۔

جبرو:۔ میں نے کب اچھا کہا ہے؟

بوٹی سائیں:۔ نہیں کہا تو پھر اسے چھوڑتا کیوں نہیں؟

جبرو:۔ میں اور کوئی کام نہیں کر سکتا۔ جس کام میں تیس سال گذارے اسے اب کون چھوڑے؟

بوٹی سائیں:۔ ہمت کر، ہمت! یہ عیب والی زندگی اچھی نہیں۔ لعنت بھیج اس پر!

جبرو:۔ (چمک کر) بوٹی سائیں! مجھے کیا کہتا ہے، اس وکیل سے جا کر کہہ جس نے میری ماں کے مرتے ہی دوسری شادی کر لی۔ جو نئی بیوی کے نخرے اٹھاتا جاتا لیکن میرا ذرا خیال نہ کرتا۔ سوتیلی ماں مجھے دن رات مارتی پیٹتی۔ برے سے برا سلوک کرتی اور اس کے عوض میں اپنے شوہر سے داد لیتی۔ خدا کی قسم! مجھے گھر سے، ماں سے، باپ سے سخت نفرت ہو گئی، سخت نفرت۔ آخر میں بھاگ گیا، بھاگ گیا۔

بوٹی سائیں:۔ پہلے بھی برا ہوا، اب بھی برا ہو رہا ہے۔

جبرو:۔ کچھ بھی ہو، کم از کم اپنا اختیار تو ہے، کسی کی دھونس تو نہیں۔

بوٹی سائیں:۔ یہ شیطانی کام ہے۔

جبرو:۔ شیطانی ہو یا انسانی۔ دنیا کا دھندا یونہی چلتا ہے۔ شیطان بھی معمولی ہستی تو نہیں۔ بڑے بڑے بزرگ آئے، ولی آئے۔ کیا ہوا؟ شیطان مرا تو نہیں، بدی کا کارخانہ بند تو نہیں ہوا۔ بوٹی سائیں!

چھوڑ ان باتوں کو!

بوٹی سائیں:۔ تو بھولتا ہے۔ یوں سکھ چین نہیں ملے گا۔

جبرو:۔ سکھ چین کسی کا اجارہ نہیں۔ نہ ملے تو نیکوں کو نہ ملے اور ملے تو بدوں کو ملے۔ دیکھ لے! اپنے علاقے میں میاں سلطان کو۔ بلیک کرتا ہے حرام کھاتا ہے۔ موج میلہ کرتا ہے۔ سکھ چین سے دن گزارتا ہے۔

بوٹی سائیں:۔ بروں کو دیکھ کر برا نہ بننا چاہیئے۔ تیرا پیشہ ناقص ہے۔ اس میں اطمینان نہیں مل سکتا۔

تاجاں:۔ اسے اطمینان کی ضرورت ہی کب ہے؟

جبرو:۔ مولا جانے، میں اطمینان کے لئے مرتا ہوں، بھلا تاجاں کے سوا کوئی اطمینان دے سکتا ہے؟

تاجاں:۔ بس رہنے دے! کہتا کچھ ہے کرتا کچھ ہے۔

جبرو:۔ قسم ہے خاکِ مدینہ کی! میں تاجاں کو ضرور خوش رکھوں گا۔ یہ صبر تو کرے۔

بوٹی سائیں:۔ تاجاں! جبرو کی بات مان لے!

تاجاں:۔ ہزار بار تو مانی ہے۔

جبرو:۔ ایک بار اور سہی۔

بوٹی سائیں:۔ تاجاں! مان لے! میری پریشانی بھی دور ہو۔ میں اس گھر سے تنگ آچکا ہوں۔ ایک دن ایسا نہیں جس دن تمہارا جھگڑا نمٹانا نہ پڑے۔ دن رات تمہارے خیال اور تمہارے فکر میں گزرتا ہے کہیں کوئی نیا گل نہ کھلا بیٹھو۔ تم سے ڈرتا ہی رہتا ہوں۔

تاجاں:۔ بوٹی سائیں! تو کہتا ہے تو مان لیتی ہوں۔

بوٹی سائیں:۔ شاباش، شاباش! جاؤ، گھل مل کر بیٹھو، پیار بڑھاؤ۔ گڑبڑ کی تو سمجھو میں الہ دین کے جن کی طرح آیا۔

جبرو:۔ سائیں بادشاہ! تیرا گھر ہے۔ جم جم آ!

بوٹی سائیں چلا جاتا ہے

پردہ گرتا ہے

دوسرا منظر

معمولی درجے کا مکان۔ جبرو کے مکان کے بعد علاقے میں مشہور ہے۔ مکان میں جیناں موجود ہے جو سوٹ کیس میں زیور اور قیمتی کپڑے سنبھال رہی ہے۔ شام کا وقت ہے۔

جیناں:۔ خالاں! بس وہیں کھڑکی کے پاس کھڑی رہنا!

خالہ:۔ گھبراتی کیوں ہے، لڑکی۔ اطمینان سے سامان سنبھال۔ میری نظر کھڑکی سے باہر لگی ہے۔ کوئی آیا نہیں اور میں نے سگنل ڈاؤن کیا نہیں۔

جیناں:۔ بس تھوڑی سی کسر رہ گئی ہے۔

خالہ:۔ رتی بھر فکر نہ کر! مزے سے کام کئے جا! اب کیا ہے! تھوڑی دیر بعد گھر میں آؤ بو لینے لگ جائیں گے۔ میں ڈھلتے رخ جاؤں گی اور تو چڑھتے رخ۔

جیناں:۔ ہاں، ہاں۔ شام ہو رہی ہے۔ تارے نکلتے ہی روانہ ہوں گے۔

خالہ:۔ بس پھر طیفہ بھی موج میلہ کرے گا۔

جیناں:۔ اپنی بلا سے۔

خالہ:۔ خالی گھر دیکھ کر اس کی تو خوب بن آئے گی۔

جیناں:۔ اسے چھٹی مل جائے گی۔

خالہ:۔ وہ تو چاہتا بھی یہی ہے۔

جیناں:۔ سمجھے گا بلی کے بھاگوں چھیکا ٹوٹا۔

خالہ:۔ تیری اسے ضرورت ہی کب ہے؟ تجھے آباد ہی کب کرنا چاہتا ہے

جیناں:۔ بے غیرت جو ہوا۔ گھر تو بھول کر بھی پھیرا نہیں مارتا۔

خالہ:۔ تو بھی تو آزاد ہی رہی ہے۔ تجھے اس نے کبھی کچھ کہا بھی تو نہیں۔

جیناں:۔ مجھے وہ کیا کہہ سکتا ہے؟ میں نہیں اس کا رعب مانتی۔ جائے مزے کرے۔ میں اس کے لئے جی جلانے سے رہی۔

خالہ:۔ تو گئی تو وہ پچھتائے گا تو نہیں۔

جیناں:۔ نہ پچھتائے، جوتی کی نوک سے۔

خالہ:۔ تیری جان تو عذاب سے چھوٹے گی۔

جیناں:۔ بس خالہ! مجھے تو اب جبرو پر پورا پورا بھروسہ ہو گیا ہے۔

خالہ:۔ طیفے سے تو ہزار درجہ اچھا ہے۔

جیناں:۔ ہزار درجہ کیا، لاکھ درجہ۔ مزاج کا اچھا ہے۔ ہوشیار ہے۔ اچھی کمائی والا ہے۔ عورت کا خیال رکھنے والا ہے۔

خالہ:۔ اور یہ طیفہ تو گھر آتا ہی نہیں۔ آتا ہے تو یہی پل دو پل کے لئے۔

جیناں:۔ آتا ہے تو کیا نہال کرتا ہے۔ وہ تو آدمی ہی اوڑھب کا ہے۔

خالہ:۔ خیر، اب بات کونسی لمبی رہ گئی ہے۔ تھوڑی دیر میں گھر کا صفایا ہو جائے گا اور تو جبرو کے پاس جا پہنچے گی۔

جیناں:۔ ایک بار اس کے پاس پہنچ جاؤں، پھر کوئی ڈر نہیں۔ پھر میں ہر خطرے سے محفوظ ہو جاؤں گی۔

خالہ:- تیری ساری تکلیفیں جاتی رہیں گی۔ طیفے کے ہاتھوں جو سختیاں جھیلی ہیں ان کے بدلے اب تجھے آرام ملے گا۔ تکلیف کے بعد راحت ہوتی ہے۔ جبرو تجھے عیش کروائے گا۔

جیناں:- وہ تو مجھ پر جان چھڑکتا ہے۔

خالہ:- جیناں! ایک بات ہے۔

جیناں:- کیا؟

خالہ:- طیفہ تجھے چاہے نہ چاہے، تیری پروا کرے نہ کرے لیکن تجھے جبرو کے پاس نہیں دیکھ سکتا۔ تو جبرو کے پاس گئی تو وہ گرم بہت ہوگا۔

جیناں:- گرم ہو یا سرد، میں تو اب گئی کہ گئی۔ طیفہ کرے گا بھی تو کیا کرے گا؟ جبرو کے آگے دال گلنے سے رہی۔

خالہ:- آج کل جبرو سے ٹھنی ہوئی ہے۔

جیناں:- کچھ بھی ہو، جبرو اس کی ایک نہ چلنے دے گا۔

خالہ:- ویسے طیفہ بھی زوروں پر آرہا ہے جبرو کے مقابلے میں اس نے پارٹی تو بنا لی ہے۔

جیناں:- مجھے تو طیفے سے نفرت ہوگئی ہے۔ جس آدمی کو اپنی عورت کا خیال نہ ہو وہ آدمی کس کام کا؟ ذرا اس کے بٹیر کی چونچ ٹیڑھی ہو جائے تو دیکھو کتنا غم کھاتا ہے، عورت مر بھی جائے تو خبر نہ لے گا۔ میں تو اب اس گھر میں نہ رہوں گی۔ کالے چور کے ساتھ رہنا منظور ہے اس کے ساتھ رہنا منظور نہیں۔

خالہ: اری، غضب ہوگیا! تاجاں آرہی ہے، ناک کی سیدھ، ٹھیک اسی طرف۔

جیناں:- اوئی اللہ، اس کو بھی اسی وقت آنا تھا۔ ذرا ٹھیر کے آجاتی تو اس کا کیا بگڑ جاتا۔

خالہ:- اس کے کانوں میں کہیں کسی نے بھنک نہ ڈال دی ہو۔ ہماری بات کا اسے پتہ نہ چل گیا ہو۔

جیناں:- ہونہہ۔

دروازے پر دستک۔ جیناں سامان سمیٹنے لگتی ہے

تاجاں:- لاڈو رانی! جیناں بی بی! ذرا دروازہ تو کھول!

خالہ:- ٹھیر، بہن! ٹھیر! ذرا دم لے!

تاجاں:- اندر خزانہ گاڑ رہی ہے جو دم لینے کو کہتی ہے؟

خالہ:- گھر میں سو باتیں ہوتی ہیں۔ کوئی بات بتانے کی ہوتی ہے کوئی نہیں ہوتی!

تاجاں:- ہاں، ہاں۔ تمہیں تو ایک گھر والی ہو۔ باقی تو سب سڑکوں پر پڑے رہتے ہیں۔ بس، بس، پھر کرلینا، دروازہ تو کھول!

خالہ:- بہن! تو تو بڑی بے قرار ہوتی ہے۔ لے، بکڑا دروازہ کھول دیا۔

(دروازہ کھلتا ہے۔ سامان سمٹ گیا ہے، کچھ بے ترتیب پڑا ہے۔ جیناں کے چہرے پر اضطراب اور پراگندگی کے آثار نمایاں ہیں)

جیناں:- (گھبرا کر) آ، آ بہن! آجا! لے یہ پیڑھی! بیٹھ جا!

خالہ:- ہاں، ہاں۔ تاجاں! بیٹھ جا!

تاجاں:- بیٹھتی ہے میری جوتی۔ میں پوچھتی ہوں، تم دونوں نے مل کر یہ کیا چکر چلایا ہے؟

جیناں:- (ڈر کر جیسے پائی گئی ہو) چکر کچھ نہیں، کچھ نہیں، کچھ نہیں۔ بس یونہی، ذرا گھر صاف کرنے لگی تھی کہ اوپر سے بہن تو آگئی۔

تاجاں:- خیر، گھر کی صفائی کی تو کوئی بات نہیں۔ میں کر دوں گی۔ پر چھوڑو، میں جھاڑو بہارو کی بات نہیں کرتی۔ میں اصلی بات پوچھتی ہوں۔ اس کی کہہ، اس کی!

جیناں:- بہن! تو تو آتے ہی گلے پڑ گئی ہے۔ مجھے کیا پتہ، اصلی بات کونسی ہے؟

تاجاں:- ہاں، ہاں! تجھے تو کچھ پتہ ہی نہیں۔ ڈائن کبھی دل کی بات بتاتی ہے؟

جیناں:- اے بہن! ذرا منہ سنبھال کے بات کر!

تاجاں:- (جھک کر) بس بس! رہنے دے! سنبھال لیا منہ! جو کچھ تو کر رہی ہے وہ کوئی بھلی عورت نہ کرتی ہوگی۔

جیناں: (جم کر، گھبراہٹ سے نجات پاکر) میں کیا کر رہی ہوں؟

تاجاں:- تو کیا کر رہی ہے؟ اپنا سر کر رہی ہے۔

خالہ:- اری لڑکی! ذرا سنبھل کے بات کر!

تاجاں:- چپ ری چھمیاں کی اماں! خبردار جو بیچ میں بولی! گھونسہ مار کر بتیسی باہر نکال دوں گی۔

جیناں:- اوہو! بڑے جلال میں آرہی ہے۔

تاجاں:- ہاں، ہاں۔ آرہی ہوں۔ تجھے قصائی کی بیٹی ہوتی۔ جبرو کی بیوی ہو!

جیناں:- (طنزاً) کس جبرو کی بات کرتی ہے؟

تاجاں:- ہاں، ہاں۔ جانتی ہوں۔ تجھے بھی جبرو پر گھمنڈ ہے۔

جیناں:- ہاں، ہاں ہے۔ تو کیا کر سکتی ہے؟

تاجاں:- میں کیا کر سکتی ہوں؟ میں تیرے ٹکڑے ٹکڑے کر سکتی ہوں، تیرے جبڑے

توڑ سکتی ہوں۔

جیناں :- اری چل! بڑھ بڑھ کے باتیں نہ بنا!

تاجاں :- یہ بات ہے تو آجا میدان میں!

جیناں :- آجا!

(تاجاں جھپٹ کر جیناں کے بال پکڑ لیتی ہے۔ دونوں گتھم گتھا ہو جاتی ہیں۔ تاجاں جیناں کو فرش پر پٹخ لیتی ہے۔ جیناں تاجاں کو ہٹا کر نیچے لڑھکا دیتی ہے۔ کبھی وہ نیچے، یہ اوپر اور کبھی یہ نیچے وہ اوپر۔ تاجاں کا پلّہ بھاری رہتا ہے۔ خالہ کھڑکی کے پاس جا کر چیخنے چلّانے لگتی ہے)

خالہ :- ارے کوئی آئے! ارے غضب ہو گیا۔ ارے کوئی بھاگ کر آئے۔ لوگو خون ہو جائے گا۔ ارے کوئی تکیئے سے جا کر طیفے کو بلا لائے۔ ارے تاجاں اور جیناں لڑ پڑی ہیں۔ (بوٹی سائیں کو دیکھ کر) بوٹی سائیں! او بوٹی سائیں! بھاگ کے آ! بھاگ آ! دیکھ کیا ہو رہا ہے۔ آجا، سائیں بادشا" جھٹ سے آجا! (کھڑکی سے ہٹ کر، تاجاں اور جیناں کو دیکھ کر) یہ تو بٹیروں کی طرح لڑ رہی ہیں۔ اوئی اللہ، جیناں کا تو سر بھی پھٹ گیا ہے۔ تاجاں! تجھے خدا سمجھے! تو نے آفت مچائی ہے۔ دیکھ لینا نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا!

(بوٹی سائیں آتا ہے)

بوٹی سائیں :- او بے شرمو، بے حیاؤ! یہ کیا پاکھنڈ مچا رکھا ہے؟ (دونوں کو پکڑ کر چھڑاتا ہے۔ دونوں ہانپ رہی ہیں۔ کپڑے جھاڑتی پونچھتی ہیں۔ بال جھٹکارتی ہیں۔ خالہ کپڑے سے جیناں کا زخمی سر پونچھتی ہے)

تاجاں :- (ہانپتے ہانپتے) بوٹی سائیں! تو بیچ میں پڑا ہے تو اس مردار کو سمجھا! یہ میرے رستے سے ہٹ جائے۔

جیناں :- مردار ہو گی تو۔ مردار ہو گی تیری ماں!

بوٹی سائیں :- کم بختو! چپ کرو نہیں تو دونوں کی کھلڑی ادھیڑ دوں گا۔

جیناں :- یہ مجھے آنکھیں کیوں دکھاتی ہے؟ اسے کہہ، اپنے خصم کو قابو میں رکھے۔ گوری چٹی چمڑی والی ہے۔ چنچل ہے۔ ناز نخرے دکھا سکتی ہے۔ قصائی باپ نے خوب نلیاں کھلائی ہوں گی۔ جبرو کو اس سے اچھی عورت کہاں ملے گی؟

بوٹی سائیں :- جیناں دم لے! زبان کو لگام دے!

تاجاں :- بوٹی سائیں! اسے کہہ، آپے میں رہے۔ میرے خصم پر ڈورے نہ ڈالے۔ اپنا مرد تو قبضے میں نہیں، دوسروں کے مردوں کو پھانستی پھرتی ہے۔

بوٹی سائیں :- او خدایا! ذرا تھم جاؤ! بات مت بڑھاؤ! تم لوگوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ یاد رکھو! یہ جو آوے کا آوا بگڑا ہے اور راہِ راست پر آنے کا نام نہیں لیتا ایک دن غارت ہو کر رہے گا۔ جھ مہینے سے صرف تمہارے گورکھ دھندے میں پڑا ہوں۔

تاجاں :- اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟

بوٹی سائیں :- قصور کسی کا بھی ہو، یہ سمجھ لو! تباہی سب پر آئے گی، میرا تو تم نے کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا حرام کر رکھا ہے۔ ہر دم تمہاری الجھن سلجھن میں پڑا رہتا ہوں۔ کوئی رستہ نہیں سوجھتا۔

جیناں :- آپ ہی سوجھ جائے گا۔

تاجاں :- اسے سوجھ گیا ہو گا نا۔

بوٹی سائیں :- طعنہ تشنہ چھوڑ دو! لڑائی جھگڑائی بند کرو!

جیناں :- اپنی طرف سے تو بند ہے۔ سائیں بادشاہ! تاجاں کو سمجھا!

تاجاں :- سمجھانے کی ضرورت نہیں۔ میرا رستہ صاف ہے تو میں کسی کے گلے نہیں پڑتی۔

جیناں :- بہن! خدا نے چاہا تو آج سے تیرا راستہ صاف ہی صاف ہے۔

بوٹی سائیں :- شاباش! یوں صلح صفائی سے کام لیا تو ساری بپتا کٹ جائیگی۔ تم دونوں بڑی اچھی ہو۔ آپس میں پیار بڑھاؤ! میں تمہارے مردوں کو سمجھاؤں گا۔ خدا کی ذات سے امید ہے کہ وہ سمجھ جائیں گے۔ سمجھاتے رہو، سمجھاتے رہو تو انسان آخر سمجھ ہی جاتا ہے۔

جیناں :- نہ نہ نہ نہ، بوٹی سائیں! یہ مردوں کو سمجھانے والا کام نہ کرنا!

بوٹی سائیں :- کیوں؟

جیناں :- ہمارے مرد بڑے اکھڑ ہیں۔ تجھے تو سب کچھ معلوم ہی ہے، تجھ سے کون بات چھپی ہے۔ ادھر جانے کو کہو تو ادھر جاتے ہیں۔ اپنی عقل کے مالک ہیں بس تو اطمینان رکھ! میری طرف سے جھگڑے والی کوئی بات نہ ہو گی۔

بوٹی سائیں :- خیر! تم دونوں پر بات چھوڑتا ہوں۔ عقل سے کام لو! میرا تو یہ مطلب ہے کہ کسی طرح یہ گڑا جھگڑا ختم ہو۔ تمہاری ناسمجھیاں کہیں برا دن نہ دکھائیں۔ اپنے اپنے مردوں کو سمجھاؤ، شاباش! میں جانوں اللہ میرا کام۔ آئندہ سے دنگا فساد نہ ہو!

جیناں:- نہیں ہوگا۔

بوٹی سائیں:- بڑی اچھی بات ہے، بڑی اچھی بات ہے۔ صلح صفائی سے رہنا چاہیئے! اچھا بی بی تاجاں! تو بھی اپنے گھر جا اور اپنے مالک پر نظر رکھ!

تاجاں:- بوٹی سائیں! تو کہتا ہے تو چلی جاتی ہوں لیکن یاد رکھ، تو ذمہ دار ہے! جیناں نے پھر جبرو سے واسطہ رکھا، ذرا بھی گڑبڑ کی تو میں تیری ایک نہ سنوں گی۔ آپ ہی اس سے نمٹ لوں گی اور خدا کی قسم! میں جھوٹ نہیں بولتی، مجھے قصائی کی نہیں کسی چمار کی لڑکی کہنا اگر میں نے اس کا پیٹ نہ پھاڑ ڈالا! ہاں۔

بوٹی سائیں:- بی بی تاجاں! بس اب جانے دے! اب جلتے جاتے گرمی سردی اچھی نہیں۔ چل، آ چلیں!

تاجاں:- (جاتے جاتے) میں جا تو رہی ہوں، لیکن کہے جاتی ہوں، پھر مجھے گھر سے نکلنا نہ پڑے۔ ہاں، میں لحاظ کرنے والی نہیں۔

(بوٹی سائیں تاجاں کو کھینچ لے جاتا ہے)

(پردہ)

تیسرا منظر

ایک مزار، مزار سے متصل (؟) یہ جہاں ایک طرف بھنگ اور تمباکو کا ڈھیر پڑا ہے۔ حقہ اور کونڈی ڈنڈا پاس دھرے ہیں۔ ایک طرف پرانا گھڑا، مٹی کا پیالہ اور لوٹا رکھے ہیں۔ ایک طرف (اونچے چبوترے پر) تاش، چوپٹ اور شطرنج کا سامان بکھرا پڑا ہے۔ جبرو اکیلا بیٹھا تاش کے پتے پھینک رہا اور گنگنا رہا ہے۔ گلو بغل میں کچھ دبائے آتا ہے۔

(رات کا وقت ہے)

گلو:- یہ لے استاد! تیری قسم! سیل بند ہے، ہاں۔ ایک دم ولیتی۔

جبرو:- لا دکھا!

گلو:- (پکڑاتے ہوئے) لے دیکھ!

جبرو:- واہ، بھئی واہ!

گلو:- کیوں استاد کیسی ہے؟

جبرو:- ارے میرے یار! یہ سچ مچ ولیتی ہے۔ نمبر ایک ہے۔

گلو:- ارے استاد یہ تو نمبر دس سے بھی اوپر ہے۔

جبرو:- (دیکھتے ہوئے) کہاں سے تیر کر لایا ہے؟

گلو:- کچھ نہ پوچھ استاد! اس کے لئے بڑا خراب ہونا پڑا۔ پہلے تو طیفے سے پوچھا۔ اس نے کہا، نہیں۔ جیجے کے اڈے پر گیا۔ وہ بھی جواب دے گیا۔ اب تو میں سوچ میں پڑ گیا۔ سوچ رہا تھا، سوچ رہا تھا، دور موڑ پر طیفہ اور بوٹی سائیں باتیں کرتے نظر آئے۔

جبرو:- (پینے میں مصروف رہتے ہوئے) اس بوٹی سائیں کو چین نہیں۔ کچھ نہ کچھ خرابی کر کے رہے گا۔

گلو:- کرنے دے استاد خرابی! ہمارا کیا کرے گا۔ بات تو سن میری!

جبرو:- سنا!

گلو:- تھوڑی دیر ہوئی تو بوٹی سائیں چلا گیا اور طیفہ پتہ نہیں مجھے دیکھ کر یا اپنے آپ جیجے کے اڈے پر آ گیا۔

جبرو:- ہونہہ۔

گلو:- آتے ہی بولا "یار گلو کس فکر میں ہے؟" میں نے کہا "شراب کی فکر میں" کہنے لگا "آ تجھے شراب دوں!"

جبرو:- اس کا یہ مطلب ہے، طیفے کی عقل ٹھکانے آ گئی ہے اور اب وہ خوشامد کرنے لگا ہے۔

گلو:- استاد! تو ڈٹا رہ! دیکھ تو سہی کس طرح سیدھا ہوتا ہے طیفہ! وہ جھکا اور تو نے میدان مارا۔ استاد! خوشی خوشی اپنے ساتھ لے گیا اور ولیتی شراب کی بوتل میرے حوالے کی۔

جبرو:- ولیتی شراب تو کیا! میں اس کے گھر کی دیسی شراب کی بوتل بھی لے اڑوں گا۔

گلو:- استاد! وہ تو بالکل موم ہو گیا ہے۔ کہنے لگا "گلو! اکیلا ساری بوتل نہ چڑھا جانا۔ استاد جبرو کو بھی پلانا۔"

جبرو:- ارے گلو! میرے پیر مرشد کو منظور ہوا تو یہ قدموں میں آ گرے گا۔

گلو:- بڑا ڈکٹیٹر بنتا تھا۔

جبرو:- بس جو کچھ بننا تھا بن لیا۔ اب اور کیا بنے گا۔ بوٹی سائیں نے سمجھایا ہوگا کہ مجھ سے ٹکر نہ لے۔ ارے گلو! سمندر میں رہنا اور مگر سے بیر، یہ بھی کوئی عقل کی بات ہے۔ میں اول درجے کا بدمعاش، علاقے کا بادشاہ۔ مجھ سے کون ٹکرا سکتا ہے۔ جو ٹکرائے میں اسے چکنا چور نہ کر دوں۔

گلو:- استاد کچھ بھی ہو۔ طیفے نے تھوڑے دن تو خوب آسمان سر پر اٹھایا۔ تیرے خلاف بڑا زہر اگلا۔ تو اسے معاف نہ کرنا۔ بدلا لے کر چھوڑنا! تجھ سے کتنا فرنٹ ہوا تھا؟

جبرو:- تو فکر نہ کر! میں بڑی پال سی ماروں گا۔ طریقے سے تو وہ کروں گا وہ کروں گا کہ یاد رکھے گا، بس ایک بوٹی سائیں کا خیال آتا ہے۔

گلو:- بوٹی سائیں کیا کر سکتا ہے؟

جبرو:- کر تو کچھ نہیں سکتا۔ بھلا آدمی ہے۔ پولیس میں رسوخ رکھتا ہے، موقعہ بے موقعہ آڑے آتا ہے۔

گلو:- استاد! پولیس تیرا کیا بگاڑ سکتی ہے؟

جبرو:- پولس کو میں کیا سمجھتا ہوں؟ تجھے کیا خبر پولس سے میرا کیا رسوخ ہے؟ سب سے بنا کے رکھی ہے۔

گلو:- مجھے سب پتہ ہے۔

جبرو:- بس پھر، بوٹی سائیں کے بغیر بھی میرا کام چل سکتا ہے۔

گلو:- استاد! تیرے برابر رسوخ والا کون ہوگا؟ بوٹی سائیں تو یونہی معتبر بنا پھرتا ہے۔

جبرو:- (نشے کی حالت میں) کہتا ہے، لفنگا پن چھوڑ دے۔ ہو نہ ہو اس کا مطلب ہے، افیم کھاؤں، ہاتھ پاؤں توڑ دوں، بھوکا مروں۔ وہ کیا جانے میرے دل کا روگ؟ میرے دل میں تو آگ لگ رہی ہے۔ بوٹی سائیں اور تیل پر تیل چھڑکتا ہے۔ خدا کی قسم میں جلا تو دنیا کو بھی جلا کر چھوڑوں گا۔ میں شرابی کبابی سہی۔ عورتوں کا بیوپاری سہی لیکن مجھ میں سو عیبوں کے ساتھ ایک آدھ بھلائی بھی ہوگی۔

گلو:- استاد! سب آدمی کیسے نیک بن سکتے ہیں؟ بد نہ ہوں تو نیکوں کو کون پوچھے؟ نیک تو سیر کے سیر بھی نہ بکیں۔

جبرو:- گلو! مجھے جو کچھ بننا تھا بن گیا۔ اب میں کیا بدلوں گا؟ کتنی کتنی آفتیں جھیلی ہیں؟ کس مشکل سے اپنے کام میں طاق ہوا ہوں؟ اب اس کام کو چھوڑ کر دوسرا کام کیسے سیکھوں؟

گلو:- استاد! دوسرے کام میں کیا پڑا ہے؟ اس کام میں تو تو کتنوں کا بھلا کرتا ہے۔ کوئی ادھر سے آتا ہے۔ کوئی ادھر سے آتا ہے۔ کوئی لیتا ہے، کوئی دیتا ہے۔ لوگ آتے، جاتے ہیں۔ کھاتے ہیں، پیتے ہیں۔ استاد! تو سخی ہے۔ تیرا دربار سب کے لئے کھلا رہتا ہے۔ استاد! چراغ لے کر ڈھونڈیں تب بھی تیری نظیر نہ ملے۔

جبرو:- مولا جانے کتنے کتنے لوگوں کے کام سنوارتا ہوں۔

گلو:- ہاں، ہاں۔ مجھے پتہ نہیں کیا؟

(جبرو ایک طرف بغور دیکھنے لگتا ہے)

: کیا ہے استاد!

جبرو:- کوئی آرہا ہے؛

گلو:- ہاں، استاد! کوئی آرہا ہے لیکن یہ تو صابر علی ہے۔

جبرو:- فکر نہ کر! آنے دے! اس سے تو سودا کیا ہے۔ آج اس کا بھی کام بنا ہی دیں گے۔

گلو:- ہاں استاد! بنا دینا!

جبرو:- آ میرے یار صابر علی؟

صابر ع:- ارے واہ! استاد! خوب چڑھائی ہے۔

گلو:- استاد نے پوری بوتل پی ہے۔

صابر علی:- ارے یہ تو ولایتی ہے۔

گلو:- استاد گھٹیا شراب تو نہیں پیتا۔

صابر علی:- کیا کہنے استاد کے!

جبرو:- اپنی تو چلتی ہے۔ صابر علی! جیسے تو اپنے علاقے کا بادشاہ ہے۔ اسی طرح میں بھی اپنے علاقے کا بادشاہ ہوں۔ جو چاہوں کروں۔ مجھے کون ٹوک سکتا ہے؟

صابر علی:- کوئی نہیں۔

جبرو:- اشارہ کروں تو اے ڈل جی کی پوری دکان میرے آگے پڑ جائے!

گلو:- مولا جانے! استاد بڑا رسوخ والا ہے۔

جبرو:- بھولے بادشاہ! چھوٹے بڑے سب کا تابع ہوں۔ میرا کام پتھر کو موم کرتا ہے۔ آئی سردی کو ناراض نہیں کرتا۔

صابر علی:- استاد! تو بڑا سیاست دان ہے۔

گلو:- استاد! بڑا نامی گرامی ہے۔ دور دور تک اس کا ڈنکا بجتا ہے۔

صابر علی:- مجھے سب خبر ہے۔ نام سن کر تو میں آیا ہوں۔

جبرو:- داتا کا حکم ہوا تو تیرا کام ایسا سنواروں گا کہ عمر بھر یاد کرے گا، یار صابر علی!

صابر علی:- استاد! تجھ پر اعتبار ہے۔ دیکھ لے! مال دیکھے بغیر سودا کیا ہے۔

جبرو:- کہہ کیا ہوا؟ اللہ جانے ایسی چھوکری ہے کہ جواب نہیں۔

صابر علی:- کنواری ہے؟

گلو:- کنواری ہے۔

جبرو:- تو سب باتیں چھوڑ! بس نری حور ہے۔

گلو:- موتی چور ہے۔

جبرو:- پری ہے پری۔

گلو:- پھلجھڑی ہے۔

جبرو:- ہنس مکھ ہے۔ رسیلی ہے۔ تا بہال نہ ہوتی تو میں اسے گھر میں ڈال لیتا۔ یہ تو دینی ضد کا معاملہ ہے۔ ایک آدمی سے بدلہ لینا ہے۔ اسی بہانے تیرا تو سب بھلا ہو جائے گا۔

صابر علی:- استاد! تجھ پر ڈھیل چھوڑی ہے۔

جبرو:- سودا ٹھیک ہوگا، مال کھرا ہوگا۔ کھوٹا ہو تو پٹخ کر منہ پر مارنا۔ ہزار میں تو بالکل سستی ہے۔

گلو:- کاجر مولی کے بھاؤ پڑے گی۔

صابر علی:- پانسو تو دے چکا ہوں۔

جبرو:- وہ تو اسی دن اٹھ گئے۔ کچھ تاجاں کی چیزوں میں لگے، کچھ اپنے کام آئے۔ میرے یار، باقی رقم تھما!

صابر علی:- رقم شوق سے لے! رقم کا گھاٹا نہیں لیکن دیکھنا، مال ٹھیک ہو۔

جبرو:- شرطیہ ٹھیک ہوگا۔ پیارے! میری زبان پہ اعتبار کر! سودا کھوٹا ہوا تو پائی پائی کا دیندار ہوں۔

(صابر علی نوٹ نکال کر جبرو کو دیتا ہے)

بس پیارے! وہ جو بڑی گراونڈ ہے۔ نالے والی سیڈ میں۔ وہیں ٹھیرنا۔ سینما ٹوٹا کہ میں اسے لے کر پہنچا۔ راتوں رات تیرے گھر پہنچا دوں گا۔

صابر علی:- استاد! تو بڑا سیانا ہے۔

جبرو:- بڑا ایکسپرٹ ہوں پیارے۔ ساری عمر یہی دھندا کیا ہے۔

صابر علی:- اچھا پھر اللہ بیلی

جبرو:- اللہ بیلی

(صابر علی چلا جاتا ہے)

جبرو:- گلو یار! اسامی تگڑی ہے۔ اپنے علاقے میں اس کا بڑا سکہ چلتا ہے۔

گلو:- استاد! یہ تو سونے کی کان ہے۔ جیناں تو نگینہ ہے، نگینہ۔ ایک ہزار میں تو بالکل سستی ہے۔

جبرو:- خیر، میں کب جیناں کو اس کے پاس ٹکنے دوں گا۔ اٹھوارے کے بعد ہی واپس بھگا لاؤں گا۔

گلو:- وہ پھر بھاگا بھاگا آئے گا۔

جبرو:- گلو! میں پھر اس کی حجامت کروں گا۔ تو تماشہ تو دیکھ! مرغی پھنسی ہے۔ یونہی تو نہیں چھوڑتا اسے۔

گلو:- کیا کہنے استاد تیرے!

جبرو:- چل! جیناں کو لے آئیں!

گلو:- چلتے ہیں استاد! ذرا شو تو ٹوٹنے دے!

جبرو:- شو کے بچے! دیکھ! اب کون ادھر آرہا ہے؟ نہیں جیناں تو نہیں؟

گلو:- شاید جیناں ہو، ذرا نزدیک آلینے دے!

(دونوں بغور دیکھتے ہیں)

گلو:- استاد! عورت نہیں، مرد ہے۔ ارے یہ تو طیفہ ہے۔

جبرو:- طیفہ ہے؟ آیار طیفے! سنا! پھر کیا حال ہے؟

طیفہ:- حال تو میں سنا دوں گا، پر استاد یہ تو بتا! تجھے شرم نہ آئی؟ جب تک مال تھماتا رہا تو میرا لحاظ کرتا رہا۔ اب مال تھمانا بند کیا تو تو نے میری عزت سے کھیلنا شروع کر دیا۔

جبرو:- طیفے! میں جبرو ہوں۔ گردن تان کر اور چلا چلا کر بات نہ کر!

طیفہ:- تو جبرو ہوگا تو اپنے گھر ہوگا۔ میں نے یہ پچاس روپے کی وسکی یونہی تو نہیں پلائی۔ اب میں گردن تان کر اور چلا چلا کر بات کر سکتا ہوں۔

جبرو:- چل بکری!

طیفہ:- چل بھیڑ! زیادہ اکڑے گا تو رگیں مسل کر رکھ دوں گا۔

جبرو:- یہ گیدڑ بھبکیاں کسی اور کو دینا!

طیفہ:- یہ گیدڑ بھبکیاں نہیں۔ طیفے کی للکار ہے۔ طیفہ جو کہتا ہے پورا کر دکھاتا ہے۔

جبرو:- آپے سے باہر کیوں ہوتا ہے؟

گلو:- گرم ہونے کی کیا ضرورت ہے؟

طیفہ:- گلو بیچ میں بولا تو ٹانگیں چیر دوں گا۔

جبرو:- گلو کو کیا آنکھیں دکھاتا ہے؟ مجھ سے بات کر!

طیفہ:- تجھی سے بات کروں گا۔ تجھ میں تو نام کو شرافت نہیں۔ میری بیوی کو ورغلاتے ہوئے شرم نہ آئی؟ آنکھوں کا پانی اتنا ہی مر گیا ہے؟ نہ اپنی عزت کا پاس نہ دوسرے کی عزت کا۔ اتنی بے حیائی، اتنی بے غیرتی، ایسی اندھیر گردی!

جبرو:- میں علاقے میں جو چاہوں کروں۔

طیفہ:- علاقے میں میں بھی کچھ ہوں۔

جبرو:۔ علاقے میں بہتیری بھیڑ بکریاں ہیں۔

لطیفہ:۔ جبرو! بھول میں نہ رہنا! میں لطیفہ ہوں، لطیفہ!

جبرو:۔ جانتا ہوں تجھے۔ تیری اوقات سے بے خبر نہیں۔ غیرت والا ہوتا تو عورت کو بس میں رکھتا۔

لطیفہ:۔ یہ میرا گھر کا معاملہ ہے کسی کو اس سے کیا؟

جبرو:۔ یہی ہے تو عورت کو باندھ کے رکھ!

لطیفہ:۔ باندھ لیا ہے۔ ایک دن ایسا کرنا ہی تھا۔ کب تک قصے کہانیاں سنتا؟

جبرو:۔ قصے کہانیاں بند تو نہ ہوں گی۔

لطیفہ:۔ کیسے بند نہ ہوں گی؟ آج کے بعد کسی نے قصے کہانیاں سنائیں تو اس کا پیٹ چاک کر دوں گا۔

جبرو:۔ جا، باتیں نہ بنا! تیری عورت پر ہمارا قبضہ رہے گا۔

لطیفہ: (غیر معمولی طور پر چلاتے ہوئے) جبرو! منہ سنبھال!

جبرو:۔ چل گھن چکر!

لطیفہ:۔ جبرو! گھمنڈ ٹھیک نہیں، تیری بھی بیوی ہے۔

جبرو:۔ خبردار جو میری بیوی کا نام لیا!

لطیفہ:۔ جو میری بیوی کی طرف بڑھے گا میں اس کی بیوی کی طرف بڑھوں گا۔

جبرو:۔ چل بکواس بند کر! جو میری بیوی کی طرف بڑھے گا میں اسے چکنا چور کر دوں گا۔

(نشے کی وجہ سے جبرو میں استقامت نہیں رہتی)

لطیفہ:۔ بس بس رہنے دے! بڑے دیکھے ہیں چکنا چور کرنے والے!

جبرو:۔ لے میں تیری بیوی کو نکال لاتا ہوں، کر کیا کرتا ہے!

لطیفہ:۔ میں اپنے باپ کا نہیں جو تاجاں کو واپس نہ لاؤں۔

جبرو:۔ ٹھہر، تیرے کمین کی ——————!

(جوش میں آتا اور چاقو نکال کر بڑھتا ہے۔ لطیفہ سنبھلتا ہے۔ دونوں مقابل آتے ہیں کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ گلو مدد کے لئے بڑھتا ہے لیکن لطیفہ اسے اٹھا کر جبرو کے اوپر پٹخ دیتا ہے۔ جبرو بچتا اور گلو کو ایک طرف ہٹا دیتا ہے۔ لطیفے پر جھپٹتا ہے۔ چاقو کا گہرا وار کرتا ہے۔ بیک وقت لطیفہ جبرو کی کلائی پکڑ لیتا ہے۔ گلو بھاگ جاتا ہے۔ دور سے گلو کے چلانے کی آواز "ارے کوئی آؤ! تاجی، ساجی، بوٹی سائیں! کوئی ہے؟ ارے جبرو آؤ! خون ہو چلا، خون ہو چلا")

(لطیفہ چاقو چھین لیتا اور جبرو کے بھونک دیتا ہے۔ جبرو "ہائے" کہہ کر گر پڑتا ہے۔ دونوں مہلک طور پر زخمی ہوئے ہیں)

لطیفہ:۔ کمین میں کہ تو؟

جبرو:۔ بدذات! تو نے نہیں شراب نے مارا ہے۔ میں تیری بوٹی بوٹی کر دیتا۔ ہائے! میرے اللہ!

لطیفہ:۔ (دیوار سے سہارا لے کر، چاقو پھینک کر اور زخمی پسلیوں پر ہاتھ رکھ کر) تو کیا بوٹی بوٹی کر سکتا ہے۔ جا تجھ سے بدلہ لے لیا۔ ایک دن تجھ سے ٹکر لینی ہی تھی۔

(لطیفہ دیوار کا سہارا چھوڑ کر چلتا ہے۔ گھاؤ گہرا ہے۔ گر پڑتا ہے سنبھل کر اٹھتا اور باہر نکل جاتا ہے۔ سازوں پر بھیانک الم انگیز تاثر۔ بوٹی سائیں، گلو، تاجاں اور جیناں آتے ہیں۔ سازوں کی آواز مدھم ہو جاتی ہے۔ تاجاں اور جیناں رو رہی ہیں۔)

جبرو:۔ آ گئے؟

تاجاں:۔ یہ کیا ہوا جبرو؟

جبرو:۔ دنیا دھوکے کی ہے۔ دنیا میں کچھ نہیں، ہائے، ہائے یہاں کچھ نہیں ہائے، میرے اللہ! بوٹی سائیں کی بات ٹھکرا کر اچھا نہیں کیا۔

بوٹی سائیں:۔ جبرو پہلوان! بڑی جلد بازی کی تو نے!

جبرو:۔ کوئی بات نہیں۔ مرنے جینے پہ کسے اختیار ہے؟ ہونی ہو کر رہتی ہے۔

بوٹی سائیں:۔ امر ربی میں کسی کو دخل تو نہیں پھر بھی نادانی بری چیز ہے۔

جبرو:۔ قدرت جو کچھ کرتی ہے ٹھیک کرتی ہے۔ میرے اعمالنامے میں ایک نیا دھبہ لگتے لگتے رہ گیا۔

تاجاں:۔ کونسا دھبہ جبرو!

جبرو:۔ (منہ چھپا کر) جیناں! مجھے معاف کرنا! میں نے تجھے محبت کا فریب دیا۔ آج میں تجھے بیچنے والا تھا اور یہ نوٹ، یہ نوٹ واپس کر دینا! گلو! اسے لوٹا دینا! کہنا، کہنا پانسو مجھے بخش دے!

جیناں:۔ اوئی اللہ، لطیفے! لطیفے! تو کہاں گیا۔

(دیوانہ وار باہر بھاگ جاتی ہے)

تاجاں:۔ جبرو! گھبرا نہیں! ہم تجھے ہسپتال لے چلتے ہیں۔ زخم ٹھیک ہو جائے گا؟

جبرو:۔ مجھے کہیں نہ لے جاؤ! کہیں نہ لے جاؤ! میں جا رہا ہوں سب چھوڑ کر! میرا مولا مجھے بلا رہا ہے۔

(دم توڑ دیتا ہے۔ خوفناک چیخیں۔ پردہ گرتا ہے)

نذرِ لطیفؒ

کب دن طلوع ہوگا؟

عبدالعزیز خالد

”سُر سسی“ ”سُر سوہنی“ ”سُر ماروی“ ”سُر مومل رانو“ اور ”سُر لیلاں چنیسر“۔ ان نظموں میں شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے سسّی، سوہنی، ماروی، مومل اور لیلاں کی زبانی ان کے احساسات کی ترجمانی کی ہے۔ اس طرح کہ ان کی زندگی کی سب سے بڑی افتاد پر ان کی سوچ بجائے خود کلامیوں کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن داستان یا واقعات کہیں بھی پیش نہیں کئے جاتے۔ یہی طریقہ مندرجہ ذیل اردو نظم میں بھی اختیار کیا گیا ہے جس میں سسّی اور اس کی روداد کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ اسی لئے نظم کو شاہ عبداللطیفؒ سے منسوب کیا گیا ہے۔ (مدیر)

دستِ صبا نے کھولا منشورِ صبح گاہی
حل ہوگئے شفق میں ناسفتگانِ گردوں
کیفیتِ صبوحی مینائے زر میں ڈھل کر
خوننابۂ جگر سے چھلکے ایاغِ مستاں
کھولی دکانِ جلوہ، خوباں نے غرفہ غرفہ
اے نکہتِ گریزاں، اے مونسِ غریباں
میرا پیام کیا ہے آشوبِ دردِ ہجراں
شعلوں پہ لوٹتی ہوں اس دردِ جاں گسل سے
تکتی ہے رہ کسی کی یہ کشتۂ جدائی
تم ہی مجھے غزالانِ جاناں کا کچھ پتہ دو
پھرتے ہو جرگہ جرگہ، ڈھونڈو اسے تو جانیں
فرقت کا حال کہنا یوں پائے بوس ہوکر
کرتا ہے ایک سائل دریوزۂ نوازش
وہ عشرتِ شبانہ افسانہ ہوگئی ہے
کٹتی نہیں شبِ غم اختر شماریوں سے
دل سے حکایتیں ہیں، شکوے شکایتیں ہیں
مشاطۂ بہاراں جاروب کش تھی جن کی
وہ کاکلِ رسا جو دوش و کمر تک آئے
ہر پیچ میں ہیں دستہ، ریحان و روح و سنبل
مارِ سیاہ بن کر شانوں کو ڈس رہے ہیں

آشفتگانِ شب کو تبسمِ سحر پکارا
مجمر میں جل بجھے ہیں اسپند دانہ دانہ
دیتی ہے بام و در کو اذنِ طلوعِ نشہ
دیکھو اے شرارِ جستہ، سلگی قبا سے لالہ
پھر کوچہ گردِ غم ہیں خانہ بدوشِ صحرا
پیارے کے کاخ و کو تک میرا پیام لے جا
میرا پیام کیا ہے اندوہ و آہ و نالہ
آرامِ جاں کہاں ہے اے جانِ ناشکیبا!
اے رنجِ نارسائی! اے حسرتِ نظارہ!
کس حال میں یہاں سے ناقہ سوار گزرا
وہ ترکمانِ وحشی ہے آشنا تمہارا
سرتاجِ کجکلاہاں اے شاہدِ دلآرا!
”روزے تفقدے کن مسکینِ بے نوا را!“
اب یہ دلِ حزیں ہے اور نوحۂ تمنا
آنکھوں سے دجلہ دجلہ بہتا ہے خوں کا دھارا
وہ درد جو نہاں تھا ہوتا ہے آشکارا
وہ نامرادِ جلوے رسوا ہیں دشت و صحرا
احوالِ برشگالاں جن کے شکن سے پیدا
ہر خم میں توشہ توشہ، نفحاتِ مشکِ سارا
اے شامِ بدگمانی! کب دن طلوع ہوگا

سناٹا

جمیل نقوی

اُداس رات، ہوا مضمحل، ستارے ماند
حریمِ شب میں سرِ شام سو گیا ہے چاند
اُفق سے تا بہ اُفق حیرتیں پرافشاں ہیں
فضا میں ہیبتِ شب گھولتی ہی خاموشی
"کدھر سے آئی نگارِ صبا کدھر کو گئی"
کہاں سے آتی ہے پیہم صدائے سرگوشی
یہ اونگھتے ہوئے لمحے، یہ سوچتا ہوا وقت
نگلتی جاتی ہے ماحول کو گراں گوشی

درونِ پردۂ شب، بیبیانِ نجدِ فلک
بصد ادا و تکلف، غرور و عشوہ و ناز
اُداس بیٹھی ہیں کچھ سوچتی ہیں شرما کر
نفس نفس میں خود آسودگی کے سو انداز
یہ سوچتی ہیں کوئی قیس، کوئی دیوانہ
غبارِ کاہکشاں، گردِ راہِ انجم سے
جلو میں اپنے لئے ناقہ ہائے محمل بار
کسی طرف سے، کسی سمت سے نکل آئے
بہت خفیف سی آہٹ پہ چونک اٹھتی ہیں
کسی نے جیسے پکارا، کسی نے دی آواز

رچا ہوا ہے فضا میں خمارِ نیم شبی
بلند و پست پہ چھایا ہے تلخ سناٹا
فسونِ ظلمتِ شب وقت کے تعاقب میں
کہ جس طرح پسِ کنجشک گربۂ مسکیں
قدم قدم پہ خموشی سے ساز باز کئے
سمجھ رہی ہے کہ دو گام اور بس دو گام
وہ سامنے ہی تو ہے حرص و آز کی منزل

فسونِ ظلمتِ شب یہ مہیب تاریکی
بجز فریبِ خیال و نگاہ کچھ بھی نہیں

●

مصوّرِ فطرت

ابوالخیر کشفی

اردو نثر نے ہمارے زمانہ میں ہمہ جہتی ترقی کی — نئے اسالیبِ بیان اختراع کئے گئے — نئے موضوعات اور نئے تجربے سامنے آئے۔ لیکن آج کے اردو ادیبوں کی تحریروں کو پڑھتے ہوئے مجھے عموماً یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کی زبان کتابی ہے، اس زبان میں زندگی اور روایات کا رس نہیں — محاورہ اور روزمرہ ادبی زبان کے لئے غیر ضروری یا خارجی عناصر نہیں بلکہ معاشرے کے صدیوں کے تجربات کا خزانہ اور زبان کے وقار اور اس کی اندرونی زندگی کا ثبوت ہوتے ہیں —

خواجہ حسن نظامی کی تحریروں نے ہماری زبان کی نئی نئی صلاحیتوں کو اجاگر کیا۔ ان کی تحریر بیرونی اثرات سے بے نیاز، خالص اندرونی پیداوار اور زبان کی قدرت ارتقا کا ثبوت تھی۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے طرز کے تنہا نمائندہ تھے۔ اسی لئے خواجہ حسن نظامی کی موت ایک اسلوبِ بیان کی موت ہے۔ حسن نظامی کی نثر ایک تہذیب اور تمدن کی آواز تھی، اگر آپ ان کی نثر آہستہ آہستہ بھی پڑھیں تو ایک آواز سی سنائی دے گی۔ متین اور دھیمی آواز اور اس آواز کے ساتھ ساتھ دو چمکتی ہوئی آنکھوں کا وجود پڑھنے والے کے لئے حقیقت بن جائے گا۔ حسن نظامی اس آواز اور دو چمکتی ہوئی آنکھوں کا نام ہے۔

میرے ایک بزرگ جو ادب کے بڑے مبصر اور زندگی کے سیاح ہیں کہتے تھے کہ اگر مجھ کو کسی تنہا جزیرہ میں قید کی سزا دی جائے تو میں اپنے ساتھ صرف سعدی کی گلستاں لے جاؤں گا اور اپنی قیدِ تنہائی کو انسانی زندگی کی وسعتوں میں بدل دوں گا۔ میرا گزارہ شاید کسی ایک کتاب سے نہ ہو سکے، لیکن مجھ سے اردو کے کسی ایک ادیب کے انتخاب کے لئے کہا جائے تو میں خواجہ حسن نظامی کا نام لوں گا۔ سعدی اور خواجہ حسن نظامی کے درمیان مجھے بہت سی مشترک باتیں ملتی ہیں۔ زندگی کے کاروبار اور نشیب و فراز پر دونوں کی نظر ہمہ گیر تھی۔ دونوں نے اخلاق اور ادب کو اس طرح یک جان رکھا کہ ایک کو دوسرے سے تقویت رہی۔ یہ کرشمہ دنیائے ادب میں نہایت کمیاب ہے اور غور کیجئے تو تیسرا نام اس فہرست میں بڑھانا مشکل ہوگا۔

خواجہ حسن نظامی کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اردو میں انشائے لطیف یا (ESSAY) کی روایت کو آگے بڑھایا اور اسے مستقل حیثیت عطا کی۔ میرے نزدیک اردو میں انشا کی باضابطہ ابتدا عبدالحلیم شرر سے ہوئی ہے لیکن خواجہ حسن نظامی نے اپنی منفرد شخصیت کے زور اور اثر سے اس میں ایسا جادو بھرا کہ وہ تنہا اپنے سہارے کھڑی رہ سکی۔ آج ہمارے نقادوں کو اس بات کی شکایت ہے کہ اردو میں خالص انشا کے نمونے نہیں ملتے۔ اردو میں کوئی چارلس لیمب یا ولیم ہیزلٹ نہیں جو پیدل چلنے یا ہوٹلوں میں کھانا کھانے یا نئے سال کی شام پر غیر فانی ادب پارہ تحریر کر دے۔ جو یہ دعویٰ کر سکے کہ وہ شہد کی مکھی کو اپنے مطالعہ کا موضوع بنا کر زندگی کے اسرار و رموز کی نقاب کشائی کر سکتا ہے۔ یہ شکایت بڑی حد تک درست ہے کیونکہ نئے ادیبوں میں کرشن چندر، منٹو، ممتاز مفتی اور ابراہیم جلیس کے علاوہ شاید کسی ادیب نے مضمون نگاری کو ایک علیحدہ صنف کے طور پر نہیں برتا۔ اگر فرحت اللہ بیگ، حسن نظامی، میر ناصر علی اور فلک پیما کی طرح ہمارے نئے ادیب بھی اس صنفِ ادب کی طرف توجہ کریں تو اس میدان میں ابھی بڑی گنجائشیں ہیں۔

حسن نظامی میرے خیال میں اردو کے سب سے بڑے مضمون نگار ہیں۔ ان کا قلم جھینگر کی موت اور مچھر کی بھنبھناہٹ کو بھی ادب میں ڈھال سکتا تھا، — چھوٹی چیزوں پر لکھنے کے لئے وسیع زاویہ نظر

ضروری ہے تاکہ تحریر محض ایک لمحۂ گزراں کی طرح ہنگامی نہ ہو بلکہ پس منظر میں بڑی حقیقتوں کا شعور بھی مل سکے۔ خواجہ حسن نظامی ولیم ہیزلٹ کی طرح کبھی ادبی حوالوں کا سہارا نہیں لیتے، ان کی بائبل تو یہ رواں دواں زندگی ہے۔ ان کی عظمت کی دوسری بنیاد ان کا اسلوب ہے، اور یہ اسلوب ہی ان کی شخصیت ہے۔ محض معلوماتی کتابیں زندہ نہیں رہتیں بلکہ وہ کتابیں یا تحریریں دوام حاصل کرتی ہیں جو کسی شخصیت کی آئینہ دار ہوتی ہیں اسی لئے آج مولوی ذکاء اللہ کی تاریخ ہند کوئی نہیں پڑھتا اور "فسانۂ آزاد"، "توبۃ النصوح" اور "نیرنگ خیال" جیسی کتابیں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نئی معنویت حاصل کر لیتی ہیں۔

خواجہ حسن نظامی کی شخصیت اتنی مستحکم ہے اور ان کی آواز میں اتنی وسعت ہے کہ ہر موضوع ایک ہی لہجہ میں ڈھل جاتا ہے۔ ان کی ہر تحریر میں ہم ان کی شخصیت کو دیکھتے ہیں اور پھر اس شخصیت کی قربت ہمیں زندگی سے اور قریب کر دیتی ہے۔ حسن نظامی کی تحریریں پڑھ کر ہم زندگی سے کچھ اور محبت کرنے لگتے ہیں۔ یہ بات خطوط غالب کے سوا اردو نثر میں حسن نظامی کے سوا کہیں اور مشکل سے ملے گی۔ کسی کی بیماری کی تفصیلات پڑھنا بھلے آدمیوں کے بس کی بات کہاں، لیکن غالب اپنی کھانسی، اپنے رعشہ، اپنے قویٰ کے اضمحلال اور کھٹری چارپائی کا بار بار ذکر یوں کرتے ہیں کہ زندگی پر ان کی گرفت کہیں ڈھیلی نہیں پڑتی۔ حسن نظامی کے روزنامچوں میں بھی ہر دن کی معمولی باتیں ہیں، سفر، لوگوں سے ملاقات، مریدوں سے گفتگو..... لیکن وہ انہیں شخصی باتوں میں ایسی انسانی دلچسپی پیدا کر دیتے ہیں کہ ان باتوں میں دوسروں کی حیاتِ معاشقہ کی کہانیوں سے زیادہ آب و رنگ نظر آتا ہے۔ حسن نظامی الفاظ کے انتخاب میں علمیت کی جگہ اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ ان میں زندگی کی انہیں عام باتوں کی جھلک ہو۔ وہ اپنے مشاہدیں کو ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں اور اسی لئے ان کے الفاظ میں خطوط یا رنگوں کی کیفیت ہوتی ہے۔ ان کی سادگی "آفتابی" ہے اور اس سفید رنگ میں کتنے ہی رنگ مضمر ہیں۔ حسن نظامی نے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر اخبار بیچے ہیں، وہیں مختلف پیشہ والوں کے ساتھ بیٹھ کر وہ باتیں بھی کرتے ہوں گے۔ انہوں نے بیگمات سے وہ زبان بھی سنی جو کبھی قلعۂ معلی میں بولی جاتی تھی۔ انہوں نے چاندنی چوک میں اس بینوا اڑی کی آوازیں سنیں جو پان بیچتے ہوئے ادب لوٹتا تھا۔ جو اپنے پان کو سہاگ رات کا ہمدم اور ہجر کی راتوں کا رفیق کہتا تھا اور جسے پان کی سرخی میں سہاگ رنگ نظر آتا تھا۔ خواجہ حسن نظامی کی تحریروں میں یہ سب عناصر بار بار جھلک اٹھتے ہیں۔ خواجہ صاحب جو الفاظ چنتے ہیں ان میں بڑی ہم آہنگی ملتی ہے۔ وہ تو حروف کے صوتی آہنگ کے منتر سے بھی آگاہ تھے۔ وہ "م" اور "ن" یا "ث" اور "س" اور "س" اور "ر" کی نغمگی اور باہمی رشتہ سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ ان کی تحریروں میں اکثر یہ نغمگی ابھرتی اور ڈوبتی موجوں کی طرح ملتی ہے مثلاً

"ہم لوگوں نے ہزار ہزار بار اکاس ان دیکھے خدا کی اسیری سے رہائی ہو۔"

"یثرب نگر کے چوہدری نے کہا جو سارے سنسار کے میلے تنوں کو دھونے آیا تھا۔"

خواجہ حسن نظامی کے الفاظ میں مغربی سازوں کی سی ہم آہنگی ہوتی ہے اور اس ہم آہنگی سے ایک مخصوص فضا کی تخلیق ہوتی ہے۔ وہ ایسے صاحبِ ساز ہیں جس کا "سر ورش" کبھی "غلط آہنگ" نہیں ہوتا۔ ایسی ہم آہنگ فضا کی تخلیق میں نذیر احمد جیسا انشا پرداز بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ نذیر احمد کے یہاں دہلی کے محاورے بھی اکثر ایسا سونا بن جاتے ہیں جس سے "ٹوٹیں کان"۔ اور اس کے علاوہ عربی کے بے میل ٹکڑے۔

خواجہ حسن نظامی کے مزاج میں ایک فطری خوش مذاقی جیسی کہ غالب کے یہاں ہے۔ غالب کی تحریروں میں اس خوش مذاقی کے کئی روپ ہیں حسن نظامی کے یہاں یہ بیشتر شگفتگی کی حد تک رہتی ہے۔ یہ شگفتگی کسی مصنف کے یہاں زندگی کی اونچ نیچ دیکھنے سے آتی ہے، زندگی کی سختیوں اور تلخیوں پر ہنسنے سے آتی ہے۔ خواجہ صاحب کی زندگی کئی منزلوں سے گزری تھی اور انہوں نے ایک طویل انقلابی دور دیکھا تھا۔ "جھینگر کا جنازہ"، "پیاری ڈکار" اور "مچھر کا اعلانِ جنگ" خواجہ صاحب کے مزاح اور شگفتگی کی نمایندہ مثالیں ہیں۔ خواجہ صاحب کی ہنسی ایک متمدن آدمی کی ہنسی ہے۔ تہذیب کے آداب ان کی ہنسی کو مسکراہٹ میں بدل دیتے ہیں۔ ان کی مسکراہٹ گوشہ ہائے لب سے زیادہ نہیں پھیلتی۔ اس مضمون کی ابتدا میں میں نے کہا ہے کہ ایک متمدن آواز اور زندہ چمکتی آنکھوں کا نام حسن نظامی ہے۔ اب اس میں مسکراتے ہوئے ہونٹوں کا اضافہ کرتا ہوں۔ خواجہ صاحب عالمِ شگفتگی میں کام کی بات کہنا نہیں بھولتے۔ یہ ان کی صوفیانہ افتادِ طبع کا نتیجہ

"مچھر کا اعلانِ جنگ" میں مسکراہٹوں کے درمیان یہ جملہ بھی ملتا ہے
— "اپنے بھائی نمرود کا قصہ بھول گئے، جو خدائی کا دعویٰ کرتا تھا۔"
"جھینگر کا جنازہ" اور "بیاری ڈکار" سے مختصر اقتباسات دیکھئے۔

— "میری کتابوں کو چاٹ گیا۔ بڑا موذی تھا۔ خدا نے پردہ
ڈھک لیا۔ افوہ! جب اس کی لمبی لمبی دو مونچھوں کا خیال کرتا ہوں
جو وہ مجھ کو دیکھ کر ہلایا کرتا تھا تو آج اس کی لاش دیکھ کر بہت
خوشی ہوتی ہے۔ بھلا دیکھو تو قیصر ولیم کی برابری کرتا تھا۔"

(جھینگر کا جنازہ)

— "کونسل کی ممبری نہیں چاہتا، قوم کی لیڈری نہیں مانگتا،
ارل کا خطاب درکار نہیں، موٹر اور شملہ کی کسی کوٹھی کی تمنا
نہیں، میں تو خدا سے اور اگر کسی دوسرے میں دینے کی قدرت ہو تو
اس سے بھی صرف ایک "ڈکار" طلب کرتا ہوں۔ چاہتا یہ ہوں
کہ اپنے طوفانی پیٹ کے بادلوں کو حلق میں بلاؤں اور پوری
گرج کے ساتھ باہر برساؤں یعنی کڑاکے دار ڈکار لوں۔"

(بیاری ڈکار)

جس قلم نے ایسے سدا بہار اور شگفتہ ادب پارے تخلیق کئے اُسی نے
شاہزادوں کی بپتا اور غدر کے افسانے لکھے۔ غدر کے مصائب خواجہ صاحب
کے بچپن میں ایک حقیقت کا درجہ رکھتے تھے، وہ لوگ زندہ تھے جو
خاک و خون کے ہنگاموں سے دوچار ہوتے تھے۔ دلی کا ایک شہزادہ
تو نظام الدین اولیا کے مقبرہ ہی کا باسی تھا اور خواجہ صاحب کی والدہ نے
فقیر شہزادہ سے اپنے لاڈلے کے لئے ایک بار تعویذ بھی لیا تھا۔ خواجہ صاحب
کے ذہن پر ان واقعات نے گہرا اثر ڈالا تھا اور خواجہ صاحب نے ادب کو
ان تاثرات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ یہ دلی مرحوم کی قسمت تھی کہ اسے نذیر احمد،
حالی، داغ، نذر، ناصر فراق، باقر علی، خواجہ حسن نظامی اور شاہد احمد جیسے
سوگوار ملے جنہوں نے اس کے ماضی کے تمدن کو ادب میں ہمیشہ کے لئے
محفوظ کر دیا۔ خواجہ صاحب نے محض شاہزادوں کا مرثیہ نہیں لکھا بلکہ
اُن کی آڑ میں وہ ایک بڑے تمدن کی کہانی کہتے ہیں۔ خواجہ صاحب کو
ان کے مخالفوں نے قومی تحریک سے علیحدہ سمجھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان کی
تحریروں سے بچی قومیت کو جو فروغ ہوا اور بدیشی راج کے خلاف نفرت پیدا
ہوئی اس کی نظیر کم ہو گی۔ مسلمانوں کے جذبۂ قومیت کے لئے ان کی
تحریریں ایک تازیانہ تھیں۔ "بنت بہادر شاہ" کی کہانی کا یہ حصہ
دیکھئے:-

"ابھی ہم ندی کے کنارے پر اترے ہی تھے کہ سامنے سے انگریزی
فوج آگئی ...... سامنے کھیت تھے جن میں پکی ہوئی تیار کھیتی تھی۔
ہم لوگ اس کے اندر چھپ گئے۔ ظالموں نے خبر نہیں دیکھ لیا تھا
یا ناگہانی طور پر گولی لگی۔ جو کچھ بھی ہوا ایک گولی کھیت میں آئی جس سے
آگ بھڑک اٹھی اور تمام کھیت جلنے لگا۔ ہم لوگ وہاں سے نکل کر
بھاگے۔ پر ہائے! کیسی مصیبت تھی۔ ہم کو بھاگنا بھی نہ آتا تھا۔
گھاس میں الجھ الجھ کر گرتے تھے۔ سرکی چادریں وہیں رہ گئیں۔
برہنہ سر، حواس باختہ۔ ہزار دقت سے کھیت کے باہر آئے۔"

خواجہ حسن نظامی نے باقاعدہ "خاکے" نہیں لکھے، ہاں پرانے دلی
والوں کے حلیے انہوں نے ضرور لکھے ہیں، مگر سچ یہ ہے کہ وہ اس میدان میں
محمد حسین آزاد اور فرحت اللہ بیگ کو نہیں پہنچے۔ پھر انہوں نے اعتراف
بھی کیا ہے کہ یہ حلیے "آبحیات" اور "دہلی کی آخری شمع" کی روشنی میں لکھے
گئے ہیں۔ جدت پسندی اہل کمال کی خصوصیت ہے۔ مگر خواجہ صاحب نے
اردو نثر میں بعض نئی طرحیں ضرور ڈالیں۔ بقول اقبال

ع۔ طرح نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم

اس قسم کا انداز تحریر جیسے "منکا ایک دھوبی کا نذری گملٹ" پہ خواجہ

(باقی صفحہ ۵۵ پر)

خواجہ حسن نظامی

چراغِ دہلی خواجہ حسن نظامی آہ — ادیب نامی ہم صوفی گرامی بود
بگفت ہاتف تاریخ او بگوش حفیظ — "ادیب و صوفی خواجہ حسن نظامی بود"
۱۹۵۵ء

(۲)

چوں رفت ز بزم اہلِ معنی — آں صوفی و آں ادیبِ نامی
برخاست یکے و گفت سالش — "یاد آبہ ارم حسن نظامی"
۱۳۷۵ – ۱ = ۱۳۷۴ھ

قاضی احمد میاں اختر

قاضی احمد میاں زحکمِ قضا — ناگہاں از جہاں برفت افسوس
با دلِ زار سالِ او گفتم — "قاضی احمد میاں برفت افسوس"
ا = ۱ — ۱۹۵۴ + ۱ = ۱۹۵۵ء

(حفیظ ہوشیارپوری)

[illegible] مآب میجر جنرل اسکندر مرزا، قائم مقام گورنر جنرل پاکستان

پاکستان کے نئے وزیر اعظم عزت مآب چودھری محمد علی

عزت مآب اے۔ کے۔ فضل الحق، وزیر داخلہ
آن کے پہلو میں عزت مآب ابراہیم رحمت اللہ
وزیر صنعت فروکش ہیں۔

عزت مآب پیر علی محمد راشدی وزیر اطلاعات و نشریات
وزارت کا حلف اٹھا رہے ہیں۔

بیادِ رفتگاں

خواجہ حسن نظامی مرحوم

دھر کو دیتے ھیں موتی دیدہ گریاں کے ھم
آخری بادل ھیں اک گزرے ھوئے طوفاں کے ھم

دہلی میں خواجہ حسن نظامی مرحوم کی وفات پر ھزایکسیلنسی
راجہ غضنفر علی خاں کی زیر صدارت تعزیتی جلسہ

قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی مرحوم

افسانہ

تلاش

آغا بابر

". . . ہمیں آپ ہی جیسے ماہر کی تلاش تھی یقین جانئے آپ کے آنے سے ہماری ہمتیں بڑھ گئی ہیں۔ آپ کا تعاون اگر ہمیں حاصل ہو گیا تو ہم بہت جلد ڈراما پیش کر سکیں گے۔" ڈراما کلب کے پریذیڈنٹ نے ان الفاظ پر تان توڑی۔

سکریٹری اور بھی لجاجت سے بولا "ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ کی تبدیلی یہاں ہو گئی ہے۔ اب اگر آپ کا ذوق اور تجربہ ہمارے ناچیز لوٹے اور شوق کی رہنمائی کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارا کھیل اس شہر کی تاریخ میں یادگار نہ بن جائے۔"

سٹیج مینجر بولے "آپ کی ڈائرکشن سے کھیل کہیں کا کہیں جا پہنچے گا۔"

ان سب عہدیداروں کو محض ڈرامے کا شوق میرے پاس لے آیا تھا۔ میں نے ان کارکنوں پر نظر ڈالی جو میری زبان سے ہاں سننے کیلئے ہمہ تن گوش تھے۔ کلب کے کاغذات جن میں پچھلے ڈراموں پر تبصرے، اشتہارات اور اخبارات کے تراشے شامل تھے، میرے سامنے میز پر پڑے تھے۔ ان لوگوں کو ڈرامے سے ضرور دلچسپی تھی، نوجوان تھے مستعد کارکن تھے۔ کلب کے ممبروں کی خاصی معقول تعداد تھی۔ میرے اندر راکھ میں دبی ہوئی ڈرامے کی چنگاری ذرا سی ہوا سے دہک اٹھی۔

میں نے کہا "میں حاضر ہوں۔ مجھے کیا انکار ہو سکتا ہے۔"

میں نے اپنا ایک ایسا ڈراما منتخب کیا جس میں عورت کا صرف ایک رول تھا۔ وہ اس لئے کہ زیادہ عورتیں کہاں سے آئیں گی؟ یہ تو اب ہو نہیں سکتا کہ لڑکے کو سٹیج پر لڑکی کا لباس پہنا کر پیش کیا جائے۔

کلب کے عہدیداروں نے دو ایک اجلاس بلائے۔ یہ خبر آناً فاناً ڈرامے کے شوقینوں میں پھیل گئی۔ نئے اور پرانے سکول کے سبھی لوگ ڈرامے میں شرکت کے لئے آنے لگے۔ کاسٹ کا چناؤ کر کے پارٹ تقسیم کر دیئے گئے۔ میں نے پہلی ہی میٹنگ میں پریذیڈنٹ سے کہہ دیا تھا کہ ہیروئن انہیں خود تلاش کرنی پڑے گی۔ یہ ذمہ داری ان کی ہوگی میری نہیں اور جب میں نے یہ کہا تھا کہ یہی مرحلہ مشکل ہوا کرتا ہے تو ان کا سٹیج مینجر بولا "انشاء اللہ ہمیں اس مشکل سے دوچار نہیں ہونا پڑے گا۔ میں ایک خاندان کو جانتا ہوں جس میں دو بہنیں ڈرامے کا بڑا شوق رکھتی ہیں۔ میں تو کہتا ہوں آپ ضرور کوئی ایسا ڈراما منتخب کر لیں جس میں عورتوں کے دو رول ہوں۔ ان کا لانا میرا ذمہ رہا۔"

میں سن کر خاموش ہو رہا۔

ایک اور صاحب بولے "ریڈیو سٹیشن سے میرے بڑے مراسم ہیں۔ وہاں سے کوئی انتظام ہو جائے گا۔ یہ مرحلہ کچھ مشکل نہیں۔"

فیصلہ یہ ہوا کہ ریہرسل شروع کر دئے جائیں۔ ہیروئن کا پارٹ مختصر ہے، وہ یاد کر لیا جائے گا۔ اس دوران میں باقی کردار تو اپنی اپنی جگہ تھوڑے بہت مستعد ہو جائیں۔ چوتھے روز سٹیج مینجر آیا۔ اس سے پوچھا گیا کیا خبر لائے؟ تو بولا "اس خاندان سے میرا رابطہ کچھ عرصہ سے قائم نہیں رہا تھا۔ اب گیا تو معلوم ہوا کہ بڑی بہن کا انتقال ہو چکا ہے اور چھوٹی کی شادی۔"

پھر دوسرے صاحب کا پرچہ آیا کہ کوئی ریڈیو آرٹسٹ سٹیج پر آنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ بند سٹوڈیو میں کاغذ پر سے اپنا پارٹ پڑھ لینا زیادہ آسان سمجھتی ہیں۔

ایک دن سکریٹری نے اطلاع دی کہ کرتارپور میں ایک بڑے میاں رہتے ہیں۔ ان کی دو صاحبزادیاں ہیں جن کو فنونِ لطیفہ کا بہت شوق ہے۔ میں نے ان سے بات کی تھی وہ کہتی تھیں ابا میاں سے بات کرو۔ دو چار پھیرے کر چکا ہوں۔ ابا میاں سے ملاقات نہیں ہو پاتی۔

میں نے سکریٹری کی مرضی نکی اور کوشش بار ی رکھنے کی تاکید کی چند دن بعد وہ خبر لایا کہ آپا میاں کے خیال میں تو بہت بڑے بڑے ہیں۔ کوئی فلم والا اُن سے وعدے وعید کر گیا ہے۔ لڑکیوں کے سین ابا میاں جیب میں ڈالے پھرتے ہیں۔ وہ ڈرامے میں حصہ لینے کے لئے معاوضہ مانگتے ہیں۔ دس روپیہ یومیہ اور جتنے روز ڈراما کھیلا جائے، سو روپیہ فی یوم۔ جب سکریٹری نے کہا کہ یہ تو شوقیہ ڈراما کھیلنے والوں کی جماعت ہے جو اس بار کی متحمل نہیں ہو سکتی، تو ابا میاں نے انکار کر دیا۔

اب کیا ہو؟ ہفتے میں چار روز پابندی سے رہرسل ہو رہا تھا۔ پارٹ یاد کئے جا رہے تھے۔ حاضریاں ٹھیک تھیں۔ ڈرامے سے دلچسپی لینے والے حضرات رہرسل دیکھنے آتے اور کرداروں کا پارٹ سن کر بڑے خوش ہوتے۔ ڈراما کلب میں سلجھے ہوئے لوگ تھے چنانچہ آنے والے اچھا تاثر لے کر جاتے۔ کلب کے پریذیڈنٹ نے ایک دن کلائی کی گھڑی پر نگاہ ڈال کر کہا "وقت تو ہو گیا ہے اب آ ہی رہے ہونگے وہ لوگ۔"

وہ لوگ جن کے لئے ہر شخص چشم براہ تھا آتے ہی نہیں تھے۔ وہ لوگ جن کے متعلق سب کا خیال تھا کہ ڈراما ہو ہی نہیں سکتا عنقا ہو گئے تھے۔ یہ میرا ہی دم تھا کہ میں نے کاسٹ کا حوصلہ برقرار رکھا اور کہتا رہا کہ ہیروئن آنے ہی والی ہے ورنہ میں جانتا تھا کہ ہیروئن کے بغیر ہیرو اپنا پارٹ بول بول کر بری طرح بیزار ہو چکا تھا۔ کرداروں میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ بغیر ہیروئن کے ڈراما کیسے ہوگا؟ ہیروئن کیوں آنے کا نام نہیں لیتی۔ سکریٹری کو اپنی نا اہلیت کی بنا پر استعفیٰ دے دینا چاہئے۔ ڈینگیں مارنے والے کس کنج میں جا چھپے ہیں؟ عہدیداروں کی کوششیں کیوں بار آور نہیں ہوتیں۔ یہی حالت ہے تو ڈرامے کا خدا حافظ ہے۔ ان حالات میں پریذیڈنٹ نے رہرسل کے دوران میں کلائی کی گھڑی پر نگاہ ڈال کر کہا تھا "وقت تو ہو گیا ہے اب آ ہی رہے ہوں گے وہ لوگ۔"

ان الفاظ سے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔ دلوں کو بڑھاوا ملا۔ ایکٹنگ میں چمک پیدا ہو گئی۔ ہر کردار کے سینے میں تجسس کی کرن پھوٹی۔ وہ لوگ کیسے ہوں گے۔ آخر آج آ ہی جائیں گے وہ لوگ۔ ہر کسی کی نگاہ صدر دروازے کی طرف تھی۔ ہر آہٹ پر کان تھے۔ اچانک پریذیڈنٹ اٹھ کر کسی کو لینے باہر چلے گئے۔ ان کے ساتھ ساڑھی باندھے ایک خاتون داخل ہوئیں۔ چہرے پر ملاحت حد سے زیادہ تھی لیکن چال میں دلآویزی کی کمی تھی۔ ان کے پیچھے پیچھے ایک بزرگ عورت تھیں، معلوم ہوا ان کی خالہ ہیں۔

پارٹ پڑھنے کے لئے مسودہ دیا گیا تو ساری کاسٹ کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنا پارٹ اچھا پڑھا۔ پریذیڈنٹ نے میری طرف دیکھا، میں نے دل بڑھانے کو کہا "آپ نے اچھا پڑھا ہے۔ بس کام چل جائے گا۔"

صرف "تانگہ کرایہ دینا" ان کے ساتھ طے ہوا کیونکہ انہیں خاصی دور سے آنا تھا۔ اس نے اگلے ہفتہ چار رہرسل کئے۔ تمام اطمینان بخش تھا۔ سب کا دل خوش ہوا کہ آخر تلاش ٹھکانے لگی۔

مگر وہ اگلے ہفتہ نہ آئی۔ چار روز بعد سکریٹری خبر لایا کہ اسکا خاوند ایران میں ملازم ہے۔ اُس کا خیال تھا پاسپورٹ بننے سے پہلے پہلے وہ ڈرامے میں حصہ لے سکے گی، مگر اب پاسپورٹ تیار ہو گیا اور وہ ایران جا رہی ہے۔

کرداروں کے حوصلے پھر پست ہونے کو تھے، مگر میں نے ان سے یہی کہا کہ نا امید ہونے کی ضرورت نہیں۔ خواہ کچھ ہو ڈراما ہو کر رہیگا۔ حقیقت یہ تھی کہ کرداروں کو اپنے پارٹ میں اب لطف آنے لگا تھا، اور مجھے اپنی تخلیق سے اک گونہ خوشی ہو رہی تھی۔ ڈراما کلب کے عہدیدار بار بار مجھ سے معافی مانگتے تھے کہ انہوں نے میرا ایک مہینہ ضائع کر دیا اور کچھ نہ ہوا۔

دس دن اور گزر گئے۔ امید کی کرن کسی طرف سے پھوٹتی دکھائی نہ دی مگر سکریٹری نے جی نہ چھوڑا۔ اس نے ایک ایک شخص کو حوصلہ دلایا۔ آخر ایک دن میرے پاس آیا اور بڑی شرمیلی نگاہوں سے بولا "دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ لڑکے سے لڑکی کا پارٹ کرالیں۔۔۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "یہ نہیں ہو سکتا کسی اور کا ڈراما کر لو۔ مجھے کچھ مطلب نہیں۔"

اس نے معافی مانگتے ہوئے کہا "ہم آپ کی ناراضگی گوارا نہیں کر سکتے۔ یہ تو مطلب ہی نہ تھا ہمارا بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اب ڈراما چونکہ تیار ہے، کوئی عورت نہیں ملتی تو کیا کیا جائے۔ یہی ایک صورت ممکن ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ کسی گانے والی کو لے آئیں، کچھ معاوضہ دے دیں گے۔ جن ممبروں کی طرف سے مخالفت کا ڈر ہے اُن سے یہ کہہ کر چھپکا رہا یا جا سکتا ہے کہ ریڈیو آرٹسٹ ہے بس۔" میں نے ذرا دیر تامل کیا۔ پھر کہا "مجبوری کی صورت میں ایسا کرنے میں ہرج تو نہیں۔ مگر گانے والی جھٹ پہچانی جائے گی۔۔۔"

وہ بولا "جی نہیں وہ ایسی نہیں ہے، اگرچہ وہ رہتی قصائی گلی ہی میں ہے جہاں اور گانے والیاں رہتی ہیں مگر اس کا چہرہ ابھی اتنا مسخ نہیں ہوا۔

اس کا باپ بڑا شریف ہے۔ یعنی میرا مطلب ہے میری بات مان جائے گا۔ میں اس سے کہوں گا تمہاری لڑکی کو ریڈیو پر پروگرام دلوا دیں گے۔ اگر سٹیج پر اس نے اچھا کام کیا تو ممکن ہے وہ کسی فلمساز کی نظر چڑھ جائے۔ دیکھتے دیکھتے لاکھوں کی آنکھوں کا تارہ بن جائے۔"

میں نے سکرٹری کو اجازت دیدی۔ وہ اگلے روز دوپہر کے وقت پسینہ میں بھیگا ہوا آیا اور خوشی خوشی بولا کہ لڑکی اور لڑکی کے باپ دونوں کو رضامند کر لیا ہے۔ لڑکی کو ڈرامے کا خود بڑا شوق تھا۔ اس نے باپ کو منوانے میں خود بڑا پارٹ لیا ہے۔ اب آپ جس دن کہیں وہ ریہرسل کے لئے آجائے۔ ویسے میں نے کہہ دیا ہے کہ اس بدھ کو ریہرسل ہے۔

"تم نے ٹھیک کہا" میں نے جواب دیا "اب ذرا ان لوگوں کو رجھائے رہنا۔ بدھ کو اپنے ساتھ لے کر آنا۔"

نوجوان لڑکی تھی۔ الماس نام تھا۔ تیکھے تیکھے نقش تھے۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ، طبیعت میں چنچل پن، آنکھوں میں چمک اور نگاہ میں تیزی۔ اس نے اپنا پارٹ کچھ اٹک اٹک کر کچھ رواں پڑھا۔ مطلب یہ کہ ڈرامے کے لئے موزوں تھی۔ اگرچہ ناک میں چھوٹی سی مرکی تھی مگر خیر اسے میک اپ سے چھپایا جا سکتا تھا۔ اس کا باپ معقول آدمی دکھائی دیتا تھا۔ وہ خود بڑا خوش تھا کہ اس کی بیٹی ڈراما کرے گی اور ہزاروں لوگ دیکھیں گے۔ اس کی خواہش تھی کہ میں ڈرامے میں دو تین گانے شامل کر دوں تاکہ وہ سٹیج پر انہیں گا سکے۔ ان سے تانگہ کا روز کا کرایہ طے ہوا اور ڈرامے کی دو راتوں کا سو روپیہ۔

الماس کو اس کا پارٹ دیدیا گیا۔ وہ اگلے روز مقررہ وقت پر اپنے باپ کے ساتھ پہنچی جس نے بتایا کہ الماس گھر پر تین چار مرتبہ اپنا پارٹ پڑھ چکی ہے۔ مجھے اس کی اس دلچسپی سے خوشی ہوئی۔ آج ہیرو نے اپنا مکالمہ بولا اور الماس نے جواب دیا تو محسوس ہوا کہ ڈرامے میں جان پڑ گئی ہے۔ ریہرسل ختم ہونے پر سب نے تالیاں بجائیں۔ الماس نے مسکرا کر اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ میں نے اس کے باپ سے کہا "بہت اچھا پارٹ ادا کیا ہے الماس نے۔ شاباش الماس۔"

میں الماس کا پارٹ اسے بتاتا اور ساتھ ساتھ شاباش بھی دیتا رہتا کہ اس کی حوصلہ افزائی ہوتی رہے۔ سکرٹری اس کے باپ کو اپنے سگرٹ بھی پلاتا اور سبز باغ بھی دکھاتا۔ بمشکل آٹھ دن گزرے ہوں گے کہ الماس نے اوپر تلے دو دن ناغہ کر دئے۔ سکرٹری نے بیان کیا کہ الماس اچھی بھلی تھی مگر اس کو دیکھ کر کھٹ سے لیٹ گئی اور بیمار بن گئی۔ کہنے لگی، میں نے پارٹ یاد کر لیا ہے مگر کیا کروں بیمار ہو گئی ہوں۔ اتنے میں اس کا باپ آگیا۔ سکرٹری نے اس سے کہا "الماس بیمار ہو گئی ہے تو کوئی بات نہیں۔ ہم چند دن کے بعد ریہرسل کریں گے۔" اس کا باپ سکرٹری کو دوسرے کمرے میں لے گیا اور بولا "میرا خیال تھا دو ایک دن کی بات ہے جس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا مگر ہر روز پورے پانچ بجے لڑکی کو باہر لے جانے سے تو ہم اپنی برادری میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔ لوگ ہمارے گھروں میں آتے ہیں اور ہماری لڑکی اس کے برخلاف جانے لگے یا ہر تو ہماری عزت کیا رہ گئی؟"

یہ بات سن کر میں نے سکرٹری سے کہا "میں الماس کے باپ سے بات کروں گا۔ اسے میرے پاس لاؤ۔"

اگلے روز الماس کا باپ آیا۔ اس نے بڑی تمکنت سے اسی بات کو دہرایا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ چند دنوں کو بڑی امام کا میلہ ہونے والا ہے۔ ابھی سے مہمان آنے شروع ہو گئے ہیں۔ ان کی خاطر تواضع کون کرے گا؟ ان کے سامنے کھانا کون لگائے گا؟ ان کی مہمانداری کون کرے گا؟ یہ سارے کام الماس کو کرنے ہیں۔ پھر برادری بڑی منہ پھٹ ہوتی ہے۔ کھا کر بھی بات کرنے سے باز نہیں آتی۔ ہم پھر کبھی خدمت کر دیں گے، اس وقت مجبور ہیں۔"

الماس کا یوں ہاتھ کھینچ لینا ڈرامے کے کرداروں کے لئے ایک ضرب کاری تھی مگر ڈرامے کا شوق اور ڈرامے کی تیاری نے حوصلے پست نہ ہونے دئے۔ ڈائرکٹر کے چھکے چھوٹے ہوئے تھے۔ پریذیڈنٹ اپنی جگہ پریشان تھا۔ سکرٹری کا رونے کو جی چاہتا تھا۔

فیصلہ ہوا کہ ہیروئن کی تلاش جاری رہے۔ ڈرامے کا ریہرسل ہفتہ میں چار دن کی بجائے دو دن کر دیا گیا۔ مگر اب حاضری میں ناغہ ہونے لگی۔ سکرٹری بیچارہ ایک طرف کاسٹ کو حاضر ہونے کی تاکید کرتا، دوسری طرف ہیروئن کی تلاش میں سرگرداں پھرتا۔ چند روز بعد میرے پاس آیا۔ کہنے لگا ایک طبلچی میرا واقف تھا۔ پرسوں اچانک سبزی والے کی دکان پر ملاقات ہو گئی۔ میں نے اس سے ہیروئن کی ضرورت کا ذکر کیا۔ کہنے لگا یہ بھی کوئی مشکل ہے۔ میرے پاس دو لڑکیاں ہیں۔ ایکٹنگ کرنا جانتی ہیں گاتی بھی اچھا ہیں۔ وہ شام کو میرے ساتھ آپ سے ملنے آرہا ہے۔ آپ خود ہی اس سے بات کر لیں۔ ماسٹر نیاضی اس کا نام ہے۔"

ماسٹر فیاضی کی لمبی لمبی قلمیں تھیں۔ بمبئی فیشن کے بال تھے۔ وہ تیز تیز باتیں کرتا تھا۔ اپنے بیان کے مطابق اس نے کئی ڈرامے تیار کیے تھے۔ اب وہ کسی ایسی پارٹی کی تلاش میں تھا جو ایک ایسا ڈراما تیار کرے جس میں مکالمے کم ہوں اور گانے زیادہ ہوں۔ اس کے پاس جو دو لڑکیاں تھیں وہ گاتی بہت اچھا تھیں۔ جب اسے معلوم ہوا کہ ہم جدید قسم کا ڈراما کر رہے ہیں جس میں گانا نہیں ہے تو اسے بہت افسوس ہوا ورنہ وہ ان میں سے ایک لڑکی کا انتظام کر دیتا۔ بہرحال اس نے ایک اور عورت کا ذمہ لیا۔ جو اس کے بیان کے مطابق لاہور سے عارضی طور پر آئی ہوئی تھی اور کسی دور کے رشتہ دار کے ہاں مہمان تھی۔ اس نے بہت سے پان کھائے، بہت سے سگرٹ پیئے اور ریہرسل پر اسے لانے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ سکرٹری نے مشکوک لہجہ میں مجھ سے کہا "مجھے تو یہ آدمی کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔" میں نے کہا "تم غلطی پر ہو۔ وہ بھی آدمی ڈھنگ کا ہے اور ہمارے کام آ سکتا ہے۔"

ریہرسل پر وعدے کے مطابق ماسٹر فیاضی اس عورت کو لے کر آ پہنچا۔ عورت کی صورت واجبی تھی۔ مگر ذرا صاف سی۔ [illegible] پوچھا۔ ماسٹر فیاضی مجھے خوش کرنے کے لیے ریہرسل کے بعد ہارمونیم لے بیٹھا اور اس عورت نے ایک غزل بھی سنا ڈالی۔

معاملہ کی بات ہونے لگی تو ماسٹر فیاضی اور اس عورت نے اسی بات پر زور دیا کہ وہ صرف ہمارے ڈرامے کی خاطر یہاں رہے گی اس لیے اس کے رہنے کا انتظام کسی ہوٹل میں یا کسی معقول جگہ کر دیا جائے۔ جب ہم نے اس تجویز کو ماننے سے قطعی انکار کر دیا تو ماسٹر فیاضی نے روز کا دو روپیہ تانگہ کا کرایہ اور ڈراما ہونے پر سو روپیہ لینا منظور کر لیا۔

سوکھے دھانوں پر پانی پڑ گیا۔ سکرٹری کو شکایت تھی کہ ماسٹر فیاضی اس سے اب ہر روز سگرٹ کی ڈبیا کا بھی مطالبہ کرتا ہے اور چائے کے لیے بھی پیسے مانگتا ہے۔ اگر نہ دیے جائیں تو وہ کہتا ہے یہ ڈراما کلب جو سب ٹھٹ پونجیا کلب ہے۔ آپ کو اتنی اچھی آرٹسٹ لا کر دی ہے جبکہ آپ کا پروگرام چوپٹ ہو چکا تھا اور آپ سگرٹ کی ڈبیا دیتے گھبراتے ہیں۔ ہم نے ایسے لوگوں کے ساتھ کبھی کام نہیں کیا۔ میں نے سکرٹری سے کہا کہ ہماری غرض اٹکی ہے۔ اس کی ہر بات مان لو۔ سگرٹ پلاتے رہو۔ تمہارا بل ڈرامے کے بعد ادا کر دیا جائے گا۔ میں نے بھی اپنی جگہ یہ محسوس کیا تھا کہ ماسٹر فیاضی میرے ساتھ کچھ مراسم بڑھانا چاہتا ہے مگر میری سرد مہری دیکھ کر وہ آگے نہ بڑھ سکا۔ کبھی کبھی جب اس کے چہرے پر ایک ایسی الجھن اور بیزاری کے آثار دیکھتا جیسے کہہ رہا ہو کہ میں کن لوگوں میں آن پھنسا۔ ان کو کسی بات کا شوق ہی نہیں۔ ڈرامے کا شوق کوئی اس طرح کا ہوتا ہے، بس اپنے کام سے جُتے ہوئے ہیں۔ یہ ضابطہ کبھی ٹوٹتا ہی نہیں۔ اصول کی مالا جپی جا رہی ہے۔ ٹوٹ کر ایک منکا بھی نیچے نہیں گرتا۔ کیسی واہیات زندگی ہے۔

سکرٹری سے مجھے معلوم ہوا کہ ماسٹر فیاضی نے جس عورت سے شادی کر رکھی ہے اس کی پہلے خاوند سے دو لڑکیاں ہیں، جن کے متعلق وہ کہتا تھا کہ گاتی بہت اچھا ہیں اور ایکٹنگ کر سکتی ہیں۔ وہ یہی لڑکیاں تھیں۔ یہ عورت جس کا نام اس نے ہمیں مس سلطان بتایا ہے ایک ریلوے گارڈ کی بیوی ہے، چار بچوں کی ماں ہے۔ میں نے سکرٹری سے کہا "خواہ وہ نصف درجن بچوں کی ماں ہو ہمیں کوئی غرض نہیں ہمیں ڈرامے کے لیے ایک عورت کی تلاش تھی جو ماسٹر فیاضی کے طفیل مل گئی۔ اب چند دنوں میں ہمارا ڈراما ہو جائے گا۔ ہمیں کسی کے عیب ثواب سے کیا مطلب؟"

سکرٹری بولا "وہ تو ٹھیک ہے مگر دیکھیے نا ماسٹر نے کس کس طرح کے جھوٹے قصے بنا کر ہمیں سنائے ہیں؟"

"ارے بھئی شکر کرو کہ ڈرامے کے لیے تمہیں عورت مل گئی۔ صبح سے شام تک کی تلاش اور سرگردانی ختم ہوئی۔ اس عورت نے اگر اپنا حسب نسب بتائے بغیر ڈرامے میں حصہ لے کر سو سوا سو روپیہ معاوضہ لے لیا تو اعتراض کی کیا بات ہے۔ اس کے بچوں کے کپڑے بن جائیں گے۔ اس سے میری نظر میں اس کی عزت گھٹتی نہیں بلکہ بڑھتی ہے۔ ایک صاف ستھرا ڈراما نہیں کرنا تھا تمہیں میرے جیسے مشقت کرنے والے محنتی اور سخت جان ڈائرکٹر کی تلاش تھی، وہ تمہیں مل گیا۔"

اور بھی میں نے سکرٹری سے کچھ کہا وہ مان گیا۔ نوجوان لڑکا تھا۔ زندگی کو دیکھنے کا زاویہ اس کا ایسا ہی سادہ تھا جیسا کہ اس عمر میں ہوتا ہے۔

ڈراما بخیر و خوبی ہو گیا۔ ہم نے سو روپیہ معاوضہ اور پچیس روپیہ انعام دے کر ماسٹر فیاضی اور مس سلطان کا شکریہ ادا کیا۔

کوئی دس دن بعد سکرٹری میرے ہاتھ سے سر پیٹنے کے لیے گویا ترپ کا پتہ لے کر آیا، کہنے لگا "کچھ سنا آپ نے مس سلطان بچوں کو چھوڑ کر ماسٹر فیاضی کے ساتھ لاہور بھاگ گئی ہے۔ فیاضی اسے لے کر فلم کمپنیوں میں پھر رہا ہے۔ مس سلطان کا خاوند اسے اور ڈراما کرنے والوں کو سو سو گالیاں دیتا ہے۔"

(باقی صفحہ ۵۵ پر)

غزل

حفیظ ہوشیارپوری

آخر ندیمِ بزم اب احباب ہو گئے
ہم بھی کوئی صدف تھے کہ نایاب ہو گئے

تم دل میں آ گئے، نہ رہے ہم کسی کو یاد
تم بن گئے خیال تو ہم خواب ہو گئے

اب ہم ہیں اور قیدِ وفا ہے تمام عمر
کس بات پر سنجانے سزایاب ہو گئے

کچھ اشک تھے جنہیں ترا دامن ہوا نصیب
کچھ اشک ہیں کہ گوہرِ شب تاب ہو گئے

جیسے ترے بغیر کبھی تشنہ ہی نہ تھے
بس اک نظر کی دیر تھی، سیراب ہو گئے

بیٹھے ہیں تک رہے ہیں اب اک دوسرے کا منہ
اے عشق ختم کیا ترے آداب ہو گئے؟

مجبور ہو گئے انہیں مجبور دیکھ کر
بیتاب اُن کو دیکھ کے بیتاب ہو گئے

پہلے بھی ہم نے ترکِ محبت کیا مگر
اس مرتبہ کچھ اور ہی اسباب ہو گئے

تقدیرِ مہر و ماہ وہی اک گہن کا داغ
ذرّوں سے بن پڑی تو جہاں تاب ہو گئے

چونکے عدم کی نیند سے اک شورشن کے ہم[1]
دیکھا ابھی ہے رات گراں خواب ہو گئے

اپنی نظر میں آپ سُبک ہو گئے حفیظ
جو لوگ بارِ خاطرِ احباب ہو گئے

[1] شورے شد و از خوابِ عدم چشم کشودیم — دیدیم کہ باقی است شبِ فتنہ غنودیم (مرزا)

غزل

روشؔ صدیقی

کیسے کیسے گلِ خوش رنگ، نظر سے گزرے
زندگی خلد بداماں تھی جدھر سے گزرے

غمِ کعبہ انھیں لاحق ہے، نہ اندیشۂ دَیر
وہی اچھے جو تری راہگذر سے گزرے

دلکشی جادۂ ہستی کی، رہی دامن گیر
ہم تو اس راہ میں مقصودِ سفر سے گزرے

چیر کر سینۂ امواج، پہونچ ساحل تک
اس سے پہلے کہ یہ طوفاں ترے سر سے گزرے

نہ برستی ہیں، نہ چھٹتی ہیں گھٹائیں غم کی
خواب تھے عیش کے بادل کہ جو برسے، گزرے

ہم بھی ہیں راہ میں کاشانۂ صیاد بھی ہے
دیکھئے، برقِ چمن زاد کدھر سے گزرے

خلوتِ زلفِ پریشاں سے چلی آتی ہے
کیوں نسیمِ سحری آج ادھر سے گزرے

قہرِ دوزخ تو یہیں دیکھ لیا انساں نے
کاش جنت بھی کوئی چشمِ بشر سے گزرے

درِ میخانہ پہ انبوہِ خلائق تھا روشؔ!
آج تو چند فرشتے بھی نظر سے گزرے

غزل

اعجاز بٹالوی

رخصت کی گھڑیاں آپہنچیں غم سے آنکھیں چار کرو
مدت سے جو پھانس اٹکی ہے اس کو دل کے پار کرو

ڈوبا عشق کی رات کا چاند اغم کا سورج نکلے گا
ڈھلتی رات بکھرتے تارے رختِ سفر تیار کرو

غربت کی ٹھنڈی چھاؤں میں دل کو نیند آجائے گی
دیس کی جلتی دھوپ میں جل کر سینے کو گلنار کرو

ساقی کی شہ پاکر اٹھو ہوش و خرد کا وقت نہیں
پاؤں کی لغزش ہی کے سہارے غم کی منزل پار کرو

ان سے دوری موت ہے دل کی موت تو اچھی چیز نہیں
میرے ان کے بیچ نہ حائل لوگو یہ دیوار کرو

دنیا ہے دنیا داروں کی ہم سے خفا کیوں ہوتے ہو
ہم تو فقیر ہیں یارو ہم سے ہنس کر بولو پیار کرو

اپنی خوشیاں ان کو دے دو ان کے غم بدلے میں لے لو
عشق کی شرط یہی ہے ورنہ اور کوئی بیوپار کرو

اے اعجاز بٹالے والے عشق کی رہ آسان نہیں
دل تو دیا ہے جاں بھی لٹا دو پھر تم ان سے پیار کرو

غزل

شہرت بخاری

اپنی بساط کیا تھی جو منزل کی سوچتے
اس راستے میں ہار گئے جی بڑے بڑے

کیا کچھ نہ بیت جائے جو صحرا سے لوٹئے
پھلواریوں سے آئے تھے کانٹے لئے ہوئے

پائیں کسی کے دل میں جگہ ہم بقدرِ حس
ان کوششوں میں اپنی نظر سے بھی گر گئے

جب تک بن آئی ساتھ دیا اے چراغِ دل
تو جان اور یہ آندھیاں جانیں کہ ہم چلے

تاروں سے کیا گلہ کہ شبِ غم وہ ہے بلا
رہنے لگے ہیں اپنے بھی سائے پرے پرے

دھیان آگیا تو چہرے پہ صبحیں دمک اٹھیں
ورنہ ہمیشہ دل میں اندھیرے بسے رہے

شہرت وہ لوگ بھی نہ رہے اپنے ہم نوا
اک عمر جن کے درد میں غزلیں کہا کئے

○

غزل

اختر انصاری اکبرآبادی

ہر بزم میں ہیں شوخ، گل اندام بہت خوب
پھولوں سے مزین ہیں، در و بام بہت خوب

خالی ہے ہر اک شیشہ ہر اک جام ہر اک ظرف
کیا دَور ہے اے گردشِ ایام بہت خوب

ہر طائرِ آزاد اسیری پہ فدا ہے!
پھیلے ہوئے گلزار میں ہیں دام بہت خوب

ہر صبح نئی آگ ہے، ہر شام نیا غم!
ہے دوست یہ رنگِ سحر و شام بہت خوب

وہ میرے ہی جذبات سے کھیلے ہیں مسلسل
میری ہی محبت پہ ہے الزام! بہت خوب

کہتے ہیں کہ آرام ہے اس دَور کا حاصل
انسان اور اِس دَور میں آرام! بہت خوب

گمنام جو سمجھے تھے جہاں میں مجھے اختر
ہے ان کی زباں پر بھی مرا نام بہت خوب

غزل

حمایت علی شاعر

ایک سی ہے یوں تو کہہ لینے کو ہر اک دل کی بات
اہلِ محفل سے الگ ہے صاحبِ محفل کی بات

کشتیو- طوفاں سے گھبرا کر نہ لو ساحل کا رُخ
لوٹتی موجوں سے پوچھو رحمتِ ساحل کی بات

جس قدر بڑھتے ہیں آگے اور ہو جاتے ہیں دور
راستے کے پیچ و خم میں کھو گئی منزل کی بات

کس سے دل کی بات کہیئے جس پہ پڑتی ہے نظر
اس کا چہرہ بول اٹھتا ہے خود اپنے دل کی بات

جب بھی چھڑ جاتے ہیں شاعرالفنوں کے تذکرے
اکثر آ جاتی ہے یاد اک کشتۂ محمل کی بات

مزاحیہ:-

ظاہردار بیگ — لاہور میں

صلاح الدین احمد

ایک دن میں صبح کرایہ ادا کرنے کے لئے آبادکاری کے دفتر میں
جو جانا ہوا تو وہاں ایک عجیب و غریب ہستی سے ملاقات ہوئی۔ چونکہ
ابھی صبح کا وقت تھا لوگ بہت کم آئے تھے اور برآمدے کی بنچ پر بھی
ایک ہی صاحب تشریف فرما تھے میں نے اندر جھانک کر دیکھا تو وہ
صاحب بھی ابھی نہیں آئے تھے، جن سے مجھے کام تھا مجبوراً میں بھی بنچ کے
ایک سرے پر بیٹھ گیا، اور بغل میں سے اخبار نکال کر دیکھنے لگا۔ ایسے میں
چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ قریب سے آواز آئی "شوق فرمائیے" آنکھ
اٹھا کر دیکھتا ہوں تو وہی صاحب جو بنچ پر تشریف فرما تھے، اپنی پانوں
کی ڈبیا میری جانب بڑھا رہے ہیں اور ڈبیا کے پیچھے پیچھے ایک سنہری
ڈوریوں والا ایک ریشمی بٹوا بھی چلا آ رہا ہے۔ ڈبیا کے ایک خانے میں چکنی
ڈلیاں تھیں اور دوسرے میں رام پوری زردہ اور تیسرے میں چھوٹی
الائچیاں اور لونگ۔ پان کی پیشکش انہوں نے ایسے رسیلے انداز میں کی
تھی کہ مجھ سے انکار بن نہ پڑا اور میں نے "شکریہ" کہہ کر ڈبیا میں سے ایک
چھوٹا سا ٹکڑا اٹھا لیا۔ ابھی میں نے ٹکڑا منہ میں ڈالا نہ تھا کہ انہوں نے فرمایا کہ
"شکریہ" کیا لفظ ہے قبلہ! جب سے اس طرف آنا ہوا ہے۔ کیا کراچی
اور کیا لاہور، شکریہ سنتے سنتے کان پک گئے ہیں۔ ہمارے ہاں تو ایسے
موقعوں پر آپس میں آداب عرض کہا جاتا ہے اور کسی بزرگ کے دست
عنایت سے کچھ ملے تو اٹھ کر تسلیمات بجا لائی جاتی ہے۔ یہ دیس بھی
نرالا ہے اور اس کے رہنے والے بھی عجیب"۔۔۔ یہ سن کر میں کچھ محجوب سا
ہو گیا اور معاً ذہن میں ایک بجلی سی کوندی کہ ہاں واقعی ہم نے شکریہ کا
لفظ انگریزی معاشرت اور انگریزی زبان سے لیا ہے اور یہ بزرگ
اگلے وقتوں کے معلوم ہوتے ہیں۔

اب جو آنکھ اٹھا کر جائزہ لیتا ہوں تو قیاس درست نکلا۔ بال
بالکل سفید ہو چکے تھے۔ سر کے بھی اور چہرے کے بھی۔ لیکن سر پہ چھوٹی
چھوٹی پٹیاں سلیقے سے جمی تھیں اور کانوں کے پیچھے سے زلفیں بڑے
انداز سے نکل رہی تھیں اور گردن کے پیچھے کی جھالر بڑے بانکپن سے ابھری
تھی۔۔۔ آنکھوں میں سرمے کی تیکھی تحریر جو گوشوں سے نکل کر دنبالے
بناتی چلی گئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں جن کی نوکیں جیسے تیروں کی انیاں۔
ٹھوڑی پر بالوں کی ایک نازک سی تکون، دانتوں پر مسّی کی دھڑی اور
سفیدی پہ سیاہ حاشیے کی بہار۔ سر پہ دوہری بیل کی بھاری کامدار ٹوپی۔
بدن پر ایک چھوڑ دو انگرکھے اوپر تن زیب کا، نیچے ڈھاکے کے
طرحدار نینو کا۔ تنگ مہری کا پائجامہ جس میں پنڈلی کے نصف تک
چوڑیاں۔ ریشمی ازاربند گھٹنوں میں لٹکتا ہوا، اس میں کنجیوں کا گچھا۔
پاؤں میں ڈیڑھ حاشیئے کی جوتی۔ یہ تھا ان چھیلا سے بڑے میاں کا
حلیۂ مبارک۔

میں حسب اشارہ اٹھ کر آداب بجا لایا تو وہ بھی ہڑبڑا کر
اٹھے اور مجھ سے لپٹ گئے اور کہنے لگے واللہ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں
تھا میں نے تو اپنے زمانے کی ایک بات کہی تھی، کوئی آپ کی تنقیص تو
مدنظر نہیں تھی۔ جیسا دیس ویسا بھیس۔ اب ہمیں کو دیکھ لیجئے توڑوں کے
رئیس، ہوادار اور فنس بغیر کبھی پاؤں زمین پر نہیں رکھا۔ گرمیوں کی دھوپ
کی باتیں ضرور سنی تھیں، آنکھوں سے نہیں دیکھی تھی۔ دن بھر مجمع احباب یا
فکر سخن ہو رہی ہے، یا شطرنج اور چوسر کی بازیاں لگ رہی ہیں۔ رات کو
کوٹھے کے صحن میں چاندنی کی بہار ہے۔ دوست احباب جمع ہیں۔ برف کی
قلفیاں کھائی جا رہی ہیں۔ روح افزا شربت پئے جا رہے ہیں۔ مشکبو
پیچوان گردش میں ہیں۔ غرض کہ ہر روز روز عید تھا ہر شب شب برات۔
ہمیں یہ بھی پتہ نہیں چلتا تھا کہ صبح کب گذری اور شام کب ہوئی۔ میں نے

جب کبھی لب کشائی کی اجازت چاہی، اسے اشارے سے روک دیا، اور محل سرائے سے دو توڑے منگوا دیئے، یا مہاجن کے نام رقعہ لکھ دیا۔ پچیس گاؤں تو جمنا پار تھے اور ادھر کی جائداد کا کبھی شمار ہی نہیں کیا۔ چلتے چلتے خدمت گار کے اسباب میں چند قبالے چلے آئے تھے۔ "لو تم بھی دیکھ لو" یہ کہہ کر کاغذات کی ایک گڈی میرے ہاتھ میں تھما دی۔ اور سلسلۂ سخن بدستور جاری رکھا۔ ہاں دیکھا آپ نے ایک تو وہ کیفیت تھی اور ایک آج کی صورت دیکھ لو کہ دربدر خاک بسر پھر رہے ہیں۔ آج اس عالم کے دروازے پہ بیٹھے ہیں کل اُس افسر کی کچہری میں، اور کسی کو اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ لاؤ نواب مرزا اپنے وثیقے اور قبالے ہمیں دو اور یہ لو وظیفے کی سند۔ آج سے ہزار بارہ سے تمہارے گزارے کے لئے منظور کئے جاتے ہیں۔ ایک گوشے میں بیٹھ جاؤ اور اپنے اللہ اللہ کئے جاؤ۔

میں نے نواب مرزا کی ترکیب سنی تو میرے کان کھڑے ہوئے اور چھوٹتے ہی میں نے سوال کر دیا۔ "تو آپ نواب مرزا داغ کے خاندان سے ہیں؟" ـــــ نہیں نہیں میرے میاں وہ بیچارے تو حیدرآبادی کے ہو کر رہ گئے تھے۔ اس خاکسار کا خمیر دلی کی خاک سے اٹھا اور اب پنجاب کی خاک میں ملا چاہتا ہے۔ نام تو اللہ ہی کو زیب دیتا ہے۔ اس ہیچمداں ہیچ میرز کو نواب میرزا طاہردار بیگ کہتے ہیں۔ دلی میں جعفر صاحب کی حویلی تو آپ نے ـــــ

اتنا سننا تھا کہ میری آنکھوں کے سامنے سے گویا ایک پردہ سا ہٹ گیا اور ذہن نے کم و بیش نوّے برس کی ایک الٹی زقند بھری۔ اخاہ تو آپ ہیں مولوی نذیر احمد والے میرزا طاہردار بیگ۔ خوب صاحب خوب۔ غائبانہ تعارف تو مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم کی بدولت آپ سے مدتوں سے حاصل ہے۔ بارے آج زیارت بھی ہو گئی۔ آپ نے بہت اچھا کیا جو اس سرزمین کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز فرمایا۔ یہاں آپ جیسے حضرات کی بہت قدر ہے۔ پھر آپ تو اپنے فن میں یکتائے روزگار ہیں یہ کہتے ہوئے میں نے قبالوں اور دستاویزوں کا پلندہ بن دیکھے مرزا صاحب کو لوٹا دیا۔ کیونکہ اب اسے دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ مرزا صاحب حسب معمول اسے بھی کہیں سے ہتھیا لائے تھے اور شاید دور جانے کی زحمت اٹھانی بھی نہ پڑی ہو۔ جمعدار صاحب کے کسی مرتے ہوئے وارث کے صندوقچے میں سے نکال لائے ہوں۔

اتنے میں جن صاحب سے مجھے کام تھا وہ آ گئے اور میں مرزا صاحب سے یہ کہہ کر رخصت ہوا کہ یار زندہ صحبت باقی۔ انشاء اللہ پھر کہیں جلد ملاقات ہو گی۔ اور کرنا خدا کا کیا ہوا کہ آٹھویں دن ہی حکیم صاحب کے ہاں ملاقات ہو گئی۔

نہ جانے یہ حضرت وہاں کس طرح پہونچے۔ چند دوستوں کی مخصوص صحبت تھی جو حضرت بیدل کی تشریف آوری کے سلسلے میں منعقد کی گئی تھی۔ میں جو پہونچا تو میرزا صاحب اپنے مخصوص لباس میں اور منفرد وضع کے ساتھ عین صدر میں تشریف فرما تھے اور پان اور الائچیوں سے شوق فرما رہے تھے۔ شوق فرماتے جاتے تھے اور صاحب خانہ سے بڑے گھل مل کر باتیں کئے جاتے تھے۔ مجھ سے آنکھیں چار ہوتے ہی آپ نے اشارۂ چشم سے مجھے ایمائے سکوت فرمایا اور پھر دوسری جانب دیکھنے لگے۔ گویا مجھ سے کبھی آشنا ہی نہیں تھے۔ اتنے میں صاحب خانہ نے دو چار اور صاحبوں کے ساتھ مجھ سے بھی ان کا یہ کہہ کر تعارف کرا دیا کہ آپ سے ملئے حضرت شوق لکھنوی۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مرزا صاحب کو اس انتخاب لاجواب پر داد دی اور پھر دوسرے احباب سے مصروف گفتگو ہو گیا۔ طعام سے فراغت کے بعد جب کلام کا دور شروع ہوا تو میں منتظر رہا کہ مرزا صاحب اپنی باری آنے پر کیا گل کھلاتے ہیں۔ مگر صاحب یہاں بھی وہ آٹھوں گانٹھ کمیت نکلے۔ جب شمع ان کے سامنے آئی تو خوب سنبھل کر بیٹھ گئے اور ایک پرانا سا چشمہ جیب سے نکال کر ناک پر جمایا اور فرمانے لگے کہ حضرات میرے ہم نام کا کلام آپ نے دیکھا ہی ہو گا۔ (نواب مرزا شوق کی طرف اشارہ تھا) اب اس گمنام کی ہفوات بھی ملاحظہ فرمایئے، اور ملاحظہ فرمانے کے بعد بندا لگتی کہئے گا کہ اس شوق سے اس شوق تک کتنے قدم کا فاصلہ ہے اور یہ کہہ کر آپ نے شوق قدوائی کی مثنوی "عالم خیال" کا وہ مقام پڑھنا شروع کر دیا جہاں محبوب کا خط کلکتے سے نہ آنے پر محبوبہ عالم خیال میں اس سے باتیں کرنے لگتی ہے۔ محفل میں جو حضرات اس مثنوی سے آگاہ تھے انہوں نے ایک دوسرے سے آنکھیں ملائیں اور مسکرائے بھی لیکن میرزا صاحب کی ڈھٹائی ایسی باتوں کو کب خاطر میں لاتی تھی۔ ان کے مرکز نگاہ ایک بہت بڑے افسر تھے جن سے وہ مخاطب ہو کر جھولیوں داد پا رہے تھے اور جن سے انھیں داد کے علاوہ اور بھی بہت کچھ پانے کی توقع تھی۔

جب رات کے گیارہ بجے محفل برخاست ہوئی تو میں نے چلتے چلتے چپکے سے ان کے کان میں صرف اتنا کہا، اور بس اتنا ہی کہہ سکا کہ ایک کلیم کو تو آپ نے قید خانے میں پہنچا کر دم لیا تھا، اس دوسرے کلیم پر ذرا نظرِ کرم رکھنا۔ بے چارہ بال بچے دار آدمی ہے۔ مرزا صاحب زیرِ لب مسکرائے اور مجھ سے یہ کہتے ہوئے ایک بڑے صاحب کی کار میں جا بیٹھے کہ میں آج کل نمبر ۱۲ بولٹن گیٹ۔ روڈ پر فروکش ہوں کبھی ادھر سے گزرنا ہو تو زیارت سے محروم نہ رکھیے گا۔

وہ دن اور پرسوں کا دن میں نے آپ کی صورت نہیں دیکھی! پرسوں شام عزیزی حمید کی معیت میں اتفاق سے بولٹن گیٹ روڈ کے قریب سے گزرنا ہوا تو میں نے ان سے کہا ذرا کار ادھر موڑنا، میرے ایک کرم فرما یہاں قیام پذیر ہیں۔ ذرا ان سے ملتے چلیں۔ نمبر ۱۲ کی پورچ میں پہنچ کر ہم نے ہارن بجایا، ایک خدمت گار باہر نکلا تو معلوم ہوا کہ صاحبِ خانہ دورے پر ہیں۔ میں نے کچھ تامل کے بعد اس سے پوچھا کہ بھئی آپ کے صاحب کے کوئی مہمان یہاں ٹھہرے ہوئے تھے مرزا ظاہردار بیگ المعروف بہ مرزا شوقی۔ وہ خالی خالی نگاہوں سے مجھے دیکھ کر کہنے لگا کہ صاحب اس نام کے تو کوئی مہمان یہاں نہیں آئے۔ ایک بڑے میاں البتہ یہاں کچھ روز ضرور رہے ہیں۔ وہی ناٹا چھوٹا سا قد، کرنجی آنکھیں، رنگت زرد زرد، دبلا ڈیل، اپنے تئیں بہت بنائے سنوارے رکھتے ہیں۔ حلیہ درست تھا۔ میں نے جواب دیا۔ ہاں ہاں وہی۔ کہنے لگا حضور انہیں تو پولیس پکڑ کر لے گئی تھی۔ چلتے چلتے مجھے چپکے سے کاغذوں کا پلندہ دے گئے تھے اور کہہ گئے تھے انہیں سنبھال کر رکھنا۔ آن کر سو روپے دوں گا۔ سو حضور وہ کاغذ سنبھلے ہوئے ہیں، کہیے تو دکھا دوں۔ میں ابھی کچھ جواب نہیں دینے پایا تھا کہ وہ لپک کر پلندہ اٹھا لایا۔ میں نے دیکھا تو وہی کاغذ تھے جو میرزا صاحب نے مجھے دفتر آبلوساری کے برآمدے میں دکھلانے چاہے تھے اور جو مجددا صاحب کی مکمل سزا اور دواؤں کے تبادلوں پر مشتمل تھے۔

مجھے یقین ہے کہ میرزا صاحب پولیس کے چنگل سے صحیح سلامت نکل آئیں گے اور خدا نے زندگی رکھی تو ایک بار ان سے پھر ملاقات ہوگی۔

(بشکریہ ریڈیو پاکستان۔ لاہور)

پروانۂ جانباز ——— (بقیہ صفحہ ۴۱)

کبھی پنجہ تو کبھی صرف پھریرا دیکھا — کبھی اس سمت کبھی اس طرف آیا دیکھا
کبھی لشکر میں کبھی جانب صحرا دیکھا — کبھی دریا کی طرف جاتا اترتا دیکھا
دیکھتے دیکھتے نظروں سے چھپا، پھر ابھرا
تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ بالآخر ابھرا

زخم کھا کر کبھی جھپٹے تو سنبھل کر جھپٹے — آئے حلقے میں تو حلقے سے نکل کر جھپٹے
روکنے والوں کو اس طرح کچل کر جھپٹے — جیسے غصہ میں کوئی شیر اچھل کر جھپٹے
ظلم کی اٹھتی ہوئی موج میں پھر ڈوب گئے
کبھی نکلے تو کبھی فوج میں پھر ڈوب گئے

پھر وہی شام کے ابر اور گھٹائیں خونریز — پھر وہی صورت حالات وہی رستاخیز
پھر وہی غلغلۂ فوج قیامت انگیز — پھر وہی وقفۂ مخدوش وہی رنگ ستیز
کبھی بڑھتا تھا علم اور کبھی رک جاتا تھا
تھرتھراتا تھا کبھی اور کبھی جھک جاتا تھا

ان کا یہ حال یہاں اور یہ عالم تھا وہاں — جب کہ عباس چلے تو سوئے افواج گراں
ٹکٹکی باندھے ہوئے تھے شہ والا نگراں — ذہن نظریں تھیں لرزاں تھا علم سبز جہاں
جیسے جیسے کہ نشاں دور ہوا جاتا تھا
گرد و پیش آنکھ سے مستور ہوا جاتا تھا

دل لگائے ہوئے اس طرح سے تھے شاہ ہدیٰ — رشتۂ جاں سے علم باندھ لیا تھا گویا
تھرتھرایا وہ اُدھر اور یہاں دل کانپا — گر گئے خاک پہ جس وقت کہ دیکھا گرتا
اٹھ کے دیکھا تو اندھیرا ہے جہاں سورج تھا!
تیرہ و تار زمانہ تھا، نہاں سورج تھا!

دل تھا عباس میں جیسے ہوئے تھے بیکل یہاں — کبھی کچھ بڑھ گئے آئے کبھی پھر خیمے کے پاس
کبھی امید ہی امید کبھی یاس ہی یاس — کبھی یہ دل میں بڑی دیر لگائی عباس
سخت تشویش بھی حالت تھی عجب حضرت کی
کبھی عباس کی تھی فکر، کبھی امت کی

سالارِ قوم —— بقیہ صفحہ ۱۳

قائدِاعظمؒ کے ساتھ ناشتے میں شریک ہوئے۔ رات کو جاگنے کی وجہ سے ہمیں چند لمحے دیر ہوگئی تھی اور ہم نے معافی چاہی، میرے ساتھی صاحب بہت ذات شریف نکلے انہوں نے نہایت شرارت آمیز انداز میں قائدِاعظمؒ کے سامنے رات کی روداد سنا دی اور کہا یہ رات ایک جرمن عورت کے ساتھ رقص میں مشغول تھے۔ قائدِاعظمؒ نے جرمن کا لفظ سنتے ہی کہا۔ اچھا مطلوب تو کل رات تم دشمن کے ہاتھوں میں تھے!

یہ ایک عام تجربہ کی بات ہے کہ کس طرح بڑے بڑے پیچیدہ قضیے جن کا حل بظاہر ناممکن نظر آتا ہے۔ ایک شوخ اور برمحل فقرے سے یکدم حل ہو جاتے ہیں۔ گویا ان میں کوئی دشواری ہی نہ تھی۔ قائدِاعظمؒ کی تقریر و تحریر اور عام گفتگو ایسے فقروں سے بھری پڑی ہے۔ انہوں نے کتنے ہی معرکے صرف تیغ زبان سے سر کئے۔ اور ان کا سب سے بڑا کارنامہ، قیامِ پاکستان جس نے ان کو غیر فانی حیثیت عطا کر دی ہے، ان کے گوناگوں فضائل و کمالات کے علاوہ ان کی شوخیٔ بیان کا کچھ کم مرہونِ احسان نہیں۔ اس کے ذکر سے وہ دلآویز ہستی وہ گوشت پوست کا انسان بھی ہمارے سامنے آجاتا ہے جس نے قائدِاعظمؒ کو صحیح معنوں میں کامیاب بنایا۔

"مصورِ فطرت" —— بقیہ صفحہ ۴۲

کی ستم ظریفیوں کی مثال ہے جو بہت مقبول ہے مگر اس کی نقل نہ ہو سکی۔ اردو کے بعض نئے افسانہ نگاروں نے خاکوں کی صورت میں افسانے ضرور لکھے لیکن ایسی کوئی چیز نہیں لکھی گئی جو اس تحریر میں جو فضا ہے وہ اپنی جگہ خود ایک دنیا ہے۔ دو ٹکڑے دیکھئے۔

"سنتی ہے، اس کاغذی گھاس پر آئی ہے چنبری چولا بیچنے
لائی ہے، تو میری بات مان، یہ چولا من کے صابن سے دھلے گا،
جس کو پریم کی بھٹی میں چڑھاؤں گا۔ نیچے آگ جلاؤں گا۔"

— "یثرب نگری کے چوہدری نے کہا جو سارے سنسار کے میلے تنوں کو دھونے آیا تھا۔ اسلام غریبوں سے شروع ہوا اور پھر غریبوں میں آجائے گا، تو بس ہم تم دونوں اپنے چوہدری کے بین پر مگن ہیں۔ اسلام ہم میں ہم اسلام میں۔ اور سب امیر پیشہ والے من و تو کے کلام میں۔

چھوا چھو، چھوا چھو، چھوا چھو
چھوا چھو، چھیو رام، چھیو، چھیو"

یہ مضمون اردو کے صوفیانہ ادب کا نمونہ ہے۔ یہاں حرف دھوبیوں کی زبان ہی نہیں، ان کا طریقۂ اظہار ہی نہیں بلکہ ان کی صحیح نفسیات اور فطرت کا صحیح مطالعہ ہے۔ خواجہ صاحب نے ان تحریروں سے اردو زبان کی عوامی حیثیت کو اجاگر کیا ہے۔ دوسری طرف رسالتمآب سے گہری محبت نمایاں ہے۔ یہ سادگی اور خلوص مسدس حالیؔ کے سوا بہت کم ملے گا۔ —— خواجہ حسن نظامی اپنے خلوص سے الفاظ میں ایک کیمیاوی سا تغیر پیدا کر دیتے ہیں۔ "اسلام میں"۔ "من و تو کے کلام میں"۔ یہ آہنگ، یہ صوتی تاثر اور سلیس نثر میں اس درجہ آسانی سے تماثل ترکیب کا استعمال کہ زبان دوس نہ ہو حسن نظامی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ حسن نظامی نے یہ گر بلاغت کی کتابوں سے نہیں سیکھا بلکہ دلی کے گلی کوچوں میں سیکھا تھا۔

بچپن میں خواجہ نے ملکہ وکٹوریہ کا سکہ دیکھ کر اپنی امی سے کہا تھا۔ "امی! میری صورت کا بھی پیسہ بنوا دو"۔ ان کی امی تو اپنے بیٹے کی یہ تمنا پوری نہ کر سکیں لیکن خود خواجہ نے اردو نثر کی ٹکسال میں اپنی صورت کا ایک سکہ ڈھالا۔ اور یہ سکہ ہمیشہ رائج الوقت رہے گا کیونکہ اردو عوامی زبان ہے اور عوامی زبان ہی بن کر زندہ رہ سکتی ہے۔

تلاش بقیہ صفحہ ۴۸

مجھے خیال آیا وہ لوگ نہ جانے کس جستجو میں گھر سے نکلے تھے اور ہمارے ساتھ آ ملے تھے۔ ہم شٹ پونجیوں کی تلاش فن کے لئے تھی اور ان کی تلاش برائے زندگی ہم پایاب پانی میں تھے اور وہ گہرے پانیوں کی تلاش میں نکلے تھے۔ مجھے معلوم نہیں وہ ان پانیوں میں ڈوبے یا تیرے۔

سکریٹری کسی دن کوئی خبر لائے تو لائے کیونکہ میری اطلاع کے مطابق اس نے بھی ایک دفعہ مس سلطان کے چھوٹے نیچے کو بوٹ خرید کر دئے تھے۔

ماہ نو میں مطبوعہ مضامین نظم و نثر دوسرے جرائد میں نقل کئے جا سکتے ہیں بشرطیکہ "ماہ نو" کا حوالہ دیا جائے۔

"ماہ نو" میں ریویو کے لئے مطبوعات کی دو کاپیاں ارسال فرمائیں۔ (ادارہ)

"ماہ نو" میں مضامین کی اشاعت کے متعلق شرائط

۱۔ ماہ نو میں شائع شدہ مضامین کا مناسب معاوضہ ادا کیا جائے گا۔

۲۔ مضامین بھیجتے وقت مضمون نگار صاحبان یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کیلئے کسی اور رسالہ یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا۔

۳۔ ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر حوالہ جات دینے ضروری ہیں۔

۴۔ ضروری نہیں کہ مضمون وصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔

۵۔ مضمون کے قابلِ اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

۶۔ ایڈیٹر مسودات میں ترمیم کرنے کا مجاز ہوگا۔ مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

مغربی پاکستان

ہماری مطبوعات

ثقافت پاکستان

انتخاب کلام ۔ مسلم شعرائے بنگال

عبداللہ

مشرقی بنگال کا پوتھی ادب

اکتوبر ۱۹۵۵ء

جوش ملیح آبادی　غلام عباس　آغا محمد اشرف　قیوم نظر

ناصر کاظمی　روش صدیقی　ضمیر جعفری　انور عنایت اللہ

عوامی صنعت گری کی نمائش
ڈھاکہ

جلد ۸ شمارہ ۷ اکتوبر ۱۹۵۵ء

مدیر: رفیق خاور
نائب مدیر: ظفر قریشی

پاکستان اور ہندوستان میں سالانہ چندہ پانچ روپے آٹھ آنے۔ فی کاپی پاکستان اور ہندوستان میں آٹھ آنے

اپنی باتیں

شہیدِ ملت لیاقت علی خاں اُس جذبۂ حب الوطنی کا ایک عظیم مظہر تھے جس نے پاکستان کو جنم دیا تھا۔ وہ ان نازک ترین لمحات میں بھی قوم کی خدمت کے لئے سینہ سپر رہے جب آزادی کی جنگ جاری تھی اور اس زمانے میں بھی پیش پیش رہے جبکہ ہماری نوزائیدہ مملکت کو اندر اور باہر دونوں طرف سے نہایت پُرآشوب حالات کا سامنا تھا۔ چنانچہ اس مردِ غازی نے، جو تمام تر جذبۂ خدمت سے سرشار تھا، اپنے وطنِ عزیز ہی کی خاطر جامِ شہادت نوش کیا اور اپنے خون کے بے بہا قطروں سے کشتِ وطن کی آبیاری کی۔ اسی لئے ہماری آنکھیں آج بھی ان کے لئے گریہ ساماں ہیں اور ہمارے دل ان کی یاد سے معمور ہیں۔ ان کی بلند شخصیت، ان کے گوناگوں اوصاف اور عظیم کارنامے اس عظیم تر ہیئت کا جزو بن گئے ہیں جسے "پاکستان" کہتے ہیں۔ اسی لئے ان کا نقش اس نگارخانے میں ہمیشہ آویزاں رہے گا۔

ڈھاکہ میں وقتاً فوقتاً مصوری کی نمائشیں منعقد ہوتی رہی ہیں جن سے ظاہر ہے کہ یہ فن وہاں شائستہ حلقوں میں روز بروز کس قدر مقبول ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ "ڈھاکہ آرٹ کونسل" کے بعد "بلبل اکاڈمی آف فائن آرٹس" کا قیام فنونِ لطیفہ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا ثبوت ہے۔ فنون صرف خواص ہی کی ملکیت نہیں۔ عوامی آرٹ شعوری فلسفیانہ اقدار سے معرا ہونے کے باوجود ایک ادائے خاص سے خالی نہیں ہوتا کیونکہ یہ درحقیقت ساری قوم کے دل و دماغ کی پیداوار ہوتا ہے۔ اور بسا اوقات عام سطح سے اُبھر کر ادب و فن میں ایک نئی روح پھونک دیتا ہے۔ جیسے کہ یادش بخیر بلبل چودھری مرحوم نے عوامی رقص کو نمایاں کر کے رقاصی کے فن میں جان ڈال دی تھی۔ کچھ عجب نہیں کہ عوامی فنون کی اس نمائش سے بھی ایسے ہی نتائج رونما ہوں جن کے کچھ نمونے اس شمارے میں پیش کئے جا رہے ہیں۔

اردو شاعری کی نئی اصناف میں سے ایک "سانیٹ" ہے۔ دیگر نئی اصناف — "نظمِ آزاد"، "ڈرامائی مونولاگ" وغیرہ کی طرح اس کی ابتدا کے بارے میں کچھ اختلاف موجود ہے۔ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی مرحوم کا دعویٰ تھا کہ اردو میں پہلا سانیٹ انہوں نے لکھا، لیکن ان سے پہلے کچھ سانیٹ مولوی عظمت اللہ مرحوم لکھ چکے تھے جن میں ایک فقرے کو کئی کئی مصرعوں پر پھیلانے کا التزام کیا گیا تھا، گو وہ بھی قافیہ سے آسان نہ گزر سکے۔ سانیٹ نویسی کا مستقل سلسلہ "راوی" (گورنمنٹ کالج۔ لاہور) سے شروع ہوا، جس کے کسی شمارہ میں ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ، انگریزی کا ایک سانیٹ شائع ہوا تھا۔ اس کا ترجمہ ایک اور شاعر نے یوں کیا تھا ؎

فرصتِ لمحہ کاش اتنی بڑھے

دن سے مہ، مہ سے سال ہو جائے (وغیرہ)

(یہ سانیٹ انگریزی سانیٹوں کی طرح ۱۴ مصرعوں پر مشتمل تھا)

ن۔ م۔ راشد اسی درسگاہ میں تعلیم پا رہے تھے جہاں سے یہ رسالہ شائع ہوتا ہے۔ اس زمانے میں انہیں "ہیئت" کے تجربات کا شوق نیا نیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس سراپا ہیئت صنف کو اپنا لیا اور اس کا نام "چوکور" رکھا جیسے کہ DRAMATIC MONOLOGUES کا نام "ڈرامائی واحد کلامیاں" رکھا تھا۔ اختر شیرانی بھی ہیئت کے دلدادہ تھے۔ انہیں سانیٹ بہت پسند آیا اور انہوں نے اس کثرت سے سانیٹ لکھے کہ یہ صنف انہی سے منسوب ہو کر رہ گئی۔ ایسے بعض حالات اور روایات عام طور پر نامعلوم مگر بیان کے لائق ہیں۔ جن حالات میں نئی اصناف ظہور پذیر ہوئیں ان کی وضاحت دلچسپ بھی ہوگی اور ضروری بھی ہے۔ اس شمارہ میں جناب قیوم نظر نے "اردو شاعری میں ہیئت کے تجربات" کے زیرِ عنوان دو نئی اصناف سانیٹ اور کینٹو کی اردو میں ترویج اور ترقی پر روشنی ڈالی ہے۔ امید ہے کہ ہیئت کے دیگر تجربات بالخصوص نظمِ آزاد کا بھی اسی طرح محرمانہ مطالعہ کیا جائے گا اور ان کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ متعلقہ روایات کی بھی چھان بین کی جائے گی ؂

اردو کے غیر معروف ناول

(جنونِ انتظار یعنی فسانۂ مرزا رسوا) (۲)

غلام عباس

ناول نگاری کی تکنیک کا ایک اسلوب یہ بھی ہے۔ کہ ناول نگار قصے میں زیادہ سے زیادہ تاثر پیدا کرنے اور اسے زیادہ سے زیادہ واقعیت کا رنگ دینے کے لئے ناول کے شروع میں اپنی ملاقات ہیرو، ہیروئن یا کسی اور اہم کردار سے کراتا ہے۔ اور پھر سارا قصہ اسی کی زبان سے بیان کر دیتا ہے۔ ناول لکھنے کا یہ طریق انیسویں صدی کے وسط کے یورپی ادب بالخصوص فرانسیسی حقیقت پسند ناول نویسوں کو بہت مرغوب تھا۔ ہمارے ہاں اردو میں مرزا محمد ہادی رسوا کا مشہور ناول "امراؤ جان ادا" اس تکنیک کی بہت عمدہ مثال ہے۔

اس ناول کے آغاز میں مصنف کی ملاقات ایک مختصر سی مجلس مشاعرہ میں ہیروئن سے ہوتی ہے۔ دونوں لکھنؤ کے رہنے والے، موزوں طبع اور سخن فہم ہیں۔ رفتہ رفتہ ربط بڑھتا ہے اور بالآخر امراؤ جان ادا اپنی سرگزشت مرزا رسوا کو سناتی ہے۔ جسے وہ قلمبند کر لیتے ہیں۔

یہ ناول انیسویں صدی کے اواخر میں (غالباً ۱۸۹۹ء میں) لکھنؤ میں شائع ہوا تھا۔ اسی زمانے میں ایک مختصر ناول "جنونِ انتظار یعنی فسانۂ مرزا رسوا" بھی چھپا تھا۔ جس کی مصنفہ کا نام امراؤ جان ادا تھا۔ اس کتاب میں مرزا رسوا کا افسانہ عشق بیان کیا گیا تھا۔ اور مصنفہ کا انداز تحریر، جیسا کہ اس کے دیباچے سے ظاہر ہوتا ہے، کچھ اس قسم کا تھا۔ کہ مرزا صاحب آپ نے جو میرے حالات چھاپ کر مجھے رسوا کیا ہے۔ میں بھی آپ کا کچا چٹھا چھاپ کر اس کا بدلہ لیتی ہوں۔

ایک مدت تک میں اس کتاب کو ایک قسم کی "ادبی شوخی" ہی تصور کرتا رہا۔ میرا خیال تھا۔ کہ بیچاری امراؤ جان ادا کے خلاف، خواہ وہ ایک افسانوی کردار ہی کیوں نہ ہو، مصنف اور ناشر نے ایک طرح کی "سازش" کر کے اپنا اپنا مقصد حل کیا ہے۔ یعنی یہ کہ مرزا رسوا نے اس بہانے اپنے افسانۂ عشق کو خود الم نشرح کیا ہے اور ناشر نے کتابوں کی فروخت کے لئے اسے اشتہار بازی کا ذریعہ بنایا ہے۔

حال ہی میں "نقوش" کے شخصیات نمبر میں جناب علی عباس حسینی نے مرزا رسوا کے جو حالات تحریر کئے ہیں، اُن میں میری نظر جب ان الفاظ پر پڑی:-

"امراؤ جان ادا سے (مرزا رسوا کی) ملاقات بڑھی تو اُس کی زبانی زنانِ بازاری کے تجربات و طرزِ معاشرت کا خاکہ ایک ناول کی صورت میں پیش کیا۔"

تو مجھے امراؤ جان ادا کے بارے میں اپنا نظریہ بدلنا پڑا۔ یہ الفاظ اس قدر واضح اور راوی۔ کے لکھنے والے ملک کے مشہور ادیب جناب حسینی ایسے ثقہ راوی ہیں کہ ادا کی شخصیت کے حقیقی ہونے میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ اگر صاحب موصوف اس سلسلے میں مزید معلومات بہم پہنچائیں، تو مرزا رسوا کے مداحوں پر، جن میں یہ خاکسار بھی شامل ہے، ان کا بڑا کرم ہوگا، کیونکہ اس طرح انہیں مرزا رسوا کو، بہ حیثیت ایک فن کار اور بہ حیثیتِ ایک انسان زیادہ قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع مل سکے گا۔

اس تمہید کے بعد اب میں اصل کتاب کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ میں ابتدا ہی میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ اس کتاب کی ادبی حیثیت کچھ زیادہ نہیں ہے۔ البتہ تاریخی اور سوانحی حیثیت سے یہ بہت اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اس سے ہمیں مرزا رسوا کی زندگی کے بعض ایسے حالات مل جاتے ہیں جو کسی تذکرے یا تاریخ ادب اردو میں نظر نہیں آتے۔ ان حالات کا تعلق مرزا رسوا کے اس عشق سے ہے، جو انہیں ایک فرنگن سے ہوا تھا۔ اور جس کا ذکر جناب علی عباس حسینی

نے بھی اپنے "نقوش" والے مضمون میں کیا ہے۔ مرزا رسوا کی نرگس سے زیادہ خوش قسمت ہے۔ کہ امراؤ جان آدا کی بدولت اُس پر سے گمنامی کا وہ پردہ اٹھ گیا ہے جو مرزا غالب کی ڈومنی پر ابھی تک پڑا ہوا ہے۔

"جنونِ انتظار یعنی فسانہ مرزا رسوا" ایک مختصر سی کتاب ہے۔ سائز ۱۸×۲۲/۸ اور صفحات کی تعداد چھپن۔ اس کا تقریباً نصف حصہ نثر میں ہے۔ اور نصف مثنوی کی صورت میں۔ شروع میں مصنفہ نے ایک دلچسپ دیباچہ بھی لکھا ہے جس میں وہ کہتی ہیں۔

"ناظرین! مرزا رسوا صاحب نے جو میری سرگزشت تحریر کی ہے، وہ غالباً آپ کی نظر سے گزری ہو گی۔ خیر میں اب نہیں کہتی کہ اچھا کیا یا بُرا۔ مگر پہلے سے اس کا اقرار نہ تھا۔ اس لئے کسی قدر ملال ہوا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری آوارگی کا افسانہ چھاپ کر شائع کیا جائے گا تو شاید میں ہرگز اس کے بیان کرنے پر راضی نہ ہوتی۔ واقعی مرزا صاحب کا چکمہ چل گیا۔ لطف یہ ہے کہ آپ فرماتے ہیں میں نے تجھ پر احسان کیا۔ اگر درحقیقت یہ احسان ہے۔ تو میں بھی ان کے ساتھ اس کا عوض کرتی ہوں ؎

دُشنام دیکے مجھ کو بہت خوش نہ ہو جیئے
کیا کیجئے گا آپ جو میری زباں کھُلی

جب سے آپ نے میری سوانح عمری کے شائع کرنے کا قصد کیا۔ مجھے بھی کد ہو گئی تھی۔ کہ آپ کے بعض اسرار سے دنیا کو واقف کراوں۔ اس کے لئے مجھے خاص اہتمام کرنا پڑا۔ آپ کا ایک ملازم خاص جس کے نام و نشان سے میں مطلع نہیں کر سکتی مجھ سے موافق ہو گیا۔ ایک دن آپ ایک دوست کے گھر پر مشاعرہ میں تشریف رکھتے تھے۔ بندی نے وزنا گاڑی کرایہ کی۔ اور آپ کی کوٹھی پہنچی۔ آپ کا آدمی جو مجھ سے مل گیا تھا اس نے چپہ چپہ مجھے دکھا دیا۔ اسی آدمی کے ذریعے سے آپ کی ایک کتاب جس میں ایک تصویر اور بہت سے خطوط اور ایک ناتمام مثنوی "نالۂ رسوا" میرے ہاتھ آ گئی۔ کچھ حالات بعض دوستوں سے معلوم ہوئے۔ غرض کہ ان سب واقعات کو میں نے بطور خود لکھ کے چھپوا لیا جس دن مرزا صاحب نے میری سوانح عمری شائع کی۔ اور ایک جلد میرے ملاحظہ کے لئے بھیجی، اسی دن میں نے اس مختصر تحریر کی ایک جلد ان کی خدمت میں روانہ کی یقیناً مرزا صاحب خوش تو ہوئے ہوں گے مگر کیا کر سکتے ہیں۔

فدویہ

یکم اپریل ۱۸۹۹ء امراؤ جان آدا"

اب میں اختصار کے ساتھ مگر قصے کا تسلسل قائم رکھتے ہوئے "جنونِ انتظار" کے جستہ جستہ اقتباسات پیش کرتا ہوں۔

"مرزا رسوا صاحب کی وجاہت اور طلاقتِ لسانی میں غضب کی دلآویزی ہے جس محفل میں بیٹھ جاتے ہیں عورت مرد سب ان ہی کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ روتے آدمی کو ہنسا دینا ان کی ایک ادنیٰ بات ہے۔ خدا کی دی ہوئی ذہانت پر طُرّہ علمیت اور تجربہ کاری۔ ان اوصاف نے ان کے جوہرِ ذاتی کو اور جلا دیدی ہے۔ طبیعت کی موزونی، شوقِ شعر و سخن کو حسن پرستی کے مذاق نے چمکا دیا ہے۔ ان سب اوصاف کے ساتھ مزاج میں کسی قدر سنک ہے۔ بعض طبیبوں کی یہ رائے ہے کہ دشمنوں کو جنون کے دورے پڑتے ہیں۔ کسی کو یہ خیال ہے۔ کہ آپ کو پریوں کی تسخیر کا شوق ہے غرضکہ کچھ نہ کچھ اسرار ضرور ہے۔

آپ جہاں رہتے ہیں اس کو وحشت آباد کہنا چاہیئے۔ لکھنؤ سے دو کوس کے فاصلے پر اس سڑک کے قریب جو بوہے کے پل سے نواب گنج کو جاتی ہے۔ ایک باغ کی مختصر چار دیواری نظر آتی ہے۔ اس کے چاروں طرف کوسوں تک میدان ہے۔ کہیں آبادی کا نام و نشان نہیں۔ یہاں آپ مع دو تین ملازموں کے رہتے ہیں۔ اس باغ کے وسط میں ایک چھوٹی سی کوٹھی بہت خوشنما بنی ہوئی ہے۔ کوٹھی کے سامنے تھوڑی دور پر ایک پختہ گول چبوترا ہے۔ اس کے گرد چمن بندی ہے گرمیوں کے زمانے میں یہاں بڑی خنکی ہوتی ہے۔ کیونکہ کٹی سقے متواتر پانی چھڑکا کرتے ہیں۔ مرزا صاحب دوپہر کو اکثر یہیں تشریف

رکھتے ہیں۔ فکرِ اشعار کے لئے یہ مقام بہت ہی مناسب ہے۔ کوٹھی اندر سے خوب سجی ہوئی ہے۔ اس کے ایک کمرے میں مرزا صاحب خود آرام کرتے ہیں۔ باقی اور کمرے مقفل رہتے ہیں۔

کوٹھی کے سامنے ایک چھوٹا سا چھپر پڑا ہے۔ اس کے چاروں طرف لوہے کے تاروں کی جالی ہے۔ اس میں طرح طرح کے آلات نصب ہیں۔ آدمی کی زبانی معلوم ہوا کہ ان کے دیکھنے سے گرمی، سردی، آندھی مینہہ زلزلے وغیرہ کے حالات معلوم ہو جاتے ہیں۔ باغ کے ایک طرف مجھ کو ایک پختہ بہت گہری باؤلی دکھائی گئی۔ اس پر لوہے کے ستونوں سے ایک بہت اونچا برج بنا ہوا ہے۔ اس باؤلی اور برج میں نیچے سے اوپر تک اندھیرا گھپ ہے۔ دن کو لالٹین جلا کے جانا ہوتا ہے۔ برج کی چھت میں جا بجا سوراخ ہیں۔ ان سوراخوں میں سے دن کو ستارے نظر آتے ہیں۔ اس باؤلی کے قریب ایک چھوٹی سی پختہ کوٹھری ہے اس میں کئی بڑی بڑی دُوربینیں، دو کرے اور کچھ اور سامان رکھا ہوا ہے جسے میں نہیں سمجھ سکتی۔ مثنوی "نالۂ رسوا" میں مرزا صاحب ان صاحب کے حال میں جن کی یہ کوٹھی اور باغ ہے۔ اس طرح تحریر فرماتے ہیں: -

ایک صاحب تھے پہلے اس میں مقیم   صاحبِ علم اور عقیل و فہیم
شوق تھا ان کو علم و حکمت سے   ذوق تھا نکتہ ہائے فطرت سے
ایک لڑکی تھی اُن کی حور لقا   حسن میں مہر و ماہ سے بھی سوا
کیا کہوں تجھ سے کیسی صورت تھی   لے یہ تصویر ایسی صورت تھی

یہ تصویر خوش قسمتی سے ہمیں مل گئی تھی۔ مگر مرزا رسوا صاحب نے باصرار ہم سے واپس لے لی۔ ورنہ اس کی نقل ہم ضرور ہی شائع کرتے۔

دب و لہجہ میں اُس کے سوا اعجاز   برق سے بڑھ کے شعلۂ آواز
اس پہ طرہ کمالِ موسیقی   دل سے محوِ خیالِ موسیقی
کسی اُستاد کی سکھائی ہوئی   دلِ کافر میں لے سمائی ہوئی
ان کے دادا کا تھا فرانس وطن   اور نانا تھے ساکنِ لندن
ہوئے ماں باپ ہند میں پیدا   دل سے اس سرزمین کے تھے شیدا
لکھنؤ میں یہ خود ہوئیں پیدا   تھا یہی شہر جائے نشو و نما
ان کی دایا بھی لکھنؤ کی تھیں   ان کی آیا بھی لکھنؤ کی تھیں

بولتی تھیں زبان اردو صاف   کس قدر با محاورہ شفاف
لکنت ان کی زباں میں ہو کیا دخل   گنجلک انکے بیاں میں ہو کیا دخل

مرزا رسوا اپنے اور مس صاحبہ کے تعلقات کے وجوہ اس طرح تحریر کرتے ہیں:

میرے عموئی نامدار و غیور   جو کہ ہیں سارے شہر میں مشہور
فوج شاہی میں تھے کمان افسر   ان کے احساں تھے ان کے والد پہ
غدر میں اپنے گھر میں کر کے نہاں   دشمنوں سے بچائی ان کی جاں
گو کہ وہ معرضِ خطر میں رہے   مگر آرام سے یہ گھر میں رہے
عورتوں میں بڑھی ملنساری   مدتوں تک یہ رسم تھا جاری
میم صاحب کبھی یہاں آئیں   کبھی میری چچی وہاں جائیں
آدمی روز آتے جاتے تھے   حصے بکرے بھی جاتے آتے تھے
یہ سویاں پکا کے بھیجتی تھیں   عید گھر میں منا کے بھیجتی تھیں
باغ سے اُن کے پھول آتے تھے   ان کی بیری کے بیر جاتے تھے

مرزا رسوا اور مس صاحبہ آپس میں کھیلا کرتے تھے۔ بچپنے ہی میں محبت دلوں میں اثر کر گئی تھی۔ چنانچہ اس واقعہ کو مرزا صاحب نے اس طرح موزوں کیا ہے:

جس زمانے میں تھا یہ رسم و راہ   جن دنوں تھا یہ چاہتوں کا نباہ
سوفیہ سے ہوئی مجھے الفت   بڑھ گئی رفتہ رفتہ کچھ وحشت
بڑھ گیا ارتباط حد سے سوا   ہو گیا اختلاط حد سے سوا
دلِ نازک کا خون ہو ہی گیا   رفتہ رفتہ جنون ہو ہی گیا

مگر یہ محبت یک طرفہ نہ تھی بلکہ:

بسکہ یہ ربط جانبین سے تھا   کل اسے تھی نہیں ہی چین سی تھا
عشق صادق تھا پاک الفت تھی   مجھ سے بڑھ کر اسے محبت تھی

اس کے بعد ان دونوں خاندانوں پر تباہی آئی۔ مرزا رسوا کے چچا نے انتقال کیا۔ اور اس کے چند ہی روز کے بعد چچی بھی مر گئیں۔ اور اُدھر

اسی اثنا میں مر گئے صاحب   اس جہاں سے گزر گئے صاحب
میم صاحب بھی کر چکی تھیں قضا   سوفیہ گھر میں ہو گئی تنہا

مگر مرزا رسوا ماتم پرسی تک کو نہ جا سکے۔ اس لئے کہ سوفیہ کو اب صاحب کے ایک عزیز نے اپنی حفاظت میں لے لیا تھا۔ وہ مرزا رسوا اور ان کے خاندان کے رسم و راہ سے مطلع نہ تھا۔ دوسرے اختلاف قوم و مذہب۔ ان خیالات نے ان کو روکا۔

گو کہ یارائے ضبط مجھ کو نہ تھا   گر ایسا بھی خبط مجھکو نہ تھا
کہ مری وجہ سے وہ ہو بدنام   ایسی باتوں کا تھا بُرا انجام

مس صاحبہ کو ان کے عزیز نے پہاڑ پہ بھیج دیا۔ اور جائداد موروثی کورٹ ہوگئی۔ اس زمانے میں جو کچھ مرزا رُسوا کے دل پر گزری اس کا حال سوا اُن کے یا خدا کے کوئی نہیں جان سکتا۔ نالہ وزاری، بے قراری راتوں کا جاگنا، ستارے گننا، دن بھر منہ لپیٹے پڑے رہنا۔ بھوک کا جاتا رہنا، چہرہ کا زرد اور لبوں کا خشک ہوجانا، چپکے چپکے دل سے باتیں کرنا، ہم نشینوں کی صحبت سے نفرت، دیوانوں کی سیر، عاشقانہ اشعار پڑھنا یا خود موزوں کرنا مگر ان باتوں سے دل کی اصلی حالت کا بیان بہت دشوار ہے۔

چچا کے مرنے کے بعد ان کی کل جائیداد پر ان کی چچا زاد بہن قابض ہوگئی تھیں۔ چچا نے اپنی زندگی میں چاہا تھا کہ اپنی لڑکی کے ساتھ (جو اب جائداد پر قابض ہوئیں) نکاح کردیں مگر آپ نے نہیں معلوم کس وجہ سے انکار کردیا تھا۔ غالباً اس کی وجہ سوفیہ کی محبت ہو۔ مگر اس کا حال ٹھیک معلوم نہیں۔ اتنا جانتے ہیں کہ چچا زاد بھائی بہنوں میں چچا کی زندگی تک بڑا میل رہا مگر جب سے ان کی شادی ہوگئی، وہ محبت بالکل عداوت سے بدل گئی۔ ان کو سب سے بڑھ کے مشکل یہ ہوئی کہ اب رہنے کا ٹھکانہ تک نہ رہا۔ اگرچہ مکان موروثی تھا مگر ان کے والد محجوب تھے۔ اس لئے ان کا کوئی حق اس میں نہ تھا۔ اس زمانہ میں ان کی ایک کھالی بوا گل بنو ان کے کام آئیں۔ انہیں کے پاس یہ رہنے لگے۔ اسکول میں نام لکھوا لیا۔ انگریزی پڑھنا شروع کیا۔

ان کو مدرسہ میں پڑھتے کوئی چھ سات برس گزرے ہوں گے۔ کہ مس صاحبہ کا علاقہ اور جائداد کورٹ سے چھوٹا۔ اور وہ لکھنؤ میں آکر اپنی کوٹھی میں رہنے لگیں۔ مگر نہیں معلوم ان کو کیا ہوگیا تھا کہ نہ جاتا تھا نہ گئے۔ اسی زمانہ میں یہ خط ان کو ملا جس کا ترجمہ لفظ بلفظ یہاں لکھا جاتا ہے:۔

"میرے پیارے دوست۔ واقعی تم بڑے بے مروت ہو۔ ہم پر کیا کیا آفتیں گزر گئیں۔ اور تم نے خبر نہ لی ماں باپ دونوں قضا کر گئے۔ ہم شہر سے کالے کوسوں دُور بھیج دئے گئے۔ برسوں گویا قید ہی رہے۔ تم کو ان باتوں کی خبر ضرور رہتی ہوگی۔ مگر افسوس ہے کہ تم نے ایک پرچہ خط بھی کبھی نہ لکھا۔

مجھ کو تمہارا پتہ معلوم نہ تھا نہیں تو میری طرف سے پہل ہوتی۔ اب آپا کی لڑکی سے جس کا میاں مارٹینیر کالج میں نوکر ہے معلوم ہوا کہ تم وہاں پڑھتے ہو۔ اسی پتے سے تم کو خط لکھا ہے۔ جلد جواب لکھو۔ بلکہ خود آؤ۔ اگر تم میں کچھ بھی انسانیت اور وفاداری کا شائبہ ہو تو ہم سے ضرور ملو۔ ہم اسی قدیم کوٹھی میں رہتے ہیں۔ جہاں لڑکپن کے دنوں میں کھیلا کرتے تھے۔ وہ درخت اب تک موجود ہیں۔ جن پر ہم چڑھ کے چڑیوں کے گھونسلے اُجاڑا کرتے تھے۔ وہ حوض ابھی باقی ہے جس میں گھنٹوں چھپاک چھپیا ہوتی تھی۔ وہ تمہارا ایک دن روٹھ جانا اور کھجور کے درخت کے نیچے مچل کے بیٹھ جانا اور پھر اگر ہی کے کوٹھی میں چلا جانا آج تک آنکھوں میں پھرتا ہے۔

بعض امور کا جو تمہیں خیال ہے، اس کو دل سے دور کرو۔ دوستی میں ایسی نازک خیالیوں سے کام نہیں چلتا۔ کیا تم مجھکو انسان نہیں سمجھتے۔ اگر ایسا ہے تو مجھے تمہاری بدگمانی پر افسوس ہے اور تمہیں مجھ سے معافی مانگنا چاہئے۔ مگر میں تم سے خود معافی مانگتی ہوں کہ میں نے یہ دو تین گلے کیوں لکھے۔ ممکن ہے تم کسی اور وجہ سے نہ آئے ہو۔ بہر طور اب آؤ اور جلد آؤ۔ مجھے تم سے ایک اور ضروری کام ہے جس کا اظہار اس خط میں مناسب نہیں۔

تمہاری لڑکپن کی دوست
سوفیہ"

اس خط کے آنے کا حال مرزا نے اپنی مثنوی نالہ رُسوا میں جس جوش مسرت کے ساتھ تحریر کیا ہے واقعی اس کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ ابتدا ایک ساقی نامہ سے کی ہے:۔

بادۂ مشکبار لا ساقی   میں ہوں اور تو پلا ساقی
اب نہیں تابِ انتظار مجھے   بھر کے دے جام خوشگوار مجھے
آسماں مجھکو دے مبارکباد   کہ ہوا قیدِ غم سے میں آزاد
قاصدِ شوق مژدہ جاں لایا   نامۂ یارِ مہرباں لایا

میں ہوں اب اور آستانِ حبیب   نہ غمِ پاسباں نہ خوفِ رقیب
خانۂ دل سے کلفتیں نکلیں   حسبِ دلخواہ حسرتیں نکلیں
آج گویا کہ ہے برات کی رات   اور ہے انتظار رات کی رات
مژدہ اے دل کہ عید کا دن ہے   مژدہ اے چشم دید کا دن ہے
ضکہ وہ رات پہاڑ ہو گئی مگر
دل سے حیلے ہزار ہا کر کے   رات کاٹی خدا خدا کر کے
صبح ہوتے ہی اپنے بستر سے   ہاتھ منہ دھو کے ہم چلے گھر سے
عازمِ کوئے گلعذار ہوئے   جا کے اس شوخ سے دوچار ہوئے
س صاحبہ دوستانہ طور پر ملیں، میٹھی میٹھی باتیں کیں، گلے شکوے ہوئے اور
ہم کو ہونا تھا شرمسار آخر   ہمیں ٹھہرے گناہگار آخر
کیوں نہ آئے یہ ان سے کیا کہتے   نہ بنا کچھ بجز "بجا" کہتے
س کے بعد مطلب کی باتیں شروع ہوئیں :-
پھر وہ کہنے لگی کہ اے رسوا   تم سے اک مدعا بھی ہے میرا
نفعِ ذاتی پہ ہے نظر سب کی   سچ ہے دنیا ہے اپنے مطلب کی
بات یہ ہے کہ میں ہوں عورت ذات   اور علاقہ کی فکر ہے دن رات
میرے لائق یہ کاروبار نہیں   غیر کا مجھکو اعتبار نہیں
اپنے ذمے یہ کام لو مجھ سے   اختیارات عام لو مجھ سے
نوکری کا نہ سلسلہ سمجھو   اس کو اپنا معاملہ سمجھو
سن کے اس مہ لقا کی یہ گفتار   چاہتا تھا کہ میں کروں انکار
کہہ رہا تھا اُدھر دلِ گمراہ   ماننا ہی پڑے گا خواہ مخواہ
دل طرفدار ہو گیا اس کا   مدعی یار ہو گیا اس کا

خلاصہ یہ کہ مرزا رسوا کے نام مختار نامہ ہو گیا۔ چند روز لکھنؤ میں رہے پھر علاقہ پر گئے۔ یہاں ناتجربہ کاری کی وجہ سے ان کو بڑی دقتیں پیش آئیں، مگر دل میں جس بات کا ارادہ اور شوق ہوتا ہے اس کی کوئی نہ کوئی راہ نکل ہی آتی ہے۔ مرزا صاحب کا نوکر نوروز علی کسانی کے کام میں بہت ہوشیار تھا۔ لکھنؤ سے اُسے بلوا کے ضلع دار مقرر کیا۔ اس نے قرار واقعی بندوبست کیا۔ رفتہ رفتہ یہ خود بھی واقف کار ہو گئے۔ کام چلنے لگا۔ کئی سال تک یہی حال رہا۔

مرزا رسوا اور مس سوفیہ کے تعلقات ویسے ہی تھے جیسے انگریز منگیتروں کے سُننے جاتے ہیں۔ انگوٹھیاں بدل گئی تھیں۔ چاہ اور نباہ کے اقرار ہو چکے تھے۔ ظاہر میں بالکل انداز عاشق معشوق بلکہ میاں بیوی کا تھا۔ دلوں میں پاک بازی تھی۔ آتشِ شوق کے شعلے بلند تھے۔ دونوں بے تاب، دونوں بے قرار۔ صبر کا امتحان، ضبط کی آزمائش۔

اس اثنا میں مس صاحبہ نے بمبئی جانے کا ارادہ ظاہر کیا، مرزا صاحب نے ساتھ چلنے کے لئے ضد کی۔ آخر انہیں بھی ہمراہ لیا۔ دونوں خوشی خوشی بمبئی روانہ ہوئے۔ وہاں جا کے ہوٹل کے دو کمرے کرائے پر لئے۔ بمبئی کی خوب سیریں ہوئیں۔ صبح سے شام تک گشت کرنا، راتوں کو تھیٹروں میں جانا۔ غرض کہ ایک ہفتہ تک خوب جشن کیا۔ ایک دن سرِ شام سے مس صاحبہ نے کہا۔ میرے سر میں درد ہے آج میں تماشہ میں نہ جاؤں گی۔ کھانے والے سے فراغت کر کے نو بجے سونے کے کمرے میں چلی گئیں۔ مرزا رسوا بھی اپنی جگہ سو رہے۔

صبح کے وقت دونوں ایک ہی ساتھ چائے پیا کرتے تھے۔ آج معمول سے زیادہ دیر ہو گئی مس صاحبہ نہ برآمد ہوئیں۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ مرزا رسوا نے انتظار کیا۔ پھر جا کے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کوئی آواز نہ آئی۔ آخر دروازہ کھولا اندر گئے۔ دیکھا مس صاحبہ ندارد ہیں، کمرہ خالی پڑا ہے۔ مرزا رسوا کی آنکھوں میں اندھیرا سا آ گیا۔ ہوٹل کے نوکروں سے پوچھا معلوم ہوا مس صاحبہ نے رات کو گیارہ بجے گاڑی مانگی تھی سوار ہو کے کہیں گئیں۔

اب تو مرزا رسوا صاحب کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ کیوں گئیں کہاں گئیں۔ اسی شش و پنج میں تھے کہ لکھنے کی میز پر ایک لفافہ مس صاحبہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ان کے نام کا ملا۔ جلدی جلدی لفافہ کھولا۔ لکھا تھا :

میرے پیارے تم میرے دفعتہً بے اطلاع غائب ہو جانے سے ملول نہ ہونا۔ بات یہ ہے کہ بمبئی میں میں صرف سیر و سیاحت کے لئے نہیں آئی تھی ایک خاص مطلب تھا۔ مگر اس کا اظہار تم سے مناسب نہ تھا۔ مجھے لکھنؤ میں معلوم ہوا تھا کہ میری پھوپی جو پیرس میں رہتی تھیں کروڑوں کی جائداد چھوڑ کے انتقال کر گئیں۔ سوا میرے ان کا کوئی وارث نہیں ہے۔ ان کے مختار کے خط سے معلوم ہوا کہ وصیت نامہ بھی میرے نام کا کر گئی ہیں، مگر اس کے لئے مجھ کو پیرس جانا ضرور ہے۔

میں تمہیں اپنا شوہر اور لکھنؤ کو اپنا وطن سمجھتی ہوں۔ مگر اس معاملے کے لئے میرا جانا ضروری تھا تم کو ساتھ نہ لے جانے میں یہ مصلحت تھی کہ ولایت کے لوگ جن میں اکثر میرے دور کے رشتہ کے عزیز بھی ہیں

(باقی صفحہ ۵۹ پر)

اُردو شاعری میں ہیئت کے تجربات

(سانیٹ اور کینٹو)

قیوم نظر

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد جہاں ملک میں معاشی، سیاسی اور سماجی ہر قسم کی تبدیلیاں نظر آنے لگیں وہاں اُردو شاعری نے بھی ایک کروٹ لی۔ اگرچہ یہ کروٹ وضاحت کے ساتھ انیسویں صدی کے آخر بلکہ بیسویں صدی کے آغاز میں نظر آئی، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُردو شاعری کو جدید راستوں پر چلانے کی شعوری کوششیں ۱۸۶۸ء سے ہی شروع ہو چکی تھیں۔ یہ وہ سال ہے جب مولوی اسمٰعیل میرٹھی نے چند انگریزی نظموں کو اُردو نظم میں ترجمہ شائع کیا۔ اسی سال مولانا محمد حسین آزاد نے بھی ایک لیکچر کی صورت میں اپنے اس کام کی بنیاد رکھی جس کو انہوں نے بعد میں حالی کی اعانت اور کرنل ہالرائیڈ کی سرپرستی میں انجام تک پہنچانے کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ اگرچہ حالی اور آزاد کی مثنویاں، بعد میں حالی کے اپنے دیوان کا مقدمہ، اس بیمار شاعری سے نجات دلانے کا شدید اظہار تھا جس کے نتیجے میں بعض شعر ایسے ہوئے تھے تاہم اس کی گرفت اس قدر مستحکم تھی کہ ابھی بات بنائے نہ بنتی تھی۔

اُردو شاعری کا کثیر سرمایہ غزل کی صورت میں ملتا ہے۔ بلکہ جتنی غزلیں اُردو میں لکھی گئی ہیں کسی دوسری زبان میں شاید اس قدر اس کا تمام شعری سرمایہ بھی نہ ہو۔ پھر بھی غزل کی محدود وسعت آج بھی ایسی نہیں کہ اس میں کوئی بڑا شاعر اپنی تمام کائنات خاطر خواہ طور پر پیش کر سکے اور شاید یہی باعث تھا کہ غالب ایسے قادر الکلام شاعر کو بھی ایک صدی پہلے یہ کہنا پڑا ؎

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کیلئے

جب سرسید اور ان کے رفقاء نے ادب کی پرانی اقدار کو بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر بدلنا چاہا، تو سب سے زیادہ جو صنفِ ادب معرضِ بقا میں آئی یا نئے تقاضوں کی چیرہ دستیوں کا نشانہ بنی وہ غزل تھی۔ چنانچہ جب غزل کی چھان پھٹک ایک نئے انداز سے کی گئی تو اکثر ذہین شعرا کو اس کی تنگ دامانی کا شدید احساس ہوا۔ اس تنگ دامانی میں اس کی ہیئت اور روایات کو خاصا دخل تھا۔ غرض بیسویں صدی کے ربعِ اوّل کے آخر تک اگر ایک طرف غزل معتوب رہی تو اس کے ساتھ ساتھ انگریزی شاعری سے اُردو شاعری صراحتاً متاثر بھی ہوتی رہی۔ اس ضمن میں اقبال کی کوششیں نہایت کارگر ثابت ہوئیں۔ جن کے سائے میں جوش ملیح آبادی اور ابو الاثر حفیظ ایسے شعرا بھی اپنے افکار کو نت نئے سانچوں میں ڈھالتے رہے۔ یہ دور تھا ساری بغاوت اور رومانیت کی آغوش میں پناہ لینے کا دور تھا۔ چنانچہ اس دور میں شعراء کو اپنی اس انفرادیت کی تلاش تھی، جس کو ان کے آباء نے قواعد و ضوابط کی پابندی، الفاظ کی تراش خراش، صنائع بدائع اور خارجی شوخی و طرحداری کے پردوں میں گم کر دیا تھا۔ اسی انفرادیت کو پانے کی لگن نے بعض من چلے شعراء کو نئے راستے سجھائے اور اگر ایک طرف عظمت اللہ ایسے نکتہ سنجوں نے اردو شاعری کے سینے کو ہیئت کے بعض تجربوں کی ضیا سے منور کرنا چاہا تو بعض ذہین نوجوانوں نے اس ضمن میں شمعِ شعرِ فرنگ سے مستعار روشنی حاصل کرنے کو مستحسن خیال کیا۔ اس سلسلے میں کئی شعرا کے نام گنوائے جا سکتے ہیں لیکن ن۔ م راشد اور اختر شیرانی کے نام شاعری میں ہیئت کی ایک خاص صنف سے بالخصوص منسلک ہیں۔ ن۔ م راشد کا ذکر تو نظمِ آزاد کے علمبرداروں میں بھی منفرد حیثیت رکھتا ہے، لیکن جب یہ نام اختر شیرانی کے ساتھ آتا ہے تو دھیان ہیئت کے سلسلے میں اُردو میں سانیٹ کے آغاز کی طرف جاتا ہے۔

کشت و کار　　　　　　　　　　عمل : زین‌العابدین

ڈاکٹر تصدق حسین خالد کے کہنے کے مطابق اردو میں نظم آزاد کا آغاز
...نے کیا لیکن اتفاق سے ان کی کہی ہوئی آزاد نظمیں جب چھپیں کہ
...ـد کی آزاد نظمیں چھپ کر لوگوں تک پہونچ چکی تھیں، اور اس
آزاد کا بانی ن۔ م راشد شمار کیا جانے لگا۔ اسی طرح ایک بیان
اردو میں پہلا سانیٹ اگرچہ ن۔ م راشد نے لکھا لیکن جو سانیٹ
...ے سامنے شائع شدہ صورت میں آیا وہ اختر شیرانی کا
...ریوں اُردو میں سانیٹ کے آغاز کا سہرا اختر شیرانی کے
...رہا۔

...نیائے شعر میں سانیٹ کی ابتدا پر اگر غور کیا جائے تو معلوم
...لم کی یہ مخصوص شکل ردیف وقافیہ کے چند در چند تجربات کے
...ی آئی۔ اطالوی زبان میں ان گنت گائی جانے والی چھوٹی
...ظموں نے اسے ایک مستقل صورت دی اور اس میں چودہ اور
...چودہ مصرعوں کا ہونا ضروری قرار پایا۔ یہ چودہ مصرعے بھی دو
...کی صورت میں جلوہ گر ہوئے۔ پہلے بند میں آٹھ مصرعوں کا ہونا اور
...ے بند کا چھ مصرعوں سے ترتیب پانا ضروری قرار دیا گیا۔ چونکہ
...شدید قسم کی پابند صنفِ سخن تھی۔ اسی لئے پہلے آٹھ مصرعوں میں
...، وقافیہ کا بھی اس ترتیب سے آنا لازمی گردانا گیا۔

الف ب ب الف الف ب ب الف

...دوسرے بند یعنی اگلے چھ مصرعوں میں اس ترتیب کا ہونا چنداں
...، نہ تھا۔ زیادہ وضاحت کے لئے اختر شیرانی کے ایک سانیٹ کا
...سنئے جس میں ردیف وقافیے کی یہی ترتیب ملتی ہے :۔

بہارِ حسن کا تو غنچۂ شاداب ہے سلمیٰ
تجھے فطرت نے اپنے دستِ رنگیں سے سنوارا ہے
بہشتِ رنگ و بو کا تو سراپا اک نظارہ ہے
تری صورت سراسر پیکرِ مہتاب ہے سلمیٰ
ترا جسم اک ہجومِ ریشم و کمخواب ہے سلمیٰ
شبستانِ جوانی کا تو اک زندہ ستارہ ہے
تو اس دنیا میں بحرِ حسنِ فطرت کا کنارا ہے
تو اس سنسار میں اک آسمانی خواب ہے سلمیٰ

اطالوی میں یہ صنف پیٹرارک اور دانتے کے ہاتھوں نہایت
...خوش اسلوبی سے پنپی۔ انگریزی میں پہلے پہل وائٹ نے ترجمے کی
صورت میں اس کی کوشش کیا اور پھر سانیٹ کہنے کا شوق اس قدر
بڑھا کہ سولہویں صدی عیسوی کے آخر تک ہر چھوٹا بڑا شاعر اس صنف
میں اپنے خیالات کا اظہار ضروری شمار کرنے لگا۔ لیکن ابتدائی دور میں
انگلستان میں ردیف وقافیہ کی جو صورت ظہور میں آئی وہ یوں تھی،

الف، ب، الف ب، ج د، ج د

یہ آٹھ مصرعوں کا پہلا بند تھا اور دوسرا بند رس رس ص ص کی صورت
میں رہا۔ مثال کے لئے معین احسن جذبی کا ایک سانیٹ، جس کا
عنوان "طوائف" ہے، سنئے۔ اگرچہ اس میں اُس ردیف وقافیہ کے
التزام سے کسی قدر انحراف کیا گیا ہے جس کا ابھی ذکر آیا ہے لیکن
یہ انحراف شاید اسی صنف کے جدید تر تقاضوں کے باعث ہے:

اپنی فطرت کی بلندی پہ مجھے ناز ہے کب
ہاں تری پست نگاہی سے گلہ ہے مجھ کو
تو گرا دے گی مجھے اپنی نظر سے ورنہ
تیرے قدموں پہ تو سجدہ بھی روا ہے مجھ کو
تو نے ہر آن بدلتی ہوئی اس دنیا میں
میری پائندگیِ غم کو تو دیکھا ہوتا
کلیاں بیزار ہیں شبنم کے تلون سے مگر
تو نے اس دیدۂ پُرنم کو تو دیکھا ہوتا

ہائے جلتی ہوئی حسرت یہ تری آنکھوں میں
کہیں مل جائے محبت کا سہارا تجھ کو
اپنی پستی کا بھی احساس پھر اتنا احساس
کہ نہیں میری محبت بھی گوارا تجھ کو
اور یہ زرد سے رخسار یہ اشکوں کی قطار
مجھ سے بیزار مری عرضِ وفا سے بیزار

سترھویں صدی عیسوی کے آغاز تک ملکہ الزبتھ کے عہد میں
علوم و فنون نے ترقی کی، تو سانیٹ بھی شیکسپیئر ایسے نابغوں کے
ہاتھوں پھلتی پھولتی رہی۔ بعد میں ملٹن اور ورڈزورتھ ایسے شعرا نے
اس ردیف وقافیہ کے التزام میں اپنی اپنی افتادِ طبع کے مطابق تبدیلیاں
کیں، جو انہی کے نام سے منسوب ہیں۔ اگرچہ اٹھارویں صدی کے
اختتام پر سانیٹ پر برا وقت بھی آیا اور اس سے عوام کی وابستگی

کم سے کم تر ہوتی گئی مگر یہ دَور عارضی سا تھا اور شعراء نے انیسویں صدی میں اس کو پھر سنبھالا دیا اور انگریزی ادب میں یہ صنف آج بھی نامقبول نہیں ہے۔

انگریزی میں سانیٹ کی اس سرسری سی تاریخ کے بعد ہم اردو میں سانیٹ کی طرف پھر پلٹتے ہیں۔ اختر شیرانی نے رومانی شاعری کو جس نہج پر چلایا۔ اس سے وہ عوام میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ اور اسکے انداز اور بیان کی مقبولیت نے ایک وبا کی سی صورت اختیار کر لی، جس کا لازمی نتیجہ یہ بھی ہوا کہ سانیٹ لکھنا، اور اختر شیرانی کی تقلید میں لکھنا فیشن میں داخل ہو گیا۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء کے چند برس بعد تک اُردو میں بے شمار سانیٹ معرضِ وجود میں آئے۔ یہ الگ بات ہے کہ آج ان میں سے صرف چند ہی کا نشان تابش صدیقی ایسے شعرا کے ہاں ملتا ہے۔

اگرچہ ابتدا میں اختر اور راشد نے سانیٹ میں ردیف و قافیہ کا وہی التزام رکھا جو اطالوی سانیٹ کا تھا، لیکن بعد میں اختر کی متلون طبیعت نے اس میں کچھ ترامیم بھی کیں جن کی نقل دوسرے شعرا سے نہ ہو سکی۔ مثال کے طور پر اس کا یہ سانیٹ دیکھئے جس میں اگر ایک طرف ردیف قافیہ کا التزام مثنوی کے انداز پر رکھا ہوا ہے۔ تو دوسری طرف مستزاد نما ایک ٹکڑا بھی ہر مصرع کے ساتھ چپکا ہوا ہے جو مستزاد ہی کے مانند اپنے پہلے مصرع کے ساتھ ہم قافیہ بھی ہے اور سانیٹ کو ایک اعتبار سے مستزاد کا قالب دئے ہوئے ہے۔ لیکن یہ ایک الگ بحث ہے۔

سانیٹ سنئے، عنوان ہے "تیتری"

یہ تیتری ہے یا کوئی رنگِ پریدہ ہے — بوئے چکیدہ ہے
آغوشِ گل میں یا کوئی نقشِ دمیدہ ہے — عکسِ کشیدہ ہے
اُٹھے تو ایک بوسۂ رقصیدہ سامنے — پاشیدہ سامنے
بیٹھے تو ایک لذتِ خوابیدہ سامنے — دامن کشیدہ ہے
جوئے صبا میں ہلکا سا طوفانِ رنگ و بو — ہیجانِ رنگ و بو
دوشِ فضا پہ چھوٹا سا نیسانِ رنگ و بو — جوصف کشیدہ ہے
اک پُربہار نقش ہے مسرت کے خواب کا — عہدِ شباب کا
یا برگِ گل پہ لرزشِ جامِ شراب کا — عکسِ رمیدہ ہے
ہلکی سی اک شعاع ہے طورِ کلیم پر — بالِ نسیم پر
رقاصۂ بہار کا فرشِ شمیم پر — رقصِ پریدہ ہے
اُبھرا ہوا سا عکس ہے رنگیں غبار کا — کیف و خمار کا
یا شاخسارِ گل پہ عروسِ بہار کا — • حسنِ دمیدہ ہے

اک نو عروس کی نگہِ انفعال ہے — شرمِ وصال ہے
یا اک شعاعِ پرتوِ قوسِ ہلال ہے — اور نودمیدہ ہے

اس سانیٹ میں، جو اپنی صنف میں ایک نادر تجربہ ہے، دیگر خصوصیات کے علاوہ ایک بات اور بھی ملتی ہے اور یہ وہی روایت سے بغاوت کا اعلان ہے۔ سانیٹ کے لئے اب تک یہ ضروری تھا کہ اس کا پہلا بند آٹھ اور دوسرا چھ مصرعوں کا ہو لیکن اختر شیرانی نے اس سلیقے کو بھی بدل دیا اور پہلا بند چھ اور دوسرا آٹھ مصرعوں سے پورا کیا۔

اردو میں سانیٹ کچھ جدت کی دھن اور کچھ غزل کی جکڑ بندیوں کے ردِ عمل کے سائے میں آیا تھا۔ صرف یہی نہیں اپنی مخصوص ہیئت کے پیشِ نظر اس کے مضامین میں زیادہ وسعت اور گہرائی کی گنجائش بھی کم ہی تھی۔ چنانچہ جب جدید تحریکوں نے اختر اور اس کے ڈھب کی غنائی شاعری کا طلسم توڑا تو شعرا نے محسوس کیا کہ سانیٹ کی ہیئت ان کے جدید شعری تقاضوں کو کم ہی پورا کرتی ہے اور پھر جب اس میں مینا کاری کے لئے اسی کلاسیکیت کے سہاروں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جس کے خلاف بیسویں صدی کے وسط میں اس قدر جدوجہد سے کام لیا گیا تو ان کو یہ فعل عبث نظر آنے لگا۔ چنانچہ وہ صنفِ سخن جس کا غلغلہ ابھی بیس برس پہلے اس قدر بلند تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی، اب اس قدر تیزی اور سرعت سے ختم ہو گیا جیسے اس کا کوئی نام لیوا بھی باقی نہ رہا ہو۔ آج اگر یوسف ظفر اور ضیا جالندھری ایسے بعض جدید شعرا کبھی کبھار زبان کا ذائقہ بدلنے کے لئے ایک آدھ سانیٹ کہہ بیٹھتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں زندگی کی ابھی کوئی رمق باقی ہے۔ اور اب کچھ اُردو میں کینٹو کے بارے میں۔

ن۔م راشد، جن کے ساتھ جدید اردو شاعری میں نئی اصناف کو داخل کرنے کے کچھ سلسلے وابستہ ہیں۔ گذشتہ جنگِ عظیم میں مصر، شام، ایران وغیرہ گئے۔ واپسی پر انہوں نے اپنی ایک طویل نظم سے اردو شاعری کو آشنا کرایا۔ اس نظم کا عنوان ہے "ایران میں اجنبی"۔

"ایران میں اجنبی" کے تحت راشد کے سامنے ایک بہت بڑا موضوع اور ایک نہایت وسیع کینوس تھا۔ ایک نئے ماحول بلکہ ایک نئی دنیا میں پرانی تہذیب کا ایک فرد تن تنہا کھڑا تھا۔ اگرچہ وہ کسی قدر مبہوت تھا لیکن اس کے دل و دیدہ دونوں کھلے تھے اور ان میں حالات کا جائزہ لینے، زندگی کو پیش کرنے اور جذبات و احساسات سے ہمکنار

(باقی صفحہ ۵۵ پر)

شہیدِ ملّت

سردار امیر اعظم خاں

"قائدِ ملت" خان لیاقت علی خاں کو میں نے سب سے پہلی بار اس وقت دیکھا جب وہ ۲۵-۱۹۲۴ء میں یوپی کی مجلس قانون ساز کے انتخابات کے سلسلے میں کرنال سے مظفر نگر تشریف لائے۔ کئی دن سے اُن کی آمد آمد کا چرچا تھا اور ضلع کے بیشتر مقتدر حضرات، جو اُن کے انتخاب میں دلچسپی رکھتے تھے، اس وقت ان کے استقبال کو جمع تھے۔ مرحوم اس سے کچھ ہی عرصہ پیشتر اپنی تعلیم کی تکمیل کرکے انگلستان سے واپس آئے تھے۔ جب وہ کار سے اترے تو علی گڑھ کٹ کا پاجامہ اور گہرے نیلے رنگ کا بند گلے کا کوٹ زیب تن کئے ہوئے تھے، سر پر سُرخ رنگ کی چھوٹی باڑھ کی ترکی ٹوپی تھی اور پاؤں میں پمپ شو، علی گڑھ فیشن کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں تھیں، اور آنکھوں پر عینک لگی تھی جب وہ لوگوں سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ تو ان کے چہرہ پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی اور ان کے کھلتے ہوئے گندمی رنگ اور بھرے ہوئے جسم پر یہ لباس بہت بھلا اور خوش نما معلوم ہوتا تھا۔ ایسا نظر آتا تھا جیسے وہ انگلستان کے بجائے ابھی ابھی علی گڑھ سے آئے ہوں۔

جب وہ انتخاب میں کامیاب ہو گئے۔ تو ان کے مخالف نے اُنکے خلاف اپیل دائر کردیا، گو انتخاب کے دوران میں مرحوم کا کافی روپیہ صرف ہوا تھا، مگر اپیل کے سلسلے میں چند ماہ کے اندر اندر اس سے بھی کہیں زیادہ روپیہ صرف ہوگیا جس وقت عدالت کے روبرو اُن کا اپنا بیان قلم بند ہو رہا تھا۔ عدالت نے کسی مخصوص فرد کے متعلق یہ دریافت کیا کہ کیا وہ الکشن کے دوران میں مرحوم کا ایجنٹ تھا یا نہیں؟ قائدِ ملت نے لاعلمی کی حالت میں جواب دیا کہ نہیں۔ بیان ختم ہونے کے بعد جب وہ اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئے، تو اُنہیں بتایا گیا کہ اُنہوں نے بہت اچھا جواب دیا اور اگر وہ اقرار کر لیتے تو اپیل ہار جانے کا امکان تھا۔ مرحوم کو جب یہ حقیقت معلوم ہوئی تو فوراً دوبارہ عدالت کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور کہدیا کہ وہ شخص ان کا ایجنٹ تھا اور لاعلمی کی حالت میں انہوں نے پہلے صحیح جواب نہیں دیا تھا۔ اُن کی اس صاف بیانی اور صداقت سے عدالت اور دیگر سب لوگ بے حد متاثر ہوئے، اور اللہ نے انہیں اپیل میں بھی کامیابی عطا کی۔ قائدِ ملت کا اپنی سیاسی زندگی کے آغاز ہی سے یہ اصول تھا خواہ نقصان ہی کیوں نہ ہو۔ دیانت اور صداقت کو کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے۔ مرحوم تمام عمر اسی پر کاربند رہے۔

۱۹۴۶ء میں پاکستان کے حصول کے لئے جو انتخابات ہوئے ان میں مرحوم مرکزی مجلسِ قانون ساز کے لئے کمشنری میرٹھ کے حلقے سے امیدوار تھے۔ جمعیت العلماء دہلی اور علمائے دیوبند کی مخالفت کی وجہ سے مقابلہ بڑا شدید تھا۔ کانگریس نے اس حلقہ پر پورا زور دے رکھا تھا اور روپیہ پانی کی طرح بہا رہی تھی۔ کانگریس نے تقریباً ۸، ۹ لاکھ روپیہ صرف کردیا اور اس نشست کو پریسٹیج الکشن بنا لیا۔ ہر بالغ کو حق رائے دہندگی حاصل نہ ہونے کی وجہ سے رائے دہندگان کی فہرست مختصر تھی، اور ایک ایک رائے کی بڑی قیمت۔ مقابلہ اتنا سخت تھا کہ بعض اوقات یہ محسوس ہوتا تھا کہ کامیابی مشکل ہے۔ ہر روز رات کو میں انتخابات کے متعلق قائدِ ملت کو رپورٹ دیا کرتا۔ ان کا حکم تھا کہ خبریں مخالف ہوں یا مایوس کن، انہیں صحیح صحیح اطلاع دی جائے۔ انتہائی بُری خبر سُن کر بھی میں نے کبھی ان کے چہرے پر پریشانی کے آثار نہیں دیکھے۔ وہ ہمیشہ پُرسکون رہتے اور کہا کرتے کہ یہ میرا ذاتی الکشن نہیں ہے۔ یہ پوری قوم کا مسئلہ ہے۔ قوم کو طے کرنا ہے کہ وہ پاکستان کے حصول کے حق میں ہے یا نہیں۔

ایک گاؤں میں ایک ہی برادری کے تقریباً ڈھائی سو ووٹ تھے۔ وہ

مسلم لیگ کی سخت مخالفت کر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ کانگریس نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کی پنچایت کے لئے گاؤں میں ایک کنواں بنوا دینگے۔ مسلم لیگ والوں کے یہ سمجھانے پر کہ پوری قوم کے مستقبل کا سوال ہے۔ یہ لوگ اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ اگر لیاقت علی خاں کنوئیں کی کھدائی کا نصف خرچ جو تین سو روپیہ ہوتا تھا، پنچایت کو دیں تو وہ اپنے سارے ووٹ مسلم لیگ کو دے دینگے۔ جب یہ بات قائد ملت کے گوش گذار کی گئی، اور کارکنانِ لیگ نے زور دیا کہ یہ روپیہ معمولی سی بات ہے لہٰذا اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہئیے تو قائد ملت نے بڑے اطمینان سے یہ جواب دیا کہ آپ کو بخوبی معلوم ہے کہ ہمارا مقابلہ ایک ایسی قوم سے ہے جو دولت میں ہم سے بہت آگے ہے۔ یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ ہم اس میدان میں ان کا مقابلہ کریں کہ جہاں ہماری ہار یقینی ہے۔ دوسرے یہ میری ذاتی ہار جیت کا سوال نہیں اصول کا سوال ہے۔ قوم کی قسمت کا فیصلہ ہونا ہے۔ ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ ہم پاکستان قائم کرکے آزادی یا عزت کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں یا غلامی کی۔ اگر قوم پاکستان کے حق میں ہے تو روپیہ کے صرف یا کسی رقم کے لالچ کا کوئی سوال نہیں ——— اور پھر اگر قائد اعظم اور ہم روپیہ صرف کرکے اس قوم سے لئے پاکستان خریدیں تو ایسے پاکستان کی کیا قدر ہوگی اور اس بات کی کیا ضمانت ہوگی کہ یہ قوم پھر پاکستان کو بنیوں کے ہاتھ گروی نہ رکھ دے گی؟ جب اس گاؤں کے لوگوں کو قائد ملت کے ان خیالات کا پتہ چلا تو انہوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کرکے مسلم لیگ کے حق میں ووٹ دیئے۔ قائد ملت کا یہ فیصلہ ہمارے لئے مشعلِ ہدایت ہے۔ انہیں اپنی قوم پر بڑا اعتماد تھا۔ وہ قوم کے صحیح کردار کو پہچانتے تھے کہ وہ روپے کی خاطر اپنے ایمان کو قربان نہیں کرے گی۔

قائد ملت کا ہاتھ ہمیشہ قوم کی نبض پر رہتا۔ وہ نہایت ٹھنڈے دماغ کے آدمی تھے۔ انہیں کبھی غصہ نہ آتا اور ہمیشہ اپنا دماغی توازن برقرار رکھتے۔ وہ ہر ایک کی بات بڑے غور سے سنتے۔ ان کے چہرے سے یہ اندازہ لگانا بڑا مشکل تھا کہ انہیں یہ بات پسند آئی یا ناپسند۔ ہر ایک کی بات بڑی خندہ پیشانی سے سن لیتے اور یہی وجہ تھی کہ وہ اس قدر مقبول تھے۔ ملک کے طول و عرض میں بیشتر سیاسی کارکنوں کو وہ نام بنام شکل سے پہچانتے اور ہمیشہ ان کی ہمت افزائی اور دلجوئی کرتے۔ تمام سیاسی کارکن انہیں صحیح معنوں میں اپنا قائد اور دوست سمجھتے اور ان کی عزت کرتے۔ بلا شبہ وہ قوم کے قائد پہلے تھے اور وزیر اعظم بعد کو۔

مرحوم کے کردار کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ نہ کبھی کسی کی سفارش سنتے اور نہ کسی کی سفارش کرتے۔ صرف وہ کام کرتے جس میں پوری قوم کے مفاد کا سوال پنہاں ہوتا۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی فرد کی اس لئے مدد نہیں کی کہ وہ ان کا رشتہ دار یا دوست تھا۔ وہ کہا کرتے کہ قائد اعظم کی اور ہماری یہ کوشش ہوتی ہے کہ قوم کو اس کا صحیح حق مل جائے۔ اس کے بعد ہر فرد اگر وہ کسی چیز کا اہل ہے تو خود اپنا حصہ اپنی قابلیت کی بنا حاصل کرے۔ جس زمانہ میں مرحوم ہندوستان کی عارضی حکومت میں وزیر خزانہ کے عہدہ پر فائز تھے۔ ان کے ایک دیرینہ ملنے والے نے ان سے اپنے تعلقات جتاتے ہوئے کچھ مراعات طلب کیں۔ قائد ملت نے جواب دیا کہ میرے دل میں ذاتی تعلقات کا بڑا احترام ہے۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ انہیں تعلقات کی بنا پر میں آپ کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ میرا تو عقیدہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی بڑے عہدے پر فائز ہو جائے تو اس پر پوری قوم کا یکساں حق ہوتا ہے، نہ کہ اس کے احباب اور رشتہ داروں کا۔ بلکہ میرا تو یہ ایمان ہے کہ کسی شخص کا وزیر بن جانا اس کے احباب اور رشتہ داروں کے لئے ڈس کریڈٹ ہونا چاہیئے۔

قائد ملت کو عمدہ لباس کا شوق تھا ان کا عمومی رہن سہن بھی اعلیٰ درجہ کا تھا۔ دیکھنے والے یہ سمجھتے کہ ان کا خرچ زیادہ ہے، لیکن وہ بڑی احتیاط سے خرچ کرتے اور کوئی ان کے رہن سہن سے ان کے اخراجات کا اندازہ نہ لگا سکتا۔ وہ ایک بڑی جائداد کے مالک تھے جس کی آمدنی ہزارہا روپیہ ماہانہ تھی، مگر مرحوم نے کبھی اپنی ریاست سے ایک ہزار روپیہ ماہانہ سے زیادہ نہ لیا۔ اپنے علاقہ میں وہ واحد زمیندار تھے، جو مقروض نہ تھے۔ وہ روپیہ کا صحیح مصرف جانتے تھے اور انتہائی عدیم الفرصتی کے باوجود گھریلو معاملات اور نظام پر پوری نظر رکھتے تھے۔

مرحوم کی تمام جائداد ہندوستان میں رہ گئی، جو بعد کو متروک قرار دی گئی۔ وہ چاہتے تو اور لوگوں کی طرح اپنی جائداد کا آسانی سے تبادلہ کر لیتے لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب ان کے کارکنوں نے ان کی جائداد کے تبادلہ کا انتظام کیا تو انہوں نے یہ کہہ کر تبادلہ کرنے سے انکار کر دیا کہ لاکھوں مہاجر ایسے ہیں جن کی جائداد وہاں رہ گئی ہے، ان کا یہاں کوئی سہارا نہیں۔ اگر اس حالت میں میں اپنی جائداد کا تبادلہ کر لوں تو کل خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا؟

قائد ملت بڑے راسخ الاعتقاد مسلمان تھے۔ پاکستان اور پاکستان کے عوام کی محبت ان کی رگ رگ میں بسی ہوئی تھی۔ ان سے میری آخری ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ پنجاب کے گذشتہ انتخابات کے بعد لاہور میں

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

عزت مآب ڈاکٹر خان صاحب اور عزت مآب سردار بہادر خان کا سرحدی عوام سے خطاب

وحدت مغربی پاکستان

عزت مآب سردار امیر اعظم خان
دستور ساز اسمبلی میں وحدت مغربی پاکستان
کا مسودہ قانون پیش کر رہے ہیں

عزت مآب سر علی محمد راشدی کی ''وحدت مغربی پاکستان کانفرنس'' حیدرآباد (۱۹۵۵) میں تقریر

رس شاہ عبداللطیف بھٹائی رح

(مغربی پاکستان کا ایک اہم ثقافتی اجتماع)

رس کے موقع
شاہ عبداللطیف رح
کے مزار کی
روحانی مجلس

زائرین کا ہجوم

میلے کا روپ

''جون جنمی جرم ناما سہل اسی ساباں ہا''

و رامی

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ

روشؔ صدیقی

کتابِ عشق کا رنگیں کلام لیکے اٹھا
محبتِ ابدی کا پیام لیکے اُٹھا
قیودِ وقت سے آزاد تھا وہ بندۂ عشق
فروغِ صبح، بہ ہنگام شام لیکے اٹھا
گمان ووہم کی ظلمت فروز وادی میں
یقینِ عشق کا ماہِ تمام لیکے اٹھا
پھر اُس نے جادۂ خاصانِ حق کیا روشن
ہزار مشعلِ سوزِ تمام لیکے اٹھا
بہ قدرِ ذوق ملا جس سے میکشوں کو سرور
بنامِ عشق وہ کاس الکرام لیکے اُٹھا
لٹائے دیدۂ پُرنم سے اس نے لعل و گہر
خزانۂ غم و دردِ عوام لیکے اٹھا
بہائے کوثر و تسنیم ریگ زاروں میں
اگرچہ ایک شکستہ سا جام لیکے اٹھا
جہاں ہوس نے بنائے تھے لاکھ بت خانے
وہاں وہ وحدتِ بیت الحرام لیکے اُٹھا
محمدِ عربیؐ کے سحابِ رحمت سے
گہر فشانیٔ فیضانِ عام لیکے اُٹھا

شہ لطیفؒ، عزیزِ انام، مردِ ولی
دیارِ سندھ، ازاو یافت دولتِ ازلی

صہبائے لطیف

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ
مترجمہ: عاصمہ حسین

کونج

اُجلی اُجلی کونجیں، کل ہی کتنے جھرمٹ سے انکے
اُڑ اُڑ کر اس دیس سے جانے کتنی منزل دُور گئے
اب کیا اس اتھلے پانی کی کھائی میں رہنے سے حاصل؛
اُڑ کے گئے جب سارے ساتھی، بنکھ ملے اور دل سے دل
اپنی سنگت وہ کب چھوڑیں، کیوں چھوڑیں وہ اپنا ساتھ؛
ان کے من یوں ساتھ ملے ہیں جیسے باہم بات سے بات
سب جاتے ہیں سنگت میں، اس اجلی کھلی ٹولی میں
من میں جتنا پریم ہو بس اتنا ہی دھن ہے جھولی میں
اتنا ہی رس ہے، اتنی مٹھاس اور اس کا کوئی انت نہیں
کونجیں کونجیں ساتھ رہیں، بھٹکیں نہ سبھوں سے دور کہیں
اپنی قوم سے ہٹ کر رہنا کونجوں کا دستور نہیں
اس سے بڑا ان کی دنیا میں کوئی اور قصور نہیں
ننھی کونج، اے ننھی کونج! آواز کو اپنی جو بن اٹھا
جیسے بھی بن آئے اس پیغام کو اپنوں تک پہنچا
دن بیتا اور رات بھئی، بھیگی رات اور رات گئی
قسمت تیری ٹولی کو اس نیارے دیس میں لائی تھی
لیکن ان کے من میں بسی تھی اپنی پہاڑوں کی بستی
اسی کی ان کے من میں لگن تھی، اسی کی من میں پریت بسی
اس میں کسی کا دوش نہیں ہے، رہ گئی تنہا پھر بھی کیا
اپنا دھنی ہے فکر میں اپنی، آن دے گا تجھے آن داتا
ننھی کونج! اس جھرمٹ میں کل خوب اک بات کا چرچا تھا:
دیپ ہے تیری پریت کا ہر ہر ساتھی کے من میں جلتا
پھانسو! اوجھل ہے تری آنکھوں سے جال شکاری کا
حال نہیں ہے تجھ پر روشن خود اپنی لاچاری کا

التجا

سنتی ہوں میں جھاڑ جھنکاڑوں سے پُر ہیں بن کے بن
میں یہ کیا جانوں، یہ باتیں کیسے جانے میرا من؟
لوگ کہتے ہیں کہ پھیلے ہیں کئی صحرا یہاں
لوٹ بھی آ جانِ من! جینا ہوا بارِ گراں
اے مرے ساجن! مرے دل کو نہ یوں ویران کر
یوں نہ لاکر چھوڑ دے لاچار سونی راہ پر
میں یہ کیا جانوں کہ پھیلے ہیں یہاں پُرخار دشت
خار کیسے ملبہ ہیں انگار ہی انگار دشت
دیکھ پیارے اِگھونٹ پانی کا کبھی میں پیتی نہیں
گرچہ جیتی ہوں سمجھتی ہوں کہ میں جیتی نہیں
دیکھ کیسے دوڑتی ہے کاٹنے کو ہر چٹان
چلچلاتی دھوپ جھلساتی ہے، تڑپاتی ہے جان
دیوں کہے شاعر کہ تو چلتی ہے تو دیوانہ وار
سو ستم، سو آفتیں، سو مشکلیں اور ایک نار!
آ بھی جا اب میرے ساتھی، آ بھی جا اے میرے میت
بات جب ہے آج اپنی لاج رکھ لے تیری پریت
دیکھ اس ویرانے میں ہیں کیسے بے ہنگم سے جھاڑ
روکتی ہے ہر قدم پر راستہ کانٹوں کی باڑھ
لوگ کہتے ہیں کہ ان جھاڑوں میں زہری ناگ ہیں
آگ کے اندر یہ گویا اور جیتی آگ ہیں
پاس آ میرے، مرے پیارے، مرے دلدار آ
تو ہی اس مہلک بیاباں میں ہے میرا رہنما
کوئی میرا، کوئی اپنا کیا مرا غمخوار ہو
تم ہی سامانِ تسلیّ اے مرے دلدار ہو

سسید اچھپئی

اس بچاری نے نہ دیکھا تھا کبھی وہ ریگ زار
کوئی ہم صورت میسّر تھا نہ کوئی غمگسار
تیرہ و تاریک تھی دھرتی بھی اور آکاش بھی
پیاری بہنو! اس گھڑی، جو تھی قیامت کی گھڑی
ڈاچی والے کو بنایا اس نے اپنا دادخواہ
اس کی ہمدردی سے پائی رنج میں تسکیں کی راہ

بنگلہ افسانہ:

بجلی

مبین الدین احمد
مترجمہ: فیض احمد چودھری

سعید پور مشرقی پاکستان کا ایک گمنام گاؤں ہے۔ گاؤں بھر میں اَن پڑھ کسان ہی بستے ہیں۔ بہت دن پہلے فقط ایک شریف گھرانا یہاں بستا تھا جو اس پرگنے کا زمیندار بھی تھا۔ اب زمینداری غیروں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ اس زمیندار خاندان کا ایک ہی چشم و چراغ رہ گیا ہے —— وہ بھی بائیس تیئیس سال سے پردیس گیا ہوا ہے اور ایک دن کے لئے بھی یہاں نہیں آتا۔ (اب یہاں) ان کی کھوئی ہوئی عظمت کی آخری نشانی صرف اس عالیشان عمارت کا کھنڈر باقی ہے جو بھوتوں اور جنات کا مسکن معلوم ہوتی ہے۔

گُلتانی اس غیر مشہور گاؤں کے غریب کسان شیخ مدار کی اکلوتی بیٹی ہے۔ طبیعت میں اس کی شوخی اور اچپلاہٹ ہے، نہ کسی سے ڈرتی ہے اور نہ اسے کسی بات کی پروا۔ سارے طور طریق بالکل لاابالی۔ اسکا اصلی نام کریمن تھا مگر یہ نام اب کسی کو یاد نہیں۔ فطری عادات و اطوار کی مناسبت سے اس کا نام گُلتانی پڑ گیا ہے۔

بچپن ہی میں اس کی شادی ہو چکی تھی۔ کوئی پانچ سال ہوئے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ گُلتانی اس وقت دس گیارہ سال کی تھی۔

آج وہ بھرپور جوانی کی آغوش میں ہے۔

گلتانی کالی ہے۔

صرف کالی کہنا کافی نہیں، بلکہ آبنوس کی طرح کالی ہے، مگر بدصورت نہیں۔ اس کی صورت میں بڑی دلکشی ہے۔

گلتانی گویا کسی ماہر سنگ تراش کی مدت کی مشق و ریاض کا نتیجہ ہے۔ اس کا مکمل سا حسین ملائم جسم۔ ناک نقشہ، آنکھیں اور بال سب کے سب اپنا جواب آپ ہی ہیں۔ بدن میں ناموزونی کہیں نام کو نہیں۔ کہیں بھی ذرا سا داغ یا ناہمواری نہیں۔ ہنستی ہے تو صرف گالوں میں گڑھے پڑ جاتے ہیں۔

گلتانی کے نادر حسن کو پرکھنے والی آنکھ اس گاؤں میں نہیں، یہ بات تو یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے۔ مگر اس کے گالوں کے گڑھے پر سب کی نظر پڑتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ گال کا گڑھا نحوست کی نشانی ہے۔ کہتے ہیں ایسی عورتوں کے شوہر زندہ نہیں رہتے۔ گلتانی کے بیوہ ہونے پر سب کے دل میں یہ وہم اور بھی راسخ ہو گیا۔

سب لوگ کہتے ہیں زندگی میں اسے اور کوئی خوشی نصیب نہ ہوگی ...... ہنستے وقت اس کے گالوں میں گڑھے پڑ جاتے ہیں۔

اگرچہ اس کے حسن و زیبائی کو کوئی نہیں دیکھتا اور اس کے گال میں منحوس گڑھے بھی پڑتے ہیں۔ پھر بھی گلتانی کی سرشار جوانی بہت سے لوگوں کو مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ ہر وقت بڑے سلیقے سے بن ٹھن کے رہتی ہے۔ خوشحال شیخ مدار کی اکلوتی بیٹی بدنصیب ہے تو کیا، باپ کی لاڈلی تو ہے۔ رنگین لباس پہن کے اور چوٹی میں کوئی پھول گوندھ کے وہ محلے میں سیر کو نکلتی ہے ...... کسی کی روک ٹوک کو وہ سنتی ہی نہیں۔

عجیب لڑکی ہے گلتانی۔

سب کے سامنے نکل آتی ہے، بات کرتی ہے، اور موقع بے موقع ہنسی میں جھومنے لگتی ہے، لچک جاتی ہے۔ گلتانی کی حرکات جسمانی،

نازوادا، طور طریق اور بات چیت میں ایک ایسا شورانگیز، پُرمعنی اور لطیف اشارہ ہوتا ہے کہ بے ساختہ دل کو لبھاتا ہے مگر ہاتھ بڑھاؤ تو گلتانی تک نہیں پہونچتا، گویا کہیں اٹک کے رہ جاتا ہے۔

جیسے وہ بلور کی شفاف اور سخت دیوار کی اوٹ چلتی پھرتی ہو۔ نظر سب کچھ آتا ہے مگر اسے کسی طرح چھوا نہیں جاسکتا۔

گلتانی صرف ایک ہی شخص سے ذرا جھینپتی ہے اور اس کا لحاظ بھی کرتی ہے۔ گبھرو بائیس تئیس سال کا ہٹا کٹا نوجوان ہے۔ سر پر گھنے گھونگھر والے بال۔

گبھرو کے سامنے گلتانی کا اونچا سر خود بخود نیچا ہوجاتا ہے — سینے کے اندر دل دھک دھک کرنے لگتا ہے۔

گبھرو گلتانی کو "گل" کہہ کے پکارتا ہے اور کبھی "گلی"۔

مراد مصور

ایک زمانے میں اسے اپنی فنکاری پر بڑا ناز تھا۔ اب مصوری اُسکا پیشہ ہے۔ باپ کے جیتے جی مراد کو فن کی تحصیل کا چنداں موقع نہ مل سکا دولتمند باپ کا اکلوتا بیٹا معمولی مصور یا نقاش نہیں ہوسکتا۔ اسے تو جج یا مجسٹریٹ ہونا چاہیئے۔ باپ کی خواہش لے دے کے بس اتنی تھی۔

مراد کے باپ کے نزدیک دستکار اور نقاش میں کوئی فرق نہ تھا گھٹیا چیز کوئی بڑا نام دینے ہی سے شاندار نہیں بن جاتی۔

مراد کے باپ کی رائے ایسی پختہ تھی کہ اسے بدل دینے کی طاقت مراد میں نہ تھی۔ لیکن مراد کی فطری صلاحیت باپ کی مرضی کے مطابق کام نہ کرسکی۔ باپ بیٹے کی ان متضاد خواہشوں میں برابر کشمکش جاری رہنے کی وجہ سے مراد نے ٹھوکریں کھاتے کھاتے کس طرح بی۔ اے تو پاس کرلیا مگر جج یا مجسٹریٹ نہ بن سکا۔

ماں بہت دن پہلے مرچکی تھی، باپ کے انتقال کے بعد دنیا میں اس کا اپنا کوئی نہ رہا۔ گاؤں کے عالیشان مکان کے سوا مراد گاؤں کی ساری جائداد بیچ کر پیرس روانہ ہوگیا۔

فن کے سیکھنے میں لگاتار ریاض کے ساتھ ساتھ مراد نے پیرس میں اور بھی بہت سی باتیں سیکھ لیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارا روپیہ اُڑا دینے میں اسے چند سال سے زیادہ نہ لگے، اور جب وطن واپس آیا تو بالکل خالی ہاتھ تھا۔

اتنی مدت تک گاؤں کی اس موروثی عمارت کا اسے خیال ہی نہ آیا تھا۔ وطن واپس آنے کے چند روز بعد ایک دن یکایک اس کے دل میں آیا کہ گاؤں کی اس عمارت کے بیچنے سے کئی ہزار روپیہ ہاتھ آئے گا۔ اور جب تک روزگار کی کوئی اچھی سبیل نہ نکلے اس وقت تک تنگدستی اور فکر معاش سے نجات ملے گی۔

اس کے بیچنے میں کوئی دقت بھی اسے نظر نہیں آتی تھی۔ برابر کے گاؤں کے، جن لوگوں نے اس کی دوسری جائداد خریدی تھی ان میں سے جس کو بھی یہ عمارت مل جائے وہ خوش ہی ہوگا۔

گاؤں میں گلتانی کے ناکام چاہنے والوں کا ایک گروہ تھا، جو گلتانی سے انتقام لے کر اپنا جی ٹھنڈا کرلے کا موقع ڈھونڈھ رہا تھا۔ موقع ایک دن خود بخود ہی پیدا ہوگیا۔ شیخ سمیر گاؤں کا مکھیا تھا۔ گاؤں پر اسکا بڑا اثر تھا۔ شیخ سمیر کی پچاس سال کی عمر تھی، جب اسکی تیسری بیوی دو تین چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر مرگئی تو سبھوں نے اسے گلتانی سے شادی کرنے کا مشورہ دیا۔

— گلتانی ہی سے نکاح کرلو پردھان — دیکھوگے کہ وہ تمہارا گھربار کس طرح سنبھال لیتی ہے۔ اس کا گھمنڈ بھی کم ہوجائیگا..... گاؤں کے لونڈے بھی ٹھیک ہوجائیں گے۔

مکھیا نے کہا: گلتانی کے تو گاؤں میں گن گائے پڑتے ہیں، کیا اس سے شادی کرکے میں وقت سے پہلے ہی مرجاؤں؟

— تم کیوں مرنے لگے چودھری! اس سے شادی کرنے میں کوئی خرابی نہیں۔ اس کا شوہر مرا۔ تمہاری بیوی مری..... نحوست کا چکر تو ختم ہوا۔

پردھان نے کہا: بات تو تم نے ٹھیک کہی..... اچھا میں اسی سے نکاح کروں گا۔ دیکھنے میں وہ خاصی اچھے ہاتھ پاؤں کی ہے۔

چودھری کے چہرے پر ہنسی کی ہلکی سی لہر داڑھی مونچھوں کے جنگل کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔

مگر گلتانی نے چودھری کا پیغام بے دھڑک رد کردیا۔ جو شخص پیغام لے کے آیا تھا اس سے کہا اپنے پردھان سے کہہ دینا کہ گلتانی کو گلے میں پھانسی ڈالنا منظور ہے مگر اس بڈھے کھوسٹ کا گھر آباد نہیں کرے گی۔

گلتانی کی ماں نے مارے ڈر کے ٹوکا کہ بات تو سن حرامزادی!

اری! یہ تیری قسمت جاگی ہے کہ چودھری تجھ سے نکاح کرنا چاہتا ہے۔ چودھری کے پاس دھن دولت، زمین سبھی کچھ ہے۔ تیرے دل میں آخر ہے کیا؟

گلتانی نے ناک بھوں چڑھا کے کہا: ایسے روپے پیسے اور زمین پر جھاڑو پھیرتی ہوں۔

جو شخص یہ پیغام لے کے آیا تھا وہ گلتانی کا منہ بولا دولہا بھائی تھا۔ اس نے ذرا چھیڑ خانی کی کہ بوڑھا کتنا پیار کرے گا تمہیں، دیکھنا۔ پیچھے پیچھے پھرے گا جیسے پالتو کتا۔

دولہا بھائی نے زور کا قہقہہ لگایا۔

گلتانی نے کہا: تو پھر کہہ دینا کہ ویسا ہی ایک جانور ڈھونڈھ لے، اپنے لئے —— میرے پیچھے کیوں پڑا ہے۔

زیادہ بات کی ضرورت نہیں۔ وہ شخص واپس چلا گیا۔

یہ باتیں سن کر شیخ سمیر بھڑک اٹھا، اتنی بڑی بات! گاؤں کے بڑے بوڑھوں نے کہا: دماغ دیکھا لونڈیا کا؟ تم اس کا کوئی علاج کرو چودھری؟ کوئی ترکیب نکالو۔

گلتانی کے ناکام عاشقوں نے کہا: گلتانی کے رنگ ڈھنگ برے اور چال چلن خراب ہے۔ رات کو تالاب کے کنارے اکیلے میں وہ اور گنجر ایک دوسرے کی بغل میں بیٹھ کے پریت کے گیت گنگناتے ہیں۔

مکھیا نے کہا: ہائیں! اچھا مزا چکھاتا ہوں میں ٹھہرو!

گاؤں میں پنچایت بیٹھی ہے۔

گلتانی کا مقدمہ درپیش ہے۔

گلتانی اپنے خلاف الزامات سن کر آگ بگولا ہو گئی۔ ایسی جھوٹی بات نہ کہو، چودھری۔ مجھ پر جو ایسا طوفان اٹھائے گا وہ کوڑھی ہو جائیگا۔

مکھیا ہنسا اور کہا: وہ تو دیکھا جائے گا بعد میں —— اب ناپ کے دو ہاتھ زمین سے ناک رگڑ۔ آئندہ کسی دن تجھے گنجر کے پاس پھٹکتے دیکھا تو سخت سزا ملے گی۔ سمجھی؟

گنجر اب تک مجلس کے ایک کونے میں خاموش بیٹھا تھا۔ یک بیک اٹھ کر بولا: تمہیں سزا دینی نہیں پڑے گی، پردھان —— میں اس سے شادی کروں گا۔

مجلس پر بجلی سی گری۔ گلتانی نے گنجر پر ایک نگاہ ڈال کے آنکھیں نیچی کر لیں۔ ساری مجلس ہکا بکا رہ گئی

مکھیا نے گرج کر کہا: شادی کروں گا۔ منہ سے کہہ دیا اور ہو گئی شادی۔

—— کیوں، شادی پر تمہیں کیا اعتراض ہے؟

—— اعتراض! اعتراض تو بڑا بھاری ہے! مگر وہ ہم تمہیں بتائینگے نہیں، گنجر!

گنجر خاں چلا اٹھا، بتاؤ گے کیسے نہیں۔ بتانا پڑے گا۔

—— اچھا رے۔ اتنی بڑی بات! مار حرامزادے کو۔

آن کی آن میں بہت سے مخالف ہاتھ گھونسے تان تان کے اٹھے اور گنجر پر پل پڑے۔

ایک خوفناک ہلڑ اور شور و غل میں مجلس برخاست ہو گئی۔ اگلے دن معلوم ہوا کہ گنجر گاؤں چھوڑ کے شاید کہیں چلا گیا۔ گلتانی بالکل گم سم رہ گئی

مراد بہت دنوں کے بعد گاؤں میں آیا ہے! اس کا عاشق فن دل گاؤں کے ہر منظر پر لوٹ ہے۔ سارے دن وہ بڑے شوق اور انہماک سے تصویریں کھینچتا ہے۔

کل جو لوگ اس کی رعیت تھے آج وہ اوروں کی پرجا ہیں، تب بھی پرانی رعیت میں سے ایک ایک کر کے بہت سے لوگ پرانے آقا کی اولاد سے ملاقات کرنے آئے۔ کوئی شخص اس سے زیادہ بات نہیں کرتا۔ —— شاید ہمت نہیں پڑتی —— پھر بھی جو آتا ہے، سلام کرتا ہے اور چلا جاتا ہے۔

مراد انسانی صحبت کی کمی کو قدرتی مناظر کی زیبائی اور دلفریبی سے پورا کر لیتا ہے۔ گاؤں اسے بہت بھلا لگ رہا ہے

مراد تصویر کھینچ رہا ہے۔

بل کھاتی ہوئی ندی کہیں نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے۔ چھوٹی بڑی طرح طرح کی ناویں ایک کے بعد ایک بہی چلی جا رہی ہیں۔

اس پار جہاں تک نظر جاتی ہے دھان کا ہرا کھیت ہے پار کھنڈرات میں ایک ٹوٹا پھوٹا محل۔

کتنی حسین تصویر! سب گویا سچ مچ کے باغ ــــــ سچ مچ کے درخت! کتنی خوبصورت چھوٹی چھوٹی نالیاں ــــ جیسے بالکل اصلی! ناریل کا درخت ــــ ناریل! واہ وا ......! مراد تصویر کو نظر اٹھا کر حیران رہ گیا۔ پندرہ سولہ سال کی ایک لڑکی .... رنگ کالا۔ مگر جسم بے عیب نہایت متناسب جس میں عنفوانِ شباب کی بھرپور بہار ہے۔ ڈھیر کے ڈھیر کالے بالوں کی بھاری بھرکم چوٹی ــــ دھاری دار رنگین ساری میں لپٹی ہوئی پتلی کمر۔ بڑی بڑی بادامی آنکھوں میں حیرت بسی ہوئی۔ ان باتوں نے مراد کا دل موہ لیا۔

ــــ تمہارا نام ؟

ــــ گلتانی .....

ــــ گلتانی! نام تو بہت پیارا ہے۔

گلتانی نے کہا: جیسے آپ خوبصورت ہیں ویسی ہی سندر تصویر بھی کھینچی ہے۔

مراد نے کہا: میں کیا بہت خوبصورت ہوں ؟

ــ بیشک! کتنا سندر ہے آپ کے بدن کا رنگ...... گورا گورا، خوبصورت۔

ــــ تم بھی سندر ہو...... مجھ سے کہیں زیادہ۔ گلتانی مسکرائی گالوں میں گڑھے پڑ گئے۔

گلتانی نے کہا: میں تو کالی ہوں۔

کالی ہو اسی لئے تو اور بھی خوبصورت لگتی ہو۔ تمہارا جسم، ناک، آنکھیں، چہرہ، بال، "ڈول" (گال کا گڑھا) سب مل ملا کے بے مثال ہو تم۔

"ڈول"؟ ڈول کیا؟

تم جب ہنستی ہو تو تمہارے گال میں جو......

اوئی! ہنستے وقت گال میں گڑھے پڑ جانا؟

گلتانی کھلکھلا کے ہنس دی، کیا اسے "ڈول" کہتے ہیں؟

گلتانی پھر ہنسی۔

ہنسیں کس بات پر ؟

آپ کی بات سن کر۔ بڑا پیارا لفظ ہے ......"ڈول"

فقط لفظ ہی پیارا نہیں...... وہ خود بھی بہت پیارا ہے۔

گلتانی نے آنکھیں نیچی کر کے کہا: ہنستے وقت جن لڑکیوں کے گال میں گڑھے پڑ جاتے ہیں وہ تو بدنصیب ہوتی ہیں ......

شوہران کے زندہ نہیں رہتے۔

کون کہتا ہے ؟

سب ہی کہتے ہیں ... میں بھی جانتی ہوں۔

غلط، بالکل جھوٹ۔ گال میں "ڈول" تو جیتے پن کی علامت ..... ایسی لڑکیاں پتی کو بہت پیاری ہوتی ہیں۔

مراد ہنسا۔

گلتانی کی بڑی بڑی آنکھیں خاموش مراد کا منہ دیکھتی رہیں

سعید پور گاؤں کا گاؤں مشتعل ہو گیا ہے۔ گاؤں والے بپھرے ہوئے ہیں۔ نشانہ مراد ہے۔

رات کے ایک بجے۔

مراد بستر پر چپ چاپ پڑا ہے آنکھوں میں نیند نہیں۔ گھر کے میں شمع جلتے جلتے ختم ہونے پر ہے۔ باہر چاروں طرف گھپ اندھیرا۔ موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ بہت سے جھینگر بلند اور کرخت آواز میں چلا رہے ہیں۔ کبھی کبھی گیدڑ کے بولنے اور ساتھ ہی کتے کے بھونکنے کی سنائی دیتی ہے۔ کہیں دور بجلی گری۔

یہ تو واقعی بری بات ہوئی۔

مراد نے اٹھ کر اپنچی کیس سے ایک نئی موم بتی نکال کے جلا سگرٹ سلگا کے کمرے میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ کسان جس طرح بگڑے ہیں۔ اگر مجھے مار بھی ڈالیں تو عجب نہیں۔ تصویر کھینچنا ان کی نظر میں ہی پاپ ہے۔ اس پر ایک نوجوان لڑکی کو ماڈل بنا کر تصویر کھینچنا! چھوکرے تو ابھی ابھی دھمکی دے گئے ہیں۔ دو ایک بوڑھے بزرگ بھی آئے تھے۔ چھوکروں کا غصہ ہی شاید تیز ہے۔ ہوتا ہی ہے۔

مراد نے ختم شدہ سگرٹ کا آخری کش لے کر اسے پھینک دیا۔ دوسرا سگرٹ سلگا کر بچھونے پر آ بیٹھا۔

"پیرس میں بیشک ایسی باتیں عام ہیں۔ مگر ہمارے ملک میں تو بڑے بڑے شہروں میں بھی جو لڑکیاں یا عورتیں ماڈل بن کے روپیہ کماتی ہیں ہرگز شریف گھرانے کی نہیں سمجھی جاتیں۔ تو پھر میں نے کیوں ایسا احمقانہ کام کیا لیکن قصور تو دراصل لڑکی کا ہے۔ اس نے خود ہی تو مجھ سے اپنی تصویر کھینچنے کو کہا! پھر خود ہی شکایت کر دی۔ یہ لونڈیا بہت پاجی نکلی۔ البتہ اسے اس بات کا سان گمان بھی نہ ہو گا کہ میں اسے ایک جانگیا دوں گا

(باقی صفحہ ۵۴ پر)

افسانہ

کشمکش

حامد علی خاں

"کیوں بھئی۔ تھر میں بارش ہوئی؟" ہر جانی پہچانی صورت سے اللہ ڈنو کا پہلا سوال یہی ہوتا۔ وہ سارا دن کارخانے میں اور رات سٹیشن پر گذارا کرتا۔ تھر کی طرف سے آنے والے مسافروں کی تلاش کرتا اور طویل سندھی علیک سلیک کے بعد جو اسے ان دنوں گراں گزرتی، پہلا سوال یہی کرتا تھا۔ جولائی کے مہینہ کے ساتھ ہی اللہ ڈنو کا دل شہری زندگی سے اچاٹ ہو جاتا۔ وہ عید پور خاص میں بھی صبح شام غیر متغیر نیلے آسمان اور بھورے افق کو دیکھا کرتا اور تھر کی سمت دیکھ کر بارش کے اندازے لگایا کرتا۔ اس کا بس چلتا تو وہ دن کی گاڑیوں سے بھی مسافروں سے برسات کا حال ضرور پوچھتا۔ سٹیشن پر وہ اس وقت تک ٹھہرتا جبتک آخری گاڑی کے سارے مسافر باہر نہ چلے گئے ہوں۔ اسے پچھلے دو سال سے مایوسی ہو رہی تھی۔ دو سال پہلے قحط کے حالات میں بادلِ ناخواستہ تھر چھوڑ کر وہ شہر آیا تھا۔ کارخانہ میں کام مشکل سے ملا تھا لیکن اب بھی وہ بارش کی خبر سنکر اپنے ریگستان کو لوٹنے کے لئے بے تاب تھا۔

اب کی بار تیسرے سال اسے قوی امید تھی کہ بارش ضرور ہوگی اور وہ اپنے گاؤں رتن کا تڑ جا کر ریتیلے پہاڑوں کے درمیان گھری ہوئی وسیع زمین کو کاشت کرے گا اور باجرے کی مرغوب لہلہاتی فصل لگائے گا۔ سٹیشن سے لوٹتے وقت اس کے پیروں میں فولادی طاقت آگئی۔ تیز قدموں سے جب وہ گھر میں داخل ہوا تو منتظر بیوی نے شکایت کے لہجے میں کہا "آجکل رات گئے آتے ہو، ٹھنڈی روٹی کیا خاک اچھی لگے گی؟"

"اری جنت! تھر میں خوب برسات ہوگئی۔ اب یہ گندم کی روٹی کھا کر کون بیمار پڑے۔ جانو تجیر کا بیٹا عرب آج سٹیشن پر ملا تھا۔ کہہ رہا تھا ہمارے مکان کے ٹیلہ پر ٹخنے برابر گھاس اگ آئی ہے۔"

جنت نے ایک لمبی ہوں بھری، وہ گویا نیم رضامندی کے انداز میں پوچھ رہی ہو، اب کیا ارادہ ہے؟ کیا تھر چلو گے؟

اللہ ڈنو کہے جا رہا تھا "اور وہاں، عرب کہہ رہا تھا کہ منارو کے پاس ہمارے جانور اچھی طرح ہیں۔" "گائے نے کیا جنا؟" جنت نے پوچھا۔

"بچھڑا۔ عرب نے تبلایا کہ منارو نے مشہور کر رکھا ہے کہ بچھڑا مر گیا لیکن چوری چھپے اپنی سسرال بھیجدیا ہے۔ اب جاتے ہی اپنے جانور اس مردود کے شکنجے سے چھڑا لوں گا۔"

اللہ ڈنو خوشی سے چہک رہا تھا۔

"روٹی کھالو" بیوی نے رکابی تھماتے ہوئے کہا۔

"خدا کی قسم جنت! باجرا نہ کھا کر دو سال گذر گئے۔ اب کی بار میں صرف باجرا بوؤں گا۔ تر بوز بھی تھوڑے سے بو لوں گا۔ گوار بالکل نہیں۔"

"کیا جانوروں کو بھوکا مارو گے؟ گوار تو بونی ہی پڑے گی۔" جنت نے اعتراض کیا۔ اسے اٹھتا دیکھ کر پوچھنے لگی "بس۔ دو ہی لوالے تو کھائے ہیں۔"

"ہوں نہوں ہوں" اس نے چباتے چباتے نفی میں سر ہلایا اور پہیلیوں کی طرح کہنے لگا "ذرا حساب لگا کر دیکھتا ہوں کہ اپنے جانور منارو سے مل سکیں گے"۔ یہ کہتے ہوئے وہ ایک پٹاری اٹھالایا اور رقم گننے لگا۔ اطمینان کا سانس لیکر اللہ ڈنو نے کہا "دھنی کی مہربانی سے تین سو ہیں۔ منارو کو دے کر اور سفر کا خرچہ چھوڑ کر پچاس، ساٹھ بچ رہیں گے۔"

"اگر منارو انکار کر جائے تو؟"

"میں برادری میں فیصلہ کرواؤں گا! اگر برادری نہ مانے تو میں پیر صاحب سے فریاد کروں گا۔"

"ہاں پیر صاحب سے ضرور عرض کرنا" خوش عقیدہ جنت کو

آخری ترکیب بہتر معلوم ہوئی۔

"تم کو پانی کی رقم تو ضرور دینی پڑے گی اللہ ڈنو۔" رتن کا نتر کے مکھی کمال جونیجو نے فیصلہ کن تجویز پیش کرتے ہوئے برادری کے ارکان سے کہا "پچھلے دو سال سے ڈکار (قحط) تھا۔ کنوئیں پر پہرے دار بٹھانے سے پانی مہنگا پڑا تھا۔ متارو نے دو سال تک تمہارے جانوروں کی دیکھ بھال کی۔ دو بیل اور ایک گائے کا دو سال کے لئے کیا خرچ بیٹھے گا؟ یہ آپ لوگ طے کریں گے۔"

"میں برادری کی ہر بات ماننے کو تیار ہوں۔ جو کچھ پانی کا حساب لگے گا وہ میں اسی وقت سب کے آگے دینے کو تیار ہوں۔ لیکن متارو کو بھی جانور سب کے سامنے اسی وقت حوالے کرنے ہوں گے۔" اللہ ڈنو نے اپنی شرائط گاؤں والوں کے آگے رکھ دیں۔

"سائیں سگورا" متارو نے جونیجو کی خوشامد کرتے ہوئے کہا "آپ بھولتے ہیں کہ ان تین جانوروں کے علاوہ ایک بچھڑا بھی چھ مہینے تک زندہ رہا۔ اس کا حساب بھی تو ہونا چاہیئے۔"

"یہ جھوٹ ہے کہ بچھڑا مر گیا ہے۔ تم نے اسے کہیں چھپا دیا ہے۔ مجھے سب کچھ پتہ ہے۔" اللہ ڈنو نے کہا "تو بتاؤ کہاں ہے؟" متارو نے بھی جھوٹ کا خود اعتمادی سے دفاع کیا۔

"تمہارے سسرال میں کسی نے یہاں اسے مردہ نہیں دیکھا" اللہ ڈنو نے جواب دیا۔

"ہم نے دیکھا ہے"۔

"ہم نے بھی مردہ دیکھا ہے"

"ارے وہ! میں نے ہی تو اس کی کھال کھینچی تھی"۔

یکے بعد دیگرے متارو کے ہوا خواہ گواہی دینے لگے۔ ابھی یہاں تک بحث ہونے پائی تھی کہ لوگ ایکدم اٹھ کھڑے ہوئے اور ہر طرف سے "سائیں بسم اللہ" "سائیں بسم اللہ" کہہ کر سلام کیا جانے لگا۔ اللہ ڈنو کی فریاد سننے کے لئے پیر صاحب یعنی سائیں بادشاہ بھی اپنے گوٹھ سے آچکے تھے۔ اللہ ڈنو نے بڑھ کر اونٹ کی مہار تھام لی اور پیر صاحب سب کو شرف قدم بوسی بخشتے ہوئے ریت کے سنگھاسن پر براجمان ہو گئے۔ مکھی جونیجو کو اپنی کرسیٔ صدارت چھن جانے کا بری طرح احساس ہو رہا تھا لیکن پیر کے آگے دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ متارو بھی مایوس ہو گیا۔ اسے اب پانی کے دام حسب دلخواہ ملنے کی امید نہ تھی۔ مکھی کی تمہید موثر تھی۔ برادری بھی پانی کی مہنگائی کی بات مان گئی تھی لیکن پیر صاحب سے خدشہ تھا کہ بات میں بات نہ پیدا کریں۔ پنچایت کا دوبارہ آغاز ہوا۔ طرفین نے صورت حال کی اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے وضاحت کی۔ پہلا مسئلہ یہ تھا کہ بچھڑا واقعی مر گیا یا متارو کے پاس موجود ہے۔ متارو نے اپنے گواہ پیش کئے۔

"ہا سائیں بادشاہ" تیسرے گواہ نے کہا "اس کی کھال میں نے خود اتاری ہے"۔

"وہ کھال کس کے پاس ہے؟" پیر صاحب نے دریافت کیا۔

"متارو کے پاس" گواہ نے کہا۔

"کھال کی قیمت بچھڑے کے چھ مہینے کے پانی کے خرچ سے بہت کم ہے۔ باقی جانوروں کا خرچ بھی کھال کی قیمت میں سے وضع ہونا چاہیئے"۔

مجمع سے "سبحان اللہ" اور "ماشاء اللہ" کی تائیدی صدائیں بلند ہوئیں۔ پیر صاحب نے متانت سے اپنا استدلال جاری رکھا۔ جب بچھڑا چھ مہینے تک زندہ تھا تو متارو نے اس کا دودھ بھی استعمال کیا ہوگا۔ معاملہ میں صرف جانوروں کی نگرانی کا خرچ ہے۔ دودھ کا حق اللہ ڈنو کو پہنچتا ہے ــــ کھال اور دودھ کی قیمت پانی کے خرچ میں سے کم کر لینی چاہیئے"۔

"الحمدللہ، بہت ٹھیک ہے" حاضرین میں سے چند نے کہا۔

"پانی کا حساب کس بھاؤ سے لگایا جائے؟" کسی نے دریافت کیا۔

"پانی کی مہنگائی کا سوال تو وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں کہ تنخواہ یاب پہرے دار بٹھائے گئے ہوں۔ رتن کا نتر میں تو سب نے مل کر نگہبانی کی۔ خرچ تو اس سے لینا چاہیئے جو پہرے داری سے انکار کرتا۔ اللہ ڈنو تو گاؤں میں تھا ہی نہیں۔ اس سال وہ اپنی کسر پوری کر دے گا۔ لہذا وہی دام لگائے جائیں جو سب نے پچھلے دو سالوں میں ادا کئے"۔ پیر صاحب نے اثبات میں ہلتے ہوئے سروں کے درمیان اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"اللہ سائیں! مڑی خیر" اللہ ڈنو نے شکر اور احسانمندی کے جذبات سے کہا اور رقم گننے لگا۔ متارو کا منہ نکل آیا۔ قرضہ کی رقم اور دیگر واجبات سے زیادہ اسے کچھ نہیں ملا وہ کھسیانے پن سے

اپنا بگڑ درست کر رہا تھا۔

جنت گائے پا کر اتنی ہی خوش تھی جتنا اللہ ڈنو اپنے دو بیلوں سے۔ یہ دن بھر اپنے کھیت میں مست رہتا اور وہ اپنی کٹیا میں مگن۔ جنت نے دو بکریاں بھی پال لی تھیں۔ گائے اور بکریوں پر جان چھڑکتی صبح ہوئی اور دونوں نے لسی سے اپنا پیٹ بھر لیا۔ وہ کھیت کی طرف روانہ ہو جاتا اور جنت اپنے چوپائے لے کر دور ایک نئے ٹیلے کی طرف نکل جاتی۔ وہ مشکل سے مشکل اونچائی تلاش کرتی کیونکہ وہاں کی گھٹنے گھٹنے ہری گھاس کو کسی نے چھوا نہ ہوگا۔ انہیں اطمینان سے چرتا چھوڑ کر جنت گھر لوٹ آتی۔ دوپہر ہونے تک نمکین باجرے کی روٹی تیار کرتی۔ مکھن لسی پیاز اور پانی لے کر وہ اللہ ڈنو کی طرف روانہ ہو جاتی۔ ایسے میں وہ ایک سندھی لوک گیت کی مجسم تصویر نظر آتی:۔

"میرے محبوب! تو اگر راضی ہو تو میں تیری رانی بن جاؤں
تجھے روٹی کے ساتھ مکھن لگا کر دوں گی۔

اور ہوا میں تنکا بن کر تیری آنکھوں میں بچھ جاؤں گی"۔

آدھا راستہ طے کرنے کے بعد وہ "ہو۔ہو۔ہو" کی آوازیں لگاتی۔ اللہ ڈنو کی جوابی آواز سنکر اسے اس کی جگہ کا پتہ چل جاتا اور وہ باجرے کی فصل کو چیرتے ہوئے اس تک پہنچ جاتی۔

"کتنی گھاس جمع کی؟" وہ پوچھتی۔

"اب کی بار گھاس بہت ہے۔ اکھیڑتا ہوں پھر اگ جاتی ہے لیکن فصل کو زیادہ نقصان نہیں پہنچے گا"۔

"خدا کرے ابکی بار تمہیں شہر جانا نہ پڑے۔ میں بھی تمہارے ساتھ گھاس اکھیڑ دوں گی"۔

"اگر یہ فصل پوری کی پوری ہاتھ لگ گئی تو کبھی نہیں جاؤں گا۔ سال بھر کا غلہ رکھ کر ہم تین گائیں آسانی سے خرید سکتے ہیں"۔

"کیا چارہ کافی ہو جائے گا؟"

"چارہ تو پانچ جانوروں کا نکل سکتا ہے۔ دیکھتی نہیں فصل تیرے سر کو چھو رہی ہے"۔

"تو باقی گھاس میں ہم اپنی جھونپڑی درست کرلیں گے"۔ جنت مستقبل کے نقشے بناتی۔

"ہاں۔ ہاں۔ ضرور"۔ وہ کھاتے ہوئے انبساط و مسرت سے سر ہلاتا۔

شام تک دونوں کام کرتے۔ اللہ ڈنو کمر جھکا کر کمان بن جاتا اور گھنٹوں کدال سے گھاس اکھیڑتا۔ جنت اس کے پیچھے پیچھے اکھڑے ہوئے ڈھیلوں سے لمبی گھاس جمع کرتی تاکہ ان سے اپنی کٹیا کے سوراخ بند کر سکے۔ پھوس کی دیواروں کو گھاس کا پیوند ہی تو چاہئے۔ ریگستان میں برسات کا سورج کم گرم نہیں ہوتا۔ اللہ ڈنو کے ریلے چھوٹ جاتے، کدال کی ہتھی پسینہ سے گیلی ہو جاتی اور وہ بار بار اپنے ہاتھ گرم ریت میں گھسیٹ کر خشک کرتا اور پھر کدال چلنے لگتی۔ جب وہ پسینہ خشک کرنے کے لئے بیٹھتا تو جنت اس کے لئے تربوز توڑ لاتی۔ مکا مار کر اس میں سوراخ کر دیتی اور تربوز کا پیالہ اس کے ہونٹوں سے لگا دیتی۔ پانی پی چکنے کے بعد اس کے دو حصے کر دیتی۔ ایک اپنے لئے اور ایک اللہ ڈنو کے لئے۔ دونوں خوب کھرچ کھرچ کر کھاتے، ایک دوسرے پر چھلکے پھینکتے اور ستا کر پھر دھرتی کا سینہ چیرنے لگ جاتے۔ جونہی سورج ریت کے پہاڑ نما ٹیلوں کو چومنے لگتا جنت کھیت چھوڑ کر مویشی لانے کے لئے نکل پڑتی۔ اللہ ڈنو دن بھر کی گھاس سر پر اٹھائے اس کے ساتھ ہوتا۔ ٹیلوں پر اترتے چڑھتے، اپنی زندہ دولت لئے، شام کے گجر کے ساتھ اپنے گھر پہنچتے۔ کام کاج کی تقسیم رضاکارانہ طور پر ہوتی۔ جنت نانِ شبینہ کا اہتمام کرتی اور اللہ ڈنو مویشی باندھ کر، دودھ دوہ کر، حقہ تیار کر لیتا۔ کٹیا کے باہر چھٹکی ہوئی چاندنی میں اپنی لہلہاتی کھیتی کی طرف رخ کئے امیدوں کے تانے بانے بنتے ہوئے دونوں محوِ خواب ہو جاتے۔ کون جانے ان دلوں میں کیسی کیسی آرزوئیں ملتی ہوں گی۔ لیکن ان کی تمناؤں کی شادابی زمین کی سرسبزی سے وابستہ رہی ہے، شاہ لطیف نے ان کے دلوں کو پا لیا تھا۔ تبھی تو دعا فرماتے ہیں:۔

"میرے مولا! سندھ پر کرم کی نظر کیجو
اے دوست! اے دلدار! سارے عالم کو شاداب رکھیو!"

اونٹ کی دہاڑ، تھلے جنت کا انتظار کرتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔ اس کے کانوں میں اب بھی جنت کی دردناک آواز گونج رہی تھی۔

"گھوڑا رے! گھوڑا رے!" جنت کی ہائے ہائے سن کر وہ جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔

"ٹکڑ۔ ٹکڑ۔ گھوڑا رے!" جنت اٹکا دکا اڑتی ہوئی ٹڈیوں کی

(باقی صفحہ ۵۹ پر)

افسانہ:

"اپنا گھر"

انور عنایت اللہ

رضیہ کو کئی گھنٹوں کی مسلسل بےچینی کے بعد نیند آئی تو ذکیہ نے چپکے سے روشنی گل کر دی، دریچے بند کر دیئے، بھاری مخملی پردہ کھینچا اور پھر کمرے سے باہر آ گئی۔

ڈرائنگ روم کی کھڑکی ایک بجا رہی تھی اور رات بے حد خاموش تھی۔ دن بھر کی دوڑ دھوپ نے شاہد کو بری طرح تھکا دیا تھا اور اب اسی کے اصرار پر وہ سو رہا تھا۔ ڈرائنگ روم میں تاریکی تھی لیکن اس سے ملحق برآمدے میں روشنی تھی۔ میز پر نئے مکان کے نقشے اب بھی یوں ہی پڑے تھے۔ ابھی وہ اور شاہد بیٹھے ان نقشوں کا مطالعہ کر رہے تھے کہ یکایک انہیں ایک چیخ سنائی دی۔ وہ تیزی سے اٹھ کر باہر آئے تو انہیں رضیہ نظر آئی جو سیڑھیوں سے قریب خون میں نہائی گٹھری سی پڑی تھی۔ وہ حسب عادت بھاگتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی کہ اس کا پیر پھسلا اور وہ لڑھکتی ہوئی نیچے آ رہی۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ بچ جائے گی لیکن شاید عمر بھر کے لئے اس کے دائیں پیر میں نقص رہ جائے۔

ذکیہ نے میز کا سہارا لے کر ٹھنڈا سانس لیا۔ یہ پچھلے چند گھنٹے قیامت کے گذرے تھے۔ وہ بری طرح نڈھال ہو رہی تھی۔ اس نے سارے نقشے سمیٹے اور انہیں ایک بار پھر الماری میں بند کر دیا۔ جب تک رضیہ مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہو جاتی انہیں الماری ہی میں بند رہنا ہوگا۔ ذکیہ نے سوچا اور وہ برآمدے کی روشنی گل کر کے دوبارہ رضیہ کے کمرے میں لوٹ آئی۔ نئے مکان کے یہ نقشے پچھلے سولہ سال سے یوں ہی بنتے اور الماری میں بند ہوتے رہے تھے۔ آج رضیہ کے قریب صوفے پر نیم دراز لیٹ کر، آنکھیں بند کئے ذکیہ کو وہ دن شدت سے یاد آیا جب پہلی بار شاہد کے سینے سے لگ کر آنکھیں بند کئے سکون اور آسودگی کا ایک طویل سانس لیتے ہوئے اس نے آہستہ سے شاہد کو یقین دلایا تھا کہ اسے بھی شاہد سے بے انتہا محبت ہے۔ اسی دن پہلی بار ایک ایسے ہی مکان کا نقشہ اس کے ذہن میں ابھرا تھا۔ ان کی شادی اب سولہ سال ہو رہے تھے۔

شاہد ایک فوجی باپ کا بیٹا تھا جس کی کوٹھی میں آجکل یہ لوگ مقیم تھے۔ شادی کے وقت کرنل واجد زندہ تھے۔ ان کا تو ابھی پچھلے ہی سال انتقال ہوا تھا۔ بڑے وضع دار اور زمانہ شناس بزرگ تھے۔ شادی کے بعد ذکیہ دلہن بن کر اسی کوٹھی میں آئی تھی۔ یہ دو منزلہ کوٹھی تھی تو قدیم وضع کی لیکن کرنل واجد کافی خوش ذوق انسان تھے۔ انہوں نے اپنے انجینئر بیٹے کی مدد سے اس میں بہت سی تبدیلیاں کر کے اسے خوبصورت اور آرام دہ بنا لیا تھا۔ چونکہ وہ گٹھیا کے مریض تھے اس لئے ان کی خوابگاہ نچلی منزل پر ہی تھی انہوں نے دوسری منزل کی سب سے خوبصورت خوابگاہ بہو بیٹے کے حوالے کر دی تھی۔ کوٹھی سے ملحق باغیچہ تھا جس کی بہت اچھی طرح سے دیکھ بھال ہوتی رہی تھی۔ ڈرائنگ روم کی بڑی کھڑکی سے باغ کی حسین ہری ہری روشیں بے حد بھلی لگتیں، جن سے ذرا پرے ایک حسین فوارہ تھا۔ شادی کے بعد اس خاموش کوٹھی میں منتقل ہو کر ذکیہ نے ایک عجیب سکون محسوس کیا تھا۔ لیکن چند ہفتوں کے قیام کے بعد باپ بیٹے بہو کے لئے شہر میں ایک خوبصورت فلیٹ کرایہ پر لے دیا جو شاہد کے دفتر سے قریب تھا۔ دونوں اپنی ایک علاحدہ خوبصورت دنیا میں منتقل ہو گئے جہاں ان کی آزادی میں مخل ہونے والا کوئی نہ تھا۔

اس فلیٹ میں منتقل ہونے کے فوراً بعد، ذکیہ کو ایک بار پھر اپنے گھر کی آرزو ہوئی تھی اور صرف اسی آرزو سے متاثر ہو کر شاہد نے شہر کے مضافات میں زمین خریدی تھی۔ اسی فلیٹ میں گھنٹوں دونوں اپنے نئے گھر کے نقشے تیار کرتے، اسکیمیں بناتے بحثیں کرتے اور ان دلچسپ باتوں کے دوران مستقبل کے سہانے خوابوں میں کھو جاتے۔

کئی دنوں کی محنت اور بحث مباحثے کے بعد کوٹھی کا پہلا نقشہ تیار ہوا تھا۔ بارشیں شروع ہو چکی تھیں۔ بارشوں کے فوراً بعد گھر کی تعمیر کا کام شروع کرنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ یکایک گھر کی تعمیر میں پہلی رکاوٹ پیدا ہوئی۔

ایک دن شاہد خلاف معمول وقت سے پہلے ہی دفتر سے لوٹ آیا تو ذکیہ پریشان ہو گئی۔ شاہد کا چہرہ قدرے اترا ہوا تھا۔ اس نے آتے ہی اداسی سے اپنی فائل ایک طرف رکھ دی اور آہستہ سے اسے یہ بری خبر سنائی تھی کہ اس کی ملازمت جاتی رہی۔ جنگ کے خاتمے پر تمام محکموں میں تخفیف ہو رہی تھی اور وہ اسی تخفیف کا شکار ہو گیا تھا۔

کرایہ کا فلیٹ چھوڑ دیا گیا اور دونوں ایک بار پھر کرنل واجد کے یہاں منتقل ہونے پر مجبور ہو گئے۔ نئے مکان کے نقشے پہلی بار الماری میں بند کر دیئے گئے اور ملازمت کی تلاش شروع ہو گئی۔

دو مہینوں کے اندر اندر شاہد کو ایک بڑی فرم میں ملازمت مل گئی تنخواہ کچھ کم تھی لیکن مستقبل میں ترقی کی امید تھی۔ ایک بار پھر نئے گھر کے نقشے تیار ہونے لگے۔ شاہد اپنے باپ سے روپے لینے کے حق میں نہیں تھا۔ پہلے تو امید تھی کہ حکومت سے قرض مل جائے گا۔ اب وہ امید بھی جاتی رہی تھی۔ پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ پچھلے نقشوں کے مطابق مکان تیار ہوتا۔ اس لئے شاہد نے ایک اور نقشہ تیار کیا۔ ایک بار پھر ایک نئے گھر کے خواب دیکھے جانے لگے۔ دونوں کو کرنل واجد کے یہاں ہر طرح کا آرام تھا۔ باپ کو اپنے اکلوتے بیٹے سے بڑی محبت تھی۔ بہو نے اپنے سگھڑاپے سے خسر کا دل موہ لیا تھا۔ خود ذکیہ کو کرنل واجد بہت پسند آئے۔ وہ ہر بات میں بہو کی رائے کو اہمیت دیتے۔ اس سے مشورے لیتے اور ہمیشہ وہی کرتے جو ذکیہ کو پسند ہوتا۔ ان تمام باتوں کے باوجود، ذکیہ کے دل میں ایک علیحدہ گھر کی آرزو پرورش پاتی رہی۔ نقشے تیار ہو گئے تو اس نے شاہد کو راضی کر لیا کہ وہ تعمیر کا کام اپنی نگرانی میں فوراً شروع کر دے۔

ٹھیکہ داروں سے ساری باتیں طے ہو گئیں اور کام شروع ہونے میں چند ہی دن رہ گئے تھے کہ یکایک اس کی طبیعت بگڑی۔ دو ایک دن تو اس نے شاہد سے یہ سب کچھ چھپائے رکھا لیکن تا کجے؟ طبیعت روز بروز اور بگڑتی گئی۔ بوڑھے کرنل نے پریشان ہو کر فوراً ڈاکٹر کو بلوایا اور ڈاکٹر نے لیڈی ڈاکٹر کو۔ لیڈی ڈاکٹر نے پوری طرح اطمینان کر لینے کے بعد چپکے سے شاہد کے کان میں مبارکباد دی ——

جب کافی علاج کے بعد بھی ذکیہ کی طبیعت نہیں سنبھلی اور سخت گرمیاں شروع ہو گئیں تو بیوی کی خاطر شاہد نے رخصت لی اور دونوں پہاڑ چلے گئے اور نئے مکان کا نقشہ ایک بار پھر الماری میں بند کر دیا گیا۔

اسی طرح یہ نقشہ بنتا اور بگڑتا رہا اور اب تو شادی کو سولہ سال ہو رہے تھے۔ ان کی پہلی لڑکی رضیہ اب پندرہ سال کی تھی اور آج صبح بری طرح سے زخمی ہو کر نیم بیہوش پڑی تھی۔ اس کا دوسرا بچہ حامد اب چودہ سال کا تھا اور نویں میں پڑھ رہا تھا۔ کرنل واجد کا انتقال ہو گیا تھا اور اب شاہد اپنی فرم میں چیف انجینئر تھا۔ اس کے بال کنپٹیوں پر سے سفید ہو گئے تھے اور ذکیہ کے سر میں بھی کئی سفید بالوں کی لٹیں ابھر آئی تھیں۔ اب تک وہ کرنل واجد ہی کی کوٹھی میں مقیم تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ نیا مکان بن جائے تو اسے فروخت کر دیں۔ کئی سال کے بعد اب شاہد نے ایک بار پھر بڑی محنت سے نئے مکان کا نقشہ تیار کیا تھا۔ اب تو اس نے وہ پرانی زمین فروخت کر کے شہر کی ایک نئی ابھرتی ہوئی کالونی میں ایک بڑا پلاٹ خرید لیا تھا۔ آج صبح وہ اس نئے نقشے کے متعلق ہی خوشی کے قہقہوں کے درمیان بحث کر رہے تھے کہ یکایک انہیں رضیہ کی چیخ سنائی دی تھی۔

رضیہ نے بے چینی سے کروٹ لی تو اس کے منہ سے ہولے سے آہ نکل گئی۔ شاید وہ اب ہوش میں آ رہی تھی اس کی کراہ سے ذکیہ چونک گئی، اس نے اٹھ کر رضائی درست کی اور جھک کر غور سے اسے دیکھا۔ اس کا سر اور چہرہ پٹیوں سے ڈھکا ہوا تھا، آنکھیں بند تھیں اور چہرہ زرد۔ ذکیہ نے فرطِ محبت سے بے چین ہو کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا جو بری طرح تپ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کی ٹھنڈک شاید رضیہ کو بھلی لگی اور اس کے ہونٹ آہستہ سے کھلے "مجھے سونے دو حامد —— سونے دو، تمہاری شرارتوں سے میں تنگ آ گئی ہو۔ آنے دو ابو کو۔ امی کے لاڈ نے تمہیں بگاڑ رکھا ہے" وہ بڑبڑائی اور ذکیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے —— "سو جا میری بچی آرام سے سو جا۔ میں حامد کی ڈپٹائی کر دوں گی کہ ساری شرارتیں بھول جائے گا۔" وہ زیر لب بولی۔ یوں جیسے واقعی رضیہ ہوش میں ہو اور اس کی باتیں سن رہی ہو۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے اور نہ جانے کب تک وہ یوں ہی بیٹھی روتی رہی۔

یکایک اس نے اپنے شانے پر شاہد کا ہاتھ محسوس کیا تو سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ سامنے کھڑا تھا اور اس کے چہرے پر تھکن کے آثار نمایاں تھے۔ شاید وہ بھی سو نہ سکا تھا۔

"یہ کیا؟ خدا کے لئے ہمت سے کام لو۔ ہماری بچی اب بہتر ہے۔ ڈاکٹر نے مجھے یقین دلایا ہے کہ وہ اچھی ہو جائے گی۔ بہت جلد اچھی ہو جائے گی۔"

یہ کہتے ہوئے وہ اس کے قریب بیٹھ گیا اور اسے تسلی دینے لگا۔ صبح تک دونوں یوں ہی بچی کے سرہانے بیٹھے خدا سے اس کی زندگی کی بھیک مانگتے رہے۔ صبح کی روشنی کے ساتھ رضیہ کی طبیعت سنبھلنے

گئی اور آٹھ بجے تک وہ مکمل طور پر ہوش میں آ گئی۔ نو بجے ڈاکٹر نے اس کا ایک بار پھر معائنہ کیا اور ذکیہ کو تسلی دی کہ اس کی بیٹی خطرے سے باہر ہے۔ "زخم جلد اچھے ہو جائیں گے۔ لیکن شاید داہنے پیر میں نقص رہ جائے کیونکہ ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ ابھی تو کافی دن اسے بستر ہی میں رہنا ہوگا۔" اس نے جاتے ہوئے آہستہ سے شاہد سے کہا۔

ڈاکٹر چلا گیا تو ذکیہ نڈھال سی ہو کر بستر پر لیٹ گئی۔ لیٹتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی اور نہ جانے کب تک یونہی بیہوش سوتی رہی۔ نیند میں اس نے بے شمار خواب دیکھے۔ بار بار وہ حسین کوٹھی اس کے سامنے آتی رہی جس کی شادی کے بعد سے اسے بڑی آرزو تھی جس کے پچھلے پندرہ سولہ سال میں کئی نقشے بنے اور بگڑے۔ ان حسین خوابوں کے درمیان یکایک اسے رضیہ کی چیخ سنائی دی جو اوپر جاتے ہوئے سیڑھیوں پر سے نیچے لڑھک کر آ رہی تھی اور خون میں نہائی ہوئی خاموش گٹھڑی بنی پڑی تھی۔ رضیہ کی چیخ کے ساتھ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

چار بج گئے تھے اور اب دن ڈھل رہا تھا۔ آسمانوں پر کالے بادل چھائے تھے جس سے کمرہ قبل از وقت نیم تاریک ہو گیا تھا اس نے تھکی تھکی سی انگڑائی لی۔ رضیہ کے کمرے سے اب اسے باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے لیٹے ہی لیٹے آوازیں پہچاننے کی کوشش کی۔ شاہد کچھ کہہ رہا تھا چند لمحوں کے بعد حامد کی آواز آئی۔ اور پھر یکایک رضیہ کی دھیمی سی آواز آئی۔ اس کی آواز سن کر ذکیہ نے خدا کا شکر ادا کیا۔

وہ اس کے کمرے میں پہنچی تو رضیہ نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"کیا حال ہے میری بچی؟" وہ اس کے قریب تپائی پر بیٹھ گئی۔

"اچھی ہوں۔ صرف پیر میں سخت درد ہے۔" رضیہ نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ اس کے قریب شاہد بیٹھا تھا اور اس کے سامنے نئے گھر کا نقشہ پھیلا ہوا تھا۔ حامد اس پر جھکا ہوا غور سے اس کا مطالعہ کر رہا تھا۔

"ہم بڑی دیر سے باتیں کر رہے ہیں ذکیہ۔ تم بے خبر سو رہی تھیں اس لئے میں نے جگایا نہیں۔" شاہد نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر آیا تھا؟" ذکیہ نے رضیہ کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں آیا تھا۔ اب بخار کم ہے۔ ایک آدھ ہفتے میں انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گی۔" شاہد نے تسلی دی۔

"لیکن شاید میں کافی عرصے تک چل پھر نہ سکوں۔ ڈاکٹر سے میں نے پوچھا تو انہوں نے گول سی بات کر دی۔ مجھے معلوم ہے امی۔ میرے پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔" رضیہ آہستہ سے بولی۔ اس پر شاہد نے مڑ کر کہا۔

"ہڈی وڈی نہیں ٹوٹی بیٹی۔ بس ذرا زیادہ چوٹ آ گئی ہے۔ کچھ دنوں میں ٹھیک ہو جاؤ گی۔ ہاں ذکیہ۔ تمہارے آنے سے پیشتر ہم اپنے نئے گھر کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔" شاہد نے فوراً موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ اس کا فوراً خاطر خواہ اثر ہوا۔

"مجھے یہ پسند نہیں آیا امی۔ ویسے اچھا ہے لیکن نہ جانے کیوں مجھے کچھ عجیب سا لگا۔" رضیہ بولی۔ "میں اس میں تھوڑی سی تبدیلی چاہتا ہوں امی۔ میرا کمرہ بالکل ایسا ہی ہونا چاہیئے جیسا کہ یہاں ہے۔ یعنی کہ مکان کے دائیں حصے میں باغیچے کے ساتھ تاکہ میرے ہوائی جہاز کے کارخانے کے لئے گنجائش نکل سکے۔ لیکن ابا راضی نہیں ہوتے۔ کہتے ہیں، یہ تبدیلی کی گئی تو گھر کا نقشہ یعنی اس کی صورت بگڑ جائے گی۔" حامد نے بھی فوراً شکایت کی۔

"اور میرا کمرہ دوسری منزل پر ہے امی۔ میں آئندہ کبھی دوسری منزل تک جا بھی سکوں گی؟" رضیہ بولی اور یکایک شاہد کا چہرہ اتر گیا اور ذکیہ نے چونک کر شاہد کو دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دے۔

"مجھے علی الصباح طلوع ہوتے ہوئے سورج کی روشنی بہت بھلی لگتی ہے۔ اسی لئے مجھے اپنے اس کمرے کی بڑی کھڑکی بے حد پسند ہے۔ میرے کمرے میں ایسی ہی کھڑکی ہوگی نا ابو؟" رضیہ نے شاہد سے پوچھا۔ اور شاہد نے سوچا۔ اتنی بہت سی تبدیلیاں ممکن بھی ہیں؟ نئے نقشے میں تو ان چیزوں کا خیال نہیں رکھا گیا تھا۔ اس نے بچوں کے اعتراضات سن کر غور سے نقشے کا ایک بار پھر جائزہ لیا تو اسے پہلی بار یوں محسوس ہوا جیسے واقعی اس میں بہت ساری خامیاں رہ گئی تھیں۔ اسے ہمیشہ سے ایک علیحدہ لائبریری کی آرزو تھی لیکن اخراجات کم کرنے کی خاطر اس نے عمداً اس نقشے میں ڈرائنگ روم اور لائبریری کے لئے ایک ہی بڑا سا کمرہ وقف کر رکھا تھا۔ اب بچوں کے اعتراضات سن کر نہ جانے کیوں صرف ایک لمحہ کے لئے اس کا جی چاہا

پشتو رومان:

شہروز غزالہ (۳)

احمد فراز

نغمہ و رقص کے وسیلے سے
خود غرض دادرس کے دامن میں
رہی دن رات ہُن ہی برساتی
اور غزالہ نئی امیدوں پر
رقص کرتی رہی، تھرکتی رہی
گیت گاتی رہی، تڑپتی رہی

غزالہ:

تجھ بن کالی رین
ستائے جی تڑپائے
تجھ بن کالی رین
تڑپ تڑپ کر گھڑیاں بیتیں پل پل برسے آگ
کوئی ہنسے اور کوئی روئے اپنے اپنے بھاگ
ہم کو نہ آئے چین
ستائے جی تڑپائے
تجھ بن کالی رین
جیون دُکھ کی قید میں بیتا اب سکھ کی کیا آس
جی کو جلائے چُپ تنہائی کوئی نہ آئے پاس
نیر بہائیں نین
ستائے جی تڑپائے
تجھ بن کالی رین
چاروں اور اندھیارے برہن ڈوبے تارے چاند
آشاؤں کا اک اک دیپک پڑنے لگا ہے ماند
گیت بھئے ہیں بین
ستائے جی تڑپائے
تجھ بن کالی رین

ایک شب دادرس نہ تھا گھر پر
اور غزالہ اُداس بیٹھی تھی
اپنے ماضی کے واقعات میں گم
گم جہانِ تصورات میں گم
کہ اچانک فضا میں لہرائی
ایک مانوس اجنبی آواز!

آواز:

تیرے نگر میں آئیں مسافر
پگ پگ ٹھوکر کھائیں
گھور اندھیروں کی نگری میں
تیرا کھوج نہ پائیں

جب غزالہ نے یہ سنی آواز
یوں اچانک تڑپ اُٹھی جیسے
خواب سے کوئی چونک اُٹھتا ہے
ہولے ہولے قدم اٹھاتی ہوئی
آنے والی صدا کی سمت چلی
نیند میں جیسے کوئی چلتا ہے
جیسے بجھتا چراغ جلتا ہے

شمروز: آخر کار میرے دل کی فغاں
کھینچ ہی لائی تم کو جانِ جہاں!
کیا کہوں تیرے انتظار کے دن
کس قدر کرب ناک تھے لیکن
جی رہا ہوں کہ میری جان، ہو تم
میری دنیا مرا جہان، ہو تم

. . . .

مجھ سے مل کر اُداس کیوں تم ہو؟
چپ ہو کیوں کس خیال میں گم ہو؟

غزالہ: کیا بتاؤں تمہیں مرے شمروز!
جی جلاتا ہے اک نہ اک غم روز
میں ترے پاس بھی ہوں دور بھی ہوں
خوش بھی ہوں، دردِ غم سے چور بھی ہوں
کتنی ویراں ہے رہگذارِ حیات!
چاندنی ہے کہ آگ کی برسات!

شمروز: جانے کیا غم ستا رہا ہے تمہیں
کونسا روگ کھا رہا ہے تمہیں
چند لمحوں کی یہ ملاقاتیں
یہ فضائیں یہ چاندنی راتیں
بیت جائیں تو پھر نہیں آتیں
کاش! تم دل کے بھید پا جائیں
زندگی دو دلوں کے میل کا نام
مسکراؤ کہ دور ہیں آلام

غزالہ: یہ نظارے، یہ چاند، یہ تارے
بس فریب نگاہ ہیں سارے
گلستانوں میں، مرغزاروں میں
کوہساروں میں، آبشاروں میں
سخت کانٹوں میں، نرم پھولوں میں
تند موجوں، سُبک بگولوں میں
رقصِ شعلہ میں، رنگِ شبنم میں
مختصر یہ کہ سارے عالم میں
دل کی کیفیتوں کے آئینے
رکھ دیئے ہیں نظر فریبی نے
دل ہو گر خوش تو ظلمتیں بھی چراغ
دل حزیں ہو تو ماہتاب بھی داغ
جتنی رنج و خوشی کی باتیں ہیں
مختلف دل کی واردातیں ہیں
ایسے عالم میں سُکھ کی کیا امید

شمروز: خیر تم بے سبب ہو ناامید
گردشیں جب چلن بدلتی ہیں
گُل شدہ شمعیں بھی جلتی ہیں

. . . .

ہاں غزالہ وہ داورس کی سناؤ
کیا ہوئی اس سے کوئی بات بتاؤ

غزالہ: وہ مری ہر خوشی پہ غالب ہے
مجھ سے وہ سیم و زر کا طالب ہے
مجھ سے وہ عہد کر چکا ہے کہ جن!
اور میں دے چکی ہوں اس کو وچن
کہ مری ذات کی بدولت اگر
جمع کر لے وہ اتنا سیم اور زر
جس سے وہ زندگی سنوار سکے
رات دن چین سے گزار سکے
تو وہ مجھ کو کبھی نہ روکے گا
میں جدھر جاؤں وہ نہ ٹوکے گا
شرط مشکل ہے گو رہائی کی
پھر بھی تو آس ہے رہائی کی

شمروز: گر تمہیں اس کے قول پر ہے یقیں
فکر کرنے کی پھر تو بات نہیں
داورس گر وچن پہ قائم ہے
اپنے عہدِ کہن پہ قائم ہے
تو یہ لو سیم و زر کی تھیلی ہے
جو اُسے عمر بھر کو کافی ہے

غزالہ: نہیں شمروز یہ نہیں ممکن
تم مری زندگی سہی لیکن
یہ گراں بار میں اٹھاؤں گی
خود ہی اپنا وچن نبھاؤں گی
میرا دُکھ اپنے سر نہ لے کوئی
کیوں مری آگ میں جلے کوئی
کچھ دلوں کے ستم ہیں، یہ بھی سہی
جس طرح اور غم ہیں، یہ بھی سہی

شمروز: کیا مجھے غیر تم سمجھتی ہو؟
کس لئے مفت میں الجھتی ہو؟
اب یہ ضد چھوڑ دو مری مانو
دوستوں دشمنوں کو پہچانو
جاؤ اس دھن کو کام میں لاؤ
وقت کی پیشکش نہ ٹھکراؤ
یہ تمہارے لئے ہی لایا تھا
آج میں عہد کر کے آیا تھا
کہ میں اس داورس لٹیرے کو
رام دھن سے کروں گا پہلے تو
اور یوں بھی اگر نہ وہ مانا
پھر اسے یا مجھے ہے مرجانا

غزالہ: نہیں ایسا نہ تم کہو شمروز!
تم سلامت سدا رہو شمروز!
گر یہی فیصلہ تمہارا ہے
تو مجھے موت بھی گوارا ہے!
اچھا چلتی ہوں، تم یہیں ٹھہرو

(گھوڑے کی ٹاپ سنائی دیتی ہے
داورس غزالہ کو پکارتے ہوئے
قریب آجاتا ہے)

داورس آرہا ہے، چھپ جاؤ!

. . . .

داورس: ہوں! تو یہ آدھی آدھی راتوں کو
فاحشہ! کس سجن سے ملتی ہو؟
بدچلن! دھوکہ باز! مکارہ!
تجھے اپنا وچن بھی یاد نہ تھا

غزالہ: داورس تم ذرا مری بھی سنو
کیا تم اپنے وچن پہ قائم ہو؟

داورس: ہوں، مگر تم سی بدزبان سے نہیں
جس کو اپنی قسم کا پاس نہیں
میں وفا کس لئے شعار کروں
سچ! میں تجھ پہ اعتبار کروں؟

غزالہ: تم کو ناحق ہوا ہے مجھ پہ شبہ
اب بھی ہے عہد استوار مرا
یہ لو تھیلی، مری ضمانت ہے
مرے عہدِ کہن کی قیمت ہے
اور اب تم بھی اپنا قول نبھاؤ
حسبِ وعدہ مجھے نہ اور ستاؤ

داورس: اتنی دولت! کہاں سے لائی ہو
سچ کہو کس کے ہاں سے لائی ہو؟

غزالہ: اس سے کیا تم کو چاہیے جو کچھ ہو
تم کو دھن سے غرض تھی وہ یہ لو

داورس: ہوں! یہ زیور، یہ سیم و زر، یہ گہر
ٹھیک ہے یہ مری طلب تھی مگر
زندگی اس کے ماسوا بھی ہے
خواہشِ حسنِ دلربا بھی ہے
خواہشِ زر تو اک بہانہ تھا
مطلب اپنا تمہیں بتانا تھا

غزالہ: او کمینے! ذلیل! عہد شکن!
اس قدر بھی نمک حرام نہ بن
تیرا باطن نہ چھپ سکا آخر
مرد اگر ہے تو بات سے مت پھر

داورس: یہ ادائیں بھرے شباب کے ساتھ
پیاری لگتی ہو کچھ عتاب کے ساتھ

یہ جواں جسم، یہ شباب حسیں
میری دولت ہے میری ماہ جبیں!
تم کہیں اور جا نہیں سکتیں
مجھ سے دامن چھڑا نہیں سکتیں

شمروز: (سامنے آتا ہے)
چپ رہو! بد زباں ضمیر فروش!!
ایک عورت کے سامنے بہ خروش!
مرد اگر ہو تو سامنے آؤ
دست و بازو کا زور دکھلاؤ

داورس: اچھا! یہ وہ زمیں زادے ہیں
کہو اے دوست! کیا ارادے ہیں؟

شمروز: فیصلہ تم سے بد شعاروں کا
جن سے اجڑا ہے گھر ہزاروں کا
لو یہ خنجر ہے، سامنے آؤ
تم غزالہ! پرے چلی جاؤ

داورس: نوجواں! یہ جنوں نہیں اچھا
بے سبب قتل و خوں نہیں اچھا
کیوں دلوں میں کدورتیں بھر لیں
آؤ ہم تم مفاہمت کر لیں

شمروز: کس سے؟ ہم سے مفاہمت؟ کیا خوب!
کبھی یکجا ہوئے شمال و جنوب؟

داورس: ہے عبث زعم زندگانی پر
تم تو مغرور ہو جوانی پر
پھینکو خنجر، نہ اتنا دم کرو
کچھ جوانی پہ اپنی رحم کرو
باہر آؤ نہ اپنے آپے سے
خوف کھاؤ مرے بڑھاپے سے

شمروز: خیر باتوں سے اب نہ دھمکاؤ
جو بھی ہوتا ہے، ہونے دو، آؤ

داورس: ٹھہرو! یہ فیصلہ غزالہ کرے
چاہے کوئی جئے کہ کوئی مرے
وہ جسے چاہے اس کی ہو جائے
دکھ نہ ہوگا جسے بھی ٹھکرائے

شمروز: جو کہے گی وہ ماننا ہے ضرور

داورس: مجھ کو منظور ہے..... تمہیں؟

شمروز: منظور

غزالہ: مجھے شمروز سے محبت ہے

داورس: ٹھیک ہے اپنی اپنی قسمت ہے

شمروز: تم سمجھتے اگر تو پھر کیا تھا

داورس: میں غزالہ کو آزماتا تھا
گو اسے مجھ سے رابطہ کم ہے
مجھ کو اس کی خوشی مقدم ہے
جاؤ اب تم خوشی سے بیاہ کرو
تا قیامت جیو، نباہ کرو

غزالہ: سچ! مرے اچھے داورس، بابا!

داورس: اب بھی تم کو یقیں نہیں آتا
آؤ شمروز میرے پاس آؤ
آخری بار اب گلے لگ جاؤ

شمروز: (گلے ملتے ہوئے) تم بھی مجھ کو معاف کر دینا

(داورس خنجر بھونک دیتا ہے)

داورس: اپنے کرتوت کا صلہ لینا

شمروز: (کراہتے ہوئے) آہ!

غزالہ: شمروز....

داورس قہقہے لگاتا ہے

شمروز: آہ! دھوکہ..... آہ!

غزالہ: بزدل انساں نے اوچھا وار کیا

شمروز: دھندسی جم رہی ہے آنکھوں میں
روشنی کم رہی ہے آنکھوں میں
تم غزالہ کہاں ہو؟ پاس آؤ
آخری بار منہ تو دکھلاؤ

غزالہ: میں تمہارے قریب ہوں جانم!

شمروز: کتنا پیارا ہے موت کا... عالم!
مرتے دم تم بھی ہو قریب مرے

غزالہ: داغِ فرقت نہ دو حبیب مرے

شمروز: پھیلتا جا رہا ہے سایہ سا
اب تو کچھ بھی نظر نہیں آتا
الوداع... الوداع... جان مری!

داورس: تم ہو میری متاع، جان مری!
زخم رونے سے بھر نہیں جاتے
جانے والے کبھی نہیں آتے
سرد لاشوں سے کچھ نہیں ملتا
پھول مرجھا کے پھر نہیں کھلتا
آؤ زندہ دلوں کو پیار کرو
جینا سیکھو، خوشی شعار کرو

غزالہ: میں غمِ مرگ سے نہیں ڈرتی
اس لئے دل برا نہیں کرتی
جو غرض آشنا نہیں ہوتے
مر کے بھی وہ جدا نہیں ہوتے
پھول مٹ جائیں بو نہیں مٹتی
موت سے آرزو نہیں مٹتی
یہی خنجر لہو پیا جس نے
قتل شمروز کو کیا جس نے
اب مرا درد بھی مٹائے گا
مجھ کو شمروز سے ملائے گا!

(غزالہ خنجر فضا میں لہراتی ہے)

داورس: (خوفزدہ ہوکر) ٹھہرو! کیا کر رہی ہو، سوچو تو
کس لئے مر رہی ہو، سوچو تو

غزالہ: زندگی بے حبیب ننگِ طلب
مرگ با دوستاں ہے جشنِ طرب

داورس: خودکشی تم نہ کر سکو گی کبھی
میرے ہوتے نہ مر سکو گی کبھی
مجھے تم سے تو کوئی بیر نہیں

(خنجر کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے)

غزالہ: چھوڑ دو خنجر، دگرنہ خیر نہیں
اپنے ہاتھوں کو دور ہی رکھو

داورس: یہ نہ ہو گا.........

غزالہ: تو پھر مزہ چکھو

داورس: (کراہتے ہوئے) آہ! تو مارِ آستیں نکلی

غزالہ: آج حسرت مری کہیں نکلی
اب مرونگی کہیں سکون کے ساتھ
شکر ملا داورس کے خون کے ساتھ
اب بھٹکتی نہیں نگاہ مری
میرے شمروز! دیکھ راہ مری

(خنجر سینے میں پیوست کر دیتی ہے)

(دم توڑتے ہوئے)
زندگی بے حبیب ننگِ طلب
مرگ با دوستاں ہے جشنِ طرب

دور ان سرمئی پہاڑوں سے
ریگزاروں کی سرحدوں سے پرے
ایک سنسان سا خرابہ ہے
جس کی پھیلی ہوئی خموشی میں
جب کبھی چاندنی نکھرتی ہے
گھنگروؤں کی دبی دبی آواز
ایک نغمے کے روپ میں ڈھل کر
دفعتاً یوں... چیخ اٹھتی ہے!
(گھنگروؤں کی جھنک کے ساتھ
پس منظر سے آواز ابھرتی ہے)
پریت کے دکھ اپنا کر
ہم نے
کیا کھویا کیا پایا!

○

مرگِ شب

عبدالرؤف عروج

ہجومِ راہرواں — محوِ انتظارِ جرس
حدیثِ خوش نظراں — جلوہ ہائے پسِ نفس
سکوتِ شامِ غریباں، چمن سے تا بہ قفس
مگر جبینِ تمدن پہ روشنی کی لکیر
اسی طرح سے ابھرتی ہے جگمگاتی ہے

لہکتی جاگتی راہوں کی صندلیں باہیں
ہجومِ راہرواں کے لئے کشادہ رہیں
ہوئی گرد کی، طوفان کی رداؤں میں
چراغِ دیدہ و دل کی لویں بھی ڈوب گئیں

متاعِ ہوش لٹائیں بھی ہم تو کیا کہ ہمیں
بصد خرابیٔ جاں دلبروں کی راہ ملی
ملولِ شہرِ نگاراں، شکستہ خیمۂ گل
بہ اہتمامِ خلش، فرصتِ نگاہ ملی
ہر آفتاب کو ہم نے گلے لگایا تھا
ہر آفتاب سے ہم کو شبِ سیاہ ملی

جھپک رہی ہیں ستاروں کی نقرئی پلکیں
فضا میں گونج رہا ہے حسین سناٹا
اس آس پر کہ ہے نزدیک ہی دیارِ غزل
غمِ حیات نے اپنا کڑا سفر کاٹا

شہیدِ عشوۂ گلچیں، قتیلِ تیغِ نجات
ہر آرزو کی جوانی، ہر آرزو کی برات

جہانِ لالہ و انجم سے اٹھ رہا ہے دھواں
شمیمِ کوچۂ دلدار میں مہک بھی نہیں
یہ کون ساعتِ مایوس ہے کہ ہمسفرو
ہم اہلِ دل کو گمانِ بہار تک بھی نہیں
ہوائے سرد جہنم کی آنچ لاتی ہے
گلاب پیکر و شبنم سرشت نرم بدن
فروغِ شعلۂ سوزاں سے تلملاتے ہیں
ستیزہ کار اندھیروں میں ڈوب جاتے ہیں

ہمیں ہیں جلوہ فزائے حریمِ فکر و نظر
ہمیں ہیں نقش گرِ کائناتِ شام و سحر
ہمیں ہیں باعثِ شادابیٔ عروسِ بہار
ہمیں نے اپنے لہو سے چمن نکھارے ہیں
زبانِ راز میں کہیے جسے فرازِ رسن
ہمیں تو اس افقِ ناز کے ستارے ہیں
ہمیں ہیں لحنِ طرب زا ہمیں ہیں شورشِ نے
ہمارے ساز پہ تہذیب مسکراتی ہے

کسی سے بجھ نہ سکیں گے شگفتگی کے دیے
زمانہ بادِ صبا کو ہلاک کر نہ سکا
خزاں کے جور سے صبحِ بہار مر نہ سکی
ستم کا قافلۂ تیرگی ٹھہر نہ سکا
ہمیں یہ رات گراں رات کیوں ڈراتی ہے
کہ پھر جبینِ تمدن پہ روشنی کی لکیر
اسی طرح سے ابھرتی ہے جگمگاتی ہے

ثقافت:

اُچ

ایس فیروز

پنجاب کے پانچ دریاؤں کے سنگم پر ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، کھجوروں کے جھنڈوں اور سبز لہلہاتے کھیتوں کے درمیان۔ یہ اُچ کا قدیم شہر ہے۔ اس خراب آباد کی یادیں ہمارے دلوں کو عزیز ہیں، کیونکہ ہمارے کتنے ہی صاحب دل صوفیا و درویش اس خاک پاک میں آرامیدہ ہیں اور اس کا ہزارہا سالہ ماضی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ اب تو یہ محض ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جس میں زیادہ سے زیادہ دس ہزار گھر ہوں گے، وہ بھی خستہ وخراب۔ ٹیڑھی میڑھی، تنگ و تاریک گلیاں، جا بجا کوڑے کے ڈھیر، اونچی نیچی سڑکیں جن پر دھول اڑتی رہتی ہے اور فضا وہی جو عام دیہات کی ہوتی ہے۔ لیکن ایک زمانہ تھا کہ یہ شہر سلطنت سندھ کا ایک عظیم و جلیل شہر اور پایہ تخت تھا اور اس کی آبادی ۳۶ میل لمبے اور ۲۴ میل چوڑے علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہ شہر سیاسی اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز اور تجارت کا گڑھ تھا اور دریائی حمل و نقل کا ایک اہم جنکشن۔ اس کے علمی مراکز اور درس گاہوں کی ایک دنیا میں دھوم تھی، اسے چھاونی کی حیثیت بھی حاصل تھی اور یہاں ہمیشہ بڑی تعداد میں فوج کا پڑاؤ رہتا تھا۔ سر چارلس میسن، جو ۱۸۲۶ء میں اُچ آیا تھا، اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے:

"یہاں سے غلہ کی بھری ہوئی کشتیاں سندھ روانہ ہوتی ہیں۔ اپنی تاریخی یادگاروں اور قدیم آثار کے لئے یہ شہر مشہور ہے"

اس برعظیم میں چند ہی شہر ایسے ہوں گے جو اپنی قدامت یا تاریخی، ثقافتی اور مذہبی اہمیت میں اس کے حریف قرار دئے جا سکیں۔

اُچ ریاست بہاولپور کے مشرقی حصے میں احمد پور کی تحصیل میں واقع ہے۔ آپ کو نارتھ ویسٹرن ریلوے کی بڑی لائن کے اسٹیشن ڈیرہ نواب صاحب پر اترنا پڑے گا۔ وہاں سے چودہ میل، بھٹے کی اینٹوں کی پختہ سڑک طے کرکے آپ اُچ پہنچ جائیں گے۔

اُچ کے باشندے زیادہ تر کاشتکار ہیں اور وہی قدیم اور سادہ وضع کی زندگی بسر کر رہے ہیں جو انہیں اپنے اجداد سے وراثت میں ملی۔ کسانوں کے جھونپڑوں میں وہی مٹی کے تیل کی لالٹینوں یا کڑوے تیل کے چراغوں کی مدھم روشنی نظر آتی ہے، البتہ درگاہوں کے سجادہ نشینوں کے بنگلے بجلی کے قمقموں سے جگمگاتے ہیں۔ بجلی پیدا کرنے کے لئے مشینیں بھی انہوں نے خرید رکھی ہیں۔

قدیم تاریخ:- اُچ نام کی توجیہیں تو آپ کو بہت ملیں گی لیکن غالباً سب سے زیادہ قابل قبول وہ ہے جو صاحب "تحفۃ الکرام" نے لکھی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مقامی بولی میں اُچ اونچی جگہ کو کہتے ہیں۔ سہسی نام کے ایک راجہ نے اُچ کے باشندوں سے لگان کے بدلے یہ خدمت لی کہ وہ ان نواحات کو مٹی ڈال کر اونچا کر دیں۔ حکم حاکم، اس سے ایک اونچے گھاٹ کی سی صورت پیدا ہو گئی۔

اُچ کا ذکر بھی پہلے پہل ہندوؤں کی داستانوں میں ملتا ہے اور وہ اس عنوان سے کہ دریائے سندھ کے کنارے بسنے والے دو قبیلوں — جاٹوں اور میروں میں لڑائی ٹھن گئی۔ انہوں نے راجہ دریودھن سے درخواست کی کہ آپ اپنی طرف سے کسی کو حاکم بنا کر بھیج دیجئے جو امن قائم کرے۔ راجہ دریودھن نے اپنی بہن

رانی وصلا کو اس مقام کا حاکم مقرر کر دیا اور اس کی وجہ سے اُچ میں امن و خوشحالی کا دور دورہ ہو گیا۔

اس کے بعد ہم کافند نامی بادشاہ کا ذکر سنتے ہیں جس کی قلمرو سارے سندھ اور بلوچستان پر محیط تھی۔ اسی بادشاہ کے دور میں ایران کے ساسانی شہنشاہ بہمن نے، جس کا ذکر فردوسی کے ہاں آتا ہے، سندھ پر یلغار کی۔ اس نے اس قلمرو کا ایک حصہ فتح کر کے وہاں اپنا نائب مقرر کر دیا، لیکن راجہ کافند نے تھوڑے ہی عرصے بعد اسے زیر کر لیا۔ کافند کے بعد اس کا بیٹا اَیند سلطنت کا وارث ہوا۔ اس نے سلطنت کو چار صوبوں میں تقسیم کر دیا، جن میں سے ایک صوبہ اُچ کا تھا۔ اُچ پر بعد میں بھی اہل پارس اور تاتاریوں کی لشکر کشیاں رہیں، اور اس دور کے کچھ طلائی اور نقرئی سکے حال ہی میں بہاولپور کے نواحات میں دستیاب ہوئے ہیں۔ اسکندر نے پنجاب سے جنوب کا رخ کیا اور ملتان کو فتح کیا تو اُچ کے راجہ نے فوراً اس کی اطاعت قبول کر لی۔ لیکن جب اسکندر کے لشکر نے اُچ کی طرف پیشقدمی کی تو راجہ نے مقابلہ کرنے کی ٹھانی۔ اور اسکندر کے ہاتھوں شکست کھا کر مارا گیا۔ اس کے بعد اسکندر نے دریائے راوی اور چناب کے سنگم پر ایک نیا شہر تعمیر کیا اور اس کا نام اسکندریہ کھا کنگم، اور بعض دیگر ماہرین جغرافیہ کا خیال ہے کہ اسکندریہ وہیں واقع تھا جہاں آج کا اُچ آباد ہے۔ جب اسکندر اپنے ملک واپس چلا گیا تو مقامی راجوں اور سرداروں نے بغاوت کر دی اور مقدونی گورنر کو تیغ کے گھاٹ اتار کر اپنا تسلط جما لیا۔
عربوں کے حملے سے پہلے کے دور میں سب سے اہم حکمران جس کا نام ہم سنتے ہیں، راجہ دیو راج تھا جس کا پایہ تخت موجودہ روہڑی کے قریب الور میں تھا۔ صاحب تحفتہ الکرام لکھتے ہیں کہ اس راجہ کے چار جانشینوں نے تقریباً ۱۳۷ سال تک سندھ کو زیر نگیں رکھا۔ ان کے نام یہ ہیں: راجہ سہارس، راجہ سہسی، سہارس دوم اور سہسی دوم۔ معلوم ہوتا ہے کہ سہارس دوم لوگوں میں بہت مقبول تھا کیونکہ لوک گیتوں اور عوامی کہانیوں میں اس کا نمایاں ذکر ملتا ہے اور اس کے انصاف اور فیاضی کے قصے مشہور ہیں۔ چچ نامہ ہی کو لیجئے جو تاریخ و روایات کی قدیم سندھی کتابوں میں سے ہے۔ اس میں بھی اس راجہ کا بہت کچھ حال لکھا ہے۔ ایرانی شہنشاہ شاہ نیمروز نے اسے شکست دے کر قتل کر دیا تو سہسی دوم اس کا جانشین ہوا۔ راجہ سہسی دوم نے اُچ کے قلعے کو نئے سرے سے تعمیر کیا۔ اس کے عہد کی ایک دلچسپ خصوصیت چچ سلائج نامی ایک قسمت آزما کے ڈرامائی عروج کی داستان ہے۔ کہتے ہیں کہ راجہ سہسی دوم کا ایک وزیر تھا، بدھیمان نامی، جو حکومت کا سارا کاروبار چلاتا تھا۔ ایک دن جب کہ وہ کسی بادشاہ کے ہاں سے آئی ہوئی ایک اہم چٹھی کا مطالعہ کر رہا تھا۔ چچ سلائج نامی ایک برہمن اس کے پاس آیا اور اپنی خدمات کو پیش کیا۔ وزیر نے از راہ امتحان شاہ دیبل کی وہ اہم چٹھی اسے دے دی اور کہا اس کا جواب لکھو۔ چچ نے اس جواب میں غیر معمولی قابلیت کا مظاہرہ کیا۔ اس کی وجہ سے بدھیمان نے اسے نوکر رکھ لیا۔ ایک موقع پر جب کہ وزیر پایۂ تخت کے باہر تھا، چچ ایک اہم خدمت سرانجام دے کر راجہ سہسی کا مقرب بن گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ رانی اس سے محبت کرنے لگی اور راجہ کے مرنے پر چچ ہی تخت کا مالک بن بیٹھا۔ اس نے رانی سے شادی کر لی اور تخت کے دوسرے دعویداروں کو بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اسی سلسلے کا ایک مشہور قصہ وہ ہے جس میں چچ، راجہ دہارت کو دھوکے سے قتل کرتا ہے۔ دہارت نے سابق راجہ کا انتقام لینے کے لئے جو اس کا رشتہ دار تھا اُچ پر حملہ کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس عیار و طرار برہمن نے پورے چالیس برس راج کیا اور طبعی موت مرا۔ اس کے بعد اس کا بھائی چندر سلائج سات برس تک برسر حکومت رہا۔ سندھ کا مشہور بادشاہ داہر، جسے اس ملک کے اولین مسلم فاتح محمد بن قاسم نے شکست دی تھی، اسی چچ کا بیٹا تھا۔

عہد اسلامی

محمد بن قاسم کی فتح سندھ (۷۱۲ء عیسوی) ایک عظیم الشان کارنامہ تھی لیکن اسے ثبات نصیب نہ ہوا، کیونکہ محمد بن قاسم اس ملک میں ایک ہی سال رہ پایا تھا کہ واپس بلا لیا گیا۔ اس کے بعد یزید سکسکی گورنر مقرر ہوا۔ تقرر کے تھوڑے ہی دن بعد اس کا بھی انتقال ہو گیا اور سندھ کے مقامی سردار پھر اپنے علاقوں پر قابض ہو بیٹھے۔ ۱۰۰۰ء کے قریب جب سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملوں کا سلسلہ شروع کیا تو جے پال پر فتح پانے کے بعد وہ اُچ پر بھی یلغار کر کے آیا۔ اُچ پر ان دنوں ابوالفتح نامی ایک قرامطی حکمران تھا۔ سلطان محمود نے

اُچ

(پاکستان کا ایک قدیم علمی و ثقافتی مرکز)

جامع مسجد

روضہ حضرت سید جلال بخاری رح
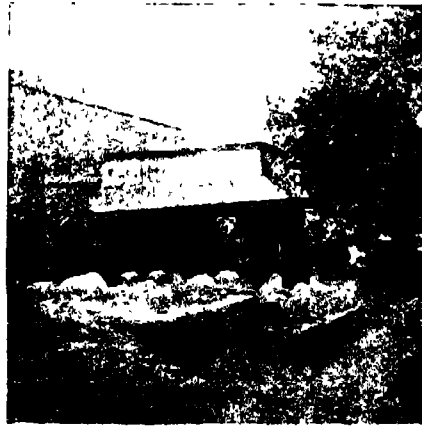
روضہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں

مقبرہ مائی جاوندی

پاکستان میں

ریڈیو پاکستان حیدرآباد (سندھ)

کراچی میں بین الاقوامی دنگل
فضیلت مآب میجر جنرل اسکندر مرزا انعامات تقسیم فرما رہے ہیں
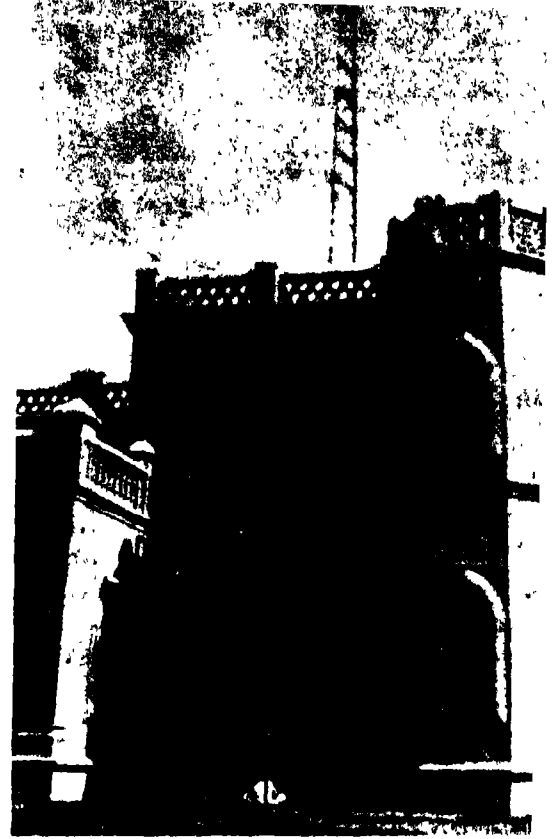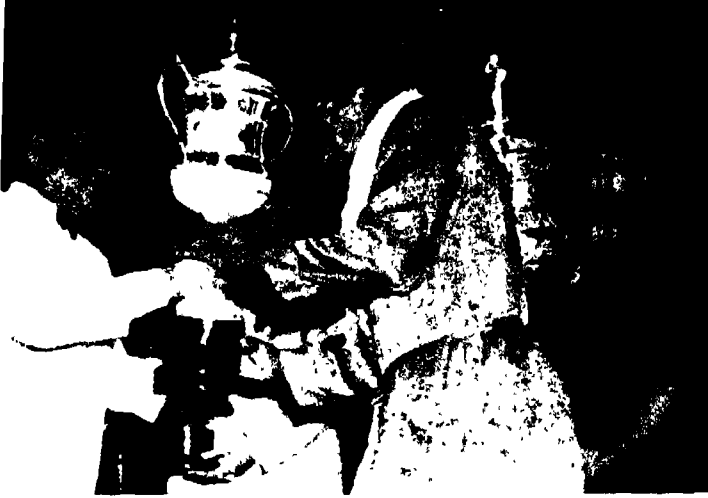
ریڈیو پاکستان حیدرآباد (سندھ) میں نشریات کا آغاز

فضیلت مآب میجر جنرل اسکندر مرزا اور عزت مآب چودھری محمد علی
مشرقی پاکستان کے سیلاب زدہ علاقوں کا معائنہ فرما رہے ہیں

اسے شکست دی لیکن بعد ازاں اس کو پنجاب کا حاکم بنا دیا جس میں اُچ بھی شامل تھا۔ سلطان محمود غزنوی کے بیٹے مسعود کے عہدِ حکومت میں اُچ غزنویوں کا مطیع فرمان رہا، لیکن جب مسعود کا بیٹا ابوالحسن تخت پر بیٹھا تو علی بن امیر نامی ایک موقع شناس شخص نے پشاور سے اُچ تک کے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ سنہ [illegible]ء میں سلطان محمد غوری نے صحیح معنوں میں اس ملک کو فتح کرنا شروع کیا۔ اس نے ملتان اور اُچ پر بھی قبضہ کیا اور علی کرماج کو وہاں اپنا نائب مقرر کر دیا —

محمد غوری کے عہدِ حکومت میں اُچ کے مشہور دارالعلوم کی بنیاد رکھی گئی جس کے صدر معلم مشہور عالم اور درویش حضرت صفی الدین گزرانی تھے۔ اس دارالعلوم میں کوئی پچیس سو طالب علم رہتے اور تعلیم حاصل کرتے تھے۔ یہ بزرگ سنہ [illegible]ء میں بغداد سے وارد ہندوستان ہوئے تھے اور اس ملک میں اسلام کے پہلے جلیل القدر مبلغ تھے۔ ان کا مقبرہ آج بھی موجود ہے اور سارے برِعظیم میں شاید ہی کوئی اور مقبرہ اس قدر قدیم اور اہم ہو۔

سلطان محمد غوری کی وفات کے بعد اس کے نائب قباچہ نے سرہند سے ٹھٹہ تک سارے علاقے کی حکومت سنبھال لی اور اُچ کو پایہ تخت قرار دیا۔ "طبقاتِ ناصری" کے مصنف مولوی منہاج السراج لکھتے ہیں :

> "سنہ [illegible]ء میں جب میں اُچ پہنچا تو وہاں سلطان ناصر الدین قباچہ سریر آرائے سلطنت تھے۔ عوام میں تعلیم عام تھی اور اس دارالعلوم کے علاوہ اُچ میں اور بھی پائے کی درسگاہیں تھیں۔"

مولوی منہاج السراج خود اس دارالعلوم کے کچھ دنوں تک منتظم رہے اور چند سال قاضی کے عہدے پر بھی کام کیا۔

کھوکھر قبیلے سے جنگ و جدل کا معرکہ پیش آیا تو قباچہ اس کا مقابلہ نہ کر سکا۔ کھوکھروں کے سردار جلال الدین نے اسے نکال کر اُچ کو تاخت و تاراج کیا۔ جب چنگیز خاں کے جرنیل چغتائی خاں نے جلال الدین کو وہاں سے نکالا تو قباچہ پھر پناہ لینے کے لئے اُچ پہنچ گیا لیکن اُچ کے باشندے اس کے مظالم سے خائف تھے — انہوں نے شہر کے دروازے بند کر دیئے اور اسے اندر نہ آنے دیا۔ ادھر جلال الدین اپنی ہزیمت پر برافروختہ تھا۔ اس نے سارے شہر کو آگ لگا دی۔ اور خود مکران کی طرف بھاگ گیا —

سلطان ناصر الدین قباچہ پھر اُچ واپس آیا اور شہر کو نئے سرے سے آباد کیا، لیکن اس نوآبادکاری کو بمشکل دو سال گزرے تھے کہ سلطان شمس الدین التمش نے چڑھائی کر دی اور قباچہ کو جان کی سلامتی کے لئے راہِ فرار اختیار کرنی پڑی۔

"تاریخِ فرشتہ" میں اس حملے کی تقریب یہ بیان کی گئی ہے کہ قباچہ کے افسروں اور اہلکاروں نے بدکرداری اور بداخلاقی کو شعار بنا لیا تھا۔ حاکمِ ملتان، قاضی شرف الدین اور ایک مقامی بزرگ، حضرت شیخ بہاء الدین کو اس کا بہت رنج ہوا۔ انہوں نے سلطان التمش کو درخواست بھیجی کہ آکر قباچہ کے دستِ تعدی سے لوگوں کو نجات دلائیے۔ سوءِ اتفاق سے ان کے خطوط قباچہ کے ہاتھ لگ گئے۔ اس لئے اس نے ملتان پر چڑھائی کر دی اور وہاں کے گورنر قاضی شرف الدین کو شکست دے کر اس کا سر قلم کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ قباچہ نے حضرت شیخ بہاء الدین سے ان خطوط کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے نہ صرف یہ تسلیم کیا کہ انہوں نے یہ خط لکھے تھے بلکہ اسے سخت فہمائش بھی کی کہ خلقِ خدا پر ظلم و ستم سے باز رہے اور اپنے اعمال کی اصلاح کرے۔

مغلوں نے اُچ پر متعدد بار حملے کئے۔ سب سے پہلا حملہ انہوں نے ۱۲۴۵ء میں کیا جب کہ ان کا لشکر قندھار جا رہا تھا۔ انہوں نے اُچ کا محاصرہ کیا لیکن بعد میں یہ سوچ کر اٹھا لیا کہ اس میں خواہ مخواہ وقت ضائع ہوگا، ہمارا اصل مقصد تو فارس پر حملہ ہے۔ اُچ میں سلطان رکن الدین کی حکومت کا زمانہ اسی کے لگ بھگ پڑتا ہے، جب مشہور صوفی اور عالم سید جلال بخاری کی اُچ میں تشریف آوری ہوئی۔ ان کا مقبرہ شہر کے مغربی گوشے میں ایک ٹیکری پر کھنڈرات کے درمیان واقع ہے۔ یہ حصہ شہر انہی کے نام پر اُچ بخاری کہلاتا ہے۔ سید جلال بخاری سنہ ۱۱۹۸ء میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۲۹۱ء میں ۹۴ برس کی عمر میں فوت ہوئے۔ ان کی زندگی فقر اور نفس کشی کی ایک زندہ مثال تھی۔ وہ پندرہ بیس برس کے تھے کہ ان سے روحانی کمالات کا ظہور ہونے لگا۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے چنگیز خاں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تھی۔ اس پر اس وحشی اور تند خو نے انہیں آگ میں ڈال دینے کا حکم دیا۔ قدرتِ حق سے ان کا بال بھی بیکا نہ ہوا اور وہ آگ سے زندہ سلامت برآمد ہوئے۔ چنگیز خاں پر اس کا ایسا اثر

ہوا کہ اس نے اسلام قبول کر لیا اور جہانگیر خاں کا نام اختیار کیا۔ یہی نہیں بلکہ اپنی بیٹی زینب بھی سید صاحب کے حبالۂ نکاح میں دے دی۔ سید جلال بخاری کے مریدوں اور حلقہ بگوشوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے اور وہ آج ہی میں نہیں سارے برِعظیم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے غیر معمولی کشف و کرامات کی سینکڑوں داستانیں لوگوں میں مشہور ہیں۔ ان کا وصال آچ کے قریب ہی "جناب رسول" نامی ایک گاؤں میں ہوا اور وہ وہیں مدفون ہوئے۔ ایک بار سیلاب سے ان کے مزار کو شدید نقصان پہنچا، لہٰذا ان کا جسدِ مبارک "سینک بیلا" میں منتقل کر دیا گیا، لیکن وہاں بھی سیلاب سے اسے گزند پہنچنے لگا۔ آخر جسدِ مبارک کو وہاں سے نکال کر راجن قتال کے مقبرے کے قریب دفن کیا گیا۔ ۱۶۲۵ء میں اسے وہاں سے بھی نکال لیا گیا اور موجودہ جگہ پر ان کا مزار بنا۔ ان کے مزار پر جو مقبرہ اس وقت نظر آتا ہے وہ نواب بہاول خاں کے حکم سے ۱۸۳۵ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔

مغلوں کے حملے

اس برِعظیم میں سریر آرائے سلطنت ہونے سے قبل مغلوں نے دو بار آچ اور ملتان پر حملے کئے۔ پہلی بار تو وہ غیاث الدین بلبن کے زمانے میں ۱۱۲۶ء میں چڑھائی کر کے آئے اور دوسری بار ۱۲۹۱ء میں جبکہ دہلی میں سلطان جلال الدین خلجی بادشاہ تھا۔ دونوں بار انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ آچ اور ملتان دونوں دہلی کی متابعت سے آزاد اور خود مختار ہو گئے تھے۔ علاء الدین تخت پر بیٹھا تو اس نے دوبارہ ان کو فتح کیا۔ مغلوں نے ۱۳۰۴ء اور ۱۳۰۵ء میں پھر دو بڑے حملے کئے۔ ان پرآشوب دنوں میں اس جگہ کئی حاکم آئے اور کئی گئے۔ آخر غازی بیگ گورنر ہوئے جو آگے چل کر غیاث الدین تغلق کے نام سے بادشاہ بنے۔

آچ کا دار العلوم غازی بیگ کی گورنری کے عہد میں قائم ہوا اور جب وہ دہلی کے تخت پر بیٹھا تو اس نے آچ کی حکومت کی باگ ڈور اپنے بھائی بہرام کے سپرد کر دی۔ اس کے بعد سلطان محمد تغلق کے زمانے میں ۱۳۲۶ء میں مغل سردار "ترماشرین" نے آچ اور ملتان پر زوروں کا حملہ کیا۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ اس حملے کے چند سال بعد ۱۳۳۳ء میں آچ میں وارد ہوا تھا۔

اس موقع پر ہم اس بزرگ روشن ضمیر کا بھی تذکرہ کریں گے جو "مخدوم جہانیاں جہاں گشت" کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کا زمانہ بھی قریب قریب یہی تھا۔ ان کی ولادت ۱۳۰۷ء میں ہوئی اور وہ سید جلال بخاری کے پوتے تھے۔ انہوں نے علومِ دینی و ستری کی تحصیل قاضی بہاء الدین اور شاہ رخ عالم ملتانی سے کی اور روحانی فیض حضرت جمال شیخ سے حاصل کیا۔ محمد تغلق کے زمانے میں وہ شیخ الاسلام کے عہدے پر فائز رہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے وقت کے سب سے جلیل القدر اور واجب الاحترام عالمِ دین سمجھے جاتے تھے۔ اور مذہبی امور میں سرکاری مشیر کا درجہ بھی رکھتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ انہوں نے سارے اسلامی ممالک کا دورہ کیا تھا اور اسی سیاحی کی وجہ سے "جہاں گشت" کے لقب سے مشہور ہیں۔ "حقیقت الاسرار" میں لکھا ہے کہ ان کا انتقال ۱۳۸۳ء اور ۱۳۸۶ء کے درمیان ۷۷ برس کی عمر میں ہوا۔ ان کا مزار شہر کے شمالی حصے میں ہے، اور ان کے مقبرے پر زائرین کا مجمع رہتا ہے۔

۱۳۶۶ء میں مغلوں نے پھر آچ پر حملہ کیا لیکن اپنے شعار کے مطابق آچ، ملتان اور دیپالپور کو تاخت و تاراج کرنے کے بعد شاہی افواج کی آمد سے قبل ہی فرار ہو گئے۔ ۱۳۹۷ء میں تیمور کا پوتا مرزا پیر محمد آچ آیا۔ وہاں اسے دہلی پر تیمور کی چڑھائی کا حال معلوم ہوا تو اس نے بھی ملتان کے راستے دہلی کا رخ کیا۔ تیمور کے حملے کے بعد آچ سیدوں کے زیر نگیں رہا، جن سے اسے لنگاہوں نے چھینا۔ لنگاہوں میں قطب الدین لنگاہ مشہور حکمران گزرا ہے۔ جس نے ۱۳۲۰ء میں وفات پائی۔ اس کی قبر حضرت بندگی محمد غوث کے قریب ہے۔

حضرت بندگی محمد غوث بھی ایک برگزیدہ بزرگ تھے۔ وہ سید بخاری کے کوئی ڈھائی سو سال بعد ۱۴۸۳ء میں لنگاہوں کے دورِ اقتدار میں آچ تشریف لائے۔ وہ عالمِ اسلام کی عظیم المرتبت شخصیت شیخ عبدالقادر جیلانی کی نویں پشت میں تھے۔ حضرت شیخ کی آل سے جو بزرگ ہندوستان میں آکر آباد ہوئے، وہ بھی روحانیت اور سلوک کے اعلیٰ مراتب کو پہنچے۔ ان کی کرامتوں کی بے شمار داستانیں مشہور ہیں لیکن ان کا سب سے بڑا اعجاز تو اس ملک میں نورِ حق کی اشاعت ہے۔ ان کی روشن کی ہوئی شمعِ حقیقت آج بھی اسی طرح فروزاں ہے اور لوگ دور و نزدیک سے آکر اس سے کسبِ نور کرتے ہیں، روحانی فیض حاصل کرتے ہیں۔

حضرت بندگی کا وصال ۱۵۱۰ء میں نوے برس کی عمر میں ہوا۔ انکے مزار پر جو مقبرہ ہے وہ بہت پرانا ہے لیکن طرز تعمیر نہایت عمدہ اور دلکش ہے۔ اس مقبرے کے ساتھ ہی ایک خوبصورت مسجد بھی ہے جو ۱۶۰۰ء کی تعمیر ہے۔

لنگاہوں کے بعد اُچ پر سمتوں اور ارغنوں کی بالادستی قائم رہی، حتی کہ ۱۵۲۹ء میں جبکہ دہلی میں ہمایوں برسر حکومت تھا، اُچ کو سلطنت مغلیہ میں شامل کیا گیا۔ اُچ آئے دن کے حملوں اور ترکتازیوں سے تباہ و برباد ہو چکا تھا اور رہی سہی کسر طغیانیوں نے پوری کر دی تھی۔ مغل افسروں نے اس کی تعمیر نو کا بیڑا اٹھایا۔ انہوں نے قلعے کو مستحکم کیا اور اسکول، عدالت اور کوتوالی قائم کی۔ جب ہمایوں شیر شاہ کے ہاتھوں شکست کھا کر بھاگا تو اُچ پر کچھ عرصے کے لئے پھر ارغنوں کا تسلط ہو گیا لیکن ہمایوں کی دوبارہ تخت نشینی کے بعد پھر یہ دہلی کی قلمرو میں شامل کر لیا گیا۔ ہمایوں نے ابوالمعالی کو اُچ کا حاکم مقرر کیا۔

اکبر کے عہد میں اُچ کی عنان حکومت یکے بعد دیگرے بہادر خان، بیرم خان اور شمس الدین اتگہ کے سپرد کی گئی۔ ۱۵۵۶ء میں اکبر نے محمد صادق خان بردہی کو شکست دے کر سیوستان پر قبضہ کیا تو اس نے ملتان، اُچ اور سکھر کو الگ الگ صوبے بنا دیا اور ہر جگہ ایک علیحدہ صوبیدار مقرر کیا۔

شاہجہاں کے دور میں قلیچ خاں، پھر نواب جان محمد، اور اس کے بعد سید موسیٰ، اُچ کے حاکم رہے۔ ان دنوں صوبیدار تو ملتان میں رہتا تھا، البتہ اس کا نائب اُچ میں ہوتا تھا۔ اس وقت تک اُچ تعلیمی اور ثقافتی مرکز کے طور پر اپنی پہلی اہمیت بہت کچھ کھو چکا تھا اور انتظامی لحاظ سے صوبہ ملتان کا ایک جزو بن کر رہ گیا تھا۔ ۱۷۲۶ء میں عباسی شہزادوں نے بہاولپور ریاست قائم کی۔ اسی وقت سے اُچ اس ریاست کا حصہ چلا آ رہا ہے۔

اسی علاقے میں جو دیگر درگاہیں اور مقبرے قابل زیارت ہیں ان میں ایک سید صدر الدین معروف بہ راجن قتال کا مقبرہ ہے جو حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے بھائی تھے۔ پھر حضرت جہاں گشت کے استاد، حضرت بہاول حلیم کا مقبرہ ہے۔ دریائے چناب میں جو طغیانی ۱۸۱۷ء میں آئی تھی، اس کی دستبرد سے اب یہ محض کھنڈر رہ گیا ہے۔ ان سے کہیں پرانا مقبرہ شیخ صفی الدینؒ کا ہے، جو بغداد سے ۹۸۰ء میں یہاں آئے اور ۱۰۰۰ء میں فوت ہوئے۔ سید جلال بخاری کے مقبرے کے دروازے کے پاس ان کے ایک مرید سچری کی درگاہ ہے جنہوں نے یہ لقب اپنی بے خوفی اور راست گفتاری کی بنا کر حاصل کیا تھا۔ وہ ڈیرہ غازی خاں کے حکمران خاندان کے ایک فرد تھے، جو آرام و آسائش کی زندگی ترک کر کے درویش ہو گئے تھے۔ وہ زندگی کی گہری صداقتوں اور حقیقتوں کے محرم ہونے کے ساتھ ساتھ بلا کے ظریف تھے۔ مقامی لوگوں میں یہ مشہور ہے کہ اگر کوئی شخص ان کے مزار کا متعدد بار طواف کرتا ہے تو قہقہہ مارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک اور دلچسپ اور قابل دید مقام ایک خاتون بی بی جاوندی کا چھوٹا سا مقبرہ ہے۔ یہ اُچ کے مغربی نواحات میں ایک اونچے ٹیلے پر واقع ہے، جس کے گرداگرد کھجوروں کے جھنڈ ہیں۔ بی بی جاوندی حضرت جہانیاں جہاں گشتؒ کی دختر تھیں اور اپنے زہد و تقویٰ اور روحانی فیوض کی بنا پر اس خاک پاک کے اولیا میں شمار ہوتی ہیں۔

یہ ہے اُچ کا شہر جس سے کتنی ہی پرانی یادیں، تاریخی داستانیں اور مذہبی عقیدتیں وابستہ ہیں۔ آج کے لوگوں کو مذہبی یادگاروں اور درگاہوں، صوفیوں اور درویشوں کی باتیں پیش پا افتادہ معلوم ہوں گی، لیکن یہ سب زندہ حقیقتیں ہیں اس لحاظ سے کہ یہاں کے سادہ دل دیہاتیوں اور دور و نزدیک کے بے شمار عقیدتمندوں کے لئے ان میں روحانی تسکین اور کیف و جذب کا سامان موجود ہے۔ تاریخ کا طالب علم تو اس مقام سے کسی طرح سرسری طور پر نہیں گزر سکتا، کیونکہ یہ اس برعظیم کی قدیم ترین بستیوں میں سے ہے اور صدیوں تک فکر و خیال اور انقلابات زمانہ کے دھاروں کا سنگم رہی ہے۔

(مترجمہ: ابن انشا)

"ماہ نو" میں مطبوعہ مضامین نظم و نثر دوسرے جرائد میں نقل کئے جا سکتے ہیں بشرطیکہ "ماہ نو" کا حوالہ دیا جائے۔

•

"ماہ نو" میں ریویو کے لئے مطبوعات کی دو کاپیاں ارسال فرمائیں۔ (ادارہ)

غزل

جوشؔ ملیح آبادی

وہ درد کے دن باقی نہ رہے درماں کی وہ راتیں بیت گئیں
دل تھام کے جن میں روتے تھے ہجراں کی وہ راتیں بیت گئیں

نہروں پہ گلے جو ملتی تھیں، شاخوں میں اُلجھ کر ہلتی تھیں
شبنم سے جو دھل کر کھلتی تھیں بستاں کی وہ راتیں بیت گئیں

جو حُسنِ رواں سے رخشاں تھیں وہ مصر کی صُبحیں شام ہوئیں
جو بوئے قبا سے رقصاں تھیں کنعاں کی وہ راتیں بیت گئیں

جو خوف سے آہیں بھرتی تھیں، آغوش میں آتے ڈرتی تھیں
جو چھُپ کے چراغاں کرتی تھیں افشاں کی وہ راتیں بیت گئیں

ہر آہ میں اک بسملِ غلطاں، ہر مس میں اک لذتِ رقصاں
سو عیش کے دن جن پر قرباں، حرماں کی وہ راتیں بیت گئیں

جو دل پہ مصیبت لاتی تھیں، سینے میں گرجتی گاتی تھیں
آنکھوں سے جو مینہ برساتی تھیں طوفاں کی وہ راتیں بیت گئیں

گھنگھور اندھیرا چھایا ہے ارماں کے جواہر خانے میں
نیلم کی وہ شامیں خاک ہوئیں، مرجاں کی وہ راتیں بیت گئیں

خود ایماں جن سے تاباں تھا وہ کفر کا سورج ڈوب گیا
خود عصمت جن پر نازاں تھی، عصیاں کی وہ راتیں بیت گئیں

خطبے تھے مُغاں کے معبد میں، سجدے تھے بتوں کے قدموں پر
ایماں کے وہ دن برباد ہوئے، عرفاں کی وہ راتیں بیت گئیں

آغوش میں گورے مہوش تھے اور دوش پہ کالی زلفیں تھیں
وہ عہد کے لمحے روٹھ گئے، پیماں کی وہ راتیں بیت گئیں

وحشت کے جزیرے ڈوب گئے، پھولوں کی سواری دور گئی
صُبحیں وہ گریباں کی نہ رہیں، داماں کی وہ راتیں بیت گئیں

دل جوشؔ دھڑکتا رہتا تھا جب زلفِ سیہ کے حلقوں میں
وہ قید کے دن باقی نہ رہے زنداں کی وہ راتیں بیت گئیں

غزل

ناصر کاظمی

حسن کو دل میں چھپا کر دیکھو
دھیان کی شمع جلا کر دیکھو

کیا عجب پھر کوئی نغمہ پھوٹے
دل پہ اک چوٹ تو کھا کر دیکھو

کیا خبر کوئی دفینہ مل جائے
کوئی دیوار گرا کر دیکھو

فاختہ چپ ہے بڑی دیر سے کیوں
سرو کی شاخ ہلا کر دیکھو

نہر کیوں سو گئی چلتے چلتے
کوئی پتھر ہی گرا کر دیکھو

کیوں چمن چھوڑ دیا خوشبو نے
پھول کے پاس تو جا کر دیکھو

دل میں بیتاب ہیں کیا کیا منظر
کبھی اس شہر میں آ کر دیکھو

ان اندھیروں میں کرن ہے کوئی
شب زدو آنکھ اٹھا کر دیکھو

کل یہاں جشنِ بہاراں ہوگا
وہ سماں دھیان میں لا کر دیکھو

غزل

باقی صدیقی

تیرے در تک نہیں جانے پاتے
ہم کہاں اور ٹھکانے پاتے

ہر قدم پر ہے نیا ہنگامہ
ہوش میں ہم نہیں آنے پاتے

تم عناں گیرِ جنوں ہو ورنہ
چور چور آئینہ خانے پاتے

لوگ غربت کا گلہ کرتے ہیں
ہم وطن سے نہیں جانے پاتے

درد ہوتا تو مسلسل ہوتا
دل کو ہم دل تو بنانے پاتے

تیری محفل نہیں غم کی محفل
بار کیا میرے فسانے پاتے

ہم بگولے بھی نہیں تھے ورنہ
گردِ منزل تو اڑانے پاتے

غم اگر ساتھ نہ دیتا باقی
دشت بھی ہم نہ بسانے پاتے

غزل

شان الحق حقی

اگرچہ سب نہیں اپنے ہر اک بیاں سے گریز
کروگے قول سے نظروں کے کس زباں سے گریز

وہیں چھپے نہ ہوں اے دل حقیقتوں کے نشاں
مری نظر نے کیا ہے جہاں جہاں سے گریز

بقدرِ شوق تھی تمہیدِ مدعا لیکن
کوئی مقام نہ سوجھا کہ ہو کہاں سے گریز

شروعِ راہِ وفا ہے ابھی تو دیکھئے گا
کوئی یہاں سے کرے گا کوئی وہاں سے گریز

بڑی حسیں ہے یہ کیفیتِ قبولِ وفا
کہ دل سے سیکڑوں اقرار اور زباں سے گریز

کسے فسانۂ ہستی کی ابتدا معلوم
بجز ایں قدر کہ ہوا دل کی داستاں سے گریز

لکھی تھیں دل کے مقدر میں الجھنیں ورنہ
مری وفا نے تو چاہا تھا ہر گماں سے گریز

غزل

حبیب جالب

سونی ہیں آنکھوں کی گلیاں دل کی بستی ویراں ہے
ایک خموشی، ایک اندھیرا چاروں جانب رقصاں ہے

ایک زمانہ وہ کہ تجھے میں یاد تھا اور اب یاد نہیں
تیرا ہر انداز مری جاں ایک انوکھا احساں ہے

کتنی دور چلا آیا ہوں چھوڑ کے تیری بستی کو
لیکن دل تیری گلیوں میں آج تلک سرگرداں ہے

پھر سورج کے ساتھ ترے ملنے کا امکاں ڈوب گیا
پھر بام و در کی تاریکی دیدہ و دل پر خنداں ہے

پھر ان پیار بھری ندیوں کی یاد میں آنکھیں پرنم ہیں
پھر اس بچھڑے دیس کے غم میں شہرِ دل و جاں ویراں ہے

جالب اب اس جانِ غزل کے پیار سے لاکھ انکار کریں
آنکھوں کی پرسوز چمک سے دل کا درد نمایاں ہے

غزل

صہبا اختر

سایۂ زلف میں اک رات بسر ہونے تک
کتنی صبحوں کو تراشا ہے سحر ہونے تک

دل کی دنیا ہے جہنم کی طرح شعلہ فروز
یہ جہنم ہے مگر تیرا گذر ہونے تک

تیرگی بننے لگی شوخ اجالوں کے کفن
دیکھیں کیا گذرے ستاروں پہ سحر ہونے تک

کتنے طوفانوں سے ظلمت کے گذرنا ہے ہنوز
چاند تاروں کو تری راہگذر ہونے تک

دیدۂ تر ابھی تیرا ہے شبستانِ وجود
کچھ دیئے اور جلا خونِ جگر ہونے تک

زندگی ایک چراغاں ہے بجائے خود بھی
سب اندھیرے ہیں تجلی نظر ہونے تک

اک قیامت ہی سہی دل سے گذرنا تیرا
ہم بھی زندہ ہیں قیامت کا گذر ہونے تک

میں نے اک زندگی تازہ خدا سے مانگی
اور وہ بھی کسی ظالم پہ اثر ہونے تک

راکھ ہو جائے گی یہ شمع تمنا صہبا
ان کو اس دل کے اندھیروں کی خبر ہونے تک

غزل

ادیب سہارنپوری

دل اب موہوم امیدوں سے بہلائے نہیں جاتے
جو دھوکے عمر بھر کھائے ہیں وہ کھائے نہیں جاتے

تری مخمور آنکھوں میں، ترے گل رنگ ہونٹوں پر
ہزاروں گیت ایسے بھی ہیں جو گائے نہیں جاتے

بغیر ان کے بسا اوقات یہ محسوس ہوتا ہے
کہ جیسے ہم دو عالم میں کہیں پائے نہیں جاتے

خوشی کی چھاؤں میں بیٹھے، غموں کی دھوپ بھی جھیلی
خیالوں سے تری دیوار کے سائے نہیں جاتے

ہمارا اور گلوں کا رنگِ وحشت ایک جیسا ہے
نکل جاتے ہیں یوں دامن کہ سلوائے نہیں جاتے

سکوں کی جستجو، آسودگی کی آرزوؤں نے
قدم ایسے نکالے ہیں کہ ٹھہرائے نہیں جاتے

ہماری تشنگی کی شرم رکھ لے ساقیِ محفل
بھری محفل میں ہم سے ہاتھ پھیلائے نہیں جاتے

چلو خود ہی ادیبؔ اس بزم میں تم بھی کہ پروانے
حضورِ شمع خود جاتے ہیں بلوائے نہیں جاتے

انعام خمسہ

مشرقی بنگال میں تپِ دق کی روک تھام

آغا محمد اشرف

پاکستان میں ہر سال تقریباً ڈیڑھ لاکھ قیمتی جانیں تپِ دق اور سِل کے نامراد مرض کی نذر ہو جاتی ہیں۔ شہروں کی گنجان آبادیاں، تاریک اور متعفن گلی کوچے اور ایسے چھوٹے چھوٹے اندھیرے گھر کہ جہاں صاف ہوا کا مشکل سے گذر ہوتا ہے، اس مرض کی بہترین آماجگاہیں ہیں۔ اس کے علاوہ ناکافی غذا اور عوام کی غربت اس موذی بیماری کو اپنے شکار پھنسانے میں اور ہاتھ بٹاتی ہے۔ اب تک اس مرض کی روک تھام کے لئے کسی قسم کی مسلسل کوشش نہیں کی گئی تھی کیونکہ مریضوں کے علاج اور مرض کے تدارک کے لئے ہسپتالوں، ڈاکٹروں، نرسوں اور اس نئے سامان کی ضرورت رہتی ہے جو بیسویں صدی میں تپِ دق کے خلاف جنگ کے لئے سائنس کے تجربوں نے ہمیں دیا ہے لیکن ہمارے ملک میں نئے سامان کا تو ذکر ہی کیا ہے، شفاخانوں اور ہسپتالوں کی اس قدر کمی ہے کہ اس بڑھتے ہوئے روگ کی ترقی کو روکنے کے لئے پہلا مورچہ بھی قائم نہیں ہو سکتا تھا۔ سند یافتہ ڈاکٹروں کے متعلق اعداد و شمار یہ بتاتے ہیں کہ ہر ۳۴ ہزار باشندوں کے لئے صرف ایک ڈاکٹر مہیا ہو سکتا ہے۔

مثال کے طور پر مشرقی بنگال کو ہی لے لیجئے۔ سنہ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس صوبے کی آبادی تقریباً ۴ کروڑ ۲۰ لاکھ ہے۔ اس علاقے میں فی مربع میل ۷۰۰ سے لے کر ایک ہزار تک انسان آباد ہیں۔ اور آبادی کی یہ اوسط ڈھاکے جیسے شہر میں اس سے بھی زیادہ ہے۔ اس اعتبار سے مشرقی بنگال کا شمار دنیا کے سب سے زیادہ گنجان آباد علاقوں میں ہوتا ہے۔

آبادی کی کثرت کے ساتھ اگر حفظانِ صحت کے اصولوں پر عمل نہ کیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ تپِ دق اور سل کے مرض کی شکل میں بھگتنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ آئے دن ان شہریوں پر ملیریا، ہیضے اور اسی قسم کی دوسری بیماریاں نازل ہوتی رہتی ہیں۔ بدقسمتی سے صحت کے متعلق ابھی تک ہمارے ہاں مکمل اعداد و شمار موجود نہیں لیکن جتنی معلومات فراہم ہو سکی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ سنہ ۱۹۵۰ء میں مشرقی بنگال کے تین دیہاتی علاقوں میں بسنے والے باشندوں میں سے ۵۰ فیصدی سے زیادہ تپِ دق کی زد میں آ چکے تھے۔ اس سے قبل سنہ ۱۹۴۶ء میں ایک اور سرکاری رپورٹ کے مطابق ہر ایک لاکھ باشندوں میں سے ۱۷۹ باشندوں کی موت کا موجب تپِ دق کا مرض تھا۔

یہ اعداد و شمار اپنی جگہ پر تباہی اور بربادی کی منہ بولتی داستان ہیں کہ جس پر کسی قسم کا حاشیہ چڑھانے کی ضرورت نہیں۔ اس کا علاج صرف ایک ہی طرح ممکن تھا اور وہ یہ کہ مشرقی پاکستان میں کسی بیرونی ادارے کی امداد سے تپِ دق کی روک تھام کا منصوبہ مرتب کیا جائے۔ اور اس طرح جو چند تجربے حاصل ہوں، ان کی روشنی میں صوبے میں جگہ جگہ ہسپتال، طبی امداد کے مرکز اور شفاخانے کھولے جائیں۔ چنانچہ سنہ ۱۹۵۳ء میں حکومتِ پاکستان کی درخواست پر عالمی ادارۂ صحت کے چند ماہر ڈھاکے پہنچے۔ کام شروع کرنے سے پہلے انہوں نے ڈھاکہ کے حالات کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ اس وقت ڈھاکہ شہر کی آبادی ۵ لاکھ کے لگ بھگ تھی اور اتنے بڑے شہر میں تپِ دق کے مریضوں کے لئے کوئی شفاخانہ موجود نہیں تھا۔ ایک ہسپتال ضرور تھا مگر وہاں تپِ دق کے مریضوں کے لئے صرف ۶۹ بستروں کا اہتمام تھا جو مرض کی وسعت کو دیکھتے ہوئے یقیناً ناکافی تھا۔

عالمی ادارۂ صحت کے ماہروں نے ڈھاکہ پہنچتے ہی ایک کنٹرول سنٹر قائم کیا۔ جو اس علاقے میں اپنی قسم کا پہلا ادارہ تھا۔ اس سنٹر میں تپِ دق کی روک تھام کے لئے مستند طریقوں کے مطابق عمل کیا گیا اور

(باقی صفحہ ۵۳ پر)

جاپانی ادب

(۲)

کیویا ڈوئی

"اکاواھیرو ریدی" کا ناول "شیطان کی چھوڑی ہوئی دولت" اسکا محض خاکہ یہ ہے کہ اس کہانی کا ہیرو اخبار نویس ہے۔ اخبار کیلئے رپورٹ لکھنے کے لئے ہیروشیما جاتا ہے۔ جانے سے پہلے اس کا خیال تھا کہ اب ہیروشیما اچھی طرح بس چکا ہے اور بم کا اثر دیکھنا مشکل ہوگا۔ مگر جب وہ ہیروشیما پہنچا، تو امید کے خلاف بم کے بہت سے اثرات اس کی نظر سے گزرے۔ ہیروشیما میں چچا کے گھر میں ٹھہرا تھا۔ چچا یکایک بیمار پڑ گیا مگر اس بیماری کا سبب بالکل معلوم نہ ہو سکا۔ شہر میں ایک اسپتال ہے جہاں ایٹم بم کے اثرات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس اسپتال میں ایک جاپانی ڈاکٹر سے ملاقات ہوئی اور شکایت سنی کہ اس اسپتال میں ایٹم بم کے بیماروں میں پیدا شدہ اثرات کا مطالعہ تو کرتے ہیں لیکن ان بیماروں کا علاج بالکل نہیں کرتے۔ ایک دن چچی کے ساتھ شہر میں سیر کر رہا تھا تو یکایک چچی کے چہرہ پر ورم آگیا اور وہ سخت بیمار پڑ گئی۔ اس طرح باہر سے کچھ آثار نظر نہیں آتے لیکن ایٹم بم کا اثر بدن میں ہوتا رہتا ہے۔ اور ایک دن یکایک اسکا اثر ظاہر ہو جاتا ہے۔ آخر ہیرو واپس جا رہا تھا کہ خبر آئی کہ اس کا لڑکا بھی ایٹم کے اثر سے بیمار پڑ گیا ہے۔

ہر دلعزیز مصنفوں میں گین جی کے تا خاصکر دفتر کے کلرکوں کی زندگی پر غور کرنے کے باعث مشہور رہے۔ ان کے ایک ناول "امن و امان کا زمانہ" میں ہیرو ایک کارخانہ میں کلرک تھا۔ لڑائی کے وقت اس کو فوج میں بھرتی ہو کر جانا پڑا۔ اتنے میں کارخانہ کی حالت بہت خراب ہو گئی اور صدر نے بہت سے حصے بیچ ڈالے۔ ایک دوسرے کارخانہ کے ڈائرکٹر نے یہ سب حصے خرید لئے اور وہ خود آکر کارخانہ کو سنبھالنے لگا۔ اس کے کارخانہ سے کلرک بھی آگئے۔ پرانا صدر معمولی ڈائرکٹر بنا دیا گیا اور دفتر میں ایک شعبہ کا صدر مقرر کر دیا گیا۔ آہستہ آہستہ ایسا ہونے لگا کہ نئے صدر کے کارخانہ سے آئے ہوئے کلرکوں کے مقابلہ میں پرانے کلرکوں کی حالت بگڑتی گئی۔ اتنے میں ہیرو لڑائی سے واپس آتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ کارخانہ کا حال بالکل بدلا ہوا ہے۔ پرانا صدر تنزل پا کر اب معمولی افسر رہ گیا۔ یہ دیکھ کر اس کے دل میں خیال آتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح وہ حصے جو پرانے صدر نے بیچ ڈالے تھے، پھر خرید لے اور اسی طریقہ سے پرانے صدر کو دوبارہ صدر بنا دے۔ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کی بہت کوشش کرتا ہے مگر کبھی کبھی نا امید ہو جاتا ہے۔ آخر ایک دوست کی مدد سے چور بازار میں کافی روپیہ کماتا ہے اور اس کارخانہ کے حصص خرید کر پرانے کلرکوں کی حالت سدھارنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بے شک اس ناول میں محبت کا قصہ بھی شامل ہے نئے صدر کا لڑکا اور پرانے صدر کی لڑکی ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے اور آپس میں محبت کرتے تھے۔ جب یہ معلوم ہو گیا کہ دونوں کے باپ شادی کی اجازت نہیں دیتے تو گھر سے علیحدہ ہو کر رہنے کو تیار ہوتے ہیں اور ہیرو کی مدد سے شادی کرتے ہیں۔ دونوں کی مائیں اپنے اپنے شوہر سے اپنے لڑکے اور لڑکی کی شادی کی اجازت حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں، لیکن ناکامیاب رہتی ہیں۔ آخر جب یہ خبر آئی کہ نئی بیوی حاملہ ہو گئی تو دونوں کی ماں اپنے اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر جوان میاں بیوی سے ملنے جاتی ہیں کارخانہ میں کلرک لڑکی ہے جو ہیرو سے محبت کرتی ہے۔ اس کی مدد سے کارخانہ کی خبریں ہیرو کو پہنچتی رہتی ہے۔ لیکن ہیرو کے روپیہ کمانے اور کارخانہ کے حصے خریدنے کے خیال میں لگے رہنے سے شادی کا موقع نہیں ملتا۔ اتنے میں ہیرو کا دوست بھی اس لڑکی سے محبت کرنے لگتا ہے۔ ہیرو کے کارخانہ کے حصے خریدنے میں بہت بڑی مدد دینے والا ایک بہت امیر ہے جس کے ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہے۔ اتفاق سے یہ لڑکی اور کلرک لڑکی سہیلیاں تھیں اس امیر کا لڑکا کلرک لڑکی سے اور لڑکی ہیرو سے محبت کرنے لگتے ہیں۔

آخر میں کلرک لڑکی کی شادی ہیرو کے دوست سے اور ہیرو کی شادی اس امیر کی لڑکی سے ہوتی ہے۔

تاریخی ناول نویسی میں یوشی کاوا اے جی اور مورا کامی گین زو بہت مشہور ہیں۔ یوشی کاوا کا عام پسند ناول "ھے کے مونوگاتاری" لوگوں میں بہت پڑھا جا رہا ہے۔

شاعری

مے جی کے ابتدائی دور میں شاعری میں بڑی تبدیلی ہوگئی تھی، اس وقت تک جاپان میں صرف واکا اور ہائکو رائج تھیں جو بہت ہی چھوٹی نظمیں ہوتی ہیں۔ واکا میں صرف ۳۱ بول ہوتے ہیں اور ہائکو میں ۱۷۔

واکا:

"آکی نو کامی
یودا رو وا مُوشی نو
کوئی نو میکا
کیکو وارے لو ٹیمو
ٹینو می یا وا آرد"

ترجمہ:۔ خزاں آگئی، ہوتی جاتی ہے کمزور کیڑوں کے گانے کی آواز
مچلتا ہے مجھ سننے والے کا دل بھی

ھائی کو میں صرف تین مصرعے ہوتے ہیں جن میں سے پہلے مصرعے میں پانچ بول ہوتے ہیں، دوسرے میں سات اور تیسرے میں پانچ مثلاً

"می نی شی مویا
بوسیٔ نو کوشی او
نایانی فومو"

ترجمہ: میں تھر تھر کانپ اٹھا
خوابگہ میں پاؤں جا پڑا
مرحومہ بیوی کی کنگھی پر!

دَور مے جی میں جب یورپ کا تمدن آیا اور یورپ کے ادب سے لوگ واقف ہوئے تو انہیں خیال آیا کہ جاپان کی پرانی نظموں میں بہت چھوٹی ہونے کی وجہ سے پورا خیال ظاہر نہیں کر سکتے۔ مے جی کے پندرھویں سال یعنی ۱۸۸۲ء میں کچھ علماء نے یورپ کی نظموں کا ترجمہ شائع کیا جس کا نام تھا "نئی نظمیں"۔ اس کے بعد موری اوگائی اور اُسے دا بن نے بھی یورپی نظموں کا ترجمہ کیا۔ ان ترجموں سے لوگوں پر بہت اثر پڑا۔ خود جاپانی نظموں کا پہلا اچھا مجموعہ شیمازاکی توسون کا ہے جو "واکانا شو" کے نام سے ۱۸۹۷ء میں شائع ہوا۔ ان کی نظم کا ایک نمونہ یہ ہے:۔

دُور اک جزیرہ ہے ——— نام بھی معلوم نہیں
بہتا ہوا آگیا ناریل کا ایک پھل

اپنے وطن سے جدا ہو کے سفر میں تجھے
کتنے مہینے لگے لہروں میں بہتے ہوئے؟

اونچا اور سایہ دار ہوگا ٹھکانا ترا
ڈالیاں دے رہی ہوں گی پیام امن کا

میں بھی تیری طرح لہروں کو ساحل کے پاس
تکیہ بنا کر ہوں سونے والا مسافر اداس

ناریل کے پھل کو اس نے چھاتی سے چمٹا لیا
دیس سے دُوری کا پھر زخم ہرا ہو گیا
دیکھتا ہوں سورج کو دُور اُفق پہ ڈوبتے،
آتی ہے وطن کی یاد گرتے ہیں آنسو مرے
یہ بہیں لہریں بے قرار کرتی ہیں کیا کیا مجھے
لوٹ کے کب جا سکوں اپنے وطن، دیکھیے

اس نظم کی خصوصیت یہ ہے کہ تمام مصرعے پانچ اور سات بولوں سے بنے ہیں، جیسے

ناموشیرا موتو کی شیما یوری
ناگوری یورو یاشی نومی ہتوتسو

یہ کسی حد تک واکا کی طرح ہے جس کے مصرعوں میں ۵، ۷، ۵، ۷، بول ہوتے ہیں۔

شروع شروع میں جب لوگ یورپی نظموں کی نقل کرتے تھے تو قافیہ بندی کی کوشش کی لیکن جاپانی زبان میں ہر بول کے آخر میں

حرف علت ہونے کی وجہ سے دیگر زبانوں کی طرح قافیہ نہیں جوڑ سکتے۔
اس لئے یکے بعد دیگرے پانچ اور سات بولوں سے مصرعے بنانے لگے۔
اس کے بعد ناولوں کے ساتھ ساتھ نظم کی نشوونما ہوتی گئی۔ فطرت نگاری
کے زمانے یعنی تقریباً ۱۹۰۸ء سے روزمرہ کی بول چال کی زبان میں
آزاد نظم بہت لکھی جانے لگی۔ آجکل کی نظم کی مثال یہ ہے:۔

رس بھری کا میدان

پگڈنڈی کے آس پاس جنگل میں
ہیں لگی رس بھریاں بہت ساری
توڑئیے تو گر جاتی ہیں ان سہانی
لال لال گولیوں کی دلفزا طراوت کا
میرے ساتھ کیا نہ لطف اُٹھاؤ گے کوکتی کوئل کی پُرسکون وادی میں؟

•

آج ہر پہاڑ سے اُٹھ رہے ہیں دَل بادل
جولائی کی ہریالی بڑھ رہی ہے ہر طرف دن بہ دن۔
پیلے پیلے پھولوں کے بَن کے بہت ہی قریب
آتی ہیں مجھ کو نظر ایلپس کی چوٹیاں۔ ۔ ۔

•

پکی ہوئی رس بھری بنتی ہے خود ہی شراب، کرتی ہے جو رتی کو مست
بخت نے کی یاوری، ساتھ رہی زندگی
اب ہے بوڑھاپا مرا جیسے پُرانی شراب۔ تند و تیز۔

واکا جاپان میں سب سے پرانی صنف کی نظم ہے۔ جاپان میں سب
سے پرانی واکاؤں کا مجموعہ مان یو شو ہے جو ۷۵۰ء کے بعد لکھا
گیا۔ اس زمانے کی واکا بہت سیدھی سادی تھی۔ ۹۰۵ء میں بادشاہ
کے حکم سے واکاؤں کا ایک اور مجموعہ تیار کیا گیا جس کو کوکین شو کہتے ہیں۔
اس کوکین شو کی واکا میں طرز ادا کی بہت نشوونما ہوئی۔ اس کے بعد ۱۲۰۵ء
میں ایک اور مجموعہ بادشاہ کے حکم سے بنا جس کو شین کوکین شو کہتے ہیں
اس مجموعہ میں واکا کی طرز ادا کوکین شو کی طرح ہے۔ لیکن کلام میں بہت
اصلاح ہوگئی ہے۔ یہ تین کتابیں واکا کے لئے سب سے اچھی کتابیں
مانی جاتی ہیں اور بعد کے ہر شاعر ان تینوں میں سے کسی ایک کی نقل کرتے ہیں
ہائی کو کی نشوونما دَورِ ادو میں ہوئی تھی۔ ہائیکو میں سب سے
بڑا شاعر ماتسواوباشو (۱۶۴۴ء — ۱۶۹۴ء) ہے۔ ان کے کلام کا ہر زمانہ میں
مطالعہ کیا جاتا رہا ہے۔

جیسا کہ پیچھے بیان کیا گیا ہے، جب عہد میجی شروع ہوا تو
لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ واکا اور ہائی کو آجکل کے خیالات کے اظہار کے
لئے بہت مختصر ہیں اور اب جدید طرز کی شاعری کو رواج دینا چاہئے۔ لیکن
واکا اور ہائی کو جاپانی کی رگ و ریشہ میں سرایت کر چکی ہیں۔ انہیں اتنی
آسانی سے چھوڑا نہیں جا سکتا۔

دَورِ میجی میں واکا اور ہائی کو کو پھر سے ترقی دینے والوں میں
ماسا اوکا شیکی (۱۸۶۷ء — ۱۹۰۲ء) سب سے بڑے آدمی تھے۔
انہوں نے واکا میں مان یو شیو اور ہائی کو میں باشو کا خاص مطالعہ کیا
تھا۔ ان کا قول ہے کہ شعر میں اسکیچ سب سے ضروری ہے یعنی تصویر بنانے
کی طرح نظم میں بھی خیال کے خدوخال ظاہر ہونے چاہئیں۔ ان کے بعد
بہت سے شاعر ہوئے اور اسکیچ کے نقطہ میں نئے نئے مطالب پیدا
کرتے رہے۔

واکا اور ہائی کو لوگوں میں بہت مقبول ہیں۔ لڑائی کے وقت
سپاہیوں نے اچھی اچھی واکا اور ہائی کو نظمیں لکھی ہیں، جیسے

چینی لوگ
کھیتوں میں بوتے ہیں دھان
آتی ہے وطن کی یاد
میں بھی ہوں اپنے وطن کا کسان

لڑائی کے بعد پھر کچھ لوگوں کو خیال آیا کہ واکا اور ہائی کو نظم کہنے
کے لئے بہت چھوٹی ہے لیکن آجکل لوگوں کا دھیان قدیم رسموں کے احیاء
کی طرف ہونے کی وجہ سے واکا اور ہائی کو زیادہ لپک کی جا رہی ہے۔ معمولی
لوگوں کے لکھے ہوئے ایک دو نمونے دیکھ لیجئے۔

کیسی خوبصورت ہے
یہ زمین کی پالی ہوئی شے،
ہاتھ میں لے لیا
لال لال دانوں کو

خزاں کے مچھر
بھنبھناتے ہیں سینے کی شین کے گرد
اس کی آخری قسط ادا کردی گئی۔ *

فکاهیه:

حکیم جی

ضمیر جعفری

یہ ان مشہور حکیم بوعلی سینا کا تذکرہ نہیں جو علم طب کے امام مانے گئے ہیں جن حکیم سینا کا ذکر میں کر رہا ہوں اگرچہ ویسے خود وہ بھی اپنے آپ کو وقت کا بوعلی سینا ہی سمجھتے تھے مگر عملاً ہمارے شہر کی ایک ایسی تنگ و تاریک پتلی سی گلی میں مطب کرتے تھے جہاں طبیب و مریض تو بڑی چیزیں ہیں یہ نفس علم طب کا گزر بھی مشکل معلوم ہوتا تھا لیکن انسان وہ مخلوق ہے کہ جب کچھ کرنے پر آتا ہے تو ایک شاعر کے بقول سمندر چیرتا ہے کوہ سے دریا بہاتا ہے۔ اور جب ایک دوسرے شاعر کے بقول کچھ بھی کرنے کو نہیں جی چاہتا۔ تو اس گلی میں مطب تک کر لیتا ہے

جینا اسی گلی میں مرنا اسی گلی میں

طبیب کی حیثیت سے حکیم سینا کی شہرت صرف اسی قدر تھی کہ وہ تقریباً اسی نوے برس تک زندہ رہے۔ شہرت سے زیادہ لوگوں کو ان کی سخت جانی پر حیرت تھی کہ جس تنگ دستی مگر پھر جس وضع داری کے ساتھ انہوں نے زندگی بسر کی ہے وہ اتنی مدت تک زندہ ہی کیونکر رہ سکے تھے محلے کی طرف سے کمیٹی کے سنسوڈ ممبر بابو مولا داد سیاہ نویس اکثر کہا کرتے تھے کہ حکیم سینا اگر اسی گلی کے نکڑ پر خوانچے میں مونگ پھلی لے کر بیٹھ جاتے تو زیادہ آسودہ ہوتے مگر حکیم صاحب تھے کہ جہاں ایک مرتبہ بیٹھ گئے تھے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ پچھلی صدی کے چوتھے یا تیسرے ربع میں ان کے والد مرحوم جو عطاری کا دھندا کرتے تھے جہاں ان کو بٹھا گئے تھے وہ پھر وہاں سے اٹھے نہیں۔ آخر آخر میں تو خیر کئی سال سے بذاتِ خود ان کا جینا ہی صحیح معنوں میں بے معنی ہو چکا تھا مگر پچھلے دنوں میں بھی اہل الرائے اصحاب کی رائے یہ تھی کہ حکیم سینا اور امام مسجد مولوی لطف اللہ خاں علی الترتیب حکمت و امامت کے علاوہ کوئی دوسرا دھندا کر ہی نہیں سکتے۔ مولوی لطف اللہ خاں تو نسبتاً پھر بھی آسودہ حال تھے مگر حکیم صاحب کا حال ساری عمر یہ رہا کہ محلے کی بوڑھی خوش عقیدہ عورتوں کو جب کبھی اللہ کی رزاقی و قدرت پر گفتگو مقصود ہوتی تو مثال کے طور پر وہ پتھر کے سینے میں جینے والے کیڑے اور اندھی گلی میں مطب کرنے والے حکیم سینا کا تذکرہ عموماً ایک ہی سانس میں کیا کرتیں۔

حکیم سینا میری طفلی ہی کے زمانے میں جس کو آج کوئی پچیس تیس برس گزر چلے ہیں، اس مقام پر پہنچ چکے تھے جہاں کوئی آدمی اپنی افادیت کھو دینے کے بعد محض ایک رائے یا مشغلہ یا قہقہہ رہ جاتا ہے۔ ہمارا شہر کچھ اس قسم کا ہے جہاں ہر شخص ہر شخص کو جانتا ہے بلکہ لوگ ایک دوسرے کے شجرۂ نسب تک سے واقف تھے۔ ہمارے شہر کا ایک معروف معزز شخص جو وزیر تک رہ چکا ہے اپنے شہر میں اب تک میاں حشمت علی ماشٹی ہی کہلاتا ہے۔ یہ دراصل ایک بڑا قصبہ ہے جس کو زرعی ملک کی سیر چشمی نے شہر کا نام دے رکھا ہے۔ چنانچہ حکیم سینا کو شہر کا بچہ بچہ جانتا تھا۔ بلکہ بڑوں کو چونکہ مدت سے ان میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہ گئی تھی اس لئے شہر کے بچے ان کو کچھ زیادہ ہی جانتے تھے۔ مجھے جس وقت ابھی یہ تمیز بھی نہ تھی کہ طبیب کیا ہوتا ہے اور مطب کسے کہتے ہیں یہ معلوم تھا کہ لہراتی ہوئی سفید ڈاڑھی والا وہ مرد بزرگ جو ہر روز شام کو بلا ناغہ ہاتھ میں موٹا سا عصا لے کر ایک مقررہ راستے پر سیر کو نکلتا ہے، حکیم سینا ہے۔ ذرا بڑا ہوا تو ان کے متعلق اور بہت سی باتیں معلوم ہو گئیں۔ مثلاً یہ کہ ان کا نام تو عبدالوہاب یا عبدالصبور تھا مگر اپنے آپ کو خاک پائے بوعلی سینا کہتے تھے جو کثرت استعمال سے گھس کر صرف سینا رہ گیا تھا۔ کسی طبیب یا طبی درسگاہ سے فن کی تحصیل قطعاً نہیں کی تھی لیکن خود کو فن کا مجتہد سمجھتے تھے۔ خود بہت چلتے تھے مگر مطب بالکل نہیں چلتا تھا۔ معمولی عوارض کا علاج

یہ نہیں کرتے اور "بڑے امراض" کے مریض ان سے علاج نہیں کرواتے۔ عمر بھر شادی نہیں کی۔ نہایت عسرت میں بسر ہوتی ہے، مگر متبنّٰی رکھنے کا شوق اتنا ہے کہ کوئی ڈیڑھ درجن متبنّٰی بدل چکے ہیں۔ آگ پر پکی ہوئی کوئی چیز نہیں کھاتے چنانچہ ۱۹۲۵ء تک وہ اپنے اس معمول پر پچیس برس کی پابندی کا ریکارڈ قائم کر چکے تھے۔ ٹوکری کی کلاہ پر نیلے رنگ کی جو پگڑی باندھ کر نکلتے ہیں وہ گزشتہ بیس برس سے بندھی ہوئی ہے۔ مطب میں مریض ملنے کو آ جائے تو اس کو تضیع اوقات گردانتے ہیں۔ طبیعت میں تلخی ہے۔ مزاج چڑچڑا ہے۔ عمر بڑی، صحت اچھی۔ الغرض ایک سے ایک دلچسپ اور سینکڑوں باتیں ان سے منسوب اور زبان زد عام تھیں۔

حکیم سینا سے میری باضابطہ ملاقات اس وقت ہوئی جب میں زندگی میں داخل ہونے کے لئے اپنے شہر سے باہر جا رہا تھا۔ حکیم صاحب اس وقت عمر کے اس مقام پر کھڑے تھے جس کے بعد آدمی اچانک کسی دن مر تو جاتا ہے مگر اس سے زیادہ بوڑھا نہیں ہو سکتا۔ مطب گھر پر ہی تھا بلکہ جیسا کہ بعد میں دیکھا گھر مطب میں تھا۔ چھوٹی اینٹوں کا چھوٹا سا پرانا مکان تھا جس کی بوسیدہ بیرونی دیواروں کے کئی مختلف شگافوں میں سے دس پندرہ کائی اور سو کھے کے لاڈلے پودے اور بیری اور شہتوت کے معزز درخت بیک وقت پروان چڑھتے ہوئے ایک دوسرے پر چڑھ گئے تھے۔ مکان اور درختوں کا رشتہ اتنا قدیم و محکم تھا کہ اب مکان ان ہی کے سہارے کھڑا تھا۔ غالب نے کسی ایسے ہی مکان کی نسبت کہا ہوگا۔

دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

مطب والی کوٹھڑی گلی میں کھلتی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ بند ہی نہ ہو سکتی تھی۔ اندر پہنچا تو عام شہرت کے مطابق مطب سائیں سائیں کر رہا تھا۔ حکیم سینا متروک وضع کے ایک پرانے صوفے کی لمبی نشست پر دراز تھے۔ سامنے بے دلی سے چھلا ہوا دیار کا ایک گرانڈیل میز پڑا تھا جس پر زنگ اور چیتھڑے دھالوں کی گنی چنی سات بوتلیں رکھی تھیں جن میں سے بالخصوص سرمئی رنگ کی ایک بوتل میں سفید سفید گولیاں مطب کے نمناک دھندلکے میں بھی چمک رہی تھیں۔ میز سے لگی ہوئی بے بازو کی دو چوکیاں تھیں اور دیواروں کے تین چار کشادہ طاقوں میں بے شمار چھوٹی بڑی بوتلیں گرد و غبار میں اس اطمینان کے ساتھ اٹی پڑی تھیں کہ اب ان کو چھیڑنے سے نہ معلوم کتنی صدیوں کی دل آزاری کا

احتمال ہوتا تھا۔ ان کے علاوہ پھٹے پرانے کپڑے، مختلف طول و عرض کے کھرل اور انواع و اقسام کے ہاون دستے بے ترتیبی سے پڑے تھے۔

میری آہٹ سن کر حکیم صاحب اکڑوں ہو کر بیٹھ گئے۔ وہ پہلے مجھے کوئی مریض ہی سمجھے۔ نبض کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولے :-

"کیا عارضہ ہے؟"۔ میں نے عرض کیا محض اشتیاق ملاقات کھینچ لایا۔ اس پر اپنے خشونت آمیز روکھے پن کو چہرے کی شکنوں سے ظاہر کر کے پہلو سمیٹتے ہوئے بولے :-

"آپ غالباً اس شہر میں نو وارد ہیں۔ میں نے اس قسم کی ملاقاتوں کو کبھی نہیں سراہا۔ خیر اب آپ آ ہی گئے ہیں تو بیٹھئے لیکن پہلے ذرا میز پر سے میری عینک اٹھا دیجئے۔ مہربانی۔ مگر نہیں رہنے دیجئے۔" اور پھر خود ہی عینک اٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں نے زندگی بھر اپنا ہر کام اپنے ہاتھ سے کیا ہے۔ یہ عادت کچھ ایسی راسخ ہو چکی ہے کہ مثلاً اب آپ عینک اٹھا کر دیتے تو بہت ممکن تھا مجھے اس میں سے کچھ سجھائی ہی نہ دیتا۔"

"اچھا" میں کچھ تعجب سے بولا

"نہیں۔ یہ نئی پود اس بات کو سمجھ ہی نہیں سکتی۔ تم لوگ تو معاف کرنا یہ چاہتے ہو کہ تمہاری جگہ حوائج فطریہ بھی کوئی دوسرا ہی بھگت آئے۔" پھر عینک کو ناک کی گھوڑی پر سوار کرتے ہوئے۔ "لیجئے اب بات کیجئے۔ کیا کہوں میری کچھ ایسی عادت ہو گئی ہے کہ عینک کے بغیر میں گفتگو بھی نہیں کر سکتا۔ ہاں تو آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ کون ہو عزیز من؟"

اس تمہید کے بعد اس روز کوئی تین گھنٹے ہماری سیر حاصل ملاقات رہی۔ کہاں تو ان کی نسبت یہ مشہور تھا کہ وہ کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں اور کہاں یہ کیفیت جو میں نے دیکھی کہ بیچ میں تین چار مرتبہ اٹھنا چاہا تو زبردستی بٹھا بٹھا لیا۔

ان سے اپنی پوری گفتگو قلمبند کرنے کے لئے تو ظاہر ہے کم از کم تین ہی گھنٹے چاہئیں بہر حال خلاصہ کلام یہ کہ حکیم صاحب اپنے آپ کو واقعی دیانتداری کے ساتھ وقت کا بوعلی سینا سمجھتے تھے۔ بوعلی سینا تو خیر ان کے پیکر میں دوبارہ پیدا ہو ہی گئے تھے لیکن ان میں بقراط، سقراط، ابونصر اور نہ جانے کن کن دوسرے حکماء اجل کی خوبیاں بھی مجتمع تھیں اس لئے ان کے نزدیک ان کے پایہ کا طبیب آئندہ پیدا ہی نہیں

ہو سکتا تھا۔ دنیا سے وہ شاکی ضرور تھے مگر کچھ اس طرح جیسے کوئی باپ نالائق اولاد کی شکایت کرتا ہو۔ انسانوں کو وہ چمگادڑ سمجھتے تھے جو چشمۂ آفتاب کی روشنی سے محروم ہے۔ فن میں اپنی عظمت کا شعور و غرور ان میں اتنا قوی تھا کہ اس پر جان کی بازی لگا بیٹھنے اور حقائق سے کسی قیمت پر سمجھوتہ کرنے پر آمادہ نہ ہوتے۔ وہ کہتے تھے کہ بشری کمزوری کے بعض لمحوں میں جب کبھی ان کے ذہن میں طب چھوڑ کر کوئی دوسرا دھندا کرنے کا خیال آیا تو اسی رات حکیم جالینوس۔ بقراط۔ خود حضرت بو علی سینا اور علم طب کے بعض دوسرے اعالی و اکابر خواب میں آکر کبھی لعنت ملامت کرتے، کبھی ہاتھ جوڑ کر منت سماجت سے کہ دیکھو اس دور میں طب کی ایک ہی تو شمع فروزاں رہ گئی ہے۔ حکیم سینا دراصل ان باذنبع اطبا میں سے تھے جو فن کو اس کی بقا کے لئے سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ نہ فن زندہ تھا نہ خود آپ۔ پھر بعض نازک مزاج باکمال شعرا کی طرح وہ اپنے آپ کو ایک مقدس قومی امانت سمجھتے تھے ان کو عزت و آسائش کے ساتھ زندہ رکھنا قوم کا فرض تھا اور ان کا اپنا فرض صرف اتنا تھا کہ بس وہ پیدا ہو گئے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ حکیم صاحب اگر "بو علی سینا" نہ ہوتے تو "میر تقی میر" ہوتے۔

بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

ہر چند وہ اب قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے مگر مستقبل کی طرف سے مایوس ہرگز نہ تھے۔ یہ سوچے بغیر کہ اس گلی میں بکری کا بچہ بھی گزر سکتا ہے یا نہیں، اس بات کا پختہ یقین تھا کہ قوم ایک دن ہاتھی گھوڑے لے کر ان کے دروازے پر پہنچے گی اور مرنے کے بعد ان کے جنازے پر خلق خدا کا ہجوم دیدنی ہوگا۔ انہوں نے بڑے تیقن کے ساتھ مجھ سے کہا تھا "میں اپنی کامیابی کو اس طرح دیکھ رہا ہوں جیسے اس وقت تمہیں دیکھ رہا ہوں مجھے بس ایک معرکے کے مریض کا انتظار ہے"!

مجھے اعتراف ہے کہ میں حکیم صاحب سے اس پہلی ملاقات میں کافی متاثر ہوا تھا۔ ان کی مضبوط قوت ارادی حیرت انگیز تھی میں نے محسوس کیا کہ ملنے والا ترحم اور سراسیمگی کی ملی جلی کیفیات کے ساتھ ان کی شخصیت کا ایک گونہ اثر ضرور قبول کرتا تھا۔ بالکل اس طرح جیسے کسی تاریخی قبرستان کے کھنڈروں میں ایک خاص عظمت و ہیبت کا احساس ہوتا ہے۔ اس ملاقات کے بعد مختلف وقفوں میں حکیم صاحب سے میری تین چار ملاقاتیں اور ہوئیں۔ میرے کاروبار کی نوعیت ایسی ہے کہ سال میں بمشکل ایک مرتبہ اپنے آبائی شہر میں آنے کی مہلت ہے مگر جب کبھی موقع ملتا میں حکیم صاحب کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا۔

ایک مرتبہ اثنائے گفتگو میں میں نے جدید زمانہ کے تقاضوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروپیگنڈے کی اہمیت پر زور دینا چاہا تو حکیم صاحب اس طرح بھڑک اٹھے کہ ان کی عمر کا آدمی اس شدت سے بالعموم بھڑک بھی نہیں سکتا۔ غضبناک ہو کر بولے۔

"کیا کہا پروپیگنڈا؟"

"جی ہاں"

"جی نہیں مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا نہیں ہو سکتا۔ نہیں ہو سکتا۔ اب تم کہو گے کہ چوک میں جا کر مجمع بھی لگایا کروں؟ — صاحبزادہ صاحب! مشک آنست ...." اور پھر میز پر سے سفوف کی دو بوتلیں اٹھا کر باہر گلی کی بدرو میں پھینکتے ہوئے کہا "یہ لو آج میں نے انسانوں کی بدبختی پر ایک اور مہر ثبت کر دی۔ اگر کسی کتے نے اس نالی میں سے ایک بوند بھی پی لی تو دیکھ لینا کہ وجع المفاصل اور عرق النسا کے امراض سے محفوظ و مامون ہو جائے گا، مگر انسانوں کے لئے ان امراض کی شفا اب دنیا سے اٹھ گئی۔ اٹھ گئی —" اور حکیم صاحب خود بھی اٹھ کر کرب کی ایک خوفناک کیفیت میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگے۔

مدت کے بعد پھر حاضر ہونے کا اتفاق ہوا تو میز کی پانچ بوتلوں میں سے تین ہی سلامت رہ گئی تھیں۔ معلوم ہوا کہ اس درمیان میں آپ صرع اور سرطان کے بیماروں کا بیڑا بھی غرق کر چکے ہیں۔ اس مرتبہ ان کی امیدیں بڑی تیزی سے ایک ایسی مایوسی میں بدلتی جا رہی تھیں، جس میں انسانوں کے خلاف نفرت اور جذبہ انتقام کی جھلک صاف نظر آتی تھی۔ انہوں نے بیس برس کی بندھی ہوئی پگڑی کھول کر اس کی جگہ یہ عہد باندھ لیا تھا کہ اب میت ہی دهلیز سے باہر نکلے گی۔ ایک خدا ترس ہمسائے کی معرفت پرانی بوتلیں معجونوں کے مرتبان۔ ہاون دستے اور کھرلیں بیچ بیچ کر کھا رہے تھے۔ اپنا پلنگ موجود تھا مگر تپائی والی چارپائی غائب تھی۔ میں نے مزاج پرسی کی تو کہنے لگے۔

"اور تو کچھ نہیں، ہاں یہ صدمہ ضرور ہے شمس میاں کہ میں زندہ ہوں اور دنیا مرتی جا رہی ہے۔ مگر خیر۔ اللہ کے بھیجے ہوئے کتنے سچے رسول بھی بظاہر اپنے مشن میں کامیاب نہ ہو سکے"۔ اس

ملاقات میں یہ لطیفہ بھی ہوا کہ میرے بیٹھے بیٹھے خدا معلوم کہاں سے اور کیوں خاصی معقول وضع کا ایک مریض لنگڑاتا لنگڑاتا مطب میں آنکلا۔ میں خوش ہوا کہ شاید حکیم صاحب کی ساعتِ مراد آپہونچی مگر وہ تو اسے دیکھتے ہی آگ بگولا ہو گئے۔

"اب آئے ہو وجع المفاصل لے کر جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔"

"لیکن قبلہ" مریض بولا "میرا مرض ابھی کچھ زیادہ پیچیدہ نہیں ہونے پایا۔"

"جی ہاں" میں نے بھی مداخلت کی۔

"جی نہیں" حکیم صاحب بولے۔ "بندہ نواز اس مرض کی شفا اب انسانوں کے مقدر ہی میں نہیں رہی۔ اب تو لوگوں کو وجع المفاصل سمیت ہی جینا پڑے گا (پھر مجھ سے مخاطب ہو کر) میاں! میرا خیال ہے کہ خط نسخ کوفی میں اس مضمون کا طغرا لکھوا کر بازار میں آویزاں کرا دوں؟"

مجھے معلوم تھا کہ حکیم صاحب اس دوا کی بوتل ہی توڑ چکے ہیں مگر اس خیال سے کہ آیا ہوا مریض ہاتھ سے نکلنے نہ پائے میں نے پھر گزارش کی۔

"لیکن قبلہ وہ دوا دوبارہ بھی تو بنائی جا سکتی ہے جی ہاں"۔

"جی نہیں۔ وہ نسخہ مسلسل بارہ برس کی ریاضت چاہتا ہے اور وجع المفاصل کا مریض پانچ برس سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتا۔"

یہ سنکر مریض کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ پہلے اس نے کانسی کے پیالے میں صراحی سے پانی انڈیل کر پیا اور پھر پہلے سے بھی زیادہ لنگڑاتا ہوا واپس ہو گیا لیکن ابھی اس کی ایک ہی ٹانگ دہلیز کے پار ہو گی کہ حکیم صاحب بولے:-

"شمس میاں مجھے اس شخص کی جوانا مرگی کا بڑا رنج ہو گا مگر کیا کر سکتا ہوں شمس میاں بخدا مجھے اس وقت کے تصور ہی سے ہول آتا ہے جب لوگ پاگلوں کی طرح پکار پکار کر مجھے آوازیں دیں گے مگر حکیم سینا اس دنیا میں نہیں ہوگا۔"

حکیم صاحب سے میری آخری ملاقات دلچسپ ترین ملاقات ثابت ہوئی۔ مطب کی ویرانی پہلے سے سوا تھی۔ میز پر صرف سفید گولیوں والی ایک سرمئی بوتل رہ گئی تھی۔ پلنگ تک اٹھ چکا تھا مگر چہرے سے وہ گھٹاٹوپ مایوسی چھٹ چکی تھی۔ جتنی بشاشت اس مرتبہ میں نے ان کے چہرے پر دیکھی پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ مجھ سے تقریباً لپٹتے ہوئے بولے:-

"بھئی بڑے اچھے موقع پر آئے! آج میں اپنی زندگی کا سب سے بڑا تجربہ کرنے والا ہوں۔ زندگی کی سب سے بڑی کامرانی سے ہمکنار ہونے والا ہوں۔ (میز والی بوتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) "دیکھتے ہو یہ کیا ہے؟"

"جی ہاں۔ بوتل ہے"

"جی نہیں۔ بوتل نہیں ہے۔ میری زندگی ہے۔ اس میں علم طب کا وہ راز بند ہے جو آج تک نہیں کھل سکا۔ بس آج ہی کھلے گا۔"

"خوب۔ بہت خوب!"

"حیرت سے میرا منہ کیا تک رہے ہو؟۔ اس نسخے کے اجزا خود حضرت بو علی سینا رحمۃ اللہ علیہ نے عالم رویا میں اس عاجز پر منکشف فرمائے تھے اور فرمایا تھا کہ اس میں بقراط و سقراط کی روحیں بند ہیں۔ چاند اور ستارے بند ہیں!"

"یعنی پھر تو واقعی بیحد عجیب چیز ہوئی"

"اور پھر حضرت نے فرمایا تھا کہ تمہاری زندگی میں فشار الدم کا ایک لاعلاج مریض آئے گا یہ گولیاں اس پر آزمانا"

"تو پھر آپ نے آزمائی؟" میں نے شوق کی بیتابی میں پوچھا۔

"کس پر آزماتا۔ تم پر؟" وہ قدرے جھلا گئے مگر فوراً ہی دھیمے بھی ہو گئے "آج تو وہ موعودہ مریض پہونچا ہے جس کی بشارت آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے مجھے دی گئی تھی۔ اور ہاں۔ حضرت نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اس کے بعد تجھ پر رزق۔ شہرت۔ عزت کے چالیس دروازے کھل جائیں گے۔ میں سمجھتا ہوں وہ مبارک ساعت آگئی ہے۔ مگر شمس میاں میں سوچتا ہوں کہ اگر مجھ پر اس طرح یکبارگی چالیس دروازے کھل گئے تو میں کس کس دروازے میں سے گزرا کروں گا؟"

اس کے بعد حکیم صاحب نے پورے تحمل کے ساتھ ساری روداد سنائی کہ فشار الدم کا ایک مایوس العلاج مریض کل اچانک ان کے ہاں آگیا تھا۔ خود مریض کو تو کچھ معلوم نہیں کہ اسے کیا مرض ہے مگر حکیم صاحب کی تشخیص تھی کہ اسے فشار الدم ہی کا عارضہ تھا۔ آج وہ معالجے کے لئے مطب میں آنے والا تھا کیونکہ ان گولیوں کا تجربہ حکیم صاحب خود اپنے سامنے کرنا چاہتے تھے۔ گولیوں کے سلسلے میں حکیم صاحب نے بتایا کہ بہت مدت ہوئی انہوں نے ایک ناگوری بیل پر دو گولیاں آزما کر دیکھی تھیں جس کا ردعمل خاطر خواہ نظر آیا تھا۔ بیل تو خیر ردعمل کے صدمے میں صرف اچھلتا کودتا ہی رہا لیکن حکیم صاحب کی رائے میں بیل کو دراصل بقراط اور جالینوس دکھائی دے رہے تھے۔ اس مرحلہ پر میں نے پوچھا کہ

آخر بقراط اور جالینوس کے نظر آجانے سے مرض کیونکر دور ہو سکتا ہے تو اس کے جواب میں حکیم صاحب نے اقبال کا یہ مصرع پڑھ دیا کہ ؎

"نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں"

ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ سچ مچ مریض آگیا جو بظاہر ہٹا کٹا گنوار سا دیہاتی نوجوان تھا۔ بات کی تو محسوس ہوا کہ فشار الدم کا مریض تو ہو یا نہ ہو ذہنی خلفشار کا مریض یقیناً تھا۔ بدحواس، پریشان خیال، پریشان وضع۔ بہرحال حکیم صاحب نے صوفے ہی پر اپنے پاس بٹھا کر کنوئیں کے آبِ تازہ کے ساتھ ورق نقرہ میں لپٹی ہوئی ایک گولی اس کے حوالہ کردی جس کو حلق سے اتارنے کے بعد مریض فوراً بولا۔

"تلخی ہے۔ ذرا تین اور دیجیے"۔ حکیم صاحب سنی ان سنی کر کے نبض تھام کر ردعمل کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ کچھ وقفہ کے بعد مریض سے پوچھا۔

"کیوں یہاں کیا کچھ محسوس ہو رہا ہے؟"۔ جس کے جواب میں مریض نے دونوں آنکھیں بند کر کے گردن کو اس زور سے اپنی چھاتی پر پھینک دیا کہ اگر رگ پٹھے مضبوط نہ ہوتے تو کچھ عجب نہ تھا کہ گردن ٹوٹ کر باہر جا گرتی۔ حکیم صاحب بولے "اب ان پر غنودگی طاری ہو رہی ہے۔ ناگوری بیل پر بھی اسی طرح پہلے غنودگی طاری ہوئی تھی۔ پھر مریض کو خواب آتا ہے۔ پھر بقراط۔ جالینوس۔ چاند۔ ستارے......." حکیم صاحب ردعمل کے مختلف مراحل پر روشنی ڈال رہے تھے کہ ادھر مریض پر ردعمل شروع بھی ہو گیا۔ ردعمل کیا تھا اچھلنے کودنے کا ایک مضحکہ انگیز سلسلہ تھا۔ مریض صوفے سے اچھل کر میز پر جا بیٹھتا اور میز سے اچھل کر صوفے پر۔ حکیم صاحب جو نبض کو کسی حالت میں چھوڑنے پر تیار نہ تھے اس ردعمل میں برابر کے شریک تھے۔ کچھ دیر کی اچھل کود کے بعد پایان کار مریض بیہوش ہو کر میز پر اس طرح جا لیٹا جیسے عامل کے سامنے معمول پڑ رہتا ہے۔ اس پر حکیم صاحب نے گرد و پیش پر یوں نظر ڈالی جیسے کوئی قلعہ سر کر لیا ہو۔

"لیجیے اب ردعمل شروع ہوتا ہے"۔

"جی ہاں ——"

"جی نہیں —— ابھی کیا ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا"۔

(اور پھر مریض پر جھکتے ہوئے)

"کیوں میاں؟"

"ارے کچھ بولو تو سہی"۔

"ہاں بھئی۔ کہو کوئی چیز نظر آئی؟

"ہاں —— کچھ ہے تو سہی"۔ مریض مری سی آواز میں بولا

"کیا ہے؟" حکیم صاحب فرطِ مسرت سے بچوں کی طرح اچھل کر بولے۔ "کیا چیز ہے۔ سورج۔ چاند۔ ستارہ۔ انسان ——"

"ابھی تو ایک لمبا سا کان ہی لٹک رہا ہے"

"الٰہی تیرا شکر! —— میاں میرا خیال ہے حکیم بقراط ابھر کر سامنے آ رہے ہیں۔ کتابوں میں آیا ہے کہ حکیم بقراط کے کان غیر معمولی طویل تھے (مریض سے) ہاں تو کوئی اور چیز بھی دکھائی دی؟"

"جی ہاں۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ بڑے بڑے دانت ......"

"شاباش! —— یہ سمجھو تمہارا نصف مرض جا چکا —— دیکھا شمس میاں ان گولیوں کا طلسمی تصرف"۔

"جی ہاں" میں بولا۔

"جی نہیں" حکیم صاحب جی ہاں کو کم ہی برداشت کرتے تھے۔ "دیکھتے جاؤ۔ ابھی تو اس شخص کے کف دست پر شمس و قمر اترنے والے ہیں۔ بخدا اس وقت اگر یہ شخص چاہے تو پورے نظامِ شمسی کو ادھر سے اٹھا کر ادھر پھینک دے۔ (مریض سے مخاطب ہو کر) —ہاں تو بھئی اور کچھ..."

"دم؟ —— لمبی دم ——" مریض یکبارگی چلایا۔ اس کی آواز میں خوشی کا جذبہ تھا۔ "دُم؟" —— حکیم صاحب دم بخود ہو گئے۔ "دم؟ شاید کوئی دم دار ستارہ طلوع ہو رہا ہے"۔ —— اتنے میں مریض پورے زور سے چلایا۔ "وہی۔ بالکل وہی۔ ہمارا اپنا کمیدیا گدھا"۔

"گدھا؟ —— لاحول ولا قوۃ۔ میرا خیال ہے مریض کو ایک اور گولی درکار ہے"۔ حکیم صاحب میز پر سے بوتل اٹھا ہی رہے تھے کہ ناگاہ دو اجڈ سے دیہاتی مطب میں داخل ہوئے جن میں سے ایک نے آتے ہی زن سے ایک طمانچہ مریض کی کنپٹی پر جما دیا۔

"حرامخور کہیں کا۔ کہاں بھیجا تھا اور کہاں آ کر لیٹا ہوا ہے —— اٹھ بے —— اٹھتا ہے یا ——" اور مریض اٹھ کر بیٹھ گیا۔ حکیم صاحب اور میں، دونوں ہکا بکا تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ پتہ چلا کہ یہ لوگ ایک نواحی گاؤں کے کمہار تھے۔ کئی روز سے ان کا ایک گدھا کھو گیا ہے۔ "مریض" ان کا ایک نیم فاتر العقل بھتیجا تھا جو تین دن سے گدھے کی تلاش میں نکلا ہوا تھا۔

یہ سن کر حکیم صاحب نے سفید گولیوں والی وہ آخری بوتل بھی باہر نالی میں پھینک دی ●

مشرقی بنگال میں تپِ دق کی روک تھام:

بقیہ صفحہ ۴۲

اس کام کے لئے پاکستانی اسٹاف کو تربیت بھی دی گئی۔ اس مہم میں مقامی باشندوں کو تربیت دینے کا کام سب سے اہم سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ جب تک نئے طریقوں اور آلات کے استعمال کرنے والے نہ ہوں، ان سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

عالمی ادارۂ صحت کے بین الاقوامی ماہروں کی ٹیم کے افسر اعلیٰ ڈاکٹر ماریو ڈی مارکی اٹلی کے باشندے ہیں اور تپِ دق کے متعلق یورپ کے بڑے بڑے ہسپتالوں میں مدت تک علاج معالجے کے تجربے حاصل کر چکے ہیں۔ ان کے ہمراہ تپِ دق کے مریضوں کی دیکھ بھال کرنے کے لئے مس ایلیشن نرس کے طور پر آئی تھیں۔ یہ برطانیہ کی رہنے والی ہیں، اور اپنے کام میں بین الاقوامی شہرت کی مالک ہیں۔ سنٹر میں ایکسرے کی مشین اور دوسرے آلات اقوامِ متحدہ کے بچوں کے امدادی فنڈ نے دیئے تھے اور ڈھاکہ یونیورسٹی کے قریب ایک خوبصورت عمارت کہ جس میں یہ سنٹر قائم کیا گیا تھا مشرقی پاکستان کی حکومت کا عطیہ تھی۔ اس طرح اس منصوبے کو صحیح معنوں میں اقوامِ متحدہ کے نئی امداد کے پروگرام کا ایک کامیاب نمونہ کہا جا سکتا ہے۔

ڈھاکہ سنٹر کا سب سے بڑا کارنامہ اس شہر کے باشندوں میں اس بات کا احساس پیدا کرنا ہے کہ تپِ دق کے خلاف سب شہریوں کو مل کر جدوجہد کرنی چاہیئے۔ اور اس جدوجہد کو کامیاب بنانے کے لئے ان کے اپنے شہر میں ایک ایسا مرکز قائم ہے کہ جہاں سے انہیں ہر قسم کی امداد مل سکتی ہے۔

ڈھاکہ کنٹرول سنٹر کی عمارت میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے نظر ڈھاکہ شہر کے ایک بہت بڑے نقشے پر پڑتی ہے جو ایک بورڈ پر بنایا گیا ہے۔ اس نقشے پر محلوں، گلیوں اور کوچوں پر جگہ جگہ سبز رنگ کے موٹے موٹے پن لگے ہوئے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ان مقامات تک ڈھاکہ سنٹر کے ہوم وزیٹر گھر گھر پہنچ چکے ہیں۔ یہ کام کیسے ہوتا ہے اس کی داستان اپنی جگہ بڑی دلچسپ ہے۔ پاکستانی مردوں اور عورتوں کو ڈھاکہ سنٹر میں ۱۹۵۴ء میں اس کام کی تربیت دی گئی تھی۔ پہلے کورس کی کامیابی اس قدر ہمت افزا تھی کہ اسی سال ہوم وزیٹروں کی تربیت کا دوسرا کورس شروع کیا گیا، اور اس نصاب کی تکمیل بھی وقت پر ہو گئی۔ یہی ہوم وزیٹر اب ڈھاکہ شہر کے مختلف علاقوں میں گھر گھر جا کر تپِ دق کے مریضوں کو مشورے اور ہدایتیں دیتے ہیں۔

ڈھاکہ سنٹر میں ہر ہفتے سینکڑوں مریض پھیپھڑوں کا ایکسرے لینے کے لئے آتے ہیں۔ ایکسرے کی تصاویر کے بغیر تپِ دق کا علاج ناممکن ہے۔ اور اب تک مشینیں نہ ہونے کی وجہ سے صحیح طریقے سے علاج نہیں ہو سکتا تھا۔ اب بغیر کسی خرچ کے ایکسرے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ شروع میں ایکسرے کی مشین پر کام کرنے کے لئے عالمی ادارہ صحت کے ایک ماہر کی خدمات حاصل کی گئی تھیں)۔ اب یہ کام ایک پاکستانی کی نگرانی میں ہوتا ہے۔ اور تصویروں کو مکمل کرنے کے مختلف مرحلے بھی پاکستانی کاریگروں کے ہاتھ سے تکمیل پاتے ہیں۔

اقوامِ متحدہ کے فنی امداد کے پروگرام کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اسے ایک منصوبے کی صورت میں شروع کیا جاتا ہے۔ اور اس منصوبے کو ابتدا میں غیر ملکی ماہر شروع کرتے ہیں۔ مگر ہر ہر قدم پر اس کی تکمیل میں مقامی ماہروں کو کام سکھایا جاتا ہے۔ تاکہ کچھ عرصے بعد جب یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے تو بین الاقوامی ماہر واپس چلے جائیں اور پورا کام مقامی باشندوں کے ہاتھ میں آ جائے۔ یہی حال ڈھاکہ کے کنٹرول سنٹر کا ہے۔ ۲ سال تک اس کام کو سکھلانے کے بعد اب بین الاقوامی ماہر آہستہ آہستہ واپس جا رہے ہیں اور ان کی جگہ وہ پاکستانی ماہر کام کر رہے ہیں جنہیں اس منصوبے کے ماتحت خاص طور سے تربیت دی گئی تھی۔ اب صرف ڈاکٹر ڈی مارکی باقی رہ گئے ہیں لیکن ان کا تعلق بھی ڈھاکہ کنٹرول سنٹر کی نسبت ان دوسرے مرکزوں سے زیادہ ہے جو تمام مشرقی پاکستان میں تپِ دق کی روک تھام کے لئے بہت جلد کھولے جانے والے ہیں۔

۱۹۵۳ء میں وہ مرکز جو پہلی بار ڈھاکہ میں تجربہ کے طور پر قائم کیا گیا تھا آج تمام مشرقی ایشیاء میں اپنی قسم کا بہترین ادارہ بن چکا ہے۔ اس تجربے کی روشنی میں ۱۹۵۵ء کے شروع میں اسی قسم کے تین اور مرکز مشرقی بنگال کے دوسرے ضلعوں میں کھولے جا چکے ہیں۔

ڈھاکہ شہر میں تپ دق کے مریضوں کے لئے ایک بڑا ہسپتال تقریباً مکمل ہو چکا ہے جس میں دو سو مریض بیک وقت زیرِ علاج رہ سکیں گے۔ بہت جلد اسی قسم کے دو اور ہسپتال بھی جلد مکمل ہو جائیں گے۔ مشرقی بنگال میں آمد و رفت کے ذرائع میں ناؤ اور کشتی کو بہت بڑا دخل ہے، یہ تجویز بھی زیرِ غور ہے کہ تپ دق کے گشتی ہسپتال کشتیوں میں قائم کئے جائیں تاکہ دور افتادہ قصبوں اور دیہات تک ان کی پہنچ ہو سکے۔

حال ہی میں عالمی ادارہ صحت نے فیصلہ کیا ہے کہ دوسرے ملکوں کے ڈاکٹروں کو تپ دق کی روک تھام کا کام سکھانے کے لئے ڈھاکہ کے سنٹر میں بھیجا جائے۔ کیونکہ یہ اپنی قسم کا سب سے نیا اور کامیاب مرکز ہے۔

آج سے دو سال پہلے ۱۹۵۳ء کے حالات کا مقابلہ آج سے کیجئے تو حیرت ہوگی کہ جہاں تپ دق کے مریضوں کی دیکھ بھال کیلئے کوئی سامان نہیں تھا اب اسی جگہ تین ہسپتال زیرِ تعمیر ہیں یا مکمل ہو چکے ہیں، اور تمام صوبے میں اسی قسم کے چودہ مرکز کھولے جا رہے ہیں۔

اقوامِ متحدہ کے فنی امداد کے خاموش عملی کارناموں کی یہ ایک عمدہ مثال ہے:

بجلی: ——— بقیہ صفحہ ۲۲

بقیہ صفحہ ۲۲

کہوں گا کہ یہ پہن لو اور ساری اتار دو — اور کونے میں جا کے چپ چاپ کھڑی ہو جاؤ — میں تمہاری تصویر کھینچے دیتا ہوں۔"

متحیر اور خوف زدہ گلتانی کے چہرے کا نقشہ مراد کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا — اس کے خوف زدہ بھاگنے کا انداز۔

"لیکن بخدا، کیا ہی انوکھی جوانی ہے اس کے سارے بدن میں جھلکتی ہے! بات چیت میں بھی ذرہ برابر جھجک نہیں — تعجب ہے!"

اچانک کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور — دبی آواز میں کہا: دروازہ کھولئے۔ مراد چونک پڑا۔ ڈرتے ڈرتے پوچھا: کون؟

مراد کے دروازہ کھولتے ہی گلتانی گھر کے اندر آگئی۔ احتیاط سے دروازہ بند کر دیا اور کہا: جلد چلئے میرے ساتھ — کپڑا لتا جو اور جیسا بھی ہے جلدی جلدی سمیٹ لیجئے۔ "مگر کیوں"؟ مراد نے پوچھا۔ سارے گاؤں کے لوگ آپ سے بگڑ گئے ہیں۔ کل وہ آپ کو مار ڈالیں گے۔

مارے خوف کے مراد کا سارا جسم سُن پڑ گیا۔ مگر اس نے کہا: میں پروا نہیں کرتا۔

"کیا مطلب"؟

میں مرنے سے ڈرتا نہیں!

مرنے سے نہیں ڈرتے، مار سے تو ڈرنا چاہیئے۔

گلتانی ہنسنے کو تھی، مگر رُک گئی۔

مراد نے کہا: میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ خدا جانے اور کس مصیبت میں ڈال دو گی۔ تم ہی نے تو شکایت کر کے یہ فتنہ برپا کیا ہے۔

گلتانی نے کہا: میں نے تو کچھ نہیں کہا — آم کے پیڑ پر چھپ کے دو آدمیوں نے ہمیں دیکھا۔ انہوں نے جا کے سب سے کہہ دیا اور بھی بہت سے جھوٹے الزام لگائے۔ خدا جانے کیا کیا کہا۔ یہ دیکھئے ماں نے مجھے کتنا مارا ہے۔

گلتانی نے مراد کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا، چلئے جلدی کیجئے۔ ناؤ گھاٹ پر لگی ہوئی ہے کسی نے بھانپ لیا تو پھر بچنا مشکل ہے۔

بارش میں گلتانی بالکل بھیگ گئی ہے بھیگی ہوئی ساری اس کے بدن سے چپٹ گئی ہے، بری طرح لپٹی ہوئی ہے۔ گلتانی کو اس عالم میں دیکھ کر مراد کا دل بے اختیار ہو گیا۔

مراد نے کہا: تم چلو گی میرے ساتھ، گلتانی!

کہاں؟

کلکتے۔ میرے گھر۔

مجھے لے جا کے آپ کیا کریں گے؟ جانگیا پہنا کے تصویر کھینچیں گے؟

گلتانی دبی آواز میں کھلکھلا کے ہنس پڑی۔

شادی کر دوں گا میں تجھ سے۔

آپ نے اب تک شادی نہیں کی؟

نہیں۔ ایسا انوکھا حسن لے کے اس ذلیل گاؤں میں پڑی سڑتی رہو گی یہاں کوئی تمہاری پوری طرح قدر نہیں کرے گا۔ مجھے گا بھی نہیں تمہاری اصلی قدر و قیمت۔

گلتانی مراد کی طرف نظر جمائے چند لمحے دیکھتی رہی پھر بولی: چلئے ناؤ میں گنجر اکیلا ہے۔

گنجر کون؟

گلتانی مسکرائی۔ ناؤ میں آیئے۔ دیکھ لیجئے ہم بھی بھاگ رہے ہیں۔

میں اور گنجر۔

شہر کے کارخانے میں اسے نوکری مل گئی ہے۔ ہم دونوں وہیں گھر بنا کے رہیں گے۔ مراد احمقوں کی طرح دیکھتا رہا۔

دور ایک اور بجلی گری ٭

اردو شاعری میں ہیئت کے تجربات: ——— (بقیہ صفحہ ۱۲)

ہونے کی پوری قوت تھی۔ ظاہر ہے اس قدر طویل سلسلے کو ایک ہی سانس میں پیش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ راشد نے ایک بار پھر انگریزی کا سہارا لیا۔ اور وہاں کے کینٹو کی صورت میں اپنے خیالات کو پیش کرنے کا سامان کیا۔ کینٹو کا لفظ اطالوی ہے جس کے معانی گیت، نغمہ، گانا، دلکش موسیقی وغیرہ وغیرہ بہت کچھ ہیں۔ لیکن قدیم ایام سے جب شعر بیشتر گانے ہی کے لئے ہوتا تھا، کینٹو کا مفہوم طویل نظموں کے درمیانی وقفوں ہی کا تھا۔ انگریزی شاعری میں اکثر بڑے شعرا نے طویل نظمیں لکھی ہیں اور ان کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا ہے ہر حصے کو ایک کینٹو کہا جاتا ہے۔ راشد نے بھی اپنی نظم "ایران میں اجنبی" کو تقریباً تیس حصوں میں تقسیم کرنے کا ڈھانچہ بنایا ہے۔ اس نظم کے بعض کینٹو چھپ چکے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اول تو نظم آزاد کے سانچے میں ڈھالے گئے ہیں، دوسرے ہر کینٹو میں مصرعوں کی تعداد مختلف ہے جو اسّی سے لے کر چار سو سے اوپر تک پہنچتی ہے۔

"ایران میں اجنبی" ابھی ہمارے سامنے مکمل طور پر نہیں آئی تھی کہ ایک اور شاعر جناب جعفر طاہر نے ایسے ہی کینٹو کی صورت میں ایک اور طویل نظم پیش کرنا شروع کی۔ یہ میر امن کے "قصہ چہار درویش" کے انداز پر مختلف درویشوں کی سیروں کا تذکرہ ہے۔ جو زمانہ حال میں مختلف ملکوں کی تہذیب و معاشرت میں ہر لحظہ بدلتے ہوئے جدید رجحانات کو دیکھتے ہیں۔ اس نظم میں قدیم و جدید کی ایک دل نشیں آویزش ملتی ہے جو نہ جانے نظم کے ختم ہونے تک یا آخر کس نتیجے پر پہنچے گی۔ جعفر طاہر کی یہ نظم راشد کے برعکس پابند شاعری کا نمونہ ہے جس میں بندوں کی ساخت اور ان کے مصرعوں کی تعداد اکثر یکساں ہے۔ کینٹو کے میدان میں ابھی تک صرف یہی دو نامکمل نمونے ہمارے سامنے آئے ہیں۔ اس لئے اس صنف کے بارے میں ابھی کوئی پیشگوئی کرنا قبل از وقت ہے۔ تاہم اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ جدید تقاضوں سے ہم آغوشی کے لئے اس قالب میں خاص جان ہے ٭

(بہ شکریہ ریڈیو پاکستان لاہور)

شہیدِ ملت : (بقیہ صفحہ ۱۶)

وزارت مرتب کرنے کے سلسلے میں مقیم تھے۔ اس سے چند دن پہلے راولپنڈی کی سازش کا واقعہ ہو چکا تھا۔ گفتگو کے دوران میں اس سازش کا حوالہ دیتے ہوئے میں نے قائدِ ملت سے کہا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ جب آپ کو یہ معلوم تھا کہ یہ سازش ہو رہی ہے تو آپ نے پورے صوبے کا دورہ کرکے جگہ جگہ جلسوں کو اس طرح کیوں خطاب کیا، جس میں آپ کی جان کا اندیشہ تھا؟ قائدِ ملت یہ سُن کر مسکرانے لگے اور کہا کہ جب میں کراچی سے پنجاب کے دورے پر روانہ ہوا تو ملتان پہنچنے پر مجھے سازش کی اطلاع مل گئی تھی۔ اگر کوئی اور ہوتا تو بیماری کا بہانہ کرکے کراچی لوٹ جاتا۔ کہنے لگے کہ لوگ کہتے ہیں مگر میرا تو یہ ایمان ہے کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے، وہ آگے پیچھے نہیں ہو سکتا۔ اس لئے موت کے خوف سے اپنے کام کو بند کر دینا ضعفِ ایمان کی نشانی ہے۔ جب تک خدا کو مجھ سے پاکستان کی اور اس قوم کی خدمت لینی منظور ہے وہ مجھے زندہ رکھے گا۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جب میرا وقت آ جائے گا تو تمہاری یہ پولیس اور فوج مجھے موت کے ہاتھوں سے بچا سکتی ہے؟ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ایک سفاک نے ایسی ہستی کو ہم سے چھین لیا جس نے ملک اور قوم کی بے لوث خدمت کی اور پاکستان کی بنیادوں کو ایک قلیل عرصے میں مضبوط بنایا۔ رخصت ہوتے وقت بھی مملکتِ پاکستان اور ملت کی ترقی اور سربلندی کی دعا ان کے لب پر تھی۔ وہ ہم سے رخصت ہو گئے، مگر ان کی محبت ہمارے دلوں پہ نقش ہے۔ ان کا غم آج بھی تازہ ہے۔ قائدِ ملت آج ہمارے درمیان نہیں ہیں، مگر ان کے زریں اصول، ان کا اعلیٰ عمل اور ان کا قابلِ تقلید کردار آج بھی ہمارے سامنے ہے اور ہر لحظہ ہماری رہنمائی کر رہا ہے۔

ع
مرنے والوں کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں

(بہ شکریہ ریڈیو پاکستان۔ کراچی)

کچھ کار سروس کے بارے میں . . . .

آپ کی کار "مارفاک لبری کیشن سروس" کی بدولت زیادہ عرصہ چلے گی۔ یہ ایک خاص طریقہ ہے جس کو اس طرح وضع اور ترقی دیا گیا ہے کہ آپ کی کار کو مناسب وقفوں پر ٹھیک سسٹم کی چکنائی ملتی رہے۔ چکنائی دینے کے لئے جو روغن برتے جاتے ہیں وہ خاص اس نظر سے تیار کئے گئے ہیں کہ ان سے کار کی کارکردگی اور طویل سروس میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہو۔ کالٹیکس کے ہر سروس اسٹیشن پر ماہر موٹر مکینک آپ کی کار کو ایک خاص نقشے کے مطابق نہ کہ بے قاعدہ لبریکیٹ کرتے ہیں۔

اپنی کار کے ساتھ اچھا سلوک کیجیے ..... اور اپنے دلی خیر خواہ کالٹیکس ڈیلر کے ساتھ کار کو با قاعدہ لبریکیٹ کروانے کا بندوبست کیجیے تاکہ کار آپ کی بہترین خدمت کر سکے

CALTEX
PETROLEUM PRODUCTS

اُردو کے غیر معروف ناول (بقیہ صفحہ ۱۱)

تمہیں ہمراہ دیکھ کر بُرا مانتے اور شاید میرے معاملات میں کچھ مشکلیں پڑ جاتیں بلکہ ممکن تھا کہ ناکامیابی ہوتی۔ وہاں کے اکثر لوگ مجھے اتنی بڑی جائداد کی وارثہ سمجھ کے امید موہوم سے خوشامدیں کام کریں گے۔ یقین ہے کہ بہت جلد کل جائداد نقد و جنس میرے قبضے میں آ جائے۔ میرے اندازے سے تین ماہ میں بالکل فرصت ہو جائے گی۔ اس کے بعد میں دم بھر وہاں نہ ٹھہروں گی۔ اس درمیان میں تم کو خطوط لکھتی رہونگی۔ اس میں شک نہیں کہ تم مجھے وفادار جانتے ہو، مگر مزید اطمینان کے لئے میں نے لکھنؤ کی کل جائداد کا بیع نامہ تمہارے نام کر دیا ہے۔ کاغذات ضروری میرے بکس میں موجود ہیں۔ جس وقت تم کو یہ خط ملے گا میں بمبئی سے بہت دور نکل گئی ہونگی۔ تم آج ہی لکھنؤ چلے جاؤ، اور تین مہینے انتظار کرو۔ خدا وہ دن کرے گا کہ ہم تم دونوں باغ کے صحن میں شام کے وقت بیٹھے ہونگے، گانا ہوتا ہوگا۔ تم اپنی غزلیں پڑھتے ہوگے میں سنتی ہونگی۔ چند روز اور انتظار کرو۔ فقط۔

راقمہ،

تمہاری سوفیہ"

"مکرر یہ ہے کہ میرے باغ کو درست رکھنا۔ جرانیم کے درخت جو میں نے نئے لگائے ہیں ان کا مجھے بہت خیال ہے۔ مالی پر تاکید رکھنا۔"

اس خط کو دیکھ کر مرزا رسوا کے دل پر جو کچھ صدمہ گزرا گزرا مگر پھر دل کو تسکین دے کے لکھنؤ چلے آئے۔ ایک خط عدن سے آیا تھا۔ دو تین خط پیرس سے آئے تھے۔ ان میں مقدمات کا مفصل حال تھا۔ اس کے بعد پیرس سے روانہ ہوتے وقت ایک تار دیا۔

"ہم آج یوٹوپیا نامی جہاز پر ہندوستان روانہ ہوتے ہیں"۔

تار کے آنے کے بعد دن کیسے، مرزا رسوا گھڑیاں گننے لگے۔ مگر وہ جہاز نہ آج آتا ہے نہ کل۔ مرزا رسوا کے دوستوں کا اُور ہی کچھ خیال ہے مگر اس کا ذکر مناسب نہیں سمجھنے والے سمجھ ہی لیں گے۔

روز سرِ شام تمام باغ میں چھڑکاؤ ہوتا ہے۔ درختوں کی ایک ایک پتی دھوئی جاتی ہے۔ جابجا فانوس روشن کر دیئے جاتے ہیں۔ صحن میں چبوترے پر دو کرسیاں بچھائی جاتی ہیں۔ جرانیم کے نانڈے گرد لگائے جاتے ہیں۔ مرزا رسوا خود بیٹھتے ہیں۔ غزلوں کی بیاض سامنے رکھی جاتی ہے۔ ایک کرسی کے سامنے ارگن باجا لگا دیا جاتا ہے۔ نگاہیں دروازے کی طرف لگی رہتی ہیں۔ آج تک اس معشوقۂ وفادار کا انتظار ہے۔ اس کو پندرہ برس ہو گئے۔ مگر ان کے جوش و خروش میں کسی طرح کی کمی نہیں ہوئی۔ دن بھر اچھے رہتے ہیں مگر شام کو اس جنون کا دورہ ہوتا ہے۔ دل بے قابو سے نکل جاتا ہے۔ خدا ان کے حال پر رحم کرے ؎

موت آ جائے گی اک دن یہی کہتے کہتے

آج آتا ہے، کل آتا ہے کہیں سے کوئی

کشمکش بقیہ صفحہ ۲۵

طرف اشارہ کر کے چلا رہی تھی۔ اللہ ڈنو کو کچھ نہ سوجھا۔ اندر جا کر وہ ٹین کے ڈبے اٹھا لایا۔ دونوں ان لکڑیوں سے بجانے لگے اور کھیتی کی طرف دوڑ پڑے۔ وہ بے تحاشا بھاگے جا رہے تھے۔ ٹڈیوں کی تعداد بتدریج بڑھ رہی تھی۔ "ادھر دیکھنا۔ غضب ہو گیا" جنت پھر چیخی۔

ایک زبردست ٹڈی دل تا حد نگاہ آسمان پر پھیلا ہوا بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ یکایک دھوپ غائب ہو گئی اور ٹڈیوں کا سایہ چھا گیا۔ جہاں کہیں سبزی تھی اس پر ٹڈیاں ٹوٹی پڑتی تھیں۔ اللہ ڈنو نے کھیت کے چاروں کونوں پر آگ لگا دی۔ دونوں دیوانوں کی طرح ٹین کے ڈبے بجاتے اور ہاؤ ہو کرتے رہے۔ لیکن سب تدبیریں بے سود ثابت ہوئیں۔ بڑی بڑی ٹکڑیاں ٹڈی دل سے ہٹ کر شاداب فصل پر بیٹھنے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ساری فصل پر ان کی چادر بچھ گئی۔ پودے، درخت، ہر جگہ جو سبز ہو ٹڈیوں سے پُر تھی۔ اب بھی ان کا ایک سیلاب ہوا میں بہتا آگے بڑھ رہا تھا۔ جنت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اللہ ڈنو خاموش تھا۔ دونوں گھنٹوں اپنی کھیتی برباد ہوتے دیکھا کئے۔ نہ اللہ ڈنو نے جنت کے نالہ و شیون کو روکنے کی کوشش کی اور نہ جنت نے اس سے غمگساری کی فکر کی۔ رات بھیگنے پر وہ اپنی جگہ آ گئے۔ کسی نے کچھ کھایا نہ پیا۔ جانوروں کا دودھ دوہنے کی کسے سدھ تھی۔ نگاہیں کھیت پر لگی تھیں اور دونوں اپنے خیال میں غرق تھے۔ جنت کبھی کبھی دبی آہ کے ساتھ کہہ اٹھتی "ہائے! ظلم ہو گیا"۔

"رونے رلانے سے فائدہ؟" اللہ ڈنو صبر کا پتلا بنا ہوا تھا۔ یہ سن کر جنت اور چلانے لگی۔ بہت دیر بعد دونوں کے ہوش ٹھکانے

ہوئے۔ شوہر نے بیوی سے کہا "دیکھو پو پھٹنے کو ہے شبنم دیر سے گر رہی ہے۔ ٹڈیاں اڑ نہ سکیں گی۔ اب چل کر جتنی ہو سکیں پکڑ لیں ۔ چند دن انہی پر گذرا ہو جائے گا"

جنت کچھ نہ بولی۔ اٹھ کر اندر سے چند بورے لے آئی۔ پانی بھر کر ایک بڑے برتن کو چولہے پر رکھ دیا۔ پانی میں نمک ملانے کے بعد بورے لے کر اپنے شوہر کے ساتھ ہولی۔ ٹڈیوں کے پر بھاری ہو چکے تھے۔ دونوں نے بورے اس طرح بھرے جیسے فصل پر باجرا۔ انہیں گرم پانی میں ڈال کر تھوڑی دیر بعد زمین پر پھینک دیتے۔ سورج نکلنے تک انہوں نے ٹڈیوں کا ایک ڈھیر لگا دیا۔ اللہ ڈتو کا دل چاہنے لگا کہ وہ ساری ٹڈیوں کو اسی طرح بھون ڈالے، لیکن وہ اپنی جھونپڑی کے آگے کی ساری ٹڈیاں بھی نہ مار سکا۔ پر سوکھنے کی دیر تھی کہ کھیت پر سے ٹڈیوں کا ایک جم غفیر اٹھا اور آندھی کی طرح آگے بڑھ گیا اور پیچھے ایک وسیع بھورا میدان چھوڑ گیا!

ان سب کا حاصل وہ چند بوریاں تھیں جو اب اونٹ پر لدی تھیں! یہ اونٹ بھی بچی کچی گھاس اور تمام جانوروں کے بدلے خریدا گیا تھا۔ جب بوروں پر نظر پڑی تو قسمت خالی نظر آئی لیکن جنت سامنے سے آ رہی تھی۔ بیوی نے اونٹ پر بیٹھنے کے لئے میاں سے اصرار کیا۔

"تم آرام سے بیٹھو۔ میں پیدل چلوں گا" اللہ ڈتو نے جواب دیا "لوگ کہتے ہیں آٹھویں ۔۔۔ میں احتیاط بہت ضروری ہے"

وہ پھر شہر جا رہا تھا ❊

آپنا گھر ۔۔۔ بقیہ صفحہ ۲۵

۔ کاش وہ لائبریری کے لئے گنجائش نکال سکتا۔" اس میں بڑی تبدیلیاں کرنی ہوں گی ابو۔ حامد نے باپ کو خاموش دیکھ کر کہا۔ "ہم دونوں کے لئے نیچے ہی جگہ نکالئے نا۔ یہاں آپ اپنے لئے کمرہ بنوا سکتے ہیں۔ دوسری منزل کی خوابگاہ مہمان خانہ بن سکتی ہے یہ رضیہ ٹھیک کہہ رہی ہے ۔اس کا کمرہ بھی نچلی منزل ہی پر ہونا چاہیئے۔ میرے کارخانے کیلئے تو آپ کو جگہ نکالنی ہی ہوگی۔ اب اس دادا جان والی کوٹھی میں دیکھئے کتنی آسانی سے انہوں نے میرے لئے جگہ نکالی تھی۔ رضیہ کی طرح دراصل ابو مجھے اپنے کمرے اور کارخانے سے بے حد محبت ہوگئی ہے۔ اب اگر ہم یہاں سے کہیں اور گئے اور وہ جگہ ایسی ہی نہ ہوئی تو ہمیں بہت دکھ ہوگا"

"اس کا مطلب یہ کہ یہ نقشہ بیکار ہوگیا۔ اس میں اب اتنی بہت سی تبدیلیوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے" شاہد نے سگریٹ ایش ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا۔ اس پر ذکیہ اٹھی اور وہ بھی میز کے قریب آ کر ماں اور بیٹے کے ساتھ نقشے کا جائزہ لینے لگی۔ ہاں واقعی ۔ اس میں تبدیلیوں کی کوئی گنجائش نہیں کس قدر مکمل ہے یہ ۔ اس نے سوچا اور یوں ہی غیر ارادی طور پر اس کی نگاہیں رضیہ تک گئیں جو بستر پر زرد زرد سی خاموش لیٹی باپ کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کتنی بیمار اور اداس لگ رہی تھی۔ نہ جانے کیوں ذکیہ کو اس کی آنکھوں میں ایک عجیب مایوسی نظر آئی اور وہ بے چین ہو گئی۔ یکایک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا اور اس نے کھوئے کھوئے سے انداز میں گرد و پیش کا جائزہ لیا اور پھر شاہد سے قریب ہو کر وہ آہستہ سے بولی، یوں جیسے آپ ہی آپ بڑبڑا رہی ہو۔

"آخر اس کوٹھی میں کیا خرابی ہے جو ہم نئی کوٹھی کی آرزو کر رہے ہیں؟ ۔ حامد کا اچھا خاصا کارخانہ بھی ہے ۔اس سے ملحق باغیچہ بھی ہے۔ رضیہ کا کمرہ بھی اچھا ہے اور نچلی منزل پر ہے، ہوادار ہے، خوبصورت ہے، بڑا دریچہ بھی ہے جس میں سے سورج کی پہلی کرنیں اندر آتی ہیں۔ خود مجھے اپنی خوابگاہ بہت پسند ہے جو بچوں کے کمروں سے قریب ہے اور نچلی منزل پر ہے نئے نقشے میں تو ہماری خوابگاہ دوسری منزل پر ہے"

ذکیہ کی باتیں شاہد کو کچھ عجیب سی لگیں اور اس نے ذرا غور سے اپنی بیوی کو دیکھا اور یکایک ایک خیال اس کے ذہن میں ابھرا۔ یہاں لائبریری بھی تو ڈرائنگ روم سے علیحدہ ہی ہے!! دونوں کی نظریں ملیں اور دونوں نے ایک ساتھ محسوس کیا جیسے آج پہلی بار انہیں اس کوٹھی کی خوبیاں معلوم ہوئی ہوں، جیسے پہلی بار وہ یہاں آئے ہوں اور اپنے اس گھر کو ڈھونڈ نکالا ہو، اس کے تمام راز پالئے ہوں ۔۔۔ ان کا یہ اپنا گھر جس میں پہلی بار ذکیہ دلہن بن کر آئی تھی، جہاں شادی کے بعد انہوں نے ابتدائی چند ہفتے ہنسی خوشی گذارے تھے، جہاں ان کے بچے پیدا ہوئے تھے، جہاں رضیہ نے ہوش سنبھالا تھا اور حامد نے بوڑھے دادا کے ساتھ بے شمار ہوائی جہاز بنائے تھے، جس کے خوبصورت باغیچے سے برسوں اس نے اپنے بچوں کے قہقہے، ان کی چیخ پکار سنی تھی ۔۔۔ یہ گھر جو، ان کی زندگی میں، ان کے ماضی اور اس کی بے شمار یادوں میں کچھ اس طرح رچ بس گیا تھا کہ اسے خیرباد کا خیال ہی کس قدر تکلیف دہ تھا۔ جو اینٹوں اور سیمنٹ کا ڈھانچہ نہیں تھا، بلکہ شاید ان کے عزیز ماضی نے اس گھر کا روپ کچھ اس طرح اختیار کر لیا تھا کہ اب وہ جب بھی ایک نئے گھر کا۔ "اپنے گھر" کا تصور کرتے، تو وہ کرنل واجد کی اس کوٹھی سے زیادہ مختلف نہ ہوتا۔

کمرہ میں سب خاموش تھے، دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، ایک دوسرے کی آنکھوں کا خاموش پیغام پڑھا اور پھر شاہد چپکے سے اٹھا اور اس نے نقشہ الماری میں بند کر دیا۔

اب یہ الماری ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہوگئی تھی! ❊

ماہِ نو
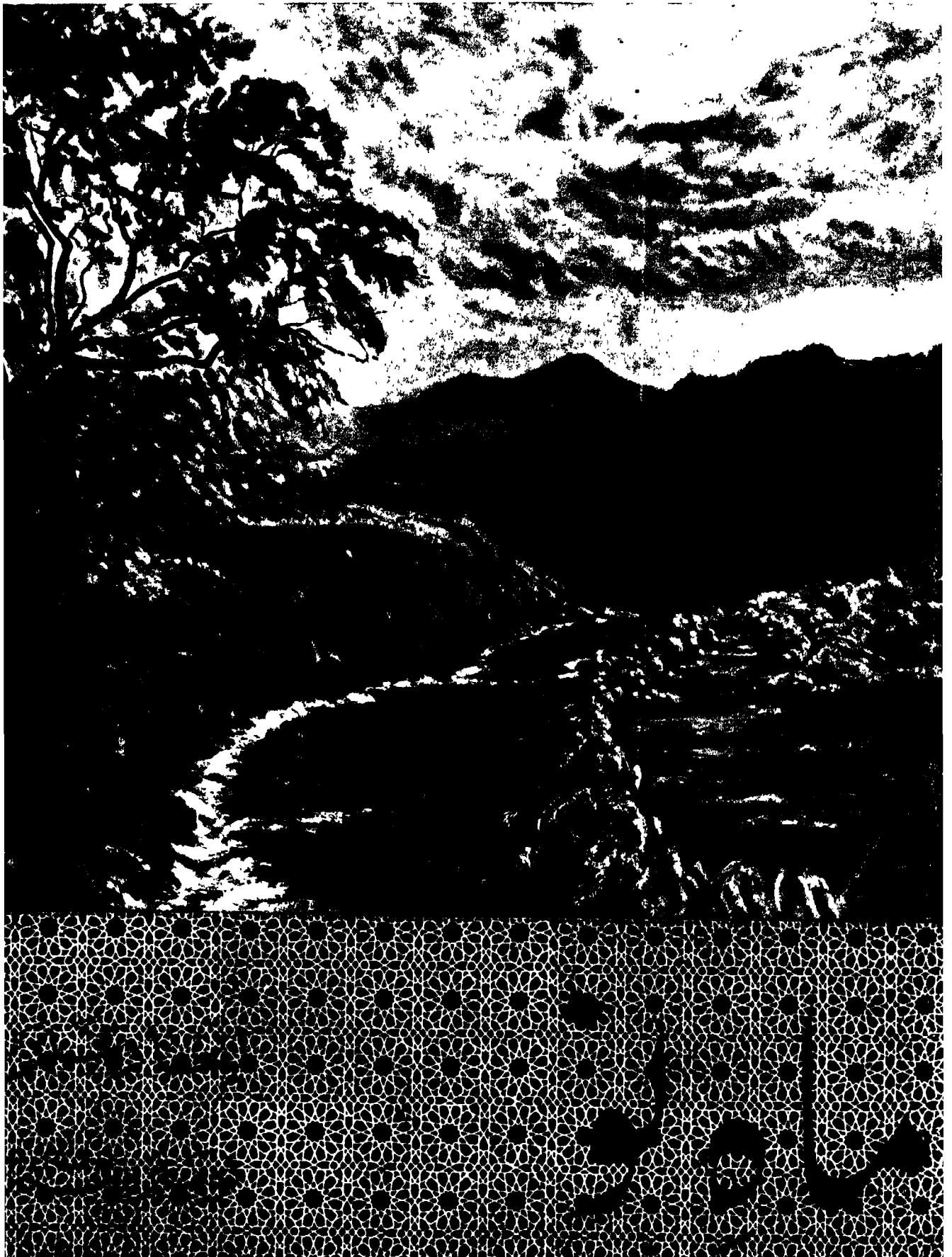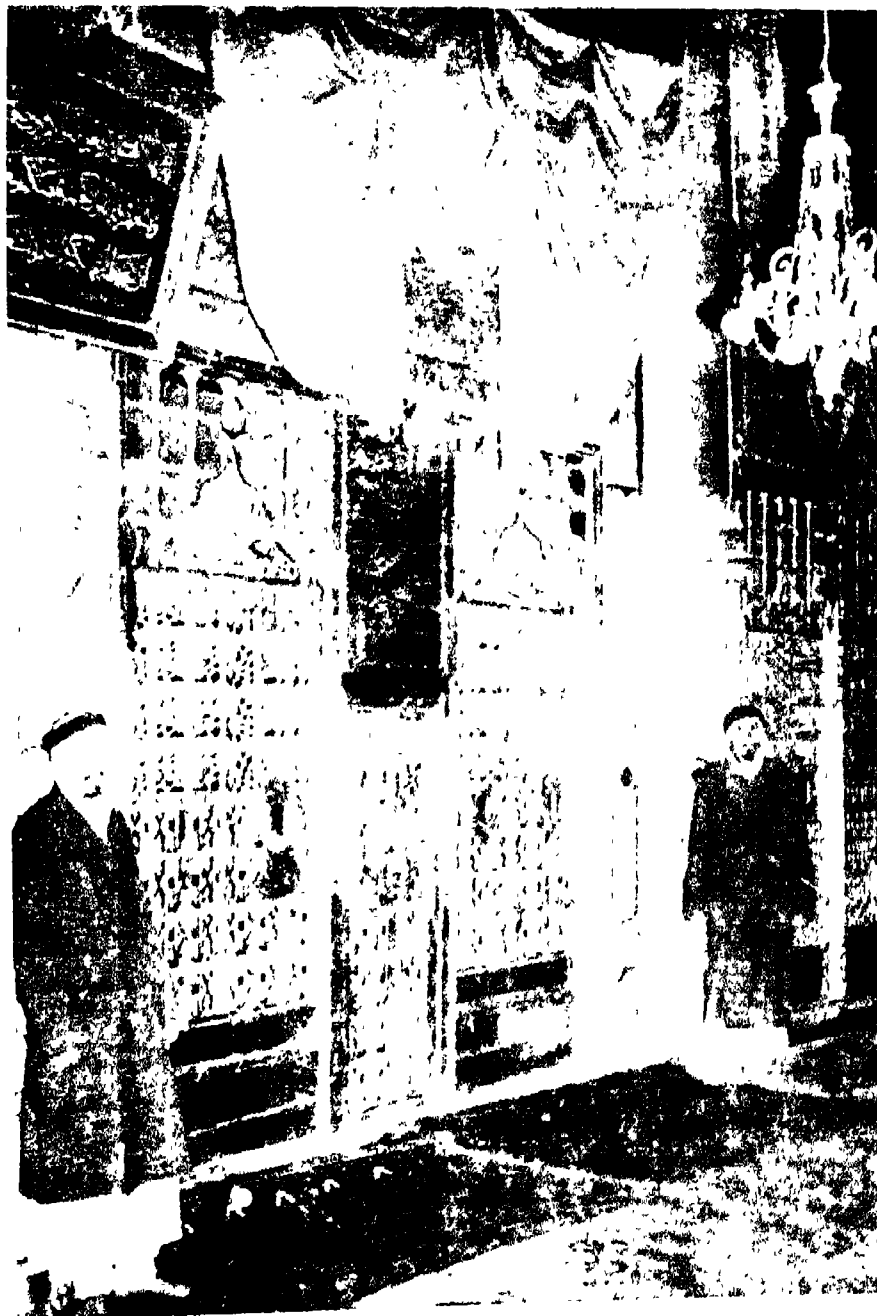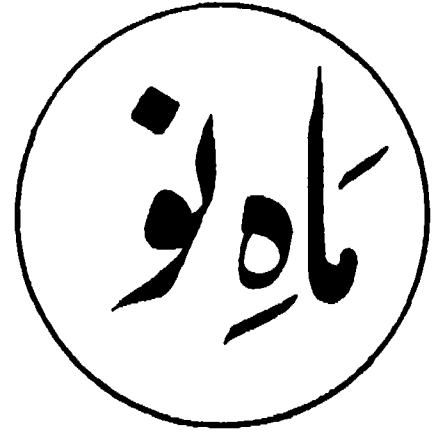
جلد ۸ شمارہ ۸ نومبر ۱۹۵۵ء

اتحاد نمبر

مدیر:- رفیق خاور
نائب مدیر:- ظفر قریشی

پاکستان اور ہندوستان میں سالانہ چندہ پانچ روپے آٹھ آنے۔ فی کاپی پاکستان اور ہندوستان میں آٹھ آنے

آپس کی باتیں

گزشتہ مہینہ ہماری قوم کی تاریخ میں یادگار حیثیت رکھتا ، کیونکہ اس میں مغربی پاکستان کی وحدت عمل میں آئی۔ یہ وہ ع نظر ہے جو پاکستان کی بنیاد ہی میں مضمر تھا۔ اس کا عملی شکل میں رپذیر ہونا ہماری ۸ سالہ قومی زندگی کا گراں قدر حاصل ہے۔ اس کے تھ ہماری آزادی کی سحر حقیقی معنوں میں طلوع ہوئی ہے۔ اب سے ہم آن گزشت صدیوں کے تاریک "بہیمانہ طلسم" اور "اجنبی ہاتھوں ، بے نام گراں بارستم" ہی سے آزاد ہوتے تھے، ہم نے ایک ب گراں سے آنکھ کھولی تھی اور اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے رہے ہ۔ ہمیں اپنی صلاحیتوں، اپنی نشو و نما کے امکانات اور مستقبل کا ندلا دھندلا، مبہم ہی سا شعور تھا۔ ہمیں پاکستان کی قومی وحدت پنے ایمان کو عملی شکل دینی تھی۔ اب ہماری قومی زندگی سے وہ ماد اور افتراق اٹھ گیا جو ایک تاریک دور کی یادگار تھا۔ اب ہمارے منے سرگرمیٔ عمل کا ایک وسیع میدان کھل گیا ہے۔

ایک وہ دور تھا جب سندھ کا صوبہ بمبئی کا ایک حاشیہ ا۔ ایک وہ وقت تھا جب سرحد کو پنجاب سے جدا کر کے مستقل پسماندگی طرف دھکیل دیا گیا تھا۔ ایک وہ وقت تھا کہ قبائل کو ایک دوسرے ، جدا اور سرگرم پیکار رکھنے پر تمام زورِ سیاست صرف ہوتا تھا۔ حالات کا دھارا وقت کے خلاف بہت دن نہیں بہہ سکتا۔ آج بچھڑے ہوؤں کو قریب اور بھٹکے ہوؤں کو راہ پر آتے دیکھ رہے ہیں۔

ع آملے ہیں سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک

'ماہِ نو' قومی ادب و ثقافت کا ترجمان ہونے کے ساتھ ملک کا ؍ مند اور اس کی شادمانیوں کا شریک ہے۔ اس شمارے کے صفحات پر ، اس یادگار واقعے کے گہرے نقوش لازماً ثبت ہیں۔

مغربی پاکستان کا مبارک اتحاد یوم میلاد نبوی صلعم سے ذرا قبل ، میں آیا۔ خدا کا شکر ہے کہ قوم اپنے ہادی کو منہ دکھانے کے قابل ئی جو تفرق کو مٹانے اور دلوں کو ملانے ہی کے لئے آیا تھا

شکر خدا کہ از مددِ بختِ چارہ ساز بر حسبِ مدعاست ہمہ کار و بار دست

ہمیں توقع ہے کہ یہ اتحاد مغربی پاکستان کی مادی اور معاشی ترقی، بہتر و باکفایت انتظامِ حکومت، اور مجموعی تقویت کے ساتھ ساتھ ادب، ثقافت، آرٹ اور ذہنی ترقی کے لئے بھی مفید ثابت ہوگا، اور ہمارے مادی وسائل اور سرمائے کے ساتھ زندگی کے روحانی پہلو کو بھی تقویت حاصل ہوگی۔ اب ہر علاقے کا ادبی و ذہنی کارنامہ، ثقافتی روایات کا سرمایہ اور نوادرات کا ذخیرہ محدود نہیں، سب کی مشترکہ میراث ہے۔ صوبے کے اندر مشترکہ ذریعۂ اظہار کی حیثیت سے اردو زبان کو بھی اہم خدمت انجام دینی ہوگی۔ 'ماہِ نو' کا مقصد شروع ہی سے پاکستانی ادب کو پیش کرنا، ادبی تخلیقات کے لئے ایک وسیلۂ اشاعت مہیا کرنا اور علاقوں کے ادب اور کمالات کا یکجا مرقع پیش کرنا رہا ہے تاکہ پاکستانیوں کا روحانی اتحاد مضبوط ہو سکے۔ ہم آئندہ بھی اپنی کوششیں جاری رکھیں گے اور اس سلسلے میں اہلِ ادب سے خصوصاً اور اہلِ ملک سے عموماً تعاون کے خواستگار ہیں۔

ہمارے ملک کو اس مختصر مدت میں بہت سی تلخیوں کو سہنا پڑا۔ حادثات ہر ملک کی زندگی میں لازم ہیں۔ سیلابوں کی تباہ کاریاں اسی قسم کی افتاد ہیں۔ یہ پہلے بنگال اور پھر مغربی پاکستان کو سہنی پڑی اور اس شدت کے ساتھ کہ پچھلے سیلاب گرد ہو گئے۔ یہ بھی ایک آزمائش ہے اور ہم نے ثابت قدمی سے اس کا مقابلہ کیا۔ سیلاب کی بار بار آنے والی مصیبت کا سدِ باب لازم ہے۔ یہ ایک مشکل مسئلہ ہے مگر امید ہے کہ مغربی پاکستان کے مجموعی وسائل اور کوششوں سے اس پر قابو پانا ممکن ہوگا۔

آزاد شاعری کے خلاف ابہام کی شکایت عام ہے۔ یہی ابہام اس کی ابتدا اور مختلف مدارج کے متعلق باقی ہے۔ دراصل سانیٹ کی طرح اس صنف کی ترویج بھی خاص حالات میں ہوئی تھی، جن کو زیرِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ اس شمارہ میں "نئے شعری تجربے" کے زیرِ عنوان اسکی کوشش کی گئی ہے۔ اگرچہ یہ آغاز ہے حرفِ آخر نہیں۔

'ماہِ نو' کے خریدار بن کر اور دوسروں کو اس کی ترغیب دلا کر پاکستانی ادب و ثقافت سے اپنے لگاؤ کا عملی ثبوت دیجئے

یک رنگ و ہم آہنگ

حفیظ ہوشیارپوری

(تمام مصرعوں کے پہلے حروف کو جمع کیا جائے تو ہجری سال (۱۳۷۵) برآمد ہوتا ہے، نظم کے آخری مصرعے کے اعداد بھی ۱۳۷۵ ہیں)

یہ عزم کا معیار، یہ تنظیم کا انداز
وحدت کا کرشمہ ہے کہ توحید کا اعجاز
ہم مقصد و ہم دوش بہ ہنگامِ تگ و تاز
ہم مرتبہ و ہم نفس و ہم دم و ہم راز
ہم فکر و ہم احساس و ہم اندیشہ و ہم رنگ

فرمانِ رفاقت ہے کہ اللہ کا انعام
یک جہتی و یک سوئی و یک روئی کا پیغام
خوش طالع و خوش بخت و خوش آغاز و خوش انجام
ہم مشرب و ہم منزل و ہم جادہ و ہم گام
ہم خانہ و ہم سایہ و ہم پایہ و ہم سنگ

دل قُرب گزیں، دور نگر دیدۂ بیدار
لب نغمہ سرا پائے طلب گرم بہ رفتار
خود راحلہ، خود قافلہ، خود قافلہ سالار
ہم مرحلہ و ہم سفر و ہم رہ و ہم کار
ہم جذبہ و ہم شوق و یک آواز و یک آہنگ

عہدِ نو

رئیس امروہوی

اُٹھ کے دورِ کہنہ نے بدلا لباسِ تازگی — چل کہ ماضی راہِ مستقبل میں ہے منزل سپار
زندگی "تجدیدِ اقدارِ کہن" میں غرق ہے — اے بہ طرزِ نو! جہانِ کہنہ کے ماتم گسار!
غربِ پاکستان کی وحدت ہے تازہ معجزہ — معجزہ ایسا کہ جس پر معجزِ عیسائی نثار
اک نئی وحدت کا آغاز، اک نئی دنیا کا جشن — اک نئی تنظیمِ ملی، اک نیا قومی وقار
اک کلیمِ طورِ تازہ! اک تجلی زارِ نو — اک نئی تزئینِ گلشن، اک نئی فصلِ بہار
اک نیا منظر، نیا جلوہ، نیا طرزِ نگاہ — اک نئی محفل، نئی زینت، نئے نقش و نگار
اک نئی تاریخِ ملت، اک نیا جغرافیہ — اک نئی تکمیلِ مقصد، اک نئی تشکیلِ کار
اک نیا جذبِ محبت، اک نیا سوزِ دروں — اک نیا ذوقِ تمنا، اک نیا رنگِ خمار
اک نیا بادہ، نیا ساغر، نئے جام و سبو — اک نئی مستی، نئے میکش، نئے بادہ گسار
اک نیا لشکر، نیا قائد، نیا پیغامِ فتح — اک نیا پرچم، نیا نعرہ، نیا میدانِ کار
اک نیا صانع، نئی صنعت، نئی صنعت گری — اک نیا قصہ، نیا دفتر، نیا دفتر نگار

سندھ و پنجاب و بلوچستان و سرحد کی حدود
ہوگئی ہیں آج اک مرکز پہ آکر بے کنار

سندھی و پنجابی و مہندی و پختون و بلوچ — ہو گئے ہیں آج اک وحدت کے باعث باوقار
ایک قوم اتنی سیاسی سرحدوں میں منقسم — ایک ملک اتنی علاقائی جدائی کا شکار
بس یہی مقصود تھا تشکیلِ ارضِ پاک کا — انفرادی ربطِ ملت، اجتماعی اقتدار
وحدتِ قومی کی بنیاد آخر اب محکم ہوئی — اجتماعی نظم آخر اب ہوا ہے استوار
غربِ پاکستان کی تاریخِ وحدت اے رئیس — قوم کی تاریخ میں ہے عہدِ نو بالاختصار

یعنی "واحد مغربی صوبے" کی تاریخِ قیام
صرف "واحد[1] مغربی صوبہ" ہے از روئے شمار

۱۳ ھ ۷۴

---

[1] یہ تاریخ چند ہفتے قبل لکھی گئی تھی ۔

تنظیم و تعمیر

محشر بدایونی

گوشِ گل میں صبا جانے کیا کہہ گئی　　گل کے لب پر ہنسی کھیل کر رہ گئی
باغ کی ناموافق ہوا کا فسوں　　اُس کلی سے سنو جو یہ دُکھ سہہ گئی
رفتہ رفتہ اُمیدِ شکستہ دلاں　　آہ میں ڈھل گئی، اشک میں بہہ گئی
رات گذرے نظر آئے روئے سحر　　چاند کی طرح یہ آس بھی گہہ گئی

اب گلستاں میں کچھ اہتمام اور ہے
گل کو بادِ صبا کا پیام اور ہے

اے گل، اندازِ گلشن بدل جائے گا　　یہ اندھیرا اجالے میں ڈھل جائے گا
شادمانی کی ایسی بہار آئے گی　　غم کا کانٹا دلوں سے نکل جائے گا
اپنے بیگانے سب ایک ہو جائینگے　　جلد ہی نظمِ گلشن سنبھل جائے گا
جو روش جڑ ہے تفریق و تخریب کی　　اب غرور اس روش کا کچل جائے گا

نغمے گونجیں گے ہم رنگ انداز میں
ایک ہی سوز ہوگا ہر اک ساز میں

یہ اُفق پر جو ہلکی سی تنویر ہے　　خواب ہائے شبِ غم کی تعبیر ہے
لوحِ پیشانیٔ وقت کی یہ چمک　　ایک روشن حقیقت کی تفسیر ہے
باغباں کے اشارے کی قدر اے چمن　　یہ اشارہ نہیں ایک تقدیر ہے
ایک گوشے کی تعمیر تعمیر کیا　　سارے گلشن کی تعمیر تعمیر ہے

اے چمن سلسلے تیری تعمیر کے
جا ملے بڑھ کے دامن سے کشمیر کے

مغربی پاکستان کی سرسبز وادیاں

دامن کوہ (بلوچستان)

روغنی رنگ: مبارک حسن

صبح مسکرائیگی

طاہرہ کاظمی

رات چھٹ ہی جائے گی
زندگی کی منزل کو
پا ہی لیں گے ہم آخر

(۲)

دور شبنمی راہیں
راہ رو کو تکتی ہیں
شب کی ڈوبتی نظریں
نور کو ترستی ہیں
منزلیں بھی آخر کو
سو گئیں اندھیرے میں
اور یہ خواہش معصوم
کون آئے گا اس بار؟
ظلمت شبستاں میں
گھٹ کے رہ گئی آخر

(۳)

کارواں بھٹکتے ہیں
راہ کیوں نہیں ملتی؟
راہ رو پریشاں ہیں
خار دار میداں میں
مضمحل ہے گردِ راہ
گھنٹیوں کا سرگم بھی
ہو گیا اداسی کی
سرد رات میں تحلیل!

جس طرح کوئی شاعر
آنسوؤں کے سائے میں
اک دیا جلاتا ہے
روشنی کی خواہش میں
اس کا خون جلتا ہے
یہ دیا جو بجھ جائے
زندگی اندھیروں کی
تنگ و تار باہوں میں
سانس توڑ دیتی ہے
اور مہیب سناٹا
اس نئی کہانی کو
موت بخش دیتا ہے
تیرگی مسلّط ہے
وقت کی نگاہوں پر
راہ کیوں نہیں ملتی؟

(۴)

دور، وہ اُفق سے دور
پردۂ تصوّر پر
روشنی کی اُمیدیں
کروٹیں بدلتی ہیں!
خواب کے دھندلکوں میں
زندگی کی آہٹ سی
کہکشاں کے دامن میں

ایک نورِ مبہم سا —
آؤ اجنبی سی تھی
اس غبارِ ظلمت میں
نور کے قدم ڈھونڈیں
دور کہکشاں سے دور
روشنی کے ہالوں کی
زندگی چھپا لائیں
بھر کے اپنے دامن میں!
سیم پاش مہ پارے
اس زمیں پہ لے آئیں

(۵)

جگمگا ہی جائے گی
تیرگیٔ شب آخر
لمبے لمبے سایوں کا
سحر ٹوٹ جائے گا
زندگی کی منزل کو
پا ہی لیں گے ہم آخر
ڈوب جائیں گے تارے
اک نئے اُجالے میں
رات چھٹ ہی جائے گی
زندگی کی تاریکی
روشنی میں آئے گی
صبح مسکرائے گی

یک چمن گل

ہم ایک زبردست تجربہ کر رہے ہیں جس کے لئے عوام کی دانشمندی، رہنمائی اور بے نفسی کی ضرورت ہے۔ اسکیم خواہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو، اگر اس کو غلط طور پر عملی جامہ پہنایا جائے تو وہ بے سود ہو سکتی ہے۔ مغربی پاکستان کو واحد یونٹ بنانے سے جو بے شمار فائدے ہوں گے وہ اس علاقے کے باشندوں کو یقین دلا دیں گے کہ اس میں ان کا ہی فائدہ ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اس ملک میں جمہوریت کی بنیادیں اور بھی مستحکم ہوں گی اور ہم ان بنیادوں پر ایک عظیم الشان عمارت تعمیر کریں گے، جس کے لئے آئندہ نسلیں ہماری شکرگزار ہوں گی۔ میں اسی امید اور عقیدہ کے ساتھ عمل کرتا ہوں اور میرا اعتقاد ہے کہ اس ایوان کے تمام اراکین اور ملک کے تمام ترقی پسند لوگ بھی اس احساس کے تحت عمل کرتے ہیں۔

آج قومی اتحاد کی ایک عظیم الشان عمارت ان بنیادوں پر تعمیر کی جا رہی ہے جو قائد اعظمؒ نے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو قائم کی تھیں۔ خدا کے فضل سے مغربی پاکستان کا صوبہ قائم ہو گیا ہے۔ اس موقع پر میں اپنے مغربی پاکستان کے بھائیوں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ وہ اس نئے اتحاد میں جو انہوں نے اپنے استحقاق کے طور پر حاصل کیا ہے زیادہ قوت محسوس کریں اور زیادہ سے زیادہ خوشحالی حاصل کریں۔ جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں میں مغربی پاکستان کے اتحاد پر عقیدت کی حیثیت سے یقین رکھتا ہوں۔ میں اپنے عوام کے غیر منقسم اتحاد، ان کی لازمی یکجہتی اور ان کے مضبوط جذبۂ اخوت پر جو اسلام کا ایک بنیادی اصول ہے، ایمان رکھتا ہوں اور مجھے کوئی شبہ نہیں کہ مغربی پاکستان کا اتحاد اگر اس جذبہ اور سماجی انصاف کے صحیح اسلامی اصولوں کے مطابق حاصل کیا گیا تو نہ صرف نئے صوبے بلکہ پورے پاکستان کے لئے عظمت اور برتری کا باعث ہوگا ۔۔۔ مجھے خوشی ہے کہ مغربی پاکستان کا اتحاد مشرقی پاکستان کے عوام کے نمائندوں کے تعاون سے حاصل کیا گیا ہے اور ہمیں توقع ہے کہ اب مشرقی و مغربی پاکستان کے عوام مساوی حیثیت میں کسی کے دوسرے پر غلبہ کے اندیشے کے بغیر مل کر آگے بڑھیں گے اور اس جذبہ کے ساتھ بڑھیں گے کہ ملک کے مستقبل کا انحصار ان کے متحد ہونے میں ہے۔

عزت مآب چودھری محمد علی صاحب وزیر اعظم پاکستان

مغربی پاکستان کے تمام صوبوں کے ایک متحدہ صوبہ بن جانیکے بعد زرعی اصلاحات قوانین کی اصلاح و ترمیم اور عام کارکردگی میں اضافہ کے لئے راستہ صاف ہو جائے گا۔ نیز یہ کہ مہاجروں کی بحالی، مالگذاری، آب پاشی و آب رسانی، زراعت اور تعلیم وغیرہ کے لئے یکساں تدابیر اختیار کی جا سکیں گی ۔۔۔۔۔۔ کوئی شخص بھی جو صدق دل سے متحدہ مغربی پاکستان کے منصوبے پر غور کرے وہ

هز آکسیلنسی مسٹر مشتاق احمد گورمانی
مغربی پاکستان کے پہلے گورنر
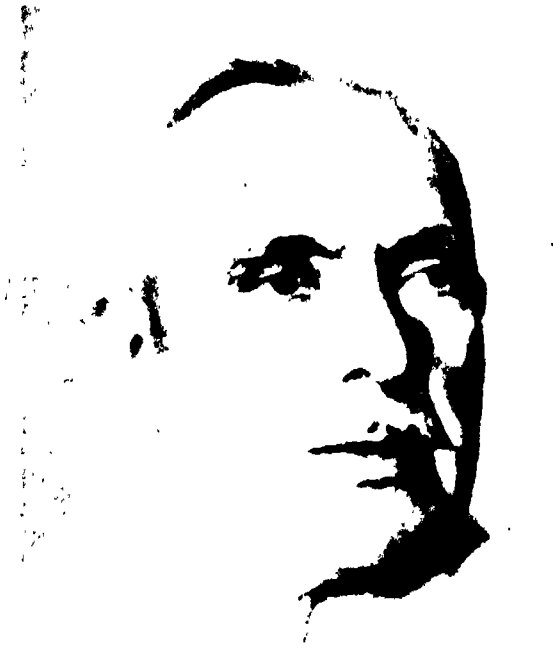
عزت مآب جناب ڈاکٹر خان صاحب
مغربی پاکستان کے پہلے وزیر اعلیٰ

نواب [illegible] خان صاحب
نے مجلس دستور ساز میں وحدت
مغربی پاکستان کی [illegible] زور
حمایت کی

سردار بہادر خاں صاحب
سرحد کے سرداروں سے
مغربی پاکستان کے
مفاد پر خطاب
کر رہے ہیں

عزت مآب سردار امیر اعظم خاں
جنہوں نے مجلس دستور ساز میں
پاکستان کا بل پیش کیا

ملک وارث خاں صاحب
جنہوں نے فرمایا کہ مغربی پاکس

اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ منصوبہ ملک کی مجموعی بہتری کے لئے اور سابقہ صورتِ حال سے کہیں بہتر ہے۔

سیاسی جماعتوں کا مقصد اصلی عوام کی خدمت ہوا کرتا ہے، کوئی سیاسی جماعت، جسے جماعت کا نام دیا جا سکے، اپنے لائحہ عمل میں یہ بات شامل نہیں کر سکتی کہ دوسرے علاقوں کو نقصان پہنچا کر کسی ایک علاقے کے لوگوں کو ناواجب فائدہ پہنچائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ جب افتراق ختم ہوا اور سب ایک ہو گئے تو اختلاف کا کیا سوال ؟

مسٹر حسین شہید سہروردی

اب مغربی پاکستان کی مصنوعی سرحدیں ختم ہو گئی ہیں۔ چنانچہ اجتماعی ترقی کے منصوبے اور متوازن تعمیر و ترقی کی اسکیمیں اور مغربی پاکستان میں عوام کی بہبودی کے جو طریقے اختیار کئے جائیں گے، وہ اچھی طرح پنپ سکیں گے۔۔۔ خدا کا شکر ہے کہ پہلے حکمرانوں نے ہمارے وطن میں جو قیود و بند کی دیواریں کھڑی کر کے بھائیوں کو بھائیوں سے جدا کر دیا تھا، وہ آج مسمار کر دی گئی ہیں مغربی پاکستان کے واحد صوبے سے اتحاد قومی کا جذبہ آشکار رہے۔ ہم قائد اعظمؒ کے اصول پر کاربند ہیں۔

ہم مغربی پاکستان کو ایک ایسے باغ کی طرح نشوونما دینا چاہتے ہیں جہاں رنگا رنگ کے پھول، درخت اور پودے آپس میں ہم آہنگ ہو کر نمو پذیر ہوں اور اس کی رعنائی و دل آویزی میں اضافہ کریں۔ درحقیقت مغربی پاکستان کے اتحاد کے معنی ہیں عوام کا اتحاد اور تمام نسلی، لسانی گروہوں کا اتحاد جنہیں اجنبی حکومت نے اپنے مقاصد کے لئے ایک دوسرے سے علیحدہ کر رکھا تھا اور اسکے ساتھ ان سب کا ایک مشترکہ میراث ہیں، مساوی شرکا کے طور پر وسائل قدرت سے متمتع ہونا۔

ہز ایکسلینسی مسٹر مشتاق احمد گورمانی گورنر مغربی پاکستان

ہمیں خود غرضی سے بالاتر ہو کر ملک کا معیار بڑھانا چاہئے۔ مغربی پاکستان کا استحکام تمام ملک کا استحکام ہے۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء جمعہ کا دن ہمارے ملک کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ پاکستان کی تکمیل کے بعد سب سے اہم کارنامہ یہی ہے۔

عزت مآب ڈاکٹر خان صاحب وزیر اعلیٰ مغربی پاکستان

مغربی پاکستان کے صوبوں کے انضمام کے ذریعہ ہم اقتصادی اور معاشرتی لحاظ سے پسماندہ علاقوں کی ترقی کی طرف زیادہ توجہ دے سکیں گے اور اپنی آبادی کو سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی لحاظ سے ایک سطح پر لائیں گے۔ اس انضمام سے آنے والی نسلوں کو ایک مشترکہ قومی نصب العین حاصل ہوگا۔

مغربی پاکستان کے صوبہ کے قیام سے دستور سازی سے متعلق بہت سے مسائل حل ہو جائیں گے۔ مثلاً مشرقی اور مغربی پاکستان کے مسائل ختم ہو جائیں گے۔ مثلاً مرکزی، مساوی حقوق کے تحت دستور سازی میں آسانی ہوگی۔ اس طرح یگانگت اور ایک دوسرے پر دارومدار رکھنے کا جذبہ پیدا ہوگا اور ہم ایک متحد قوم کی طرح اپنی منزل کی طرف گامزن ہو سکیں گے۔

عزت مآب سردار امیر اعظم خاں صاحب

دریائے سندھ کے طاس میں جو تہذیب نشوونما پاتی رہی ہے اس کا سکہ شمالی کشمیر سے لے کر بحیرۂ عرب تک اب بھی رائج ہے۔

عزت مآب الحاج محمد ایوب کھوڑو صاحب

وڈیرے تو ایک متحدہ صوبۂ مغربی پاکستان کے منصوبے کی مخالفت ہی اس لئے کر رہے تھے کہ اس کی بدولت ان کے ظلم و تشدد اور استحصال کا دور ختم ہو جائے گا۔ اب سندھ کے غریب لوگوں کو پنجاب، سرحدی صوبہ، بہاولپور اور بلوچستان کے غریبوں اور ناداروں میں بڑے اچھے ہمدرد اور دوست میسر آجائیں گے، اور جب یہ سب مل کر ایک متحدہ محاذ بنالیں گے تو وڈیروں کے لئے یہ ناممکن ہو جائے گا کہ وہ ہاریوں پر اسی طرح تسلط جمائے رکھیں۔

جب سندھی زبان اور تمدن نے ماضی کے تمام منظم اور سوچے سمجھے حملوں کا کامیابی سے مقابلہ کرلیا اور ذرا بھی اس میں فرق نہ آنے پایا تو اب اس نئے انتظام کے تحت اس کو کیا خطرہ لاحق ہوسکتا ہے؛ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ ملک کی اس نئی ہیئت میں اس کو اور زیادہ پھولنے پھلنے کے مواقع حاصل ہوں گے۔

عزت مآب پیر علی محمد راشدی صاحب

اگر ہم بلوچستان، سرحد اور قبائلی علاقوں کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینا چاہتے ہیں تو یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم اپنے وسائل کو یکجا کریں اور ان سے اس جگہ کام لیں جہاں ان کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ وسائل کو اس طرح یکجا کرنے اور انہیں زیادہ سے زیادہ علاقے کے لئے کام میں لانے سے مغربی پاکستان کے لوگوں بلکہ سارے پاکستان کے باشندوں کو بہت فائدہ پہنچے گا اور یہ فوائد کسی خاص علاقے یا کسی خاص محلے کے لئے جس کا اثر زیادہ ہو، محدود ہو کر نہ رہ جائیں گے۔
مغربی پاکستان کے حصوں کے آپس میں مل جانے سے ہر علاقہ ایک خیر اندیش مملکت کی برکات سے یکساں طور پر متمتع ہوسکے گا۔ جونہی آپ مغربی پاکستان کو ایک صوبہ بنائیں گے، آپ کو اس انضمام اور اس اتحاد کی وجہ سے پسماندہ علاقوں کے حالات اور معیار زندگی کو ترقی یافتہ علاقوں کے حالات اور معیار کے برابر لانا پڑے گا۔ ایک صوبہ بنتے ہی اس صوبے کے کل علاقوں کے اسکولوں، ہسپتالوں اور خدمتِ خلق کے دیگر اداروں کو ایک ہی معیار پر لانا پڑے گا۔
مغربی پاکستان کے صوبوں اور ریاستوں کے مل جانے سے سارے پاکستان کی ترقی کے وسائل و ذرائع کو تقویت حاصل ہوگی۔ ایک خوشگوار اور سازگار فضا میں آزادی کی فرحت بخش ہوا زیادہ آزادی کے ساتھ پھیلے گی اور اس کے زور سے مکڑی کے جالوں کی طرح مقامی جبر و استبداد، جس کا ذکر آج کل اکثر سننے میں آتا ہے، نیست و نابود ہو جائے گا۔

عزت مآب میاں ممتاز دولتانہ

نئی بستیاں

ابوالخیر کشفی

اب سے برسوں پہلے کی بات ہے سمجھ لیجئے ہی کوئی سو برس پہلے کی بات ــ ایک امریکی نے سامنے اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ــ "دیکھو کتنا عظیم الشان شہر ہے" ــــ اس کے انگریز ساتھی نے حیرت سے کہا کہ ــ "عظیم الشان شہر؟ ـــ میرے سامنے تو ویران بنجر زمین پڑی ہے۔ یہاں سے وہاں تک "تاحدِ نظر" ـــ امریکی اپنے خوابوں میں کھو گیا تھا چونکتے ہوئے اس نے کہا کہ "میں آج سے پچاس سال بعد دیکھ رہا ہوں"۔

کراچی سے پشاور تک سفر کرتے ہوئے میں نے بھی بیداری کے ایسے کتنے ہی خواب دیکھے ہیں ـــ تاحدِ نگاہ پھیلے ہوئے ریگستانی علاقے اور ان کی وسعتوں سے میرے دل میں اتنی گنجائشوں کا احساس پیدا ہوا کہ وہ گنجائشیں "قلبِ مسلماں" کے سوا اور کہیں نہیں سماسکتیں ــ ہماری قومی تاریخ میں جو وسیع خلا پیدا ہوگیا تھا میرا ذہن اُس خلا کو پُر کرنے لگتا۔ انہیں میدانوں اور ریگستانوں سے محمد بن قاسم کی فوجیں گزری ہوں گی ۔ یہیں نخلستانوں میں انہوں نے ڈیرے ڈالے ہوں گے اور یہیں شام کو شفق آلود آسمان کے تلے ان کی اذانوں سے فضاؤں کے سینے آباد ہوئے ہوں گے ـــ اور اب ہم اس وسعتِ بے پایاں کے مالک ہیں، انہیں آباد کرنا ہمارا کام ہے گنجائشوں کی کمی نہیں اور آزادی، انہیں گنجائشوں اور نت نئے امکانات کا دوسرا نام ہے۔ اپنی تقدیر اور اپنے مستقبل کی تعمیر میں جو لذت ہوتی ہے، آزادی ہمیں اس سے ہم کنار کرتی ہے۔

مجھے اور میری نسل کو ان خوابوں کی تعبیر کے لئے بہت دنوں انتظار نہ کرنا پڑا ـــ نئی بستیاں بسنے لگی ہیں ــ اور ان بستیوں میں محض افراد آباد نہیں کئے گئے ہیں، صرف چند ہزار خانمانوں کو مکان نہیں دیئے گئے ہیں بلکہ یہ بستیاں ایک نئے تمدن کا گہوارہ ہیں ـ نیا تمدن خرم گڑھی، ورسک، تونسہ اور تھل کی بستیوں میں پیدا ہوگا۔ صحیح معنوں میں قومی اور پاکستانی تمدن۔ زمین کے یہی خطے ہمارے مستقبل کا افق ہیں اور اسی لئے میں نے کم از کم اس باب میں اپنی سرحد کے پرے کبھی نہیں دیکھا ؎

مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد
کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد

پچھلے دنوں جب میں تھل گیا تو اس بات پر یقین آگیا کہ زندگی "جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں" سے عبارت ہے۔ مایوسی کے دھندلکے ماضی کے پردوں میں گم ہوگئے اور میرا ذہن نئی امیدوں کا سرچشمہ بن گیا ـــ اقبال میرے ذہن میں گنگنانے لگا ؎

مری جفا طلبی کو دعائیں دیتا ہے
وہ دشتِ سادہ، وہ تیرا جہانِ بے بنیاد

یہ دشتِ سادہ نہیں بلکہ "وہ دشتِ سادہ ـــ "یہ" اور "وہ" کے درمیان ماضی اور حال کا فرق ہے (تعلق بھی)۔ اپنی قوتِ تخلیق پر اپنے آپ کو ایمان لانا پڑا۔ ویسے بھی خدا نے انسان کو خالق بنایا ہے، نہیں تو وہ اپنے آپ کو "خالقوں میں سب سے بہتر" کیوں کہتا؟

تھل، خرم گڑھی اور ورسک میرے نزدیک محض زرعی نوآبادیاں اور بستیاں نہیں بلکہ تمدنی گہوارے ہیں ـــ یہاں ایک نئی زندگی جنم لے گی ـــ ویسے تو پاکستان خود ایک تمدنی حقیقت ہے، مشترک تمدن، تاریخ اور روایات کی بنیادوں پر دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک قائم کیا گیا لیکن پچھلے پانچ چھ برسوں میں اس اشتراک کے جذبہ پر تعصب اور تنگ نظری کا کہرا چھا گیا تھا۔ لوگوں کا

ذہنی افق محدود ہو گیا تھا۔ مشترک باتوں کو بھول کر وہ اختلاف کو ابھارنے لگے تھے —— یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے صوبوں کی اپنی روایات ہیں اور یہ روایات کسے عزیز نہیں ہوتیں مگر ہماری مشترک قومی روایات بھی تو ہیں — اور یہ روایات اپنے مختلف روپ میں ہر جگہ نظر آتی ہیں ——— بنگال کے مسلمان شاعروں، شاہ لطیفؒ، خوشحال خاں خٹک، ہیر رانجھا کے خالق اور اقبال کے دل میں ایک ہی سے جذبات کی دنیا آباد تھی، ان کی نگاہوں میں ایک سے خواب بسے ہوئے تھے ... اب غربت اور دوری کی سرحدیں مٹ گئی ہیں۔ فاصلے اپنی طنابیں کھینچ لی ہیں۔ اسلام کے تصورِ اتحاد نے ان سرحدوں کو اپنی آغوش میں لے کر ایک وحدت کو جنم دیا ہے اور اسی وحدت میں یہ نئے تمدنی گہوارے ہیں۔

تھل، خرم گڑھی، اور دریک کی زرا عتی آبادیوں کی جگہ نئی تجربہ گاہیں کہنا چاہیئے۔ یہاں ہمارے کسان زمین کے سینے کو چیر کر اُسے قوتِ نمو عطا کر رہے ہیں اور یہ کسان پنجابی بھی کہلاتے ہیں، سرحدی بھی، سندھی بھی، بلوچ بھی اور مہاجر بھی ——— وہ لوگ جو اسی تمدنی وحدت کا حصہ بننے کے لئے اپنے وطن کو چھوڑ کر سرحد کے اس طرف آ گئے۔ ان کے وطن میں بہت کچھ تھا، ریشم کے تھان تھے، فیروزآباد کی چوڑیاں تھیں، بنارس کے کپڑے تھے، ملیح آباد کے آم تھے، کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی زبان تھی، لکھنؤ کی وہ تہذیب تھی جو آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا احترام کرنا جانتی تھی اور دہلی کے کوچے تھے جہاں میر و غالب کے غیر فانی نغمے گونجتے تھے لیکن یہ سب کچھ ہوتے ہوئے کچھ بھی نہ تھا۔ جامِ مسرت میں مذہبی تعصب نے غم کا زہر ملا دیا تھا۔ کوثر و تسنیم کی زبان کو کاٹنے کے لئے ایک مری ہوئی تہذیب کی قینچیاں تھیں ——— چہروں پہ جنونِ حبِ وطن کا اظہار تھا اور سینے تعصب کے سمندر تھے ——— اور دوری کے اس احساس نے انہیں مشرقی بنگال کے کھیتوں، پنجاب کے میدانوں، سرحد کی پہاڑیوں اور سندھ کے ریگستانوں کی طرف کھینچا — یہ علاقے ان کے لئے نئے تھے لیکن یہاں سے محبت کی ہوائیں ان تک جاتیں اور کہتیں۔

ع ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی

—— آج یہ سب مل کر ان بستیوں میں ایک نئے دور کی شیرازہ بندی کر رہے ہیں۔ کل یہاں انسانی جذبات کو نئی زبان اور نیا اندازِ بیان ملے گا — پنجاب کے گندم کے کھیتوں کے پہلو میں ملیح آباد کے آموں کے باغ دکھائی دیں گے۔ محبوبہ ہیر رانجھا گائے گی اور عاشق اسے میر کے شعر سنائے گا۔ ان زرعی نو آبادیوں میں صرف انسان گلے نہیں مل رہے ہیں بلکہ ان کی زبانیں بھی ایک دوسرے سے ہم آغوش ہو گئی ہیں۔ وہ لسانی رشتے جو بعدِ مکانی سے ٹوٹ گئے تھے، وہ پھر سے استوار ہو رہے ہیں۔ پنجابی جب تصوف کی کوئی بات کہتا ہے، تو اردو مسکراتے ہوئے جواب دیتی ہے "اسے 'ملنگ' — یہ لفظ تو میں ہمیشہ سے بولتی رہی ہوں۔ تم نے میرا مَن سے تو سُنا ہوگا!"

مغربی پاکستان میں گزشتہ چھ سات سال میں کئی زرعی نو آبادیاں بن گئی ہیں اور ان بستیوں میں ایک قومیت کی تشکیل کا کام انتہائی خاموشی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ یہ محض یہ ایک خاموش انقلاب نہیں بلکہ قومی معجزہ ہے۔ خرم گڑھی اور دریک کے دامنوں میں آج نئی بستیاں قومی اتحاد کا اشارہ ہیں۔ تونسہ اور تھل میں لاکھوں ایکڑ زمین قابلِ کاشت بنا دی گئی ہے ... کل تھل ایک ایسا صحرا تھا جو انسانوں کے نقوشِ قدم سے نا آشنا تھا — یہاں ریت کے تودے تھے، بگولوں کا رقص تھا اور سراب کی فریب سامانی — آج ریت کے تودوں کی جگہ ہرے بھرے جنگل اور شاداب کھیت ہیں، بگولوں کی جگہ صحت بخش ہوائیں ہیں اور سراب کی جگہ پانی کی نہریں ——— قدرت کی فیاضیاں قدم قدم پہ ہم سے کہتی ہیں "اور تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں سے انکار کرو گے؟" — یہاں دھاتوں کی کانیں ہیں، زمین کی گود میں شادابی ہے، پہاڑ ہیں، جنگل بھی ہیں اور زرخیز زمین بھی ——— ہمارے دور میں انسان نے زمین اور ہوا کو بھی مسخر کر لیا ہے۔ سائنس کے جدید ترین آلات ریتلی زمین کے مزاج کو بدل رہے ہیں ——— بنجر زمین اور بانجھ عورت کے درمیان مجھے ہمیشہ بڑی مماثلت نظر آتی ہے ——— ایک نوخیز اور جوان ہمت قوم نے بانجھ زمین کے دامن کو گلِ مراد سے بھر دیا ہے ...

کبھی انسان عناصرِ قدرت کے سامنے اپنے آپ کو بہت حقیر سمجھتا تھا لیکن خدا نے اسے حوصلہ دیا، عقل عطا کی، اور اس نے ان عناصر کو فتح کر لیا — یہ نئی بستیاں انسان کی اس فتح کا سب سے موثر اعلان ہیں، دریاؤں پر بند باندھے گئے ہیں، نئے بیراج اب ہماری زمینوں کو نئی زندگی بخشیں گے۔

یہ سب منظر ایسے ہیں کہ دیکھنے والا ان میں گم ہو جائے، لیکن مجھے تھل، ورسک، تونسہ اور خرم گڑھی کے تمدنی اور تعلیمی اداروں نے بے حد متاثر کیا ہے ـــ یہ ادارے ان بستیوں میں رہنے والوں کے ذہن اور شعور میں نئی قومیت کا احساس پیدا کریں گے۔ آج جو بچے یہاں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ پاکستانی قومیت کا احساس ان کے شعور کا حصہ بن چکا ہے۔ یہاں کے اسکولوں اور تمدنی اداروں میں تعلیم کی منصوبہ بندی قومی نقطۂ نظر سے کی گئی ہے۔ ہر جگہ تعلیم کا ایک ہی نمونہ ہے ـــ یہ تعلیم جو بچوں کو سکھاتی ہے کہ تم ایک قوم ہو تم ایک وحدت ہو، تم میں کوئی اختلاف نہیں، کہیں بھائیوں میں بھی کوئی فرق ہوتا ہے؟

ـــ یہ تمدنی ادارے اور یہ سرگرمیاں ہمیں انسانی تاریخ کی کئی دور آبادکاریوں کی یاد دلاتی ہیں۔ امریکہ اور کینیڈا میں بھی تو یہی کچھ ہوا تھا۔ ملکوں ملکوں کے لوگ جمع ہوئے۔ کوئی جرمنی کا باشندہ تھا، کوئی اپنی آزادی کے تحفظ کے لئے اسپین سے چلا آیا تھا، کسی کی اولوالعزمی نئی دنیاؤں کی تلاش میں اُسے انگلستان سے لے آئی تھی ـــ اور پھر وہ ایک ایسے حالات کے تحت سب اختلافات بھول کر ایک قوم بن گئے ـــ ہم تو پہلے سے ایک قوم ہیں، ہمارے مسائل ایک ہیں، ہماری زندگی اور موت ایک دوسرے سے وابستہ ہے، یہ ادارے انہیں حقیقتوں اور صداقتوں کو نئی پود کے دل میں اتار رہے ہیں اور ان کے شعور کا حصہ بنا رہے ہیں۔

پاکستان بنیادی طور پر ایک زراعتی ملک ہے اور پاکستان کی معاشی منصوبہ بندی میں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ـــ پاکستان میں صنعت اور زراعت کو ساتھ ساتھ آگے بڑھنا ہے ـــ سائنس نے زراعت میں بھی صنعتی پہلو پیدا کر دیا ہے۔ آج کا کاشتکار صرف بیل اور ہل کا محتاج نہیں ـــ اس کے ٹریکٹر، اس کی مشینیں آج اس کی قوت ہیں۔ تھل، تونسہ، خرم گڑھی اور ورسک کے کاشتکار سائنس کے ان آلات کو استعمال کر رہے ہیں۔

اسی کے ساتھ ساتھ ان نوآبادیوں کے کارخانوں کی چمنیوں سے اٹھتا ہوا دھواں ملک کی صنعتی ترقی کی نشان دہی بھی کرتا ہے ـــ کہیں کپڑے بُنے جا رہے ہیں، کہیں شیشے کے برتن اور سامان بن رہے ہیں، اور کہیں دوسری مصنوعات تیار ہو رہی ہیں۔ یہ کامگار اور کسان ہمارے معاشرہ کے نئے اور بلند حوصلہ انسان ہیں ـــ ان کی زندگی روایتی مزدوروں اور کسانوں کی زندگی سے مختلف ہے ـــ یہ اپنے غم و اندوہ کو غرقِ مینا و جام نہیں کرتے۔ یہاں کارخانوں کے باہر شراب خانے نہیں بلکہ ان کے کلب ہیں، تفریح گاہیں ہیں، دواخانے ہیں، اور کھیل کے میدان ہیں ـــ کل برِصغیر کے مزدور اور کسان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ قرضے کے اندھیروں میں آنکھ کھولتا ہے، دادا کا قرض پوتا ادا کرتا رہتا ہے اور بیاج بھی ادا نہیں کر پاتا اصل تو کہاں ـــ یہاں کسانوں کا خون چوسنے والے بنئے نہیں بلکہ حکومت کی بچت کی اسکیمیں ہیں۔ جب اُسے ضرورت ہو تو حکومت اور کارخانوں سے قرض مل سکتا ہے۔ اس کے بچے غربت اور افلاس کی وجہ سے بے علاج دم نہیں توڑتے۔ سرکاری دواخانے اس کی خدمت کے لئے موجود ہیں ـــ پاکستان کی کسی ایسی بستی میں چلے جائیے وہاں آپ کو دلوں کا دھواں اور گھٹی ہوئی چیخیں نہیں ملیں گی، بلکہ آزاد اور بے فکر قہقہے آپ کا خیر مقدم کریں گے ـــ کامگار اور کسان آپ کو اپنے گھر میں جگہ دیں گے اور جو کچھ حاضر ہوگا آپ کے سامنے پیش کر دیں گے ان کے بچے جب سرکاری اسکول سے بغل میں بستہ دابے ہوئے آئیں گے تو آپ کو دیکھ کر ٹھٹکیں گے نہیں، آپ کو اجنبی نہیں سمجھیں گے، بلکہ بڑی اپنائیت کے ساتھ سلام کر کے مزاج پرسی کریں گے۔

تھل کے کسانوں کے ساتھ میں نے ایک ہفتہ گزارا ہے ـــ ان دنوں مجھے یہی محسوس ہوا کہ زندگی کا ہر غم اس بستی کے باہر سرگرداں ہے ـــ زبان کی اجنبیت بھی ہمارے درمیان حائل نہیں ہوئی ـــ محبت تو انسان کی فطری زبان ہے اور پیار بھری نظروں کی سی وضاحت کہیں اور کب ملے گی ـــ

یہ ساری نئی بستیاں ہمیں یاد دلاتی ہیں کہ

ط   اک نئے دور کی خاطر یہ حنا بندی ہے

زمین کے یہ بیٹے اور کارخانوں کے شہزادے پاکستان کے تمدنی اتحاد کے نقیب ہیں ـــ انھیں اپنا ہی غم نہیں، بلکہ ہم سب کا خیال ہے، یہ ہمارے لئے زمین کے سینے سے گندم اگاتے ہیں، ہمارے لئے، اپنے بھائیوں اور بہنوں کے لئے کپڑے بنتے ہیں، ہمارا بدن ڈھانپتے ہیں۔ اور آج جب مغربی پاکستان ایک وحدت بن گیا ہے تو یہ ہم سے اور قریب آ گئے ہیں ـــ ہم کہیں بھی ہوں اور کچھ بھی کر رہے ہوں یہ ہمارے

(باقی صفحہ ۶۰ پر)

مغربی پاکستان

تمدّنی وحدت

محمد سرور

یہ خطہ جس پر آج مغربی پاکستان کا صوبہ مشتمل ہے، تاریخ کے ابتدائی دور سے ایک سے حالات سے گزرتا رہا ہے۔ عہدِ قدیم میں یہاں جو لوگ بستے تھے اور بعد میں باہر سے آکر یہاں جو آباد ہوئے، ان کا فی الحال ذکر نہیں کرتے، اور نہ اس خطے کے قدیم باشندوں نے یہاں جن تہذیبوں کی بنیاد رکھی، ان پر ہم اس وقت بحث کرنا چاہتے ہیں، یہاں ہمارے پیشِ نظر اس خطے کا صرف موجودہ دور ہے۔

مغربی پاکستان کا موجودہ دور شمال مغرب سے آنے والے مسلمانوں کی آمد سے شروع ہوتا ہے، جس پر اس وقت تقریبًا ایک ہزار سال گزر چکا ہے۔ سب سے پہلے سندھ میں مسلمان آئے۔ یہ مسلمان عرب مسلمانوں کا پایۂ تخت دمشق تھا، کچھ عرصہ بعد جب بنو امیہ کی جگہ بنو عباس برسرِ اقتدار آئے، تو عربی اسلامی سلطنت کا پایۂ تخت دمشق کے بجائے بغداد منتقل ہو گیا۔ بغداد سندھ سے نسبتًا قریب تھا، اور خاص طور سے بغداد کی بندرگاہ بصرہ، سندھ سے کافی نزدیک تھی۔ اس زمانے میں سندھ اور عراق میں بڑا ربط ضبط بڑھا۔ سندھ میں بہت سے عربی شعرا پیدا ہوئے، جو سندھی ذہن اور سندھی افکار کو عربی اشعار میں پیش کرتے تھے۔ اسی طرح بہت سے سندھی بصرہ اور بغداد پہنچے، اور وہاں کی عالمی تہذیب کی تعمیر میں برابر کے شریک ہوئے۔ اس زمانے کا ایک مسلمان مورخ لکھتا ہے کہ بصرہ کا شاید ہی کوئی صراف ہوگا، جس کا منیم سندھی نہ ہو۔ عباسی خلفا، منصور، ہارون، مامون اور ان کے بعد آنے والوں کے عہد میں برِعظیم پاک و ہند پر جو بھی اسلامی اثرات پڑے، اُن کا ذریعہ سندھ بنا، اور بغداد کی عالمی تہذیب میں اس برِعظیم کا جو بھی حصّہ ہے، وہ اسلامی سندھ ہی کا دین ہے۔

سندھ کے بعد دوسری بار شمال مغرب کے پہاڑی دروں سے صوبہ سرحد اور پنجاب کے میدانوں میں مسلمان آئے، ان مسلمانوں کی زبان فارسی تھی، لیکن ایسی فارسی جس کے پچھتر فی صدی الفاظ عربی تھے، اور جس کی روح اور ادبی روایات تو خالصًا اسلامی اور عربی تھیں۔ یہ نووارد مسلمان کسی ایک نسل کے نہ تھے، ان میں مغربی اور وسطی ایشیا کی ساری نسلیں ملی جلی ہوئی تھیں، بلکہ یہ خطہ جس سے آج مغربی پاکستان عبارت ہے، ان نئے آنے والے مسلمانوں میں اس کے باشندوں کا بھی کافی اختلاط ہو چکا تھا۔ یہ نووارد مسلمان ایک مرکب نسل کے تھے۔ ان کا مذہب اسلام تھا، زبان فارسی تھی اور ان کی تہذیب کی گو روح تو اسلامی تھی، لیکن اس کے اجزا اس عہد کی معلوم دنیا کے ہر حصّے سے لئے گئے تھے۔ چنانچہ اس خطے کے باشندوں کی تہذیب کے بھی بعض اجزا موجود تھے، جو یہاں سے عراق، ایران اور خراسان منتقل ہوئے تھے۔ اور وہاں کی تہذیب میں جذب ہو کر اب ایک نئی شکل میں واپس اس دیس میں نووارد مسلمانوں کے ساتھ آئے تھے۔

یہ تھا مغربی پاکستان کے موجودہ دور کا نقطۂ آغاز۔ اس کی طرح سیاسی لحاظ سے جیسے پڑی، ہم اس سے یہاں بحث نہیں کر رہے۔ ہمارے پیشِ نظر صرف ذہنی، معنوی اور تہذیبی اثرات کا ذکر کرنا ہے، جنہوں نے آگے چل کر یہاں کے باشندوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو نشو و نما دی، اسے ایک خاص قالب بخشا اور اس قالب کے اندر ایک خاص روح پیدا کی۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی چیز یہ ملحوظ رہنی چاہئے کہ مغربی پاکستان کے جس خطے کا ہم ذکر کر رہے ہیں، وہاں کے باشندے

رصہ دراز سے نسلی لحاظ سے آپس میں اس طرح مل جل گئے ہیں۔
ن کی بنا پر ان میں آپس میں نسلی امتیاز کرنا ناممکن ہے۔ مثال کے
پنجاب کے تمام شہروں میں اس وقت جو آبادی ہے، اس کی اکثر بہت
، کے مخصوص علاقے کی نہیں، بلکہ وہ گزشتہ سو ڈیڑھ سو سال
ربی پاکستان کے دوسرے حصوں آکر وہاں آباد ہوئی ہے اور
جاب کے مخصوص علاقے کے جو لوگ ہیں، انہیں بھی نسلاً ایک
ا بہت بڑی غلطی ہوگی۔ پنجاب ایک علاقے کا نام تھا، کسی
کا نہیں، اور یہ نام بھی زیادہ قدیم نہیں، اور نہ اس کی موجودہ
ی وحدت زیادہ عرصے کی ہے۔ یہی حال مغربی پاکستان کے
سے حصوں کا ہے۔ الغرض مغربی پاکستان ملی جلی نسلوں کی
، اور مخلوط آبادی ہے۔

اس ضمن میں دوسری بنیادی بات یہ ہے کہ پورے مغربی پاکستان
ہنی، معنوی اور تہذیبی زندگی کا سرچشمہ ایک ہے، اور اس سرچشمے
تیں گزشتہ ایک ہزار سال سے یہاں کے باشندوں کی انفرادی
اعی اور داخلی و خارجی زندگی کو سیراب کرتی آرہی ہیں، ان باشندوں
امی شاعری کی زبانیں گو الگ تھیں، لیکن ان کی بنیادی روح
ہی تھی۔ پشتو زبان کے سب سے بڑے صوفی شاعر رحمٰن بابا،
ی زبان کے سب سے بڑے صوفی شاعر شاہ عبداللطیف اور
زبان کے سب سے بڑے صوفی شاعر بلھے شاہ نے ایک ہی
نت کو پیش کیا ہے۔ گو ان کی زبانیں الگ الگ ہیں، لیکن
سب نے ایک ہی کہی ہے، پیغام سب کا ایک ہے لیکن
ں کی رعایت سے اسے مختلف جاموں میں پیش کیا ہے۔

بے شک جس زمانے میں ان بزرگوں نے اپنا اپنا پیغام
اس وقت جس جس ماحول میں انہوں نے یہ پیغام دیا ان
ایک حد تک آپس میں بُعد تھا، اس لئے باوجود اس کے
ن کا پیغام ایک تھا، اس پیغام کا تہذیبی، معنوی اور ذہنی
منظر ایک تھا، اور ایک ہی غرض اس پیغام کے پیش نظر بھی
، پھر بھی ان بزرگوں کو اپنے اپنے پیغام کے لئے الگ الگ
ے اختیار کرنا پڑا۔ چنانچہ ہماری علیحدہ علاقائی زبانیں آپس میں
ہرا روحانی رشتہ رکھتی ہیں اور ایک ہی روحانی نظام کے
ملف اجزاء ہیں۔

خفیف علاقائی اختلافات جو اتنے بڑے علاقے میں موجود ہونے
لازم تھے، دراصل یادگار ہیں ایک ایسے دور کی جب ذرائع آمد و رفت
محدود اور سست رفتار تھے۔ ہر گاؤں دوسرے سے الگ تھلگ
تھا جس کے باشندے سیاسی، انتظامی اور معاشی لحاظ سے
خود کفیل ہوتے تھے۔ اس ماحول میں شاذ و نادر ہی ایک علاقے
کے لوگ دوسرے علاقے میں جاتے، ہر بستی اپنی جگہ ایک ملک تھا
جہاں کے باشندے دوسری بستی والوں سے الگ تھلگ اپنی
ساری زندگیاں گزار دیتے۔

مغربی پاکستان اس وقت ایک نئے ماحول کے دروازے
پر کھڑا ہے۔ وہ ماحول جو خالص دیہی معیشت کی پیداوار تھا اور
جس میں ہر ضلع اور علاقے دوسرے سے بے واسطہ تھا، اب ختم ہو رہا
ہے۔ علیحدگی پسند دیہی معیشت کو درآمد و برآمد کی نئی تجارت
نے تبدیل کر دیا ہے۔ اور لوگ تلاشِ معاش کے لئے سفر کرنے پر
مجبور ہو گئے، اور اس کی وجہ سے ان کی نظروں اور ذہنوں سے
علیحدگی اور انفرادیت کے دبیز پردے ہٹنے لگے۔ آپس میں اختلاط
و ارتباط اور آبادیوں کے انتقال مکانی کی ضرورتیں اب تو پہلے
سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ دریاؤں پر بند باندھنے اور ان سے
لاکھوں ایکڑ زمین سیراب ہونے، نیز بڑے بڑے کارخانوں کے
قیام اور صنعت و حرفت کی ترقی سے پورے مغربی پاکستان کے
معاشرتی حالات سرعت سے بدل رہے ہیں۔ آئندہ ایک علاقے
کے لوگ دوسرے علاقے کے لوگوں کے ساتھ اس طرح گھل مل جائیں گے
کہ مقامی زبانیں، مقامی کلچر اور مقامی خصوصیات ایک ہی تہذیب
کے مختلف عناصر بن جائیں گے اور انہیں اپنے محدود علاقے ہی کا
نہیں بلکہ پورے وسیع علاقے سے تعلق ہو جائے گا اور سب انہیں
اپنا سمجھنے لگیں گے۔ ایک مرکب اور مخلوط تہذیب معرض وجود میں
آجائے گی، جس کی مشترک زبان چاہے اردو سہی، مگر دوسری زبانیں
بھی ایک وسیع تر ماحول میں پھل پھول سکیں گی اور وہ خود بھی ایک
طرف علاقائی زبانوں کی ترقی کا باعث بنے گی، اور دوسری طرف خود
ان سے تقویت حاصل کرے گی۔

جو لوگ مغربی پاکستان کی حد بندیوں کو مستقل سرحدیں سمجھتے

(باقی صفحہ ۳۴ پر)

میرا سفر

رانلڈ آگڈن
مترجمہ: ابن انشا

مسٹر رانلڈ آگڈن جو بین الاقوامی لیبر آفس کی طرف سے صنعتی امور کے مشیر کے طور پر ایک سال کے لئے پاکستان آئے ہوئے ہیں انگریزی کے اچھے صحافی اور افسانہ نگار گنے جاتے ہیں۔ انہوں نے پچھلے دنوں مغربی پاکستان کے صنعتی حالات کا بچشم خود مشاہدہ کرنے کے لئے کار میں تین ہزار میل کا سفر کیا۔ سفر میں ان کی اہلیہ اور بچے بھی ساتھ تھے۔ ——— (ادارہ)

میں نے پچھلے دنوں کار میں اپنی رفیقۂ حیات اور بچوں کے ہمراہ مغربی پاکستان کے مختلف مقامات کا دورہ کیا ہے۔ تین ہزار میل کی اس سیاحت کے تاثرات میں سے کون سا تاثر، کون سا نقش سب سے گہرا اور سب سے دیرپا ہے اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ صحرائے سندھ میں سے گزرتے ہوئے ہمیں اس کی تپتی جھلستی ریت سے دوچار ہونا پڑا جو کار کی کھڑکی کے کھلے شیشوں میں سے در آتی تھی۔ (کھڑکی کو بند کرنا اس لئے محال تھا کہ دم گھٹتا تھا)۔ پھر ایک بار ایک چوراہے پر جہاں دور دور تک سائے یا سائبان کا نشان نہیں تھا دو گھنٹے ایک شاہی مہمان کے انتظار میں کھڑے رہنا پڑا جس نے کبھی نزول اجلال نہ فرمایا۔ ہمارا گزر ٹھٹھہ کے ایام قدیم کی خستہ و کہنہ عمارات کے پاس سے بھی ہوا اور ہمیں حیدرآباد وارد ہونے کا منظر بھی خوب اچھی طرح یاد ہے جہاں گرد ہی گرد اڑتی ہے اور جہاں ہمیں ریسٹ ہاؤس کی ناکام جستجو میں بھٹکنا پڑا۔

حیدرآباد کو سکھر سے جو ٹرنک شاہراہ ملاتی ہے اس کے دو بڑے بڑے سنگ میل بھی یاد آتے ہیں جن میں سے ہر ایک ہمیں بتاتا جاتا تھا کہ لاہور کے سو میل کی راہ ہے اور پیشاور کتنی دور۔ سکھر کا انسپکشن بنگلہ بھی ہمیں یاد رہے گا جس کے ناقابل یقین اسباب راحت پر ہم حیران رہ گئے۔ رنجڑی کی تنگ و تاریک گلیوں میں ہم نے ریشم کے پرانے کارخانے اور کھڈیاں دیکھیں جن کے شٹل یوں گردش کرتے ہیں جیسے ریوالور میں کارتوس۔ دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ وہ عظیم پشتے بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا جس کی مدد سے پیاسی زمین کی سیرابی کے لئے پانی مہیا کیا جاتا ہے۔ لاڑکانہ سے آگے مشہور "چاول نہر" کے ساتھ ساتھ ہم موئن جو ڈرو پہنچے جہاں آفتاب میلوں لمبی سیدھی اور تنگ گلیوں کو بے رحمی سے جھلستا نظر آتا ہے۔ ملتان میں والی بال کے اس کھیل کا منظر بھی آنکھوں کے آگے آتا ہے جو پاکستان کی ایک بہت بڑی کیپٹرال کے اہتمام سے ہوا تھا۔ ہم نے پگھلے شیشے سے گھریلو استعمال کے گلاس بنتے دیکھے اور ذہن میں ایک نقش لائلپور کی اس شام کا بھی ہے جب ہم سرکٹ ہاؤس کے باغیچے میں بیٹھے تھے۔ بوجھل ہوا سے حرارت رفتہ رفتہ رخصت ہو رہی تھی اور ظلمت کے سائے پھولوں کے تختوں پر اترتے رہے تھے۔ ذہن میں یادوں کا ایک ہجوم ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کس نقش کو ابھارا جائے کس کو چھوڑا جائے۔ ان تاثرات کے تار و پود سے جو مرقع بنتا ہے اس کی مثال ایک رختِ مشجر کی سی ہے جس کے رنگوں کا تنوع اور دلآویزی بے اختیار دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

میرے دورے کا مقصد تھا پاکستان کی صنعتوں کا مشاہدہ۔ سرکاری مطبوعات، رپورٹوں اور اعداد و شمار سے قطع نظر کرکے ان کا بچشم خود مطالعہ، خود کاریگروں سے باتیں کرنا اور ان کی زبان سے ان کے مسائل سننا چاہتا تھا۔ میں بطور خود یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اگر کوئی بڑا زرعی ملک چشم زدن میں صنعتی انقلاب لانے کی کوشش کرتا ہے تو کیا ہوتا ہے۔ اسے کن مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ میں نے کراچی اور لاہور میں بڑے بڑے اور باقاعدہ

ج ہزار سالہ فنی و تہذیبی ورثہ

مغربی پاکستان کی تاریخی صناعیوں کے مختلف فنی نوادر

مغربی پاکستان کے شہر

پشاور

بہاول پور

لاہور

کوئٹہ

حیدر آباد

کارخانے دیکھے تھے جن کی پشت پر لاکھوں روپیہ سرمایہ ہے اور کام ماہر کاریگروں کی نگرانی میں ہوتا ہے۔ ان کاریگروں میں سے بہت سے تو ہیں بھی باہر کے۔ لیکن مجھے یہ محسوس ہوا کہ اصل پاکستان یہ نہیں ہے، پاکستان تو دھندلے افق سے پرے قدامت و کہنگی کے پردوں میں مستور ہے جہاں چھوٹی چھوٹی گلیوں میں کرگھوں کی کھٹا کھٹ کی آوازیں گونجتی ہیں۔ لوگ کمانوں کی ڈوریوں سے خراد چلاتے ہیں اور پاؤں کی انگلیوں میں سیدھے سادے اوزار تھام کر ان سے اسی طرح کام لیتے ہیں جو ان کے آبا و اجداد کا قرنہا قرن سے طریقہ رہا ہے۔

اسی خیال سے میں اپنی نو خرید فورڈ کونسل کار میں اپنی بیوی اور بچوں کو ساتھ لے کر اس سفر پر روانہ ہوا۔ ہم نے اپنی ضرورت کا سب سامان بستروں سے لے کر کھانا پکانے کے برتنوں تک اپنے ساتھ رکھ لیا اور ایک نامعلوم منزل کی تلاش میں ایک اجنبی راہ پر رواں ہو گئے۔ یہ نامعلوم منزل کیا تھی، وہ وسیع سرزمین جس میں جابجا صحرا آتے ہیں، جو پانچ بڑے دریاؤں کی وادی ہے جس میں دریائے سندھ کا راج ہے، جو قدیم تہذیبوں کا گہوارہ ہے جس کے نام پر اس برعظیم کا نام رکھا گیا تھا۔ لیکن ٹھہریئے۔ ذہن میں کچھ اور یادیں، کچھ اور نقوش ابھرنے لگے ہیں۔ یہ دیکھئے مغل بادشاہوں کے عظیم الشان محل اور خوبصورت باغات جو قدیم فاتحین کے مقبروں کا احاطہ کئے ہوئے ہیں، جو رومان اور تاریخ کی فضائیں محصور ہیں۔ اور یہ رہے سیالکوٹ کے بازار جن میں لوگوں کی بھیڑ لگی ہے اور جن میں سے گھوڑے کی رفتار سے گزرنا پڑ رہا ہے، مبادا ہماری ٹھوکر سے کسی بیچارے کی پھلوں کی بھری دکان الٹ جائے۔ کاریگر زمین پر ہی پھسکڑا مارے بیٹھے ہیں اور اپنی کاریگری کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ یہ ہسپتالوں کے لئے جراحی کے آلات بن رہے ہیں، یہ موسیقی کے ساز ہیں، یہ سامان ٹینس کا ہے، یہ کرکٹ کا۔ لیجئے منظر بدلتا ہے۔ یہ ایک صوبائی وزیر کے اعزاز میں دعوت ہو رہی ہے۔ طرح طرح کی پگڑیاں اور ٹوپیاں اور بہت سی لمبی داڑھیاں نظر آ رہی ہیں۔ اس دعوت میں بس ہمیں ہم یورپین ہیں۔

اور پھر وہ مزے کے مختصر لمحات جب ایک اتوار کو راولپنڈی سے ہم لیکایک جہاز میں برف پوش پہاڑیوں کی فصیلوں کے اس پار، دنیا کی تیسری سب سے بڑی چوٹی کے دامن کا چکر کاٹ کر گلگت میں جا اترتے ہیں۔ یہ ایک شنگریلا۔ یا خوابوں کی دنیا ہے جو دور کوہستان ہمالیہ کی پرسکون آغوش میں واقع ہے۔ پھر وہ دن بھی یاد آتا ہے جو عہد عتیق کی بستی ٹیکسلا میں بدھ بھکشوؤں کے نقش کردہ کتبوں اور ایک قدیم شہر عتار کے خرابوں کے درمیان گزرتا ہے۔

اور پشاور کی وہ پرکیف شام جبکہ خوب کباب اڑے تھے اور مقامی لیبر ایکسچینج کے مینجر سے پرلطف گفتگو، پھر سرحد کے قبائلیوں کے ہاں جانے کا منظر بھی یاد آتا ہے جو یورپ کے اسلحہ کی اتنی مشاقی سے نقل اڑاتے ہیں کہ اصل نقل میں تمیز نہیں ہو سکتی؟ وہ درہ خیبر میں سے گزرنے کی کیفیت جہاں چٹانوں کی عظمت دل پر ایک سحر طاری کر دیتی ہے اور اس حد سے ادھر لنڈی کوتل کی جھلک۔ بعد ازاں چودھویں پنجاب رجمنٹ کے افسروں کے میس میں ایک پرتکلف دعوت، جہاں کی مہمان نواز فضاؤں میں سکون ہی سکون ہے۔ کہیں قبائل کے جھگڑوں کی بازگشت سنائی نہیں دیتی۔

اور وہ پاکستان کے میدانوں میں سردیوں کے دن گزار کر خانہ بدوشوں کے قافلے واپس چلے جا رہے ہیں۔ ان قافلوں کا سلسلہ کہیں ختم ہوتا معلوم نہیں ہوتا۔ ان قافلوں میں بے نقاب لڑکیاں اور عورتیں ہیں یا جن کی سرمگیں آنکھوں میں ستاروں کی جھلک ہے۔ ان کے اونٹ بھدی چال چل رہے ہیں، جن کی پیٹھوں پر دونوں طرف گونیں ہیں، اور گونوں میں بچے۔ ان اونٹوں کے بچے بھی آہستہ آہستہ ساتھ ساتھ چلے جا رہے ہیں۔

نوشہرے کے کاغذ کے کارخانے میں بھی ہمارا جانا ہوا جس کے بیلن ساٹھ ساٹھ ٹن کے ہیں اور دیوہیکل مشینیں ابھی نصب کی جا رہی ہیں۔ مردان کا شکر صاف کرنے کا کارخانہ بھی دیکھا۔ اس کی فیل پیکر مشینیں دیکھ کر بھی عقل دنگ رہتی ہے۔ اس کے بھپکے اور چکر بیس بیس چالیس چالیس فٹ قطر کے ہیں۔

اٹک کا بھاری بھرکم آہنی پل بھی دیکھنے کی چیز ہے جو اٹک کے قدیم قلعے کے دامن میں واقع ہے۔ اس پل کے شہتیروں معلوم ہوتا ہے کہ پیٹھ کے بل لیٹے ہیں۔ ان کے اوپر سے ریل گزرتی ہے اور نیچے سے سڑک۔ وادئ سندھ سے نکل کے ایک سڑک باقی ہے جس کی چٹانیں اور چشمے سکاٹ لینڈ کی یاد دلاتے ہیں لیکن دریا کے پر

تارکول کی سڑک ختم ہو جاتی ہے اور ہم پہاڑی راستے پر بے طرح ہچکولے کھاتے ہوئے ایک گاؤں میں سے گزر کر ایسی جگہ پہونچتے ہیں کہ سامنے بس دریا ہیں اور ایک میدان۔ اب ہم ہیں اور دریا کا چکر کھاتا ہوا بہاؤ۔ کار یکایک رک جاتی ہے اور پانی اس دروازے سے داخل ہو کر دوسرے دروازے سے بہنے لگتا ہے۔ اب ہم دریا کے بیچوں بیچ پھنسے کھڑے ہیں۔ دیہات کے لوگ جمع ہو جاتے ہیں اور ہمیں آکر نکال لیتے ہیں۔ تیز سری ندی سے تو ایک جیپ ہمیں رسہ باندھ کر گزارتی ہے۔ اب انجن پھر چل نکلتا ہے اور ہم بالآخر ہری پور پہونچتے ہیں اور وہاں کے مہمان خانے کی بے رنگ دیواروں کے دامن میں آرام کرتے ہیں اور اپنے بستروں کے سوکھنے کا انتظار کرتے ہیں۔

اب ہم اس سفید رنگ کی صاف ستھری عمارت کو دیکھتے ہیں جس میں تار اور ٹیلی فون وغیرہ کے عملے کی تربیت کا مرکز قائم ہوگا۔ پھر آہستہ آہستہ چکر کاٹتے ہوئے گھوڑا گلی پہونچتے ہیں۔ ہر چہار طرف بلند و بالا پہاڑ نظر آتے ہیں، جن کی رفعت کا مقابلہ جزائر برطانیہ کے کوہستان نہیں کرسکتے۔ ایک گہر آلود شام کو لکڑی کے لٹھوں کا سہانا الاؤ اور گرج چمک کا طوفان بھی یاد آتا ہے۔ اگلے روز ہم برق و باراں کے لامتناہی طوفان میں سے گزرتے ہوئے لاہور کے پُرسکون اور مہمان نواز ماحول میں پہونچتے ہیں اور منٹگمری روانہ ہونے سے پہلے چند روز وہاں مزے میں گزارتے ہیں۔ منٹگمری کے بعد رینالہ خورد کے باغات کی سیر بھی کرتے ہیں جہاں پھلوں کے رس کی مشہور فیکٹری ہے۔ اس فیکٹری کے منیجر کی زندگی پر رشک آتا ہے، جن کا وسیع اور جدید وضع کا بنگلہ جیکرنڈا کے درختوں میں گھرا ہوا ہے۔

اگلے روز ہماری کار چار سو میل کی مسافت طے کرتی ہے ان چار سو میں سے ایک سو میل تو بہاولپور کی فرسودہ خشتی سڑکوں کا ہے جہاں کار چلتی نہیں رینگتی ہے۔ اب پھر ہم گرد و غبار اور سفر کی تکان کے مارے سکھر کے پُرتکلف انسپکشن بنگلے میں پناہ لیتے ہیں۔ وہاں سے چلے تو حیدرآباد کے جمخانہ کلب اور ریسٹ ہاؤس میں پہنچے جہاں چینی کی پچی کاری تو ہر طرف نظر آتی ہے لیکن پنکھوں کے علاوہ ہر چیز ناکارہ ہے۔ بالآخر ہمارا قافلہ کراچی پہونچتا ہے جہاں ہمارا نیا آرام دہ گھر ہمارا انتظار کر رہا ہے اور مالک مکان تواضع سے ہمیں ممنون کرتا ہے۔

سفر تو ختم ہوا، اس سے ہم نے سیکھا کیا ہے؟ ہماری جستجو ہمیں مردان کے شکر صاف کرنے کے عظیم الشان کارخانے سے لے کر لاہور کی ایک دور افتادہ گلی کے اس سائبان تک لے گئی جہاں ایک لوہار لکڑی کے کوئلوں کی بھٹی کے پاس بیٹھا ہوزری کی ان انتہائی نازک اور پیچیدہ مشینوں کے پرزے ڈھالتا نظر آیا جن پر ہم نے سیالکوٹ میں موزے اور سوئیٹر بنتے دیکھے تھے۔ اس سے ہم نے کیا تاثرات حاصل کئے؟ ان لوگوں کو، ان مشینوں کو، ان عمارات کو اور ان مناظر کو دیکھ کر اور اس سارے تجربے سے کیا نتائج اخذ کئے؟ ان کی کوئی ٹھوس اساس ہونی چاہیئے۔ ان سے کوئی اصول مرتب ہونا چاہیئے، ان سے کوئی انداز نظر دریافت ہونا چاہیئے۔ آخر ملک کی بنی ہوئی شکر کیوبا سے درآمد کردہ شکر کا مقابلہ کیوں نہیں کر پاتی؟ مال کی تیاری کی لاگت اتنی زیادہ کیوں ہے؟ اس کی وجہ ہمیں یہ بتائی گئی کہ دیسی گنے سے شکر کم حاصل ہوتی ہے لیکن لائلپور کے زراعتی کالج میں ایک فاضل ماہر نباتیات نے بتایا کہ گنے کے پودے پر روز بروز نئے تجربے کئے جا رہے ہیں اور پیوند لگا کر گنے کی ایسی نسلیں پیدا کی جا رہی ہیں جن میں شکر کا عنصر زیادہ ہوگا۔ لائلپور میں ہم نے کپاس کی بھی ایسی اقسام دیکھیں جو مصر اور امریکہ کی کپاس سے کسی طرح کمتر نہیں۔ گویا اب پاکستانی کپاس سے پاکستان ہی میں نفیس اور باریک کپڑا تیار ہو سکیگا۔

میرے دورے کا اصل مقصد صنعتی تربیت، خصوصاً نو آموز کاریگروں کی تربیت کے انتظامات کا مطالعہ کرنا تھا۔ بعض جگہ تو ضرور میں نے نئے لوگوں کو عملاً کام سیکھتے دیکھا، لیکن کہیں کہیں مایوسی ہوئی۔ جب تک باقاعدہ تنظیم اور منصوبے کے تحت اور ماہرین کی کماحقہ نگرانی میں کاریگروں کو کام کی عملی تربیت نہیں دی جاتی صنعتیں آگے نہ بڑھ سکیں گی۔ مغربی ملکوں نے بڑے تلخ تجربوں کے بعد یہ گر جانا ہے کہ کاریگروں کی عملی تربیت کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ یہ کمی کسی اور طرح پوری نہیں ہو سکتی۔ پیچیدہ اور نازک مشینوں کو ناتربیت یافتہ لوگوں پر چھوڑنا تباہی کو دعوت دینا ہے۔ صنعتوں کے لئے اگر جدید قسم کی مشینوں پر روپیہ لگانا ضروری ہے تو کاریگروں کی عملی تربیت پر خرچ اس سے زیادہ ضروری ہے۔ کیونکہ

(باقی صفحہ ۴۳ پر)

نویدِ وحدت

ڈاکٹر خان صاحب

میرے نزدیک یہ بڑا مبارک موقع ہے کہ میں مغربی پاکستان کو ایک یونٹ بنانے کے بارے میں آپ سے مخاطب ہوں۔ اس کے دو سبب ہیں۔ ایک تو یہ کہ ریڈیو پاکستان سے یہ میری پہلی تقریر ہے۔ دوسرا یہ کہ ایک بہت بڑے تجربے کو کامیاب بنانے کی خدمت میرے سپرد کی گئی ہے۔ وہ تجربہ ہے ایک ایسی قوم کو اتحاد کے ذریعے مضبوط بنانا جو اب تک فرقوں، طبقوں اور گروہوں میں بٹی رہنے کی وجہ سے کمزور ہو چکی تھی۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ موجودہ صوبوں اور ریاستوں کو ملا کر مغربی پاکستان کو ایک یونٹ بنانے کی حمایت پورے ملک نے کی ہے۔ ملک کے ہر گوشے سے، قبائلی علاقوں سے، سندھ اور بلوچستان کے دور افتادہ حصوں سے مجھے بے شمار پیغام آئے ہیں جن میں ایک یونٹ کی مکمل حمایت کا یقین دلایا گیا ہے۔ یہ ہماری قوم کی سیاسی بیداری کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ مغربی پاکستان کا اتحاد ہماری سیاسی اور اقتصادی بحالی کا مؤثر علاج ہے۔

قومی نصب العین

میں ایک بات عرض کروں۔ وہ لاکھوں انسان جنہوں نے پچھلی نصف صدی میں آزادی کی خاطر مصیبتیں، تکالیف اور قربانیاں دیں۔ ان کی نظر میں آخر کوئی نصب العین بھی تو تھا۔ وہ ایسے وطن کا خواب دیکھ رہے تھے جہاں وہ خود اپنے آقا ہوں گے۔ جہاں سماجی برابری ہوگی۔ جہاں قوم کے ہر بچے اور بچی کو ایک جیسے موقعے حاصل ہوں گے۔ جہاں ایسی حکومت ہوگی جس کا مقصد حکومت کی بجائے خدمت ہوگا۔ جہاں حکومت سختی اور ظلم کی بجائے لوگوں کی بہتری اور بہبودی کے لئے کام کرے گی۔

بدیسی حکومت نے آزادی کی جدوجہد کو کچلنے کے لئے شہنشاہیت کا ہر حربہ استعمال کیا۔ بڑے بڑے جیل خانے بنائے جہاں سیاسی قیدیوں کو معمولی مجرموں سے بدتر زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ ہزاروں کو غدار کہہ کر گولی مار دی گئی یا پھانسی دے دی گئی۔ لیکن ظلم اور سزا کا یہ ہنگامہ آزادی کی جدوجہد کو کم نہ کر سکا۔ اس کے بعد شہنشاہیت پرست حکومت کو بڑھتی ہوئی تحریکِ آزادی کی راہ میں روڑا اٹکانے کی ایک انوکھی تدبیر سوجھی۔ اس نے سوچا کیوں نہ ملک میں ایک ایسا طبقہ پیدا کر دیا جائے جو ہماری حکومت کی برکتوں اور نعمتوں کا پروپگنڈا کرے، تحریکِ آزادی کی مخالفت کرے اور آنے والے معرکوں میں حکومت کا ساتھ دے۔ اس پالیسی کو بڑی احتیاط اور توجہ سے چلایا گیا، نئی سیاسی حد بندیاں کی گئیں، ملک کو پنجاب، سندھ، شمال مغربی سرحدی صوبہ، بلوچستان اور دوسرے علاقوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس کے بعد ان تمام علاقوں میں ہر قسم کا اختلاف اور تعصب پیدا کیا گیا۔ پھر اسے ہوا دی گئی بعض علاقوں کو جان بوجھ کر دوسروں سے پیچھے رکھا گیا۔ اس طرح انہوں نے ملک کی اقتصادی ترقی کو اپنی سیاسی خود غرضی پر قربان کر دیا۔

جن لوگوں نے تحریکِ آزادی کو نقصان پہنچانے میں ان کا ہاتھ بٹایا ان کو خطابوں سے نوازا گیا۔ جن خاندانوں نے حکومت کی وفاداری کا ثبوت دیا ان کے بچوں کو سرکاری ملازمتیں دی گئیں۔ جن لوگوں کو سرکاری عہدے دیئے گئے ان کو مقامی لوگوں پر سختی اور جبر کے ساتھ حکومت کرنے کی تعلیم دی گئی۔ سرکاری ملازموں کا ایک الگ طبقہ بنا دیا گیا۔ اور انہیں عام لوگوں سے بالکل بے تعلق رکھا گیا۔ پولیس کا محکمہ ان لوگوں کو دبانے کا ذریعہ بن گیا جو حکومت کے نزدیک سیاسی مفسد تھے اور اس طرح عوام کے دلوں میں اس کا خوف چھا گیا۔

ان حالات نے ان سیاسی لیڈروں اور سیاسی کارکنوں کی راہ کو

اور زیادہ دشوار بنا دیا۔ جو غیر ملکی حکومت کا جوا کندھوں پر سے اتار پھینکنے کی کوشش کر رہے تھے۔

میں نے ایک خاص غرض سے قریبی تاریخ کے واقعات دہرائے ہیں۔ ہماری تحریک کا آخری مقصد صرف غیر ملکی اقتدار سے چھٹکارا پانا ہی نہ تھا۔ ہمارا اصل مقصد تو اپنی آئندہ نسلوں کے لئے ایک مضبوط وطن کی عمارت تعمیر کرنا تھا۔ غیر ملکی اقتدار سے آزادی اس مضبوط عمارت کا سنگ بنیاد تھا۔ یہ مقصد اسی طرح پورا ہو سکتا تھا کہ اجتماعی کوششیں کی جائیں اور ملک کی بہتری پر ذاتی فائدوں کو قربان کیا جائے۔ قوم میں یکجہتی پیدا کرنا ہمارا نصب العین تھا۔ اور قوم کی یکجہتی ہی وہ چیز ہے جو ہمیں ایک قوم کی حیثیت سے ہمیشہ کے لئے زندہ رکھ سکتی ہے۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء تحریک آزادی کے لاکھوں سرفروشوں کے لئے بڑی مسرت کا دن تھا۔ آخر غیر ملکی اقتدار کا دور ختم ہو گیا اور ہمارے آباد و اجداد کی اس سرزمین کو ایک نئے دور کی صبح نے روشن کر دیا لیکن پاکستان کے قیام پر ہماری جد و جہد ختم نہیں ہوئی۔ پاکستان کو مضبوط بنانے کا عظیم تر کام باقی تھا۔ اگرچہ غیر ملکی حکومت ختم ہو چکی تھی مگر اس کی چھوڑی ہوئی روایتیں اسی طرح موجود تھیں۔ جن لوگوں کو ملک کی آزادی کے بعد شکست اٹھانی پڑی وہ موقعے کی تاک میں تھے اور آخر وہ صوبائی اور علاقائی مفاد کے نگہبانوں اور حامیوں کا بہروپ بھر کے سامنے آئے۔ پچھلے سات سال کی تاریخ سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ پاکستان کی سالمیت کے لئے سب سے بڑا خطرہ صوبائی تعصب ہے۔ صوبائی تعصب نے آئین سازی کے کام کو معطل کر دیا۔ عوام میں مایوسی اور بے اطمینانی پھیلائی اور قومی ترقی کے راستے میں رکاوٹیں ڈالیں۔ صوبائی تعصب کی وجہ سے دھڑے بندیاں ہوئیں، پھوٹ پڑ گئی اور قوم کی حیثیت سے ہمارے وجود کو خطرہ پیدا ہو گیا۔ پچھلے سال دسمبر میں پاکستان کے گورنر جنرل ہز ایکسلنسی جناب غلام محمد کی حکومت نے قوم کے اتحاد کو مضبوط کرنے کے لئے صوبائی حد بندیوں کو توڑ دینے کا تاریخی فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ ہمارا بالکل اندرونی انتظامی معاملہ ہے اور پاکستان کی خارجی پالیسی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ پاکستان کی خارجی پالیسی ہمیشہ یہ رہی ہے اور رہے گی کہ دوسرے ملکوں سے اور ہمسایہ ملکوں سے خاص طور پر دوستانہ تعلقات رکھے جائیں۔

اس کے فوراً بعد ایک انتظامی کونسل مقرر کر دی گئی جس کے چیئرمین پنجاب کے گورنر جناب مشتاق احمد گورمانی ہیں۔ ایک یونٹ کی اسکیم جاری کرنے کی ذمہ داری اس کونسل کے سپرد کی گئی۔ پورے مغربی پاکستان کے لئے اطمینان بخش انتظامی مشینری کا خاکہ تیار کرنا آسان کام نہ تھا۔ مگر اس کونسل نے حیرت انگیز تیز رفتاری کے ساتھ بہت ہی کم مدت میں یہ کام انجام دیا۔ سول سروس کے لوگوں نے بڑی قابلیت اور سلیقے کے ساتھ کونسل کی مدد کی۔ میں ان کے کام کی بہت قدر کرتا ہوں۔

اب صورت حال یہ ہے کہ تمام اہم عہدوں پر لوگوں کے تقرر کا اعلان کیا جا چکا ہے اور لاہور میں حکومت کا صدر مقام بنانے کے تمام انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔ جیسے ہی دستور ساز اسمبلی اس اسکیم کو منظور کرے گی۔ مغربی پاکستان کی حکومت کا افتتاح ہو جائے گا۔

ہم کبھی کبھی دبے دبے لہجے میں بے اطمینانی کی آواز بھی سنتے ہیں۔ بے اطمینانی کا اظہار کرنے والوں میں بھی تو وہ خود غرض لوگ ہیں، جو علاقائی مفاد کی حمایت کر کے فائدہ اٹھا رہے تھے اور انہیں ایک یونٹ میں اپنے ذاتی مفاد اور موقع پرستی کی موت نظر آ رہی ہے بعض وہ لوگ ہیں جو شک اور شبہ میں مبتلا ہیں اور ڈرتے ہیں کہ ہمارے زیادہ ترقی یافتہ بھائی ہم پر چھا نہ جائیں۔ میں ان سب کو یقین دلاتا ہوں کہ مغربی پاکستان کی حکومت ان کے حقوق اور ان کی بہتری اور بہبودی پر خاص توجہ دے گی۔ ان کو تعلیمی اور اقتصادی اعتبار سے دوسرے لوگوں کی سطح پر لانے کے لئے موثر قدم اٹھائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ مغربی پاکستان کے اتحاد اور وحدت سے خاص فائدہ بلوچستان اور سندھ کے لوگوں کو پہنچے گا۔ یہ لوگ پورے مغربی پاکستان کے تمام وسائل میں برابر کے شریک ہو جائیں گے۔

سماجی، ذہنی اور اقتصادی وحدت

واقعہ یہ ہے کہ مغربی پاکستان سماجی، ذہنی اور اقتصادی اعتبار سے ایک وحدت ہے موجودہ صوبائی تقسیم کو قائم رکھنے کی کوئی وجہ نہیں۔ مغربی پاکستان کے اتحاد سے سماجی اور اقتصادی شعبوں میں بڑی اچھی تبدیلیاں اور خوشگوار انقلاب آ جائے گا۔

صوبائی حد بندیوں کے ختم ہو جانے کی وجہ سے سیاسی جماعتوں کا احاطہ وسیع ہو جائے گا۔ اقتصادی پروگرام کو وسیع تر پیمانے پر ترتیب دینے کا موقع ملے گا۔

اب میں کچھ باتیں سرکاری ملازموں سے کہنا چاہتا ہوں۔ مجموعی طور پر تمام سرکاری ملازموں نے پاکستان میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں ایک

مغربی پاکستان کی سرسبز وادیاں

جھیل سیف‌الملوک (کاغان)　　　　آبرنگ: سردار محمد

یونٹ میں ہم ڈسٹرکٹ افسروں کو زیادہ سے زیادہ اختیار دے رہے ہیں۔ اب انہیں موقع ملے گا کہ وہ زیادہ جوش کے ساتھ عوام کی خدمت کریں اور یہ ثابت کر دکھائیں کہ ان پر جو اعتماد کیا گیا ہے، وہ بجا ہے۔ ہمارے اکثر عوام سادہ اور تعلیم سے بے بہرہ ہیں۔ افسروں کو ان کے ساتھ ضبط اور برداشت سے کام لینا چاہیئے۔ انہیں اس طرح کام کرنا چاہیئے جیسے وہ عوام کے دوست ہیں اور عوام کی بھلائی اور ترقی ہی ان کا کام ہے۔ ہم افسروں کے کام کو عوام کی خدمت کے معیار پر جانچیں گے۔

سرکاری افسر پیشہ ور سیاسی لیڈروں (PROFESSIONAL POLITICIANS) کے بے جا دباؤ سے آزاد ہوں گے۔ انہیں اپنے جانشینوں اور اپنے آنے والوں کے لئے ایک مثال قائم کرنی چاہیئے۔

رائے عامہ کے رہبروں سے اپیل

میں رائے عامہ کے لیڈروں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ سامنے آئیں اور تعمیری کاموں کی طرف لوگوں کی رہبری کریں۔ یہ ظاہر ہے کہ اخبار عوامی مفاد کے نگہبان ہوتے ہیں اور آزاد رائے عامہ ترقی کی روح ہوتی ہے۔ ہم اخباروں کی آزادی کا اس وقت تک احترام کرینگے جب تک وہ ملک کی حفاظت اور سالمیت کے لئے خطرہ نہ بن جائیں۔ پاکستان زبردست قربانیوں کے بعد حاصل ہوا ہے۔ موجودہ نسل کے کندھوں پر بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ اگر پاکستان کو مضبوط کرنا ہے تو ہمیں اپنے آپ کو بنگالی، پنجابی، سندھی اور پٹھان سمجھنا ترک کر دینا ہوگا ہمیں صرف پاکستانی ہونا چاہیئے۔

پاکستان کے استحکام کے سلسلہ میں سب سے بڑی کوشش اور سب سے اہم قدم مغربی پاکستان کا اتحاد اور وحدت ہے۔ اس کوشش کو کامیاب بنانا ہمارا فرض ہے۔ اس کوشش کی کامیابی ہی سے قومی وحدت پیدا ہوگی اور پاکستان مضبوط بنے گا۔ ذاتی طور پر مجھے اس بات پر فخر ہے کہ پاکستان کے استحکام کے لئے کوشش کرنے کا بیش بہا موقع مجھے ملا ہے۔ مجھے اس بات کا پورا احساس ہے کہ جو کام میرے سپرد کیا گیا ہے وہ بہت عظیم ہے لیکن میرے ہموطنوں نے حمایت کا اتنا یقین دلایا ہے کہ میں ان کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو جوان محسوس کرنے لگا ہوں۔

(بشکریہ ریڈیو پاکستان)

ہمیشہ سے میری یہ کوشش رہی ہے کہ مسلمانوں میں اتفاق و یکجہتی پیدا ہو جائے اور مجھے امید ہے کہ اس عظیم مملکت پاکستان کی تعمیر و ترقی کا جو کام اس وقت ہمارے سامنے ہے اسے دیکھتے ہوئے سب کو اس بات کا کامل احساس ہوگا، کہ اس وقت اتحاد باہمی کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ ہم مسلمانوں کا خدا ایک ہے، قرآن ایک ہے، رسولؐ ایک ہے اس لئے ہمیں ایک واحد قوم کی طرح متحد ہو کر رہنا چاہئے۔ ایک پرانی کہاوت ہے، کہ اتفاق میں طاقت اور نااتفاقی میں ہلاکت ہے۔

مجھے یقین ہے کہ آپ یہ بخوبی سمجھتے ہوں گے کہ پاکستان [illegible] کے دو حصے ہوں اور وہ بھی کافی فاصلہ پر۔ آپس کا میل جول اس کے شہریوں کا خواہ وہ کسی حصہ سے تعلق رکھتے ہوں، باہمی اتحاد و یکجہتی نہ صرف اس کی ترقی کے لئے بلکہ اس کی بقا کے لئے کس قدر ضروری ہے۔ پاکستان مسلمانوں کے اتحاد کا مظہر ہے اور اسے ایسا ہی رہنا چاہئے۔ سچے مسلمانوں کی حیثیت سے آپ کا فرض ہے کہ جی جان سے اس کی پاسبانی و حفاظت کریں۔ اگر ہم یہ سمجھنے لگیں کہ ہم پہلے بنگالی۔ پنجابی۔ سندھی وغیرہ ہیں۔ اور مسلمان و پاکستانی محض اتفاقیہ تو جان لیجئے کہ پاکستان کا شیرازہ بکھر جائے گا۔

قائد اعظم محمد علی جناحؒ

قطرے سے گہر ہونے تک

۱۰۔ نومبر ۱۹۵۴ء: ریاست خیرپور نے ایک یونٹ کی تجاویز کی حمایت کی۔

۲۲۔ نومبر ۱۹۵۴ء: وزیر اعظم پاکستان نے مغربی پاکستان کو متحد کرنے کی اسکیم کے بارہ میں تقریر نشر کی۔

۲۵۔ نومبر ۱۹۵۴ء: صوبہ سرحد کی مجلس قانون ساز نے ایک یونٹ کی موافقت میں بہ اتفاق رائے قرارداد منظور کی۔

۲۹۔ نومبر ۱۹۵۴ء: بلوچستان کے شاہی جرگہ نے ایک یونٹ پلان کی حمایت کی۔

۳۰۔ نومبر ۱۹۵۴ء: مجلس قانون ساز پنجاب نے بہ اتفاق رائے ایک یونٹ پلان کی تائید کی۔

۶۔ دسمبر ۱۹۵۴ء: ریاست چترال کی مشاورتی کونسل نے ایک قرارداد کے ذریعہ مغربی پاکستان کو متحد کرنے کی حمایت کی۔

۱۱۔ دسمبر ۱۹۵۴ء: مجلس قانون ساز سندھ نے بھاری اکثریت سے ایک یونٹ پلان کی تائید میں قرارداد منظور کی۔

۱۴۔ دسمبر ۱۹۵۴ء: گورنر جنرل نے ایک یونٹ کے سلسلہ میں ریاستی حکمرانوں، مرکزی وزراء، صوبوں کے گورنروں اور چیف منسٹروں اور بڑے افسروں کی کانفرنس کا افتتاح کیا۔

۱۵۔ دسمبر ۱۹۵۴ء: گورنر جنرل نے مغربی پاکستان کی انتظامی کونسل کے انعقاد کے متعلق احکام جاری کئے۔

۱۸۔ دسمبر ۱۹۵۴ء: مغربی پاکستان کی انتظامیہ نے پہلا اجلاس کیا۔ مسٹر ایم اے گرمانی اس کے صدر منتخب ہوئے۔

۲۔ جنوری ۱۹۵۵ء: بلوچستان کی ریاستی یونین نے انضمام کی تائید کی۔ ریاست بہاولپور اور خیرپور نے بھی اس کی تائید کی۔

۲۰۔ مارچ ۱۹۵۵ء: گورنر جنرل نے ایک آرڈیننس جاری کیا جس کی رو سے مغربی پاکستان کے صوبوں کو ایک یونٹ میں ضم کر دیا گیا۔

۴۔ اپریل ۱۹۵۵ء: مغربی پاکستان کی انتظامی کونسل نے اپنی سوچ بچار ختم کی۔

۵۔ اپریل ۱۹۵۵ء: مسٹر ایم اے گرمانی، مغربی پاکستان کے نامزد گورنر اور ڈاکٹر خان صاحب وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔

۱۳۔ اپریل ۱۹۵۵ء: فیڈرل کورٹ نے فیصلہ صادر کیا کہ گورنر جنرل اور مجلس دستور ساز باہمی طور پر دستوری معاملات طے کر سکتے ہیں۔

۱۰۔ اگست ۱۹۵۵ء: سردار امیر اعظم خاں نے مغربی پاکستان کے قیام کے متعلق بل کا نوٹس دیا۔

۲۰۔ اگست ۱۹۵۵ء: سردار امیر اعظم خاں نے مجلس دستور ساز میں بل پیش کیا۔

۲۴۔ اگست ۱۹۵۵ء: بل کے عام اصولوں پر بحث کا آغاز۔

۱۶۔ ستمبر ۱۹۵۵ء: بحث کا اختتام۔ اس اجلاس میں، جو ۶۲ گھنٹہ جاری رہا، ۴۰ ارکان نے حصہ لیا اور مجلس نے دفعہ وار بحث کا آغاز کیا۔ بل کی ۲۰۰ ترمیمیں پیش کی گئیں، جن میں سے ۲۴ منظور ہوئیں۔

۲۹۔ ستمبر ۱۹۵۵ء: تمام دفعات ترمیموں کے ساتھ منظور کر لی گئیں بحث ۵۴ منٹ تک جاری رہی۔ دوسری خواندگی مکمل ہو گئی۔ تیسری خواندگی کا آغاز ہوا۔ مسٹر یوسف ہارون نے سب سے زیادہ ترمیمیں پیش کیں۔

۳۰۔ ستمبر ۱۹۵۵ء: مجلس نے اس کی کامیابی کی دعا کے ساتھ بل منظور کیا۔

"نقشہائے رنگ رنگ"

ابواللیث صدیقی

مولانا حالی نے پہلی مرتبہ "یادگارِ غالب" میں غالب کی شخصیت اور شاعری کے مطالعہ میں ان کے فارسی کلام کی اہمیت پر زور دیا اور خسرو اور بیدل کے بعد مرزا کو ہندوستان میں فارسی کا آخری بڑا صاحب کمال شاعر اور انشا پرداز قرار دیا۔ اگر اقبال کی فارسی شاعری کو الگ کرلیں تو حالی کا قول بالکل درست معلوم ہوتا ہے لیکن یہ عجیب حادثہ ہے کہ خود مرزا غالب کے دعوے اور حالی کی تشان دہی کے باوجود مرزا کی اردو شاعری اور خطوط کے مقابلہ میں اُن کے فارسی کلام نظم ونثر پر بہت کم توجہ دی گئی۔ ڈاکٹر لطیف اور شیخ محمد اکرام نے اس کی اہمیت کو محسوس کیا۔ اور موجودہ نسل کو غالب کی فارسی شاعری اور نثر کی روح سے روشناس کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ظاہر ہے کہ اسے پوری طرح روشناس کرنے کے لئے ابھی اور بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے فارسی کا زوال اور اس ملک میں آہستہ آہستہ ادبی مذاق کی تبدیلی قابلِ غور ہے۔ مغلوں کے عہدِ حکومت میں فارسی صرف سرکاری اور عدالتی زبان ہی نہ تھی، اس کی ایک تہذیبی حیثیت اور اہمیت بھی تھی اور اسکا اثر خود اُردو کی نشوونما پر پڑا تھا، شمالی ہند کے مقابلہ میں دکن میں اردو شعر وادب کی نشوونما جلد بھی ہوئی اور شدت کے ساتھ بھی کیونکہ فارسی کا درباری اثر وہاں کچھ کم تھا۔ دکنی کو شاہی سرپرستی حاصل تھی اور دکنی فرمانروا خود اس زبان میں شعر کہتے تھے، لیکن شمالی ہند میں مغلوں کے سیاسی زوال کے ساتھ ساتھ فارسی کا زور بھی ٹوٹنے لگا اور نتیجہ یہ ہوا کہ انیسویں صدی کے آغاز تک ایسے بہت سے لوگ نظر آنے لگے جو فارسی سے آشنا نہ تھے اور ان کی وجہ سے وہ لوگ بھی جو بذاتِ خود اُردو کو منہ لگانے کے قابل نہ سمجھتے تھے مجبوراً اسے اختیار کرنے لگے۔ شاہ عبدالقادر نے قرآن شریف کے ترجمے میں بطور معذرت یہی خیال ظاہر کیا ہے۔ ادھر فارسی کی جگہ انگریزی کی سیاسی اور سماجی اہمیت بڑھتی جارہی تھی اور اُردو کے ساتھ ساتھ انگریزی کو بھی فروغ ہونے لگا۔ یہاں تک کہ ایک دور ایسا آیا کہ جو تہذیبی حیثیت اس ملک میں فارسی کو حاصل تھی وہ انگریزی کو نصیب ہوئی، انگریزی پڑھنے والوں کو سرکاری ملازمتوں کے حصول میں آسانی تھی اور انگریزی کے ہی ذریعے سے ہندوستانیوں کو انگریزوں سے تقریب کا شرف حاصل ہوسکتا تھا، اردو پھر بھی ایک ملکی زبان تھی اور انگریزی کا فروغ اس کی قوت اور حلقۂ اثر میں خارج ہونے کے باوجود اسے مٹا نہیں سکتا تھا، اُدھر انیسویں صدی کے نصف اول میں ہی اردو سرکاری زبان قرار پائی، پریس کا رواج ہوا، اخبار اور رسالے نکلنے لگے یہاں تک کہ سرسیدؒ اور ان کے رفقا کے دور تک پہنچتے پہنچتے اردو کی علمی اور تہذیبی حیثیت بھی مسلّم اور متعین ہوگئی، اس سے پہلے اُردو پر جو فارسی کا اثر تھا قدرتی طور پر وہ بھی کم ہوگیا، فارسی آمیز اردو کی جگہ سادہ اور عام فہم ہندوستانی اردو نے لے لی جس پر انگریزی الفاظ، خیالات اور اسالیبِ بیان کا بھی اثر پڑنے لگا، جدید نظامِ تعلیم اور نصاب نے بھی عربی فارسی اور قدیم اسلامی علوم وفنون کی ترقی کی راہیں مسدود کردیں اور سرکاری سرپرستی صرف ایسے اداروں کے لئے مخصوص کردی گئی جہاں جدید علوم وفنون اور انگریزی زبان کی تدریس ہوتی تھی۔ دیکھتے دیکھتے مکتب، مدرسے، خانقاہیں اور مسجدیں جو ان علوم وفنون کا سرچشمہ تھیں ویران ہوگئیں اور ان کی جگہ ان سرکاری مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں نے لے لی۔ جہاں ایک مدت تک صرف سرکاری ضرورتوں کو پورا کرنا ہی تعلیم وتدریس کا مقصد رہا۔ سرسیدؒ کی تحریک نے ملک وقوم کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا لیکن مغرب زدگی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کی اس نے کوشش نہ کی بلکہ اور تقویت پہنچائی۔ اس کے مقابلہ کیلئے اکبرؔ کی آواز بڑی کمزور معلوم ہوتی ہے اور پھر اس انجمن میں وہ تنہا بھی تھے۔

اس طرح کی تنہائی کا احساس مرزا غالب کو اپنی فارسی شاعری میں بھی محسوس ہوتا ہے ؎

بیا در بزم گر اینجا بود زباں دانے
غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد

غالب کے اُردو اور فارسی کلام کو پڑھنے والے محسوس کر سکتے ہیں کہ اُن کے "سخنہائے گفتنی" ناگفتہ ہی رہے اور اپنے جس کلام کو وہ اپنے لئے باعث ننگ و عار سمجھتے تھے لوگوں نے اس پر اتنی توجہ کی کہ ان کے اصلی جوہر فراموش ہو گئے۔ یہ سلسلہ بہادر شاہ ظفر کے دربار سے شروع ہوا یہاں جن حریفوں سے غالب کو سابقہ پڑا وہ سب اردو کو اپنا سرمایۂ کمال جانتے تھے اور ناقدین مرزا کو بھی اُنہیں کے معیار پر پرکھتے تھے اور مرزا اس معیار کے ہی منکر تھے، ایک فارسی قطعہ میں لکھتے ہیں :۔

اے کہ در بزم شہنشاہ سخن رس گفتۂ
کے بہ بزرگونی فلاں در شعر ہم سنگ من است
راست گفتی لیک میدانی کہ نبود جائے طعن
کمتر از بانگ دہل گر نغمۂ چنگ من است
نیست نقصاں یک دو جزو است ار سواد ریختہ
کاں ہوم برگے ز نخلستانِ فرہنگِ من است
فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است
فارسی بیں تا بدانی کاندر اقلیم خیال
مانی و ارژنگم و آں نسخہ ارژنگ من است
کے درخشد جوہر آئینہ تا باقیست زنگ
صیقلے آئینہ ام ایں جوہر آں زنگ من است

بخت من ناساز و خوئے دوست زاں ناساز تر
تا چہ پیش آید کنوں با بختِ خود جنگ من است
در سخن چوں ہمزبان و ہمنوائے من نہٗ
چوں دلت رانیچ و تاب از رشک آہنگ من است
راست می گویم دلے از راست سر نتواں کشید
ہر چہ در گفتار فخر تست آں ننگ من است

انوری و عرفی و خاقانیٔ سلطان منم
پادشہ ظہوری و جمشید و ہوشنگ من است

یہاں تو خیر وہ اپنے آپ کو انوری، عرفی اور خاقانی کہنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں لیکن کلیات کے فارسی دیباچے میں اس سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں :

"آرے صہبائے سخن بروزگار من از کہنگی تند و پُر زور است و شب اندیشہ را بفروغ میدان سپیدۂ سحری برات فراوانی نور است، ہر آئینہ رفتگاں سرخوش خفتہ اند و من خرابستم، پیشیناں چراغاں بودہ اند و من آفتابستم ؎

سنج شوکت عرفی کہ بود شیرازی
مشو اسیر زلالی کہ بود خوانساری
بسومنات خیالم در آئے تا بینی
رواں فروز برو دوشہائے زناری

اس طبقۂ سخن ناشناساں سے بیزاری کا اظہار ایک اور قطعہ میں یوں کیا ہے :۔

چہ از یں فرقۂ ادا نشناس
خویشتن را ہلاک یاس کنم
بہ دو بیتے ز گفتہائے حزیں
صفحہ را طرۂ ایاس کنم
لائق مدح در زمانہ چو نیست
خویشتن را ہمی سپاس کنم
کس زبانِ مرا نمی فہمد
بعزیزاں چہ التماس کنم

مرزا نے گیارہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا اور فارسی کلیات کی تدوین (۱۸۴۵ء) کے وقت تک دس ہزار چار سو چوبیس اشعار قطعہ، مثنوی، قصیدہ، غزل اور رباعی کے کہہ چکے تھے۔ اس مجموعے کے متعلق خود ان کا خیال یہ تھا :

گر ذوق سخن بدہر آئیں بودے
دیوانِ مرا شہرتِ پروین بودے
غالب اگر ایں فن سخن دیں بودے
آں دیں را ایزدی کتاب ایں بودے

لیکن حیف کہ دینِ سخن شناسی کی یہ ایزدی کتاب اب تک حقیقی قدر دانی سے محروم رہی۔ فارسی شاعری میں مرزا غالب کے مسلک کو متعین کرنے کے لئے ہمیں پہلے خود ان کے اعترافات پر نظر ڈالنا ہے۔ کلیات کے آخر میں جو پر تکلف تقریظ انہوں نے خود لکھی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے ابتدائی دور کی "آوارگیہائے من" کا انہیں خود احساس ہے اور اس بے راہ روی۔۔۔ سے نکالنے والوں میں وہ خاص طور پر شیخ علی حزیں، طالب آملی، عرفی شیرازی، ظہوری اور نظیری کا اعتراف کرتے ہیں لیکن تعجب ہے اس سلسلے میں مرزا بیدل شامل نہیں جن کے متعلق وہ خود ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

عصائے خضر صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

اور معنوی اعتبار سے بھی شاید جتنا گہرا اثر غالب کے یہاں مرزا بیدل کا ہے اتنا ان شعرا کا نہیں جن کا وہ ذکر کرتے ہیں۔ البتہ شاعری کے عام اسلوب میں ان سب کے اثرات کار فرما نظر آتے ہیں، مرزا بیدل اور غالب میں بہت سی صفات مشترک ہیں، دونوں کا انداز فکر اور نقطۂ نظر حکیمانہ اور عارفانہ ہے، کائنات کو دونوں ایک صوفی کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں، دونوں کے یہاں کہیں وحدت وجود اور کہیں وحدت شہود کا جلوہ نظر آتا ہے، لیکن دونوں کا تصوف منفی ہونے کی بجائے مثبت قسم کا ہے، حسرت و یاس یا مایوسی ناکامی، الم و اندوہ کے باوجود دونوں کے یہاں ایک سیماب صفت اور آتش زیر پا شخصیت جھلکتی ہے، دونوں کے کلام میں آگ، آگ کے شعلے، تپش، حرارت اور گرمی کے مضامین بکثرت ہیں، دونوں کے یہاں یہ "آتش پسندی" شعلہ نوائی کا سامان بہم پہنچاتی ہے، جس میں آدم کی عظمت بے نقاب ہوتی ہے، دونوں کے یہاں "عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا" موجود ہے لیکن عشرت قطرہ یہ نہیں کہ فنا ہو کر اسے سکون ساحل نصیب ہو جاتا ہے۔ "حلقۂ صد کام نہنگ" سے گذرنے کے بعد قطرہ جب سمندر میں شامل ہو جاتا ہے تو اسکا نشیمن طوفانوں، طوفانی موجوں اور لہروں میں رہتا ہے، یہ فنا عدم محض نہیں، اس میں سکون وجمود نہیں، سکوت وسکون نہیں، قرار و شکیب نہیں، ایک اضطراب مسلسل، ایک طوفان پیہم اور ایک کشمکش دائمی ہے جو زندگی کے سمندر میں مدوجزر کی صورت میں ظاہر ہوتی رہتی ہے عظمت آدم کا راز دونوں کے یہاں جدوجہد، عزم و استقلال، حرکت و عمل میں پوشیدہ ہے۔ دونوں کی طبیعت مشکل پسند ہے، دونوں اپنی راہیں شارع عام سے الگ نکالتے ہیں، دونوں خود دار اور غیرت مند ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ حالات اور واقعات نے مرزا غالب کو زندگی میں اس عالی ظرفی، غیرت اور شکوہ کی بجائے جو ان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا، بادشاہوں، شہزادوں، ولیعہدوں، نوابوں، بلکہ معمولی انگریز عہدہ داروں کی مدح سرائی اور دریوزہ گری پر مجبور ہونا پڑا۔ غالب کی طبعی ظرافت کے باوجود ان کے کلام میں جہاں حرماں نصیبی اور غم و اندوہ کا بیان ہے وہ شاید اسی مجبوری کا رد عمل ہے، غالب اور بیدل کی ہم آہنگی انہیں مضامین اور موضوعات کی بدولت ہے اور یہ سمجھنا درست نہیں کہ غالب محض طرز بیدل کے مقلد ہیں اور اس طرز کا مطلب فارسی تراکیب میں جدت، تشبیہ در تشبیہ، خیالی استعارے اور مشکل انداز بیان ہے۔

بیدل کے یہاں جو مشکل پسندی ہے وہ محض لفظی نہیں، ان کے یہاں خیال بھی نہایت دقیق ہوتا ہے اور اسی دقت خیال کی وجہ سے کبھی کبھی "الفاظ کا جامہ ان کے مضامین پر تنگ نظر آتا ہے"۔ یہی بات مرزا غالب کے یہاں ہے۔ اُن کی مشکل پسندی اکثر و بیشتر خیالات کی ندرت اور دقت سے پیدا ہوتی ہے اور کمتر اس لئے کہ انہیں اپنے اسلوب بیان میں بھی اسی جدت اور ندرت کی تلاش رہتی ہے جس کی فکر انہیں مضامین و موضوعات میں دامنگیر رہتی ہے، بیدل کے چند اشعار ان کے مسلک، موضوعات اور اسلوب بیان کی مثال میں پیش کئے جا سکتے ہیں:

عالم ہمہ یک جلوۂ ذات احد است
ایں خانہ ہیولیٰ نہ صورت نہ جسد است
کثرت آثار چشم وا کردن است
ایں صفر چوں محو شد یہاں یک عدد است
بہ شوخی برنمی آید دماغ نازِ یکتائی
من از حیرت فزودم صفر بر اعداد دیر نگش
واکردن چشم انبقدر رم نہ دلہ دارد
بیدل بہ ہمیں صفر فزود است حسابم
شش جہت آئینہ دار شوخیٔ اظہار اوست
نیست جز مژگاں حجابے راکہ برداریم ما
حسن مطلق داشتم، خود بینیم آئینہ کرد
ایں قدرہا ہم اثر بیہودہ است اوہام را
حیرت نگاہ شوکت نو میدئ خودم
کایں ہفت عرصہ یک کف بے دستگاہ اوست
دریاست قطرہ کہ بہ دریا رسیدہ است
جز ماکسی دگر نتوانند بما رسید
محیط است چوں محو گردد حباب
ز خود گم شدن جز و را کل کند
پیشتر ز آشوب کثرت وحدتے ہم بودہ است
یاد آں موجیکہ در بیرون ایں دریا زدیم

وحدت وجودی کا یہ صوفیانہ مسلک وہی ہے جس سے بیدل اور ان کے علاوہ فارسی اردو کے اکثر شعرا نے اپنی دکان سجائی ہے مرزا غالب کے یہاں بیدل کے انداز میں ان مضامین کی بازگشت دیکھئے:

سراغ وحدتِ ذاتش تواں ز کثرت جست
کہ سائرست در اعدادِ بےشمار یکے
از وہم قطرگیست کہ در خود گمیم ما
اما چو واریسیم ہماں قلزمیم ما
پنہاں ز عالمیم ز بس عینِ عالمیم
چوں قطرہ در روانیٔ دریا گمیم ما
آفتاب عالمِ سرگشتگی ہائے خودیم
میرسد بوئے تو از ہر گل کہ مے بوئیم ما
غالب الف ہماں علمِ وحدت خود است
ہر کاچہ بر فزود گر ازاں نوشتہ ایم
بے پردگیٔ محشرِ رسوائی خویشم
در پردۂ یک خلق تماشائی خویشم
جوہر ہر ذرہ از خاکم شہیدِ شیوہ ایست
وائے من کز خود شمار کشتگانش کردہ ام
ہوش پرکار کشائے ورقِ بےخبری ست
گم شوم در خود و در نقشِ تو پیدا باشم
سر از حجابِ تعین اگر بروں آید
چہ جلوہ ہا کہ بہر کیش میتواں کردن
چمن از حسرتیانِ اثرِ جلوۂ تست
گل شبنم زدہ باشد لبِ دنداں زدہ
ذرہ را روشناس صد بیاباں گفتہ
قطرہ را آشنائے ہفت دریا کردہ
جلوہ و نظارہ پنداری کہ از یک گوہر است
خویش را در پردۂ خلقے تماشا کردہ
مرد ز آئینہ خانہ کہ خوش تماشائیست
یکے تو محو خودی و چوں تو ہزار یکے
اے کہ تو ہیچ ذرہ را جز براہِ تو روئے نیست
در طلبت تواں گرفت بادیہ را بہ رہبری

مرزا کے اردو فارسی کلام میں اس طرح کے اشعار اور مسائل تصوف جس کثرت سے نظم ہوئے ہیں ان کو پیشِ نظر رکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ یہ مضامین محض فارسی شاعری کی تقلید میں نہیں، غزلوں کے ان اشعار سے قطع نظر دیگر اصناف میں بھی اسکا پرتو موجود ہے۔ مثنویات میں ایک مثنوی "سرمۂ بینش" ہے جس میں سراج الدین بہادر شاہ ظفر کی مدح کی ہے۔ بہادر شاہ بادشاہ برائے نام تھے لیکن فقیر صاحبِ دل تھے۔ اس مثنوی میں خصوصیت کے ساتھ ان کے اسی پہلو کو نمایاں کیا ہے۔ یہ مثنوی، مولانا رومؒ کی مثنوی کے اس مطلع سے شروع ہوتی ہے ؎

بشنو از نے چوں حکایت می کند   وز جدائی ہا شکایت می کند

اس کے بعد مثنوی کے چند اشعار دیکھئے:

من نیم کز خود حکایت می کنم   از دمِ مردے روایت می کنم
از دمِ فیضے کز استاد آورم   خامہ را چوں نے بفریاد آورم
نالۂ نے از دمِ مردِ رہ است   کاں ہم از ساز و ہم از راز آگہ است
بر نوائے رازِ حق گر دل نہی   بایدت چوں نے ز خود بودن تہی
گر نۂ در ریش از مستی ملاف   کیں مے از تندی بود پہلو شگاف
اے کہ از رازِ نہاں آگہ نۂ   دم مزن از رہ کہ مردِ رہ نۂ
دست در دامانِ مردِ راہ زن   لیک رہبر را شناس از راہزن
در ہزاراں مرد، مردِ رہ یکیست   آدمی بسیار اما شہ یکیست
مردِ رہ باید کہ باشد مردِ عشق   لب ترنم خیز و در دل دردِ عشق

پھر مدح کے اشعار لکھنے کے بعد تصوف میں بہادر شاہ کا مسلک اس طرح بیان کیا ہے:۔

گفت کاندر معرضِ اسرارِ دوست   ہر کہ باشد طالبِ دیدارِ دوست
خواہد از نورِ جمالِ یارِ خویش   روکشِ مشرق در و دیوارِ خویش
بایدش کاشانہ نیکو ساختن   حجرہ از نامحرماں پرداختن
خار و خس از خانہ بیروں ریختن   مشکِ تر با خاکِ رہ آمیختن
ناں پس کایں کار را یکسو کند   خانہ را زیں گونہ رفت و روکند
آورد آب و زند در رہگذار   تا ہوا از رہ نینگیزد غبار
برگِ گل در رہ فشاند مشت مشت   تا نیابد خاک زیرِ پا درشت
رخت گرد آلودہ از تن برکشد   جامۂ پاکیزہ اندر برکشد
چوں در آید آں نگار از خود رود   خوش باستقبالِ یار از خود رود
عاشق از خود رفت و دلبر ماند و بس   سایہ گم شد مہرِ انور ماند و بس
جملہ جاناں ماند و جسم و جاں نماند   حسرتِ وصل و غمِ ہجراں نماند
شبنمے را طعمۂ خورشید کن   خویش را قربانیٔ ایں عید کن
تیرگی بزدائے تا رخشاں شوی   قطرگی بگزار تا عماں شوی

اس کے بعد ان اسرار و رموز کی تشریح ہے، کاشانۂ دلِ صحن سرا کے صاف کرنے کا مطلب یہ ہے کہ لسان دفعِ اوہام اور نفی ماسوا میں کوشش کرے، اس کا مدعا تہذیبِ اخلاق اور تحصیلِ اشراق ہے، محبوب جو اس گھر میں آتا ہے وہ جذبہ ہے جو حق کی جانب سے ودیعت ہوتا ہے۔ عاشق کا دوست کے استقبال کے لئے اپنے آپ سے گذرنا در اصل اس کے اپنے آثار کے محو ہونے سے مراد ہے۔ سالک جب اس منزل پر پہونچ جاتا ہے تو اسکا سفر ختم ہو جاتا ہے، یہی بقا بعد الفنا ہے ؎

نیست کس بعد از خدا غیر خدا　　　این بود سرِ بقا بعد الفنا

ایک اور مثنوی کا عنوان ہے "بیان نموداری شانِ نبوت و ولایت که در حقیقت پرتو نور الانوار حضرت الوہیت است" اس میں حمد و نعت کے علاوہ منقبت حضرت علیؓ اور بہت سے صوفیوں اور بزرگوں کی مدح ہے جن میں حضرت معین الدینؒ، شاہ عبد العزیزؒ، مولوی رفیع الدین، شاہ عبد القادر، حضرت کلیم اللہؒ اور شیخ المشائخ حضرت فخر الدین شامل ہیں، اس مثنوی کے بعض اشعار دیکھئے :-

نورِ فیض واصلِ ہستی ذاتِ اوست　　　ہر چہ جز حق بینی از آیاتِ اوست[له]

تا بخلوت گاہِ غیب الغیب بود　　　حسن را اندیشہ سر در جیب بود

صورتِ فکر اینکہ بارے چوں کند　　　تا ز جیبِ غیب سر بیروں کند

جلوہ کرد از خویش ہم بر خویشتن　　　داد خلوت را فروغِ انجمن

جلوۂ اول کہ حق بر خویش کرد　　　مشعل از نورِ محمد پیش کرد

شد عیاں زاں نور در بزمِ ظہور　　　ہر چہ پنہاں بود از نزدیک و دور

مثال اس کی یوں ہے کہ جس طرح ذرات کائنات سورج کی تابانی میں اپنے چہروں پر سے غیب کی نقاب اُلٹ دیتے ہیں اسی طرح نورِ محمدی ذرات پر پرتو افگن ہے اور سارا عالم اسی ایک اختر کی تابانی سے روشن ہے، محمد نورِ حق ہے اور لمعانِ نور اس نور سے اولیا میں ظاہر ہوتے ہیں، اس طرح ہر ولی نبی سے "پرتو پذیر" ہے جس طرح ماہ خورشید سے مستنیر ہے، اس سے ظاہر ہو گیا کہ جلوۂ حسنِ ازل مستور نہیں ہے لیکن کور چشم نور سے محروم رہتا ہے، جلوۂ حسنِ ازل کے طلبگار کو منزل بمنزل پیرِ روشن ضمیر، ولی اور نبی سے مدد کا طالب ہونا چاہیئے۔

ایک اور ناتمام مثنوی" ابرِ گہر بار" کے یہ چند اشعار دیکھئے :-

جہاں چیست آئینۂ آگہی　　　فضائے نظر گاہِ وجہِ الٰہی

چو پیدا تو باشی نہاں ہم توئی　　　اگر پردہ باشد آنہم توئی

بہر پردہ دمساز کس جز تو نیست　　　شناسندۂ راز کس جز تو نیست

بدیں روئے روشن نقاب از چہ رو　　　چو کس جز تو نبود حجاب از چہ رو

ظہورِ صفات تو جز در تو نیست　　　نشانہائے ذاتِ تو جز در تو نیست

ز ہر پردہ پیدا نوا سازیئے　　　بہر جلوہ پنہاں نظر بازیئے

مثنویوں سے قطع نظر قصائد کی طرف آیئے تو پہلا قصیدہ توحید میں ہے، اس کا مطلع ہے :-

اے ز وہم غیر غوغا در جہاں انداختہ
گفتہ خود حرفے و خود را در گماں انداختہ

اس کے بعد دو شعر دیکھئے :-

اے اساس عالم و اعیاں بہ پیوندِ الف
ہمچناں بر صورتِ علم و عیاں انداختہ
بر رخ چوں ماہ برقع از کتاں انداختہ
در نہفتن پردہ از رازِ نہاں انداختہ

دوسرا قصیدہ نعت میں ہے، اسکا مقطع ہے :-

بجنبش اثرِ لا الہ الا اللہ　　　غبار ہستیٔ غالب ز پیش بر داری

ایک قصیدہ منقبت حضرت علیؓ میں ہے جسکا مطلع ہے :-

نازم بہ گراں مایگیٔ دل کہ ز سودا　　　ہر قطرۂ خوں یافتہ پہنائے سویدا

بعد کے اشعار بھی اسی رنگ میں ہیں :-

دانستہ شود ہر چہ ز اسرار تعین　　　سنجیدہ شود ہر چہ ز آثار من و ما

از خامۂ نقاش بروں نامدہ ہرگز　　　ہر نقش کہ بینی ز پس پردہ ہویدا

وحدت ہمہ در لیست ثمین کہ خود از وے　　　ہستی ہمہ جز نیست حقیقی کہ مر او را

طرفے نتواں بست بسر گرمیٔ اوہام　　　ہرگز نتواں کرد پراگندہ براجزا

[له] : مرزا بیدل کے یہاں یہ اشعار دیکھئے :

بہ ہر رنگ آیاتِ حرف ست و بس　　　نفس در عبارات حرف است و بس

حقیقت کہ آں سوئے ما و من است　　　چوں بے پردہ شد حرف پیراہن است

چہ مقدار بیتابِ اظہار شد　　　کہ آخر در انساں نمودار شد

(نکات بیدل صفحہ ۱۹۱)

بیدل کے دوسرے شعر سے مرزا کے اردو دیوان کے مطلع حمد کی طرف بھی رہنمائی ہوتی ہے ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا　　　کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

آئینہ بہ پیشِ نظرِ جلوہ فراواں — دل پرپرہن صاحبِ خلوت کدہ تنہا
پیدا و نہاں شعلۂ حسب ظہور است — چوں پردہ برافتد نہ نہالست نہ پیدا
مدہوشِ رہ و رسم فنایم خبرم نیست — بیخویش قدرح میزنم از خمکدۂ لا
ایمان من اے لذتِ دیدار کجائی — درکار ہذا قم بچکاں بشمعۂ الا
آں رشحہ کہ سارلیست در امدادِ جوداہ — آں رشحہ کہ حالیست بصورت چہ میولیٰ

قطعات، مثنویات اور قصائد سے قطع نظر مرزا کی فارسی غزل میں بار باران صوفیانہ مسائل کا ذکر ہے جو محض رسمی طور پر نہیں بلکہ مرزا کے عقیدہ کے طور پر ظاہر ہوئے ہیں :۔

غالب الف ہماں علم وحدت خود است — برلا چہ برفزود گر الا نوشتہ ایم
بے پردگی محشرِ رسوائی خویشم — در پردۂ یک خلق تماشائی خویشم
ہم ہر ذرہ از عالم نہ پیدا شیوہ ایست — وائے من کز خود شمار کشتگانش کردہ ام
ہوش پرکار کشائے ورق بیخبریست — گم شوم در خود و در نقشِ تو پیدا باشم
سر از حجاب تعین اگر برون آید — چہ جلوہ ہا کہ بہر کیش می تواں کردن
چمن از حسرتیان اثر جلوۂ تست — گل شبنم زدہ باشد لب دنداں زدۂ
ذرۂ را روشناس صد بیاباں گفتۂ — قطرۂ را آشنائے ہفت دریا کردۂ
جلوہ و نظارہ پنداری کہ از یک گوہر است — خویش را در پردۂ خلقے تماشا کردۂ
گر نہ نوا ہا سر دہے چہ غمے — منکہ نیم گر نبود مے چہ غمے
سراغ وحدتِ ذاتش تواں ز کثرتِ جست — کہ سازگرت در امدادِ بسیار یکے

یہ اور اس طرح کے بیسیوں اشعار غزلوں میں موتی کی طرح پروئے ہوئے ہیں۔ ان مضامین میں جو بات سب سے نمایاں ہے وہ تصوف کا فکری پہلو ہے مسئلۂ توحید ہو یا وحدتِ وجود، حجاب ہو یا جلوہ، ہوش یا بے خبری، سب کا اندازِ بیان فکری ہے' جسے تصوف کا فلسفیانہ پہلو کہہ سکتے ہیں، اس سے مرزا غالب کی افتادِ طبع اور اندازِ فکر دونوں کا اندازہ ہوتا ہے شعر کا نازک آبگینہ فلسفے کی گرانباری کا تحمل مشکل سے کرسکتا ہے۔ اس لئے کبھی کبھی "آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے" والی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے لیکن یہ بات فارسی میں کم اور اردو میں زیادہ ہے جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ فارسی میں اس طرح کے مضامین مرزا سے بہت پہلے صوفیانہ اور حکیمانہ شاعری میں نظم ہوتے چلے آئے تھے، اردو کے لئے یہ مضامین نئے تھے، اسی لئے کبھی کبھی ان خیالات پر الفاظ کا جامہ تنگ نظر آتا ہے۔

غالب کی فارسی شاعری کے تفصیلی مطالعہ سے ان کے نظامِ فکری کی ترتیب مشکل نہیں لیکن بخوفِ طوالت یہاں اس کے چند پہلو نمایاں کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے، دنیا اور کائنات کی حقیقت کیا ہے، ہستیٔ عالم کی کیا اصلیت ہے۔ یہ ایسے سوال ہیں جنہیں ہر دور میں مفکرین اور مذاہب نے حل کرنے کی کوشش کی ہے، دیکھئے مرزا غالب کیا کہتے ہیں مثنوی "ابر گہربار" کے یہ اشعار آپ دیکھ چکے :

جہاں چیست آئینۂ آگہی — فضائے نظرگاہ وجہ الٰہی

غزلوں کے یہ اشعار دیکھئے :۔

خطے بر ہستیٔ عالم کشیدیم از مژہ بستن
زخود رفتیم و ہم با خویشتن بردیم دنیا را

انسان اپنی دنیا آپ ہے، ادراک اور احساس اس کی ذات سے وابستہ، شعور اس کے وجود کا محتاج ہے، خارج میں کسی چیز کا وجود نہیں، آنکھ کھولئے سب کچھ موجود ہے، بند کر لیجئے سب غائب!

عالم آئینہ راز است چہ پیدا چہ نہاں
تاب اندیشہ نداری بہ نگاہے دریاب

نگہ آئینہ پر پڑتی ہے، آئینہ میں سما جاتی ہے، جو کچھ نظر آتا ہے اسی نگہ اور اسی نظر کا کرشمہ ہے، آئینہ تو محض ایک ذریعہ یا وسیلہ ہے، یہی حال عالم ہے دیکھنے والا نہ ہو تو راز ہے، حقیقت بھی راز اور مجاز بھی راز دیکھنے والا ہو تو دونوں روشن اور واضح :

ہر ذرہ محوِ جلوۂ حسنِ یگانہ ایست — گوئی طلسمِ شش جہت آئینہ خانہ ایست
حیرت بہ دہر بے سر و پا می برد مرا — چوں گوہر از وجودِ خودم آب و دانہ ایست
پابستۂ نوردِ خیالی چو وارسی — ہر عالمے ز عالمِ دیگر فسانہ ایست

شیش محل میں کھڑے ہو کر دیکھو، جدھر نظر کروگے ایک صورت نظر آئے گی، ہزاروں صورتیں لیکن حقیقت سب کی ایک، اور پھر یہ حقیقت کیا خود دیکھنے والے کی نظر۔ ظاہر ہے اس شیش محل میں انسان پر حیرت طاری ہو جاتی ہے اور حیرت کی شدت قوتِ عمل و ارادہ کو مفلوج کر دیتی ہے اس عالم میں نہ کسی سے فیض پہونچ سکتا ہے نہ کسی کو فیض پہنچایا جاسکتا ہے۔ یہاں مرزا مضمون آفرینی اور نازک خیالی سے ایک نادر تشبیہ پیدا کرتے ہیں۔ عارف گوہر نایاب ہے کہ خود اسکا وجود اس کے لئے آب و دانہ ہے' انسان اسی عالم میں گھر کر رہ جاتا ہے۔ اس کے خیالات اسے اس طلسم میں الجھا لیتے ہیں، اگر ایک قدم آگے بڑھائے، اس شیش محل کے باہر بھی دیکھ سکے تو معلوم ہوگا کہ ؎

ہر عالمے ز عالمِ دیگر فسانہ ایست

عالم ایک نہیں بہت سے عالم ہیں، کچھ پیچھے گزرے کچھ اس وقت ہیں، کچھ ابھی پردۂ تخلیق میں ہیں ع

کہ آرہی ہے دما دم صدائے کن فیکوں

پنہاں بہ عالمیم ز بس عین عالمیم   چوں قطرہ در روانیٔ دریا گمیم ما

دریا سے قطرہ جدا ہوتا ہے تو قطرہ کہلاتا ہے، نہیں تو قطرہ کو دریا کون کہے، ظاہر ہونا ہی گویا دریا کا قطرہ بننا ہے۔ روانیٔ دریا میں گم ہو تو پھر دریا ہے، قطرہ کہاں۔

سوال یہ ہے کہ اس عالم، کائنات، تخلیق یا دنیا میں آدم کا کیا مرتبہ اور تخلیق آدم کی کیا غرض وغایت ہے۔ ایک غزل کے دو شعر دیکھئے :۔

فنا رست ہستیٔ من در تصورِ کہ رشش
چو نغمہ کہ ہنوزش وجود در تار است
ز آفرینشِ عالم غرض جز آدم نیست
بگردِ نقطۂ ما دورِ ہفت پرکار است

انسان ابھی اس نغمہ کی طرح ہے جو رگِ تار میں چھپا ہوا زخمہ ور کی انگلیوں کا منتظر ہے۔ آفرینشِ عالم کا مقصد سوائے آدم کی تخلیق کے اور کچھ نہیں، گردشِ ہفت پرکار اسی نقطہ کے گرد ہے۔ یہی نغمہ ہے جو بالآخر زودِ رس گوش بننے والا ہے :۔

زما گرمست ایں ہنگامہ بنگر شورِ ہستی را
قیامت می دمد از پردۂ خاکے کہ انساں شد

یہ شورِ ہستی، یہ ہنگامہ اور گرماگرمی محض خاک اور خاک کے پتلے سے تو پیدا ہونے سے رہی، ہاں یہی پردۂ خاکی جب لباسِ انسان بن جائے تو رونقِ ہستی ہنگامہ محض سب کچھ ہے۔ ایک بڑا مزیدار شعر دیکھئے :۔

نیست با غنودنہا برگِ پر کشودنہا
از عدم بروں آمد سعیٔ آدم از من پرس

آدم جو سیماب صفت ہے، پردۂ عدم سے باہر آنے کے لئے سعی اور جد وجہد کرتا ہے یہی حقیقت آدم اور یہی اصل حیات ہے، اسی غزل کا یہ شعر ہے :۔

خلد را نہادم من لطف کوثر از من جوئے
کعبہ را سوادم من شورِ زمزم از من پرس

عالی ظرفی اور مشکل پسندی اس آدمِ خاکی کا خاصہ ہے۔ راستہ کی دشواریاں اس کی ہمتوں کو بلند کرتی ہیں، ناکامیاں اس کے سمندِ شوق پر تازیانہ کا کام کرتی ہیں، یہ مشکل پسندی جو ہمیں مرزا کے فارسی کلام میں ان کے جزو ایمان کے طور پر ملتی ہے ان کی شاعری کا نہایت صحت مند اور مثبت پہلو ہے، یہ اشعار دیکھئے :

بوادیٔ کہ در آں خضر را عصا خفتست
بسینہ می سپرم رہ اگرچہ پا خفتست

خضر کو دشوار گذار صحراؤں اور ناقابلِ عبور وادیوں میں رہبری اور رہنمائی کا دعویٰ ہے لیکن جس منزل میں میں ہوں وہاں عصائے خضر بھی اظہار اور اعترافِ عجز کر رہا ہے، میں برہنہ ہوں اور میرے پیر تھک کر سو گئے ہیں تو میں سینے کے بل یہ راہ طے کرتا ہوں، اسی غزل کا یہ شعر ہے :

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز
گسستہ لنگرِ کشتی و ناخدا خفتست

زندگی تو زندگی، مرنے کے بعد بھی "پیچ و تاب" ختم نہیں ہوتے :۔

غبارِ طرفِ مزارم بہ پیچ و تابے ہست
ہنوز در رگِ اندیشہ اضطرابے ہست

انتہا یہ ہے کہ زندگی آسان ہو تو دشوار ہو جاتی ہے :۔

فراغت بر نتابد ہمتِ مشکل پسندِ من
ز دشواری بجاں می افتدم کارے کہ آساں شد

مجو آسودگی گرمردِ راہی کاندریں وادی
چو خار از پا برآمد پا ز داماں بر نمی آید

غم مشرباں بہ چشمۂ حیواں نمی دہند
موجے کہ دشنہ در جگر از پیچ و تاب زد

گر بود مشکل مرنج اے دل کہ کار
چوں رود از دست آساں میرود

چہ ذوقِ رہروی آنرا کہ خارخارے نیست
مرو بہ کعبہ اگر راہ ایمنی دارد

ذوقِ رہروی تو یہ ہے کہ ایک ایک قدم پر کانٹے لگیں تو سفر کا مزہ آئے مشکل پسندی کا تقاضا تو یہ ہے کہ راہِ کعبہ بھی اگر بے خطر ہو تو اُدھر کا رخ نہ کرو، دوسرے ذوقِ عافیت تلاش کرتے ہیں اور کانٹے ہیں کہ ان کے پاؤں ہو کر دامن کی خبر لاتے ہیں :۔

بذوقِ عافیت یاراں روند از خویش چوں من ہم
خلد در پائے من خارے کہ در پیراہنم باشد

ذوقِ مشکل پسندی یہاں تک بڑھ جاتا ہے کہ آشوبِ غم سے تسلی نہیں

ہوتی، کچھ اور ہنگامے درکار ہیں کہ یہ آگ بھڑکتی ہی رہے:

دلم اے شوق ز آشوب غمے تنگ شاید
فتنۂ چند ز ہنگامہ ستانے بمن آر

آگ اور طوفان کم حوصلہ لوگوں کے لئے روح فرسا ہیں، یہاں انکی تمنا ہے:

بسانِ موج نی بالم بہ طوفاں | برنگِ شعلہ می رقصم در آتش
خواہم ز بہرِ لذتِ آزارِ زندگی | بر دل بلا فشانم و بر جاں خورم دریغ

مرد آنکہ در ہجوم تمنا شود ہلاک
از رشک تشنۂ کہ بہ دریا شود ہلاک
گردم ہلاکِ ذرۂ در جامِ رہروے
کاندر تلاشِ منزلِ عنقا شود ہلاک

عنقا حاصل ہونے والی چیز نہیں لیکن اسکا ذوقِ تلاش دیکھئے اور اسکی جدوجہد کی داد دیجئے، جو اس کی تلاش میں خود کو ہلاک کردے، علامہ اقبالؒ نے پیر رومی کا یہ قطعہ سرِ عنوان بنایا ہے۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت
شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

جو ملتا نہیں اس کی تلاش ہی سچی تلاش کے جذبہ کو آشکار کر سکتی ہے مرزا کے یہاں بھی یہی خیال ہے۔ اسی غزل کے دو اور شعر ہیں:

با خضر گرنے روم از بیم ناکسی است
ترسم ز ننگِ ہمرہی ما شود ہلاک
غم لذتے است خاص کہ طالب بذوقِ آں
پنہاں نشاط ورزد و پیدا شود ہلاک
در تپش ہر ذرہ از خاکم سویدائے دلست
ہرچہ از من رفت ہم بر خویش قسمت میکنم
شیوۂ رندانِ بے پروا خرام از من مپرس
ایں قدر دانم کہ دشوار است آساں زیستن

مرزا غالبؔ کی فارسی شاعری کے بحرِ ذخار میں سے یہ صرف چند موتی ہیں جو پڑھنے والوں کے دیدہ و دل کو خیرہ کرتے ہیں، شوخیٔ بیان، ندرتِ خیال، معنی آفرینی، عالی ظرفی، حسرت و یاس، ذوق و شوق، حرکت و سفر، اندیشۂ منزل، نومیدی جاوید، نازک دماغی، راہِ عشق اور دردِ فراق کے نادر مضامین کی ایسی مثالیں کلامِ غالبؔ میں موجود ہیں جو ہندوستان کے فارسی گو شعراء کے یہاں بہت کم ہیں اور جن کی بنیاد پر مرزا بجا طور پر اپنی فارسی شاعری پر ناز کرتے ہیں اور اپنے اردو مجموعے کو "بے رنگ" کہتے ہیں، حالانکہ اہلِ نظر اسی مجموعۂ بے رنگ کو سرمایۂ افتخار جانتے اور آنکھوں سے لگاتے ہیں!

تمدنی وحدت: بقیہ صفحہ ۱۹

تھے، اُن کی نظر سے ایک تو مغربی پاکستان موجودہ تاریخی دور کا نقطۂ آغاز او جھل، دوسرے ان کی نگاہیں یہ اچھی طرح نہ دیکھ سکی تغیر کہ زمانہ کس رُخ پر جا رہا ہے۔ حالات گردوپیش کتنی تیزی سے بدل رہے ہیں، اور مستقبل قریب میں صنعتی انقلاب دیہی معیشت پر کیا اثر ڈالے گا۔ اور اس کے نتیجے میں مغربی پاکستان کی معاشرتی زندگی میں کتنے دوررس تغیرات واقع ہوں گے۔ یہاں اب ایک نئی معیشت معرضِ وجود میں آرہی ہے۔ اس نئی معیشت میں یقینی طور پر علیحدگی پسند رجحانات کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ اب ایک نیا معاشرہ وجود میں آرہا ہے جس کی معنوی اساس وہ روح ہوگی جس نے ایک ہزار سال پہلے اس خطے کو وحدت بخشی تھی۔ ہمارا نیا صنعتی معاشرہ اس روح کو اور بھی عام کر دے گا۔ اس میں مزید توانائی پیدا کرے گا اور اسے اتنی ہمہ گیری بخش دے گا۔ اس خطے کے تمام باشندے اُس کی بدولت اپنے آپ کو ایک تہذیبی وحدت کے اجزا سمجھنے لگیں گے۔ یہ دراصل کوئی انقلاب نہیں بلکہ حقیقت کے ساتھ ایک تعاون ہے، البتہ اس سے نہایت دوررس مبارک اور خوشگوار نتائج نکلنے والے ہیں۔

نئے شعری تجربے

صدیق کلیم

آزاد شاعری نے ادبی بغاوت کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ شعری سرمائے کی صدیوں کی روایات نے شعر کے حسین چہرے پر تکلف اور تصنع کا جو پردہ ڈال دیا تھا بیسویں صدی کے آغاز میں وہ کچھ زیادہ ہی دبیز اور بے رنگ ہوتا جا رہا تھا۔ آزاد شاعری اسی کے خلاف بغاوت ہے۔

آزاد شاعری کا مسئلہ دراصل آہنگ نغمہ کا مسئلہ ہے۔ نظم کے مصرعوں کا وزن بحر کے پیمانے میں ناپا جاتا ہے، مگر اس کے علاوہ مصرعوں کی اپنی "سپیچ ردم" یا خود مصرعے کا اپنا آہنگ بھی شاعرانہ ترنم کی خصوصیت ہے۔ اگر جملے کا وزنی آہنگ جملے کے بے ساختہ خود رو آہنگ پر حاوی ہو جائے تو شعر پھیکا اور بے کیف ہوگا اور اگر "سپیچ ردم" وزن کے ہاتھوں مدھم نہ پڑے یا اس کے بہاؤ میں فرق نہ آئے تو اس سے خوشگوار کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ مقفی شاعری کا ترنم ان ہر دو آہنگ کے نازک حسین امتزاج پر مبنی ہے۔ مصرعوں یا جملوں کے آہنگ کے بہاؤ کی ہر لحہ بدلتی ہوئی ہیئت کے نیچے بحر کا اپنا وزن شعر کو ایک نازک ریشمیں سانچے میں ڈھالتا رہتا ہے۔ ایک خلاق فن کار کے ہاتھ میں موسیقی کی یہ لہریں لہروں سے پیدا ہوتی ہیں یا فطری بے ساختہ گفتگو میں سانس کے اپنے آہنگ سے تخلیق ہوتی ہیں یا بیک وقت دونوں کی مدد سے ظہور میں آتی ہیں۔ جملے کے آہنگ وزن کے گرد مچلتی بل کھاتی رہتی ہیں۔ ایک مصرعے کا وزن یا بحر کی حرکت موسیقی میں تال کے مانند ہے۔ آزاد شاعری کی آزادی کا راز اسی میں ہے کہ وہ بے شمار مختلف آہنگوں کی لہروں کا ایک معین آہنگ کے پس منظر میں ایک نازک تانا باناتی رہے۔ ایسے وقت تنوع کے احساس سے ایک جمالیاتی لطف پیدا ہوتا ہے۔ ہر لحہ بدلتے ہوئے بہاؤ کی اتھاہ گہرائی میں ایک مستقل معین بہاؤ کا ایک ہلکا سا احساس مسرت خیز فنی کمال ہے۔ بحر کے ترنم اور خود آواز کے ترنم کے ایک ساحرانہ امتزاج سے مختلف لَے اور سُر کے ساتھ باقاعدہ شاعری قاری کو نغمگی کا کیف بخشتی ہے۔ آزاد شاعری اس بحر والے ترنم سے آزادی حاصل کر لیتی ہے۔ چونکہ بسا اوقات یہ ترنم فطری ترنم کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ آزاد شاعری محض آواز اور سانس کے فطری ترنم اور خیال اور احساس کی بے ساختہ موسیقی سے ایک بے تکلف آہنگ کا بہاؤ پیدا کرتی ہے۔ ایک فن کار ان اجزا کے امتزاج سے ایسا نغمہ تخلیق کرتا ہے کہ اس پر کسی معین بحر کا گمان ہونے لگتا ہے۔ مگر جب ذہنی تحریک مدھم پڑ جاتی ہے تو یہی نغمہ بے کیفی اور کرختگی میں بدل جاتا ہے اور ہمارے احساس نغمگی کو شدید دھچکے لگتے ہیں۔ ایک قسم کے تصنع اور تکلف اور کھردرے پن کا احساس ہونے لگتا ہے۔ آزاد شاعری ایک خاص موڈ اور ایک خاص تجربے کی رہین منت ہے۔ کامیاب آزاد شاعری کے لئے آہنگ اور نغمگی کا زیادہ واضح شعور درکار ہے۔ اس کی سحر کاری شاعر کی صلاحیت پر ایک کڑا نظم وضبط عائد کرتی ہے۔ آزاد شاعری پابند شاعری کی طرح آزادی کم اور ذمہ داری زیادہ ہے جو شاعر ان پابندیوں سے گھبراتا ہے وہ دراصل فن سے ناانصافی برتتا ہے۔

آزاد شاعری ایک طرف یورپ اور دوسری طرف امریکہ سے انگلستان میں آئی اور اس تمام پس منظر کے ساتھ برصغیر ہند و پاکستان میں پہنچی۔ حالات کی سازگاری نے اس شاعرانہ اپج کو قبولیت عطا کی۔ مقفی شاعری، خصوصاً غزل، کے خلاف نہ صرف محاذ تیار تھا بلکہ جنگ جاری تھی اور ایک طرح سے غزل ناکارہ صنف سخن سمجھ لی گئی تھی۔

اردو شاعری میں آزاد نظم اجتہاد کا درجہ رکھتی ہے۔ مگر اس اجتہاد کا سہرا ہمارے ہاں بیک وقت مختصر نظم، غیر مقفیٰ نظم اور آزاد نظم تینوں کے سر ہے۔ ۱۹۳۵ء سے ہمارے ہاں ادب نے بڑی سرعت اور شدت کے ساتھ بین الاقوامی تحریکوں کا اثر قبول کیا ہے۔ اس وقت کی ادبی تنقید دو چراغوں سے روشنی حاصل کر رہی تھی۔ ایک تو نفسیات اور تحلیل نفسی اور دوسرے معاشی اور معاشرتی تجزیئے۔ معاشی اور معاشرتی تجزیئے نے انسان کی صف بندی سے پیدا شدہ خرابیوں کے خلاف جہاد کیا اور ادھر انسانی ذہن اور کردار کے مطالعہ نے تہذیب و تکلف کے پردوں کو پھاڑ کر انسان کو اس کے اصل روپ میں پیش کیا۔ اس لئے ایک ایسے سماج کی طلب ہوئی جو سادہ و معصوم ہو اور جس میں انسانی رشتے ابتدائی بے ساختگی اور بے تکلفی پر مبنی ہوں۔ اس لئے انسان نے ایک بار پھر یہ محسوس کیا کہ شاعری نہ صرف ایک داخلی صنف سخن ہے بلکہ ایک نہایت ہی ابتدائی ذریعۂ اظہار ہے۔ انسان کی جبلی زندگی تہذیب کے صالح نظریوں کی روح کو جذب کرنے کے بعد بھی سادگی اور بے ساختگی کے جوہر کو قائم رکھ سکتی ہے۔ اور اس طرح ہمہ گیر انسانیت اور عالمگیر اخوت کے رشتوں سے عظمت کا سراغ پا سکتی ہے۔

اردو میں آزاد نظم کا اس وقت تک کافی ذخیرہ جمع ہو چکا ہے بعض شعراء نے اکثر و بیشتر شاعری اسی میں کی ہے اردو میں آزاد نظم کے شعراء کی ہر نظم کسی نہ کسی مروجہ بحر میں ہے۔ صرف ارکان کی تعداد بدلتی رہتی ہے۔ اس طرح آزاد نظم کو فکر کے ڈھلے ڈھلائے ٹکڑے مل جاتے ہیں۔ چونکہ اردو میں ابھی تک "سپیچ ردم" کا استعمال نہیں کیا گیا اس لئے بعض مقامات پر اس میں بھی وہی روایتی شاعری کا تکلف اور تصنع پیدا ہو جاتا ہے۔ وزن کا استبداد یہاں بھی خالص آزاد شاعری کے نقطۂ نظر سے قائم رہتا ہے۔ اس لئے اردو میں آزاد شاعری اپنی قسم آپ ہے جس نے وزن کے لحاظ سے ایک طرح کی سہولت تو ضرور حاصل کی ہے۔ مگر کلاسیکل شاعری کی روایت کو اپنے اندر سمو لیا ہے۔ میری رائے میں "سپیچ ردم" کا سوال اس شاعری میں اس لئے نہیں آ سکا کہ ہمارے ہاں وہ مخصوص ذہنی اور معاشری حالات پیدا نہیں ہوئے جو اس "ردم" کی تخلیق کے ذمے دار ہو سکتے ہیں۔ اس لئے ہماری آزاد شاعری مقفیٰ شاعری اور صحیح آزاد شاعری کا ایک حسین امتزاج ہے۔ اس کی دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آزاد شاعری کے ساتھ ہی اردو میں مختصر نظم کا رواج بھی شروع ہوا، جو ہماری زندگی کے تقاضوں اور ہماری ذہنی ساخت سے زیادہ قریب تھی، جس کے باوصف ہمارے ہاں بہت حسین و جمیل مختصر نظمیں لکھی گئی ہیں۔ اور تعداد میں بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ تیسرے یہ کہ اسی دور میں مقفیٰ شاعری کا رواج بھی چل نکلا۔ آزاد شاعری ذہنوں پر وہ تسلط نہ جما سکی کہ "سپیچ ردم" کی تخلیق کے لئے پوری کاوش کی جاتی۔ چونکہ ہمارے ہاں مختصر نظم، غیر مقفیٰ نظم اور آزاد نظم کا تجربہ بیک وقت شروع ہوا، اس لئے میرے خیال میں آزاد نظم کی سب سے بڑی کامیابی یہی ہو سکتی تھی کہ ہم اسے اپنی روایت میں ڈھال لیں۔ ہو سکتا ہے آئندہ کے شاعر "سپیچ ردم" کا تجربہ کریں۔ تاہم یورپ میں آجکل آزاد شاعری اور باقاعدہ شاعری ساتھ ساتھ لکھی جا رہی ہیں۔ مقصد یہ کہ آزاد شاعری ہماری اصنافِ سخن میں سے محض ایک صنف ہے۔

اردو میں سب سے پہلے، بقول ان کے، ڈاکٹر تصدق حسین خالد نے آزاد شاعری کی۔ خالد کی بعض نظموں میں سلاست اور روانی کا حسن ملتا ہے، مگر ڈاکٹر تاثیر نے نئی شاعری کے لئے بڑے خلوص اور کاوش سے کام کیا۔ تاثیر نے نوجوان طبقے کو نئے فکر اور نئے اسلوب سے متعارف کیا اور خود اپنی نظموں کی شکل میں قابلِ قدر نمونے پیش کئے۔ انہوں نے نئے موضوعات کو خالصتاً فنی سطح پر نظم کا لبادہ پہنایا ہے۔ ان کی آزاد نظم حسن رمزیت، جوشِ بہار اور قوتِ اظہار ایسے اوصاف سے متصف ہے۔ نظم "دوراہا" کا پہلا بند ملاحظہ ہو:

"ریل گاڑی پہ یہ گھمسان الہٰی توبہ!
نہ مروت نہ تکلف نہ تبسم نہ ادا
یونہی اک غیر شعوری سی خشونت کا خروش۔
بے ارادہ ہے تو کیا غیر شعوری ہے تو کیا
یہ نئے دور کے احساسِ غلامی کا ظہور
انتقاماً نہ تحکم کی نمود!
خانہ جنگی ہی سہی۔
اس میں اظہارِ بغاوت بھی تو ہے"

آزاد نظم کو ن۔ م راشد نے آسودگی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ اور اپنی بعض نظموں میں اسے معراج فن کی حدود تک پہنچا دیا ہے۔ ہمارے

ہاں آزاد نظم کس وجہ سے پیدا ہوئی، تتبع سے، یا اندرونی تخلیقی ضرورت سے؟ راشد اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ اردو میں آزاد شاعری کی تحریک محض ذہنی شعبدہ بازی نہیں محض جدت اور قدیم راہوں سے انحراف کی کوشش نہیں۔ اگر ان نظموں میں آپ کے کسی تخلیقی جوہر کی معمولی سی چمک، کسی قوت کا ادنیٰ سا شائبہ، کسی نئے احساس کی ہلکی سی جنبش نہ ملے تو انہیں قطعی طور پر رد کر دیجئے کیونکہ اجتہاد کا جواز صرف یہ نہیں کہ اس سے کس حد تک قدیم اصولوں کی تخریب عمل میں آئی۔ بلکہ یہ کہ آیا تعمیری ادب اس میں سے کسی نئی صبح کی طرح نمودار ہوتا ہے یا نہیں۔ اگر یہ نہ ہو تو اجتہاد بے کار ہے۔ اجتہاد کا جواز صرف وہ خیالات و افکار ہی پیش کرتے ہیں جن کی خاطر نیا راستہ اختیار کیا گیا ہو۔ میری رائے میں راشد بہت حد تک اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔ راشد کے کلام کی بڑی خوبی اس کا صوتی حسن اور نغمگی ہے۔ ان کی تشبیہیں اور استعارے ان کی نظموں کی ہئیت کو اور بھی حسین بنا دیتے ہیں ؎

"نیند آغاز زمستاں کے
پرندے کی طرح
اپنے پر تولتی ہے چیختی ہے" یا

"تیرے بستر پہ مری جان کبھی
جذبۂ شوق سے ہو جاتے ہیں اعضا مدہوش
ذہن بن جاتا ہے دلدل کسی ویرانے کی۔"

ان نظموں میں لہجے کی جھنکار، جذبات کا آہنگ، بے ساختہ رمزیت اور جگہ جگہ تجزیاتی رکاوٹ، یہ تمام اجزاء ایک خاص ماحول اور فضا تیار کرتے ہیں۔ ایک مثال اور ملاحظہ ہو ؎

"اے مری ہم رقص مجھکو تھام لے
زندگی میرے لئے
ایک خونیں بھیڑیئے سے کم نہیں
اے حسین و اجنبی عورت اسی کے ڈر سے میں
ہو رہا ہوں لحظہ لحظہ اور بھی تیرے قریب
جانتا ہوں تو مری جاں بھی نہیں
تجھ سے ملنے کا پھر امکاں بھی نہیں
تو مری ان آرزوؤں کی مگر تمثیل ہے
جو رہیں مجھ سے گریزاں آج تک!"

مگر ان تمام صفات کے باوجود راشد کے کلام میں فارسی الفاظ و تراکیب کی زیادتی کی وجہ سے گرانباری کا احساس ہوتا ہے۔

میراجی نے آزاد نظم کو اور بھی چمکا دیا۔ نظم میں حد درجہ لطافت، روانی اور نفاست پیدا کر دی۔ ان نظموں کو میراجی نے ہلکا اور پھلکا بنا دیا ہے۔ ہندی ترکیبوں، تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال سے آزاد شاعری میں ایک خاص لچک اور حسن پیدا ہو گیا ہے۔ میراجی کے مصرعوں میں ربط بہت کم ہوتا ہے۔ ان کو محض ایک مرکزی خیال کے تحت جمع کر دیا جاتا ہے۔ وہ آزاد تسلسل خیال کی تکنیک استعمال کرتے ہیں۔ بے ربط مضمون، غیر ضروری باتوں اور منتشر مصرعوں کا انبار بعض مقامات پر گراں گذرتا ہے۔ لیکن اس بے راہ روی سے بھی ایک فضا تیار ہو جاتی ہے۔ جو نظم کے صوتی بناؤ اور موسیقانہ جھنکار کے سبب ذہنی آسودگی اور لطف اندوزی کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ میراجی میں ابہام بہت زیادہ ہے۔ تاہم ان کی نظمیں کا تکنیکی حسن قاری کو ہر لمحہ بدلتی ہوئی خیال و احساس کی لہروں میں گم کر دیتا ہے۔ اور نظم باوجود اپنی ظاہری بے معنویت کے معنویت کا اخراج حاصل کر لیتی ہے:

"دن ختم ہوا دن بیت چکا
رفتہ رفتہ ہر نجم فلک اس اونچے نیلے منڈل سے
چوری چوری یوں جھانکتا ہے
جیسے جنگل میں کٹیا کے اک سیدھے سادے دوارے سے
کوئی تنہا چپ چاپ کھڑا چھپ کر گھر سے باہر دیکھے!
جنگل کی ہر اک ٹہنی نے سبزی چھوڑی شرما کے چھپی تاریکی میں،
اور رنگ برنگے پھولوں کے شعلے کالے کاجل بن کر
روپوش ہوئے،
اور بادل کے گھونگھٹ کی اوٹ سے ہی تکنے تکنے چنچل
چندا کا روپ بڑھا!
یہ چندا کرشن ستارے ہیں جھرمٹ برندا کی سکھیوں کا!
اور زہرہ نیلے منڈل کی رادھا بن کر کیوں آئی ہے؟
کیا رادھا کی سندرتا چاند بہاری کے من بھائے گی؟"

راشد اور میراجی نے نئی پود کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ ان

لکھنے والوں میں منیب الرحمن۔ انجم رومانی، ضیا جالندھری، محمد صفدر اور حامد عزیز مدنی کے نام قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے اپنی بیشتر شاعری اسی صنف میں کی ہے۔ عبدالمجید بھٹی نے اپنی آزاد نظم میں ہندی الفاظ کو سمونے کی کوشش کی ہے۔

منیب الرحمن کے کلام میں شگفتگی اور بعض جگہ ایک نئے عزم کی قوت کا احساس ہوتا ہے ؎

"بنا تجھے اسی معتبری پہ اپنی ناز ہے
ترا یہ سحر رنگ و بو
اسی کی قید میں تری حیات گھٹ کے رہ گئی
وہ شوخیٔ قلم کہاں
وہ حسن پیچ و خم کہاں
ہزاروں نقش تو نے اس سے خوب تر بنائے ہیں
یہ تیرا شاہکار ہے
فلک بھی سرنگوں ہوا
زمیں بھی تھرتھرا گئی
جنسِ خود نگر مگر نہ جھک سکی نہ جھک سکی"

ان شعرا کے علاوہ قیوم نظر، یوسف ظفر، سلام مچھلی شہری، احمد ندیم قاسمی، علی سردار جعفری اور فیض احمد فیض نے بھی اپنی مقفیٰ اور غیر مقفیٰ شاعری کے علاوہ اردو ادب کو بعض حسین اور کامیاب آزاد نظمیں دی ہیں۔ ان میں سے بعض نظموں کی اپنی دائمی حیثیت ہے۔

اس تمام بحث سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آزاد نظم اردو میں اب ایک مستند صنف کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ آزاد نظم بعض خاص حالات کی وجہ سے خاص تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے معرض وجود میں آئی بعض شعراء نے ان تجربات کو بھی مقفیٰ شاعری میں حسن و خوبی سے بیان کیا ہے۔ مگر یہ ایک دوسری بحث ہے۔ اردو میں آزاد شاعری مقفیٰ اور خالص آزاد شاعری کا ایک حسین امتزاج ہے۔ اس لئے آزاد نظم ہماری اصناف سخن میں سے ایک مستند اور خوبصورت صنف ہے جس سے مستقبل میں اچھی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

(بہ شکریہ ریڈیو پاکستان۔ لاہور)

○

میرا سفر: (بقیہ صفحہ ۲)

ان شینوں کے تحفظ و بقا کا انحصار انہی لوگوں پر ہے۔ کپڑے کے کارخانوں میں پیداوار کی رفتار اس قدر سست ہے کہ پچھلے دنوں دو غیر ملکی ماہرین نے ایک مل میں محض اپنی سمجھ بوجھ کے بل پر دو ہفتے کے اندر اندر پیداوار ڈیوڑھی کر کے دکھا دی۔ ان ماہرین کا کہنا ہے کہ سب سے بڑی کمی تربیت یافتہ کاریگروں کی ہے۔ پاکستان اس کمی کو پورا کرنے کی کیا تدبیریں کر رہا ہے۔ ماہرین بطور خود کچھ نہیں کر سکتے۔ ان کو لوگوں کے تعاون کی ضرورت ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ پاکستان میں ایک ہی صنعت کا ایک کارخانہ دوسرے کارخانے کے ساتھ تعاون نہیں کرتا اور یہ طے ہے کہ کامیابی تعاون کے بغیر ممکن ہی نہیں۔

پاکستان میں لوگ صنعتوں اور کارخانوں کی ملازمت کو ابھی تک عار سمجھتے ہیں۔ نوجوانوں کو کوٹ اتار کر اپنے ہاتھ سے کام کرنا خلاف شان معلوم ہوتا ہے۔ پھر صنعتی اسکولوں اور کالجوں کی شدید کمی ہے جہاں نئے آدمی کسی کام کے نظری اصولوں کی تعلیم حاصل کر سکیں جس سے نہ صرف کام کرنا آ جائے بلکہ یہ بھی معلوم ہو سکے کہ وہ اس کام کو کیوں کر رہے ہیں۔ یہ کام وزارت تعلیم کے کرنے کا ہے۔ اگر صنعتوں کی بقا منظور ہے تو اس کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے۔

پاکستان میں نظام تعلیم کو بھی نئی بنیادوں پر استوار کرنے کی ضرورت ہے۔ طوطے کی طرح رٹنے والے تو بہت ہیں، لیکن صحیح انداز پر غور و فکر کرنے کی تربیت نہیں دی جاتی۔ تعلیم تو ذہنی تربیت ہی کا دوسرا نام ہے۔ اس سے انسان میں دو چیزوں کے درمیان فرق کرنے، تحلیل و تجزیے سے کام لینے اور کسی مسئلے کو جانچنے اور پرکھنے کا ملکہ پیدا ہوتا ہے۔ ہر قسم کی سائنسی ترقی — بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ انسان کی ہر قسم کی ترقی کی اساس تعلیم ہی ہے۔ لہٰذا تعلیم و تدریس کے معیار کو بہتر بنانے کی تدبیریں اختیار کرنا لازم ہے۔

غزل

مرزا یگانہ چنگیزی

بندھی ہے نکتے کی آپس میں گفتگو نہ سہی
زبانِ حال سہی، حرفِ آرزو نہ سہی

بھرا ہے بادۂ بے رنگ سے یہ شیشۂ دل
دماغ تازہ ہے اپنا شگفتہ رو نہ سہی

ٹٹول لینے سے بیچارہ کیوں رہے محروم
ہوس نصیب کو احساسِ رنگ و بو نہ سہی

بھری بہار میں نیّت نہ ہوگی ڈانواں ڈول
خیال خام سہی تیری آرزو نہ سہی

مزاج کیوں نہ بہکتا زمانہ سازوں کا
زمانہ اُن کے موافق ہے ایک تو نہ سہی

جو تیری یاد میں کھویا گیا تو کیا پروا
جدھر بھی ہو دلِ گم گشتہ قبلہ رو نہ سہی

پیامِ حق تو اُدھر ہی سے آئیگا اک دن
کھڑے ہیں منتظرِ وقت، جستجو نہ سہی

کہاں وہ جلوۂ عریاں کہاں یہ حُسنِ حجاب
یہی تو دید کے قابل ہے روبرو نہ سہی

غزل

فضل احمد کریم فضلی

امتحاں اور بھی ہونا ہے تو ہاں اور سہی
سیکڑوں غم ہیں جہاں ایک وہاں اور سہی

اور ہو طوق گراں، اور ہو زنجیر کڑی
ناز برداریِ آشفتہ سراں اور سہی

اور اے پھول مہک اور چہک اے بلبل
اک ذرا خاطرِ خونیں جگراں اور سہی

لو اُنھوں نے بھی مجھے رحم کے قابل سمجھا
طبع نازک پہ یہ اک بارِ گراں اور سہی

شدتِ غم میں بھی لازم ہے وسیع النظری
ساتھ ساتھ اپنے خیالِ دگراں اور سہی

قافلے حسرت و ارماں کے ہزاروں گذرے
دل گذرگاہِ غمِ عمرِ رواں اور سہی

ہم نے کل تک تو اٹھایا تھا بہت لطفِ بہار
اب جو آئی ہے خزاں، لطفِ خزاں اور سہی

اس خرابات سے دل سیر تو کیا ہوگا، مگر
اک نظر سوئے جہانِ گذراں اور سہی

غم ہوا اور تو کیا گذرے گی دل پر فضلی
تم یہ کہنے کو تو کہتے ہو کہ "ہاں اور سہی"
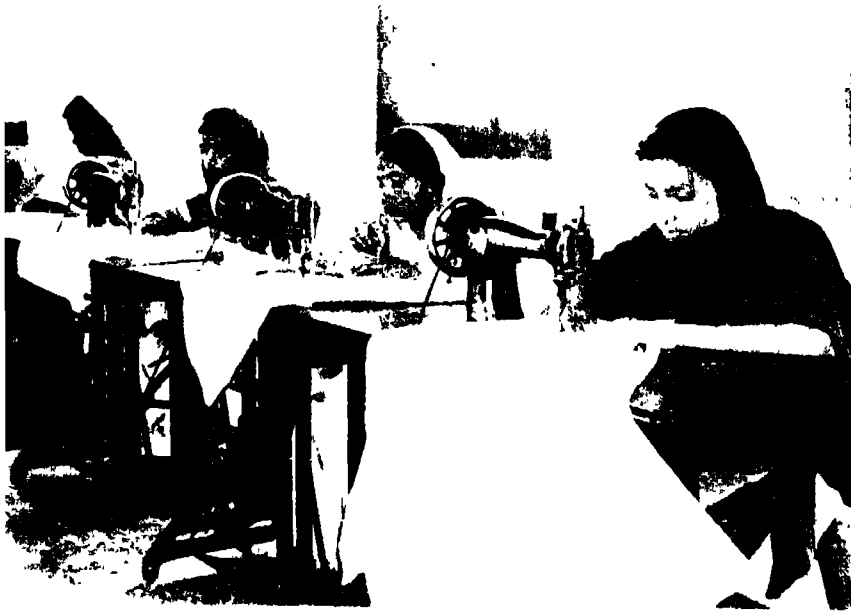
مغربی پاکستان میں مہاجرین کی آبادکاری

مغربی پاکستان تقریباً ۸۰ لاکھ مہاجرین کی پناہ گاہ ہے۔ جنہیں
مختلف منصوبوں میں بسایا گیا اور بسایا جا رہا ہے
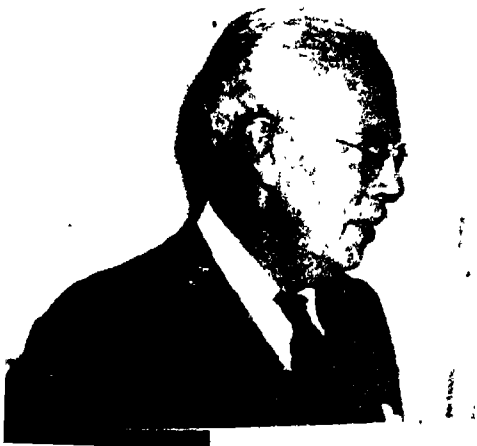
غزل

یوسف ظفر

میں ہوں تیرے لئے بے نام و نشاں آوارہ
زندگی! میرے لئے تُو ہے کہاں آوارہ

تجھ سے کٹ کر کوئی دیکھے تو کہاں پہنچا ہوں
جیسے ندی میں کوئی سنگِ رواں آوارہ

تجھ کو دیکھا ہے کہیں، تجھ کو کہاں دیکھا ہے؟
وہم ہے سر بگریبان و گماں آوارہ

دیر و کعبہ کی روایات سے انکار نہیں
آؤ! دو دن تو پھریں نعرہ زناں آوارہ

لطفِ گلشن کے لئے بادِ صبا پر پہرہ
صحنِ گلشن میں مگر برگِ خزاں آوارہ

تیرے دامن کی طرح دامنِ شب رخشندہ
چار سُو میں ہوں بحسرت نگراں، آوارہ

جلتے بجھتے ہیں ہر اک گام پہ تابندہ نجوم
کوئی ہے آج سرِ کاہکشاں آوارہ

دل کی دھڑکن بھی ہم آہنگ نہیں ہے دل سے
جیسے اک زلفِ رسا رقص کناں آوارہ

بھیگی راتوں میں ظفر پھرتا ہے تنہا تنہا
آہ! وہ سوختہ دل، سوختہ جاں آوارہ

غزل

قیوم نظر

ان کی جب خود نگری یاد آئی
اپنی ہی بے خبری یاد آئی

یاد آیا بھی تو یوں عہدِ وفا
آہ کی بے اثری یاد آئی

دل نے پھر وقت سے لڑنا چاہا
پھر وہی دردبھری یاد آئی

اپنا سینہ ہوا روشن تو نہیں
حسن کی کم نظری یاد آئی

جب بھی دھیان آیا کہیں منزل کا
راہ کی شب بسری یاد آئی

دیکھ کر بے دلی شوق کا رنگ
اپنی آشفتہ سری یاد آئی

اس پہ کیا گذری جو اس عالم میں
پھول کو جامہ دری یاد آئی

باغ کا حال کچھ ایسا دیکھا
شاخ تھی جو بھی ہری یاد آئی

کس کو ہے فرصتِ تزئینِ جمال
بے سبب بے ہنری یاد آئی

غزل

ناصر کاظمی

دشت سے چل کے تا نگر پہنچا
اب کے سیلاب اپنے گھر پہنچا

راستے گنگ، منزلیں سنسان
کیا خبر قافلہ کدھر پہنچا

دُور ہوں کارواں سے غربت میں
اے صبا! تو ہی اب خبر پہنچا

زندگی کے عتاب بھول گئے
دُکھ عزیزوں سے اس قدر پہنچا

دردِ جاں لا دوا نہ تھا لیکن
چارہ گر دیر سے اِدھر پہنچا

دیکھ نیرنگِ گردشِ تقدیر!
کس نے بویا؟ کسے ثمر پہنچا؟

رات کس دل جلے نے آہ بھری
غلغلہ آسمان پر پہنچا

اب تو جاگو! حویلیوں والو!
اب تو سیلاب تا کمر پہنچا

دھوپ ٹھنڈی ہوئی نہ تھی ناصر
کہ ڈبونے کو ابرِ تر پہنچا

غزل

منظور حسین شور

احباب بدلتے جاتے ہیں اغیار بدلتے جاتے ہیں
جتنا غمِ دوراں بڑھتا ہے غمخوار بدلتے جاتے ہیں

ہنسنے پہ نہ جا ہنسنا تو فقط اک عنواں ہے گریانی کا
نغمہ تو وہی ہوتا ہے مگر مزمار بدلتے جاتے ہیں

اک تو ہے کہ تیری نظروں کی زنجیر ہے خطِ ساحل بھی
کچھ لوگ ہوا و طوفاں کی رفتار بدلتے جاتے ہیں

الزامِ سیہ مستی کب تک ساقی کی نگاہوں کو سمجھو
اے بادہ کشو میخانوں کے اسرار بدلتے جاتے ہیں

زنداں کے نوا پردازوں میں کچھ لوگوں پر یہ تہمت ہے
یہ نغموں سے زنجیروں کی جھنکار بدلتے جاتے ہیں

یا اہلِ جنوں کا رونا تھا یا اہلِ خرد کا ماتم ہے
دیوانے تو پھر دیوانے ہیں ہشیار بدلتے جاتے ہیں

اے دَورِ فسونِ آزادی کچھ تو بھی اپنا طور بدل
کچھ ہم بھی اپنا اندازِ گفتار بدلتے جاتے ہیں

اک اور بھی نغمہ اے مطرب اک اور بھی شعلہ اے ساقی
شب ختم ہوئی اب محفل کے آثار بدلتے جاتے ہیں

شورؔ اُن کی نظر کا کیا کہنا اقرار بھی ہے انکار بھی ہے
اقرار بدلتے جاتے ہیں انکار بدلتے جاتے ہیں

غزل

احسان دانش

فطرت نے جسے عشق کا غم ساتھ دیا ہے
عرفانِ زر و جاہ و حشم ساتھ دیا ہے

ہر عزم کے تخلیق کے اعجاز کا اعلان
ہر ضربتِ آذر کو صنم ساتھ دیا ہے

اے قافلہ والو مری ہمت کو سراہو
ہر چند کہ زخمی تھے قدم ساتھ دیا ہے

تو قول و قسم اپنے جو بھولا ہے تو بھولے
ہم نے ترا بے قول و قسم ساتھ دیا ہے

تنہائی گوارا نہیں فطرت کو کسی کی
دل جس کو دیا ہے اُسے غم ساتھ دیا ہے

چھوڑے ہیں سُلگتے ہوئے کچھ داغ نشانی
جس جس نے مرا چند قدم ساتھ دیا ہے

تم رکھ نہ سکے اپنی وفاؤں کا بھرم بھی
تم نے مرا امید سے کم ساتھ دیا ہے

احسان خدا جانے کہاں شامِ عدم ہو
ہستی نے تو تا صبحِ عدم ساتھ دیا ہے

○

انتخاب

عائشہ یوسف

تری آرزو کے ملتے نہ اگر انہیں سہارے
تو کہیں کے بھی نہ رہتے غمِ زندگی کے مارے
کبھی زندگی میں رچ کر، کبھی زندگی سے بچ کر
غمِ زندگی کو پرکھا، غمِ دوست کے سہارے
کوئی تیرگیٔ شب کی ہے ضرور اس میں سازش
جو سحر کی بھینٹ چڑھتے چلے جا رہے ہیں تارے
نہ مجھے بھنور کا ڈر ہے نہ مجھے تلاشِ ساحل
ابھی رُخ بدل رہے ہیں مری زندگی کے دھارے

○

کیا کہیں کیوں ہیں بدگماں سے ہم
کہہ سکیں گے نہ کچھ زباں سے ہم
شعر میں رنگ بھرتے رہتے ہیں
کسی رنگین داستاں سے ہم

ہر نفس ہر قدم بدلتے ہیں
ہم زمانے کے ساتھ چلتے ہیں
جُراتِ شوق سے ترے دَر تک
کس قدر فاصلے نکلتے ہیں
گونج اُٹھے پھر وہ دھیمے دھیمے راگ
ہوگئی شام سائے ڈھلتے ہیں

"گر رہا ہو جائیے"

ابوالفضل صدیقی

"اماں! بسم اللہ حلوا پوری کھا رہی ہو" جیدا نے ہونٹ چاٹتے ہوئے کہا۔ اور للچائی للچائی نظریں بسم اللہ کے لقمہ اٹھاتے ہوئے ہاتھ اور چلتے ہوئے جبڑے پر ڈالیں۔ "چپ رہ نیت کے خراب! تو کھا چکا ہے، شکر نہیں کرتا، روٹی میٹھی ہیں" ماں نے بیٹے کو سرگوشی میں گھڑکا اور کنکھیوں سے سامنے چولہے کے قریب ننھی بسم اللہ پر نظر ڈالی جو بڑے اطمینان کے ساتھ حلوا پوری کھا رہی تھی۔ اور آج صبح تو رمضانی اور اس کے بچوں کو ایک ایک مکئی کی روٹی اور پیالہ پیالہ بھر مٹھا نصیب ہو گیا تھا۔ اور یہ تو ننھی معصوم بسم اللہ تھی، ورنہ ان کا پورا کنبہ ہی دو دو وقت ٹھنڈا چولہا دیکھتا اور پانچ گز کے فاصلہ پر سگا بھائی شبراتی یوں ہی دیکھتا رہتا اور شبراتی کا چولہا سیزن بھر مہینہ بیس پچیس دن اور بقیہ دنوں مہینہ میں اٹھائیس روز گرم رہتا اور گرم بھی [illegible] کے ساتھ حلوا پوری، کچوری پراٹھا، بھنا گوشت، میری روٹی، کھیر کڑاہی پکتی۔ اور شبراتی، اس کی جورو اور ننھی بچی بسم اللہ آنگن میں سامنے پڑی چارپائیوں پر بیٹھے اسی آنگن میں کھاتے رہتے اور ان کی آنکھ اتنی نہ جھپکتی کہ سامنے رمضانی، رمضانی کے دونوں لڑکے اور بیوی فاقہ پر فاقہ منہ میں لئے اور تکتے ہوئے۔ سگا بھائی، سگے بھائی اور اس کے بچوں کو یوں ہی بھوکا دیکھتا رہتا اور خود شکم سیر ہو کر اٹھ بیٹھتا۔

شبراتی اور رمضانی ایک باپ کے دونوں بیٹے ایک ماں کے پیٹ میں پاؤں پھیلائے، بچپن سے جوانی تک اسی گھر میں ایک چولہے کی پکی روٹیوں سے پلے بڑھے۔ مگر پہلے گانوں گانوں تھا، اور اب دس سال سے گانوں کی خاموش اور پرسکون وسعتوں پر شہر لوٹ پڑا تھا۔ گھڑگھڑاتا، گرجتا، دوڑتا شہر اور پیدا نے زمینداروں نے توڑی روک تھام کی، بڑے بوڑھے کسانوں نے ہر چند ناک بھوں چڑھائی مگر شوگر فیکٹری کھل کر ہی رہی۔

گنگا کی ترائی کا علاقہ، بڑی زرخیز زمین، بغیر کھاد پانی بہترین گنا پیدا کرنے والی۔ سرکاری ماہرین زراعت نے پہلے تو جدید ترقی یافتہ شکر کی کاشت کا مزاج تمام علاقہ کے کسانوں میں پیدا کر دیا پھر محکمہ زراعت کے شعبۂ متعلقہ نے بڑے پیمانہ پر اعلیٰ گنے کی کاشت کا شعور پیدا کیا۔ ایک سرکاری فارم بھی قائم کر دیا تاکہ تخم حاصل کرنے میں آسانی ہو اور چند خوشحال زمینداروں اور مہاجنوں کی ہمت افزائی کر کے کئی فارم اور بھی کھلوا دیئے اور کئی ایک کلب پیدا کر دیئے اور جب گنے کی کاشت اتنی بڑھی کہ گڑ اور راب کی کھانڈسالوں کے قابو سے باہر ہو گئی تو گورنمنٹ اور سیٹھوں نے مل کر فیکٹری قائم کر دی۔ کاشتکار منڈی کی تلاش میں تھا ہی، پہلے ہی سال سے فیکٹری بڑی کامیابی کے ساتھ چلنے لگی۔ جنگل میں منگل ہو گیا، صحرا کی تاریک وسعتوں کی روشنیاں جگمگا اٹھیں، پرسکون فضاء بسیط میں مشینیں گھڑگھڑا اٹھیں، سائرن ہو کنے لگے، نغمے پھوٹنے لگے۔ اور چار پیسہ کا نفع تو آدمی بڑی جلدی دور سے دیکھ لیتا ہے۔ فیکٹری میں گنا فروخت کرنے میں ہر اعتبار سے فائدہ ہی فائدہ تھا۔ کسان بڑے زور سے دوڑ پڑے، فیکٹری میں مزدوری اٹھ گئی دس گنی تھی کھیت مزدور پل پڑے بلکہ بہت سے چھوٹی حیثیت کے کسان کھیتی چھوڑ کر مزدوری پر پڑ گئے، پھر نپا تلا کام، سیزن بھر تو مہینہ تیسوں دن لگنے والا۔ اور شبراتی نے بھی کھیتی چھوڑا اور شہر کا رخ کیا۔

رمضانی اور شبراتی دونوں بھائیوں کے پاس باپ کے زمانہ

"روپہلی ریشہ"

کاشت سے بنائی تک روئی
کی صنعت کے مختلف
مدارج جو مغربی پاکستان کی
خاص پیداوار ہے

مغربی پاکستان میں سیلاب کی تباہ کاریاں

سیلاب کا فضائی نظارہ (ہالا سندھ)

امدادی مشن ... سے ہوئی

کی تھوڑی سی موروثی اراضی تھی، دو بیل، ایک ہل، ایک بھینس اور ایک مکان تھا، مدت بھر تو رمضانی شبراتی دونوں بھائیوں میں شبراتی کی تجویز پر بڑا اتفاق اور جیص بیص رہی، رمضانی نے بہتیرا رو کا، بار بار پرانی کہاوت کا حوالہ دیا کہ پرکھے کہہ مرے ہیں "اتم کھیتی مدھم بان، نکھد چاکری بھیک ندان"

اور جب اس نے ارادہ کر ہی لیا کہ فیکٹری میں مزدوری کریگا تو سو جتن سمجھایا کہ "دیکھ یہ مشین چلتے ہاتھ پاؤں کی یاری ہے اور کھیتی باپ دادا کی جنم بھوم ہے، اسے مت چھوڑ، مگر شبراتی کو تو فیکٹری کی مزدوری کی چڑھی ہوئی تھی ایک نہ مانی۔ خیر تھوڑے دنوں ہل، مزدوری اور کھیتی کا ساجھا بھی چلا مگر نبھا نہیں۔ مثل مشہور ہے مندار اور ملنگ کا کیا ساتھ۔ اور شبراتی تو بھائی تھا اور شاید بہت دنوں نہ دیکھ پاتا مگر اس کی بیوی نے اپنے شوہر کی کمائی اور اپنے جیٹھ کی کمائی کا اندازہ کیا۔ وہ روز کما کر لانے والا، یہ سال میں دو مرتبہ خریف ربیع، وہ بھی زمیندار کی نگاہوں سے بچا کر چور کی طرح موٹا جھوٹا، جو، جوار، بجھی، بجھرا، اور سب کے سب بارہوں مہینہ کھانے والے پھر رمضانی چار، دو میاں بیوی دو بیٹے، اور شبراتی اور ان کی بیوی فقط دو دم اور ایک ذراسی جان بسم اللہ، اسے تو گھاٹا ہی گھاٹا تھا، مشترک خاندان کو توڑ دینے کا مطالبہ کیا۔ شروع میں بیوی کی بات پر شبراتی کچھ چونکا پھر جب اونچ نیچ دکھائی تو اپنا فائدہ نظر آیا، دو تین سال چلتے گھاٹا اٹھا کر بھائی کا ساجھا بھی نبھا دیا، کل موروثی کاشت دونوں بیل اور بھینس اور ہل وغیرہ رمضانی کے حصہ پڑا ہر چیز کی قیمت کا تخمینہ ہوا اور اس کا نصف بصورت نقد رمضانی نے کچھ بیوی کا زیور بیچ کر کچھ ساہوکار سے قرض لے کر شبراتی کے حصہ کی قیمت ادا کی صرف رہنے کے مکان میں شبراتی کا آدھا حصہ باقی رہ گیا۔ گھر میں ایک چولہے کے دو چولہے ہوئے، سینہ میں ایک دل کے دو دل ہوئے۔ باہر ایک پیشہ کے دو پیشہ ہوئے اور اس طرح گذرنے لگی۔ رمضانی کی تنگی اور فاقوں میں ایک بیوی اور دو بیٹے شریک رہ گئے اور شبراتی کی کرخنداری مستی و قلندری میں ایک بیوی اور ایک بچی رہ گئی۔ گنے کا سیزن اکتوبر سے شروع ہو کر اپریل تک سات مہینے چلتا، پانچ مہینہ مشین کی صفائی اور شکر کے لدان کا کام ہوتا، سیزن سیزن تو شبراتی کے مزے ہی مزے تھے، نئی چڑھتی جوانی تھی، بدن میں جان تھی، آسانی سے ڈبل ڈیوٹی کرتے

دن کو ڈونگے پر، بوائلر پر، سنٹی فیوگل پر یا بھٹی پر جہاں کہیں بھی ڈیوٹی لگتی کام کرتا اور رات کو گندھک کی بھٹی پر خاص طور پر ڈیوٹی لیتا جس میں رات کی ڈیوٹی کی مزدوری اور پھر گندھک کی بھٹی کے سخت کام کا اولاؤنس بڑی اچھی اجرت مل جاتی۔ مئی سے ستمبر تک ضرور تھوڑی بہت تنگی کا سامنا ہوتا مگر مہینہ میں پچیس روز کا اوسط پڑ ہی جاتا اور یہ پانچ دن میں جو بس وقت فاقہ پڑتا وہ شبراتی کو زیادہ کھلتا بھی نہ تھا کیونکہ یہ بھنے گوشت خمیری روٹی، کھیر، اور حلوے پوری سے ہی ٹوٹتا اور کبھی کبھی ایک دو مٹکی تازہ میٹھی تاڑی بھی چڑھا لیتے اور ساری فکریں معدوم ہو جاتیں اور رمضانی کے سال میں چھ مہینے فاقوں کے اوسط میں کٹتے۔ زمیندار بقایا اور لگان واجب کے مطالبہ میں اپنے بندار میں کل جنس اٹھا کر لے جاتا، پھر ساہوکار کا مطالبہ اور سود در سود علیحدہ چل رہا تھا، دانہ پڑنے سے پکنے تک کھیت سے لگا کھلیان تک بیچارے کو اپنا مال چراتے ہی گذرتی، آئے دن ساہوکار کے سامنے ہاتھ پھیلا رہتا تو دو وقت میں کہیں ایک وقت مشکل سے پلے پڑتی۔ پھر آئے دن کی زمیندار کی بیگاریں، طرح طرح کی روایاتی دھونسیں اور اپنی سال بھر کی محنت کے ثمرہ پر سخت پہرے تھے۔ جاڑوں میں جب رمضانی کے بچوں کی طبیعت رس کھیر کھانے کو چاہتی تو بیچارے اپنے کھیت میں سے گنوں کی پھاندی چراتے اور برابر کے گانوں میں چپکے سے کسی دوست کے کولھو پر پیل لاتے اور رس کھیر سے موہنہ میٹھا کر لیتے۔ اور شبراتی جس دن چاہتے بوائلر میں سے ابلا ابلایا رس آنکھ بچا کر بالٹی میں بھر لاتے اور ہفتہ میں دو بار رس کھیر کھاتے۔ رمضانی اپنی بھینس کا سب گھی زمیندار کے یہاں دے آتے اور مٹھے سے خود وقت کاٹتے۔ پیداوار کا کل گیہوں، چنا، گنا زمیندار کی بقایا میں چلا جاتا، ساہوکار کے سود میں کھپ جاتا اور بیل بھینس کا دانہ اور رمضانی کی غذا ایک ہوتی۔ جس روز شبراتی کا جی کھیر کھانے کو چاہتا یا ان کی بیوی کی طبیعت میٹھی پوریاں کھانے کو ہوتی اور بالعموم اس زمانہ میں ہوا کرتی جب شبراتی کی ڈیوٹی سنٹی فیوگل پر ہوتی تو شبراتی نائٹ مینجر سے کر میٹ تک کی آنکھوں میں دھول جھونک کر شکر کی پوٹ دبا ہی لاتے اور مزدوری کے پیسے نکال کر گیٹ پر سے ابلتا ہوا دودھ خریدتے اور کھیر پکتی۔ اور ستم بالائے ستم یہ تھا کہ شبراتی کبھی آسمان کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھنا بھی نہ جانتے۔ تھے اور نہ دعا مانگنے کے لئے

نہ بادل اور بارش کی امید میں، کہ اللہ میاں کب مینہ برسائیں گے۔ ان کی روزی تو آسمان پر نہ تھی، دہقان کے سامنے زمین پر تھی، اور اللہ میاں کی ساری قدرتیں مشین کے پہیہ میں دکھائی دیتی تھیں، اور "قادر مطلق" فیکٹری کا پرائیویٹ لمیٹڈ۔ اور کبھی کبھی بسم اللہ آسمان پر کالے کالے بادل دیکھ کر کہتی "جس فیکٹری میں میرے ابا کام پر جاتے ہیں اسی کا دھواں تو یہ بادل بن کر برستا ہے تو تمہارے ابا کی کھیتی ہری ہوتی ہے" اور عیدا کو جاڑوں بھر کی مستقل نکلتی ہوئی دھوئیں کی کالی کالی دھار یاد آتی، اور پھر عیدا کہتا "اور یہ آسمان پر گڑگڑاہٹ جو ہوتی ہے یہ بھی فیکٹری چلتی ہے، اور رحما بول پڑتا "ارے لونڈیا لونڈے کیا بکتے ہو! بانو ن تمام خدائی کے، بڑی ملانی کہتی تھیں کہ رعد فرشتے کی آواز ہے، اور یہ بجلی جو لہراتی ہے اس کا کوڑا ہے، اور بارش تو اللہ میاں کرتے ہیں اپنے حکم سے"

اور رمضانی بیچارے سالوں بھر ہواؤں کا رخ دیکھتے، آسمان کے رنگ دیکھتے، اچھی سمت اور برے سمت کی علامتیں دیکھتے، پنج وقتہ نماز کے بعد دعا وکشائش رزق پڑھتے، اور گڑگڑا کر رازق مطلق کے سامنے غیب سے پاک روزی نازل کرنے کی دعا مانگتے۔ پھر دعا کی جزئیات میں جاتے تو برسات اچھی ہونگی، اور سمت پوری ہونگی دعائیں مانگتے۔ صبح سے شام تک ہاتھ نگاہ آسمان ہی کی جانب اٹھی رہتی، اور ہاتھ پاؤں زمین پر چلتے رہنے کے باوجود بھی ان کا ایمان تھا کہ روزی آسمان پر ہے زمین پر نہیں۔ اور رمضانی بیچارے کو ساری عمر پیشانی رگڑتے رگڑتے گٹا پڑ گیا تھا، ٹخنوں پر گھٹیاں ابھر آئی تھیں، اور بھرے پیٹ پر ہاتھ پھیرنا نصیب نہ ہوا تھا اور بقول شخصے ہزاروں لاکھوں من غلہ پیدا کرنے کے بعد بھی روٹی پہ رکھ کر روٹی نصیب نہ ہوئی تھی، اور عید کا خریدا ہوا تہمد جو لوٹ عید تک لنگوٹی سے بھی اوپر ہو جایا کرتا تھا چھ سات مہینہ تو نماز کی پوری ستر پوشی کیا کرتا تھا اور پھر بقیہ پانچ چھ مہینہ تو گھٹنوں سے نیچے لانے میں ان کی جورو کو اپنے دوپٹہ اور پرانی چادر کے چیتھڑوں کے بہتر پیوند لگا کر جوڑا کرنا پڑتا تو کہیں نماز درست ہوتی۔ اور جیٹھ سے لوٹ جیٹھ تک گیہوں چنا، گنا، جوار، باجرا اور مکئی کوئی چیز اوکر بھی نہ رکھ سکتے تھے کہ کھائینگے۔ اور کھائینگے تو پھر کھائینگے بھی بھرے پیٹ پر الحمد للہ کہتے اور فاقہ بھی شکر کے ساتھ گذارتے۔ مگر فاقوں، دھوپوں، لوؤں، اور سردیوں کے ستائے رمضانی کی تندرستی اپنی مثال آپ تھی، نہ معلوم کتنا کس بل تھا ان کھلی ہوئی ہڈیوں میں، اور سر تو کبھی دکھتا ہی نہ تھا۔ اور فاقوں اور بھوکوں سے تنگ آ کر کبھی کبھی رمضانی کی بیوی چیخ ہی پڑتی "اس نگوڑی کھیتی میں کچھ نہیں دھرا ہے، نہ تن کو کپڑا نہ پیٹ کو روٹی" "اڑے بدو بی بی، کسی کی تقدیر میں نپی تلی ہوتی ہے کسی کی تقدیر میں زیادہ، اور ہماری تقدیر میں نپی تلی ہے"۔

"ہوں ہماری تقدیر میں نپی تلی ہے۔ آج ہم فیکٹری میں مزدوری کرنے لگیں، ہماری تقدیر بھی زیادہ ہو جائے گی"۔

"کیا بکتی ہے کفر کے کلمے، توبہ کر توبہ۔ قناعت اور صبر کرنا سیکھ، روزی آسمان پر ہے زمین پر نہیں"۔

"وہ کچھ کہو پر اپنے دونوں بیٹوں کو خیر سے ذرا ہاتھ پاؤں سیدھے ہوتے ہی بھیجوں گی فیکٹری پر مزدوری کرنے، چچا کے قدموں پر، دیکھو کیسے آرام سے کٹ رہی ہے شبراتیا کی!"

"ہوں بڑے آرام سے کٹ رہی ہے، چرخ تو لگ گئی ہے، بوڑھے تھکے بیل کی طرح دم کرتا ہے، اس کمائی میں برکت نہیں، یہ روح کو داغ دار کرتی ہے"۔

"پھر اس کی جورو بیٹی پہ کیسا روپ ہے۔ اور بہروذت دن رات فیکٹری کے کپڑے پہنے بابو بنا پھرتا ہے، یہاں چاروں دم چیتھڑے لادے پھرتے ہیں اور مدتوں سے بھرے پیٹ پر ہاتھ پھیرنا نصیب نہیں ہوا، سال میں بارہوں مہینہ بیل کے ساتھ کام میں جٹے رہو، بارہوں مہینے بھوکے مرتے رہو اور زمیندار کے جوتے کھاتے رہو"۔

(۲)

اور دمہ دق نہ معلوم کیا کیا روگ شبراتی پر دوڑ پڑے، کچھ دنوں فیکٹری کے شفاخانہ میں رہا پھر وہاں کی حدود سے مرض نکل گیا، تین چار ہی مہینہ میں جیسے مشینی تیزی سے سب کچھ گذر گئی اور شبراتی مرے تو گھر میں ایک وقت کھانے کو بھی نہ تھا، کفن دفن کے اخراجات تو بڑی چیز ہیں اور جنازہ آبائی گھر میں رمضانی کے چھپر اور کوٹھرے سے پانچ گز کے فاصلہ پر شبراتی کے حصہ کے مکان میں رکھا تھا اور گھومتے پہیوں کا رشتہ تو چلتے ہاتھ پاؤں سے تھا، اور خیر آج تو وہ مر گئے تھے اور مشین کے پہیوں نے تو ان کے ہاتھ پاؤں کا ساتھ چار مہینے پہلے ہی چھوڑ دیا تھا جب وہ ذرا سست پڑنے

لگے تھے۔ اور اس کے جوڑ بند دن کی چربی موبل آئل کے ساتھ تپ کر بھٹیوں کی گھمر گھمر میں جل گئی تھی، اور اس کی لاش اسی چارپائی پر پڑی تھی جس پر بیٹھ کر وہ حلوا پوری اور بھنا گوشت کھایا کرتا، اور سامنے رمضانی فاقہ سے بیٹھے مونہتا کتے تھے، مگر رمضانی تو کسان تھے، اور بھائی کے رشتہ کے پورے محرم اور بھائی بھی مرا بھائی! ویسے ہر دن کی طرح آج بھی رمضانی کے پاس پھوٹی کوڑی اپنے کفن کے لئے بھی نہ تھی مگر گاؤں کے پنچوں میں اپنی ناک رکھنی تھی، اور پھر سبھی بھائی مردہ اور زندہ میں جو رشتہ ہوا کرتا ہے اس کے تحت اپنے فریضہ کو خوب جانتے تھے۔ چپکے سے گاؤں کے ساہوکار کے پاس گئے اور من مانی شرح سود پر راضی ہو کر قرضہ لائے اور شبراتی کا کفن دفن کیا۔

سویم کے بعد رمضانی نے بیوہ بھاوج اور یتیم بھتیجی کو پھر ساجھے کر لینے کی تجویز پیش کی تو رمضانی کی بیوی بہت جز بز ہوئی۔ اور بولی "اے ہے اکس نیرے پہ ساجھا ہو رہا ہے، نہ ہار میں ٹپریا، نہ گاؤں میں منڈیا"

"ہوں اسی پہ تو ساجھا ہو رہا ہے کہ نہ ہار میں ٹپریا نہ گاؤں میں منڈیا، اور ہمارے پاس دونوں چیزیں ہیں۔ یہ کہاں جائینگی"

"ہم کیا جانیں کہاں جائیں گی۔ یہ تو انہیں کے سمجھنے کی بات تھی جب دودھ ملیدہ، حلوہ پوری کھایا کرتی تھیں اور میرے بخت کو بھولے پڑی تھیں"

"خیر دونوں وقت جب تھا تھا جب انہوں نے سوچا ہوتا۔ اور جب انہوں نے نہ سوچا اور آج ہم نہ سوچیں کہ یہ کہاں ماری پھریں گی"

"ہم کیا جانیں۔ جب ہمارے بچوں کو دوسرا وقت ہو جاتا تھا تو کبھی کسی نے نہ پوچھا اور ایسے ہی سگا چچا آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ڈکارتا رہتا تھا"

"تو یہ بری بات تھی نا کہ وہ ایسا کرتا تھا اور آج میں سگا چچا بھی ایسا ہی کروں تو بری بات ہوگی نا، پھر تم بری بات کرنے کے لئے مجھ کو کیوں آمادہ کرتی ہو؟ دنیا میں پنچ مونہہ کالا کریں اور قیامت کے دن روسیاہ اٹھوں"۔

اور رمضانی کی بیوی نے عاجز سی ہو کر پینترا بدلا اور کھسیا کر بولی "ہمیں اپنا ہی پورا نہیں پڑتا، ہم کسی کو کہاں سے کھلا دیں گے"

"اوں ہوں، اوں یہ بیکار بات، کوئی کسی کا نہیں کھاتا اپنی تقدیر کا کھاتا ہے" وہ ہمارے چولہے میں شریک ہوں گے اپنی تقدیر لے کر آئیں گے۔ اور نہ اہر اتنے سے بھوکے تو مر نہیں جائیں گے کھائینگے کہیں سے کھائیں، روزی تو ہر آدمی تقدیر میں لکھ کر لایا کوئی نپی تلی کوئی بھرپور، تو سمجھتی ہے روزی زمین پر ہے، روزی تو آسمان پر ہے"۔

اور رمضانی کی بیوی کے دماغ میں بگولہ سا بھن بھنا پڑا، جیسے پوری فیکٹری بھڑ بھڑا پڑی "میاں آسمان پر تو ہے روزی نگوڑی، پھر آسمان والے نے کبھی تم کو بھر پیٹ دی تو نہیں اور دیکھو تو جو دن جیا تم سے اچھی کھا گیا۔ اور موت زندگی تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، جو جتنی لکھ کر لایا ہے اس سے پل بھر ادھر ادھر نہیں ہو سکتی"

"بڑی اچھی کھا گیا۔ کیا کہنے، یہ نہیں کہتی یہ کمائی اسے کھا گئی، بے برکتی کمائی، بھرا بھر جوانی سوئی سی نگل گیا تھا، گھن لگ گیا تھا، جان لیکر ہی ٹلی اور چار کے ساتھ دو فاقے اور شامل ہو گئے۔ اور رازقِ مطلق نے ادھر نگاہ بھی نہ اٹھائی اور ان کی نظر کرم جوں کی توں زمیندار کی تجاریوں اور تاجر کی کوٹھیوں پر مرکوز رہی، اور شبراتی کی بیوہ اور بیٹی کو محسوس ہوا کہ رمضانی بکتا ہے کہ روزی آسمان پر ہے زمین پر نہیں اور شبراتی کی بیوی اور بیٹی کی روزی تو زمین پر ہی تھی اور صرف اتنی زمین پر جتنی پر فیکٹری واقع تھی اور اب جیسے وہ دونوں رمضانی کی تقدیر کا بانٹ بانٹ کر کھا رہی تھیں۔

(۳)

اور دیکھتے دیکھتے فاقوں، سردیوں، گرمیوں اور بارشوں کے طوفانوں سے رمضانی کے دونوں بیٹے جوان ہو کر نکلے، ایک سے ایک بڑھ کر بانکا سجیلا، عبدا اگر سنگ خارا کی چٹان تھا تو رحیما لوہے کی لاٹ، رونگٹے رونگٹے پر تو جوانی چھنی سی پڑتی تھی۔ اور رمضانی کی بیوی تو ان کے بچپن سے رائے قائم کئے بیٹھی تھی کہ فیکٹری کی مزدوری پر لگائے گی۔ رمضانی نے اختلاف کیا۔ مگر چھوٹے بیٹے پر تو کوئی اثر نہ ہوا۔ بڑے نے البتہ باپ کی تجویز پر اتفاق کیا۔ بڑی بحث رہی رحیما نے کہا کہ "اماں اب کھیتی وہ کھیتی نہیں رہی ہے جو پہلے زمانہ میں تھی۔ ایک قانون ایگری کلچرسٹ ریلیف ایکٹ بڑے لاٹ صاحب نے بنا کر بھیجا ہے اور ایک لینڈ ریفارم ایکٹ بڑے وزیر صاحب اور بنا رہے ہیں۔ نہ زمیندار کی داب دھونس ہے نہ بیدخلی، اب

وہ بات نہیں ہوگی کہ کسان سال بھر محنت کرے اور زمیندار لے کر چل دے۔ نہ ساہوکار ہی یہ من مانا سودا پائے گا" اور اماں ابا ٹھیک کہتے ہیں یہ فیکٹری کی کمائی دھوئیں کی طرح اڑ جاتی ہے اس میں برکت نہیں۔ دیکھ لو اب چچا بیچارے خیر وہ موت زندگی اللہ کے ہاتھ ہے جو جتنی لکھ کر لایا ہے اتنی ہی جئے گا مگر جیتی زندگی اچھی کھا گئے اور مرے تو کوڑی کفن کو بھی نہ تھی، اگر باپ کی زمین نہ ہوتی تو ساہوکار کا نہ ہوتا دیتا، لاش کفن کو پڑی رہتی، وہ تم کھیتی مدھم بان نکمے چاکری بھیک ندان؟" بس یہ سب باتیں ہیں ہم تو ساری عمر کھیتی والوں کو بھیک مانگتے دیکھتے چلے آ رہے ہیں، اور چاکری والے مزہ کرتے ہیں، دیکھو ہمارے باپ کو عمر بھر روٹی پہ رکھ کر روٹی نصیب نہ ہوئی اور چچا جو دن جئے ٹھاٹھ کر گئے۔ خوب کھا پی گئے۔ اور تمہیں معلوم ہو فیکٹری میں بھی وہ بات نہیں ہے چچا کے زمانہ والی، بڑے لاٹ صاحب نے قانون بنایا ہے فیکٹری ایکٹ اور بڑے وزیر صاحب قانون بھیج رہے ہیں انڈسٹریل ٹریڈس، کل فیکٹری کے مزدوروں میں ذکر تھا اب فیکٹری سیٹھوں کی نہیں مزدوروں کی ہو جائے گی۔ بڑی مزدوری کے ساتھ منافع میں حصہ، اور یہ نہیں کہ جب چاہو مزدور کو نکال باہر کرو۔ ہم کچھ مزدور تھوڑی رہیں گے حصہ دار بن کر کام کریں گے۔" اور رمضانی کی بیوی کی آنکھیں چھوٹے بیٹے کی گراں قدر اور پرمغز تقریر پر چمک اٹھیں اور آہستہ سے بڑبڑائی "دل پڑے نگوڑی کھیتی پہ سال بھر بیلوں کے ساتھ جتے رہو، اور سال تمام پہ ہاتھ جھاڑ کے چلے آؤ۔ اور رحیما تیرے باپ نے تو میری کبھی ایک نہ سنی۔ اگر تو نہ مانے گا تو تیرا دودھ نہ بخشوں گی۔ دھول ڈال نگوڑی کھیتی پہ اور بھائی کے ساتھ مزدوری پر جا۔"

رمضانی اب تک چپکے بیٹھے سن رہے تھے یکدم مشتعل ہو کر گرج پڑے "چپ نادان عورت! تو کیا جانے اس مشین کی کمائی شیطان سے ترتیب اور رحم سے دور کرتی ہے، اس کے پہیہ میں ابلیس ناچتا ہے، یہ روح کو داغ دار کرتی ہے، یہ بدن کو چوستی ہے، اس میں آدمی کا پاک خون پسینہ بن کر بھٹی کی آگ میں جل جاتا ہے اور کھیت کی مٹی میں مل کر گیہوں کی سنہری بالیاں بن کر چمکتا ہے، ہرے بھرے گنے بن کر لہلہاتا ہے، دیکھ جلد رزق بہانے موت، مجھ جیسی بھوک کو دیکھ لے اور وہ مجھ سے دس برس چھوٹا تھا اور آج قبر میں گھس گیا"

"اچھا خیر تم کر لو، کر لو، اپنی کچھ اور؟ ہاں تو اب بتاؤ۔ بہانہ بکا یا موت بکی"،

"دیکھو تو، چہ چہ چہ! پنج وقتہ نمازی ہو کر کفر کا کلمہ نکالتے ہو زبان سے، موت کھیت میں بھی ہے اور موت فیکٹری میں بھی، تم سمجھتے ہو کہ موت کھیت میں نہیں ہے تو تم خوشی سے لے جاؤ دونوں بیٹوں کو اپنے ساتھ ہل چلوانے"

"خیر بی بی تیرے دل کی بات تو میں ماننے سے رہا کہ زمین بیچ باچ کر اور ہل بیل بگاڑ کر گھر بیٹھ جاؤں اور مزے سے دونوں بیٹوں کی کمائی کھاؤں۔ کیوں یہی ہے نا تیری اور عبدا کی مرضی۔ اور بڑھاپے میں اکیلے مجھ سے کام ہو گا۔ رحیما کو تو میں اس کے دادا کی جنم بھوم پہ لگاؤں گا اور بسم اللہ اسے بیاہ ہو گا، بڑھاپے میں ٹہل کرے گی بہو کی بہو بیٹی کی بیٹی"۔

(۴)

رحیما باپ کے دوش بدوش چلا اور عبدا مرحوم چچا کے قدموں پر دوڑا۔ اور تھوڑے دنوں میں رمضانی بھی انتقال کر گئے، شبراتی کی بیوہ بھی مر گئی۔ بسم اللہ رحیما کے نکاح میں آ گئی اور ایک مرتبہ پھر باپ چچا کی سرگذشت کو گویا دوہرا دیا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد بلکہ قانون کے نفاذ کے سال ہی بھر کے اندر رحیما کو پتہ چل گیا تھا کہ اگیری کلچرسٹ ریلیف اور لینڈ ریفارم کے سائے ببول اور املی کی چھاؤں ہیں اور ادھر عبدا نے فیکٹری میں پہنچ کر بڑی جلدی حساب کر لیا کہ فیکٹری کے بہی کھاتوں کی میزان کل بڑوں کے حق میں لگتی ہے اور مزدوروں کے بازوؤں کی رسائی تو بالائی رقموں کی دھائیاں بھی نہیں اکائیوں تک ہی ہو پاتی تھی، رحیما کا نظام تو دستور یہی شدآمد قدیم کے آئین کے تحت چل رہا تھا۔ مگر فیکٹری میں آئے دن تھوڑی بہت نئی الجھنیں دبتی رہتی تھیں، اور دھرم کھاتہ کی رقم مزدوروں سے جرمانہ کی شکل میں جمع کی جاتی تھی۔ جو مزدور ڈیوٹی سے چند پائے جاتے یا کام میں کوتاہی کرتے پکڑے جاتے ان کی اس دن کی پوری مزدوری دھرم کھاتہ میں ڈال دی جاتی اور جو مزدور ڈیوٹی دے چھینے نہ پکڑے جاتے ان کی بھی مہینہ میں ایک دن کی مزدوری دھرم کھاتہ میں پڑتی۔ آخر الذکر رقم کی ادائیگی میں کچھ لیڈر قسم کے مزدوروں نے اعتراض کیا۔ نوبت ہڑتال تک پہنچی، مگر ہڑتال آسان نہ تھی بیسیوں ہل چاروں طرف کے

چھوٹے بڑے کسانوں کا مفاد اس میں تھا کہ فیکٹری تیزی سے چلتی رہے اور ان کا گنا زیادہ سے زیادہ بکتی رہی اور گرمی شروع ہونے سے قبل ہی گنے کا بڑا جز پل چکا ہو جبکہ گنے میں وزن زیادہ ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ دو تین دن تو فیکٹری بند رہی اور پھر بہت جلد علاقہ کے کاشتکاروں کی مدد سے نئے مزدور بھرتی کر لئے۔ پرانے مزدوروں نے پکٹنگ کیا، ایک مرتبہ پھر فیکٹری بند ہو گئی۔ فیکٹری نے ابکی مرتبہ بڑے کاشتکاروں اور خود کاشت کرنے والے زمینداروں کے اشتراک عمل سے پھر نئے مزدور بھرتی کئے اور پرانے مزدوروں نے پھر پورے زور کے ساتھ ستیہ گرہ کیا، اور اب کی مرتبہ پولیس کے زیر سایہ چلنا شروع ہوئی، اور جب لاٹھی چارج اور ٹیئر گیس سے قانونی مسئلہ حل نہیں ہوا کرتا تو پھر گولی کا نمبر آتا تھا۔ اور گنے کی مشین اور گولی کی مشین، مشین مشین بہنیں ہی بہنیں تو تھیں۔ اور بہن کے خون کی حفاظت کے لئے بہن بروئے کار آئی، کئی باڑھیں چلیں، اور ایک گولی عیدا کے حصہ میں بھی پڑ گئی۔ اور عیدا اپنے چچا کی قسمت سے دوچار ہو گیا۔ بغیر بیاری الاؤنس پائے ہوئے، بلا فیکٹری کے شفاخانے کی دوا کا ایک قطرہ پئے ہوئے "قانونِ قدرت سے نہ ہی مروجہ ضابطے کے زور سے؛......

اور تیسرے روز بھرپور جوان لاش پوسٹ مارٹم کے بعد رگ رگ دگار کے ماں کے حوالے کر دی گئی۔ اور شبراتی کی بیوہ کو تو فیکٹری کی موت کے جھٹکے کا اندازہ نہ ہوا تھا کیونکہ شبراتی پر ڈبل ڈیوٹی، گندھک کی گیس، بھٹی کی آنچ اور لاکھوں من لوہے نے ضیق النفس اور دق و سل کی آڑ سے حملہ کیا تھا مگر رمضانی بیوہ کے جوان بیٹے کی چٹان سی چھاتی پر شکر کی مشین کی حمایت میں گولی کی مشین نے گرج کر وار کیا تھا کھلم کھلا دن دہاڑے کاغذی قانون کی ٹیک لے کر۔ اور ایک بیٹا کھو کر رمضانی کی بیوہ کو پتہ چلا کہ آسمان پر ہی نہیں مشین کے پہیے میں بھی عزرائیل رہا کرتے ہیں جو چپکے چپکے آہستہ آہستہ روح قبض کرنے کے بجائے کبھی کبھی کھلم کھلا دن دہاڑے بھی گرج کر دے مارتے ہیں۔

اور اب وہ اتم پیشہ پر قانع ہوئی۔ اپنا آدھا کھو کر، دو وقت ہی ایک ہی وقت کھانے پر اکتفا کیا۔ اور اسے یاد آیا کہ اس کا کسان شوہر کہا کرتا تھا کہ مشین کی کمائی میں برکت نہیں، یہ شیطان سے قریب اور حق سے دور ہے، یہ روح کو داغ دار بناتی ہے، اس کے پہیے میں ابلیس ناچتا ہے، اس میں آدمی کا پاک خون پسینہ بن کر بھٹی کی آگ میں جل جاتا ہے۔ اور کھیت کی مٹی میں کسان کا پسینہ مل کر گیہوں کے سنہرے سنہرے خوشے بن کر چمکتا ہے۔ ہرے بھرے میٹھے میٹھے گنے بنکر جھومتا ہے۔ اور زرعی قناعت کی سنہری چھاؤں میں اس تین آدمیوں کے مختصر سے خاندان کو بے زری کی کلفتیں زرداریاں سی معلوم ہونے لگیں اور تہ بہ تہ فاقے شکم سیریاں سی محسوس ہونے لگی۔ چند سال فیکٹری اور کھیتی کی آمدنیاں ساتھ ساتھ چلتی رہیں اور ایک دوسرے کی ناہمواری کا ازالہ کرتی رہیں اور اب تو ایک کھیتی ہی کھیتی کا ناہموار اور خار دار راستہ زندگی کاٹنے کا ذریعہ رہ گیا تھا۔ خالص تقدیری پیمانہ جو کبھی من کبھی دو من، چار من، چھ من دس من بارہ من پر چھلک جاتا اور کبھی بغیر ہی کسی من کے یوں ہی خالی چھلک کر رہ جاتا، غرض گھر کے نظام نے پھر رمضانی کی تاریخ کو دوہرا دیا اور دو سال ہو چکے تھے، رحیما کھیتی کا پاک کام کر رہا تھا۔ ایک روز تپتی دوپہر میں بسم اللہ اس کے لئے کھیت پر کھانا لے کر جا رہی تھی، سورج کی شعاعوں کا کل قرمزی رنگ چہرہ پر روج سا بن کر چڑھ گیا تھا، اور راہ پر سے راستہ کی باریک باریک گرد نہیں پوڈر بن کر تمام چہرہ پر چھائی ہوئی تھی۔ ایک ہاتھ سے سر پر کھانے کی ڈلیا سنبھالے دوسرے ہاتھ میں پانی کا لوٹا لٹکائے منزل کی جانب لو لگائے الہڑپن سے چلی جا رہی تھی۔ صبح کا شکار کا نکلا زمیندار کا نوجوان بیٹا شہباز خاں اپنے ساتھیوں کے جلوس میں واپس آ رہا تھا۔ بسم اللہ کی نگاہیں تو دو ایک ایک مرتبہ چار ہو کر فطری طور پر جھک گئیں مگر شہباز خاں کی تو مرکوز ہو کر رہ گئیں گھوڑے پر سے مڑ مڑ کر دیکھتا رہا اور دوسرے روز ٹیننسی ایکٹ کے مطالبوں میں رحیما کس لیا گیا، اور تھوڑے ہی کہنے پر رحیما زمیندار کا مطلب سمجھ گیا۔ لیکن بہت کچھ کہنے کے بعد شہباز خاں اور اس کے آدمیوں کو اندازہ ہو گیا کہ یہ آسانی سے قابو میں آنے والا نہیں ہے اور پورے ہتھکنڈے ختم کرنے کے بعد یقین ہو گیا کہ رحیما کی جیتی زندگی بسم اللہ شہباز خاں کے ہاتھ آنی محال ہے، مگر دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر؟ کبھی سوچتا کہ کھیتی باڑی چھوڑ چھاڑ فیکٹری میں مزدوری کرنے لگوں، پھر دابِ دھونس جانے مگر زمین کیسے چھوڑ دے، اور پھر مشین کی کمائی جس کے متعلق اس کا باپ کہا کرتا تھا "یہ شیطان سے قریب اور حق سے دور کرتی ہے، یہ روح کو داغدار بناتی ہے، اس میں برکت نہیں، اس کی بھٹی میں آدمی کا پاک خون پسینہ بن کر جل جاتا ہے، اس کے پہیہ میں ابلیس ناچتا ہے۔ اور کھیتی کی پاک کمائی، کھیت کی مٹی میں

(باقی صفحہ ۷۶ پر)

فکاہیہ

پیچ

عصمت انصاری

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں کوئی آٹھ نو برس کی تھی تو اپنے تینوں بڑے بھائیوں کے ساتھ پھوپھی ماں کی حویلی کی چھتوں پر خوب گڈی اڑایا کرتی تھی۔ پھوپھی اماں کی حویلی، کنویں والی حویلی کے نام سے مشہور تھی۔ اور اس کے دالان کی چھت اتنی بڑی تھی کہ پچاس پچاس پلنگ بچھ سکتے تھے۔ کنواں زینے کے پاس تھا۔ منجھلے بھائی جن سے میری خاصی بنتی تھی، کہا کرتے "تم کہ اگر کنویں میں سے کبھی کوئی آواز آئے تو پلٹ کر کبھی نہ دیکھنا بس کلمہ پڑھتی ہوئی آگے بڑھ جانا۔" میں بھی ان کی ہاں میں ہاں ملا کر کہتی کہ "انا اماں کہتی تھیں کہ غدر میں لوگوں نے اس میں بڑا مال بھرا تھا۔ اس میں بڑے بڑے گھروں کے خزانے ہیں۔ وہ خزانے بھینٹ مانگتے ہیں۔ اس لئے یہ کنواں بھاری ہے۔" حالانکہ سب روز وہاں نہاتے اور کوئی بھینٹ نہ چڑھتا اور خزانہ دیکھنے کی حسرت دل ہی میں رہ جاتی۔

میں جب بھی اپنے بھائیوں کے تعاقب میں جاتی۔ تو ایسی تیزی سے اوپر چڑھتی۔ کہ ان سیڑھیوں کو جو قطب مینار کے آدھے کھنڈر سے کم نہ تھیں، ایک سانس میں طے کر لیتی۔ اور اوپر ہی جا کر سانس لیتی۔ پیچھے مڑ کر نہ دیکھنے کی نصیحت مجھے ہمیشہ یاد رہتی، اور کلمہ برابر پڑھتی رہتی، لیکن دل ہی دل میں زبان تو ساکت ہوتی تھی بخشش کے لئے سوا لاکھ کلمہ پڑھا اسی زمانے میں ہو گیا ہوگا۔ میں اکیلی چڑھ تو جاتی تھی لیکن واپسی میں اکیلی کبھی نہ آتی۔ بھائیوں کے لئے اوپر کے کام کے لئے لونڈے سے کم نہ تھی کبھی پانی، کبھی سادی، کبھی گڈیاں۔ اور جب کبھی ان سے مانجھا یا سادی لینی ہوتی تو ان کے لئے پان بنا کر بھی لے جاتی تھی۔ حالانکہ پان بنانے میں مجھے انا اماں کی بڑی باتیں سننی پڑتی تھیں۔ "دیکھو، کہتی ہوں بیوی سے، پٹاری کا ستیاناس ہو رہا ہے۔ یہ پان کہاں لے جا رہی ہو، دیکھو میاں کے ویسی پان نہ لے جانا۔" اور میں اس وقت اپنے دل میں کہتی۔ کہ کھا گئی کمبخت بڑھیا۔ آج چاروں مل کر اس نصیحتوں کی پوٹلی کو ضرور کنویں کی بھینٹ چڑھا دینگے۔ کم از کم خزانہ تو ہاتھ آ جائے گا۔ جب میں سوچتی کہ بڑھیا کی نیفی ہم چاروں کنویں میں یک دم پھینک دیں گے تو مجھے فوراً خیال آتا کہ بھینٹ تو پھوپھی کی چڑھتی ہے۔ مجھے بڑے بھائی کا خیال آتا اور میں جلدی سے پٹاری بند کر کے بھاگ جاتی اور کلمہ پڑھتی ہوئی زینے پر چڑھ جاتی۔

ہاں تو پھوپھی اماں کی چھتیں پتنگ بازی کا اڈا تھیں۔ ان چھتوں پر بڑے بھائی کا راج تھا۔ کیا مجال جو آس پاس کا کوئی لڑکا ان کی موجودگی میں ادھر آ جاتا۔ حالانکہ بندروں کی طرح تاک لگائے بہتیرے کھڑے رہتے تھے۔ ان چھتوں پر بڑی ڈوریں پڑا کرتیں اور دس بارہ گڈیاں بھی کٹ کر آ جاتیں۔ جب تینوں بھائی ماسٹر سے پڑھنے جاتے اور مجھے اپنی چرخیوں اور گڈیوں کے پہرے پر چھوڑ جاتے، تو میں بھی وہاں پہرے کے سپاہی سے کم نہ ہوتی۔ جب کوئی لڑکا گڈی لوٹنے لگتا تو میں وہیں سے ہانک کر آواز لگاتی "ٹھہر تو جا چھجو کے بچے، آنے دے بھائی کو، تیری ایسی گت بنواؤں گی کہ یاد رکھے گا۔" جس کی شکایتیں زیادہ کرتی، بھائی موقع پا کر اس کو خوب مرغا بناتے۔ اور نہ کرا کر ہی چھوڑتے۔ یہ چھجو کمبخت تو دو دفعہ مرغا بن چکا تھا، لیکن وہ ایسا ڈھیٹ تھا کہ باز نہ آتا تھا۔ آخر تھا نہ قصائی کا۔ بڑا ہی نڈر، کالا بھجنگ لنگوٹ باندھے اور کرو شیے کا بنیان پہنے، ادھر ادھر لنگور کی طرح چھلانگیں لگاتا رہتا زیادہ تر لوگ اسی کی دوکان سے گوشت لیتے تھے۔ گلی کے پھاٹک کی نکڑ پر ہی ان کی دکان تھی۔ ہمارے ہاں بھی گوشت اسی کے ہاں سے آتا تھا۔ وہ ہر روز صبح پوچھنے آتا گوشت کتنا آئے گا جی۔ جی، وہ بڑے مزے سے کھینچتا۔ مرغا بنانے کے دونوں مرتبے بھائیوں کو

وران میں ملے تھے۔ ویسے تو وہ کیا ہاتھ تم نے والا تھا۔ میں اسے
ت کی دھمکی دیتی کہ آج تو آئے گا تو گوشت پوچھنے، پھر تیری کیا
ت آتی ہے، لیکن تھا وہ بھی بڑا ہی چالاک۔ گوشت پوچھنے وہ جب
جب صبح بھائی اسکول گئے ہوتے۔ یا شام کو ماسٹر صاحب آتے اور
میں پوچھ کر بھنبھیری کی طرح بھاگتا۔ پھر چاہے اتا اماں چیختی رہتیں۔
"ارے کمبخت بات تو سنا کر" لیکن وہ اس وقت اتا اماں کو بھتنی
نہ سمجھتا کہیں ایسا نہ ہو، اس پر سوار ہو جائیں۔

بڑے اور منجھلے بھائی پیچوں کی بڑی تیاریاں کرتے، سادی کو سُوت
میں۔ مانجھے پر شیشہ پھیر رہے ہیں۔ باقاعدہ ان کے پیچ بند و پہلوان
کے سے لڑا کرتے۔ وہ پیچوں میں بڑے ماہر تھے۔ محلے کے سب
ان سے پیچ لڑاتے ڈرتے تھے جو ان کو اُستاد نہ کہتا، ان کے پیچھے پڑ
تا جاتے۔ لیکن بندو کا لڑکا بڑا ناک والا تھا اس کی تو ان سے ایسی
یسے اکھاڑے میں دو چکت ہونے سے پہلے داؤں دکھا رہا ہو۔ روز
بار دکھتا تا لیکن لڑانے سے باز نہ آتا۔ میں خوب اس کی ڈور لوٹتی۔ وہ
ب ڈھیل دے دیکر جھٹکے مارتا۔ اکثر مجھے اپنی دو پٹیا کا کونہ انگلی پر
پڑتا۔ جتنی دفعہ بھی میری انگلی کٹی، اسی کے جھٹکوں سے۔ جب میں
اوٹی کرتی تو دو نو بڑے بھائی تو اسی طرح پیچ لڑاتے رہتے، اور
بھائی جو گڈیاں لوٹنے پر مقرر تھے، بھاگے ہوئے آتے اور اگر
گلاس میں بچی کچی پانی کی دو بوندیں پڑی ہوتیں تو وہ ٹپکا کر میری
ٹیاپں سے دو بھی پھاڑ کر باندھ دیتے۔ اگر خون نہ رکتا تو بھولے دی
نے کے لیے بڑے بھائی سے کہتے، میاں بھائی اس کی انگلی بہت
گئی ہے۔ دو تین مرتبہ میں تو وہ سن ہی نہ پاتے تھے۔ جب پیچ کاٹ کر
ت ہوتی تو بڑی تیزی سے کہتے "میری شیروانی کی جیب میں پھنکری
ہے، وہ اتنے دو جب۔ میرے، مرچیں لگتیں اور میں چیختی تو وہ بڑے
کی سی سخاوت کرتے "چلو یہ ڈور تم لے لو" اور میں اپنی ساری تکلیف
جاتی۔ اپنی ایک پیسے کی چار والی دمڑیل کے ساتھ بڑھ سے اس
ح موڑتی، جیسے بھائی ادھے اور پیسے والی کو موڑا کرتے تھے۔ جب
اسے اپنے سیدھے کئے باندھ کر اڑاتی اور وہ سامنے گوندنی میں
جاتی یا ہمسائی کی بیری میں اٹک جاتی تو میں بڑی رنجیدہ ہو جاتی،
ن بچارے منجھلے بھائی جن کو مجھ پر بڑا ترس آتا تھا۔ خود میری دمڑیل میں
باندھتے اور اونچی کرکے ڈور مجھے دیدیتے۔ اور بڑے بھائی کی
آواز پر کہ وہ "آیا چڑا، لینا اسے۔ بڑی لمبی ڈور ہے۔" وہ فوراً اسکے
تعاقب میں بھاگتے۔ میں اپنی گڈی کو دو چار ٹھمکیاں دیتی اور پھر
وہ بیچاری بجلی کے تاروں میں اٹک جاتی۔ جہاں اناڑیوں کی ڈھیروں
رنگ برنگ کی گڈیاں لٹک رہی ہوتیں۔ میں جلدی سے جھٹکا دے کر
ڈور توڑ لیتی کہ کہیں بجلی کا کرنٹ نہ آ جائے۔

جب میں تھک کے ٹھوڑی پہ ہاتھ رکھ کر اور گھٹنے پہ کہنی ٹکا کر
دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھتی تو بھائیوں کی باتیں بڑے غور سے سنتی،
وہ اکثر فرفری زبان میں بولا کرتے تھے۔ اور پیچ لڑانے میں خوب باتیں
کرتے۔ میں جب کہتی بھائی یہ کونسی انگریزی ہے۔ ہمیں بھی سکھا دو۔
تو وہ کہتے یہ انگریزی سے بھی مشکل ہے پہلے انگریزی آئے تو پھر یہ
بولی جاتی ہے۔ جیسے اُردو کے بعد فارسی اور عربی ہے ایسے ہی انگریزی
کے بعد فرفری ہے۔ میں اپنے دل میں بڑا فخر محسوس کرتی کہ ہمارے بھائی
بڑے قابل ہیں۔ حالانکہ بڑے بھائی نویں میں اور چھوٹے صرف ساتویں
ہی میں پڑھتے تھے۔ منجھلے تو ابھی چوتھی ہی میں تھے۔ اور میں؟ ہماری گلی
ہی میں جو پرائمری اسکول تھا، اس کی دوسری میں۔

میں اپنی اُستانی کو بہت چاہتی تھی۔ وہ صورت شکل کی خاصی تھیں۔
اور بالکل لڑکی سی تھیں۔ روز نئے نئے جوڑے اور چُنے ہوئے دوپٹے
پہنتی تھیں۔ قد اگرچہ خوب لمبا تھا، پھر بھی اونچی ایڑی کی جوتی پہنتی
تھیں۔ میں اکثر ان کے لئے اپنے گھر کی لگی ہوئی موتیا کا ہار بنا کے لے
جاتی۔ اور وہ شکریہ کے ساتھ اسے اپنے جوڑے میں لگا لیتیں۔ کبھی کبھی
گھر سے پھول لگا کر آتیں، تو میرا ہار ہاتھ پر لپیٹ لیتیں۔

کئی اُستانیاں اُن سے ملتی تھیں اور مذاق ہی مذاق میں ان کو
گلدستہ کہتیں۔ وہ بیچاری ہنس کر خاموش ہو جاتیں۔ اکثر ہماری کلاس کی
لڑکیاں دوسری کلاس کی لڑکیوں سے لڑ پڑتیں۔ وہ کہتیں ہماری اُستانی
اچھی ہے۔ ہم کہتے ہماری سب سے اچھی ہے۔ ایک مرتبہ ہیڈ مسٹرس تک
یہ بات پہونچ گئی۔ انہوں نے اپنی عینک ناک پر سے اوپر کھسکاتے
ہوئے، رولر کو دو چار مرتبہ میز پر مار کر کہا، آئندہ ایسی بات نہ سنوں،
اتنی اتنی سی فتنیاں اور یہ گن، اُستاد اُستاد سب برابر ہیں۔ سیدھی لائن
بنا کر خاموشی سے منہ پر انگلی رکھ کر اپنی کلاسوں میں جاؤ، ہم خدا کا شکر
کرتے ہوئے کہ یہ رولر صرف میز تک ہی رہا۔ کچھ دور تک تو چپ چاپ
آئے اور آگے آکر پھر لونڈیوں کی طرح بڑبڑانے لگے۔ دروازے پر

انتظار میں کھڑی ہنسیں۔ استانی جی نے کہا جلدی آؤ، جغرافیہ کا گھنٹہ نکلا جا رہا ہے اور ہم تیزی سے کلاس کی طرف چلنے لگے۔ استانی جی نے بڑی شفقت سے پوچھا کس کس کے کنکوے رُل گئے۔ ہم نے کہا جی بچ گئے۔ سعیدہ جو بڑی چٹاخ پٹاخ تھی اور کلاس میں رہتے بڑی ہستی کہنے لگی میں نے تو تینوں مرتبہ درود شریف پڑھ کر اپنے اوپر پھونکا۔ استانی جی نے کہا ہاں یہ اسی کی برکت تھی۔ چلو جلدی بیٹھو۔

بڑے بھائی جب پیچ لڑاتے تو کہتے "یار ماموں جان کے آجکل خوب پیچ لڑ رہے ہیں۔" اور پھر فرفری پر اُتر آتے۔ اور میں ان کا منہ وفادار کتیا کی طرح تکنے لگتی۔ ماموں جان حال ہی میں علی گڑھ سے بی۔ اے پاس کرکے آئے تھے، نانی اماں کے اکلوتے بیٹے تھے، بچپن ہی میں وہ منصب دار ہو گئے تھے کمخواب کی شیروانیاں ان کے پاس بہت تھیں لیکن وہ فخر سے علی گڑھ کی کالی ترکش کٹ ہی پہنا کرتے تھے۔ ماموں جان اچھے خاصے چھبیلے جوان تھے، بہت حسین تو نہ تھے لیکن خاصے خوش رو تھے۔ محلے کی بہتیری لڑکیاں ان کو چاہتی تھیں، اکثر تو نانی اماں کا ہاتھ بٹانے آجاتیں کبھی ان کی ٹانگیں دباتیں، کبھی ان کی صحنک کنگھی نکال کر سر گوندھتیں اور پھر تیلے دانی میں لپیٹ کر پٹاری میں رکھ دیتیں، سرمے کی سلائی دھو کر لا دیتیں۔ جب بھی نانی اماں سرمے دانی میں سلائی ڈال کر جھٹکتیں تو ماموں جان کو ضرور آواز دے کر کہتیں "آ بیٹا منو، تو بھی کبھی کبھی آنکھوں میں سرمہ لگا لیا کر، بھیجوں سرمے دانی؟" ماموں کہتے، ہاں رات کو سوتے وقت لگاؤں گا۔ اس وقت تو ایک پان بھجوا دیجئے۔" پردے کے مارے خود تو ادھر نہ آتے تھے اور نہ ایسی خاص لفٹ دیتے لیکن سلام ضرور کر لیتے اور وہ شرما کر کواڑ کی اوٹ میں ہو جاتیں۔

ماموں جان کو خود تو اپنی حیثیت پر اتنا غرور نہ تھا، لیکن ان کی چاہنے والیوں کو بہت تھا۔ وہ اپنے آپ کو لیلا چٹنس سے کم نہ سمجھتی تھیں۔ ان میں سے اکثر تو میرے سکول کی پانچویں جماعت کی تھیں۔ انا اماں ان لڑکیوں کو آنے جانے پر بہت ڈانٹتی۔ ان میں سے بہت سی میری دوستی کا بہانہ بنا دیتی تھیں۔

ایک دن بڑے بھائی نے پھر وہی فقرہ دہرایا۔ "یار ماموں جان کے خوب ہی پیچ لڑ رہے ہیں۔" میں نے کہا "بھائی کس سے" منجھلے بھائی بولے، تمہارے سکول کی چھت سے۔ اور دونوں ٹھٹھہ مار کر ہنسنے لگے۔ میں جل ہی تو گئی۔ میں نے کہا بتاتے کیوں نہیں کہیں چھت بھی پیچ لڑاتی ہے۔ بڑے بھائی نے ڈانٹ کر کہا۔ چپ رہو۔ تمہارے سمجھنے کی بات نہیں۔" اور پھر فرفری میں بولنے لگے۔ دوسرے دن ہماری استانی جی دھوپ میں چھت پر ہماری کلاس لے رہی تھیں، بورڈ پر ہمیں سوال سمجھا رہی تھیں۔ تو ایک سرخ رنگ کی گڈی پہلے تو بورڈ کے سٹینڈ میں ٹکرائی اور پھر بورڈ پر سے پھسلنے لگی۔ استانی جی کے ہاتھ سے چاک چھوٹ گیا۔ انہوں نے گھبرا کر پہلے پتنگ باز کو دیکھا اور پھر شرما کر کھینچے ہوئے دوپٹے کے گھونگٹ کی آڑ لی۔ ان سہیلیوں سے سہما ہوا جوڑا پتنگ باز کی طرف تھا۔ سب لڑکیوں نے پتنگ باز کی طرف دیکھا اور میں چونک سی گئی، یہ ماموں جان کیا ہو گیا۔ استانی جی نے گڈی اس طرح چھڑائی جیسے رہائی دی ہو۔

وہ روز چھت پر دھوپ میں کلاس لیتیں۔ کبھی کمر کو خوب بل دے دے کر ڈرل کراتیں کبھی تپلی تپلی روغن لی انگلیوں سے سوال سمجھاتیں اور نقشے بناتیں۔

ایک دن استانی جی نے مجھ سے پوچھا۔ تمہارے ماموں جان ٹیوشن کرتے ہیں۔ میں نے کہا نہیں وہ کہیں نوکر نہیں ہیں حالانکہ میں ٹیوشن کا مطلب ہی نہ جانتی تھی۔ اکثر گھر میں ماموں جان کی نوکری کا ذکر ہوتا۔ تو نانی اماں کہتیں۔ اے خدا نخواستہ کیا ضرورت۔ توبہ اس کے دشمن نوکری کریں۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ اس کے باپ نے نہ کی۔ اس کے دادا نے نہ کی۔" پھر وہ اپنی بیٹیوں کے پیچھے بری طرح پڑ جاتیں۔

استانی جی کہنے لگیں، میں میٹرک کا امتحان دینا چاہتی ہوں، انہوں نے گلابی رنگ کا لفافہ دیتے ہوئے کہا کہ اپنے ماموں کو دے دینا اور جواب چپکے سے مجھے لا دینا۔

ماموں جان نے ان کی ٹیوشن کر لی۔ اب وہ صرف اس وقت ہی پتنگ اڑاتے جب ہماری کلاس باہر چھت پر لگتی۔ ورنہ اپنے کمرے کی کھڑکیاں کھول کر خوب سُریلی آواز میں ہارمونیم پر گاتے۔ استانی جی بھی ماموں جان کی غزلیں تفریح میں یا چھٹی کے بعد مجھ سے سنا کرتیں۔ مجھ پر اب ان کی خاص عنایت رہنے لگی تھی۔ ماموں جان اکثر مجھے مضمون لکھوا دیتے۔ استانی جی پوچھتیں کہ کس نے لکھوایا، تو میں صاف مکر جاتی اور وہ ہنسنے لگتیں۔

میرے بھائی ماموں جان کے پیچوں کی باتیں فرفری میں خوب

(باقی صفحہ ۹۵ پر)

افسانہ

گلی در گلی

حمید کاشمیری

ایکا ایکی دونوں طرف سے زور کا ریلا جو آیا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی پسلیاں ہی ٹوٹ گئیں۔ وہ سمٹا سمٹایا پیچھے دیوار کے ساتھ جا لگا اور پانچ چھ آدمی گتھم گتھا ہوتے اس کے اوپر آن گرے۔ اس نے پھر بھی کوئی جوابی کارروائی نہیں کی۔ بھیر موالی تو پہلے ہی سے اس کی جان کے بیری تھے۔ اس کے اپنے ہاتھ پاؤں میں اگر دم نہ ہوتا تو جانے وہ لوگ کب کا اسے ٹھکانے لگا چکے ہوتے۔ اگرچہ اس نے ایک سینما پر موالیوں کے پورے گروہ کو مار بھگایا تھا اور اپنی دھاک بٹھا لی تھی، مگر اس واقعے کے بعد اسے خود بھی تو کتنی تکلیف کا سامنا کرنا پڑا تھا اور ٹکٹ بیچنا تو درکنار وہ کئی مہینے تک اس سینما کا رخ بھی نہ کر سکا تھا۔ آخرکار وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ کاروبار اگر لڑائی جھگڑے کی بجائے پرامن طریقے سے جاری رہے تو زیادہ بہتر ہے۔ مگر آج تو بھیڑ تھی کہ سیلاب کی طرح امڈی چلی آ رہی تھی۔ اس نے پہلے دو شوؤں میں بھی ٹکٹ خریدے تھے، مگر اس شو کی سی بھیڑ تو دونوں میں نہیں تھی جیسے فلم آج ہی آج ہو گی پھر کبھی نہیں۔

جب وہ قطار میں تھا تو بمشکل پانچ سات آدمی اس کے آگے تھے اور اب وہ کم از کم تیس آدمیوں کے پیچھے ہو گیا تھا اور ٹکٹ ملنے کی امید بھی بہت کم رہ گئی تھی، مگر ریلا تھمنے میں نہ آتا تھا اور ہر ریلے کے ساتھ ایک شور مچتا اور چند آدمی اور لائن میں گھس آتے۔ اس نے اپنی پھنسی ہوئی گردن لائن سے آگے نکال کر دیکھا تو ہجوم اور بڑھ چکا تھا۔ اس نے اپنے پیچھے والے آدمی سے بولنا چاہا مگر اچانک ایک اور ریلا ایسا آیا کہ اس کے لئے سنبھلنا ہی مشکل ہو گیا۔ اب کے اس نے تاؤ کھا کر ایک قہر آلود نظر لائن پر ڈالی، قدم مضبوطی سے جمائے اور اپنے چوڑے چکلے سینے کو تان کر آگے [illegible] تو ساری قطار کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اب اس نے پوری قوت سے آگے کو دھکا لگانا شروع کیا اور پچھلی ساری قطار اس کے پیچھے پیچھے بڑھنے لگی۔ ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ ایک ایک کر کے اگلے آدمی لائن سے باہر نکلنے لگے اور وہ سب کو دھکیل دھکیل کے نکالتا ہوا خود کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ کھڑکی پر پہنچ کر اس نے قدم جمائے اور اپنی پوری قوت سے پیٹھ کے سہارے پچھلے زور کو روکا۔ پچھلا ریلا تھما تو اس نے پسینہ پونچھ کر لمحہ بھر کے لئے دم لینا چاہا، مگر فوراً چوکنا ہو گیا۔ اس نے دیکھا دو تین موالی کچھ کھسر پھسر کرتے ہوئے اور اسے گھورتے ہوئے اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ وہ قطعی لڑائی پر آمادہ نہیں تھا، مگر اب سوائے لڑائی کے اور کیا چارہ تھا۔ اس نے حقارت آمیز نظروں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پیشانی پر بل ڈال کر بائیں آنکھ بارعب انداز سے تھوڑی سی میچ دی اور بڑی مستعدی سے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالنا ہی چاہا تھا کہ جھٹ سے ٹکٹ والی کھڑکی کھل گئی۔ وہ تو پہلے ہی لڑنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس نے موقع کو غنیمت سمجھا، جلدی سے ٹکٹ لئے اور نظریں بچاتا ہوا کھڑکی سے علیحدہ ہو گیا۔ بھیڑ میں گم ہو کر وہ سڑک کے اس پار چلا گیا اور بڑے پیشہ ورانہ انداز میں دونوں ٹکٹ بیچ کر ادھر طرف نکل گیا۔

آج وہ ذہنی طور پر اتنا پریشان تھا کہ اس کا فلم دیکھنے کو بہت جی چاہ رہا تھا۔ مگر حالات سازگار نہ ملے اور بڑی بے دلی سے بڑے چوک کی گہما گہمی اور آنکھوں کو چکا چوند کر دینے والی روشنی سے نکل کر خلاف معمول سامنے والی گلی میں داخل ہو گیا اور مدھم مدھم روشنیوں والے دیسی شراب خانے کی دوکان پر پہنچ کر اس کے قدم رک گئے۔ لمحہ بھر کے لئے اس نے کھڑے کچھ سوچا، گرد و پیش پر ایک ہلکی سی نظر ڈالی اور اپنے الجھے ہوئے بالوں کو کھجاتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

جب ٹھرے کے نشے میں دھت ہو کر گتے سے باہر نکلا تو رات کا پہلا پہر گذر چکا تھا اور گلی پر مکمل سکوت چھایا ہوا تھا۔ اس نے ایک خمار آلود انگڑائی لی اور جھومتا جھامتا بڑے چوک کی جانب واپس چل پڑا۔ اس کے ڈھیلے ڈھالے جوتوں کی ٹپا ٹپ گلی کی خاموش فضا میں گونجتی رہی۔ جب وہ بڑے چوک پر پہنچا تو نظروں کو خیرہ کر دینے والی روشنی کی جگہ زردی مائل اسٹریٹ لیمپوں نے لے لی تھی۔ چلنے والوں کی آمد و رفت برائے نام رہ گئی تھی اور دیر تک بیٹھنے والے خوانچہ فروشوں کا بھی کہیں نشان نہ تھا۔ وہ اپنی اسی رفتار سے جماہیاں لیتا اور جوتوں سے ٹپا ٹپ کرتا ہوا مشرقی جانب بڑی سڑک پر ہو لیا۔ اور جانے کتنی دیر تک چلتا رہا، راستہ میں کہیں کوئی لاوارث کتا مل جاتا یا ایک دو جگہ اس نے دوکانوں کے چوکیداروں کو ٹہلتے پہرہ دیتے دیکھا اور سب سے بے نیاز اپنے سرور کے عالم میں چلتا گیا ــ جب وہ اپنے فٹ پاتھ پر پہنچا تو نیند اس پر افیون کے نشے کی طرح سوار ہو رہی تھی اور اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ رات کتنی نکل چکی ہے۔ وہ فٹ پاتھ پر سوئے ہوئے پائپ لائن کے قلیوں سے ٹکراتا اور انہیں پھلانگتا ہوا مخصوص جگہ پر رک گیا، جہاں وہ روزانہ سویا کرتا تھا اور جہاں سامنے والی گلی کے راستے ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے آیا کرتے تھے۔ مگر یہاں تو آج پاؤں ٹکانے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ اس نے بھیڑیئے کی طرح اپنا سارا منہ کھول کر ایک کرخت سی آواز پیدا کر کے ایک اور انگڑائی لی اور ایک سوئے ہوئے آدمی کو ٹھوکر سے جگا کر اکھڑ لہجے میں بولا:

"اٹھ بے کون ہے تو"

مگر سویا ہوا آدمی ٹس سے مس نہ ہوا۔ اب کے اس نے اپنی خمار آلود آنکھوں کو کھولتے ہوئے اس کے منہ پر جھک کے بغور دیکھا اور پھر اس کے شانوں پر زور کی چپت مارتے ہوئے قدرے اونچی آواز میں بولا:

"ارے او جمالو کے بچے اٹھ۔ یہ جگہ میری ہے"

"تیرے باوا کی ہے" جمالو نے جواب میں ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کروٹ بدلی اور اس کے ٹخنوں پر زور کی ایک لات دے ماری۔ اور پھر نیم خوابی کے عالم میں بڑبڑانے لگا "سالا آ جاتا ہے آدھی رات کو تنگ کرنے کے لئے" ــ یہ بڑی دیر تک ٹخنہ سہلاتا رہا۔ اسے جمالو پر کوئی غصہ تو نہیں آیا بس اس کا جی چاہا کہ بس یونہی جمالو کی ٹانگ پکڑ کر اسے نالی میں گھسیٹ دے۔ پھر جانے کیا سوچ کر ٹھٹک گیا۔ اس نے فٹ پاتھ پر سوئے ہوئے آدمیوں پر نظر ڈالی ـ کوئی معقول اور ہموار جگہ اس کی سمجھ میں نہ آئی جہاں وہ سو سکتا اور وہ اپنی اس جگہ پر مخالفانہ قبضہ کرنے والے جمالو کو دل ہی دل میں گالیاں دیتا ہوا کسی اور جگہ کی تلاش میں نکل گیا۔

تین چار متوازی سڑکوں کو گلیوں کے ذریعہ عبور کر کے جب وہ شہر کی حدود سے باہر نکل کر ایک وسیع سڑک پر پہنچا تو اسے اپنی تنہائی کا شدت سے احساس ہونے لگا۔ پھر فوراً ہی اسے سڑک کے اس پار دو تین آدمی سوتے ہوئے نظر آئے کھلی فضا میں مدھم مدھم رفتار سے چلتی ہوئی ٹھنڈی ہوا کی وجہ سے نیند نے اور زور پکڑ لیا اور وہ تیز تیز ڈگ بھرتا ہوا سڑک کے اس پار بجلی کے کھمبے کی طرف چل دیا جہاں آدمی سو رہے تھے۔ اور بس اسٹینڈ والے ویٹنگ روم کے علاوہ دور تک کوئی مکان نہیں تھا۔ سڑک کے پار پہنچ کر اس نے ان سونے والوں سے کچھ فاصلہ پر اپنے سونے کیلئے ایک جگہ پسند کی اور ابھی وہ اپنی چادر سے مٹی ہی جھاڑ رہا تھا کہ غیر ارادی طور پر اس کی نظر سونے والوں پر پڑی اور وہ ایک دم چونک سا گیا۔

ایک بوڑھا آدمی، اس کے ساتھ ایک نوجوان قبول صورت لڑکی اور اس کے ساتھ ایک بوڑھی عورت گہری نیند سو رہے تھی۔ اس نے چادر وہیں پھینکی دبے پاؤں قریب گیا اور جھک کر بیچ میں سوتی ہوئی لڑکی کو بلب کی روشنی میں بغور دیکھا، جس کے کھلے ہوئے بالوں کے گچھے اس کی پیشانی پر ہلکی ہلکی ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اس کے گندمی رنگ کا چہرہ پورے چاند کی گولائی کی طرح خوبصورت لگ رہا تھا، گلے کا بٹن کھل رہا تھا اور بجلی کی روشنی میں گوری گوری گردن پر چکنی چکنی چمک سی پیدا ہو رہی تھی۔ یہ کچھ دیر تک عجیب نظروں سے دیکھتا رہا اور پھر دبے پاؤں واپس آ کر اپنی جگہ پر لیٹ گیا........ وہ پڑے پڑے کافی دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ مگر نیند اچاٹ ہو گئی تھی۔ حالانکہ تھوڑی دیر پہلے نیند کے نشے میں بے حال ہو رہا تھا۔ جب وہ دیسی شراب خانے سے نکلا تھا تو اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے اور اب صبح تک آنکھ لگنا محال معلوم ہوتا تھا۔ اس نے ایک بار پھر کروٹ بدلی اور ذہن کو بالکل خالی کر کے سو جانے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا اور جب مارکیٹ کے ٹاور نے رات کے تین بجنے کا اعلان کیا تو اس وقت بھی نیند کا کہیں نشان نہ تھا ــ اس نے سوچا کہ کاش کوئی خوبصورت لڑکی اس کے پاس بھی آ کر وہی فلم والا گانا "دھیرے سے آ جا ری اکھین میں" گاتی تو وہ چند لمحوں

میں ہی نیند کی پرسکون وادیوں میں کھو جاتا اور نجانے کتنی دیر تک سویا رہتا۔

وہ کچھ تذبذب کے عالم میں اٹھ بیٹھا، گردوپیش پر ایک سرسری نظر ڈالی اور بوڑھی اور بوڑھے کے درمیان سوئی ہوئی لڑکی پر اس کی نظریں اپنے آپ ٹھہر گئیں۔ وہ کچھ دیر ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا، پھر اٹھ کر آہستہ آہستہ پنجوں کے بل چلتا ہوا لڑکی کے سرہانے آن بیٹھا اور گردن کو جھکا کر اس کے چہرے پر ایک بھرپور نظر ڈالی جہاں بالوں کے گچھے اس کے رخساروں پر ابھی تک لہرا رہے تھے۔ وہ کافی دیر تک دیکھتا رہا، اس کے دل میں ہلکی ہلکی گدگدی سی ہوئی اور اس نے دھیرے دھیرے ہاتھ بڑھا کر اس کے رخساروں سے بال ہٹا کر اس کی کنپٹیوں پر بکھیر دیئے۔ اور اپنی انگلیوں کی پوروں سے اس کی پلکوں کو آہستہ آہستہ سہلانے لگا۔ یکایک لڑکی بدک کر جاگ اٹھی اور اس نے حلق میں اٹکی ہوئی آواز میں کہا . . . .

"کو . . . . کو . . . کون ؟" اس نے گھبرا کر بڑے خوشامدانہ انداز سے مسکرا کر ہاتھ اٹھا کے سلام کیا اور لپک کر اپنی جگہ واپس آ کے لیٹ گیا، مگر اس کی حالت عجیب ہو رہی تھی، پیشانی پر پسینے کے قطرے پھوٹ آئے تھے، دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور سانس اکھڑی اکھڑی سی چل رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے اس کیفیت سے نجات پائی، دل کو قابو میں کیا اور پسینے کے قطرے پونچھ ڈالے۔ جب قدرے سکون ہوا تو اس نے چوروں کے سے انداز سے تھوڑی سی گردن اٹھا کر ایک بار پھر دیکھا۔ عین اسی وقت لڑکی کی گردن اسی انداز سے تھوڑی سی اوپر اٹھی اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ۔ دونوں گردنیں دھپ سے نیچے ہو گئیں۔ اور اس کا دل پھر زور سے دھڑکنے لگا اور نہ جانے کتنی دیر تک یونہی دھڑکتا رہا۔ اسی وقت اس کی گردن کتنی ہی بار اوپر اٹھی، نظروں کا تصادم ہوا اور اس کا دل دھڑک دھڑک کے ٹھہرتا رہا، بے چینی بڑھتی گئی۔ اور نیند بھاگتی گئی، مگر جب قریب کی کسی مسجد سے صبح کی اذان سنائی دی تو اس نے اذان کو بہت دور سے آتے ہوئے محسوس کیا اور ابھی یہ ختم نہیں ہونے پائی تھی کہ وہ گہری نیند سو گیا . . . . اور جب سورج طلوع ہونے سے پہلے بھنگی کی جھاڑو کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی تو سڑک کا کنارا بالکل خالی تھا اور بھنگی کے علاوہ دور دور تک کسی آدمی کا پتہ نہ تھا . . . . !!!

دوسری رات حسب معمول جب وہ اپنے ڈھیلے ڈھالے جوتوں کی ٹپا ٹپ سے ویران سڑک کے بھیانک سناٹوں میں ارتعاش پیدا کرتا ہوا گذشتہ رات والی سڑک پر پہنچا تو رات کافی ہو چکی تھی۔ اس ویران سڑک پر آج بھی کل والے لوگوں کے علاوہ اور کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے سونے والوں کے قریب پہنچ کر سگریٹ سلگایا اور کنکھیوں سے پیچھے دیکھا تو اس کے چہرے پر کچھ حیرت اور مسرت کے ملے جلے جذبات سے چھا گئے۔ آج لڑکی درمیان میں سونے کی بجائے ایک طرف سو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک ہلکا سا تبسم بکھر گیا۔ وہ تھوڑے سے فاصلے پر گرد جھاڑ کے چت لیٹ گیا۔ اور لیٹے لیٹے بجلی کے بلب کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا اور اپنی بڑھی ہوئی داڑھی کی کھونٹیوں پر بڑے انہماک سے انگلیاں پھیرتا رہا۔ پھر جب اس نے بجلی کے متحرک پنکھے کی طرح آہستگی سے گردن کو تھوڑا سا گھما کر بائیں طرف دیکھا تو اسے محسوس ہوا جیسے اس نے ایک بہت بڑا چور پکڑ لیا ہو۔ لڑکی اس کی طرف دیدے پھاڑ پھاڑ کے دیکھ رہی تھی۔ اس کے دیکھتے ہی اس نے جھٹ سے آنکھیں بند کر لیں، لمبے لمبے خراٹے لینے لگی۔ ایسے خراٹے جو اس نے کبھی نیند میں نہیں لئے تھے، اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ جب وہ سوتی ہے تو اتنے زور زور کے خراٹے نہیں لیتی بلکہ کسی پھول کی خوشبو سونگھنے کے سے انداز سے سینے میں ایک مدوجزر کی سی کیفیت پیدا کر دیتی ہے اور اس کے نتھنوں کے گرد بھینی بھینی خوشبو کے سلسلے پھیل جاتے ہیں، مگر جب سے اس سڑک کو وہ آ گیا تھا تب سے وہ سوتی کم تھی اور جاگتی زیادہ تھی اور جب جاگتی تو زور زور کے خراٹے لیتی اور وہ جانتا تھا کہ یہ خراٹے اس کے سونے کی نہیں جاگنے کی دلیل ہوتے ہیں۔ اس کے وہ خراٹے اسے کتنے بھلے معلوم ہوتے تھے، اس کی بھولی بھالی صورت کی طرح پیارے اور رخساروں پر لہراتے ہوئے بالوں کے گچھے کی طرح عزیز۔ ان خراٹوں کو سننے کے لئے وہ کتنی دور سے آتا تھا۔ اس نے اپنی پرانی پٹڑی چھوڑ دی تھی۔ اس علاقے کے دوست چھوڑ دیئے تھے جنہیں ہر روز دس گالیاں دیئے اور سننے کے بغیر اسے چین ہی نہ آتا تھا اور اب مہینوں سے اس نے ان کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ پھر بھی کتنا خوش تھا اس کی زندگی میں ایک عجیب انقلاب آ گیا تھا، ایک ملحلی ایک انوکھی کیفیت . . . . . . وہ اس کے پڑوس میں سو کر کتنی لطافت محسوس کرتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہونے کے باوجود ایک دوسرے کو کتنی اچھی طرح جانتے تھے۔ جیسے مدتوں کے پرانے ساتھی ہوں جو اتفاقاً بچھڑ گئے ہوں۔ وہ ہمیشہ اس وقت آتا تھا جب بوڑھی اور بوڑھا سوئے ہوئے ہوتے تھے۔

مگر لڑکی نے جیسے اس کے آنے سے پہلے سونے کی قسم کھا رکھی ہو۔ یہ لڑکی سے آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کرتا ہوا سو جاتا اور صبح جب اس کی آنکھ کھلتی تو سڑک بالکل صاف ہوتی اور وہ لوگ جا چکے ہوتے اور یہ دوسری رات کے انتظار میں بڑی بے تابی کے ساتھ پہاڑ کا سا دن کاٹنا پڑتا۔

دن جانے کہاں اور کیسے گذر جاتا اور رات جب بوڑھا اور بوڑھی دونوں نیند کے اتھاہ سمندر میں ڈوب جاتے تو دو جوان دل بڑے زور زور سے دھڑکنے لگتے آنکھوں میں محبت جھلکنے لگتی، مگر منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکتا اور یہ سلسلہ مہینوں تک یونہی جاری رہا۔ اس رات بھی وہ حسب معمول اپنے پرانے اور وزنی جوتوں کی ٹپا ٹپ سے سڑکوں کے مہیب سناٹے کو چیرتا ہوا آیا اور ان کے قریب ہی اپنی جگہ پر چادر سر پانے رکھ کر دراز ہو گیا۔ آج وہ بہت تھک گیا تھا اور تھکن سے اس کا سارا جسم چور چور ہو رہا تھا، جیسے کسی نے کوٹ ہی ڈالا ہو نیند اس پر ایک دم سے غالب آ گئی، اس نے سونے سے پہلے گردن کو تھوڑا سا گھما کر ایک نظر لڑکی کو دیکھا۔ آج وہ بھی خلافِ معمول گہری نیند سو رہی تھی، وہ زور زور سے دو تین بار مصنوعی طریقے سے کھانسا تو لڑکی نے ایک لمبی سی آہ کی اور آنکھیں نیم وا کر کے مسکرا دی۔ اس نے بڑے مودبانہ طریقہ پر ہاتھ پیشانی تک اٹھا کے سلام کیا اور لڑکی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں سلام کا جواب دے کر کروٹ بدل لی۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ اس کے دل کے ساتھ ساتھ نیند کو بھی اڑا کر لے گئی ہو۔ اس نے زبردستی آنکھیں بند کیں تو خیالوں کا ایک سلسلہ اس کے ذہن میں وارد ہوا اور وہ سوچنے لگا کہ آخر کب تک وہ یونہی ہوائی گھوڑے دوڑاتا رہے گا۔ وہ اس سے محبت کرتا ہے اور وہ محبت کا جواب محبت بھری آنکھوں کے اشاروں ہونٹوں کی مسکراہٹوں چہرے کی جنبشوں اور سینے کی لرزشوں سے دیتی ہے لیکن یہ خاموش محبت اظہار چاہتی ہے ورنہ یونہی سسک سسک کے دم توڑ دے گی اور اس کے شادی اور خانہ آبادی کے خواب ٹوٹ جائیں گے اور اس کا ٹوٹا اور پھوٹا ہوا مکان ویران کا ویران رہے گا اور ان میں کبھی کوئی رونق نہ ہو سکے گی ـــــ وہ کافی دیر تک اسی طرح سوچتا رہا اور جب اس نے ایک بار پھر لڑکی کی جانب غور سے دیکھا تو لڑکی بدستور کروٹ بدلے بوڑھی کے ساتھ لگی سو رہی تھی۔ اس نے بھی ایک کروٹ بدلی اور آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا لڑکی کے پاس آ پہنچا۔ اور ڈرتے ڈرتے اور دھیرے سے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اس کے گداز کندھے پر رکھ ہی دیا۔ لڑکی بدستور سوتی رہی۔ اس نے ہولے ہولے اس کے کندھے کو ٹہوکا دیا۔ لڑکی کے جسم میں قدرے حرکت پیدا ہوئی اور اس نے منہ اس کی طرف کر کے زیر لب ذرا تلخ سے لہجے میں کہا:

"کیا حرکت ہے"

"کچھ نہیں صرف محبت" اس نے کسی فلم ہیرو کی طرح رٹا رٹایا جملہ بڑے جذباتی انداز میں کہا

"چلے جاؤ واپس بابا جاگ جائیں گے" اس نے منت سے کہا۔

"لیکن ایک بہت ضروری بات کہنی تھی تم اس طرف آؤ" اس نے بڑی جسارت سے سرگوشی کی اور ـــــ اس کا بازو پکڑ کے آہستہ سے کھینچنے لگا..... لڑکی کشمکش میں پڑ گئی مگر ـــــ تھوڑی دیر بعد دونوں رینگتے ہوئے بڈھے بڑھیا سے کافی دور چلے گئے۔

جب اچانک بڈھے کی آنکھ کھلی اور اس نے سوئی ہوئی بڑھیا کے کندھے ہلا کر سرگوشی میں کچھ کہا تو بوڑھی کچھ بڑبڑاتی ہوئی جاگی اور جاگتے ہی اسے اپنا پہلو خالی ہونے کا احساس ہوا۔ اس نے گردن موڑ کے دیکھا تو لڑکی موجود نہیں تھی۔ اس کے تو جیسے حواس ہی جاتے رہے۔ بڈھے نے پھر اس سے کچھ کہا تو بوڑھی جھنجھلا گئی۔

"تمہیں اپنی پڑی ہے مردار۔ لونڈیا کہاں ہے؟" اس نے دبے دبے خشم آلود لہجے میں کہا۔ جب بڈھے نے بھی گردن اٹھا کر اس کے پہلو میں دیکھا تو واقعی لونڈیا نہیں تھی۔ ادھر ادھر نظریں دوڑا کر دیکھا تو پتہ چلا کہ لونڈیا قریب ہی سوئے ہوئے آدمی کے پاس بیٹھی سہمی ہوئی نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہی۔ بڈھے پر تو جیسے بجلی گری غضب آلود نظروں سے گھورتا ہوا اٹھا، آنکھوں میں خون اتر آیا، وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے لونڈیا کی طرف بڑھا۔ منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا مگر اس کا کانپتا ہوا ہاتھ خوفناک انداز سے اٹھ کر لہرایا اور پھر یکے بعد دیگرے تین ہاتھ دھماکے کی سی آواز کے ساتھ لڑکی کی گردن پر پڑے۔ پھر اسے کان پکڑ کر گھسیٹتا ہوا لے گیا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا ہے بابا..... میں تو......" لڑکی نے رحم طلب انداز میں روتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ اور نہ کہہ پائی تھی کہ ایک بھرپور ہاتھ اس کے ہونٹوں پر آن لگا۔ اس کے ہونٹ سے خون کی

(باقی صفحہ ۸۴)

سندھی افسانہ

ناتمام

آغا شاہین

میں جانتی ہوں کہ میرا یہ پیام، میرے سازِ زندگی کی شکستہ تاروں پر گایا ہوا یہ ماتمی گیت تم سن نہ سکو گی لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں میرا دل تمہیں خط لکھنے کو چاہتا ہے۔ میرے غم کی شدت سے منجمد ہو کر الفاظ کا روپ اختیار کر لینے والے آنسو تم تک پہنچنا چاہتے ہیں۔

آج جب میں تمہیں یہ خط لکھ رہی ہوں، میری زندگی کا ہم سفر مجھے تنہا چھوڑ کر اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ چکا ہے!

میری تاریک زندگی کو روشنی کی چادر میں لپیٹنے والا دیپ آج بجھ چکا ہے اور میں ....، میں قلم کو انگلیوں میں دبائے تمہیں یہ خط لکھنے بیٹھی ہوں۔ انگلیوں کی گرفت میں آیا ہوا قلم انگلیوں کے کانپنے کی وجہ سے لرزش میں ہے۔ سامنے میز پر دودھ کا گلاس رکھا ہے اور دودھ کے اس گلاس میں بھی میں نے وہ چیز ملا رکھی ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ہر انسان کو ایک ابدی نیند سے ہم آغوش کر دیتی ہے۔ اس گلاس میں سے تھوڑا سا دودھ میں پی چکی ہوں اور باقی تمہیں یہ خط لکھ لینے کے بعد پیونگی۔

نہ جانے انگلیاں کیوں کانپ رہی ہیں ....؟ شاید یہ زہر کا اثر ہے یا موت کا ڈر ......! دیکھا گیا ہے کہ دنیا کی ہر عجیب چیز دلچسپ ہوتی ہے اور قدرت نے بھی اپنے شاہکار کو عجیب بنانے کے لئے کیسے کیسے عجیب طریقے اختیار کئے ہیں۔ موت کی آرزو میں میں نے دودھ میں زہر ملایا ہے اور موت ہی کے احساس سے دل کانپ بھی رہا ہے جس کی شہادت کانپتی ہوئی انگلیاں دیتی ہیں۔

کہتے ہیں کہ انسان کو مرنے کے بعد ابدی سکون نصیب ہوتا ہے، لیکن میں کہتی ہوں کہ اگر مرنے کے بعد ہی انسان کو سکون ملتا تو پھر قدرت نے انسان کو زندگی ہی کیوں دی؟

میں بنگلے کے پشت والے باغ میں آلوچے کے ایک خزاں رسیدہ درخت کے نیچے بیٹھی تمہیں یہ خط لکھ رہی ہوں۔ سورج غروب ہونے کو ہے۔ سورج کا چہرا کسی مردہ انسان کے چہرے کی طرح اداس اداس ہے۔ سورج کے چہرے کی اداسی ماحول کی اداسی میں اضافہ کر رہی ہے۔ ہوا کے کسی بھٹکے ہوئے جھونکے سے باغ کے درختوں سے سوکھے پتے زمین پر گر رہے ہیں۔ بنگلے کے اگلے برآمدے میں دیپ کی لاش پڑی ہوئی ہے۔ دیپ کی زندگی کے پھول کی سوکھی پنکھڑیوں پر سارے گھر کے افراد اپنے آنسوؤں کی شبنم گرا رہے ہیں۔ دیپ کی لاش کو غسل وغیرہ دیا جا رہا ہے اور میں بنگلے کے پشت والے خزاں رسیدہ باغ میں ایک سوکھے آلوچے کے درخت کے نیچے بیٹھی تمہیں یہ خط لکھ رہی ہوں۔

دیپ کو تمہاری تلاش تھی اور مجھے دیپ کی ......! میں تو اب اس زہریلے دودھ کا گلاس پی کر اس سے جا ملوں گی لیکن بیچارہ دیپ .....؟ نہ جانے زہر کھانے کے بعد تمہیں حاصل کر بھی سکا یا نہیں....؟

دیپ کو ہمارے خیالی مجسمے کی تلاش تھی۔ اور تمہیں پانے کے لئے اس نے تمہاری بڑی جستجو کی کبھی کبھی اسے اپنا وجود بھی خیالی محسوس ہوتا اور اسے یہ احساس ہونے لگتا کہ وہ ہستی جس کا وہ متلاشی ہے، شاید وہ خود ہی ہے۔ لیکن ایسا سمجھنے والے دیپ نے ایسا سمجھنے سے قبل یہ بھلا دیا کہ ایسا ہی سمجھنے والے منصور کو موت کے سوا کچھ بھی نصیب نہ ہوا...!

ملنے کو تو اسے زندگی کے مختلف موڑوں پر، پرتیما، شیلا... اور کامنی ہمسفر ملیں، لیکن وہ تو خود دیپ کی طرح کسی منزل کی تلاش میں تھیں اور نہ جانے انہوں نے دیپ کو ہی اپنی منزلِ مقصود تصور کیا تھا یا غبارِ کارواں سمجھ کر کسی دوسری منزل کی تلاش میں رہیں۔ دیپ نے تمہیں ان سب میں ڈھونڈا لیکن تم اسے کسی ایک میں بھی نظر نہ آئیں۔ اور تب

محض تمہیں حاصل کرنے کی خواہش کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے بغیر دیکھے مجھ سے شادی کر لی کہ شاید تم مجھ ہی میں ہی ہو!

شادی کی پہلی رات وہ میرے پاس آیا۔

"تم نے مجھے میری زندگی کے دامن افق پر اپنی کامیابی کا چمکتا ہوا ستارہ دیکھنے دو۔ تم اس رسمی گھونگھٹ کو ہٹا دو تاکہ میں ان پلکوں کی چھاؤں میں جن پلکوں کے لئے ٹیگور نے کہا ہے کہ تمہاری یہ پلکیں کسی شوخ نہر کے پرے کنارے پر کھڑے درختوں کی قطار کی طرح ہیں...... کسی کنواری کے تھکے ہوئے گیت۔ اور کسی سندھی چرواہے کی بنسری کے آخری سروں کی طرح تھک کر سو جاؤں اور تب تک سویا رہوں جب تک مجھے وہ نیند نہ آ جائے جو ہر انسان کو ایک ابدی نیند سے ہم آغوش کر دیتی ہے۔ اور مجھے کسی پہاڑی گڑھے میں بہت دنوں سے ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح نیلاہٹ مائل کالی اور گہری آنکھوں اور کسی جھکی ہوئی کالی گھٹا کی طرح چھائے ہوئے سیاہ بالوں کو دیکھ لینے دے۔ میں نے کسی جواری کی طرح اپنی زندگی کی آخری پونجی بھی اس جوئے میں لگا دی ہے اور مجھے اپنے جینے کی پوری امید ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ تم ہی وہ ہستی ہو جس کی مجھے تلاش تھی......"

اس نے میرے گھونگھٹ کو ہٹایا اور پاگلوں کی طرح میرے بالوں کو دیکھنے لگا۔ وہ میری آنکھوں میں نہ جانے کن گم شدہ جہانوں کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اور پھر اس کی حالت اس انسان کی سی ہو گئی جس کا سب کچھ اس کی آنکھوں کے آگے لٹ رہا ہو۔ میرے بالوں کو اپنے ہاتھوں سے چھوڑ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں کچھ بھی نہ سمجھ سکی۔ بہت دیر تک انتظار کرنے کے بعد میں سو گئی۔ اور صبح کو جب میری آنکھ کھلی تب میں نے دیپ کو اپنے پلنگ کے ساتھ پڑے ہوئے صوفے پر دراز دیکھا۔ وہ نوشاہ کے کپڑوں میں ملبوس تھا۔ اس کے چہرے پر شادی کے نیم مرجھائے ہوئے پھول پڑے تھے۔ لمبے قد کی وجہ سے اس کی ٹانگیں صوفے سے نیچے لٹک رہی تھیں۔ اس کا ایک ہاتھ اس کے وزنی جسم کے نیچے تھا اور دوسرا ہاتھ کسی مردہ سانپ کی طرح لٹک رہا تھا۔ اور میں نے اس کے سونے کے انداز سے تاڑ لیا کہ اس پر نیند کی نہیں بلکہ شراب کی مدہوشی طاری تھی۔ میں اس کے نزدیک گئی۔ سانس لیتے وقت اس کے منہ سے شراب کی سخت بو آ رہی تھی۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے پلنگ پر لٹا دیا اور اس کے پریشان بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کرنے لگی۔

یہ میری سہاگ کی پہلی رات تھی!

شفتالو اور آلوچے کے اداس اداس اور خزاں نصیب درختوں میں پرندوں کا شور بلند ہو رہا ہے۔ پرندوں کا شور اور دیپ کی ماں کی چیخیں اس میں مل کر ماحول پر ایک عجیب ہیبت ناک سا رنگ بھر رہی ہیں۔ ماتا کی یہ دلدوز چیخیں سن کر میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہیں ——

—— میری آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے چھلکتی ہوئی شراب کی طرح چھلک کر اس خط پر پڑ رہے ہیں۔ مجھے تعجب ہو رہا ہے کہ آج جب کہ تھوڑی ہی دیر کے بعد میں اپنے دیپ سے جا ملوں گی تو اس خوشی کے موقعے پر یہ آنسو کیسے؟

جب تم اسے مجھ میں بھی نظر نہ آئیں تب وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر تمہاری تلاش میں کوئٹہ کے ہیبت ناک پہاڑوں میں چلا گیا۔ اس نے اپنے ایک پٹھان دوست سے ہنا کے چشمے کے پاس کچھ دنوں کیلئے ایک بنگلہ کرایہ پر لیا۔ میں سارا دن بنگلے کے اگلے باغ میں بیٹھی نوکر سے باتیں کرتی رہتی اور وہ ہنا کے ہیبت ناک پہاڑوں میں آوارہ گردی کرنے چلا جاتا۔

تم نے ہی دیپ کو فن کار بنایا۔ تمہاری ہی وجہ سے اس نے فسانوی انسانوں کی تخلیق کی تمہیں کو جاوید بنانے کے لئے اس نے اپنے برش کی جنبشوں سے کسی مست دوشیزہ کی پریشان زلف کی طرح بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیوں اور پہاڑ کی الھڑ جوانیوں کی تخلیق کی۔ تمہاری ہی وجہ سے اس نے پربت میں دبی ہوئی کہانیوں کو کاغذ کے سینے پر سجایا۔ اور محض تمہیں حاصل کرنے کی حسرت سے مجبور ہو کر اس نے اپنی محبت کی یادگار میں سنگِ مرمر کی بجائے سجل الفاظ سے ایک نہیں کتنے ہی تاج محل بنائے! تم کبھی فنا نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ شاعر کا محبوب کبھی نہیں مرتا۔ کتنی خوش نصیب ہے وہ ہستی جو کسی شاعر یا افسانہ نگار کی محبوبہ ہو! چاہے وہ کوئی جیتی جاگتی ہی ہو یا تمہاری طرح ایک رنگین خیال!

دیپ کے فن میں تمہیں نہ پانے کی وجہ سے ایک قسم کی پیاس تھی۔ اس کا فن ابھی نامکمل تھا لیکن اس کے فن کی اس کمی کو کوئی بھی محسوس نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ تم نے بھی..... جس کی وجہ سے وہ افسانوی کائنات کا خالق بنا۔ اس کے فن کی اس ازلی پیاس کو محسوس نہ کیا۔ جس پیاس کو بجھانے کے لئے وہ تم جیسے سراب کو آبِ حیات سمجھ

بیٹھا! لیکن اس کے فن کی وہ تشنگی ہی اس کی کامیابی کا باعث بنی۔ واقعی ہر چیز بھی جا کر مکمل ہوتی ہے کہ اسے تشنہ رکھا جائے۔ خدا نے بھی اپنے شاہکار کو تشنہ رکھا۔ چاند بھی اپنے چہرے کے سیاہ داغ ہی کی وجہ سے اتنا حسین ہے۔ یہی تو اس کے کمال کا مفہوم ہے۔

الفاظ کے پتھروں اور قلم کے ہتھوڑوں سے بنائے ہوئے دیپ کے تشنہ تاج محل اب بھی شکستہ حالت میں میرے سامنے پڑے ہوئے ہیں۔ یہ تاج محل دیپ کی تمناؤں کی قبریں ہیں اور میں انہی قبروں کے کنارے بیٹھی یہ مرثیہ لکھ رہی ہوں۔

تم پریتما کو تو جانتی ہی ہوگی؟ تم ضرور میری طرح بدنصیب پریتما کو جانتی ہوگی۔ کیونکہ تمہارا وجود خیالی ہے۔ اور اسی لئے ہر اس چیز پر جس تک انسانی نظریں نہیں پہنچ پاتیں انسانی خیالات ضرور پہنچ جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح تمہیں خیال تک دیپ کی محدود نظریں نہیں پہنچ سکتی تھیں، لیکن لامحدود خیالات ضرور پہنچ جاتے تھے! تم اس پریتما کو ضرور جانتی ہوگی جس کی روح آج بھی سکون کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ پریتما نے دیپ کے لئے جان دے دی اور آج جب دیپ نے تمہارے لئے جان دی ہے تب قدرت کے اس انتقام پر اس کے مردہ اور ویران ہونٹوں پر ایک بے جان اور شکستہ سی مسکراہٹ رقصاں ہے!

کل رات برف کا ایک زبردست طوفان آیا۔ شفتالو، شہتوت اور اخروٹ کے درختوں اور بے جان پہاڑوں کو برفانی طوفان نے ایک قسم کا سفید کفن پہنا دیا۔ ہر طرف اداسی اور ماتمی سفیدی پھیلی ہوئی تھی۔ میں انگیٹھی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی اور دیپ اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کئے کاغذ کی بے جان چیزوں میں زندگی بھر رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے دروازے کے شیشوں میں سے اندر جھانک کر دیکھا۔ دیپ کاغذ پر کچھ بنا رہا تھا اور میز پر شراب کا بھرا ہوا گلاس پڑا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹوں میں دبے ہوئے سگریٹ سے دھواں نکل کر ایک عجیب قسم کی بالکل تمہاری طرح کی شکلیں بناتا کمرے میں پھیلی ہوئی روشنی میں گم ہو جاتا تھا۔ میں پلنگ پر آ کے لیٹ گئی اور مجھے نیند آ گئی۔ اور صبح کو جب میں اٹھی تو طوفان پر بھی کا زوال آ چکا تھا۔ برفانی طوفان کے بعد آہستہ آہستہ ابھرتے ہوئے سورج کی سوگوار دھوپ اخروٹ، بادام اور شہتوت کے درختوں سے لپٹے ہوئے برف کے سفید کفن کو

اتار رہی تھی۔ ہر طرف ایک ایسی خاموشی چھائی ہوئی تھی جیسی کسی میت کے دفنانے کے بعد ہر طرف چھا جاتی ہے۔ دیپ کے کمرے کا دروازہ بدستور اندر سے بند تھا۔ میں نے شیشوں میں سے کمرے کے اندر جھانک کر دیکھا۔ دیپ میز پر گردن ٹکائے سو رہا تھا۔ میں اسے سوتا سمجھ کر واپس آ گئی۔ بہت دیر کے بعد میں نے پھر جا کر دیکھا۔ تب بھی دیپ اسی حالت میں سویا ہوا تھا۔ مجھے بڑی تشویش ہوئی۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا لیکن دیپ نیند سے نہ جاگا۔

مجھے معلوم نہ تھا کہ دیپ کو ایسی نیند آ گئی ہے جس سے وہ روزِ محشر کے سوا کبھی بھی بیدار نہ ہو سکے گا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ میری تاریک زندگی کو نور کی چادر میں لپیٹنے والا دیپ اس طرح بجھ چکا ہے کہ کبھی بھی روشن نہ ہو سکے گا!

آج وہ بجھا ہوا دیپ بنگلے کے اگلے برآمدے میں پڑا ہوا ہے۔ اس ابدی نیند سونے والے دیپ کے گرد لوگوں کا ہجوم لگا ہوا ہے۔ میں نے صبح سویرے ہی دیپ کی ماں کو دیپ کے وقت سے پہلے مر جانے کی اطلاع بھیج دی تھی اور وہ اپنے سب رشتہ داروں کے ساتھ کار کے ذریعے دوپہر سے پہلے یہاں پہنچ گئیں۔ اب وہ سب رشتہ دار دیپ کو دفنانے کی تیاریاں کر رہے ہیں اور میں بنگلے کے پشت والے باغ میں آلوچے کے ایک خزاں نصیب درخت کے نیچے بیٹھی تمہیں یہ خط لکھ رہی ہوں!

گزشتہ طوفانی رات میں دیپ نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ تمہاری مکمل تصویر بنائی ہے۔ اس نے زہر ملی ہوئی شراب پی کر تمہاری تصویر بنانی شروع کر دی۔ اور ساری تصویر مکمل کر لینے کے بعد ابھی وہ بالوں میں کسی جھکی ہوئی کالی گھٹا کا سا رنگ بھر ہی رہا تھا کہ ابدی نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔ اس نے اپنا نامکمل شاہکار گزشتہ طوفانی رات میں ہی مکمل کیا ہے۔ بالکل ویسی ہی کسی پہاڑی گڑھے میں بہت دنوں سے ٹھہرے ہوئے بارش کے پانی کی طرح، نیلاہٹ مائل کالی اور گہری آنکھیں۔ کسی جھکی ہوئی کالی گھٹا کی طرح بال، اور ان پلکوں کی چھاؤں میں جن پلکوں کے لئے ٹیگور نے کہا ہے کہ "تیری پلکیں کسی شوخ نہر کے پرلے کنارے پر کھڑے ہوئے درختوں کی قطار کی طرح ہیں۔" آج ہمالہ کے چشمے کے ہیبت ناک پہاڑوں میں بھٹکنے والا دیپ تھک کر سو گیا ہے۔ اب کچھ دنوں کے بعد دیپ کا وجود بھی دنیا کے لئے خیالی ہو کر رہ جائے گا اور ایک خیالی مورت بن جانے کے بعد شاید وہ تجھے پا سکے۔

کیونکہ شہر اس چیز تک جس تک انسانی نظریں نہیں پہنچ پاتیں اس تک انسانی خیالات ضرور پہنچ جاتے ہیں! دیپ کو اپنی زندگی کی راہ میں تلاش بھی ایسی ہی ہستی کی تھی جس کی تصویر اس نے گذشتہ طوفانی رات میں مکمل کی ہے۔ اسے ایک ایسے ہم سفر کی تلاش تھی جو ہم سفر ہونے کے ساتھ ساتھ منزل بھی ہو اور شاید اس منزل تک پہنچنے کی راہ کا اختتام اسی حد پہ ہے جس پر اب وہ پہنچ چکا ہے۔

رات کی سیاہی ہر چیز پر چھاتی جا رہی ہے۔ باغ میں چرنے والی بھیڑوں کو واپس لے جانے کے لئے نوجوان پٹھانی لڑکی خزاں نصیب سوکھے پتوں پر گھوم رہی ہے۔ اس کے پیروں اور سوکھے پتوں کی آواز کسی مرتے ہوئے انسان کی ہچکیوں کی آواز کی طرح معلوم ہو رہی ہے۔ وہ بھیڑوں کو ہانکتی اپنی زبان میں کوئی ماتمی گیت گا رہی ہے،

"یہ میری آنکھ کا تارا ..... دہکتے انگارے
کی طرح ہے ......
اور یہ سینے میں دل ..... ؟ یہ تو پرانا ناسور ہے.."

شفتالو، شہتوت اور اخروٹ کے ننگے درختوں کی آنکھوں سے آنسو گر رہے ہیں جنہوں نے زرد پتوں کے روپ میں ساری دھرتی پر بسنتی رنگ پھیلا دیا ہے۔ افق کی پیشانی پر کسی نامراد انسان کی جلتی ہوئی چتا کے آخری شعلوں کی طرح شفق کے شعلے بھی ماند پڑتے جا رہے ہیں اور میری زندگی کا شعلہ بھی بجھتا جا رہا ہے۔ قلم کی لرزش بڑھ گئی ہے۔

میں بھی خط کو ادھورا ہی چھوڑ رہی ہوں کیونکہ ہر چیز اسی وقت جا کر مکمل ہوتی ہے ..... جب اسے .... نامکمل چھوڑ دیا جائے ❖

نئی بستیاں: بقیہ صفحہ ۱۶

ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔ نئے دور کے یہ معمار اور نئی بستیوں کے بسانے والے ــــ یہ بلند حوصلہ انسان جو مشکلوں کے شکوہ سنج نہیں بلکہ ان کو حل کرنے میں لگے رہتے ہیں ــــ انہیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ نفرت ہوتی کیا ہے؟ تعصب کسے کہتے ہیں؟ ان کے دروازے سب کے لئے کھلے رہتے ہیں اور یہ رات گئے تک چراغ جلائے اسی انتظار میں رہتے ہیں کہ شاید کوئی راہی آ جائے۔ انہیں بس ایک ہی بات معلوم ہے کہ زمین اللہ کی ہے۔ ہم سب ایک ہیں اور پاکستان ہمارا زمن ہے ❖

عالمِ بے نام

ماہر القادری

زمانہ کا رسالت پر تری ایمان ہے ساقیؐ
مگر الفت تری ایمان کی بھی جان ہے ساقیؐ
ترے کردار پر دشمن بھی انگلی رکھ نہیں سکتا
ترا اخلاق تو قرآن ہی قرآن ہے ساقیؐ
مشیت بھی تری مرضی کے تیور دیکھ لیتی ہے
بہ ایں اقرارِ عبدیت یہ تیری شان ہے ساقیؐ

تری آوازِ حق کا آخری پیغام ہے ساقیؐ
کہ تیری ذات ہی پر دین کا اتمام ہے ساقیؐ
شبِ معراج تو اس بارگاہِ خاص میں پہنچا
جہاں پر ختم دورِ گردشِ ایام ہے ساقیؐ
ترے دورِ رسالت کا تعین ہو نہیں سکتا
ازل آغاز ہے ساقی، ابد انجام ہے ساقیؐ
تری ہر بات پر ایمان لانا عینِ فطرت ہے
کہ تیرا نطق تو پروردۂ الہام ہے ساقیؐ
مکان و لامکاں میں کس قدر ہے فصل کیا کہئے!
مگر تجھ کو بہ قدرِ وسعتِ یک گام ہے ساقیؐ
حریمِ لی مع اللہ کے کوئی اسرار کیا جانے!
جہاں تو ہے وہاں اک عالمِ بے نام ہے ساقیؐ
مبارک اہلِ دنیا کو زر و دولت کی ارزانی
مگر ماہر کو بس کافی ترا اک نام ہے ساقیؐ

حاصلِ فکر

سید محمد مہدی

فشارِ غم سے دل ہے یوں کبیدہ
کہ جیسے کشتیٔ سیلاب دیدہ
یہ دنیائے کہن ہے ننگِ تخلیق
الٰہی کوئی تخلیقِ جدیدہ
نہ جذبہ ہے کوئی شائستۂ دل
نہ جلوہ ہے کوئی شایانِ دیدہ
مری فکرِ جواں پر جلوہ گر ہے
نیا اک عالمِ ناآفریدہ
انوکھی ایک شامِ ناشگفتہ
نرالی ایک صبحِ نادمیدہ
وہ دنیا جس کی روحِ آفرینش
مساوات و اخوت کا عقیدہ
وہ انساں علم و عرفاں میں جو یکتا
وہ آدم آدمیت میں جو چیدہ
محمدؐ ہیں اسی دنیا کے خالق
یہ ہے دنیائے افکارِ جدیدہ
اسی دنیا کے دیوانے رہے ہیں
خدا کے بندگانِ برگزیدہ
زباں پر کس کا یا رب نام آیا
یکایک ہو گیا دل آبدیدہ
محمدؐ کردگارِ عشق و مستی
محمدؐ حاصلِ فکر و عقیدہ
جو ممدوحِ خدائے دو جہاں ہو
لکھوں توصیف میں اس کی قصیدہ
خموش اے میرے نطقِ نامرتب
خجل اے میری فکرِ نارسیدہ

بیلڈ[1]

ملاحوں کا مان

(میراجی کی یاد میں)

رفیق خاور

یہ سونا اور دھندلا ساگر، ایک اکیلے اسکے کنارے
سانجھ سویرے پاؤں سے سر تک لپٹے کفن میں گھومنے والے
اب وہ پرانا میت کہاں ہے، ملاحوں کا مان کھویا!
وہ اور کشتی، گھاٹ اور ساگر، پانی سب کا تن من سانجھا
نیا میں پاؤں لٹکائے، اپنا شہر پرے آگے کو جھکائے
ہاتھوں میں پتوار ہوائی، لٹے ہوئے کھیتا نہیں ناؤ؟
یا دریا کی ترچھی تیکھی، بپھری موجوں، تند بھنور سے
تھک کر ختم نہ ہونے والے بیڈھب موڑوں کے تانوں سے
اس نے بنائی اور رہی بستی، چین اور سنگیت کا پیٹ[2] بسایا
دور کہیں اس پار اندھیرے، سپنے دیس کے پردوں میں!
آ آ کر واپس گئے ہیں گھاٹ سے کتنے ہی راہی
آخری دم قسمت کے دھنی تھے کون جو اسکے ساتھ سدھارے!

اسکے پار اتر جانے پر کس نے نہیں وہ دھیرے دھیرے
دھرتی کے دل میں ڈوبنے والی دبی دبی نوبت کی صدائیں
باجے کی دھیمی دھیمی راگنی، سوگ کی چھپنے والی دھنیں؟
پاؤں کی بے ترتیب سی آہٹ اسکی چیت کے پیچھے؟
یا وہ دور پہنچنے والی اونچی گونج سلامی کی؟
یا ہر دے دہلانے والی غمگیں شہنائی کا نفیر؟
جھنڈیوں سے آراستہ گلیوں کوچوں میں پُرزور صدائیں؟

اس سالار کی موت پہ فوج کے دل میں نہ کوئی ہوک اٹھی
کوئی نوائے غم نہ اٹھی اس سورما کے مرجانے پر!

جلووں سے معمور جہاں میں اس گہوارۂ ہستی میں
جس میں ہمیشہ رہنے کا ارمان ہے رہنے والوں کو
کسی نے واویلا نہ کیا یا سوگ میں نیلی پوش ہوا
کوئی دل تڑپانے والا، رونے اور رلانے والا
اپنی چھاتی پیٹ کے سب کو اسکی ریس دلانے والا
اس کے جلوسِ ماتم میں مشتاقِ رضاکاری نہ ہوا
عظمت کی بہارِ رفتہ پر آنسو نہ بہے، آہیں نہ اٹھیں
اس کی بڑائی کے آگے دنیا والوں کے سر نہ جھکے
یہ شمع وہ تھی جس کی لو پر سودائی پروانے نہ جلے

آخری بار اس گھاٹ سے جس دم ٹوٹی پھوٹی ناؤ سدھاری
کوئی پھول نہ اس پر بکھرے اور نہ ہار پہنانے آئے
کھڈی کے کھُردرے کھدر کی سیدھی سادی چادر کوئی
عزت کے سنہرے تار نہ تھے جس میں کی، دھیلی پود نہ تھی
پُرجوش عقیدت نے کوئی موتی کی مالا نذر نہ کی
صرف اک مالا زیبِ کفن تھی، وہ بھی یونہی کچھ ٹوٹی پھوٹی
یاس کی اشک آلودہ قبا سے ۔۔ ہاں اے تٹ پر سوچتے راہی
یہ تو بتا اس مردِ خدا کو آخری اُجرت کتنی ملی؟

اُجرت؟ ۔ اس ساگر کے کنارے اک ٹوٹی پھوٹی کشتی
اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر خستہ، ٹوٹا پھوٹا پیکرِ زار
ایک مغنی جس پہ پڑی تھی ساری خدائی کی پھٹکار
اک بربادِ شکستہ پیکر سرتاپا نقشِ فریادی
جو سو بار بڑھا لیکن ہر بار مقدر نے اس کو

---

[2] پیٹ، گاؤں

ڈھلوان سے نیچے دے پڑکا، ایک پیاسی راندۂ عالم
اسکی نوائیں جملہ خسارہ، نفع کے اندھے بازاروں میں
جسے نہ شہرت نے اپنایا اور نہ کبھی عظمت نے نوازا
اک رسوائے زمانہ ہستی دنیا کی ٹھکرائی ہوئی
ایک نوا پردازِ یگانہ، ایک خدائے موسیقی

لیکن دور پرے عالم سے، دور عدم کے اندھیارے میں
کئی فرشتے چشم براہ ہیں اور مشتاقِ زیارت حوریں
کئی پرستاروں کے جمگھٹ، کئی فداکاروں کے جھرمٹ
کئی ارادت مند نگاہیں دیکھنے کی حسرت میں پرافشاں
کئی عقیدت مند جبینیں سجدوں کی بیتاب دوام
حدِ نظر تک انسانوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ و ...

مسندِ زریں اک گوشے میں اُسکے لئے آراستہ ہے
اک تختِ طاؤس کہ جس پر جودو ملائک کی فن کاری
پورے فنوں سے صرف ہوئی ہے، ایک طلسمی کاریگری
کس کیلئے؟ اُس نازشِ دوراں ساحرِ بے ہمتا کے لئے
جسکے تکلم میں جادو ہے، اک اعجازِ مسیحائی
اسکے نطق آتشِ دیوانوں کا، شمعِ سخن کے پروانوں کا
اُس نگری میں قحط نہ ہوگا، اس اندھیاری نگری میں
دیکھو بنگتی رینگتی پانی پر یہ کیسا آواز آئی
اے لو، لوٹ آیا دہ مانجھی، تنئے کھویتے کا ہمراہی
جو اس گہریلے ساگر سے اس کو گیا تھا پار لگانے
جانے کیسی خبر لایا ہے، ہاں صورت تو یہی کہتی ہے
مل گیا اسکو دور اندھیارے دیس کو جانے کا پروانہ
ختم ہوئی سب اسکی تگ و دو اور اب اسکا انت بھلا ہے

میں ڈرتا ہوں مسرت سے

میراجی مرحوم

میں ڈرتا ہوں مسرت سے،
کہیں یہ میری ہستی کو
پریشاں، کائناتی نغمۂ مبہم میں اُلجھا دے،
کہیں یہ میری ہستی کو بنا دے خواب کی صورت؛

مری ہستی ہے اک ذرّہ
کہیں یہ میری ہستی کو چکھا دے مہر و مہتاب کا نشہ؛
ستاروں کا علمبردار کر دے گی، مسرت میری ہستی کو،
اگر پھر سے اُسی پہلی بلندی سے ملا دے گی
تو میں ڈرتا ہوں ——— ڈرتا ہوں
کہیں یہ میری ہستی کو بنا دے خواب کی صورت؛

میں ڈرتا ہوں مسرت سے
کہیں یہ میری ہستی کو
بھلا کر تلخیاں ساری
بنا دے دیوتاؤں سا
تو پھر میں خواب ہی بن کر گذاروں گا
زمانہ اپنی ہستی کا۔

"چلتن" کی آواز

عبدالباقی بلوچ

غم کی اندھیر نگری میں جل گئے ہو تارو ابھی سو رہو
سو رہو، میرے شب تاب دل کے سہارو ابھی سو رہو
ہر طرف شور ہی شور، ہر شور مستاں کا جادو جواں
میرے کہسار کی نو دمیدہ بہارو ابھی سو رہو

کس کی غمخوار ہوتی ہیں یخ بستہ تختہ بہ تختہ سلیں؟
میرے اشکوں کے بہتے ہوئے آبشارو ابھی سو رہو
میری بے جان آہوں سے کب برف پیکر پگھلنے لگے؛
میرے سینے میں بھڑکے ہوئے شعلہ زارو ابھی سو رہو

نور ہے خواب کا یا چمک آنسوؤں کی؟ سحر تو نہیں
شب ہے گھنگھور چاروں طرف، غم کے مارو ابھی سو رہو
کون آئے گا میرے فسردہ شبستاں میں؟ کوئی نہیں
میری امید کی منتظر رہگزارو ابھی سو رہو

غم کی شب کا یہ آغاز ہے، تیرگی اور بڑھ جائے گی
سو رہو، سو رہو، میرے ویراں دیارو ابھی سو رہو
صبح ہوگی تو میں خود جگا لوں گا تم کو اُگل کر لہو
رات باقی ہے سو جاؤ، سو کر گزارو ابھی سو رہو

"چلتن" کوئٹہ اور قلات کے درمیان ایک مشہور پہاڑ کا نام ہے جس کے متعلق وہاں عجیب و غریب باتیں سننے میں آتی ہیں۔ مثلاً اس میں چالیس ابدال روپوش ہیں۔ یہ پہاڑ آتش فشاں ہے اور بلوچستان کے زلزلے اسی کی وجہ سے آتے ہیں۔ کبھی کبھی رات کو اس میں سے ہولناک آوازیں بھی نکلتی ہیں جنہیں قرب و جوار کے لوگ کسی مصیبت کا پیش خیمہ سمجھتے ہیں۔ اس کی چوٹیوں پر سارا سال ہی برف جمی رہتی ہے۔ نام کے متعلق کہا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں آنی بزرگ وہاں چلہ کشی کرتے تھے جن کے چالیس تن تھے، اس لیے یہ نام مشہور ہوا۔ بعض کہتے ہیں اس کی چالیس چوٹیاں ہیں۔

بادل

سیّد عبدالحمید عدمؔ

یہ جھومتے ہوئے بادل کدھر کو جاتے ہیں؟
شرابیوں کی طرح مست لڑکھڑاتے ہوئے
خموش پھر بھی بہر گام گنگناتے ہوئے
مہ و ستارہ کو حالِ سفر سُناتے ہوئے
تخیلات کی شہنائیاں بجاتے ہوئے

یہ جھومتے ہوئے بادل کدھر کو جاتے ہیں؟
بس ایک سمت روانہ ہے کارواں اِن کا
قیام جادۂ افلاک میں کہاں اِن کا
ہوا کا سیل ہے کچھ کچھ مزاج داں اِن کا
ستارہ روں سے بھی آگے ہے آشیاں اِن کا

یہ جھومتے ہوئے بادل کدھر کو جاتے ہیں؟
یہ جھومتے ہوئے بادل ہیں یا سپاہی ہیں
مصاحبانِ رسولانِ صبح گاہی ہیں
یہ راہ بر ہیں، روایات ہیں کہ راہی ہیں؟
یہ کس دیار کی شہزادیوں کے "ماہی" ہیں؟

یہ جھومتے ہوئے بادل کدھر کو جاتے ہیں؟
نقیب ہیں یہ مہکتی ہوئی بہاروں کے
حبیب ہیں یہ دھڑکتے ہوئے ستاروں کے
گماشتے ہیں جواں بخت شہر یاروں کے
مراسلے ہیں محبت زدہ نگاروں کے

ایک حسرت

صفیہ شمیم

پرکیف ہو جب دنیائے چمن اور ہر سو ہو آغازِ سحر
انگڑائیاں لیں نازک شاخیں اور جھوم رہے ہوں مست شجر
جب نہروں اور تالابوں پر ہوں عکس فگن انوارِ سحر
ہر قطرۂ شبنم ہو موتی، ہر ذرّۂ خاک لعل و گہر

جب غرقِ تبسم عالم ہو، گل صحرا کو مہکاتے ہوں
جب نکہت ہوا کے جھونکوں سے میدانوں میں لہراتے ہوں

جب مست فضائیں نکھری ہوں جیسے ہوں دھلی آبِ زر سے
چاندی سے جھلکتے دریا پر جب کرنوں کا سونا برسے
آراستہ ہو سلمائے سحر جب نور کے ترشے زیور سے
انگڑائیاں لے خوابیدہ فضا مہتاب کے سیمیں منظر سے
کوئل کی صدائیں آتی ہوں جب رہ رہ کر گلزاروں سے
اک نغمۂ شیریں پھوٹ پڑے جب دل کے نازک تاروں سے

اس وقت سنہرے گردوں سے تو کاش چمن میں بھی آئے!
ہستی کا مری ذرّہ ذرّہ تصویرِ مسرت بن جائے!

پسِ پردہ

مقبول شاہ کرالہ واری
ترجمہ: مقبول احمد سید

دامنِ کوہ میں کھلتے ہوئے لالے کی طرح
تو جو ہنگامۂ بازار سے بیگانہ رہے
تیرے ہی دم سے ہے عالم میں بہاروں کو فروغ
رنگ و رعنائیٔ گل تیرا ہی افسانہ ہے!

شمع کا نور رہی ہے قربتِ منزل کا سراغ
۔ شمع کی لو ہے لرزتا ہوا بے نام قلم ۔
شمع مینخانہ ہو یا شمعِ سرِ راہگذار
لوحِ ظلمت پہ بھی ہے تیرا ہی اک نام رقم!!

میرے محبوب! مرے حجلہ نشیں، گوشہ گزیں!
تو مری آنکھ سے مستور رہے، دل سے تو نہیں،
دلِ بیتاب کی دھڑکن کو سمجھتا ہوں میں،
میں اگر راہ سے بیگانہ ہوں، منزل سے نہیں!!

(کشمیری سے)

ازل سے تا امروز

حمایت علی شاعر

روشنی دوست نگاہوں کے سکوں کی خاطر
سال ہا سال سے ڈھلتے ہوئے خورشید کا نور
رات کے ماتھے پہ بنتا رہا زرّیں سا جال
لیکن اب تک نہ ہوئی رات سحر رنگ کبھی
چاندنی پا نہ سکی صبح کا دوشیزہ جمال
روشنی دوست نگاہوں کے سکوں کی خاطر
اب بھی ڈھلتے ہوئے سورج کا سسکتا ہوا نور
رات کے ماتھے پہ پھیلا ہے افق تا بہ افق
لیکن اس کوشش ناکام سے حاصل کیا ہے
جس کی بنیاد میں ترتیب نہ وسعت نہ عمق
روشنی دوست نگاہوں کے سکوں کی خاطر
پھیر کر رخ شبِ کشکول بکف سے اپنا
اب سحر دوست کہیں اور نظر رکھتے ہیں
چاندنی گرچہ دیئے جاتی ہے ہر گام فریب
اپنی منزل کی بہر گام خبر رکھتے ہیں
کل تلک ڈوبتا سورج تھا چراغِ محفل
آج ابھرتا ہوا خورشید ہے ان کی منزل

انجام

اختر ہوشیارپوری

وہ خواب، وہ خواب اب کہاں ہیں
بھٹک رہا ہوں میں جن کی خاطر
وہ خواب ۔ وہ خواب اب کہاں ہیں

غمِ زمانہ کا تیز جھونکا لپک کے آیا
بجھا گیا شمعِ آرزو کی حسین لو کو
حسین لو جو گداز ہونٹوں پھسلتے ملبوس کی لطافت پہ چھوٹتی تھی
سہانے خوابوں کو چومتی تھی
وہ خواب جو زندگی کے گلشن میں چُن رہا تھا روش روش سے
وہ خواب جو دل میں جاگ اٹھے تھے خارِ احساس کی خلش سے
وہ خواب جو ہر قدم پہ میرے شریکِ رہ تھے
بہارِ الفت کی جلوہ گہ تھے
وہ خواب کیسے عجیب تھے دسترس بھی جن تک نہیں رہی ہے
وہ خواب لیکن غمِ زمانہ کی تیز آندھی
کہ گُل ہوئی شمعِ آرزو کی حسین لو
اور میری نظروں کو پھر کہیں کچھ نظر نہ آیا

فریبِ ایّام کھا رہا ہوں
بھٹک رہا ہوں غمِ زمانہ کے تیرہ و تار راستوں میں
مری شریکِ سفر اکوئی گیت کوئی گاتا ہوا تبسم
کہ اب یہی ہیں چراغِ انجم
یہاں کہیں شمعِ آرزو کا گماں نہیں ہے
یہ اُجڑی بستی غمِ زمانہ کی سرزمیں ہے

گر رہا ہو جائیے ــــــ بقیہ صفحہ ۲۹

مل کر کسان کا پاک پسینہ سنہری سنہری گیہوں کی بالیاں بن کر چمکتا ہے۔ ہرے بھرے میٹھے میٹھے گنے بن کر لہلہاتا ہے، بھلا وہ اپنے باپ دادا کی جنم بھوم کیسے چھوڑ دیتا جس پر اس کے باپ دادا کو قانون قبضۂ آراضی نے حق دلایا تھا اور ایگری کلچرسٹ ریلیف ایکٹ اور لینڈ ریفارم ایکٹ نے اس کا نال گاڑ دیا تھا۔

مگر اب اس نے احتیاط برتنی شروع کر دی تھی، رات کو کھیتوں پر رہنا تو درکنار پہرہ ڈالنے بھی نہ جاتا۔ اور شام ہوتے ہوتے گھر میں آ جاتا۔ ایک روز مغرب بعد دھندلکے میں تیز تیز بڑھتا نہر کی پٹری پٹری آ رہا تھا کہ جیسے یکدم دائیں بائیں دونوں جانب کی زمین نے پانچ چھ آدمی اگل دیئے اور ساتھ ہی سر پر گنڈاسوں کی بارش ہو گئی۔ ایک چیخ بھی اچھی طرح نہ نکال پایا اور ذرا دیر میں گوشت کے ٹکڑے اور پٹری کی خون آلود مٹی نک کھرچ کر بہا دی گئی۔

انتظار اور انتظار کے بعد مختلف افواہیں اور سب سے بڑا ثبوت رحیا کا غائب ہونا، جب رحیا کی موت کے یقین کے بعد بسم اللہ اور رحیا کی ماں دونوں ساس بہو رو پیٹ کر فارغ ہو گئیں اور جلدی ہو گئیں کیونکہ پیٹ کی آگ غم کی آگ کو بڑی جلدی بجھا لیتی ہے تو زمیندار کا دستِ شفقت بڑھا پہلے تو گول گول لفظوں میں اور پھر کھلم کھلا، رحیا کی ماں کو زمیندار کے بار پہنچانے کا انتظام پیش کیا گیا اور رحیا کی بیوہ کو ماتھو رکھ لینے کی پیشکش ہوئی۔ اور جب انہیں یقین ہو گیا کہ جس بات کے پیچھے رحیا نے اپنی جان دیدی اور منظور کیا وہ اب سامنے آنے والی ہے اور جب اندازہ ہوا کہ یہ حیلہ ہندستانی بہ ستم میر سند کا مضمون ہوا چاہتا ہے تو ایک اندھیری رات میں وہ دونوں چل پڑیں، وہ چکی کے پاٹوں میں سے بچ کر نکلتے ہوئے وہ چیل دانے سے ...... ان کے داہنے پہلو پر لہلہاتے جھومتے کھیت پھیلے ہوئے تھے رازقِ مطلق کی شان رزاقی کے وسیع مظہر، اور بائیں ہاتھ پہ نیکٹری کھڑی تھی، سر بفلک جمنی والی انسانی عقل کا شاہکار، اور زمین گردش میں تھی نیکٹری گردش میں تھی، اور ان دونوں گردشوں سے نکلنے کے لئے ان کے پاؤں گردش میں تھے، گر کر جیسے بیل اور نیکٹری کے پہیہ کی طرح جہاں کے تہاں گھوم گھوم کر رہ جاتے تھے، نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ ایک ادنیٰ سی کرن کے لئے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی تھیں اور ٹامک ٹوئیاں مار مار کر رہ گئیں......

انتخاب از ماہِ نو، کراچی، نومبر ۱۹۵۵ء

فکاہیہ

اپنے گھر کا حال

راقم کو کچھ مدت لکڑی کی بنی ہوئی ایک ایسی "ہٹ" میں رہنے کا اتفاق ہوا، جو ایک کُنبے کے لئے بھی تنگ تھی، مگر اس میں بیک وقت دو مختلف کُنبے آباد تھے۔ ذیل کے اشعار میں اسی "زندگی" کی چند جھلکیاں پیش ہیں۔

ضمیر جعفری

لکڑی کی نصف "ہٹ" میں بسیرا ہے آجکل
جو حال میر کا تھا وہ میرا ہے آجکل

دو کمریاں کہ عرض ہے جن کا نہ طول ہے
جینا اگر یہی ہے تو مرنا قبول ہے

جو چیز جس جگہ تھی ضروری وہیں نہیں
چھت بے تکلفی میں کہیں ہے کہیں نہیں

آواز جو بلند ہوئی پار ہو گئی
اب گھر میں بات چیت بھی دشوار ہو گئی

یوں ہر شبک منڈیر پہ چھجا بڑھا ہوا
مجنوں پہ جیسے ناقۂ لیلیٰ چڑھا ہوا

گرمی کے دن عذاب تو راتیں حرام ہیں
ہر وقت سر پہ حضرتِ مسیح علیہ السلام ہیں

پنکھے کے ساتھ ساتھ ہی چھت بھی چلی ہوئی
"دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی"

بادل کبھی جو لہر میں لہرا کے آ گیا
کُنبہ تمام سامنے دریا کے آ گیا

دیوار اس طرف ہے تو شہتیر اس طرف
جذبہ اِدھر ہے نعرۂ تکبیر اُس طرف

"اسٹور" اس طرف ہے "کچن" دوسری طرف
"بلب" اس طرف لگے ہیں "بٹن" دوسری طرف

اس طرف کا مکان کوئی دوسرا نہیں
راشن کی کوٹھڑی تو ہے بیت الخلا نہیں

دو سنگ جوڑ جاڑ کے اک آدھ ٹین پر
چولہا سلگ رہا ہے خدا کی زمین پر

"باغِ عدن" کی نہر بہے "دوسری طرف"
نلکے کا دھڑ اِدھر ہے تو "ٹونٹی" دوسری طرف

روئے سخن اِدھر تو سخن دوسری طرف
گھنٹی کا "ٹن" اِدھر ہے تو "ٹن" دوسری طرف

سجدہ اِدھر تو دستِ دعا دوسری طرف
بندہ اِدھر پڑا ہے خدا دوسری طرف

شاعر اِدھر ہو مشقِ سخن دوسری طرف
"تن" اس طرف بپا ہے "تنن" دوسری طرف

مے اس طرف تو مستیِ مے دوسری طرف
"نے" اس طرف ہے "نالۂ نے" دوسری طرف

در اس طرف تو پردۂ در دوسری طرف
ہر چیز بالغرض ہے مگر دوسری طرف

کھلتا ہے اُن کے غسل کا خانہ مری طرف
گانا اِدھر ہو وجد میں آنا مری طرف

فرعون کا ہے شوق ذرا اُدھر کے مکین کو
اچھی سزا ملی ہے اِدھر کی زمین کو

گھبرا کے پی گئے کبھی کلغا کے پی گئے
پانی نیاز مند کے گھر تک کے پی گئے

کچھ خود پسند صبح کو بیدار ہو گئے
وہ شام ہی سے فتنۂ بیدار ہو گئے

مہمان میرے پاس جو کوئی آ کے رہ گیا
کچھ ایسی شرم آئی کہ شرما کے رہ گیا

نہلا دیا جہاں وہیں کھلوا دیا گیا
ٹہلا دیا گیا کبھی لٹکا دیا گیا

ہم اُس سے اور وہ جان سے بیزار ہو گیا
رشتہ تعلقات کا ہموار ہو گیا

فرزند خیر سے جو یہاں چار ہو گئے
پیدا ہوئے ہی تھے کہ نظر بند ہو گئے

گھر میں کبھی جو بیٹھ گیا ہوں نماز میں
بچے اُچھل پڑے ہیں جبینِ نیاز میں

جینے سے یوں نباہ کئے جا رہا ہوں میں
جیسے کوئی گناہ کئے جا رہا ہوں میں

ڈرامہ

ایک اندازِ جنوں

طاہرہ احمد

(ویسے تو تین کرداروں کے نام ملتے ہیں، لیکن شاید ایک محض خود کلامی سے کردار بڑی حد تک علامتی ہیں)

سعاد۔

حمیدی۔

جمال۔ سعاد کا بھائی

منظر

نشست کا بڑا سا کمرہ۔ کمرے میں سرمئی نیلگوں پردوں کی وجہ سے روشنی کم محسوس ہوتی ہے کبھی کبھی دھندلاہٹ زیادہ معلوم ہونے لگتی ہے اور کبھی اچانک روشنی سی ہو جاتی۔ کمرے میں سامان کچھ زیادہ نہیں۔ اور نہ اس سے کسی خاص ذوق کا اظہار ہوتا ہے کہیں کہیں گرد کی ہلکی سی تہہ جمی ہوئی نظر آتی ہے۔ لیکن کتابوں کی الماری اور آتشدان پر رکھی ہوئی افرادِ خاندان کی تصاویر نمایاں طور شفاف ہیں اور پھولدان میں مختلف قسم کے سفید پھول بہت سلیقے سے سجائے گئے ہیں۔

مغربی جانب: دو کھڑکیاں عقبی میدان کی طرف کھلتی ہیں جہاں صرف چند درخت اور خودرو پودے ہیں جن سے پرے کچھ فاصلے پر کھیت دکھائی دے رہے ہیں۔ مشرقی سمت میں: دو دروازے دوسرے کمروں میں کھلتے ہیں ان کے اور سامنے کے دروازے کے درمیان میں بھی دو کھڑکیاں ہیں۔

وقت:۔ ستمبر کی آخری تاریخوں کی ایک شام

(سعاد کمرے میں سر پر تولیہ لپیٹے ہوئے داخل ہوتی ہے اور آتشدان کے قریب جا کر رک جاتی ہے۔ کمرہ بالکل خالی ہے۔ گھوم کر آئینے پر نگاہ ڈال کر مسکرا دیتی ہے۔ اور پھر چونک کر آپ ہی آپ کہنے لگتی ہے۔)

سعاد:۔ اوہ میں آج کچھ بھی نہیں کر سکی۔ یونہی وقت گزر جاتا ہے۔ باجی نے قمیص سینے کے لئے کہا تھا اور جمال کا سوئیٹر مکمل کرنا ہے کتنی بار کہہ چکا ہے۔ "اب تو اگلے سال پہنا جائے گا یہ سوئیٹر شاید" کتنا کام ہے گھر میں نے اس کا کمرہ بھی ٹھیک نہیں کیا۔ کھانا نہ جانے کیا پکا ہے۔ کہیں پھر ہلچل مچ جائے۔ وہی ناخوشگوار فقرے "کھانے میں نمک تیز ہے۔ نہانے کے لئے پانی تیار نہیں۔ بستر ابھی تک نہیں ہوا" نہ جانے یہ لوگ اتنے عجیب کیوں ہیں جیسے سب کے اعصاب... لیکن اب تو میں۔ ہاں میں تو پرسکون رہتی ہوں نا۔ جیسے میں نے اپنے دل کی ہر کمزوری پر فتح پالی ہو۔ اور زخود سعاد لوٹ آئی ہو...

... اس نے خود کو پا لیا ہو۔ بہت دنوں سے میں نے آپ ہی آپ الجھنا چھوڑ دیا ہے۔ میں روئی بھی نہیں عرصے سے ــــ حالانکہ کل .... ہاں کل شام ہی تو مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے پھر مجھے وہ دن یاد آ گئے ہوں جو اب کبھی نہیں لوٹیں گے اور وہ راہیں جو کبھی کی ہمیں چھوڑ کر بہت دور جا چکی ہیں۔ سدا سدا کے لئے۔ اور جیسے اب میں۔ سعاد بھی ایک تصویر، گم گشتہ تصویر بن جائے گی جو خلش جن کے دل میں بس رہے اور گردشِ میں آتے آتے نکل جائے۔ (سعاد قریب رکھے ہوئے صوفے کی طرف لوٹتی ہے۔ دروازے سے حمیدی داخل ہوتا ہے)

سعاد:۔ (چونکتے ہوئے اور گھوم کر دیکھتے ہوئے)

اور تم .... مجھے معلوم تھا کہ تم ضرور آؤ گے نرگس!
شاید آ ہی رہے ہو۔

حمدی:۔ (غور سے سعاد کی طرف دیکھتا ہے۔ جیسے وہ اس کے چہرے پر کچھ پڑھنا چاہتا ہے)
یہ تم نے کیوں کہا تھا؟

(سعاد کے چہرے پر بے رنگ سی لہر دوڑ جاتی ہے لیکن فوراً ہی وہ گھبراہٹ پر قابو پا لیتی ہے)

سعاد:۔ کچھ نہیں۔ کوئی خاص بات نہیں، ویسے ہی۔ آج اتوار ہے نا! آپ اتوار کو عموماً آتے ہیں نا۔

حمدی:۔ اُو۔ ہ ۔ اچھا۔

(سعاد سامنے کی کرسی پر بیٹھ جاتی ہے کرسی کمرے کے وسط میں ہے جہاں دروازے سے آتی ہوئی روشنی نمایاں ہے)

سعاد:۔ اور آپ بخیر تو ہیں نا؟ کیسی طبیعت ہے آپ کی؟ .....
جی؟ کون میں؟۔ ہوں ۔ میں تو اچھی ہوں۔ میں بخیر کب نہیں تھی؟

حمدی:۔ تم اداس ہو۔ تم الجھ رہی ہو۔ آخر کیوں؟
تم نے ایک بار کہا تھا کہ تم مجھ سے ہر بات کہہ سکتی ہو۔
پھر؟

سعاد:۔ نہیں تو.... اداسی کا میری زندگی سے کوئی تعلق نہیں، بس میں کبھی کبھی اداس ہو جاتی ہوں۔ حقیقت پر واہمے کا غبار دھوئیں کی طرح چھا جاتا ہے۔ اور پھر یوں لگتا ہے جیسے کوئی سویا ہوا دکھ جاگ اٹھا ہو۔ لیکن جلدی ہی سکون کی لہر اسے اپنی بانہوں میں لے کر تھپک دیتی ہے۔

حمدی:۔ کیا خبر؟ (عجیب انداز سے ہنستی ہے)

ویسے میں چاہتی ہوں کہ صبح میں باغیچہ میں پھول چنتے اور گنگناتے ہوئے پہلی کرن کو خوش آمدید کہوں۔ ان مٹ مسکراہٹوں کو اپنے ہونٹوں اور آنکھوں میں محسوس کروں۔ پرسوں (WUTHERING HEIGHTS) پڑھتے پڑھتے میری آنکھ لگ گئی تو مجھ سے نہ جانے کس نے کہا۔" اپنے چہرے اور آنکھوں کی کیفیت اور ہر انداز سے تم مجھے اس لمحہ وحشت پسند معلوم ہو رہی ہو۔ اس کی آنکھیں بہت مانوس سی تھیں۔ ان نگاہوں کو اپنے چہرے پر محسوس کر کے میں نے اکثر سوتے سوتے اچانک آنکھیں کھول دی ہیں۔ اور میں یہ سن کر مسکرا دی۔

اس نے کہا "یوں بھی کوئی مسکراتا ہے۔ یہ تبسم نہیں کچھ اور ہے جسے میں شاید سمجھا نہ سکوں۔ میرے ذہن میں کوئی ایسی چیز نہیں آ رہی جس سے میں تمہیں مماثلت دے سکوں، جس میں تمہاری زندگی اور تمہاری کیفیات منعکس ہوں۔"

جب اس نے یہ کہا تو مجھے ایک آبگینے کا خیال آ گیا جس میں کبھی کبھی خود بخود ہی بغیر کسی ٹھیس کے بال پڑ جاتا ہو اور ہلکی سی آواز کے ساتھ موہوم سی لکیر نمودار ہو جاتی ہو۔"

حمدی:۔ پھر کیا ہوا؟

سعاد:۔ پھر میرے ذہن کے پردے پر ایک ساز ابھرا۔ نیا خوبصورت مگر گرد آلود ساز۔ اس کے تار ساکت تھے۔ جیسے ہوا تھم گئی ہو۔ مگر کچھ دیر کے وقفے سے ان میں خفیف لرزش ہوتی۔ ہلکی سی جھنجھناہٹ جیسے کوئی نرم انگلیوں کی جنبش سے انہیں آہستہ آہستہ چھیڑ رہا ہو۔ لیکن اسے میں دیکھ نہ سکتی ہوں۔ ویسے وہاں کوئی نہ تھا بس دھیمی سی آواز مجھے تاروں سے نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس آواز کو میں بمشکل سن سکتی تھی ــــ واہمے کی طرح۔ موہوم آواز۔ وہ میرا واہمہ نہیں تھا۔ میں نے تاروں کو لرزتے ہوئے دیکھا تھا.... مجھے معلوم نہیں کہ وہ مسرت کا نغمہ تھا کہ اداس نوحہ۔ اچانک پھر ایک بار تاروں میں حرکت ہوئی، پہلے کی نسبت تیزی کے ساتھ۔ زور سے۔ پھر شاید کوئی تار ٹوٹ گیا۔ اور وہ تصویر یا وجھل ہو گئی میرے ذہن سے۔ میں مسکراتی رہی۔ لیکن اس کی آنکھوں میں شکایتیں رچ سی گئیں۔ اس نے کہا۔ "تم مسکرا کیوں رہی ہو۔ میں تمہاری آنکھوں میں نمی دیکھنا چاہتا ہوں۔" یہ لبادہ مجھے پسند نہیں ہے۔ دوسروں کے لئے رہنے دو۔ یہ اندازِ بے ہنسی۔ میں تمہیں بے حجاب دیکھنا چاہتا ہوں۔ شاید تم خود کو دوسروں کی نگاہوں سے دور رکھنا چاہتی ہو۔ لیکن ہر احساس سے گریز ــ یہ ..."

حمدی:۔ ہاں پھر کیا ہوا؟

سعاد :۔ کچھ نہیں۔ شاید آنکھ کھل گئی۔

حمدی :۔ شاید تم کمتری کی الجھن کی یورش سے گھبرا جاتی ہو۔ میں نے اکثر چاہا کہ تم سے کہوں۔ بہت کچھ کہوں۔ لیکن پھر یہی خیال رہا کہ شاید تم۔ تم برا مان جاؤ۔

سعاد :۔ بہت کچھ... یعنی؟ (سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی ہے۔)

حمدی :۔ یہ۔ یہ کہ میں تمہاری زندگی میں۔ یہ ذہنی سفر میرے لئے انکشاف حقیقت بن جائے گا۔

سعاد :۔ اوں۔ ہوں۔ میری دنیا۔ میری زندگی وہ تو خود ایک تصویر ہے۔ میں خود ایک تصور۔ یا۔ حقیقت کی تمنا۔ نہیں تو یہ سب کچھ مجھے بہت عجیب لگتا ہے.... میں مسکرانا چاہتی ہوں، لیکن جیسے مسکرا نہیں سکتی۔

حمدی :۔ لیکن تم محض ایک تصور یا حقیقت کی تمنا نہیں۔ تم تو ایک زندہ حقیقت ہو۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اس حقیقت کو بھرپور نگاہوں سے دیکھ سکوں۔ چھو سکوں۔

(سعاد حمدی کی طرف گہری نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوتی ہے۔ جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو کچھ کہنے کو ہو۔ لیکن نگاہیں ہٹا کر خاموشی سے کھڑکی کی طرف دیکھنے لگتی ہے۔)

حمدی :۔ تمہارے بال گیلے ہیں شاید۔ نہا کر آ رہی ہو؟ مجھے گیلے بال اچھے لگتے ہیں۔ اور ان کی نرمی اور خوشبو۔ جیسے بارش کے بعد مٹی اور پھولوں کی ملی جلی خوشبو۔ تمہاری گردن پر پیچھے ایک تل ہے نا! امی کی طرح۔ ویسا ہی۔ جب وہ نہا کر آتیں تو میں ان کی گردن کے اس تل کو چوم لیا کرتا تھا۔

(سعاد گردن پر سے بال ہٹاتے ہوئے ایک طرف کو پیشانی پر ڈال کر انہیں دونوں ہاتھوں سے تھامتی ہے اور سر جھکانے لگتی ہے لیکن فوراً ہی بالوں کو جھٹک کر پیچھے کر لیتی ہے۔ اور کھڑکی کی طرف دیکھنے لگتی ہے۔

حمدی آگے بڑھ کر اس کے دونوں بازو تھام کر اسے کرسی کی پشت کی جانب دھکیلتا ہے۔ سعاد شانے سکیڑنے کی کوشش کرتے ہوئے دوسری طرف دیکھنے لگتی ہے۔ اس طرف آئینے میں اسے اپنا اور حمدی کا عکس نظر آتا ہے۔ وہ چند لمحے۔ اسل؟ آئینے میں دیکھتی ہے۔ پھر چونک کر پہلو بدلتی ہے اور اٹھ کر ٹہلنے لگتی ہے۔ حمدی قریب رکھی ہوئی کتاب کی ورق گردانی کرنے لگتا ہے۔

سعاد کمرے کے دوسری طرف کھڑکی کے برابر پہنچ کر حمدی کی طرف پشت کئے ہوئے آہستہ آہستہ بولتی ہے۔ یوں کہ حمدی نہ سن سکے۔ جیسے بڑبڑا رہی ہو)

سعاد :۔ (خود سے مخاطب ہو کر)۔ ہونہہ۔ یہ لمس۔ لطیف لمس میرے بازوؤں کے نیچے یہ انگلیاں۔ جو مجھے چھو رہی تھیں۔ یہ سب میرے لئے کتنا تکلیف دہ ہے۔ یہ لمس مجھے بے حس بنا دے گا۔ ہمیشہ کے لئے۔ سرد زہریلی بے حسی۔ اور پھر۔ یا مجھے کچھ ہو جائے گا۔ نہ جانے کیا۔ کچھ نہ کچھ ہو ضرور جائے گا مجھے یوں ہی لگتا ہے۔ معلوم نہیں کیوں؟ یا کہیں میں نفرت کرنے لگوں تم سے۔ کیا خبر؟

حمدی :۔ سعاد مجھ سے کہا تم نے کچھ؟ وہاں کیا کر رہی ہو؟

سعاد :۔ (پلٹ کر عجیب انداز سے مسکراتی ہے)

جی نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔ یوں ہی دیکھ رہی تھی۔ ذرا بس وہ منظر۔

حمدی :۔ اوہ۔ تو گویا۔ (ہنستا ہے)

ہاں وہ کون تھا جسے تم نے خواب میں دیکھا تھا پرسوں۔ شاید۔ شاید کوئی خیالی وجود۔ تم نے کہا تھا کہ اس کی نگاہیں بہت مانوس۔

سعاد :۔ (آواز جیسے بہت دور سے آ رہی ہو۔)

۔ نہیں۔ وہ حقیقت کی طرح حقیقی اور خوابوں کی طرح سرمدی وجود ہے۔ ہاں خوابوں کی طرح پر اسرار اور مگنجا۔ جیسے وہ ابھی تحلیل ہو جائے گا۔ کبھی اتنا قریب کہ میں گھبرا جاؤں۔ سر بہ گریباں ہو جاؤں اور۔ اور کبھی اس قدر دور کہ میں الجھنے لگوں۔ روہانسی ہو جاؤں۔ اور.......

حمدی :۔ (چونک کر) تم اسے جانتی ہو؟ کب سے؟

سعاد :۔ شاید ہمیشہ سے۔ میں اس وقت بہت چھوٹی تھی جب

میں نے اسے دیکھا۔ لیکن ایسی بچی بھی نہیں تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ میرا
پہلا احساس تھا۔ اور پہلا احساس۔ چاہے ہم اسے سمجھ بھی
نہ پائیں۔ بہت شدید ہوتا ہے نا؟ اور کبھی تو میں اس کے
متعلق فضول سی باتیں سوچنے لگتی۔ بےکار فضول عجیب سی
باتیں ۔"

حمدی :۔ کیا باتیں کیا سوچا کرتی تھیں تم؟

سعاد :۔ میں یہ نہیں بتا سکتی۔ چاہے کچھ بھی ہو۔ شاید مجھے بھی معلوم
نہیں کہ میں کیا سوچتی۔ بس اس کے متعلق میں وہ سب کچھ
سوچا کرتی جو ۔ میرا خیال تھا کہ۔ وہ بھی سوچتا ہے۔ اور پھر
میرا جی چاہتا کہ میں اس سے نہ ملوں۔ اس کے سامنے نہ جاؤں۔
میرا دل چاہتا سچ مچ بہت دل چاہتا کہ میں کہیں بھاگ جاؤں۔
کہیں بھی چلی جاؤں ۔ جیسے مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے
لگتی۔ ڈر لگنے لگتا۔ بہت دنوں تک میں آئینہ نہ دیکھ پاتی۔
اپنے بال مجھے برے معلوم ہونے، جو میں سمجھتی کہ شاید اسے
اچھے لگتے ہیں اور پھر میں رو رو کر اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیتی۔

حمدی :۔ (سوچتے ہوئے بے دلی کے ٹھہرے ہوئے دھیمے لہجے میں)
ہوں ۔ عجیب سی بات ہے لیکن تم آخر چاہتی کیا تھیں ۔

سعاد :۔ ہوں میرا جی چاہتا تھا۔ نہ جانے کیا جی چاہتا تھا۔ یہ بات
شاید عجیب ہی تو تھی زندگی کی طرح کتنی شدید گمبھیر عجیب
اور مبہم۔

حمدی :۔ شاید وہ نہ جانتا ہو یہ سب، شاید تم سے وہ بہت دنوں
سے نہیں ملا۔ ورنہ ۔

سعاد :۔ ہاں بہت دنوں سے۔ اس دن جب وہ ایک طویل عرصے
کے لئے دور کہیں چلا گیا تھا۔ بہت دور اور مجھ سے ملے بغیر
تو مجھے یوں ہی لگا تھا کہ وہ بہت دنوں سے مجھ سے نہیں ملا۔
اور اب بہت دنوں تک وہ نہیں ملے گا۔ وہ جا چکا تھا۔ ایک
لفظ کہے بغیر۔ اس دن مجھے اپنی ہر بات پر غصہ آتا رہا غم و غصّہ
مجھے گھیرے ہوئے تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں بس ایک لڑکی ہوں
اور اب صرف چند باتیں ہیں جو کھٹکتی رہیں گی۔ چند پھول ۔ جو
مرجھا چکے ہیں۔ اور کچھ تحائف جن کے متعلق یہ میں کبھی نہ کہہ سکی۔
یہ سب تم اس لڑکی کو دے دینا جو اس سے پہلے تمہیں ملی ہو۔
باآئندہ تمہیں ملنے میں کسی سلسلے کی کڑی نہیں بن سکتی۔" اسی لئے
میں اس کے ساتھ کہیں جاتا نہ چاہتی تھی اور ایسی ہی کوئی بات
میرے لئے اتنی شدید کیوں بن جاتی تھی۔ اور کچھ لمحے اسی لئے
میرے ذہن پر ایک دائمی ناقابل برداشت بوجھ بن کر چھا گئے
تھے۔ میرا جی چاہتا تھا میں اسے کہہ دوں کوئی بات جو بہت سنگین
ہو۔ میں اسے چپکے سے بتا دوں کہ وہ اور میں بہت دور ہیں
ایک دوسرے سے اور لڑکیاں سب وہ تو بہت سی ہیں۔ باتیں
کچھ کہے بنا کہیں چلی جاؤں۔ اور اس لمحے وہ تمام نرم نرم
پیاری باتیں جو زندگی کی طرح زندہ عجیب اور گمبھیر ہوتی ہیں۔
میرے ذہن سے اتنی ہی دور ہو جاتیں جتنی وہ میری زندگی میری
دنیا سے دور رہیں۔"

سعاد سعاد صوفے کے بازو پر سر رکھ دیتی ہے۔ اور کمرے میں دیر تک
خاموشی چھائی رہتی ہے۔

(جمال کی آواز دوسرے کمرے سے سنائی دیتی ہے۔)

جمال :۔ سعدی۔ سعاد۔ ارے شاید تمہاری کوئی دوست آئی ہوئی
ہیں۔ میں نے آوازوں سے پہچاننے کی بہت کوشش کی، مگر کچھ
سمجھ میں نہ آسکا کہ کون ہیں۔ کب سے چائے کے انتظار میں
یہاں بیٹھا ہوں۔ سوچا شاید وہ پردہ کرتی ہوں۔ ممکن ہے
کوئی اجنبی خاتون ہوں۔ اندر کیسے آتا!
کیا واقعی چائے آج نہیں ملے گی؟

(سعاد چونک کر ادھر ادھر دیکھتی ہے۔ کھڑی ہو جاتی ہے
کمرے میں اندھیرا ایک دم بڑھ جاتا ہے۔ حمدی کمرے میں
کہیں نظر نہیں آتا۔ شاید جا چکا ہے۔)

سعاد :۔ اجنبی؟ ۔ تو ۔ تو ۔ کیا وہ یہاں نہیں تھا۔ یہ وہ
نہ تھا ۔ وہ آیا ہی نہیں۔ وہ کیوں آتا؟ ۔ وہ نہیں آئے گا

(فرش پر یوں آہستہ سے گر جاتی ہے جیسے کسی کے بازوؤں
سے پھسل کر نیچے گر گئی ہو۔ دونوں ہاتھ پھیلا کر اوندھے منہ
لیٹ جاتی ہے۔)

سعاد :۔ یہ وہ کب تھا؟
وہ تو ایک گزرا ہوا لمحہ تھا جو چپکے سے لوٹ آیا۔ اور وہی
لمحہ مرے قریب آکر ٹھٹک سا گیا۔ جیسے وہ مجھے پہچاننے کی

(باقی صفحہ ۷۶ پر)

پشتو رومان

بہرام وگل اندام

فیاض

ترجمہ رضا ہمدانی

فیاض سترھویں صدی عیسوی کا ایک خانہ بدوش موسیقار تھا جو نغمے نظم کر کے ترنم بہ قریہ، رباب کے تاروں کی زبانی، اہل دل تک پہنچاتا۔ "بہرام وگل اندام" اس کی ایک طویل رومانوی داستان ہے جسکے چند اقتباسات ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں: ——— (مدیر)

تھا دیارِ رُوم میں اک حکمراں — مملکت اس شاہ کی تھی بیکراں
دولتؔ جاہ وحشم میں کم نہ تھا — حسرتِ اَولاد سے محرم نہ تھا!
طفلِ خوش اندام سے محروم تھا — جم تھا لیکن جام سے محروم تھا
منتیں مانیں، دُعائیں کیں مگر — ہو سکا کوئی نہ حربہ کارگر
آخر اک درویش کے فیضان سے — ہوگیا آزاد اس خلجان سے
عالمِ پیری میں بر آئی امید — شامِ غم میں صبح کی پائی نوید

ڈوبتے دل کو سہارا مل گیا
چشمِ اشک افشاں کو تارا مل گیا

اسقدر تھا خوبرو وہ مہ لقا — جس نے دیکھا ہوگیا دل سے فدا
دوستِ انجم، وہ مہِ گلفام تھا — نام اسکا اصل میں بہرام تھا
تربیت اسکی ہوئی اس شان سے — رہ گئے اہلِ فلک حیران سے
جب وہ شہزادہ جواں ہونے لگا — ماہِ کنعاں کا گماں ہونے لگا
آنکھیں اس کی اسقدر مخمور تھیں — رُوم کی سب لڑکیاں مسحور تھیں
وہ کسی پر بھی نظر کرتا نہ تھا — وادیٔ غم میں قدم دھرتا نہ تھا
بے نیازی میں بہت مشہور تھا — وادیٔ الفت سے کوسوں دور تھا

صنفِ نازک ہی سے تھی نفرت اسے
تھی شکار و سیر سے رغبت اسے

ایک دن صحرا میں تھا محوِ شکار — ساتھ اسکے تھے ملازم بے شمار
ایک آہو کے تعاقب میں چلا — ہوگیا ہمراہیوں سے پر جُدا
سوچتا تھا یہ کہ اب جائے کدھر — سامنے اک جھونپڑا آیا نظر

دفعتاً دیکھا وہاں اک مردِ پیر — خال وخد میں خضر لی گویا نظیر
پیار سے اس نے بٹھایا اور کہا — کیسے آئے اور کیا ہے مدعا؟
سوچکر کچھ مردِ حق کے سامنے — کہہ سنایا حال سب بہرام نے

سُن کے آہِ سرد وہ بھرنے لگا
داستاں اپنی بیاں کرنے لگا

بولا، دنیا گھوم کر آیا ہوں میں — کہکشاں کو چوم کر آیا ہوں میں
دیکھے ہیں لاکھوں حسینانِ جہاں — رشک جن پر کر رہا ہے آسماں
گرچہ ہیں وہ پیکرِ حسن وشباب — بنتِ چیں کا نہیں کوئی جواب
شاہِ چیں کی دخترِ زیبا ہے وہ — تو کہے پیمانۂ صہبا ہے وہ

تُندمے کا اک چھلکتا جام ہے
نام اُس مہ وش کا گل اندام ہے

یہ بیاں سنتے ہی مردِ پیر کا — ہوگیا شہزادہ کچھ دلگیر سا
وہ تصور دل کو تڑپانے لگا — اُٹھ کے سمتِ چین وہ جانے لگا
ہجر کے اندوہ سے دل ریش تھا — رات دن اس کو سفر درپیش تھا
جاتے جاتے پیاس نے گھیرا اُسے — ہر طرف سے یاس نے گھیرا اُسے
راہ میں اک باغ دیکھا پُر بہار — گلشنِ جنت بھی ہے جس پر نثار
کچھ عجب پُرکیف تھا وہ گلستاں — جابجا شفاف چشمے، ندیاں
تلخیٔ انجام سے غافل ہوا — دوڑ کر وہ باغ میں داخل ہوا
جھک کے اک چشمے سے جب پانی پیا — اک پری پیکر کا اس میں عکس تھا

یہ پری پیکر وہی گلفام تھی!
بنتِ چیں یعنی گل اندام تھی

جب نظر اس نے اٹھائی یک بیک — بس نگاہیں ہوگئیں اس کی دو چار
عشق آخر کام اپنا کر گیا — دل میں دونوں کے محبت بھر گیا
گفتگو کر کے لبِ خاموش سے — ہوگئے دونوں مگر بیہوش سے

دیر تک بجتا رہا الفت کا ساز
جب وہ آپس میں جدا ہونے لگے
اس طرف تھا غم سے شہزادہ نڈھال
تھے غمِ فرقت سے دونوں بیقرار
جل رہے تھے آتشِ الفت سے وہ
رفتہ رفتہ مشکلیں حل ہو گئیں

آنکھوں آنکھوں میں ہوئے راز و نیاز
دونوں اپنے حال پر رونے لگے
اس طرف بستر تھا شہزادی کا حال
مشکلیں تھیں راستے میں بے شمار
مل نہ سکتے تھے کسی صورت سے وہ
دشمنوں کی قوتیں شل ہو گئیں

ختم جورِ آسماں ہو کر رہا
عشق آخر کامراں ہو کر رہا

تصحیح

افسوس ہے کہ ماہ نو، کے جولائی اور اگست کے شماروں میں فضل محمد کریم فضلی صاحب کے چند اشعار درست طور پر نقل نہیں ہوئے۔ قارئین حسب ذیل تصحیح فرما لیں۔

شمارہ جولائی، صفحہ ۲۔ غزل کے مطلع کا مصرع ثانی ؛

دل ہے وہ طرفہ چیز تماشا کہیں جسے

کی بجائے "دل ہے وہ چیز طرفہ تماشا کہیں جسے" ہونا چاہئے۔

شمارہ اگست صفحہ ۴، نظم بعنوان "معرکۂ نظم و غزل" کے دوسرے شعر میں "ہوا رد و بدل" کی بجائے "ہوئی رد و بدل" اور ساتویں شعر میں "گونجتا ہے" کی بجائے "گونجتی ہے" کر لیا جائے۔

گلی در گلی ——— بقیہ ۵۶

سرخی پھوٹ پڑی اور وہ درہم ہو کر رہ گئی۔ وہ کافی دیر تک لڑکی کی سہمی سہمی سسکیاں سنتا رہا۔ مگر اس کا کوئی بس نہ چل سکا۔ بڑھا لے کھا جانے والی نظروں سے مسلسل گھور رہا تھا۔ پس وہ کلیجہ مسوس کے رہ گیا اور پھر اپنا بستر اٹھا کے کافی دور سے گیا جہاں لڑکی کی سسکیاں اب اس تک نہیں آ رہی تھیں مگر وہ اپنی سسکیوں کو تمام رات نہیں روک سکا

دوسری رات وہ لوگ اس ویران سڑک کو چھوڑ چکے تھے جب وہ ان کی تلاش میں پچھلے پہر تک چکر کاٹنے کے بعد مایوس ہو کر واپس اپنے پرانے ٹھکانے پر آیا تو ساری جگہ پائپ لائن کے قلیوں سے اٹی پڑی تھی۔ وہ سب کچھ بھلا گیا ہوا اپنی پرانی مخصوص جگہ پر رک گیا جہاں سامنے گلی کے راستے سے ہوا کے تیز جھونکے آتے تھے۔ مگر اس کی عدم موجودگی میں جگہ ساری کی ساری گھر چکی تھی۔ اس نے جھک کر سوئے ہوئے آدمی کے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور جھنجھوڑ کر رعب دارانہ انداز میں کہا۔

"اٹھ بے جاہل کے بچے۔ جگہ خالی کر میں آ گیا ہوں؟"

ایک انداز جنوں —— بقیہ ص۳۷

کوشش کر رہا ہو۔ شاید وہ یہ پوچھنے کو ہی تھا — "ہوں تو یہ تم ہی ہو نا؟ یہ آنکھیں۔ میں نے فوراً پہچان لیا انہیں۔ بھلا کیسے نہ پہچانتا"

لیکن وہ مجھے بس دیکھتا رہا ایک اجنبی کی طرح۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔ اس نے مجھے چھوا بھی نہیں اور پھر وہ چلا گیا —

اس خیال کی طرح جو خلش بن کے دل میں بس رہے اور گرفت میں نہ آسکے۔ گزرا ہوا لمحہ — جواب کبھی نہیں آئے گا کبھی نہیں۔

(کمرے میں مکمل تاریکی چھا جاتی ہے۔ اور نہ وہ جیسی سسکیاں اور سانسوں کی ہلکی آواز بتدریج گم ہو جاتی ہے۔)

○

پیچ —— بقیہ صفحہ ۵۲

کرتے۔ ایک دن کہنے لگے۔ یار ماموں جان کی تو ہتھے پر سے کٹ گئی۔ ایسا لگا کہ بالکل صاف۔ منجھلے نے گھبرا کر پوچھا "کیا شادی ہوگئی؟" اور میں نے ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا "ہاں ہماری استانی کی شادی ہوگئی۔ ان کے ہاتھوں میں مہندی لگ رہی تھی اور وہ سرخ جوڑے میں بڑی پیاری لگ رہی تھیں"

اس کے بعد ہماری استانی جی نے پھر کبھی باہر کلاس نہ لی۔ اور نہ ماموں جان نے ہمارے سکول کی چھت سے کبھی پیچ لڑائے ✦

○

تیسری بین الاقوامی صنعتی نمائش کراچی

ثقافت پاکستان

اگرچہ ہمارا ملک سیاسی طور پر ایک نوزائیدہ مملکت ہے لیکن ثقافتی اعتبار سے اس کی بنیادیں ماقبل تاریخ عہد کی گہرائیوں تک پہنچتی ہیں - فی الحقیقت پاکستان تہذیب، علم اور تمدن کا قدیم ترین گہوارہ ہے اور تقسیم ملک کے بعد اس بر صغیر کے بہترین تہذیبی ورثہ کا جزو اعظم پاکستان ہی کے حصہ میں آیا ہے۔ " ثقافت پاکستان " ایک مبسوط کتاب ہے جس میں پاکستان کے ثقافتی ورثہ کا مکمل جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کتاب کی تدوین میں ملک کے نامور ماہرین اور اہل قلم نے حصہ لیا ہے۔

دیدہ زیب مصور سرورق - مجلد پارچہ، طلائی لوح، ۱۶۰ تصویری صفحات، متن ساڑھے تین سو صفحات - قیمت ساڑھے چار روپیے -

انتخاب کلام - مسلم شعرائے بنگال

پچھلے ڈیڑھ سو سال میں مشرقی پاکستان کے مسلمان شعرائے بنگالی ادب میں جو بیش بہا اضافے کئے ہیں ان کا ایک مختصر مگر جامع انتخاب عہد قدیم سے لیکر معاصر شعراء تک پیش کیا گیا ہے، یہ ترجمے پروفیسر احسن احمد "اشک" اور یونس احمر نے براہ راست بنگالی سے اردو میں کئے ہیں -

۲۰۰ صفحات - مجلد (پارچہ)، طلائی لوح، ساڑھے چار روپیے - سادہ مجلد - چار روپے

عبداللہ

یہ بنگالی زبان کا ناول پہلی بار اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ یہ ناول عبوری دور کے معاشرہ کی جیتی جاگتی تصویر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ جس میں نئی زندگی پرانی زندگی کے ساتھ محو کشمکش ہے۔ اور آخر کار نئے تقاضے حیات کا رخ بدل دیتے ہیں -

ناول کا پس منظر بنگال کا ہے - مگر اس کی کہانی ہم سب کی اپنی کہانی ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کے دونوں حصوں کا تاریخی ارتقا کس طرح ایک ہی سطح پر ہوا اور ہم ایک دوسرے سے کس قدر قریب ہیں -

۳۰۰ صفحات - مجلد کتاب، دیدہ زیب سرورق، قیمت سادہ جلد چار روپے، طلائی جلد ساڑھے چار روپیے -

مشرقی بنگال کا پوتھی ادب

مسلم بنگال کی عوامی زبان اور ادب اسلامی افکار و علوم سے مالا مال رہا ہے۔ مسلم ادبا و شعرا نے اس زبان کو دیوی دیوتاؤں کے تصور سے نجات دلا کر انسان اور زندگی کو اپنا موضوع بنایا اور اپنے تاثرات کو ایسے سانچے میں ڈھالا کہ ان کا ادب مذہب، تصوف، تاریخ، تمدن، روایات اور قومی داستانوں کا لا زوال سرچشمہ بن گیا - اسے پوتھی ادب کہتے ہیں - یہ کتاب مسلمانان بنگال کے اس ادب کا مکمل تعارف ہے۔ اس کے ذریعے آپ بنگال کے مسلم عوام کی روح تک پہنچ سکتے ہیں - قیمت صرف ۱۲ آنے -

ماہِ نو

جلد ۸ شمارہ ۹ دسمبر ۱۹۵۵ء

مدیر:- رفیق خاور

نائب مدیر:- ظفر قریشی

سالانہ چندہ:- پانچ روپے آٹھ آنے. فی کاپی ۸ر

آپس کی باتیں

قائداعظمؒ کی سالگرہ ہم پاکستانیوں کے لئے پیغامِ حیات ہے، کیونکہ ان کی زندگی تمام تر ایک مجاہد کی زندگی تھی۔ قدرت نے انہیں دل و دماغ کی صلاحیتوں کے ساتھ وہ سوجھ بوجھ عطا کی تھی جو زندگی کی اصلیتوں اور تقاضوں کو کماحقہٗ سمجھتی ہے اور ان کے مطابق لائحۂ عمل اختیار کرتی ہے۔ ان کی تمام عمر مسلسل جد و جہد میں گذری۔ اس لئے یہ تمام انسانوں کو زندگی کی مشکلات کے خلاف مردانہ وار سینہ سپر ہونے کی دعوت دیتی ہے۔ قائداعظم کے سینے میں ایک بے باک مجاہد کا دل تھا اور جسم میں مردِ غازی کی توانائی۔ یہ شعلہ منش انسان تھا جس کو "عشق نے حرارتِ سوزِ دروں" عطا کی اور وہ مشرق کے افق پر ایک "آتشیں سیارہ" بن کر نمودار ہوا۔ قائداعظم نے جو روش بھی اختیار کی اس میں عشق کی والہیت اور سپردگی پوری طرح کارفرما تھی اور وہ اس پر پورے استقلال سے قائم رہے۔ انہوں نے جس چیز سے پیمانِ وفا باندھا، ہمیشہ اس سے وابستہ رہے اور اپنے نصب العین کو کسی مصلحت یا مفاہمت کی قربان گاہ پر بھینٹ نہ چڑھنے دیا۔ انہوں نے کوئی ایسا مسلک اختیار نہ کیا جس سے ان کی اخلاقی وجاہت کو ٹھیس لگے یا انہیں اس مقام سے نیچے اترنا پڑے جس پر ان کی فطرتِ بلند نے اپنا نشیمن بنایا تھا، کیونکہ وہ نہ ابن الوقت تھے نہ موقع پرست، نہ ضمیر فروش تھے اور نہ "سود و سودا" کے پرستار۔ انہیں اپنی ذات پر پورا پورا اعتماد تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شدید ترین حالات میں بھی ان کے قدم کو لغزش نہیں ہوئی اور ان کی رہنمائی میں "مورِ ناتواں" کا قافلہ ہزارہا موجوں کی کشمکش کے باوجود دریا کے پار ہو کر رہا۔ یہ حیرت انگیز کامیابی بلاشبہ ایک معجزے سے کم نہیں جس نے قائداعظم کو غیر فانی بنا دیا ہے۔

عام طور سے قائداعظم کو ایک عظیم رہنما اور بانیٔ پاکستان کی حیثیت سے ہی پیش کیا جاتا ہے، لیکن ان کی شخصیت کا خالص انسانی پہلو بھی نہایت تابناک ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ محمد علی جناحؒ کی حیثیت سے ان کی شخصیت زیادہ دلچسپ اور جاذبِ نظر ہے۔ یہاں ہم ایک سخت گیر سیاست دان کی بجائے ایک ایسے انسان سے ملتے ہیں جس کے رگ و ریشہ میں زندہ دلی کی لہریں دوڑتی دکھائی دیتی ہیں۔ اسکی بذلہ سنجی اور خوش مذاقی اس کی شخصیت کو اور پُرکشش بنا دیتی ہے، ہمیں اس کے ساتھ بے تکلفی کا احساس ہوتا ہے۔ ہم اسے آہن کی طرح گرم نہیں بلکہ ریشم کی طرح نرم پاتے ہیں اور یہ سمجھ جاتے ہیں کہ وہ کیا چیز تھی جس نے اس قدر سخت سیاست دان کو اتنا ہر دلعزیز انسان بنا دیا۔ یہ قائدِاعظم کی شوخیٔ طبع اور زندہ دلی ہی تھی جس نے ان کے سیاسی وجود میں بلا کی قوت اور حرکت پیدا کر دی اور آج جب ہم بابائے ملت حضرت قائداعظمؒ کو یاد کرتے ہیں تو ساتھ ہی، بلکہ اس سے زیادہ محمدؐ علی جناح کو یاد کرتے ہیں۔

قائدِاعظمؒ کی سالگرہ ہمیں پھر سے ان کے نقشِ قدم پر چلنے اور اپنی زندگی کو ان کے سانچے میں ڈھالنے کی ترغیب دلاتی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ اتحاد پر زور دیا۔ قیام پاکستان سے پہلے یہ اتحاد اس برصغیر کے مسلمانوں کو منظم اور مضبوط بنانے کے لئے ضروری تھا اور آج اس مملکتِ خداداد کے تحفظ کے لئے اور بھی ضروری ہے۔ یقیناً ہماری ملی نشوونما، عروج و ترقی اور رہنمائی کے لئے قائداعظمؒ کی شخصیت چراغِ راہ رہے گی۔

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں! — پہلے خواجہ حسن نظامی، پھر بیخود دہلوی اور اب پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی — علم و ادب کی تین نورانی شمعیں گل ہو گئی ہیں جن سے پاک و ہند کی ادبی محفلوں میں غیر معمولی فروغ تھا۔ انہوں نے اپنے اپنے طور پر دنیائے ادب و فن کو روشن کیا۔ پنڈت دتاتریہ قیام پاکستان سے پہلے بھی اردو کے زبردست حامی تھے اور اسکے بعد بھی ایک ناسازگار ماحول میں اس شمع کو روشن رکھنے کی سرگرمی سے حمایت کرتے رہے۔ وہ اُن لوگوں میں سے تھے جنہوں نے قول و عمل سے اردو زبان اور ادب کو بھارت میں زندہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ انہوں نے نہ صرف انفرادی طور پر بلکہ مختلف اداروں کے ذریعہ بھی اپنی محبوب زبان اور اس کے ادب کو فروغ دینے کی سعیٔ بلیغ کی اور گراں قدر خدمات کا ایک اہم سرمایہ یادگار چھوڑا۔ ہم ان کے بارہ میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ ؎

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

"سیّارۂ آتشیں"

بیگم تصدق حسین

قائداعظمؒ کی یاد تا دمِ زیست دل و دماغ کے گوشہ گوشہ میں جاگزیں رہے گی۔ اگر ہم نے مسلمانانِ ہند کے اس محبوب رہنما کو نہ دیکھا ہوتا، اس کی دلکش اور ولولہ انگیز تقریریں نہ سنی ہوتیں اور اسکی پُرجلال قیادت میں کام نہ کیا ہوتا، تو شاید آج ہم بھی اُسی طرح اس کا نام لیتے جیسے آئندہ نسلیں، جو اسے محض تاریخی حیثیت سے جانتی ہوں گی، لیا کریں گی۔ انہیں کیا معلوم کہ قائداعظم کیا تھے، کیسے تھے کس طرح اپنے ساتھیوں سے محبت کرتے تھے اور اپنے کارکنوں کے کتنے قدردان تھے۔ وہ کس قدر دوربین دوراندیش اور قیافہ شناس تھے۔ دشمن کی گھاتوں اور چالبازیوں کو کیسے سمجھتے تھے۔ انہیں ہزار بار مکر و فریب کی شکر آلود گولیاں کھلانے کی کوشش کی گئی، مگر وہ کبھی دھوکے میں نہ آئے۔ انہوں نے فوراً بھانپ لیا کہ ان کے پردہ میں کونسی تلخ اور زہریلی حقیقتیں پوشیدہ ہیں۔ ان آزمائشوں میں خلوص اور نیک نیتی ان کی واحد سپر تھی۔

ہمارے دل قائداعظم کے احترام اور عقیدت سے آج بھی اسی طرح لبریز ہیں جیسے ان کی زندگی میں تھے۔ اگرچہ وہ جلیل القدر انسان نظروں سے اوجھل ہوگیا ہے، پھر بھی اس کی باتیں ابھی تک کانوں میں گونج رہی ہیں۔ ایک بار نہیں ہزار بار انہیں بھلانے کی کوشش کی جائے، مگر ہم انہیں کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ ایک دن کا ذکر ہے، قائداعظمؒ لاہور تشریف لائے۔ لوگوں کے دل عقیدت سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ پُرآشوب زمانہ بہت کرب انگیز تھا جبکہ حکومت برطانیہ مسلمانوں کو دبانے اور پاکستان کے مطالبہ کو پس پشت ڈالنے کے لئے ہر طرح طرح کی سختیاں کر رہی تھی۔ قائداعظمؒ کے لاہور آنے کی خبر نے ہمارے خشک دلوں میں تازگی پیدا کر دی۔ ہر کہ و مہ ان کی تشریف آوری کی خوشی سے سرشار تھا۔ اچانک ۶ بجے شام یہ سنسنی خیز خبر پہونچی کہ کسی نے قائداعظمؒ پر حملہ کرکے انہیں زخمی کر دیا۔ میں اس وقت اندرونِ شہر ایک میٹنگ میں شریک تھی۔ یہ خبر پہونچتے ہی میٹنگ فوراً درہم برہم ہو گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ خبر شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ لوگوں نے سنتے ہی دکانیں بند کر دیں، بارونق بازار فوراً خاموش اور سنسان ہو گئے۔ لوگوں کی لمبی لمبی قطاریں ممدوٹ ولا کی طرف رواں تھیں۔ سڑکوں پر موٹر تانگے چلنا دشوار تھا۔ جو سنتا وہیں سب کام چھوڑکر ساتھ ہو لیتا چند ہی لمحوں میں ممدوٹ ولا کے دروازے پر ایک بے پناہ بھیڑ لگ گئی اور "قائداعظم زندہ باد" کے نعروں سے فضا گونج اُٹھی۔ شہر کے ہر حصے سے ہزارہا ٹیلیفون آئے، قائداعظم کے سیکریٹری، ہجوم کا شور سُن کر باہر نکل آئے اور لوگوں کو بتایا کہ قائداعظم بخیریت ہیں، انہیں کوئی حادثہ نہیں پیش آیا، مگر اس کو کون سنتا تھا! لوگوں کا مطالبہ تھا کہ ہمیں قائداعظم دکھاؤ، وہ کہاں ہیں؟ انہیں کس موذی نے زخمی کیا؟ ہمیں بتاؤ وہ شقی القلب کون ہے؟ سیکریٹری بہت دیر تک ہجوم کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہا، مگر لوگوں نے اس کی ایک نہ مانی۔ ہجوم لحہ بہ لحہ اور بے تاب ہو رہا تھا۔ قائداعظم کی صورت دیکھنے کے لئے ہر شخص بے چین تھا۔ جب مجمع بالکل قابو سے باہر ہوگیا اور اسکی آوازیں اندر پہونچنے لگیں تو قائد کا دل اپنے فدائی مسلمانوں کی محبت دیکھ کر تڑپ اٹھا۔ انہوں نے خود تینوں دروازے کھولے اور باہر نکل آئے۔ برآمدے کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوکر فرمایا: "میرے بھائیو! میں بالکل اچھا ہوں مجھے کوئی گزند نہیں پہنچا، تم بے فکر

ہو کر جائے محمد علی کے ساتھ خدا کی مدد شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ کو پاکستان بنانا مقصود ہے۔ میں بخیریت ہوں اور تمہیں بے چین کرنے کے لئے یہ خبر کسی دشمن نے اڑائی ہوگی۔ میں تمہاری محبت کا بہت شکر گزار ہوں اور چاہتا ہوں کہ تمہاری یہ محبت پاکستان کی محبت میں تبدیل ہو جائے"۔

قائد اعظمؒ لوگوں کو تسلی دے کر اندر تشریف لے جا رہے تھے کہ میں بھی بھیڑ کو چیرتے ہوئے ممدوٹ ولا پہنچ گئی۔ اسوقت آپ کھانے کے کمرے میں تشریف فرما تھے۔ میں نے جا کر حیرت سے پوچھا" قائد اعظمؒ آپ خود اس ہجوم میں کیوں تشریف لے گئے؟" آپ نے ہنس کر فرمایا "یہ سب میرے دوست ہی نہیں، پاکستان کے دوست ہیں۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ سب پاکستان کے سچے ہمدرد اور جان نثار سپاہی ہیں اور پاکستان کے لئے ہر تکلیف اٹھائیں گے"۔ اس واقعہ کی وحشت دور ہوئی اور میں نے اٹھ کر اجازت طلب کی تو فرمایا" بیٹھو، کھانا کھاؤ"۔ میرے لئے اس سے بڑی سعادت کیا ہو سکتی تھی۔ میں بہ ادب بیٹھ گئی اور کھانا شروع ہوا۔ اتنے میں اور ہزاروں دوست قائد اعظم کی خیریت پوچھنے کے لئے باہر جمع ہو رہے تھے اور ہر قسم کے سوالات کی بوچھاڑ کر رہے تھے۔

قائد اعظمؒ نے اس شام ہمیں اپنے سیاسی دشمنوں اور دوستوں کی کوششوں کی بے شمار مثالیں سنائیں اور بتایا کہ ہم نے ایسے وقت پر ذرا بھی حوصلہ ہار دیا ہوتا۔ تو ہمارے مخالف مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے میں کامیاب ہو چکے ہوتے۔ آپ نے ۱۹۴۳ء کا وہ واقعہ بھی بیان فرمایا جب کہ خاکساروں کی طرف سے انہیں کئی دھمکیاں موصول ہوئی تھیں۔ وہ ان پر ملک سے غداری کا الزام لگاتے تھے اس لئے کہ وہ مسلم لیگ کو کانگریس کے ساتھ مدغم نہیں کرنا چاہتے تھے اور اپنے مطالبے کانگریس کے مطالبوں کے ساتھ شامل نہیں کرتے تھے۔ آپ نے بتایا کہ ایک دن تو مجھے پچاس تار اور سو خطوط موصول ہوئے جن میں مجھے قتل کرنے کی دھمکی دی ہوئی تھی اور یہ کہا گیا تھا کہ اگر تمہیں پاکستان ہی لینا ہے تو گاندھی جی کے ساتھ صلح کر لو، ان سے جیل میں جا کر ملو۔ ورنہ ایک روز اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ قائد اعظمؒ نے بتایا کہ جس دن اس دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کے لئے میرا ایک دوست آن پہنچا تو میں اپنے کمرے میں اپنی فائیلوں میں کھویا ہوا تھا۔ اور کئی گھنٹے کام کرنے کے بعد اٹھ کر دوسرے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ اچانک وہ شخص سامنے آ گیا۔ یہاں پہنچ کر قائد اعظم رک گئے۔ پھر فرمایا کہ میرا دشمن کامیاب نہ ہو سکا، اسی لئے مجھے یقین ہے کہ خدا ہم کو پاکستان دینے کے حق میں ہے۔

مسٹر جناح اپنی زندگی میں شکست کا نام لینا گوارا نہیں کرتے تھے۔ جب انہیں مسلسل کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو اور فرنگی لیڈروں سے پے درپے ملاقاتوں میں صبح و شام دماغی کاوشوں میں گذارے، قتل کی دھمکیاں سنیں اور پھر یہ سانحہ ظہور میں آیا، تب بھی ان کے عزم صمیم جرأت اور استقلال میں ذرا بھی فرق نہ آیا۔ وہ اپنی قوتِ ارادی سے ہر مشکل پر قابو پا لیتے۔ ان کی وجاہت ایک بے مثال، پُر جلال وجاہت تھی، جو آج کسی اور شخص میں نہیں ملتی اور نہ آئندہ ملنے کی امید ہے +

○

جب تک آپ اپنی ملکی سیاست سے اس زہر کو نکال کر نہیں پھینک دیں گے، اس وقت تک آپ خود کو ایک حقیقی قوم میں نہیں ڈھال سکتے۔ اور نہ ویسا جوش اور ولولہ پیدا کر سکتے ہیں۔ آپ کو چاہیئے کہ بنگالی، سندھی، بلوچی، پٹھان وغیرہ کی باتیں نہ کریں۔ آپ سب ایک قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ نے ایک سلطنت اپنے لئے بنائی ہے۔ ایک وسیع عریض سلطنت۔ یہ سب آپ کی ہے، یہ نہ پنجابی کی ہے نہ بنگالی کی، نہ سندھی کی، نہ پٹھان کی۔ یہ آپ کی ہے۔

قائد اعظمؒ

قائد اعظم رحمتہ اللہ علیہ

عظیم قائد

سر محمد یامین

قائد اعظم مرحوم مسلم لیگ پارٹی کے سنٹرل اسمبلی میں لیڈر تھے اور میں سکرٹری تھا اور قریب قریب روزانہ ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ ایک دن ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد مرحوم کے یہاں لنچ تھا، جس میں صرف قائد اعظم، چودھری ظفر اللہ خاں، سید محمد حسین بیرسٹر، سر ضیاء الدین احمد اور میں تھے۔ دورانِ گفتگو میں پاکستان بننے کا تذکرہ آگیا اور یہ گفتگو چھڑ گئی کہ آیا وہ تجویز جو رحمت علی صاحب لندن سے لکھ لکھ کر پیش کر رہے ہیں، کہاں تک قابل عمل ہے۔ سید محمد حسین اس تجویز کے معاون اور سر ظفر اللہ خاں اس کو ناقابل عمل سمجھتے تھے۔ میں اور ڈاکٹر سر ضیاء الدین اس رائے کے تھے کہ پاکستان میں اگر زیادہ رقبہ اراضی شامل ہو اور مشرقی علاقہ بھی شامل ہو تو کوئی مضائقہ نہیں ورنہ رحمت علی کی تجویز بہت کم رقبہ دلاتی ہے اور وہ ناقابل عمل ہوگا۔

قائد اعظمؒ، جو کہ بہت دور اندیش تھے اور پولٹیکل سوجھ بوجھ بہت رکھتے تھے، ایک دم چونک کر مجھ سے کہنے لگے کہ ہم پاکستان کو مسلم لیگ کا نصب العین کیوں نہ بنا لیں؟ ابھی تک ہماری مانگ مبہم ہے، اس کے بعد مخصوص ہو جائے گی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ قائد اعظمؒ نے پاکستان کے معاملے پر غور کیا اور اس کو پسند کر کے اپنا لیا اسکے بعد لاہور کا رزولیوشن ۱۹۴۰ء میں اسی کے نتیجے میں پاس ہوا۔

یہ رزولیوشن مردم شماری کے صحیح اعداد و شمار نہ ہونے کی وجہ سے اس وقت مکمل نہ تھا۔ دہلی سے واپسی پر میں نے صحیح اعداد و شمار دئے جس کے بعد قائد اعظمؒ اپنی تقریروں میں پاکستان کا مطلب کل پنجاب، کل بنگال اور آسام لیا کرتے تھے، لیکن لاہور کے رزولیوشن کی وجہ سے پنجاب، بنگال اور آسام کے ٹکڑے ہوگئے اور پاکستان موجودہ صورت میں ملا۔ قائد اعظمؒ چونکہ بہت بڑے کانسٹی ٹیوشنلسٹ تھے اور خوشامد کو ناپسند کرتے تھے۔ اس لئے یہ دونوں واقعات جو خالی از دلچسپی نہیں ہیں بیان کرتا ہوں :-

اول۔ جب لاہور میں ۱۹۴۰ء میں پاکستان رزولیوشن پر بحث ہو رہی تھی اور رات کے دو بج گئے تھے، ایک ممبر کونسل آل انڈیا مسلم لیگ نے جو کہ ایک بڑے کاروباری ہیں، کھڑے ہو کے اور خوشامدانہ طریقے سے کہا کہ ہم آپ یعنی قائد اعظم کو پورا اختیار دیتے ہیں۔ آپ جیسا بھی رزولیوشن بنا لیں گے ہم کو منظور ہوگا۔ قائد اعظم نے فوراً سختی سے جواب دیا "یہ جلسہ سبجکٹ کمیٹی کا ہے اور اس میں ہر شخص کی رائے لی جائے گی۔ اور جو صاحبان رائے رکھتے ہیں، ان سب کو اختیار ہے کہ وہ اس کو ظاہر کریں۔ رزولیوشن سب کی رائے سے بنایا جائے گا نہ کہ میری تنہا رائے سے"!

دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ جب دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کا جلسہ ہو رہا تھا تو وہاں بھی ایک خوشامدی نے نعرہ لگایا: "شاہِ پاکستان زندہ باد!" قائد اعظمؒ بجائے خوش ہونے کے فوراً بولے "دیکھئے، آپ لوگوں کو اس قسم کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ پاکستان میں کوئی بادشاہ نہیں ہوگا۔ وہ مسلمانوں کی ریاست پبلک ہوگی، جہاں سب مسلمان برابر ہوں گے کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت نہیں ہوگی"!

جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ۱۰ اپریل ۱۹۴۷ء کو مجھ سے دوران گفتگو میں یہ صاف ظاہر کر دیا کہ وہ پنجاب اور بنگال کے ٹکڑے کرینگے تو میں نے قائد اعظمؒ سے کہا کہ اس قدر چھوٹے چھوٹے صوبوں کی حکومت پر بہت خرچ ہوگا۔ اس وقت قائد اعظمؒ نے کہا کہ اگر ایسا ہوا تو ہم سارے مغربی حصہ کو ملا کر ایک حکومت کر سکتے ہیں اور جب پاکستان ایک ہی قوم کا ملک ہوگا تو اسکے جدا جدا ٹکڑے کیوں کئے جائیں...

(بشکریہ ریڈیو پاکستان کراچی)

دمِ شمشیر

اسد ملتانی

اُفقِ فریادی ہے کس کی شوخیٔ تقریر کا
ہو گیا مشکل تحمل شعلۂ تاثیر کا
کٹ گیا دورِ غلامی، بٹ گیا برِ عظیم
مردِ حق کا قولِ فیصل تھا، کہ دمِ شمشیر کا
شاعرِ مشرق نے پاکستان کا دیکھا تھا خواب
قائدِ اعظم نے ساماں کر دیا تعبیر کا
عصرِ حاضر کی سیاسی ظلمتوں کے درمیاں
نورِ حق کرنا عیاں، لانا تھا جوئے شیر کا
قومیت کے ایک ہی پہلو پہ تھی سب کی نظر
دوسرا رخ اس نے روشن کر دیا تصویر کا
قوتِ عزم و یقیں سے اس نے ثابت کر دیا
کس طرح تدبیر کرتی ہے عمل تقدیر کا
تھا ابد پیوند حسنِ تدبر، حق پرستی اور خلوص
رہبرِ فرزانہ کی اس قوتِ تسخیر کا
معجزے سے کم نہ تھی گو کشورِ نو کی بنا
مرحلہ دشوار تر ہے قوم کی تعمیر کا
رابطۂ ملت کے لئے درکار ہے ایسا نظام
جو کہ صورت گر بنے ہر فرد کی تقدیر کا
اُس کی مضبوطی پہ کر سکتے ہیں کیونکر اعتماد
ایک بھی حلقہ اگر کمزور ہو زنجیر کا

قائدِ اعظم رہے گا خلد میں بھی بے قرار
حل نہیں ہوتا ہے جب تک مسئلہ کشمیر کا

شعلہ و شبنم

ماہر القادری

اب بھی ہے تیرے نام کی اک دھوم کو بہ کو
اب بھی ہے تیرے ذکر کا ہنگامہ چار سو
تو مسکرا دیا تو شگوفے چٹک گئے
تیرا خرام ناز کہ اک موجِ رنگ و بو
اے وہ کہ تیرا ناخنِ حکمت گرہ کشا
اے وہ کہ تیری ذات سیاست کی آبرو
یہ امتزاجِ شعلہ و شبنم بھی خوب تھا
لہجہ میں طمطراق مگر نرم گفتگو
میدانِ جد و جہد میں تھی تیری زندگی
آہو کی چال ڈھال تو شاہیں کی جستجو
تدبیر تیرے سامنے اک طفلِ نو شعور
دانش تھی اک کنیزِ حرم تیرے روبرو
پیرانِ پارسا کا بھی گرما دیا لہو
تو نے بنایا برف کے ٹکڑوں کو شعلہ خو
تجھ پر سلام، قصرِ شبستاں میں بھی رہا
ملت کے غم میں اشکِ چکیدہ سے باوضو
دیکھو تو ایک جسم بہت زار اور نحیف
سوچو تو فرق تا بہ قدم سوزِ آرزو
اک یہ زمانہ پھول ہیں اور تازگی نہیں
وہ تیرا دور جب کہ تھی کانٹوں میں بھی نمو

دامانِ چاک چاک ہے مدت سے بے رفو
شیرازہ بندِ ملتِ بیضا کہاں ہے تو!

افسانہ

مونچھ

ممتاز مفتی

شام کا وقت تھا۔ وہ چپ چاپ بیٹھک سے ملحقہ برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا۔ مکان پر ہو کا عالم طاری تھا۔ جیسے صور پھونک چکا ہو۔ بیٹھک میں اس کی چیزیں ادھر اُدھر یوں بکھری پڑی تھیں، جیسے ان کا کوئی وارث نہ ہو۔ میز پر صبح کا بچا ہوا کھانا ویسے ہی پڑا تھا۔ ریک پر سگرٹ کے خالی ڈبوں کے ڈھیر سے بنے ہوئے تھے۔ سگرٹ کے ڈبوں کی طرف دیکھ کر اقبال نے ایک لمبی آہ بھری۔ اور پھر سامنے رکھی ہوئی تپائی پر پڑے ہوئے سگرٹ کو اٹھا کر اسے خالی ڈبی میں ڈال کر چارپائی پر پھینک دیا۔ اس نے وہ سگرٹ کئی بار ڈبیہ سے سلگانے کے لئے نکالا تھا، لیکن نہ جانے کیوں سگرٹ پینے کو اس کا جی نہ چاہا تھا۔ اب تو اسے سگرٹ کو دیکھ کر وحشت ہوتی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے وہ سالہا سال سے بیمار ہو یا جیسے وہ مادی طور پر مر چکا ہو اور اب صرف روح کی حیثیت سے جی رہا ہو۔ چاروں طرف ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ خاموشی اور ویرانی، اور وہ اس گہری خاموشی میں گویا ڈبکیاں کھا رہا تھا۔

ہی ہی ہی ہی ——— ہنسی کی آواز سُن کر وہ چونکا۔ پڑوس میں گوہر قہقہہ مار کر ہنس رہا تھا۔ کتنا خوش قسمت ہے، اقبال نے سوچا۔ گوہر کا مردانہ دار چہرا اس کے سامنے آگیا۔ کتنا بارعب چہرا تھا اور پھر اس کی گھنی مونچھ۔ گوہر کی مونچھ کا خیال آتے ہی اس کا سینہ تن گیا۔ وہ اٹھ بیٹھا جیسے دفعتاً مایوسی کے اُس گہرے اندھیرے میں امید کی ایک شعاع آ چمکی ہو۔

اقبال کے گھر کی خاموشی اور ویرانی کا تمام تر سبب گوہر کی مونچھ تھی۔ اگر گوہر کی مونچھ اس دور کی یادگار ہوتی جب کلین شیو اور مونچھ کے درمیان سمجھوتہ ہوا تھا اور لوگوں نے لبوں پر فل سٹاپ سے لگائے تھے، جیسے مکھیاں بیٹھی ہوں، تو حالات خراب نہ ہوتے یا اگر وہ بالوں کے تیلے سے کش کی طرح ہوتی جیسے نوجوان رومانی شکل و صورت بنانے کے لئے رکھ لیتے ہیں تو بھی کوئی مضائقہ نہ ہوتا۔ یا اگر مولوی صاحب کی طرح گوہر مونچھ کی لبیں کٹوا کر انہیں کھلا کر لیتا تو بھی بات نہ بگڑتی، لیکن گوہر کی مونچھ پینٹ برش کی طرح گھنی اور پھیلی ہوئی تھی۔ مونچھ کی بات چھوڑئیے، گوہر کا چہرا بھی تو چوڑا اور بھرا ہوا تھا۔ اس کا قد اونچا تھا، اس کا جسم فربہ تھا۔ اس کی آواز، بات کرنے کا انداز، قہقہہ، چال ڈھال، ہر تفصیل سے رعب، دلیری، بے پروائی، بے فکری اور خوش باشی کا اظہار ہوتا تھا اور یہ تمام خصوصیات اقبال کی نگاہ میں مردانہ اوصاف تھے، جن سے وہ خود محروم تھا۔

ان کے علاوہ دو ایک اور تفصیلات بھی تھیں۔ مثلاً گوہر کی بیوی انوری تھی۔ جس کا چہرا انسانی زبردستی کا مرقع تھا اور جس کی آواز اس قدر مدھم تھی کہ وہ کمرے کے اندر ہی دب کے رہ جاتی تھی، لیکن سب سے اہم تفصیل یہ تھی کہ گوہر ان کے پڑوس میں، ان کے گھر سے ملحقہ گھر میں آ بسا تھا۔ اگر وہ ان کے پڑوس میں نہ آتا تو شاید یہ واقعہ کبھی رونما نہ ہوتا۔

شادی سے پہلے اقبال کو اپنی موجودہ بیوی وسیمہ سے محبت تھی۔ اس لئے نہیں کہ وسیمہ بے حد خوبصورت یا شوخ تھی، یا اُس کے انداز میں کوئی انوکھا پن تھا۔ خوب صورت اور شوخ لڑکیاں تو وہ کئی دیکھا کرتا تھا، چلتے ہوئے سڑک پر یا کمپنی باغ میں یا کاروں میں۔ انہیں دیکھ کر وہ چونک جایا کرتا تھا، لیکن ان کی خوبصورتی اور شوخی کا اثر دیر تک نہ رہتا۔ چونکہ وہ محسوس کرتا جیسے وہ بہت دور ہوں، بہت دور، اس کی دسترس سے دور اور وہ بے حد اُجلی ہوں، اتنی اُجلی کہ ہاتھ لگاؤ تو میلی ہو جائیں اور اس کے اپنے ہاتھ میلے تھے، لہٰذا ان سے

محبت کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے برعکس وسیمہ اس کے بہت قریب تھی۔ وہ اس کی خالہ زاد بہن تھی نا اسلئے۔ آپ جانتے ہیں لڑکیاں جب جوان ہو جاتی ہیں تو ان میں ایک بے نام سی دلکشی پیدا ہو جاتی ہے چاہے خدوخال کیسے ہوں، رنگ گندمی ہو یا سانولا، ان کی شخصیت میں ایسی تفصیلات نمایاں ہو جاتی ہیں جو نوجوان لڑکوں کو بے حد پیاری لگتی ہیں، نہ جانے لڑکیاں جوان ہو کر جاذبِ نظر کیوں ہو جاتی ہیں؟ وسیمہ اقبال کے سامنے کھیل کھیل کر جوان ہوئی تھی۔ ان دنوں اس نے اس بچی کی طرف کبھی توجہ نہ دی تھی۔ پھر جب جوان ہونے کے بعد پہلی مرتبہ وہ اسے دیکھ کر چھپ گئی تھی تو دفعتاً اقبال نے محسوس کیا تھا کہ وہ بڑی جاذبِ نظر ہے اور اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ اس کے بعد جب کبھی دور سے وہ اس کی آواز سنتا تو وہ محسوس کرتا جیسے اس کے اتار چڑھاؤ میں ایک خصوصی رنگ ہو اور جب کبھی وہ سامنے سے گزرتی ہوئی مسکرا کر آنکھیں جھکا لیتی تو اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا۔

وسیمہ سے منگنی ہونے کے بعد وہ بے حد خوش تھا اور اس خوشی کی شدت میں وہ اس قدر کھو گیا تھا کہ اس نے کبھی یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ وسیمہ کی ناک ستواں ہے یا نہیں، یا اس کے ہونٹ پتلے ہیں یا موٹے۔ اسے یہ تفصیلات دیکھنے کا موقع بھی تو نہیں ملتا تھا۔ جب کبھی وسیمہ سامنے آتی تو اس کی آنکھوں سے متبسم شعاعیں نکلتیں اور پھر نکھرے ہوئے گندمی گال ابھر آتے اور اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا۔ بے معنی تفصیلات پر سوچنے کی اسے فرصت بھی ملتی۔

شادی کے دو سال بعد آہستہ آہستہ اس کے خدوخال آنکھوں کی چمک کی اوٹ سے باہر نکل آئے۔ ناک بیٹھتی گئی، ہونٹ موٹے ہوتے گئے اور رنگ سانولا پڑتا گیا اور اس کی حرکات میں ایک بھدا پن سا نمایاں ہوتا گیا۔ بیٹھے بٹھائے دفعتاً وہ محسوس کرتا جیسے بڑے غور سے اس کی طرف دیکھ رہا ہو، موازنہ کر رہا ہو، لیکن اسکے باوجود وہ خوش تھا۔ چونکہ طبعاً وہ گھریلو طبیعت کا تھا اور وسیمہ اسکے گھر کا محور تھی۔

پھر آہستہ آہستہ اقبال پر انکشاف ہونے لگا کہ وہ وسیمہ کی ہر بات پر ٹھیک ہے یا جی ہاں کہہ دیتا ہے۔ وسیمہ سے ٹھیک ہے یا جی ہاں کہتے ہوئے اسے اس بات کا احساس نہیں ہوتا تھا کہ وسیمہ اس سے ہر بات منوا لیتی ہے۔ ٹھیک ہے یا جی ہاں کہنے کے بعد کسی وقت جب وہ کسی اور کام میں مصروف ہوتا تو دفعتاً اسے خیال آتا کہ اس وقت اس نے وسیمہ کی بات کے جواب میں ٹھیک ہے کیوں کہہ دیا تھا، حالانکہ بات تو کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ اس وقت اُسے وسیمہ پر غصہ آنے لگتا اور وہ سمجھتا کہ وسیمہ بڑی خود پسند ہے کہ ہر جائز و ناجائز بات پر اس سے جی ہاں کہلوا لیتی ہے اور وہ دل ہی دل میں اپنی شرافت کو کوستا جس کی وجہ سے وہ جی ہاں کہہ دیا کرتا تھا۔

سب سے پہلے اُسے اس بات کا احساس اس روز ہوا تھا جب وہ دفتر میں جمیل کے ساتھ بیٹھا سگرٹ پی رہا تھا۔ جمیل کے سامنے بڑھیا سگرٹ کا پیکٹ پڑا تھا اور وہ اس ڈبہ میں سے لگاتار سگرٹ پیئے جا رہا تھا۔ اُس وقت اُسے یاد آیا کہ اُس کی اپنی جیب میں تین بگلے کے سستے سگرٹ کاغذ میں لپیٹے ہوئے پڑے تھے اور اس سے ایک روز پہلے اس نے وسیمہ سے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ سے وہ سستے سگرٹ پیا کرے گا اور وہ بھی دن میں پانچ سے زیادہ نہیں۔ دفعتاً اس نے محسوس کیا جیسے بگلے اس کی جیب سے سر نکال کر اس کا منہ چڑا رہے ہوں اور جمیل سے کہہ رہے ہوں ذرا اس کی طرف دیکھیئے یہ میاں جیب میں سگرٹوں کی جگہ کیا لئے پھرتے ہیں۔ اس وقت اُسے اپنی حماقت اور وسیمہ کی زیادتی پر غصہ آنے لگا تھا۔ آخر جمیل کی تنخواہ بھی تو اس کے برابر تھی۔ اس کے باوجود وہ کس مزے سے سگرٹ پی رہا تھا۔ اگرچہ وسیمہ سے وعدہ کرتے وقت اُس نے محسوس کیا تھا کہ وسیمہ کی بات بڑی معقول ہے، لیکن اب وہ سمجھنے لگا تھا جیسے دھوکا دے کر اس سے وعدہ لے لیا گیا ہو۔ اور پھر معقولیت کا کیا مطلب؟ کیا وہ گاڑھے پسینے کی کمائی سے گھر والوں کا پیٹ نہیں پالتا تھا؟ کیا وہ گھر کا مالک نہیں تھا؟ گھر کا مالک، اللہ اکبر۔

انہی دنوں اس کی گوہر سے ملاقات ہوئی۔ گوہر کا اونچا لمبا قد، بھرا ہوا جسم، رعب دار چہرہ اور اس پر گھنی مونچھیں دیکھ کر اس نے محسوس کیا جیسے وہ مردانہ وقار کا ایک مجسمہ ہو۔ گوہر کو دیکھ کر اُسے اپنی کمتری کا شدید احساس ہونے لگا۔ اور اپنے ٹھیک ہے اور جی ہاں ذہن میں اور بھی چبھنے لگے۔ اس روز اس نے بڑھیا سگرٹ کا ایک پورا پیکٹ خرید لیا اور بیٹھک سے ملحقہ برآمدے میں بیٹھ کر ایک شانِ بے نیازی سے سگرٹ کا دھواں اڑانا شروع کر دیا۔ اس لحاظ سے تو

گوہر کی مونچھ تمبل کی سگرٹ کی ڈبیہ سے بھی زیادہ زود اثر ثابت ہوئی۔

کچھ دنوں کے بعد وسیمہ نے اسے کہا "اے ہے! آپ گوہر صاحب سے ملنے نہیں گئے کیا؟ آخر وہ ہمارے پڑوسی ہیں۔ سنا ہے کل رات انکے گھر چور آئے تھے۔"

جب وہ گوہر کے گھر پہنچا تو گوہر بیٹھک میں ایک شان استغنا سے بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ "سنا ہے آپ کے ہاں چور آئے تھے کل رات" اقبال نے بات شروع کی۔ گوہر نے ایک زبردست قہقہہ لگایا۔ "ہاں وہ چور، وہ چور! ہا ہا ہا ہا۔" میز پر پڑا ہوا بلوری گلاس جل ترنگ کی طرح بجنے لگا۔ "ہاں وہ آئے تھے، ہی ہی ہی ہی۔" وہ یوں ہنس رہا تھا جیسے چوروں کا نہیں بلکہ ہسپتال کے مریضوں کا ذکر کر رہا ہو۔ "بیوی نے مجھے جگایا" وہ بولا، "کہنے لگی اوپر کوئی ہے، روشن دان میں۔ میں نے کہا اُسے تو چپ رہ۔ اور پھر چپ چاپ سنتا رہا۔ اوپر سٹور کے پاس روشندانوں میں دو آدمی تھے۔ پھر میں نے ڈانٹ کر کہا "ابے او چور کے بچے، بے وقوف! ہمیں سو تو لینے دے۔ اتنی جلدی ہی آدھمکے ہو۔ ہائیں۔ ہا ہا ہا۔" اُس نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ "میری بات سُن کر وہ بھاگ گئے۔ کوٹھے پر دھڑ دھڑ کی آوازیں آئیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔ مجھ سے وہ کہنے لگی اوپر جا کر دیکھ تو آؤ۔" وہ پھر ہنسنے لگا، اور مونچھ کو تاؤ دیتے ہوئے بولا "بیوقوف ہوتی ہیں یہ عورتیں۔ بس ان کی صورت دیکھتے رہو یا ان سے پیار کر لو، بس ان کی بات نہ سننا کبھی۔ سمجھے؟" اس نے مجھے ڈانٹا۔ میں نے اس سے کہا "بھلی مانس کس خیال میں ہے تو؟ ہفتہ بھر تو وہ اب ادھر کا رخ نہیں کریں گے۔ پھر کبھی آئیں گے تو دیکھا جائے گا۔ اب تو یوں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے ہیں کہ بیچاروں کو کوئی چیز اٹھانے کی فرصت نہیں ملی۔"

"تو کیا بیگم صاحبہ کی تسلی ہوئی؟" میں نے پوچھا۔

"ہونہہ! بیگم صاحبہ" وہ چلایا، "تم لوگوں نے گھر والیوں کے مزاج بگاڑ دئے ہیں۔ شہزادیاں بنا دیا ہے انہیں۔ ان کے آگے پیچھے جی ہاں جی ہاں کرتے پھرتے ہو۔ کوئی بات ہے یہ۔ اجی مرد کا کام ہے کہ مرد بن کر رہے۔" اس نے مونچھ مروڑتے ہوئے کہا "اور عورت کو عورت بنا کر رکھے۔ ہاں!"

اس کی باتیں سُن کر اقبال گھبرا گیا۔ اس نے مجرموں کی طرح ادھر اُدھر دیکھا۔ اس کی نگاہ سامنے صوفے پر جا پڑی جس پر گیہوں کی بوری رکھی ہوئی تھی۔ "یہ صوفے پر گیہوں کی بوری" اس نے بات بدلنے کیلئے کہا۔

"کیوں جی؟" گوہر بولا "تمہاری بیٹھک سے تو اچھی ہے۔ میاں اناج ہے۔ اناج۔" وہ پھر قہقہہ مار کر ہنسا۔

اقبال اس بات پر بالکل ہی گھبرا گیا اور کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولا "اچھا پھر ملاقات ہوگی۔"

گوہر کے گھر سے نکل کر وہ سیدھا اپنے پنواڑی کے پاس پہنچا اور ایک بڑھیا ڈبہ ادھار لے کر گھر آگیا۔ جب وہ گھر میں داخل ہوا تو اس کا سینہ ابھرا ہوا تھا، گردن اکڑی ہوئی تھی اور وہ سگرٹ کے ڈبے کو یوں اچھال رہا تھا جیسے کوئی ٹرافی یا تمغہ ہو۔

شام کے وقت وسیمہ بیٹھک میں آئی تو اس نے حیرانی سے سگرٹ کے ڈبے کی طرف دیکھا "یہ آپ کا ڈبہ ہے؟" وسیمہ نے اس سے پوچھا۔

"ہوں" وہ بولا۔ اور پھر کتاب پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔

"آپ نے خریدا ہے؟" وسیمہ نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہوں" اس نے سر اٹھائے بغیر جواب دیا، لیکن اس بے نیازی کے باوجود اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا اور کتاب کے صفحات سے سر نکال کر گوہر مونچھ مروڑتے ہوئے طنزاً مسکرا رہا تھا۔

"ادھار لیا ہے کیا؟" وہ بولی۔

"اور کیا خیرات میں بٹتے ہیں؟" اقبال کی چھاتی اور بھی تن گئی اور اس نے بڑے طمطراق سے گوہر کی طرف دیکھا۔

"آپ کہہ رہے ہیں کیا؟"

"جی ہاں خاکسار ہی عرض کر رہا ہے۔"

"جی ہاں جی ہاں جی ہاں" منڈیر پر بیٹھا ہوا کوا چلانے لگا۔

— "تم نے انہیں شہزادیاں بنا دیا ہے، انکے آگے پیچھے جی ہاں جی ہاں کرتے پھرتے ہو۔" گوہر قہقہہ مار کر ہنسا۔

اقبال نے غصے میں کتاب بند کر دی "کوئی اور سوال پوچھنا باقی ہے؟" اس نے وسیمہ سے غصے میں پوچھا۔

"لیکن آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا" وہ بولی ——

"ہاں کیا تھا" اس نے جواب دیا۔ "پھر؟"

"پھر؟" اب وہ حیرانی سے بولی۔

"اب ہماری مرضی، ہماری باتوں میں دخل دینے والی تم

کون ہو؟ جاؤ اپنا کام کرو۔"

وسیمہ کے لئے یہ ایک انوکھی بات تھی۔ اس نے محسوس کیا جیسے اُسے تخت سے اتار کر فرش پر گرا دیا گیا ہو۔ چونکہ وہ ایسے رویّے کی عادی نہ تھی، وہ سٹ پٹا گئی اور بھاگ کر اندر چارپائی پر آگری اور ٹپ ٹپ آنسو گرانے لگی۔ اُسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ یکدم جی ہاں جی ہاں کے مرغزار سے نکل کر تم کون ہو کے لق و دق صحرا میں کیسے آگری تھی۔ نہ جانے کب تک وہ ویسے ہی پڑی رہی۔ کچھ دیر کے بعد جب ان کا بیٹا ننھا اختر پڑوس میں باجی سے کھیلنے کے بعد فارغ ہو کر آیا اور اپنی امّی کو یوں پڑے دیکھا تو پہلے تو وہ حیران ہوا، پھر جب اس کے شور مچانے پر بھی امّی نے اسے وہ توجہ نہ دی جس کا وہ خود کو حقدار سمجھتا تھا تو وہ چیخ چیخ کر رونے لگا۔ اس پر باہر سے اقبال چلّایا "یہ کیا شور ہے؟ وسیمہ، وسیمہ! بند کرو اس شور کو۔"

پیارے اختر کا رونا شور سمجھا جائے اور اس کو گود میں اٹھا کر بہلانے پھسلانے کی بجائے کہا جائے "بند کرو اس شور کو"۔ بھوکی شیرنی کی طرح وہ اٹھ بیٹھی اور اس نے لپک کر اختر کو گود میں اٹھا لیا۔ پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کرتی یا کہتی اقبال کمرے میں آ داخل ہوا۔ "تم بولتی کیوں نہیں؟ وہ چلّایا "میں کب سے بلا رہا ہوں" اسے غصّے میں دیکھ کر وسیمہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ "نہیں بولتی؟" اقبال چلّایا۔ "نہیں بولتی تو نہ سہی" وہ غرّایا "مجھے کیا ضرورت کہ میں زبان گھسنا پھروں"۔ یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

اُسے یوں کمرے سے نکلتے دیکھ کر وسیمہ نے پوری کوشش کی کہ لپک کر اُسے پکڑ لے اور اس سے پوچھے کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ آخر کیوں؟ لیکن وسیمہ کی ٹانگیں منوں بوجھل ہو چکی تھیں، ان میں سے حرکت کی اہلیت خارج ہو چکی تھی، جیسے وہ زمین میں گڑی ہوں۔ اگلے روز ہی شام کے وقت برآمدے میں بیٹھے ہوئے اقبال نے محسوس کیا، جیسے وہ گھر ویران پڑا ہو۔ اندر سے کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی، محض ویرانی دکھائی دے رہی تھی، سکوت اور ویرانی! وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا ساوہ جیسے تو جانا ہے اور وہ چپ چاپ باہر نکل گیا۔ چار پانچ روز وہ پرانے دوستوں سے ملتا رہا۔ وہ دوست جن کے گھر جانے کی اُسے عرصۂ دراز سے فرصت نہ ملی تھی۔ دراصل وہ اپنے گھر سے دور رہنے کی شدید کوشش میں مصروف تھا، لیکن دقت یہ تھی کہ آخر اسے اپنے گھر لوٹنا ہی پڑتا تھا اور پھر وہی سکوت، وہی ویرانی جیسے صور پھونک گیا ہو۔

اس کا جی چاہتا تھا کہ کچھ ہو، کوئی شور شرابا ہو، کوئی بات چیت کرے۔ اور کچھ نہیں تو کوئی مزید جھگڑا ہی ہو جائے، تقرار ہو، بدزبانی ہو کچھ تو ہو۔ لیکن وہی خاموشی وہی ویرانی ——— غصّے سے اس کا دماغ پھر جاتا اور وہ سگرٹ کے ڈبے کی طرف جھپٹتا، لیکن سگرٹ تو گھٹیا سگرٹ کا سا مزا دینے لگے تھے اور ان کا دھواں اس کی آنکھوں اور حلق میں چبھنے لگا تھا۔ وہ سگرٹ پھینک کر گوہر کی طرف جا بیٹھتا۔ "ہاہاہا" گوہر اُسے دیکھ کر ہنستا "میاں سارا دن گھر میں گھسے رہتے ہو۔ کیا بات ہے؟ کیا ہو گیا آج کل کے نوجوانوں کو؟ بیوی کے گلے کا ہار بنے رہتے ہیں۔ ہی ہی ہی۔ اور پھر بعد میں جب وہ پنجے نکالتی ہے تو روتے ہیں۔ بھئی جیبی تو ہمارے والد کہا کرتے تھے۔ گربہ کشتن روزِ اوّل۔ ہی ہی ہی" وہ ہنسنے لگا۔ "جانتے ہو ہمارے چچا نے اپنی نئی نویلی دلہن سے اوّلین بات کیا کی تھی؟ کہنے لگے ذرا اٹھ کر ہماری بندوق تو بھر دینا۔ بندوق بھر دینا، نئی نویلی دلہن سے! ہا ہا ہا" وہ ہنسنے لگا۔

گوہر سے مل کر اُسے ایک گونہ تسلی ہو جاتی، لیکن گھر پہنچ کر وہی اُداسی اُس پر مسلّط ہو جاتی۔ اور اس کا جی چاہتا کہ دیوانہ وار قہقہہ لگا کر ہنس پڑے یا چیخ مار کر رو دے، کچھ کرے تاکہ گھر کی وہ خاموشی اور ویرانی دور ہو جائے۔ رات کے وقت ڈولی میں سے کھانا نکالتے ہوئے اقبال غرّایا "یہ کھانا برف میں لگا کر رکھا گیا ہے کیا۔ گائے بھینس سمجھ رکھا ہے مجھے؟" کھانا اٹھا کر وہ بیٹھک میں آ گیا۔

چوری چوری اس کا جی چاہتا تھا کہ گھر میں کوئی حرکت ہو۔ وسیمہ کوئی بات کرے یا ننھا اختر ہی رو دے۔

کچھ دیر کے بعد اسے اندرونی دروازے میں وسیمہ کی شکل دکھائی دی۔ وہ چپ چاپ کھڑی اُس کی طرف ڈری ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر اقبال کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ بھاگ کر اسے تھام لے اور اسے پوچھے "جی آپ اس قدر اداس کیوں ہیں؟ ——— "ہی ہی ہی ہی" سگرٹ کے خالی ٹین سے گوہر کا سر نکل آیا۔ "بندوق بھر دینا نئی نویلی دلہن سے! ہی ہی ہی"

وسیمہ چپ چاپ اس کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ "لائیے میں گرم کر دوں" وہ بولی۔ اس کا ہاتھ اس کے قریب آ پہنچا۔ اس کی انگلیاں کتنی سفید اور حنا رنگیں۔ اقبال کا دل چاہا کہ انہیں تھام لے اور پھر مسکرا کر اس کی طرف دیکھے اور پوچھے جی آپ مجھ سے ناراض کیوں ہیں۔ عین اس وقت پلیٹ سے گوہر کا چہرا ابھرا۔ گوہر نے مونچھ مروڑتے ہوئے بامعنی نگاہوں سے اقبال کی طرف دیکھا۔ اقبال نے محسوس کیا جیسے وہ جرم کرتے ہوئے پکڑا گیا ہو۔ اس نے پلیٹ اٹھا کر زور سے دیوار پر دے ماری۔ "لے جاؤ اپنا کھانا!" وہ غرایا "لے جاؤ۔ مجھے تمہارے کھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں ہوٹل میں کھا سکتا ہوں"۔

اپنا غصہ نکال لینے کے بعد جب اس نے وسیمہ کی طرف دیکھا تو اسے ایک دھچکا سا لگا۔ وہ مایوسی کی تصویر بنی کھڑی تھی۔ یہ میں نے کیا کر دیا، یہ میں نے کیا کر دیا؟ اس کے دل میں سے آوازیں آنے لگیں۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ ایک بار پھر وسیمہ اس کی طرف ہاتھ بڑھائے، صرف ایک بار ـــــ لیکن وہ چپ چاپ کھڑی تھی۔ اقبال نے کوشش کی کہ وہ اس سے کچھ کہے، لیکن اس کے حلق میں آواز نہیں تھی۔ اور ہوتی بھی تو آخر کوئی بہانہ بھی تو ہوتا۔ شدید غصے کا اظہار کرنے کے فوراً بعد محبت کی کوئی بات کرنا کس قدر مشکل ہوتا ہے۔ وہ ویسے منتظر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا اور آخر چڑھ کر اٹھ بیٹھا، شاید اس لئے کہ وسیمہ کی طرف مزید دیکھنے کی اس میں ہمت نہ تھی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔

اس واقعہ کو بیس دن ہو چکے تھے، بیس دن! اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے سالہا سال گزر چکے ہوں، سالہا سال! اس کے گھر کی خاموشی روز بروز بھیانک صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔

وہ جاں بخش آوازیں جو گھر سے ابھرتی رہتی ہیں اور محلے بھر میں گونجتی رہتی ہیں، اس کے گھر سے عنقا ہو گئی تھیں، جیسے وہاں کوئی بستا ہی نہ ہو۔ پہلے ننھا اختر کھیلتے ہوئے کتنا شور مچایا کرتا تھا لیکن اب ـــ اب نہ جانے وہ کہاں چھپا رہتا تھا اور پھر برتنوں کے کھنکنے کی آواز تک بھی نہیں آیا کرتی تھی۔ صرف صبح اور شام کے وقت جب وہ بوڑھی مائی آتی جو ان کا سودا لایا کرتی تھی تو گویا وہ اپنے آپ سے باآوازِ بلند باتیں کرتی اور اقبال کو محسوس ہوتا کہ ابھی تک اس گھر میں لوگ جاگ رہتے تھے۔ لیکن اس کے جانے کے بعد پھر وہی خاموشی، وہی ویرانی۔ اس ویرانی سے وہ اکتا چکا تھا۔ بارہا اس کے جی میں آئی تھی کہ اندر چلا جائے اور جا کر وسیمہ سے پوچھے "کیا تم نے واقعی یہ سمجھ لیا ہے کہ میں تم سے ناراض ہوں بے وقوف؟" اور یہ کہتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لے، لیکن گوہر کا وہ بارعب چہرا اور گھنی مونچھیں اور اس کا وہ مردانہ وار قہقہہ ـــــ وہ رک جاتا اور دعائیں مانگتا یا اللہ کوئی راستہ، کوئی سہارا۔ اب میں کبھی ایسی بات نہیں کروں گا، لیکن اپنی عزت بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ پھر وہ بھاگا گوہر کی طرف جا بیٹھا۔ ہا ہا ہا ہا۔ گوہر اسے دیکھ کر قہقہہ لگاتا۔ اور اس کا غم گوہر کے اس قہقہے میں ڈوب جاتا، اور گوہر کی مونچھ سے تازہ تقویت حاصل کر کے وہ لوٹ آتا۔

"اب میں کیا کروں۔ کیا کروں میں"۔ اقبال سوچ رہا تھا، وہ شام کتنی اداس تھی۔ اور پھر سر پر کالی پہاڑ سی رات کھڑی اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ کس کی طرف جاؤں۔ سینما؟ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر روپے گنے۔ ہاں۔ لیکن کوئی ساتھی بھی ہو۔ اس نے ایک آہ بھری۔ دروازہ پر آواز سن کر وہ چونکا۔ اندر آ جاؤ وہ بولا۔

بھئی واہ گوہر اس کے قریب آ کر چلایا۔ اس وقت گھر بیٹھے ہو۔ شام کے وقت؟ کیا ہو گیا ہے تمہیں میاں؟ آؤ باہر گھومیں، یہ کیا گھر بیٹھنے کا وقت ہے؟ تم آجکل کے نوجوانوں نے تو حد کر دی۔ اس کا قہقہہ گونجا۔ آؤ سیر کو چلیں، سیر کرتے کرتے وہ دونوں سنیما ہال میں جا پہنچے۔

گوہر صاحب شو دیکھیں گے آپ؟ اقبال نے جیب کے روپے ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔ اسے خاموش دیکھ کر اقبال بولا۔ ہاں دیر ہو جائیگی۔ گھر اطلاع بھی نہیں دی آپ نے۔ بارہ ایک بج جائیگا۔

گھر؟ گوہر قہقہہ مار کر ہنسا۔ ہم نے گھر والی کو شہزادی بنا کر نہیں رکھا ہوا۔ کیا مجال کہ کوئی پوچھے کہ کہاں سے آئے ہو۔ وہ پھر ہنسنے لگا۔

شو دیکھ کر وہ دونوں واپس آئے تو اقبال ابھی لیٹا ہی تھا کہ گوہر آ گیا۔ ہی ہی ہی ہی وہ ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ یادداشت تو بالکل ہی جواب دے گئی ہے۔ وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ یاد ہی نہ رہا کہ آج رات میری بیوی کو اپنی خالہ کے ہاں جانا تھا۔ وہ لوگ تالا لگا کر چلے گئے ہیں۔ ہی ہی ہی ہی۔ وہ ہنسنے لگا۔ نہ جانے چابی

(باقی صفحہ ۲۶ پر)

سودا کے سفر (۱)

کلب علی خاں فائق

ادب اردو میں اگرچہ تحقیقاتی کام عرصے سے جاری ہے اور اس وجہ سے تاریخ ادب اردو کی حیثیت کافی بلند ہو چکی ہے پھر بھی اس سلسلہ میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ ہم ابھی تک مشاہیر شعرائے اردو کی سوانح حیات قابلِ اطمینان طریقے پر مرتب نہیں کر سکے ہیں۔ مثلاً سودا کے بارے میں کافی کام ہو چکا ہے پھر بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ کام مکمل ہو گیا ہے۔ سودا کے سفرِ فرخ آباد، فیض آباد اور لکھنؤ کو ہمیں اسی روشنی میں دیکھنا ہے کہ تاریخ سے واقعات کس حد تک مطابقت پاتے ہیں۔ چند قدیم اور جدید تذکروں کی بنا پر ہم حسب ذیل مختلف نظریات بیک وقت موجود پاتے ہیں۔

(۱) سودا کی ولادت بقول بعض حضرات ۱۱۲۵ھ میں ہوئی اور ستر برس کی عمر میں ۱۱۹۵ھ میں وفات۔ لیکن حالات کے ضمن میں خود ہی اپنے قول کی تردید بھی کر دیتے ہیں۔

(۲) شاہ عالم سودا کے شاگرد ہوئے اور خطاب ملک الشعرائی پایا، حالانکہ سودا کے قیام دہلی کے زمانہ میں شاہ عالم صرف ولی عہد تھے۔

الف ۔ خطاب ملک الشعرائی نواب آصف الدولہ نے دیا۔

ب ۔ ملک الشعرائی کا خطاب عوام نے دیا؟

(۳) دہلی کی تباہی کے بعد فرخ آباد کا سفر ساٹھ سال کی عمر میں کیا۔

(۴) سن شباب میں دہلی سے لکھنؤ کا سفر کیا۔

(۵) مدت قیام فرخ آباد: بعض کے نزدیک سترہ سال اور بعض کے نزدیک "چند سال" تھی۔

(۶) تاریخ ورود فرخ آباد: ۱۱۶۷ھ، ۱۱۷۰ھ یا ۱۱۸۵ھ

(۷) تاریخ ورود فیض آباد: ۱۱۷۵ھ، ۱۱۸۳ھ، ۱۱۸۴ھ یا ۱۱۸۵ھ

(۸) تاریخ ورود لکھنؤ: ۱۱۸۵ھ، ۱۱۸۸ھ وغیرہ

سب سے پہلے ہمیں سودا کی ولادت کے مسئلہ پر مختصر بحث کرنا ہے، کیونکہ اسی وجہ سے غلطیاں سرزد ہوتی رہی ہیں۔ معاصرین نے سودا کی عمر کا اندازہ جو کیا ہے اس سے سال ولادت ۱۱۱۸ھ تا ۱۱۲۰ھ متعین ہوتا ہے۔ حسن[۱] کا بیان ۱۱۸۶ھ کے متصل یہ ہے کہ سودا کی عمر ستر کے قریب پہنچ گئی ہوگی۔ اگر ۶۸ سال بھی عمر مان لی جائے تو سالِ ولادت ۱۱۱۸ھ ہی ہے۔ میر نے ۱۱۶۵ھ میں نکات[۲] الشعرا میں سودا کو جوان لکھا ہے۔ ۱۱۱۸ھ سالِ ولادت مانتے ہوئے بھی بروقتِ تالیفِ مذکورہ اُس کی عمر ۴۷ - ۴۸ کے قریب پہنچتی ہے اور اتنی عمر تک تذکرہ نویسوں کی نظر میں جوان شمار ہوتے رہے ہیں۔

(۲) شاہ عالم (عالی گوہر) کا شعر و سخن میں سودا کا شاگرد ہونا تذکرہ نویسوں کی ایجاد ہے، عالمگیر ثانی بڑھاپے میں تخت نشین ہوا، شاہ شطرنج سے زیادہ اُس کی حیثیت نہ تھی، لیکن اس بڑھاپے میں بھی اسے دختر[۳] محمد شاہ سے نکاح کی سوجھی، اگرچہ ناکام رہا۔ شاہ عالم کا مختصر قیام دہلی بزمانگی سودا بحالت ولی عہدی یہ ظاہر کرتا ہے کہ اُسے اطمینان قلب نصیب نہ تھا۔ ۱۱۶۹ھ/۱۷۵۵ و ۱۷۵۶ء میں عماد الملک اسے اپنے ساتھ پنجاب لے گیا۔ اس کے

۱: سن شریف بہ ہفتاد رسیدہ باشند نوکری مپشہ الحال در سرکار نواب شجاع الدولہ بوسیلۂ فن شاعری مختار است۔ تذکرہ میر حسن ص ۸۲ و ص ۸۳ (طبع جدید)

۲: جوانیست خوش خلق، خوش خو، گرم جوش، یار باش شگفتہ روئے (نکات الشعرا ص ۳۲ (مطبع نظامی بدایوں)

۳: جاتے ہیں مشیرا احمد شاہ نے محمد شاہ کی بیٹی سے، جو نہایت خوبصورت تھی، اپنی شادی کی۔ پہلے اس شاہزادی سے شادی کرنے کا ارادہ خود عالمگیر ثانی کا تھا۔ (ص ۲۹۰ و ص ۲۹۱ تاریخ ہند ذکاء اللہ صاحب) عالی گہر عالمگیر ثانی کا بڑا بیٹا تھا اور وہی ولی عہد تھا۔ ابھی شاہ ابدالی کے بعد عماد الملک دلی میں نہیں آیا تھا کہ اس کے خوف کے مارے ولی عہد کو تعلقات ... مرد ہانسی، دادری وغیرہ جاگیر میں دے کر بادشاہ نے رخصت کر دیا اور فوج دے کر اُسے کہہ دیا تھا کہ جتنے ملک پر تم سے قبضہ ہو سکے قبضہ کرو۔ جب عماد الملک دلی میں آیا تو اس نے بادشاہ کو مجبور کیا کہ ولیعہد کو بلائے۔ سیف الدین محمد خاں کشمیری کو دس ہزار سواروں کے ساتھ بھیجا کہ جس طرح ہو سکے شہزادے کو لے آئے، ناچار شہزادہ دلی میں آیا۔ ... ارادہ کیا کہ اس کو سلیم گڑھ کے قلعہ میں قید کرے۔ شہزادہ ..... لڑ بھڑ کر نکل گیا ..... آٹھ مہینے نجیب الدولہ کے پاس رہا۔ یہاں سے بمشورہ نجیب الدولہ بنگالہ روانہ ہو گیا۔ (ص ۲۹۸ و ص ۲۹۹۔ تاریخ ہندوستان ذکاء اللہ) مئی ۱۷۷۱ء میں الہ آباد سے بادشاہ دلی کو چلا ... فرخ گڑھ میں پہنچا۔ یہاں احمد خاں بنگش ان ہی دنوں میں مرا تھا۔ اس کے بیٹے مظفر الدولہ نے پانچ لاکھ روپیہ نذرانہ کا پیش کیا۔ بادشاہ نے یہاں برسات کے سبب سے مقام کیا۔ اس وقت تیس ہزار مرہٹوں کی سپاہ دلی میں تھی۔ مادھوجی سیندھیا پہلے فرخ آباد میں بادشاہ کے پاس آیا اور اپنے عہد و پیمان بادشاہ سے ٹھہر گیا اور ۲۵ دسمبر ۱۷۷۱ء کو بادشاہ قلعہ میں ... (ص ۳۲۲ و ص ۳۲۳ تاریخ ہندوستان جلد نہم ... ذکاء اللہ ...)

بعد واپسی میں عماد الملک کی کج روی کے باعث احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کر دیا، چنانچہ جب عماد الملک شاہ ابدالی کے لئے پیش کش وصول کرنے شجاع الدولہ کے مقابلہ میں پہنچا تھا تو نجیب الدولہ عالی گوہر (شاہ عالم) کو (رمضان ۱۱۷۰ھ/مئی جون ۱۷۵۷ء) میں عالمگیر ثانی نے اُسے فوج دے کر پنجاب کی طرف روانہ کر دیا کہ جتنے ملک پر ہو سکے قبضہ کر لو۔ شاہ ابدالی کے جانے کے بعد عماد الملک نے عالمگیر ثانی کو مجبور کر کے شاہ عالم (عالی گوہر) کو بلا لیا۔ شاہ عالم قلعہ نہیں گیا بلکہ علی مردان خاں کی حویلی میں دب جمن ٹھہرا۔ عماد الملک نے گرفتار کرنا چاہا، وہ لڑ بھڑ کر فرخ نگر ہوتا ہوا سہارنپور پہنچا۔ یہاں نجیب الدولہ کے پاس آٹھ مہینے مہمان رہا۔ پھر نجیب الدولہ کے مشورے سے اودھ ہوتا ہوا بنگال پہنچا، اور یہاں مختلف معرکہ آرائیاں کیں۔ اسی درمیان میں عالمگیر ثانی کو (۸ ربیع الثانی ۱۱۷۳ھ، نومبر ۱۷۵۹ء) (عماد الملک) غازی الدین خاں نے قتل کرا دیا۔ ۴ جمادی الاوّل ۱۱۷۳ھ کو بمقام کھتولی وہ تخت نشین ہوا۔ نجیب الدولہ اس کی نیابت میں دار الخلافہ کا نگراں اور محافظ رہا، رجب ۱۱۸۴ھ میں جب نجیب الدولہ نے انتقال کیا تب شاہ عالم نے الہ آباد سے نقل و حرکت کی اور ۱۸ رمضان ۱۱۸۵ھ ۲۵ دسمبر ۱۷۷۱ء کو وہ تقریباً پندرہ سال بعد دہلی آیا۔ ایسی صورت میں رشتۂ شاگردی بعید ہے، ہاں کسی خاص موقع پر ۶۰، ۱۱۶۹ھ کے مابین اصلاح کلام ہوئی ہو جس کی شہادت نہیں ملی ہے۔ امکان ضرور ہے لیکن سوال خطاب ملک الشعرائی کا رہ جاتا ہے۔ تو کہنا پڑتا ہے کہ اس کی ملاقات تخت نشین ہونے کے بعد سودا سے نہیں ہوتی۔ اس نے قصیدہ مدحیہ ضرور کہا ہے۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں کیا جاتا کہ یہ قصیدہ شاہ عالم کو پڑھ کر سودا نے سنایا ہو، شاہ عالم نواب احمد خاں کے مرنے سے دو ایک دن پہلے پہنچے اور نواب احمد خاں کے مر جانے پر اس کے بیٹے مظفر جنگ نے نذر نہیں کی، پھر نبی گنج میں جا کر بائیس دن قیام کیا۔ ان حالات میں خطاب ملک الشعرائی کا عطا ہونا کس طرح ہو سکتا ہے؟

الف:۔ ملک الشعرائی کا خطاب نواب آصف الدولہ نے دیا ہو[1]؟ اس کا کسی معاصر تذکرہ نویس نے ذکر نہیں کیا بلکہ تذکرہ نگاروں کو دھوکا قیام لکھنؤ سے ہو گیا۔ سودا نے عمر کے آخری ایام آصف الدولہ کے سایۂ عاطفت میں گذارے۔ آصف الدولہ کو خود ذوقِ سخن تھا لیکن وہ اپنے استاد سوز کو پہلے ملک الشعرائی کا خطاب کرتا۔ وہ نہ حیات سودا میں، نہ ہی بعد میں اگر یہ سلسلہ جاری ہوتا تو ضرور سوز تک پہنچتا۔ پھر میر کی فضیلت شاعری سے کس کو انکار کی طاقت تھی لیکن محروم بھی رہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نوابانِ اودھ کی جانب سے شعرا کو خطاب دینے کا طریقہ نہ تھا، ہاں جب انگریزوں نے نوابانِ اودھ کو خطاب شاہی سے نوازا تب بہت سی باتیں دہلی کی تقلید میں جاری ہو گئیں۔

ب:۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میر[2] اور قائم[3] نے ملک الشعرائی کے خطاب سے کیوں یاد کیا ہے۔ میر نے تو اعتراف شاعری کے طور پر کہا ہے کہ ریختہ کی ملک الشعرائی کے لئے وہ موزوں ہے، یہ وہ زمانہ تھا کہ سودا آسمانِ شہرت پر پرواز کر رہے تھے، اور میر نے وہ درجۂ اختصاص حاصل نہیں کیا تھا جو سودا کو حاصل تھا، لیکن جب میر کی شاعری کے جوہر نمایاں ہوئے تب اس نے اپنا مد مقابل کسی کو نہیں سمجھا یقین سے مد نکات الشعرا میں ذکرِ یقین[4] کے ہر فقرے سے ٹپک رہا ہے۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ اس نے عوام کے رجحانات کی ترجمانی کی تھی، لیکن قائم کے جملوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ملک الشعرائی کا اعزاز حکومت کی جانب سے بخشا گیا تھا اور اس کا اشارہ عالمگیر ثانی کی جانب ہو سکتا ہے جو خود سخن گو اور سخن پرست تھا۔ شاہزادہ حاتم[5] نے اس مصرعہ کو مقطع میں لیا ہے ؎

شاہ عالمگیر کا مصرع ہے حاتم رمز سنج — دل میں آتا ہے کہ شاہی میں گدائی کیجئے

مصحفی نے اس خطاب ملک الشعرائی پر لطیف طنز کیا ہے کہ بعض لوگ اس کی ملک الشعرائی[6] کے حامی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حقیقتاً

---

[1] از نواب آصف الدولہ بہ خطاب ملک الشعرا مخاطب گشتہ۔ بزم سخن ص ۶۲ (مطبع مفید عام آگرہ)
نواب آصف الدولہ کے مقربوں میں منسلک ہو کر ملک الشعرا کا خطاب پایا تھا۔ سخن شعرا ص ۲۲۲ (مطبع نولکشور ۱۸۷۴ء)

[2] چنانچہ ملک الشعرائی ریختہ او را شاید۔ نکات الشعرا ص ۴۳ (نظامی پریس بدایوں)

[3] بالفعل ملک الشعرائی رہین پایۂ سخنوران است اعزاز و امتیاز دارد۔ مخزن نکات ص ۳۵ (طبع اول ۱۹۲۹ء)

[4] مردماں می گفتند کہ مرزا مظہر او را شعر گفتہ می دہد ...... ذائقہ شعر فہمی مطلق ندارد۔ نکات الشعرا ص ۸۵

[5] تضمین مصرع بادشاہ عالمگیر ثانی حسب الحکم ۱۱۶۹ھ، دیوان زادہ شاہ حاتم مخطوطہ رضا لائبریری رام پور ص ۸۵

[6] بعضے از ادیں فن بہ ملک الشعرائی پرستش می کنند۔ تذکرہ ہندی ص ۱۲۵ (طبع اول ۱۹۳۳ء)

یہ خطاب عوام وخواص کا عطا کردہ تھا اور حکومت سے اس خطاب کا تعلق نہ تھا۔ پھر سودا جیسا شاعر، جو عوام وخواص کا پسندیدہ اور محبوب شاعر تھا، عالمگیر ثانی اور شاہ عالم جیسے نام نہاد بادشاہوں کے خطاب سے قطعاً خوش نہ ہوتا۔ رہے شجاع الدولہ اور آصف الدولہ نوابانِ اودھ، جو وزیران ہی بادشاہوں کے تھے تو وہ ان کے خطاب سے کس طرح مسرور ہو سکتا تھا۔ البتہ عماد الملک[لہ] وزیر اعظم بعہد عالمگیر ثانی، جو علم وفضل میں بہت بلند حیثیت رکھتا تھا اور جو اردو فارسی کا شاعر بھی تھا۔ اس کی جانب سے ایسا خطاب دیا جانا ممکن ہے جس کی تائید برابر عوام وخواص کرتے رہے ہیں۔

[لہ] اس سلسلہ میں میر قمر الدین منت تلمیذ قائم کی مثال بھی ملتی ہے جس نے گورنر جنرل ہسٹنگز کی مدح میں قصیدہ لکھ کر ناظمِ بنگالہ سے خطاب ملک الشعرائی حاصل کیا تھا۔

۳۔ دہلی کی تباہی کے بعد فرخ آباد کا سفر بعمر ساٹھ سال

جن تذکرہ نویسوں نے دہلی کی تباہی کے بعد ساٹھ سال کی عمر میں سفر فرخ آباد کا ذکر کیا ہے وہ سبھی سنہ ولادت ۱۱۲۵ ہجری تسلیم کرتے ہوئے ساٹھ سال کی عمر میں سفر کا تذکرہ کرتے ہیں اس طرح سفر کا سنہ ۱۱۸۵ھ متعین ہو جاتا ہے۔ ۲۰ ربیع الاول ۱۱۸۵ھ کو نواب احمد خاں بنگش کا انتقال ہوا۔ اب ساٹھ سال کی عمر میں سفر کرنا، نواب احمد خاں میں اور پھر کچھ مدت اور چند سال قیام کرنا کتنا دلچسپ لطیفہ بن جاتا ہے۔ اتنی بڑی غلطی کا پیہم ارتکاب فرائض تذکرہ نویسی کو عمداً نظر انداز کرنا نہیں تو کیا ہے؟

سب سے پہلے ۱۱۹۲ھ میں مردان علی خاں مبتلا صاحب "گلشنِ سخن"[ہ] نے ساٹھ برس کی عمر میں ترکِ دہلی کا تذکرہ کیا۔ اس کے بعد مرزا علی لطف، لطف صاحب "گلشنِ ہند"[ہ] نے اس کی تکرار کی۔ "تاریخ ادب اردو" میں رام بابو سکسینہ نے تفصیلی حالات پر بحث کرنے کے بعد بھی یہی روایت نقل کر دی۔ صاحب "گل رعنا" مولانا عبد الحئی صاحب نے ذرا اس میں لچک پیدا کر دی اور یہ کہتے ہوئے گزر گئے کہ چند سال فرخ آباد رہ کر فیض آباد میں گئے اور اس وقت ان کی عمر ساٹھ سال کی ہو چکی تھی۔ ان آرا کو آج بھی نقل کیا جاتا ہے اور اس کی جانب توجہ نہ کی گئی کہ تذکروں کی اس غلطی کا دہرانا خود مضحکہ خیز امر ہے۔

۴۔ سنِ شباب میں سفرِ لکھنؤ

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ جن کی نقد نگاری کی شہرت قدیم عہد میں بطور مسلمات تھی، اور مولوی عبد الغفور خاں نساخ جنہوں نے اساتذۂ لکھنؤ کے اغلاط نکال کر نام آوری حاصل کی تھی، ان کا بیان ہے کہ سودا جوانی میں دہلی سے ترکِ وطن کر کے لکھنؤ پہنچے۔ اگر ان کی نظر میں سابقہ تذکرہ نگاروں کا سنِ ولادت ۱۱۲۵ھ تھا تو اس روشنی میں لکھنؤ پہنچنے کے وقت سودا کی عمر کم از کم ۶۴ سال ہونی چاہئے۔ ۶۴ سال کی عمر کے کسی شخص کو خواہ کتنا ہی تندرست کیوں نہ ہو جوان نہیں کہہ سکتے۔ نواب آصف الدولہ ۲۴ یا ۲۵ ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ کو تخت نشین ہوئے اور ذی حجہ ۱۱۸۹ھ میں فیض آباد کو چھوڑ دیا۔ ۱۱۹۰ھ میں لکھنؤ میں جشن منایا۔ اب اگر اس کے علاوہ کوئی اور سنہ ولادت اُن کی نظر میں تھا تو اس کا تعین انہوں نے نہیں کیا ہے، یہ غلطی بھی دلچسپ لطائف

لہ ہفت قلم: ہفت زبان است، اشعارش بسیار، سبب اشتہار دیافتہ کہ شعر ہائے خود را سر بہ مہر گذاشتہ۔ تذکرہ میر حسن ص۱۰۹ (طبع جدید ۱۹۴۰ء)
وزیر الممالک غازی الدین صاحب ..... در اینکہ فقیر ایں غزل طرح کردہ بود کہ مطلعش ایں است ے
کوئی دن آگے بھی زاہد عجب زمانہ تھا ٭ ہر اک محلہ کی مسجد شراب خانہ تھا۔ در ہماں ردیف و قوافی بہ تغیر بحر چند شعر بلاہتہ موزوں کردہ کہ مثل آں بسیار بہ تلاش می تواں گفت وہم بریں نسق گاہ گاہ وحی بسبب تقریب یک دو مصرع ریختہ و فارسی فکری کند، چنانچہ ایں مطلع از آں غزل است ے
کھولنا زلف اک بہانہ تھا ٭ مدعا ہم سے منہ چھپانا تھا (مخزن نکات ص۱۹ و ۵۵ طبع اول)
لہ کلکتہ آکر عماد الملک گورنر مسٹر ہسٹن بلاوت جنگ بہادر کی اعانت کے باعث چیتن گاہ نظارت سے صوبہ بنگ کے خطاب ملک الشعراء کا لیا۔ گلشن ہند ص۱۴۱ طبع اول۔

لہ از عہد شباب تا شصت سال در دلی بہ رفاہ و عزت و حرمت در روشناسی وزیر و امیر بسر برد۔ بعد ویرانی و خرابی آں دیار۔ نقل و حرکت نمودہ، چندے در فرخ آباد نزد نواب احمد خاں گذرانید و بعد وفات او بہ لکھنؤ آمد۔ گلشن سخن۔ مردان علی خاں مبتلا حاشیہ ص۶۱ دستور الفصاحت
لہ روز تولد سے ساٹھ برس کی عمر تک دلی میں ساتھ عزت و وقار کے رہے ...... آخر بلدۂ لکھنؤ میں طور سکونت کا کیا۔ گلشن ہند لطف (طبع اوّل)

جگہ پا چکی ہے۔

مدتِ قیامِ فرخ آباد | بقول بعض یہ کچھ مدت اور بعضوں کے نزدیک چند سال یا سترہ سال ہے۔[1] اس سلسلہ میں سرِ دست اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ یہ تمام نظریات غلط ہیں۔

تاریخ ورودِ فرخ آباد | سوداؔ پر شیخ چاند کی مفصل تصنیف اردو ادب میں پہلی ادبی خدمت تھی۔ مرحوم نے اس موضوع پر مولانا عبدالحق صاحب بابائے اردو کی نگرانی میں کام کیا، لیکن عجلت کے باعث یہ تصنیف بھی سوداؔ کے حالاتِ زندگی کو صحیح طور پر واضح نہ کر سکی۔ اس سفر فرخ آباد کے سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں[2]:

"سوداؔ اول سے دلی کو ترک کرنا چاہتا تھا لیکن کچھ دنوں جو وہاں ان دل شکن حوادث و انقلابات کے باوجود ٹھہر گیا محض دوست احباب کے اصرار سے۔ چنانچہ ایک رباعی میں خود اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ خواجہ میر دردؔ کا نام خصوصیت سے لیا ہے؎

نادیدنی از بسکہ ہے روئے عالم
ہے کثرت التفات جو کیجے باہم
کرتا ہوں کہیں جانے کا جس وقت میں عزم
دردؔ آن کے سوداؔ مرے پکڑے ہے قدم

وہ حوادث و انقلابات سے گھبرا گیا تھا۔ اور موقع کا طالب تھا، اور بہانہ ڈھونڈھ رہا تھا، کہ کسی طرح دلی سے باہر کوئی پُرامن جگہ مل جائے۔"

اتفاق سے اُسے ایک موقع ہاتھ آیا، جب شاہ درانی کے مشورے سے ۱۱۶۷ھ میں عماد الملک دو شہزادوں کو لے کر دوآبے سے زرِ خطیر وصول کرنے گئے، اور فرخ آباد میں احمد خاں بنگش کے پاس ٹھہرے تو سوداؔ بھی ہمراہ تھا، بنگش نے نواب عماد الملک اور شہزادوں کا بڑا احترام کیا۔ شجاع الدولہ کے خلاف اُن کی مدد کی، اس کا دیوان مہربان خان تھا جو کمال نیک نامی سے اوقات گذارتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کی کمال عزت تھی یہاں تک کہ احمد خاں بنگش اسے اپنا بیٹا کہتا تھا۔ "مجلس رنگین و بزم ارم تزئین رکھتا ہے اور صادر و وارد کے ساتھ اپنی استعداد اور حوصلے کے مطابق سلوک کرتا ہے۔ اہلِ سخن کے ساتھ سرگرمِ سخن رہتا ہے اور ہر صاحبِ فن کے ساتھ اس طرح گھل مل جاتا ہے جس طرح جسم میں جان، زیورِ اخلاق سے آراستہ ہے، موسیقی اور ہندی شاعری سے (کہ عبارت ہے کبت سے) بہرہ رکھتا ہے۔ امارت ظاہر اس مرتبہ پہنچ گئی ہے کہ امرائے حال و سابق کا انیس و جلیس ہو گیا ہے[3]۔ اس کے سوا موزوں طبع تھا۔ شاعری میں سوزؔ سے اصلاح لیتا تھا، دوسرے کئی ریختہ گو شاعر پہلے ہی سے اس کی سرکار میں موجود تھے، اور اب جبکہ نواب غازی الدین کے ساتھ سوداؔ پہنچا تو اس نے نواب موصوف سے درخواست کی کہ مرزا کو اُس کی رفاقت میں رکھنے کی اجازت دی[4]۔ سوداؔ کی شاعری کا یہ شور پہلے ہی سُن چکا تھا، اور اب جبکہ ملاقات ہو گئی، تو زیادہ متاثر ہوا اور بڑے اشتیاق و اصرار سے مرزا کو اپنی رفاقت میں رکھنے کی

---

[1] فرخ آباد میں سوداؔ کا قیام ۱۱۸۵ھ سے کچھ پہلے تک کا رہا ۔ ۔ ۔ ۔ فرخ آباد میں کم و بیش سترہ سال بڑی عزت و آبرو میں گزار دیئے ..... نواب احمد خاں بنگش وفات ۱۱۸۵ھ سے دو سال قبل نابینا ہو گیا تھا اس لئے کاروبارِ سلطنت میں ابتری ہو گئی تھی۔ فرخ آباد، خیرآباد رہنے کے سلسلہ میں سوداؔ نے ایک مثنوی کہی ہے جس میں معذرت چاہی ہے اور سوزؔ کی سفارش کی ہے؎

شعر کے بحر میں ترا اُستاد	کشتیٔ ذہن کو ہے باد مراد
اس کو ہر طرح تو غنیمت جان	پھر ملے گا نہ سوزؔ سا انسان
کر چکا ہوں دُعا پہ ختم کلام	پہنچے رخصت کا میری تجھ کو سلام
حشر تک زیرِ سایۂ نواب	رہیو جوں آفتاب عالم تاب

[2] "سوداؔ" مصنفہ شیخ چاند مرحوم ص۵۴ تا ۵۵ طبع اول

[3] تذکرہ میر حسن

[4] مخزنِ نکات

اجازت حاصل کرلی:

شیخ چاند کی اس رائے کے بعد ڈاکٹر ابواللیث صاحب نے فیض آباد پہنچنے کی تاریخ سے اختلاف کیا، اور کہا:۔

اب عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ سودا ۱۱۷۳ھ ۱۷۵۹ء اور ۱۱۸۵ھ ۱۷۷۱ء کے مابین فیض آباد پہنچے۔

دستور الفصاحت[1] کے دیباچے میں بسلسلۂ حواشی مخزن نکات مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی نے مہربان خاں رند کے ذکر سے حسبِ ذیل نتائج اخذ کئے ہیں:۔

"دریں اثنا ...... مرزا محمد رفیع سودا سلمہ اللہ تعالیٰ برفاقت وزیر الممالک نواب غازی الدین خاں بہادر در بلدۂ فرخ آباد رسیدند خان موصوف از نواب وزیر درخواستہ، مرزائے موصوف را بہ رفاقت خود گرفتہ"

ظاہر ہے کہ یہ ٹکڑا سودا کے فرخ آباد جانے کے بعد لکھا گیا ہے چونکہ اس میں قائم نے سودا کا فرخ آباد جانا، نواب غازی الدین خاں کے ہمراہ بتایا ہے .... بظاہر یہ ناممکن ہے کہ سودا عماد الملک کے ساتھ ۱۱۷۰ھ میں فرخ آباد گئے ہوں کیونکہ انہیں تذکرہ نویسوں نے شاہ عالم بادشاہ کا اُستاد بتایا ہے جو ۱۱۷۳ھ (۱۷۵۹-۶۰ء) میں تخت نشین ہوئے تھے۔ اگر یہ ۱۱۷۰ھ (۱۷۵۶-۵۷ء) میں فرخ آباد چلے گئے ہوتے تو یہ استادی شاگردی کا رشتہ بعید الوقوع تھا۔ نشترِ عشق سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی دہلی سے روانگی احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں دار السلطنت کی دوسری

---

[1] مخزن نکات (طبع اول ۱۹۲۹ء) از قائم ص ۴۵

حضرت میرزا رفیع سودا مدظلہ العالی، در سخنِ نزہت، گاہ معنی بردے کشیدہ است کہ دو مصرع کلکِ معجز طرازش شہرت را آمادہ، اشعار رنگین و قصائد متین دارد، چنانچہ قصیدہ کوہ و دو چکیدہ زمہ بہار و بحرے گراں، و تضحیک روزگار وغیرہ از تصانیف اوست، والد شریفش مرزا شفیع نام مغل زادہ محل تجارت مشہور بود، وقت معہودہ بہ قدیم برین ستانا فتنہ زرے کہ از ترکہ وے بدست مرزا افتاد در مدت قلیل بمقتضائے شاعر مزاجی بر سبیل باد دو بنہا بہ باد داد و بہ مصاحب چنگی برآمد قبول ملوک نام دارد تقرب سلاطین عالی متعدد را او میسر گشت، بالفعل ملک الشعرائی کہ ہمین پایۂ سخنوران آن اعزاز و امتیاز دار و الی سایۂ اش از سرِ بے سرو پایاں کم مباد بجنوں و فرہاد۔ طبقات الشعرا از مولوی قدرت اللہ شوقؔ (از گل رعنا ص ۱۳۲)

در فنون انواع سخن یکی طاق، و بہ جمیع کمالات سخنوری شہرۂ آفاق، در مضمار قصیدہ گوئی گوئے سبقت از عرفی و خاقانی ربودہ و در غزل گوئی سلیم و کلیم را پس پشت می گذارد۔ بسیار خوش گو پرگو است، چند مدت بہ سبب ویرانگی دلی در بلدۂ فرخ آباد ہم راہ مہربان خاں ماندہ، الحال بہ طرف لکھنؤ رفتہ، نوکر شجاع الدولہ بہادر شدہ است۔ تذکرہ مسرت افزا (مطبوعہ و مشمولہ رسالہ معاصر جلد ۲ نمبر ۶ اپریل ۱۹۵۲ء پٹنہ)

مرزا رفیع از دار الوطن اصلی وے دار السلطنت دہلیست ... قصیدہ در مدح مہربان خاں رند گفتہ بود ... زبان آوران کامل او را بہ استادی باور می کنند۔ و شعرائے ہند بہ آئین خود ملک الشعرا قرار دادہ اند ... دریں دلا در لکھنؤ بہ رفاقت وزیر الممالک نواب آصف الدولہ بہادر ہر بر بنگ بسری برند، در سنہ یک ہزار و یک صد و نود و یک ہجری کہ مؤلف جہت سیر تحصیل علم دار و لکھنؤ شدہ بود آتش دیدنش پیوستہ در کانون سینہ شعل می شد آخر چوں تلافی جسمانی بہم رسیدہ زیادہ از شنیدہ دیدم

تذکرہ شعرائے اردو (طبع جدید ۱۹۴۰ء) از میر حسن ص ۸۲ و ۸۳

سودا، میرزا محمد رفیع ..... اُستاد شعرائے عصر و سر دفتر بلغائے دہر ...... در قصیدہ و ہجو ید بیضا دارد ...... مردے است از مغتنمات روزگار، خوش خو، و نیک خو، یار باش، مولدش شاہ جہان آباد، سن شریف بہ ہفتاد رسیدہ باشد نوکری پیشہ، الحال در سرکار نواب شجاع الدولہ بہادر بہ وسیلۂ فن شاعری سرفراز است، و در علم موسیقی نیز ماہر است و تصانیف بسیار در نفیسہ ہم دارد تا حال قبل او در ہندوستان جنت نشان کسے نہ برخاستہ، اکثر فقیر در خدمت، آں بزرگوار می رسد بسیار کرم می فرماید ..... عقد ثریا (طبع اول ۱۹۳۴ء) مصحفی ص ۳۳

سودا کہ مرزا محمد رفیع نام دارد ..... آخر آخر عنان شعر فارسی ہم سرے درد راہ بہ ہند آوردند ... غزلہائے فارسی خود کہ در لکھنؤ گفتہ داخل دیوان ریختہ بقید ردیف ساختہ

[2] "لکھنؤ کا دبستان شاعری" ص ۸۹

لوٹ کے بعد واقع ہوئی تھی۔ احمد شاہ کا دہلی میں دوسری بار داخلہ شعبان سنہ ۱۱۷۰ھ (مارچ ۱۷۶۱ء) میں ہوا تھا مقالات الشعرا کے مصنف نے بھی اس سال کے حملے کو دوسرا حملہ قرار دیا ہے، وہ لکھتا ہے :-

"دریں ہنگام کہ سنہ یک ہزار و یکصد و ہفتاد و سہ ہجری و شعلہ انگیزی آتش ہنگامہ مسطور کرت ثانی است" (ورق ۲۴ ب)

لہٰذا سودا کو ۱۱۷۰ھ کے بعد دہلی کو خیرباد کہنا چاہیے۔ سودا کے دیوان میں نواب مہربان خاں کی شادی پر قطعہ تہنیت پایا جاتا ہے جس کے مادۂ تاریخ "ہوا ہے وصل ماہ و مشتری کا" سے ۱۱۷۶ھ برآمد ہوتے ہیں۔ چونکہ عماد الملک ۱۱۷۰ھ میں بھرت پور سے فرخ آباد گئے ہیں اسلئے اغلب یہ ہے کہ سودا احمد شاہ کے دوسرے حملے کے بعد عماد الملک کے پاس بھرت پور پہنچے اور وہاں سے اُن کے ساتھ ہی ۱۱۷۰ھ میں فرخ آباد چلے گئے۔ اس صورت میں قائم نے ان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ ۱۱۷۶ھ کے بعد کا اضافہ ہوگا۔

سودا[1] کے قیام فرخ آباد کے بحث کے سلسلہ میں مہربان[2] خاں رند کا بیان ناگزیر ہے، بقول ولیم آروِن صاحب، وہ کسی راجہ کا بیٹا تھا۔ بانی فرخ آباد نواب محمد خاں بنگش نے اس رسم کی بنیاد ڈالی تھی کہ شرفا کے لڑکے لے کر وہ اولاد کی طرح پرورش کرتا اور نظم حکومت میں ان ہی پر مدار کار رکھتا، فرخ آباد کا استحکام ان چیلوں کا اہم کارنامہ نظر آتا ہے۔ مہربان خاں نواب احمد خاں کا پسر خواندہ تھا، اس کی حیثیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اکثر مشاہیر شعرا اس کے متوسل تھے، نواب احمد خاں بنگش کے انتقال پر فرخ آبادی امرا حصول اقتدار کی کوشش میں باہم لڑنے لگے مظفر جنگ کم سن تھا، اس لئے فرخ آباد کی ریاست نواب آصف الدولہ کے عہد میں باج گذار اودھ ہو کر رہ گئی،

---

[1] تذکرہ ہندی (طبع اول سنہ ۱۹۳۳ء) از مصحفی ص ۱۲۵/۱۲۶

سودا مرزا محمد رفیع .... یعنے او را دریں فن بہ ملک الشعرائی پرستش می کنند .... فقیر در عہد نواب شجاع الدولہ بہادر برائے دیدن ایں بزرگ بہ خدمتش رسیدہ بود بہ پرورش سگاں ابریشم پشم شوق تمام داشت .... غرضکہ شخص جامع الکمالات بود، ہر جا کہ می رفت عزت و حرمت تمام می یافت۔ نواب مرحوم مغفور بنیز بودن او را در سرکار خود بسیار غنیمت می دانستند و فاتش در لکھنؤ ....

مجموعۂ نغز حصہ اول (طبع اول سنہ ۱۹۳۳ء) حکیم قدرت اللہ قاسم ص ۳۰۴ و ۳۰۵

سودا مرزا محمد رفیع مرحوم است، وے کابلی الاصل و شاہ جہاں آبادی المولد بود .... از بدو شعور تا دم واپسیں ہمیشہ بہ مصاحبت وزرائے عالی مقدار و امرائے نامدار ایام بہ کام بسر بردہ، در آخرہا بہ بلدۂ لکھنؤ رسیدہ اقامت ورزیدہ۔

گلشن بے خار (طبع نول کشور لکھنؤ سنہ ۱۸۷۴ء) از شیفتہ ص ۹۹

سودا .... مرزا محمد رفیع نام، اصلش از کابل و مولد و منشایش جہاں آباد است، بہ سن شباب بہ لکھنؤ رفت و ہم دراں جا وفات یافتہ ...... از مقربان بارگاہ وزیر الممالک نواب آصف الدولہ بہادر بود ....

بزم سخن (طبع مفید عام آگرہ) از سید علی حسن خاں ص ۱۳

سودا ..... از نواب آصف الدولہ بہ خطاب .... ملک الشعرا مخاطب گشتہ ...

سخن شعرا (مطبع نولکشور لکھنؤ سنہ ۱۲۹۱ھ) از مولوی عبد الغفور نساخ ص ۲۲۲

سودا تخلص مرزا محمد رفیع ولد مرزا محمد شفیع شاگرد شاہ حاتم، وطن ان کا کابل مولد دلی ایام شباب میں لکھنؤ میں آ کر نواب آصف الدولہ بہادر کے مقربوں میں منسلک ہو کر ملک الشعرا کا خطاب پایا۔

[2] تذکرہ ہندی (طبع اول سنہ ۱۹۳۳ء) از مصحفی ص ۱۰۱

نواب مہربان خاں، رند تخلص کہ در زمانۂ اقبال خود بہ علم موسیقی و شعر و مرثیہ شوق تمام داشت، ہزارہا دریں کار برباد دادہ، و در نیکنامی بر دست خود کشادہ، اگرچہ شخص جاہل بود اما سلیقۂ صحبت شعرا آورا ہم بہ عرصۂ قلیل بہ مرتبہ والائے شاعری رسانیدہ، فقیر حسب اتفاق روزے برائے دیدن آں بزرگ ہمراہ مرزا قتیل در "رستم نگر" بر مسکنش گذرا فگندہ بود، مخرج زباں ہم درست نہ داشت، آخرہا بہ بادر گذشت :

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

اس بنا پر مہربان خاں رند فرخ آباد سے روانہ ہوکر دہلی پہنچا اور افراسیاب خاں متبنائے نواب نجف خاں کی بدولت کچھ مدت آرام سے زندگی بسر کی، لیکن فرخ آباد کی زندگی کا تصور کہاں ہو سکتا ہے۔ مصحفی کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ رستم نگر میں، جو لکھنؤ کا مشہور محلہ تھا۔ اتفاقاً مرزا قتیل کے ساتھ جاکر اس نے ملاقات کی، یہ ملاقات ۱۱۹۶ھ کے بعد ہو سکتی ہے چونکہ نواب افراسیاب خاں اسی سال قتل ہوا ہے۔ بقول مصحفی وہیں قریباً ۱۲۰۵ھ میں انتقال کیا۔

متذکرہ بالا بیانات کی صحت کے سلسلے میں ہمیں تاریخ ہی کی طرف رجوع کرنا پڑے گا اور جو تاریخ کا فیصلہ ہوگا اُسے تسلیم کرنا پڑے گا، تذکرہ کی حد تک سودا کے حالات ذیل میں ہمیں قائم کے بیان پر انحصار کرنا لابدی ہو جاتا ہے وہ اس کا شاگرد بھی ہے اور دوست بھی، اور مد مقابل بھی جیسے کہ ہجو فوقی میں سودا نے اسے حریف مخالف بنایا تھا۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۷۱)

گلشن بے خار (مطبع نول کشور ۱۸۷۴ء) از شیفتہ صفحہ ۹

رند تخلص مہربان خاں از متوسلان نواب احمد خاں بنگش است کہ ناظم فرخ آباد بودہ، و نیز بہ عہد نواب ذوالفقار الدولہ مرحوم بہ رفاقت افراسیاب خاں گذارد۔ مرزا رفیع سودا از مدحت طرازان اوست سخنے در فنون موسیقی نیز شناسائی داشت،

مجموعۂ نغز (طبع اول ۱۹۳۳ء) از حکیم قدرت اللہ قاسم حصہ اول صفحہ ۲۶۶

رند تخلص مہربان خاں مرحوم است از پیلہائے (کذا) عمدۂ نواب غفران مآب احمد خاں بنگش بود عفی اللہ عنہ، در ایام دولت نواب معز الیہ در فرخ آباد بہ شوکت تام و شکوہ تمام تعیش می نمود، اکثرے از شعرائے نامی، مانند سر آمد شعرائے فصاحت آرا، مرزا محمد رفیع سودا و شاعر فصاحت افروز محمد میر سوز وغیرہما ملازم سرکار وے بودند، بعد رحلت آں مرحوم لبت بہ مہارتے کہ با شرف الدولہ افراسیاب خاں پیلہ، نواب معلی القاب امیر الامرا ذوالفقار الدولہ بہادر غفر اللہ لہٗ بود، در حضرت دہلی ہم بہ خوبی ایام بسری نمود۔

تذکرۂ شعرائے اردو (طبع جدید ۱۹۴۰ء) از میر حسن صفحہ ۶۵

رند مہرباں خاں ...... در سرکار نواب غالب جنگ بہادر بہ فرخ آباد، بہ خدمت دیوانی ممتاز بودند، بہ کمال نیک نامی اوقات بسر کردہ ...... امارت ظاہری ہم بہ مرتبہ رسید، کہ با امرایان، ناہن رحال، انیس و جلیس گردیدہ۔ از شاگردان میر سوز و میرزا رفیع مشہور است۔ ..... در علم تیر اندازی اصلاح از میر سوز گرفتہ ..... امور دیگر نیز مثل شمشیر شناسی، ادب شناسی و قدر دانی انسان از صحبت میر مسطور حاصل نمودہ غرض کہ از مغتنمات روزگار است سلامت باشد۔

تذکرۂ مسرت افزا (مطبوعہ رسالہ معاصر حصہ ۷ اپریل ۱۹۵۲ء پٹنہ) از ابو الحسن امیر الدین احمد عرف امر اللہ الہ آبادی صفحہ ۹۲

نواب مہرباں خاں رند از ملازمان نواب احمد خاں غالب جنگ در فرخ آباد، در سرکار نواب بہ خدمت دیوانی سرفرازی داشت، رند مشرب، و عاشق مذہب، آشنائے اہل سخن و یار، صاحب ہر فن، آغوزلان اطراف بہ استماع قدردانی وے، از راہ دور و دراز رو براہ آوردہ، در خدمت وے، موافق قسمت خود، بہرہ اندوز می شدند، مجلس رنگین، وے از شاعران اطراف خلد آئین می بود، در خانۂ خلد آمیش، از زمزمہ سازی زبان آوران گلشن رنگین و فرخ آباد مجمع شعرا و ظرفا از قدر شناسی وے بود واساتذہ ایں فن مثل ریختہ سودا و محمد میر سوز راگری بازار از قدر دانی او، بعد رحلت نواب کہ تخلل عظیم در دولتش افتاد بر یا دانش لعزتہ کلی رو دادہ، ہر یکے بہ طرفے فرار نمودند، حالا شنیدہ می شود کہ وے در سرکار نواب نجف خاں بہادر سرفرازی دارد الغرض وے باوجود ناشناسائی ہم از فیض صحبت سخنوراں لب سخن می کشود، وآں آبدار نظم می نمود۔ دیوان مرتب از وے مشہور است۔

گلزار ابراہیم و ترجمہ گلشن ہند مصنف علی ابراہیم خاں مترجم مرزا علی لطف لطف

رند مہربان خاں:۔ کہتے ہیں موسیقی میں ماہر، تصنیف کبت و دوہرہ، ٹپہ پر قادر ہے فرخ آباد میں نواب احمد خاں غالب جنگ کی دیوانی میں تھا، سافر زادہ مرزا محمد رفیع سودا و میر محمد سوز تخلص کے شاگردوں سے ہے تیر اندازی اور شمشیر شناسی میں ید طولیٰ رکھتا ہے۔

مہربان خاں رند یہ نواب کا دیوان تھا اور یہ شخص کسی راجہ کا بیٹا تھا جس کے پدر نے الہ آباد کے محاصرہ میں اس کو نواب کی نذر کیا تھا، یہ شاعر تھا اور صاحب دیوان ہوا ہے نہایت فصیح وقت تھا، مفتی ولی اللہ نے کچھ اس کی نظم سے منتخب کیا ہے۔ اس وقت کے مشہور شعرا، مرزا رفیع السودا و میر سوز عرصہ تک اسکے ملازم رہے ہیں۔ تاریخ فرخ آباد۔ مصنفہ ولیم اروِن صفحہ ۱۳۰

افسانہ

دردِ افزوں سہی

اُمِّ عمارہ

ناجیہ میری جان! اب چپ بھی ہو جاؤ پیاری!! کیا تم نے ان نرگسی کٹوروں کی ساری شراب ضائع کر دینے کی قسم کھائی ہے جنہیں تمہارے محبوب نے ساغرِ شراب اور بادۂ گلابی سے تشبیہ دی ہے اور جن کے بارے میں وہ اب تک کہتا رہا ہے کہ ناجیہ کی آنکھیں تو ایسی ہیں جیسے کنول کی پنکھڑیوں پر بھونرے بیٹھے ہوں۔

اور ذرا سوچو تو جب اسے پتہ چلے گا کہ ناجیہ نے اپنی آنکھیں رو رو کر خراب کر لی ہیں اور اب وہ آنکھیں اپنی تمام دلکشی کھو چکی ہیں تو یقین جانو اُسے بہت رنج ہوگا۔ کیونکہ اسے تمہارے ساتھ تمہاری آنکھیں بھی بہت پیاری ہیں۔

ہاں! ہاں! یہ ٹھیک ہے کہ اب یہ آنکھیں ایسی نہیں ہو سکیں گی۔ لیکن پیاری میں سچ کہتی ہوں (کم از کم میرے خیال میں) تمہارے محبوب کا پیار بھونرے کا نہیں جو پھول سے اس کا طالب ہو بلکہ اس کا پیار تو بلبل کا ہے، لیکن بھئی بلبل کا پیار سچا سہی لیکن اس کی تشبیہ پرانی اور روایتی ہے، اور میں اسے کسی نئی چیز سے تشبیہ دینا چاہتی ہوں، اس لئے ڈیر! تم ذرا چپ ہو کر کوئی نئی تشبیہ سوچنے میں میری مدد کرو، اچھا تو تم کہہ رہی ہو کہ "مارے غم کے میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے اور میرے دماغ میں کسی نئی چیز کے سوچنے کی صلاحیت نہیں"۔ خیر بھئی مت سوچو لیکن تم مجھے بھی تو سوچنے کی مہلت نہیں دے رہی ہو۔ سوچو تو میری جان!! میں تمہیں کب سے کہہ رہی ہوں کہ آخر یہ صرف تمہارے ہی ساتھ تو نہیں ہوا۔ بلکہ ہمارے اس فرسودہ معاشرے میں تو ہمیشہ سے ایسا ہوتا آیا ہے۔

مت روؤ بھئی! مت روؤ!! اب میرا دماغ خراب ہو گیا ہے اگر تم اسی طرح روتی رہیں تو میرے سوچنے کی تمام تر صلاحیتیں یکدم مفقود ہو جائیں گی۔

اور پھر یہ کوئی ایسا غم بھی تو نہیں جیسے ہمارے آس پاس یہ ہزاروں غم جو بکھرے پڑے ہیں کبھی تم نے ان کے بارے میں بھی سوچنے کی کوشش کی۔ آخر ان دکھوں کی بھی تو کوئی وجہ ہوگی۔ آؤ نا پیاری ہم اپنا غم بھلا کر ان بے شمار غموں کے بارے میں سوچیں جو ہمارے اردگرد بکھرے ہیں۔ کیا کہا؟ "تمہیں ان دکھوں کے بارے میں سوچنے کی ضرورت نہیں کیونکہ تمہیں اپنا ہی غم بہت ہے؟" لیکن ڈیر تمہارا غم تو یہی ہے نا کہ تمہیں تیرے سے الگ کیا جا رہا ہے اور یہ تمہارے لئے بہت کٹھن ہے۔

مگر سوچو تو اس کے سوا تمہاری امّی بیچاری کر بھی کیا سکتی تھیں۔ تمہارے علاوہ اور کوئی دوسرا سہارا بھی تو ان کا نہیں تھا جس کا وہ آسرا کرتیں۔ وہ تو ایسا کرنے پر مجبور تھیں۔ ان کو تمہارے علاوہ ارشد، حامد اور ناشیہ کا بھی تو خیال ہے، جن کے لئے تمہارے ابو کچھ بھی نہیں کر گئے ہیں، اس لئے اگر تمہاری امّی نے تمہیں تیرے سے منسلک کرنے کی بجائے اس سے الگ کر دیا تو کیا بیجا ہے؟ تمہیں تو اپنی اس قربانی پر خوش ہونا چاہیئے جس سے تمہارے معصوم بھائی بہنوں کا بھلا ہو۔ تو تم کہہ رہی تھیں کہ "تم اتنی بہادر نہیں ہو کہ اپنی خوشی دوسروں کی ضرورت پر قربان کر کے خوش رہ سکو"۔ لیکن میری جان! اب رونے سے کیا فائدہ، جبکہ تم اچھی طرح جان رہی ہو کہ بات اپنے قابو سے نکل چکی ہے، اب تو تمہیں خوش ہی رہنا چاہیئے۔ سنو تو بھئی —— میری طرف دیکھو نا —— میں کیا کہہ رہی ہوں —— اونہہ —— تم تو بس روئے جا رہی ہو۔ میری کچھ سنتیں ہی نہیں —— دیکھو تو —— آخر اسی بلڈنگ میں تمہارے فلیٹ کے اردگرد بہت سے ایسے

لوگ بھی بستے ہیں جو تم سے کہیں زیادہ دکھی ہیں، لیکن پھر بھی وہ اپنے آپ کو خوش و خرم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تمہاری طرح رو رو کر اپنے دکھوں کا اعلان نہیں کرتے۔

اسی چائے کے ایجنٹ اور اس کی بیوی کو لے لو نا جو تمہارے فلیٹ کے برابر والے فلیٹ میں رہتے ہیں۔ کتنے عجیب ہیں وہ اس کی بیوی کے خیرہ لبوں میں ہمیشہ ایک کراہ پنہاں رہتی ہے۔ بتاؤ تو تم نے آج تک یہ سوچا کہ آخر وہ بار بار اتنی اداس کیوں رہتی ہے اور ایک اداس مسکراہٹ اس کے چہرے پر کیوں رقصاں رہتی ہے۔ جب کہ اس نے تمہیں بتایا تھا کہ اسکا شوہر کبھی اس کا محبوب بھی رہ چکا ہے، لیکن وہ آج اپنے محبوب کے ساتھ زندگی گذار کر بھی کیوں خوش نہیں ہے۔ بظاہر تو کوئی معقول وجہ نہیں نظر آتی۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے۔ اقتصادی بدحالی نے ان کی محبت کی کمر توڑ دی ہے۔ کیونکہ کل جب میں تمہارے کمرے میں تھی تو ان کی گفتگو کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس لئے کہ وہ اس کمرے میں گفتگو کر رہے تھے جو تمہارے کمرے سے ملا ہوا ہے اور ان کی آواز اتنی بلند تھی کہ انسان ان کی ساری باتیں سننے پر مجبور ہو جائے۔ اس کی بیوی ایک ساری کا تقاضا کر رہی تھی جس کے لانے کا وعدہ ایک ہفتہ قبل کر چکا تھا۔ لیکن اس کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ ہارجٹ کی ایک معمولی سی ساری لاکر اپنی بیوی کو خوش کر سکتا۔

اور اب اس کی محبوبہ یا بیوی جو کچھ اس سے بدگمان ہوتی جاتی ہے کہ اب وہ اس سے ویسی محبت نہیں کرتا ہے جیسی پہلے کیا کرتا تھا، اس کی بیوی یہ نہیں سوچتی کہ اس کا محبوب سیدھا سادا سا ایجنٹ ہے۔ جو اس کے لئے جان تو دے سکتا ہے لیکن اس کی نت نئی فرمائشیں پوری نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ ایک محبوب نہیں بھائی بھی ہے اور صرف بھائی ہی نہیں، بیٹا بھی ہے اور بیک وقت بیٹا، بھائی، اور محبوب بننے کے لئے کمپنی کی ایجنسی کافی نہیں اور اسی لئے وہ بہت ساری چیزیں جان بوجھ کر بھول جاتا ہے اور اس کی بیوی اس سے بدگمان ہوتی جا رہی ہے کہ وہ اس سے اتنا پیار نہیں کرتا جتنا کہ پہلے کرتا تھا۔ بقول تمہارے بار ہا ان دونوں کی ان بن ہو جاتی ہے اور وہ ہفتوں ایک دوسرے سے روٹھے رہتے ہیں اور اس درمیان میں اس کی خوبصورت بیوی مسلسل پریشان اور دکھی سی دکھائی دیتی ہے اس کے لبوں کی وہ اداس مسکراہٹ بھی کہیں کھو جاتی ہے، اور وہ بھی اداس اداس رہتا ہے اور پھر جب وہ آپس میں میل کر لیتے ہیں تو جیسے ان کی زندگی میں بہار آ جاتی ہے۔ وہ چہکنے لگتے ہیں لیکن چہکنا بھی ان کا گھڑی دو گھڑی کا ہوتا ہے۔

اور پھر وہی اداسی وہی خاموشی ان کے درمیان تیرتی رہتی ہے تو کیا سچ مچ وہ اپنی بیوی کو اب نہیں چاہتا ہے۔ نہیں بھئی یہ بات نہیں ہے۔ وہ اب بھی اسے چاہتا ہوگا۔ وہ ان خوابوں کو جو (شادی سے پہلے اس نے دیکھے ہوں گے) اپنی زندگی میں سمو کر ایسے خوشگوار سے خوشگوار تر بنا دینا چاہتا ہوگا۔ لیکن موجودہ بدحالی اس کی خوشگوار زندگی اور محبت کی دنیا میں ایک مسلسل عذاب بن کر شامل ہو چکی ہے جس کی بدولت وہ خوش و خرم رہنے کی کوشش کرتے ہوئے بھی خوش نہیں رہ سکتا۔ سوچو تو یہ ان دونوں کے لئے کتنے صدمہ کی بات ہے کہ وہ ایک دوسرے کے قریب رہتے ہوئے بھی خوش نہیں ہیں۔ اور اسے کتنا دکھ ہوتا ہوگا جب وہ یہ دیکھتا ہوگا کہ اس کی بیوی کے لبوں پر مسکراہٹ کی جگہ ایک نہ مٹنے والی کراہ قبضہ جمائے ہوئے ہے۔ دیکھو تو ڈیر! وہ کتنے دکھی ہیں اگرچہ بظاہر ان کا کوئی دکھ نہیں ہے لیکن حالات نے انہیں دکھی بنا دیا۔ کیوں؟ میں سچ کہہ رہی ہوں نا۔ اسی طرح ہو سکتا تھا۔ کہ تم بھی اپنے محبوب کے ساتھ خوش نہ رہ سکتیں کیونکہ تم بھی اس ایجنٹ کی بیوی سے کچھ کم عقلمند نہیں ہو، اور یہ صرف تم پر ہی موقوف نہیں، اس قسم کی سب لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ کیا ــ؟ اوہ ــ کوئی بات نہیں۔ میں جیسی بھی ہوں لیکن ہوں تم لوگوں سے مختلف۔ یہ تو ماننا ہی پڑے گا۔ بہرحال میں کہتی ہوں بھئی کہ تم سچ مچ نیر کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی تھیں کیونکہ وہ بھی ایک معمولی انسان ہے جو تمہارا محبوب ہے، اپنی امی کا پیارا بیٹا ہے اور شیما کا پیارا پیارا بھیا ہے اور صرف ایک سو پچاس روپے حاصل کرتا ہے جو اس کے اپنے اخراجات کیلئے مشکل سے کافی ہوتے ہیں۔ کیا کہا؟ "تم اس کے ساتھ ہر حال میں خوش رہ سکتی تھیں"۔ اتنی جذباتی مت بنو۔ تم جانتی ہو نا ؎

کہ زندگی کے تقاضے خیال و خواب نہیں

اور تم اپنی ضروریات تو نہیں بھلا سکتی تھیں، تمہیں ان کو پورا کرنے کی خواہش ہوتی ہی۔ اور جب بیچارا نیر کسی مجبوری کی بنا پر تمہاری فرمائشیں پوری کرنے سے قاصر رہتا تو تم اداس ہو جاتیں کہ تمہارا محبوب اب تم سے

ویسی محبت نہیں کرتا جیسی پہلے کرتا تھا۔ اور تم بدگمان ہو جاتیں اور یہ بدگمانیاں دن بدن ترقی کرتی رہتیں، یہاں تک کہ تمہارے درمیان بدگمانیوں کی ایک بڑی خلیج حائل ہو جاتی ۔ (جیسی کہ اس ایجنٹ اور اسکی بیوی کے درمیان حائل ہے) لیکن تم بھلا یہ کب ہے کو سوچتیں کہ تیرا ایسا کرنے پر مجبور ہے۔ اس کے سامنے تمہاری خواہشوں کے علاوہ چند ایسی ضرورتیں بھی ہیں جن کے تقاضے اسے تمہاری خواہشوں پر ترجیح دینے پر مجبور کرتے ہیں۔ اگر چہ اسے یہ سوچکر افسوس بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنی محبوبہ بیوی کی معمولی سی خواہش بھی نہیں پوری کر سکا۔ مگر تم تو بس یہی سوچتیں کہ تیرا اب تم سے ویسی محبت نہیں کرتا جیسی پہلے کرتا تھا۔

تم کہہ رہی ہو کہ مجھے کیا پتہ کہ تم یہ سب کچھ نہیں سوچتیں، تو پیاری یہ تو مجھے اسی وقت پتہ چل گیا تھا، جب مجھے معلوم ہوا کہ تم نے یہ سن کر کہ تمہیں عبید کے ساتھ منسلک کیا جا رہا ہے اپنی امی کے خلاف احتجاجاً رونا شروع کر دیا ۔ میں تو پہلے ہی سے جانتی ہوں کہ تم جذباتی ہو اور جذبات کی رو میں بہہ جانا تمہاری پرانی عادت ہے۔ بس تمہیں عبید کے بارے میں خبر ملی اور تم نے واویلا مچادی۔ یہ ٹھیک ہے بھئی کہ یہ چیز تمہارے لئے ناقابلِ برداشت ہے اور تمہاری امی ایک طرح سے تم پر ظلم کر رہی ہیں۔ ہاں! ہاں!! یہ بھی ٹھیک ہے کہ وہ تمہاری معصومیت سے ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ لیکن گوتیا! بہت سی مجبوریاں ایسی بھی انسان پر آ پڑتی ہیں کہ وہ بے بس ہو جاتا ہے۔ اور جائز و ناجائز کچھ بھی نہیں دیکھتا۔

مثلاً ایک بہت بھوکے انسان کے سامنے روٹی کا ٹکڑا پھینک دو اور پھر دیکھو کہ وہ آنکھ بند کر کے روٹی پر کیسے جھپٹ پڑتا ہے، بالکل اسی طرح تمہاری امی نے کیا اور انہوں نے جو بھی کیا مجبوریوں کے تحت کیا اور اسی برتے پر کیا کہ ناجیہ یقیناً بہت آسانی سے برداشت کر سکتی ہے۔ ارے نہیں بھئی! مجھے تمہاری امی نے اپنی وکالت کرنے کو نہیں بھیجا ہے۔ بلکہ میں تم سے خود کہہ رہی ہوں کہ آنسوؤں کی بارش کو روک کر ذرا ٹھنڈے دل سے کچھ سمجھنے کی کوشش تو کرو۔ کہ آخر تمہاری امی نے ایسا کیوں کیا اور وہ کونسی وجہ تھی جس نے انہیں ایسا کرنے پر مجبور کیا تم کہتی ہو کہ وہ تیر کو ناپسند کرتی ہوں گی؟ اس لئے انہوں نے ایسا کیا؟ درحقیقت ایسی بات نہیں ہے، میری بنو، ایک حد تک تمہاری امی نے ضرورتوں کے تحت تمہیں تیر سے الگ کر دیا۔ کیونکہ انہیں تمہاری خوشی کے ساتھ ساتھ تمہارے بھائی بہن کا مستقبل بھی عزیز تھا جب انہیں تمہاری خوشی منظور تھی تو تیر کو پسند اور ناپسند کرنے کا ذکر بیکار ہے۔ جیسا کہ انہوں نے بتایا وہ بارہا سوچا کرتی تھیں کہ انہیں تیر کے ساتھ بیاہ دیں گی لیکن حامد، ارشد اور ناشبہ کی تو خیز جانیں ان سے اپنے نشو و نما کے بارے میں بار بار کہہ رہی تھیں کہ "اگر تم نے ناجیہ کی خواہش پوری کر دی تو ہمارا کیا بنے گا"۔ "ابو" تو ہمارے لئے کچھ بھی نہیں کر گئے ہیں۔ اگر تم آپا کی خوشی کا خیال نہ کرو تو ان کی بدولت ہمارا مستقبل بھی سنور سکتا ہے، کیونکہ عبید بھائی کافی دولتمند ہیں"۔ اگر چہ تمہاری امی نے ان سوالوں کو پس پشت ڈالنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن حالات نے انہیں پریشان بنا رکھا تھا۔ اور وہ ان مستقل تقاضوں کو جو سوتے جاگتے ان کے دماغ میں سوئیاں سی چبھوتے رہتے تھے۔ باوجود کوشش کے بھی ان سے منہ نہ موڑ سکیں، جنہیں سوچ سوچ کر وہ کھلا کھلا جاتی تھیں۔ پھر انہوں نے ایک فیصلہ کر لیا اور تم ہو کہ اس فیصلے کو سن کر بے سوچے سمجھے روئے جا رہی ہو۔ اور میں ہوں کہ تمہارے ساتھ مستقل مغز زنی کر رہی ہوں۔ تم تو بس ایک ہی رٹ لگائے جا رہی ہو۔ امی نے مجھ پر ظلم کیا، میں انہیں کبھی معاف نہیں کر سکتی۔" میں کہتی ہوں ناجیہ تم پر تو وہی مثال صادق آتی ہے کہ ساری رام کہانی کہہ سنائی پھر سیتا کس کی جوئے "اگر تمہاری امی نے ظلم بھی کیا تو بے بس ہو کر۔ انہوں نے صرف تمہاری خوشی پر تین جانیں قربان کرنے کی بجائے اگر تمہاری خوشی ان تین زندگیوں پر قربان کر دی تو کیا غلط کیا؟

اب تم کہہ رہی ہو کہ" امی نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔ مجھے کوئی شکایت نہیں"۔ لیکن تم ابتک روئے جا رہی ہو۔ سنو تو بہن۔۔۔۔ آخر کب تک تم یونہی روتی رہو گی۔ دیکھو تو ڈیر!۔۔۔۔ تمہیں سمجھاتے سمجھاتے میرا حلق سوکھ گیا۔ اوہ تمہیں افسوس ہے کہ تیر کہے گا کہ ناجیہ نے بیوفائی کی؟ وہ تم سے بدگمان ہو جائے گا اور آزردہ ہو کر تم سے پھر کبھی نہیں ملے گا؟ مگر ڈارلنگ! عبید سے شادی کے بعد تو اس سے ملنے کا سوال ہی تمہارے لئے بیکار ہے، اور تمہاری بے وفائی کا جہاں تک تعلق ہے تو وہ کبھی بھی تمہیں بے وفا نہیں کہے گا، کیونکہ میرے خیال میں (کم از کم) تیر تمہاری طرح جذبات کی رو میں بہہ جانے والا انسان نہیں ہے اور زندگی کے ٹھوس اور اہم مسائل کو اچھی طرح

سمجھتا ہے۔ اگر وہ یہ سب کچھ سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو اب سے کتنے ہی دن پہلے جب تمہارے ابو زندہ تھے اور تم ایک ٹائپسٹ کی بجائے اپنے کالج کی ہونہار طالب علم تھیں تو تم سے شادی کر کے اپنا گھروندہ بسائے رہتا لیکن اس وقت اس کے سامنے کچھ ایسے حل طلب مسائل تھے جنہوں نے اسے اس وقت شادی کرنے کی اجازت نہیں دی اور وہ تمہاری طرف انتظار بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔ اور اب جبکہ وہ ایک ہو چکا ہے۔ ڈپٹی ٹائپسٹ ہو چکا ہے اور کسی حد تک تم سے شادی کرنے کے لئے تیار بھی ہے تو تم لوگوں کی حالت اس لائق نہیں ہے۔

وہ بھی حالات کا غلام رہ چکا ہے اور جانتا ہے کہ زندگی کے تقاضے بہت اہم ہوتے ہیں اور کسی قیمت پر بھی انہیں پس پشت نہیں ڈالا جا سکتا۔ اسی لئے وہ تم سے بدگمان نہیں ہوگا کیونکہ تم لوگوں کی حالت اس سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔

تم ٹھیک کہہ رہی ہو کہ اس واقعہ سے تمہاری زندگی مجسم درد ہو جائے گی اور اس درد کی وجہ سے اس میں ایک نہ جانے والی تلخی آ جائے گی۔ لیکن ناجیہ میری پیاری یہ تو تم اچھی طرح جانتی ہو ناکہ دوسری صورت میں بھی بہت سے غموں کا سامان ہے اور شاید اس درد کی صلاحیت کبھی مٹ جائے۔ مفلس کا علاج بھی تو کرنا ہے سے

درد افزوں بھی ناقابل درماں ہی سہی

مونچھ: ۔ ۔ ۔ بقیہ صفحہ ۱۵

کسے دے گئی ہے۔ احمق کہیں کی۔

پھر کیا ہوا آقبال چلایا۔ ابھی ہو جاتا ہے انتظام۔ آپ کا اپنا گھر ہے یہ۔ البتہ حقہ نہیں ہوگا۔ ہو رہے ہاں، لیکن سگرٹ تو ہیں۔ سگرٹ۔ دفعتاً اسے خیال آیا کہ سگرٹ ختم ہو چکے ہیں۔ ابھی لایا میں وہ بولا۔ یہ نکڑ والی دکان شاید کھلی ہو۔

سگرٹ خرید کر لوٹتے ہوئے اتفاقیہ اس کی نگاہ گوہر کے مکان کی طرف پڑی۔ اندر بتی جلتی ہوئی دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ اس نے غور سے اس کے گھر کے دروازے کی طرف دیکھا۔ باہر کی طرف کوئی تالا نہ تھا۔ اس نے دروازے کو چھوا۔ اندر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ اسکی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ قہقہہ مار کر ہنس دے یا چیخیں مار مار کر رو دے۔ دیوانہ وار وہ اپنے گھر کی طرف بھاگا۔

"صبح آ لینے دو اسے واپس" گوہر آقبال کو دیکھ کر بولا۔ اور پھر مونچھ کو تاؤ دینے لگا "لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ وہ سامنے آ کر بول نہیں سکتی۔ ہی ہی ہی ہی۔ گوہر ہنسا۔ آج کل کے نوجوانوں کی بیویوں کی طرح نہیں۔ اس نے اک انداز سے مونچھ مروڑنی شروع کر دی۔"

ہاں۔ آقبال نے محسوس کیا، جیسے مونچھ نہیں بلکہ وہ بوٹ کے فیتے مروڑ رہا ہو۔ وہ دیوانہ وار ہنسنے لگا۔ ہی ہی ہی ہی ہی۔ اور پھر پاگلوں کی طرح اندر دوڑا۔ وسیمہ اسے دیکھ کر ڈر کر اٹھ بیٹھی۔ ہا ہا ہا ہا وہ ہنستے ہنستے بیٹھ گیا اور اس نے اپنا سر وسیمہ کی گود میں رکھ دیا۔ اور اس کی ہنسی ہچکی میں بدل گئی ؛

●

اس عظیم مملکت کی خاطر جبکہ آپ فرد ہیں ان عوام کی وجہ سے ان کی خدمت آپ کے ذمہ ہے، دراصل خود اپنے لئے آپ کا یہ فرض ہے کہ کسی مشکل سے نہ گھبرائیں، بلکہ آگے بڑھیں اور پوری تندہی اور یکسوئی کے ساتھ اپنی دھن میں لگے رہیں۔ پاکستان کے سامنے ایک بڑا شاندار مستقبل ہے۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ قدرت نے ہمیں جن فیاضیوں سے نوازا ہے ان سے پورا فائدہ اٹھائیں اور ایک مضبوط و شاندار پاکستان کی تعمیر کریں۔

قائد اعظم

غزل اور غمِ دوراں

عبادت بریلوی

زندگی کے ہر دور میں شاعری اور غم کا آپس میں ایک ایسا ناگزیر ربط رہا ہے کہ شاعری کے ساتھ غم اور غم کے ساتھ شاعری کا خیال آتا ہے۔ اسی لئے مارک آنند سے نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ شاعری رنج و غم کی ماں جاتی ہے۔ ہر وہ شخص جو غم اٹھاتا اور تکلیفیں سہتا ہے، شاعر ہے۔ ہر آنسو ایک شعر ہے اور ہر دل ایک نظم "۔ یہ خیال اگرچہ بڑی حد تک انتہا پسندانہ ہے لیکن ایک ایسی حقیقت ہے جس سے شاید ہی کسی کو انکار کی جرات ہو۔ کیونکہ شاعری اور غم کا ہمیشہ چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ یہ غم شاعری میں از خود پیدا نہیں ہوتا۔ زمانے کے حالات اور ماحول کے اثرات سے پیدا ہونے والی ذہنی و جذباتی کیفیات بڑی حد تک اس غم کو وجود میں لاتی ہیں۔ اس غم کی نوعیت اضطراری نہیں ہوتی۔ اس کے کچھ محرکات ہوتے ہیں۔ اور ان محرکات کی نوعیت تمام تر سماجی اور معاشی ہوتی ہے۔ اسی لئے اس غم کو غم دوراں سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اردو شاعری اور خصوصاً اردو غزل میں اس غم کی فراوانی رہی ہے۔ ابتدا سے لے کر اس وقت تک اس غم نے اپنے آپ کو مختلف صورتوں میں نمایاں کیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ بڑی حد تک مضامین عاشقانہ اور گلگشتِ مستانہ کی داستان ہے لیکن یہ داستان بھی غمِ دوراں سے خالی نہیں رہی ہے۔ زمانے کا غم اس پر بھی اثر انداز ہوا ہے، اور اس نے بڑی حد تک اس کی صورت بدل دی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہر دور کے عشقیہ تصورات میں غمِ دوراں کی جھلک کسی نہ کسی صورت میں دکھائی ضرور دیتی ہے۔ ایسے شاعر جنہوں نے زندگی کو تمام تر ایک رنگین عینک سے دیکھا ہے، وہ بھی اس کے اثر سے دامن نہیں بچا سکے ہیں۔ لیکن غم دوراں کا یہ احساس صرف حسن و عشق کے معاملات ہی تک محدود نہیں رہا ہے۔ اس کے اثرات زندگی کے تمام پہلوؤں پر پھیلے ہیں۔ اس غم نے زندگی کی سماجی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی و تمدنی حقیقتوں کو سمجھنا بھی سکھایا ہے۔ ماورائی اور مابعد الطبیعیاتی مسائل کے شعور کو بھی عام کیا ہے۔ اور ان تمام پہلوؤں کی ترجمانی کی ایک عظیم روایت اردو غزل میں قائم ہوتی ہے۔ نہ صرف یہ، بلکہ زمانے کے اس غم نے اردو غزل کو ایک مخصوص سوز و گداز دیا ہے اور اس سوز و گداز کے ہاتھوں وہ ایک مخصوص آہنگ سے آشنا ہوئی ہے۔ اس آہنگ میں وہ جو ایک میٹھے میٹھے درد کا احساس ہوتا ہے وہ جو ایک ہلکی ہلکی کسک سی نظر آتی ہے، اس میں غم دوراں اور اس کے احساس کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔

غزل کا بنیادی موضوع عشق ہے، اور اس میں شک نہیں کہ غزل میں مختلف عشقیہ کیفیات کی ترجمانی بڑی خوبی سے کی گئی ہے۔ لیکن اس ترجمانی میں سماجی حالات کا شعور ہر جگہ کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور بعض اوقات تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ سماجی حالات کا یہ شعور جیسے معاملاتِ عشق کی راہوں میں حائل ہو رہا ہے۔ عشق و عاشقی کی دنیا میں اردو کے غزل گو شعراء کو قدم قدم پہ جو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے، اس کا ایک سبب یہ بھی ہے۔ متقدمین میں میر کے یہاں اس رجحان کے اثرات بڑے گہرے ہیں۔ انہوں نے اپنی عشق کی ناکامی کو بڑی حد تک ان ناسازگار حالات کا نتیجہ بتایا ہے، جن سے انہیں زندگی میں دوچار ہونا پڑا۔ ماحول کی زبوں حالی اور اس کے زیر اثر پیدا ہونے والی معاشی بدحالی نے مل کر ان کے یہاں غم دوراں کے احساس کو جگایا، اور وہ ان کی زندگی کا لازمی جزو بن گیا۔ اسی لئے تو ان کی ساری عشقیہ شاعری میں اس کے گہرے اثرات ملتے ہیں۔ تہہ داری اور رمز و ایما کی

خصوصیت اس غم کو ابھرنے نہیں دیتی لیکن ان تہوں کو کھولا جائے اور اس رمزیا یت کی نقاب اٹھائی جائے تو ان کے بیشتر اشعار میں غم دوراں کا شدید احساس کارفرما نظر آتا ہے۔ اور کہیں کہیں تو یہ احساس اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ ایسے شعر بھی ان کے قلم سے نکل گئے ہیں ؎

زور و زر کچھ نہ تھا تو بارے میر
کس بھروسے پہ آشنائی کی

اس شعر سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ افلاس کے سائے میں زندگی بسر کرنے کے باعث زور و زر کے نہ ہونے کا احساس ان کے یہاں موجود تھا۔ اس "زور و زر" کو وہ آشنائی کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ میر کی ناکامی کا ایک بڑا سبب اسی زور و زر کا فقدان ہے۔ یہی سبب ہے کہ اپنا پورا عہد انہیں محبت کے لئے ناسازگار معلوم ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اس طرح کا شعر ہرگز نہیں کہہ سکتے تھے ؎

اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا
چھوڑا وفا کو ان نے مروّت کو کیا ہوا

صاف ظاہر ہے کہ محبوب کا وفا کو چھوڑنا اور مروّت کو خیرباد کہہ دینا، درحقیقت اس مخصوص عہد اور اس میں پیدا ہونے والے ناسازگار معاشی معاشرتی حالات کا نتیجہ ہے جن کے شدید احساس نے میر کے یہاں غم دوراں کا روپ اختیار کر لیا تھا۔ میر کی غزل اس لحاظ سے ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ غم دوراں کا اتنا شدید احساس متقدمین شعرائے اردو میں کسی اور کے یہاں نہیں ملتا۔ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ میر کی طرح دوسروں کو زندگی کے سفر میں ان منزلوں سے اس طرح دوچار ہونے کا موقع نہیں ملا۔ پھر بھی کم و بیش ہر شاعر کے یہاں اس کے اثرات نظر آتے ہیں۔ سودا کی غزلوں میں اگرچہ میر کی طرح غم کا احساس نسبتاً کم ہے لیکن غم دوراں کے احساس نے ان سے بھی اسی طرح کے اشعار کی تخلیق کرائی ہے ؎

فکر معاش، عشق بتاں، یاد رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کیا کرے

صاف ظاہر ہے کہ اس شعر میں عشق بتاں کے ساتھ ساتھ فکر معاش اور یاد رفتگاں کا خیال، درحقیقت غم دوراں کا پیدا کردہ ہے جو اسے سودا اپنی طبیعت کے نشاطیہ رجحان کے باوجود اثر قبول کرنے کے لئے مجبور تھے۔ چنانچہ یہ اثر ان کی غزلوں میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔

میر اور سودا کے علاوہ اس دور کے بعض دوسرے شعراء کے یہاں بھی غم دوراں کی یہ ترجمانی کسی نہ کسی صورت میں ضرور ملتی ہے۔ میر درد، میرزا مظہر، تاباں، یکرنگ، فغاں، یقین میں کسی ایک کی غزلیں بھی اس سے بچ نہیں سکی ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ عشق کے سلسلے میں غم دوراں کی یہ ترجمانی ان کے یہاں بہت نمایاں نہیں ہے، اور اس کا سبب یہ ہے کہ ان شعراء کے یہاں معاشی معاشرتی شعور زیادہ گہرا نہیں تھا۔

غالب کے وقت تک آتے آتے غم دوراں کے اس احساس میں کچھ شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب کے زمانے میں معاشی معاشرتی شعور بڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں حالات زندگی کو ایک نئی منزل پر لاکر کھڑا کر دیتے ہیں۔ اس زمانے کی نیم مذہبی اور نیم سیاسی تحریکیں افراد میں معاشی معاشرتی اعتبار سے ایک اجتماعی شعور کو پیدا کرتی ہیں۔ یہ اجتماعی شعور افراد کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر نظر دوڑاتے ہیں۔ اور انہیں ساری زندگی ناسازگار حالات کا مجموعہ نظر آتی ہے۔ چنانچہ وہ صرف جذبات کے دھارے پر نہیں بہتے۔ عقل و شعور سے کام لیتے ہیں۔ اور اسی لئے ان کے یہاں عشق کے معاملات و کیفیات کو پیش کرتے ہوئے نری جذباتیت پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس کی بنیاد میں زندگی کے صحیح احساس اور حالات کے صحیح شعور پر استوار نظر آتی ہیں۔ چنانچہ وہ اس حقیقت کو محسوس کرتے ہیں کہ زندگی کی ناسازگاری کیفیت غم کو پیدا کرتی ہے اور یہ غم عشق کی لذتوں اور مسرتوں کی راہوں میں حائل ہوتا ہے۔ یہی خیال اس زمانے میں غم حیات کو غم عشق پر غالب کر دیتا ہے۔ غالب کی ساری شاعری اس غم کی ترجمان اور عکاس ہے۔ غالب زندگی کی مسرتوں اور دلآویزیوں کے عاشق ہیں۔ لیکن معاشی معاشرتی اعتبار سے حالات ناسازگار ہوں تو یہ مسرتیں اور دلآویزیاں بھلا کس کا ساتھ دیتی ہیں۔ غالب نے ان کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ وہ زندگی بھر ان کے پیچھے دوڑتے رہے ہیں، لیکن ناسازگار حالات نے انہیں ان مسرتوں اور دلآویزیوں سے ہمکنار ہونے کا موقع نہیں دیا ہے۔

زمانے کا غم ان کی راہوں میں حائل ہوگیا ہے، اور وہ بے بس ہوگئے ہیں۔ یہی صورت حال نے غالبؔ کو غمِ دوراں کا احساس دلا کر ان پر اداسی کی ایک تاریکی کو مسلط کر دیا ہے۔ اگر ان کے یہاں غمِ دوراں کا شدید احساس نہ ہوتا تو غم کی یہ تاریکی ان کے پاس بھی نہ پھٹکتی۔ اور اگر وہ اس غم سے عدد درجہ متاثر نہ ہوتے تو اس طرح کے اشعار کی تخلیق کا انہیں خیال بھی نہ آتا ؎

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

غم اگرچہ جانگسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ دل اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

لکد کوبِ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی
مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

غالبؔ کی طاقت بتوں کے ناز اٹھانے کی ضامن تھی، اس لئے لکد کوبِ حوادث کا تحمل کرنا ان کے لئے مشکل تھا۔ پھر بھی غمِ روزگار کے ہاتھوں وہ رہینِ ستم ہائے روزگار رہے، یہاں تک کہ محبوب کی وفا سے بھی ان کی تلافی نہ ہو سکی۔ بہر حال غالبؔ کے یہاں عشق کا تصور غمِ دوراں کے ساتھ وابستہ ہے۔ زندگی کے گہرے شعور نے ان دونوں کو آپس میں اس طرح ہم آہنگ کیا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے الگ نہیں معلوم ہوتے۔ اسی لئے غالبؔ کی شاعری میں حقیقت اور رومان کا ایک سنگم نظر آتا ہے۔ اور یہ ان کی شاعری کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔ غالبؔ طبعاً رومانی ہیں۔ لیکن غمِ دوراں کے شدید احساس نے زندگی کی سنگین اور ٹھوس حقیقتوں کا جو شعور اُن کے یہاں پیدا کیا ہے، اس نے ان کی شاعری کی دنیا ہی بدل دی ہے۔

شاعری میں رومان اور حقیقت کو ہم آہنگ کرنے اور ان دونوں کا ایک سنگم بنانے میں غالبؔ کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔ انہوں نے اس ہم آہنگی کی ایک روایت اردو غزل میں قائم کی۔ غالبؔ کے بعد وقت کے ساتھ ساتھ یہ روایت اردو غزل میں استوار ہوتی گئی۔ غالبؔ کے زمانے میں سماجی شعور تیزی سے بڑھا، اور اس کی وجہ سے، عشق کے ساتھ غمِ دوراں کی ہم آہنگی کا خیال غزل میں عام ہوتا گیا۔

یہ ٹھیک ہے کہ غالبؔ کے بعد آنے والے ہر غزل گو شاعر کے یہاں اس رجحان کے اثرات نہیں ملتے لیکن ویسے جدید دور کے ہر باشعور غزل گو شاعر نے عشقیہ معاملات کو اسی زاویۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اسی لئے نوجوان شعراء میں سے ہر ایک کے یہاں اس رجحان کے اثرات ملتے ہیں۔ فراقؔ، فیضؔ، مجازؔ، حفیظؔ ہوشیارپوری، جذبیؔ، مجروحؔ اور ناصرؔ کاظمی، سب کی غزلوں میں اس رجحان کی عکاسی نمایاں نظر آتی ہے۔ زندگی سے کتنے بھرپور اور حقیقت سے لبریز اشعار ان شعراء نے نکالے ہیں ؎

غم ترا جس میں تھا وہ دل کیونکر — وقفِ غم ہائے روزگار کریں
یہ شاد کامِ محبت یہ رازدانِ نشاط — یہ لوگ اپنے لہو میں ہیں کیوں نہائے ہوئے

فراقؔ

کر رہا تھا غمِ جہاں کا حساب — آج تم یاد بے شمار آئے
نہ گئی تیرے غم کی سرداری — دل میں یوں روز انقلاب آئے
گراں ہے دل پہ غمِ روزگار کا موسم — ہے آزمائشِ حسنِ نگار کا موسم

فیضؔ

کیا تجھکو خبر ہے ہم کیا کیا اے گردشِ دوراں بھول گئے
وہ زلفِ پریشاں بھول گئے وہ دیدۂ گریاں بھول گئے
بڑی مشکل ہے دنیا کا سنورنا — تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے

مجازؔ

غمِ زمانہ تری ظلمتیں ہی کیا کم تھیں
کہ بڑھ چلے ہیں اب ان گیسوؤں کے بھی سائے

حفیظؔ ہوشیارپوری

ملے مجھ کو غم سے فرصت تو سناؤں وہ فسانہ
کہ ٹپک پڑے نظر سے مئے عشرتِ شبانہ

جذبیؔ

گریزاں تو نہیں تجھ سے مگر تیرے سوا دل کو
کئی غم اور بھی ہیں اے غمِ جانانہ برسوں سے
اب اہلِ درد یہ جینے کا اہتمام کریں — اسے بھلا کے غمِ زندگی کا نام کریں
غمِ حیات نے آوارہ کر دیا ورنہ — تھی آرزو کہ ترے در پہ صبح و شام کریں

مجروحؔ

ایسا الجھا ہوں غمِ دنیا میں — ایک بھی خوابِ طرب یاد نہیں

رفتۂ جاں تھا کبھی جس کا خیال — اس کی صورت بھی تو اب یاد نہیں

ذرا سی دیر ٹھہرنے دے اے غمِ دنیا
بلا رہا ہے کوئی بام سے اتر کے مجھے
زمانہ پرسشِ غم بھی کرے تو کیا حاصل
کہ تیرا غم، غمِ لیل و نہار بھی تو نہیں
رہِ حیات میں کچھ مرحلے تو دیکھ لئے
یہ اور بات تری آرزو نہ راس آئی

ناصر کاظمی

ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ غمِ دنیا اور غمِ روزگار کے شدید احساس نے ان شعراء کو زندگی اور حقیقت سے زیادہ قریب کیا ہے یہی سبب ہے کہ ان کے عشق میں نری جذباتیت کا احساس نہیں ہوتا۔ تمام تر رومانیت نظر نہیں آتی۔ زندگی اور حالات کے صحیح شعور نے ان کے عشق کو حقیقت اور واقعیت سے ہم آہنگ کیا ہے۔ اسی لئے ان کی شاعری میں حقیقت اور رومان کی ہم آہنگی سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دور کے نوجوان کی صحیح ذہنی اور جذباتی کیفیت موجودہ دور کی غزلوں میں بے نقاب ہے — وہ نوجوان جو جذباتی اور رومانی ہے لیکن جس کے حالات اسے تمام تر جذباتی اور رومانی ہونے سے روکتے ہیں۔ جو اسے سنگین اور ٹھوس حقیقتوں کا احساس دلاتے ہیں۔ اور جن کے نتیجے میں اس کے پیش کئے ہوئے خیالات میں حقیقت کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر نوجوان شعراء میں غمِ دوراں کا صحیح احساس نہ ہوتا تو یہ صورتِ حال پیدا نہ ہوتی۔ غمِ دوراں کو آج حالات نے زندگی کی سب سے بڑی حقیقت بنا دیا ہے۔ چنانچہ اس کے صحیح احساس نے موجودہ دور کی غزل میں حقیقت و واقعیت کی لہریں دوڑا دی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ عشق غزل کا بنیادی موضوع ہے لیکن زندگی کے دوسرے معاملات کو پیش کرنے کی بھی اس میں ایک عظیم روایت ملتی ہے۔ ابتدا سے لے کر اس وقت تک عشقیہ معاملات کے ساتھ ساتھ، مختلف ادوار میں اس نے سیاسی، سماجی اور تہذیبی مسائل کی ترجمانی کو بھی اپنے پیش نظر رکھا ہے۔ اور ایک مخصوص انداز میں زندگی کے ان پہلوؤں کی ترجمانی غزل میں بڑے سلیقے سے ملتی ہے۔ اسی سلیقے نے اسے ان موضوعات کی ترجمانی کے باوجود بھی غزل باقی رکھا ہے۔ اور یہی میں اس صنفِ سخن کی بڑائی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ غزل میں سیاسی سماجی، اور تہذیبی مسائل کی جو ترجمانی ہوئی ہے، اس میں ان سب کی تفصیل جزئیات کا پتہ نہیں چلتا۔ کیونکہ غزل کی صنف اس بات کی اجازت نہیں دیتی۔ اس کے اصول اس کو گوارا نہیں کرتے۔ اس میں تو ہر موضوع کا بیان آدابِ غزل کو ملحوظ رکھ کر کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل میں سیاسی اور سماجی مسائل کی ترجمانی، اس کے مخصوص اشاروں اور کنایوں میں ہوئی ہے، لیکن ویسے ہماری زندگی کا ایک دور بھی ایسا نہیں ملتا جس میں اس وقت کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی مسائل کو اس نے نظر انداز کیا ہو۔ یہ مسائل غزل میں پیش کئے جاتے رہے ہیں، اور ان کو پیش کرنے میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے، وہ اس غم کا احساس ہے جس کو مختلف زمانوں میں مخصوص معاشی معاشرتی حالات نے پیدا کیا ہے۔ اردو غزل نے جن حالات میں آنکھ کھولی اور جس ماحول میں اس کی نشو و نما ہوئی، وہ انحطاط و زوال اور انتشار و افراتفری کا زمانہ ہے۔ چنانچہ اردو کے غزل گو شعراء نے جب بھی ان مسائل کو پیش کیا ہے تو ان کی نظر سب سے پہلے زندگی کے اسی انحطاط و زوال اور انتشار و افراتفری پر پڑی ہے۔ اس صورتِ حال نے ہمیشہ غمِ دوراں کے خیال کو ان کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ اور وہ ہمیشہ اس کے مختلف پہلوؤں کو اپنی غزلوں میں جگہ دینے کے لئے مجبور ہو گئے ہیں۔ ولی کے وقت سے لے کر موجودہ دور تک کے تقریباً ہر باشعور غزل گو شاعر کے یہاں اس صورتِ حال کا احساس ہوتا ہے۔

ولی یوں تو حسن و عشق اور اس کے مختلف معاملات و کیفیات کے شاعر ہیں۔ تصوف اور اس کے مختلف پہلو بھی ان کے پیش نظر رہے ہیں اور ان تمام موضوعات کو پیش کرنے میں مجموعی طور پر ان کی شاعری کا رجحان جمال پرستی اور لذت پسندی کی طرف نظر آتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی شاعری میں جو سوز و گداز ہے، وہ ان کے زمانے کی سیاسی اور سماجی افراتفری کی پیداوار ہے۔ بالواسطہ طور پر تو ان حالات کی ترجمانی ان کی غزلوں میں ہر جگہ موجود ہے لیکن کہیں کہیں براہ راست اور کھلم کھلا بھی ان کی ترجمانی کر گئے ہیں۔ اگر سیاسی انتشار اور سماجی افراتفری کے ہاتھوں پیدا ہونے والے زمانے کے غم کا احساس ان کے یہاں اتنا شدید نہ ہوتا تو وہ اس قسم کے شعر ہرگز نہیں کہہ سکتے تھے ؎

باعثِ رسوائیٔ عالم ولی — مفلسی ہے مفلسی ہے مفلسی

مفلسی سب بہار کھوتی ہے　　مرد کا اعتبار کھوتی ہے

یہ اشعار غزل کے اشعار کم معلوم ہوتے ہیں لیکن بہر حال ان اشعار کو انہوں نے اپنی غزلوں میں جگہ دی ہے۔ یہ غزل کے بہت اچھے اشعار نہ سہی لیکن غزلوں کے اشعار تو بہر حال ہیں، اور ان کا موضوع وہی غم دوراں یا زمانہ کا غم ہے، جس کو ولی نے اپنے آس پاس دیکھا تھا۔ ان اشعار کی اصل حقیقت اس وقت تک واضح نہیں ہو سکتی، جب تک اس معاشی معاشرتی افراتفری کو سامنے نہ رکھا جائے جس کو ولی کے زمانے میں دکن کی سرزمین پر اورنگ زیب عالمگیر کی پیہم یورشوں نے پیدا کیا تھا۔ اور جن کے باعث دکن کے باشندوں کی زندگی دوبھر ہوگئی، ان کے جینے کے لالے پڑ گئے تھے۔

دکن کے علاوہ شمالی ہندوستان، اور خصوصاً دلّی میں، مغلوں کے انحطاط و زوال نے جس انتشار اور افراتفری کو پیدا کیا، اس کی ترجمانی غزلوں میں جیسی میرؔ، سوداؔ اور دردؔ نے کی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس زمانے میں ان شعراء نے مسلمانوں کی عظمت رفتہ کے شیرازے کو بکھرتے ہوئے دیکھا ہے۔ دلّی کی سرزمین پر انہیں نادر و ابدالی کی تلواریں بجلیوں کی طرح چمکتی اور خون کا مینہ برساتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اور ان حالات کے نتیجے میں شرفاء کی جو آبرو ریزی ہوتی ہے، عزت و وقار کے جو جنازے نکلے ہیں، اقبال کا آفتاب جس طرح گہنایا ہے، دولت و ثروت کو جس طرح آگ لگی ہے، ان سب سے یہ شعراء اس حد تک متاثر ہوئے ہیں کہ ان کی ساری شاعری میں ایک المیہ آہنگ پیدا ہوگیا ہے۔ ان کے یہاں وہ جو ایک کسک سی نظر آتی ہے، وہ جو ایک میٹھا میٹھا درد سا محسوس ہوتا ہے، وہ سب انہیں حالات کے شدید احساس کا نتیجہ ہے۔ ان کی شاعری کے افق پر غم کے بادل چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور یہ غم زمانے کا غم ہے، غم دوراں ہے جس کی آگ میں سے ان شعراء کو گزرنا پڑا ہے اور جس کے شعلوں سے وہ اپنے دامن کو بچا نہیں سکے ہیں۔ انہیں خود اس آگ میں جلنا پڑا ہے۔ ان کی غزلوں میں اسی صورت حال کی ترجمانی کے مختلف روپ ہیں۔ جو کچھ بھی اس زمانے کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا، اور جس طرح افراد اس کو دیکھ رہے تھے، جن خیالات کی موجیں ان کے دلوں میں اٹھ رہی تھیں، ان سب کو انہوں نے اپنی غزلوں میں سمو دیا ہے۔ میرؔ، سوداؔ اور دردؔ کے یہ اشعار اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں ؎

دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ
جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا

اس کہنہ خرابے میں آبادی نہ کر منعم
اک شہر نہیں یاں جو صحرا نہ ہوا ہوگا

جہاں کو فتنے سے خالی کبھو نہیں پایا
ہمارے وقت میں تو آفت زمانہ ہوا

یہ عیش گہ نہیں ہے، یاں رنگ اور کچھ ہے
ہر گل ہے اس چمن میں ساغر بھرا لہو کا

اب شہر ہر طرف سے میدان ہو گیا ہے
پھیلا تھا اس طرح کا کاہے کو یاں خرابا

فکر معاش یعنی غم زیست تا بہ کے
مر جائیے کہیں کہ ٹک آرام پائیے

اب خرابا ہوا جہان آباد
ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

میرؔ

نگر ہو آباد جس کے دل کا، نہ پوچھ اس سے تو دکھ ہمارا
یہ درد سن اس زمیں سے ٹک جو لٹتے دیکھے نیا را پیا

میں کیا کہوں کہ کون ہوں سوداؔ بقول دردؔ
جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں

سوداؔ

میں اپنا درد دل چاہا کہوں جس پاس عالم میں
بیاں کرنے لگا قصہ وہ اپنی ہی خرابی کا

اہل زمانہ آگے بھی تھے اور زمانہ تھا
پر اب جو کچھ ہے یہ تو کسی نے سنا نہ تھا

دردؔ

ان اشعار میں اس انتشار اور افراتفری کی تصویر ہے جس کو دلّی میں مغلوں کے دور آخر نے پیدا کیا تھا۔ میرؔ، سوداؔ، اور دردؔ اسی دور کی پیداوار ہیں۔ یہ ماحول ان کا ماحول تھا۔ یہ حالات ان کے حالات تھے۔ اور ان پر اس ماحول اور حالات کا گہرا اثر تھا۔ اسی لئے اس کے سائے میں پرورش پانے والے سارے غم کی ترجمانی انہوں نے اپنی غزلوں میں کی ہے۔ اس غم کی ترجمانی میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے، وہ ایک

معاشی معاشرتی شعور اور ایک انسانی زاویۂ نظر ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اسی معاشی معاشرتی شعور اور انسانی زاویۂ نظر نے زمانے کے اس غم کی ترجمانی کے لئے ان شعراء کو مجبور کیا ہے۔

میرؔ، سوداؔ اور دردؔ کے بعد غمِ دوراں کی یہ ترجمانی غالبؔ، مومنؔ اور بہادر شاہ ظفرؔ کے یہاں ایک اور نیا روپ اختیار کرتی ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے، غالبؔ کے زمانے میں معاشی معاشرتی شعور بڑھ جاتا ہے۔ زندگی کا قافلہ اس وقت جن راہوں سے گزر رہا تھا ان سے سب ہی واقف تھے۔ وہ انحطاط و زوال جو ایک زمانے سے مسلمانوں کی زندگی میں شروع ہو چکا تھا، اب اس نے نئی صورتیں اختیار کر لی تھیں۔ ایک نظام کے ختم ہونے کا احساس اس زمانے میں ضرور تھا۔ افراد اس پہ ماتم بھی کر رہے تھے۔ لیکن اب ان کی نظریں ایک نئی زندگی اور ایک نئے نظام کی صبح کو طلوع ہوتے ہوئے بھی دیکھ رہی تھیں۔ نئے تصورات نے زندگی میں انفعالیت کی جگہ جولانی اور انفرادیت کی جگہ اجتماعیت کے خیال کو عام کرنا شروع کر دیا تھا لیکن بہرصورت اس وقت کی زندگی میں اس کے باوجود ایک کسک تھی، ایک درد تھا۔ اور افراد اس کسک اور درد کو انفرادی اور اجتماعی دونوں زاویوں سے دیکھ رہے تھے۔ ایک تہذیب کے مٹنے، ایک نظامِ معاشرت و معیشت کے فنا ہونے کا انہیں بڑا غم تھا۔ اور چونکہ زندگی میں ایک بحرانی کیفیت تھی، کسی چیز کا کچھ ٹھیک نہیں تھا، اس لئے افراد ذہنی اور جذباتی اعتبار سے ناآسودہ رہتے تھے۔ اس ناآسودگی نے ان کے یہاں زمانے کی ناہمواری کا احساس پیدا کیا تھا۔ اور اس احساس کے باعث وہ زمانے کے غم یا غمِ دوراں سے روشناس تھے۔ اسی لئے اس دور کی زندگی اور شاعری دونوں میں اس کے اثرات نظر آتے ہیں۔

غالبؔ اس زمانے کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں زندگی کی لذتوں اور مسرتوں کے دوش بدوش اس غم کا احساس بھی ملتا ہے جو ان کے زمانے کی زندگی میں موجود تھا۔ وہ زندگی کے معاملات مسائل کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ اسی شعور نے ان کے یہاں غمِ دوراں کے احساس کو جگایا ہے۔ اس غم کی نوعیت انفرادی بھی ہے لیکن گہرے سماجی شعور نے ان کی غزلوں میں اس غم کو بڑی حد تک ایک اجتماعی رنگ بھی دے دیا ہے۔ ان کے اس طرح کے اشعار ان کی اپنی شکست کی آواز ضرور ہیں لیکن اس سے کہیں زیادہ ان میں ایک دور، ایک معاشرت اور ایک تہذیب کی آوازِ شکست سنائی دیتی ہے ؎

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

خزاں کیا فصلِ گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھئے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

فرق صرف اتنا ہے کہ غالبؔ ظلمت کدے میں شبِ غم کے جوش پر خون کے آنسوں ہی نہیں بہاتے، بزمِ مے سے تشنہ کام آنے پر گریہ و زاری ہی نہیں کرتے، بادۂ شبانہ کی سرمستیوں کے ختم ہونے کا ذکر ہی نہیں چھیڑتے، لذتِ خوابِ سحر سے بیدار ہونے کا پیام بھی دیتے ہیں۔ اور اس طرح آمدِ سحر کا مژدۂ جاں فزا بھی ان کے یہاں سنائی دیتا ہے۔ درحقیقت یہ اس ماحول کا اثر ہے جس میں زندگی کا احساس بڑھنے لگا تھا۔ عمل کی خواہش بیدار ہونے لگی تھی، غمِ دوراں کے صحیح احساس کے بغیر غالبؔ کے یہاں اس صورتِ حال کا پیدا ہونا مشکل تھا۔

مومنؔ کی شاعری کا میدان اگرچہ غالبؔ سے مختلف ہے لیکن اپنے زمانے کی افراتفری اور انتشار کو انہوں نے بھی شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے۔ ان کی شاعری کی نوعیت تمام تر عشقیہ ہے لیکن غمِ دوراں کے صحیح احساس نے ان سے ایسے شعر کی بھی تخلیق کرائی ہے ؎

اے حشر جلد کر تہہ و بالا زمین کو
گر کچھ نہیں امید تو ہے انقلاب میں

حشر کے ہاتھوں زمین کے تہ و بالا ہونے کی تمنا کرنا اور انقلاب میں امید کی جھلک دیکھنا، درحقیقت انہیں حالات کی پیدا کردہ ہے جس کے سائے میں مومنؔ نے زندگی بسر کی تھی، اور جس میں حالات کو بدلنے کا احساس بڑھنے لگا تھا۔ زندگی کو انقلاب سے دوچار کرنے کی خواہش بیدار ہونے لگی تھی۔

بہادر شاہ ظفر کے یہاں یہ خواہش تو بیدار نہ ہو سکی لیکن انہوں نے اپنے زمانے کی زندگی پر خون کے آنسو ضرور بہائے ہیں۔ ان کے بہت سے اشعار اپنی زبوں حالی کا مرثیہ ہیں لیکن ان کی شخصیت نے ان اشعار کو اس نظام اور تہذیب کا مرثیہ بھی بنا دیا ہے اس طرح کے اشعار کی تخلیق بہادر شاہ ظفر ہی کر سکتے تھے ؎

بلبلو! دیکھو چمن میں اتنا
نہ کرو شور کہ صیاد آیا

سوا ہمارے نہ سن ہماری حکایت غم سنی سنائی
جو ہم پہ گزری نہ ہم سے پوچھو، کہے ہے عالم سنی سنائی

کس سے حمایت ڈھونڈیں ہم اور کس سے مرہم چاہیں ہم
دیکھتے نظر ہیں اپنے خدا پہ وہی ہمارا حامی ہے

نہ تنگ کیوں ہمیں صیاد یوں قفس میں کرے
خدا کسی کو کسی کے یہاں نہ بس میں کرے

روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفر
ایسی بستی سے تو ویرانہ بنایا ہوتا

ان اشعار میں بہادر شاہ ظفر کی کس مپرسی اور زبوں حالی کا بیان ہے لیکن ان سے ان حالات پر روشنی بھی پڑتی ہے جنہوں نے اس کس مپرسی اور زبوں حالی کو پیدا کیا تھا۔

غالب اور ان کے بعض ہم عصروں نے اردو غزل میں اس صورت حال کی ترجمانی سے ایک نئی روایت کا سنگ بنیاد رکھا۔ اور ان کے بعد آنے والے غزل گو شعراء نے اس روایت کو پوری طرح برتنے کی کوشش کی۔ حالی کے یہاں اس نے قومی اصلاح کا روپ اختیار کیا۔ اقبال کے یہاں اس نے ملت کے احساس کو جگایا۔ چکبست کے یہاں اس نے سیاسی آزادی کی صورت اختیار کی — اور پھر نوجوان غزل گو شعراء کے یہاں یہ غم زندگی کی سیاسی تہذیبی اور معاشی کشمکش کو پیش کرنے کا باعث بنا۔ چنانچہ ان کی غزلوں میں زندگی کے تمام بنیادی مسائل نے اپنی جگہ بنالی۔ ان مسائل کی ترجمانی کے مختلف روپ فراق، جگر، احسان، فیض، جذبی، مجروح، اور ناصر کاظمی وغیرہ کی غزلوں میں نظر آتے ہیں چند اشعار سے اس کا اندازہ ہوگا ؎

دیکھو رفتار انقلاب فراق
کتنی آہستہ اور کتنی تیز

اے نظام کہن کچھ آہٹ لے — وہ دبے پاؤں موت آئی دیکھ
زندگی کیا ہے آج اسے اے دوست — سوچ لیں اور اداس ہو جائیں
کاروان حیات بے منزل — جانے درپیش ہے کہاں کا سفر

ہمیں سے پیشانیاں ابھریں ہمیں سے رفعتیں جھکیں
نہ پوچھو ہم سے اے ارض و سما ہم کون ہیں کیا ہیں

فراق

صحن کعبہ نہ سہی کوئے صنم خانہ سہی
خاک اڑانی ہے تو پھر کوئی بھی ویرانہ سہی
تشنہ لب ہاتھ پہ کیوں ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں
کچھ نہیں ہے تو شکست خم و خم خانہ سہی

جگر

میں دیوانہ بھلا مجھکو مرے صحرا میں پہنچا دو
کہیں پابند آداب گلستاں ہو نہیں سکتا

احسان دانش

یوں بہار آئی ہے امسال گلشن میں صبا
پوچھتی ہے گزر اس بار کروں یا نہ کروں

جنوں میں جتنی بھی گزری بکار گزری ہے
اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گزری ہے
جگہ جگہ پہ تھے ناصح تو کو بکو دلبر
انہیں پسند انہیں ناپسند کیا کرتے
جنہیں خبر تھی کہ شرط نوا گری کیا ہے
وہ خوش نوا گلۂ قید و بند کیا کرتے
اب وہی حرف جنوں سب کی زباں ٹھہری ہے
جو بھی چل نکلی ہے وہ بات کہاں ٹھہری ہے

فیض

جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

جذبی

ہم قفس! صیاد کی رسم زباں بندی کی خیر
بے زبانوں کو بھی انداز کلام آ ہی گیا

ہزاروں ماہتاب آئے ہزاروں آفتاب آئے — مگر ہم ہیں کہ ہے ظلمت غم خانہ سوں سے

ہنگامہ ہائے دہر بہت خوب ہیں مگر
اپنا لہو بھی سرخیٔ شام و سحر میں ہے

مجروحؔ

بہاریں لے کے آئے تھے جہاں تم
وہ گھر سنسان جنگل ہو گئے ہیں
یہاں تک بڑھ گئے آلامِ ہستی
کہ دل کے حوصلے شل ہو گئے ہیں
جنہیں ہم دیکھ کر جیتے تھے ناصرؔ
وہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں
اُداسیوں کا سماں محفلوں میں چھوڑ گئی
بہار ایک خلش سی دلوں میں چھوڑ گئی

ناصرؔ کاظمی

جدید غزل گو شعراء کے یہ اشعار جدید معنویت کے حامل ہیں۔ ان میں زندگی کی کشمکش، انسانوں کی جدوجہد اور ایک نئے نظامِ اقدار کے قیام کی آرزو۔ ان سب نے مل کر ایک ایسا ماحول پیدا کیا ہے جو اردو غزل کے لئے بالکل نیا ہے، لیکن نامانوس نہیں ہے۔ کیونکہ آج زندگی کا قافلہ افکار و خیالات کی انہیں منزلوں سے گزر رہا ہے۔

غرض اردو غزل کے ہر دور میں زمانے کے غم اور اس کے شدید احساس نے اپنا اثر دکھایا ہے۔ بدلتے ہوئے حالات کے زیرِ اثر اس نے مختلف روپ اختیار کئے ہیں۔ اس احساس نے اس میں زندگی کے شعور کو بڑھایا ہے۔ زندگی کو سدھارنے، حالات کو سنوارنے اور ماحول کو نکھارنے کی ایک لگن پیدا کی ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود غزل نے اپنے آپ کو غزل باقی رکھا ہے اس کے بنیادی مقتضیات کی "کارگہ شیشہ گری" کو ٹھیس نہیں لگی ہے اسی لئے اس نے غمِ دوراں کی ترجمانی کو بھی جگہ جگہ غمِ جاناں کا روپ دے دیا ہے۔ اصغرؔ نے کیا خوب کہا ہے ؎

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اُسے غمِ جاناں بنا دیا

ہر نقطۂ نظر سے .....
VACUUM REFINED COTTON SEED OIL
Benawell
COOKING MEDIUM
بناول
SCIENTIFICALLY
NEUTRALIZED · BLEACHED · DEODORIZED
Untouched by hand
BENGAL OIL MILLS LTD.
بناول کھانا پکانے کا بہترین روغن ہے۔
ہاتھوں سے چھوئے بغیر تیار کیا جاتا ہے۔
۳۵ پاؤنڈ - ۱۰ پاؤنڈ اور ۵ پاؤنڈ کے مُہر بند ڈبوں میں ہر جگہ ملتا ہے
بنگال آئل ملز لمیٹڈ۔ بنگال ہاؤس۔ کراچی
فون 34537.
(بناول ہماری مِل میں واقع خوردہ بکری کی دوکان سے بھی مل سکتا ہے۔)

ایک آزاد نظم

ابوالاثر حفیظ

کسی نے کیا خوب کہا تھا کہ ؎ دیوانِ ظہیر فاریابی ✤ در کعبہ بدزد اگر بیابی

ایک پابند شاعر کی آزاد نظم بھی اسی ذیل میں آتی ہے، بالخصوص جب وہ شاعر ابوالاثر حفیظ ہو جنہوں نے ۲۲ء میں ایک آزاد نظم لکھی تھی۔ یہ نظم ہمیں بالواسطہ موصول ہوئی ہے اور ہم اسکو شاعر سے معذرت کرتے ہوئے ایک نادر فن پارے کی حیثیت سے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ (مدیر)

آج بستر ہی میں ہوں
یہ علالت، مضمحل اعضا کا اک عذرِ شکست
میرا جسمِ ناتواں —
میرا غلامِ باوفا
واقعی معلوم ہوتا ہے تھکا ہارا ہوا

اور میں
اک سخت گیر آقا زمانے کا غلام
کس قدر مجبور ہوں
پاؤں شل ہیں اور میں ان کی رضا کے سامنے
سر اٹھا سکتا نہیں
سخت گیر آقائے فطرت کے حضور
اُٹھ کے جا سکتا نہیں
آج بستر ہی میں ہوں

کینٹو :

پری محل

سیّد جعفر طاہر

یہ کینٹو ایک طویل نظم "قصۂ چہار درویش" کا جزو ہے جس میں نوعِ انسان کے تمدنی ورثہ کی عکاسی کی گئی ہے۔ چہار درویش ہندوستان، چین، یونان اور کشمیر ہیں جو اپنے اپنے تمدن کی داستان شاعرانہ پیرائے میں پیش کرتے ہیں اور اس طرح عظمتِ آدم کی تاریخ مرتب ہو جاتی ہے۔ پری محل ایک نہایت خوبصورت محل تھا جس کو ملکہ نور جہاں نے شالیمار سے کچھ فاصلہ پر جھیل ڈل کی شرقی سمت ایک پُر فضا پہاڑی پر تعمیر کیا تھا۔ اس کینٹو میں اسی محل کی ایک دعوتِ شبانہ کا نقشہ پیش کیا گیا ہے جس کا اہتمام جہانگیر کی ہندو رانی نے کیا تھا۔ (مدیر)

خیارِ شبنم کی نرم شاخیں خنک ہواؤں میں لہلہائیں
وہ سبز کاہی کے آشرم میں الوپ روحیں بھی گنگنائیں
سوادِ سرو و سمن میں نغمہ سرا ہوئیں کم سخن بہاریں
سنہرے کنجوں میں جس طرح دیو داسیاں آرتی اُتاریں

فضاؤں کے سیم کار ہونٹوں پہ دُر فشاں کامنا کی لہریں
ہرے بھرے گنگناتے رمنوں کے درمیاں نگ رس کی نہریں
بنفشہ و بہرماں کی نازک مزاج بیلوں کی انجمن میں
مگن مگن سارکائیں جیسے شریر سکھیاں کسی سگھن میں

ہواؤں کی تال تال پر ناچتی ہوئی اپسرائیں آئیں
دوارکا دیش کی حسیں پتلیاں کھٹولے اڑا کے لائیں
وہ رس میں ڈوبے ہوئے سہانے بدن، وہ بہکی ہوئی نگاہیں
کسی مغنّی کی آتشیں تان کی طرح تمتماتی باہیں

انوپ انجن لگا کے اندر پرستھ کی سندریاں جو آئیں
تو سیکری کی سہاگنیں بھی برج کے جادو جگا کے لائیں
کہیں سراندیپ کی حسینائیں شرم سے یوں قدم اٹھائیں
کسی سوئمبر میں جیسے نونت رانیاں جھینپ جھینپ جائیں

پلک پلک اچپل چتر چپت چھوریاں یہ چتاونی دیں
کہ بیگمیں آج شب مہاراج کی اگونی کو بن سنور لیں
یہ حکم کوئی سیاہ پیکر حرم سرا میں نہ آنے پائے
مگر کوئی بانوئے ستارہ نگاہ محلوں میں رہ نہ جائے

رشی رشی نے، پتی پتی نے عبیر کی دھونیاں رمائیں
کنول کے پتوں پہ لکھنے والے کوی کی آنکھیں بھی مسکرائیں
سورج رانی نے سر اٹھایا کچھ اس طرح ڈبڈبا کر حیا میں
جوئے میں ہاری ہوئی دروپد کھڑی ہو جیسے بھری سبھا میں

کہیں کوئی آسنی بچھائے پکارتا ہے جٹاؤں والا
یہ شبھ لگن، شبھ گھڑی ہے بھگوان کی دیا سے ہو بول بالا
یہ روج مہراج کی ہیں بڑھتی کے ایشور خود بھلی کرے گا
لگا ہے منگل جو پانچواں چندرماں تمہارا بلی کرے گا

جبیں پہ قشقہ، گلے میں کنٹھی، دہکتی آنکھوں میں سرخ ڈورے
حسین کانوں میں زرد من پُرسے، طلائی رخسار، ہاتھ گورے
وہ شیر کی کھال پر بڑی تمکنت سے بیٹھا پکارتا ہے
کہ آج سب کام سدھ ہوں گے ارے منش کیا بچارتا ہے

چمن چمن کتنی شرم پروردہ نکہتوں کے حجاب ٹوٹے
چلے بتانِ کمان ابرو تو راہ میں ماہتاب ٹوٹے
روش روش سیدہ بان و صفصاف و سنبل و نسترن کے سائے
وہ گلستاں نلادیوں نے بڑھ بڑھ کے شعلہ افشاں علم اڑائے

کرم کی شاخوں میں شوخ پریوں نے موتیوں کی نفیریوں پر
دھیمی دھیمی پدمنی گوپیوں نے چندن کی مرلیوں پر
گنی سپردائیوں نے مردنگ پر کہر وا بجا بجا کر
وہ چہرہ پرداز مطربوں نے سروں کے سہرے سجا سجا کر

نقیبِ عظمت کے حرفِ آغاز پر ہزاروں سرود چھیڑے
ترانہ ہائے طرب کے ہمراہ نغمہ ہائے درود چھیڑے
قدم قدم پر کئی حسینانِ برق آواز راگ چھیڑے
گماں یہ ہو کتنی زردشت آرائیں آج شب میں بہاگ چھیڑے

سروں کی دولت لٹا کے رامشگروں نے کی شہ کی پیشوائی
رتن جڑت خلعتوں کی صورت میں ہر مغنی نے داد پائی
بجنتری اس ادا سے جھک کر ہوئے مہاراج کے سلامی
عطا کئے تاجدارِ ہندوستاں نے پیراہن تمامی

وہ کوئی فیاض خاں سے استاد کی طرح ٹھیٹھ راگ گائے
اسد علی خاں کے رکھ رکھاؤ سے کوئی الینڈ کے سر لگائے
کریم خاں یاد آئے کوئی جو سُر بتوں سپتکوں میں جھولے
قدم لرزنے لگے شہنشاہ کے طبلچی بھی چال بھولے

وہ آرزوئیں کہ وقت جن کی بساطِ رنگیں الٹ چکا تھا
وہ سلسلے جن کی ڈور اب کٹ چکی تھی، محور پلٹ چکا تھا
وہ سرمدی لذتوں کا دریا جو ایک مدت سے تھم چکا تھا
وہ پھول جن کا لہو زمیں کے سلگتے ہونٹوں پہ جم چکا تھا

وہ ٹہنیاں جن کے چار سو بے کفن جنازے پڑے ہوئے تھے
جنازے جن پر خزاں کے لانبے نکیلے ناخن گڑے ہوئے تھے
وہ پتیاں جن کی ننھی لاشیں کہیں خلاؤں میں کھو چکی تھیں
وہ شبنمیں جو شعاعوں کی سولیوں پہ تھرا کے سو چکی تھیں

یہ آرزوئیں یہ خوشبوئیں شبنمیں نئے سانس لے رہی تھیں
ہوا کی لہروں پہ ہولے ہولے ابھر کے آواز دے رہی تھیں
غرض مسیحا دمانِ یکتائے فن کے اعجازِ دلنشیں سے
حیاتِ رفتہ کی رونقیں لوٹ آئیں خوابوں کی سرزمیں سے

گلے ملے مسکرا کے محفل میں برگ و بار و بہار باہم
چٹختی شاخوں نے جھرجھری لے کے زیب فرمایا رختِ شبنم
سلگتے ٹیلوں کی چیختی دھڑکنیں ملاروں میں کھو گئی تھیں
ہزاروں بے نور پتلیاں آج شب چناروں میں سو گئی تھیں

رخِ جواں سے نقاب اٹھائے ہوئے انیسانِ بزمِ شاہی
وہ کاکلیں، غالیہ فروشانِ شام کے بخت کی سیاہی
چمن چمن گاتیاں وہ دوپٹے کی باندھ کر پھول ڈول کھیلیں
وہ پاؤں میں لوٹ لوٹ جائیں ہزار افشاں کی نرم بیلیں

حرم سرائیں روش روش پر جو مغنیوں نے گلاب چھڑکا
طبیعتیں بھر بھر آئیں، دل گدگدائے لیکن حیا نے جھڑکا
منقش کی جلوہ باریاں دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی تھیں
یہ آج شب کتنی بجلیاں ایک ساتھ آ کر برس گئی تھیں

وہ بادلے سے منڈھے درختوں پہ جھاڑ رہ رہ کے جگمگائیں
کبھی مشجر کی تھیلیاں ڈال ڈال پر تالیاں بجائیں
کبھی گریں چھوٹ کر جو مستی میں قمقمے دستِ حوریاں سے
گماں یہ ہو ننھے ننھے تاروں کے گل برستے ہیں آسماں سے

نظر نظر میں نفس نفس میں شراب شعلے شفق لبا کر
سنہری صحراؤں کی حسینائیں موتیوں کے مکٹ سجا کر
حنائی ہاتھوں میں لے کے مالائیں سیم و زر کے دیئے جلائے
سجیلے سینوں کے تٹ پہ رقصاں شریر سندر لوؤں کے سائے

لجیلی شرمیلی باندیاں آج شب بہر گامِ ایستادہ
یہی تمنا کہ چوم لیں جس طرح بھی ہو شاہ کا لبادہ
قدم قدم پر تفنگ بردار نازنینیں صفیں جمائے
وہ کُرذمیں، اُردبیگنیں، بازوؤں پہ قلماق سے چڑھائے

خجستہ رو خادمائیں زریں چنور لئے مورپنکھ تھامے
مرصع سرپیچ، کار چوبی کے پیرہن، سامبری کے جامے
لچیلی بانہوں میں جگمگاتی ہوئی جہانگیریوں کا پرتو
وہ لوحِ ناخوردہ زنگ سینوں پہ عنبریوں کی ناچتی ضو

قطار اندر قطار پھولوں کے اوٹ، بانات کی تنائیں
مقامِ ششم پہ مستعد شہ کی پیشوائی کو بیگمائیں
کنیزیں کچھ اس ادا سے اپنے سروں پہ کیسِ زر اٹھائے
کہ جس طرح سیگوں سفینوں کو گھیر لیں بادلوں کے سائے

غرض ادھر مرغزارِ مینو نشاں میں لیلائے شام آئی
ادھر نگارانِ کوشکِ خسروی نے کی شہ کی پیشوائی
ہمائے اوجِ وفا جو فردوسِ عشق میں آج رات اترا
تو مسکراتی ہوئی تمناؤں نے کیا ہر قدم پہ مجرا

وہ خود شکن ترکنوں نے بے اختیار کورنش کو سر جھکائے
جہانگی مسکرائے، رانی کی سمت دیکھا، قدم بڑھائے
مگر سہارا لیا وہیں لغزشوں کا طبعِ بہانہ جو نے
ادھر سلیمانہ طور سمجھے سنبھل کے بانوئے ماہ رو نے

سلیم کے کپکپاتے ہاتھوں میں بانوئے سیم تن کے شانے
گماں یہ تھا لوٹ آئے "مہرالنسائیوں" کے حسیں زمانے
مگر شہنشاہِ ذی حشم کا شباب اب ڈھل رہا ہو جیسے
تھکا ہوا آفتاب دیوار تھام کر چل رہا ہو جیسے

لہ: یہ لفظ انداز آتیشن "ہوگا۔

آہٹ

عبدالرؤف عروج

ایک آہٹ سی ہوئی دل کے دریچے کے قریب
کون یادوں میں دبے پاؤں چلا آتا ہے
گونج اٹھتی ہے شبِ ہجر کی خاموشی کیوں
کس کا احساس مجھے دیر سے اکساتا ہے

ہو اگر حسنِ نظر، زرد خزاؤں کے طلسم
آئینہ پوش بہاروں سے بدل جائیں گے
ہو اگر ذوقِ سفر، آبلہ پایانِ جنوں
لڑکھڑاتے ہوئے قدموں پہ سنبھل جائیں گے
ہو اگر تابِ ہنر، موت کے سناٹے بھی
نغمۂ شعر کے پیمانوں میں ڈھل جائیں گے
ہو اگر سوزِ جگر، سوزِ وفا، سوزِ یقیں
جبر کے آہنی انداز پگھل جائیں گے

صبحِ رنگینیٔ فردا کی چمکتی ہوئی صبح
غم کی بے نوری آنکھوں میں فروزاں ہوگی
زندگی تازہ تقاضوں کی حسیں راہوں پر
اک نئی موت نئی راہ سے غزلخواں ہوگی
یہی اشکوں کا ترنم، یہی گیتوں کی پکار
دلِ وحشی کے بہل جانے کا ساماں ہوگی

ایک آہٹ سی ہوئی دل کے دریچے کے قریب
اسی آہٹ کی لطافت میں الجھ جاتا ہوں
وقت ہنستا ہے تضادوں کے شکنجے لے کر
اور میں آنکھ اٹھاتے ہوئے گھبراتا ہوں

شہرِ ویراں

تمہید الاسلام سید

مدت بیتی اس نگری میں شہر آباد تھا پھولوں کا
اس وادی آبادی میں رہتا تھا میلہ جھولوں کا

ڈال ڈال پر جھومیں تھے اس روپ نگر میں پات ہی پات
اس بن کی پھلواری میں ملتی تھی پھولوں کی سوغات

نرم گھاس پر سبزے کی تھرکیں تھے چمک چمک جگنو
اس جگ میں مہکے تھی پھولوں کی سوندھی سوندھی خوشبو

میں اس جگ کے سناٹوں میں پیار کی ٹھنڈی چھاؤں میں
رات رات پھرتا تھا دیپ جلائے گاؤں گاؤں میں

یاد کی بوجھل آندھی میں اس جگ سے میں نے خار چنے
پھولوں کے اس شہر میں آکے نرم رسیلے گیت بنے

آہ مگر اس پھولوں کی نگری میں آج نہ پھول نہ خار!
پھولوں کی نگری میں گھور اندھیرا، ویراں ہے سنسار!

میرے نرم رسیلے گیتوں کا رس سوکھ گیا ہے آج
میں اس جگ میں آوارہ دیوانہ، مجھ کو کام نہ کاج

پاکستان کے چند مقبول ساز
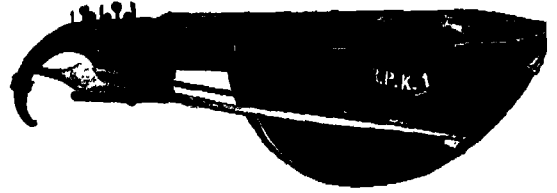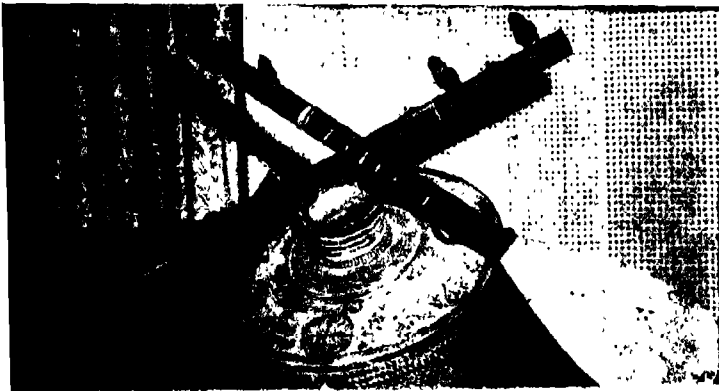
''سروذ'' (بلوچستان)

ڈھول اور گھنگھرو ا .سرحی سا لسماد

ڈھول

''تن تا،، اور گھڑا (سندھ)

ثقافت
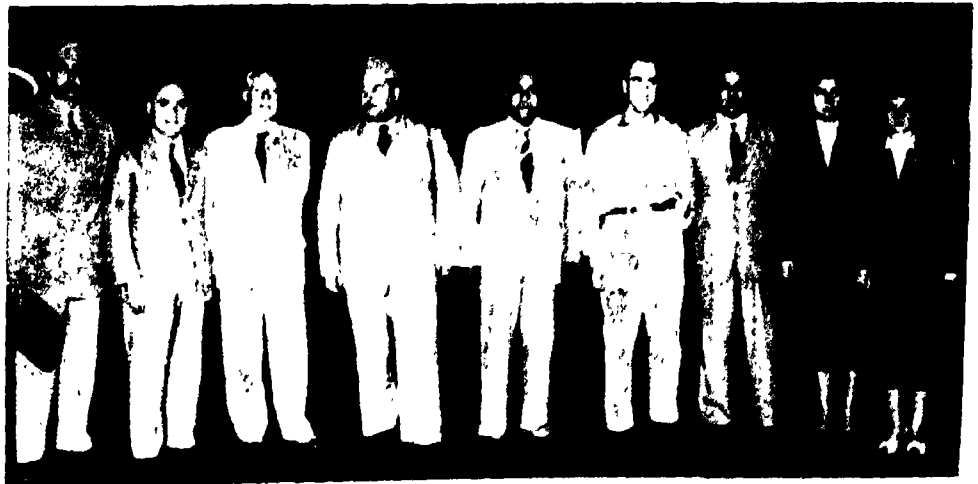
مغربی پاکستان کی سفال گری

سید امجد علی

کراچی کے "قومی عجائب گھر" اور دیگر مقامات میں سرخ رنگ کے سادہ ظروف کے متعدد نمونے دکھلائی دیتے ہیں، جو یہاں پانچ ہزار سال پہلے بنائے گئے تھے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ آج ہی کسی ظروف سازی کے بھٹے سے، پاکستان کے کسی بھی مقام سے تیار ہو کر آئے ہوں۔ یہاں تک کہ وہ سرخ و سیاہ نقوش بھی جو وادیٔ سندھ کی تہذیب سے مخصوص ہیں آجکل جہاں تہاں پائے جا سکتے ہیں۔ کئی قسم کے ظرف اور گھڑوں کے علاوہ، جو عجائب گھر میں دکھائی دیتے ہیں، مجھے ایک بالکل ابتدائی کُنڈے دار پیالی اور پرچ بھی دکھائی دی جس سے ان قدیم لوگوں کی غیر معمولی کاریگری ظاہر ہوتی ہے۔ یہ لوگ چکنی مٹی کے استعمال میں کس قدر ماہر تھے، اس کا اندازہ ان بے شمار دلچسپ اور معلومات افزا مورتیوں سے کیا جا سکتا ہے جو موئن جو دڑو اور ہڑپہ سے دستیاب ہوئی ہیں۔

اگر ہم اس عہد سے ذرا آگے بڑھیں تو ہمیں ٹیکسلا کے عجائب گھر، کراچی کے "قومی عجائب گھر" اور سر جان مارشل کی ٹیکسلا پر معرکہ آرا تصنیف میں انواع و اقسام کے ظروف نظر آتے ہیں جو چھٹی صدی عیسوی سے لے کر ایک ہزار سال کے عرصہ میں تیار ہوتے رہے یعنی ایرانیوں کی آمد سے لے کر پارتھیوں کے عہد تک۔ ان ظروف میں یونانیوں سے حاصل کی ہوئی اشکال کا بے انتہا تنوع نظر آتا ہے۔ اگرچہ یہ ظروف آرائشی نہیں، بلکہ زیادہ تر عام استعمال کی چیزیں ہیں، پھر بھی اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ظروف ساز کس قدر جامع الکمالات تھے، اور اس فن کو کس قدر فروغ حاصل تھا۔ یونانیوں نے اس فن پر بالخصوص نمایاں اثرات چھوڑے۔ چنانچہ کاریگر زیادہ باریک پسی ہوئی مٹی استعمال کرنے لگے، مرتبانوں پر نقاشی کو پھر فروغ حاصل ہوا، سانچوں اور ٹھپوں سے تیار کئے ہوئے ظروف پھر بننے لگے اور معلوم نہیں یونانیوں کے زیر اثر یا دگوں کی اپنی ذہانت سے، ڈھلائی کا کام بھی ظہور میں آیا۔

اب ہم اسلامی دور کی طرف آتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ آیا یہ فن بھی دیگر اسلامی ممالک سے قدیم پاکستان میں پھیلا تھا یا نہیں۔ سر آرل سٹین کی تصنیف "آرکیالوجیکل ری کنائیسنز" میں آر۔ ایل۔ ہابسن، سابق محافظ سفالیات برٹش میوزیم، کا اس علاقے کے ظروفی نوادر پر ایک تشریحی حاشیہ ہے۔ جو "مغربی پاکستان" کے نام سے موسوم ہے۔ موصوف ان نوادر کو نویں اور دسویں صدی عیسوی کی یادگار قرار دیتے ہیں۔ جہاں پنجاب کے ظروف محض وہی سادہ سرخ اور سرخی مائل زرد ہیں جو پہلے اس ملک میں بنائے جاتے تھے، وہاں اسلامی اثر سندھ اور بلوچستان میں کارفرما نظر آتا ہے۔ برہمن آباد (سندھ) اور مکران (بلوچستان) میں سبز و زرد روغن کے ساتھ ساتھ رنگ برنگی پنبہ کیوں والے ظروف نظر آتے ہیں۔ یہاں سرمئی کھردرے ظروف بلکہ ایسے ظروف بھی ملے ہیں جن پر صیقل کیا گیا ہے اور یہ خصوصیت اسلامی ظروف کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کے علاوہ سامرہ کے ظروف سے ملتے جلتے سادہ خاکستری مائل اُجلے ظروف بھی دستیاب ہوئے ہیں غرضیکہ مجموعی طور پر مشرق قریب کے اسلامی ممالک کے ساتھ ان ظروف کا ربط و تعلق بالکل واضح ہے۔ علاوہ بریں بعض مقامی نمونے بھی ہیں جو اور کہیں دستیاب نہیں ہوتے۔ مثلاً مٹی کے سرخ برتن جن پر پاکستان کی چادر دانیوں کی طرح سادہ کتھئی روغن دکھائی دیتا ہے۔ جیسا کہ گجرات کے موجودہ برتنوں پر ہوتا ہے۔ برہمن آباد اور مکران کے ظروف پر ایک دلچسپ نشان نظر آتا ہے، یعنی پیالوں اور رکابوں کے چپٹے پیندوں کے گرداگرد ایک وسیع گول چکر یا نالی سی دکھائی دیتی ہے۔ غوریوں میں بھی یہی خصوصیت دکھائی دیتی ہے، جن کے متعلق مشہور ہے کہ ان میں اگر زہریلی چیز ڈالی جائے

تو وہ تڑق جاتی ہیں۔ یہ غوریاں جو بعد کو دنیائے اسلام میں بہت مشہور ہوئیں غالباً انہیں مقامات میں بنائی جاتی ہیں۔

جب ۱۲۰۰ء کے لگ بھگ مسلمان اس ملک میں داخل ہوئے تو اس فن کے ماہر کاریگر بھی ان کے ساتھ چلے آئے اور انہوں نے یہاں کی صناعی پر گہرا اثر ڈالا۔ ملتان کے اُن مقبروں کی نقشین اینٹیں جو مغلوں سے پہلے تعمیر ہوئے تھے پاکستان میں اس فن کے ابتدائی، پرشوق استعمال کا بیّن ثبوت ہیں۔ ملتان اور ہالا کے ظروف ساز اس برصغیر میں روغنی سفال گری کے واحد ماہرینِ فن نہیں تو کم از کم قدیم ترین نمائندے ضرور ہیں۔ جے پور، بمبئی اور مدراس میں کچھ عرصہ پہلے جو تھوڑا بہت کام ہوا وہ درحقیقت مقامی مدرسوں میں ملتان اور ہالا کے ظروف سازوں کی مدد سے ہوا۔ دہلی اور خورجہ میں انہی کاریگروں کے خاندان کی متفرق شاخیں بکھری ہوئی ہیں جو کسی قدر روغنی اینٹوں کا کام کرتی ہیں لیکن زیادہ مقدار میں نہیں۔

اس سرسری تاریخی جائزہ کے بعد آیئے ہم سفال گری پر تفصیلی نظر ڈالیں۔ اس صنف کی تین اقسام ہیں۔ ایک عام یعنی سادہ، ہنڈولے کے سرخ برتن جو عام استعمال میں آتے ہیں مثلاً صراحیاں، بھگونے، پیلے، مرتبان، رکابیاں، ہنڈیاں وغیرہ۔ یہ ہر جگہ بڑی مقدار میں بنائے اور برتے جاتے ہیں کیونکہ یہ بہت سستے بھی ہوتے ہیں اور کارآمد بھی۔ ان کے بعد روغنی برتنوں کا نمبر آتا ہے جو پنجاب اور سرحد میں بالعموم استعمال کئے جاتے ہیں۔ مثلاً پیلے، ہنڈیاں اور کٹورے، حقے کی چلمیں اور فرشیاں۔ یہ سب بڑی محکم بنی ہوتی ہیں اور ان کو دیکھ کر نفاست و نازکی کے بجائے قوت کا احساس ہوتا ہے۔ ان سب پر نیلا یا سبز روغن ہوتا ہے۔ ان کے ڈیزائین آزادانہ ہیں یا ان پر صرف نقش مڑھ دئے جاتے ہیں اور سانچوں ہی سے ٹیڑھے میڑھے کھنڈ الو بنا دئے جاتے ہیں۔ ان دونوں روغنی اور سادہ چیزوں کی اعلیٰ صورتیں بھی ہیں جو صرف آرائشی ضرورتوں کے لئے کام میں آتی ہیں۔ روغنی چیزوں کا مرکز بہاولپور ہے اور سادہ مال ملتان اور ہالا میں بنتا ہے۔ تیسری قسم چینی کے برتنوں کی ہے جو موجودہ مانگ کو پورا کرنے کے لئے بنائے جاتے ہیں۔ یعنی چاء کے برتن اور ہر قسم کی طشتری تھالیاں وغیرہ۔ ان کا مرکز گجرات ہے۔ سیالکوٹ اور گوجرانوالہ دو اور مرکز ہیں۔ کراچی میں ایک بہت بڑا جدید کارخانہ بھی قائم کیا گیا ہے۔ اس میں نئی وضع کی مشینیں نصب کی گئی ہیں اور اس کی بنیاد سائنٹیفک اصولوں پر رکھی گئی ہے۔

پاکستان میں روزمرہ کی ضروریات کے لئے مٹی کے برتنوں کا استعمال عام ہے۔ بالخصوص بڑے بڑے گول مٹکے یا گھڑے اور پانی ٹھنڈا رکھنے کے لئے صراحیاں۔ مٹی کے برتن دوسری ضرورتوں کے لئے بھی کام میں لائے جاتے ہیں مثلاً دودھ رکھنے یا اُبالنے کے لئے مٹکے، دہی جمانے کے لئے چھینٹے پیندے کی صحنکیں، آٹا گوندھنے کے کونڈے اور کونڈیاں، وضو کے لئے لوٹے وغیرہ۔ فیرنی جمانے کے لئے سکوریاں بھی بنائی جاتی ہیں تاکہ اس میں سوندھا پن پیدا ہو جائے۔ گھٹیا ہوٹلوں میں ایسے خوانچے کھانا کھانے کے لئے کام میں لائے جاتے ہیں مگر کھانے کے بعد انہیں پھینک دیا جاتا ہے۔ اچار مربّے اور گرم دودھ ہمیشہ مٹی کے آبخوروں میں ہی دیا جاتا ہے۔ سندھ میں آم چھوٹی چھوٹی ہنڈیوں میں بھی بند کر کے منڈی بھیجا جاتا ہے۔ اور مٹی کا بہت بڑا آرائشی حقہ بھی جو بھاری بھرکم لیمپ اسٹینڈ سے ملتا جلتا ہوتا ہے، برتا جاتا ہے۔ پنجاب میں بادام گھوٹ کر ٹھنڈائی بنانے کے لئے بڑی بڑی مضبوط کونڈیاں بنائی جاتی ہیں۔ غریب دہقانی کھانا پکانے کے لئے بھی مٹی کی ہنڈیاں ہی استعمال کرتے ہیں۔

ہر گاؤں اور شہر میں کمہار رہتے ہیں جو ان برتنوں کو تیار کرتے ہیں۔ یہ اسقدر سستے ہوتے ہیں کہ کمہاروں کو ان کے جلد جلد اور بڑی تعداد میں بنانے کا فن سیکھنا پڑتا ہے تاکہ وہ اپنی روزی کما سکیں۔ معمولی صراحی بنانے کے لئے بھی کتنے ہی مراحل طے کرنے پڑتے ہیں۔ پہلے چاک پر دونوں گول

حصوں کا ڈول بنایا جاتا ہے، پھر انہیں سانچوں میں بھر کر جانے کے لئے رکھ دیا جاتا ہے۔ اوپر کے سانچے میں وہ بیل بوٹے ہوتے ہیں جن پر مٹی

ٹھوپنے سے صراحی کی سطح پر ایسے ہی بیل بوٹے ابھر آتے ہیں۔ اسکے بعد اوپر کا حصہ نچلے حصہ پر جما کر پانی سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ صراحی کا کچا گینڈا باہر نکال لیا جاتا ہے اور پھر اس کے نیچے پینڈی اور اوپر گردن جوڑی جاتی ہے۔ آخر میں پوری صراحی کو بھٹے میں رکھ کر پکاتے ہیں لیجئے آپکی صراحی تیار ہے، قیمت صرف چار آنے!

اس قسم کے بہترین کاریگروں کو دیکھنے کے لئے بہاول پور جانا ضروری ہے۔ اس صنعت کے یہاں تین اہم مرکز ہیں۔ بہاول پور شہر، نامے والی، اور ڈیرہ نواب صاحب۔ آخر الذکر شہر بہترین کاریگروں کا گھر ہے مجھے یہاں کے ایک بہت بڑے صناع کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ اسکے صحن کے فرش پر کچی صراحیاں ہی صراحیاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ پتلی پتلی گردن والی ہلکی پھلکی صراحیاں جو ابھی تو بہت کمزور تھیں لیکن پک جانے کے بعد شیشے کی طرح سخت ہو جائیں گی ــ بعض صراحیاں دوہری دیوار کی تھیں، اندرونی دیوار میں پانی رہتا ہے اور بیرونی دیوار پر نقش ونگار بنائے جاتے ہیں۔ ایسی کاغذی پتلی دیوار پر بیل بوٹے بنانا اور صراحی کو بچانا صرف ایک ماہر کاریگر ہی کا کام ہے جو شاید دنیا بھر میں اپنی مثال آپ ہو۔ جب صراحی پک کر تیار ہو جاتی ہے تو بڑی سخت اور گٹھی ہوئی ہوتی ہے۔ ہموار سطح نہایت ملائم، رنگ بہت پاکیزہ اور خوش منظر ہلکا سرخ جو مصور اپنی رنگین پنسلوں میں برتتے ہیں اور اوپر نہایت ہلکی چکنی چکنی روغنی تہ۔

جب میں اللہ بخش سے باتیں کر رہا تھا تو اس نے بڑی بے تکلفی سے کچے برتن پر نقاشی شروع کر دی۔ بیل بوٹوں میں ایک دلکش لہراؤ تھا اور ان ہوں میں ایسی استادانہ مہارت جسے دیکھ کر آدمی دنگ رہ جائے۔ اس نے مجھے بتایا کہ میاں، ماہر کاریگر بننے کے لئے ساری عمر کا ریاض چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ ظروف ساز کے بچے بچپن ہی سے اس کی مشق شروع کر دیتے ہیں۔ اسکے بیس سالہ لڑکے نے چاک پر مجھے اپنی مہارت کا کرشمہ بھی دکھایا اور دیکھتے ہی دیکھتے کتنی ہی صراحیاں، گلاس اور رکابیاں بنا ڈالیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ اللہ بخش کے ساتھ اس کے صرف دو بیٹے کام کرتے ہیں اور اس کام میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ ایک دو آدمی اُجرت پر بھی کام کرتے ہیں مگر صرف ابتدائی کام۔ فن کے استادانہ گُر انہیں نہیں بتلائے جاتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اللہ بخش صرف دو سو روپے ماہوار ہی کما سکتا ہے اور اس سے صرف ایک بھٹہ ہی کام کر سکتا ہے۔ اس کی مصنوعات کی مانگ اس قدر ہے کہ ابھی ایک بھٹی کھلنے نہیں پاتی کہ دوسرے کے گاہک موجود ہوتے ہیں اسے کسی دلال یا خوردہ فروش کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ اسکی

بہترین صراحی کی قیمت دس روپے ہے۔ اس کے بنائے ہوئے برتنوں میں یونانی ظروف کا سا مکمل سڈول پن اور تراش کی بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ لیکن اسلامی ظروف سازی میں جو رنگینی، ملسی دلفریبی اور حسنی کیفیت پائی جاتی ہے وہ ان میں نہیں ہے۔ رکابیوں کے گرداگرد جو حلقے بنائے جاتے ہیں وہ کسی قدر سانچوں ہی سے ڈھل کر نکلتے ہیں۔ تقریباً تمام چیزوں پر سفید اور ہلکے سرخ رنگ کے نفیس بیل بوٹے بھی بنائے جاتے ہیں۔

بہترین روغنی سامان کا مرکز سندھ ہے۔ جہاں اعلیٰ درجہ کے برتن بہت سے گاؤں اور شہروں جیسے سہوان، بلڑی، خیرپور اور سب سے بڑھ کر ہالا میں تیار ہوتے ہیں۔ جہاں برتنوں کی دوکانیں اپنے بے پناہ رنگوں سے عجب بہار دیتی ہیں۔ ہالا میں اچھے اچھے کاریگر موجود ہیں لیکن صرف ایسی اینٹیں تیار کرتے ہیں جنکی مانگ زیادہ ہے۔ لاہور اور کراچی کے عجائب گھروں میں مجھے ہالا کے ظروف کے پچاس اور پچھتر برس پرانے بعض نمونے بھی دکھائی دئے جن کو دیکھ کر کاریگروں کی غیر معمولی مہارت و صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہاں کا مشہور کاریگر نور محمد ہی تھا، جس نے مسٹر جے، ڈبلیو، ٹیری کے ساتھ بمبئی میں جاکر "گجرات سکول آف آرٹ" کے منقش روغنی ظروف تیار کرنے میں مدد دی۔

آرائشی روغنی کام کا ایک اور مرکز ملتان ہے اس کام کو "کاشی کاری" کہتے ہیں۔ لفظ "کاشی" ایران کے شہر کاشان سے نسبت رکھتا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ فن ہمارے یہاں یہیں سے آیا ہے۔ یہ ایک طرح کا روغنی گلی اور چینی ظروف کا کام ہے جس کی روایات آج سے سات سو

سال پرانی ہیں۔ گزشتہ صدی تک یہ کام تقریباً متروک ہو چکا تھا، اور اب بھی ملتان اور ہالا میں زیادہ تر ایسا ہی کام بنتا ہے۔ یہاں کے صناع دیواروں کو آراستہ کرنے کے لئے گہری نیلی اور فیروزی زمین پر نہایت خوبصورت رسمی قسم کے نقش و نگار بناتے ہیں۔ مثلاً گنبدوں کی چوٹیوں کے لئے کلس، مردوں کے لئے مختلف ناپ کے "پینل" یا زائد تختے، طاقوں اور شہ نشینوں کی محرابوں کے لئے جدولیں اور کار وغیرہ۔ رفتہ رفتہ آرائشی ظروف کی مانگ نے ان صناعوں کو ترغیب دلائی کہ وہ اپنے فن کو عام افادی اور آرائشی مقاصد کے لئے استعمال کریں۔ یہ کام سندھ کے کام سے مختلف ہے کیونکہ اس میں صرف دو یا تین رنگوں، زیادہ تر نیلے رنگوں میں روغن یا خام چینی کی زمین پر نقاشی کی جاتی ہے۔ اس کے برعکس سندھ میں روغن کے نیچے رنگین پتلی چکنی مٹی کی تہیں جمائی جاتی ہیں۔ ملتان میں صرف ایک دھات "کوبالٹ" سے حاصل شدہ گہرا نیلا اور تانبے کے آکسائیڈ سے بنا ہوا نفیس فیروزی رنگ ہی برتا جاتا ہے یا کبھی کبھار خاکی اور سبز بھی۔ آنچ ایک ہی وقت دے دی جاتی ہے۔

سندھ میں رنگوں کا انتخاب زیادہ وسیع اور انداز زیادہ قدرتی ہے۔ آجکل ہالا میں جو کام بنتا ہے وہ کچھ بھاری بھرکم اور پرانی وضع کا ہے۔ اس کے مقابلہ پر ملتان کا کام زیادہ صفائی کا حامل، نفیس، سجل اور پرتکلف ہے۔ تاہم کاریگروں کے ان دونوں دبستانوں کے کام میں روپ رنگ کا
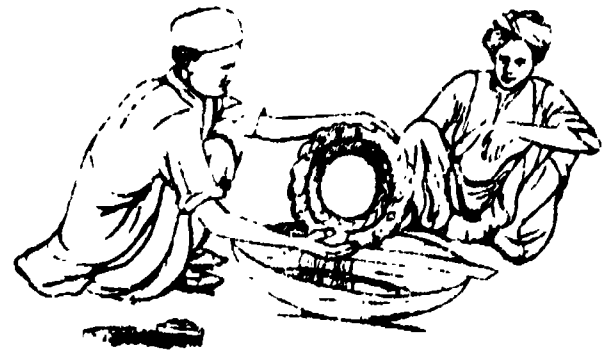
ایک طوفان سا اُٹھتا دکھائی دیتا ہے اور یہ ہمارے وطن کی اُجلی اُجلی روشن روشن فضا کے ساتھ پوری طرح میل کھاتا ہے۔ دنیا کے پرستار اسے بے حد حیرت اور تحسین و ستائش کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ چنانچہ سیوورز (فرانس) کے "قومی سفالیاتی عجائب گھر" میں ملتان کے ایک مقبرہ کا وہ نمونہ محفوظ ہے جسے ایک جدید کاشی کار نے تیار کیا ہے۔

جیسا کہ اس فن کے نمائندوں کو یاد کیا جاتا ہے۔

کاریگروں کا کہنا ہے کہ آج کل گلدانوں کی زیادہ مانگ نہیں۔ کیونکہ اب اتنے غیر ملکی لوگ باقی نہیں رہے جو انہیں نوادر کے طور پر خریدیں اور جو پاکستانی انہیں عام استعمال کے لئے خریدنا چاہتے ہیں اب گجرات کے سفید چینی کے سستے برتن خریدتے ہیں۔ ملتان کی منڈی بھی اس مشینی پیداوار سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ یہاں تک کہ ڈیرہ نواب صاحب جیسی چھوٹی بستی پر بھی اس یورش کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ ٹائلز بھی باہر سے منگائی جا رہی ہیں۔ اگرچہ ایک کاشی کار نے مجھے ایک نہایت عمدہ پتھر چینی کی اینٹ دکھائی جو اس نے کسی مشین کے بغیر بنائی تھی۔

آج کل گجرات، سیالکوٹ اور گوجرانوالہ میں جو چینی کے برتن بنائے جاتے ہیں ان میں فن کی کوئی خوبی نہیں لیکن وہ ایک اہم صنعت ضرور ہیں۔ یہاں کے صناع میانوالی کی سفید مٹی برتتے ہیں، جو پاس ہی دستیاب ہوتی ہے اور اس پر "لیڈ گلیز" چڑھا دیتے ہیں۔ برتنوں کو ۹۰۰ درجہ سے زیادہ آنچ نہیں پہنچائی جاتی، اس لئے یہ اعلیٰ درجہ کے ظروف میں شمار نہیں ہوتے۔ یہ کاریگر جدید مشینری، پلستر کے سانچے اور تیل کی بھٹیاں استعمال نہیں کرتے، بلکہ معمولی چاک، پرانی قسم کی بھٹیاں اور تجربہ و آزمائش کے طریقے سے کام لیتے ہیں اور عام استعمال میں آنے والے کافی اعلیٰ درجہ کے ظروف بنا لیتے ہیں۔ ان کی کامیابی تمام تر ان کی دستی مہارت پر موقوف ہے اور انہیں اپنے طریقوں اور مواد کا ایسا جبلی احساس ہے کہ سفال گری کے ایک کیمیا داں کی رائے میں جتنا کیمیا داں کیمیاوی تجزیہ سے بتا سکتا ہے یہ لوگ محض مٹی کو دیکھ کر یا چکھ کر اس سے بہتر بتا سکتے ہیں کہ ایک اچھی چیز تیار کرنے کے لئے اس میں کون سے اجزا کم اور کون سے زیادہ ہیں۔

صرف کراچی ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں سفال گری کی صنعت کو ایک جدید نوع کے کارخانے کی شکل میں منظم کیا گیا ہے۔ "دی سرامک انڈسٹریز" (لانڈھی) نے بہترین بیرونی مشینری کے ساتھ بہترین مقامی صناعوں کو اپنے کام میں شریک کیا ہے، خواہ وہ کاریگر ہوں یا سائنسداں۔ اب یہ کارخانہ ۲½ ٹن یومیہ کے حساب سے چینی کا سامان تیار کر رہا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ اقدام بہت کامیاب ثابت ہوا ہے۔ (ترجمہ و تلخیص)
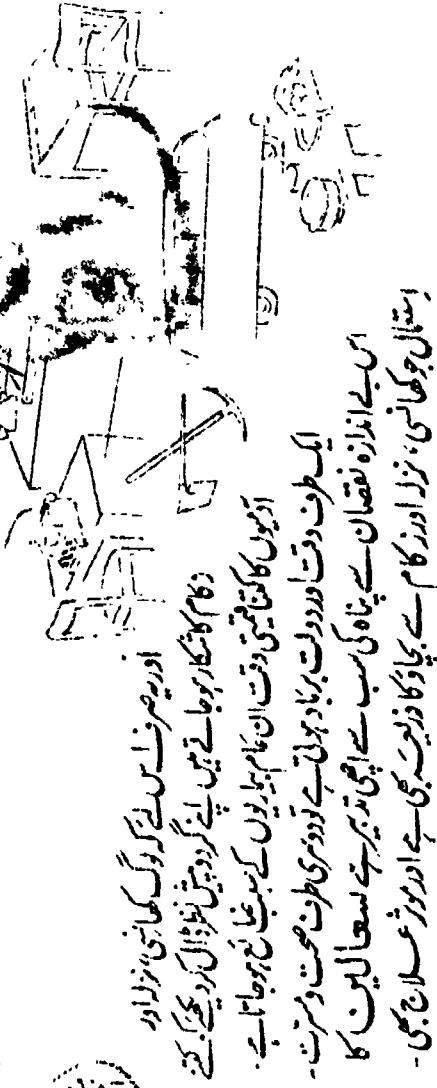
لاکھوں دن کے کام کا نقصان
جناب! میں سخت کھانسی اور زکام میں مبتلا ہونے کی وجہ سے آج دفتر حاضر نہ ہو سکوں گا امید ہے آپ معاف فرمائیں گے۔
اور یہ صرف اس لئے کہ لوگ کھانسی، نزلہ اور زکام کا شکار ہو جاتے ہیں اپنے گرد و پیش نظر ڈال کر دیکھئے کتنے آدمیوں کا کتنا قیمتی وقت ان عام بیماریوں کے سبب ضائع ہو جاتا ہے۔
ایک طرف وقت اور دولت برباد ہوتی ہے تو دوسری طرف صحت و مسرت۔
اس بے اندازہ نقصان سے پناہ کی سب سے اچھی تدبیر ہے سعالین کا استعمال جو کھانسی، نزلہ اور زکام سے بچاؤ کا ذریعہ بھی ہے اور موثر علاج بھی۔
کھانسی، نزلہ اور زکام کی خصوصی دوا
سعالین
گلے اور پھیپھڑوں کی حفاظت کرتی ہے
ٹیوب ۲۰ ٹکیاں — ۸/ آنے
شیشی ۷۵ ٹکیاں — ۱/۴/۰ روپیہ
جار ۴۰۰ ٹکیاں — ۵ روپیہ
ہمدرد
Sualin
UNITED

غزل
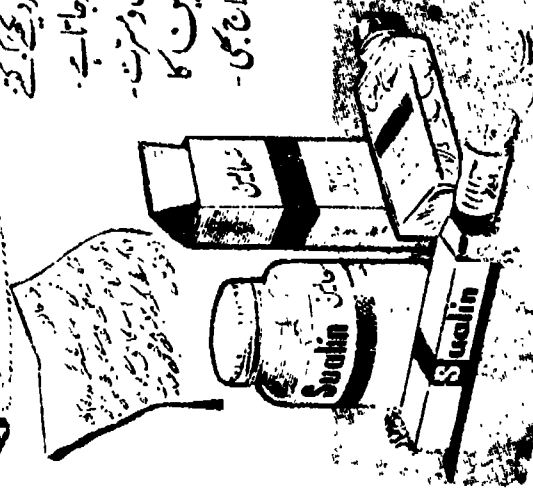
فضل احمد کریم فضلی

ہم تبہ تھے ہی، ہوا کیا گر تباہی بڑھ گئی
آپ کی تو شہرتِ عالم پناہی بڑھ گئی

صرصرِ غم سے نگوں تو کیا بھلا کرتی مجھے
اور بھی کچھ میری شانِ کجکلاہی بڑھ گئی

اور تو کچھ ہو سکا تجھ سے نہ اے عمرِ دراز
ہاں مگر شہرِ تمنا کی تباہی بڑھ گئی

ہو رہے ہیں سرفرازِ دار ناکردہ گناہ
اور بھی اب عزّ و شانِ بیگناہی بڑھ گئی

تجھ سے یہ کس نے کہا تھا آ سیہ بختوں کے گھر
اے شبِ غم! دیکھ تیری روسیاہی بڑھ گئی!

لشکرِ غم نے اُدھر دُنیائے دل تاراج کی
چشمِ پُرنم کی ادھر انجم سپاہی بڑھ گئی

دیکھئے جس کو وہی رسماً بنا ہے خیرخواہ
اس قدر دُنیا میں رسمِ خیرخواہی بڑھ گئی!

اب تو نظروں میں بلائیں زلفِ خوباں بن گئیں
خوش جمالوں کی بدولت خوش نگاہی بڑھ گئی

ڈھل گئی برقِ حوادث قالبِ اشعار میں
اور بھی ان نشتروں کی بے پناہی بڑھ گئی

تم کو فضلی گر اسی میں لطف آتا ہے تو لو
ان نگاہوں کی ادائے کم نگاہی بڑھ گئی!

غزل

حیدر دہلوی

اب کے غضب ہے دل فریب رنگِ فضا چمن چمن
شاہدِ عہدِ گل رہے پا بہ حنا چمن چمن

تجھ سے ہی جوش میں ہے دل تیرے ہی دم سے جزو کل
ردِّ خزاں، فروغِ گل، سایہ ترا چمن چمن

نکلی نہ دل کی آرزو، بادِ سموم سو بہ سو
اور قیامِ رنگ و بو چاہیئے تھا چمن چمن

صبح کو بو بھی تھی ہوا، پردۂ گل بھی چاک تھا
جلوۂ حسن آپ کا چھپ نہ سکا چمن چمن

عہدِ بہار فی المثل غیرتِ محفلِ ازل
کون نہیں ہے آج کل نغمہ سرا چمن چمن

گل بھی شگفتہ وقتِ سیر، بلبلِ زار بھی بخیر
تیری نگاہ کے بغیر بن نہ سکا چمن چمن

آنکھ کو ہلکی سی تپش دل کو سکوں نما خلش
ہوش ربا روش روش روح فزا چمن چمن

صدقے ترے شباب کے کس سے مثال دیں تجھے
نیرِ جمال سے کرے کسبِ ضیا چمن چمن

اب وہ بہارِ گلستاں حیدرِ خستہ تن کہاں
بن کے رہی خزاں خزاں، رہ نہ سکا چمن چمن

غزل

سراج الدین ظفر

ہم دلِ زہرہ وشاں میں خالقِ اندیشہ ہیں
گو خرابا تی سہی جبریل کے ہم پیشہ ہیں

پیروئ واعظانِ شہر میں بزدل ہیں ہم
اور غزالوں کا تعاقب ہو تو شیرِ بیشہ ہیں

اے سبو ہم کو مدارج اور ابھی کرنے ہیں طے
ہم ابھی ذہنِ خداوندی میں اک اندیشہ ہیں

سنگ و خشتِ ناتراشیدہ سے ابھرا خطِ حسن
بادہ خواروں کی نگاہیں ہیں کہ ضربِ تیشہ ہیں

آ ہمارے سائے میں بیٹھ اے غزالِ رہگذار
جو دمیں ہم لوگ نخلِ سایہ دارِ بیشہ ہیں

ہم نے وہ گیسو بھی کھولے ہیں کہ جن کے روبرو
سنبل و ریحاں کنیزانِ خوشامد پیشہ ہیں

کفر کی کچھ کچھ غزالانِ حرم میں بھی ہے بُو
یہ کسی بے باک بت گر کی تراشِ تیشہ ہیں

پیشۂ شوقِ سمن بُویاں کوئی آساں نہیں
ہائے وہ محنت کشانِ شب کہ دل در پیشہ ہیں

زُہد کو ہم ہجو دانِ حلقۂ یارانِ شب
سیم قائل ہیں سرایت کردۂ ہر ریشہ ہیں

ہم نہیں گو کوہکن لیکن ہماری یادگار
وقت کے کوہِ گراں پر کچھ نقوشِ تیشہ ہیں

نخلِ قدِ دوست کیا ہم سے ہو پوشیدہ کہ ہم
بیشۂ تحقیق کے آوارگانِ بیشہ ہیں

ہم وہ نوشاہِ گلستاں ہیں ہمارے ولولے
لالہ و گل میں رواں در ہر رگ و ہر ریشہ ہیں

شرحِ اسرارِ دو عالم ہے ظفرؔ اپنا بیاں
ہم ہیں آئینۂ گل طوطیٔ اندیشہ ہیں

غزل

جگن ناتھ آزاد

کبھی بلندیٔ ذوقِ نظر تک آ پہنچی
کبھی جماعتِ غمِ بال و پر تک آ پہنچی

فغاں کہ مل کے بھی ہم تم اسے نہ روک سکے
شبِ وصال حدودِ سحر تک آ پہنچی

نظر سے بڑھ کے زباں تک کہیں نہ آ جائے
جہانِ دل کی کہانی نظر تک آ پہنچی

ابھی تو دل میں ہے خوابیدہ حسرتِ پرواز
یہی ہوس جو کبھی بال و پر تک آ پہنچی

نظر کی بات تو کچھ اور ہے مگر کیونکر
تری شبیہہ دلِ بے خبر تک آ پہنچی

بھٹک رہی ہے ابھی تک تو آرزو دل کی
اگر کبھی یہ تری رہگذر تک آ پہنچی

غزل

تابشؔ دہلوی

جلوۂ پنہاں مذاقِ حسن کا حاصل سہی
دید کے قابل اگر آنکھیں نہیں ہیں دل سہی

غم سے راحت بیقراری سے سکوں حاصل سہی
درد ہی کا نام عہدِ عاشقی میں دل سہی

عشرتِ غم میں بھی دل کی زندگی ممکن نہیں
ڈوب جانا ہے یقینی، بحر بھی ساحل سہی

دوست تک ہے ماسوائے دوست بھی اک مرحلہ
اِس طلب میں، جادۂ منزل بھی اک منزل سہی

میں تماشا در تماشا چاہتا ہوں دیکھنا
تو تجلی در تجلی دید کے قابل سہی

زندگی ہر لحظہ مجھکو چاہتی ہے مارنا
اب مسیحا کا یہ کہنا ہے کہ ہم قاتل سہی

تابشِ ناشاد اگر یہ دل سلامت ہے تو پھر
رونقِ محفل سہی، ہنگامۂ محفل سہی

غزل

باقیؔ صدیقی

نہ سہی سازِ غم ساز تو ہے
زندگی کا کوئی انداز تو ہے

کچھ گریزاں ہے صبا ہی ورنہ
بوئے گُل مائلِ پرواز تو ہے

بن سکے سُرخیٔ رُودادِ حیات
خونِ دل اتنا پس انداز تو ہے

لبِ خاموش بھی بول اُٹھے ہیں
کچھ نہ کچھ وقت کا اعجاز تو ہے

میری آمد نہ گراں گذری ہو
اِس خموشی میں کوئی راز تو ہے

اُن کی آہٹ ہو کہ دل کی دھڑکن
پسِ پردہ کوئی آواز تو ہے

کس توقع پہ صدا دیں باقیؔ
درِ اربابِ کرم باز تو ہے

غزل

احمد فراز

تم زمانہ آشنا تم سے زمانہ آشنا
اور ہم اپنے لئے بھی اجنبی نا آشنا

راستے بھر کی رفاقت بھی بہت ہے جانِ من
ورنہ منزل پر پہنچ کر کون کس کا آشنا

اب کے ایسی آندھیاں اٹھیں کہ سورج بجھ گئے
ہائے وہ شمعیں کہ جھونکوں سے بھی تھیں نا آشنا

مدتیں گذریں اسی بستی میں لیکن اب تلک
لوگ بیگانے فضا انجان، ہم نا آشنا

ہم بھرے شہروں میں بھی تنہا ہیں جانے کس طرح
لوگ ویرانوں میں کر لیتے ہیں پیدا آشنا

خلقِ شبنم کے لئے دامن کشا صحراؤں میں
کیا خبر ابرِ کرم ہے صرف دریا آشنا

اپنی بربادی پہ ہم خوش تھے مگر وائے فراز
دوست دشمن کا نکل آیا ہے اپنا آشنا

غزل

شیر افضل جعفری

غزل مست و رقصاں گھٹا چاہتا ہوں
جھناں[1] کی بہاریں فضا چاہتا ہوں
پتنگوں کی، بلبل کی، شمعوں کی، گل کی
کہانی کا عنواں ہوا چاہتا ہوں
ہیتواں کے بھیس میں زندگی سے
لبِ آبِ جو کھیلنا چاہتا ہوں
سجل دیس کی نازنیں بوٹیوں کے
ہرے گیسوؤں کی ہوا چاہتا ہوں
کفِ آرزو کے لئے چاندنی سے
بنامِ جمیلاں حنا چاہتا ہوں
مدھر بانسری کے سروں کی زباں میں
غزالوں سے باتیں کیا چاہتا ہوں
جوانی شیشموں کی حسیں ٹہنیوں سے
شرابی دعا چاہتا ہوں

قضا سے کہو راگنی بن کے آئے
کہ میں اس کا منہ چومنا چاہتا ہوں

[1] : چناب

چار بیکار

شفیق شاہ

ہم سب چار تھے۔ میں، شکیل، ریاض اور مظفر اور چاروں بیکار، ہم چاروں کی حالت ایک جیسی تھی۔ چاروں کے کپڑے پھٹے ہوئے، چاروں کی جیبیں خالی اور چاروں کا مقصد بھی صرف ایک ہی تھا — نوکری۔

ہم میں سے تین اپنے قصبے سے مایوس ہو کر شہر آئے تھے مظفر ہمیں یہیں ملا اور ہمارا دوست بن گیا۔ اس سے ہماری ملاقات بڑی عجیب طرح ہوئی۔ ایک مرتبہ کسی اخبار میں ایک کلرک کی آسامی کے لئے جو ایک چھوٹی سی فرم میں خالی تھی اشتہار چھپا میں اور شکیل تو ایسے موقعوں کی تاک میں رہتے ہی تھے، ہم نے فوراً اپنی اپنی درخواست روانہ کی اور جواب کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑے ہی دن گذرے تھے کہ ہماری امید کے برخلاف ہمیں انٹرویو کے لئے بلا لیا گیا۔ چنانچہ مقررہ تاریخ کو، مقررہ وقت سے کئی گھنٹے پہلے ہم گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور پتہ پوچھتے پوچھتے آخر اس بلڈنگ تک جا پہنچے جس میں یہ فرم واقع تھی۔ یہ ایک چھ منزلہ، عظیم الشان عمارت تھی اور جیسا کہ نیچے بیٹھے ہوئے چوکیدار سے معلوم ہوا یہ فرم اس عمارت کی سب سے آخری منزل پر تھی۔ میں نے اور شکیل نے سیڑھیاں چڑھنی شروع کیں لیکن ابھی چوتھی منزل بھی پوری طرح طے نہ ہوئی تھی کہ ایک دبلا پتلا آدمی اوپر سے آتے ہوئے جانے کس طرح ہم سے ٹکرا گیا۔ وہ چوتھی منزل سے آ رہا تھا اور بہت بوکھلایا ہوا تھا — اس نے جلدی سے اسے سنبھالا اور نیچے گرنے سے بچا لیا۔ یہ مظفر تھا۔ جیسا کہ اس نے بتایا وہ اسی فرم سے ناکام و نامراد واپس آ رہا تھا۔ اس نے کہا کہ ایک گریجویٹ کو منتخب کر لیا گیا ہے جس نے صرف ستر روپے ماہوار پر کام کرنے کی پیشکش کو قبول کر لیا تھا۔ باتوں باتوں میں مظفر نے ہمیں بتایا کہ وہ بہار کے ایک اعلیٰ خاندان کا چشم و چراغ ہے اور ڈیڑھ سال سے روزگار کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے۔

"پھر تو آپ ہمارے ہی ساتھی نکلے۔" شکیل نے کہا۔

"ہم بھی یہاں کافی عرصے سے ملازمت کے چکر میں ہیں۔" میں نے وضاحت کی۔

"اوہ . . . . خوب — !" وہ ایک کھوکھلی ہنسی ہنستے ہوئے بولا، "خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔"

"اجی دو نہیں چار کہیے" شکیل نے کہا۔

اس کے بعد مظفر ہمارا دوست ہو گیا اور ہمارے ساتھ ہی رہنے کے لیے چلا آیا۔

ہم سب الگ الگ ایک ٹریجڈی کا شکار تھے۔

شکیل کسی محکمے میں ملازم تھا اور ایک سو بیس روپے ماہوار تنخواہ پاتا تھا۔ وہ وہاں دو سال سے کام کر رہا تھا۔ عنقریب اس کو ترقی ملنے والی تھی اور وہ وہاں دو سال سے کام کر رہا تھا۔ عنقریب اس کو ترقی ملنے والی تھی اور وہ ایک عدد کوارٹر کا مالک بھی بننے والا تھا کہ اچانک تخفیف ایک بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہوئی اور اس کے خوابوں کا محل زمین پر آن رہا۔

ریاض ادنیٰ فلم اسٹوڈیو میں ایک "سب ایڈیٹر" کے فرائض انجام دے رہا تھا اور تھوڑے ہی دنوں میں ڈائریکٹر کے کئے ہوئے وعدے کے مطابق اسے پردے پر آنے کا موقع ملنے والا تھا کہ ایک دن بیٹھے بٹھائے ڈائریکٹر اسے گالی دے بیٹھا اور ریاض نوکری چھوڑ چھاڑ کر چلا آیا۔

مظفر ایک انگریزی فرم میں بطور ٹائپسٹ کام کر رہا تھا اور ڈیڑھ سو روپے ماہوار پاتا تھا۔ اس کے علاوہ اسے اور بھی بہت سی مراعات حاصل

ہیں۔ مثلاً کمپنی کی اسٹیشن ویگن ہی اسے گھر سے دفتر لاتی اور دفتر سے گھر لے جاتی تھی۔ دن میں دو مرتبہ ڈبے کے دودھ کی چائے ملا کرتی جو خاصی زیادہ ہوتی تھی اور چونکہ وہ کام بہت اچھا کرتا تھا اس لئے اس کے افسران اس سے خوش تھے اور اکثر مالی امداد بھی دیدیا کرتے تھے لیکن شومئی قسمت مدا ایک دن سب دفتر والوں کا ڈاکٹری معاینہ ہوا اور مظفر کو ٹی بی کی شروعات کا سرٹیفکیٹ مل گیا اسے ایک ماہ کے "نوٹس کی تنخواہ" دے کر برخاست کر دیا گیا۔

میں ایک بسکٹ فیکٹری میں کلرک تھا اور پچاسی روپے لیتا تھا۔ فیکٹری میں میرے جتنے دوست تھے سب کے سب اتفاق سے معتوب تھے اور میں ان کا حامی بن گیا۔ فیکٹری اونر کو میری یہ بات کھٹکتی تھی کہ میں کیوں انہیں احتجاج کی طرف راغب کرتا ہوں، اس لئے اس نے ایک دن بغیر کسی وجہ کے مجھے نوٹس دیدیا۔

ہم چاروں کی حالت بڑی قابل رحم تھی۔ ہم ایک گنجان آبادی میں ایک پرانی بلڈنگ کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتے تھے۔ اس فلیٹ میں صرف ایک کمرہ تھا جس میں ہم چاروں کا سامان بڑی بے ترتیبی کے ساتھ پھیلا پڑا رہتا۔ ہمارے بوسیدہ بستر، شیونگ کا سامان، کتابیں، رسالے۔ اس کمرے میں صرف ایک ہی بالکنی تھی جس میں ایک ٹوٹی پھوٹی کرسی جانے کب سے پڑی تھی اور جس پر بیٹھ کر شکیل اپنی محبوبہ کی یاد میں لہک لہک کر گایا کرتا۔

وہ اب تک تقریباً درجن بھر لڑکیوں سے عشق لڑا چکا تھا اور ناکام رہا تھا۔

آج کل وہ غزالہ کی آنکھوں کی مستی میں کھویا ہوا تھا۔ غزالہ اس کی رشتہ دار تھی۔ اس کا باپ پنجاب کے کسی چھوٹے سے شہر میں وکالت کرتا تھا اور کافی مالدار آدمی تھا۔ مظفر اپنے بھائی کو جو حیدرآباد میں سندھ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی میں ملازم تھا خط لکھا کرتا۔ پیارے بھائی جان، آپ نے جو تیس روپے بھیجے تھے، وہ ختم ہو چکے ہیں۔ یہاں کراچی میں ہر چیز بہت مہنگی ملتی ہے۔ میں دوپہر کو "ایک روٹی اور ایک سنگل دال" کھاتا ہوں اور رات کو کبھی چاول اور کبھی "ایک تنوری روٹی اور ہاف پلیٹ بھاجی گوشت" مگر پھر بھی وہ تیس روپے جو آپ مجھے مہینہ بھر چلانے کی نصیحت فرماتے ہیں، ایک ہفتے میں ختم ہو جاتے ہیں۔ یقین کیجئے میں نے سگریٹ پینی بہت کم کر دی ہے اور فلمیں دیکھنا تو بالکل ہی چھوڑ دیا ہے۔

یہ سب جھوٹ تھا۔ سفید جھوٹ۔ ہم میں سے کسی کے پاس جب بھی تھوڑے بہت پیسے ہوتے کسی اچھے سے ہوٹل میں جاتے اور خوب خوب کھاتے۔ بڑھیا سگریٹ پیتے اور دل پسند اداکاروں کی فلمیں دیکھتے۔ یہ عموماً اس وقت ہوتا تھا جب مظفر اپنے بھائی کا بھیجا ہوا منی آرڈر وصول کرتا یا مجھے کسی کہانی کا معاوضہ ملتا۔

صبح سویرے ہی شکیل ہم سب کو جگا دیتا۔ ہم بیچ "مون لائٹ ریسٹورینٹ" میں جا کر چائے پیتے، توسٹ کھاتے اور سگریٹیں پھونکتے۔ اس ہوٹل کا مالک غلام حسین ایرانی شکیل کا دوست بن گیا تھا اور ہمیں قرض پر سب چیزیں سپلائی کرتا تھا۔ ہم وہاں دیر تک بیٹھے رہتے اور اخبار میں "ضرورت" کا کالم بڑے غور، بڑی امید کے ساتھ پڑھا کرتے۔ اخبار دیکھنے کے بعد ہم ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے اور شام تک اِدھر اُدھر گھومتے رہتے۔ پھر رات کو مون لائٹ ریسٹورینٹ کے کسی کیبن میں ہماری ملاقات ہوتی۔ سب اپنی اپنی رپورٹ پیش کرتے اور کھانا کھا کر اپنے فلیٹ میں آ کے سو جاتے۔ ہمارے پاس صرف ایک لحاف تھا اور ایک توشک اور ایک پرانا کمبل جس میں جگہ جگہ ننھے ننھے سوراخ تھے اور جس میں سے خارش کے مرہم کی بدبو آتی تھی۔ ریاض کو کراچی آنے کے تھوڑے ہی دن بعد کھجلی ہو گئی تھی۔ ہم نے وہ کمبل اسے دیدیا تھا۔ یہ کمبل مظفر اپنے ساتھ لایا تھا اور لحاف ہم تینوں کی مشترکہ ملکیت تھا۔ اسے ہم استعمال کرتے تھے۔ جس رات سردی زیادہ ہوتی، اس رات ہم ایک دوسرے سے بالکل چمٹ کر سوتے، سوتے کم تھے۔ سونے کا مذاق زیادہ اڑاتے تھے۔ ہوتا یہ کہ ابھی میری آنکھ لگی اور ابھی مظفر نے اپنا بھاری بھرکم پیر میرے اوپر رکھا یا کبھی زیادہ خرمستی سوجھی تو پورا لحاف ہی کھینچ کر لے گئے۔ اب میں پڑا سردی میں ٹھٹھر رہا ہوں۔

"لعنت ہو تم پر خدا کی۔" ریاض کہا کرتا۔ "نہ خود سوتے ہو نہ دوسروں کو سونے دیتے ہو۔ کتنی نیند آ رہی تھی اور کتنا اچھا تھا وہ خواب جو میں دیکھ رہا تھا۔"

"تم ہمیشہ خواب ہی دیکھتے رہو گے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوں گے۔" مظفر شرابیوں ایسی آواز میں کہتا، "اچھا اب سگریٹ نکالو اور نیچے چلو۔"

شکیل سب کو سگریٹ پیش کرتا۔ پھر ہم سب نیچے ریسٹورینٹ میں جا کر بیٹھ جاتے۔ ریاض اپنے اردگرد کمبل لپیٹ لیتا۔ یہ ہوٹل چوبیس گھنٹے کھلا رہتا تھا اور چوبیس گھنٹے بھرا رہتا تھا۔ اس کا ایرانی مالک ہم لوگوں کو دیکھ کر مسکرا دیتا۔ وہ ہم کو باولا سمجھتا تھا اور ہم سے اس طرح بولتا جیسے ہم گونگے بہرے تھے۔ اشاروں سے سمجھا سمجھا کر۔ وہ اپنے ساتھی سے اپنی دیہاتی فارسی میں کہا کرتا: "یہ غریب کہتے ہیں کہ ہم کہانیاں اور شعر لکھتے ہیں۔ کافی پڑھے لکھے ہوں گے"۔ وہ سمجھتا تھا کہ شاید ہم میں سے کوئی فارسی زبان نہیں جانتا لیکن ایک دن جب شکیل نے اسے بتایا کہ اس کی مادری زبان بھی فارسی ہے تو وہ خوشی سے ناچ اٹھا اور ہمارا گہرا دوست بن گیا۔ وہ اکثر ہمیں اپنے یہاں مدعو کرنے لگا۔ عموماً رات کے وقت جب ہم ایک لحاف میں نہ سو سکتے ہم نیچے ہوٹل میں آ بیٹھتے۔ غلام حسین بھی ہمارے پاس ہی آ کر بیٹھ جاتا اور شکیل سے عمر خیام کی رباعیات اور حافظ اور رومی کا کلام سنا کرتا۔ شکیل کی مادری زبان حقیقتاً فارسی ہی تھی۔ وہ افغانی تھا۔ مگر اس کے دادا، پردادا مدت ہوئی ہندوستان میں آ کر بس گئے تھے۔ شکیل لکھنؤ میں پیدا ہوا! وہیں پلا بڑھا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو اس کے گھر میں صرف اس کی ماں، باپ اور بڑا بھائی فارسی بولتے تھے اور وہ بھی بہت ٹوٹی پھوٹی۔ اس میں آدھے سے زیادہ الفاظ اردو کے ہوتے تھے۔ شکیل کو جب یہ احساس ہوا کہ فارسی اس کی مادری زبان ہے تو اس نے اس پر زیادہ توجہ دینی شروع کر دی۔ وہ کافی اچھی فارسی بول سکتا تھا لیکن اس کا تلفظ ٹھیٹھ فارسی زبانوں کی طرح نہ تھا۔ غلام حسین کا ساتھی ایک جوان صحت مند اور خوش شکل آدمی تھا۔ اس کے بال انگلستانیوں کی طرح بالکل سنہرے تھے اور آنکھیں بھوری تھیں اور گالوں پر قدرتی لالی کچھ اس طرح رچی ہوئی تھی گویا مصنوعی سرخی لگائی گئی ہو۔ وہ بھی ہمیں دیکھ دیکھ کر مسکراتا رہتا۔ ہماری لینڈ لیڈی بھی جو گداز بدن کی ایک خوبصورت عورت تھی اور اس کے تمام نوکر، اور تمام پڑوسی اور راہ گیر بھی جو غلطی سے ہماری طرف دیکھ لیتے تھے ہمیں دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ اس شہر میں ایک اچھی بات یہ ہے کہ چاہے آپ برہنہ پھریں کوئی آپ کی طرف دھیان نہ دے گا۔ ہر شخص اپنے خیالوں میں کھویا ہوا ہے۔ کوئی لڑکی بھی آپ کی طرف نظر اٹھا کے نہیں دیکھے گی بقول شکیل کے "لعنت"

ایک دن — ان دنوں ہم یہاں نووارد تھے۔ ہم چاروں نے شام کے وقت میری دیدہ ٹاور سے ایک وکٹوریا کرائے پر لی اور کوچوان سے کہا کہ ذرا ہمیں شہر کی سیر کرا دو۔ وہ سیر کا مطلب جانے کیا سمجھ بیٹھا۔ تھوڑی دیر تک تو ادھر ادھر بازاروں میں گھماتا رہا۔ اس کے بعد وکٹوریا کو ایک سنسان علاقے کی طرف موڑ لے گیا۔ یہ علاقہ پرانی کراچی میں شامل ہے۔ اور نسبتاً سنسان ہے۔ یہاں کی بیشتر آبادی پان فروشوں، دودھ والوں، دھوبیوں اور "چھوٹے چھوٹے" ہوٹلوں کے بڑے بڑے مالکان پر مشتمل ہے۔ ہم چلاتے ہی رہے: ارے بھئی، ہم کو کہاں لئے جا رہے ہو۔ لیکن اس نے ایک نہ سنی۔ ہم سب اپنی اپنی جگہ حیران تھے کہ اس سنسان علاقے میں کیا سیر کی جا سکتی ہے۔ اس نے کہا "بابو صاحب ذرا دیکھو تو سہی"۔ میں نے چاہا کہ میں کوچوان کی غلط فہمی دور کر دوں مگر ریاض نے مجھے روک دیا۔ وکٹوریا ایک تنگ سی گلی میں ایک سہ منزلہ عمارت کے صدر دروازے پر پہنچ کر رک گئی۔ جیسے ہی وکٹوریا رکی ایک بوڑھا آدمی ہانپتا کانپتا نمودار ہوا اور کوچوان سے بولا:

"اب کی تو بہت دنوں بعد آئے دینا۔ خیر تو ہے۔؟"

"ہاں چاچا بس زندہ ہیں"۔ کوچوان نے کہا: "ہمارے خاص آدمی ہیں سمجھے؟"۔

بوڑھا ہمیں اپنے ساتھ لئے مختلف تنگ و تاریک زینے طے کرتا ہوا ایک بڑے ہال میں پہنچا۔ اس میں ایک چھوٹا سا بلب ٹمٹما رہا تھا۔ اس نے ہمیں ایک طرف کھڑا کر کے ایک دروازے پر، جو اندر سے بند تھا، دستک دی۔ تھوڑی بعد دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر کی عورت برآمد ہوئی۔ بوڑھا اس سے کچھ دیر کھسر پھسر کرنے کے بعد نیچے چلا گیا۔ پھر وہ عورت ہماری طرف بڑھی اور بولی:۔

"پسند کر لیجئے"۔

"خوب"، شکیل نے کہا: "جیسے ہم بھیڑ بکریاں لینے آئے ہیں"۔ کسی ایسی جگہ آنے کا یہ اس کا پہلا موقعہ تھا اس لئے وہ وہاں کی باتوں سے ناواقف تھا۔

ادھیڑ عمر کی عورت نے آگے بڑھ کر جلدی سے اس کمرے کا دروازہ کھولا جس میں سے وہ نکلی تھی اور ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔ اندر گھستے ہی آنکھوں میں چکا چوند پیدا ہو گئی۔ یہ کمرہ بجلی کی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ اور اس میں مال ہی مال بھرا ہوا تھا۔ سستا غازہ، سرخی لپ اسٹک وغیرہ۔

"بولئے"۔ ادھیڑ عمر کی عورت بولی: "آپ لوگ کیا سوچ رہے ہیں؟"

میں نے دیکھا کہ شکیل کا چہرہ یک لخت سرخ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکلنے لگیں اور ہونٹ کپکپانے لگے۔ "چلو واپس چلیں۔" اس نے کہا۔ ہم سب واپس آنے کے لئے مڑنے لگے تو وہ عورت بولی:

"ٹھہریئے آپ لوگ یوں نہیں جا سکتے۔ یہاں سے کوئی اس طرح واپس نہیں جاتا۔ آپ کو یہاں کی فیس ادا کرنی پڑے گی۔"

شکیل نے خاموشی کے ساتھ اپنی جیب سے بیس روپے کے نوٹ نکالے اور فرش پر پھینک دیے۔ ادھیڑ عمر کی عورت نے لپک کر نوٹوں کو یکجا کیا اور گنتے ہوئے بولی: "اب آپ لوگ شوق سے تشریف لے جا سکتے ہیں۔"

ہم سب واپس آ کر وکٹوریہ میں بیٹھ گئے۔ کوچوان غائب تھا۔ بہت دیر بعد وہ اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو درست کرتا ہوا ایک کوٹھے پر سے اترا۔ ہمیں دیکھتے ہی اس کا منہ سوالیہ نشان بن گیا۔ "واپس چلو" شکیل نے اسے حکم دیا۔ وکٹوریہ چل پڑی۔ راستے میں کسی نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ سب خاموش رہے اور کچھ سوچتے رہے۔ جب وکٹوریہ فلیٹ پر پہنچی تو میں نے اپنی جیب سے پانچ کا نوٹ نکال کر کوچوان کو دیا اور کہا: "یہ لو تمہاری اجرت۔"

"اور یہ بھی" شکیل نے اس کے پچکے ہوئے گال پر ایک بھرپور تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا: "یہ کافی عرصہ تک یاد رہے گا۔"

کوچوان کی آنکھیں شعلہ بن گئیں لیکن ہم چار تھے اور وہ تنہا تھا۔ اس نے ہلکے سے اپنا گال سہلایا۔ نوٹ کو اپنی واسکٹ کی جیب میں رکھا اور وکٹوریہ پر بیٹھ کر چلدیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ شکیل نے اس کو کیوں مارا ــــ؟

جس رات ہم میں سے کسی کو دوسرے دن نوکری مل جانے کی امید ہوتی تو ہم خوب ادھم مچاتے۔ ناچتے، گاتے۔ ہماری لینڈ لیڈی پہلے تو ہمارے شور و غل پر ناک بھوں چڑھاتی لیکن تنگ آ کر خود بھی ہماری شرارتوں میں شریک ہو جاتی۔ وہ جتنی اچھی تھی، اس کا شوہر اتنا ہی برا تھا۔ آئے دن ان دونوں میں لڑائیاں ہوتی رہتیں۔ اس کا شوہر چاہتا تھا کہ وہ شریف بہو بیٹیوں کی طرح گھر میں بیٹھے اور باہر نکلے تو برقع پہن کر لیکن وہ ایک سرکش عورت تھی۔ سرکش اور آزاد طبع۔ اس کی اپنے شوہر کے ساتھ کبھی نہ بنی۔ مزاجوں کے فرق کے علاوہ۔ اس کا شوہر جتنا غریب تھا وہ اتنی ہی امیر تھی۔ اس کی ایک دو منزلہ عمارت تھی، ایک آٹو رکشا کرائے پر چلتی تھی، ایک چھوٹی سی پان کی دکان تھی، مون لائٹ ریسٹورنٹ کے ملحق، جس پر اس کا چھوٹا بھائی سعید بیٹھتا تھا۔ اپنے اس بھائی کو اس نے اپنی اولاد کی طرح پالا تھا۔ اس کی ماں اس کی شادی کے چند سال بعد ہی مرگئی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ ماں نے اس کی زندگی تباہ کر دی۔ اس کو صرف اس نے ایک ایسے انسان کے پلے باندھ دیا کہ وہ اپنی برادری کا تھا۔ اس لئے آج تک اپنے شوہر کے ساتھ ایک لمحہ بھی خوشی کا نہ گذارا تھا۔ اس کی ماں نے صرف خاندان کی پرانی روایات کی خاطر اس کے جذبات کا گلا گھونٹ دیا۔ اپنی شادی سے ایک دن پہلے اس نے سوچا تھا کہ وہ کہیں بھاگ جائے۔ لیکن وہ وہاں اس کی ماں نہ پہونچ سکے۔ لیکن اس کے پیروں نے اس کی ہمت کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ آخر وہ ایک مشرقی عورت تھی۔ اس کا باپ بھی شیر خوارگی میں چل بسا تھا۔ لے دے کے ایک چھوٹا بھائی تھا جسے اس نے بڑے پیار سے پالا اور جب ذرا ہوشیار ہو گیا تو ہوٹل کا تھوڑا سا حصہ پان کی دکان کے لئے لے لیا۔ اس کا شوہر چاہتا تھا کہ وہ اپنی تمام دولت اس کے قدموں میں ڈال دے جسے وہ اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھی۔ وہ اپنا روپیہ بنک میں رکھنے کے حق میں نہ تھی۔ کہتی کہ بینکوں کا کیا اعتبار؟ اس نے اپنی تمام دولت اپنے گھر کے کسی کونے میں چھپا کے رکھ چھوڑی تھی۔ زیادہ حصہ مختلف زیوروں کی شکل میں تھا۔ اس کو زیوروں کا بیحد شوق تھا۔ وہ سونے سے لدی رہتی تھی۔ اس کی برادری میں جب کبھی کوئی تقریب ہوتی اور اسے بلایا جاتا تو وہ اپنا تمام زیور پہنتی۔ بلا مبالغہ اس کے زیورات کا بوجھ اس کے جسم کے بوجھ سے زیادہ ہی ہوتا تھا۔ دولت کی ریل پیل اور جنسی غیر آسودگی نے اسے بہت چڑچڑا بنا دیا تھا: وہ اپنے نوکروں کو بری بری گالیاں بکتی اور اپنے کرایہ داروں کو بے دھڑک، جو جی میں آتا سناتی۔ پورے محلے میں کوئی اس سے خوش نہیں تھا اور بعض سرپھرے تو اسے قتل تک کرنے کی دھمکیاں دے چکے تھے۔ لیکن ہم چاروں کو اس کی خاص عنایت حاصل تھی حالانکہ یہ حقیقت تھی کہ ہم اسے کچھ زیادہ تنگ کرتے تھے۔ کبھی وہ سو رہی ہوتی اور ہم باجا بجانا شروع کر دیتے۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی اٹھ بیٹھتی اور وہیں سے آوازیں لگاتی: "کیوں رے شکیل، کے بچے تو باز نہیں آئے گا۔ ٹھہر جا میں آتی ہوں۔" پھر وہ آتی اور آ کر بجائے ہم پر ناراض ہونے کے ہماری ہلچل کو دیکھ میں شریک ہو جاتی۔ وہ خوشی کی بھوکی تھی، محبت کی۔ ہم سب اسے

سیٹھانی کہتے تھے۔ وہ اس خطاب سے بہت خوش تھی۔ وہ ہمارے ساتھ گھنٹوں ناچتی گاتی رہتی۔ ہم رمی کھیلتے، پیسے کے دو پائنٹ، اور اس سے پندرہ بیس روپے جیت لیتے۔ لیکن جب وہ ہمارے پیسے جیت جاتی تو کھیل کے اختتام پر واپس کر دیتی۔ شکیل اس کا منظور نظر تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ اکثر مولوی ملاؤں کے پاس لے جاتی اور اس کی نوکری کے لئے دعا کراتی۔ وہ تعویذ گنڈوں کی بڑی قائل تھی اور اب تک تقریباً پچیس مولویوں اور زندہ پیروں سے اپنے یہاں بچہ پیدا ہونے کے لئے تعویذ لے چکی تھی۔ کبھی کبھی شکیل اس سے کہتا: "سیٹھانی تم تو بلا وجہ اپنا پیسہ برباد کر رہی ہو۔ ارے ڈاکٹر سے علاج کراؤ۔" تو وہ کہتی "اے نہ ایسا نہ کہو۔ اللہ کے کلام میں بڑی برکت ہوتی ہے۔ اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں اور یہ ڈاکٹر موئے تو لوٹنے کھسوٹنے کے ہیں ––"

وہ اکثر رات کو بھی ہمارے کمرے میں چلی آتی۔ ہمارے پاس چارپائیاں یا کرسیاں تو تھیں ہی نہیں ہم اسے اپنے پاس ہی بیٹھ جانے کی دعوت دیتے اور وہ بغیر کسی تکلف کے ہمارے بستروں پر دراز ہو جاتی۔ ایک دن اس کے شوہر نے شکیل کو سر بازار پکڑ لیا اور بولا "دیکھو جی میں تمہارا اپنی بیوی کے ساتھ اتنا ربط برداشت نہیں کر سکتا –– اپنے آپ کو درست کر لو ورنہ میں گھر سے نکال دوں گا۔" گھر تو سیٹھانی کا تھا شکیل نے ایک دن یہی الفاظ سیٹھانی سے کہہ دیئے۔ بس پھر کیا تھا وہ گھمسان کا رن پڑا کہ توبہ ہی بھلی۔ ہاتھا پائی کی نوبت آ گئی۔ اور وہ بولی: "کھون پی جاؤں گی۔ مجھ پہ شک کرتا ہے!" شکیل جلدی سے بھاگا ہوا گیا اور اس نے بیچ بچاؤ کروایا۔ سیٹھانی کا غصے سے برا حال تھا۔ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ اس کی ململ کی قمیص جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی اور اس کا گورا گورا جسم جھلک رہا تھا۔ اس دن ہمیں احساس ہوا کہ وہ اتنی عمر رسیدہ نہیں ہے جتنا کہ ہم اسے سمجھتے تھے –– اس کے شوہر نے پھر کبھی ہمارے تعلقات پر اعتراض نہیں کیا ––

اس رات سوتے وقت شکیل نے مجھ سے کہا: "سیٹھانی بہت اچھی ہے۔"

"–– تو پھر ہم کیا کریں؟" کونے میں سے ریاض کی آواز آئی۔

"وہ ہم سے کتنی محبت کرتی ہے۔" شکیل بولا: .....

"خاص طور سے تم سے –– ٹھیک ہے نا!" ریاض نے کہا: "اچھا اب سو جاؤ۔ صبح جلدی اٹھنا ہے۔"

سیٹھانی بدستور ہمارے یہاں آتی رہی اور برابر ہماری دلچسپیوں میں شریک ہوتی رہی۔ وہ ہم سب سے یکساں سلوک کرتی تھی لیکن شکیل سے یہ ذرا زیادہ مانوس تھی۔ اپنے ساتھ اکثر بازار لے جاتی اور بہترین ہوٹلوں میں چائے پلواتی اور جب اس کے پاس سگریٹ ختم ہو جاتے تو وہ ہمارے کمرے کی بالکنی کے اوپر جھک کر اپنے بھائی کو آواز دیتی: "ارے سعید ایک دو پیکٹ کیپسٹن کے بھیجنا۔" شکیل بھی اس کا ہر حکم بجا لاتا۔ میں کبھی کبھی اسے چھیڑنے کی غرض سے سیٹھانی کی برائیاں شروع کر دیتا تو وہ بگڑ جاتا اور کہتا: "انسان کی برائیوں کو بھول جاؤ، اس کی اچھائیوں کو دیکھو۔ اگر وہ ایک کام برا کرتی ہے تو دو کام اچھے بھی کر دیتی ہے۔ ابھی فلاں دن تمہارے پاس سگریٹ نہیں تھے تو اس نے نیچے سے تمہیں پورا ایک پیکٹ کیپسٹن کا منگا کے دیا تھا اور اس سے پہلے ایک مرتبہ جب تمہیں بخار ہو گیا تھا۔ تو وہ تمام رات تمہارے سرہانے بیٹھی تمہارا سر دباتی رہی تھی ––"

ہماری زندگی بڑی یکسانیت کے ساتھ گزر رہی تھی۔ روز صبح کو ہم "مون لائٹ ریسٹورنٹ" میں جا کر چائے پیتے اور ٹوسٹ کھاتے۔ روز ہم نوکری کی تلاش میں لارنس روڈ، بندر روڈ، میکلوڈ روڈ اور صدر کے علاقے میں مارے مارے پھرتے۔ روز شام کو ہماری ملاقات مون لائٹ ریسٹورنٹ کے کسی کیبن میں ہوتی، جہاں سے ہم سیدھے اپنے کمرے میں آتے اور پڑ کر سو جاتے۔ اتوار کا دن البتہ ہم گھر پر ہی گزارتے تھے۔ اس دن ہم دیر تک سوتے اور جب جاگتے تو خوب ادھم مچاتے۔ ریاض ماؤتھ آرگن بجاتا، میں گاتا، شکیل ڈانس کرتا۔ مظفر کو ناچنا آتا تھا نہ گانا اس لئے وہ امام ڈانسر کے فرائض انجام دیتا تھا۔ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر سیٹھانی بھی ہمارے یہاں چلی آتی۔ پھر رمی اڑتی یا فلش اور جو جیتتا وہ مٹھائی منگاتا۔ ہم سب شہنشاہوں کی طرح رہتے۔ ہزاروں فکر ہوتے ہوئے بھی ہمیں کسی بات کی فکر نہ تھی۔ چھ مہینے سے سیٹھانی نے فلیٹ کا کرایہ نہیں مانگا تھا۔ تین مہینے ہو گئے تھے کہ ایرانی نے بل کی ادائگی کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ سیٹھانی اور غلام حسین کے علاوہ اور جتنے قرضدار تھے وہ بھی بیچارے کبھی تقاضہ

کرنے نہیں آتے تھے۔ ایک بشیر صاحب تھے، ہمارے پڑوسی کے کسی دفتر میں بطور خزانچی ملازم تھے۔ ان سے ہم تقریباً ساٹھ روپے قرض لے چکے تھے اور اس خدا کے بندے نے کبھی بھول کر بھی ہم سے تقاضہ نہیں کیا تھا۔ اگر کبھی ان سے کہا بھی گیا کہ: بھائی صاحب ہمیں بےحد افسوس ہے کہ آپ کا قرضہ ابھی تک ادا نہیں ہو سکا۔ وہ دراصل ہمیں نوکری......

"ارے کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ وہ کہا کرتے: بھئی آپ کا اور ہمارا معاملہ الگ تھوڑا ہی ہے۔ ضرورت ہو تو..... اور بھی لے لیں"۔

ایسے موقع سے ہم لوگ پورا پورا فائدہ اٹھاتے تھے۔ ریاض تھوڑے دن کے وقفے کے بعد بشیر کو خط لکھتا:

"جناب بھائی صاحب۔ دام ظلکم

امید ہے آپ معہ بھابی صاحبہ و بچوں کے بخیریت ہوں گے۔ اس وقت آپ کو تکلیف دینے کی وجہ یہ ہے کہ مبلغ دس روپوں کی سخت ضرورت آپڑی ہے۔ شکیل کو کل سے تیز بخار ہے۔ ڈاکٹر نے اس کے لئے کونین کے انجکشن تجویز کئے ہیں۔ لہٰذا براہ مہربانی حامل رقعہ ہذا کے ہاتھ مبلغ دس روپے روانہ فرما دیں عین نوازش ہوگی۔ یہ دس روپے بھی آپ کے پچھلے قرضے کے ساتھ ادا کر دیئے جاویں گے"

اور حامل رقعہ دام لئے چلا آتا۔ ہم بریانی کھاتے اور کیپسٹن کے سگریٹ پیتے۔ یوں کئی مہینے گذر گئے۔

غزالہ کبھی کبھی شکیل کو خط لکھتی رہتی تھی۔ وہ خط کچھ عجیب قسم کے ہوتے تھے۔ ان میں القاب ہوتا تھا نہ بھیجنے والے کا نام۔ سوائے چند آڑی ترچھی سطور کے جو ایک صاف کاغذ پر کھنچی ہوتی تھیں اور بس۔ شکیل نے اس کے تمام خطوں کو بہت سنبھال کر رکھ چھوڑا تھا اور اکثر فرصت کے اوقات میں انہیں دوبارہ سہ بارہ پڑھا کرتا تھا۔

ایک دن سہ پہر کے وقت میں تھکا ہارا بالکنی میں پڑی ہوئی آرام کرسی پر دراز تھا کہ میں نے دیکھا شکیل دور سے بھاگا چلا آ رہا ہے۔ اسکے ہاتھ میں ایک چاک شدہ لفافہ تھا۔ میں سمجھا شاید کہیں سے میرے لئے منی آرڈر آ گیا لیکن اس نے کہا:

"ارے سنتے ہو، غزالہ آ رہی ہے غزالہ۔ اپنا علاج کرانے میں اسے لینے اسٹیشن جا رہا ہوں"

"منہ کھولے کیا دیکھتے ہو کمرہ ٹھیک کر لو"۔ وہ باہر ہی باہر چلدیا۔ شام تک غزالہ واقعی پہنچ گئی۔

شکیل اسے اسٹیشن سے سیدھا کمرے پر لے آیا۔ غزالہ کے ساتھ اس کا چچا بھی تھا۔ وہ کسی اچھے ہوٹل میں ٹھہرنا چاہتے تھے لیکن شکیل نے سیٹھانی سے کہکر، ان کے لئے ایک بڑا کمرہ خالی کروا لیا۔ جو سیٹھانی کے پاس تھا۔ شکیل نے جلدی جلدی ان کا سامان اس کمرے میں منتقل کر دیا۔ مظفر اور ریاض کسی دوکان سے دو لوہے کی چارپائیاں کرائے پہ لے آئے۔ ایک چھوٹی سی ڈریسنگ ٹیبل سیٹھانی سے مانگ لی گئی۔ غزالہ شکیل کے لئے بہت ساری چیزیں لائی تھی: دو تین ٹھنڈے سوٹ جو اس کے باپ کے جسم پر اب تنگ ہو گئے تھے۔ کچھ پرانی ٹائیاں، کنگھا شیشہ، دو تین قسم کے انگریزی تیل اور اسی طرح کی ایک دو چیزیں اور۔ شکیل کو سب سے زیادہ خوشی سوٹ پاکر ہوئی۔ اس نے اسی شام نہا دھو کر ایک سوٹ زیب تن کیا اور ایک شوخ رنگ کی ٹائی کا پھندا گلے میں لٹکا دیا۔ سوٹ پہن کر وہ خاصا معقول آدمی معلوم ہونے لگا۔ سیٹھانی بار بار کسی بہانے سے ان کے کمرے میں ہو آتی کبھی چائے دینے، کبھی پانی اور کبھی یہ پوچھنے کہ انہیں کسی بات کی تکلیف تو نہیں ہے۔ جیسا کہ مجھے دو تین روز غزالہ کے ساتھ رہ کر پتہ چلا۔ وہ ایک بیمار تنک مزاج لڑکی تھی اور کم بولتی تھی۔ شکیل کہتا تھا کہ اس کی عمر بیس برس ہے اور پہنیں لیکن میرے اندازے کے مطابق وہ پچیس برس سے کم نہ ہوگی۔

شکیل چند ہی روز میں کچھ کا کچھ ہو گیا۔ اب وہ روز خوشبو ملانے لگا اور روز نہانے لگا۔ وہ غزالہ اور اس کے چچا کے ساتھ اسی کمرے میں سوتا تھا۔ منہ اندھیرے ہی وہ نیچے سے غزالہ کے نہانے کے لئے پانی لاتا اور شلوار میں کمر بند ڈالتا۔ نہا دھو کر وہ سب ناشتہ کرتے اور اس کے بعد سیر و تفریح کے لئے سڑکوں سڑکوں نکل جاتے۔ اجنبی آدمی کے لئے اس شہر میں بڑی کشش ہے۔ شکیل نے ان کے اصرار پر انہیں ایک ایک تفریح گاہ دکھائی اور ہر بڑے ہوٹل میں لے گیا۔ ان کی بیشتر شامیں وہیں گذریں۔ پہلے پہل تو غزالہ کا چچا ہر وقت اور ہر جگہ غزالہ کے ساتھ رہتا تھا لیکن جب اسے یقین ہو گیا کہ شکیل بڑا شریف لڑکا ہے تو وہ اپنے وقت کا بیشتر حصہ کمرے میں گذارنے لگا۔ شکیل نے اب غزالہ کو سینما بھی لے جانا شروع کر دیا۔ دونوں رات گئے واپس آنے لگے۔ غزالہ نے آتے ہی شہر کے ایک معقول ڈاکٹر کو دکھا دیا تھا۔

اس نے مکمل آرام اور پرہیز کا مشورہ دیا تھا لیکن غزالہ اس کے بالکل برعکس عمل کر رہی تھی۔ وہ دن بھر شکیل کے ساتھ گھومتی پھرتی۔ جو جی میں آتا کھاتی۔ اور رات کو بارہ ایک بجے کے قریب سونے کے لئے لیٹتی۔ نتیجہ یہ کہ وہ پہلے سے زیادہ بیمار ہوگئی اور آخر پلنگ سے جا لگی۔ غزالہ کا چچا اس غیر متوقع افتاد سے بوکھلا گیا۔ اس نے گھبرا کر غزالہ کے باپ کو تار دے دیا اور تین چار دن کے اندر اندر ہی وکیل صاحب معہ اپنی شریک حیات کے کراچی پہنچ گئے۔ انہوں نے جو دیکھا کہ ان کی لڑکی ایک ذہنی سی جگہ پڑی ہوئی ہے تو بہت غصہ آیا اور انہوں نے اپنے بھائی کو آڑے ہاتھوں لیا۔ ان کے بھائی نے اپنی گلو خلاصی کے لئے تمام الزام شکیل کے سر تھوپ دیا۔ وکیل صاحب شکیل پر بھی بہت بگڑے۔ وہ ویسے بھی شکیل سے خوش نہیں تھے اور اسے لاپروا، لاابالی اور بے فکرا ایسے ناموں سے یاد کرتے تھے۔ سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ اس نے ان کی اچھی خاصی لڑکی کو بیمار بنا دیا۔ انہوں نے اسی دن ایک اچھی سی آبادی میں ایک اچھے سے ہوٹل میں اپنے قیام کا بندوبست کیا اور غزالہ کو لے کر وہاں چلے گئے۔ اب شکیل ڈر کے مارے غزالہ سے ملنے بھی نہ جا سکتا تھا نہ ٹیلیفون کر سکتا تھا کہ کہیں وکیل صاحب ہی سے ٹکر نہ ہو جائے۔ کئی مرتبہ جانے کی کوشش کی لیکن ہمت نہ ہوئی۔ ڈر تھا کہ وکیل صاحب رہی سہی عزت بھی خاک میں نہ ملا دیں۔

تقریباً ایک ہفتے بعد ڈاک کے ذریعے غزالہ کا ایک مختصر سا خط ملا جس میں اس نے لکھا تھا: ہم لوگ واپس جا رہے ہیں۔ میں وقتی طور پر اچھی ہوگئی ہوں۔ ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق پاپا جلد از جلد میری شادی کر دینا چاہتے ہیں: ان کا کوئی بھانجا یا بھتیجا ہے جو حال میں یورپ سے واپس آیا ہے اور کسی اچھے عہدے پر فائز ہے۔ اس لئے رخصت — شاید اب ہم کبھی نہ مل سکیں۔

خط پڑھ کر شکیل کی عجیب حالت ہوگئی۔ دم بخود سا رہ گیا۔ بخار چڑھ آیا۔ میں فوراً سیٹھانی کے پاس گیا اور اسے تمام حالات بتائے۔ وہ بھی پریشان ہو کر سیدھی میرے ساتھ چلی آئی۔ شکیل نیم بیہوشی کے عالم میں پڑا تھا۔ سیٹھانی نے اپنے دوپٹے کے پلو سے اس کا چہرہ صاف کیا اور اس کی پیشانی کو ہلکے ہلکے دبانے لگی۔ ہم تینوں — میں، ریاض اور مظفر مصلحتاً نیچے آ کر ریسٹورینٹ میں بیٹھ گئے۔

اسی رات — قطعی غیر متوقع طور پر — مجھے معروف مل گیا۔ میرا بچپن کا دوست۔ وہ ایک دکان پر کھڑا سگرٹ لے رہا تھا۔ میں نے دیکھتے ہی پہچان لیا اور پیچھے سے جا کر اسے اپنی باہوں میں جکڑ لیا۔ معروف نے گھبرا کر پیچھے دیکھا مجھے پا کر خوشی کا ایک زوردار نعرہ بلند کیا۔ وہ میرا بہترین دوست تھا۔ ہم نے اپنا بچپن ساتھ گذارا تھا اور لڑکپن بھی۔ معروف ایک امیر باپ کا بیٹا تھا۔ اس نے دسویں کے بعد تعلیم کو خیرباد کہہ دیا اور تجارت کی طرف رجوع ہو گیا۔ میں آگے پڑھتا رہا۔ پھر تقسیم ہو گئی۔ میں پاکستان چلا آیا اور معروف ہندوستان ہی میں رہ گیا۔ اور اس وقت پورے چار سال کے بعد مجھے ملا تھا۔ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ باتوں باتوں میں جب میں نے اسے بتایا کہ میں ان دنوں بے کار ہوں تو اسے بہت دکھ ہوا اور اس نے کہا: کاش تم سے کچھ دن پہلے ملاقات ہو گئی ہوتی۔ خیر تم کل میرے پاس آ جانا میں تمہیں کسی کے پاس بھیجوں گا۔ یہاں تمباکو کی ایک بہت بڑی کمپنی ہے جس میں میرا ایک دوست منیجر ہے۔ وہ تمہاری مدد کر سکے گا"

میں نے معروف کے لئے چائے منگوائی۔ وہ اس سے پہلے بھی پی چکا تھا لیکن میری دل شکنی کا خیال کرتے ہوئے اس نے وہ پیالی بھی حلق میں انڈیل لی۔ میں نے اس کا تعارف ریاض اور مظفر سے کرایا جن سے مل کر وہ بہت خوش ہوا۔ پھر اس نے مجھے اپنا پتہ بتایا اور چلا گیا۔

دوسرے دن میں نے اپنے میلے کپڑوں کو ایک ایک کر کے استری کیا۔ کند بلیڈ کو گھس گھس کر اس سے شیو بنایا، جوتوں پر پالش کی اور معروف سے ملنے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ اس کا مکان کچھ ایسا دور نہ تھا۔ آدھے گھنٹے کی پیدل مسافت طے کرنے کے بعد میں نے اسے ڈھونڈ لیا۔ وہ اس وقت اپنے کمرے کی بالکنی میں کھڑا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی، پرخلوص مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ نیچے اتر آیا اور مجھے اپنے کمرے میں لے گیا۔ یہاں میز پر بیٹھ کر اس نے اپنے دوست مسٹر خان کو خط لکھا اور مجھے یقین دلایا کہ میں ضرور ملازم ہو جاؤں گا اور یہ کہ مجھے وہاں بہت سے فائدے رہیں گے: ۱۔ ڈیڑھ سو روپے ماہوار تنخواہ ملے گی۔ ۲۔ مہینے میں پچیس پیکٹ مفت ملیں گے۔ ۳۔ اوور ٹائم ملے گا۔ ۴۔ بونس ملے گا۔ ۵۔ کمپنی کی بس مجھے دفتر سے گھر لایا لے جایا کرے گی۔ وغیرہ وغیرہ۔

میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ سامنے اپنا مستقبل

جگمگاتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میں نے فوراً سوچا کہ تنخواہ کے ڈیڑھ سو روپوں میں سے تیس روپے ماہوار تو ایرانی کو کھانے کے دیدیا کروں گا اور آٹھ روپے مکان کے کرائے کے۔ پچاس روپے ماہوار کے کپڑے بنایا کروں گا اور باقی جو بچے گا اس میں سے کچھ پس انداز کیا کروں گا اور کچھ سیر و تفریح پر خرچ کیا کروں گا۔

خلاء کی گھنٹوں کی مسافت منٹوں بلکہ سکینڈوں میں طے کرتا ہوا میں خان کے پاس پہنچا۔ اور اسے وہ پرچہ جو معروف نے دیا تھا پیش کیا۔

خاں صاحب گو مسلمان تھے مگر شکل و صورت، وضع قطع سے نیم یوروپین معلوم ہوتے تھے۔ ڈھیلا ڈھالا پتلون، آدھی آستین کی قمیص۔ اس پر ایک شوخ رنگ کی ٹائی بندھی ہوئی۔ ہالی وڈ کے ایکٹروں کی طرح بنے ہوئے بال اور منہ میں ایک موٹا سا سگار۔

انہوں نے عام منیجروں کی طرح مجھ سے سوال کیا:

"آپ کی تعلیم۔ ؟"

"بی۔ اے۔"

"پہلے کہیں کام کیا ہے۔ ؟"

"جی ہاں۔"

"کتنے عرصے۔ ؟"

"دو برس۔"

"ٹائپ آتا ہے؟"

"جی ہاں۔"

"کس رفتار سے ٹائپ کر سکتے ہیں؟"

"آجکل صرف پچیس الفاظ ایک منٹ میں ٹائپ کر سکتا ہوں۔ کیونکہ آؤٹ آف پریکٹس ہوں۔"

"اچھا۔" خاں صاحب نے ارشاد فرمایا: "آپ کل آئیے اور اپنے ساتھ تعلیم، عمر، چال چلن، ملازمت اور ٹائپنگ کا سرٹیفکیٹ لانا نہ بھولئے۔ ہمارے یہاں فی الحال ایک ٹائپسٹ کی ضرورت ہے۔ کل آپ کا امتحان لے لیا جائے گا۔ اگر آپ اس میں کامیاب ہو گئے تو ہم آپ کا میڈیکل ایگزامینیشن کرا دیں گے۔ کل معائنہ ہو گیا تو پرسوں آپ کا تقرر کر دیا جائے گا۔ کرنا ہی پڑے گا بھئی آخر آپ ہمارے دوست کے دوست ہیں۔"

"بہت اچھا۔" میں نے مودبانہ کہا

مجھے قوی امید تھی کہ میرا تقرر ہو جائے گا۔ لہذا میں نے بڑی دوڑ دھوپ کے بعد وہ تمام سرٹیفیکیٹ حاصل کر لئے اور دوسرے دن پھر خان کے پاس جا پہنچا۔

خان اس وقت اپنی خوبصورت میز پر جھکا ہوا کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ میں جا کر اس کے عین مقابل کھڑا ہو گیا۔ خان نے مجھے دیکھ لیا تھا لیکن اس نے ظاہر کرنا چاہا جیسے وہ میری آمد سے بے خبر ہے۔ وہ دیر تک کاغذ پر قلم چلاتا رہا اور جتنی دیر وہ لکھتا رہا میں کرسی کا سہارا لئے کھڑا رہا۔ بڑی دیر کے بعد خان نے اپنی نظریں اٹھائیں اور کہا: "اوہ آپ آ گئے۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ آج آپ کا کام نہ ہو سکے گا۔ آج میں بہت مصروف ہوں، آپ کل آئیے۔"

میں کل پھر گیا لیکن بدقسمتی سے جیسا گیا تھا ویسا ہی لوٹ آیا۔

خان نے کہا: "ہماری کمپنی کا ڈاکٹر چھٹی پر چلا گیا ہے اور شاید دو تین دن بعد واپس آئے۔ لہذا آپ چار پانچ روز اور انتظار کیجئے اور پھر آ جیے۔" میں خان سے کہنا چاہتا تھا کہ میں بہت دور سے آتا ہوں۔ آتے جاتے تھک جاتا ہوں۔ مجھے ایک آخری تاریخ دیدی جائے تاکہ میں روز روز کی تکلیف سے بچ جاؤں۔ لیکن اس دن خان کا موڈ بہت بگڑا ہوا تھا۔ اس نے میری موجودگی میں کئی بار اپنے چپراسی کو ڈانٹا اور ڈرائیور کو گالیاں دیں۔ اس لئے میں نے اس سے کچھ نہ کہا۔ میں اسے سلام کر کے واپس آنے لگا تو اس نے کہا: "گھبرائیے مت آپ ملازم ہو جائیں گے" اور میں ایک آس، ایک امید لئے چلا آیا۔

شکیل، ریاض اور مظفر خوش تھے کہ اب میں نوکر ہو جاؤں گا۔ شکیل غزالہ کو بھی بھول گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کی مستی کو بھی، اس کے نازک نفیس جسم کو بھی، وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ غزالہ عنقریب کسی اور کی ہو جائیگی اور پھر وہ دونوں کبھی نہ مل سکیں گے۔ وہ خوش تھا اور پرامید۔

ایک دن کٹا، دو دن کٹے۔ تیسرے دن دوپہر کے وقت میں کمرے میں پڑا بے خبر سو رہا تھا کہ کسی نے مجھے جھنجھوڑ ڈالا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ شکیل تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پوسٹ کارڈ تھا جس پر میرا نام ٹائپ کیا ہوا تھا۔ شکیل کے چہرے پر معمول سے زیادہ خوشی دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ یہ کارڈ کیا پیغام لے کر آیا ہے۔ میں نے جلدی سے عبارت پر نظر ڈالی۔ یہ میرا تقرر نامہ تھا جو میکلوڈ روڈ کی ایک فرم

مجھے بھیجا تھا۔ اس فرم نے تقریباً پچیس دن ہوئے میرا انٹرویو لیا تھا۔ مجھے کوئی امید نہ تھی کہ اتنے دنوں بعد مجھے بلا لیا جائے گا۔ خط کا مضمون کچھ اس طرح تھا۔

"آپ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ کمپنی نے آپ کو اپنے یہاں ملازم رکھ لیا ہے۔ آپ کو سو روپے ماہوار ملیں گے اور الاؤنس جن کے آپ حقدار ہوں گے۔ اگر آپ کو ملازمت درکار ہے تو فوراً رپورٹ کریں۔"

خط پڑھ کر میں عجیب شش و پنج میں پڑ گیا۔ ایک طرف ڈیڑھ سو روپے تھے اور سگریٹ کے پیسے اور بونس وغیرہ اور دوسری طرف صرف سو روپے تھے۔ صرف سو روپے۔ دیر تک بڑی الجھن میں پھنسا رہا۔ اور آخر بڑے غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ تمباکو کمپنی والی نوکری بہتر ہے بہ نسبت اس سو روپے والی ملازمت کے جہاں نہ سگریٹ ہیں نہ اوور ٹائم نہ بونس۔

شکیل نے مجھے خاموش دیکھ کر پوچھا

"کیا سوچ رہے ہو۔؟"

"سوچ رہا ہوں" میں نے کہا: "کہ اب کیا کروں۔ خان نے پختہ وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے اپنی کمپنی میں ملازم کرا دے گا۔ اور تم جانتے ہو اُدھر ڈیڑھ سو روپے ملیں گے اور یہاں صرف سو اور ترقی کی کوئی امید نہیں۔ کوئی "چارم" نہیں۔"

"تم تو گدھے ہو" شکیل نے کہا: "ایسے موقع روز روز نہیں ملا کرتے جاؤ اور جا کر تقرری کا خط لے لو۔ خان کا اعتبار مت کرو۔ کیا پتہ وہاں کام بنے بھی یا نہیں۔"

"ایسا نہ کہو۔" میں نے اسے روک دیا۔ ایسا نہیں ہوگا۔ خان ایسا ویسا آدمی نہیں ہے کمپنی میں اس کی بڑی قدر ہے وہ ڈیڑھ ہزار روپیہ مہینہ تنخواہ پاتا ہے معلوم ہے۔؟"

"جیسی تمہاری مرضی۔" شکیل نے برا سا منہ بنا کر کہا: "ویسے اپنی تو رائے یہی ہے کہ تمہیں یہ سنہری موقعہ نہیں کھونا چاہیئے۔"

میں نے وہ کارڈ اسی وقت نذر آتش کر دیا۔!

میں چار دن بعد پھر خان کے پاس پہنچا۔ ڈاکٹر آ گیا تھا۔ خان نے مجھے ایک چٹ دی جس نے مجھے ڈاکٹر سے متعارف کرایا۔ میرا ڈاکٹری معاینہ کیا گیا اور میں فِٹ قرار دیا گیا۔ اب صرف اتنی کسر تھی کہ جنرل منیجر میری درخواست پر اپنی منظوری دیدے۔ اس کے لئے خان نے مجھ سے کہا کہ میں کل دوپہر کو اس سے آکر ملوں۔ اس نے کہا: ہمارا جنرل منیجر بڑا شریف اور رحمدل آدمی ہے لہٰذا مجھے قوی امید ہے کہ وہ اپنی منظوری دیدے گا۔ چنانچہ میں خوشی خوشی گھر لوٹ آیا اور گھر آکر میں نے یہ مژدہ جانفزا شکیل، مظفر اور ریاض کو سنایا۔ وہ بھی مارے خوشی کے دیوانے سے ہو گئے۔ اس رات ہم سب نے مل کر ایک عظیم الشان جشن منایا جس میں سیٹھانی اور بھائی بشیر کے علاوہ اور بھی بہت سے پڑوسی شریک ہوئے۔ رات گئے تک خوب گہما گہمی رہی۔ میں بھی خوش تھا کہ اب تمام تکلیفوں سے چھٹکارا مل جائے گا، ایرانی سے قرض کی درخواست بھی نہیں کرنی پڑے گی اور زندگی کے بگڑے ہوئے سنور جائیں گے۔!

دوسرے دن میں صبح سویرے ہی اٹھا۔ ہم سب نے نیچے جا کر چائے پی اور بہت سارے ٹوسٹ کھائے۔ سگریٹ کی پھیا دی۔ خوبصورت اور مہربان ڈبیاں ختم کیں۔ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ آج ہم میں سے کسی نے بھی اخبار دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی اور نہ اس کے متعلق کچھ سوچا۔ ایک بجے کے قریب، دوپہر کے کھانے کے بعد میں شکیل، ریاض اور مظفر سے رخصت ہوا، وہ سب مجھے ٹرام تک رخصت کرنے آئے اور جب ٹرام چلی تو انہوں نے ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے خدا حافظ کہا اور دعائیں دیں۔ ٹھیک دو بجے میں خان کے پاس تھا۔ خوشی سے میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ میں گویا آسمان کی سیر کر رہا تھا لیکن خان نے مجھے ایک دم اتنی بلندی سے زمین پر لا پٹکا۔ اس نے بڑا رونکھا سا منہ بنا کر، بڑے درد بھرے لہجے میں کہا: "میں نے آپ کا کیس جنرل منیجر کو پیش کیا تھا۔ وہ کہتے ہیں ٹائپسٹ رکھنے کی ابھی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے بڑا افسوس ہے کہ آپ کو ناکامی اٹھانی پڑی۔"

میرے ہاتھ پیروں کا دم نکل گیا۔ میں جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ کائنات اندھیرے میں ڈوب گئی اور تیزی سے چکرانے لگی۔

یہاں سے مایوس ہونے کے بعد میں سیدھا اس سڑک پر پہنچا جہاں دوسری فرم کا دفتر واقع تھا جس نے مجھے بلایا تھا۔ اس کے منیجر سے ملا۔ میں نے اس سے بڑی آنسوؤں بھری آواز میں کہا "مجھے آپ کا لیٹر مل گیا تھا۔ میں فوراً حاضر ہوتا مگر میں بیمار ہو گیا تھا۔

میں بستر مرگ پر پڑا تھا۔ میں ایک قدم بھی نہیں چل سکتا تھا، اس لئے میں جلدی نہ آسکا۔ مگر اب میں بالکل اچھا ہوں اور کام کر سکتا ہوں۔"

"مگر اب ہمارے یہاں کوئی کام نہیں ہے۔" اس نے کہا: "مجھے افسوس ہے مسٹر آپ بہت لیٹ ہوگئے۔ ہمیں ایک کلرک کی سخت ضرورت تھی، آپ نہیں آئے تو ہم نے ایک دوسرے آدمی کو رکھ لیا۔ کاش آپ جلدی آسکتے۔"

بہت اداس، بہت اکتایا ہوا جب میں گھر لوٹا تو شکیل، ریاض اور مظفر دوڑے دوڑے آئے اور خوش خبری سننے کا انتظار کرنے لگے۔

"سنو۔ میں نے کہا: نوکری نہیں ملی اور نہ ملے گی۔ اس لئے میں یہ شہر کراچی چھوڑ رہا ہوں۔"

سب کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔

میں کمرے میں آکر اپنے بستر پر گر پڑا اور اس وقت سوائے رونے، اپنی تیرہ بختی پر آنسو بہانے کے مجھے کچھ اور نہ سوجھا۔ دوسرے دن جب میں اپنا سامان باندھ رہا تھا، شکیل ڈھیلے ڈھالے قدم رکھتا ہوا میرے پاس آیا اور بولا:

"ہم سب بھی تمہارے ساتھ چلیں گے۔"

سیٹھانی کو جب ہمارے جانے کی بابت معلوم ہوا تو وہ بہت اداس ہوگئی اور رنجیدہ اور اس کی گلابی گلابی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے ہمیں روکنا چاہا مگر اب ہم نہیں رک سکتے تھے۔ اس نے کہا: "تم سب بہت اچھے ہو اور مجھے بے حد عزیز ہو۔ کاش۔۔۔ کاش مجھے لکھنا آتا تو میں تم چاروں کی کہانی لکھتی۔" اس سے آگے وہ کچھ نہ بول سکی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ٹوٹ کر اس کے چہرے پر بکھر گئے تھے۔ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ اس نے ہم سے فلیٹ کا کرایہ نہیں مانگا۔ بلکہ اپنی جیب سے ایرانی کا بل بھی ادا کر دیا اور بشیر کا قرضہ بھی۔

اور پھر — پھر اس تاریک، سوگوار رات میں ہم نے شہر کو خیرباد کہدیا۔

"ماہ نو" میں ریویو کے لئے مطبوعات کی دو کاپیاں ارسال فرمائیں۔ (ادارہ)

بہتر ہے
MEDIUM
CAPSTAN
Navy Cut
CIGARETTES
10 CIGARETTES

ترقی کی فضاؤں میں

[illegible]

مغربی پاکستان میں روئی کی فصلوں پر ہوائی جہاز کے ذریعہ کیڑے مار دوا چھڑکنا
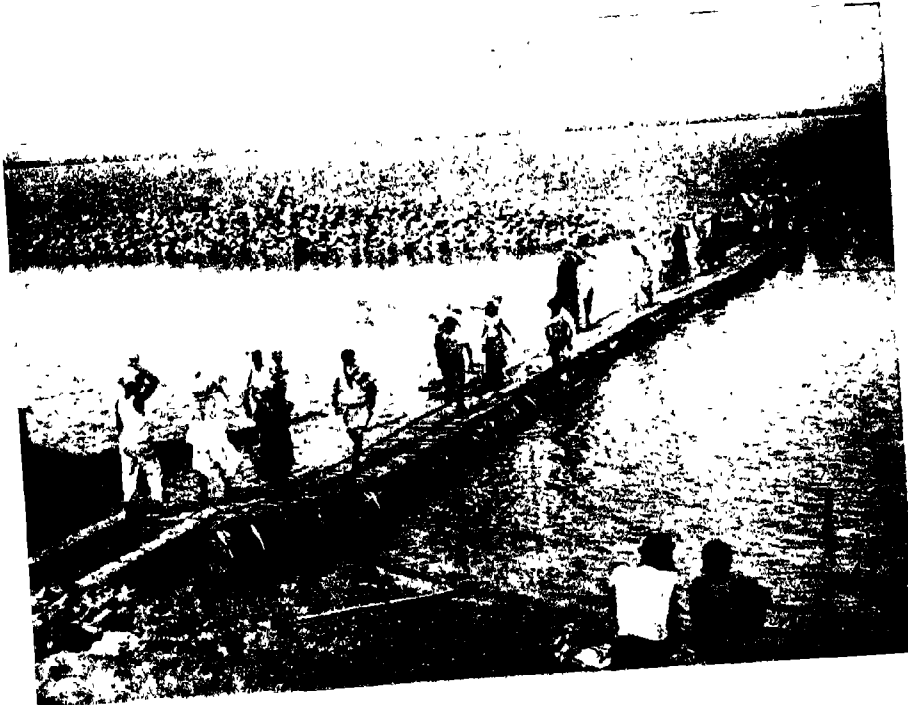
بندرگاہِ کراچی پر

ابوالاثر حفیظ

غلام عباس

فضل احمد کریم فضلی

ممتاز حسین

روش صدیقی

اصغر بٹ

یوسف ظفر

حمید کاشمیری

وحیدہ نسیم

ماہِ نو

قیمت آٹھ آنے

جنوری ۱۹۵۶ء

ل جماعتی کشمیر کانفرینس
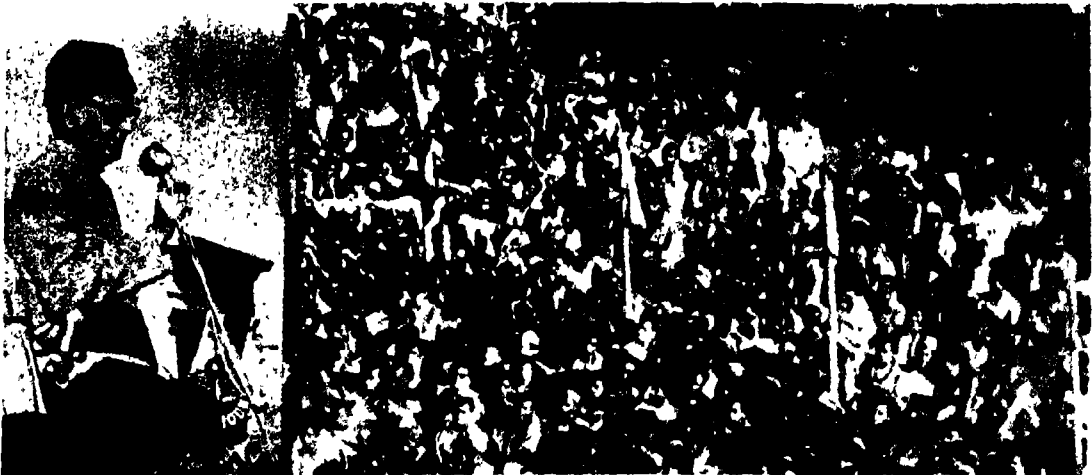
کراچی

جلد ۸ شمارہ ۱۰ جنوری ۱۹۵۶ء

مدیر:۔ رفیق خاور
نائب مدیر:۔ ظفر قریشی

سرورق:۔ مصورہ "بوستان سعدی" کا ایک ورق "مسجد قاہرہ" بہزاد

سالانہ چندہ:۔ پانچ روپے آٹھ آنے۔ فی کاپی ۸ر

آپس کی باتیں

وہ جذبات جو کشمیر کے لئے ہمارے سینوں میں سلگ رہے ہیں شعلہ زن ہیں، کیونکہ ہم پاکستانیوں کو اس زمین کے ساتھ ایک رابطۂ خاص ہے۔ یہ سرزمین ہم سب کو محبوب ہے کیونکہ یہ ہمارے ہی بھائیوں کا وطن ہے جن کے ساتھ ہمارا رشتۂ اخوت ناقابلِ شکست اور لازوال ہے۔ ان کا سکھ ہمارا سکھ ہے اور ان کا دکھ ہمارا دکھ۔ اگر زمانے کی چیرہ دستیوں نے اس سرزمین کا جامۂ زیبائی چاک کر دیا ہے تو ہم بھی اس کے درد آشنا ہیں اور چارہ سازی کے کچھ فرائض ہم پر بھی عائد ہوتے ہیں۔ ہم میں سے کس کو وہ دن یاد نہیں جب موجودہ شکست و ریخت کے آغاز میں اس سرزمین نے ہمیں اپنی طرف بلایا تھا اور ہم نے اس کی آواز پر لبیک کہی تھی۔ اس ولولۂ عظیم کی یاد آج تک ہمارے دلوں میں محفوظ ہے اور اس ولولۂ تازہ کی ہنگامہ آفرینی بھی دنیا نے دیکھ لی جو حالیہ کشمیر کانفرنس کے موقع پر رونما ہوا، جس کی بعض تصاویر اس شمارے میں پیش کی گئی ہیں۔ ہمارے وزیرِ اعظم عزت مآب چودھری محمد علی نے ہم سب کے دلی احساسات ہی کی ترجمانی کی جب انہوں نے فرمایا:-

"ہم ایک انتہائی اہم مسئلہ پر غور کرنے کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے حل پر اس علاقہ کے امن و استحکام کا دار و مدار ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو پاکستان اور بھارت کے دوستانہ اور خوشگوار تعلقات کے لئے کلیدی حیثیت رکھتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بنی نوعِ انسان کی بہبود کا مسئلہ ہے۔ اس سے ریاست جموں و کشمیر کے چالیس لاکھ باشندوں کی قسمت اور ان کا حقِ خود ارادیت وابستہ ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ نہ صرف کشمیر کے چالیس لاکھ باشندوں بلکہ اس علاقے کے کروڑوں افراد کی قسمت کا انحصار اس مسئلہ پر ہے۔

یہ تنازعہ دنیا کے سامنے ایک عظیم اخلاقی مسئلہ پیش کرتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ کیا باشندگانِ کشمیر کو وہ حقِ خود ارادیت استعمال کرنا چاہیئے جو ان کا پیدائشی حق ہے؟ کیا انہیں آزادانہ استصواب کے ذریعہ اپنی ریاست کے الحاق کے سوال کا فیصلہ کرنے کی اجازت دینا چاہیئے؟ خود بھارت انہیں اجازت دینے کا وعدہ کر چکا ہے۔ اس وعدہ کو پورا کرنا ہے . . . میں باشندگانِ کشمیر کو یقین دلاتا ہوں کہ ان کے حقِ خود ارادیت کی اس جد و جہد میں ... گے

اگر محبت قربانیاں چاہتی ہے، تو ہم پاکستانی ان سے کبھی دریغ نہ کریں گے۔ ہماری نگاہیں مستقبل کے افق پر جمی ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ ہماری امیدوں کی سحر، جو ہمارے بھائیوں کی امیدوں کی سحر بھی ہے، ضرور طلوع ہو گی۔ اور اگر ہمارا جذبۂ شوق سلامت ہے تو امید ہے کہ یہ دن زیادہ دور نہیں ؎

چلے چلو جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا

مغربی پاکستان کے ہر گوشہ میں ایسے بزرگ پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے ظاہر کے بجائے باطن اور قال کے بجائے حال پر زور دیا ہے۔ خواجہ غلام فرید انہی مردانِ حق پرست کے سلسلہ کی ایک کڑی ہیں۔ ایک عارفانہ لے کے ساتھ لطیف احساس، مقامی رنگ، اور زندگی کے عینی مشاہدات۔ یہ سب مل کر ان کے کلام میں عجیب کیف و مستی کا عالم پیدا کر دیتے ہیں۔ اس شمارہ میں ہمارے ایک مضمون نگار نے حضرت کی ایک کافی پر دلچسپ تبصرہ کیا ہے اور اس کے صوری و معنوی محاسن کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

میاں محمد بخش مصنفِ "سیف الملوک" ایک اور اہلِ دل ہیں جنکی منتخب ابیات اس شمارہ میں تبرکاً پیش کی جا رہی ہیں۔ ان سے اندازہ کیا جا سکے گا کہ مغربی پاکستان کے مختلف گوشوں سے کس طرح ایک ہی نوائے سرمدی بار بار بلند ہوتی رہی ہے۔

جب ابوالاثر حفیظ ۲۲ - ۲۴ء میں نئے نئے تجربے کر رہے تھے تو انہوں نے بہت سی نامکمل یا اپنے خیال میں غیر مطبوع کوششیں یونہی رکھ چھوڑی تھیں۔ ان کی تجربہ گاہ میں ایسے بہت سے پرزے بکھرے ہوئے ہیں، جن کو انہوں نے اپنے مجموعوں میں شامل نہیں کیا لیکن بہر حال دلچسپی سے خالی یا خوبی سے عاری نہیں۔ "ماہِ نو" کے پچھلے شمارہ میں ان کا ایک ایسا ہی فن پارہ، جو کسی چابکدست نے اڑا لیا تھا، شائع کیا گیا تھا۔ اب کے ہم نے خود ہی چیرہ دستی کر کے ایک اور پارہ اڑا لیا ہے جو اس شمارہ میں پیش کر رہے ہیں۔

"غمِ دل" کا ستایا اور "وحشتِ دل" کا مارا مجاز چل بسا۔ افسوس ہے کہ کچھ عرصہ سے کوئی مہینہ کسی نہ کسی سانحے سے خالی نہیں گزرتا۔ مجاز کی زندگی ایک عرصے سے محض زندگی پر ایک طنز ہو کر رہ گئی تھی، وہ ہمارے جواں سال اہلِ کمال کے لئے تصویرِ عبرت بنے پھرتے تھے۔ آخر موت نے اس تصویر پر بھی پردہ ڈال دیا۔ مجاز سراپا افسانہ بن گئے تھے، اب خواب ہو گئے ؎

مرگِ مجنوں پہ عقل گم ہے میرؔ
کیا دوانے نے موت پائی ہے

لیکن اردو نظم کے ایک مختصر مگر پُرخروش دور میں مجاز کے دم سے کافی رونق ... گی ...

حالی بہ حیثیتِ نقّاد

ممتاز حسین

حالی سرسید تحریک کے ایک اہم رکن تھے اور ان کی تحریر و تقریر اس تحریک کے اغراض و مقاصد کو آگے بڑھانے کے لئے وقف تھی، اس لئے جب تک ہمیں سرسید تحریک کے اغراض و مقاصد اور حالی کے تاریخی رول کا علم نہ ہو، صرف "مقدمۂ شعر و شاعری" کے منطقی تناقضات سے بچانے سے ہم ان کی تنقیدی صلاحیت اور ان کے فلسفۂ تنقید کے بارے میں کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکیں گے۔ اگر شعر و شاعری کا کوئی مجرد معیار ہاتھ آجائے جس سے واقعتاً شعر و شاعری کو تاریخ سے علیحدہ کیا جا سکے تو یقیناً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے ادب میں صرف دو ہی شاعر یعنی میر و میرزا پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن چونکہ اس قسم کے مجرد معیار کا ہاتھ آنا محال ہے، اس لئے ہم تاریخی عنصر کی اہمیت کو بھی ماننے پر مجبور ہیں اور تاریخی عنصر کو ملحوظ رکھئے تو زندگی کے بندھے ٹکے معمولات اس قدر اہم نہیں ہیں جتنا کہ زندگی کے نئے روز و شب کا پیدا ہو جانا۔ میر و میرزا کی شاعری ایک خود مختار سوسائٹی کے کلچر کی شاعری تھی، خواہ وہ سوسائٹی اندرونی انتشار ہی میں مبتلا کیوں نہ ہو۔ لیکن حالی کے زمانے کی تاریخ اس سے مختلف ہے۔ انگریزی حکومت کے تسلط کے بعد سوسائٹی کی خود مختاری ختم ہو چکی تھی۔ ایک نیا متوسط طبقہ ترقی کی شمع لئے ہوئے سرمیدان تھا۔ وہ اپنے تاریخی حدود اور اقتصادی ضرورتوں کے تحت اپنے قدیم کلچر پر بھروسہ کرنے اور اسے آگے بڑھانے کے بجائے حکمراں قوت سے سمجھوتہ کر لینے ہی میں فائدہ دیکھتا تھا (اور سمجھوتہ ہمیشہ دو پارٹیوں کے درمیان ہوتا ہے) لیکن چونکہ مغربی کلچر سے مشرق کی اجنبیت شدید تھی ——— کیونکہ مشرق مغرب کی کلچرل ترقی سے تقریباً پانچسو سال سے کٹا رہا، اس لئے ابتدائی منزلوں میں وہ سمجھوتہ سیاسی رہا نہ کہ کلچرل ——— کلچرل سمجھوتہ تو اس وقت پیدا ہوا جب کہ قدیم نظام تعلیم اور نصاب تعلیم کے ختم ہونے کے بعد وہ ایک نئے نظام تعلیم اور نئے علوم سے دوچار ہوئے۔ متوسط طبقے کی اقتصادی ضرورتیں اسے اس نئی تعلیم کو قبول کرنے کے لئے اکسا رہی تھیں، لیکن اس کا پرانا کلچر مغرب کے اس نئے کلچر سے برسرپیکار تھا۔ یہ کشمکش مذہب اور سائنس کی کشمکش بن کر سامنے آئی، لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد سمجھوتہ ہو گیا۔ مذہب کو سائنس کی زد سے بچانے کی بھی ضرورت تھی۔ سرسید نے جدید علم الکلام (تفسیر القرآن) اسی ضرورت کے تحت وضع کیا تھا۔ اس جدید علم الکلام کا کام حالی کے الفاظ میں اسلام کو، جس کا ماخذ صرف قرآن مجید تھا، عین قوانین فطرت کے مطابق ثابت کرنا تھا، نہ کہ اٹھارویں صدی کے فرانسیسیوں کی طرح قرون وسطیٰ کی منقولات اور اسناد پرستی کے خلاف کسی مہم کو چلانا۔ یہی سبب ہے کہ نیچر کا لفظ سرسید اور حالی کے یہاں ان معنوں میں نہیں آیا جن معنوں میں یورپ کے نیچریوں یعنی میکانکی مادہ پرستوں کے یہاں آیا ہے۔ اب یہ بات دوسری ہے کہ اس زمانے کے مولوی صاحبان نیچر کا لفظ ہی برداشت نہیں کر پاتے تھے۔

جب ہم لفظ نیچر یا نیچرل حالی کی تنقید میں پائیں، تو ہمیں اسے اس معنی میں نہیں لینا چاہیئے جس میں کہ ہمارے مولوی صاحبان سرسید کے حق میں استعمال کرتے تھے یا اسے اٹھارویں صدی کے معقولین نے استعمال کیا ہے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ سائنس یا مغربی خیالات کے کلی طور پر مخالف تھے۔ سمجھوتے کے تو معنی ہی یہ ہیں ——— کچھ موافقت تو کچھ مخالفت۔ سوال یہ ہے کہ حالی نے نیچرل شاعری، نیچرل خیالات، نیچری انداز بیان کو کن معنوں میں استعمال کیا۔ انگریزی ادب اور انگلستان کے مفکرین کے خیالات سے حالی کی واقفیت بالواسطہ، اردو ترجموں کے ذریعے، پیدا ہو گئی تھی۔ انہوں نے براہ راست اور بالاستیعاب ان کے ادب اور خیالات کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ ایسی صورت میں نیچرل کی جو تاویلات کہ یورپ کے مفکرین نے کی ہیں، ہم انہیں سامنے رکھ کر انکے اس لفظ کے استعمال سے بحث نہیں کر سکتے۔ حالی فرماتے ہیں :—

> "نیچرل شاعری سے وہ شاعری مراد ہے جو لفظاً و معنیً دونوں حیثیتوں سے فطرت یا عادت کے موافق ہو۔ معنیً فطرت یا عادت کے موافق ہونے سے یہ مطلب ہے کہ شعر میں ایسی باتیں بیان کی جائیں جیسی کہ ہمیشہ دنیا میں ہوا کرتی ہیں یا ہونی چاہئیں۔ لفظاً فطرت یا عادت کے موافق ہونے سے یہ غرض ہے کہ شعر کے الفاظ اور ان کی ترکیب و بندش تا بمقدور اس زبان کی معمولی بول چال کے موافق ہو۔"

یہاں یہ کہنا کہ جب حالی "ہونی چاہئیں" کا فقرہ بھی استعمال کرتے ہیں تو وہ نیچر کی تعریف سے دور ہو جاتے ہیں، صحیح نہ ہوگا۔ کیونکہ اس وقت ہم نیچرلزم کے ایک خاص مفہوم کو اپنے ذہن میں رکھ کر ان کی عبارت کو پڑھیں گے۔ اس لئے بہتر یہی ہو گا کہ ہم

یہ جاننے کی کوشش کریں کہ اگر وہ انگریزی کا یہ لفظ استعمال نہ کرتے تو اردو میں کونسا لفظ استعمال کرتے۔ حالی نے "مقدمہ شعر و شاعری" میں بہت سی جگہوں میں نیچرل اور اصلیت کو تقریباً ایک ہی معنی میں استعمال کیا ہے اور یہ امر اتفاقی ہے کہ اصلیت کا لفظ ملٹن کے قول کا حوالہ دیتے وقت آگیا۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے اصلیت کو (SENSUOUS) کے اُس معنی سے مختلف معنی میں استعمال کیا ہے جو کہ ملٹن کے قول میں ہے۔ ویسے جو نیچرل ہے وہ محسوس ہے اور جو محسوس ہے وہ نیچرل ہے۔ اب یہ دیکھئے کہ وہ اصلیت کو کن معنوں میں استعمال کرتے ہیں:۔

"اصلیت پر مبنی ہونے سے یہ مراد نہیں ہے کہ ہر شعر کا مضمون حقیقت نفس الامر پر مبنی ہونا چاہئے بلکہ یہ مراد ہے کہ جس بات پر شعر کی بنیاد رکھی گئی ہے وہ نفس الامر میں یا لوگوں کے عقیدے میں یا محض شاعر کے عندیے میں فی الواقع موجود ہے یا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ فی الواقع موجود ہے۔ نیز اصلیت پر مبنی ہونے سے یہ بھی مقصود نہیں کہ بیان میں اصلیت سے سر مو تجاوز نہ ہو بلکہ یہ مطلب ہے کہ زیادہ تر اصلیت ہونی ضرور ہے"

یہاں یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ حالی اصلیت کی بنیاد منظر کی صرف خارجیت ہی پر نہیں، بلکہ شاعر کی داخلیت پر بھی رکھتے ہیں کیونکہ ہر وہ شے جو کہ شاعر کے عقیدے یا عندیے میں موجود ہے، اس کا خارجی وجود لازمی نہیں ہوتا ہے۔ اب اگر ہم اصلیت کے اس مفہوم کے ساتھ اس اقتباس کو پڑھیں جہاں کہ نیچرل کی وضاحت کی گئی ہے تو پھر وہاں "ہونی چاہئیں" کا فقرہ زیادہ نہیں کھٹکتا ہے کیونکہ حالی کی نظر میں کسی شے کا صرف عقیدے یا عندیے میں پایا جانا نہ تو خلاف اصلیت ہے اور نہ خلاف نیچر، فطرت یا عادت۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ انہوں نے لفظ نیچرل کو صرف خارجی معنوں ہی میں نہیں بلکہ داخلی معنوں میں بھی لیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ ہیں "کو" ہونی چاہئیں" کے ساتھ ہم آہنگ سمجھتے ہیں۔ ہمارے اس نتیجے کو اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ سرسید بھی مثنوی "خواب امن" اور "مناظرہ رحم و انصاف" پر تبصرہ کرتے وقت نیچرل کو نہ صرف خارجی اور داخلی دونوں ہی معنوں میں استعمال کرتے ہیں، بلکہ شاعری کے حق میں اس کے داخلی پہلو کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

"ابھی تک ہماری قوم کا کلام بیرونی حالت سے زیادہ مناسبت (CORRESPONDENCE) رکھتا ہے۔ مگر ہم کو امید ہے کہ بہت جلد اندرونی حالت تک بھی پہونچ جائے گا۔"

اب یہ دیکھنا ہے کہ نیچرل کا داخلی پہلو کسے کہتے ہیں۔ جب کبھی تکلف اور تصنع کے بالمقابل نیچرل یا اصلیت کے لفظ کو استعمال کیا جاتا ہے، تو وہاں وہ لفظ داخلی پہلو ہی کا احاطہ کرتا ہے یعنی جو کچھ کہ شاعر نے کہا ہے اس میں اس کا اپنا تجربہ اور جذبہ موجود ہے کہ نہیں۔ حالی نے جھوٹ اور مبالغے کے خلاف جو اس قدر زیادہ جہاد کیا ہے اور کلام میں تصنع اور تکلف کے بالمقابل سادگی، اصلیت اور جوش کو سراہا ہے، وہ سب کے سب اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ حالی 'نیچرل' کو 'پُر تکلف اور پُر تصنع' کے بالمقابل استعمال کر رہے ہیں۔ اس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ شاعری کے لئے جو شرائط وہ ضروری ٹھہراتے ہیں، ان میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ شاعری کی طرف اس وقت مائل ہونا چاہئے جب کہ طبیعت کا میلان اندر سے ہو۔

لیکن جب حالی یہ کہتے ہیں کہ دور متقدمین کے شعرا کا کلام فطرت سے نزدیک تر ہونے کے باعث نیچرل تھا تو ہمیں یہ سوچنے کا موقع ملتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اس لفظ کے پیچھے ان کے ذہن میں یورپ کی رومانوی تحریک کا وہ تصور کام کر رہا ہے جو کہ "مراجعت بہ فطرت" کے نعرے میں پوشیدہ ہے۔ یہ خدشہ بلا وجہ نہیں ہے، کیونکہ اگر نیچرل کو صرف پُر تصنع کے بالمقابل استعمال کیا جاتا تو کسی کے کلام کے نیچرل ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ کسی مخصوص تاریخی عہد سے بھی تعلق رکھے۔ حالی رومانوی تحریک کے اس رجحان سے بہت ہی مشروط طور پر متاثر نظر آتے ہیں اور یہ سب کچھ کیا دھرا لارڈ مکالے کے اس مضمون کا ہے جو کہ ملٹن کی شاعری کے متعلق ہے اور جس کا مطالعہ حالی نے بالاستیعاب کیا تھا۔ لارڈ مکالے کے بارے میں یہ بات عام طور سے مشہور ہے کہ وہ مشکل ہی سے کسی مضمون میں اوریجنل ہیں، چنانچہ وہ نہ صرف اسی مضمون میں جرمنی کے ناقد ہرڈر کے مضمون "عبرانی شاعری کی اسپرٹ" سے متاثر ہیں، بلکہ اور دوسرے مضامین میں بھی ہرڈر کے خیالات سے متاثر رہے ہیں۔ ہرڈر بیشک اپنے ذہنی ارتقا کے ابتدائی دور میں اسی خیال کا حامی تھا جیسا کہ اس نے عبرانی شاعری والے مضمون میں لکھا ہے کہ "چونکہ تاریخ کے ابتدائی عہد کے لوگ فطرت سے قریب تر ہے، اس لئے ان کی شاعری لازمی طور پر دور حاضر کی شاعری سے بہتر ہے اور ایک بہت ہی ترقی یافتہ سماج میں اوریجنل شاعری کرنا ممکن نہیں ہے۔" لیکن اس نے

روحانی رہبر

خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم

حضرت خواجہ غلام فرید رح

انک اور رقاصہ (مغربی پاکستان)

عوامی رقص (مغربی پاکستان)

منی پوری رقص (مشرقی پاکستان)

نامور رقاصہ [illegible]

اپنا یہ خیال بہت جلد بدل دیا اور اپنی کتاب "DEEN" میں اس خیال کا
حامی ہو گیا کہ پرانے زمانے کی طرف مراجعت، خواہ وہ افلاطون ہی کا زریں
عہد کیوں نہ ہو، زمانے اور دنیا کے اعتبار سے ناممکنات میں سے ہے۔
ہم آگے بڑھتے جاتے ہیں اور چشمہ کبھی بھی اپنے منبع کی طرف نہیں لوٹتا"
یہ سارے خیالات لارڈ مکالے کے مضامین میں بکھرے پڑے ہیں،
جن کا کہ حالی نے مطالعہ کیا تھا، چنانچہ جب حالی لکھتے ہیں "اگرچہ یہ
رائے (شاعری ناشائستگی کے زمانے میں ترقی پاتی ہے)..... کسی قدر
صحیح ہے، مگر اس کو بھی بے سمجھے بوجھے قبول نہ کرنا چاہیئے.... قوتِ متخیلہ
ضعیف ہو جاتی ہے۔ تو وہ موافقت اور مخالفت دونوں ہی صورتوں میں
ہرڈر کے خیالات کا اعادہ لارڈ مکالے کے توسط سے کرتے ہیں۔ "سائنس
اور میکانکس کی ایجادات تھوڑے ہی دنوں تک غلط طور پر استعمال کی
جا سکتی ہیں، آخرکار اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انسانی عقل و فہم کا ہر ایک
استعمال انسانیت کی ترقی میں سودمند ہوگا اور کیا جائے گا۔" (اقتباس
از آئیڈین" ہرڈر)

چونکہ حالی، ہرڈر کے تاریخی نقطۂ نگاہ سے ٹھیک طور سے واقف
نہ ہو سکے، اس لئے وہ اپنی تنقید میں تاریخی نقطۂ نگاہ کو ابھار نہ سکے،
لیکن اس حد تک تو ضرور ہی تاریخی اسباب نے ان کی تنقید میں جگہ بنا لی
کہ وہ قصائد کے جھوٹ کو مطلق العنان شخصی حکومت کا آوردہ سمجھنے لگے۔
تاہم وہ زیادہ تر اخلاقی اصلاح ہی کی طرف مائل رہے نہ کہ تاریخی ارتقا کی
طرف۔ لیکن چونکہ حالی کے یہاں اخلاقیات صرف فقہ نہیں، بلکہ ایک عالمگیر
فطری اصول بھی ہے، جس کا ادراک دل کے ذریعے ہوتا ہے نہ کہ دماغ
کے ذریعے، اس لئے وہ رومانوی تحریک کی اس قدامت پسندی سے
بھی متاثر رہے جو کہ تاریخ (ذہن اور ٹکنالوجی) کے ارتقا کو دل کے ضمیر اور
بصیر رہنے کے حق میں خطرناک سمجھتی ہے، لیکن یہ رومانوی رجحان
حالی کے یہاں زیادہ پرورش نہ پا سکا۔ اس وجہ سے نہیں کہ وہ واقعیت
پسند تھے، بلکہ اس لئے کہ ہندوستان میں اخلاق کا تصور فقہ کا پابند
تھا۔ یہ بات ورڈسورتھ یا ٹالسٹائی کے مسیحی اخلاق کے بارے میں نہیں
کہی جا سکتی۔ یہی سبب ہے کہ حالی اخلاق اور نیچر کو شیر و شکر نہیں کر سکتے۔
کبھی ان کی اخلاقیات نیچر کے خلاف بغاوت کرتی ہے، تو کبھی نیچر ان کی
اخلاقیات کے خلاف۔ مرزا شوق کی مثنویاں حالی کی نظر میں نیچرل ہوتے
ہوئے "امِ مورل" اسی لئے تو ہیں کہ ان میں ہوس رانی اور کامجوئی کی تبلیغ
ہیں۔ خالصتاً اخلاقی شاعری بے مزہ اسی لئے تو ہے کہ وہ نیچرل نہیں ہے

اس کا حل بجز اس کے کوئی اور نہیں ہے کہ ہم مورل کو بھی فطرت سے
اخذ کریں، جیسا کہ اسپنوزا نے اپنی کتاب "نیچرل اخلاقیات" میں کیا ہے، نہ کہ اخلاقیات
کو نیچر پر باہر سے عائد کریں۔ حالی اس منطقی نقطے تک جانے کیلئے تیار نہ تھے،
حالانکہ وحدت الوجودی صوفیوں کے یہاں اخلاق نیچرل ہی ہے۔ یہی وہ جگہ
ہے جہاں حالی معلم اخلاق اور ناصح پہلے ہیں اور ادیب بعد میں۔ ظاہر ہے
کہ واعظ جس کا "نسب" بقول میر "آدم کے تئیں بڑے تردد سے پہنچتا ہے۔"
ادب کو خارجی مقاصد کا ذریعہ ٹھیراتا ہے، خواہ وہ مقصد خارج سے عائد
کرنے والی اخلاقیات کا ہو یا سیاسیات کا، نہ کہ ادب کو اپنے مقصد کا ذریعہ
رہنے دیتا ہے جو کہ مختلف الاوضاع صداقت کو منفرد اور محسوس میں جلوہ گر
کرتا ہے۔ ادب زندگی کی خدمت صرف اس پہلو سے کرتا ہے، نہ کہ کسی
اور پہلو سے۔ فن کارانہ شغل انسانی شعور کے اظہار کا ایک مخصوص فارم ہے۔
اگر شعور کو اس کے اس فارم سے جدا کر دیا جائے تو وہ فن کارانہ شغل نہ
رہے گا۔ چنانچہ یہ کہنا صحیح ہے کہ جمالیاتی صداقت کو اسکے جمالیاتی فارم
سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ شعر کی دلفریب صورت سے اس لئے ملچانا کہ
اس نے زندگی کے چھوٹے چھوٹے مقاصد پورے کئے ہیں، ادب کے حق
میں مہلک ہے اور جو چیز ادب کے حق میں مہلک ہے وہ زندگی کے حق
میں بھی مہلک ہے، کیونکہ ادب زندگی کی سچائیوں ہی کو بے نقاب کرتا ہے
نہ کہ کسی اور شئے کو۔

حالی نے جس حد تک ادب کے حسی پہلو پر زور دیا ہے وہ ادبی
فارم سے قریب رہتے ہیں۔ مثلاً جب وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ خیال بغیر
مادے کے پیدا نہیں ہو سکتا ہے (لاک) تو وہ اس کے حسی پہلو ہی پر
زور دیتے ہیں، لیکن جب وہ اصلیت (جو کہ حسی ہی کا نعم البدل ہے)
کی تعریف میں شاعر کے عقیدے اور عندیے کو بھی شامل کرتے ہیں تو
وہ ادب کے حسی فارم یا ادبی فارم سے دور ہو جاتے ہیں۔ رہ گئی یونیورسل
کو منفرد (PARTICULAR) میں جلوہ گر کرنے کی بات،
سو اس کے بارے میں یہ عرض ہے کہ جب وہ تمثیلی ALLEGORICAL
شاعری کو سنائی، عطار اور رومی کی اخلاقی شاعری پر ختم کر کے زمانۂ حال
کے لئے پسند نہیں کرتے ہیں تو ان کا منشاء ادب میں منفرد ہی پر زور دینے کا
ہوتا ہے، کیونکہ تمثیلی شاعری میں ذہنی تصویریں اس قدر تعلیم یافتہ ہوتی
ہیں کہ منفرد دم توڑ چکتا ہے لیکن جب وہ شوق کی نیچرل مثنویوں کے
بارے میں "امِ مورل" کی بات اٹھاتے ہیں اور غزلوں میں شیخ پر لعن طعن
کرنے سے گھبراتے ہیں (شیخ علامت ہیں نہ کہ کوئی فرد) کسی شاعر کو ان سے

ذاتی مخاصمت ہو، تو وہ اپنے اس بیان کی تائید کرنے لگتے ہیں کہ "شاعری اخلاق کی تابع ہے۔"

ادبی یا جمالیاتی صداقت محیط ہے تاریخی اور اخلاقی صداقت پر، کیونکہ جمالیاتی صداقت یونیورسل کو منفرد اور محسوس میں جلوہ گر کرتی ہے نہ کہ کسی اور شے کو۔ اور ہر وہ شے جو یونیورسل قانون کا درجہ رکھتی ہے بذات خود ایک اخلاقی قدر ہے۔ اس طرح ہر وہ شے جو محسوس اور منفرد ہوتی ہے، وہ ایک انسانی تاریخی قدر بھی رکھتی ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر وہ یونیورسل سے رشتہ نہیں رکھ سکتی۔ اس لئے ادب کو اخلاق اور سیاست کے تابع کرنا غلط ہے۔ وہ تو محیط ہے ان دونوں پر۔ ادب ذہن ہے جو اپنی جمالیاتی صداقت میں اخلاقی اور تاریخی صداقتوں کو بھی شامل کر لیتا ہے، بشرطیکہ ہمارے ذہن پر اصلاح کا نیچرل تصور نہ ہو چونکہ ہر نیچرل ادبی شعور کا فارم شعور کے اور دوسرے فارم مثلاً قانون، اخلاقیات، سائنس وغیرہ سے منفرد ہو جاتا ہے۔ وہ ہر زمانہ شعور کی مختلف لہروں سے لین دین تو کرتا رہتا ہے۔ لیکن اپنی لہر کو بھی برقرار رکھتا ہے۔ "شعر کی تاثیر مسلم ہے" لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم ہر بات تاثیرات اپنے مقصد سے آزاد کر کے اس کے کندھے پر کسی دوسرے مقصد کا جوا رکھ دیں۔ وقتی طور پر ممکن ہے فائدہ پہنچ جائے، لیکن وہ زندہ دیرپا نہ ہوگا بلکہ اپنا ردعمل بھی لائے گا۔

نیچر اور اخلاق کی اس دوئی، صورت و معنی اور زور اور مقصد کی اسی دوئی نے حالی سے ایسی باتیں کہلوائیں جو ان کے عہد نیچرلزم کے نعرے کو بھی شدید صدمہ پہنچاتی ہیں۔ جھوٹ اور مبالغے، تکلف اور تصنع کی مخالفت کے تو یہ معنی تھے کہ وہ آمد کی حمایت کرتے اور آورد کی مخالفت کرتے (خواہ یہ دونوں الفاظ سب کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ بات اصول کی ہے، نہ کہ الفاظ کی) لیکن حالی نے اپنے منطق کے خلاف آورد کی حمایت کی:

"ہمیشہ وہی شعر زیادہ مقبول، زیادہ لطیف، زیادہ بامزہ، زیادہ سنجیدہ اور زیادہ موثر ہوتا ہے جو کمال غور و فکر کے بعد مرتب کیا گیا ہو ..... بیکار ہوگی" (مقدمہ شعر و شاعری)

حالی نے یہاں یہ بات لکھی ہے کہ "وہ خیال ممکن ہے کہ شاعر کے ذہن میں فوراً ترتیب پا جائے مگر اس کے لئے الفاظ مناسب کا لباس تیار کرنے میں ضرور دیر لگے گی" صحیح نہیں ہے کیونکہ خیالات ذہن میں بغیر الفاظ کے وجود میں نہیں آتے ہیں اور جب مناسب الفاظ سابق غیر مناسب
الفاظ کے وجود میں نہیں آتے ہیں اور جب مناسب الفاظ سابق غیر مناسب
الفاظ کو بدل کرتے ہیں تو اس وقت خیال میں بھی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے، خواہ وہ اصلاحِ خیال کی صورت کیوں نہ ہو۔ یہ غیر سائنٹفک بات حالی اس لئے کہنے پر مجبور ہوئے کہ انہوں نے آرٹ اور کرافٹ کا فرق ملحوظ نہیں رکھا۔ ورنہ وہ مستری کی مثال نہ دیتے۔ جو کچھ کہ مستری کرتا ہے وہ کرافٹ کے تحت آتا ہے نہ کہ آرٹ کے تحت۔ دونوں کا فرق یہ ہے کہ کرافٹ میں فارم خارج سے عاید کیا جاتا ہے اور آرٹ میں فارم اندر سے نمو کرتا ہے۔ کرافٹ میکانکی عمل ہے اور آرٹ تخلیقی۔ یہ فرق اضافی ہے نہ کہ مطلق۔ شاعری میں ایسا نہیں ہوتا ہے کہ خیالات ذہن میں پہلے ترتیب پائیں، پھر ان کے لئے مناسب الفاظ تلاش کئے جائیں۔ یہ تو میکانکی آرٹ ہوا۔ حالی اپنی نیت کے برخلاف اسی میکانکی آرٹ کی حمایت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ گو وہ اس کی میکانکیت سے بچنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ اس ضمن میں اگر ایک طرف وہ محدود خیالات کو بار بار نئے الفاظ کے ذریعے دہرانے والی میکانکیت کی مخالفت میں مطالعۂ فطرت کی دعوت دیتے ہیں جہاں معنی کا نہ بگڑنے والا خزانہ موجود ہے تو دوسری طرف وہ بندھے ٹکے فقروں اور شاعری کی رسمی اور تقلیدی زبان کے حدود سے باہر نکلنے کی دعوت دیتے ہیں، لیکن یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے اس حد تک علیحدہ کر کے پیش کرتے ہیں کہ ان کا نظریۂ ادب میکانکی کرافٹ ہو جاتا ہے جس کی اصلاح ان کے اس جملے سے نہیں ہو سکتی ہے کہ شاعری کی طرف وہی متوجہ ہوں جن میں شاعری کا ملکہ اور استعداد فطری ہے اور فکر شعر کی طرف وہ لوگ اس وقت رجوع کریں جب کہ اس کی چٹیک ان کے دل میں پیدا ہو۔

تخلیقی ادب اور آرٹ میں نہ تو فارم معنی سے جدا رہتا ہے اور نہ الفاظ معنی سے، اس لئے جمالیاتی یا تخلیقی ادب کی توضیح اس طرح نہیں کی جا سکتی ہے جس طرح کہ حالی نے مستری کی مثال دے کر کی ہے، کیونکہ دونوں مختلف سطح کی چیزیں ہیں۔

جمالیاتی فارم کی خوبی اور کمزوری کو جمالیاتی سچائی ہی کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے نہ کہ مجرد سچائی کے حوالے سے۔ ایک ایسے شخص کے لئے جو کہ مذاق سخن نہ رکھتا ہو اور صرف ایک ٹھس قسم کا منطقی آدمی ہو، ایک خوبصورت شعر بھی مناسب الفاظ کا محتاج یا مبہم اور ناصاف معلوم ہو سکتا ہے لیکن وہی شعر ایک ایسے شخص کے لئے جو مذاق سخن رکھتا ہو اور اپنی قوت متخیلہ کو بھی عمل میں لانے کا عادی ہو، صاف اور واضح معلوم

ہوسکتا ہے۔ وہ انہی الفاظ کو مناسب الفاظ تصور کرسکتا ہے۔ ان حالات میں شعر و شاعری کی دنیا میں مناسب الفاظ کا تعین کارٹیزین CARTESIAN صفائے تصور سے نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ شعریت کے نقطۂ نگاہ سے جس کے حوالجات اور تلازمات ذہنی تصویروں اور تلمیحات کے ہوتے ہیں۔ حالی شاعری میں قوت متخیلہ کے عمل کو مانتے ہیں اور ایک جگہ تو کولرج کی تعریف تخیل سے قریب بھی ہو جاتے ہیں، لیکن چونکہ وہ باز آفرینی کے طریق کار میں ترتیب کا لفظ استعمال کرتے ہیں نہ کہ تخلیق کا، اسلئے وہ قوت متخیلہ کی خلاقیت اور دراکی تک نہیں پہنچتے۔

قوت متخیلہ کے تخلیقی عمل میں درک و تمیز بھی کچھ شامل ہوتی ہے۔ اسے قوت ممیزہ کے پابند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، جیسا کہ حالی نے اسے پابند کیا ہے۔ یہ ضرورت تو فینسی (FANCY) کے معاملے میں پیش آتی ہے۔ چنانچہ یہی بہت ہے کہ کولرج نے فینسی کو قوت متخیلہ سے ممتاز کردیا جو کہ ایک بہت ہی نیچی سطح کی چیز ہے۔ حالی نے قوت متخیلہ کی جس بے راہ روی کی طرف اشارہ کیا ہے وہ دراصل فینسی کی بے راہ روی ہے جو کہ صورت پرمتتبع ہے نہ کہ قوت متخیلہ کی جس کا کام حقیقت کو مجاز کے تخالف میں ابھارنے کا ہوتا ہے۔ کیا وہ یہ کام درک و تمیز کے بغیر انجام دے سکتی ہے؟

حالی نظریاتی اعتبار سے وضعداری کے مخالف تھے لیکن چونکہ وہ زمانے کے ساتھ چلنے کے عادی نہ تھے اسلئے عملاً پرانی حقیقت سے کبھی سمجھوتہ کرنے کے باعث اس قدر پابند وضع رہے کہ سوانح عمریوں میں اپنے ہیرو کی کمزوریوں کو بے نقاب کرنے سے قاصر تھے، شاید یہ اسی اندرونی روک (INHIBITION) کا نتیجہ تھا کہ جب وہ کھل کر تنقید کرتے تو کچھ اجنبی سے لگتے۔ میرحسن کی مثنوی بدرمنیر کی جس قدر تعریف حالی نے کی ہے وہ انکے مذاق سخن کی صحت پر دلالت کرتی ہے مگر جب وہ تخیل میں تجربے اور مشاہدے کی فی الواقع مطابقت پر زور دینے پر آتے ہیں تو ایسی بات کہہ جاتے ہیں کہ ساری محفل حیران رہ جائے۔

دھوپ وہ دھانوں کی سبزی وہ سرسوں کا روپ
درختوں کی کچھ چھاؤں اور کچھ وہ دھوپ

میرحسن کی اس بیت کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ "اخیر مصرعے سے صاف یہ مفہوم نکلتا ہے کہ ایک طرف دھان کھڑے تھے اور ایک طرف سرسوں پھول رہی تھی، مگر یہ بات واقعے کے خلاف ہے کیونکہ دھان خریف میں ہوتے ہیں اور سرسوں ربیع میں۔" اب یہ بتلائیے کہ قوت متخیلہ کی وہ ساری باتیں کہاں گئیں جنہیں حالی نے الفاظ میں بیان کیا ہے" یہ وہ طاقت ہے جو شاعر کو وقت اور زمانے کی قید سے آزاد کراتی ہے اور ماضی اور استقبال کو اس کے لئے زمانہ حال میں کھینچ لاتی ہے (کیا وہ طاقت میرحسن کے شعر میں اتنا بھی نہیں کرسکتی ہے کہ ربیع اور خریف کے زمانے کے فرق کو مٹا دے۔ مصنف) وہ آدم اور جنت کی سرگذشت اور حشر و نشر کا بیان اس طرح کرتا ہے گویا اس نے تمام واقعات اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں۔" قوت ممیزہ کی لگام کو اس قدر کھینچنا نہ چاہئے کہ اشہب برق پیما (متخیلہ) بیٹھ جائے۔

یہ ہے حالی کے نظریۂ نقد و ادب کا نچوڑ۔ باقی باتیں انہوں نے مشوروں کے طور پر کہی ہیں، جن میں صنف غزل کی تنقید خاص طور سے اہم ہے۔ تنقید کے میدان میں حالی کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ غیر مربوط طریقہ ہی سے سہی، انہوں نے فلسفۂ تنقید کو ہاتھ تو لگایا۔ انہی معنوں میں وہ ہماری جدید تنقید کے رہبر ہیں کیونکہ تنقید کی ابتدا وہیں سے ہوتی ہے جہاں سے کہ ہم فلسفۂ تنقید پر تنقید کرتے ہیں۔ لیکن حالی اپنی اس کوشش میں کسی مدلل بحث کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے یا کسی منضبط نظریئے کے دینے سے قاصر رہے۔ چونکہ تنقید کا تعلق فلسفۂ آرٹ سے ہے نہ کہ وہ بذات خود آرٹ ہے، اسلئے یہاں میں نے جان بوجھ کر کسی زبان کا نام نہیں لیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے کہ اس کمی کے باوجود ان کے خیالات کا اتنا گہرا اثر اردو شاعری اور تنقید پر رہا ہے؟ کیا اس لئے کہ لوگ فلسفۂ تنقید سے واقف نہ تھے؟ بالکل نہیں۔ بلکہ اس لئے کہ انہوں نے اپنی شاعری سے ہمیں متاثر کیا، اور شاعری کے اس سوشل رجحان کو اپنی تنقید سے تقویت پہونچائی جس نے ادب اور زندگی دونوں ہی کے ارتقا میں ہماری مدد کی ہے، حالی کی تنقیدات نثر و نظم میں اپنے رجحانات کے باعث مقبول رہی ہیں نہ کہ کسی منضبط فلسفہ کی بنیاد دینے۔ حالی کا یہی سب سے بڑا کارنامہ ہے کہ وہ آج بھی ہم میں بطور رجحان کے زندہ ہیں، وہ ہماری سماجی اور ذہنی تاریخ کا ایک جزو بن گئے ہیں۔

"خواب کی باتیں"

ابوالاثر حفیظ

(۱)

سیرِ چمن کی وہ سحر ۔ یاد ہے خوب یاد ہے
داغ تو دل پہ ہے مگر ۔ لطفِ نگاہ شاد ہے

منظرِ شرق لال لال
منہ پہ ملا ہُوا گلال
بادِ صبا کی نرم چال
رقص میں شاخِ ہر نہال

اور مرے دل و جگر ۔ نغمہ و رنگ سر بسر
سیرِ چمن کی وہ سحر
یاد ہے خوب یاد ہے
داغ تو دل پہ ہے مگر ۔ لطفِ نگاہ شاد ہے

(۲)

حدِ نگاہ تک تمام ۔ جزو سے کل ملا جُلا
سُرخ، سفید، نیل فام ۔ تختۂ گل کھِلا ہُوا

بلبل و گل کی داستاں
حُسن کی عشوہ کاریاں
عشق کی آہ و زاریاں
نہرِ چمن رواں دواں
سرو و سمن یہاں وہاں

برگ و ثمر کا انتظام ۔ فطرتِ پختہ کار خام
حدِ نگاہ تک تمام
جُزو سے کُل ملا ہُوا
سرخ، سفید، نیل فام ۔ تختۂ گل کھِلا ہُوا

(۳)

ہاں وہ عجیب تھا سماں ۔ درد فزا و پُر سرور
آئی نظر جو ناگہاں ۔ تختۂ گل پہ ایک حور

آہ وہ پیکرِ شباب
آہ وہ روئے بے نقاب
ہائے شرارتی حجاب
ولئے اشارتی عتاب

(میرا ہی وہم تھا کہ خواب)
(یہ تو کہوں گا میں کہ ہاں ۔ کچھ تو ضرور تھا وہاں)

ہاں وہ عجیب تھا سماں

درد فزا و پُر سرور

آئی نظر جو ناگہاں۔ تختۂ گل پہ ایک حور

(۴)

جام بدست کائنات۔ لالہ فروش ہر طرف

حسن پرستشِ جہات۔ دوش بدوش صف بصف

موجِ شمیم عطر بیز

فوجِ نسیم تیز تیز

ولولے انبساط خیز

ہو زرِ گل نشاط ریز

ایک عروس کا جہیز

اور دلہن بس ایک ذات۔ جس کا جلوس ادر برات

جام بدست کائنات

لالہ فروش ہر طرف

حسن پرستشِ جہات۔ دوش بدوش صف بصف

(۵)

آنکھ میں بجلیاں مگر۔ اُن کے اثر سے بے خبر

جنبشِ سر سے بے خبر۔ سحرِ نظر سے بے خبر

مکر نہیں، ریا نہیں

ظلم نہیں، جفا نہیں

نازشِ ناروا نہیں

سازشِ فتنہ زا نہیں

یہ بھی خبر ذرا نہیں

کس پہ پڑی ہے یہ نظر۔ برق گری کدھر کدھر

آنکھوں میں بجلیاں مگر

ان کے اثر سے بے خبر

جنبشِ سر سے بے خبر۔ سحرِ نظر سے بے خبر

(۶)

جب وہ خرامِ ناز سے۔ ایک روش پہ مڑ گئی

دامنِ گل بھرے ہوئے۔ سبز پری تھی اڑ گئی

لے گئی دولتِ قرار

کر گئی ہوش کو شکار

چھوڑ گئی بہ حالِ زار

آنکھ کو محوِ انتظار

دل کو نظر سے شرمسار

شوخیِ بے نیاز سے۔ عشوۂ پاک باز سے

جب وہ خرامِ ناز سے۔ ایک روش پہ مڑ گئی

ملتانی ادب:

خواجہ فریدؒ کی ایک کافی

نور احمد فریدی

حضرت خواجۂ خواجگان، زین الاولیاء حضرت خواجہ شاہ غلام فریدؒ ایک باکمال درویش تھے۔ فقر و ولایت کے ساتھ خدا نے حضرت کو شاعری کا ملکہ بھی بڑی فیاضی سے عطا کیا تھا۔ اگرچہ فارسی اور اردو میں بھی جناب نے بہت کچھ کہا ہے اور خوب کہا ہے، مگر اپنی مادری زبان ملتانی کے ملک الشعراء ہیں۔ آپ کے دیوان کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ حافظؒ کے کلام کی طرح عوام و خواص ان کے کلام کو شوق سے سنتے اور مستی سے سر دھنتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ فرمایا کرتے تھے: میں حیران ہوں جن لوگوں کی زبان میں دیوانِ فریدی موجود ہے وہ "بانگِ درا" کیوں پڑھتے ہیں۔ آج حضرت کو دنیا سے رخصت ہوئے تقریباً ۵۳ سال کا عرصہ گذر چکا ہے، لیکن آپ کا کلام اس شغف اور انہماک سے پڑھا اور سنا جاتا ہے، جیسا کہ حضرت کی موجودگی میں پڑھا، سنا اور گایا جاتا تھا، خواہ برکت کی نال اور حسنِ ادا نہ سہی۔ حضرت کے کلام میں استعارات اور تلمیحات کا بحرِ ذخار ہے، درد ہے، سوز ہے، مناظرِ قدرت کی عکاسی ہے اور تصوف کے دریا بہائے ہیں۔ الفاظ نہایت حسین و جمیل ہیں۔ تصغیر کے تواتر نے کلام کی دلکشی میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ ہر کہیں سوز و گداز اور شدتِ جذبات کے باعث ایک ساحرانہ کیف نظر آتا ہے۔ ذیل میں نمونۃً حضرت کی ایک کافی کے مطالب و معانی کے ساتھ ساتھ اس کی فنی خوبیوں کو بروئے کار لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ع قیاس کُن ز گلستانِ من بہارِ مرا

پہلے اس نغمۂ عارفانہ کو اپنی مکمل شکل میں ملاحظہ فرمائیے:۔

آپے بار محبت چایم اڑی — ونج آپ کوں آپ اڑایم اڑی
بھوں ڈُکھاں سُولاں دی تات یلیم — غم، درد، اندوہ برات گلیم
بھیڑی ڈوکھڑیں مار مونجھایم اڑی

سوہناں ہوت پنل چھڈ کیچ گیا — گل سوز فراق دا پیچ پیا
جو لکھیا پلڑے پایم اڑی
ڈکھا تھل مارو آپیش گیا — دل جان جگر تن ریش تھیا
تتی عشق اولڑا لایم اڑی
بنجا یار پنل گیا کیچ رہتا — سر ظلمیں بینہ دا مینہ وٹھا
رب ایڑے بار سہایم اڑی
ہک وار فرید نوں یار ملے — سر دل پینڈا ہجر دا بار ٹلے
جیندے کارن عمر گنوایم اڑی

اب اس نوائے معرفت کے معنوی اور صوری محاسن کی طرف آئیے۔ آپے خود بخود، چایم میں نے اٹھایا۔ اڑی اڑی کا مخفف۔ اری او کے معنوں میں۔ ونج جا کر۔ اڑایم میں نے پھنسایا۔

ملتانی زبان میں جس قدر دوہڑے، کافیاں اور غزلیں لکھی گئی ہیں، ان میں مرد کو معشوق اور عورت کو عاشق فرض کیا گیا ہے۔ چنانچہ سسی، ہیر اور سوہنی سب اپنی اپنی جگہ عاشق ہیں اور پنل خان، رانجھا اور مہینوال ان کے معشوق۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں:

"اری سہیلی! میں نے محبت کا بوجھ خود بخود اپنے سر پر اٹھا لیا ہے اور خود ہی جا کر اپنے آپ کو عشق کے جال میں پھنسایا ہے یعنی انسان نے عشق کا بار خود ہی اپنے سر پر اٹھا لیا ہے۔ حسبِ فرمانِ آیۂ شریفہ انا عرضنا الامانۃ علی السموات والارض فابین ان یحملنہا و اشفقن منہا وحملہا الانسان ؕ یعنی:

ہم نے بارِ امانت آسمانوں اور زمینوں کو پیش کرنا چاہا، مگر انہوں نے اپنی عاجزی اور کمزوری کا اظہار کیا اور اس بارِ عظیم سے اپنا دامن چھڑا لیا، مگر حضرت انسان نے خوشی خوشی اس بار کو اپنے سر لے لیا

...یہ سب کچھ ہوگیا تو پھر قدرت اپنی طرف سے تبصرہ کرتی ہے کہ انہٗ ...ظلوماً جہولاً۔ علامہ اقبالؒ اس حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے ...تے ہیں ؎

...نے کیا اچھی کہی ظالم ہوں میں جاہل ہوں میں

...انسان یہ بار امانت اٹھا چکا، تو اس کے نتائج پر غور کرنے سے ...ے معلوم ہوا کہ اس نے بڑی بھاری غلطی کی ہے، مگر اب کیا ہو سکتا ... بقول حافظؒ ؎

کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا

...ہ کر انسان کو اپنی جہالت پر افسوس آتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ بوجھ اس ...جبراً نہیں اٹھوایا گیا۔ اس نے خود بخود حماقت سے اتنا بڑا بار اپنے ...ر پر اٹھا لیا ہے اور مفت میں اپنے آپ کو عشق کی پُرخار وادی میں ...پھنسایا ہے۔

دوسرے بند میں فرماتے ہیں :-

...وڑ دکھاں سُولاں دی تات لیم   غم، درد، اندوہ برات لیم
...ہ سارا دُکھ درد سُول مروڑ تات خلعت برآت عطیہ، انعام
...م مجھے ملا۔ مطلب یہ کہ سارے دُکھ اور درد مجھے خلعت کے طور پر ...، اور غم، درد اور اندوہ انعام میں ملے۔ امانتِ عشق کی تفویض عالم ...ارواح میں ہوئی تھی۔ عالمِ اجسام میں جب روح اور جسم کو آپس میں ...لایا گیا تو غم، اندوہ، اور درد انسان کو بطور تحفہ دے دئیے گئے۔ حافظؒ ...ماتے ہیں :-

جلوۂ کرد رُخش، دید ملک عشق نداشت
عین آتش شد ازیں غیرت، بر آدم زد
مدعی خواست کہ آید بہ تماشہ گہ راز
خیمہ در آب و گل مزرعۂ آدم زد

...نی جب حسنِ ازل نے دیکھا کہ ملائکہ اس کے حسنِ بے مثال کو دیکھ کر متاثر ...نہیں ہوتے تو وہ غیرت سے سراپا آگ ہوگئی اور یہ آگ بیچارے آدم پر ...پھینک دی جس سے انسانی وجود میں زبردست تڑپ پیدا ہوگئی، عضو عضو ...رد کرنے لگا، رگ رگ اور نس نس میں آتشِ عشق نے اپنا دورہ شروع ...کیا اور انسان کی جمعیت اس میں جل کر خاک ہوگئی جیسا کہ دوسرے ...مقام پر خواجہ فریدؒ نے فرمایا ہے ؎

عشق نہیں ہے نارِ غضب کی، تن من کُٹھ کرے

اور مولانا جامیؒ اسی کیفیت سے دوچار ہونے پر بے اختیار پکار اُٹھتے ہیں ؎

اے آتشِ فراقت دلہا کباب کردہ
دے آرزوئے رویت جانہا خراب کردہ

جس پر دنیا بھر کے اہل اللہ کو بالاتفاق ماننا پڑا کہ العشق نار یحرق ماسوی اللہ (عشق وہ آگ ہے کہ سب کچھ پھونک دیتی ہے اور خدا کے ماسوا کچھ باقی نہیں رہتا) اسی بنا پر عشق سے پریشان حال روح کہتی ہے کہ "اے بھولی سہیلی، عشق کے ہاتھوں مجھ پر اتنے دُکھ اور مصیبتیں ٹوٹی ہیں کہ ان سے میری زندگی پر حزن و ملال چھا گیا ہے یعنی انسان کی جسمانی حالت، قلبی جذبات سے خطاب کر کے کہتی ہے کہ امانت عشق کے اٹھانے میں مجھے ایسے ایسے دکھوں سے دوچار ہونا پڑا کہ بس خدا ہی بچائے، زندگی دو بھر ہوگئی ہے اور ہر وقت دل پر غم واندوہ کی حالت طاری رہتی ہے۔

اس درد و کرب کی تشریح کے لئے خواجہ صاحب مقامی روایات کو کام میں لاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ حسین و جمیل پنل خاں، جو پنوں کے نام سے مشہور ہے، مجھے چھوڑ کر کیچ یعنی کچھ کو چلا گیا جس سے میرے گلے میں فراق کا طوق پڑ گیا اور قسامِ ازل نے میری تقدیر میں جو کچھ لکھ دیا تھا میں نے اپنے پلو میں ڈال لیا یعنی حسنِ ازل نے اپنے آپ کو عالمِ مجاز میں پردۂ صفات سے نورِ یثرب میں ظاہر فرمایا۔ جیسا کہ حدیث قدسی میں آیا ہے انا من نور اللہ والخلق من نوری روحانیتِ انسانی مائل بہ صفات تھی۔ جونہی "نورِ یثربی" میں حسنِ ازل کی جھلک دیکھی بے اختیار اس پر مائل ہوگئی۔

اگرچہ ادبی حیثیت سے حضرات علماء نے ذات رسالتمآب روحی فداہ کو رانجھا، پنل، اور مہینوال جیسے محبوبانِ دہر سے تشبیہ دینے سے منع کیا ہے، مگر جب انسان پر جذباتی کیفیات طاری ہوتی ہیں، تو وہ ان پابندیوں سے وراء الوراء چلا جاتا ہے۔ گویا پنل اور کیچ تلمیح در تلمیح ہے۔ حسنِ ازل کو پہلے "نورِ یثربی" سے تشبیہ دی گئی ہے اور پھر نورِ یثربی کو پنل سے۔ اسی طرح کیچ سے مراد مدینہ طیبہ ہے۔

خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ میرا "مدنی" پیا مجھے چھوڑ کر مدینہ طیبہ کو چلا گیا ہے جس سے میں فراق کی جلن میں تڑپ رہا ہوں اور امانتِ الٰہی کے اٹھانے سے جو آفات اور مصائب میرے نوشتہ میں لکھ دی گئی تھیں

(باقی صفحہ ... پر)

کلاسکی فنِ رقص

سید حسنین جاوید

اس برِ عظیم میں قدیم زمانے سے رقص کا مقصد صرف تفریح یا جسمانی نمائش نہ تھا بلکہ دیکھنے والوں کے جمالیاتی تصور کی تسکین اور حسن و خیال کی مختلف کیفیات کو محسوس کرنے اور سمجھنے کو اصل مقصد سمجھا جاتا تھا یعنی وہ تمام باتیں جو شاعری کا مقصود ہیں۔ اس باب میں جو اصول قدما نے وضع کئے تھے وہ ان سب مقاصد پر حاوی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ رقص تمام ایشیائی ممالک میں بہترین اور مکمل فن سمجھا گیا۔

رقص کی مقبولیت کی دوسری وجہ ہندوؤں کا اس کو عبادت میں شامل کر لینا تھا۔ ان کے رقص مذہبی موضوعات پر وضع کئے گئے تھے۔ جس کے باعث رقاص اور ناظرین کے لئے اس فن میں ایک خاص کشش اور جاذبیت پیدا ہو گئی تھی۔ رقاص کا کام صرف یہی نہیں تھا کہ وہ رقص میں اپنے کمال دکھائے یا صرف اس فن کے ارکان پورے کر دے بلکہ اس کا مقصد چونکہ دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتا تھا اس لئے ایک رنگِ عبودیت اور سرشاری اس میں پیدا کرنا لازمی تھا۔ بعد ازاں جب بدھ مذہب نے ترقی کی اور ہندوستان سے باہر نکل کر چین، جاپان جزائرِ ہند وغیرہ میں پہنچا تو وہاں کے رقص اور قدیم ہندو رقص نے مل کر ایک نئی صورت اختیار کر لی۔ چنانچہ جاپانی گیشا ناچ اگر ایک طرف جاپانی تصورات کا حامل ہے تو دوسری طرف بدھ کی تعلیم کی قدیم بنیاد پر مبنی ہے۔ چین کے قدیم ناچوں میں صرف بزرگوں کی پرستش کا جذبہ کارفرما تھا۔ اور دیوی دیوتاؤں کے سامنے ناچ کر ان کا قرب حاصل کرنے کا ہندوستانی جذبہ مفقود تھا۔ فن چونکہ بغیر پشت پناہی کے ترقی حاصل نہیں کر سکتا لہٰذا محض تفریحی یا تمدنی رواج کے طور پر رقص کہیں وکمالِ حسن کا وہ درجہ حاصل نہ کر سکا جو ہندوستان میں اسے حاصل ہوا۔ ایرانی رقص بھی کاکشیا (کوہ قاف)، یار قند اور آذربائیجان کے قبائلی ناچوں کے زیرِ اثر رہا۔ آتش پرستوں کے رقص میں مذہبی چاشنی کارفرما تھی۔ لیکن مذہبی زوال اور جنگی کمالات کو نصب العین بنا لینے کے باعث قدیم ایرانی رقص تفریح کی حد سے آگے نہ بڑھ سکا۔

اہلِ ایران کے بعد عرب کے قبائل کا رقص قابلِ ذکر ہے۔ جنہوں نے مذہبی عناصر کارفرما نہ ہونے کے باعث محض جنگی رقص اور تفریحی رقص کو اوجِ کمال تک پہنچا دیا۔ ان کے یہاں قصیدہ کی ٹیپ اور رقص کی حرکت کا امتزاج بدرجہ اتم پیدا ہو گیا تھا۔ مگر جنگ شورِ زندگی اور شدیدگیٔ عمل و آرٹ کے خاموش نمو اور پرسکون اوج کو روک دیتی ہے لہٰذا جوں جوں جنگ میں شجاعت کا تصور بڑھا۔ رقص اور اس کے پیغام کی ضرورت پسِ پشت ڈال دی گئی۔ حتیٰ کہ ظہورِ اسلام سے قبل عربی رقص صرف مردانہ کھیلوں یا تہواروں کے موقع پر ناچ اور دف بجا کر کودنے مٹکانے کا نام رہ گیا۔ جنگ سے قبل اور مابعد قبیلے کی مجلسِ شوریٰ کے سامنے کمسن لڑکیوں کا رقص، کھجور کے پیڑوں کے سایہ میں شبِ ماہ کو دف بجا کر ناچنا اور اسی قسم کے دیگر مظاہراتِ رقص رفتہ رفتہ ختم ہو گئے۔

چین، ترکستان، ملایا اور برما کے رقص زیادہ تر چینی قول سے مشابہ ہیں اور کورس (طائفہ کے ساتھ رقص) اس کا خاص جزو ہوتا ہے۔

ابتدائی سطروں میں ہندوستان و پاکستان کے فنِ رقص کا جو مقصود بیان کیا گیا ہے۔ اس کا اگر ایشیا کے دیگر رقصوں سے مقابلہ کیا جائے تو آسانی سے سمجھ میں آ سکتا ہے کہ برِ صغیر کے رقص کو کیوں فروغ ہوا۔ اس کی حفاظت کیونکر ہوئی اور ایشیاء بلکہ تمام مشرق میں ہمارے ملک کے رقص کو کیوں فوقیت حاصل رہی؟

یہ رقص دراصل جمالیاتی ذوق کو حرکاتِ جمیلہ سے ظاہر کرنے کا دوسرا نام ہے اور قدیم فلسفہ کے مطابق اس کا مقصد انسانی روح کو

اوج پر پہنچانا اور اس میں ذوقِ حسن اور احساسِ جمال کا ابھارنا ہے تاکہ روح مادہ کی کثافت سے بالاتر ہو کر اس بالیدگی اور تسکین کو حاصل کر سکے جو ہر انسان کی تمنا ہوتی ہے کہ دیکھنے والے کے دل میں ایسا گداز پیدا ہو جائے کہ وہ شورشِ حیات میں تسکینِ قلب اور عجائباتِ روح کی سیر کرنے لگے۔ ناچ دیکھنے کے لئے دیکھنے سے زیادہ دل کے احساس اور ذہن کی رسائی کی ضرورت ہے۔ رقص کے لئے بصارت سے زیادہ بصیرت و تعلیم کی ضرورت ہے۔ جو اسے بخوبی سمجھ نہیں سکتا، اس کے دیکھنے کا فائدہ بھی نہیں اٹھا سکتا۔ نہ ہی معنوی لحاظ سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

چونکہ رقص کا مقصد تقویتِ روح تھا۔ اس لئے اس بات کی بھی کوشش کی گئی کہ رقص کو عریاں حرکات سے پاک رکھا جائے۔ اگر عورت ناچنے والی ہے تو اس کے جسم پر معمولی اور روزمرہ کے کپڑوں سے زیادہ پوشش ہوتی کہ رقص ہیجان کا باعث نہ بنے اور جس کثافتِ روح کو دور کرنے کے لئے یہ تدبیر کی گئی ہے اس کا مقصد فوت نہ ہو۔ نیم عریاں لباس اور عریاں حرکات بعد میں تقلیدی طور پر شامل ہوگئیں اور رفتہ رفتہ ناچ کا تعلق صرف اسفل جذبات کو حرکت میں لانے سے متعلق و منسوب ہو گیا۔ چنانچہ یہ فن تیخ اقوام میں رائج ہو کر مادی تسکین کا باعث بن گیا اور اعلیٰ اقوام نے اس کی سرپرستی سے ہاتھ اٹھا لیا۔

قدیم ہندی فلسفہ کے مطابق فطرت ہم آہنگی چاہتی ہے۔ اور ایک مکمل نظم کی طلبگار رہتی ہے۔ چونکہ ہم آہنگی اور نظم حیات تمام کائنات پر حاوی اور جاری ہے جس کی مثال جسمِ انسانی ہے۔ دل کی حرکات، نبض کی جنبش اور اعصاب کی خود رفتاری میں جو ترنم و سلاست نظم و وابستگی اور ترتیب و کمال پایا جاتا ہے وہ اس بات کا طالب ہے کہ انسان کی ہر حرکت اور اس کا ہر فعل نظم و ضبط اور ترتیب کا مظاہرہ ہو اور کوئی رکنِ حیات ترتیبِ عمل سے عاری نہ ہو۔ چنانچہ رقص کی تعریف یہ کی گئی ہے:-

"رقص جسم کی حرکات و سکنات کو ایک ضابطۂ ترنم اور ترتیب کے ماتحت لانا ہے تاکہ اعصاب اور جوارح کی مشاقانہ حرکات سے ایک ایسی منظم فضا پیدا ہو جائے جیسے نظامِ شمسی کی ترتیب ہے۔" روزمرّہ کی حرکات اور رقص کی حرکات میں فرق پیدا کرنا ایک موزونیت و تنظیم کا طلبگار ہے اور اسے حسن و جمال کی سجاوٹ سے آراستہ کر کے ہماری نظروں کے سامنے

سامانِ عیش اور دل کے لئے تسکین پیدا کرنا اس کا مقصد و مدعا ہے۔

رقص دراصل ایک مکمل شاعری ہے اور اس کی ہر حرکت ایک باضابطہ شعر ہے جس کے ایک معین معنی ہیں۔ رقص میں انسان جسم کی چند منظم حرکات سے کسی تاریخی واقعہ کا اظہار، کسی جنگ کا نقشہ، کسی عشق کی طلسمی داستان، کسی حیرت کا اظہار یا کسی مذہبی تعلیم کا مظاہرہ کرتا ہے اور ہر چیز آنکھوں کی زبان اور ہاتھوں کے خفیہ مگر بالکل صاف اور آسان اشاروں سے دل میں پیوست ہو جانے والی جسم کی حرکتوں سے دکھائی جاتی ہیں۔ ان حرکاتِ ظاہرہ کے پیچھے آرائش و ترتیبِ موسیقی و موزونیت کی چاشنی ہوتی ہے۔ جو ایک ایسی فضا پیدا کر دیتی ہے کہ انسان رقاص کا منہ تکتا رہ جاتا ہے۔

رقص ایک بہت مشکل ورزش ہے اور بہت احتیاط و تدبر چاہتی ہے۔ ایک ماہر کا قول ہے کہ شاید نظامِ شمسی میں بھی کبھی بے ترتیبی اور بدنظمی پیدا ہو جاتی ہوگی جس کی دلیل ستاروں کا ٹوٹنا اور دیگر حوادثِ سماوی ہیں مگر رقص میں ایک لمحہ کے ہزارویں حصہ کے برابر بھی تاخیر یا کاہلی ہو تو رقص کی باریکی اور نزاکت میں [illegible] آجاتا ہے اور نظامِ شمسی سے زیادہ اس کی ترتیب میں فرق پڑ جاتا ہے۔ یہ قول بڑی حد تک صداقت پر مبنی ہے کیونکہ آنکھ، گردن، کولھے، سر اور ہاتھوں کی جنبش و حرکات اپنی اپنی جگہ ایک مستقل معنی رکھتی ہیں۔ اگر ان کی ترتیب و موزونیت یا تنظیم اظہار میں بال برابر بھی فرق پڑ جائے تو خوبی و کمال میں فرق پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ یہ فن اقلیدس کے جامد اصولوں، نظامِ شمسی کی ترتیب شعر و تصویر کی فنی قیود، غرض ہر چیز کے نظام اور ضابطہ سے زیادہ پیچیدہ، نازک اور اہم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رقص اتنا آسان فن نہیں جس قدر کہ سمجھا جاتا ہے۔

چونکہ جدید تمدن نے ملکی رقص میں سے مذہبی سرجوشی اور تصوف کو رفتہ رفتہ کم کر دیا ہے اس لئے کلاسیکل رقص تو اب تقریباً مفقود ہے بمشکل آجکل ایسے لوگ دستیاب ہو سکیں گے جو قدیم اصولوں پر ناچ دکھا سکیں۔

نئے تمدن کے اثرات اور مغرب کی تقلید نے برصغیر کے قدیم رقص کو بالکل بدل دیا ہے۔ گو اس کی قدامت کے بعض ذرّے اب بھی کہیں کہیں چمکتے نظر آجائیں لیکن دراصل اب اس کی وہ مقبولیت کی ہر دلعزیزی افقِ ماضی میں غروب ہو چکی ہے۔

اصطلاحات :-

فن رقص بھی جسم کی حرکات و سکنات کو علیحدہ علیحدہ اصول سے منظم کیا گیا ہے جو دیگر ایشیائی ناچوں میں اس قدر متانت اور حسن کے ساتھ نہیں پایا جاتا۔ بھاؤ یا بتاؤ" اصطلاحاً رقص کے ذریعہ خاموش زبان پیدا کرنے اور خاموش الفاظ ظاہر کرنے کو کہتے ہیں۔

بھاؤ

"مدرا" سے مراد ہاتھوں کی مخصوص حرکات و سکنات ہیں۔ ہاتھوں کے ذریعہ رقاص پوری طرح ہر جذبہ، ہر خیال، ہر رائے اور ہر تصور کو ظاہر کرسکتا ہے۔ بشرطیکہ اس میں ذہانت اور حرکات اعضاء کی مشق بہ درجہ کمال پائی جاتی ہو۔ بعض اہل کمال ہاتھوں کی ترتیب اور گفتگو سے خط کا مضمون تک بتا دیا کرتے تھے۔ اور غالباً یہ خاموش تکلم حقیقی گفتگو سے بھی زیادہ دل نشیں اور ذہن رس ثابت ہوتا تھا۔ کیونکہ جوارح کی حرکت اپنے جمالیاتی اپیل کی وجہ سے بہت زیادہ قریب الفہم اور سریع التاثیر ہوتی ہے۔ نسبتاً زبان سے نکلی ہوئی آوازوں کے اب بھی مالابار اور جنوبی ہند میں ایسے ناٹک اور کتھا میں ہوتی ہیں جن میں "مدرا" یعنی ہاتھوں کے رقص کے ذریعہ اس کمال کو ظاہر کیا جاتا ہے لیکن یہ زبانِ حرکات اپنی قدیم آن بان سے ساتھ قائم نہیں ہے۔ زمانہ جدید کی ضرورتوں نے اس میں تبدیلی پیدا کردی ہے۔ لہٰذا قدرتی طور پر اس میں پھیکا پن پیدا ہوگیا ہے۔

"رس"

مختصراً رس جذبات کی حرکاتی شکل اور ہیولے کا نام ہے جسے جمالیاتی رنگ میں بہ کمال حسن و ترتیب اس طرح دیکھنے والوں کے ذہن پر نقش کیا جائے گویا وہ آئینے میں اپنے حسیات کا عکس دیکھ رہے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں "رس" چہرہ کے انعکاسِ جذبات کا نام ہے اور یہ مظاہرہ جذبات ہی پر ڈرامائی حرکت و عمل کی جان ہے۔ اگر چہرہ سے اظہارِ جذبات نہ ہو تو "مدرا" بیکار اور بے جان ہے۔

"رس" کے لفظی معنی ذائقہ اور جوہرِ خالص کے ہیں اور رس سے مراد یہ ہے کہ فطرت انسانی میں جو نشیب و فراز واقع ہوتے ہیں وہ ذائقہ کی مانند کڑوے، پھیکے، میٹھے، کھٹے وغیرہ ہوتے ہیں اسکے اظہار کے لئے رقص میں بھی رس مقرر کئے ہیں، جن کی تعداد عموماً نو ہے۔

(۱) "شانتی" (آرام۔ سکون) (۲) "شرنگارہ" (جذباتی) (۳) "رودرا" (غصہ ور) (۴) "ویرا" (شجاعت) (۵) "ادبھاتسا" (نفرت) "ہنسیا" (تفریح ہنسی مذاق) (۷) "کرونا" (رنج دہ) (۸) "ردھ بھوتا" (حیرت انگیز) (۹) "بھیانکا" (ڈراونی)۔

جس طرح کھانڈ، شکر کھٹائی نمک اور دیگر ذائقہ دار چیزیں اپنا اپنا ذائقہ الگ الگ رکھتی ہیں اور ان کو جس چیز میں شامل کرلیا جائے۔ وہ چیز ویسی ہی ہوجاتی ہے بالکل اسی طرح ان رسوں کو ایک خاص حرکت میں شامل کیا جاتا ہے جسے اصطلاحاً "سنچائی بھاؤ" کہتے ہیں جس کا مطلب مستقل حرکات رقص ہوسکتا ہے۔ "بھاؤ بتانا" ناچ کی ایک معروف اصطلاح ہے اور یہ بھی اسی ترتیب سے تعداد میں نو ہیں۔

(۱) "شاما" (اطمینان سکون) (۲) "رتی" (عشق) (۳) "کرودھا" (غصہ) (۴) "اتی ہہا" (ہمت) (۵) "جوگپسہ" (بے رغبتی بے تعلقی) (۶) "ہنیا" (دل لگی مذاق تفریحی حرکات وجذبات) (۷) "شوکا" (رنج) (۸) "وسمیایا" (تعجب وحیرت) "بھایا" (خوف)۔

تکلفات کے طور پر رقص میں رس کے علاوہ "سنچی" "بھاؤ" "ویبھاؤ" (شورش انگیز سکنات اور پُرجوش حرکات) شامل کی جاتی ہیں "انوبھاوا" (معمولی حرکات) "ساتچی بھاوا" (فالتو حرکات) بھی اپنے اپنے موقع محل سے استعمال کی جاتی ہیں۔ یہ سب حرکات اس طرح تنظیم اور ترتیب سے ہوتی ہیں کہ ان کے غلط یا بیجا استعمال سے سارا ناچ خراب ہوجاتا ہے اور رقص کا یہ نقص لوگوں کی طبیعتوں کو برہم اور جمالیاتی تصور کو مجروح کردیتا ہے۔ لہٰذا یہ سمجھنا چاہیئے کہ رس اظہار مسرت اور اظہار جذبات عالیہ کا ایک ایسا طریقہ ہے کہ اس کو بے ضابطہ بھی کہہ سکتے ہیں اور منظم بھی۔ اس کے بنیادی اصولوں میں سر مو فرق بھی نہیں ہوسکتا۔ اور وہ تمثیل و تشکیل جذبات کے اعتبار سے منفرد و مرکب صورتیں حسب خواہش و ضرورت حاصل کرتا بھی رہتا ہے اسکو نظم بے ضابطہ کہہ سکتے ہیں۔

"بھاؤ" عموماً تیس ہیں جن میں مشہور یہ ہیں :-

"نرویدا" (بے خودی) "جلانی" (زندگی) "شنکا" (تخیل) "اسویا" (حسد) "مد" (نشہ) "شرما" (تھکن اداسی) "ان سیا" (چاؤ) "چینیہ" (رنجوری) "چنتا" (فکر) "موہا" (جسم چرانا) "امرتی" (تصور) "دھرتی" (سلامت مزاجی) "ورودھا" (شرم) "چاپیتا"

(عدم استقلال) "ہرسا" (مسرت) "گروا" (جلد بازی) "سپنا" (خوبی)

تین قالتو حرکات کے علاوہ مستقل بھاؤ ایسے ہیں جن کے ذریعہ انسان جذبات کو سینہ کی گہرائیوں سے نکال کر ہاتھ اور آنکھ کے اشارہ سے دیکھنے والوں کے سامنے رکھ دیتا ہے۔

نظریہ انبساط یا رس فلاسفی کے اعتبار سے رقص نغمہ اور ہر ڈرامائی کیفیت میں ایک تنظیم و ترتیب اور رس کا پیدا کرنا ضروری ہے اور رقص میں اس التزام کو بدرجہ اتم مانا جاتا ہے تاکہ ذرا سی لغزش نہ ہونے پائے۔ یہ امر بھی خالی از دلچسپی نہیں کہ ہر جذبہ کے لئے ہندو اصنامیات میں ایک علیحدہ دیوی یا دیوتا اور رس کا ایک مستقل جذباتی رنگ ہے تاکہ جمالیاتی تصور حق الیقین کے ساتھ عین الیقین کی منزل بھی طے کرے جس کی مثالیں درج ذیل ہیں:۔

شانتی آرام اور سکون کے لئے سفید رنگ ہے اور ہندی روایت کے مطابق اسکا دیوتا "نارائن" ہے۔ "شرنگارہ" (حیاتِ قلب) کے لئے سبز رنگ ہے اور اس کو "وشنو" کا جلوہ سمجھا جاتا ہے۔ "رودرا" (وحشت) کا جذبہ ظاہر کرنے کے لئے سرخ رنگ ہے اور اس کے دیوتا کا نام بھی "رودرا" ہے۔ "ویرا" (شجاعت) سنہری رنگ کے ماتحت ہے اور اس کی دیوی "پرمتھا" ہے۔ "کرونا" (رنجیدگی) زرد رنگ کا ہے اور "شیوجی" اسکا دیوتا ہے۔ "ردہ بھوتا" (حیرت) نارنجی رنگ کے مثل ہے اور "برہما" اسکا دیوتا ہے۔ "بھیانکا" (خوف و دہشت) کے لئے سیاہ رنگ مقرر ہے۔ اور یہ کالی دیوی کے ساتھ منسوب ہے۔

"برصغیر کے مشہور رقص":۔

"رادھا کرشنا" رادھا اور کرشنا کے عشق اور گوپیوں کے ساتھ کرشن کی زندگی اور طلسماتی بانسری کے جذبات کا اظہار اس رقص میں کیا جاتا ہے۔

"گنگا پوجا" دریائے گنگا جو ہندوؤں کے نزدیک مقدس ہے اس کی پوجا کے موقع پر عموماً ناچ لڑکیاں کرتی ہیں۔

"رام چندرا" "وشنو دیوتا" کے ساتویں سروپ راجہ رام چندر کی یاد میں یہ رقص مندروں کے صحن میں نغمہ ستائش کے ساتھ ہوتا ہے۔

"اندرا" "راجہ اندر" کو آگ پانی ہوا، بادل، آسمان ستاروں اور کائنات کے دیگر مظاہرات کا دیوتا سمجھا جاتا ہے اس کے مختلف جلوے بحالت رقص دکھانا۔

"استرا پوجا" ہتھیاروں کی پوجا کا رواج جو بہت قدیم زمانہ سے رائج تھا۔ اس رقص میں ہتھیاروں کے مختلف "بھاؤ" بتائے جاتے ہیں۔

"گندھروا" راجہ اندر کے اکھاڑے کے پیشہ ور ناچنے گانے والوں طائفہ فن کے کمالات کا اظہار۔ علاوہ ازیں موسم بہار کا رقص "دیوی بیوکا" کے سامنے رقص "شیوجی" کے گھر لڑکا ہونے کی خوشی میں رقص۔ فصل پکنے کی خوشی میں تمام مردوں اور عورتوں کا مل کر رقص کرنا بھی رائج ہیں۔

ملکی اور غیر ملکی کی باتیں نہ ملک کے لئے مفید ہیں نہ آپ کے شایان شان۔ اب تو ہم سب پاکستانی ہیں۔ ہم نہ بلوچی ہیں نہ پٹھان، سندھی ہیں نہ بنگالی اور نہ پنجابی۔ ہمارے احساسات، ہمارا طرز عمل، ہمارا رویہ بھی پاکستانیوں جیسا ہونا چاہیے۔ ہمیں چاہیے کہ پاکستانی اور صرف پاکستانی کہلانے ہی پر فخر کریں۔

قائد اعظمؒ

حاضرات

غلام عباس

(اس ڈرامہ کے تمام کرداروں کے نام فرضی ہیں)

(۱۹۵۵ء کی آخری رات ہے۔ نئے سال یعنی ۱۹۵۶ء کی صبح ہونے میں چند گھنٹے رہ گئے ہیں۔ کراچی کا مشہور سوداگر سیٹھ حاتم بھائی اپنے دیوان خانے میں بے چینی سے ٹہل رہا ہے۔ اس کا پرانا ملازم نیاز داخل ہوتا ہے۔)

نیاز :- حضور ایک شخص آیا ہے جو ......

حاتم بھائی :- سمجھ گیا سمجھ گیا۔ جو مجھ سے ملنا چاہتا ہے؟

نیاز :- جی سرکار۔

حاتم بھائی :- تو لے آؤ اسے۔

نیاز :- (رکتے ہوئے) مگر حضور وہ عجیب قماش کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ لمبی لمبی زلفیں، گلے میں سبز کفنی۔ سرخ سرخ آنکھیں

حاتم بھائی :- میں سمجھ گیا تم لے آؤ۔

نیاز :- مگر سرکار ..... کیا عرض کروں۔ آدھی رات کو ایسے عجیب آدمی کا آنا .....

حاتم بھائی :- کچھ پروا نہیں (اس سوال و جواب سے تنگ آ کر) کہہ جو دیا کہ لے آؤ۔ میں اسی کا منتظر تھا۔

نیاز :- سرکار مالک ہیں .....

(دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہے گویا اب بھی تامل ہے آخر کمرے سے نکل جاتا ہے۔ اور تھوڑی دیر بعد ایک پراسرار درویش کو لئے ہوئے داخل ہوتا ہے سیٹھ حاتم بھائی اس دوران میں اور بھی بے چینی سے دیوان خانے میں گھومتا رہتا ہے)۔

نیاز :- حضور۔

حاتم بھائی :- (بات کاٹ کر) اچھی بات تم جاؤ۔

(نیاز بادل ناخواستہ چلا جاتا ہے)

حاتم بھائی :- کیوں شاہ صاحب وہ دکھ لے آئے تم۔

درویش :- (لرزتی ہوئی آواز میں) ہاں سیٹھ۔

حاتم بھائی :- (بے صبری سے) کہاں ہے؟

درویش :- یہ رہی ڈبیا میں۔

حاتم بھائی :- اور وہ اسم؟

درویش :- ہاں وہ اسم بھی۔

حاتم بھائی :- (اور بھی بے صبری سے) تو لاؤ وہ بھی دے دو۔

درویش :- (گنبھیر اور لرزتی ہوئی آواز میں) اسم بھی کبھی لکھے گئے ہیں سیٹھ!

(نیاز داخل ہوتا ہے)

حاتم بھائی :- کیوں نیاز کیا ہے؟

نیاز :- سرکار میں باہر ہی بیٹھا ہوں۔ جب ضرورت پڑے گھنٹی بجا دیجئے گا۔

حاتم بھائی :- اچھا۔ جاؤ۔

(نیاز جاتا ہے)

حاتم بھائی :- اب بتاؤ وہ اسم۔

درویش :- بتاتا ہوں۔ مگر یہ کام اطمینان کے ساتھ تنہائی میں ہونا چاہئے سیٹھ۔

حاتم بھائی :- کچھ فکر نہ کرو۔ یہاں کوئی نہیں آئے گا کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔

درویش :- پھر بھی دروازے کا بند ہونا ہی بہتر ہے۔

حاتم بھائی :۔ خیر یونہی سہی (دروازہ بند کر دیتا ہے)

درویش :۔ اس کمرے کا کوئی اور دروازہ بھی ہے؟

حاتم بھائی :۔ ہے تو مگر اس سے کبھی کوئی نہیں آتا جاتا۔

درویش :۔ تو بہتر ہے اسے بھی بند کر دو سیٹھ۔

حاتم بھائی :۔ خیر یہ بھی سہی۔ (دوسرا دروازہ بھی بند کر دیتا ہے) لو بس؟

درویش :۔ بس اب ٹھیک ہے۔ اس ڈبیا میں جو راکھ ہے پہلے فرش پر
اس سے ایک دائرہ بناؤ۔ اتنا بڑا کہ اس کے اندر دو پاؤں
بخوبی آ جائیں۔

حاتم بھائی :۔ کتنے بڑے پاؤں؟

درویش :۔ بس ہمارے تمہارے پاؤں کے برابر لیکن اگر ابلیس کی
روح کو بلانا ہو تو دائرے کو ڈھائی گنا بڑا ہونا چاہیئے۔

حاتم بھائی :۔ نہیں نہیں میں ابلیس کی روح کو نہیں بلانا چاہتا۔

درویش :۔ (خوش ہو کر) خوب خوب بہت ہی مناسب میں ابلیس
کی روح سے بہت ڈرتا ہوں۔ (لرزتی ہوئی آواز میں)
اف وہ قوی ہیکل روح۔ اس کا خوفناک چہرہ۔ میں اس کی
طرف دیکھنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا۔

حاتم بھائی :۔ تم خاطر جمع رکھو شاہ صاحب۔ میں ابلیس سی روح کو نہیں
بلاؤں گا۔ ہاں وہ اسم ......؟

درویش :۔ تو بس پہلے فرش پر اس راکھ سے دائرہ بناؤ۔ اور جب
دائرہ بن جائے۔ تو راکھ کو دیا سلائی دکھا دو۔ بس راکھ سلگ
اٹھے گی اور دھواں دونوں طرف بڑھے گا۔ یہاں تک کہ چکر
پورا ہو جائے گا۔ جیسے ہی دونوں طرف کے دھوئیں ملیں۔
ٹھیک اس وقت تم یہ اسم پڑھ دینا (سیٹھ کے قریب آ کر کان میں
بتلاتا ہے) پھر جس روح کو تم بلانا چاہو۔ اس کا نام لے دینا بس وہ آموجود
ہوگی۔ اور تمہاری ایک فرمائش پوری کر دے گی۔ صرف ایک فرمائش پہلی فرمائش
..... مگر جان لو سیٹھ کہ یہ معاملہ بڑا خطرناک ہے۔

حاتم بھائی :۔ تم کوئی اندیشہ نہ کرو شاہ صاحب۔ اچھا تو پھر۔

درویش :۔ تو سیٹھ روحیں کئی قسم کی ہیں۔ موت کی روح ہے۔ قحط کی روح
ہے۔ وبا کی روح ہے۔

حاتم بھائی :۔ (فرش پر راکھ سے دائرہ بناتے ہوئے) دیکھو یہ دائرہ ٹھیک
بن رہا ہے نا؟

درویش :۔ ٹھیک ہے

حاتم بھائی :۔ ہاں تو کیا کہا تم نے! موت کی روح ہے قحط کی روح ہے۔
وبا کی روح ہے۔ یہ تو کچھ گھناؤنی سی روحیں ہیں۔ میں تو کسی
خوش مذاق روح کو بلانا چاہتا ہوں۔

درویش :۔ (تشویش ناک لہجے میں) دیکھو سیٹھ۔ وبا کی روح کو بلا لو۔ اور
دل چاہے تو خوف کی روح کو بلا لو۔ مگر خدا کے واسطے ہنسی کی
روح کو ہرگز نہ بلانا۔

حاتم بھائی :۔ تو کیا ہنسی کی بھی کوئی روح ہے! واہ وا۔ یہ تو عین میرے
مذاق کے مطابق ہے۔ بس میں اسی کو بلاؤں گا۔

درویش :۔ ایسی غلطی نہ کر بیٹھنا سیٹھ۔ میں اس روح سے بہت ڈرتا ہوں۔
تم کو بھی اس سے ڈرنا چاہیئے۔

حاتم بھائی :۔ لیکن آخر کیوں؟

درویش :۔ بس میں جو کہتا ہوں۔ تم میری بات مانو۔ اور اس کا خیال دل
سے نکال ڈالو۔ یہ بہت خوفناک روح ہے (جیسے یاد کر کے
لرز اٹھتا ہے) اف ہنسی کی روح!

حاتم بھائی :۔ لیکن کوئی وجہ بھی تو ہو۔ آخر تم کو کیا اعتراض ہے؟

درویش :۔ سنو سنو۔ یہ سب روحیں انسان کی بدترین دشمن ہیں۔ اور
سب کی سب بلا کی چالاک اور کینہ ور ہیں۔ دس بیس سو دو سو
برس سے نہیں۔ ان گنت صدیوں سے یہ سر جوڑے بیٹھی منصوبے
بناتی رہتی ہیں۔ کہ کس طرح انسان پر غالب آئیں، کس طرح اسے
نیچا دکھائیں۔ صدیوں سے ان گنت صدیوں سے سیٹھ۔ پھر
جب کبھی وہ کوئی منصوبہ بنا لیتی ہیں تو انہیں اس پر عمل کرنے کی
دھن لگ جاتی ہے۔ اور جب تک وہ پورا نہیں ہو جاتا انہیں
چین نہیں پڑتا۔ وہ انسان سے اس قدر کینہ رکھتی ہیں سیٹھ کہ
تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ وہ سب کی سب اسی تماش
کی ہیں کوئی کم کوئی زیادہ اور ایسے موقع کی تو وہ خاص کر تاک میں
رہتی ہیں جب ان سے کوئی فرمائش کی جائے۔

حاتم بھائی :۔ اچھا تو ہم موت کی روح کو نہیں بلائیں گے۔ ہم ہنسی کی
روح کو بلائیں گے۔

درویش :۔ ہنسی کی روح، موت کی روح سے کہیں زیادہ ہولناک
ہے سیٹھ۔ اس کی ہنسی اس کی دل لگی، اس کے قہقہے انسان کی

فہم سے بعید ہوتے ہیں۔

حاتم بھائی:۔ دیکھو شاہ صاحب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں ہنسی کی روح ہی کو بلاؤں گا۔

درویش:۔ دیکھو سیٹھ میں پھر خبردار کئے دے رہا ہوں۔

حاتم بھائی:۔ (خوش طبعی سے) اجی آپ اس کا نام تو بتلایئے شاہ صاحب۔

درویش:۔ دیکھو سیٹھ میں ——

حاتم بھائی: (بات کاٹ کر) شاہ صاحب تم ناحق میرا وقت ضائع کر رہے ہو۔ تم کو اس سے کیا میں جسے چاہوں بلاؤں۔ کیا میں نے تمہیں منہ مانگے دام نہیں دے دیئے؟

درویش: ہاں دے دئے۔ لیکن تم کو آگاہ کرنا بھی تو میرا فرض ہے۔

حاتم بھائی: (کسی قدر درشتی سے) تمہاری اس خیر خواہی کا شکریہ۔ ان باتوں کو چھوڑو۔ اور ہنسی کی روح کا نام بتاؤ۔

درویش: (عاجز آکر) اچھا تم نہیں مانتے تو سنو۔ اس کا نام ہے ..... قہ قہ

حاتم بھائی: قہ قہ! خوب۔ بڑا بھلا نام ہے۔ ہاں وہ اسم پھر بتلانا شاہ صاحب۔

(درویش دوبارہ سیٹھ کے قریب آکر اس کے کان میں کچھ کہتا ہے۔ سیٹھ سر ہلاتا ہوا دائرے کے قریب جاتا ہے اور جیب سے دیا سلائی کی ڈبیہ نکالکر ایک تیلی جلاتا ہے)

حاتم بھائی: کس جگہ دیاسلائی دکھاؤں؟ ..... یہاں؟

(درویش سر سے ہاں کا اشارہ کرتا ہے اور سیٹھ راکھ میں آگ لگا دیتا ہے۔ دھواں دونوں طرف پھیلنے لگتا ہے اور جب دونوں سرے ملتے ہیں تو دھوئیں میں سے روح نمودار ہوتی ہے)

حاتم بھائی: ارے یہ سفید چادر میں لپٹا ہوا کون آکھڑا ہوا؟

درویش: (لرزتی ہوئی آواز میں) یہ ہنسی کی روح قہ قہ ہے سیٹھ۔

قہ قہ:۔ (خوفناک قہقہہ لگا کر غضبناک آواز میں) تو مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ مانگ کیا مانگتا ہے؟

درویش: (خوشامدانہ لہجہ میں) سیٹھ کوئی ایسی فرمائش نہ کر بیٹھنا جس پر یہ اپنی گھات چلا سکے۔

حاتم بھائی: تم خاطر جمع رکھو میں بہت معمولی سی چیز مانگوں گا میں نے خوب سوچ رکھا ہے۔

درویش: ہاں بس ایسی ہی چیز ہو۔

قہ قہ: تو مجھ سے کیا طلب کرتا ہے؟

حاتم بھائی: بس ایک معمولی سی چیز۔

قہ قہ:۔ یعنی؟

حاتم بھائی: روزنامہ "ستارہ" کا ایک فائل۔ اخبار "ستارہ" کا ایک فائل!

قہ قہ: کس سال کا؟

حاتم بھائی: (ایک ایک لفظ پر زور دے کر) ۱۹۵۶ء انیس سو چھپن کا۔

قہ قہ: (اشارہ کرکے) لے وہ رہا فائل

(سیٹھ کے سامنے والی تپائی پر فائل نظر آتا ہے)

حاتم بھائی: (خوش مذاقی سے) شکریہ بیگم صاحبہ۔ بہت بہت شکریہ۔

قہ قہ:۔ یہ فائل تیرے پاس صرف ایک گھنٹہ رہے گا۔ پھر یہ غائب ہو جائے گا۔

حاتم بھائی: ایں۔ اس قدر جلد؟

قہ قہ: اسے دور دراز مقام پر جانا ہے اور صبح سے پہلے پہلے اس کا پہونچنا ضروری ہے۔

حاتم بھائی: کہاں؟

قہ قہ: وقت کے اتھاہ ساگر میں۔

(روح غائب ہو جاتی ہے)

حاتم بھائی: یہ کہاں چلی گئی؟

درویش: جہاں سے آئی تھی۔

حاتم بھائی: تو مجھے وقت ضائع نہ کرنا چاہیئے پنسل کاغذ کہاں ہے۔

(تپائی کی طرف جس پر فائل رکھا ہے جاتا ہے اور قریب بیٹھ کر فائل کو دیکھتا ہے)

درویش: سیٹھ شکر ہے کہ تم نے اس سے معمولی سی چیز ہی مانگی۔

حاتم بھائی: ہوں۔ تم اس کو معمولی کہتے ہو!

درویش: میں ان کی گھاتوں سے خوب واقف ہوں۔

حاتم بھائی: ہوں۔ معمولی سی چیز۔ نادان میں اس سے کروڑوں پیدا کروں کروڑوں!

درویش: خبردار سیٹھ اس روح کے شر سے بچنا۔
حاتم بھائی: (اخباروں کے ورق اُلٹتے ہوئے) میں صرف اس پہلے پرچے ہی سے لاکھوں پیدا کروں گا۔ (پڑھتے ہوئے)
۳۱۔ دسمبر ۱۹۵۶ء۔ واہ وا۔ کیا سلیقہ ہے۔ وہی ترتیب۔ جس طرح اخبار والے اپنے فائل رکھا کرتے ہیں۔ سب سے اوپر دسمبر کے پرچے۔ اس کے نیچے نومبر، اکتوبر، ستمبر وغیرہ کے اور سب سے نیچے جنوری کے۔ صرف یہی دسمبر کا آخری پرچہ۔ میری تمام دولت، میری تمام متاع سے زیادہ قیمتی ہے۔ لو سنو۔ سونے کا بھاؤ۔ سونا تیز۔ ابی ایک سو چار روپے سات آنے نو پائی۔ او ہو۔ تقریباً چار روپے فی تولہ بڑھ گیا۔ جاؤ جاؤ شہر میں تمہیں جس قدر سونا مل سکے خرید لو — جاتے کیوں نہیں۔ ہوں تم کیا جانو!
درویش: قہقہے سے ملنے والی دولت مجھے نہیں چاہیئے سیٹھ۔
حاتم بھائی: پگلا کہیں کا۔ قہقہہ کا اس سے کیا واسطہ۔ وہ تو جا چکی اور یہ تو میں ۳۱۔ دسمبر ۱۹۵۶ء کے اخبار میں پڑھ رہا ہوں کہ سونے کا بھاؤ چار روپے چڑھ گیا۔ تم کو منظور نہیں نہ سہی۔ میں تو لکھے لیتا ہوں۔ (پنسل سے کاغذ پر لکھتا ہے) مجھے تھوڑے ہی دنوں میں معلوم ہو جائے گا کہ فائل اصلی ہے یا نقلی۔
درویش: یہ نقلی نہیں ہو سکتی سیٹھ۔ قہقہہ ہے تو بڑی مکار اور کینہ پرور مگر وہ جھوٹی نہیں۔ روحیں بھی کبھی جھوٹی ہوتی ہیں سیٹھ۔
حاتم بھائی: بے شک تم سچ کہتے ہو۔ یہ فائل اصلی معلوم ہوتا ہے اور میں یقیناً اس سے کروڑوں پیدا کروں گا۔ لو اور سنو۔ سترہ دسمبر۔ اپاہج پر سے کنٹرول اٹھ گیا —— (جلد جلد کاغذ پر لکھتا ہے) —— شاہ صاحب میں نے تمہیں بہت کم معاوضہ دیا ہے تمہاری خدمت کا لاکھواں حصہ بھی نہیں۔ ٹھہرو میں تمہیں ابھی نہال کئے دیتا ہوں۔
درویش: نہیں سیٹھ مجھے تو معاف ہی رکھو۔ قہقہے سے ملنے والی دولت مجھے درکار نہیں۔
حاتم بھائی: ارے قہقہہ کیسی یہ تو میں تمہیں دیتا ہوں۔ دنیا میں فقط میں ہی ایک شخص ہوں جس کے پاس ستارہ کا یہ فائل ہے۔ (ورق اُلٹتے ہوئے) ارے لو۔ آٹھ اگست شاک ایکسچنج کی خبریں۔ آہاہا ہا او ہو ہو ہو (جلد جلد کاغذ پر لکھتا ہے) دنیا میں تنہا میں ہی ایک ایسا شخص ہوں جس کو معلوم ہے کہ آج سے آٹھ ماہ بعد کس کس کمپنی کے حصے کتنے کتنے بڑھے، کتنے کتنے گھٹے۔ کس کس کمپنی نے ترقی کی۔ کس کس کا دیوالہ نکل گیا۔ او ہو ہو ہو۔ واللہ تجارت کی منڈیوں میں ہلچل ڈال دونگا سٹہ بازوں کا بھُرکس نکال دوں گا۔ کروڑوں، نہیں نہیں اربوں، واللہ اربوں ...... شاہ صاحب اگر تم ایک لاکھ روپیہ بھی لینا چاہو۔ تو میں تمہیں ابھی چیک دے سکتا ہوں۔ دولت کی اب میری نظروں میں کوئی حقیقت نہیں۔
درویش: نہیں سیٹھ مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔
حاتم بھائی: اچھا تو دو لاکھ .... پانچ لاکھ ....
درویش: نہیں سیٹھ مجھے اب کچھ نہیں چاہیئے
حاتم بھائی: تو تم جانو۔ (اخباروں کے ورق اُلٹتے ہوئے ایک دم رُک کر) ۲۲۔ جولائی۔ ارے ارے ارے دس ہزار ٹن دوائیوں سے لدا ہوا جہاز ڈوب گیا۔ چشم زدن میں غرقاب ہو گیا .....
۲۰۔ جولائی۔ ہائے ہائے میرا پرانا دوست اور اردو کا مشہور شاعر سہیل کرمانوی چل بسا۔ بیچارہ مری کی ٹھنڈی فضاؤں کے مزے لے رہا تھا کہ اچانک پاؤں پھسلا اور وہ خندق میں گر کر ہلاک ہو گیا۔ میں اسے مری نہیں جانے دوں گا۔ میں اسے اپنا مہمان رکھوں گا۔ میں اُسے کمرے میں بند کر دوں گا پھر دیکھوں گا وہ مری کیسے جاتا ہے، میں اس کی جان بچاؤں گا۔ خواہ مجھے تقدیر ہی سے کیوں نہ لڑنا پڑے...
درویش: (بات کاٹ کر) سیٹھ میری ایک بات سنو۔ تم نے مجھے روپیہ دیا۔ میں نے تمہاری ملاقات روحوں سے کرا دی۔ ہمارا تمہارا حساب برابر ہو گیا۔ اب میں اجازت چاہتا ہوں۔
حاتم بھائی: (اخباروں کے مطالعہ میں غرق بے خیالی سے) کیسی اجازت؟
درویش: میں جانا چاہتا ہوں۔
حاتم بھائی: جیسی تمہاری مرضی۔
درویش: اچھا سیٹھ۔ اللہ تعالیٰ تم کو اپنی امان میں رکھے۔ تمام خبیث

روحوں میں بھی سب سے زیادہ ہنسی کی روح سے ڈرتا ہوں۔

حاتم بھائی:- یہ تم پہلے بھی کہہ چکے ہو۔

درویش:- اچھا سیٹھ خدا حافظ۔

حاتم بھائی:- ذرا رکو۔ میں تمہیں ایک تحفہ دینا چاہتا ہوں بس ذرا سی دیر۔

درویش:- نہیں سیٹھ مجھے جانے دو۔

حاتم بھائی:- بس بن گیا کام (اخبار پڑھتے ہوئے) ۲ فروری۔ کراچی ریس کورس "بارہ" نامی گھوڑا اوّل رہا۔ بس تم اس گھوڑے پر جتنی رقم بھی نکال سکتے ہو، لگا دو، ایک کے دس دس پاؤ گے۔ لو میں تمہیں کاغذ پر گھوڑے کا نام لکھے دیتا ہوں، (کاغذ پر لکھتا ہے) یہ گھوڑ دوڑ ایک مہینہ اور دو روز بعد کراچی میں ہوگی۔ لو یہ کاغذ سنبھال کر رکھنا۔

درویش:- نا سیٹھ۔ میں باز آیا۔ اس گھوڑ دوڑ سے۔ اپنا کاغذ تم اپنے ہی پاس رکھو۔

حاتم بھائی:- دیکھو شاہ صاحب۔ یہ فائل میرے پاس صرف چند منٹ اور رہے گا، اور میں انہیں فضول باتوں میں گنوانا نہیں چاہتا، ایک ایک لمحہ ایک ایک لاکھ سے زیادہ قیمتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲۸ جنوری لکڑی کا بھاؤ بارہ روپے مکعب فٹ ۔ ۔ ۔ ۔ بس اتنا ہی بہت ہے، اسی سے میں اربوں کما لوں گا ۔ ۔ ۔ ۔ شاہ صاحب تمہارا بہت بہت شکریہ۔ اس مرتبہ تمہاری قدرت اپنی سب دل لگی بھول جائے گی۔

میں آج دنیا کا سب سے امیر آدمی ہوں۔

درویش:- ابھی یہ کہنا قبل از وقت ہے سیٹھ۔

حاتم بھائی:- ابھی نہیں تو چند روز میں سہی۔

درویش:- اب زیادہ نہ پڑھو سیٹھ۔ قدرت کو زیادہ اشتعال نہ دلاؤ۔

حاتم بھائی:- بس ختم کیا چاہتا ہوں۔ مجھے اب اتنا علم ہوگیا ہے کہ دنیا بھر کے جوتشیوں اور عاملوں کے سر پھرا سکتا ہوں۔

درویش:- تو بس اب اس کو چھوڑ دو۔

حاتم بھائی:- تم جانتے ہو یہ کس تاریخ کا پرچہ ہے؟ یکم جنوری ۱۹۵۶ء کا یعنی آج کا۔ یعنی جو پرچہ چند گھنٹے میں چھپ کر لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا۔ میں سونے سے پہلے یہ اخبار ضرور پڑھوں گا۔ اب ہم ۱۹۵۶ء کے دور میں ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا خدا حافظ شاہ صاحب۔

درویش:- خدا حافظ سیٹھ۔

(رخصت ہو جاتا ہے)

(حاتم بھائی انگڑائی لیتا ہے۔ اور پھر اخبار پر سرسری سی نظر ڈالتا ہے۔ اس کے چہرے سے اکتاہٹ ظاہر ہوتی ہے)

حاتم بھائی:- ہونہہ۔ کتنا پھیکا، کتنا بے لطف پرچہ ہے، کوئی دلچسپ خبر نہیں، کوئی کام کی بات نہیں نئے سال کا پہلا پرچہ تو خاص اہتمام سے شائع کرنا چاہئے تھا۔

(ورق الٹتا ہے اور اچانک بھونچکا رہ جاتا ہے۔ وحشتناک آوازیں)

خدایا یہ کیا! غلط غلط سراسر غلط۔ بالکل ناممکن۔ میں تو بفضل خدا زندہ سلامت ہوں، پھر یہ غلط خبر کس بے وقوف جاہل نے چھاپ دی! ۔ ۔ ۔ ۔ اور یہ آج کا اخبار ہے۔ اُف اُف (آواز میں کرب "دم گھٹا ہوا") کراچی کے مشہور سوداگر حاتم بھائی دفعتہً حرکتِ قلب بند ہونے سے انتقال کرگئے" (آواز بیٹھ جاتی ہے) کیسی بے تکی بات، کس قدر جھوٹ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نیاز! (گلے سے آواز نہیں نکلتی۔ بمشکل گھنٹی بجانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ جب تک نیاز آئے، لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑتا ہے۔ اخبار "ستارہ" کا فائل غائب ہو جاتا ہے۔)

نیاز:- (داخل ہو کر) ہیں حضور گرے پڑے ہیں سیٹھ صاحب! سیٹھ صاحب! منہ سے جھاگ نکل رہا ہے۔ الٰہی انہیں کیا ہوگیا۔ اور یہ کاغذ کیسے بکھرے پڑے ہیں۔ (ایک دو کاغذوں کو اٹھا کر پڑھتا ہے) "سونا تیزابی ایک سو چار روپے سات آنے تو پائی" "دس ہزار ٹن دوائیوں کا جہاز ڈوب گیا" اونہہ کیا واہیات (تمام کاغذوں کو اٹھا کر دیکھتے ہوئے آتش دان میں ڈال دیتا ہے۔ پھر سیٹھ کی طرف متوجہ ہوتا ہے) سیٹھ صاحب سیٹھ صاحب میرے اللہ یہ تو جواب ہی نہیں دیتے، (جسم پر جھک کر نبض کو ٹٹولتا ہے)، نبض بھی نہیں چلتی۔ دل کی حرکت بھی بند ہے۔ کہیں یہ چل تو نہیں بسے۔ ہائے میرے آقا (سوچتا ہے) اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ پولس کو خبر کروں، ڈاکٹر کو بلاؤں، اخبار کو اطلاع دوں! (ٹیلی فون کے قریب جا کر متعدد مرتبہ ڈائیل گھماتا ہے)۔ سب سوئے پڑے ہیں، گھنٹی کی آواز کوئی سنتا ہی نہیں۔ (پھر کوشش کرتا ہے) ہیلو، کون؟ روزانہ

(باقی صفحہ ۵۲ پر)

ماہ نو، کراچی، جنوری ۱۹۵۶ء

افسانہ

آسیب

حمید کاشمیری

اونچے اونچے سر بفلک پہاڑوں کے نشیب میں ایک سرسبز و شاداب وادی میں زرد آلو، آلوچے اور ناشپاتی کے درختوں میں گھرا ہوا ایک حویلی نما بوسیدہ مگر وضعدار مکان ہے۔ مکان کی چھت لوہے کی چادروں کی ہے۔ اور دیواریں پکّے پتھر کی جن میں سیمنٹ کی ٹیپ کی گئی ہے۔ مگر دیواروں میں ہلکے ہلکے شگاف سے پڑ گئے ہیں۔ دروازوں کا رنگ اڑا ہوا ہے۔ اور روشندانوں کے شیشے ٹوٹے ہوئے ہیں۔ مکان کے عقب میں انار کا ایک بہت بڑا جھنڈ دار درخت ہے۔ جس پر گذشتہ کئی برس سے جنات کے قابض ہونے کی خبر مشہور ہے۔ احاطے کے گرد کافی وسیع رقبے میں ایک ٹوٹی پھوٹی زنگ آلود کانٹے دار باڑھ لگی ہوئی ہے۔ اور جو اس درجہ شکستہ ہو چکی ہے کہ چوپائے تک آسانی سے اندر داخل ہو سکتے ہیں۔ مکان سات برس سے غیر آباد ہے۔ سات برس پہلے جب مکاندار احاطے میں رہتے تھے تو یہ کانٹے دار باڑھ جالی سے بھی زیادہ باریک بنی ہوئی تھی جس میں سے چڑیاں تک بھی اندر داخل نہ ہو سکتی تھی اور نشیبی بستیوں کے لوگ جب دودھ گھی اور مکھن وغیرہ فروخت کرنے کے لئے صبح صبح چھاؤنی جاتے تھے تو انہیں احاطے کی وجہ سے بہت لمبا راستہ طے کر کے احاطے کے اوپر والے راستے میں پڑنا پڑتا تھا۔ مگر اب جب کہ باڑھ ٹوٹ ٹاٹ گئی ہے تو گاؤں والوں نے احاطے کے بیچ میں سے چلنا شروع کر دیا اور جیسے صدیوں پرانی پگڈنڈی سی بن گئی اور مکان کے بائیں جانب سے نکلتے ہوئے چشمے پر دیہاتی عورتوں نے کپڑے دھونے اور مویشی نہلانے شروع کر دیئے اور اسی چشمے کو دیکھنے کے لئے دیہاتی عورتیں ترسا کرتی تھیں۔ مکان کی رکھوالی اور احاطے کی دیکھ بھال کے لئے پورے سات برس سے خانو بڑھئی کو ماہانہ منی آرڈر مل رہا ہے مگر خانو پھر بھی احاطے کی حفاظت نہ کر سکا۔ گاؤں والوں کے سامنے اس کی کوئی پیش نہ چلی۔ سارے گاؤں کا گاؤں مستفید ہو رہا تھا گاؤں والوں نے تو خانو کو احاطے کا پھل تک نہیں بیچنے دیا حالانکہ اسے اجازت مل چکی تھی کہ وہ پھلوں کو بیچ کے اپنے لئے روپیہ حاصل کرتا رہے۔ بس خانو بے چارہ تو اپنا منہ تکتا رہ گیا اور مکان اور احاطے کو گاؤں والوں ہی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا کبھی کبھار منی آرڈر کے ساتھ جب خط بھی آ جاتا اور احاطے کی اور احاطے کے حالات دریافت کئے ہوتے تو خانو ہر چیز کی خیر خیریت کی اطلاع دے دیتا........

ساتویں سال کے "سیزن" میں جب ایک بار خانو کو مالکن کا خط ملا کہ وہ گرمیاں گزارنے پہاڑ پر آ رہی ہیں لہذا مکان صاف کروا دیا جائے، تو خانو نے اس خط کو کوئی اہمیت ہی نہ دی وہ جانتا تھا کہ مالکن نہیں آئے گی اسے قریباً ہر سیزن میں ایک ایسا ہی خط مل جایا کرتا تھا۔ مگر دوسرے ہی روز اچانک اسے ایک تار ملا دیکھتے ہی خانو نے پھوٹ پھوٹ کے رونا شروع کیا اور روتے روتے جب اچانک اسے خیال آیا کہ اس کا پردیس میں کوئی مرنے والا ہی نہیں تو قدرے تسلی ہوئی اور جب چھاؤنی جا کر اس نے تار پڑھوایا تو اسے پکا یقین ہو گیا کہ مالکن اسی مہینے کی سولہ تاریخ کو پہاڑ پہ آ رہی ہیں۔ اگرچہ مکان برسوں کی دھول سے اٹا ہوا تھا اور کمروں میں جابجا مکڑی کے جالے لٹک رہے تھے لیکن پھر بھی خانو نے ایسی محنت سے صفائی کی تھی کہ مکان کا گوشہ گوشہ چمک اٹھا تھا اور بسنے گھر کی سی رونق آ گئی تھی۔ مقررہ تاریخ کو جب ریل گاڑی، بس، تانگہ اور پھر طویل پیدل سفر کرنے کے بعد جب مالکن اپنی دو جوان لڑکیوں اور ایک کمسن لڑکے اور سامان اٹھائے ہوئے قلیوں کے ساتھ پہاڑ کی ڈھلکی سے نیچے نشیب کی طرف اتر رہی تھی تو راستہ چلنے والوں کی آنکھیں جیسے چکاچوند ہو گئیں۔ مالکن جب یہاں سے گئی تھی تو اس وقت رفعت اور رضیہ دونوں چھوٹی چھوٹی گڑیا سی تھیں، مگر اب تو نقشے ہی بدل گئے تھے۔ جوانی تھی کہ سیلاب کی طرح امڈی چلی آ رہی تھی انگاروں کی طرح دہکے ہوئے چہرے، چست لباس سے پھوٹ پھوٹ کے نکلتا ہوا جسم، دلکش انداز سے پھیلے ہوئے سینے، جدید وضع کے بنائے ہوئے بال، پیشانی پر مارلن مانرو ٹائپ کے بالوں کے گچھے۔ اور آنکھوں پر سرخ فریم والا سیاہ چشمہ

جس کے نرمیوں کا رنگ ہونٹوں کی لپ اسٹک سے میل کھاتا تھا۔ گاؤں کے جس شخص نے بھی راستے میں انہیں دیکھا اسے اپنی آنکھوں پر دھوکا سا ہونے لگا۔ خانو بڑھئی کی جب نظر پڑی تو وہ ہانپتا ہوا ڈھکی کی طرف استقبال کے لئے بھاگا۔ بڑے احترام سے مالکن کے پاؤں چھو کر سلام کیا۔ پھر لڑکیوں کی طرف متحیر نظروں سے دیکھا۔ کچھ کہنا چاہا مگر جراٴت نہ ہوئی۔ سلام کر کے رہ گیا۔ احتراماً رفعت کے ہاتھ سے اٹیچی کیس لے لیا اور فاصلہ قائم کر کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اور مکان تک اسی خدمت گذارانہ انداز سے چلتا رہا ......

مالکن تو بہت خوش تھی جیسے کوئی نئی نویلی دلہن میکے لوٹ رہی ہو لیکن رفعت اور رضیہ کچھ عجیب اجنبی اجنبی انداز سے مکان کو گھورتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔ ایک ایک کمرے میں گھس کر اچھی طرح دیکھا۔ کھڑکیوں اور کواڑوں کو کھینچ تان اور کھول بند کر کے جائزہ لیا۔ پھر امی کے کہنے سے سارا سامان مناسب جگہوں پر قرینے سے رکھا۔ کتابیں صندوق سے نکال کر شلف میں سجا دیں۔ فالتو سامان پچھلی کھولی میں رکھوایا۔ تین کمروں میں تین پلنگ بچھائے بستر لگا دئے۔ اور پلنگ پوشوں سے ڈھانپ دیئے۔ امی نے دوپہر کا کھانا تیار کیا تینوں ماں بیٹیوں اور ننھے جاوید نے مل کر کھانا کھایا اور کھانے کے فوراً ہی بعد تھکان نے ایسی نیند غالب کی کہ شام تک گھر کا گھر سویا رہا۔ اور خانو صحن میں بیٹھا بچے کھچے کھانے کی ہڈیاں چچوڑتا رہا۔!

امی نے لمحہ بھر کے لئے جو کروٹ بدل کے نیم خوابی کے عالم میں آنکھ کھولی تو اچانک ان کی نظر دیوار پر لگے ہوئے کلاک پر پڑی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں آنکھیں ملتی ہوئی رفعت کے کمرے کی طرف آئیں۔ وہ ابھی تک گہری نیند سو رہی تھی۔ انہوں نے رفعت کو جھنجوڑ کر جگایا اور پھر لپک کر رضیہ کو بھی اٹھایا۔ ننھا جاوید ابھی تک سو رہا تھا۔ اسے سوتا ہوا ہی چھوڑ کر تینوں آنکھیں ملتی ہوئیں باہر صحن میں نکل آئیں۔ خانو بدستور چوکی پر پہرے داروں کے انداز سے بیٹھا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی احتراماً اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہم بہت دیر سوئیں تم نے جگایا کیوں نہیں" امی نے خانو سے کہا۔

"میں نے سوچا آپ بہت تھک گئی ہوں گی اس لئے ....." خانو نے جواز پیش کیا۔

"اچھا بتیاں صاف کر کے جلا دو" رفعت نے حکم دیا اور تینوں ماں بیٹیاں منہ ہاتھ دھونے کے لئے چشمے پر چلی گئیں۔ جھرنا برساتی نالے کی سی تیزی سے بہہ رہا تھا اور پانی میں برف کی سی خنکی اور ہلکی ہلکی مٹھاس تھی۔ چشمے کے گرد بے ڈھب پتھروں کی قد آدم دیوار لگی ہوئی تھی اور پانی کی شدت کی وجہ سے دیوار کی دراڑوں اور سیلی زمین پر لمبی لمبی ہری گھاس اگی ہوئی تھی جو آئے دن مویشیوں کا چارہ بننے کے باوجود گز بھر اونچا قد نکالے ہوئے تھی۔ امی دیوار کے پیچھے جا کر دیر تک صرف پانی کے پھوٹتے ہوئے دھارے کو دیکھتی رہیں جو بدستور سات سال پہلے کی سی شان کے ساتھ بہہ رہا تھا جبکہ ہر چیز خرد برد ہو گئی تھی۔ کتنے ہی درخت گاؤں والوں نے کاٹ دیئے تھے۔ احاطے کے گرد لگی ہوئی باڑھ اکھاڑ دی گئی تھی کھیتوں کی مینڈیں گرا دی گئی تھیں۔ کھڑکیوں اور روشندانوں کے بیشتر شیشے ٹوٹ گئے تھے مگر اس پانی کا غرور قائم تھا اس کی سالمیت میں رتی بھر فرق نہ آیا تھا۔

"امی جلدی سے فارغ ہو جاؤ" چشمے کی دیوار کے باہر سے رفعت چہکی۔ اور امی نے جلدی جلدی منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے شروع کئے اور اس کے بعد رضیہ اور رضیہ کے بعد جب رفعت اندر گئی تو اس کا جی چاہا کہ اس پانی کو اپنی نس نس میں سمو لے۔ اس نے ایک نظر اوپر پہاڑ کی چوٹی پر دیکھا جہاں سورج کی زرد زرد کرنیں اب بھی موجود تھیں۔ اور تاریک سائے ان کرنوں کو ہڑپ کرنے کے لئے بادلوں کی طرح نشیب سے اوپر کی طرف بھاگ رہے تھے۔ رفعت نے اونچی ہو کر دیوار کے باہر جھانکا تو امی اور رضیہ کھڑی انتظار کر رہی تھیں۔ اس نے جلدی سے کپڑے اتار دیئے ہوا کے تیز جھونکوں نے اس کے جسم کا محاصرہ کر لیا اس نے بازو سکیڑے اور سمٹ سمٹا کر جھم سے جھر جھر بہتے پانی کے نیچے دبک گئی۔ اور اس نے عجیب لطافت سی محسوس کی اس اشنان میں جو شہر میں اسے سو سال تک بھی میسر نہ آ سکتی۔ اور اگر امی اور رضیہ باہر سے چلا نہ اٹھتیں تو نجانے رفعت کتنی دیر تک یونہی پانی میں دبکی رہتی۔ جب وہ نہا کر چشمے سے باہر نکلی تو اسے محسوس ہوا کہ جیسے وہ گاؤں کی دوسری دنیا میں آنے کے بعد کسی تیسری دنیا میں آگئی ہو۔ وہ سر سے پاؤں تک ٹھنڈک محسوس کر رہی تھی اس نے ہلکی سی ایک جھرجھری لی۔ امی نے گھوم کر دیکھا اور بولیں۔

"واہ یہ بھی کوئی نہانے کا وقت تھا"

"بس ہماری مرضی" رفعت اٹھلائی۔

پھر تینوں ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے گھر کی طرف چلنے لگیں۔ مکان کے عقب میں جب وہ انار کے جھنڈ دار درخت کے پاس پہنچیں تو امی باتیں کرتی کرتی ایک دم خاموش ہو گئیں۔ اور دبے پاؤں چلتے ہوئے زیر لب کچھ پڑھنے لگیں اور انگلیوں کی پوروں پر انگوٹھے کی نوک سے ہلکی ہلکی چوٹیں سی دینے لگیں۔ رفعت نے بھی دیکھا دیکھی دھیرے دھیرے کچھ پڑھنا شروع کیا۔ اور رضیہ سمٹتی سکڑتی ہوئی امی اور رفعت کے کندھوں کے ساتھ جیسے چپک گئی۔ مکان کے پیچھے کا چکر کاٹ کر جب وہ صحن میں پہنچیں تو امی نے سکوت توڑا "ہاں تو میں کہہ رہی تھی ....."

"تمہیں کیا ہو گیا تھا امی تم دونوں کو" رضیہ نے بات کاٹتے ہوئے بڑی تشویش سے پوچھا۔

"سب بتا دوں گی" امی نے تھپک دیا۔!

رفعت تو سات سال پہلے بھی اگر جوان نہیں تھی تو بچی بھی نہیں تھی ایک ایک بات اس کے حافظے میں محفوظ تھی۔ مگر رضیہ تو گاؤں سے متعلق ایک خواب کی سی کیفیت رکھتی تھی جیسے یہ جگہ اس نے کبھی کہیں کسی زمانے میں دیکھی ہو۔ اور امی نے اس رات اسے بہت سارے قصے بتائے تھے جن کے اظہار کی کبھی شہر میں فرصت ہی نہ ملی تھی اور اگر فرصت ملی تھی تو ضرورت ہی نہ محسوس ہوئی۔ اور جب بات انار کے پیڑ تک پہنچی تو خانو جو صحن میں سو رہا تھا آ گیا اور اپنی معلومات کا دفتر کھول بیٹھا۔

"کیا بتاؤں بی بی جی" وہ جبڑے پھیلا کر بولا اور رفعت اور رضیہ ہمہ تن گوش ہو گئیں "منگھو کمہار کے لڑکے نے ایک دفعہ بھولے سے کہیں انار کے نیچے پیشاب کر دیا بس اللہ کے چارا ہی قدم چلا ہو گا کہ گھوٹ پڑ گئی اور لڑکھڑا کے گر پڑا میری نظر پڑی تو میں نے سنبھالا دے کر گھر تک پہنچا دیا۔ مگر کہاں جی گھر پہنچتے ہی لگا واہی تباہی بکنے۔ دو تین دن تک جن اس کے قالب میں بولتا رہا منگھو کمہار بیچارے کا وہی ایک سہارا تھا۔ اپنا سر پیٹ ڈالا۔ پیر فقیر بلائے مگر سب جواب دے گئے میاں جیونے ایک گھنٹے تک کلمے پڑھ پڑھ کے پھونکا۔ کوئی اثر نہ ہوا سائیں دتے نے دعا کی ایک گولی میں ورد کی پانچ سو گرہیں لگائیں مگر سب بیکار منگھو کمہار نے بڑی تلاش اور خوشامد کے بعد بیس روپے پیشگی دے کر پیر ولی اللہ شاہ کو شہر سے بلوایا۔ پیر صاحب نے پوری کوشش کی مگر کچھ نہ بنا کہنے لگے جن ہندو ہے اور خطرناک بھی جو بھی نکالے گا اسی کے سر چڑھ جائے گا مولوی الہ دین نے جب معاملہ خطرناک دیکھا تو صاف مکر گئے کہنے لگے میں نے جن نکالنے کا دھندا ہی چھوڑ دیا ہے۔ اور منگھو کمہار بیچارا چاروں طرف سے ناامید ہو گیا مگر دوسری ہی رات جن نے خود ہی کالے بکرے کا صدقہ مانگا منگھو کمہار نے تو اس وقت حامی بھر لی اور جن نے لڑکا بھی چھوڑ دیا مگر منگھو نے جب مہینہ بھر تک بھی صدقہ نہیں دیا تو لڑکے ہی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اسے ایسا تپ چڑھا کہ بیچارہ ٹھکانے ہی لگ گیا"

خانو بات ختم کر چکا تو رفعت اور رضیہ نے ایک جھرجھری سی لی اور خوف زدہ چہروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں لیکن امی کے چہرے پر خوف کے کوئی آثار نہیں تھے اور ننھا جاوید ابھی تک سو رہا تھا۔

"ایک دفعہ یوں ہوا کہ . . ." خانو نے دوسرے قصے کا آغاز کیا لیکن امی نے لڑکیوں کے تیور دیکھ کر خانو کو چپ کرا دیا۔ اور باتوں کا موضوع بدل گیا مگر رات بھر رفعت اور رضیہ کے ذہن میں جن کا ہلکا ہلکا تصور رسا رہا . . . . . !!

دوسرے دن صبح صبح جب چڑیاں چہک چہک کر درختوں سے اڑ گئیں۔ اور سورج کی روپہلی کرنیں روشندانوں سے چھن چھن کر رفعت کے بستر پر پڑنے لگیں تو کرنوں میں لپٹی ہوئی رفعت نے نیم خوابی کے سے عالم میں صبح کی پہلی انگڑائی لی۔ ہاتھوں کی انگلیوں میں گرہ لگا کر بازو اینٹھے ہوئے پہلو بدلا۔ آنکھیں تھوڑی سی وا کیں اور پلنگ کے ساتھ لگے ہوئے قد آدم آئینے میں اپنے پلنگ پر ایک بھرپور نظر ڈالی ہونٹوں کی ہلکی سی مسکراہٹ بکھیری اور انگلیوں کی گرفت چھوڑ دی۔ جمائیاں لیتی ہوئی اٹھی۔ ہاتھوں ہی سے بکھرے ہوئے بالوں کو سلجھایا اور ساتھ کے کمرے سے رضیہ کو جگا کر دونوں چشمے پر چلی گئیں۔

چشمے کی فضا دلکشی کی حد تک حسین اور رومانٹک ہو رہی تھی۔ ہری ہری لمبی گھاس میں سے پانی کے پھوٹتے ہوئے تیز رفتار دھارے، درختوں کی ٹہنیوں سے صبح کے ٹھنڈے سورج کی چھنتی ہوئی کرنوں اور گھاٹیوں کے کنوارے پھولوں اور اچھوتی کلیوں کو چوم کر آتے ہوئے ہوا کے خوشگوار جھونکوں اور آس پاس کے درختوں پر پرندوں کی ہلکی ہلکی چہکار سے رفعت کے من میں گدگدی سی ہوئی۔ اس کے کندھے اپنے آپ سکڑ گئے من میں ایک سرسراہٹ سی ہوئی اور ماحول میں کسی چیز کی کمی کا ہلکا ہلکا احساس سا ہونے لگا۔ اس کے بازو ایک بار پھر انگڑائی لینے کے لئے سینے کے برابر اٹھ گئے۔ اور اس نے قریب کھڑی ہوئی رضیہ کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں لپیٹ لیا اور اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ چپکا کر دیئے ۔۔۔ ساتھ کی پگڈنڈی سے دودھ مکھن اور گھی والے پہاڑیوں کی ایک قطار چڑھ رہی تھی۔ سر پر بے ترتیبی سے بندھی ہوئی پگڑیاں اور پگڑیوں پر سلور کی بڑی بڑی چمکدار بالٹیاں اور ہاتھوں میں سنہری کیلوں والی لمبی لمبی لٹھیں ان میں سے ہر ایک رفعت اور رضیہ کو للچائی للچائی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر رفعت نے دیکھا کہ ایک کانوں تک مونچھ والے نے اسے گھورتے ہوئے جبڑے پھیلا کر ہلکی سی آنکھ ماری ہے۔ رفعت غصے سے چراغ پا ہو گئی اس نے کپکپاتے ہوئے لہجے میں انگریزی میں کوئی گالی دی اور جو گیت بن کر پہاڑیوں کی سماعت تک پہنچی اور پہاڑی محظوظ ہونے لگے رفعت خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی پھر اس نے دیکھا کہ پہاڑیوں کے گروہ کے گروہ احاطے کی پگڈنڈی سے گذر کر احاطے کے اوپر والے راستے میں پڑتے ہیں۔ اسے یہ عام راستہ بہت کھٹکا۔ تیسرے پہر جب وہ کرسی چشمے پر بچھا کر مطالعہ کر رہی تھی تو اس وقت بھی پگڈنڈی سے اترتے چڑھتے بے ڈھب اور غلیظ پہاڑی اسے تکلیف دہ نظروں سے گھور رہے تھے۔ اور پھر سورج غروب ہوتے ہی چھاؤنی سے لوٹنے والے پہاڑی بھیڑوں کے ریوڑ کی طرح پگڈنڈی سے اتر کر چشمے پہ نہ [illegible]

جانے لگے۔ رفعت کو بہت ناگوار گذرا۔ اس نے امی سے احتجاج کیا اور دوسرے ہی دن کام شروع ہو گیا اور احاطے کے گرد دنی کانٹے سوار باڑھ لگ گئی اور احاطہ پہاڑیوں کے لئے جنت کی سی حیثیت اختیار کر گیا اور پگڈنڈی بند ہو جانے سے پہاڑیوں کا راستہ قریب ایک میل بھر لمبا ہو گیا جس سے عارضی طور پر انہوں نے نجات حاصل کر لی تھی۔

راستہ بند ہو جانے سے احاطہ پھر مالکان کے لئے مخصوص ہو گیا اور رفعت کو اپنی فتح پر غرور کا ہلکا ہلکا احساس ہونے لگا۔ اور اسے یوں لگا جیسے وہ کسی الف لیلوی کہانی کی پری زاد ہیروئن ہو جو ایک وسیع اور سر سبز و شاداب احاطے کے اندر رقص کرتی پھرتی ہو۔ ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی ہو۔ موتیوں کے سے صاف اور نغمہ بار چشمے پہ نگی غسل کرتی ہو۔ زہد شکن انگڑائیاں لیتی ہو ——— اس کا جی چاہتا تو رضیہ کو ساتھ لے کر تفریح کیلئے نکلتی اور جی چاہتا تو اکیلی۔ اور جب رضیہ اس کے ساتھ ہوتی تو وہ اکثر ایک دوسرے کے اچھے اچھے پوز لیتیں اور اچھے اچھے مناظر کی تصویریں کھینچتیں ——— اور امی تو اکثر گھر پر ہی دن گذار دیتیں۔ کھانے پکانے کے لئے تو گاؤں کی مائی کرمو کو ملازمہ رکھ لیا گیا تھا مگر پھر بھی امی کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹاتیں اور اپنے من پسند کھانے خود اپنے ہاتھ سے بنایا کرتیں۔ رضیہ اور رفعت کو چولھے چوکھے سے کوئی کام ہی نہ تھا۔ اور نہ ہی امی چاہتی تھیں کہ ان سے کوئی سخت یا نرم کام لیا جائے۔ پھر ایسے کام کی سخت مخالف تھیں جس سے لڑکیوں کے ہاتھ منہ کالے ہوں۔ دونوں کو ڈھیل تو ل ہی چکی تھی بس پکے پکائے پر آکر بیٹھ جاتیں۔ اور باقی سب وقت سونے، کھیلنے، تفریح کرنے اور ناولیں پڑھنے میں گذر جاتا۔

چشمے کے پاس شہتوت اور زرد آلو کے گھنے اور خوشبودار سایوں میں آرام کرسی بچھا کر رفعت نیم دراز سی ہو گئی اور تپائی پر پڑی ہوئی کتابوں کی ورق گردانی کرنے لگی ——— گھاٹیوں کے ننھے ننھے پودوں اور معصوم کلیوں کو چومتے ہوئے اور مدھم مدھم سروں میں کوئی دلکش نے گنگناتے ہوئے ہوا کے ٹھنڈے جھونکے زرد آلو اور شہتوت کے نومولود پتوں سے ٹکرا کر ایک نیا راگ پیدا کر کے سائیں سائیں کرتے ہوئے پہاڑوں کے دامن میں کھو جاتے۔ یکے بعد دیگرے ہوا کے جھونکے نئی نئے میں وارد ہوتے۔ بہتا ہوا چشمہ کسی کسی پتھر سے ٹکرا کر جلترنگ سا بجا اٹھتا۔ پہاڑی نالے میں کوئل کوئی نیا سا گیت چھیڑ دیتی۔ آسمان پر بادل کا کوئی ٹکڑا ہلکی سی گرج پیدا کر دیتا۔ ہوا تیزی سے چلنے لگتی بھینی بھینی خوشبو چاروں طرف پھیل جاتی اور رفعت کے بال کنپٹیوں سے اوپر کو اٹھ جاتے۔ اور وہ ایک کتاب بند کر کے رکھ دیتی اور دوسری اٹھا لیتی۔ ماحول اتنا خوشگوار ہو رہا تھا کہ وہ مطالعے سے زیادہ ماحول سے محظوظ ہو رہی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ کتابیں ساری اٹھا کے الگ رکھ دے اور اسی طرح کرسی پر پڑے پڑے آنکھیں نیم خوابی کے عالم میں بند کر دے۔ پاؤں پسار دے۔ ہاتھ سینے پر رکھ دے اور بیٹھی رہے "تصور جاناں کئے ہوئے"! اور سچ مچ وہ کتنی دیر تک آنکھیں موندے بیٹھی رہی اور اچانک رضیہ اس کے کان میں آکر "ہو" نہ کرتی تو نجانے رفعت کتنی دیر تک تصور جاناں میں کھوئی رہتی۔ اور جب رضیہ اسے چھوڑ کر دیوا سے پیچھے چشمے پر نہانے کے لئے چلی گئی تو رفعت سوچنے لگی کہ اس زندگی اور شہر کی زندگی میں کتنا فرق ہے۔ اتنا ہی فرق جتنا کالے اور سفید رنگ میں ہوتا ہے۔ یا اس سے بڑا کوئی فرق ہو سکتا ہے۔ زمین اور آسمان کا فرق ——— شہر کا گھٹا ہوا ماحول، گنجان آبادی۔ ٹراموں اور بسوں کی کھڑکھڑاہٹ خوانچہ فروشوں کی ٹائیں ٹائیں۔ فٹ پاتھوں اور سڑکوں پر پان اور بلغم کی پیکوں کی گلکاریاں ——— لوگوں کے پیلے پیلے مدقوق چہرے جسم ہڈیوں کے ڈھانچے..... اسے لمحہ بھر کے لئے شہر سے نفرت ہو گئی اور اس نے وادی کی حسین فضا میں شہر کے تصور کو بھی گناہ بے لذت سمجھا ——— لیکن شہر میں تو اور بھی بہت سی چیزیں تھیں جو اس کی دلچسپی کا سامان مہیا کئے ہوئے تھیں۔ ریڈیو، اخبار، سینما، کلب، پکنک پارٹیاں اور رومانس..... اور رومانس کے ساتھ ہی اسے شہر کا ذہین جرنلسٹ عبیدی یاد آ گیا جس کی تحریروں نے اخباری حلقوں میں تہلکہ مچا دیا تھا اور جو اسے پسند ہی نہیں تھا بلکہ اس کی بے تکلفیاں بھی پسند تھیں۔ مگر نجانے امی عبیدی کو کیوں پسند نہیں کرتی تھیں جبکہ اس کے گھٹیا گھٹیا دوست بھی امی کو بہت پسند تھے۔ اور وہ کتاب بند کئے آنکھیں موندے پہروں اسی سوچ میں کھوئی رہی۔

(۲)

ایک آدھ مہینے کے دن تو بڑی دلچسپی سے گذر گئے مگر جوں جوں وقت گذرتا گیا اور ماحول کی یکسانیت، ایک ہی سے مناظر ایک ہی سی فضا سے رفعت کچھ اکتا تی گئی اب نہ اسے لالہ زاروں سے آتی ہوئی ٹھنڈی اور معطر ہواؤں کی سنسناہٹ ہی سے کوئی کیف ملتا۔ نہ بادلوں کی گھن گرج اس کے دل میں کوئی ہلچل مچاتی۔ جلترنگ بجاتے ہوئے چشمے ہی میں کوئی موسیقیت ملتی اور نہ ہی سریلی کوئل کی کوک ہی کوئی جانگداز اثر چھوڑتی ——— اور اس نے محسوس کیا کہ جیسے وہ گھاٹیوں کے مسلسل ٹھہراؤ اور قبرستان کے سے اکتا دینے والے سناٹوں کے لئے نہیں بلکہ شہر کی ہماہمی اور گہما گہمی کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ اسے قدم قدم پر اکتاہٹ کا احساس ہونے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ بغیر کسی تامل کے شہر کو کوچ کر جائے مگر اس خیال سے رضیہ کی چھٹیاں ختم ہونے پر امی خود ہی تیار ہو جائیں گی وہ خاموش ہو گئی۔ اور اس نے مزید کچھ دن صبر و استقلال سے گزارنے کا ارادہ کر لیا۔ مگر رضیہ

کی چھٹیاں ابھی ختم ہی نہ ہوئی تھیں کہ امریکہ سے ان کے بھائی جان کا تار آگیا۔ لکھا تھا کہ ان کے آنے تک پہاڑ پر ہی قیام کیا جائے ــــ رفعت اور رضیہ بھائی جان کے آنے کی خبر سن کر بے انتہا خوش ہوئیں وہاں انہیں پہاڑ پر رک جانے کا کہیں اس سے زیادہ افسوس ہوا۔ اور وہ کلیجہ مسوس کے رہ گئیں۔ اور بھائی جان کی آمد کا بغیر کسی مقررہ وقت کے بڑی بے قراری کے ساتھ انتظار کرنے لگیں اور اس انتظار میں رضیہ کی چھٹیاں بھی ختم ہو گئیں مگر بھائی جان کی پھر بھی کوئی اطلاع نہیں آئی۔ رفعت نے امی کو پہاڑ چھوڑنے پر اکسایا مگر امی ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ پھر اس نے رضیہ کی تعلیم کی اہمیت جتائی مگر امی نے ٹال دیا اور رضیہ کی مزید ایک ماہ کی چھٹی کے لئے لکھ دیا۔ جس کا رضیہ کو شدید افسوس ہوا اور رفعت کے لئے جیسے صفِ ماتم بچھ گئی۔ اور اسے یوں لگا جیسے اسے کئی مہینے کی سزائے قید بامشقت سنا دی گئی ہو۔ اور اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے اس نے امی سے مزید کچھ کہنا بیکار سمجھا۔ بس دن رضیہ کے ساتھ مل کر کسی نہ کسی طرح گذار دیتی اور رات سونے سے پہلے اپنے ماضی پر ایک نظر ڈالتی اور ماضی ایک متحرک تصویر کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے آتا اور گذر جاتا۔ اور اس تصویر میں وہ بہت سارے چہروں کے ساتھ عبیدی کا مسکراتا ہوا چہرہ بھی دیکھ لیتی اور بعض اوقات تصویر ختم ہو جاتی مگر عبیدی کھڑا مسکراتا رہتا اور رفعت میٹھی میٹھی نیند میں آنکھیں موندے اسے دیر تک دیکھتی رہتی ــــ ! مگر انتظار جان لیوا حد تک طویل ثابت ہوا اور اس قید خانے سے نجات پانے کے کہیں کوئی آثار نمودار نہ ہوئے اور نہ امریکہ سے بھائی جان کی روانگی کی مزید کوئی اطلاع آئی اور یہ پہاڑ چھوڑنے کی کوئی معقول تجویز نہ سوچ سکیں۔

اس رات ہوائیں معمول سے کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ چل رہی تھیں۔ چاند نور کی روئی کی سی آدھی گولائی لے کر پہاڑوں کی اوٹ میں غروب ہو چکا تھا۔ مگر رات کے سائے ابھی گہرے نہیں ہونے پائے تھے۔ دور پہاڑوں کی گپھاؤں سے کہیں کہیں کسی گیدڑ کے کوکنے کی سامعہ خراش آواز بلند ہو جاتی تھی مگر حویلی کے گرد و نواح میں مکمل سناٹا تھا۔ دروازے بھڑے ہوئے تھے اور ہوا کی تیزی کی وجہ سے کھڑکیاں بند کر دی گئی تھیں۔ اور نیند کے سائے لمحہ بہ لمحہ گہرے ہوتے جا رہے تھے ـــــــ اچانک رفعت کے کمرے سے ایک چیخ بلند ہوئی جو سناٹے کو چیرتی ہوئی دور تک نکل گئی اور احاطے میں ایک ارتعاش سا پیدا ہو گیا۔ امی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں، جلدی سے بتی جلائی اور گھبرائے ہوئے انداز سے دوڑتی ہوئی رفعت کے کمرے کی طرف گئیں ــــ رفعت پلنگ پر بے حال پڑی تھی، اس کا جسم مارے خوف کے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ آواز حلق

میں اٹک رہی تھی۔ منہ سے کف جاری تھا اور آنکھیں پھٹی پھٹی سی باہر نکل رہی تھیں۔

"بچاؤ ..... بچاؤ" امی کو دیکھتے ہی وہ پھٹ پڑی۔ امی نے اسے سہارا دیا۔ کمبل اچھی طرح اوڑھایا اور تسلی آمیز لہجے میں پوچھا "کیا بات ہے رفعت۔ کیا ہوا" مگر رفعت نے پھر کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے جسم پر ہلکا ہلکا رعشہ سا طاری تھا اور دانت اس طرح بجنے لگے جیسے وہ برف میں ٹھٹھر گئی ہو۔ امی کی گھبراہٹ بہت زیادہ بڑھ گئی وہ رضیہ کو جگانے کے لئے اس کے کمرے کی طرف دوڑیں اور دوسرے ہی لمحے جب وہ رضیہ کو ساتھ لے کر آئیں تو رفعت گہری نیند سو چکی تھی اور پسینے کے ننھے ننھے قطرے اس کی پیشانی پر چمک رہے تھے۔ امی نے دوپٹے سے آہستہ آہستہ پسینہ پونچھا اور پھر دونوں متفکر سی اپنے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

صبح رفعت نے بتایا کہ رات اس نے کوئی مہیب سا سایہ کمرے میں پھرتا ہوا دیکھا اور جب اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو سائے نے دونوں خونخوار پنجے اس کی گردن کی طرف بڑھائے اور وہ مارے خوف کے بمشکل ایک چیخ مار کے رہ گئی۔ امی خوف زدہ ہو گئیں مگر لڑکیوں کی تسلی کے لئے حوصلہ آمیز لہجے میں بولیں:-

" ایسی کوئی بات نہیں۔ تم نے ضرور کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہوگا۔" بات آئی گئی ہو جاتی اگر تھوڑی ہی دیر بعد دوسرا واقعہ پیش نہ آتا۔ امی ہاتھ منہ دھو کر ناشتہ کرنے کے لئے بیٹھی ہی تھیں کہ روشندان میں سے ایک بہت بڑا پتھر آیا اور امی بال بال بچ گئیں مگر ناشتہ دان چور چور ہو گیا۔ ایک دم بھگدڑ سی مچ گئی۔ خانو دوڑتا ہوا مکان کے عقب میں گیا مگر وہاں کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ اور انار کی ٹہنیاں بڑے زور زور سے ہلکورے لے رہی تھیں۔ اس نے واپس آکر اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو امی بہت زیادہ پریشان ہو گئیں۔ خوف زدہ نظروں سے کچھ دیر پتھر کو دیکھتی رہیں پھر اٹھا کے الگ رکھ دیا اور تینوں ماں بیٹیاں سر جوڑے پہروں سوچتی رہیں اور شام تک دونوں واقعات کی خبر احاطے کی کالنٹی وار بارڈھ کو عبور کر کے مضافات کے دیہات تک پہنچ چکی تھی۔ اور اکثر گھروں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں۔

اگلی رات خانو کو برابر والے کمرے میں سلایا گیا۔ اور رفعت، رضیہ اور امی ننھے جاوید سمیت مل کر بڑے کمرے میں سوئیں۔ مگر روز کی طرح نیند کے دبے پاؤں آنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ مغربی گھاٹیوں سے آتی ہوئی ہواؤں کی سنسناہٹ اور دور کسی گپھا سے گیدڑ کی ابھرتی ہوئی کرخت آواز اور کتوں کے بے وجہ بھونکنے سے رات معمول سے کچھ مختلف اور ڈراؤنی سی لگ رہی تھی ..... امی کی

بیتاب کروٹیں گنتے گنتے جب گھڑی نے بارہ گھنٹیاں بجائیں تو امی نے سر اٹھا کر خاموش کمرے کا ایک سرسری سا جائزہ لیا۔ پھر رفعت اور رضیہ کے پلنگ پر نظر ڈالی تو انہیں سویا ہوا دیکھ کر تنہائی کا شدید احساس ہوا مگر نجانے کیا سوچ کر بتی بجھا دی اور ننھے جاوید سے لپٹ کر سو گئیں اور تھوڑی ہی دیر بعد انہیں احساس ہوا جیسے نیند چوروں کی طرح دبے پاؤں کہیں سے داخل ہو رہی ہو اور وہ لحظہ بہ لحظہ گرد و پیش سے دور ...... بے خبر اور نیند سے قریب ہوتی گئیں۔

اور نیند کا میٹھا میٹھا خمار ان کے سراپے پر جیسے کسی اوڑھنی کی طرح چھا گیا۔

جانے رات کتنی گزری ہوگی کہ خاموش کمرے میں امی کے ابھرتے ہوئے خراٹے گلے میں اٹک اٹک کر رک سے گئے۔ انہوں نے نیم خوابی کے سے عالم میں محسوس کیا کہ ان کے سینے پر کسی کی انگلیاں بڑی تیزی کے ساتھ حرکت کر رہی ہیں اور پھر جب انگلیاں بڑھتے بڑھتے گردن پر آ کر رک گئیں تو امی نے پوری طرح بیدار ہو کر ایک خوفناک چیخ ماری اور چیخ کے ساتھ ہی وہ خوفناک ہاتھ ان کی گردن سے اٹھ گیا۔ اور امی نے گھبراہٹ میں بے تحاشا چلانا شروع کیا اور رفعت اور رضیہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں، جلدی سے بتی جلائی تو دیکھا کمرے کی حالت ہی غیر تھی۔ دوسرے کمرے کا فرنیچر اس کمرے میں الٹا سیدھا پڑا تھا اور گھر کا سارا سامان بکھرا ہوا تھا۔ اور امی پسینے میں نہائی ہوئی تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ رفعت نے دروازے پر دو تین بار مار کے دوسرے کمرے میں سوئے ہوئے خانو کو جگایا۔ خانو نیند سے بوجھل آنکھیں ملتا بھاگتا ہوا آیا۔ رفعت گھبرائے ہوئے انداز سے امی کے منہ پر جھک گئی۔ رضیہ پلنگ کے پاس کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی اور بے ہوشی کے عالم میں امی کے منہ سے کف بہہ رہا تھا اور نتھنوں سے شائیں شائیں کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ خانو لپک کر پانی کا گلاس لے آیا اور مالکن کے منہ پر پانی کے ہلکے ہلکے چھینٹے مارنے لگا اور کافی دیر بعد جب مالکن کے حواس ٹھکانے آئے تو انہوں نے تھکے تھکے انداز سے آنکھیں کھولیں، پتلیاں گھما گھما کر اپنے گرد کھڑے خانو، رفعت اور رضیہ کو دیکھا۔ اور ہونٹوں کی ہلکی سی جنبش سے زیر لب بولیں:-

"پانی" .... اور جب رفعت نے سہارا دے کر پانی کا گلاس پلایا تو امی پسینے سے شرابور ہو گئی تھیں۔ اور تھوڑی دیر بعد جب وہ پوری طرح ہوش میں آئیں تو سہمے سہمے لہجے میں ساری کیفیت بتا دی اور تھوڑی دیر کیلئے کمرے پر ایک اور بھیانک سناٹا چھا گیا۔ رفعت اور رضیہ امی کے پلنگ کی دونوں پٹیوں پر چپ چاپ سی بیٹھ گئیں۔ اور خانو سر پکڑے ہوئے زمین پر جیسے ڈھیر ہو گیا اور ماتھے کو انگلیوں کی پوروں سے دباتا ہوا کافی دیر تک سوچتا رہا پھر خاموشی توڑتے ہوئے بڑے رازدارانہ طریقے سے بولا۔

"جن پھر جاگ اٹھا ہے مالکن معلوم ہوتا ہے کوئی بے ادبی ہو گئی ہے ہم سے۔"

"کیا کہیں" مالکن نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا اور پھر سب چپ چاپ بیٹھے حیرت زدہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے اور جاگتے ہوئے کمرے کی بتی صبح تک جلتی رہی۔

اگلے دن مالکن کے کہنے سے خانو گاؤں کی مسجد سے میاں خیرے کو بلا لایا۔ میاں خیرے نے پہلے واقعات کو بہت غور سے سنا۔ پھر بنفس نفیس حویلی کے گرد و پیش اور انار کے پیڑ کا جائزہ لیا۔ کتاب دیکھی۔ اور جب بات کچھ سمجھ میں آ گئی تو داڑھی پر بڑے اعتماد سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اونچی ذات کا جن ہے۔ سید ہے۔ کچھ بے ادبی ہو گئی کسی سے جس بنا پر بگڑ گیا۔ تین روز تک وظیفہ کرنا ہوگا۔ انشاء اللہ سب معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"میں ہر خدمت کے لئے تیار ہوں مولوی جی۔ آپ وظیفہ شروع کر دیجئے۔" امی نے بڑی بے تابی سے کہا۔ اور میاں خیرا اپنے چار شاگردوں سمیت انار کے پیڑ کے نیچے اگربتیاں سلگا کر وظیفے کے لئے بیٹھ گیا اور شاگردوں کو ساری ترتیب بتا دی کہ کس ورد کے بعد کیا پڑھنا ہوگا۔ پہلے سو بار "اللہ ھو" اور پھر سو بار دوسرے اذکار۔ اور ہدایت کے مطابق شاگردوں نے مولوی خیرے کی آواز سے ہم آہنگ ہو کر تسبیح کے دانوں کو رولتے ہوئے "اللہ ھو" کا ورد شروع کر دیا اور مالکن عقیدت مندانہ طریقے سے دو زانو ہو کے پاس بیٹھی رہیں۔ اور جب ذکر پچاس کے قریب پہنچا۔ تو مولوی خیرے نے آنکھیں میچ لیں، کندھے سکیڑ لئے اور گردن کو بڑے زور سے جنبش دیتے ہوئے آواز کو قدرے اور بلند اور ہیبت ناک کر دیا اور شاگردوں کی آواز اپنے آپ ہی اونچی ہو گئی اور گردنیں گھٹنوں تک جھولنے لگیں اور ابھی سو کا ورد پورا نہیں ہوا تھا کہ قریب کی جھاڑیوں کے پیچھے سے ایک بہت بڑا اکدوا آیا اور مولوی خیرے کے حال میں آتے ہوئے سر پر دھم سے ایسا لگا کہ وہیں شگاف پڑ گیا اور مولوی خیرے نے ایک دھاڑ ماری اور چکرا کے اوندھے منہ گر پڑا۔ شاگردوں نے دیکھا تو ورد بھول گئے اور کلمۂ توحید پڑھنے لگے۔ پھر ایکا ایکی جھاڑیوں سے پتھروں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔

امی زور زور سے رفعت اور رضیہ کو پکارنے لگیں اور شاگرد کلمہ بھی بھول بیٹھے اور چیخنا شروع کر دیا اور جب پتھروں کی بوچھاڑ کی تو پیڑ کے نیچے کوئی بھی نہیں تھا۔ میاں خیرا ہانپتا کانپتا ہوا شاگردوں سمیت اوپر والے پھاٹک

سے نکل رہا تھا۔ اور امیؔ، رفعت اور رضیہ صحن میں سر جوڑے پریشان حال بیٹھی تھیں اور خانو بھاگتا دوڑتا احاطے کی چھان بین کر رہا تھا، مگر احاطے میں کسی چیز کا نشان تک بھی موجود نہیں تھا.... ! جب مولوی خیرےؔ نے واقعات گاؤں میں بیان کئے تو لوگوں نے اس موضوع پر سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا۔ اگرچہ احاطے کا عام راستہ بند کر دینے سے گاؤں والے سخت نالاں تھے تاہم بیشتر لوگوں کو احاطے والوں سے ہمدردی ہوگئی اور اس روز شام تک گاؤں کے کتنے ہی معزز لوگ مالکن کے پاس اظہار ہمدردی کے لئے آئے اور خانو کو کئی بار احاطے کا لیشبی پھاٹک کھولنا اور بند کرنا پڑا۔ دن بھر اکا دکا آدمیوں کی آمدورفت رہی مگر کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ کبھی کبھار مکان کے عقب سے کوئی پتھر زناٹے سے آجاتا، جو سب کو متحیر اور خائف کر دیتا.... جب شام ہیبتناک رات کا پیغام لئے ہوئے قریب آئی تو گھر پر ایک دہشت سی طاری ہونے لگی جیسے رات میں کوئی قیامت آنے والی ہو۔ تاہم امی لڑکیوں کی ڈھارس بندھانے کے لئے حوصلہ آمیز انداز سے باتیں کرتی رہیں، لیکن خود ان کا حوصلہ قائم نہیں تھا جیسے آنے والے کسی خطرے کا مقابلہ کرنے کی ساری قوت سلب ہو چکی ہو۔ —— لیکن سائیں دتےؔ کے خیال سے انہیں کسی قدر تسلی ہوئی۔ خانو نے بتایا تھا کہ اس علاقے میں جنات پر جتنا عبور سائیں دتےؔ کو ہے کسی دوسرے کو نہیں اور خانو کافی دیر سے سائیں دتے ہی کی تلاش میں گیا ہوا تھا اور سارے گھر کو سائیں دتے کی آمد کا بہت بےتابی سے انتظار تھا.... !

شفق کی سرخیاں ابھی سیاہ رات کے سینے میں اترنے نہیں پائیں تھیں کہ خانو سائیں دتےؔ کو لے کر آگیا۔ امی کی جان میں جان آئی اور کچھ رات کے کٹنے کے آثار نظر آئے۔ گذشتہ رات کی طرح امی، رفعت اور رضیہ نے اپنے بستر پھر ایک ہی کمرے میں بچھائے۔ ایک ملحقہ کمرے میں خانوؔ کو سلایا گیا اور دوسرا علیحدہ کمرہ سائیں دتے کو دیا گیا —— عشا کی نماز سے فارغ ہو کر سائیں دتے نے سب لوگوں کو اطمینان دلاتے ہوئے سو جانے کی ہدایت کی اور دعویٰ کیا کہ اگر جن کو آج کوزے میں بند کر کے نہ جلا دوں، سائیں دتا نام نہیں"۔ امی اور لڑکیاں قدرے مطمئن ہو کر بستروں میں دبک گئیں اور سائیں دتے نے کمرے کے دروازے اور کھڑکیاں بند کر دیں اور مٹی کے دیئے کی روشنی میں دھاگے کی گولی لے کر بیٹھ گیا اور کچھ پڑھ پڑھ کے ایک سرے سے گرہیں لگانی شروع کر دیں —— اور لگاتار سائیں دتا پڑھتا رہا۔ پھونکتا رہا اور دھاگے میں گرہیں لگاتا رہا......

جانے رات کتنی گذری ہوگی، ہر طرف ایک مکمل سکوت چھا چکا تھا۔ برابر کے کمرے میں سوئی ہوئی امی رفعت اور رضیہ کے ملے جلے خراٹے ابھرنے لگے تھے جن سے کمرے میں ایک ارتعاش سا پیدا ہو جاتا تھا اور سائیں دتا بند کمرے میں لگاتار وظیفہ کر رہا تھا۔ اس کے ہونٹ بڑی تیزی کے ساتھ حرکت کر رہے تھے اور انگلیاں بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ تاگے میں گرہیں لگاتی ہوئی چل رہی تھیں اور دیئے کی لو میں بتی کا گل جمع ہو گیا تھا اور کمرے میں روشنی مدھم پڑ گئی تھی۔ سائیں دتے کی انگلیاں اکڑ سی گئیں اور آنکھیں نیند کے خمار سے بوجھل ہونے لگیں۔ اس نے لمحہ بھر سستانے کے لئے پڑھنا بند کر دیا، آنکھیں پوری طرح کھولیں۔ انگلیاں کھینچ تان کے چٹخائیں، دیئے کا گل جھاڑا، گرد و پیش پر ایک ہلکی سی نظر ڈالی اور پھر محویت کے سے عالم میں پڑھنے لگا۔ —— معاً کوئی چیز دھپ سے اس کے آگے گری، بدک کر آنکھیں کھولیں تو دیا بجھ چکا تھا اور کمرے میں مہیب سناٹا چھا گیا تھا۔ سائیں دتا کچھ تذبذب میں پڑ گیا اور ابھی وہ کچھ سوچ بھی نہ سکا تھا کہ کواڑوں کے قریب سے ایک دبی دبی آواز آئی "بھاگ جا ملاؔ"

"کون ہو تم" سائیں دتے نے سہمے ہوئے پوچھا

"تمہاری شامت" وہی آواز

"میں تمہارے ٹکڑے کر دوں گا" سائیں دتے نے قدرے جرأت کی، مگر دوسرے ہی لمحے ایک تختہ بڑے زناٹے کے ساتھ سائیں دتے کے سر پر آن لگا۔ اور پھر پے در پے تختوں کے وار شروع ہو گئے۔ سائیں دتے نے حلق پھاڑ پھاڑ کے چلانا اور مدد کے لئے پکارنا شروع کیا۔ سارا گھر گھبرا کے جاگ اٹھا، بتی جلی، سائیں دتے کے کمرے کی طرف دوڑے دیکھا تو سائیں دتا برا حال ہو رہا تھا۔ سر پر زخموں کے نشان پڑ گئے تھے اور جسم پر رعشہ طاری تھا۔ خانو نے تلوے سہلائے۔ مالکن نے پانی پلوایا۔ گرم گرم دودھ کی پیالی دی اور بڑی مشکل سے کہیں سائیں دتے کے حواس قائم ہوئے۔ رات اللہ اللہ کر کے کاٹی اور صبح پو پھٹتے ہی سائیں دتا احاطے کی حدود سے باہر نکل گیا تھا اور صبح اس کے ساتھ ہی ساتھ رات والے واقعہ کی خبر بھی بہت دور نکل گئی تھی۔ میاں خیرے والا واقعہ اور دوسرے حالات گاؤں والوں نے پہلے ہی چھاؤنی تک پہنچا دئے تھے اور سائیں دتے والی خبر اس سے بھی دور دور تک پہونچی۔ ضلع کے اخباروں نے مختلف طریقوں سے چھاپا اور ایک سنسنی خیز خبریں چھاپنے والے اخبار نے سنسنی خیز طریقے سے صفحہ اول پر سرخی جمائی اور دوسرے شہروں کے اخباروں نے دھڑا دھڑ خبر کو چھاپنا شروع کیا اور مزید حالات کا انتظار کرنے لگے اور سنسنی خیز خبریں پڑھنے والے حلقوں میں موضوع

سخن سا بن گیا۔

امی نے لڑکیوں کے مشورے سے امریکہ میں اپنے بیٹے کے نام تار لکھا: "ہم زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔ تمہارا جواب آنے پر ہی شہر روانہ ہو جائیں گے۔" اور جب خانو تار لے کر چھاؤنی جانے لگا تو رفعت نے چپکے سے جھبدری کے نام خط ڈالنے کے لئے دے دیا۔

پھر دن بھر احاطے کے پھاٹک کھلے رہے، لوگ آتے رہے جاتے رہے، پہاڑ کے دیہاتی بڑی بڑی لٹوں والے، بے ترتیبی سے بندھی ہوئی پگڑیوں والے، نسوار چبانے والی عورتیں اور بچے........ رضیہ اور رفعت بالکل الگ رہیں اور امی سب کو مختلف حالات سناتیں اور شکریہ ادا کر کے رخصت کرتی رہیں۔ گاؤں کے نمبردار نے احاطہ چھوڑ دینے اور اپنی حویلی میں رہنے کے لئے ایک خالی مکان کی پیشکش بھی کی۔ مگر امی کچھ فوری طور پر فیصلہ نہ کر سکیں۔

سہ پہر کو خانو ضروری سامان اور کچھ اخبار لے کر چھاؤنی سے واپس لوٹا۔ رفعت نے اخبار کو بے تابی سے کھولا اور احاطے کی خبر پڑھنے لگی، جو سنے سنائے واقعات پر مبنی تھی اور جسے بہت غلط سلط خبر اور مبالغہ آمیز طریقے سے پیش کیا گیا تھا۔ خبروں کو پڑھ کر وہ تھوڑی دیر کے لئے مسکرائے بغیر نہ رہ سکی...... وقت اور کٹ گیا تھا، رات سر پر آ رہی تھی اور گھر کا گھر متفکر ہو رہا تھا جیسے کوئی قیامت آنے والی ہو۔ امی کی رنگت بھی اڑی اڑی سی لگ رہی تھی اور رفعت اور رضیہ بھی کھوئی کھوئی سی معلوم ہو رہی تھیں مگر ننھا جاوید سب باتوں سے بے نیاز تھا۔ اور خانو کو اپنی پریشانی سے زیادہ مالکن اور لڑکیوں کی پریشانی کا احساس تھا۔ ...... امی نے رفعت اور رضیہ سے کچھ مشورہ کیا اور پھر تار کے جواب کا انتظار کئے بغیر آناً فاناً تیاری کا اعلان کر دیا اور فیصلہ کر لیا کہ صبح سورج طلوع ہوتے ہی پہاڑ چھوڑ دیا جائے گا۔ اس اچانک فیصلے سے گھر میں ایک تبدیلی سی محسوس ہونے لگی۔ رفعت اور رضیہ کے چہروں پر خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی لیکن امی جو دراصل پہاڑ پر مستقل طور پر قیام کرنے کا ارادہ لے کر آئی تھیں اس اپنے ہی کئے ہوئے فیصلے سے مطمئن نہیں ہوئیں بلکہ بڑی مجبوری اور بےبسی کے عالم میں انہوں نے یہ فیصلہ کیا۔ وہ چاہتی تھیں کہ بیٹے کو امریکہ سے بلا کر مشورہ کرتیں اور احاطے کو از سر نو آباد کر کے اپنے خاندان کی یادگار کو مٹنے سے بچا لیتیں، بنجر زمین سیراب کر کے زراعت کا کام شروع کرا دیتیں اور چند ہی برس میں احاطہ پھر ہری بھری سبزیوں اور فصلوں سے لہلہا اٹھتا۔ مگر خلاف توقع انہیں اپنے ارادے میں ناکامی ہوئی اور ناکامی ہی نہیں بلکہ اپنی ہی جان کے لالے پڑ گئے۔ اور اس دن شام سے پہلے پہلے سارا موٹا موٹا سامان سمیٹ لیا گیا۔ فالتو بستر باندھ دیئے گئے۔ کتابیں شلفوں سے نکال کر صندوقوں میں ڈال دی گئیں اور چھوٹی چھوٹی پوٹلیوں کی ایک ڈھیری سی لگا دی گئی۔ مگر آنے والی رات کا اندیشہ سارے گھر کو لگا ہوا تھا اور امی آخری رات کے خیریت سے گزر جانے کی دعا مانگ رہی تھیں۔ مکان کے عقب سے اب بھی کوئی مہیب قسم کی آواز ابھر آتی تھی یا کبھی کبھار کوئی پتھر آ جاتا تھا اور گھر کے اندر کے سامان میں سے کوئی نہ کوئی چیز خود بخود اپنی جگہ تبدیل کر دیتی یا بکھر جاتی۔

سورج غروب ہوا تو امی کے چہرے پر ہلدی سی کھنڈ گئی اور رفعت اور رضیہ کی پریشانی میں اور اضافہ ہو گیا اور ننھے جاوید کو سب کی پریشانی کا ہلکا ہلکا احساس ہونے لگا مگر کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آ سکی۔

سورج غروب ہوتے ہی ایک ملنگوں کی سی وضع قطع کا گرانڈیل شخص احاطے میں داخل ہوا۔ داڑھی صفا چٹ اور ملٹری کٹ مونچھیں، رنگ گندمی، آنکھیں موٹی موٹی جن میں سرمے کی سلائیاں کنپٹیوں تک کھنچی ہوئی تھیں۔ کانوں میں چھوٹی چھوٹی بالیاں اور بال گھنگھریالے اور بکھرے ہوئے تھے اور ہاتھ میں ایک روپہلی کیلوں والی لاٹھی تھی، جو قدرے بھی لمبی تھی۔ اُسے دور سے آتا دیکھ کر امی کچھ متعجب سی ہوئیں مگر جب خانو کی نظر پڑی تو ایک دم چلا اٹھا:

"پیر ولی اللہ شاہ..... پیر ولی اللہ شاہ" وہ دوڑتا ہوا استقبال کے لئے آگے گیا اور بڑے احترام کے ساتھ پیر ولی اللہ شاہ کو مکان پر لایا۔ خانو نے مالکن سے پیر ولی اللہ شاہ کا تعارف کرایا اور بتایا کہ پیر صاحب کا علم سات سمندروں کے برابر ہے۔ اتنے علم روئے زمین پر کسی اور شخص کو نصیب نہیں ہو سکے۔ آپ میں اتنی طاقت ہے کہ بہتے دریاؤں کا رُخ پھیر سکتے ہیں۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ پیر صاحب خود بخود تشریف لے آئے ہیں ورنہ مدتوں ڈھونڈنے سے نہیں ملتے۔" امی پہلے ہی سے غائبانہ طور پر متعارف تھیں، پیر صاحب سے مل کر بہت متاثر ہوئیں۔ پیر صاحب کہنے لگے:۔

"میں دورے پر گیا ہوا تھا۔ اسی دوران میں مجھے یہاں کسی جن کی

مارستانیوں کا پتہ چلا۔ میرا خون کھول اٹھا اور میں کام چھوڑ کر یہاں آگیا ہوں۔"

"پیر صاحب ہماری تو یہاں آخری رات ہے، وہ بھی خیریت سے گذر جائے تو غنیمت ہے۔ ہم لوگ کل جارہے ہیں۔" مالکن نے بڑی حسرت سے کہا اور پیر صاحب بڑے جلال میں آکر بولے :-

"آپ جائیے یا نہ جائیے، یہ آپ کی مرضی ہے مگر جن آج کے بعد اس حویلی میں نہیں پھٹکے گا۔"

"اگر ایسا ہوگیا تو میں دوبارہ اس حویلی کو آباد کروں گی پیر جی۔" مالکن مسرت سے بولیں۔

رات جب سب لوگ کھانے سے فارغ ہو گئے تو حسبِ معمول رفعت، رضیہ، ننھا جاوید اور امی مل کر بڑے کمرے میں سوئیں۔ خانو باہر والے کمرے میں اور پیر ولی اللہ شاہ کو کھولی کے ساتھ ملحقہ کمرہ دیا گیا جس کا ایک دروازہ کھولی میں اور دوسرا بڑے کمرے میں کھلتا تھا۔

رات کافی گذر چکی تھی۔ سب لوگ سو گئے تھے۔ باہر والے کمرے میں سویا ہوا خانو بھینس کے ڈکارنے کے سے انداز سے خراٹے لے رہا تھا جو رات کے سناٹے میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔ بڑے کمرے میں مکمل سکوت اور تاریکی تھی۔ آج ا می بہت دنوں کے بعد اتنی گہری نیند سوئی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ پیر ولی اللہ شاہ کے کمرے میں بھی مکمل سناٹا تھا۔ مٹی کا ٹمٹماتا ہوا دیا انہوں نے رات پہلے پہر ہی بجھا دیا تھا اور ایک کونے میں دبکے بیٹھے کسی واقعہ کا مسلسل انتظار کر رہے تھے مگر کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ باہر والے کمرے میں خانو کے خراٹے مسلسل ابھر رہے تھے اور بڑے کمرے میں گھڑی کی ٹک ٹک رات کو خوفناک بنا رہی تھی... ایک دم باہر درختوں میں شائیں شائیں کی آواز پیدا ہوئی۔ سامنے والی کھڑکی سے ہوا کا ایک تیز جھونکا اندر داخل ہوا اور کسی کونے میں پڑے ہوئے کاغذ کھڑکھڑانے لگے۔ پیر صاحب فوراً چوکنے ہو گئے..... پھر ہوا اور تیزی سے چلنے لگی اور کاغذ کھڑکھڑا کے چپ ہو گئے جیسے کسی دیوار کے ساتھ چپک گئے ہوں۔ پیر ولی اللہ نے کمرے میں کچھ خنکی سی محسوس کی اور آنکھوں میں نیند کا ہلکا ہلکا خمار سا ـــــ دبے پاؤں اٹھے پنجوں کے بل چل کر کھڑکی کے قریب پہنچے۔ آہستہ سے کھڑکی بند کردی اور ٹٹولتے ہوئے واپس آکر اسی کونے میں دبک گئے اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر ایک جماہی سی لی اور سو جانے کی کوشش کرنے لگے۔ معاً برابر والا دروازہ تھوڑا سا چرچرایا اور کسی کے قدموں کی ہلکی سی آہٹ سنائی دی۔ لیکن کمرے کی گہری تاریکی میں کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ پیر صاحب سمٹ سمٹا کر دیوار کے ساتھ لگ گئے اور ٹکٹکی باندھ کے کواڑوں کی طرف دیکھنے لگے۔ دوسرے ہی لمحے دروازے میں تھوڑی سی اور آواز پیدا ہوئی اور ایک پٹ تھوڑا سا کھلتا ہوا محسوس ہوا۔ پیر صاحب نے جلدی سے پاؤں لپیار لئے۔ سر سے پاؤں تک چادر اوڑھ لی۔ منہ تھوڑا سا کھلا رکھا اور نیند کی سی دبی دبی سانسیں لینے لگے۔ اور گہرے اندھیرے میں دیدے پھاڑ پھاڑ کے دروازے کی طرف غور سے دیکھتے رہے ـــــ آہستہ آہستہ دروازے کا ایک پٹ پورا کھل چکا تھا لیکن کوئی چیز وارد نہیں ہوئی تھی مگر اچانک ہی انہیں محسوس ہوا کہ کوئی نامعلوم سا سایہ بڑی آہستگی سے دبے پاؤں کمرے میں داخل ہو رہا ہے۔ پیر صاحب دبے دبے خراٹے لینے لگے جیسے وہ گہری نیند سو رہے ہوں۔ کچھ دیر سایہ اپنی جگہ پر ساکت رہا پھر چپکے سے زمین پر جھک گیا اور رینگتا ہوا سا محسوس ہونے لگا۔ دوسرے ہی لمحے انہیں ایسا محسوس ہوا کہ کوئی ہاتھ ان کی طرف بڑھ رہا ہے اور ابھی وہ کچھ سوچنے بھی نہ پائے تھے کہ کسی نے ایک جھٹکے کے ساتھ ان کے اوپر والی چادر کھینچ لی۔ سایہ پھرتی سے کواڑ کی طرف لپکا مگر پیر ولی اللہ شاہ بڑی مستعدی سے اٹھے اور تیزی کے ساتھ کواڑ بند کر دیئے، کنڈی چڑھا دی اور دونوں بازو پھیلا کر کواڑوں کے ساتھ لگ گئے۔

"کون ہو تم" پیر ولی اللہ نے ہانپتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

"تمہاری موت" کسی کونے سے ایک کرخت آواز آئی۔

"ابھی معلوم ہو جائے گا" پیر صاحب نے بڑے اعتماد سے کہا مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ اور کمرے پر ایک عجیب سناٹا چھا گیا معاً مٹی کا ٹھیکرا پیر ولی اللہ کے سینے پر اتنے زور سے لگا کہ ان کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

"زندگی چاہتے ہو تو دروازہ کھول دو اور اسی وقت احاطے کی حدود سے نکل جاؤ۔" اب کے آواز پہلے سے مختلف تھی اور پیر ولی اللہ شاہ نے بغیر کسی تامل کے ہاتھ بڑھایا دروازے کی چٹخنی کھول دی اور ایک پٹ وا کردیا۔ اور خود دروازے سے الگ ہٹ گئے۔ سایہ بجلی کی سی تیزی سے کھلے ہوئے پٹ کی طرف دوڑا مگر پیر ولی اللہ شاہ چیل کی طرح جھپٹے، اور سایہ طلسماتی انداز سے پیر صاحب کی مضبوط بانہوں میں جکڑ کے رہ گیا۔ کواڑ دوبارہ بھڑ گئے اور ایک تھل تھل پل پل کرتا نسوانی جسم پیر صاحب کی بانہوں کے شکنجے میں کس کے رہ گیا۔

(باقی صفحہ ۵۲ پر)

فکاہیہ

حاتم طائی لاہور میں

عباس احمد عباسی

بیکار ہونا ایک فن ہے اور بیکار بیٹھے رہنا ایک ایسی سعادت ہے جو زور بازو سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور اسی لئے شرفا چاہے الف کے زمانے میں ہوں یا آجکل اس فن میں دسترس رکھتے ہوں۔ مگر حالات نے جہاں اور بہت سی روایات ختم کر دی ہیں وہیں بعض ایسے بھی افراد شرفا میں پیدا ہونے لگے ہیں جو اس فن میں کمال حاصل کرنے کی بجائے اس سے کنارہ کشی اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ اس میں ڈاک کی آسانی اور رسل و رسائل کی سہولت کو بڑا دخل ہے۔ دنیاوی لذتیں اس قدر سہل الحصول ہو گئی ہیں کہ اچھے اچھے صبر پیشہ حضرات بہک جاتے ہیں۔ اب حاتم طائی ہی کو لیجئے۔ پہلے قاعدہ یہ تھا کہ حاتم طائی گھر کے دروازے کھول کر بیٹھ جاتے تھے اور حاجتمند جوق در جوق آتے رہتے تھے اور باری باری اپنی ضروریات پوری کرتے رہتے تھے اور حاتم طائی کو اپنی جگہ سے ہلنے کی ضرورت پیش نہ آتی تھی لیکن آج کل اول تو لوگ حاجتمند بننا ہی نہیں جانتے اور اگر کوئی پیدائشی طور پر حاجتمند ہو بھی گیا تو غالب کے زمانہ کی طرح کوئی اس سے یہ کہنے والا نہیں کہ :

"کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند"

بلکہ آجکل تو اگر کہیں سے حاجتمند آیا تو اول تو وہ خود ہی اخبار میں اعلان کر دیتا ہے اور اکثر تو حاجتمندوں کے متلاشی خود اخبار میں حاجتمندوں کے لئے اشتہار دے دیتے ہیں یعنی یہ کہ اخبارات کی موجودگی نے حاتم طائی کی بیکاری میں اور اضافہ کر دیا ہے اور اسی بیکاری سے یہ آسانی بھی پیدا ہو گئی ہے کہ جب بھی جس کو کوئی ضرورت ہوتی ہے حاتم طائی کو تار دے دیتا ہے اور حاتم طائی آن موجود ہوتا ہے۔ اور اکثر تو اس کی آمد کی بھی لوگوں کو خبر نہیں ہوتی۔ پچھلے دنوں آپ نے میرا مطلب ہے لاہور کے رہنے والوں نے حاتم طائی کو سڑکوں پر گھومتے دیکھا ہوگا اور پھر اچانک وہ غائب ہو گیا۔ آپ کا خیال ہوگا وہ شہر چھوڑ گیا مگر میرا اندازہ یہ ہے کہ وہ کسی دن بھی اونٹ کی نکیل پکڑے مال روڈ کے کسی سپاہی سے جھگڑتا ہوا پایا جائے گا اور اپنی وہی پرانی منطق دہرا رہا ہوگا کہ اونٹ سیدھا چل رہا ہے۔ مال روڈ ہی کی کوئی کل سیدھی نہیں اور جب سے اس نے یہ بات کہی ہے میں بھی مال روڈ کو شک کی نظر سے دیکھتا ہوں۔

آپ لوگوں میں سے اکثر کو یہ بھی نہیں معلوم ہوگا کہ لاہور میں حاتم طائی کیوں آیا۔ اسے کس نے بلایا، حالانکہ آپ کو یہ باتیں معلوم ہونی چاہئیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ ہم لوگ اہمیت ان کو دیتے ہیں جنہیں اہمیت کی ضرورت نہیں اور جنہیں ضرورت ہے انہیں پوچھتے تک نہیں۔ اور ریسٹوران میں حاتم طائی سے لوگوں نے اکثر یہ سوال کیا ہے کہ وہ اونٹ کی سواری کو کیوں ترجیح دیتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس کے پاس موٹر نہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کے کہنے کے مطابق وہ اکثر سڑکوں پر کھڑا رہا ہے اور موٹر والوں کو اشارہ کرتا رہا ہے مگر موٹر والے لفٹ نہیں دیتے۔

بسوں میں بیٹھنے میں اسے صرف ایک اعتراض ہے۔ وہ رکتی بہت جگہ ہے اسلئے وہ اونٹ پر بیٹھتا ہے، اونٹ پر چلتا ہے اور پچھلے دنوں تو میں بھی اس سواری کا قائل ہو گیا۔ اتفاق سے لاہور میں ہی نہیں پورے پنجاب میں جو بارشوں کی وبا پھیلی تو پانی یہ کہتا ہوا کہ دریا تو دریا دشت بھی نہ چھوڑے ہم نے ہر جگہ پھیل گیا۔ بڑی بڑی گاڑیاں اور لاریاں پانی کے سامنے ہتھیار ڈال گئیں مگر حاتم طائی اونٹ پر بیٹھا ہر جگہ گھومتا رہا۔ بات یہ ہے کہ اونٹ سطح سمندر سے کافی اونچا

واقع ہوا ہے اور حاتم طائی کا کہنا یہ ہے کہ نانگا پربت پر وہ اونٹ کے ذریعہ کافی دفعہ ہو آیا ہے بلکہ "پرمن بوہل" جب نانگا پربت کے قصے سنا رہا تھا تو حاتم طائی زیر لب مسکراتا ہوا باہر چلا گیا۔ سنا ہے بعد میں اس نے اپنے حاجتمندوں میں بیٹھ کر "پرمن بوہل" پر ہوٹنگ بھی کی (اور یہ بھی کہا کہ اونٹ کے ہوتے ہوئے پہاڑ پر پیدل چڑھنا حماقت ہے) اس سلسلہ میں وہ ان لوگوں کا حوالہ دیتا ہے جو سمندر پار جا کر واپس آتے ہیں اور بات بات میں اپنی ملکوں کو یاد کر کے آٹھ آٹھ آنسو روتے ہیں اور دوسروں کے لئے عبرت کا سامان بن جاتے ہیں۔

حاتم طائی نے ایک شخص کو روتے دیکھا تو اسکا دل پسیج گیا اس کے پاس بیٹھ گیا، کچھ دیر یہ ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر روتے رہے اور پھر رو رو کر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے یہاں تک کہ حاتم طائی کا چپل اور اس شخص کا ہاف بلکسٹن ڈوب گئی پھر اس شخص نے حاتم طائی سے پوچھا کہ میں تو گردش حالات پر رو رہا تھا تجھے کس بات پر رونا آیا اور حاتم طائی اس بات پر رویا کہ اسے اس قسم کا کوئی دوسرا شعر یاد نہیں تھا۔ پھر نثر میں حاتم طائی نے اس شخص سے پوچھا کہ تجھے گردش حالات نے کیا ستایا ہے اس نے جواب دیا کہ مجھے سمندر پار سے کھینچ بلایا ہے اور حاتم طائی قافیہ ملتے دیکھ کر اس سے بغلگیر ہوا اور ایک کافی کی پیالی اس کے لئے منگائی۔ آس پاس کے بیٹھنے والوں نے اس سخاوت سے اس کے حاتم طائی ہونے کا اندازہ لگایا اور اس کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ حاتم طائی نے ان سب کو کافی پلائی اور اپنے نام کے چھپے ہوئے کارڈ تقسیم کئے جسکا نام پڑھ کر لوگوں نے اسے دیکھا اور اسے دیکھ کر پھر اس کا نام پڑھا۔ کچھ نے سنجیدگی سے ہنسنا شروع کیا اور کچھ متانت سے ہوٹنگ کرنے لگے۔ حاتم طائی پہلے ہنسا اور پھر رویا اور ان سب کے اصرار پر قصہ ہنسنے اور رونے کا سنایا جو سوتے جاگتے کے قصہ سے ملتا جلتا تھا۔

لوگوں نے اس پر سرقہ کا الزام لگایا اور اس دور کا بڑا ادیب تسلیم کیا۔ پھر حاتم طائی نے انہیں ایک نظم سنائی جو کسی غیر ملکی زبان کی نظم کا لفظی ترجمہ تھی۔ اس میں یہ صفت رکھی گئی تھی کہ شعریت کا شبہ تک نہ ہو سکے صرف شاعر کے پڑھنے کا انداز یہ گواہی دے رہا تھا کہ یہ نظم ہے۔ اس پر باذوق حضرات نے تالیاں بجائیں، ایک ایک سطر کو کئی کئی بار پڑھوایا اور متفقہ طور سے اسے سب سے بڑا شاعر تسلیم کر لیا پھر ایک شخص نے جو نقید کا بادشاہ تھا اور ادب کا سطحی مطالعہ رکھتا تھا

حاتم طائی کا شکریہ ادا کیا اور ایک بار پھر اسے سب سے بڑا ادیب اور شاعر تسلیم کیا اور یہ بھی کہا کہ اس اعلان میں کافی کی پیالیوں کا کوئی حصہ نہیں۔

حاتم طائی باہر نکلا تو اونٹ کافی پی رہا تھا۔ حاتم طائی کو اس کی یہ بات بہت ناگوار گزری اسے یہ خیال ہو گیا کہ کہیں اسے سوچنے اور کتابیں پڑھنے کی بری عادتیں نہ پڑ جائیں پھر یہ حاتم طائی سے زیادہ کتابیں لاد نا پسند کرنے لگے گا اور سواری کا رہا سہا آرام ختم ہو جائے گا۔ اونٹ خراماں خراماں مال روڈ کی طرف چلا۔ حاتم طائی نے اسی میں مصلحت سمجھی کہ وہ سوار ہونے کا ارادہ ملتوی کر دے مگر یہ اس کی سیاسی غلطی تھی کیونکہ اسکے بعد سے اسے دوبارہ اونٹ پر بیٹھنا نصیب نہیں ہوا۔ حاتم طائی یہ بات بھی گوارا نہ کر سکا۔ مگر سب سے بڑا حادثہ یہ پیش آیا کہ ایک دن اونٹ چلتے چلتے ایک آدمی سے ٹکرا گیا اور حاتم طائی کی تنبیہہ پر اس نے یہ شکایت کی۔ راہ رو دیکھ کر نہیں چلتے آکے خواہ مخواہ ٹکرا جاتے ہیں۔ حاتم طائی نے احتیاطاً اپنے لئے ایک عینک خرید لی اور کئی دن وہ عینک لگائے اکثر لائبریریوں کے چکر لگاتا، کافی پیتا اور سگریٹ منہ میں لئے ماچس مانگتا نظر آتا رہا ادھر اونٹ کا یہ حال کہ وہ قدم قدم پر ہر کس و ناکس سے ٹکرا جاتا تھا۔ حاتم طائی کا کہنا تھا کہ اونٹ کو لاہور کی صحبت نے خراب کر دیا ہے۔ وہ انسان کے آداب راہ روی کا سخت شاکی تھا اور اسی لئے حاتم طائی نے عینک اتار دی اور اونٹ نے اسے پہچاننا چھوڑ دیا۔

اس اونٹ کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد سے حاتم طائی نے یہاں کسی نئے اونٹ کی تلاش شروع کی، اس سلسلہ میں لوگوں نے اسے یہ بتایا کہ چیرنگ کراس کے پاس ایک نہایت خوشنما جگہ ہے اس میں ہر قسم کا جانور پایا جاتا ہے، بلکہ دور دور سے جمع کیا جاتا ہے۔ شاید اسکی مشکل وہاں حل ہو جائے۔ حاتم طائی نے ایک دن سویرے سویرے وہاں کا رخ کیا، باہر اس سے ٹکٹ کے پیسے مانگے گئے تو حاتم طائی چکرا گیا۔ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ آخر جانوروں کو دیکھنے کے لئے ٹکٹ کیوں لیا جائے جبکہ آدمی کو دیکھنے کے لئے جانور کبھی ٹکٹ نہیں لیتے اور پھر جانوروں میں ایسی عجیب کیا بات ہو کہ انہیں دیکھنے کے لئے لوگ آئیں مگر کسی نے اس کی بات تسلیم نہیں کی اور اسے ٹکٹ لینا پڑا۔ کہتے ہیں کہ حاتم طائی چڑیا گھر سے بھی ناکام لوٹا۔ چڑیا گھر کے اونٹ نے اس کے ساتھ آنے سے انکار کر دیا۔ حاتم طائی کو جس بات کی سب سے زیادہ شکایت ہے وہ یہ ہے کہ یہاں لوگوں کو ہمدردی کی ضرورت نہیں۔ لوگوں کی مدد کرنی چاہیے تو لوگ شبہ کی

نظرے دیکھتے ہیں اور پھر یہ کہ یہاں اس قسم کے محکمے قائم ہیں جو شخصی امداد کا موقع ہی نہیں دیتے۔ اب ایسی زندگی میں کیا لطف کہ آدمی کسی کے آنسو بھی نہ دیکھ سکے۔ پہلے زمانہ میں لوگ حاجتمند ہوتے تھے۔ سخی لوگوں کی تلاش میں شہر شہر چکر لگاتے تھے اور پھر کہیں نہ کہیں سے ضرورت پوری ہو جاتی تھی۔ اب لوگ مانگنے سے زیادہ قرض لینا زیادہ پسند کرتے ہیں اور قرض بھی اکثر حکومت سے لیتے ہیں۔ پھر یہ لوگ صرف قرض پر گزارہ نہیں کرتے کام کرنا چاہتے ہیں۔ حاتم طائی سے مدد مانگنے کی بجائے لوگ نوکری مانگتے ہیں اور اب حاتم طائی یہ حیران ہے کہ کون سا محکمہ کھولے۔ اسے تو صرف ایک کام آتا ہے، سخاوت اور یہ پیشہ اس دور میں مقبول نہیں اور سخاوت کا کوئی محکمہ نہیں کیونکہ محکمہ میں تو کام بھی ہوتا ہے اور جو لوگ نوکری کرنا چاہتے ہیں وہ کام پہلے کرنا چاہتے ہیں اور حاتم طائی ان لوگوں کو دیکھ دیکھ کر سوچتا ہے کہ آخر ان کی رگ رگ و پے میں یہ غلامی کیوں ہے۔ آخر انہیں یہ کیوں پسند نہیں کہ بغیر کچھ کئے کھائے جائیں اور حاتم طائی کہ پہ ئم کہا جاتا ہے۔

زندگی کے متعلق نظریات اس قدر غلط ہو گئے ہیں کہ حاتم طائی تھوڑی دور بھی ساتھ نہیں چل سکتا۔ حاتم طائی کی دولت اس کے کسی کام نہیں آسکی۔ اس طرف سے مایوس ہو کر حاتم طائی نے دوسری طرف کا رُخ کیا۔ ایک شام وہ اونٹ کے فراق میں، مال روڈ پر چکر لگا رہا تھا کہ اسے ایک شخص ملا جس کے چہرے سے مایوسی اور اداسی ٹپک رہی تھی۔ حاتم طائی دل میں کچھ مایوسی اور اداسی جمع کرنے لگا تو اس شخص نے حاتم طائی کو غور سے دیکھا اور بغلگیر ہو گیا۔ حاتم طائی ابھی اس خلوص پر حیران تھا کہ اس نے چائے کی دعوت دیدی اور پھر چائے کی پیالی پر سے ساری اداسی اور مایوسی کی جمع پونجی دے دی۔ حاتم طائی اس کی سخاوت دیکھ کر حیران ہو گیا اور پوچھا کہ اے مردِ سخی کیا تو حاتم طائی کو جانتا ہے؟ اس شخص نے حاتم طائی کے متعلق نہایت بری رائے دی جس پر حاتم طائی بغلگیر ہوا اور کہا کہ اے مردِ سخی تو نے سچ کہا، مجھے حاتم طائی کہتے ہیں۔ اس پر وہ شخص دوبارہ بغلگیر ہونا چاہتا تھا کہ بیرے نے بل پیش کر دیا اور اس نے بل بیرے سے لے کر حاتم طائی کی طرف بڑھا دیا اور نہایت خوشامدانہ لہجے میں کہا یہ ہماری دوستی کا میری طرف سے پہلا حقیر تحفہ ہے، پیسے دیجئے اور اُٹھئے۔ حاتم طائی بہت خوش ہوا اور پیسے دے کر اس مردِ سخی کے ساتھ چلا۔ یہ مردِ سخی اسے اپنے ایک دوست کے پاس لے گیا جو اداس اور مایوس ہونے کے ساتھ بیزار بھی تھا۔ حاتم طائی سے تعارف ہونے اور حاتم طائی کی تعریف سننے کے بعد اس دوست نے اپنی بیزاری حاتم طائی کو بخش دی اور بغلگیر ہوا بلکہ اپنے ساتھ ٹھہرنے کی بھی دعوت دی مگر حاتم طائی نے ان دونوں کو اپنے ساتھ ہوٹل میں ٹھہرایا۔ ان دو دوستوں نے حاتم طائی کو ایک اور دوست سے ملا دیا جو اداس، مایوس اور بیزار نہیں تھا مگر بیمار تھا۔ اس دوست نے جب اپنے دوستوں کی دریا دلی کے قصے سنے تو حاتم طائی کو اپنی بیماری دینی چاہی جو حاتم طائی نے بہت پس و پیش کے بعد قبول کر لی۔ پھر باری باری سب ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے اور حاتم طائی نے اسے بھی اپنے ساتھ ہوٹل میں ٹھہرا لیا اور اب وہ تینوں دوست تو اس ہوٹل میں نظر آتے ہیں۔

حاتم طائی کہیں غائب ہو گیا ہے۔ سنا ہے یہ کہ حاتم طائی اس قدر اداس مایوس اور بیزار ہو گیا تھا کہ وہ ان دوستوں کی خوشیوں میں شریک نہ رہ سکا۔ ان دوستوں سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ چار پانچ دن کے بعد حاتم طائی نے بولنا ترک کر دیا تھا، سگریٹ زیادہ پینے لگا تھا اور راتوں کو تارے گننے کا شغل اکثر کیا کرتا تھا۔ اس سے ان لوگوں کو یہ شبہ ہوا کہ شاید حاتم طائی کو عشق ہو گیا ہے اور انہوں نے جستجو بھی کی مگر ایسی کوئی بات دریافت نہیں ہوئی۔ آس پاس کوئی ایسا موقع بھی نہیں تھا۔ پھر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ ایک دم سے حاتم طائی کیوں غائب ہو گئے اور اپنی دولت کیوں چھوڑ گئے۔ اس کے تکیہ کے نیچے سے ایک خط نکلا ہے وہ میں پیش کئے دیتا ہوں :-

"منکہ مسمی حاتم طائی حال وارد لاہور۔ ایک عدد مایوس، اداس، بیزار اور بیمار آدمی ہوں۔ لیکن جب یہاں آیا تھا تو ایسا نہیں تھا۔ میری ان تمام بیماریوں کی ذمہ داری میرے اُن احباب پر ہے جو آجکل میرے ساتھ رہتے ہیں۔ ان میں سے ایک شاعر ہے، ایک افسانہ نگار ہے اور ایک نقاد۔ یہ لوگ میرے مخلص دوست ہیں۔ انہوں نے مجھ سے میری خوش طبعی

(باقی صفحہ ۵۲ پر)

افسانہ

عمرِ عزیز

احمد یوسف

نواب صاحب نے شجاعت میاں کو کیوں نکال دیا؟ یہ ایک بڑا ٹیڑھا سوال ہے، بس یونہی نکال دیا، جیسے وہ اپنی میز سے ردی کاغذ کو نکال دیتے ہیں۔ شجاعت میاں بھی تو ان کے خیال میں ردی کاغذ ہی ہوگئے تھے۔ بھلا ستر سال کی نوکری کے بعد کوئی ردی کا غذ نہ ہوجائے تو کیا ہو؟

شجاعت میاں نواب صاحب کے ہاں ستر سال سے تھے، انہوں نے نواب صاحب کے دادا تک کو دیکھا تھا۔

"بڑے نواب صاحب، کیا مرتبہ پایا تھا انہوں نے"۔ اکثر یہ جملہ شجاعت میاں کی زبان سے سنا جاتا، اس جملے کے علاوہ بھی انہیں بڑے نواب صاحب کے متعلق بہت ساری باتیں کہتے اکثر سنا گیا تھا۔ اس بڑھاپے میں ان کا مشغلہ ہی کیا رہ گیا تھا؛ بس نواب صاحب کی ڈیوڑھی پہ چارپائی بچھائے پڑے رہنا اور دن بھر حقہ گڑگڑانا۔ البتہ وہ شام کو برابر کی مسجد میں لاٹھی ٹیک ٹیک کر پہنچ جاتے، اور جب سب نمازی چلے جاتے تو موذن سے دیر تک ان کی باتیں ہوا کرتیں۔ بس ادھر ادھر کی، کچھ غم دوراں کی، کچھ پرانی باتیں، اور آخر میں ٹیپ کے بند کے طور پر شجاعت میاں نواب صاحب کے والد یا ان کے دادا کے متعلق کوئی قصہ۔

عشا کی نماز تک وہ موذن سے بیٹھے گپیں ہانکا کرتے۔ موذن سے ان کے دیرینہ تعلقات تھے اور گہرے مراسم کی بنا پر دونوں نے ایک دوسرے کو بہت کچھ پہچان لیا تھا، اور دونوں ایک دوسرے کے دکھ درد میں برابر کے شریک تھے۔ عشا کی نماز کے بعد وہ اسی طرح آہستہ آہستہ ڈیوڑھی تک پہنچتے۔ وہاں پہنچ کر زنان خانے میں گھر کی ماما کو آواز دیتے۔ وہ ان کے لئے المونیم کی ایک رکابی میں بھات جس کے کنارے عموماً ساگ یا آلو کا بھرتہ ہوتا، اور ایک پیالے میں دال لے آتی۔ شجاعت میاں کے دانت تو گویا تھے ہی نہیں بس دو چار آگے پیچھے رہ گئے تھے۔ وہ دیر تک کھانا کھاتے رہتے۔ کھانا کھانے کے بعد ڈیوڑھی کے ایک کونے میں بیٹھ کر اپنا حقہ سلگاتے، اور پھر گڑگڑ... گڑگڑ کی آواز ڈیوڑھی کی ساکت فضا میں گونجنے لگتی، اور یہ آواز ڈیوڑھی سے نکل کر مکان کے دوسرے حصے میں پہنچ جاتی۔ نواب صاحب کے پوتے سمجھ جاتے کہ شجاعت میاں آگئے، پھر وہ ایک دوسرے سے کہتے:۔

"شجاعت دادا آگئے چلو"۔ یہ معمولی سا جملہ اس چھوٹی سی جماعت کا نعرہ بن جاتا اور یکدم سے وہ سب ڈیوڑھی پر دھاوا بول دیتے۔

"دادا آج کونسی کہانی سناؤ گے؟" ان میں سے کوئی ایک بول اٹھتا۔

"کہانی وہانی کوئی نہیں، جاؤ رات زیادہ ہوگئی ہے، جاکر سو رہو"۔ شجاعت میاں بچوں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرنے لگتے۔

"نہیں دادا ہم سب تو قصہ سن کر رہیں گے" وہ سب مل کر احتجاج کرتے۔

"سرکار سنیں گے تو خفا ہوں گے ...... جاؤ جاکر سو رہو" وہ آخری ہتھیار استعمال کرتے لیکن یہ بھی کارگر ثابت نہ ہوتا۔ اور پھر قصہ شروع ہوجاتا ــــــ

"تو سنو... ایک تھا بادشاہ، اس کی تھیں سات بیویاں....."

اور یہ قصے کا سلسلہ اس وقت تک ختم نہ ہوتا جب تک کہ تقریباً سارے بچے شجاعت میاں کے بستر پر نیند سے مغلوب ہوکر لڑھک نہ جاتے۔ شجاعت میاں کے لئے یہ بڑی مصیبت ہوجاتی، دیر تک زنان خانے میں ماما کو پکارنا پڑتا، وہ کوسنے دیتی ہوئی باہر نکلتی اور

پھر شجاعت میاں ایک ایک کرکے بچوں کو گود میں اٹھا کر زنان خانے بھجوا دیتے، لیکن بچے کہانی سننے سے باز نہ آتے اور دوسرے دن پھر روز اول کی طرح آ دھمکتے۔

ادھر کئی برسوں سے ان کا یہی معمول ہو گیا تھا۔ دن بھر حقہ گڑگڑانا، شام کو مسجد جانا، عشا کے بعد واپس آنا، اور رات کا کھانا کھا کر بچوں کو کہانی سنانا۔ زندگی عرصے سے ایک ہی ڈگر پر چل رہی تھی اور اس سیدھی سادی زندگی میں کوئی ان کا شریک نہ تھا، کوئی مونس و غمخوار نہ تھا، بیوی جوانی ہی میں مر چکی تھی، لے دے کے ایک لڑکا تھا، اس سے بھی گویا رشتہ منقطع ہی ہو چکا تھا۔ ان کی ساری امیدیں نواب صاحب کے گھر ہی سے وابستہ تھیں۔

ادھر نواب صاحب سوچتے کہ گائے جب تک دودھ دے اسی وقت تک اسے رکھنا چاہیئے۔ اور جب بوڑھی ہو جائے تو اسے الگ کر دینا چاہیئے۔ نواب صاحب اصول کے آدمی تھے۔ اور انہیں یہ بے اصولی بے حد گراں گزر رہی تھی، گائے کب کی بوڑھی ہو چکی ہے، کب سے وہ گاؤ شالے میں پڑی پڑی مفت گھانس چارہ کھائے جا رہی ہے، شجاعت میاں بوڑھی گائے ہی تو تھے۔ لے دے کے یہی ایک کام رہ گیا تھا۔ بچوں کو بادشاہ ملکہ کی اور جن و پری کی کہانیاں سنانا۔ "لیکن یہ تو کوئی کام نہیں ہوا۔" نواب صاحب سوچا کرتے "اس سے تو اور بچوں کے اخلاق پر برا اثر پڑتا ہے۔"

اکثر وہ بڑی سنجیدگی سے بیگم سے اس مسئلے پر گفتگو کرتے۔ گھر میں دو بوڑھے تھے، جن میں ایک گھر کی پرانی مغلانی تھیں، جن کا سوائے دن بھر پان چبانے کے کوئی کام نہ تھا، اور پھر دن بھر شور مچاتی رہتیں، بات بات پر جھگڑا، بچوں پر خفا ہونا، ان کو ڈانٹنا، خیر وہ تو پچھلے دنوں رخصت ہو گئیں۔ یہ ایک شجاعت میاں مرد لے دے کے رہ گئے، کہنے کو ضعیفی خود سو بیماریوں کی ایک بیماری ہے، لیکن بڈھا تو کچھ ایسا ٹانٹھا تھا کہ کمبخت کو زکام بھی نہ ہوتا۔ بیگم کہتیں "چھوڑو بھی، کیا دھرا ہے ان باتوں میں کوئی اور بات کرو۔"

"کیا دھرا ہے ان باتوں میں، تم خرچ کرنے بیٹھو تو پتہ چلے۔ پورے ہزار روپے ہر مہینے خانہ داری پر اٹھتے ہیں۔" اور پھر وہ لپک کر اپنے کمرے سے اخراجات کی بہی لے آتے، بیگم بظاہر اخراجات کو بڑے غور سے دیکھتیں، اور جب وہ اپنی نگاہیں بہی پر سے اٹھا لیتیں تو نواب صاحب کہتے :-

"تم تو جانتی ہی ہو زمینداری کا جو حال ہے۔ کمبخت وصولی ہی نہیں ہوتی، کیا زمانہ پلٹا ہے، وہ تو اللہ بھلا کرے کچھ پرمٹ وغیرہ مل جاتا ہے، ورنہ گھر کا خرچ چلنا مشکل ہو جاتا۔"

بیگم نواب صاحب کو دھیما ہوتا دیکھ کر کہتیں :-

"اب کیا ضرورت ہے شجاعت میاں کو نکالنے کی، وہ تو خود ہی قبر میں پیر لٹکائے ہوئے ہیں، آج نہیں کل، آخر کب تک۔"

"لیکن جب گائے بوڑھی ہو جائے تو اسے الگ کر دینا چاہیئے۔"

یہ ایک ایسا اصول تھا، جو نواب صاحب کو شش و پنج میں ڈال دیتا۔ گائے کب کی بوڑھی ہو چکی تھی، لیکن پھر بھی اسے علیحدہ نہیں کیا گیا، آخر یہ کیوں؟ یہ سوالیہ جملہ اکثر ان کی نظروں کے سامنے آ جاتا۔ زندگی بھر وہ یہاں اپنی بیگم کی وجہ سے اس اصول کو برت نہیں سکتے تھے۔

اس طویل عرصے میں انہوں نے کتنی ہی بار کوشش کی تھی کہ وہ کسی طرح شجاعت میاں کو نکال دیں۔ مگر بیگم جیسے ان کی راہ میں دیوار بن گئی تھیں۔ اسی دن کی بات ہے جب شجاعت میاں نے بیگم سے پچھلی تنخواہ منگوائی تھی، تو نواب صاحب نے کہا تھا کہ ان کا حساب صاف کر کے انہیں الگ ہی کر دیا جائے، پر بیگم کی سفارش نے انہیں مجبور کر دیا۔ اسی طرح بہتیرے مواقع ایسے آئے جب کہ وہ آسانی سے شجاعت میاں کو الگ کر سکتے تھے، لیکن ہر بار بیگم نے اڑنگا لگا یا۔

اور اس دن جب وہ کہیں باہر سے آئے تھے تو انہوں نے ڈیوڑھی میں لڑنے جھگڑنے کی آواز سنی، جیسے کوئی ضعیف مرد کسی ادھیڑ عمر کی عورت سے لڑ رہا ہو۔ بات دراصل یہ تھی کہ شجاعت میاں کے کھانے میں ایک بال نکل آیا تھا۔ اور جب انہوں نے ماما سے وجہ پوچھی تھی تو اس نے عجیب تیکھے پن سے جواب دیا تھا :-

"بیٹھے بیٹھے کھاتے ہو اور اس پر نوابی نکھٹو کہیں کے۔" تو گائے کے بوڑھے ہو جانے کا دوسروں کو بھی احساس ہو گیا ہے۔ نواب صاحب یہ سوچ کر خوش ہوئے، لیکن شجاعت میاں کہہ رہے تھے کہ وہ ہمیشہ ایسے نہیں تھے کبھی جوان تھے کبھی ان کے جسم میں کس بل تھا اور جب وہ جوان تھے تو انہوں نے بڑی بڑی خدمتیں انجام دی تھیں۔ — "لیکن اب تم بالکل بیکار ہو۔" ماما کہہ رہی تھی۔

اور یہ بات ان کے ذہن میں بجلی کی طرح کوند پڑی، وہ ایک ساعت کے لئے چپ ہو گئے، پر نہیں انہوں نے ہمیشہ خدمتیں کی ہیں اور یہ سوچ کر پھر ان کی ہمت بندھ گئی۔

"کیا کر رہے ہیں شجاعت میاں؟" نواب صاحب کی گرجدار آواز ڈیوڑھی کی فضا میں گونج کر گم ہو گئی۔

"کچھ نہیں سرکار، یہ گلشنا جھگڑے کرتی ہے۔" انہوں نے سٹپٹا کر جواب دیا۔

"عورتوں سے لڑتے شرم نہیں آتی آپ کو؟"

"مگر سرکار اس میں میرا کیا قصور؟"

"میں ابھی آپ کا حساب بیباق کر دیتا ہوں، ایک تو بیٹھے بیٹھے کھاتے ہیں اور اس پر گھر کی ماماؤں سے جھگڑا کرتے ہیں۔" نواب صاحب کی آواز میں خفگی تھی، خشونت تھی، جھنجھلاہٹ تھی۔ جیسے وہ ایک عرصے سے یہ کہنے کو ادھار کھائے بیٹھے ہوں۔

یہ چھوٹا سا جملہ شجاعت میاں پر بجلی بن کر گرا۔ انہیں ایسا معلوم ہوا جیسے ان کی ستر سال کی خدمت اکارت گئی۔ بالکل اکارت۔ اور یہ جملہ اب انہیں معاوضے کے طور پر دیا جا رہا ہے شجاعت میاں بالکل سناٹے میں آ گئے۔

"ستر سال کی خدمت کا یہ صلہ، کیا اندھیر ہے۔" وہ سوچ رہے تھے اور ان کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو بہہ کر ان کے شکن آلودہ گال پر پھیل گئے۔ اور بہتے بہتے ان کی سفید داڑھی تک پہنچ گئے۔ ڈیوڑھی میں سناٹا تھا، ایک اتھاہ خاموشی ڈیوڑھی کی فضا میں پھیل گئی تھی، نواب صاحب جا چکے تھے۔ اور شجاعت میاں کی ضعیف آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"کاش وہ پیدا ہی نہ ہوتے کہ آج یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا" لیکن وہ پیدا ہوئے جوان ہوئے۔ اور اپنی عمر کے ستر سال انہوں نے نواب صاحب کے دربار میں رائیگاں کئے۔

"لیجئے یہ رہی آپ کی پچھلی دس مہینوں کی تنخواہ۔" نواب صاحب نے دس روپلیاں ان کے آگے پھینک دیں۔

"لیکن سرکار میرا قصور؟" شجاعت میاں ہاتھ جوڑے نواب صاحب کے آگے کھڑے تھے۔ ان کی سرخ سرخ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور ان کی آواز پھنسی پھنسی نکل رہی تھی۔

"قصور وصور کچھ نہیں بس اپنا راستہ لیجئے ورنہ . . . ." اور یہ "ورنہ" کا لفظ پھر شجاعت میاں پر بجلی کا ایک کڑکا بن کر گرا۔

"ورنہ شاید وہ دھکے دیکر نکال دیں گے" اس ستر سال میں تو کبھی ایسی بات نہیں ہوئی۔ شجاعت میاں سوچ رہے تھے لیکن نہیں، پہلے اور اب میں بڑا فرق تھا۔ پہلے ان کے بدن میں طاقت تھی، آنکھوں میں بینائی تھی۔ اور وہ ہر کام بڑی پھرتی سے کرتے تھے لیکن اب ان کے جسم کی طاقت زائل ہو چکی، آنکھوں کی بینائی تقریباً ختم ہو چکی اور وہ دن بھر ڈیوڑھی میں بیٹھے بیٹھے حقے گڑگڑایا کرتے ہیں۔

اگر نواب صاحب انہیں یہ بتا دیتے کہ "گائے جب بوڑھی ہو جائے تو اسے الگ کر دیا جاتا ہے" تو انہیں سمجھنے میں دقت نہ ہوتی، لیکن انہوں نے تو شجاعت میاں کو نکالنے کے لئے ایک اوچھا ہتھیار استعمال کیا۔

"لیکن اب انہیں جانا ہے" انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا۔

"شجاعت دادا، بیگم کہہ رہی ہیں کہ آپ رک جایئے" گھر کا چھوکرا منجو آ کر کہہ رہا تھا۔

"بیگم سے کہہ دو انہیں اس معاملے میں دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔" نواب صاحب کی گونجتی ہوئی آواز ان کے کمرے سے نکل کر گھر کے صحن میں پھیل گئی۔ منجو دبے پاؤں ڈیوڑھی سے چلا گیا۔ اور شجاعت میاں اپنے مختصر سے سامان کو سمیٹنے لگے۔ ایک چھوٹا بکس، ایک حقہ، ایک لوٹا، ایک گلاس اور دس روپلیاں، ان کی ساری ملکیت اس مختصری فہرست پر ختم ہو جاتی تھی۔

انہیں یاد تھا، ستر سال پہلے جب وہ اس گھر میں پہلی بار آئے تھے، تو ان کے بدن پر صرف ایک لنگی اور ایک پرانی مرزئی تھی، جو انہیں باپ کے ترکے میں ملی تھی۔ اس وقت ان کی عمر دس سال کی ہو گی، اس لئے وہ مرزئی ڈھیلی ڈھالی اور لانبی تھی، انہوں نے وہ مرزئی پہننے سے انکار بھی کر دیا تھا۔ اس پر ان کی ماں نے کوسنے دیتے ہوئے کہا تھا۔

"نگوڑے یہ نہیں پہنے گا تو کیا ننگا پھریگا؟" ۔ اور جب شجاعت میاں نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ انہیں ایک نئی مرزئی سلوا دے، تو ان کی ماں نے بڑے سخت گیر لہجے میں کہا:

"تیرا باپ بڑی دولت بھی تو چھوڑ گیا ہے۔" یہ بات ان پر بڑی شاق گزری تھی۔ ہاں تو وہ پہلی بار اس گھر میں ایک لنگی اور ایک ڈھیلی ڈھالی مرزئی پہن کر اپنی ماں کے ساتھ آئے تھے۔ بڑی بیگم یعنی نواب صاحب کی دادی اس وقت زندہ تھیں۔ ان کی ماں نے بیگم صاحب سے ان کی نوکری کے متعلق باتیں کی تھیں، اور ایک روپیہ مہینہ، کھانا ناشتہ اور سال میں دو جوڑے کپڑے یہ معاملہ طے ہو گیا تھا۔ نواب صاحب کے والد اس وقت کڑیل جوان تھے، نئی نئی شادی ہوئی تھی، ان کے سرخ و سفید

چہرے پر بھوری بھوری مونچھیں بڑی خوبصورت نظر آتی تھیں، انہوں نے جب شجاعت میاں کو پہلی بار دیکھا تھا، تو زیر لب مسکرا دئے تھے، اور مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"معاذ اللہ ایسی اچھی مرزئی تو شہر کے رئیسوں کو بھی نصیب نہیں ہے۔"
اس جملے نے شجاعت میاں کو بڑا گہرا چرکہ دیا تھا۔ اور جب ان کی ماں انہیں نواب صاحب کے ہاں چھوڑ کر جانے لگی تھی، تو وہ ماں سے لپٹ کر خوب روئے تھے۔ اور ان کے آنسو اس وقت تک نہ تھمے، جب تک کہ ان کی ماں نے ان سے یہ نہ کہا تھا کہ وہ اگلی عید پر ان کے لئے ایک نئی مرزئی اور میٹھی کے لڈو گاؤں سے بھیج دے گی۔

نواب صاحب کے دادا ابا اس وقت لب گور ہو چکے تھے، اور عرصے سے باہر آنا جانا ترک کر کے خلوت نشین ہو چکے تھے۔ لوگ گھر ہی پر ان سے ملنے آیا کرتے۔

ان کے ملاقاتیوں میں ایک بنّے صاحب تھے، جو پتنگ بازی میں شہر میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ ایک حافظ نابینا تھے جن کا اصل نام تو گویا لوگوں نے بھلا ہی دیا تھا۔ بس حافظ نابینا ہی کے نام سے جانے جاتے تھے انہیں طلسم ہوشربا کی سات جلدیں بھی یاد تھیں۔ تیسرے بندے علی میاں تھے، جنہیں چڑیاں پالنے کا شوق تھا۔ بلبل، مینا، لال، تیتر بٹیر اور اسی طرح کی بہت ساری چڑیاں ان کے ہاں تھیں، اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ وہ چڑیوں کی زبان بھی جانتے تھے، اور اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ یہ فن انہوں نے آسام کے جنگلوں میں برسوں کی ریاضت کے بعد سیکھا ہے۔

انہی دنوں کی بات ہے ایک بار کبوتر کا ایک جوڑا آ کر دیر تک گھر کے برآمدے میں غٹغٹایا تھا، تو بندے علی نے کہا تھا کہ کبوتر نواب صاحب کی درازیٔ عمر کی دعا کر رہے ہیں۔ اس پر نواب صاحب نے خوش ہو کر انہیں کمخواب کی ایک شیروانی اور مبلغ پانچ روپے عنایت فرمائے تھے۔ اور حافظ نابینا نے طلسم ہوشربا کی سات جلدوں کی قسم کھاتے ہوئے کہا تھا کہ نواب صاحب جیسا فیاض انہوں نے اس شہر میں ایک بھی نہیں دیکھا۔ اس جملے پر نواب صاحب اور پھڑکے تھے اور انہوں نے حافظ نابینا، کو نئی زردوزی کی سلیم شاہی جوتی سے سرفراز کیا تھا۔

بنّے صاحب کو شبرات کے تہوار پر اپنے فن کا کمال دکھلانے کا موقع ملتا تھا جب بنّے صاحب کا پتنگ نواب صاحب کی چھت سے اڑتا تھا تو محلے میں شور مچ جاتا تھا کہ استاد بنّے کا پتنگ آ گیا۔ اور آہستہ آہستہ نوسیکھے پتنگ باز اپنا پتنگ دور کر لیتے تھے۔ بس شہر میں اگر کوئی ان کے مقابلے کا تھا، تو وہ تھے دلاور خاں جنہیں پتنگ کی کمان بنانے میں بڑی مہارت حاصل تھی، لیکن بنّے صاحب انہیں خاطر میں نہ لاتے تھے۔

ان دنوں شہر میں جاناں صاحب کی شاعری کی بڑی دھوم تھی۔ جاناں صاحب اپنی قصیدہ گوئی کی وجہ سے بڑے ہر دل عزیز تھے۔ یوں وہ مرثیہ گوئی بھی کرتے تھے اور محرم کی مجلسوں میں انہیں بلایا بھی جاتا تھا، لیکن ان کی اصل شہرت قصیدہ گوئی کی وجہ سے تھی۔ ایک بار انہوں نے کسی فرنگی جرنیل کی خدمت میں حاضر ہو کر ایک قصیدہ اس کی شان میں سنایا تھا۔ فرنگی نے خوش ہو کر انہیں سو روپے نقد اور ایک سند عطا فرمائی تھی۔ یہ سند وہ بڑی حفاظت سے رکھا کرتے تھے، اور اگر کبھی کوئی انہیں آڑے ہاتھوں لینے کی کوشش کرتا تو وہ بڑی شان سے کہتے۔ "صاحبزادے کیا سمجھتے ہو، فرنگی جرنیل کی سند رکھتا ہوں" نواب صاحب کے ہاں بھی وہ اکثر آیا کرتے تھے۔ اور اکثر ان کے اعزاز میں مشاعرے بھی منعقد ہوا کرتے تھے۔

بڑے نواب صاحب کے انتقال کے بعد یہ مجلسیں کم ہو گئیں۔ ان کے صاحبزادے نواب شکوہ کے تو زیادہ تر انگریزی دوست تھے، جو فر فر انگریزی بولا کرتے تھے۔ اور پھر نواب شکوہ خود بھی تو ولایت جا چکے تھے، وہاں کسی میم کو بھی رکھ لیا تھا، لیکن خیر یہ تو رئیسوں کی شان ٹھہری۔

نواب شکوہ کے زمانے میں تو میز کرسیاں آئیں، اور پرانے لوگ آہستہ آہستہ کھسکتے ہی گئے۔ شہر کے اکثر حلقوں میں کہا جاتا کہ بھئی اب تو نواب شکوہ کے ہاں انگریزی کا دور دورہ ہے۔"

اس ستر سال کے عرصے میں کتنی ہی بار گھر میں دائیاں آئیں اور بچے جنے گئے۔ خود موجودہ نواب صاحب بھی تو ان کے سامنے ہی پیدا ہوئے تھے۔ انہیں اب تک یاد تھا، نواب صاحب کی پیدائش پر شاندار دعوت ہوئی تھی۔ ہندوستانیوں کے لئے دسترخوان بچھے تھے، اور انگریزوں کے لئے میز کرسی کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس بات پر انہیں سخت غصہ آیا تھا، اس دعوت میں انہوں نے خوب کام کیا تھا۔ نواب صاحب ان سے بے حد خوش ہوئے تھے۔ اور انہوں نے ان کے ہاتھوں کی ابھری ہوئی مچھلیوں کو دیکھ کر کہا تھا۔

"اب جلد ہی تیری شادی کر دوں گا۔"

ایک سال بعد انہوں نے واقعی ان کی شادی کردی، ایک دبلی پتلی گوری سی لڑکی سے یہ تمام سماں ان کی آنکھوں میں بسا ہوا تھا۔ اور یکایک آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہنے لگیں۔

نواب صاحب کے چھوٹے چھوٹے پوتے آکر کہہ رہے تھے۔ "شجاعت دادا مت جاؤ" "بیٹا میں بہت جلد آجاؤں گا"۔ انہوں نے بہتے ہوئے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے جھوٹ بول دیا۔ ننھے ننھے بچوں کی آنکھوں سے بھی آنسو نکل پڑے۔ پتہ نہیں کیوں انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ دادا پھر نہیں آئیں گے۔

شجاعت میاں نے جاتے جاتے نواب صاحب اور بیگم صاحب کو سلام کہلوا بھیجا، بچوں کو پیار کیا اور جب وہ دروازے کے قریب پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ منجو اپنی قمیص کے دامن میں آنسو پونچھ رہا ہے۔

"چپ رہ بیٹا منجو" انہوں نے دبی زبان میں کہا۔ پھر منجو کو ایک بار غور سے دیکھا اتنی ہی عمر میں وہ بھی تو آئے تھے۔ اور یکایک ان کی آنکھوں کے آگے منجو کا بھیانک مستقبل چکر کاٹنے لگا۔

دروازے سے باہر نکل کر انہوں نے مکان کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔ مکان پر شکوہ منزل کی سنگِ مرمر کی تختی لگی ہوئی تھی، جو نواب صاحب نے خان بہادر ہونے کے موقع پر لگوائی تھی۔

ستر سال پہلے وہ اس شکوہ منزل میں پہلی بار داخل ہوئے تھے، ایک دس سالہ چھوکرے کی حیثیت سے اس وقت ان کے چہرے پر بچپن کا نکھار تھا، طاقت تھی بینائی تھی، لیکن آج ان کے چہرے پر جھریاں ہیں، ضعیفی سے چلنا دوبھر ہے، بدن میں رعشہ ہے، اور اس حالت میں ان سے ان کی روزی چھین لی گئی۔ وہ لاٹھی ٹیکتے سڑک پر آ گئے تھے۔ سامنے میدان میں ملک محمد دین کنجڑا اپنی بوڑھی گائے کی پیٹھ کو تھپتھپا رہا تھا، جیسے کہہ رہا ہو:

"تو اب بوڑھی ہوگئی۔ جی میں آتا ہے تجھے قصائی کے ہاتھ بیچ دوں"۔

خواجہ فریدؒ کی ایک کافی؛ بقیہ صفحہ ۱۱

میں نے برضا و رغبت ان کو اپنے دامن میں ڈال لیا ہے۔

چوتھے بند میں تھل مارو بہت عمدہ ترکیب ہے یعنی ایسا صحرائے بے آب و گیاہ جس میں آدم زاد پھنس جائے تو پھر زندہ بچ کر نہ نکل سکے۔ فرقت کی ماری سسّی کہتی ہے کہ جب پنّل خاں مجھے چھوڑ کر چل دیا تو میں اس کی تلاش میں نکلی، اس کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک ایسے بے آب و گیاہ صحرا میں جا پھنسی جس سے کوئی آدم زاد زندہ بچ کر نہیں نکل سکتا۔ دل، جان، جگر اور وجود زار زار ہوگیا۔ اے ہے! مجھ بدبخت نے انوکھا عشق لگا لیا ہے۔ یعنی ممکنا تند میں جب وہ محبوب ازلی مجھ کو اس طرح کس مپرسی کی حالت میں چھوڑ کر چلا گیا، تو مجھے اس کی طلب میں مختلف حوادث اور جانکاہ حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ کہیں عالم تحیر میں "خناس" کی چیرہ دستیوں نے محروم عقل کرنے کی کوشش کی، کہیں عالم شکر میں "عدوِ مبین" نے اپنے شعبدات سے بھٹکانا چاہا۔ ان پیہم تردداتنے میرے تن زار کو اور بھی ناتواں بنا دیا اور میں نے عجیب مصیبت خرید لی ہے۔

اس سلسلہ بیان کو جاری رکھتے ہوئے خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ میرا پنّل محبوب روٹھ کر کیچ چلا گیا اور میرے سر پر غضب کی مجت کی بارش ہوگئی۔ اے خدا، اب اس طرح کے بوجھ مجھ سے نہ اٹھوا۔ آخر میں وہ تمنا ظاہر کرتے ہیں کہ اے کاش! ایک بار فرید کو وہ محبوب، جس کے لئے اس نے اپنی ساری عمر ضائع کر دی ہے، مل جائے تاکہ ہجر و فراق کا وہ بڑا بھاری گٹھ جو اس نے اپنے سر پر اٹھا رکھا ہے، ٹل جائے۔ ظاہر ہے کہ سالکین کی ساری زندگی انتظار میں گزرتی ہے اور وہ موت کو وصال سے تعبیر کرتے ہیں جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے الموت جسر یوصل الحبیب الی الحبیب یعنی موت ایک پل ہے جو دوست کو دوست سے ملاتا ہے۔ گویا اہل اللہ کی موت ان کا یقینی وصال ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ایک مقام پر فرماتے ہیں۔ ع

آ دے موت نہ تھیندا میلا

یعنی موت آجائے کیونکہ اور کسی طرح وصال کی صورت نظر نہیں آتی۔ زندگی انسان کو اسی لئے ملی ہے کہ وہ وصلِ یار کا منتظر رہے۔ جب تک انسانی روح جسدِ خاکی کے اندر مقید ہے، وصال سے محروم ہے۔ خواجہ صاحب محبوب کی زیارت کے اشتیاق میں پکار اٹھتے ہیں: اے کاش! ایک دفعہ وہ دلربا مل جاتا جس کی آرزوئے وصل میں میں نے اپنی ساری عمر گنوا دی۔

○

حسنِ نظر

یوسف ظفر

حسن کو حسن سمجھنا مرے امکاں میں نہ تھا
تیرے ہی جلووں نے چھیڑا تھا مرے دل کا رباب
میں نے تیرے ہی تبسم کی شفق میں دیکھا
ساحلِ صبح پہ اُگتا ہوا سورج کا گلاب
تیری آواز سے نغموں کی پرافشانی نے
بھیگتی رات کے تاروں سے بنایا تھا سحاب
تیرا ملنا تھا مجھے ملتے ہوئے وقت کا گیت
گیت جس سے غمِ ایام کا دریا پایاب
تُو نہ تھی ساری خدائی مری آغوش میں تھی
زندگی رقص میں تھی، گردشِ دوراں نایاب
تیری فرقت تھی شبِ تار میں گم سُم دنیا
جس کی آنکھوں میں ہو اک راحتِ جاوید کا خواب
میں نے ہر شمع تری شمع سے روشن کی تھی
تیرا ہی حسن دلآویز تھا حسنِ مہتاب

وہ حیا، جس کی ترے رُخ پہ فراوانی تھی
تھی کہاں، — چاند کی کرنوں میں بھی عریانی تھی

تیرے جلووں نے مجھے حسنِ نظر تو بخشا
تیرے جلووں کے سوا کیا نظر آتا مجھ کو
میں ترے قرب کی فردوس میں آسودہ تھا
اُس میں جز حسنِ ادا کیا نظر آتا مجھ کو
تیرے احساس میں ڈھلتے تھے مرے خواب تمام
گرم تھی بزمِ وفا کیا نظر آتا مجھ کو
میری آنکھوں پہ تری زلفوں کے پیچ و خم تھے
صبح تھی، شام تھی کیا، کیا نظر آتا مجھ کو
تیرے نغموں میں تھی زیر و بمِ کہسار کی موج
اس کے پردے میں بھلا کیا نظر آتا مجھ کو
تیرے دل میں تھی جگہ میری، مجھے غم کیا تھا
میرا دل تھا کہ نہ تھا کیا نظر آتا مجھ کو
اب نظر آتی ہیں تنہائی کی سُونی راہیں
جب تھی تُو جلوہ نما کیا نظر آتا مجھ کو

آج یہ وسعتِ دنیا مجھے چونکاتی ہے
تیری دوری، تری یادوں میں ڈھلی جاتی ہے

تو لگا رکھی ہے میں نے سحر و شام کے ساتھ
کہ انہی جلووں میں ہر جلوۂ جانانہ ہے
چونک اُٹھتا ہوں میں ہر حسن کی تابانی سے
کہ ہر اک حسن ترے حسن کا افسانہ ہے
میں نے جس دل میں بسا رکھا تھا کل تک تجھ کو
اب وہی دل تری یادوں کا صنم خانہ ہے
بھیگ جاتی ہے ہر اک رات ترے گیتوں میں
ہر سکوں اب تری آواز کا پیمانہ ہے
اب ترے سائے اُبھرتے نظر آتے ہیں مجھے
وہ مری بزم ہے اوروں کو جو ویرانہ ہے
اب کسے دوست بناؤں، کسے اپنا کہہ دوں
دوست اب وہ ہے جو احساس سے بیگانہ ہے
میں نے ہر حسن میں جلوہ ترا رسوا پایا
کون کہتا ہے کہ تو زینتِ کاشانہ ہے

لاکھ تنہا ہوں، ترا حسنِ نظر راہ میں ہے
ہمسفر تو نہیں، سامانِ سفر راہ میں ہے

بیلڈ:

بیت چکی رُت

عاصمہ حسین

بیت چکی رُت امریوں کی | کوئل کوک پکار چکی | چاروں کھونٹ اک شور مچا تھا | جیسے کوئی ٹھہری ہو برات
فطرت کے رم جھم میلے میں | باوری سب کچھ ہار چکی | لمبے دسترخوان بچھے تھے | جن پہ چُنے تھے پات ہی پات

لدی پھندی ناریں گھٹائیں | روپ نہیں بگ پریوں میں | جیسے قہروں کی برکھائیں | زور شور سے ریلا آئے
اک ویرانی کھیل رہی ہے | سونی بارہ دریوں میں | اِدھر اُدھر کھیتوں میں پھر کر | زنّاٹے سے گذر جائے

اُڑن کھٹولے گھوں گھوں کرتے | کہاں ہیں اُن کے ساز انوکھے؟ | یونہی یہاں اک ریلا آیا | تند اور تیز اور تار اور مار
کہاں ہیں ان کے رتھوں کا تانتا | کہاں ہیں ہونکتے اِکتارے؟ | جس نے نہ دیکھا دائیں بائیں | اور نہ دیکھا آر اور پار

نگر نگر سے آنے والے | جانے کہاں روپوش ہوئے | جو کچھ دیکھا راہ میں روندا | زد پہ جو آیا اس کو رگیدا
کہیں نوا کا نام نہیں ہے | کچھ ایسے خاموش ہوئے | توڑا مروڑا کچلا مسلا | مر بھی گیا پھر بھی نہ پسیجا

رنگ برنگے کپڑے پہنے | بانکے ٹیڑھے چھیل چھبیلے | پھر بھی کبھی یہ دَور آئے گا | پھر وہی شور عیاں ہوگا؟
کہاں ہیں انکے جھومتے طرے | کہاں ہیں انکے بول رسیلے؟ | پھر وہی گہما گہمی ہوگی | برپا اک طوفاں ہوگا؟

بکھرے بکھرے پات پڑے ہیں | ٹوٹے پھوٹے پھل پھلواڑی | کون کہے پھر آئے نہ آئے | یہ رُت، یہ پرکیف سماں
دھن میں دھن وہ لوگ جنھوں نے | اتنی بھاری فصل اُجاڑی | اپنے جلووں میں کیا جانے کیا | لائے گا نیرنگِ جہاں

اہلِ دِل

(منتخب ابیات)

میاں محمد بخش (مرحوم) مصنف "سیف الملوک"
مترجمہ: شفقت تنویر میرزا

جو اہلِ عشق ہیں صبر و قـــرار اُن کو کہاں
یہ سوتے جاگتے دلبر کی سمت ہیں نگراں

یہ آہِ درد بھریں تو نگر نگر ویراں
ہو راکھ قاف پہ سبزہ، ہو خشک نہرئے رواں

خیالِ یار میں صادق، اور اپنے یار سوا
نہ بھائیں شہر و چمن، دیں جہاں کو آگ لگا

نظر نہ آئیں، پھریں ملک ملک جیسے ہوا
ہوں مشک بیز، رہیں چُپ مثالِ نافہ سدا

نہ پیار باقی کسی سے نہ رسم و راہ رہی
نہ فکرِ عظمتِ آبا نہ لاج اپنوں کی

جنہوں نے ساغرِ توحید سے ہے گھونٹ پیا
وہ قیل و قال سے گذرے، نہ علم یاد رہا

ہر ایک لحظہ پڑے کان میں صدائے الست
پکاریں "قالو بلیٰ" ہو کے ذوق میں سرمست

تمہارے جسم کی ریت، اس میں زر نظر آئے
بہیں جو اشک تو یہ ساری ریت بھی بہہ جائے

دلوں میں آگ، بظاہر بڑے شکستہ حال
گریں پہاڑ لگائیں جو نعرہ خـــستہ حال

جو آیا موج میں وحدت کا بیکراں دریا
تو چھوٹی چھوٹی سی جھیلوں کو بھی ملا کے چلا

جو ایک قطرہ گرے اس میں، کیا وہ کہلائے؟
جو اپنی ذات کو کھوئے تو خود وہی بن جائے

کنارے بیٹھ کے زہد و ریاض کر برداشت
یہ دھوپ، ابر، زمستاں کرے یہ سر برداشت

شجر سے سبز گل و برگ تھے جو توڑ لئے
چمکتے پتے ہرے، دھوپ میں تھے خشک کئے

بتاؤں عشق کی کیا بات؛ اس کی حد ہے کوئی؟
یہ جو نبا رہے کیا طے کرے اسے کوئی؟

قدم بڑھایا ہے جس نے وہی جلا ہے یہاں
بغیر جلنے کے بنتی ہے کوئی بات کہاں

کھڑی ہے موت ترے سر پہ تیری عمر گھٹی
پڑے ہیں خاک میں تجھ سے سوا حسین کئی

نہ عشق ہو تو رہے دیں بھی کب سلامت دوست
حیات مرگ نشنا سا نفس قیامت دوست

جہاز ڈوب گئے، کون پار اتر سکتا؟
کہ موج موج کو دیکھا تو سب کا دل کانپا

حصولِ عشق نہیں سہل، دیکھ! پروانہ
خوشی سے جل کہ تو بن جائے ایک افسانہ

سبھی قرابتیں بھولیں جو دوست اپنائے
نہ ماں نہ باپ، نہ بھائی بہن ہی یاد آئے

اسے تو پائے گا خلقت سے جب ہوا روپوش
بھنور کی تہ میں ہو جس طرح کوئی موج خموش

بپائے خشک سمندر کو طے کریں وہ لوگ
مثالِ پیالۂ آتش نہ پھر جلیں وہ لوگ

بغیر محرم و ہمدم کسی سے کچھ نہ کہیں
جو سر پہ آئے قیامت اسے خوشی سے سہیں

ہجوم یاس میں عشاق کھو نہیں سکتے
ہزار چاہیں پہ بیگانے ہو نہیں سکتے

(پنجابی سے)

بچھڑا ہوا محبوب

سیّد ضمیر جعفری

شبِ ماہ کی ساعتِ اولیں !
نہ جانے مری "چاندنی" ہے کہاں ؟

وہ، ماضی کے سیّال لمحوں کا جسم! — وہ، طفلی کے خوابوں کا نقشِ جواں
وہ، شہروں کے اطراف کھیتوں کا رنگ — وہ، نہروں میں پھولوں کا عکسِ رواں
وہ، سینے میں رمتی ہوئی ایک لے — وہ، آنکھوں میں بستا ہوا اِک سماں
وہ، گرما کی دکھی ہوئی دوپہر — وہ، سرما کا نِتھرا ہوا آسماں
وہ، پھولوں میں چھپتی ہوئی آرزو — وہ، خوابوں میں کھلتی ہوئی کہکشاں
وہ، ساحل پہ سورج کی پہلی کرن — وہ، منزل پہ اُترا ہوا کارواں
وہ، دریا میں ڈوبا ہوا آفتاب — وہ، لہروں پہ اُڑتا ہوا بادباں
وہ، پھیلے ہوئے جنگلوں کا ثبات — وہ، سیلی ہوئی بستیوں کا دھواں
وہ، قلعوں کے اوپر کمانوں کا خم — وہ، منگول زادوں کا رقصِ جواں
وہ، چاندی کے مکھڑے پہ کندن کی چھوٹ — وہ، سونے کے دانتوں کی اِک کہکشاں
وہ، نزدیک آتی ہوئی ایک چاپ — وہ، کچھ دُور گاتا ہوا ساربان
وہ، سویا ہوا ایک فغفورِ چین — وہ، چونکا ہوا اِک غزالِ جواں
وہ، یارانِ مکتب کی باتوں کا رس — وہ، یادوں کا دامانِ انجم فشاں
وہ، بچھڑی ہوئی دھڑکنوں کا خلوص — وہ، اُمڈے ہوئے آنسوؤں کی زباں
وہ، اُجڑی ہوئی محفلوں کی کسک — وہ، بستی ہوئی بستیوں کا سماں
وہ، تاروں میں اِک ٹوٹتا سا یقیں — وہ، کلیوں میں اِک جاگتا سا گماں
وہ، قرنوں کے دَر کھولتی ایک یاد — وہ، صدیوں کا رس گھولتی داستاں
وہ، شادی کے بے داغ گہنوں کا رُوپ — وہ، شیشے میں اِک موتیوں کی دُکاں
وہ، اِک اجنبی سرزمیں کی مٹھاس — وہ، اِک سحرِ شیراز و ہندوستاں

شبِ ماہ کی ساعتِ اولیں!
دریچوں کے قرطاس پر چاندنی!
ستائے گی اب رات بھر چاندنی!

(ماخوذ)

چاندنی رات

عبدالباقی بلوچ

تیری نظر کے جادو سے ہے دل کی دنیا بزمِ چراغاں
دل بھی جیسے چاند ہے کوئی میری حیات میں تاباں تاباں
چاند کے داغ کی صورت دل کے داغ ہوئے جاتے ہیں فروزاں
تیری آنکھیں مثلِ ستارہ میرے خیال میں لرزاں لرزاں
غم کا چاند افق سے اُبھرا پھیکا پھیکا، ویراں ویراں
تیرے لبوں کی خاموشی کے ذہن میں نغمے گونج رہے ہیں
درد کی موجوں نے کروٹ لی، دل میں سوئی امیدیں جاگیں
جیسے دریاؤں میں طوفاں، جیسے صحراؤں میں غزالاں
میری آہ سے چاندنی رات کی طرح روپہلی دھند اٹھی ہے
جیسے غم کی لاکھوں شمعیں جل کے بجھی ہیں، بجھ کے جلی ہیں
تیری یاد کی کرنیں پھوٹیں دل کے سلگتے ویرانوں سے
جن کے نور سے میرے خیال کا ذرہ ذرہ تابندہ ہے
تیرے جمال کے جلووں کو میں دیکھ رہا ہوں حیراں حیراں
میرے خیال کی دنیا ہے یا چاندنی رات ہے رخشاں رخشاں

سمن زار

(کشمیر)

قمر جمیل

کنول جھیل میں، برف کہسار پر
پرندے فضاؤں میں اُڑتے ہوئے
بنفشہ کے پھولوں سے مُڑتے ہوئے
وہ بھونرے، رواں اپنی یلغار پر
سبک ابر، گلزار پر
ہر اک سمت چھینٹے اُڑاتے ہوئے
وہ قازوں کے جوڑے نہاتے ہوئے
دمِ صبح ہر جوئے کہسار پر
یہ رنگینیاں روئے گلزار پر
یہ قوسِ قزح سائباں کی طرح
سبز آبجو بادباں کی طرح
یہ مرغابیاں ان کے زرتار پر
گل و لالہ کے نرم رُخسار پر
وہ موتی صفِ کہکشاں کی طرح
کشادہ کفِ باغباں کی طرح
چناروں کے سائے سمن زار پر
درختوں کے طاقوں پہ مینار پر
اندھیرے میں جگنو چراغاں کریں
اُجالے میں کرنیں فروزاں کریں
نئے نقشے تختۂ گلزار پر
کہیں پھول آمادہ گفتار پر
کہیں تتلیاں رقص کرتی ہوئی
شکاری کی نظروں سے ڈرتی ہوئی
جوانی کہیں قمری و سار پر
مگر یہ حقیقت بھی نظروں میں ہے
کہ جنت جہنم کے شعلوں میں ہے

غزل

فضل احمد کریم فضلی

کون سی تھی وہ بلا جو میرے گھر آئی نہیں
شکر ہے لیکن طبیعت میری گھبرائی نہیں

چوٹ کب ٹوٹے ہوئے دل نے مرے کھائی نہیں
یعنی کس دن میرے ہونٹوں پر ہنسی آئی نہیں

بارشِ سنگِ حوادث سر پہ ہوتی ہی رہی
میرے ماتھے پر بحمداللہ شکن آئی نہیں

ایک قم میں عظمتِ کردارِ انساں جی اٹھی
کون کہتا ہے حوادث میں مسیحائی نہیں!

زندگی میں اب جو رعنائی ہے وہ پہلے نہ تھی
غم کی انگڑائی ہے یہ، عشرت کی انگڑائی نہیں

غمزدوں کا صبر و تمکیں دیکھنے کی چیز تھی
آپ نے لیکن کبھی تکلیف فرمائی نہیں

محفلِ عیش و طرب میں ساتھ میرا چھوڑ دے
اس قدر بھی سستیٔ پیماں میری تنہائی نہیں!

بے تعلق سا رہا ہر چند میں ان سے، مگر
ان کی در پردہ توجہ میں کمی آئی نہیں

میری فضلی زندگی خود زندگی پر طنز ہے
یعنی اب تک مجھ کو طرزِ زندگی آئی نہیں

غزل

روش صدیقی

غم بہ اندازۂ راحت ہی سہی
نہ سہی شکر، شکایت ہی سہی

اک مصیبت ہے سنبھل کر چلنا
جادۂ ترکِ محبت ہی سہی

دل بہلنے کے کچھ آثار تو ہیں
شورِ طوفانِ ملامت ہی سہی

ہوش میں کون ہے اے اہلِ خبر
عشق اک پردۂ غفلت ہی سہی

وہ دل آویزیٔ گفتار نہ پوچھ
حرفِ انکارِ محبت ہی سہی

چاک کرنا ہے تو اے دستِ جنوں
پردۂ رازِ مشیت ہی سہی

کیا عجب ہے تجھے ہم یاد آئیں
بھول جانا تری عادت ہی سہی

تیرے ملنے کی خوشی کیا کہئے
ہاں وہ فردائے قیامت ہی سہی

حسن ہی حسن ہے ہر سوئے دوست
کوئی جلوہ نہیں، حیرت ہی سہی

روح شاداں ہے کہ مختار ہے عشق
زندگی جبرِ مشیت ہی سہی

عہدِ حاضر کا حدی خواں ہے روش
دوش پر بارِ قدامت ہی سہی

غزل

ضمیر اظہر

نے غمِ زیست، نے خیالِ حبیب
جانے پھر کیوں سکوں نہیں ہے نصیب

دل میں ہے ایک درد سا مستور
ذہن میں ایک کشمکش ہے عجیب

سب مسافر ہیں ساحلِ غم کے
کوئی اس سے ہے دور، کوئی قریب

کیسے قائم ہو حُسن کا معیار
دل نظر کا، نظر ہے دل کی رقیب

تو شبِ نو بہار کا مہتاب
میں ہوں صبحِ خزاں کا نجمِ غریب

زیست حُسنِ حبیب میں کھو کر
بن گئی ہے خیالِ حُسنِ حبیب

مجھ کو معلوم ہی نہ تھا اظہر
آدمیت کا آدمی ہے رقیب

●

غزل

وحیدہ تبسم

طبیعت جب غمِ دنیا سے اُکتائے چلے آنا
خیالِ بیکسی جب دل پہ چھا جائے چلے آنا

نہ چاہے دل تو مت آنا بلائیں لاکھ ہم تم کو
ہماری یاد لیکن جب تمہیں آئے چلے آنا

نہ کرنا یاد ہم کو جا کے ساحل کی فضاؤں میں
بھنور جب راہ میں حائل نظر آئے چلے آنا

ملے جب منزلِ مقصود تو چاہے بھلا دینا
رہِ ہستی اگر مشکل نظر آئے چلے آنا

شبِ تاریکِ غم میں ہم نفس کی جستجو کر کے
نگاہِ یاس جس دم تھک کے رہ جائے چلے آنا

کہیں نیرنگیوں میں دل جو لگ جائے تو رہ جانا
کسی صورت نہ جب رنگِ جہاں بھائے چلے آنا

تبسم صبحِ خنداں کا تبسم یاد مت کرنا
مژہ پر اشکِ غم جس وقت لہرائے چلے آنا

غزل

حبیب جالب

لوک گیتوں کا نگر یاد آیا
آج پردیس میں گھر یاد آیا

جب چلے آئے چمن زار سے ہم
التفاتِ گُلِ تر یاد آیا

تیری بیگانہ نگاہی سرِ شام
یہ ستم تا بہ سحر یاد آیا

ہم زمانے کے ستم بھول گئے
جب ترا لطفِ نظر یاد آیا

تو بھی مسحور تھا اُس شب سرِ بزم
اپنے شعروں کا اثر یاد آیا

پھر ہوا دردِ تمنّا بیدار
پھر دلِ خاک بسر یاد آیا

ہم جسے بھول چکے تھے جالب
پھر وہی راہگذر یاد آیا

غزل

شیدا گجراتی

برقِ غم اشک بن کے لہرائی
اک دبی چوٹ پھر اُبھر آئی

جب سکوں مل سکا نہ دل کو کہیں
غم کی آغوش میں اماں پائی

دیدہ و دل سے لے رہی ہے خراج
حسن کی سادگی و رعنائی

زندگی کے خموش ہنگامے
آج لینے لگے ہیں انگڑائی

پھر شعورِ نظر ہوا بیدار
پھر کسی سے نگاہ ٹکرائی

پھول کو دیکھ کر گلستاں میں
ایک گل پیرہن کی یاد آئی

رک گیا ہے جبینِ دوست پہ کیا
کاروانِ شباب و رعنائی

بڑھ گئی اور تیری محفل میں
دیدہ و دل کی ناشکیبائی

جز غمِ دوست ان دنوں شیدا
کون ہوگا انیسِ تنہائی

کرنافلی کی رومانی فضا میں

محمود حسین

دو سو میل لمبا یہ دریا بڑی متانت اور وقار سے بہہ رہا ہے۔ ہزارہا سال سے اس کے سینہ پر نسل انسانی کا بسیرا رہا ہے۔ اس بوڑھے لیکن جوان جسم دریا نے اپنے کشادہ سینہ پر چھوٹی کشتیوں، بڑی کشتیوں، بادبانی جہاز، دخانی جہاز، ماہی گیر، سپاہی، سپہ سالار اور بادشاہ سب کو جھولا جھلایا ہے۔ قدیم ہند و چین کے سوداگروں کی بڑی بڑی بادبانی کشتیوں پر زرہ بکتر میں غرق گذر گئے، بھکشوؤں کا ایک قافلہ زعفرانی لباس پہنے ایک کنارے سے دوسرے کنارے پر چلا گیا، شائستہ خاں کے جنگی جہاز اس کی گہرائیوں میں کھو گئے، اسلام خاں کی مسلح کشتیاں اراکان کو فتح کرنے کے لئے بڑھتی چلی گئیں لیکن کرنافلی کی روانی میں فرق نہ آیا۔ اس کے کناروں کی شادابی، اس کے گھنے جنگلوں کا سبزہ، اس کے مٹی پانی کی پُر عظمت گہرائی خوش منظری کا ایک لازوال افق پیش کرتی رہی۔ کارواں گذر گئے اور کرنافلی سطوتِ کارواں دیکھتا رہا۔ کئی بار اس کی لہریں تڑپ کر اٹھیں، کئی بار اس کے سینہ میں تموج پیدا ہوا، لیکن کوئی اس کی تمنا کو شاد کام نہ کر سکا، کوئی اس کی موجوں کا حریف نہ بن سکا۔

پاکستان کے ایک فرزند نے اس کی آواز سنی اور یہ منصوبہ بنایا کہ اس لازوال خزانۂ آب اور اس کے شاداب جنگلوں سے انسان کی فلاح و بہبود کے لئے کام لیا جائے جو حقیقۂ قدرت کا حقیقی منشا ہوتا ہے۔

چاٹگام سے ۴۳ میل دور، کپتائی سے ۳ میل قریب، سلچری کی گھاٹی میں دریائے کرنافلی پر ایک بند تعمیر کیا جا رہا ہے جو پتھر کی نابابی کی بنا پرمٹی کا بند ہوگا۔ اس کی بنیاد میں دونوں پایوں کے پاس سیمنٹ کے ستون دئے گئے ہیں تاکہ پانی اس میں نہ نکلنے پائے۔ یہ بند دو ہزار فٹ لمبا اور چوٹی پر دریا کی تہہ سے ۱۴۰ فٹ اونچا ہوگا۔ مکمل ہونے کے بعد اس خزانۂ آب میں ۲ سنکھ ۳۷ ارب ۴۲ کروڑ ۷۰ لاکھ مکعب فٹ پانی جمع رہ سکے گا۔

بند کی تعمیر کے سلسلہ میں ایک مختصر سا شہر آباد ہو گیا ہے جسے کرنافلی کہتے ہیں۔ یہاں انجینیروں کے چھوٹے چھوٹے عارضی بنگلے ہیں، مزدوروں کے مکانات ہیں، مسجد ہے، اسپتال ہے، اسکول ہے، ڈاک خانہ ہے، ہوٹل ہیں، ڈاک بنگلہ ہے، نل کا صاف پانی ہے اور ہر جھونپڑے میں بجلی کی روشنی ہے۔ چاروں طرف گھنا جنگل ہے جہاں سے کبھی کبھی جنگلی ہاتھیوں کا ایک غول یہ تماشا دیکھنے کے لئے آ جاتا ہے۔ کرنافلی کی آبادی ۵ ہزار ہے اور کام کی رفتار کے ساتھ اس میں مزید اضافہ ہوگا۔ دن بھر کشتیاں اور اسٹیمر دریا میں سے گذرتے ہیں اور روز نئے نئے وسائل معاش پیدا ہوتے ہیں۔

شام کو اس آبادی میں گھومتے ہوئے میں نے دیکھا کہ لوگ بجلی کی روشنی میں بیڈمنٹن کھیل رہے ہیں، مزدوروں کی ایک جماعت ریڈیو کی موسیقی کے ساتھ چائے نوشی میں مصروف ہے۔ بازار میں ہر قسم کی ضروریاتِ زندگی موجود ہیں، ایک میلہ سا لگا ہوا ہے۔ کوئی گداگر نہیں ہے، کوئی ہنگامہ نہیں، ایک تنظیم کے تحت ہر شخص اپنے کاروبار میں مصروف ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک مثالی ضبط کے تحت ایک مشترکہ خاندان آباد ہے۔ پولیس کی عدم موجودگی سے مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ یہاں کوئی پولیس نہیں صرف چار کیمپ چوکیدار ہیں، جو معمولی نگرانی کے فرائض انجام دیتے اور ڈیڑھ سال میں کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا جو پولیس کی دست اندازی کے قابل ہوتا۔ اور ان کرنافلی کی یہ بالغ نظری داد کے قابل ہے۔ شاید پاکستان میں ۵ ہزار نفوس کی یہ واحد آبادی ہے جو پولیس کی سرپرستی کے بغیر امن سے اپنے کام میں مصروف ہے۔

اس اسکیم کی تکمیل کے بعد جو فوائد حاصل ہوں گے، وہ ذیل میں درج ہیں:-

(۱) تقریباً ایک لاکھ بیس ہزار کلو واٹ بجلی کی طاقت

(۲) اس بجلی سے صنعتی و حرفتی ترقی کی بے شمار راہیں کھل جائیں گی، اس لئے کہ زیادہ سے زیادہ بجلی کی قیمت ایک آنہ فی یونٹ ہوگی۔ تمدنی ترقی کے لئے یہ ضروری ہے کہ زیادہ سے زیادہ قدرتی ذرائع کو انسان کی خدمت کے لئے استعمال کیا جائے۔ کوئلہ اور دیگر معدنی مادّوں سے جو طاقت حاصل کی جاتی ہے وہ نہ صرف غیر یقینی بلکہ گراں بھی ہوتی ہے۔

یہ بہت ہی دلچسپ بات ہے کہ پاکستان میں جو پیداوار ہوتی ہے وہ ۷۵ فیصد انسان، ۲۰ فیصد جانوروں اور ۵ فیصد مشینوں سے حاصل ہوتی ہے۔ یعنی ۱۰۰ میں سے صرف ۵ فیصد طاقت استعمال کی جاتی ہے۔ اس نکتہ کو سمجھنے کے لئے غور فرمایئے کہ سویڈن میں جملہ پیداوار کا ۹۱ فیصد، کینیڈا میں ۹۵ فیصد اور اطالیہ میں ۸۰ فیصد بجلی کی طاقت سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں یہ جاننا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ امریکہ میں فی کس بجلی کا خرچ ۲۰۵۰ یونٹ، برطانیہ میں ۲۰۵۰، فرانس میں ۴۰۰، جاپان میں ۴۷۰ اور بھارت میں ۵ یونٹ ہے۔ کرنافلی سے جو بجلی پیدا ہوگی اس سے ایک کروڑ ۴۰ لاکھ ۵۰ ہزار انسان مستفید ہوسکیں گے، جو مشرقی پاکستان کی ایک تہائی آبادی سے زیادہ ہے اور ان میں ہر شخص ۲۰ یونٹ فی کس خرچ کرسکے گا۔

(۳) پندرہ ہزار مربع میل کا علاقہ یعنی چاٹگام، نواکھالی، تپرا، ڈھاکہ، میمن سنگھ اور کھلنا بجلی سے جگمگانے لگیں گے۔

(۴) موسم برسات میں نشیبی علاقے زیر آب ہو جاتے ہیں اور وہاں زراعت ناممکن ہو جاتی ہے۔ بجلی کی سستی پیداوار سے یہ ممکن ہو جائے گا کہ تقریباً ۲۵۰۰ پمپ لگا کر ان علاقوں کا پانی کھینچ لیا جائے اور انہیں زراعت کے قابل بنا دیا جائے۔ اندازہ یہ ہے کہ اس طرح ۵ ہزار مربع میل کا علاقہ لائق کاشت ہو جائے گا، جو ہماری خوراک کی ضروریات پوری کرنے میں مدد دے گا۔ اس کے علاوہ اس بند کے پانی سے مزید دس لاکھ ایکڑ زمین کو قابل زراعت بنایا جاسکے گا۔ اس طرح جملہ ۵۰ لاکھ ٹن زائد اناج پیدا ہوگا۔

(۵) سیلاب کی روک تھام میں یہ بند بہت مفید ہوگا۔ صرف چاٹگام میں ۳ لاکھ ایکڑ زمین سیلاب کی تباہ کاریوں سے محفوظ ہو جائے گی۔ مزید برآں دریائے کرنافلی ہر موسم میں کشتی رانی کے لئے نہ صرف محفوظ بلکہ موزوں ہو جائے گا۔

(۶) جنگلات کی پیداوار دس گنا بڑھ جائے گی۔

اس عظیم الشان کام پر اندازاً ۲۵ کروڑ ۶۵ لاکھ روپیہ لاگت آئے گی۔ اتنی بڑی رقم کی فراہمی بذات خود ایک مشکل مسئلہ ہے، لیکن حکومت پاکستان کی دلچسپی اور ناظمان اسکیم کی ان تھک کوششوں سے یہ مسئلہ بھی تقریباً حل ہوگیا ہے۔ یہ امر ذہن نشین رکھنے کے قابل ہے کہ ایسی اسکیم آئندہ چل کر خود مکتفی ہو جاتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر ایک معینہ مدت میں اس کی آمدنی سے نہ صرف خرچ پورا ہو جائے گا بلکہ ملک کی خوشحالی میں جو اضافہ ہوگا وہ اس کے ماسوا ہوگا۔ اسکیم مکمل ہونے کے بعد اس سے خالص آمدنی ایک کروڑ ۳۱ لاکھ ۱۸ ہزار روپیہ سالانہ ہوگی اور ۲۸ سال میں جملہ خرچ شدہ سرمایہ ادا ہو جائے گا یعنی ۱۹۹۰ء میں یہ بند قرض سے بالکلیہ سبکدوش ہو جائے گا۔ یوں بھی ایسے اخراجات کا موازنہ اس رقم سے نہیں کیا جاتا جو تکمیل کے لئے ضروری ہو، بلکہ اس خرچ کا تقابل اس خوشحالی، بڑھتے ہوئے معیار زندگی اور عوام کی سہولت سے کیا جاتا ہے جو انہیں میسر آتی ہے۔ ٹیکس، مالگذاری یا حکومت کی دیگر آمدنی کا منتہا تو بہرصورت عوام کی بھلائی ہوتا ہے اور جس اسکیم کا مقصد یہ ہو اس کی تکمیل کا انتظار کٹھن ہونے کے باوجود خوش گوار ہوتا ہے۔

رات کی نبض ڈوب رہی تھی جب میں کرنافلی کا آخری چکر لگا کر اپنی قیام گاہ کو واپس آیا۔ میں نے دیکھا وہاں تین شفٹ میں کام ہو رہا تھا۔ آٹھ ہزار مزدور کام کر رہے تھے، بجلی کے ہزاروں طاقت ور بلب روشن تھے۔ جنگل میں منگل ہو رہا تھا۔ بھاری بھاری مشینیں مٹی کھود رہی تھیں، مٹی پھینک رہی تھیں، ہزاروں ٹن وزنی موسل سیمنٹ کے ستون بڑی چابکدستی سے زمین میں اتار رہے تھے۔ ٹریکٹروں کی چھک چھک، ستونوں کے اترنے کی ڈگ ڈگ اور مشینوں کی کھڑکھڑاہٹ مسلسل ایک پیغام دے رہی تھی۔ کام، کام، عمل عمل، کام کام۔ اور کرنافلی مسکراتا ہوا لہریں مار رہا تھا۔

یکایک مکمل خاموشی چھا گئی۔ شاید ۱۹۵۶ء آگیا اور کرنافلی مکمل ہوگیا۔ ہزارہا سیاہ، تنومند جسم پھاؤڑا اور کدال اٹھائے ہوئے کرنافلی سے جا رہے تھے۔ ان کے پیچھے پیچھے انجنیر، ٹریکٹر، موٹریں اور ہزارہا قسم کے کاریگر۔ محنت کے جلال سے چہرے نورانی، آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے بڑی بے نیازی سے گاتے جا رہے تھے۔

ہم نے نقش میں خام نہیں چھوڑا ہے
کام چھوڑا ہے کہیں نام نہیں چھوڑا ہے

آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی، کچھ نظر نہ آتا تھا لیکن متفرق آوازیں میرے ذہن کے تاروں پر ایک ہی گت بجا رہی تھیں:

کام - کام - کام

کرنافلی

کاغذ کا کارخانہ

تیار شدہ مال
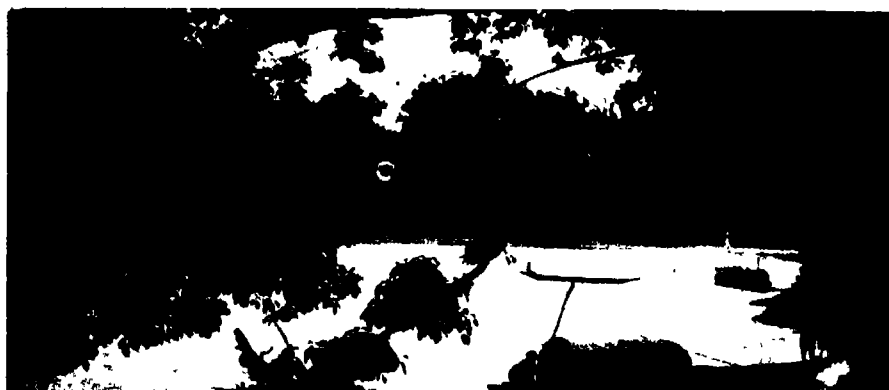
دریائے کرنافلی

پاکستان سیاحوں کی نظر میں

خواجہ جمیل احمد

سیر و سیاحت اور تلاش و تجسس ازل سے انسانی فطرت کا خاصہ رہا ہے۔ زمانہ قدیم سے انسان سیر و سیاحت کا متلاشی رہا ہے۔ لیکن ان زمانوں میں سفر کی صعوبتیں، راستے کے خدشات اور ذرائع نقل و حمل کی خرابیاں اس انسانی جذبے کی تکمیل میں حائل تھیں۔ جن کو جدید زمانے نے بالکل دور کر دیا ہے۔ پرانے زمانوں میں سو میل کا سفر سفر ہفت خواں سے کم نہ تھا لیکن اب ہزاروں میل کا سفر گھنٹوں میں طے ہو جاتا ہے۔ گراں مشکلات کے باوجود زمانہ قدیم میں مشہور سیاح گزرے ہیں جنہوں نے سفر کے خدشات کی پروا نہ کرتے ہوئے ہزاروں میل کا سفر کیا ان میں ابن بطوطہ، مارکوپولو، سلیمان ماہری، ابن ماجد، مسعودی، ابن حوقل کولمبس اور واسکوڈاگاما کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

زمانہ قدیم میں انسانی نقل و حرکت کے محدود ہونے کی وجہ سے انسانی تہذیب کی ترقی بھی جگہ جگہ محدود ہو کر رہ گئی۔ جہاں جہاں تہذیب کی شمعیں روشن ہوئیں ان کی روشنی انہی کے گرد و نواح میں مقید رہی اور اس سے آگے پھیل نہ سکی۔ پاکستانی علاقوں میں قدیم ترین تہذیب کے نشانات ملے ہیں۔ موئن جو دڑو میں پانچ ہزار قبل اعلیٰ قسم کی تہذیب پائی جاتی تھی لیکن یہ تہذیب اس کے گرد و نواح کے علاقوں کو متاثر نہ کر سکی اور یہیں تک محدود رہی۔ اسی طرح پنجاب میں ٹیکسیلا اور ہڑپا، سندھ میں پٹالا اور منصورہ عظیم الشان سلطنتوں کے صدر مقام تھے۔ جن کے کھنڈرات اب بھی ان کی عظمت کا پتہ دیتے ہیں۔ ان ترقی یافتہ سلطنتوں کی تہذیب اور تمدن کی جھلک متعدد سیاحوں نے دیکھی ہے جن کے سفرنامے کسی قسم کی رنگ آمیزی کے بغیر اس زمانہ کی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ یوں تو سیکڑوں سیاح پاکستانی علاقوں میں آتے جاتے رہے لیکن ان میں مشہور سیاح فاہیان، ہون شان۔ البیرونی مارکوپولو، ابن بطوطہ اور دوسرے مسلمان سیاح ہیں۔ جنہوں نے اپنے تجربات کو سفرناموں میں نقل کیا ہے۔ انھیں سفرناموں سے ہمیں پاکستانی علاقوں کی قدیم تہذیب کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔

سکندر اعظم نے ۳۲۵ سال قبل مسیح ہندوستان پر حملہ کیا۔ صوبہ سرحد اور پنجاب کے علاقوں میں راجہ پورس کی فوجوں نے اس کا مقابلہ کیا۔ اس زمانے کے حالات ہمیں یونانی وقائع نگاروں کی تحریروں میں ملتے ہیں جو غیر ملکی سیاحوں کے قدیم ترین سفرنامے شمار کئے جاتے ہیں۔ یونانی وقائع نگاروں نے راجہ چندر گپت کی بڑی سلطنت میں رعایا کی خوشحالی اور فارغ البالی کے واقعات تفصیل کے ساتھ درج کئے ہیں۔ اسی زمانے میں دریائے سندھ کے دہانے کے قریب سندھ کا صدر مقام پٹالا کا شہر تھا۔ یونانی وقائع نگاروں نے پٹالا کی شان و شوکت رونق اور وسعت کی بڑی تعریف کی ہے۔ پٹالا کے بازار پُر رونق تھے۔ وسط ایشیا کے کاروانوں کے لئے کارواں سرائے بنی ہوئی تھی۔ جہاں تجارتی قافلے آکر ٹھہرتے تھے۔

مشہور چینی سیاح فاہیان، پامیر پلیٹو اور کوہ ہندوکش کے دشوار گزار راستہ سے ۴۰۵ء میں پاکستانی علاقے میں داخل ہوا اور ۴۱۱ء تک اس برصغیر میں مقیم رہا۔ اس نے اپنے سفرنامے میں بدھ مت کے حالات تفصیل کے ساتھ تحریر کئے ہیں۔ اس وقت ہندوستان میں بدھ مت زوال پذیر ہو چکا تھا اور ہندو مت بدھ مت پر غالب آ رہا تھا۔ سندھ کا مشہور شہر پٹالا بھی بدھ مت کا بڑا مرکز بن گیا تھا۔ بدھ مذہب کے ٹوپ اور خانقاہیں پٹالا میں پائی جاتی ہیں۔ چینی سیاح فاہیان جو بدھ مت کے تیرتھوں کی زیارت کرنے اور ان کے نوشتوں کی تلاش میں چین سے نکلا تھا کئی مہینہ تک پٹالا میں مقیم رہا اپنے

سفرنامے میں اس نے پٹالا کی فارغ البالی، آسودگی، امن و امان، لوگوں کی نیک نفسی اور علمی، ثقافتی اور مذہبی شغف کا جگہ جگہ ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے: "آبادی گھنی لیکن خوشحال ہے۔ گھر کے اثاثہ کا کوئی ٹیکس نہیں ادا کیا جاتا ہے۔ صرف وہ کاشتکار جو شاہی مزروعہ زمین پر زراعت کرتے ہیں اپنی پیداوار کا قلیل حصہ ٹیکس کے طور پر ادا کرتے ہیں۔ جہاں چاہے لوگ جا سکتے ہیں۔ پھانسی کی سزا ممنوع ہے۔ اگر کوئی شخص بغاوت بھی کرے تو صرف اس کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے۔ غریب یتیم، لوگوں اور بیواؤں کے لئے مراکز قائم کئے گئے ہیں۔ بیماروں کا مفت علاج کیا جاتا ہے۔" اس نے ۶ سال تک اس برصغیر کا دورہ کیا لیکن جنگلی جانوروں کے علاوہ کبھی اسے کسی خطرہ سے دوچار ہونا نہیں پڑا۔

دوسرا مشہور چینی سیاح ہیون تسانگ ۶۳۰ء میں پاکستانی علاقے میں داخل ہوا اور پندرہ سال تک اس برصغیر میں مقیم رہا۔ اس نے بھی پٹالا شہر میں قیام کرکے بدھ مت کے ٹوپوں اور خانقاہوں کی زیارت کی۔ وہ بھی اس قدیم شہر کی رونق، آسودگی اور خوشحالی کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتا ہے۔ اس نے اپنے سفرنامے میں پٹالا شہر کے باشندوں کی نیک نفسی، مہمان نوازی، اور خلوص کی بہت تعریف کی ہے۔ اس کے مطابق یہ اس زمانے میں علم و عرفان کا مرکز تھا۔ — جب وہ ٹیکسیلا کے مشہور شہر میں پہونچا تو وہاں افراتفری کا دور دورہ تھا۔ اسکی خانقاہیں اُجڑ چکی تھیں۔ شاہی خاندان تباہ ہو گیا تھا اور بھکشو بھی چند ہی باقی رہ گئے تھے۔ یہ ساری تباہی سفید ہنوں کی مچائی ہوئی تھی، جنہوں نے ۵۰۰ء کے بعد حملہ کرکے اس خطۂ زمین کو ویرانے میں تبدیل کر دیا تھا۔ جس تباہی کے بعد ٹیکسیلا دوبارہ سرسبز نہ ہو سکا۔ — پشاور کے قریب جہاں راجہ کنشک نے بدھ مت قبول کیا تھا ایک عظیم الشان ٹوپ تعمیر کیا گیا تھا۔ ہیون تسانگ نے اس کو دیکھا تھا اور اس کی تحریر کے مطابق یہ ۵۵۰ فٹ بلند تھا جسکی عمارت پانچ منزلہ تھی۔ یہ ٹوپ اب مٹی کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکا ہے۔ صوبۂ سرحد کے علاقے میں "چارسدہ" کا قدیم صدر مقام تھا۔ ہیون تسانگ نے اس کی بھی زیارت کی ہے۔ پورش پورا جسے اب پشاور کہتے ہیں اس زمانے میں بھی ایک پُر رونق اور آباد شہر تھا۔ ہیون تسانگ نے یہاں اشوک کا ایک ٹوپ بھی دیکھا تھا۔ ہیون تسانگ نے مشرقی پاکستان کے خطوں کا بھی دورہ کیا تھا۔ وہاں کے لوگ بدھ مت کے پیرو تھے۔ ہیون تسانگ ۶۳۵ء میں یہاں پہونچا اور اس نے شمالی بنگال میں بیس بدھی خانقاہیں اور جنوبی مشرقی بنگال میں تیس بدھی خانقاہیں دیکھیں۔ ہیون تسانگ کے سفرنامے کے مطابق مشرقی بنگال میں بدھ مت کی ترویج راجہ اشوک کے زمانے میں ہوئی اور اشوک نے اس علاقے میں متعدد ٹوپ تعمیر کئے۔ ان میں سے ایک پنڈرانگر کے نواح میں تھا جس میں کشادہ کمرے تھے جن میں سات سو سے زائد بھکشو رہتے تھے۔ ہندوؤں اور بدھ لوگوں کے متعلق وہ اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے: "وہ زیادہ تر ننگے پیر رہتے ہیں۔ ان میں سے چند کھڑاؤں پہنتے ہیں اپنے دانتوں کو سُرخ یا سیاہ رنگتے ہیں۔ اپنے کانوں میں سوراخ کرتے ہیں۔ صفائی کے بڑے دلدادہ ہیں۔ اور کھانے سے پہلے غسل کرنے کے عادی ہیں۔ ایک وقت کا پکا ہوا کھانا دوسرے وقت نہیں کھاتے۔ لکڑی اور مٹی کے برتن کھانے کے بعد پھینک دیئے جاتے ہیں۔ پیتل کے برتن اچھی طرح مانجھے جاتے ہیں۔ کھانے کے بعد وہ "داتن" (مسواک) کرنے کے عادی ہیں۔ لوگ بہت خوشحال ہیں اور زمین بہت زرخیز ہے گندم کی روٹی، خشک اور بھنا ہوا اناج، شکر، گھی اور دودھ لوگوں کی عام غذا ہے مچھلی اور گوشت بھی کھایا جاتا ہے۔ گائے کا گوشت البتہ ممنوع ہے تعلیم برہمن لوگ دیتے ہیں۔ تعلیم یافتہ لوگوں کی بڑی عزت کی جاتی ہے۔" محمود غزنوی کے عہد میں اسلام کے مشہور مفکر ابو ریحان بیرونی ہند و پاکستان کے برصغیر میں ہندوؤں کی ریاضی فلسفہ، اور زبان سیکھنے کے لئے وارد ہوئے۔ عرصہ دراز تک وہ اس برصغیر میں مقیم رہے۔ قدیم ہند کے مفصل حالات انہوں نے اپنی مشہور تصنیف "کتاب الہند" میں تحریر کئے ہیں جو قدیم ہند کی سب سے مستند تاریخ شمار کی جاتی ہے۔

وینس کا مشہور سیاح مارکوپولو سمندر کے راستے چین سے ایران جاتے ہوئے ۱۲۹۳ء میں مکران کے ساحل سے گزرا۔ وہ چین کی شہزادی کو کاچین کو چین سے تبریز لے جا رہا تھا۔ شہنشاہ چین نے اس شہزادی کو اپنے لڑکے سے جو چین میں حکومت کر رہا تھا شادی کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ مارکوپولو نے سندھ اور مکران کے ساحل پر کئی دن قیام کیا اور یہاں کی طبعی حالت اور لوگوں کی جفاکشی کا ذکر اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔

مشہور عرب سیاح ابن بطوطہ، جس نے ۷۵۰۰۰ میل سے زیادہ کا سفر کیا ہے، ۱۲ ستمبر ۱۳۳۳ء کو سندھ میں وارد ہوا۔ یہ شہنشاہ محمد تغلق کا

زمانہ تھا۔ وہ اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے: "دریائے سندھ کو جسے پنجاب کہتے تھے عبور کرنے کے بعد ہم ایک نرکل کے جنگل سے گزرے جہاں میں نے پہلی بار گینڈا دیکھا۔ دو دن کے سفر کے بعد ہم جنانی میں داخل ہوئے جو دریائے سندھ کے کنارے ایک بڑا اور خوبصورت شہر ہے۔ اس کے باشندے "سمیرا" کہلاتے ہیں جن کے آباؤ اجداد حجاج بن یوسف کے زمانے میں یہاں آباد ہوئے۔ یہ لوگ کبھی کسی کے ساتھ نہیں کھاتے، نہ کوئی شخص انہیں کھاتے ہوئے دیکھ سکتا ہے۔ اپنے خاندان سے باہر یہ شادی بیاہ نہیں کرتے۔ جنانی سے ہم سواستان پہونچے (اب اسے سہوان کہتے ہیں) یہ ایک بڑا شہر ہے جو ایک خشک ریتلے میدان کے کنارے واقع ہے۔ یہاں کدو کے علاوہ کوئی پودا نہیں اُگتا ہے۔ یہاں کے لوگ زیادہ تر مٹر کی روٹی کھاتے ہیں۔ مچھلی اور بھینس کا دودھ یہاں بہ افراط ہے۔ یہاں کے لوگ ایک قسم کی چھپکلی کھاتے ہیں۔ میں نے دیکھا تو مجھے بہت کراہت محسوس ہوئی۔ گرمی کے زمانے میں سہوان جہنم کا نمونہ معلوم ہوتا تھا۔ ہم لوگ صوبہ کے حاکم کے ساتھ دریائی سفر پر روانہ ہوئے اور پانچ دن کی مسافت کے بعد دریائے سندھ کے دہانے پر لہاری شہر میں پہونچے۔ اس کی بندرگاہ بہت وسیع ہے جس میں یمن، فارس اور دوسرے ممالک کے تجار سال بھر سامان تجارت لاتے رہتے ہیں۔ اس بندرگاہ سے حکومت کو ساٹھ لاکھ روپیہ سالانہ آمدنی ہوتی ہے۔ ہم لوگ گورنر کے ساتھ لہاری سے سات میل کے فاصلہ پر ایک مقام تارنا پہونچے، جہاں ہم نے پتھر کی بنی ہوئی آدمیوں اور جانوروں کی بیشمار مورتیاں دیکھیں۔ جو ایک بڑے انسانی بت کے چاروں طرف استادہ تھیں۔ اس بُت کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ گرد و نواح کے تالاب میں سخت بدبودار پانی تھا۔ گورنر نے بتایا کہ یہاں کے باشندے سخت ناہنجار تھے، اسلئے ایک ہزار سال قبل پتھر میں تبدیل کر دئے گئے۔ وہاں سے ہم باکر پہونچے، جو روہڑی سکھر کے درمیان دریائے سندھ میں ایک مستحکم جزیرہ ہے جو بہت تفریح کا مقام ہے۔ وہاں سے ہم اوجا کے شہر پہونچے۔ جو دریائے سندھ کے کنارے آباد ہے، اس کے بازار اور عمارتیں بہت خوبصورت ہیں۔ اوجا سے ہم ملتان پہونچے جو سندھ کا صدر مقام اور بڑے گورنر کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ ملتان سے دس میل کے فاصلہ پر بڑا دریا ہے جو کشتیوں سے پار کیا جاتا ہے۔ یہاں ہر مسافروں کے سامان کی تلاشی ہوتی ہے اور محصول دینا پڑتا ہے۔ ملتان سے دہلی کا سفر چالیس روز کا ہے اور راستہ آباد خطوں سے گزرتا ہے۔ راستہ میں ہمیں قزاقوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ ملتان سے دو روز کے سفر کے بعد ہم اجودھن پہونچے جسے اب پاک پٹن کہتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹا شہر ہے۔ یہاں ہم نے حضرت بابا شیخ فریدالدین شکر گنج سے نیاز حاصل کیا۔ یہاں میں نے پہلی بار ستی کا نظارہ کیا اور میں اتنا متاثر ہوا کہ گھوڑے سے گرتے گرتے بچا۔ اجودھن سے روانہ ہو کر چار دن کے سفر کے بعد ہم سراستی پہونچے جو غلّہ اور خصوصاً چاول کی بڑی منڈی ہے۔" عرب کا مشہور جغرافیہ داں ابن حوقل سندھ کے مرکزی شہر منصورہ کا تفصیل کے ساتھ ذکر کرتا ہے جس کا نام سندھیوں کی زبان میں برہمن آباد تھا۔ وہ لکھتا ہے: "اس کا بادشاہ قریشی النسل ہے۔ اس شہر پر قریش بادشاہ کے بزرگوں نے قبضہ جمالیا تھا اور اس طرح حکومت کی کہ رعیت ان کی گرویدہ ہو گئی اور دوسرے لوگوں پر ان کو ترجیح دینے لگے۔ البتہ شہر میں خطبہ عباسیوں کا پڑھا جاتا ہے۔ مسلمانوں کا لباس عام عراقیوں کا لباس ہے۔ شاہی خاندان کے لوگوں کے بال اور کرتے ہندوستانی راجوں سے ملتے جلتے ہیں۔" سندھ کے جاٹوں کے متعلق لکھتا ہے: "یہ لوگ دریائے سندھ کے دہانے کی دلدلی زمین پر رہتے ہیں اور نرکل کی جھونپڑیاں بناتے ہیں۔ ان کی خوراک مچھلی اور آبی پرندے ہیں۔" ملتان کے متعلق لکھتا ہے کہ اسے "فرج بیت الذہب" یعنی سونے کے گھر کے شگاف کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ لکھتا ہے: "ملتان اس وقت فتح ہوا جب ابتدا میں اس ملک میں اسلام داخل ہوا۔ مسلمان اس وقت سخت تنگی میں مبتلا تھے اور قحط کا شکار ہو گئے۔ ملتان میں انہیں سونے کا بڑا ذخیرہ ہاتھ آیا جس سے فارغ البالی پیدا ہو گئی۔" ساحل کے متعلق لکھتا ہے: "ساحل پر بدھ لوگ آباد ہیں اس طرح مکران اور ملتان میں بدھ مذہب کے لوگ پھیلے ہوئے ہیں۔ ملتان میں ایک عظیم الشان بت خانہ ہے جس میں ایک دیوہیکل بُت رکھا ہوا ہے۔ جو آمدنی امیر ملتان کو ہوتی ہے اس میں سے اس بت خانہ کے پجاریوں پر بھی صرف کرتا ہے۔" اس طرح مسلمان حکمرانوں کی بے تعصبی کا پتہ چلتا ہے۔ زبان کے متعلق لکھتا ہے: "منصورہ اور ملتان اور انکے گرد و نواح کے علاقوں کی زبان عربی اور سندھی ہے۔"

مشہور بحری سیاح سلیمان اپنے سفرنامے میں ہندوؤں کی طرزِ معاشرت پر روشنی ڈالتا ہے: "یہ لوگ دن کے کھانے سے پہلے

غسل کرتے ہیں۔ دانتن "(مسواک) کئے بغیر کھانا نہیں کھاتے۔ خاص خاص خاندانوں کے لئے مختلف پیشے موروثی طور پر مخصوص ہیں۔ وہ دوسرا پیشہ اختیار نہیں کرسکتے۔ یہ لمبی داڑھیاں رکھتے ہیں۔ بعض وقت انکی داڑھیاں تین تین ہاتھ لمبی ہوتی ہیں جب کوئی مرجاتا ہے تو سر اور داڑھی کے بال منڈوا دیتے ہیں"۔

دنیائے اسلام کے شہرۂ آفاق مفکر، جغرافیہ داں اور سیاح مسعودی نے منصورہ کا تذکرہ اپنی لافانی کتاب "مروج الذھب" میں کیا ہے "منصورہ، منصور بن جمہور کے نام پر موسوم ہے۔ جو بنی اُمیہ کی طرف سے سندھ کا گورنر تھا۔ اس منصورہ کے جو آجکل بادشاہ ہے، اس کے پاس ایک جنگی ہتھنی اور اسّی ہاتھی ہیں"۔

جغرافیہ داں اصطخری نے لکھا ہے کہ ۹۵۱ء میں منصورہ ملتان سے زیادہ عروج پر تھا۔ اس کے باشندوں کی تہذیبی اور تمدنی شائستگی تمام سندھ میں ممتاز حیثیت رکھتی تھی"۔

سرہنری پوٹنگر جو ۱۸۰۹ء میں سندھ کے برٹش مشن کا رکن تھا ٹھٹھہ کے متعلق لکھتا ہے "دہلی سے واپسی پر نادرشاہ نے ٹھٹھہ میں قیام کیا۔ اسوقت ٹھٹھہ میں چالیس ہزار جولاہے کام کرتے تھے۔ لنگی اور عمدہ قسم کے کپڑے تیار کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بیس ہزار سے زائد مختلف قسم کے کاریگر تھے۔ دکانداروں، مہاجنوں اور غلّہ فروشوں کی تعداد ساٹھ ہزار سے زائد تھی اور یہ بہت بڑا تجارتی اور صنعتی مرکز تھا"۔

غرضکہ مسلم اور غیر مسلم سیاحوں کے سفرناموں سے پاکستانی علاقوں میں بلند پایہ تہذیب اور تمدن کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔

حاتم طائی لاہور میں : ——— بقیہ صفحہ ۳۲

نے کر ایسی ایسی نعمتیں مجھے دی ہیں کہ میں ان لوگوں کا احسان کبھی نہیں اتار سکتا۔ شاعر اپنی طویل نظمیں مجھے سناتا ہے۔ افسانہ نگار وہ افسانے سناتا ہے جو کبھی نہیں چھپیں گے اور پھر نقاد اپنی گمبھیر آواز میں ان دونوں پر تنقید کرتا ہے۔ اور ان میں اتنی گرما گرم بحث ہوتی ہے کہ پہلے دن کے بعد سے میں نے ہوٹل والوں کا فرنیچر واپس بھجوا دیا ہے۔ جو یہ خط پڑھے اس سے میری صرف ایک التجا ہے کہ اگر میں کبھی مرا ہوا پایا جاؤں تو میری قبر پر یہ کتبہ لگا دے :-

(حاتم طائی جو بوریت سے مرگیا۔)

(بشکریہ ریڈیو پاکستان لاہور)

حاضرات : ——— بقیہ صفحہ ۲۰

"ستارہ" کا دفتر۔ جی۔ میرا نام نیاز ہے، میں، حاتم بھائی کا ملازم ہوں، ہاں وہی جو کراچی کے مشہور سوداگر ہیں، میں یہ اطلاع دینا چاہتا ہوں۔ کہ حاتم بھائی ابھی ابھی دل کی حرکت بند ہو جانے سے انتقال کر گئے۔ جی ہاں شکریہ (ٹیلیفون رکھ دیتا ہے۔ فرش پر کاغذ کے ایک پرزے پر نظر پڑتی ہے جو اٹھانے سے رہ گیا تھا۔ اٹھا کر پڑھتا ہے) "۲ فروری۔ کراچی کی گھوڑ دوڑ۔ پارہ اول رہا۔ (وہ کیا لغویات (اس پرزے کو بھی آتش دان میں جھونک دیتا ہے)

(پردہ)

(آئرستان کے ڈرامہ نگار لارڈ ڈنسانے کے ایک ڈرامہ سے ماخوذ)

آسیب : ——— بقیہ صفحہ ۲۹

"چھوڑ دو مجھے بدمعاش"۔ اس نے آزاد ہونے کی کوشش کی۔

"خبردار"، پیر صاحب نے دبے دبے لہجے میں گھُڑکی دیتے ہوئے کہا۔ میں جن بھوت اُتارنے میں ماہر ہوں۔ میں نے بڑے بڑے اکھڑ جن نکالے ہیں اور وہ جیسے اپنی پوری طاقت کے ساتھ جن پر ٹوٹ پڑا۔

دوسرے دن پیر صاحب نے فخریہ اپنی کامیابی کا اعلان کیا۔ اور مالکن نے اظہار احسان مندی کے طور پر گردن جھکا دی۔ تھوڑی دیر بعد بندھے ہوئے بستر دوبارہ کھُل گئے اور سامان اپنی اپنی جگہ قرینے سے رکھ دیا گیا۔ مالکن نے امریکہ اپنے بیٹے کے نام ایک اور تار لکھا اور جب خانو تار لے کر چھاؤنی جانے لگا، نورنعمت نے چپکے سے جیدی کے نام دوسرا خط ڈالنے کو دے دیا۔

سٹیج کیلئے ڈرامہ نویسی

اصغر بٹ

حال ہی میں مغربی سٹیج کی ہیئت وغیرہ کے سلسلے میں اتنے سارے تجربے ہوئے ہیں کہ ڈرامہ نگار کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ وہ سٹیج ڈرامہ لکھے تو کس قسم کے سٹیج کے لئے۔ تازہ ترین سٹیج وہ ہے جس میں ہال کے عین بیچوں بیچ ایک پلیٹ فارم بنا دیا جاتا ہے اور حاضرین اسکے دونوں طرف بیٹھتے ہیں۔ اداکار کو صرف سامنے ہی مُنہ کر کے مکالمے نہیں بولنا ہوتے بلکہ چاروں طرف گھوم کر بات کرنا پڑتی ہے تاکہ پیچھے بیٹھے ہوئے لوگ بھی پوری بات سُن سکیں اور اداکاروں کی پوری حرکت دیکھ سکیں۔ اگرچہ سامنے کون ہے اور پیچھے کون، یہ فیصلہ کرنا ذرا مشکل ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے سٹیج کے لئے ڈرامہ لکھا جائے گا تو زیادہ تر اداکاری ایسے طریقے سے ہوگی کہ دونوں طرف کے دیکھنے والے کرداروں کو مستقل "پروفیل" میں دیکھتے رہیں اور کوئی بڑی حرکت محض ایک جانب کے دیکھنے والوں کے حصے میں نہ آئے۔ ایسے سٹیج کے پرستار جب اپنی پیش کش کے فوائد گنواتے ہیں تو کہتے ہیں کہ چونکہ دیکھنے والے برابر کے دو حصوں میں بٹ جاتے ہیں، اس لئے اداکار وہ تمام حرکات کر سکتا ہے جو چھوٹے ہال میں تو ممکن ہیں۔ لیکن بڑے ہال میں کھو کر رہ جاتی ہیں۔ مثلاً چہرے کی کیفیات بڑے ہال میں صرف سامنے کی چند صفیں بخوبی دیکھ سکتی ہیں۔ پیچھے بیٹھے ہوئے لوگوں کے پلّے کچھ نہیں پڑتا۔ سرگوشی اور مدھم آواز کے جذباتی مکالمے بڑے ہال میں یا تو سنائی نہیں دیتے۔ یا اگر اتنی بلند آواز سے بولے جائیں کہ سب لوگ سُن سکیں تو تاثر کی شدت میں کمی ہو جاتی ہے۔ ہال کے درمیان کے سٹیج میں یہ فوائد بے شک ہیں لیکن کئی خامیاں بھی ہیں۔ مثلاً تناظر (پرسپیکٹیو) محض کنایاتی ہوتا ہے دونوں طرف کے حاضرین میں سے لامحالہ ایک طرف کے لوگ چند جسمانی حرکات اور چہرے کی کیفیات دیکھیں گے جو دوسری جانب کے لوگ نہ دیکھ سکیں گے۔ اداکاروں اور خود ڈرامہ نگار کو حرکات کی تقسیم میں ترازو لے کر بیٹھنا پڑے گا کہ اگر ایک طرف کے لوگوں نے اداکار کا سر کھُجانا پوری طرح دیکھا ہے تو دوسری طرف کے لوگ اس کا قہقہہ لگاتا ہوا چہرہ اچھی طرح دیکھ لیں۔ (ڈرامہ نگار کی ذمہ داری اس طرح ہے کہ سب سے پہلے اداکاروں کی حرکات کا تصور ڈرامہ نگار کرتا ہے اور ہدایات میں اُسے یہ سب کچھ واضح طور پر لکھنا پڑتا ہے۔

پھر پورے ہال کا کنایاتی سٹیج ہے جس پر سٹیج کا ساز و سامان نہیں ہوتا، محض اداکاروں کے مکالموں سے یہ تصور کرنا پڑتا ہے کہ یہاں مِل کا ایک بڑا پہیہ گھوم رہا ہے اور وہاں بظاہر نظر آتی ہوئی بنچ کے بجائے دراصل بوریاں رکھی ہیں جن میں آٹا پس پس کر بھر رہا ہے۔

یا جدید تھیٹر کے پورے لوازمات کا سٹیج ہے جس میں منظر حاضرین کی نظروں کے سامنے گھوم جاتے ہیں۔ اداکار یکایک ہوا میں اُٹھ جاتے ہیں، فرش پھٹ جاتا ہے اور اداکار زمین میں غائب ہو جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ مختصر یہ کہ اداکاروں اور ڈرامہ نویس کے لئے امکانات کا دائرہ بے حد وسیع ہے۔ ایک چیز جو یہ سٹیج پیش نہیں کر سکتا وہ ہے کمرے کی چوتھی دیوار۔ حاضرین کو تصور کرنا پڑتا ہے کہ جس طرف وہ خود بیٹھے دیکھ رہے ہیں اس طرف چوتھی دیوار ہے۔ ایک چیز اور جو اس سٹیج کے لئے غیر تحریر شدہ اصول کے طور پر مانی جاتی ہے وہ ہے سٹیج پر مائیکروفون کی عدم موجودگی۔ اداکاروں کو خود اپنی آواز حاضرین تک پہنچانا پڑتی ہے۔ سائنس کی اس نہایت مفید ایجاد کو رسمی سٹیج نے ابھی تک اس لئے دور رکھا ہے کہ مائیکروفون سٹیج پر خواہ کتنے ہی لگا دیئے جائیں وہ آوازوں کا فاصلہ وہ نہیں بتا سکتے جو خود حاضرین کو کرداروں کے درمیان نظر آتا ہے۔ اور ایسا مائیکروفون ایجاد نہیں ہوا جو پورے سٹیج کے مکالمے متوازن گہرائی سے لے۔ مائیکروفون کا بہر صورت

ایک فائدہ بھی ہے اور وہ یہ کہ سرگوشی اور مدھم جذباتی مکالمے بخوبی آجاتے ہیں اور اداکاروں کو چلانا نہیں پڑتا۔

پھر سیدھا سادا کالجوں اور سکولوں کا ایک پردے کا سٹیج ہے۔ یا اس سے بہتر دو پردوں کا سٹیج۔ دو پردوں کے سٹیج سے مراد مقابلتاً زیادہ گہرا سٹیج ہے جس کے بیچ میں ایک پردہ لگا کر بیک وقت دو سیٹ تیار رکھے جا سکتے ہیں۔

یونانی ڈراموں کے تتبع میں اوپن ایئر تھیٹر کا سٹیج ہے یا شیکسپیئر کے زمانے کا الزبیتھین سٹیج جس پر ایک مستقل سیٹ بنا رہتا ہے اور گرانے کے لئے کوئی پردہ وغیرہ نہیں ہوتا۔ شیکسپیئر کو جب اپنا منظر بدلنا ہوتا تھا تو اداکاروں سے سٹیج خالی کروانے کے لئے اس طرح کے مکالمے بلواتا تھا کہ "چلو فلاں جگہ چلیں" یا مثلاً ہیملٹ کو پولونیس کی لاش کو گھسیٹ کر سٹیج پر سے لے جانا پڑتا کیونکہ سٹیج خالی کرنے کے لئے لاش خود ہی اٹھ کر نہیں جا سکتی۔ پردے کے سٹیج پر ظاہر ہے کہ ایسے مکالمے یا حرکات غیر ضروری ہوں گی۔

ڈرامہ نویس کو یہ دیکھنا ہے کہ ایک پردے کے سٹیج کے لئے جو ہدایات یا مکالمے وہ لکھے اس سادہ سٹیج کے لئے موزوں ہوں۔ یہ نہ ہو کہ میسر تو ایک پردے کا سٹیج ہے۔ اور ڈرامہ ایسا ہے جو صرف کاروباری سٹیج پہ کھیلا جا سکتا ہے۔ اسی طرح کاروباری سٹیج کے لئے اگر کوئی کنایاتی سٹیج کے مکالمے لکھ ڈالے تو وہ بے معنی ہو جائیں گے۔ اس میں بہرصورت بھلے کی بات یہ ہے کہ کاروباری سٹیج کے کارپرداز خود ہی اسے نامنظور کر دیں گے اور ڈرامہ نویس کو اپنی تکنیک کی خامیوں کا علم ہو جائے گا۔ ہر ڈرامے کے ڈھانچے اور مکالموں کو سٹیج کے امکانات کے مطابق ہونا پڑتا ہے۔ جو ڈرامہ نویس اس خیال سے لکھتے ہیں کہ ہر ڈرامہ ہر سٹیج پر کھیلا جا سکتا ہے ان کا سٹیج کے بارے میں مطالعہ بے حد غیر مکمل ہے۔

ہمارے ہاں عام طور پر جو سٹیج میسر آ سکتا ہے وہ ایک پردے کا سٹیج ہے۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ اور کسی قسم کا سٹیج بن نہیں سکتا بلکہ یہ کہ تجرباتی سٹیج کے لئے ہمارے حاضرین پورے طور پر پختہ نہیں ہیں اور وسیع اور بسیط سٹیج بنانے کے امکانات ایک فیصدی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان حالات میں ایک ڈرامہ نویس کے لکھنے پر تو کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔ وہ لکھے اور اس کے بعد اپنے مطلب کا سٹیج بنانے کے لئے کوشش کرتا رہے۔ جب وہ کامیاب ہو جائے گا تو اسکا ڈرامہ کھیلا جا سکے گا۔ وگرنہ آنے والی نسلوں میں سے شاید کوئی ان ڈراموں کو دیکھے اور اُن کی تازگی اور دلچسپی کو برقرار پا کر پیش کر سکے لیکن ہر حالت میں ڈرامہ نویس کے ذہن میں سٹیج کا تصور مکمل ہونا ضروری ہے خواہ وہ سٹیج ہال میں موجود ہے یا نہیں۔ آج تک یہ کبھی نہیں ہوا کہ ایک ڈرامہ نویس تو ڈرامہ لکھ کر چھوڑ گیا اور اس کی پیش کش کے مسائل آنے والی نسلیں خود حل کرتی رہیں۔ ڈرامہ نویس کے ذہن میں اگر کوئی ایسا سٹیج ہے جو فی الحال موجود نہیں تو اسکا مکمل خاکہ ڈرامہ نویس لکھ کر چھوڑ جائے۔ کم از کم وہ سٹیج امکانات کے دائرے میں تو معلوم ہو۔

سٹیج کا نقشہ واضح ہو جانے کے بعد ڈرامہ نویس کو اپنے مواد کو دیکھنا ہے۔ اس مواد میں ایک ایکٹ کا ڈرامہ بننے کی صلاحیت ہے یا پورا ڈرامہ بننے کی۔ ایک ایکٹ کا ڈرامہ ظاہر ہے پورے ڈرامے سے محض اپنے مواد کے اختصار میں ہی مختلف نہیں ہے۔ سٹیج کی بعض اور پابندیاں بھی اُسے سہنا پڑتی ہیں۔ مثلاً کاروباری سٹیج کے لئے ایک ایکٹ کا ڈرامہ منفعت کے نقطۂ نظر سے ناقابل قبول ہے۔ ہاں ایک ایکٹ کے دو تین ڈرامے مل کر ڈھائی تین گھنٹے کے لئے مواد مہیا کر سکیں تو دوسری بات ہے۔ حاضرین کو بہرصورت اپنے داموں کا معقول معاوضہ چاہیئے۔ دو تین ڈراموں کو کاروباری سٹیج عام طور پر ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے کیونکہ ان سب میں تاثر کی یگانگت بنانا بے حد مشکل کام ہے اور حاضرین کو ڈرامے سے زیادہ یہ چیزیں ویرائیٹی پروگرام معلوم ہوتی ہیں۔ تھیٹر کی عام روایات سے ویرائیٹی پروگرام بہرصورت خارج ہے اور نہ ویرائیٹی پروگرام کو باقاعدہ ڈرامے کی صنف میں شمار ہی کیا جا سکتا ہے۔ ایک ایکٹ کے بہت سے ڈرامے چننے میں ایک دقت یہ بھی ہے کہ تین چار ڈراموں کے کل سیٹ اور کرداروں کی گنتی کو جمع کیا جائے تو کل خرچ عام طور پر ایک مکمل ڈرامے سے زیادہ ہی پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں چند مثالیں ایسی بھی نکل آئیں گی جہاں خرچ والی بات مکمل طور پر صادق نہ آتی ہو لیکن چونکہ ایسی مثالیں بہت کم ہیں، اس لئے کاروباری تھیٹر ایک ایکٹ کے ڈراموں کو عدم اعتماد سے دیکھتا ہے۔

لیکن اگر یہ طے نہیں ہو سکا کہ مواد کو ایک ایکٹ میں چار ایکٹوں میں سمیٹا جا سکتا ہے اور ڈرامے کی میعاد نہ پابندی سے ایک ایکٹ والی یعنی آدھ گھنٹے کے لگ بھگ بنتی ہے نہ پورے ڈرامے والی یعنی تین گھنٹے کے قریب، بلکہ ایک اور دو گھنٹے کے بین بین ہے تو کیا کیا

اس قسم کا تجرباتی سا ڈرامہ لکھنے میں بظاہر کوئی چیز حائل نہیں سوائے حاضرین کے ردعمل کے اور شاید منتخب حاضرین اسے بخوشی قبول بھی کرلے لیکن ایک ایکٹ کے حاضرین کا موڈ مقابلتاً طوالت کو دیکھ کر کسمساہٹ میں بدل سکتا ہے اور مکمل ڈرامے کے حاضرین کے لئے تو بہرصورت یہ مختصر ہے ہی۔

مواد کو دیکھ چکے اور سٹیج کی صلاحیتوں کا جائزہ لیا جا چکا۔ ڈرامے کے لئے مناسب قالب بھی انتخاب ہوگیا، لیکن ڈرامہ نویس کے لئے پھر بھی مشکلات باقی ہیں۔ اگر اسے ایک ایکٹ کا ڈرامہ لکھنا ہے تو اداکاروں کی تعداد اور مکالموں میں ہر طرح سے بچت دکھانی ہوگی۔ ایک ایکٹ کے ڈرامے کا کینوس اتنا چھوٹا ہے کہ دونوں میں سے کسی ایک کا فیاضانہ استعمال جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اداکار کم سے کم ہوں۔ محض اتنے جو پلاٹ کو آگے بڑھانے میں مدد دیں۔ نمائشی کردار جو بالآخر سیٹنگ کا حصہ بن جاتے ہیں ایک ایکٹ کے ڈرامے میں مانع حرکت ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر ایک دکان کے منظر میں ایک شخص آ کر آٹے تیل کا بھاؤ پوچھنا شروع کر دیتا ہے تو دکان کے ماحول تک تو اسکی آمد کا جواز ہے، لیکن پلاٹ کے لئے چونکہ وہ غیر ضروری ہے اس لئے ایک ایکٹ کے ڈرامے میں اس کی گنجائش نہیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جتنا عرصہ وہ شخص آٹے، تیل کا بھاؤ پوچھتا رہے گا، پلاٹ کی حرکت رُکی رہے گی۔ ہاں اگر دکاندار کا کردار اس مکالمے کے ذریعے اُجاگر کرنا مقصود ہے اور کردار کی اس وضاحت سے پلاٹ کو تحریک ملتی ہے تو ٹھیک ہے محض نمائشی کردار نہ صرف تکنیک کے اعتبار سے خام ہیں بلکہ غیر ضروری بھی ہیں۔

سٹیج پر اگر چند ضروری سامان کی چیزیں رکھ دی گئی ہیں جن سے ایک خاص ماحول متصور ہوتا ہے تو پھر مکالموں کے ذریعہ اس ماحول کو یقینی بنانا ایک ایکٹ کے قیمتی وقت کو چُرا کر فضول خرچی کرنے کے مترادف ہے۔ ویسے دیکھا جائے تو سٹیج کے سیٹ کو زیادہ سے زیادہ یقینی بنانے بھی کوئی زیادہ فرق نہیں پڑتا جس شخص کو یہ احساس ہو جائے گا کہ اس دکان کی دیواریں گتے کی ہیں اور اداکار کی مونچھیں مصنوعی ہیں۔ وہ محض ایک یا دو گاہکوں کی آمد سے دکان کے حقیقی ہونے کا تصور تو کر نہیں لے گا، لیکن اگر دکاندار بغیر گاہکوں کے ساتھ بیٹھا ایسی باتیں کرتا رہے جن سے حاضرین کی توجہ کہانی پر مرکوز رہے تو دیکھنے والا گاہکوں کی آمد پر اصرار نہیں کرے گا بلکہ ڈرامہ نویس کا ممنون ہوگا کہ اس نے غیر ضروری طور پر اس کی توجہ کو بھٹکایا نہیں اور کہانی کی سلاست، روانی اور یک جہتی برقرار رکھی ہے۔

سٹیج ڈرامے میں واقعات پر خود بخود یقین آجانا مرکزی خیال کی زیادہ توجہ دینے سے حاصل ہوتا ہے نہ کہ اشاروں کی افراط بہم پہنچانے سے تین یا چار ایکٹ کے ڈرامے میں وقت کی طوالت کی وجہ سے جو بوجھ دیکھنے والوں پر پڑتا ہے وہ ہر ایکٹ کے بعد پردہ گرا کر دُور کر دیا جاتا ہے۔ اسلئے لمبے ڈرامے میں پردے کا گرنا حاضرین کے موڈ کے مطابق ہے اور حاضرین کی طرف سے تسلسل کا تقاضا نہیں ہے۔ حاضرین کی طرف سے اس نہایت فطری آرام کی خواہش کو ڈرامہ نویس اپنا منظر بدلنے کے لئے استعمال کر لیتا ہے اور حاضرین اُسے خوش آمدید کہتے ہیں لیکن اس کے برخلاف ایک ایکٹ کے ڈرامے میں حاضرین پر طوالت کا کوئی بوجھ نہیں ہوتا۔ وہ بڑے اطمینان سے آدھ گھنٹے کے لگ بھگ کی مسلسل اداکاری کا مظاہرہ دیکھ سکتے ہیں بشرطیکہ کہانی دلچسپ ہو اور اچھی طرح پیش کی جا رہی ہو۔ کہانی میں اگر کہیں پردہ گرا کر منظر تبدیل کیا جاتا ہے تو حاضرین کے موڈ کا تعاون اس میں شامل نہیں۔ ممکن ہے کہانی میں پردہ گرانے کی رکاوٹوں سے اُن کے موڈ پر بُرا اثر پڑے جس کے معنی یہ ہیں کہ ڈرامے کا تاثر کم ہو گیا۔ ڈرامہ نویس جب اپنا منظر بدلتا ہے تو مجبوری کے عالم میں اور حاضرین کو ڈرامہ نویس کی مجبوریوں سے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔ ایسی صورت میں حاضرین کا تقاضا یہ ہوگا کہ ڈرامہ نویس کوئی ایسا نکتہ پیدا کرے جس پر تمام کہانی سمٹ سکے، یا اگر یہ ممکن نہیں تو کوئی اور کہانی پیش کرے جس میں یہ ممکن ہو۔

ظاہر ہے کہ اس اُصول کے سلسلہ میں ایسی مثالیں بھی دی جا سکتی ہیں جہاں پردے کا گرنا در اصل حاضرین کی دلچسپی میں اضافہ کرتا ہے۔ مثلاً کہانی کی رفتار بڑھتے بڑھتے یکایک ایک ایسے خطرناک موڑ پر آکر رک گئی ہے جہاں حاضرین دم بخود ہیں کہ آگے کیا ہوگا۔ وہاں ممکن ہے بعض حالات میں پردے کا گرنا اُن کے تجسس میں اضافہ کر دے، لیکن عام حالات میں ایک ایکٹ کے ڈرامے میں وقت، حرکت، اور جگہ کی اکائی حاضرین کے لئے مقابلتاً کہیں زیادہ قابل قبول ہے۔ محض ڈرامہ نویس کی مجبوری کو اس سے انحراف کے جواز میں جائز تصور نہیں کیا جا سکتا۔

طویل ڈرامے کے مقابلے میں ایک ایکٹ کے ڈرامے پر زیادہ بحث کرنے سے مقصد یہ ہے کہ ہمارے ہاں کئی ایک ایکٹ کے ڈرامے لکھے لکھے گئے ہیں جن میں ان ابتدائی باتوں کا خیال نہیں رکھا گیا اور طویل ڈرامے کی تکنیک پر مفصل بحث کرنے کے لئے اس مختصر مقالے کا دامن تنگ ہے۔ یہاں شاید یہ کہہ دینا کافی ہو کہ طویل ڈرامہ لکھنے کے لئے اتنا مواد ہونا ضروری ہے جو آسانی سے ڈھائی تین سو صفحات کے ناول کی صورت میں بھی نمودار ہو سکتا ہو۔ اس مواد میں قطع و برید اور ترتیب و تدوین کے مراحل آتے ہیں۔ ایک بہت بڑی تصویر کو کاٹ چھانٹ کر دوبارہ یوں جوڑنا پڑتا ہے کہ وہ بذاتِ خود جامع اور مکمل ہو، کہیں سے ادھورے پن یا غیر ضروری تفصیلات کا احساس نہ ہو اور کہانی پہلے ایکٹ سے ہی ایک سیلِ رواں کی طرح نقطۂ معراج کی طرف یوں بڑھے کہ کہیں ہچکچاہٹ، سست رفتاری، غیر ہمواری اور بھدے پن کا احساس نہ ہو۔ نقطۂ معراج پر پہونچ کر جب وہ تیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھے تو آخری نتیجہ بالکل ناگزیر معلوم ہو۔ آخر میں کردار غیر ضروری طور پر بیٹھ کر اپنے زخم نہ چاٹتے رہیں۔ پہلے جہاں سب بڑی تن دہی سے ایک چوٹی کی طرف چڑھ رہے تھے، جب وہ چوٹی سے گریں تو کئی گنا زیادہ تیزی سے۔ مسائل جب کھل جائیں تو مجموعی تاثر ایک تسکین کا ہو۔ تانے بانے میں اگر کہیں جھول رہ گیا ہے تو پھیکے پن اور پھس پھسے پن کا احساس ہوگا۔ جو باتیں ناول میں اس کے بڑے کینوس کی وجہ سے نبھ جاتی ہیں۔ ڈرامے میں بری طرح کھٹکتی ہیں۔

سٹیج پر چونکہ پوری کہانی آواز اور حرکت کے ذریعے حاضرین تک پہنچتی ہے اس لئے چند اور ابتدائی باتوں کی طرف دھیان دینا ضروری ہے۔ مثلاً یہ کہ اگر ہیرو نے ہیروئن سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی بات کہہ دی تو فلم کے کلوز اپ میں تو وہ آ سکے گی اور سمجھی بھی جائے گی، لیکن سٹیج کے حاضرین بدقسمتی سے اس سے محروم رہ جائیں گے۔ اس قسم کی ہدایات لکھنا کہ "اس کی آنکھوں میں ناامیدی تھی" محض بیکار ہیں۔ اداکار تو شاید اپنی آنکھوں میں ناامیدی لے آئے لیکن وہ سو گز دور بیٹھے شخص کو نظر نہیں آئے گی۔ پھر سٹیج ایکٹر کے چہرے سے جس پر پوڈر اور غازے کی آدھ انچ گہری تہہ جمی ہوئی ہے ایسی جذباتی کیفیت کہ "اس کا چہرہ اتر گیا" کیسے ظاہر ہوگی؟ لہٰذا اگر کسی اداکار کو کوئی ناامیدی ہوئی ہو یا اُسے کوئی ذہنی صدمہ ہوا ہے تو حاضرین کو اس کا علم یا اس کے کسی مکالمے سے ہو سکے گا یا کسی بڑی واضح جسمانی حرکت سے جو سو گز دور سے بھی صاف نظر آ سکے۔

جب ابتدائی باتوں کا ذکر ہی ہے تو دو ایک چیزیں جن کی طرف ہمارے لکھنے والے توجہ نہیں دے رہے دہرا دینے میں مضائقہ نہیں ہے کسی اداکار کے سٹیج پر آتے ہی پہلے چند منٹوں میں یہ واضح ہو جانا چاہیئے کہ وہ کون ہے اور اس کا دوسرے کرداروں سے کیا تعلق ہے۔ یعنی اگر یہ سب کچھ کسی مصلحت سے چھپایا نہیں جا رہا تھا کرداروں کے آپس میں تعلقات اگر بے احتیاطی کی وجہ سے غیر واضح رہ گئے ہیں تو کہانی سمجھنے میں کافی الجھنیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ پھر بعض ڈراموں میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ سٹیج پر چند کرداروں کو لا کر بٹھا دیا جاتا ہے اور پردہ گرنے تک وہ اپنی اپنی جگہوں پر یونہی بیٹھے بولے چلے جاتے ہیں۔ اس سے پورے ماحول پر ایک جمود سا طاری ہو جاتا ہے۔ اگر یہ جمود ارادتاً نہیں لایا گیا تو کرداروں کو ہلانا جلانا پڑے گا۔ اور یہ مسئلہ ہدایت کار کا نہیں، ڈرامہ نویسی کا ہے ٭

ی سرگرمیاں

واشن کے وفد قائد اعظم رح
کے مزار پر

جمائی نے ایک نقش جو سمیر ... لسان
اسلام ... علی خان نے ... کے
''ایوان امن'' کو پیش کیا

''ایاسس آرٹ سوسائٹی'' (پشاور)
کے زیر اہتمام ... کی ایک نمائش

ثقافت پاکستان

اگرچہ ہمارا ملک سیاسی طور پر ایک نو تشکیل مملکت ہے لیکن ثقافتی اعتبار سے اس کی بنیادیں ماقبل تاریخ عہد کی گہرائیوں تک پہنچی ہیں۔ فی الحقیقت پاکستان تہذیب، علم اور تمدن کا قدیم ترین گہوارہ ہے اور تقسیم ملک کے بعد اس برصغیر کے بہترین تہذیبی ورثہ کا جزو اعظم پاکستان ہی کے حصہ میں آیا ہے۔ "ثقافت پاکستان" ایک مبسوط کتاب ہے جس میں پاکستان کے ثقافتی ورثہ کا مکمل جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کتاب کی تدوین میں ملک کے نامور مفکرین اور اہل قلم نے حصہ لیا ہے۔

دیدہ زیب مصور سرورق - مجلد پارچہ، طلائی لوح، ۱٦٠ تصویری صفحات، متن ساڑھے تین سو صفحات۔ قیمت ساڑھے چار روپے۔

انتخاب کلام - مسلم شعرائے بنگال

[illegible] مسلمان شعرائے بنگالی ادب میں [illegible] پہلا اضافہ [illegible] انتخاب عہد قدیم سے لیکر معاصر شعراء [illegible] پروفیسر احسن احمد "اشک" اور یونس احمر نے براہ راست [illegible] اردو میں [illegible] ہیں۔

[illegible] مجلد (پارچہ)، طلائی لوح، ساڑھے چار روپے - سادہ مجلد - چار روپے

عبداللہ

یہ بنگالی زبان کا ناول پہلی بار اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ یہ ناول عبوری دور کے معاشرہ کی جیتی جاگتی تصویر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ جس میں نئی زندگی پرانی زندگی کے ساتھ محو کشمکش ہے۔ اور آخر کار نئے تقاضے حیات کا رخ بدل دیتے ہیں۔

ناول کا پس منظر بنگال کا ہے۔ مگر اس کی کہانی ہم سب کی اپنی کہانی ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کے دونوں حصوں کا تاریخی ارتقا کس طرح ایک ہی نہج پر ہوا اور ہم ایک دوسرے سے کس قدر قریب ہیں۔

۳۰۰ صفحات - مجلد کتاب، دیدہ زیب سرورق، قیمت سادہ جلد چار روپے
طلائی جلد ساڑھے چار روپے۔

مشرقی بنگال کا پوتھی ادب

[illegible] بنگال کی عوامی زبان [illegible] مالا مال رہا ہے۔ مسلم ادبا و شعراء نے اس زبان [illegible] انسان اور زندگی کو اپنا موضوع بنایا [illegible] مذہب، تصوف، تاریخ، تمدن، روایات [illegible] پوتھی ادب [illegible] یہ کتاب مسلمانان بنگال کے اس ادب کا مکمل تعارف ہے۔ اس کے ذریعے آپ بنگال کے مسلم عوام کی روح تک پہنچ سکتے ہیں۔ قیمت صرف [illegible] روپے۔

ادارہ مطبوعات پاکستان - پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ - کراچی

مارچ ۱۹۵۶ء

محمد امین زبیری غلام عباس شکیلہ معظم سید محمد جعفری
سیماب اکبرآبادی سید آل رضا ناصر کاظمی ہادی حسین
سراج الدین ظفر سید عبدالحمید عدم طاہرہ کاظمی نسیمہ اشرف علی

قیمت آٹھ آنے
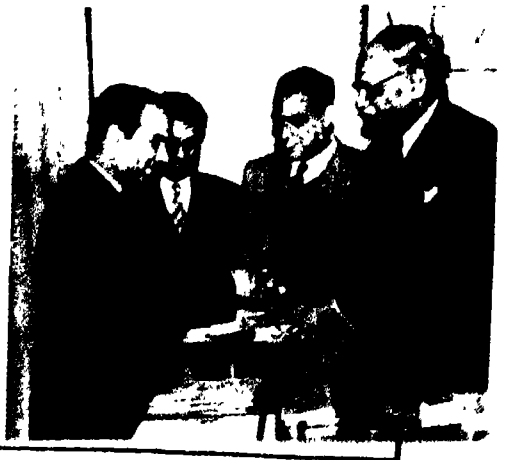
جلد ۸ شمارہ ۱۲ مارچ ۱۹۵۶ء

مدیر: رفیق خاور
نائب مدیر: ظفر قریشی

پاکستان اور ہندوستان میں سالانہ چندہ پانچ روپے آٹھ آنے ـ فی کاپی آٹھ آنے

اپس کی باتیں

پچھلے دنوں ڈھاکہ میں گورنمنٹ انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس کی نئی عمارت کے افتتاح کے موقع پر فضیلت مآب میجر جنرل اسکندر مرزا نے فنونِ لطیفہ کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ یہ محض تفریح اور دل لگی کا سامان ہی نہیں بلکہ زندگی کا خلاصہ اور اس کی روح و رواں ہیں۔ آپ نے فرمایا "اس میں شبہ نہیں کہ جب سے پاکستان قائم ہوا ہے ہم اور ہماری حکومت ان مسئلوں کو حل کرنے میں مصروف رہے ہیں جو ہمارے مخصوص حالات کا لازمی نتیجہ تھے۔ اب جبکہ ہم اس بحرانی دور سے گزر چکے ہیں جس میں ہم اپنی قومی حفظ و بقا کے لیے سرتوڑ کوشش کر رہے تھے، وہ وقت آپہنچا ہے کہ ہم زیادہ لطیف قدروں کو اپنائیں — وہ قدریں جو فنونِ جمیلہ میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ آرٹ کوئی بیکار چیز نہیں اور نہ ہم اس کو ذہنی عیاشی قرار دے سکتے ہیں۔ درحقیقت یہ زندگی کا لطیف جوہر ہے۔ خواہ یہ زندگی کی گھناؤنی اصلیتوں کو بے نقاب کرے یا اس کی رعنائیوں سے پردہ اٹھائے، آرٹ ہمیشہ یا تو زندگی کی عکاسی کرتا ہے یا اس پر تبصرہ کرتا ہے۔ دونوں صورتوں میں اس کی سرگرمیاں بڑی تعمیری ہیں اور ہماری بصیرت و مسرت میں اضافہ کرتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر آرٹ عالمگیر بنیادی قدروں کا حامل ہوگا تو بین الاقوامی تعلقات کو خوشگوار بنانے اور باہمی خیرخواہی پیدا کرنے میں کس قدر مفید ہوگا۔ آرٹ کی ایک اپنی ہی زبان، اپنا ہی مزاج ہے جو تمام مقامی و علاقائی حدود سے بالاتر ہے۔ کوئی قوم اس وقت تک ذہنی و تمدنی حیثیت سے بالغ نہیں کہلا سکتی جب تک وہ فنونِ لطیفہ کی نشو و نما کو اپنی زندگی میں نمایاں جگہ نہ دے"

یہ افکار ہماری قومی ترقی و ثقافتی ترقی کے لئے بڑی نیک فال ہیں۔ مشہور نقاد رسکن نے اپنے اس قول میں ایک کھلی ہوئی حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ کسی قوم کا فن ہی اس کی صحیح عظمت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ادب اور فن ہمارے قدیم قومی سرمائے ہیں۔ زندگی کی دوسری سرگرمیوں کے ساتھ ہمارا فنی شعور بھی نئے سرے سے بیدار ہو رہا ہے۔ "ماہِ نو" ابتدا ہی سے پاکستان کی ادبی و فنی سرگرمیوں کا ترجمان رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔

ہمارے ہاں اوقاف کا استعمال ناپید تھا بلکہ قرآنِ کریم کے اوقاف تو علوم قرآنی میں ایک مستقل باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر ترقی یافتہ زبان کے لئے ایسی علامات ضروری ہیں جن سے عبارت میں صحیح نظم و ترتیب پیدا ہو۔ اس دور میں از دو زبان کے لئے ہم نے بعض انگریزی علامات اپنالی ہیں، لیکن ان کے استعمال میں باقاعدگی پیدا نہیں ہو سکی۔ اسی لئے ہر شخص اپنی پسند اور مزاج کے مطابق انہیں برتتا ہے۔ یہ صورت حال ایک ترقی یافتہ اور ترقی پذیر زبان کے شایانِ شان نہیں۔ ہمارے خیال میں بہتر ہوگا کہ کم از کم چند علامات کے سلسلہ میں یکساں روش اختیار کر لی جائے، مثلاً:-

۱۔ فقرے کے خاتمے پر —

۲۔ فقرے کے درمیان زیادہ توقف کے لئے ؛

۳۔ تشریح کے لئے :

۴۔ پیراگراف کا خاتمہ ÷

۵۔ الفاظ اور جملوں کے مابین توقف کے لئے ،

۶۔ تشریح کے لئے کشش ———

یہ وہ علامات ہیں جن کا استعمال کم و بیش تسلیم شدہ ہے، لیکن پابندی سے نہیں کیا جاتا۔ اگر ان کی عام طور پر پابندی کی جائے تو عبارت میں یقیناً زیادہ سلجھاؤ پیدا ہو سکتا ہے۔ انگریزی میں سیمی کولن (؛) اور کولن (:) کے استعمال کا ایک عام اصول یہ ہے کہ یہ علی الترتیب خفیف اور واضح وقفہ کے لئے استعمال ہوتے ہیں جو کوما (،) اور فل اسٹاپ کے بین بین ہیں جہاں سے طویل جملوں یا فقروں کو باہم پیوست اور مربوط کرنے کا کام بھی لیا جاتا ہے، جہاں عبارت کا تسلسل قائم رکھنا مقصود ہو اور یوں وقفہ تسلسل خیال میں حارج ہو۔ البتہ یہ علامات ہمارے ہاں ابھی نہیں اپنائی گئیں۔ ہم اپنے ناظرین کو اس مسئلے پر اظہار خیال کی دعوت دیتے ہیں÷

دست قضا نے افقِ ادب سے دو اور روشن ستارے چُن لئے — قاضی عبدالغفار اور میرزا یاس یگانہ چنگیزی۔ دونوں نے اپنے اپنے محوروں میں وہ گرمی اور آب و تاب دکھائی جو ادب میں یادگار رہیگی۔ یہ وہ ستارے ہیں جو ٹوٹ کر اپنے پیچھے ایک روشن لکیر چھوڑ جاتے ہیں۔ "لیلیٰ کے خطوط" اور "مجنوں کی ڈائری" ہمارے ادب و فن کی شاہراہ پر مینارۂ نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ صحافت اور ادب دونوں میں قاضی صاحب پیش کارواں تھے۔ یگانہ نے غزل کی محفل میں نئی رونق پیدا کی، وہ اکثر اہلِ کمال کی طرح تختۂ مشق حوادث رہے اور جان جان کر بھی زمانے سے اُلجھتے رہے، لیکن موت مرنے والے کی زبان کے ساتھ دنیا کی زبان کو بھی خاموش کر دیتی ہے

"غالب و میرزا یگانہ کا آج کیا فیصلہ کرے کوئی"

مرحوم نے وفات سے کچھ عرصہ پہلے ہمیں ایک غزل اور چند رباعیاں بھیجی تھیں۔ کیا معلوم تھا کہ یہ ماہِ نو کے لئے ان کا آخری ہدیہ ہوگا! غزل نومبر کے شمارہ میں پیش کر دی گئی تھی۔ اس بار رباعیات ان کی یادگار کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔

سر سیّد کے قلمی کارنامے

محمد امین زبیری

سرسید کی زندگی ایسی متنوع خصوصیات سے معمور ہے کہ ان میں سے ہر ایک خصوصیت نہایت شرح و بسط سے بیان کی متقاضی ہے۔ ہنوز ان کی سوانح حیات، تذکرے اور مقالے وغیرہ سب ناتمام و تشنہ ہیں، اس لئے کسی رسالے کے چند محدود صفحات میں کسی ایک خصوصیت پر اور کسی ایک شخص کے قلم سے ہلکی سی بھی روشنی نہیں ڈالی جا سکتی، تاہم بالاختصار بھی ان کی علمی و ادبی خصوصیتِ ذوق اور اس میں تدریجی ترقی کا بیان دلچسپی سے دیکھا جائیگا +

سرسید دہلی میں ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ اس وقت یہ مرکزِ علم و فضل اُجڑ چکا تھا، تاہم چند نفوس، جو قدیم علم و ادب اور تہذیب کے نمونے تھے، زندہ و موجود تھے۔ ان بزرگوں میں سرسید کی چشمِ ہوش کھلی اور ان کی تربیت و تعلیم سے دل و دماغ منور ہوا۔ ان کی عمر ۱۹، ۲۰ سال کی تھی کہ انہوں نے سب سے پہلے صحافت کے میدان میں قدم رکھا +

۱۸ویں صدی کے آغاز میں صحافت کو خصوصاً ملکی زبان میں اجاری ہوئے بہت کم مدت گذری تھی۔ سرسید کے بڑے بھائی سید محمد نے بھی ایک اخبار "سید الاخبار" کے نام سے جاری کیا تھا۔ سرسید اس کے بڑے سرگرم مضمون نگار تھے مگر مجبوریوں نے سرکاری ملازمت کی طرف مائل کیا۔ کمپنی کی حکومت تھی۔ قوانین و قواعد بھی ملکی زبان اردو میں جاری تھے۔ عدالتی و دفتری کارروائی بھی اسی میں ہوتی تھی۔ وہ ۱۸۳۸ء میں سررشتہ دار مقرر ہو گئے اور رفتہ رفتہ امتحانات میں کامیابیوں کے ساتھ ساتھ ترقی کرتے کرتے صدر الصدوری تک پہنچے جہاں سے ۱۸۷۶ء میں پنشن لی +

علمی ذوق اور حصولِ علم کا ولولہ و شوق رگ و پے میں ساری اور دل و دماغ پر مستولی تھا۔ سررشتہ داری کے زمانے میں بھی تصنیف و تعلیم کی طرف بھی رجحان پیدا ہوا اور سب سے اوّل ترتیب دفتر کا دستور العمل اور پھر قواعد منصفی کا خلاصہ مرتب کیا۔ دونوں کتابیں عملے اور امیدواران ملازمت کے لئے بے حد مفید ثابت ہوئیں۔ اس زمانے میں ہائی کورٹ کے مماثل صدر عدالتیں قائم تھیں۔ ان کے فیصلوں کی زبان انگریزی تھی۔ ان کے ترجمے کرائے اور بطور نظائر شائع کیا، جو اردو داں حکام عدالت کے لئے بڑے رہنموں تھے +

اب یہ شوق روز بروز بڑھتا رہا اور زندگی بھر باوجود دیگر اہم سرکاری اور قومی تعلیمی و سیاسی مصروفیتوں کے قائم رہا، حتیٰ کہ رحلت سے ایک ہفتہ پہلے تک یعنی جب تک ہاتھ میں قلم پکڑنے کی طاقت رہی اس میں مصروف رہے +

بہرحال زندگی کی یہ شصت سالہ مدت جو صحافت سے شروع ہوئی علاوہ متذکرہ بالا کتب کے، مذہب و تاریخ، تصوف، ریاضی، ادب سب ہی پر محیط ہے +

مذہب میں جلاء القلوب بذکر المحبوب محافلِ میلاد کے لئے بروایاتِ صحیحہ پڑھنے کے لئے "تحفۂ حسن" (ترجمہ تحفہ حسن اثنا عشریہ باب ۱۰، ۱۲) کلمۃ الحق در بیان پیری مریدی، ترجمہ چند ابواب کیمیائے سعادت، نمیقہ در بیان تصور شیخ، تبئین الکلام، تفسیر توریت و الانجیل، پھر رسالہ طعام اہل کتاب

پاکستان کی جمہوریتِ اسلامیہ

۷۵ ھ ۱۳

ملتِ پاک کے جمہور کا دستور حفیظ — عین آئینِ خداوندی کی پابندی ہے

رفعتِ عرشِ بریں سے پئے تائید آئی — ایک آواز "یہ دستورِ خداوندی ہے"

۷۵ ھ ۱۳

حفیظ ہوشیارپوری

الخطبات الاحمدیہ علیٰ ملت الاسلام تالیف و ترجمہ کیں ۔ تبیین الکلام ۱۸۶۱ء میں لکھی جس کا تصنیفی مقصد یہ تھا کہ عیسائیوں اور مسلمانوں کے تعصبات دور ہوں اور ان میں اصولی مطابقت دکھائی جائے۔ اسی مقصد سے انہوں نے عبرانی بھی پڑھی ۔ یہ بالکل ایک جدید تصنیف تھی۔ اب تک کسی عالم نے اس موضوع پر قلم نہیں اٹھایا تھا۔ انہوں نے اپنے دعووں کے اثبات میں عیسائیوں کے مسلمہ مسائل پیش کئے۔ یہ کتاب یورپ کے مستشرقین میں مقبول ہوئی۔ اس کتاب کے لئے سرسید نے کئی ہزار کا ایک ٹائپ پریس خریدا اور اردو، انگریزی اور عبرانی حروف بھی منگائے ؛

سرسید جو کچھ لکھتے تھے، انگریزی ترجمہ ساتھ ساتھ ہوتا تھا۔ ایک کالم میں عبرانی توریت کی عبارت عبری حروف اور اس کا اردو و انگریزی ترجمہ اس کے نیچے ٹائپ میں ہوتا۔ اسی طرح دوسرے کالم میں اسی مضمون میں کوئی آیتِ قرآنی یا حدیث اردو، انگریزی میں مع تفسیر ہوتی ؛

فرنچ مستشرق گارسن دتاسی نے ۱۸۶۳ء میں اپنے لکچر میں اس کتاب پر سرسید کی معلومات و قابلیت کی پوری پوری ستائش کی تھی اور اس تعجب کا اظہار کیا تھا کہ یورپ کی تصانیف تک ان کو کس طرح رسائی ہوئی۔ یہ کتاب درحقیقت وسیع علم کا نتیجہ ہے ؛

اسی طرح دورِ اوّل میں تاریخ کا بھی بڑا حصہ ہے :۔

(۱) جامِ جم: امیر تیمور سے بہادر شاہ تک کے مختصر حالات، ۱۷ خانوں کی جدول میں ؛

(۲) سلسلۃ الملوک: دہلی کے راجاؤں، بادشاہوں کی فہرست اور مختصر تاریخ ہے ؛

(۳) آثار الصنادید: اس زمانہ کی معرکۃ الآرا کتاب جس میں عمارات کے نقشے، اُن کا جغرافیہ، طول و عرض وغیرہ ہے۔ ایک باب میں بہ تقسیم عنوانات "۱۱ مشاہیر جو اس زمانہ میں تھے" کا حال ہے جس میں علماء، شعراء، صوفیا و مشائخ، مجاذیب وغیرہ ہیں، مگر دوسرے اڈیشن میں ترمیم ہے اور اسی مرتمہ نسخہ کو ایک فرانسیسی مستشرق، گارساں دتاسی نے فرنچ میں ترجمہ کر کے فرانس میں شائع کیا ؛

(۴) آئینِ اکبری: یہ ایک بڑی مشہور کتاب ہے۔ انگریزی میں بھی اس کا ترجمہ ہو چکا تھا، لیکن اس میں بہت سی غلطیاں تھیں اور بہت سی جگہ ایک قسم کا خلا تھا، اس کی تصحیح کی اور خلا کو معمور کیا ؛

(۵) تاریخ فیروز شاہی: اس کی صحت کر کے اس پر ایک تاریخی دیباچہ مع ذکرِ مؤلف لکھا۔ یہ نسخہ مصححہ ۱۸۶۲ء میں ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے شائع کیا ؛

(۶) سیرتِ فریدیہ: اپنے نانا خواجہ فرید[1] کی سیرت

(۷) رسالہ قدیم نظامِ دیہی ہندوستان ؛

(۸) رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند: اس دور کی تصانیف میں ایک ایسی جرأت مندانہ کتاب ہے جو خدا نے سرسید کے ہی لئے مخصوص کی تھی ؛

ریاضی میں تسہیل فی جر الثقیل عربی سے ترجمہ ہے۔ دوسرا ترجمہ فوائد الافکار فی اعمال الفرجار ہے۔ اس میں خود مثالوں کا اضافہ کیا ہے ؛

ایک رسالہ قولِ متین در ابطالِ حرکت زمین تصنیف کیا ؛

دوسرے دور میں مذہب کے موضوع پر متعدد رسائل ہیں :۔

(۱) رسالہ تحقیق لفظ نصاریٰ[2] (۲) رسالہ طعام اہلِ کتاب (۳) النظر فی بعض مسائل امام الغزالی (۴) رسالہ ابطالِ غلامی (۵) ترقیم فی قصہ اصحاب الکہف والرقیم (۶) ازالۃ الغین عن ذی القرنین (۷) تحریر فی اصول التفسیر (۸) تفسیر السمٰوات (۹) الدعا والاستجابت (۱۰) تفسیر القرآن (۱۲) خطباتِ احمدیہ اور (۱۱) ازواجِ مطہرات مستقل کتابیں ہیں، لیکن تفسیر مکمل نہ ہو سکی ؛

خطباتِ احمدیہ کا انگریزی ترجمہ بھی ہوا۔ یہ کتاب لندن کے قیام کے زمانہ میں لکھی اور سر ولیم میور، لفٹننٹ گورنر کی کتاب "لائف آف محمدؐ" کا گویا جواب ہے ؛

ازواجِ مطہرات بھی مکمل نہیں۔ رحلت سے دس یوم پہلے تک اس کے لکھنے میں مصروف تھے۔ پھر قلم پکڑنے کی طاقت جب سلب ہو گئی تو مجبور ہو گئے ؛

---

[1] خواجہ فرید ایک متبحر عالم اور علم ریاضی کے فاضل تھے۔ انہوں نے قلعہ اور کمپنی کی حکومت میں بڑے بڑے مناصب و اعزاز حاصل کئے۔ اکبر شاہ ثانی نے "دبیر الدولہ امین الملک مصلح جنگ" کا خطاب دیا تھا ؛

[2] رسالہ تحقیق لفظ نصاریٰ، کے لکھنے کی وجہ یہ تھی کہ کسی مسلمان نے انگریزوں کی نسبت یہ لفظ لکھا تھا۔ اس کو تحقیر و ذلت کے مرادف سمجھا گیا اور اس کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ سرسید نے ثابت کیا کہ یہ لفظ عزت احترام کا ہے۔ اسی طرح انگریزوں کے ساتھ خورد و نوش کو بروئے مذہب جائز ثابت کرنے کی ضرورت تھی، اس غرض سے رسالہ "حلتِ طعام اہلِ کتاب" تالیف کیا۔ باقی رسائل علمی ہیں ؛

ہومیو پیتھک طریق علاج پر بھی ایک رسالہ لکھا ایک رسالہ ہندوستانی طریقۂ تعلیم پر تنقید ہے۔ یہ انگریزی میں بمقام لندن شائع ہوا۔

تفسیر القرآن کی ۶ جلدوں میں ۱۶ سورتوں کی تفسیر ہے۔ باقی سورتوں کی تفسیر بعض مجبوریوں کے سبب سے نہ لکھ سکے، تاہم قرآن مجید کے مقامات مشکلہ کی توضیح اور ان شکوک کے جواب بعض معترضین اسلام نے کرتے تھے، رد میں چند چھوٹے چھوٹے رسائل نے کچھ کمی پوری کی۔ ان مذہبی تصانیف و تالیفات کا ایک مجموعہ بھی تصانیف احمدیہ کے نام سے شائع کیا اور اول دور کی کتابوں پر خود ایک تبصرہ بھی لکھا جو ایک جدت و ندرت تھی۔

خطبات: خطبات احمدیہ جس جذبہ و جوش اور محنت و انہماک سے لکھی، اس کا کچھ اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے جو نواب محسن الملک کے نام لندن سے لکھے تھے۔ یہ کتاب سرسید کا ایک زبردست کارنامہ ہے اور کتب سیرت میں اس کو زبردست شرف حاصل ہے۔ بقول مولوی عبدالماجد دریا بادی خطبات احمدیہ کو شرف اولیت ہی حاصل نہیں، اس کے جو دلائل و شواہد فرنگیوں کے مقابلہ میں اثبات رسالت میں پیش کر دئے تھے خصوصاً بشارات توریت و انجیل کے ذیل میں، ان پر اضافہ آج تک شاید ہی کچھ ہو سکا ہو۔

۱۸۸۰ء میں سرسید نے اپنی مذہبی تالیفات و تصانیف کا، جو اس وقت تھیں، ایک مجموعہ تصانیف احمدیہ کے نام سے مرتب کیا۔ اولاً ایک تمہید لکھی، پھر ہر کتاب پر ریویو کیا۔ یہ گویا مصنف کی زبان سے اپنے خیالات کے انقلاب اور ارتقائے فکر و ادب کی دلچسپ داستان ہے۔

۱۸۹۰ء میں ایک عیسائی احمد شاہ شائق نے بعنوان "امہات المومنین" ایک کتاب شائع کی، جو بدتہذیبی اور دریدہ دہنی کی ایک دل آزار اور بدترین مثال تھی۔ سرسید نے اس کے جواب میں رسالہ "ازواج مطہرات" لکھا۔ اول عام اعتراضوں کا جواب ہے۔ پھر ازواج مطہرات کا تاریخی حال ہے لیکن وہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ، حضرت سودہ، حضرت زینب بنت جحش، حضرت حفصہ، حضرت ام حبیبہ، حضرت ام سلمہ اور ام المساکین حضرت زینب کے ہی متعلق لکھنے پائے تھے کہ پیغام اجل آگیا۔

اسباب بغاوت ہند

رسالہ "اسباب بغاوت ہند" کا لکھنا حقیقتاً ایک بڑا جرأت کا کام تھا، جو خداداد جرأت و علمی نے سرسید کے لئے ہی مخصوص کیا تھا۔ اس زمانہ میں تمام انگریزی اخبارات اور مستقل و غیر مستقل رسائل میں مسلمانوں پر ہی بغاوت کا الزام قائم کیا جاتا تھا اور وہ ہی انتقامی تیروں کا نشانہ تھے۔ سرسید نے تمام خطرات کو نظرانداز کر کے اور باوجود سرکاری ملازم ہونے کے اسباب بغاوت پر روشنی ڈالی، اس میں پوری ذمہ داری حکومت پر آتی تھی۔ ہندوستانیوں کا مجلس واضع قوانین میں، جو ۱۸۳۳ء میں قائم تھی، شریک نہ کیا جانا، مذہبی مباحثوں میں حکام کا شریک ہونا اور مشنری طریقے پر تنا، مشنریوں کے دل آزار مواعظ، مشنری مدرسوں کا بہ کثرت اجرا، ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم کے طریقوں کی خرابی ایسے قوانین کا اجرا جو اہل ہند کی عادات کے مناسب نہ تھے، عام افلاس جو حکومت کی معاشی پالیسی کا نتیجہ تھا، انگریزوں کی ہندوستانیوں سے بیگانگی، سخت مزاجی، بدزبانی، فوجی نظام کی غلطیاں اور بدانتظامی ان سب امور کو بہ تفصیل و دلائل و شواہد ظاہر کیا۔

اس رسالہ کو اکثر حکام نے باغیانہ تصور کیا، لیکن چند ممتاز انگریزوں نے اس کی تائید کی اور مخلصانہ بتایا۔ انگریزی پارلیمنٹ میں بھی اس پر بحث ہوئی چنانچہ ۱۸۶۱ء میں ہی اصلاحات شروع ہو گئیں اور گورنر جنرل کی کونسل میں ہندوستانی بھی شامل ہوئے۔

۱۸۶۰ء میں جبکہ ہر طرف سے مسلمان قوم و مذہب کے اعتبار سے نشانۂ بغاوت تھے، سرسید نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اگر قومیت و مذہب وجہ بغاوت ہوتی تو کوئی مسلمان حکومت کا وفادار نہ ہوتا، ایک رسالہ "لائل محمڈنز آف انڈیا" جاری کیا۔ اس میں ان مسلمانوں کا حال شائع ہوتا تھا جنہوں نے حکومت کی وفاداری کی تھی۔

ایک رسالہ سرولیم ہنٹر کی ایک زہریلی کتاب کے جواب میں لکھا۔ سرولیم نے ثابت کیا تھا کہ مسلمان حکومت انگریزی کے از روئے مذہب وفادار نہیں ہو سکتے۔ یہ کتاب ایسے وقت میں شائع ہوئی تھی جبکہ ایک طرف سرحدی خطرہ نمودار تھا، دوسری طرف انڈمان اور کلکتہ میں گورنر جنرل اور ایک جج (ایکٹنگ چیف جسٹس) کو دو مسلمانوں نے قتل کر دیا تھا۔ سرولیم نے وہابی فرقہ کو بڑا ہدف بنایا تھا، مگر سرسید کے جواب سے یہ زہر پورا اثر نہ کر سکا۔

ایک علمی سوسائٹی

۱۸۶۴ء میں سرسید نے ایک علمی ادارہ سائنٹیفک سوسائٹی کے نام سے قائم کیا تھا جس کی تاسیس تو گورکھپور میں ہوئی، لیکن بعد کو وہ علی گڑھ منتقل ہو گیا۔ یہاں اس کی عالیشان عمارت تعمیر ہوئی جس کے ساتھ وسیع باغ اور زراعتی تجربات کے لئے خاصا رقبہ بھی تھا۔ اس میں ہر قوم اور ہر فرقہ کے قابل اصحاب ممبر ہوتے تھے۔ لٹریری اور علمی کتابوں کے ترجمے کی اردو میں اشاعت ہوتی تھی۔ اس کا اپنا پریس بھی تھا۔ مقاصد کی اشاعت کے لئے ۱۸۶۶ء سے ایک اخبار انسٹیٹیوٹ

گزٹ کے نام سے بھی شائع کیا جاتا تھا، جس کے مدیر خود سرسید تھے۔ اس طرح آخر تک صحافت کا رشتہ قائم رہا۔ علمی مضامین پر لیکچر بھی دئے جاتے تھے۔ سرسید عموماً قانون پر لیکچر دیتے اور زراعتی تجربات بھی کرتے تھے۔ انہوں نے تخم ریزی کے لئے ایک شیشہ کی نلکی بھی ایجاد کی تھی۔

۱۸۶۷ء میں اس ادارہ کی جانب سے ایک ورنیکلر یونیورسٹی کے قیام پر حکومت کو بذریعہ عرضداشت متوجہ کیا گیا۔

اس سوسائٹی کے نمونہ پر بعض مقامات پر اور سوسائٹیاں بھی قائم ہوئیں اور ملک میں ایک خاص شوق مغربی ادب و علم کو اردو میں منتقل کرنے کا پیدا ہو گیا۔

تہذیب الاخلاق: "معاشرتی، تہذیبی، اخلاقی اور علمی و ادبی اصلاح" کے لئے ۱۸۷۰ء سے رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔ خود سرسید ادارتی فرائض انجام دیتے تھے۔ اگرچہ اس کے مضمون نگاروں میں متعدد بڑے بڑے قابل اصحاب — مولوی سید مہدی علی خاں محسن الملک، مولوی مشتاق حسین وقار الملک، مولوی چراغ علی اعظم یار جنگ، سید محمود وغیرہ تھے، مگر سرسید کے مضامین سب سے زیادہ تھے۔ چنانچہ کم و بیش سات سال میں منجملہ ۲۲۶ کے ۱۱۲ مضامین سرسید نے لکھے تھے۔ یہ رسالہ ۱۸۷۶ء میں بند ہو گیا، پھر تین سال بعد جاری ہوا، مگر ڈھائی سال بعد بند ہو گیا۔ اس کے متعلق سرسید نے یہ معذرت کی کہ چونکہ دیگر اسلامی بہی خواہی کے کاموں سے مجھے فرصت نہیں ملتی، اس لئے بند کیا جاتا ہے۔ بہرحال "تہذیب الاخلاق" نے بہت بڑا ذہنی انقلاب پیدا کیا اور صحیح تہذیب کا مفہوم ذہن نشین کیا، ساتھ ہی اردو لٹریچر کا قالب ہی تبدیل کر دیا۔ تعلیم کی ضرورت کا عام احساس ہو گیا۔ سرسید کے یہ مضامین کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے ہیں۔ اوّل مرتبہ بند ہونے پر سرسید نے لکھا تھا کہ:

"سات سال تک ہم نے بذریعہ اس پرچہ کے اپنی قوم کی خدمت کی۔ مذہبی بے جا جوش سے جس تاریک گڑھے میں پڑی تھی اس سے خبردار کیا۔ دنیاوی باتوں میں جن تاریک خیالات کے اندھیرے میں وہ مبتلا تھی ان میں اس کو روشنی دکھائی۔ اردو زبان کا علم جو بد خیالات اور موٹے اور بھدے الفاظ کا مجمع ہو رہا تھا اس میں جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اصلاح چاہی۔ قومی ہمدردی، قومی عزت، سیلف آنر یعنی آپ عزت کا خیال اگرچہ ہم نے اپنی قوم میں پیدا نہیں کیا تو ان لفظوں کو تو ضرور اردو زبان کے علم و ادب میں داخل کیا۔ ہم نے کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو مگر ہر طرف سے تہذیب و شائستگی کا غلغلہ سننا، قومی ہمدردی کی صداؤں کا ہمارے کانوں میں آنا، اردو زبان کے علم و ادب کا ترقی پانا، یہی ہماری مرادیں تھیں۔ اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے بہت سے ایسے دوست ہیں جو اس پرچہ کے بند ہونے سے نہایت ہی شکستہ خاطر ہوں گے، مگر ہم ان سے معذرت کرتے ہیں اور اب اس پرچہ کو ان سے رخصت کرتے ہیں اور وہ دن بھی [illegible] ہے کہ ہم خود بھی ان سے رخصت ہوں گے۔"

خطوط: زمانہ قدیم سے اپنے اپنے وقت کے مشاہیر و اکابر کے ملفوظات و مکتوبات جمع کرنے کا ایک خاص شوق دنیا میں رہا ہے۔ اسی ذیل میں بادشاہوں کے فرامین بھی ہیں۔ ان سے اکثر اہم تاریخی واقعات پر اور کاتب خط کے نجی حالات اور سیرت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اردو میں اس کا سلسلہ غالب کے خطوط سے شروع ہوا۔

سرسید کے خطوط ان کی رحلت کے بعد رسالہ "معارف" علی گڑھ میں شائع ہوئے، لیکن ان کی تعداد بہت کم تھی۔ پھر ۱۹۲۴ء میں سر راس مسعود نے بڑی کوشش سے خطوط جمع کر کے ان کا مجموعہ شائع کیا۔ ان خطوط میں طرز تحریر کا سانچہ بھی نیا ہے اور تنوع کے لحاظ سے وہ ایک نادر نمونہ اور ادبی لحاظ سے نہایت بلند پایہ ہیں۔ ان میں بعض خاص دوستوں کے نام کے خطوط ہیں۔ بعض موقعہ پر جو شعر لکھ دیا ہے وہ گویا انگوٹھی میں نگینہ معلوم ہوتا ہے۔ بعض لوگ ان کے پاس از نام یا گمنام دل آزار خطوط بھی بھیجتے رہتے تھے۔ ایک گمنام خط موصول ہونے پر "انسٹی ٹیوٹ گزٹ" میں لکھا کہ:-

"ہمارے پاس ایک خط جس کے لفافہ پر الہ آباد کی مہر تھی بذریعہ ڈاک پہونچا۔ جب ہم نے کھولا تو اس میں ایک پرچہ پر یہ شعر لکھا ہوا تھا ؎

یگہ زند بر دل و جاں گاہ خورد بر ایماں
مار زلفِ تو ندانم کہ چہ در سر دارد"

چونکہ ہم اس دوست کے نام و نشان سے واقف نہیں ہیں اس لئے اخبار میں اس کا جواب چھاپے دیتے ہیں ؎

"نہ نہد گوش بر افسانۂ من ہیچ گہے
یار ہیچ ندانم کہ چہ در سر دارد"

فارسی کا ادبی مذاق: باوجودیکہ سرسید اردو کی ترقی اور اس کو ادب کی رفعت پر پہونچانے میں ساعی و

سرگرم تھے، لیکن فارسی ادب کا بھی پورا مذاق تھا اور خطوں میں اکثر فارسی اشعار بھی لکھتے تھے۔ بعض خطوط فارسی میں بھی لکھے ہیں۔ مثلاً ایک خط مولوی مہدی علی خاں (نواب محسن الملک) کو لکھتے ہیں کہ:-

مخدومی و محبوب من سلامت تسلیم نہ صرف تسلیم بلکہ دل و جان تسلیم

نامۂ محبت مورخہ ۱۸ جولائی یافتم مسرتے کہ برآں پذیرفتم پایاں نے

ندارد۔ اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی، اشعار آبدار

آں محبت نامہ بجانم خلید مگر ایں اتحاد روحانی و جسمانی را باید نگریست

کہ احمد و مہدی دریک بحر و مضمون گنجیدہ اند ع

لہ مشتاقِ جمال است ایں احمد شیدا ہم۔ در مصرع اوّل کہ خطاب

بمن فرمودہ اند اگر بجائے لفظ دیدارت احوالت بودے مناسب

حال من بودے ؎ آنکہ بہ احوالت خلقے است تماشائی،

وہٰذا ہو الحق، ـــــ آنم کہ بہ احوالم خلقے است تماشائی

اگر غم است ہمیں است کہ نمی دانم، خدائے من تماشائے

کدام احوال من می کند۔ ہو الغفور الرحیم۔

گناہ من ار نامدے در شمار ترا نام کے بودے آمرزگار

یہ ذوق اتنا تھا کہ ان کے زمانہ کی کالج کی عمارتوں پر جس قدر کتبات ہیں، وہ سب فارسی ہیں اور انہی کے افکار طبع ہیں۔

تاریخی جمل سے دلچسپی:-

مادۂ تاریخ نکالنے سے بھی ان کو دلچسپی تھی۔ کالج کی بعض عمارتوں کے انہوں نے خود مادے نکالے جیسے:

(۱) بنائے یادگار برکت علی خاں بہادر ۱۸۹۴ء

(۲) ای بشر قد بنا ہا اخوان الصفا و الوداد ۱۲۹۲ھ

شاعری:-

سر سید باقاعدہ یا پیشہ ور شاعر نہ تھے، لیکن شعر گوئی ان کی فطرت میں تھی۔ مصنف حیاتِ جاوید نے بڑی کوشش سے ان کا صرف ایک شعر اردو کا حاصل کیا ؎

ہزار حیف کہ عمر اپنی مفت صرف ہوئی
نہ کچھ خدا کی عبادت کی نے بتوں کی چاہ

انہوں نے تخلص بھی آہی لکھا ہے، مگر فارسی میں ان کے ایسے متعدد اشعار ہیں، جن کو انہوں نے "ہمارا شعر" کہہ کر لکھا ہے۔ مثلاً کالج کی ایک رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ:-

"کوئی زمانہ ایسا نہیں ہوتا کہ ہم اپنے دوستوں سے کالج کے کسی نہ کسی فنڈ کے لئے چندہ نہ مانگتے رہتے ہوں، مگر ہمارے دوست بھی ہمارے شعر کو کبھی کبھی پڑھ لیا کریں ؎

در مکرر زلبت بوسہ گرفتیم مرنج
سرخیِ لعل لبت بیں کہ چہ زیبا گشتہ است"

ان کے مزار پر ایک کتبہ نصب ہے اور اس پر ان کا یہ شعر کندہ ہے ؎

تاب یک جلوہ نیاورد نہ موسیٰ و نہ طور
ایں دلم ہست کہ زیں گونہ ہزاراں دیدہ است

دو انگریزوں کا بیان

بعض انگریز، خصوصاً حکامِ ضلع، جن کو علمی ذوق ہوتا عموماً سر سید کی خدمت میں آتے رہتے۔ ان میں جو زیادہ بلند خیال ہوتے، ان کو ایک قسم کی عقیدت ہو جاتی اور سر سید کے مقاصد تعلیم و علمی کے معاون بن جاتے۔ ایسے ہی انگریزوں میں ایک مسٹر کینیڈی تھے۔ انہوں نے سر سید کی وفات پر ایک بڑا مضمون لکھا تھا۔ اس میں ایک موقع پر لکھا ہے:-

"۱۸۸۷ء میں سر سید کالج کے قریب ایک اینگلو انڈین بنگلہ میں رہتے تھے۔ مجھے مرکزی کمرہ میں لے جایا گیا جو شاندار بھی تھا اور اس میں اندھیرا بھی تھا اور یورپین طرز پر سجایا گیا تھا۔ فوراً ہی سر سید داخل ہوئے، ان کا لباس مشرقی تھا۔ وہ ایک معمر آدمی تھے، جن کا قد میانہ تھا اور جسم دوہرا، لیکن مطالعہ اور عمر کے سبب ان کی کمر کچھ خمیدہ تھی۔ ان کا سر بہت بھاری تھا، چہرہ زرد تھا اور سر اور داڑھی کے بال سفید تھے اور ان کی آواز خاص طور سے شیریں اور نمایاں تھی۔ پہلی نظر میں ان کی بہت بڑی خصوصیات اخلاق اور شان معلوم ہوتی تھیں۔ بعد ازاں برسوں میرا ان سے بہت تعلق رہا اور مجھے اکثر ان کو مختلف حیثیتوں میں دیکھنے کا موقع ملا۔ سرکاری مواقع پر جب وہ اسمبلی میں تقریر کرتے، وائسراؤں اور لفٹنٹ گورنروں کی مہمان نوازی کرتے یا کالج کے جلسوں میں صدارت کرتے اور پرائیویٹ زندگی میں اپنی میز پر کام کرتے ہوتے یا اپنے مطالعہ میں مصروف ہوتے، ان تمام مواقع پر ان کی شخصیت میں کوئی تغیر نہ واقع ہوتا۔ وہ ہر موقع پر عقلمند، بیانہ رو

لہ شاید یہ مصرع اس طرح ہے:-

مشتاقِ جمالِ تست ایں احمد شیدا ہم یا مشتاقِ جمالت ہست ایں احمد شیدا ہم (مدیر)

بے باک، صاف گو، اور مستقل مزاج رہتے، لیکن میں ان سے اس وقت زیادہ محبت کرتا تھا جب وہ تنہا ہوتے۔ بعض اوقات میری ان سے ملاقات کالج میں ان کی صبح کی معروفیات کے دوران میں ہوتی، جبکہ وہ اپنے اسٹاف پر سایہ کی طرح چھائے ہوتے یا اینٹوں کے کام کرنے والے مستریوں کی نگہداشت کرتے۔ چونکہ بڑی حد تک اپنے کالج کے معمار اور تعمیر کرنے والے بھی تھے۔ یا میں ان کو مطالعہ کے کمرہ میں کتابوں پر جھکا ہوا دیکھتا۔

ایک شام میرے حافظہ میں بہت تازہ ہے، جبکہ میں غروب آفتاب کے بعد سر سید سے ملنے گیا۔ وہ آرام کرسی پر ایک چھوٹے سے کمرہ میں، جو ان کا مطالعہ کا کمرہ تھا، بیٹھے تھے۔ سامنے میز پر لیمپ جل رہا تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور سامنے باغ اور رات کا منظر تھا اور ایک ملازم سفید چادر اوڑھے برآمدہ کے سائے میں سو رہا تھا اور اندر ان کے بھاری سر اور ڈاڑھی پر روشنی پڑ رہی تھی اور وہ عربی فلسفہ کی ایک ضخیم کتاب پر جھکے ہوئے تھے۔ انہوں نے قلم رکھتے ہوئے مجھ سے کہا کہ میں غروب آفتاب کے بعد اس دنیا سے دور ہو کر صدیوں پہلے کے عظیم دماغوں کے ساتھ وقت گذارتا ہوں۔ اس زمانہ میں وہ ایک عرب فلسفی پر تنقید کر رہے تھے۔

دوسرے انگریز کرنل گراہم تھے۔ انہوں نے سر سید کی زندگی میں ہی ان کی لائف لکھی تھی۔ اس میں ایک موقع پر لکھا ہے کہ:۔

"سر سید اب کئی سال سے علی گڈھ میں اپنے آرام دہ مکان میں رہتے ہیں۔ یہ مکان ان کے لئے ان کے بیٹے سید محمود نے خریدا اور اس کو یورپین طرز پر سجایا ہے۔ یہاں پر وہ اپنے بے شمار دوستوں کی خاطر مدارات کرتے ہیں، جن میں مسلمان، سکھ، ہندو اور انگریز سب شامل ہیں اور جو ہندوستان کے ہر حصہ سے ان کے پاس آتے ہیں۔ اس گھر کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں اور اس پر لٹریری ماحول چھایا ہوا ہے۔ ان کے بیٹھنے کے کمرہ میں، جہاں وہ اپنا ان کا زیادہ حصہ گذارتے ہیں، ایک میز ہے، جس پر کتابیں اور کاغذات بکھرے ہوئے ہیں اور ان کے کھانے کے کمرہ میں دیواروں کے ساتھ ساتھ کتابوں کی الماریاں لگی ہوئی ہیں، جن میں معیاری انگریزی کتابیں ہیں۔ ان کی ایک لائبریری بھی ہے، جس کا کمرہ بہت شاندار ہے۔ اس میں انواع و اقسام کی

(باقی صفحہ ۵۸ پر)

طرز یگانہ

میرزا یاس یگانہ چنگیزی (مرحوم)

نغمہ بھی کوئی وجد میں لاتا نہیں اب
کیسا ہی مزہ ہو دل کو بھاتا نہیں اب
آغاز وہ تھا حسن کا انجام ہے یہ
پیاری صورت پہ پیار آتا نہیں اب

ہر گام پہ تازہ گل کھلاتے چلئے
ہر روز کوئی فتنہ اٹھاتے چلئے
فطرت کے ساتھ ساتھ چلنا ہے اگر
ہر وقت بگاڑتے بناتے چلئے

پستی سے بلندی پہ جو چڑھتا جائے
ہر خطرہ پہ لاحول ہی پڑھتا جائے
ایسے کو سہارا نہ ملے کیا معنی
گرتا پڑتا جو آگے بڑھتا جائے

مردانِ عمل کو رجز کی پروا کیا
خود ذوقِ عمل رجز ہے اندیشہ کیا
دنیا میری بلا سے خوش ہو کہ نہ ہو
میں اپنے سے خوش ہوں تو غم دنیا کیا

غزل

سیماب اکبرآبادی (مرحوم)

اتفاقاتِ نظر تھے کہ اُدھر سے گزرے
آہ! وہ چند مناظر جو نظر سے گزرے

آدمی، اور قیودِ تن و سر سے گزرے
کیا فرشتے تھے جو اس راہ گزر سے گزرے

مختلف راستوں کا مرکز و مرجع تو تھا
تیری ہی راہ تھی جس راہ گزر سے گزرے

بحرِ غم تا کمر آیا بھی تو کیا خاک آیا
آبرو ہے اُسی پانی کی جو سر سے گزرے

اے زہے عالمِ یک رنگ شبستانِ لحد
آج ہم مرحلۂ شام و سحر سے گزرے

تنگ و محدود ہے پروازگہہِ فکر و نظر
جس پہ سب بند ہوں رستے وہ کدھر سے گزرے

میرے صحرائے جنوں میں نہیں ایسا کوئی خار
جو کفِ پا میں چُبھے اور نہ سر سے گزرے

کسی انسان کی تحقیر کرے کیوں انساں
اپنا عالم اگر اپنی ہی نظر سے گزرے

کوئی افسانہ ہو، بن جائیگا افسانۂ دل
شرط یہ ہے کہ محبّت کی نظر سے گزرے

ساری دنیا سے بہت دُور ترا گھر نکلا
ساری دُنیا سے گزر کر ترے در سے گزرے

کر دیا سب کو بلندیٔ نظر نے نظری
جتنے جلوے نگہہِ سیر نگر سے گزرے

تھا کہاں وقت کہ ہستی کے فسانے پڑھتے
صرف عنوان ہی عنوان نظر سے گزرے

سعیِ پرواز، کچھ اس ڈھب سے کیا مجھ کو اسیر
کہ ہوا تک بھی نہ ہو کر کسی پر سے گزرے

اپنی رُودادِ محبّت پہ نگاہِ تنقید
نہیں معلوم یہ کس کس کی نظر سے گزرے

نالۂ شبگیر کیا تو نے تو کیا مارا تیر
نالہ وہ ہے جو گریبانِ سحر سے گزرے

منزل اُس کی ہے جو منزل سے رہے مستغنی
طلب اُسکی ہے جو بچ کر ترے در سے گزرے

یہ مرا گفتۂ بے کیف و پریشاں سیماب
کاش اُن کی نظرِ کیف اثر سے گزرے

ماہِ نو، کراچی، مارچ ۱۹۵۶ء

افسانہ

آپ بیتی

غلام عباس

میری جیب میں جو تھوڑے سے پیسے رہ گئے تھے وہ سر شام ہی میں نے کافی ہاؤس کی نذر کر دئے تھے۔ مجھے اُمید تھی کہ کافی پی کر میرے قویٰ کو تقویت پہونچے گی میرے تخیل میں جنبش پیدا ہوگی۔ مگر ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔ میں کافی کا ایسا عادی ہوگیا تھا کہ اس کا پینا اب مجھ پر کوئی اثر نہیں کرتا تھا۔

اُس زمانے میں روٹی کی بھوک تو مجھے رہتی ہی تھی مگر ساتھ ہی مَیں شہرت کا بھی بھوکا تھا۔ مَیں دنیا میں جلد نام پیدا کرنا چاہتا تھا۔ میرا آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ نہ کوئی یار تھا نہ مددگار۔ ہاں ایک رسالے کا اڈیٹر جو ایک موٹا، زرد رو خاموش سا آدمی تھا جب کبھی اس کے پاس رسالے میں چھاپنے کے لئے کوئی بہتر چیز نہ ہوتی تو وہ میری کہانی خرید لیا کرتا۔ وہ مجھے دس روپے فی کہانی دیا کرتا۔ اور اس بات کا مطلق خیال نہ کرتا کہ کہانی کتنی لمبی یا کس پایہ کی ہے۔

جس شام کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ جنوری کی ایک شام تھی۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ ساتھ ہی تند و تیز جھکڑ بھی چل رہا تھا۔ میں معمول سے کچھ دیر پہلے ہی کافی ہاؤس پہونچ گیا تھا۔ میں نے کافی کی پیالی کو بہت دھیرے دھیرے ختم کیا تھا۔ اس دوران میں میرا ذہن سخت جدوجہد کرتا رہا تھا کہ کوئی انوکھی بات مجھے سوجھ جائے، جس پر میں اپنی کہانی کا تانا بانا تیار کر سکوں۔ اس رات میرے لئے ایک کہانی لکھنا اشد ضروری تھا، تاکہ مَیں صبح اُسے اڈیٹر کے حوالے کر کے دو تین روز کے لئے پیٹ بھرنے کا سامان کر سکوں۔ اگر میں اس میں کامیاب نہ ہوا تو نوبت فاقوں تک پہونچ جائے گی۔ یہی وجہ تھی کہ میرا ذہن کہانی سوچنے کی انتہائی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا تھا۔ اس شام میرے تخیلہ نے میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

میں پورے دو گھنٹے اپنے سامنے کورے کاغذوں کا پیڈ رکھے یونہی گذار چکا تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا، میرا اضطراب بڑھتا جاتا تھا۔ میرا ذہن خالی تھا۔ میرا تخیل پراگندہ اور دماغ مضمحل آخر کار تھک کر میں نے لکھنے لکھانے کا خیال ہی چھوڑ دیا۔ اور جو چند آنے میری جیب میں تھے اُن سے کافی کا بل چکا کر باہر نکل آیا۔ کافی ہاؤس سے نکلتے ہی اچانک ایک فقرہ میرے ذہن میں اُبھرا۔ یہ فقرہ میں نے دو تین مرتبہ کسی تنقیدی مضمون کے سلسلے میں پڑھا تھا لیکن تنقید نگار کا نام یاد نہیں آرہا تھا۔ فقرہ یہ تھا۔

"اگر کوئی آدمی خواہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو، اپنی زندگی کے واقعات بلا کم و کاست قلبند کر دے تو وہ ایک عظیم ناول بن سکتا ہے، جس کا افسانوی ادب میں جواب نہ ہو۔"

کوئی دس منٹ تک میں اس فقرے پر غور کرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ میرے ذہن پر نقش ہوگیا۔ میں گھر کی طرف جا رہا تھا۔ چلتا جاتا تھا، اور سوچتا جاتا تھا۔ جیسے ہی میں گھر کے قریب پہنچا یکبارگی میرے قدم رُک گئے۔ ایک بات میرے ذہن میں آئی۔ میں نے دل میں کہا:

"کیوں نہ تم خود ہی اس نسخے کو آزماؤ۔ اور آج رات سب سے پہلے جس آدمی سے بھی، خواہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو، تمہاری مڈبھیڑ ہو، اسکی منت خوشامد کر کے اس کی آپ بیتی معلوم کرو اور پھر خود ہی اسے لکھ ڈالو۔"

اس تجویز پر مَیں دل ہی دل میں بہت خوش ہوا۔ یہ تجویز تھی تو انوکھی سی مگر ساتھ ہی کچھ ایسی آسان معلوم ہوئی کہ میں نے فوراً اس پر عمل کرنے کی ٹھان لی۔

آپ شاید پوچھیں کہ میں نے اپنی آپ بیتی سے یہ فائدہ کیوں نہ

اٹھایا تو میں عرض کروں گا کہ میں اپنے واقعاتِ زندگی کو پہلے ہی اتنی مرتبہ لکھ چکا تھا کہ اب ان میں کوئی بات لکھنے کے قابل رہ ہی نہیں گئی تھی چنانچہ میرے لئے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ میں کسی اور شخص کو، کسی انجانے شخص کو تلاش کروں اور اس کی آپ بیتی کو کام میں لاؤں۔

میں نے تلاش شروع کر دی۔ میں گھر نہ گیا۔ بلکہ شہر کے ایک ایسے حصے کا رُخ کیا۔ جو نسبتاً بارونق تھا اور جہاں اتنی رات گزر جانے پر بھی تند و تیز جھکڑ چلنے پر بھی امید ہو سکتی تھی، کہ کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ مل ہی جائے گا۔

میں اپنے چاروں طرف دیکھتا بھالتا تیز تیز قدم اٹھاتا چلا جا رہا تھا ابھی تک کسی شخص سے میری مڈبھیڑ نہیں ہوئی تھی۔ آخر میں ایک چوراہے پر پہونچ کر رک گیا۔ اور بجلی کے ایک کھمبے سے ذرا ہٹ کر ایک رہزن کی طرح اپنے شکار کا انتظار کرنے لگا۔

سب سے پہلے جو شخص اس کھمبے کے پاس سے گزرا وہ ادھیڑ عمر کا تھا اس نے میلے کچیلے کپڑے پہن رکھے تھے۔ چہرے پر جھریاں تھیں، جو بڑھاپے نے وقت سے پہلے ہی ڈال دی تھیں۔ میں نے دل میں کہا اس سے کیا پوچھوں۔ اس کی داستانِ حیات تو اس کے چہرے ہی پر صاف لکھی ہے۔ میں نے اس سے کچھ تعرض نہ کیا اور وہ اپنی راہ چلا گیا۔ اس کے بعد ایک نوجوان گزرا۔ وہ ایک لمبا کوٹ پہنے تھا قمیص کا گریبان کھلا ہوا، ڈاڑھی بڑھی ہوئی، سر پر لمبے لمبے بال جو ہوا میں اُڑ رہے تھے مگر وہ سردی اور جھکڑ سے بے نیاز جھومتا جھامتا چلا جا رہا تھا۔ اس کا موحش چہرہ دیکھ کر میں نے بھانپ لیا کہ کوئی شاعر واعر ہے۔ اس کو اتنا ہوش کہاں کہ میری بات پر دھیان دے۔ اور میں اس سے بھی کنارہ کش ہی رہا۔

تیسرا شخص جو اُدھر سے گزرا، خاصا عمر رسیدہ تھا مگر ابھی آنکھوں میں زندگی کی لو مدھم سی باقی تھی۔ اس کی بچی ڈاڑھی میں کالے بال اکا دکا ہی رہ گئے تھے۔ اس نے شلوار قمیص پر کوٹ پہن رکھا تھا سر پر ترکی ٹوپی تھی جس کا پھندنا غائب تھا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھا رہا تھا۔ جیسے خواب میں چل رہا ہو۔ ساتھ ساتھ وہ پنجابی زبان کا ایک درد بھرا لوک گیت بھی گنگناتا جا رہا تھا۔ اس کی چال ڈھال اور وارفتگی کہے دیتی تھی کہ بڑے میاں نے عجب رنگینیوں میں اپنی جوانی گزاری ہوگی اور اس وقت بھی بلاشبہ انہی کی یاد میں یہ گیت اس کے لبوں پر آیا ہوگا۔ سچ جانئے اس کی محویت کے اس طلسم کو توڑنے کی مجھے جرأت نہ ہو سکی اور یوں وہ بھی

میرے ہاتھ سے نکل گیا۔

میں شکار کی آس لگائے اسی کھمبے کے پاس کھڑا رہا۔ رفتہ رفتہ بازار بالکل سنسان ہو گئے تھے۔ کیونکہ راتوں کو سیر گشت کرنے کے رسیا آج کی کڑاکے کی سردی اور تند ہوا سے گھبرا کر معمول سے سویرے ہی اپنے اپنے ٹھکانوں میں جا دبکے تھے اور اب خاصے وقفے کے بعد کسی کے قدموں کی چاپ سڑکوں کی خاموشی کو توڑتی ہوئی سنائی دیتی تھی۔

آخر کار ایک سایہ اس روشنی کے نیچے سے گزرا۔ جہاں میں کھڑا تھا۔ میں نے جھٹ بھانپ لیا۔ کہ جس شخص کی مجھے جستجو تھی وہ یہی ہے۔ اس کو دیکھ کر اس کی عمر کا اندازہ کرنا سخت مشکل تھا۔ وہ نہ تو بوڑھا تھا نہ جوان، نہ بدصورت نہ خوبصورت۔ اس کے چہرے سے سکون اور اطمینان جھلکتا تھا۔ ڈاڑھی صاف، چھوٹی چھوٹی کترواں مونچھیں۔ اس نے ایک موٹا سا کوٹ پہن رکھا تھا اور گلے کو گلوبند سے خوب لپیٹ رکھا تھا۔

جیسے ہی وہ میرے قریب پہنچا میں اس کی طرف لپکا۔ وہ ٹھہر گیا اور خوفزدہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے فوراً اس کی تشفی کر دی۔ اور نہایت ملائم لہجے میں کہا:۔

"صاحب ڈریئے نہیں، میں کوئی قاتل یا چور اُچکا نہیں ہوں اور میں کوئی بھک منگا بھی نہیں ہوں، اس لئے آپ بالکل پریشان نہ ہوں مجھے آپ کے روپے پیسے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ سے میں جس چیز کا طالب ہوں اس پر آپ کا کچھ خرچ نہیں آئے گا یعنی یہ کہ مجھے آپ کی آپ بیتی چاہیئے۔"

اس شخص نے حیرت زدہ ہو کر مجھے دیکھا اور ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ بلاشبہ اس نے مجھے کوئی سودائی خیال کیا ہوگا۔ چنانچہ میں نے پہلے سے بھی زیادہ ملائم لہجے میں کہا:

"نہیں میں پاگل بھی نہیں ہوں۔ میں تو...... اب میں کیا عرض کروں۔ میں ایک حقیر سا مصنف ہوں۔ مجھے آج رات ایک کہانی لکھنی ہے، اگر یہ کہانی میں نہ لکھ سکا تو کل مجھے فاقہ کرنا ہوگا۔ میرے پاس کہانی لکھنے کے لئے جو کچھ مواد تھا وہ سارا ختم ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے آپ کے واقعاتِ زندگی کی ضرورت ہے۔ مجھے آپ کی ذاتِ گرامی سے پوری امید ہے کہ آپ مجھے اس نوازش سے محروم نہیں رکھیں گے آپ جو حالات مجھے مرحمت کریں گے کیا عجب کہ میں اس سے ایک لافانی شاہکار تحریر کر سکوں۔"

معلوم ہوتا تھا کہ وہ شخص میری درخواست سے متاثر ہوگیا ہے۔ اب اس نے مجھے جن نظروں سے دیکھنا شروع کیا ان میں خوف کے بجائے ترحم پایا جاتا تھا۔ اس نے کہا "اگر میری آپ بیتی سے آپ کا کوئی کام نکل سکتا ہے تو مجھے اس کے سنانے میں کوئی عذر نہیں۔ لیکن میری کہانی بڑی سیدھی سادی ہے۔ میری پیدائش کو ۳۵ برس گزر چکے ہیں۔ میرے ماں باپ خاصے کھاتے پیتے عزت دار لوگ تھے۔ والد صاحب قبلہ کپڑے کا کاروبار کیا کرتے تھے۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جب میری عمر چھ برس کی ہوئی تو مجھے مسجد کے مُلّا کے پاس بھیجا گیا۔ اس کے بعد میں ایک مدرسے میں داخل ہوگیا۔ سولہ برس کی عمر میں میں نے میٹرک پاس کرلیا۔ میں نے نہ تو کسی خاص ذہانت کا اظہار کیا تھا اور نہ میں نرا احمق ہی تھا۔ میٹرک کے بعد والد صاحب نے مجھے ریلوے کے دفتر میں ملازم کرا دیا اور اپنی برادری کی ایک لڑکی سے میری شادی بھی کردی۔ شادی سے پہلے میں نے اپنی بیوی کو نہیں دیکھا تھا مگر وہ میری توقع سے کچھ اچھی ہی نکلی۔ مجھے روزانہ آٹھ گھنٹے دفتر میں کام کرنا پڑتا ہے جس میں کسی خاص لیاقت یا ذہانت کی ضرورت نہیں، بس اچھے حافظے اور تن دہی کی ضرورت ہے۔ ہر سال میری تنخواہ میں چھ سات روپے کا اضافہ ہوجاتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ پچپن برس کی عمر میں جب میں ریٹائر ہوں گا تو مجھے کوئی ڈیڑھ پونے دو سو پنشن مل جائے گی۔ مجھے اپنے بیوی بچوں سے بڑی محبت ہے۔ میرے ایک لڑکا ہے اور ایک لڑکی۔ لڑکے کی عمر اب دس برس کی ہوچکی ہے، میرا ارادہ ہے کہ اس کو انجینئر بناؤں۔ لڑکی کی عمر نو برس ہے۔ خدا نے چاہا تو وہ اُستانی بنے گی۔ ہم لوگ بڑی خاموش زندگی گزارتے ہیں۔ میں ہر روز صبح آٹھ بجے اُٹھتا ہوں اور نو بجے تک نہانے دھونے سے فارغ ہوکر دفتر چلا جاتا ہوں اور پانچ بجے لوٹ آتا ہوں۔ میرے چار پانچ دوست ہیں، جن سے کبھی کبھی کافی ہاؤس میں ملاقات ہوجاتی ہے، اور ہم چند منٹ اِدھر اُدھر کی باتیں کرلیتے ہیں۔ کبھی کبھار کسی دوست کے اصرار پر ایک آدھ مشاعرہ بھی سن لیتا ہوں۔ لو میں نے تمہاری فرمائش پوری کردی ہے، خدا کرے کہ تم اس سے کچھ فائدہ اٹھا سکو۔ اب میں اجازت چاہتا ہوں۔ میرے بیوی بچے گھر پر انتظار کر رہے ہوں گے، اچھا، فی امان اللہ۔"

یہ کہہ کر وہ چل دیا۔ لمحہ بھر کے لیے میں بھونچکا سا رہ گیا۔ اس نے مجھے اپنی جو آپ بیتی سنائی تھی اس پر مجھے بے اختیار رونا آرہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ اپنا سر پیٹ لوں اور کپڑے پھاڑ کر کسی طرف نکل جاؤں۔

لیکن ابھی میں پورے طور پر مایوس نہیں ہوا۔ میں لپک کر اس کے پیچھے گیا۔ میں نے پوچھا:-

"کیا آپ کی زندگی میں اس کے سوا اور کوئی بات نہیں ہوئی؟ کیا کبھی آپ پر کوئی حادثہ نہیں گذرا؟ کیا کبھی آپ کو کسی نے قتل کرنے کی کوشش نہیں کی؟ کیا آپ اپنی بیوی کی طرف سے کبھی بدگمان نہیں ہوئے؟ کیا آپ کے بڑے افسروں نے کبھی آپ کو کچلنا نہیں چاہا ہے؟"

"نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔" اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ظاہر تھا کہ وہ میرے ان آخری سوالات کا کچھ برا مان گیا ہے۔ "جن باتوں کا آپ نے ذکر کیا ہے ان میں سے ایک سے بھی مجھے کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ میری زندگی ہمیشہ پرسکون، ہموار اور باقاعدہ رہی ہے۔"

"کیا سچ مچ کچھ نہیں؟" میں نے کہا۔ "ذرا پھر سوچئے اور غور کیجئے۔ مجھے یقین نہیں آسکتا کہ آپ کی زندگی میں کوئی نشیب و فراز نہ آیا ہو۔ اس کے بغیر تو آپکی زندگی بڑی بے کیف اور بے رنگ ہوگی۔"

"آپ باور کیجئے کہ مجھ پر اس قسم کی کوئی افتاد نہیں پڑی۔" ظاہر تھا کہ اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہوچکا ہے۔ پھر بھی اس نے خوش اخلاقی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اور بڑے تحمل سے کہا "کم از کم کل تک تو ایسا نہیں ہوا تھا۔ ہاں آج آپ سے ملاقات میری زندگی میں ایک نئی بات ہے۔"

اور پھر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ وہاں سے چل پڑا۔ میں کئی منٹ تک گم سم، سکتے کے سے عالم میں کھڑا اُس کے قدموں کی چاپ سُنتا رہا، جو رفتہ رفتہ دھیمی ہوتی گئی، اور بالآخر رات کے سناٹے میں گم ہو کے رہ گئی۔

(ماخوذ)

(افسانہ)

تشنگی

شکیلہ معظم علی

آپا زاہدہ نے بالوں کے جھنڈ کو سپنوں کی قید سے آزاد کرتے ہوئے ایک سرسری سی نگاہ آئینہ پر ڈالی اور آہ بھرتے ہوئے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ ان کی بڑی بڑی بے رونق آنکھیں جن میں کچلی ہوئی امنگیں مدفون تھیں، آپ ہی آپ بند ہوگئیں اور جب کچھ دیر بعد انہوں نے سر اٹھایا، تو ان کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ کمرہ میں ایک سبز رنگ کا مدھم سا بلب ٹمٹما رہا تھا اور اس ہلکی سی روشنی میں ہر چیز دھندلی دھندلی اور پُراسرار سی دکھائی دے رہی تھی۔ اوّل تو اس کمرہ میں تھا ہی کیا۔ ایک بڑا سا پلنگ جس کی صاف ستھری چادر پر ایک بھی شکن نہیں تھی، سرہانے چھوٹی سی میز پر رکھی ہوئی چند کتابیں، ایک ڈریسنگ ٹیبل، ایک وارڈروب اور سامنے دیوار پر لگی ہوئی ایک تصویر۔ اُفوہ! اس تصویر سے انہیں کتنی نفرت تھی۔ ایک پریشان حال سی لڑکی ایک چٹان سے چمٹی ہوئی، اس پانی کی طرف مسرت سے دیکھ رہی تھی، جو اس کی پہونچ سے دور، لیکن اسی چٹان کے کسی سوراخ سے نکل رہا تھا۔ اس تصویر کو دیکھ کر ان کا ذہن مسلسل الجھن میں مبتلا ہوجاتا تھا، لیکن نہ وہ اسے اپنے کمرے سے نکال سکتی تھیں، نہ اس سبز رنگ کے بلب کو بدل سکتی تھیں، جو ان کی اماں نے کفایت کے خیال سے ان کے کمرہ میں لگا دیا تھا۔ ان کی اماں کی حد سے بڑھی ہوئی کفایت کی وجہ ان کے لئے بڑی کشش آمیز تھی کہ اماں ان کی شادی کے لئے پیسے جمع کر رہی تھیں۔ شادی! اس چھوٹے سے لفظ میں کتنی کشش اور کتنے معنی پوشیدہ تھے۔ انہوں نے ایک اچٹتی سی نظر آئینہ پر ڈالی اور ان کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ کیا انہیں اب سے بہت پیشتر شادی نہیں کر لینا چاہئے تھی؟ انہوں نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ اس سوال کا جواب وہ صفائی سے اپنے آپ کو بتلاتے ہوئے بھی ڈرتی تھیں۔ شاید ان کے خوابوں کا راجہ ان کی زندگی میں اب تک آیا ہی نہیں۔ انہوں نے اس خیال سے اپنے دل کو تسلی دینا چاہی۔ مگر ان کی بے لطف اور پھیکی زندگی میں آیا ہی کون تھا۔ آپا زاہدہ نے بے چینی سے اپنے سر کو جھٹک دیا۔ وہ ان حقیقت آمیز خیالوں کی یورش سے بری طرح گھبراتی تھیں، لیکن اس سبز بلب کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی واضح طور پر احساس تنہائی کو تیز تر کر رہی تھی۔ کاش! وہاں کوئی ہوتا۔ وہیں اس بے شکن چادر والے پلنگ پر ہلکے سبز سلیپنگ سوٹ میں ملبوس، بے ڈھنگے پن سے لیٹا ہوا کوئی ایسا شخص جو ان کی ویران آنکھوں کی گہرائیوں میں جھانک سکتا۔ انہوں نے جھنجھلا کر بتی بجھا دی۔ تاریکی اور تنہائی نے ملکر ان کے دل پر موہوم سا خوف طاری کر دیا۔ ان کا جی بے اختیار رو دینے کو چاہا، لیکن وہ آسانی سے شکست ماننے والی نہیں تھیں۔ "ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال"، انہوں نے سوچا:

وہ نیم فلسفیانہ دماغ کی مالک تھیں، جس کی وجہ سے لوگ انہیں سنکی سمجھنے لگے تھے، مگر کہتے نہیں تھے۔ لیکن ریحانہ کی زبان کو کون روکتا؟ اسے تو جیسے دوسروں پر فقرے کسے بغیر نیند نہیں آتی تھی۔ وہ کہتی:

"آپا زاہدہ! آپ کی زندگی کی دوسری ٹریجیڈیوں کے متعلق مجھے علم نہیں، لیکن سب سے بڑا المیہ غالباً یہی ہے کہ آپ غیر ضروری طور پر فلسفی ہیں"۔

کیا چبھتی ہوئی بات کہی تھی اُس کمبخت نے! گویا اسے اس کا احساس تھا کہ آپا زاہدہ اپنی زندگی سے مطمئن نہیں ہیں اور وہ مطمئن تھیں بھی کب؟ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ اپنی اماں کی ڈانٹ پھٹکار سننے اور اسکول کی چند بے حیا چنچل لڑکیوں کے ساتھ، جو اپنے آپ کو ان کی شاگرد نہیں، استانی سمجھتی تھیں، سر کھپانے میں گذرا تھا۔ ماضی سے متعلق چند ناخوشگوار یادیں اور بھی تھیں، جن کا تصور کچھ خوش کن نہیں تھا۔ آپا زاہدہ کو اس کا خوب احساس تھا، اور وہ ماضی کی راکھ کو چھیڑنے سے گھبراتی

تھیں، مبادا اُن کی انگلیاں دبی دبائی چنگاریوں سے جُھلس جائیں، لیکن ریحانہ کو کیا کہا جائے جو نادانستہ اور غیر شعوری طور پر اُن کے مصائب میں زیادتی کا سبب بن چکی تھی +

"ہائے اللہ! آپا زاہدہ، آپ کا کمرہ کیسا صاف ستھرا رہتا ہے۔ ایک ہمارا کمرہ دیکھئے۔ کیا گندگی پھیلائی ہے میرے میاں نے۔ کیا مجال جو اپنے کپڑے تک ڈھنگ سے رکھ لیں۔ صفائی کرتے کرتے ناک میں دم آگیا ہے۔"

آپا زاہدہ کے دل کو ٹھیس سی لگتی۔ ریحانہ کو کیا معلوم کہ وہ اپنے کمرہ کی ان ویرانیوں سے، جسے وہ صفائی کہتی ہے، کتنی بیزار ہیں اور انہیں دن بھر کسی اکرم کے چاروں طرف بکھرے ہوئے کپڑوں، شیو کا سامان اور موزوں جوتوں کے انبار کو ٹھکانے سے سنبھالنے میں کوئی اعتراض نہیں؛

"کیا کر رہی ہے؛ سوئی نہیں تو اب تک؛ چل سو۔" ساتھ کے کمرہ سے ان کی اماں نے ڈانٹ کر حکم دیا اور وہ جیسے سہم کر کھلی ہوئی کھڑکی کے سامنے کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔ کیا انہیں سو جانا چاہئے؛ انہوں نے آج تک اپنی اماں کے حکم سے سرتابی نہیں کی تھی اور شاید ——— انہوں نے ڈرتے ڈرتے سوچا۔ شاید یہ ان کی اماں کی حکومت پسندی اور انانیت کا ہی نتیجہ ہے کہ آج ان کا دل ہزاروں مچلتی ہوئی آرزوؤں کا مدفن ہے، لیکن وہ اماں کو زیادہ دیر تک قصوروار نہ ٹھہرا سکیں۔ اماں نے ان کی بہتری کے خیال ہی سے شروع شروع میں ان کے لئے آئے ہوئے پیاموں کو رد کیا تھا۔ وہ انہیں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل بنانا چاہتی تھیں اور اب کہ تعلیم مکمل کر کے انہیں اپنے پاؤں پر کھڑے ہوئے عرصہ ہو چکا ہے، اماں گھر کے اخراجات میں کاٹ چھانٹ کر کے ان کے لئے جہیز تیار کرنے میں تندہی سے مصروف ہیں۔ انہیں کس طرح قصوروار ٹھیرایا جا سکتا ہے۔ اگر انہوں نے آپا زاہدہ کی نقل و حرکت پر لاتعداد غیر ضروری پابندیاں عائد کر رکھی ہیں، تو یہ بھی انہی کی بہتری کے خیال سے۔ دنیا کی زبان کو کون روک سکتا ہے؛ عورت کی عزت موتی کی سی آب ہے۔ ذرا سی بے احتیاطی ہوئی اور ساری چمک زائل ہوئی، لیکن ریحانہ پر تو یہ نکتہ واضح ہی نہیں ہوتا تھا۔ وہ کہتی: "عزت نہ ہوئی چھوئی موئی کا پودا ہو گئی۔ ہنسنا بولنا، کھانا پینا سب کچھ حرام۔ کیوں جی۔ دوپٹہ ذرا سر سے ڈھلک گیا، تو کیا بے عزتی ہو گئی؟ آپا زاہدہ، جینا سیکھئے جینا ہنسئے کھیلئے اور اپنی اماں سے کہہ دیجئے کہ آپ کی نگاہوں کا تعاقب نہ کیا کریں اور نہ آپ کی بے ضرر مسکراہٹ کی چھان بین۔ آپ کوئی بچہ تو ہیں نہیں کہ بُرے بھلے میں تمیز نہ کر سکیں؟"

ریحانہ کی باتیں آپا زاہدہ کے دل کو لگتی ضرور تھیں، لیکن نہ جانے کیوں انہیں اس کی باتوں سے طنز کی بو آتی تھی۔ اب بھلا بچپن کے ذکر کا کیا موقع تھا؟ کیا یہ صریحاً اُن پر فقرہ نہیں کسا گیا؟ یہ خود پسند اور مغرور لڑکی انہیں حقیر سمجھتی ہے۔ اُن کے دل میں بغاوت کا جذبہ پیدا کر کے ان کی ٹھیری ہوئی زندگی میں ہلچل مچا دینا چاہتی ہے، لیکن آپا زاہدہ اتنی بیوقوف نہیں ہیں کہ اُسے اپنے پر غالب آجانے دیں۔ انہیں اس سے مقابلہ کر کے اُسے نیچا دکھانا ہی ہوگا، مگر مشکل یہ تھی کہ یہ سانولے رنگ کی دُبلی پُتلی سی لڑکی فتنہ تھی بالکل۔ اسے ہرا دینا آسان نہ تھا۔ ہزار اُسے برا بھلا کہہ لو، بے غیرتی سے بیٹھی ہوئی کھلکھلایا کرتی اور پھر چپکے سے ایک ایسا جملہ کہہ جاتی جو سب کئے کرائے پر پانی پھیر دیتا۔ دوسروں کے مشورے غور سے سنتی۔ مگر کرتی وہی تھی جو اس کا اپنا جی چاہتا۔ اوّل درجہ کی مکار تھی وہ۔ اور لوگ اسے سمجھدار کہتے تھے۔ اُس چھوٹی سی جماعت کے ہر فرد نے، جسے آپا زاہدہ شیطانی لشکر کے نام سے موسوم کرتی تھیں؛ آپا زاہدہ کے بقول ریحانہ کو سر پہ چڑھا رکھا تھا کوئی بھی اس کی بات کا بُرا نہیں مانتا تھا۔ اسی دن ظہیر صاحب نے کہا: "بھئی ریحانہ، تم قطعی منافقت پسند ہو۔ تمہارے منہ سے کبھی کسی کی بُرائی نہیں سُنی۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ اس وسیع دنیا میں کوئی تمہیں بُرا ہی نہ لگتا ہو۔ اگر کسی کو گدھا سمجھتی ہو، تو گدھا ہی کہو نا۔"

اور ریحانہ نے بناوٹی سنجیدگی سے سوال نما جواب دیا تھا: "آپ برا تو نہیں مانیں گے؟" سب ہنسنے لگے تھے۔ اور سب میں نمایاں ظہیر صاحب کا قہقہہ تھا۔ لیکن آپا زاہدہ کو بہت غصہ آیا۔

ریحانہ کے بعد انہیں سب سے زیادہ چڑ ظہیر صاحب سے تھی۔ پتہ نہیں اس کی کیا وجہ تھی۔ ہرچند کہ اس جماعت میں ان کی حیثیت ایک بزرگ کی سی تھی۔ وہ ہر ایک سے بزرگانہ شفقت سے بات چیت کرتے تھے۔ موقع بے موقع ہر ایک کو ڈانٹتے بھی تھے لیکن آپا زاہدہ کا بہت ادب کرتے تھے۔ جب تک آپا زاہدہ کسی غیر اہم مسئلہ پر اہم تقریر کرتی رہتیں، وہ کرسی پر پہلو بدلا کرتے۔ اور اچانک گھڑی دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوتے۔ ریحانہ کہتی: "واہ؛ ابھی تو آپا زاہدہ ہمیں چائے پلائیں گی۔" آپا زاہدہ اس بیجا مداخلت پر سٹپٹا جاتیں اور

پھر شرما کر مسکراتے ہوئے باورچی خانہ کا رُخ کرتیں۔ ظہیر صاحب ریحانہ کی طرف دیکھ کر مسکراتے اور پھر تاش کی محفل جم جاتی ۔ تاش کھیلنے کا ان سب کو بہت شوق تھا اور ریحانہ تو جیسے برج پر مرتی تھی۔ تو کیا آپا زاہدہ کا جی اس کھیل میں حصہ لینے کو نہیں چاہتا تھا؟ مگر وہ کیا کریں؟ مردوں کے ساتھ تاش کھیلنا اُن کی اماں کی نظروں میں ناقابل معافی جرم تھا اور انہیں عافیت اسی میں نظر آتی تھی، کہ بالوں کو اچھی طرح ڈھانپ کے مسز ظہیر کے پاس جا بیٹھتیں جو اس جماعت میں ان کی واحد قدر دان تھیں ؛

"مسز ظوہیر" وہ ہمیشہ منہ کو گول بنا کر ظہیر کا تلفظ ادا کرتی تھیں "آپ کے میاں کو آپ سے بہت محبت ہے نا؟" آپا زاہدہ نے معنی خیز مسکراہٹ سے پہلے ظہیر صاحب کو دیکھا، اور پھر ریحانہ کو دیکھتے ہوئے مسز ظہیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالدیں۔ مسز ظہیر اس غیر ضروری سوال سے متعجب سی ہوگئیں۔ ان کی بارہ چودہ سال کی شادی شدہ خوشگوار زندگی اس سوال کا جیتا جاگتا جواب تھی، لیکن آپا زاہدہ نے کہا :-

"مرد کا اعتبار ہی کیا۔ نہ جانے کب کس پر طبیعت پھسل جائے۔"

اور انہوں نے پھر ریحانہ کو دیکھا! پھر ظہیر صاحب پر حقارت آمیز نظر ڈالی اور پھر مسکرا دیں۔ مسز ظہیر کی نظروں نے ان کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ اور لمحہ بھر کے لئے ان کی نظر ریحانہ کے دمکتے ہوئے چہرہ پر رک گئی جو اکرم کو پُرشوق نظروں سے تک رہی تھی۔ مسز ظہیر نے اطمینان کا سانس لیا اور آپا زاہدہ سے کہنے لگیں "آپ کی طبیعت میں شک بہت زیادہ ہے"؛

"خدا نہ کرے کہ آپ کو اپنی خوش فہمی کی قیمت دینا پڑے" آپا زاہدہ نے عجیب چونکا دینے والے لہجے میں کہا۔ اور مسز ظہیر کے اچانک چونک پڑنے پر، آپا زاہدہ نے آہستہ آہستہ انہیں بہت سی باتیں بتائیں "آپ کے آنے سے پہلے آپ کو معلوم ہے یہاں کیا ہوتا تھا؟

"سینما چلیں گے" ریحانہ صاحبہ اٹھلائیں۔ اور سب لوگوں کی مخالفت کے باوجود ظہیر صاحب سینما چلنے پر مصر ہوتے۔ پوچھیئے کیوں؟ کیونکہ یہ ریحانہ کی خواہش تھی۔ "اللہ! کیسی اچھی چاندنی ہے، چلیئے پکنک کریں"! اور ظہیر صاحب سب سے آگے آگے چلدیئے۔ کیوں بھئی؟ ریحانہ کا جی نہ میلا ہو جائے یہی سوچتے ہوں گے۔ ساری پارٹی باہر جانے پر آمادہ ہے، لیکن چونکہ ریحانہ کے خیال میں گھر بیٹھکر تاش کھیلنے میں زیادہ دلچسپی رہے گی، ظہیر صاحب پتے پھیلا کر بیٹھ گئے ہیں۔ یہ سب کچھ کیوں؟ اگر درمیان میں "کچھ" نہیں ہے؟ انہیں ریحانہ کی بات کا اتنا مان کیوں ہے؟ آپ کہتی ہیں ظہیر صاحب خود برج کے بہت شوقین ہیں۔ چاندنی راتیں انہیں پسند ہیں۔ سینما سے انہیں دلچسپی ہے۔ اس وقت ان کی سینما سے دلچسپی کہاں چلی گئی تھی جب ایک بار میں نے سینما چلنے کی تجویز پیش کی تھی تو ظہیر صاحب کسی سے ملنے کا بہانہ کر کے چل دئے تھے" آپا زاہدہ نے حقارت سے ظہیر صاحب کو دیکھا۔

مسز ظہیر نہ آپا زاہدہ کی نگاہوں کو دیکھ سکیں، نہ ان کے لہجہ کی تلخی کو محسوس کر سکیں۔ وہ سوچ رہی تھیں۔ ریحانہ کی خواہشوں کا احترام! ریحانہ کا جی میلا ہو جانے کا خیال! اُنہیں ظہیر صاحب کی وقتاً فوقتاً کہی ہوئی باتیں یاد آنے لگیں "ریحانہ بہت سمجھ دار ہے۔ ریحانہ غیر معقول باتیں نہیں کرتی۔ ریحانہ ــــ" تو اسلئے ریحانہ کے نام کی تسبیح پڑھی جاتی ہے۔ انہیں خیال آیا کہ وہ کچھ مبالغہ کر رہی ہیں۔ اور ناانصافی بھی۔ ظہیر صاحب نے کبھی ریحانہ کے متعلق زیادہ باتیں نہیں کیں۔ "مرد کا اعتبار ہی کیا" آپا زاہدہ کے الفاظ اُن کے کانوں میں گونجے۔ ظہیر صاحب کا ریحانہ کے متعلق زیادہ باتیں نہ کرنا ہی اُن کی مکاری کا بیّن ثبوت ہے ؛

اور ظہیر صاحب ریحانہ کے استفسار پر کہہ رہے تھے "ہاں آجکل ایک بہت اچھی تصویر چل رہی ہے۔ کیوں بھئی چلتی ہو؟" وہ اپنی بیوی کی طرف مخاطب تھے۔ مسز ظہیر کچھ چڑ سی گئیں "میرا جی نہیں چاہتا، آپ لوگ جایئے"؛

اور جیسے ظہیر صاحب اور ریحانہ نے یک زبان ہو کر کہا "آج آپ کا جی نہیں چاہتا تو چلیئے پھر کبھی سہی" مسز ظہیر زیادہ جَل گئیں "مکار!" انہوں نے دل ہی دل میں پتہ نہیں دونوں میں کس کے متعلق کہا ؛

اور ظہیر صاحب اور ان کی بیوی کے جانے کے بعد ریحانہ نے بچوں کی طرح مچل کر کہا "آج تو ضرور ہی سینما دیکھیں گے"؛

"ضرور" اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی اکرم اپنی ٹائی ٹھیک کرتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا؛

"ضرور" احمد نے جوتوں کے تسمے کستے ہوئے کہا ؛

"خوب!" آپا زاہدہ نے جیسے بل کھاتے ہوئے سوچا۔ احمد، ان کا اپنا بھائی بھی ریحانہ سے متاثر ہو چکا ہے۔ ہونا ہی تھا۔ آپا زاہدہ اور اُن کی اماں کو آئے ہوئے ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ پورے ایک سال سے وہ ریحانہ اور اکرم کے ساتھ ایک ہی مکان میں رہتا ہے۔ ریحانہ جیسی، جسے دوسروں کو اپنا بنانے، یا یوں کہئے کہ دوسروں کو بیوقوف بنانے کے سینکڑوں گر

آتے ہیں اور احمد ایسا سیدھا سادا مخلص سا لڑکا، جو چھوٹی چھوٹی باتوں سے متاثر ہو جاتا ہے۔ اگر ریحانہ نے اس کے سوٹ پر استری کر دی تو وہ ممنون ہے۔ اس کا کمرہ صاف کر دیا گیا، وہ شکر گذار ہے، اس کی فرمائش پر کوئی چیز پکا دی، وہ خوش ہے۔ اسے پاگل بنانا کونسا مشکل ہے ؎

ریحانہ، اکرم اور احمد کے جانے کے بعد، (آپا زاہدہ نے خفا ہو کر ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا) انہوں نے اپنی اماں سے کہا: "دیکھا آپ نے آپ نے یہاں پہونچنے میں دیر کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ احمد اس حد تک ان لوگوں کے اثر میں آچکا ہے کہ اسے اپنی ماں، اور بہن کی پروا نہیں رہی۔ میں نے ان لوگوں کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔ تو کیا اسے یہ نہیں چاہئے تھا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ گھر پر ہی رہے؟"

اماں پہلے ہی احمد سے اس بناء پر خوش نہیں تھیں کہ ان کے بار بار لکھنے کے باوجود احمد نے الگ گھر کا انتظام نہیں کیا تھا اور اب بھی کہ ان لوگوں کو آئے ہوئے دو ماہ ہو چکے ہیں، وہ ان کے اصرار پر ہمیشہ یہی کہتا ہے: "آپ کو معلوم نہیں اماں جس وقت میں تنہا، اور تنہائی کی وجہ سے زندگی سے بیزار تھا، یہ لوگ کمال مہربانی سے میرے ساتھ رہنے پر آمادہ ہو گئے اور ہم لوگ ہمیشہ بہت خوش رہے ہیں۔ آپ کی آمد کی خبر پر مسز اکرم نے علیحدہ مکان لے لینے کی تجویز پیش کی تھی۔ اس خیال سے کہ اکٹھے رہنے کی وجہ سے شاید عورتوں میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر غلط فہمیاں پیدا ہو کر شکر رنجیوں کی شکل اختیار کر لیں۔ میں نے ان کے اس خیال کا مذاق اڑایا تھا۔ اب میں ان سے کس طرح کہوں کہ وہ علیحدہ گھر کا انتظام کریں، جبکہ مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہے۔" اور اماں کے بدلتے ہوئے رنگ کو دیکھ کر اس نے جلدی سے کہا: "اب اگر ان کی طرف سے اس قسم کی خواہش کا اظہار ہوتا ہے تو آپ کی مرضی کے مطابق میں ان سے ہمارے ساتھ ٹھیرنے پر اصرار نہیں کروں گا۔" اور احمد نے غیر محسوس سی ٹھنڈی سی سانس لی ؎

اماں نے بگڑ کر کہا: "ان کی طرف سے ابتداء کاہے کو ہوگی ــــ دیکھتے نہیں ہو ریحانہ کو۔ رانی بنی بیٹھی ہے سارے گھر پر قبضہ کئے ہوئے۔ کرایہ کا ایک پیسہ نہیں دینا پڑتا۔ تم اپنی ساری تنخواہ دوسروں پر اڑا دیتے ہو"۔

اور احمد نے جیسے برا مان کر کہا: "مکان کا کرایہ تو مجھے بھی اپنی جیب سے نہیں دینا پڑتا، حکومت دیتی ہے اور میری تنخواہ کے اڑ جانے میں ریحانہ کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ میں نے شروع شروع میں ریحانہ اور اکرم سے کہا تھا، کہ ہم مل جل کر گھر چلائیں گے، لیکن ریحانہ نے جواب دیا تھا: "مکان آپ کا۔ کرایہ کہیں سے ملے ہمیں اس سے بحث نہیں اور باقی سارے اخراجات کے ہم ذمہ دار ہیں"۔ اور مجھے تو اتنا بھی معلوم نہیں کہ میرے کپڑوں کی دھلائی کہاں سے جاتی ہے۔ میری تمام ضرورتیں کس طرح پوری ہوتی ہیں۔ اکثر میرے دوستوں کی دعوتیں ہوتی ہیں، کس طرح؟ مجھے معلوم نہیں۔ مجھ سے اگر کبھی کچھ پیسے لئے گئے ہیں تو بطور قرض، جو میرے نہ لینے کے اصرار کے باوجود مجھے واپس مل گئے ہیں ؎

"رہا ریحانہ کا گھر پر قبضہ جما کر رانی بننے کا سوال۔ اس نے کتنی بار مجھ سے اور آپ سے کہا ہے کہ آپ بزرگ ہیں، گھر آپ سنبھال لیجئے۔ معلوم نہیں کن وجوہ کی بناء پر آپ یہ ذمہ داری قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ اور ان لوگوں نے میرے اخراجات کا ذمہ لیا تھا۔ میرے خاندان بھر کی پرورش کا بیڑا نہیں اٹھایا تھا۔ آپ لوگوں کو یہاں آئے ہوئے دو ماہ ہو چکے ہیں۔ مہمانداری کی بھی انتہا ہوتی ہے ہمیں خرچ آدھا آدھا بانٹ لینا چاہئے۔ ان لوگوں پر اتنا بوجھ ڈالنا مناسب نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں وہ خود کچھ نہیں کہیں گے مگر ــــ" احمد اماں کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر سہم کر خاموش ہو گیا ؎

"وہ کہہ بھی کیا سکتے ہیں؟" اماں چلائیں۔ "پانچسو روپے ماہوار کے مکان میں بادشاہت کر رہے ہیں۔ اپنے پلّے سے اتنی رقم نکلتی تو پتہ چل جاتا۔ اور تم انہیں کی ہمدردی کر رہے ہو۔ اپنے مستقبل کا کچھ خیال ہے، نہ ماں بہن کی پروا۔ کیسی قیدیوں کی سی زندگی گذار رہے ہیں ہم لوگ۔ کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ کسی کام میں دخل نہیں دے سکتے۔ اور ــــ"

لیکن احمد سے خاموش نہ رہا گیا: "آپ کو منع کون کرتا ہے اماں۔ بلکہ مجھے تو ترس آتا ہے کہ ریحانہ دن بھر گھر کے کاموں میں جُتی رہتی ہے۔ اور آپا زاہدہ مزے سے اپنے کمرے میں آرام کیا کرتی ہیں۔ اور ــــ"

اچانک احمد کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اماں اتنے زیادہ غصے میں ہیں کہ انہیں اس طرح قائل نہیں کیا جا سکتا۔ صاف گوئی اور سچائی سے حالات کبھی سدھرے بھی ہیں۔ اور اس نے ایک دم بات پلٹ دی: "چلئے اماں مسز ظہیر کے ہاں چلیں ؎"

اماں کو اپنے بیٹے سے بہت زیادہ محبت تھی۔ وہ اس کی کسی بے ضرر فرمائش کو، جب تک کہ وہ ان کی اپنی کسی خواہش سے نہ ٹکرا جائے نہیں ٹالتی تھیں ؎

اور آپا زاہدہ اس ساری بحث سے بے خبر بیٹھی ہوئی اماں کے کہے ہوئے صرف ایک لفظ پر غور کر رہی تھیں۔ ان میں یہ زبردست خوبی تھی، کہ وہ جب چاہتی تھیں، ماحول سے بے خبر ہو جاتی تھیں۔ "رانی! رانی!" انہوں نے زیر لب دہرایا۔ اور بالکل غیر متعلق طور پر انہیں ریحانہ کے والدین پر غصہ آگیا۔ آخر انہوں نے اس کے لئے یہ نام کیوں چنا تھا۔ اگر اس کا نام ریحانہ نہ ہوتا تو اکرم اسے نام کی رعایت سے پیار سے رانی کہہ کر نہ پکارتا، تو ریحانہ کی آنکھوں کی چمک نہ بڑھ جایا کرتی، جسے محسوس کر کے آپا زاہدہ کی طبیعت جھنجھلا جاتی ہے۔ یہ خوشامد پسند مرد لفظوں کی الٹ پھیر سے کس طرح عورتوں کو بیوقوف بنا لیتے ہیں۔ اور وہ بڑی خوشی سے مردوں کے ہاتھوں کھلونا بننے پر آمادہ ہو جاتی ہیں —— لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹا تھا۔ خود اکرم ریحانہ کے اشاروں پر ناچتا تھا۔ آپا زاہدہ کو اکرم ناپسند نہ تھا، بلکہ ظریف الحسن کے بعد ان لوگوں میں وہ اکرم کو ہی پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی تھیں، لیکن ان کی طبیعت کس بری طرح الجھتی تھی جب ریحانہ کے آتے ہی اکرم آپا زاہدہ کے ساتھ زیر بحث سنجیدہ موضوع کو بیچ میں چھوڑ کر اس کی بے تکی باتوں کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا۔ اور خواہ مخواہ نخرے کرنا شروع کر دیتا۔ "تھک گئیں رانی؟" "ہاں ذرا پانی پلا دو نا" اور وہ سعادتمندی سے پانی لینے چلا جاتا۔

آپا زاہدہ کو اکرم کی حالت پر افسوس ہونے لگتا۔ اتنا اچھا لڑکا، کیا اس چھوکری کے ہاتھوں بیوقوف بن رہا ہے۔ اسے اپنی خودداری کا بھی احساس نہیں ہے۔ اس کی خدمت کے لئے اس طرح تیار رہتا ہے گویا وہ سچ مچ رانی ہی ہے اور وہ ایک ادنیٰ خادم۔ عورتوں کو کس طرح قابو میں رکھا جاتا ہے، اسے بالکل علم نہیں۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ اسے ریحانہ سے بہت بہتر لڑکیاں مل سکتی تھیں، جو اسے دیوتا بنا کر پوجتیں اور اچانک وہ ریحانہ پر بے رحمی سے تنقید اور اپنے ساتھ موازنہ کرنے لگیں۔ اس میں دھرا ہی کیا ہے۔ نہایت ہی واجبی سی شکل ہے۔ آپا زاہدہ کی بڑی بڑی آنکھوں، غیر معمولی طور پر پتلے ہونٹوں اور وسیع پیشانی کے مقابلہ میں، اس کا کوئی بھی نقش اتنا تیکھا نہیں ہے۔ رنگت اس کی کونسی ایسی کھلتی ہوئی ہے، البتہ اسے میک اپ کا ایسا ڈھنگ آتا ہے کہ خاصی قبول صورت لگتی ہے اور کمبخت کی آنکھوں میں کاجل بلا کا جچتا ہے اور اس کا سر کو قدرے جھکا کر، پوری آنکھیں کھول کر غور سے دیکھنے کا بے جھجک انداز جیسے مخاطب کے دل کی گہرائیوں ہی میں تو اتر جائے گی۔ جانے لوگ اس ادا سے متاثر ہوتے ہوں، مگر آپا زاہدہ کو تو اس چھچھورے پن اور بے حیائی پر غصہ ہی آتا ہے۔ شرم عورت کا زیور ہے۔ آپا زاہدہ اس کی سختی سے قائل تھیں اور آنچل کو رکھ کے سر پہ، شرما کے مسکرانا ان کی خاص ادا تھی اور ریحانہ انہیں ٹوکتی۔ "اتنا مت شرمایا کرو آپا زاہدہ، غیر ضروری شرم دوسرے کی ہمت بڑھاتی ہے۔ ویسے بھی اگر ظریف الحسن آپ کی خیریت پوچھتے ہیں تو اس میں شرمانے کی کیا بات ہے؟"

وہ ریحانہ سے زیادہ سمجھدار تھیں۔ اس سے بہت زیادہ تعلیم یافتہ تھیں۔ اور دنیا کا انہیں اس سے زیادہ تجربہ تھا، لیکن اگر ریحانہ ڈھٹائی سے کم بختی پر اتر آئے تو اس کا کیا علاج۔ "زندگی کا تجربہ محض کتابوں سے تو حاصل نہیں ہوتا، آپا زاہدہ۔ اگر آپ کتابوں کے انبار سے نکل کر صرف شرمانے اور مسکرانے میں وقت گزار دیں گی اور شرمیلی مسکراہٹ سے تھک کر پھر کتابوں میں جت جائیں گی، تو آپ کو یہ معمولی سی بات بھی معلوم نہیں ہو سکتی، کہ ایک ہی ماحول کا مختلف انسانوں پر کیا مختلف اثر ہو سکتا ہے، ہوتا ہے اور کیوں ہوتا ہے؟ اور —— اچھا یہ تو اندازہ لگائیے کہ ظریف الحسن اس وقت کیا سوچ رہے ہیں؟"

ریحانہ عموماً ایک بات ختم کئے بغیر بے تکے پن سے موضوع بدل دیا کرتی تھی۔ آپا زاہدہ کو یقین تھا کہ اس میں سنجیدگی سے بات کرنے اور سنجیدہ بات کو سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ریحانہ کو قصداً یا غیر ارادی طور پر دکھتی رگیں چھیڑنے کا ملکہ تھا۔ آپا زاہدہ کو عافیت اسی میں نظر آتی تھی، کہ وہ اس کے ساتھ کسی بحث میں نہ الجھیں۔ اور آپا زاہدہ کو نفسیات سے بہت لگاؤ تھا اور اس بات پر ناز بھی کہ وہ انسان کی صورت دیکھ کر، اس کی صحیح فطرت کو پہچان سکتی ہیں اور صحیح طور پر اندازہ لگا سکتی ہیں کہ کون کس وقت کیا سوچ رہا ہے۔ انہیں خیال آیا کہ یہ ریحانہ کو قائل کر کے شرمندہ کرنے کا اچھا موقع ہے۔ انہوں نے غور سے ظریف الحسن کو دیکھا، جو بہت دیر سے کسی رسالہ کے ایک ہی صفحہ پر نظر جمائے ہوئے کچھ سوچ رہے تھے اور ایک بار کاغذ پر کچھ لکھ کر کاٹ چکے تھے اور اب ریحانہ کے منہ سے اپنا نام سن کر اس کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ اور انہوں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ "آپ دونوں میں سے جو بھی ٹھیک ٹھیک بتائے گا کہ میں کیا سوچ رہا تھا، میں اسے مان لوں گا۔"

"ریحانہ برا تو نہیں مانیں گی؟" آپا زاہدہ نے اطمینان کرتے ہوئے کہا۔

"ظریف الحسن سوچ رہے تھے کہ ریحانہ نے آپ کو اتنا اونچا اور سمجھدار کیوں سمجھتی ہے۔ اسے وہی سمجھنا چاہیئے جو وہ دراصل ہے"۔ آپا زاہدہ نے نہایت صفائی سے اپنی اسی رائے کا جو وہ ریحانہ کے متعلق قائم کر چکی تھیں، اظہار کر دیا۔ "خواہ آپ مانیئے نہیں، مگر آپ کے دل میں "قطعی" یہ خیال تھا"

انہوں نے شرماتے ہوئے زور دیا۔

"آپ نے کس طرح یہ اندازہ لگایا؟" ظریف الحسن نے حسب عادت جرح کی۔

"ریحانہ کی بے تکی باتیں سن کر ہر سمجھدار شخص کو یہی اندازہ ہوتا ہے۔ اور پھر اس کی طرف آپ کا غور سے دیکھنا۔ ظاہر ہے آپ اسی کے متعلق سوچ رہے تھے"۔

"اب آپ بولیئے مسز اکرم"۔ ظریف الحسن نے فرمائش کی۔

"میں اب کیا بولوں۔ آپا زاہدہ جیت گئیں"۔ ریحانہ شرارت سے مسکرائی۔ "ویسے میرا خیال تھا کہ آپ زیر نظر مضمون کا ترجمہ کرنا چاہتے ہیں۔ عنوان کا ترجمہ آپ نے کیا بھی، جو آپ کو پسند نہیں آیا"۔ ریحانہ کو ان کے ادبی ذوق کا علم تھا۔

ظریف الحسن نے لمحہ بھر کے لئے ٹھٹک کر اسے غور سے دیکھا۔ اور رسالہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آپا زاہدہ جیت گئیں۔ میں مان گیا۔ مسز اکرم واقعی آپ کو اپنے متعلق وہی سمجھنا چاہیئے، جو آپ ہیں"۔ انہوں نے آخری الفاظ پر زور دیا۔

آپا زاہدہ نے خوش ہو کر ریحانہ کو دیکھا۔ ان کا خیال تھا کہ ریحانہ جھینپ کر چڑ جائے گی۔ اس کے چہرہ پر ہلکی سی سرخی دیکھ کر جیسے ان کے خیال کی تائید ہو گئی، لیکن وہ فوراً ہی جیسے سمجھ کر ہنسنے لگی۔

اور آپا زاہدہ نے سوچا۔ "کوئی اس حد تک بے غیرت نہ ہو"۔

اور ریحانہ نے سوچا۔ "ظریف الحسن کی باتیں اتنی بے معنی نہیں ہوتیں جیسا کہ سمجھی جاتی ہیں"۔

اور ظریف الحسن نے سوچا۔ "آپا زاہدہ نہ جانے ریحانہ سے کیوں بدظن ہیں۔ اس میں کوئی خرابی نہیں۔ بہت سمجھدار اور نہایت گہری لڑکی ہے"۔

ظریف الحسن بہت شریف، نیک اور مخلص قسم کے لوگوں میں سے تھے۔ عام خیال تھا کہ وہ بہت سیدھے سادے ہیں اور آسانی سے بیوقوف بنائے جا سکتے ہیں۔ ریحانہ کو اس خیال سے اتفاق نہیں تھا۔ وہ کہتی تھی کہ ظریف الحسن ان لوگوں میں سے ہیں، جنہیں اپنے آپ کو بیوقوف ظاہر کر کے، دوسروں کو بیوقوف بنانے میں مزا آتا ہے۔ بہر صورت وہ ہر ایک کی دلچسپی کا مرکز تھے اور سب کو ان پر بھروسہ تھا کہ وہ برا نہیں مانیں گے۔ ان کی دلچسپ شخصیت اور پر خلوص برتاؤ کی وجہ سے ہر شخص ان کا خیال رکھتا تھا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اس پردیس میں تنہا تھے۔ یوں بھی وہ شادی شدہ نہ تھے اور غالباً اسی لئے آپا زاہدہ کو سب سے زیادہ ان کے بچاؤ کی فکر تھی اور انہیں یقین تھا کہ جب ریحانہ بڑے بڑے ذمہ دار آدمیوں کو (ان کا اشارہ ظہیر صاحب کی طرف تھا) بیوقوف بنانے سے نہیں چوکتی، تو ظریف الحسن کو جن پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے اور جو خود مخلص ہونے کی بنا پر تصنع آمیز برتاؤ کو بھی خلوص سمجھ لیتے ہیں، پاگل بنانے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہو سکتی۔ ویسے ظریف الحسن انہیں پسند بھی تھے اور ان کے متعلق وہ ظہیر صاحب اور اکرم سے زیادہ سوچ سکتی تھیں۔ آپا زاہدہ نے وقتاً فوقتاً ریحانہ کی مکاری اور دوسری خامیوں کے متعلق، جن پر محض ان کی تیز نظر ہی پڑی تھی، بڑی ہوشیاری سے ظریف الحسن کے سامنے تنقید کی تھی اور یہ بھی بتایا تھا، کہ جب ریحانہ ان کا مذاق اڑاتی ہے تو آپا زاہدہ کو اچھا نہیں لگتا۔

ظریف الحسن سب کی سن لیتے تھے۔ انہوں نے آپا زاہدہ کی بھی سنی۔ اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ان باتوں کا اثر تھا، یا ریحانہ کے تیز تیز فقرے اور شوخ جملے ان کے لئے کشش آمیز تھے، لیکن یہ دیکھا گیا کہ وہ بات بات پر ریحانہ سے الجھ پڑتے تھے اور طرح طرح سے بحث میں الجھا کر اسے قائل کرنے کی کوشش کرتے جو عموماً ناکامیاب رہتی تھی۔ اور آپا زاہدہ خوش تھیں کہ ان کی کوششوں کی بنا پر ظریف الحسن ریحانہ سے مرعوب نہیں ہوئے۔

اور اب حالات بدل رہے تھے۔ دلچسپیاں محدود ہو رہی تھیں۔ اماں نے ریحانہ سے بات کرنا چھوڑ دیا تھا۔ احمد جھینپا ہوا سا نظر آتا تھا۔ مسز ظہیر کی گفتگو میں ریحانہ کو رکھائی محسوس ہوتی تھی، ظریف الحسن اس کے ہر فقرے کو خاموشی سے پی لیتے تھے۔ اور ظہیر صاحب خاموش تھے۔

"کیوں آخر؟" ریحانہ نے آپا زاہدہ سے پوچھا۔

"یونہی تمہیں خیال ہو گیا ہے۔ سب لوگ پہلے ہی کی طرح تم سے محبت کرتے ہیں"۔ آپا زاہدہ کے لہجہ کی تلخی نے ریحانہ کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ محبت کی ضرورت نہ اسے پہلے تھی نہ اب ہے، لیکن مل جل کر

بیٹھنے اور ہنس کھیل کر وقت گذارنے میں یہ رکاوٹیں کیوں پیش آ رہی ہیں۔ اب سب ملتے ہیں، تو ہر شخص سنبھل سنبھل کر بات کرتا ہوا کیوں محسوس ہوتا ہے؛ احمد کو کیا ہو گیا ہے؟ اماں کیوں بگڑی ہوئی ہیں؟ ظہیر صاحب اور مسز ظہیر کی اس نے ہمیشہ عزت کی ہے، اس نے تو کسی کا بھی کچھ نہیں بگاڑا۔ آپا زاہدہ سے البتہ بے ضرر سی چھیڑ چھاڑ چلتی ہی رہتی ہے اور اب تو وہ بھی اکثر اپنا کمرہ اندر سے مقفل کئے رہتی ہیں اور ریحانہ کچھ نہ سمجھ سکی۔ اور اکرم نے کہا "بیوقوف مت بنو۔ سب کے سب ٹھیک ہیں" لیکن ریحانہ کو محسوس ہو رہا تھا کہ ہر بات غلط ہو رہی ہے۔ اور اسے بہت جلد ثبوت مل گیا۔ ناشتہ پر بسکٹوں کے خالی ڈبہ کے اندر جھانکتے ہوئے اس نے بے دھیانی میں احمد کو مخاطب کیا:

"کیوں بھئی، کل شام چائے پر ڈبہ بھرا ہوا تھا نا۔ ایں؟"

"تو احمد سے کیا پوچھ رہی ہو؟ کیا اس نے آدھی رات کو اٹھ کر بسکٹ نگل لئے" احمد کی بجائے اس کی اماں نے بپھر کر جواب دیا:

اور ریحانہ سہم گئی۔ چند لمحوں کے بعد جب وہ کچھ سمجھی تو اس نے شرمندگی سے کہا "میرا یہ مطلب نہیں تھا اماں۔ مجھے خیال تھا کہ شام چائے کے بعد بسکٹ موجود تھے۔ میں نے سوچا کہ پہلے تصدیق کر لوں تو نوکر سے بازپرس کروں۔ اب یہ اتفاق ہے کہ میری نظر سب سے پہلے احمد صاحب پر پڑی اور میں نے انہیں کو مخاطب کر لیا" اور وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ احمد دیر ہونے کا بہانہ کر کے ناشتہ کئے بغیر دفتر چلا گیا:

اور اکرم نے ریحانہ سے کہا "غلطی تمہاری ہی ہے تمہیں سوچ سمجھ کر بات کرنی چاہیئے، لیکن اب آئے دن اس قسم کے واقعات پیش آ رہے تھے اور اب ہر بات تو ریحانہ کی غلطی کہہ کر اسکے سر نہیں منڈھی جا سکتی تھی۔ تین چار دن کے بعد احمد کے ہاتھوں میں کھانے پینے کی چیزوں کے چند ڈبے دیکھ کر وہ حسبِ دستور خوش ہو کر آگے بڑھی "اہا۔ احمد صاحب کیا کیا لے آئے آپ؟" "آپ صبح ذکر کر رہی تھیں نا کہ چائے کی پتی ختم ہو گئی ہے اور یہ دیکھئے یہ کچھ پھلوں کے ٹین ہیں، یہ جام ہے، یہ مکھن اور جناب" احمد نے ایک خوبصورت سے ڈبے کو اٹھا کر کہا "اگر آپ بوجھ جائیے کہ یہ میں آپ کے لئے کیا لایا ہوں تو جانوں"

ریحانہ نے خوش ہو کر ہاتھ بڑھایا "دیکھوں"

"ادھر کیا دیکھتی ہو۔ یہ دیکھو یہ" اماں نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھوں میں بل تھما دیا:

ریحانہ غیر محسوس طور پر کانپ سی گئی۔ اس کے ہونٹ لرزے! اس نے احمد کی جھکی ہوئی آنکھوں کو دیکھا اور کچھ کہہ نہ سکی۔ اکرم نے خاموشی سے اپنا بٹوا نکالا:

"اکرم صاحب۔ اماں کا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں ان چیزوں کی قیمت ادا کر چکا ہوں" احمد نے بے بسی سے اکرم کو دیکھا۔ اکرم نے احمد پر بھرپور نظر ڈالی اور اس نے سوچا۔ احمد مجبور ہے اس کا کوئی قصور نہیں اور اس نے بات ٹال دی:

اور اسی دن اکرم نے خود ریحانہ سے کہا "اپنا سامان سنبھالو رانی۔ اب یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ ہماری علیحدگی سے احمد کو تکلیف ہوگی۔ ہماری موجودگی البتہ اس کے لئے تکلیف کا باعث ہے"

فرحت صاحب کے کانوں میں ان باتوں کی بھنک نہ پڑ سکی ــــ لیکن ان کی دوربیں آنکھوں نے کچھ دیکھا ضرور۔ انھوں نے اکرم سے کہا۔ اگر ریحانہ اسی سرعت سے دبلے پن کی طرف مائل رہی تو کچھ دن بعد اسے پا لینے کے لئے تمہیں یقیناً بستر کی چادر کو جھاڑنا پڑے گا" اور پھر سنجیدگی سے کہنے لگے "ریحانہ کی اور ان لوگوں کی طبیعتوں میں بہت اختلاف ہے۔ مجھے تو حیرت ہے اس نے تین ماہ یہاں کس طرح گذارے ہیں۔ میں تو اب یہاں اماں کے ڈر سے کانپتا ہوا داخل ہوتا ہوں اور ریحانہ کی آپا زاہدہ کی موجودگی سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔ جب تک مکان کا انتظام ہو، تم لوگ میرے یہاں چلے آؤ"

فرحت صاحب بامذاق مہذب اور سمجھ دار لوگوں میں سے تھے اور چونکہ انھوں نے ان سب سے زیادہ دنیا دیکھی ہوئی تھی اور انسانوں کو سمجھا تھا وہ کامیابی سے زندگی گذارنے کا ڈھنگ جانتے تھے:

"نہ میٹھا بن کہ چٹ کر جائیں بھوکے
نہ کڑوا بن کہ جو چکھے سو تھوکے"

یہ ان کا اصول تھا جو وہ اکثر ریحانہ کو بتایا کرتے تھے اور اسی بنا پر ہر ایک سے ان کے واجبی سے تعلقات تھے جن میں ناخوشگواری کا پہلو مشکل سے نکلتا ہے، لیکن ریحانہ کو انھوں نے نہ صرف زبانی طور پر اپنی چھوٹی بہن مان لیا تھا بلکہ ریحانہ کو ان کے برتاؤ میں ہمیشہ برادرانہ شفقت محسوس ہوتی تھی:

اور جب کچھ دن بعد ریحانہ اپنے بھیڑے سے گھر میں آباد ہو گئی، تو ظریف الحسن وہاں آ کر پھر چہکنے لگے "یہ ایک کمرہ تو بس میرے لئے ریزرو کر دیجئے مسز اکرم"

احمد نے ٹیلیفون پر کہا "ہم آپ کا گھر دیکھنے آرہے ہیں"

اور آپا زاہدہ نے گھر میں قدم رکھتے ہی ریحانہ کو گلے لگا لیا "بے مروت مجھے اکیلا چھوڑ کے چلی آئی" اور ریحانہ ٹھٹک گئی، لیکن فوراً ہی اس نے سوچا شاید وہ سب خرابیاں ایک جگہ رہنے کے باعث پیدا ہوگئی تھیں۔ اب سب ٹھیک ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ خوش ہوگئی، لیکن زیادہ دیر تک خوش نہ رہ سکی۔ "مگر" اسے خیال آیا۔ مسز ظہیر کی رکھائی کا کیا سبب ہے۔ اب انھیں آپا زاہدہ اور ان کی اماں سے اتنا زیادہ انس تو نہیں ہو سکتا کہ وہ ان کی ہمدردی میں اس سے ملنا جلنا تقریباً چھوڑ دیں۔ پھر۔۔

اور اکرم نے اسے بتایا کہ ان دنوں ظہیر صاحب کے اور اس کے درمیان کاروباری معاملات میں کچھ اختلاف پیدا ہو گیا ہے جو اس کھنچاوٹ کا سبب ہے ؛

"لیکن میرا تو اس میں کوئی قصور نہیں۔ پھر مجھ پر اس کا اثر کیوں پڑے" ریحانہ واقعی یہ بات نہیں سمجھ سکی تھی ؛

اور اکرم نے کہا "کھلی ہوئی سی بات تو ہے کند ذہن کہیں کی۔ تم میری بیوی نہیں ہو کیا" وہ اس زبردست حقیقت سے انکار نہ کر سکتی تھی اور جب فرحت صاحب نے اکرم کی تائید کی تو وہ خاموش ہوگئی، لیکن مطمئن نہ ہو سکی۔ آپا زاہدہ اور ان کی اماں کے غیر مناسب سلوک کی وجہ سے اسے احمد سے کوئی شکایت نہیں پیدا ہوئی تھی۔ اس نے بتانا چاہا مگر کچھ کہا نہیں۔ وہ بہت سی باتیں سوچتی تھی مگر بہت کم کہتی تھی ؛

اور اب اسے سوچنے کے لئے بہت کچھ مواد ملنے لگا۔ آپا زاہدہ نے کہا "ہم لوگ آپس میں کتنی اچھی طرح وقت گذارتے تھے، مگر لوگوں کو اس بات سے جلن ہوئی اور ہمارے درمیان غلط فہمیاں پیدا کر دی گئیں"

"کن لوگوں کو؟" اس نے چونک کر پوچھا۔ اور آپا زاہدہ نے جواب دینے کی بجائے ریحانہ سے ظہیر صاحب کے متعلق اس کی رائے معلوم کی "تم انھیں پہلے سے جانتی ہو۔ کیسے آدمی ہیں؟" اور ریحانہ کو اپنے سوال کے جواب کی ضرورت باقی نہیں رہی اور یکایک اس کی شوخی عود کر آئی ؛

"بہت اچھے۔ مجھے تو بیحد پسند ہیں" وہ ہنسی "اور آپ کو؟" اس نے پوچھا ؛

"اچھے ہوں گے، لیکن قابل اعتماد نہیں۔ مسز ظہیر بہت اچھی ہیں" ظاہر ہے۔ آخر آپ کی مسز ظہیر سے اتنی دوستی بھی تو ہے جو آپ کی پسندیدگی کا کھلا ہوا ثبوت ہے" ریحانہ نے کچھ کہنے کی خاطر کہا، لیکن وہ ان کے پہلے جملے پر غور کر رہی تھی۔ آپا زاہدہ کا اس غیر ضروری بات سے کیا مطلب ہے ؛

"دوستی ہی کیا۔ اس دنیا میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا" آپا زاہدہ نے گہری سی سانس لی اور پھر عجیب سے لہجے میں کہا ؛

"تمھارے تو یہاں بہت سے ایسے دوست ہیں جو تمھارے لئے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتے ہیں۔ ظہیر صاحب، فرحت صاحب، ظریف الحسن اور وہ رضیہ، جس کے یہاں تم پورا پورا دن گذار دیا کرتی ہو"

"ہاں" ریحانہ نے ان کے لہجہ کی طنز کو محسوس کیا، لیکن اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ "رضیہ بڑی اچھی لڑکی ہے" اس نے مختصراً کہا۔

"اور تمہاری موجودگی میں تو جیسے وہ تمہاری پرستش کرتی ہے" آپا زاہدہ کی آواز میں حدت تھی ؛

"ہاں" ریحانہ کچھ سوچ رہی تھی ؛

"تمہارا ذہن کس خیال میں الجھا ہوا ہے ریحانہ۔ پریشان کیوں ہو کیا سوچ رہی ہو؟" اور جواب سنے بغیر انہوں نے بظاہر غیر متعلق سی بات کہی "ظہیر صاحب صرف پندرہ دن کے لئے ہی تو باہر جا رہے ہیں نا" وہ عجیب انداز سے مسکرائیں ؛

اور ریحانہ کی کنپٹیاں جلنے لگیں۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اچانک جیسے اس کے سامنے سے تہ در تہ پردے سرکنے لگے۔ آپا زاہدہ کا اصلی رنگ اس پر واضح ہو گیا۔ مسز ظہیر کی رکھائی کا اصلی سبب اس سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ ظہیر صاحب کے متعلق اس سے مختلف لوگوں کے مختلف سوالات کرنے کی وجہ اس کی سمجھ میں آگئی۔ ظہیر صاحب کی خاموشی اور ایک بار اُن کا دفتر میں اس کے ٹیلیفون کر دینے پر یہ کہنے کا کہ "بھئی تم کام میں کیوں گڑبڑ کرتی ہو۔ دفتر کے بعد تو میں گھر پر ہی ہوتا ہوں، وہاں بات کیا کرو تو بہتر ہے" مطلب وضاحت سے اس کے سامنے تھا۔

اچھا۔ تو یہ سب کچھ یوں تھا اور ریحانہ بیگم آپ اپنے آپ میں ہی مگن رہیں۔ آپ کو آپا زاہدہ کے پھیلائے ہوئے جال کا بالکل علم نہ ہو سکا۔ لعنت ہے آپ پر!

آپا زاہدہ نے مسز ظہیر سے کیا کچھ کہا ہے۔ یہ پوچھنے کی ضرورت نہ تھی لیکن آپا زاہدہ نے ایسا کیوں کیا؟ ریحانہ سمجھ نہ سکی۔ اس نے سوچا خواہ مخواہ کون کسی سے الجھتا ہے۔ شاید یہ اس کی غلط فہمی ہی ہو۔ مسز ظ

کے برتاؤ میں ظہیر صاحب اور اکرم کے اختلاف کی بناء پر ہی سرد مہری آگئی ہو۔ ریحانہ نے کسی کے ساتھ کوئی برائی نہیں کی تھی۔ اور اسے اطمینان تھا کہ کوئی بھی اسے بلاوجہ نقصان نہ پہنچائے گا۔ آپا زاہدہ زندہ باد۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔

اور ایک دن رضیہ نے ریحانہ سے کہا "آپا زاہدہ کو تم سے بہت شکایتیں ہیں ریحانہ"۔ ریحانہ نے کچھ دیر خاموشی سے انتظار کیا کہ رضیہ ان شکایتوں کی وضاحت کرے۔ رضیہ کی عادت تھی کہ جب تک کوئی اس کی بات میں دلچسپی نہ لے وہ آگے نہ بڑھتی تھی۔ ریحانہ کا خیال تھا جو بات کسی کو کہنی ہے وہ بہرصورت کہے گا۔ کریدنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اور جب رضیہ کچھ نہ بولی تو ریحانہ نے کہا "مگر تمہیں تو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہے نا؟"

"ابھی تک تو میں متاثر نہیں ہوئی"۔ رضیہ نے دھیمے سے کہا اور ریحانہ کو محسوس ہوا کہ رضیہ کچھ باتوں کو اپنے ذہن میں اجاگر کر رہی ہے۔

"تمہیں یاد ہے ریحانہ میں نے ایک بار تمہیں بتایا تھا کہ نہ جانے کیا وجہ ہے کہ امی میری دوستوں سے زیادہ دنوں تک خوش نہیں رہ سکتیں۔ دو سال کا لمبا عرصہ خیریت سے گذر جانے پر میں خوش تھی کہ قدیم روایتیں مٹ رہی ہیں۔ امی واقعی تمہیں چاہتی تھیں ریحانہ اور ابا جان اب تک تم سے خوش ہیں"۔ رضیہ جلدی سے پلکیں جھپک کر مسکرائی۔

"اور تمہیں بھی اداس ہونے کی ضرورت نہیں"۔ ریحانہ عجیب طرح ہنسی

"تم تو جانتی ہو ریحانہ۔ ہمارا گھرانہ کتنا قدامت پسند ہے۔ یہاں سر سے دوپٹے کا کھسک جانا اور ذرا زور سے ہنس لینا بھی معیوب ہے۔"

"ہوں!" ریحانہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"اور آپا زاہدہ کی اماں ہی یہاں امی کی ہمعصر لوگوں میں سے ہیں۔ ظاہر ہے امی کو ان کی باتوں سے کتنی دلچسپی ہوگی۔ اور آپا زاہدہ کو سر ڈھانپ کے نیچی نظروں سے مسکرانا خوب آتا ہے۔ مسز ظہیر سے آپا زاہدہ کی بہت دوستی ہے اور مسز ظہیر دوسروں کی ہمدردی حاصل کر لینے کے گر سے واقف ہیں"۔

"ہوں!" ریحانہ بدستور سوچ رہی تھی۔

"اور ریحانہ۔ کیا انسان میں اتنی قدرت ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو کہیں کچھ اور کہیں کچھ ظاہر کر سکے۔ آپا زاہدہ مجھے اتنی عجیب عجیب باتیں بتاتی ہیں کہ مرد جیسی متلون مزاج ہستی کو کس طرح قابو میں رکھا جا سکتا ہے۔ پوچھو انھیں کیا معلوم؟ مگر وہ بہت پڑھی لکھی ہیں"۔ رضیہ نے مسخرے پن سے کہا۔

ریحانہ بے اختیار ہنس پڑی۔ "ہاں جب وہ شروع شروع میں مجھ سے خوش تھیں تو انھوں نے مجھے بھی بہت سی پتے کی باتیں بتائی تھیں۔ بتاؤں تمہیں؟"

"نہیں"۔ رضیہ نے بات کاٹی۔ "مجھے معلوم ہے کہ تم بہت بدسلیقہ اور بہت خود پسند ہو۔ دن چڑھے تک اپنے میاں کے سامنے بال بکھرائے پھرتی ہو۔ نہ جانے تم اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہو۔ اور تمہیں اپنی مدقوق سی شکل پر کیوں ناز ہے۔ آخر اکرم صاحب کب تمہیں، تمہاری حماقت آمیز حرکتوں کو برداشت کریں گے؟ دیکھتی رہو کیا ہوتا ہے۔ ہاں ذرا یہ تو بتا دو کہ تم کونسی فاؤنڈیشن کریم استعمال کرتی ہو؟ آپا زاہدہ پوچھ رہی تھیں"۔

وہ دونوں کھلکھلا کر ہنسنے لگیں اور ریحانہ نے ہنستے ہنستے سوچا۔ یہ سب کچھ اتنی ہنسی کی بات تو نہیں ہے۔

اور پھر جب ایک دن رضیہ نے طنز سے پوچھا "ریحانہ وہ کونسی بیہودہ کتابیں ہیں جنہیں میں گھر والوں سے چھپا کر پڑھا کرتی ہوں؟" تو ریحانہ کی ہنسی نے بالکل دم توڑ دیا۔ "آپا زاہدہ خوش رہو۔ تمہاری زہر پاشیوں میں گل کھلانے کی اہلیت ہے"۔ اس نے دل ہی دل میں کہا اور رضیہ کو کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنی صفائی پیش کرنے کی قائل نہیں تھی۔ اس کے بے تکے عقیدوں میں سے ایک خیال یہ بھی تھا کہ جب کوئی خود سوچنے سمجھنے کی قوتوں سے کام لینا چھوڑ دے تو اسے سمجھانے کی کچھ ضرورت نہیں اور پھر رضیہ جو اس کی نظروں میں عام لوگوں سے بلند تھی۔ "رضیہ!" اس نے حسرت سے دل ہی دل میں رضیہ کو اس طرح پکارا جیسے وہ اس سے بہت فاصلہ پر ہو۔

اور پھر آپا زاہدہ نے ریحانہ کو ٹیلی فون پر اطلاع دی۔ "یہ جو نئی صاحبہ آئی ہیں مسز حمید صغر۔ انھیں تم سے ملنے کا بہت اشتیاق ہے۔ ہم نے اُن سے تمہاری بہت تعریفیں کی ہیں"۔ "تو شاید وہ مجھ سے کبھی نہ ملیں"۔ ریحانہ نے بے ساختگی سے کہا اور پھر اس نے سنبھل کر ایک دم بات پلٹ دی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ آپا زاہدہ کو اس بات کا علم ہو جائے کہ وہ انھیں کس حد تک سمجھ چکی ہے۔

اور آپا زاہدہ بار بار ریحانہ کو اس بات کا احساس دلانے لگیں کہ مسز حمید صغر کا اس سے اب تک نہ ملنا ان کی بہت زیادتی ہے، ہوگی چلو نہ؟ وہ جن لوگوں سے ملی تھی، ان میں سے کس نے اسے سمجھا تھا۔ فرحت صاحب کی مصروفیتیں بہت بڑھ گئی تھیں۔ رضیہ کو گھر کے کاموں سے یک لخت اتنی دلچسپی ہو گئی تھی کہ اس کی طولانی باتوں میں اختصار پیدا ہو گیا تھا۔ مسز ظہیر جب بھی اس سے ملتیں، بڑے اخلاق سے کہتیں "اتفاق سے آپ سے بہت دن سے ملاقات نہ ہو سکی"۔

"جی ہاں۔ اتفاق ہی تو ہے" وہ اسی اخلاق سے سیدھے سادے لہجے میں جواب دیتی ÷

ظہیر صاحب بدستور خاموش تھے۔ البتہ ظریف الحسن پرانی وضعداری سے اسی طرح چہکا کرتے تھے اور کچھ دن چہک لو میاں ظریف الحسن، کب تک آپا زاہدہ کے اثر سے محفوظ رہ سکو گے۔ وہ دن بہت دور نہیں ہے، جب زمانہ بھر کی برائیاں مجسم ہو کر ریحانہ کی شکل اختیار کر لیں گی ÷

اور جب کافی عرصہ کے بعد ایک پارٹی کے اختتام پر مسز حمید صغر کی مڈبھیڑ مجبوراً ریحانہ سے ہو گئی (وہ بار بار اس کے قریب سے گذری تھیں، لیکن چونکہ وہ چاہتی تھیں، کہ ابتدا ریحانہ کی طرف سے ہو، بار بار اس کے وجود کو نظرانداز کر چکی تھیں۔) انھوں نے ریحانہ سے کہا "آپ سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ آپا زاہدہ نے آپ کی بہت تعریفیں کی ہیں"

اور سنبھلتے سنبھلتے بھی ریحانہ کے منہ سے نکل گیا "اسی لئے آپ نے ابتک مجھ سے ملنے کی زحمت نہیں کی"

"وہ آپ کا مکان بہت دور ہے نا کسی دن ہمارے یہاں آیئے" مسز حمید صغر نے ریحانہ کو دعوت دی ÷

"انشاءاللہ۔ ضرور۔ لیکن میرے اور آپ کے گھر کے درمیان اتنا ہی فاصلہ ہے، جتنا آپ کے اور میرے گھر کے درمیان"

اور اس سے پیشتر کہ وہ کچھ بولتیں، آپا زاہدہ نے چونک کر کہا "میں نے آپ کا مسز اکرم سے تعارف کرا دیا ہے نا؟"

اور واپسی پر مسز حمید صغر نے آپا زاہدہ سے کہا "مسز اکرم کو اپنی شکل پر بہت ناز معلوم ہوتا ہے"

"ہاں۔ دیکھو تو صورت نہ شکل۔ اور مزاج پریوں کے سے۔ دیکھا تمہارے دیکھ کر کس طرح جل گئی تھی" آپا زاہدہ نے خوش ہو کر کہا ÷

"بھئی شکل میں تو کوئی برائی نظر نہیں آتی اور کپڑے تو وہ خود بہت اچھے پہنے ہوئے تھیں" حمید صغر خواہ مخواہ بول پڑے اور آپا زاہدہ کو غصہ آگیا۔ یہ حضرت بھی یونہی سے نکلے۔ عام مردوں کی طرح نرے بیوقوف۔ آخر یہ سب لوگ ریحانہ کو آپا زاہدہ کی نظروں سے کیوں نہیں دیکھتے؟"

آپا زاہدہ کو معلوم تھا کہ ریحانہ کمبخت اتنی چالاک ہے کہ ایک بار کوئی اس سے مل لے تو وہ، آپا زاہدہ کے الفاظ میں، اسے بڑے مزے میں پھنسا لیتی ہے۔ اسی سے انھوں نے اس کے متعلق بہت سے قصے گھر کے ان لوگوں کو سنائے تھے کہ وہ اس سے دور رہیں اور اکیلے میں مسز حمید صغر کو نصیحت کی تھی،

"ڈیر۔ تم تو بہت بیوقوف نہیں دنیا کا کچھ تجربہ نہیں ہے۔ اپنے میاں کی محبت پر زیادہ بھروسہ مت کرو۔ ریحانہ سے دور ہی رکھنا"

مسز حمید صغر نے جو یوں بھی تصویر کے تاریک رُخ پر زیادہ توجہ دیتی تھیں، بڑی خوشی سے ان کی نصیحت مان لی تھی اور مسز صغر کی عادت تھی کہ جو کچھ ان کے دل میں آتا تھا بڑی صفائی سے اس کا اظہار کر دیتی تھیں۔ انھوں نے کہا "مگر آپا زاہدہ۔ ریحانہ تو شادی شدہ ہے۔ مجھے تو زیادہ خطرہ آپ کی طرف سے ہے"

"تمہیں نہیں معلوم ڈیر۔ مردوں کو زیادہ دلچسپی کدھر ہوتی ہے" انھوں نے بے دھیانی میں ٹھنڈی سانس لی "اور مجھ سے کیا خطرہ، میں تو بالکل بے ضرر ہوں"

"ٹھیک ہے آپا زاہدہ۔ آپ تو بالکل بے ضرر ہیں" مسز حمید صغر نے انھیں غور سے دیکھتے ہوئے شرارت سے کہا اور جب یہ بات انھوں نے اپنے میاں کو سنائی تو حمید صغر کے شرارت پسند ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ کیوں نہ آپا زاہدہ کو بیوقوف بنایا جائے۔ ذرا دل لگی ہی رہے گی۔ انھوں نے اپنی بیوی سے سازش کی۔ نہ جانے دونوں میاں بیوی کو کس بنا پر یہ یقین تھا کہ دل لگی، دل لگی ہی رہے گی، دل کی لگی نہ بن پائے گی۔ اور حمید صغر نے آپا زاہدہ سے کھل کر باتیں کرنا شروع کر دیں لیکن وہ کتنا گھبرائے جب انھوں نے دیکھا کہ تھوڑی سی جھجک کے بعد آپا زاہدہ نے بڑی بے تکلفی سے فرائڈ کے فلسفے پر بحث کرنا شروع کر دی ہے۔ وہ زیادہ تر انگریزی بولتی تھیں، جو ان کی اماں نہیں سمجھتی تھیں۔ ایک دن موقع پا کر وہ آپا زاہدہ کے پیچھے پیچھے باورچی خانے میں گھس گئے ÷

"آپا زاہدہ۔ آپ کو اللہ میاں نے ان فضول کاموں کے لئے نہیں بنایا ہے۔ چائے میں بناؤں گا۔ آپ بیٹھئے" حمید صغر نے اسٹول ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ÷

"مگر ———" آپا زاہدہ نے جن کے دل میں اچانک انجانی سی خوشی ہلکورے لینے لگی تھی، غیر شعوری طور پر اٹھلا کر اور غیر ضروری طور پر شرما کر احتجاج کیا ÷

"نہیں۔ آپ کے اتنے اچھے ہاتھ آگ جلانے میں خراب ہو جائیں گے، بس آپ میرے سامنے بیٹھی رہیئے" حمید صغر نے دیا سلائی سنبھالتے ہوئے کہا ÷

آپا زاہدہ کا دل اچھلا، ڈوبا اور بھر اچھلنے لگا۔ انھوں نے کن انکھیوں سے

حمید صغر پر نظر ڈالی اور پھر اپنے ہاتھوں کو جو خود انھیں بھی پسند نہیں تھے، دوپٹے کے آنچل میں چھپا لیا۔ یہ ستائیس اٹھائیس سالہ خوش شکل سا لڑکا کیا ان کا مذاق اڑا رہا ہے؟ انھوں نے سوچا، مگر آج کوئی نئی بات نہیں حمید صغر ہمیشہ ہی ان کی تعریف کرتا رہا ہے۔ خیر، ظہیر صاحب جیسے بد مذاق آدمی کا تو خیال ہی انھیں جھنجلا دیتا تھا۔ ظریف الحسن نے ان کی باتیں غور سے سنی تھیں۔ اکرم نے ان کی معلومات کی وسعت کو سراہا تھا، لیکن یہ پہلا موقع تھا، جو کسی کی نظر ان کے جسمانی محاسن پر پڑی تھی۔ انھوں نے زیادہ غور سے حمید صغر کو دیکھا جس کی پیشانی پر شاید آگ کے قرب کی وجہ سے پسینے کے قطرے چمک رہے تھے، یا آپا زاہدہ کی نگاہوں کی گرمی کا اثر تھا، کچھ پتہ نہیں لیکن وہ آپا زاہدہ کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے کچھ گھبرا ضرور گیا تھا۔

"کچھ رنگ بدل رہی ہے میری انکی بات چیت" وہ دل ہی دل میں گنگنایا اور اس نے مزید شرارت سے کہا "کہیں اماں ناراض نہ ہو جائیں کہ ہم اکیلے یہاں کیا کر رہے ہیں۔ بڑی مشکل ہے، ذرا دیر کو کھل کے باتیں کرنے کا موقع نہیں ملتا" اور اس نے چلنے کی ٹھانی۔

"سنو تو حمید" آپا زاہدہ نے آہستہ سے اسے پکارا۔ مگر حمید صغر نے جیسے کچھ نہیں سنا۔ آپا زاہدہ نے سوچا حمید اُن سب سے بہت اچھا ہے، بہت زیادہ اچھا اور بہت سمجھدار۔ اسے ریحانہ سے ملنے کا موقع نہیں ملا ورنہ شاید وہ بھی باقی سب کی طرح اس پر اتنی توجہ نہ دیتا۔ دیکھنا اگر تمہیں سب کی نظروں سے گرا یا نہ ہو تو میرا نام زاہدہ نہیں" انھوں نے ریحانہ کو غائبانہ دھمکی دی۔

اور پھر کچھ ایسا ہوا کہ کئی ماہ کے بعد مسز حمید صغر کو آپا زاہدہ کی کسی بات پر بُرا مان کر اچانک خیال آیا کہ ریحانہ سے ملنا تو چاہیئے۔ پتہ تو چلے کہ آپا زاہدہ نے جتنے الزامات اس پر لگائے ہیں، ان میں کتنی اصلیت ہے۔

اور پھر کچھ ایسا ہوا کہ مسز حمید صغر نے آپا زاہدہ کی کہی ہوئی سب باتیں ریحانہ کے سامنے دہرا دیں۔ اور ریحانہ کو پتہ چلا کہ کس طرح اس نے ظریف الحسن کو پھانسنے کی کوشش کی۔ کیسے احمد پر ڈورے ڈالے جو آپا زاہدہ اور ان کی اماں کی آمد کی وجہ سے بال بال بچ گیا۔ فرحت صاحب کو بیوقوف بنایا۔ ظہیر صاحب کو تو خیر پاگل کر ہی دیا۔ حد ہے کہ رضیہ کے ساٹھ سالہ ابا بھی، اس سے متاثر ہیں۔

ریحانہ سنتی رہی، ہنستی رہی۔ جیسے کوئی غیر متعلق سی دلچسپ کہانی سن رہی ہے۔ اور اس نے صرف اتنا سوچا کہ مسز حمید اصغر اسے یہ سب کچھ کیوں بتا رہی ہیں۔ اور انہیں کم از کم الفاظ میں احتیاط کرنی چاہیئے تھی۔

مسز حمید اصغر کو غصہ آ رہا تھا کہ ریحانہ کو ان باتوں پر غصہ کیوں نہیں آ رہا۔ کم از کم آپا زاہدہ کی اس بات میں بالکل سچائی ہے کہ ریحانہ حد سے زیادہ بیغیرت ہے۔

اور مسز حمید صغر کے جانے کے ریحانہ نے سوچا "اُفوہ رے میری بے خبری! میرے ارد گرد چاہنے والوں کا اتنا مجمع تھا۔"

"تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں" اس نے مسز صغر کی باتیں ہنس ہنس کر دہراتے ہوئے اچانک رُک کر اکرم سے پوچھا۔

"تم اتنی بیوقوف ہو رانی! ان بے سروپا باتوں سے متاثر ہو رہی ہو۔ ایں؟" اکرم نے پیار سے اسے تھپتھپاتے ہوئے کہا "چلو آپا زاہدہ کے یہاں چلیں۔ مجھے ان پر بے حد ترس آ رہا ہے۔ اگر آج سے دس پندرہ سال پہلے ان کی شادی ہو گئی ہوتی۔ اور ان کا نوٹس لیا گیا ہوتا تو انھیں تمھارے اس شدت سے احساس کمتری نہ ہوتا۔ خبردار جو ان بے چاری سے لڑنا مت۔"

"تم مجھ سے بھی بے غیرت ہو اکرم" دونوں ہنسنے لگے۔

مسز حمید صغر پردہ داری کی قائل نہیں تھیں۔ کچھ ایسا ہوا کہ یہ سب باتیں پھوس میں لگی ہوئی آگ کی سی تیزی سے سارے گھر میں پھیل گئیں اور وہ چھوٹی سی جماعت جو آپا زاہدہ کی کوششوں سے منتشر ہو گئی تھی، جیسے پھر ایک مرکز پر سمٹ آئی اور ریحانہ کہیں اور ان کہی ہمدردیوں کے ڈھیر میں جیسے دب سی گئی۔ لیکن ریحانہ کو ان ہمدردیوں سے کچھ ہمدردی نہ تھی، وہ چاہتی تھی کہ اسے تنہا چھوڑ دیا جائے، مگر اس نے اپنی اس خواہش کا اظہار نہیں ہونے دیا اور لوگ منتظر تھے کہ ریحانہ کا اگلا قدم کیا ہو گا، وہ کس طرح آپا زاہدہ سے اپنی توہین کا بدلہ لے گی۔ عام خیال یہ تھا کہ وہ آپا زاہدہ پر برس پڑے گی اور یوں خوب چہل پہل ہو جائے گی، لیکن بڑے غور سے ان ترکیبوں کو سنتی رہی کہ آپا زاہدہ کو کس طرح انتقاماً بدنام کرنا چاہیئے اور خاموشی سے انسانی فطرت کی شر پسندی کا مطالعہ کرتی رہی۔

اور خود آپا زاہدہ کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ریحانہ اسی طرح ان سے مل جل رہی ہے۔ وہ ظہیر صاحب کے متعلق زیادہ باتیں کرنے لگی تھی۔ ظریف الحسن کو زیادہ چھیڑتی تھی اور بات بات پر احمد کو مخاطب کرتی تھی۔ "بے حیائی تیرا ہی آسرا ہے" آپا زاہدہ کے ساتھ ساتھ باقی سب نے بھی یہی سوچا اور مسز حمید صغر نے

تو گویا جل کر صاف صاف کہہ بھی دیا۔ "میں تو آپ کو بالکل نہیں سمجھ سکی۔ مسز اکرم اگر آپ کی جگہ کوئی اور خود دار شخص ہوتا تو آپا زاہدہ کی شکل بھی نہ دیکھتا۔ محض آپ کی خاطر میں نے ان سے ملنا جلنا چھوڑ دیا ہے۔ اور آپ ہیں کہ ــــــ"

"میری خاطر لوگوں کو کتنی عزیز ہے۔ اُنوہ!" ریحانہ نے سوچا اور ہنس دی۔ اس کی ہنسی میں تلخی پیدا ہو چلی تھی۔

اور ظہیر صاحب نے جو شاید ریحانہ ہی کی خاطر اس سے بات چیت میں احتیاط برت رہے تھے اور اب وہ سب کچھ منظر عام پر آ جانے کے بعد وہ خدشہ جو واقعہ کے ہونے سے پہلے زیادہ تکلیف کا باعث ہوتا ہے، مٹ چکا تھا۔ ریحانہ سے کہا۔ "اب کیا کرو گی؟"

"کیا کروں؟" اس نے پوچھا۔

"وہی جو تمہاری چہیتی آپا زاہدہ نے تمہارے ساتھ کیا ہے۔" ظہیر صاحب کو واقعی بہت غصہ آ رہا تھا۔

ریحانہ نے سوچا کیا آپا زاہدہ کی من گھڑت کہانیوں کا ظہیر صاحب کی زندگی پر کچھ اثر پڑا ہے؟ ہو سکتا ہے۔ مسز ظہیر کوئی فرشتہ تو ہیں نہیں اور ہو سکتا ہے کہ وہ ریحانہ سے بات چیت میں احتیاطاً مسز ظہیر کی خاطر اور اپنے بچاؤ کے لئے برت رہے ہوں۔

لیکن ریحانہ کو ظہیر صاحب کے منہ سے اتنی سستی سی بات سن کر بہت تعجب ہوا وہ انھیں عام لوگوں سے زیادہ سمجھدار سمجھتی تھی۔

اور ظہیر صاحب نے قدرے تلخی سے کہا۔ "میں نہیں سمجھ سکتا کہ وہ کونسی وجہ ہے جس کی بنا پر تم آپا زاہدہ سے بدلہ لینے پر تیار نہیں ہو۔"

"میں نہیں چاہتی کہ آپا زاہدہ سمجھیں کہ میں نے ان کی ذلیل باتوں کو کچھ اہمیت دی ہے اور میں ان سے شکست کھا گئی ہوں۔" ریحانہ نے دھیرے سے کہا۔

"کیا فلسفہ ہے ماشاءاللہ۔" ظہیر صاحب نے طنزیہ کہا۔ "تم قطعی ہار گئی ہو تم میں مقابلہ کرنے کی قوت بالکل نہیں ہے۔"

ریحانہ نے چونک کر ظہیر صاحب کو دیکھا اور اچانک تیزی سے کہا "کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں انہیں کی سطح پر آ گروں؟" ریحانہ نے سوچا۔ کوئی نہیں سمجھتا اس کی باتوں کو کوئی نہیں سمجھے گا اور اچانک اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ظہیر صاحب خاموشی سے اسے دیکھتے رہے اور پھر انھوں نے کہا۔ "شاید تم ٹھیک ہی کہتی ہو۔ اب میں اس مسئلہ پر کبھی کچھ نہیں کہوں گا۔ دراصل ان بے سروپا باتوں سے مجھے بے حد تکلیف ہوئی ہے اور اسی لئے مجھے تم پر غصہ آ گیا کہ تم نہایت بے حسی کا مظاہرہ کر رہی ہو۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ میں غلطی پر تھا۔ پھر بھی تمہیں پورے طور پر نہیں سمجھ سکا۔" اور ظہیر صاحب خواہ مخواہ ہنسنے لگے اور مسز ظہیر نے مزے لے لیکر ریحانہ کو بتایا کہ آپا زاہدہ نے کس کس طرح انھیں ریحانہ کے خلاف اکسانے کی کوشش کی ہے۔

"کامیاب کوشش، لیکن اب یہ سب کچھ اسے کیوں بتایا جا رہا ہے۔ اگر واقعی سب کو پہلے سے آپا زاہدہ کی باتوں میں شرارت اور جلن کا عنصر دکھائی دیتا تھا تو سب اس حد تک متاثر کیوں ہوئے اور اب سب کے سب کیوں اپنی سمجھ داری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ انسان کو سمجھنا کتنا مشکل ہے۔" اس نے سوچا۔

اور کھلی ہوئی کھڑکی کی چوکھٹ پر ٹکے ہوئے سر کو اٹھاتے ہوئے اس نے چاروں طرف بکھری ہوئی چاندنی کو بے بسی سے دیکھا اور آنکھیں بھر آئیں۔ پورے دو ماہ گندی ہوئی باتوں کو دہرائے بغیر ہنستے کھیلتے گذار کر بعد آج ریحانہ نے انھیں کس طرح ذلیل کیا تھا۔

آپا زاہدہ جنہیں ریحانہ کا سلوک دیکھ اپنے ضمیر کے مجرم ہونے کا احساس ہونے لگا تھا آج اچانک کہہ بیٹھیں۔ "مجھے معلوم ہے ریحانہ کہ میرے خلاف تم سے کیا کیا باتیں کہی گئی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے کچھ باتیں ضرور کہیں اور وہ اس لئے کہ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ تم مجھ سے جلتی ہو خواہ اکرم بھائی کا مجھ سے باتیں کرنا تمہیں بالکل پسند نہیں تھا۔ ایک بار میری بہت بے عزتی کی تھی۔ میں نے کھانے کی میز پر کوئی چیز اکرم بھائی بڑھائی تو تم نے لینے سے منع کر دیا۔ کیا تم نے سمجھا تھا کہ میں انھیں ـــ تھی؟"

اچھا تو یہ یوں تھا۔ ریحانہ نے سوچا۔ اسے یہ واقعہ یاد نہ تھا لیکن اس کی عادت تھی کہ وہ اکرم کے روز بروز موٹا ہوتے جانے کی وجہ سے زیادہ کھانے پر ٹوکا کرتی تھی۔

اور ریحانہ نے کہا۔ "خیر آپا زاہدہ، جو نہ ہونا چاہئے تھا، وہ ہو چکا۔ بتائیے کہ آپ نے ظہیر صاحب کو تختۂ مشق کیوں بنایا؟ آپ نے یہ مسز ظہیر کے دل میں غلط فہمیوں کے پیدا ہو جانے کا ان دونوں کی خوش زندگی پر تلخ اثر پڑ سکتا ہے اور اگر اکرم بچپن سے مجھ سے واقف نہ ہوتے تو ان کا متاثر ہو جانا بھی کچھ تعجب آمیز نہ تھا۔ اور پھر ــــــ پھر کیا ہوتا۔ کیا ملتا آپا زاہدہ؟" ریحانہ غیر محسوس طور پر کانپ سی گئی۔

آپا زاہدہ نے کچھ پریشان ہو کر سچ بولا۔ "دراصل میں نے دیکھا

(باقی صفحہ ۸۵)

حشرِ نو

ہادی حسین

مرے ذہن کے خلاؤ، میں تمہیں کیسے دکھاؤں؟

مرے سینے کے سکوتو، میں تمہیں کیسے سناؤں؟

مرے گم شدہ خیالو، میں تمہیں کہاں سے لاؤں؟

مری خلوتو، میں کیونکر تمہیں انجمن بناؤں؟

مری شاعری کا ایواں ہے بہت دنوں سے ویراں

مرے اجڑے، بچھڑے خوابو، میں تمہیں کہاں بساؤں؟

مری حسیاتِ مردہ، میں تمہیں جلاؤں کیونکر؟

میں جہانِ دل میں کیونکر کوئی حشرِ نو اٹھاؤں؟

مری خاک کے شرارو، مرے آنسوؤں کے تارو

میں کس آسمانِ غم سے تمہیں جا کے توڑ لاؤں؟

مرے تابناک داغو، مرے سینے کے چراغو

کوئی لو نئی لگا کر تمہیں کس طرح جلاؤں؟

مرا سینہ کب سے گنبد ہے مزارِ شاعری کا

مرے جذبو، پھر سے کیونکر تمہیں بولنا سکھاؤں؟

تخلیقِ سحر

صدیق کلیم

یہ مقاصد کی کشاکش یہ امنگوں کا تضاد
زندگی خود زندگی سے برسرِ پیکار ہے
نیم روشن رہگزاروں کی چمک بڑھتی گئی
شاید اندھیارے کی منزل طے ہو جانے کی کرن
زیست کا یہ ارتقا ہی زیست کی تعبیر ہے
زندگی خلاق لمحوں کی امر تصویر ہے
بارہا ہم نے ستاروں پہ کمندیں ڈال دیں
بارہا افلاک تک پھیلا ہے اپنا اقتدار
بارہا امید کی شمعیں فروزاں ہو گئیں
بارہا ہم نے بسائے اس زمیں پر خلد زار
لیکن اپنی آرزوئیں ہیں کہ دیو خشمناک
زیست کی تخریب بھی ہے ابنِ آدم کا مزاج
اختیارِ زیست کے پہلو میں جبر احتیاج
آرزوؤں کی کشاکش ہی جہنم بن گئی
اب تو اک اک سانس پر جی کی دھڑکن رک گئی
موت کی بے مہر ظلمت روشنی پر چھا گئی
دھیرے دھیرے کس روش پر آ گئی یہ زندگی
دھیرے دھیرے بجھ گئی گہنا گئی یہ زندگی
ہم ہیں اک سلجھی ہوئی الجھی انجمن کے اسیر
گو یہ شیریں دلکشی زہراب بن کر رہ گئی
پھر بھی انساں کی قسم اس زندگی سے پیار ہے
شاید اب بھی آرزو کی روشنی بڑھتی رہے
شاید اب یہ تیرگی خود ہی سحر پیدا کرے
حسن کی تخلیق ہی انسان کا اظہار ہے
شوق پھر زندہ ہوا ہے آس پھر بیدار ہے

نین سیج

(کافی)

بُلھے شاہ

مترجمہ: شفقت تنویر مرزا

راہ تکوں میں توری ساجن کرو تو پھیرا
بنتی [illegible] ساجن بنتی [illegible] کوئی
نین سیج بچھائی ہے میں تیری ہوئی
انگ لنگ کر آئے شاہ عنایت میرا

راہ تکوں میں توری ساجن، کرو تو پھیرا
کون ہے جا کے کہے پیا سے بات میری
بھول ہوئی کیا ہے، میں تو داسی تیری
بناں ترے مورا کون ہے؟ جی ڈھاؤ نہ میرا

راہ تکوں میں توری ساجن، کرو تو پھیرا
برہا ہوک اٹھی ہے، ہردے تیر تیرا
پریم جال میں پھانس کے لے گیو منوا میرا
توڑے مورے بیچ میں اب کس کا ڈیرا

راہ تکوں میں توری ساجن، کرو تو پھیرا
کنگن چوڑیاں بتیاں میں، تن جوگن جوڑا
پاگل کر کے ساجن! مجھ رانجھن کو چھوڑا
نئے نویلے دکھ آئے، برہا نے گھیرا

راہ تکوں میں توری ساجن، کرو تو پھیرا
موری ساری سکھیاں بھی اب آن پھنسی ہیا
لہک لہک کر جلتی آگ میں آن جلی میں
آن بنی اب سر پہ کیسا جھگڑا جھیڑا

راہ تکوں میں توری ساجن، کرو تو پھیرا

کسے خبر

شاہین غازی پوری

ڈھلی ڈھلی سی ہوائیں خرام آہستہ
وہ دور نیم کی شاخوں سے جھانکتا مہتاب
روش روش پہ ہے ساون کی چاندنی رقصاں
سرک رہا ہے کنول سے رخ دن نظر سے حجاب
تمام پھیل گئے قافلے بہاروں کے
فضائے گلشن ہستی میں کھو گیا ہوں میں
تصورات میں تنہا سکون ملتا ہے
غمِ حیات سے بیگانہ ہو گیا ہوں میں
کچھ اس طرح سے پریشاں ہیں پیڑ کے سائے
کہ جیسے روح لرزتی ہو ماہ پاروں کی
بکھرتی ہوئی نغمے رواں دواں ہے ندی
کہ جیسے گاتی ہو دوشیزہ کوہساروں کی
کچھ ایسا ہوتا ہے محسوس چاندنی کے تلے
جبینِ شب پہ ہو جیسے غرورِ عظمت کا
کہ جیسے وادیٔ ماہ و نجوم میں جا کر
کسی نے چھیڑ دیا ہو رباب فطرت کا
کہ جیسے خواب بسے ہوں نگاہِ نرگس میں
کہ جیسے رقص کناں ہو شباب فطرت کا
کہ جیسے پھول بچھائے گئے ہوں راہوں میں
کہ جیسے محوِ سفر کارواں ہو نکہت کا
ڈھلی ڈھلی سی ہوائیں خرام آہستہ
کہ جیسے صحنِ چمن میں چلے نگارِ حسیں
تمام پھیلے ہوئے قافلے بہاروں کے
کسے خبر کہ زمیں پر بھی ہے بہشتِ بریں

❋

وادیٔ اُلفت

طاہرہ کاظمی

آج پھر وادیٔ اُلفت میں مجھے میرے قدم
رات کے پچھلے پہر کھینچ کے لے آئے ہیں
کس قدر دلکش و مانوس ہے یہ خوابِ حسیں
ہے مگر کیسا یہ چھایا ہوا تاریک غبار؟
ایک ہی شب میں یہ دیوارِ ستم کی تعمیر
اور ہر در پہ یہ جبروت کی خونیں تحریر
"عشق قانون و قواعد میں گرفتار رہے!
روشنی روح کی اور روح سے بیزار رہے؟"
تھے جہاں لالہ و سنبل ہیں وہیں سنگِ مزار
جلوہ فرما ہے سیہ پوش ہیولوں کی قطار
کتنی ظلمت ہے فضاؤں کے جلو میں رقصاں
شب کی آغوش میں سہمی ہوئی تنہائی میں
سینکڑوں غنچہ و گُل، نرگسِ شہلا کے چراغ
گھُٹ کے رہ جائیں گے ماحول کی تاریکی میں

درونِ دل

ضمیر اظہر

نگارِ سکوں کی تمنّا میں اکثر
سمندِ تجسس کو مثلِ صبا اجنبی وادیوں میں پھرایا ہے میں نے
برنگِ تخیّل خیاباں خیاباں، بیاباں بیاباں
پہاڑوں کی حلقہ نما، گھومتی رہگذاروں میں اس کو گھمایا ہے میں نے
تھکن سے ہوا چُور تو از سرِ نو نئے راستوں پر چلانے کی خاطر
جواں مرغزاروں کا منظر دکھایا
گھنی چھاؤں سے اسکے دل کو لبھایا
اسے گنگناتی ہوئی ندیوں کا حسیں آبشاروں کا پانی پلایا
بہارِ سکوں کی تمنا میں میں نے
کہاں تک نہ پھیلایا دامِ محبت
کہاں پر نہ دوڑایا اسپِ تجسس
مگر روئے منزل نہاں ہی رہا حسنِ نادیدہ و آرمیدہ کی صورت
اُبھر کر بہم وقت کی رَو سے اک ایسا لمحہ خیالوں کی خلوت میں آیا
عجب معجزہ جس نے آکر دکھایا
کہ پیشِ نظر وا دریچہ تھا دل کا
اور اس میں نگارِ سکوں صاف و براق نورانی پوشاک پہنے کھڑی تھی
لبوں پر بہارِ تبسم عیاں تھی!

کرن نے کہا

فضا ابن فیضی

سورج کی اَن تھک اُڑان — [illegible] گل پیرہن
تعبیرِ الماس و گہر — عینِ تجلی در نظر
صبحِ ازل کی آبرو — پھولوں کی معصوم آرزو
پہلوئے شبنم کی خلش — پروردۂ سوز و تپش
جس کی نگاہِ دلبری — پیرایۂ رامش گری
سرسبزیٔ شاخِ نمو — صد پارہ سونے کا سبو
بلور پگھلا یا ہوا — ہیرے کا دل چیرا ہوا
یا نور میں ڈوبا ہوا — تارِ نظر کا سلسلہ
وارفتۂ پندارِ ضَو — تنویرِ شبنم جس کی لَو
موجِ غبارِ صاعقہ — رنگِ شکستِ آئینہ
اک آبشارِ گوہریں — جس کا طلوعِ دلنشیں
آئینۂ عرشِ بریں — جس کی جبینِ احمریں
جس کے تجسس میں رہی — شبنم کی ناآسودگی
جس کی نگاہوں کی تھکن — ابرو پہ جلووں کے شکن
اُتری افق سے خاک پر — صد طورِ فاراں در نظر
گویا ہوئی یوں پھول سے — اے میری جاں صدقے ترے

اے پھول! اے رنگِ سحر
اے کعبۂ حسنِ نظر

تو مہر کی ہے آرزو — گلشن کو تیری جستجو
مستی طرازِ انجمن — تیری نظر کا بانکپن
پندارِ شبنم تجھ سے ہے — نکہت مجسم تجھ سے ہے
سیمِ سمن کا تاج ہے — تو خاک کی معراج ہے
پروردۂ نازِ ہوا — عنوانِ آغازِ صبا
ہونٹوں کا نم شہد آفریں — پلکوں کے سائے احمریں

مشکیں نفس، رنگیں نظر — سب کچھ ہے تو المختصر
اے خاتمِ نزہت نگیں — لیکن ہوا یہ طرزِ حسیں
آزاد ہے نکہت تری — پابند ہے فطرت تری
گو تو سراپا ہوش ہے — آتش تری خاموش ہے
اے کردگارِ رنگ و بو — خالی ہے کیوں تیرا سبو؟
اک بے سبب آزردگی — کیوں ہے دخیلِ زندگی؟
ہیں کس لئے تیرے قدم — ناآشنائے ذوقِ رم؟
کیوں ہے متاعِ رائیگاں — تیرا جمالِ زرفشاں؟
تو خاک سے پیدا ہوا — اور خاک پیما ہی رہا
ناپے مری پرواز نے — عرش و زمیں کے فاصلے

تیری ضعیفی بارہا
تجھ سے ہوئی گرمِ نوا

بن ایک "فردوسِ رواں" — اے "جلوۂ خاک آشیاں"
کس دام میں ہے قید تو — صیاد ہے یا صید تو؟
یہ دامِ رنگیں توڑ دے — حالات کا رُخ موڑ دے
ہیں نصب ہمت کے علم — صحرا بہ صحرا، یم بہ یم
تا کے بہ حسنِ منفعل — برقِ تجلی پا بہ گل؟
فکرِ بلندی شرط ہے — عرفانِ ہستی شرط ہے
یہ کائناتِ گلستاں — ہیں اس سے آگے بھی جہاں
قیدِ مقامی سے نکل — ہاں اس غلامی سے نکل
ہیں تیری شمعِ رہگزر — لے نکہتوں سے بال و پر

آ! اُٹھ کے میرے ساتھ آ!
گلشن سے کاشانہ اُٹھا!

●

مشرقی پاکستان کی شاداب ٹہنیاں

پریوں کی وادی - کاغان

مزار حضرت سید احمد شہید بریلوی رح (بالا کوٹ)

لالہ زار

ایک درہ

شوگراں بستی

ایک عورت

پریوں کی وادی — کاغان

حبیب الرحمان

پاکستان کی یہ وادی، جو اپنے حسن و جمال کی بدولت کافی شہرت حاصل کر چکی ہے اور جس کا شمار دنیا کے حسین ترین خطوں میں ہوتا ہے، یعنی موجودہ پشاور ڈویژن کے ہزارہ نامی ضلع میں واقع ہے۔ یوں تو اس ضلع میں کئی اور بھی حسین خطے اور وادیاں موجود ہیں مثلاً گلیات، ایبٹ آباد (مغربی پاکستان کا گرمائی دارالخلافہ) ٹھنڈیانی، وادی بھوگرمنگ وغیرہ وغیرہ، لیکن مصورِ فطرت کے حسن کار ہاتھوں نے جس طرح وادیٔ کاغان کو آراستہ کیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔

یہ ۹۲ میل لمبی اور اوسطاً ۱۵ میل چوڑی وادی بالاکوٹ سے شروع ہو کر درۂ بابوسر پر ختم ہوتی ہے۔ اس کے بیچوں بیچ دریائے کنہار شور مچاتا اور بڑی بڑی چٹانوں کا سینہ چیرتا ہوا بہتا ہے۔ دریا کے دونوں جانب پہاڑوں کے اونچے اونچے سلسلے چلتے ہیں جو راستے میں متعدد درے اور چھوٹی بڑی وادیاں بناتے چلے جاتے ہیں۔

بالاکوٹ سے چند میل آگے تک پہاڑ اور پہاڑیاں تمام تر سبزے سے ڈھکی ہوئی ہیں اور کہیں کہیں تھوڑے بہت درخت بھی ہیں، مگر اس کے بعد جنگلات کا باقاعدہ ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو پہاڑوں کی چوٹیوں سے لے کر دریا کے کناروں تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ خوش قسمتی سے یہ جنگلات انسانی دستبرد سے بہت حد تک محفوظ رہے ہیں اور بہت گھنے اور خوشنما ہونے کی وجہ سے آج اس وادی کی خوبصورتی میں معتدبہ اضافہ کر رہے ہیں۔

وادیٔ کاغان کی سرسبز ڈھلانیں اور گھاٹیاں، جنگلات سے ڈھکے ہوئے پہاڑ اور درے، پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں جنہیں صبح و شام سورج کی کرنیں سنہری تاج پہنا دیتی ہیں، سرد اور شیریں پانی کے چشمے، مترنم پہاڑی نالے، انواع و اقسام کے خوبصورت اور خوش الحان پرندے، درختوں کی گھنی، خنک اور تسکین بخش چھاؤں، چیل، دیودار، پڑتل، صنوبر اور اسی قسم کے دیگر فلک بوس درختوں کی روح پرور سائیں سائیں اور مسحور کن مہک، پُرسکون، وسیع، گہری اور شفاف برفانی جھیلیں، سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے دریائے کنہار کا پُرکیف نظارہ اور خواب آور شور، انواع و اقسام کے خودرو پھولوں سے اٹے ہوئے سبزہ زار اور پہاڑوں کے دامن، دلکش آبشار اور لطیف و صحت بخش آب و ہوا، ہر انسان، ہر ناظر کو اپنا مداح بنا لیتی ہے۔ کون ہے جو اس قدر حسین و دلکش نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے لئے بیتاب نہ ہو۔

پاکستان سے پہلے اس سراپا حسین وادی کا نظارہ بہت ہی کم لوگوں کو نصیب ہوتا تھا۔ اسے حکمران طبقے نے اپنے ہی لئے مخصوص کر رکھا تھا، چنانچہ اُس وقت بالاکوٹ سے لے کر بابوسر تک صرف ایک پگڈنڈی تھی۔ انگریز افسر اور سیاح گھوڑوں یا خچروں پر یہ راستہ طے کرتے، کئی کئی ہفتے اس وادی کے مختلف حسین حصوں میں خیمے لگا کر مچھلی وغیرہ کا شکار کھیلتے اور اس کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ وہ ضروری اشیاء، خوراک و دیگر سامان اور نوکر چاکر اپنے ساتھ لے جاتے تھے، مگر عام آدمی کو یہ سہولتیں میسر نہ تھیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد

حکومتِ پاکستان نے اس پگڈنڈی کو صرف تین ماہ کے مختصر عرصے میں ایک جیپ گاڑی کی سڑک میں تبدیل کر دیا، اور اس طرح اس گمنام اور بھولی بسری وادی کے بھاگ کھل گئے۔ اب اس سڑک کو کشادہ کرنے کا کام شروع ہو چکا ہے اور مستقبل قریب میں اس پر لاری موٹر کی آمد و رفت بھی شروع ہو جائے گی۔ یہ سڑک جو بالاکوٹ سے لے کر درۂ بابوسر تک دریائے کنہار کے ساتھ ساتھ، کبھی دائیں کبھی بائیں ہو کر جاتی

ہے۔ بابوسر سے گزر کر دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی گلگت تک جا پہنچتی ہے۔ اب یہ دنیا کی دوسری بلند ترین سڑک شمار ہوتی ہے ÷

آغازِ سفر: وادیٔ کاغان کو جانے والے شائقین کی رہنمائی کے لئے یہ بتانا ضروری ہے کہ انہیں اس وادی میں پہنچنے کے لئے ایبٹ آباد سے ہو کر جانا پڑے گا جو مغربی پاکستان کا گرمائی دارالخلافہ ہے اور ضلع ہزارہ کا صدر مقام ہونے کے علاوہ ایک اہم اور خوبصورت صحت افزا مقام بھی ہے۔ یہ شہر ایک سرسبز میدان میں واقع ہے اور اس کے ارد گرد چھوٹی بڑی پہاڑیوں کے سلسلے ہیں جو چیل کے درختوں اور سبزے سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ ایبٹ آباد سطح سمندر سے ۴۱۰۰ فٹ بلند ہے۔ اور پشاور اور راولپنڈی سے بذریعہ ریل اور سڑک ملا ہوا ہے۔ یہ پشاور سے ۱۲۲ میل اور راولپنڈی سے ۶۷ میل پر ہے۔ ریل سے آنے والے حویلیاں سے بذریعہ بس یا ٹیکسی ایبٹ آباد پہنچ سکتے ہیں جو حویلیاں سے صرف دس میل کے فاصلہ پر ہے ÷

ایبٹ آباد میں ٹھہرنے کے لئے ایک معیاری ہوٹل کے علاوہ دو تین کیمپ، ایک ڈاک بنگلہ اور ایک سرکٹ ہاؤس بھی موجود ہیں۔ سرکٹ ہاؤس یا ڈاک بنگلے میں ٹھہرنے کے لئے ایگزیکٹو انجینئر تعمیرات عامہ اور ڈپٹی کمشنر ہزارہ کے اجازت نامے ضروری ہیں۔ اگر کسی کو کاغان جاتے ہوئے ایبٹ آباد میں ایک آدھ رات گزارنے کے لئے جگہ نہ مل سکے تو مایوسی کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ مانسہرہ یا گڑھی حبیب اللہ کے ڈاک بنگلوں میں ٹھہرنے کے انتظامات بخوبی ہو سکتے ہیں۔ یہ دونوں مقامات بجائے خود خوش منظر ہونے کے علاوہ وادیٔ کاغان کے بھی بہت قریب ہیں۔ جو لوگ ضروری سامان ساتھ نہ لا سکیں، وہ اپنی ضروریات ایبٹ آباد کے صاف ستھرے اور پُر رونق بازاروں سے پوری کر سکتے ہیں ÷

حال ہی میں ایبٹ آباد سے شمال کو چار میل کے فاصلہ پر میرپور نامی مقام پر حکومت نے ایک یوتھ ہاسٹل تعمیر کیا ہے جو عنقریب سیاحوں کے لئے کھلنے والا ہے۔ اس طرح قیام کی سہولت میں مزید اضافہ ہو جائے گا ÷

بالاکوٹ: بالاکوٹ، جو ایبٹ آباد سے ۴۵ میل کے فاصلے پر واقع ہے، وادیٔ کاغان کا دروازہ ہے اور ایبٹ آباد سے پختہ سڑک کے ذریعے ملا ہوا ہے۔ ایبٹ آباد اور بالاکوٹ کے درمیان ٹیکسی گاڑیاں، اور بسیں عام چلتی ہیں اور سفر میں کوئی خاص دقت نہیں ہوتی۔ رہائش کے لئے یہاں دو ڈاک بنگلے موجود ہیں۔ اگر ڈاک بنگلوں میں جگہ نہ مل سکے تو یہاں کے ہائی سکول میں رات بھر کے قیام کا انتظام ہیڈ ماسٹر صاحب کی اجازت سے ہو سکتا ہے۔ طعام کا انتظام بھی آسانی سے حسبِ منشاء ہو جاتا ہے یہاں چھوٹی موٹی کھانے کی دکانیں موجود ہیں جو فرمائش کے مطابق کھانا تیار کر دیتی ہیں ÷

بالاکوٹ نام کا پہلا حصہ بالا پیر صاحب کے نام سے موسوم ہے جن کا مزار قریب ہی پل کے اس پار واقع ہے۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کوڑھیوں کو اپنی کرامت سے اچھا کر دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج سے چند برس پہلے تک درجنوں کوڑھی اس مزار پر پڑے نظر آتے تھے۔ اب حکومت نے ان کوڑھیوں کے لئے آبادی سے دور ایک ہسپتال بنا دیا ہے جہاں علاج کے مناسب انتظامات موجود ہیں۔ یہاں ایک گورنمنٹ ہائی سکول، ایک تھانہ، گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سروس کا دفتر اور ایک سول ہسپتال موجود ہے ÷

بالاکوٹ وادیٔ کاغان کا دروازہ اور منڈی ہونے کے علاوہ ایک اہم تاریخی مقام بھی ہے یہاں مجاہدینِ اسلام حضرت سید احمد صاحب بریلویؒ اور حضرت اسماعیل صاحب کے مزار ہیں جو ۱۸۳۱ء میں سکھوں کے مقابلے میں لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ یہاں سے لے کر بابوسر تک تمام راستے میں اوسطاً ہر بارہ میل کے فاصلے پر ایک پڑاؤ آتا ہے جہاں رہائش وغیرہ کے انتظامات موجود ہیں ÷

پہلا پڑاؤ کوائی: بالاکوٹ سے چل کر ۱۲½ میل کے فاصلے پر پہلا پڑاؤ پڑتا ہے جسے کوائی کہتے ہیں۔ یہاں ایک مختصر سا پی۔ ڈبلیو۔ ڈی ریسٹ ہاؤس موجود ہے۔ ۱۹۵۲ء میں جب پاکستان کے گورنر جنرل کاغان کے دورے پر گئے تھے تو انہوں نے اور ان کی پارٹی نے اسی مقام پر قیام کیا تھا۔ یہ پڑاؤ سطح سمندر سے ۴۸۰۰ فٹ بلند ہے ÷

کوائی سے تھوڑے ہی فاصلے پر سڑک کی دائیں جانب ایک اور سڑک بڑی سڑک سے جدا ہو کر بل کھاتی ہوئی سامنے کی پہاڑی کی چوٹی تک چلی جاتی ہے جہاں شوگراں واقع ہے۔ یہ سڑک کوئی چار میل لمبی ہے اور اس پر جیپ گاڑی بخوبی جا سکتی ہے۔ یہ راستہ تقریباً تمام کا تمام چڑھائی کا ہے اور خوشنما جنگل میں سے گزرتا ہے ÷

شوگراں جو ۷۹۴۰ فٹ کی بلندی پر ایک سرسبز اور جنگلات سے ڈھکی ہوئی پہاڑی کی چوٹی پر واقع ہے، کاغان کے ان چند نہایت حسین اور دلکش مقامات میں سے ہے جہاں پہنچ کر انسان پر عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے۔ شوگراں ریسٹ ہاؤس سے جنوب مغرب، شمال اور شمال مشرق میں وادیٔ کاغان کے تمام رنگین مناظر کی خوب سیر ہو سکتی ہے۔ سوائے چند ایک

بلند چوٹیوں کے باقی وادی کا بہت سا حصہ قدموں کے نیچے نظر آتا ہے۔ یہاں سے دور شمال مشرق کو راجہ بھوگی اور ملکا پربت کی برفانی چوٹیاں آسمان سے باتیں کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اسی طرح مغرب کی جانب "موسیٰ کا مصلے" اور مشرق میں مکڑا کی اونچی اور سفید چوٹیاں دکھائی دیتی ہیں۔ ملکا پربت کاغان میں بلند ترین چوٹی ہے جو سطح سمندر سے ۱۷،۳۶۰ فٹ بلند ہے۔

شوگراں میں محکمۂ جنگلات کے دو عمدہ اور کشادہ ریسٹ ہاؤس موجود ہیں جن کے سامنے ایک اچھا وسیع اور شاداب چمن ہے۔ اس چمن میں اخروٹ کے بڑے بڑے سرسبز درخت ہیں جن کی خوشبو سے تمام چمن مہکتا رہتا ہے۔ جیپ میں یا پیادہ سفر کرنے کے بعد آدمی جب یہاں پہنچتا ہے تو اکثر چت لیٹ کر اپنے آپ کو ایک حسین خواب کے عالم میں محسوس کرتا ہے اور گھنٹوں اٹھنے کا نام نہیں لیتا کیونکہ ہوا کے سرد اور فرحت بخش جھونکے ایک خواب آور دوا کا سا عمل کرتے ہیں۔

کوائی سے ۱۴ میل کے فاصلے پر دوسرا پڑاؤ آتا ہے۔

دوسرا پڑاؤ: جسے مہانڈری کہتے ہیں۔ یہاں تمام وادی کی آرجار (ٹریفک) کی تنظیم کی جاتی ہے۔ اس مقام پر ایک پھاٹک ہے اور قریب ہی پولیس کی چوکی۔ چونکہ وادی کاغان میں ٹریفک یک طرفہ ہے، اس لئے پولیس اس پھاٹک کو صرف مقررہ وقت پر کھولتی اور بند کرتی ہے بالاکوٹ سے ناران اور ناران سے بالاکوٹ جانے والی جیپ گاڑیاں یہاں آکر رک جاتی ہیں اور پھاٹک کھلتے ہی اپنی اپنی منزل کو روانہ ہو جاتی ہیں۔ عام حالات میں یہ پھاٹک دن میں دو بار کھلتا اور بند ہوتا ہے۔

مہانڈری میں محکمۂ تعمیرات عامہ کا ایک مختصر سا ریسٹ ہاؤس موجود ہے جو لب دریا واقع ہے۔ اس ریسٹ ہاؤس کے سامنے ایک چھوٹا سا سرسبز چمن ہے جہاں بیٹھ کر دریا کے نظارے کا لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔ یہ مقام سطح سمندر سے ۵،۰۰۰ فٹ بلند ہے۔

مہانڈری پہنچنے سے قبل رستے میں ایک مقام آتا ہے، جسے شینو کہتے ہیں۔ یہاں محکمۂ جنگلات نے ٹراؤٹ مچھلی کی پرورش گاہ قائم کر رکھی ہے۔ اس پرورش گاہ میں مچھلی کی پرورش کی جاتی ہے اور ایک خاص میعاد کے بعد انہیں دریا میں ڈالا جاتا ہے تاکہ ان کی نسل زیادہ ہو اور دریا میں مچھلی کم نہ ہونے پائے۔

مہانڈری سے چل کر گیارھویں میل پر تیسرا اور اہم

تیسرا پڑاؤ: پڑاؤ کاغان ہے جس کے نام سے تمام وادی موسوم ہے۔ یہاں ایک ریسٹ ہاؤس، ایک ہسپتال، ایک ڈاک خانہ، تار گھر، ایک مڈل سکول، ایک زنانہ پرائمری سکول اور ایک زراعتی فارم ہے۔ یہاں وادی قدرے کھلی ہے اور لوگ تھوڑی بہت کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ یہ مقام ۸،۱۸۹ فٹ بلند ہے۔

مہانڈری سے کاغان جاتے ہوئے رستے میں ایک "نالہ" آتا ہے جسے شنی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس نالے کو پار کر کے چلئے تو تھوڑے ہی فاصلے پر ایک پگڈنڈی سڑک سے جدا ہو کر نیچے بائیں ہاتھ کو اتر جاتی ہے۔ یہ کمال بن کا راستہ ہے جو ریچھ کے شکار کے لئے بہت اہم اور مشہور مقام ہے۔ یہاں محکمۂ جنگلات کا ایک چھوٹا سا ریسٹ ہاؤس موجود ہے۔ شنی نالے سے کمال بن تک کوئی چار میل فاصلہ ہے جو پیادہ یا سواری کے جانوروں پر ہی طے کیا جا سکتا ہے۔ کمال بن اور کاغان سے ڈاڈر ایک پگڈنڈی کے ذریعے ملا ہوا ہے جس کا ذکر آگے چل کر قدرے تفصیل سے بیان کیا جائے گا۔

کاغان سے چل کر کوئی ساڑھے چودہ میل پر چوتھا

چوتھا پڑاؤ: پڑاؤ ناران آتا ہے، جو نہ صرف اس وادی کا صدر مقام ہے بلکہ کئی اور وجوہات سے بھی اہم ہے۔ جوں جوں آپ ناران کے قریب ہوتے جاتے ہیں آپ کو جنگلات بتدریج کم ہوتے نظر آئیں گے۔ اس کمی کی وجہ محض بلندی ہے۔ درخت ایک خاص اونچائی تک ہی پھل پھول سکتے ہیں اور اس سے زیادہ بلندی پر درختوں کا کم ہونا ایک لازمی امر ہے۔ ناران کی بلندی ۸،۰۸۶ فٹ ہے۔

ناران جاتے ہوئے راستے میں برف کے

برف کے تودے: متعدد بڑے بڑے تودے جنہیں انگریزی میں گلیشیرز کہتے ہیں، پڑے ہوئے ملتے ہیں اور جیپ کو ان تودوں کے اوپر سے یا بیچ میں سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ یہ تودے سال بھر رہتے ہیں اور ٹریفک کے لئے بڑی دشواریاں پیدا کرتے ہیں۔ کئی کئی ماہ تک آرجار محض ان تودوں کے باعث رکی رہتی ہے۔ ناران سے لے کر بابوسر تک درجنوں ایسے نالے آتے ہیں جہاں برف کے تودے پڑے ہوتے ہیں اور جن کو مشکل سے کاٹ کاٹ کر جیپ کے گزرنے کے لئے راستہ بنایا جاتا ہے۔

ناران ایک مختصر سی جگہ ہے۔ یہاں ایک چھوٹا سا بازار، محکمۂ تعمیرات کے اوورسیر کا دفتر، فرنٹیئر کانسٹیبلری کاغان کا ہیڈ کوارٹر، محکمۂ جنگلات کے

رینج افسر کا دفتر، پولیس کی چوکی اور ایک پرائمری سکول ہے۔ علاوہ ازیں یہاں ٹھیکم ووں پر مشتمل محکمۂ تعمیرات کی ایک قیام گاہ ہے جس میں ہوٹل کی سی سہولتیں میسر ہیں۔ اس ہوٹل کے علاوہ بھی مقامی آدمیوں کے دو تین ہوٹل ہیں جہاں رہائش اور خوراک کا عمدہ اور ارزاں بندوبست موجود ہے۔

ناران سے شمال کو تقریباً ایک میل دور ایک شاندار عمارت ہے جو حال ہی میں تعمیر ہوئی ہے۔ یہ سرکٹ ہاؤس ہے جو ناران کنٹھ اور دریائے کنہار کے سنگم پر واقع ہے۔ یہاں دریائے کنہار ایک جھیل کی شکل اختیار کرتا ہوا بہتا ہے اور اس کا نظارہ اتنا دلفریب ہے کہ یہاں سے اور کہیں جانے کو جی نہیں چاہتا۔ یہاں دریا ٹراؤٹ مچھلی کے شکار کے لئے نہایت عمدہ جگہ ہے اور عموماً شکاری اسی مقام یا اس سے چار میل اوپر کاک کے علاقے کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔ یہ علاقہ جسے سوہج کہتے ہیں، مچھلی کی سب سے مقبول شکارگاہ ہے۔

سرکٹ ہاؤس کے قریب ہی ناران کنٹھ پر ایک لکڑی کا پل ہے جس پر سے سڑک گذر کر بالاکوٹ سر جاتی ہے۔ اس پل کے دائیں اور بائیں اطراف سے دو راستے نکل کر مشرق کی طرف جاتے ہیں اور تقریباً ڈیڑھ میل تک جدا جدا چل کر آپس میں مل جاتے ہیں۔ یہ راستہ سیف الملوک جھیل کو جاتا ہے جو ناران سے ۶ میل کے فاصلے پر ایک درے میں واقع ہے۔ اس کی پشت اور دائیں بائیں ڈھلانوں سے برفانی تودے پگھل پگھل کر اس جھیل کا پیٹ بھرتے رہتے ہیں۔ یہ تقریباً نصف میل لمبی اور ۵۰۰ گز چوڑی ایک بے قاعدہ دائرے کی شکل میں ہے۔ یہ کافی گہری ہے اور اس میں قوس قزح کے رنگ سے ملتی جلتی ٹراؤٹ مچھلی پائی جاتی ہے جو وادئ کاغان کی باقی ٹراؤٹ مچھلی سے وزن میں دو یا چار پونڈ زیادہ ہوتی ہے۔ ۱۹۵۳ء میں پشاور کے ایک مشہور شکاری نے اس جھیل میں سے ۱۰ پونڈ وزنی قوس قزح کے رنگ سے ملتی جلتی ایک ٹراؤٹ مچھلی پکڑی تھی۔ بعد میں محکمۂ جنگلات نے تین سال کی مدت کے لئے یہاں شکار بند کر دیا تاکہ اس میں مچھلی ختم نہ ہو جائے۔

جھیل سیف الملوک تک راستہ قدرے دشوار ضرور ہے مگر ہمت نہیں ہارنا چاہئے کیونکہ آپ جب یہ مسافت طے کر کے جھیل کے کنارے قدم رکھیں گے تو آپ کو یوں محسوس ہوگا جیسے آپ پریوں کی کسی وادی میں پہنچ گئے ہیں۔ اس جھیل کے متعلق ایک عجیب چیز یہ ہے کہ یہاں پہنچنے کے بعد عام طور پر صاف موسم میں بھی بادل کا ایک آدھ ٹکڑا نمودار ہو کر سرد ہوا اور بارش کا سبب بن جاتا ہے اور بہت سے لوگ اس رومانی داستان پر یقین کرنا شروع کر دیتے ہیں جو اس جھیل کے متعلق صدیوں سے مشہور چلی آتی ہے۔ یہ جھیل سطح سمندر سے ۱۰،۵۰۰ فٹ اور ناران سے ۱۴،۲۴۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔

پرانی کہانی

وہ داستان یوں ہے کہ ایک دفعہ دہلی کے ایک مسلمان شہزادے سیف الملوک نے ایک رات خواب میں پریوں کی شہزادی بدرجمال کو دیکھا اور دیکھتے ہی اس پر لٹو ہو گیا۔ اس خواب نے شہزادے کی زندگی میں تلاطم پیدا کر دیا۔ اسے پل بھر چین نصیب نہ تھا اور اس کی آنکھیں نیند سے بیگانہ ہو گئیں۔ وہ اپنی زندگی میں اب ایک ایسا خلا محسوس کرنے لگا جس کا بدرجمال پری کے بغیر پر ہونا ناممکن تھا۔ اس کے کسی کامل درباری نجم نے زائچہ کھینچ کر مشورہ دیا کہ وہ شمال کی سمت پہاڑوں میں جائے، جہاں کچھ مدت کے بعد اس کی معشوقہ اسے مل جائے گی۔ چنانچہ عشق اسے کشاں کشاں ناران تک لے آیا، جو ان دنوں ایک بہت بڑا اور مشہور شہر تھا۔ یہاں لوگوں نے شہزادے کو بتایا کہ اس جھیل پر ہر بارہ سال کے بعد پریوں کا ایک غول نہانے کے لئے آتا ہے اور ان میں ان کی ایک شہزادی بھی ہوتی ہے جو تخت پر سوار ہو کر آتی ہے۔ اتنی رہنمائی شہزادے کے لئے کافی تھی، چنانچہ وہ اس جھیل پر چلا گیا اور ایک طویل مدت کے بعد آنے والے سنہرے موقع کا بے صبری سے انتظار کرنے لگا۔ آخر ایک دن اسے آسمان پر زور زور کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ جب اس نے اوپر دیکھا تو پریوں کا ایک جمگھٹا ایک تخت اٹھائے نیچے اتر رہا تھا۔ یہ نظارہ دیکھ کر شہزادہ ایک محفوظ جگہ چھپ گیا۔ جب پریاں نیچے اتریں اور اپنے اپنے کپڑے اتار کر جھیل میں اتر گئیں تو شہزادہ اٹھا اور شہزادی بدرجمال کے کپڑے چرا لئے۔ باقی پریاں آدم زاد کو دیکھ کر اپنے کپڑے پہن کر اڑ گئیں، مگر ملکہ بدرجمال بے بس ہو کر رہ گئی۔ شہزادہ سیف الملوک کی سچی محبت اپنا اثر کئے بغیر نہ رہ سکی اور ملکہ بدرجمال نے بخوشی اس کی زوجہ بننا منظور کر لیا۔ یہ دونوں جھیل چھوڑ کر نیچے ناران آ رہے تھے کہ اس واقعہ کا علم اس دیو کو ہو گیا جو ملکہ بدرجمال پر دل و جان سے فریفتہ تھا۔ اسے ملکہ کی بے وفائی اور ایک آدم زاد کی جرأت پر بہت غصہ آیا اور دونوں کو بیک وقت ختم کرنے کی ٹھان لی۔ ان دونوں کو نیچے وادی میں اترتے دیکھ کر اس نے جھیل کے ایک کنارے کو اپنی ایڑی کی ٹھوکر سے توڑ دیا، جس سے تمام وادی میں عظیم الشان سیلاب آ گیا۔ شہزادہ سیف الملوک اور ملکہ بدرجمال نے ایک پہاڑی پر چڑھ کر سیلاب سے پناہ لی، مگر ناران کا شہر اس سیلاب کی نذر ہو گیا۔ سرکٹ ہاؤس کے قریب ایک معمولی سا ٹیلہ ہے جس کے اندر ایک بہت بڑا غار ہے۔ اس غار کے متعلق مشہور ہے کہ یہ اس دیو کی قیام گاہ تھی جسے سیلاب کے بعد اس نے ہمیشہ ہمیشہ

…ملئے خالی کر دیا ۔

جھیل سیف الملوک سے جو نالہ نکل کر بہتا ہوا دریائے کنہار میں … جاتا ہے اسے ناراں کٹھ کہتے ہیں۔ یہ ایک کافی بڑا تیز رفتار نالہ ہے۔ … ریسٹ ہاؤس کے لئے پینے کا پانی اسی سے حاصل کیا جاتا ہے۔ پل سے … کر تقریباً آدھ میل اوپر تک اس کٹھ کے کنارے اچھے خاصے رقبے میں محکمۂ … جنگلات کا نرسری فارم ہے، جس میں کافی پودے اب جوان ہو چکے ہیں۔ ناراں کٹھ … نرسری فارم کے سارے رقبے کو چھوٹی چھوٹی نالیوں کے ذریعہ سیراب … کرتا ہے۔ گھنی چھاؤں اور سبزے میں سے گذرتے وقت پانی ان نالیوں میں … معلوم ہوتا ہے جیسے پگھلی ہوئی چاندی ہو۔ یہ مقام سیر و تفریح اور پکنک کیلئے … نہایت موزوں ہے۔ جو لوگ پہاڑی راستوں کی صعوبتوں کے متحمل نہیں ہو سکتے … اس خوبصورت فارم میں دل بہلاوے کا کافی سامان پائیں گے ۔

ناراں تجارتی لحاظ سے بھی ایک اہم جگہ ہے۔ بالاکوٹ کے بعد وادی کاغان … ناراں کی منڈی کا نمبر آتا ہے۔ یہاں کاغانی کمبل، اخروٹ، شہد، کاغانی گھی، … میں، زیرہ گچھی وغیرہ ارزاں نرخوں پر دستیاب ہوتی ہیں ۔

…واں پڑاؤ: ناراں کے بعد دس میل کے فاصلے پر پانچواں پڑاؤ پڑتا ہے اسے بٹہ کونڈی کہتے ہیں، جو دریائے کنہار کے کنارے … کھلے اور سرسبز میدان میں واقع ہے۔ بٹہ کونڈی سے دریا کی سطح کافی … ہے۔ یہاں محکمۂ تعمیرات کی دو فرودگاہیں ہیں ان کے علاوہ یہاں ایک … ہاسٹل بھی بن چکا ہے جو وادی کاغان کے چار یوتھ ہاسٹلوں میں سے … ہے۔ ایک ایسا ہی ہاسٹل ناراں میں تعمیر کیا جا چکا ہے۔ بٹہ کونڈی سطح … سمندر سے ۸،۶۹۲ فٹ بلند ہے۔ ناراں سے جوں جوں آگے چلیں وادی … ہوتی جاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ پہاڑوں پر درخت بھی کم ہوتے جاتے … جن سے یہ خیال پیدا ہونے لگتا ہے کہ یہ کوئی نئی وادی ہے ۔

بٹہ کونڈی ریسٹ ہاؤس سے شمال مشرق کو ایک بلند چوٹی نظر آتی … جو ہمیشہ برف سے سفید رہتی ہے۔ اس چوٹی کا نام ڈلوکا ہے جو سطح سمندر … ۱۶،۱۹۶ فٹ بلند ہے۔ اس چوٹی پر سورج کی تمازت کا بہت ہی کم اثر … ہوتا ہے چنانچہ یہاں لاکھوں برس پرانی برف موجود ہے جو پتھر سے زیادہ … سخت اور نیلے رنگ کی ہے ۔

بٹہ کونڈی ریسٹ ہاؤس ایک برفانی نالے کے کنارے واقع ہے … جسے ڈنڈر نالہ کہتے ہیں۔ اس نالے کے ساتھ ساتھ داہنی طرف ایک … پگڈنڈی دور تک درے کے اندر چلی گئی ہے۔ یہ راستہ کشمیر تک جاتا ہے۔ کاغان کے لوگ اسی راستے کشمیر جایا آیا کرتے تھے۔ اب بھی اس راستے کے ذریعے کاغان اور آزاد کشمیر کے درمیان آمد و رفت ہوتی ہے ۔

لالہ زار: بٹہ کونڈی ریسٹ ہاؤس سے تھوڑے فاصلے پر جنوب مشرق کی ایک سرسبز پہاڑی ہے جو ڈنڈر نالے کی بائیں طرف چلتی ہوئی یکدم جنوب مشرق کو رخ پھیر لیتی ہے۔ اس پہاڑی کی چوٹی بٹہ کونڈی سے بذریعہ سڑک ملی ہوئی ہے۔ یہ سڑک جو پہاڑی کی چوٹی تک جاتی ہے کوئی دو میل کے لگ بھگ لمبی ہوگی۔ پہاڑی کی چوٹی پر پہنچکر اچانک وسیع اور دلکش سبزہ زاروں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ سبزہ زار تعداد میں کل سات ہیں اور یکے بعد دیگرے سیڑھیوں کی صورت میں سامنے والی اونچی پہاڑی کی چوٹی تک چلے جاتے ہیں۔ یہ سبزہ زار ڈھلوان کی شکل کے ہیں اور جنگلی پھولوں سے اٹے رہتے ہیں۔ ان کے عین وسط میں ایک برفانی نالہ گذرتا ہے۔ ان میں جا بجا دیودار اور پڑتل کے سرسبز اور خوشنما درخت ایسا سماں پیدا کرتے ہیں جو نہایت ہی دلفریب ہوتا ہے۔ جی بے اختیار سبزے پر لوٹنے کو چاہتا ہے ۔

حسین قدرتی مناظر کے دلدادہ اصحاب کو لالہ زار ہر وقت دعوت دیتا ہے۔ یہ جگہ کاغان کے حسین ترین مقامات میں سے ہے اور کیمپ کے لئے نہایت موزوں ہے۔ یہاں چند دن گذارنے پر انسان کے مردہ جسم میں تر و تازگی کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر ہے ۔

چھٹا پڑاؤ: بٹہ کونڈی سے آگے کوئی آٹھ میل کے فاصلے پر بوڑا وائی نامی چھٹا پڑاؤ پڑتا ہے۔ یہ ایک کھلے مگر پتھریلے رقبے میں واقع ہے، جہاں کچھ خودرو پھول اور جڑی بوٹیاں بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ یہ مقام سطح سمندر سے ۱۰،۰۰۹ فٹ بلند ہے۔ اس کے پہلو میں ایک برفانی نالہ بہتا ہے جسے بوڑا کٹھ کہتے ہیں۔ بوڑا وائی کاغان میں سب سے بلند مقام ہے جہاں کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ یہاں بھی محکمۂ تعمیرات کی ایک مختصر سی فرودگاہ ہے۔ بوڑاوائی سے آگے بابوسر تک جتنے بھی پڑاؤ آتے ہیں وہاں کوئی قیام گاہ نہیں۔ ہاں اگر کسی کے پاس اپنا خیمہ وغیرہ ہو تو وہ بغیر کسی خطرے کے ان میں سے کسی پڑاؤ پر نصب کر کے رہ سکتا ہے۔ بہتر ہے کہ خیمہ فرنٹیر کانسٹیبلری کی پوسٹ کے متصل نصب کیا جائے ۔

ساتواں پڑاؤ: … میل اس وادی میں ساتواں پڑاؤ ہے جو بوڑاوائی سے گیارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ مقام سطح سمندر سے ۱۰،۶۶۰ فٹ بلند ہے اور گوجر قوم (کاغان کی قدیم مشہور خانہ بدوش

قوم جس کا پیشہ مال مویشی پالنا ہے) کا گرمائی مرکز ہے۔ یہاں پہاڑوں کی ڈھلانوں پر سبزے اور جڑی بوٹیوں کی بہتات، دروں کے اندر شاداب چھوٹے بڑے ٹیلے، برفانی نالوں کے کشادہ اور سبزے سے لہلہاتے ہوئے کنارے اور پانی کی فراوانی ایسی چیزیں ہیں جو مال مویشی کے لئے بہشت سے کم نہیں۔ کاغان وادی میں یہ سب سے مشہور اور عمدہ چراگاہ ہے ✽

گوجروں کے قافلے: بالاکوٹ سے روانہ ہونے کے بعد راستے میں آپ کو جا بجا گوجروں کے چھوٹے بڑے قافلے ملیں گے جو اپنی بھیڑ بکریاں اور مال مویشی وادی کاغان کی چراگاہوں میں لئے جاتے ہیں۔ ان چراگاہوں کو گوجر اپنی اصطلاح میں ناحلی کہتے ہیں۔ ان قافلوں میں سے اکثر کی منزل مقصود مہنسل ہوتی ہے۔ وادی کاغان کی لطیف اور تازہ ہوا، سرد پانی اور جڑی بوٹیوں سے اٹی ہوئی چراگاہیں بھیڑ بکریوں اور مال مویشی کو صحت مند اور فربہ کرنے میں جادو کا سا اثر رکھتی ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے مہنسل میں کوئی ریسٹ ہاؤس نہیں۔ اگر خیمہ ساتھ ہو تو اسے کانسٹیبلری کی چوکی کے متصل گراؤنڈ میں نصب کر کے بے خوف و خطر رہائش اختیار کی جا سکتی ہے ✽

مہنسل پہنچنے سے کچھ قبل دائیں جانب ایک برفانی نالہ ایک درے سے نکل کر دریائے کنہار کی آغوش میں سما جاتا ہے۔ اسے پوربیا کٹھ کہتے ہیں۔ اس کے دوسرے سرے پر وادی کی دوسری مشہور جھیل دُودی پاٹ واقع ہے۔ یہ جھیل مہنسل سے ۱۲ میل دور مشرق میں واقع ہے۔ اس کی شکل گول دائرے سے مشابہ ہے اور اس کا قطر تقریباً نصف میل ہے۔ سطح سمندر سے اس کی اونچائی ۱۲،۰۰۰ فٹ ہے۔ سڑک سے دور ہونے کی وجہ سے یہاں شاذ و نادر ہی کسی سیاح کا گذر ہوتا ہے۔ البتہ پاکستان بننے سے قبل جو انگریز بھی اس وادی کو جاتا تھا اس کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ وہ اس جھیل کے نظارے سے ضرور لطف اندوز ہو ✽

بٹہ کونڈی سے لے کر بوڑا وائی اور بوڑا وائی سے لے کر مہنسل تک دریائے کنہار کے اس پار پہاڑوں کے ڈھلوان اس قیمتی بوٹی سے ڈھکے ہوئے ہیں جس کی بدولت وادی کرم کے لوگ خوشحال ہو چکے ہیں۔ اسے انگریزی زبان میں آرٹی میزیا، پشتو میں ترخہ اور مقامی زبان میں چہاہو کہتے ہیں۔ اس بوٹی سے ایک دوائی بنتی ہے جسے انگریزی میں سینٹونین کہتے ہیں۔ یہ دوا پیٹ کے کیڑوں کے لئے تیر بہدف سمجھی جاتی ہے۔ اس بوٹی کے نکاس کے لئے کوئی قدم اٹھایا جائے تو یہ وادی کے لوگوں کی اقتصادی حالت سدھارنے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ بوڑا وائی سے آگے مہنسل تک تمام پہاڑوں پر بالخصوص اس بوٹی کی اتنی بہتات ہے کہ اس کی تیز بو سے سر چکرانے لگ جاتا ہے۔ کاغان کے لوگ اس بو کے اثر سے محفوظ رہنے کیلئے عام طور پر پیاز پاس رکھتے ہیں اور بوقت ضرورت استعمال کرتے رہتے ہیں ✽

آخری پڑاؤ: مہنسل سے چل کر آٹھ میل کے فاصلے پر نالہ گیٹی داس کے کنارے آٹھواں اور آخری پڑاؤ پڑتا ہے جسے گیٹی داس کہتے ہیں۔ یہ مقام سطح سمندر سے ۱۱،۸۶۰ فٹ بلند ہے۔ مہنسل کی طرح یہاں بھی کوئی ریسٹ ہاؤس وغیرہ نہیں۔ نالہ گیٹی داس جھیل لولوسر کا پہلا اور اہم ترین معاون ہے ✽

مہنسل سے آگے تقریباً ۵ میل چل کر ایک لکڑی کا پُل آتا ہے۔ پل سے پار سڑک دائیں ہاتھ کو مڑ جاتی ہے۔ یہ پُل دریائے کنہار کے اس مقام پر ہے جہاں دریا اس جھیل سے نکلتا ہے۔ پُل پار کرنے کے بعد سڑک جھیل لولوسر کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ یہ جھیل جو شکل میں بے قاعدہ ہلال جیسی ہے، بہت وسیع ہے اور ڈیڑھ میل کے لگ بھگ لمبی، ۲۰۰ گز چوڑی اور ۱۵۰ فٹ گہری بتائی جاتی ہے۔ عموماً اس کے وسط میں مرغابیوں کے جھنڈ بڑے مزے سے تیرتے اور کلیلیں کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں مچھلی کافی ملتی ہے مگر اس جھیل میں شکار کا تجربہ لازمی ہے۔ یہاں سینکڑوں کی تعداد میں سگِ آبی (کتے کی قسم کا ایک دریائی جانور) موجود ہیں جو مچھلی کو بہت نقصان پہنچاتے رہتے ہیں۔ ان کا قلع قمع کرنے کی غرض سے محکمۂ جنگلات نے اس جانور کے مارنے کے لئے انعام مقرر کر رکھا ہے۔ مگر اس کا شکار بے حد مشکل ہے، کیونکہ یہ دن کے وقت شاذ و نادر ہی پانی سے باہر آتا ہے۔ اس کا شکار بہت ہی تجربہ کار شکاری کر سکتے ہیں اور وہ بھی صرف رات کے وقت ✽

جھیل لولوسر جب سڑک کے ساتھ ساتھ چل کر اچانک دائیں ہاتھ کو مڑ جاتی ہے تو عین اس موڑ پر جھیل کے دوسرے کنارے ایک برفانی نالہ کر جھیل میں گرتا ہے جس کا نام آپٹھ کٹھ ہے۔ یہ اس جھیل کے دو اہم معاونوں میں سے ایک ہے۔ اس کٹھ کے ساتھ ساتھ ایک پگڈنڈی چلتی ہوئی آپ کو جل کوٹ لے جاتی ہے جو آزاد کوہستان کا مرکز ہے۔ آزاد کوہستان چھوٹا سا قبائلی علاقہ ہے جو کاغان سے شمال کو، گلگت سے جنوب کو اور کالام (ریاست سوات) سے مشرق کو دریائے سندھ کے اس پار واقع ہے ✽

رّہ بابوسر: درہ بابوسر جو وادیٔ کاغان کا دوسرا دروازہ ہے گیٹی داس سے چار میل کے فاصلے پر دو پہاڑیوں
، درمیان ہے اور گیٹی داس سے دکھائی دیتا ہے۔ نالہ گیٹی داس کے
کو عبور کرنے کے بعد آپ کا سفر تھوڑی دور تک ایک سرسبز میدان
سے ہوتا ہے۔ یہ میدان اور اردگرد کی پہاڑیوں کے ڈھلوان
ادیٔ کاغان اور چلاس کے چرواہوں کی بیش قیمت چراگاہیں ہیں۔
اس چھوٹے سے میدان کو عبور کرنے کے فوراً بعد چڑھائی شروع
جاتی ہے جو بابوسر پر جا ختم ہوتی ہے۔ سڑک گیٹی داس نالے کے
اتھ ساتھ پیچ و خم کھاتی ہوئی چڑھتی جاتی ہے اور کچھ دور جا کر نالے کو
ں ہاتھ پر چھوڑ دیتی ہے۔ یہ نالہ ایک گول شکل کی سرسبز وادی میں اپنا
جود برقرار رکھتا ہوا بڑھتا جاتا ہے اور وادی کے آخری سرے پر
ہنچ کر بتدریج کم ہوتے ہوتے اپنا وجود ختم کر دیتا ہے۔ اس نالے کا
جود بھی دیگر نالوں کی طرح ان برفانی تودوں کا مرہونِ منت ہے۔ جو اس
دی میں پہاڑوں کی ڈھلوانوں اور گہرے کھڈوں میں سال بھر پڑی
ہتی ہیں۔

سڑک اوپر چڑھتے چڑھتے آپ کو ایک ایسے درّے میں پہنچا
یتی ہے جس کی دونوں جانب کوئی پانچ پانچ سو فٹ اونچی پہاڑیاں ہیں۔
، درہ بابوسر کے نام سے مشہور ہے اور سطح سمندر سے ۱۳،۵۸۹ فٹ بلند
ہے۔ یہاں ضلع ہزارہ کی حد ختم ہو جاتی ہے اور گلگت ایجنسی کی حد شروع
ہو جاتی ہے۔ یہاں سے گلگت ایجنسی کا بہت سا علاقہ سامنے دور دور
تک دکھائی دیتا ہے۔ درہ بابوسر کے بعد فوراً اترائی شروع ہو جاتی
ہے جو چلاس تک چلی جاتی ہے۔

کوہ قراقرم: عموماً یہ مشاہدے میں آیا ہے کہ دن ڈھلتے ہی بابوسر کے درے میں موسم خراب ہو جایا کرتا ہے۔
تیز ہوا جو بعض اوقات ایک تند آندھی کی شکل اختیار کر لیتی ہے چلنے
لگ پڑتی ہے، بادل اردگرد سے امڈ آتے ہیں اور گرد و پیش کا نظارہ اوجھل
ہو جاتا ہے، مگر صاف موسم میں دور گلگت ایجنسی میں آپ کو قراقرم کا عظیم الشان
سلسلہ نظر آتا ہے۔ اس کی سب سے اونچی چوٹی نانگا پربت جو ۲۶،۶۲۰ فٹ
بلند ہے برفانی لباس اوڑھے سر اٹھائے آسمان سے باتیں کرتی دکھائی
دیتی ہے۔ نانگا پربت کا نظارہ کرنے کے لئے چاہیئے کہ دائیں اور بائیں
جانب والی پہاڑیوں میں سے کسی پر آدمی چڑھ جائے جہاں سے یہ
چوٹی اچھی طرح دکھائی دیتی ہے۔ دوربین کی مدد سے اس کا اچھی طرح
جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ درہ بابوسر سے نانگا پربت تک ہوائی فاصلہ
کوئی ۴۵ میل ہے۔

درہ بابوسر پر پہنچ کر آپ کو ایک سنگِ میل نصب نظر آئے گا۔ جو
حدبندی کا نشان ہونے کے ساتھ ساتھ بالاکوٹ سے فاصلہ بھی بتاتا ہے۔
اس کے اردگرد پتھروں کے کئی ایک مورچے بنے ہوئے ہیں جنہیں فرنٹیئر کانسٹیبلری
کے سپاہی گشت کے دوران استعمال میں لاتے ہیں۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ درہ بابوسر کی چڑھائی طے کرتے وقت
لوگوں کو سر میں خفیف درد اور سانس رکنے کی شکایت ہو جایا کرتی ہے مگر
اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں کیونکہ زیادہ بلندی پر چڑھتے وقت ایسی
علامات کا پیدا ہونا قدرتی بات ہے، البتہ جو لوگ زیادہ احتیاط کرنا چاہیں
انہیں چاہیئے کہ وہ اپنے ساتھ خشک خوبانیاں لے جائیں جن کے کھانے
سے یہ شکایت رفع ہو جاتی ہے۔ ہاں وہ لوگ جو دل کے کسی عارضے میں
مبتلا ہوں انہیں اس بلندی پر چڑھنے سے ضرور احتراز کرنا چاہیئے۔

دوسرا راستہ: وادیٔ کاغان میں داخل ہونے کا ایک اور راستہ بھی ہے جو وادیٔ سرن سے ہو کر آتا ہے۔ یہ
راستہ صرف ۶ فٹ چوڑا ہے اور اس پر پیدل یا گھوڑے، خچر، ٹٹو
وغیرہ ہی کے ذریعہ سفر ہو سکتا ہے۔ یہ تمام راستہ خوبصورت کہساروں
حسین گھاٹیوں اور دلکش گھنے جنگلات میں سے گزرتا ہے اور اس کی دلکشی
سفر کی تمام صعوبتیں یکسر بھلا دیتی ہے۔ حسین قدرتی مناظر کی بہتات
کے باعث یہ راستہ وادیٔ کاغان کے دوسرے راستے سے زیادہ دلکش
اور پُر کیف ہے۔ یہ راستہ ڈاڈر نامی مقام سے شروع ہو جاتا ہے
جو ایبٹ آباد سے ۲۵ میل کے فاصلہ پر وادیٔ سرن میں واقع ہے۔ یہاں
تپ دق کے مریضوں کے لئے پاکستان بھر میں بڑا ہسپتال ہے۔ جس کے
باعث یہ مقام ملک بھر میں مشہور ہے۔ اس کی بلندی سطح سمندر سے
۳،۹۰۰ فٹ ہے۔

ایبٹ آباد اور ڈاڈر کے درمیان سڑک پختہ ہے، اور بسیں دن میں
کئی بار آتی جاتی رہتی ہیں۔ علاوہ بریں ایبٹ آباد سے ڈاڈر کے لئے ٹیکسی
موٹر بھی آسانی سے مل جاتی ہے۔ یہاں محکمہ جنگلات کا ایک اچھا خاصا
ریسٹ ہاؤس موجود ہے۔ باربرداری کے جانور یا قلی وغیرہ یہاں سے
بآسانی مل سکتے ہیں۔

ڈاڈر سے روانہ ہونے کے بعد پہلا پڑاؤ کنڈ آتا ہے جو ڈاڈر کے بالکل سامنے پہاڑ کے اوپر نظر آتا ہے۔ ڈاڈر سے کنڈ ۸ میل کے فاصلے پر ہے اور اس کی بلندی سطح سمندر سے ۸۰۰۰ فٹ ہے۔ ڈاڈر اور کنڈ کے درمیان جتنا فاصلہ ہے وہ سب چڑھائی کا ہے۔ کنڈ سے تمام زیریں وادی کی اچھی طرح سیر ہو سکتی ہے ٭

کنڈ کے بعد دوسرا پڑاؤ "شہید پانی" آتا ہے جو کنڈ سے ۸ میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ مقام سطح سمندر سے ۹۳۰۰ فٹ اور کنڈ سے ۱۳۰۰ فٹ بلند ہے ٭

شہید پانی کے بعد تیسرا پڑاؤ ندی ہے جو شہید پانی سے ۹ میل کے فاصلہ پر ہے۔ ندی کی بلندی سطح سمندر سے ۸۰۰۰ فٹ ہے۔ یہ مقام شہید پانی سے ۱۳۰۰ فٹ نیچا ہے ٭

اگر آپ شہید پانی کے رستے جانا نہ چاہیں تو کنڈ سے ایک اور راستہ آپ کو براہ راست ندی لے جاتا ہے۔ یہ راستہ کل چودہ میل لمبا ہے ٭

ندی کے بعد آخری پڑاؤ شیراں ہے جو ندی سے ۱۴ میل آگے ہے۔ یہ مقام سطح سمندر سے ۸۲۰۰ فٹ بلند ہے ٭

شیراں سے چل کر آپ وادی کاغان میں داخل ہو جاتے ہیں۔ شیراں سے کاغان ۱۲ میل، مہانڈری ۱۵ میل اور کوائی ۹ میل کے فاصلے پر ہیں۔ وادی سرن کے رستے میں مندرجہ بالا جتنے بھی پڑاؤ آتے ہیں، وہاں محکمۂ جنگلات کے ریسٹ ہاؤس موجود ہیں ٭

بالائی اور زیریں وادیاں: موسمی لحاظ سے وادی کاغان دو حصوں میں منقسم ہے۔ بالائی وادی اور زیریں وادی۔ زیریں وادی بالاکوٹ سے لے کر کاغان تک اور بالائی وادی کاغان سے لے کر بابوسر تک ہے۔ وادی کاغان میں مون سون جون کے آخر یا جولائی کے پہلے ہفتے میں شروع ہو کر اگست کے آخر تک جاری رہتی ہیں مگر خوبی کی بات یہ ہے کہ جہاں نچلی وادی جولائی اور اگست کے مہینوں میں عموماً دھند اور بارشوں کی لپیٹ میں رہتی ہے وہاں بالائی وادی میں موسم صاف اور خوشگوار رہتا ہے اور جو لوگ دھند، بارش، نمی وغیرہ سے گھبراتے ہوں انہیں چاہئے کہ وہ بالائی وادی میں ٹھہریں اور لطف اٹھائیں ٭

شکار: شکار کے لحاظ سے بھی کاغان کچھ کم اہم نہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس وادی میں شکار کم ہے۔ ایسے لوگ یا تو خود شکاری نہیں یا وہ کاغان کے تمام حصے سے بخوبی واقف نہیں۔ ستمبر کے آخر میں دریائے کنہار پر مرغابی بکثرت ملتی ہے جو اکتوبر کے آخر تک رہتی ہے۔ اس کے بعد اپریل اور مئی میں بھی ملتی ہے۔ مرغابی کے علاوہ اس وادی میں مرغ زریں، چکور، راج چکور، جنگلی مرغ، جنگلی بکریاں، نافہ ہرن، چیتے اور ریچھ بھی کافی ملتے ہیں۔ چونکہ شکار کا موسم ہر سال ۱۵ ستمبر کے بعد شروع ہوتا ہے جب کہ سردی شروع ہو جاتی ہے اور کئی مقامات پر برفباری بھی شروع ہو جاتی ہے۔ اس لئے پرندوں اور چند جنگلی جانوروں کے شکار کا سوال خصوصاً بالائی وادی میں بہت کم پیدا ہوتا ہے۔ البتہ ریچھ کا شکار ایسا ہے جو عام ہونے کے علاوہ گرمیوں میں ہو سکتا ہے۔ اس وادی میں ریچھ کے شکار کے لئے بہترین موسم جولائی کے آخری چند دن اور اگست کا پورا مہینہ ہے۔ اس موسم میں مکئی کے بھٹے خوراک کے قابل ہو جاتے ہیں اور ریچھ پہاڑوں کی بلندیوں سے اتر کر مکئی کے کھیتوں میں پہنچ جاتا ہے اور اسے مکئی کے کھیتوں میں آسانی سے شکار کیا جا سکتا ہے۔ کسان یہاں ریچھ کے شکاریوں کی بہت آؤ بھگت کرتے ہیں اور انہیں شکار کرنے میں پوری مدد دیتے ہیں کیونکہ اس جانور کے ہاتھوں جو ان کی فصل کا ستیاناس کر کے رکھ دیتا ہے، کسان بہت نالاں ہیں ٭

اس وادی کو مچھلی کے شکار کی وجہ سے بھی کافی اہمیت حاصل ہے۔ یہاں دریائے کنہار اور جھیلوں میں برفانی ٹراؤٹ مچھلی بکثرت ملتی ہے جو کھانے میں نہایت لذیذ ہوتی ہے۔ اس کا شکار صرف کنڈیوں سے ہی کرنے کی اجازت ہے جس کے لئے محکمۂ جنگلات کے دفتر سے اجازت نامہ حاصل کرنا ضروری ہے۔ یہ اجازت نامہ مقررہ فیس ادا کرنے پر ہر شکاری کو فوراً مل سکتا ہے۔ ایک کنڈی سے ایک دن میں صرف چھ بڑی مچھلیاں پکڑنے کی اجازت ہے مچھلی کے شکار کا موسم یکم اپریل سے ۳۱ اکتوبر تک ہے ٭

باشندے: کاغان میں تین مشہور قومیں آباد ہیں: سید، سواتی اور گوجر۔ سید اور سواتی اس وادی میں مالکانہ حیثیت رکھتے ہیں اور تقریباً تمام کی تمام وادی کے مالک ہیں لیکن گوجر سب کے سب مزارعین ہیں جو کھیتی باڑی کے علاوہ بھیڑ بکریاں اور مال مویشی پال کر گذر اوقات کرتے ہیں۔ گوجروں کو اپنے جانوروں سے اتنی محبت ہوتی ہے کہ کئی دفعہ انہیں بچانے کے لئے

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

افسانہ

محرومیاں

نسیمہ اشرف علی

دیوانگی کی حد تک پیار ہے تمہیں چاند اور تاروں سے؟ میرے متعلق سب کا یہی خیال ہے، لیکن کسی کو کیا معلوم کہ اگر یہ چاند تاروں کی فرضی دلچسپی بھی میری دنیا سے نکال لی جائے تو پھر ... میری دنیا میں باقی ہی کیا رہ جاتا ہے!

اُف! وہ "کوہِ الماس" کی بے برگ و گیاہ، اونچی نیچی پہاڑیاں، جن کے بازوؤں سے بل کھاتے ہوئے حسین ناگوں کے سے چشمے لپٹے ہوئے ہیں، نہ تالیاں بجاتی ہوئی ان کے اوپر سے گزرتی ہے۔ جہاں نہ جھینگر شور مچاتے ہیں اور نہ زمین کے اشکِ ندامت سے اُن کا دامن تر ہے، نہ آبادی ہے نہ بازار، بس دور نیچے کہیں کہیں مزدوروں کے بوسیدہ جھونپڑے نظر آتے ہیں، جیسے زمین میں بھوری بھوری میخیں گاڑ رکھی ہوں اور ان کے اپنے تھکے ہوئے، بجھے بجھے سے چہرے فضا میں اور بھی اداسی سمو دیتے ہیں۔ ایسی اُداسی جو تلخی کا احساس لیے ہوئے ہوتی ہے۔ ہر چیز پر جمود طاری ہے، ایک بے کیف سا ٹھہراؤ، جیسے زندگی کی تیز رفتار گاڑی یہاں آ کر تھم گئی ہو، جیسے آگے کوئی منزل ہی نہیں ہے۔ بس خلا ہی خلا ہے۔ اُف! وہ خاموش، سنسان اور غیر دلچسپ "کوہِ الماس" گہری اداسیوں کا حال!

ابا جان تو خیر ملازمت کی وجہ سے یہاں رہنے پر مجبور تھے ہی، لیکن امی؟ درود اور وظیفہ کی دلدادہ تھیں۔ ایسے خاموش مقام پر ہی تو یادِ خدا آتی ہے اور اس خاموشی اور سکوت ہی میں تو خدا ملتا ہے۔ وہ اکثر فرمایا کرتی تھیں، لیکن ہمیں تو یہاں اپنے ساتھیوں کی یاد آتی تھی جنکو ہم نے کبھی نہیں دیکھا تھا اور جن کی کمی ہمیں شدت سے محسوس ہوتی تھی۔ جانے اسی احساس کا نام یادِ خدا تھا جو "خیال اپنا اپنا، نظر اپنی اپنی" کے مصداق ہو۔

شام کے وقت میں اپنی گورنس کے ہمراہ پہاڑیوں پر دور تک ٹہلنے کے لیے چلی جاتی، جہاں سے نظر تک پھیلی ہوئی تہہ در تہہ پہاڑیوں میں اُس سکوت چھایا رہتا۔ نہ سرسبز درخت، نہ سبزہ، خود رو پھولوں کی بہار، نہ جھرنے، نہ چشمے۔ بس نیچے ڈھلانوں میں سیلانی مزدوروں کے ننگ دھڑنگ کالے کلوٹے بچے کھیلتے ہوئے نظر آتے اور بچوں کی مائیں یا تو اپنے کام میں مشغول ہوتیں یا پھر فرصت کے وقت ایک دوسری سے لڑتی ہوئی گتھم گتھا ہو جاتیں جس کا خاتمہ ان کے خاوندوں کی لاٹھیاں کرتیں ——— بس یہ ایک ذرا سا دلچسپ مشغلہ تھا، لیکن کوئی انسان کب تک اس مکروہ منظر کو برداشت کر سکتا ہے؟ اور میرا دل اپنی تنہائی اور اس بے کیف ماحول سے اکتا جاتا۔ جہاں نہ عزیز ہوں نہ بہن بھائی، نہ سہیلیاں نہ دوست، وہاں چاند تارے ہی دوست ہیں جو یہاں سے انتہائی نزدیک معلوم ہوتے تھے، جو اپنی خاموش زبان میں سینکڑوں داستانیں کہہ رہے تھے اور میرا دلچسپ اور محبوب مشغلہ پہروں چاند اور تاروں کو تکتا تھا۔ کاش میں ان کو چھو سکتی۔ چاند کی نرم و نازک ملائم کرنیں ایسے کرخت پہاڑوں کو بھی تھوڑی دیر کے لیے حسن بخش دیتیں، جن میں زندگی کے آثار قریباً معدوم ہی تھے۔ ان میں زندگی کی رو دوڑ جاتی۔

بچپن کا حسین اور خوشگوار زمانہ اس بے کیف ماحول میں گزر گیا۔ بس چاند تاروں سے کھیلتے اور ان کو ایک معصوم بچے کی طرح ہاتھوں سے کر اُلٹ پلٹ کر کے دیکھنے کی تمنائیں۔ اور طبیعت مجبوراً اسی ماحول اور ان ہی حالات سے مانوس ہو گئی۔

اچانک والد صاحب اس موت کے سے سکوت سے اکتا گئے اور ملازمت چھوڑ کر وطن چلے آئے۔ سالہا سال کا مقید پنچھی، قید سے چھوٹ کر خود کو کتنا حقیر، بے حقیقت اور دنیا اور اس کی دلچسپیوں سے کتنا بے تعلق محسوس کرتا ہے، بس یہی حال میرا تھا۔ جس خاموشی اور تنہائی سے مجھے شدید نفرت محسوس ہوتی تھی، شاید اب وہی میری فطرت بن چکی تھی اور وطن اور اس کی گہما گہمی اجنبیت کے بھاری بھاری پردوں کے پیچھے گم ہو گئی تھی۔ یہاں آ کر بھی میرے ہم جلیس وہی چاند تارے ہی

رہے، گو میں پیار ہی "وحشی"، "بد دماغ" اور نہ جانے کیا کیا مشہور ہو گئی!

محبت ہر انسان کی فطرت ہے لیکن کسی میں کم کسی میں زیادہ، اور بعض انسانوں کا تو خمیر ہی محبت کی مٹی سے تیار ہوتا ہے شاید! لیکن جسے محبت ہی نہ مل سکے، جسے اس لطیف جذبے سے ہمیشہ محروم رہنا پڑے اس کی مایوسیوں کا کون اندازہ لگا سکتا ہے؟ دنیا اور دنیا والے جسے دوست نہ رکھیں، چاند تاروں کی خاموش دنیا ہی ان کی دوست ہو سکتی ہے!

جوان لڑکیوں کو کب کسی سے ملنے یا بات چیت کرنے کا موقع ملتا ہے اور پھر امی تو اس معاملے میں بہت ہی محتاط تھیں۔ عمران اور شاکر بھائی اگر کبھی ہمارے گھر آتے تو میں انہی کی ہدایت کے مطابق فوراً دوسرے کمرے میں چلی جاتی۔ مجھے خود بھی تو شاید انسانوں سے نفرت تھی۔ لڑکیوں نے میری خاموشی کو بد دماغی پر محمول کرکے مجھے نظر انداز کر دیا اور لڑکے ــــ؟ سماجی پابندیوں کے سبب مجھ سے دور رہے۔ انس، یگانگت، محبت یہ تمام الفاظ میرے لئے محض الفاظ ہی رہے حقیقت نہ بن سکے۔ میری زندگی کے مضمحل دامن میں رومان کا پیوند کبھی نہ لگ سکا! اُف یہ تشنۂ محبت دل!

میری سالگرہ کے تحفوں میں منظور بھائی کا تحفہ سب سے زیادہ حسین تھا، اور شاید میری نظروں میں سب سے زیادہ قیمتی بھی۔ وہ ایک انتہائی خوب صورت سیٹ تھا جھلملاتا ہوا، قمیص، غرارہ، دوپٹہ اور جاکٹ جن پر ستاروں سے انتہائی نفیس "زردوزی کا کام" کی ہوئی تھی۔ منظور بھائی انہیں کیسے معلوم ہوا کہ مجھے چاند تارے بہت ہی پسند ہیں۔ منظور خود بھی تو بہت حسین تھے، میرے محبوب چاند تاروں کی طرح کہیں خواہ مخواہ نظر بدلنے کے باوجود انہیں دیکھنے پر مجبور ہو جاتی اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ منظور مجھ سے قریب، بہت ہی قریب ہوتے جا رہے ہیں اور پھر یہ احساس رفتہ رفتہ مجھے "کوہِ الماس" کی پہاڑیوں سے بھی زیادہ خاموش اور سنسان پگڈنڈیوں میں بھٹکتا ہوا چھوڑ کر خود کہیں گم ہو گیا۔ منظور بھائی کی شادی ہو گئی اور ــ میری دنیا میں بس چاند اور تارے رہ گئے!

پھر چاند تاروں سے کھیلنے والی یہ خاموش، تشنۂ محبت زندگی ایک اجاڑ قسمت کے ایک ٹیڑھے میڑھے موڑ میں گم ہو گئی۔ شادی بھی کتنی عجیب کیفیت کا نام ہے، اچھے بھلے لڑکے لڑکیوں کو مرد، عورت کی کردہ اصطلاحوں میں مدغم کرکے رکھ دیتی ہے جہاں محبت کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے خوابوں کی سی رومانی دنیا کسی ڈائن کی طرح خوفناک جبڑے کھول کر سامنے آ جاتی ہے اور وہ لڑکی جو ہزاروں آرزوؤں سے ایک محبوبہ کی شکل میں کسی کے آستانے پر حاضر ہوتی ہے، ایک بیوی، یا عورت بن کر رہ جاتی ہے، محض ایک کل!

بھلا فلسفہ پڑھانے والے ایک خشک طبیعت پروفیسر سے محبت کی توقع حماقت نہیں تھی تو اور کیا تھا؟ جو محبت کو محض ایک وقت ضائع کرنے کا ذریعہ سمجھے، اور بیوی کو گھر کے لئے ایک قفل سے زیادہ اور کچھ درجہ نہ دے سکے جس کا یقین ہو کہ محبوبہ وہ ہوتی ہے جو نظر نہ آ سکے، جسے ہم چھو نہ سکیں، خیالی۔ محض ایک وہمی شبیہہ! محبوبہ کبھی بیوی نہیں بن سکتی اور بیوی محبوبہ نہیں بن سکتی۔ محبت ایک عام جذبہ سے اونچا کوئی جذبہ نہیں ہے۔ وہ چاند تاروں کی کرنوں کی نرم و نازک باتیں کیا جانے، اسے پھولوں اور بہار سے کیا نسبت ہو سکتی ہے؟ وہ صبح کو نکلتے ہوئے سورج کی بے ضرر اور اچھوتی کرنوں کی لطافت اور شام کی شفق گوں رنگینیوں کو کیا سمجھ سکتا ہے جس کی آنکھوں پر فلسفہ کی دبیز عینک چڑھی ہوئی ہو۔ خیر، یہ زندگی تو کسی نہ کسی طرح گزر ہی جائیگی۔ چاند تاروں کی معیت میں، لیکن کہیں یہ چاند بھی نہ ڈوب جائے، میری خاموش زندگی کا خاموش ساتھی! یہ تارے چمکنا ہی نہ چھوڑ دیں اور میں تاریکی میں بھٹکتی رہ جاؤں!!

زندگی کے غبار رفتہ رفتہ اٹھتے رہتے ہیں اور فضا میں تحلیل ہوتے رہتے ہیں۔ کب تک؟ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا، کب اس پگڈنڈی پر تارکول بچھا دیا جائے اور کب یہ غبارِ زندگی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ "کون ہیں یہ انجم؟" پروفیسر نے مجھ سے پوچھا تھا:

"کیا معلوم کون ہیں؟" کہتے ہوئے میں نے لفافہ چاک کرکے پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ "کچھ خاص بات تو نہیں کسی انجم نے میری تازہ نظم "ستارے" کی تعریف کی ہے۔" میں نے جواب دیا تھا۔ "ہوگا کوئی بیکار اور تمہارے جیسا دیوانہ جس کے پاس ان فضول کاموں اور باتوں کے لئے وقت کافی ہوگا" انہوں نے خشک سی مسکراہٹ کے دوران میں کہا تھا۔

اور پھر انجم کے خطوط آتے رہے مسلسل۔ کتنی پاکیزہ اور شگفتہ تحریر تھی ان کی! بس، خوابوں کی دنیا سے آیا ہوا کوئی انتہائی حسین اور پاکیزہ لمحہ معلوم ہوتا تھا۔ خواہ میں جواب نہ بھی دوں، مہینوں خط نہ لکھوں لیکن وہ پابندی سے خط لکھتے، ہر ہفتہ دو خط، متواتر دو سال انہی خواب کی سی کیفیات سے لبریز خطوط مجھے ملتے رہے!

"یا اللہ۔ کیا ہے ان خطوط میں؟" کبھی کبھی مجھے شک سا گزرنے لگتا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چاند اور تاروں کی خاموش محفل میں اب میں ہی اکیلی شریک نہیں

تھی، بلکہ انجم بھی انہی حسین کھلونوں سے کھیل رہے تھے۔ وہ کون ہیں؟ کیسے ہیں؟ غیر شادی شدہ یا ---؟ کتنا عجیب معمہ ہیں وہ! کبھی کبھی میں نہ جانے کیوں یہ سب باتیں سوچنے لگتی۔

بھلا خوابوں کی حسین دنیا کی متلاشی حقیقت کی تلخی کب گوارا کر سکتی ہے۔ نہ انجم سے کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس ہوئی نہ اس معاملے میں کوئی قدم اٹھایا۔ ہم یونہی رہے، اپنی اپنی پگڈنڈیوں پر بیگانے اور غیر متعارف سے۔

"لو بھئی رخشاں! تمہارے انجم سے بھی مل آئے ہم اس دفعہ سلہٹ میں ایک پُر فضا جگہ ایک خوب صورت سے بنگلے میں رہتا ہے۔ سچ مچ اپنے خطوط ہی کی طرح خوب صورت ہے۔ پچیس چھبیس سال کا نوجوان ہے غالباً اپنے والد کی فرم ہی میں کام کرتا ہے۔" پروفیسر صاحب نے سلہٹ سے واپسی پر مجھے بتایا تھا۔ "کیا کہا جا سکتا ہے یہ وہی انجم ہے؟ کیا ثبوت ہے اس کا؟"

"بھئی ادیب انجم تو وہی ہے وہاں۔"

رخشاں!

ہم اتنے عرصے سے ایک دوسرے کی معیت میں زندگی کی پگڈنڈیوں پر چل رہے ہیں، لیکن الگ تھلگ اور بالکل اجنبی سے۔

مگر یہ غیر متعارف زندگی، طویل اور بے کیف سفر اور یہ خوابوں کی سی کیفیات کب تک برداشت کی جا سکتی ہیں؟ کاش ہم تصورات کی دنیا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آنے کی جرأت کر سکیں!

میں کون ہوں، کیا ہوں اور کیسا ہوں؟ ان سب سوالوں کے جواب میں اپنی تصویر بھیج رہا ہوں۔ قلم جن جذبات کو ظاہر نہ کر سکا شاید آنکھیں ان کی کچھ ترجمانی کر سکیں۔

آپ کا --- "انجم"

اُف یہ کیا ہوا؟ خط پڑھ کر میرا دماغ چکرا گیا، آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا اور کب ہوا؟ جب ...... جب ......

"انجم --- بھیا!

میں وہ نہیں ہوں جو کچھ آپ سمجھے۔ میں اب منزل نہیں ہوں، محض گردِ کارواں ہوں۔ میرے کارواں کا غلہ کی خرید و فروخت کے سلسلے میں شاید ایک مہینہ گزرا آپ سے کل مل چکے ہیں اور متاعِ کارواں، آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ ان کی کلاس تفریح کے لئے سامنے آئی ہوئی ہے۔

--- عرف "رخشاں"

جانے کیا ہوا کہ انجم، گھر بار سب کو چھوڑ کر سوئٹزرلینڈ چلا گیا کتنے پریشان، کتنے غمگین ہیں اس کے اس طرح چلے جانے سے! بیوقوف نوجوان --- دیکھا، میں نہ کہتا تھا کہ یہ خوابوں کی ذہنی دنیا بسانے والے عقلمند ہرگز نہیں ہو سکتے، ویسے کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔" پروفیسر صاحب نے حسب معمول خشک لہجے میں مجھے بتایا۔

"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" میں نے انتہائی حیرانی اور پریشانی کے ملے جلے جذبات کے تحت پوچھا۔

"اس کے والد کا خط آیا ہے، سلہٹ میں ملاقات کے بعد ہماری خاصی دوستی ہو گئی ہے۔"

اب بھی کچھ شک ہے کہ مجھے چاند اور تاروں سے پیار کیوں ہے؟ میری خاموش زندگی کے خاموش ساتھی یہی تو ہیں!

اب بھی رات کی تاریکیوں میں میرے ذہن پر ایک ہیولیٰ ابھرتا ہے۔ آہ! یہ تم نے کیا کیا؟ کہاں چلے گئے؟ کیا محبت صرف محبت کے لئے نہیں کی جا سکتی؟ کیا ہم اپنی خود غرضیوں کو دفنا نہیں سکتے؟ انجم چلا گیا، لیکن میرے ساتھی انجم اب بھی آسمان پر اسی طرح جھلملاتے ہیں اداسیاں اور محرومیاں لئے ہوئے! میں ان سے بارہا پوچھتی ہوں کہ انجم کہیں تمہاری ہی دنیا میں تو نہیں پہنچ گئے؟ اور جب جواب کے لئے ان کی طرف دیکھتی ہوں تو وہ جھلملا جھلملا کر روپوش ہو جاتے ہیں اور چاند؟ تو دنوں نظر ہی نہیں آتا! زندگی میں اگر محبت کی بھیک ملی بھی تو --- ؟

(۱)

غزلیات

سیّد آلِ رضا

محبت نا شناسوں میں محبت کی فغاں کب تک
نہ جانے کٹ کے دل سے کام دیتی ہے زباں کب تک

فسانہ دردِ دل کا آپ ایسے کیوں سُنے جائیں
مگر دیکھیں کہ ہم ایسے ہیں مصروفِ بیاں کب تک

گلوں کی چلتی پھرتی چھاؤں میں کیا چین سے بیٹھیں
نگاہوں میں یونہی کھٹکا کرے گا آشیاں کب تک

وہی جس کو ہمیں اب بھول جانا چاہیئے شاید
اسی کی یاد آخر دل میں لے گی چٹکیاں کب تک

کھلے کچھ پیکرِ امید یا یہ وہم مٹ جائے
نظر آئیں گی دھندلی دھندلی سی پرچھائیاں کب تک

تمہارے نام پر کس کس طرح دل کو نہ سمجھایا
مگر یہ اہتمامِ خود فریبی مہرباں، کب تک

رضا کب سے یہی فریاد ہے باغِ تمنا کی
مجھے لوٹے چلا جائے گا میرا باغباں کب تک

سراج الدین ظفر

دن کو بحر و بر کا سینہ چیر کر رکھ دیجئے
رات کو پھر پائے گل رویاں پہ سر رکھ دیجئے

مفلسی موسم کی جائے گی نہ بے نقدِ شراب
جام چھلکا کر کفِ ہر گل میں زر رکھ دیجئے

دیکھئے پھر کیا دمکتے ہیں گل اندامانِ شہر
اک ذرا ان میں محبت کا شرر رکھ دیجئے

گرمیٔ آغوش سے بھر دیجئے عزمِ جواں
پھر ہمالہ کو ہمارے دوش پر رکھ دیجئے

آہوانِ شب گریزاں ہوں تو ان کی راہ میں
دامِ دل رکھ دیجئے، دامِ نظر رکھ دیجئے

زہد اگر جنگ آزما ہو کھینچئے شمشیرِ شوق
حُسن اگر مدِ مقابل ہو، سپر رکھ دیجئے

مدرسے کا فرنگاہی سے نہیں لذت شناس
ان کے سینے میں بھی سوزِ نظر رکھ دیجئے

بُت بھی دلکش، حور بھی دلجو ہے، پھول اخلاص لے
کچھ ادھر رکھ دیجئے اور کچھ اُدھر رکھ دیجئے

گردشِ جامِ انقلابی نہیں تو کچھ نہیں
اس میں جزوِ گردشِ شام و سحر رکھ دیجئے

راحتِ جانِ ظفر ہیں شاہدانِ بے ہُنر
رونے کو ان کے قدموں میں ہنر رکھ دیجئے

عبدالحمید عدم

قرطاس لو، قلم لو اور لکھ ہی دو فسانہ

کس طرح دو دلوں کے بیچ آ گیا زمانہ

کس حیلہ جُو جہاں میں بھیجا ہے تو نے ہم کو

تدبیر بھی بہانہ تقدیر بھی بہانہ

دو بے خطا دلوں کو تکلیف دے کے ناحق

محسوس ہو رہا ہے ٹھہرا گیا زمانہ

تم سے تو بات کی تھی تسکینِ دل کی خاطر

تم کو بھی آ گئی ہے تقریرِ ناصحانہ

چپ چاپ ہو کے میکدے کے نزدیک سے نکل جا

ورنہ خراب ہو گی اے گردشِ زمانہ

شیشے، رباب، شاہد، خوشبو عدم گلوں کی

موسم گزر رہا ہے کیا مست و والہانہ!

ناصر کاظمی

نت نئی سوچ میں لگے رہنا
ہمیں ہر حال میں غزل کہنا

صحن مکتب میں ہمسنوں کے ساتھ
سنگریزوں کو ڈھونڈتے رہنا

گھر کے آنگن میں آدھی آدھی رات
مل کے باہم کہانیاں کہنا

دن چڑھے چھاؤں میں ببولوں کی
رم آہو کو دیکھتے رہنا

ابر پاروں کو، سبزہ زاروں کو
دیکھتے رہنا سوچتے رہنا

شہر والوں سے چھپ کے پچھلی رات
چاند میں بیٹھ کر غزل کہنا

ریت کے پھول، آگ کے تارے
یہ ہے فصلِ مراد کا گہنا

بوئے خوں آ رہی ہے پھولوں سے
کیا ہے ایسی بہار نے لہنا

سوچتا ہوں کہ سنگِ منزل نے
چاندنی کا لباس کیوں پہنا!

کیا خبر کب کوئی کرن پھوٹے
جاگنے والو جاگتے رہنا!

عبدالباقی بلوچ

چشمِ فسوں گر جب مری جانب نگراں گزری ہے
دامن چیدہ میری طرف سے گردشِ دوراں گزری ہے

میں نے اپنی شمعِ ہستی دونوں سروں سے جلائی ہے
شب نہ کٹے گی لیکن اب تک خوب فروزاں گزری ہے

زیست بہر صورت گزراں تھی ہمدم اس کا ذکر ہی کیا
خندہ بہ لب، یا اشک فشاں یا بے خود و حیراں گزری ہے

اکثر دل کے ہاتھ سے تیری یاد کا دامن چھوٹ گیا
ایسے چند مراحل سے بھی عمرِ گریزاں گزری ہے

آبلہ پائی کے افسانے اب بھی زبانِ خار پہ ہیں
اس انداز سے میری وحشت سوئے بیاباں گزری ہے

آنکھوں سے حسرت کے فسانے آنسو بن کر ٹپکے ہیں
عمر ہماری منزل منزل اشک بداماں گزری ہے

موسمِ گل ہے جوش پہ لیکن تو جو نہیں اے جانِ بہار!
چشمِ تماشا منظر منظر خار بہ داماں گزری ہے

کیسے پھول تھے! کیا رنگت تھی! مجھ کو کچھ معلوم نہیں
اب کے جانے کس صورت سے فصلِ بہاراں گزری ہے

عمر جو تیری راہ میں گزری، غم کا بار اٹھا کر بھی
رقصاں رقصاں خنداں خنداں مست و غزلخواں گزری ہے

جب تک دل رنگیں تھا باقی دنیا اپنے ساتھ رہی
جب سے دل کچھ بجھ سا گیا ہے ویراں ویراں گزری ہے

شبیر افضل جعفری

ندی کنارے جو نغمہ سرا ملنگ ہوئے
حباب موج میں آ کے جلترنگ ہوئے

ارم کے پھول، ازل کا نکھار، طور کی لو
سخی چناب کی وادی میں آ کے جھنگ ہوئے

یہ ریگ زار، یہ ٹیلے، یہ خشک ویرانے
ہمارے لطفِ نظر سے گلاب رنگ ہوئے

شہیدِ لالہ رخاں کے لہو لہو نغمے
لہک لہک کے فضا میں اڑے پتنگ ہوئے

کبھی جو ساز کو چھیڑا بہار مستوں نے
نو گنگ گنگ شجر ہم زبانِ چنگ ہوئے

مری شریر دعاؤں کے دلربا جادو
مزاجِ وقت میں قوسِ قزح کے رنگ ہوئے

گدازِ شام کے باغ و بہار سناٹے
مرے جنوں کے لئے گونجتی امنگ ہوئے

عطا کیا ترے ماتھے نے جن کو عید کا چاند
نثار ان پہ ستاروں کے راگ رنگ ہوئے

شبِ حیات میں انساں کے ولولے افضلؔ
ابھر کے تارے بنے کہکشاں کے سنگ ہوئے

افسانہ

تصویر

شریف الحسن

"اور یہ کیسی آئی ہے؟"

"خاصی ہے"

"دیکھوں، دیکھوں، ذرا میں بھی تو دیکھوں" ماں نے اشتیاق سے بیٹی کے ہاتھ سے تصویر لی اور تکلف سے سنہری عینک خانہ سے نکال کر ریشمی ساڑی کے پلّو سے پونچھ کر لگائی۔ "پیاری، تم بھی کمال کرتی ہو، ماشاءاللہ اتنی اچھی تو کھچی ہے اور تم ہو کہ خاصی کہہ رہی ہو"

مسعود کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آئی۔ اس لئے نہیں کہ اس کو مصوری کی داد ملی تھی، بلکہ اس لئے کہ وہ عقیلہ سے بھی عقیلہ کی برائی نہیں سن سکتا تھا اور اب خالہ جان نے تصویر کی تعریف کر دی تھی۔ عقیلہ کے اس انکسار پر اس کو غصہ بھی آتا تھا اور دلی تکلیف بھی ہوتی تھی۔ یہ انکسار کبھی تو اس کو تصنع معلوم ہوتا اور کبھی یہ جھنجھلاہٹ ہوتی کہ عقیلہ کو بھی عقیلہ کی تصویر یا صورت شکل کو برا کہنے کا کیا حق حاصل ہے۔

مسعود کو اب باقی تصویریں دکھلانے میں تامل تھا، مگر ماں بیٹیوں کے اصرار پہ دکھلانے لگا۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ بناوٹی انکسار بھی حسن طلب کا ایک انداز ہوتا ہے، تاکہ دوسروں کے منہ سے اپنی تعریف سنی جائے۔ اس مرتبہ عقیلہ نے اتنی رعایت کی کہ "خاصی اچھی ہے" "ہاں اچھی ہے" وغیرہ کہنا شروع کر دیا۔ تصویریں سب اسی کی تھیں اور پچیس تیس سے کم نہیں، بلکہ زیادہ ہی ہوں گی۔

مسعود ہوائی فوج میں تھا اور عراق سے چار ہفتے کی رخصت پر آیا ہوا تھا، جو اس کو دو سال کے بعد ملی تھی۔ عقیلہ کے لئے بہت بڑھیا کیمرا تحفتہً لایا تھا اور آج کل اس کا دل پسند مشغلہ عقیلہ کی تصویریں اتارنا ہی تھا۔ کوئی تصویر ساڑی میں تھی تو کوئی دوپٹہ اور کھڑے پاجامہ میں اور کوئی شلوار قمیص میں، کسی میں پھول توڑ رہی ہے، کسی میں مصروف مطالعہ ہے، کسی میں چوٹی گوندھ رہی ہے۔

اب عقیلہ وہ دو سال پہلے کی عقیلہ نہیں تھی۔ شرمائی لجائی، بغداد جانے سے پہلے مسعود نے تصویر کھینچنی چاہی تھی تو کتنے جتن کرنے پڑے تھے۔ خالہ جان بگڑی سنوری تھیں کہ بھلا بھائیوں سے کوئی اتنا شرماتا ہوگا، تب جا کر اس شرط پہ راضی ہوئی تھی کہ اماں جان اور چھوٹا بھائی بھی شامل ہوں تو کھچواؤں گی، اکیلی نہیں کھچواؤں گی۔ اماں تو اکیلی تصویر میں کوئی ہرج نہیں سمجھتی تھیں، مگر بیٹی کی جھجک دیکھ کر انہوں نے اس روشن خیالی کے اظہار کو مناسب نہیں سمجھا اور جب میں پھر بھی تصویر کھچواتے وقت عقیلہ کا چہرہ شرم کے مارے سرخ ہو گیا تھا، مگر اب تو کالج میں دو سال پڑھ کر اس نے خاصے پر پرزے نکال لئے تھے اور جبلی شرم و حیا کے باوجود جھجک باقی نہیں رہی تھی، جو خواہ مخواہ کنبہ کے لڑکوں کے سامنے پیدا ہو جاتی تھی۔ شاید یہ سبب بھی تھا کہ دو سال پہلے شرمانے کے دن نئے نئے آئے تھے، احساسِ شباب بات کرتے، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، سوتے جاگتے، شعور پر غالب رہتا اور بن بات کے شرم آتی رہتی، مگر اب دو سال گزرنے کے بعد وہ اد کو اول تو محسوس نہیں کرتی تھی۔

"بھئی یہ تصویر تو بہت پیاری آئی ہے، اسے بڑا کرا دو، میں اسے چوکھٹے میں لگا کر اپنی سنگھار میز پر رکھوں گی" خالہ جان نے مسعود سے کہا۔ درحقیقت تصویر بہت عمدہ آئی تھی، اس تصویر میں عقیلہ دانتوں تلے قلم دبائے مصروفِ مطالعہ تھی، تصویر میں بے ساختگی تھی اور یہ گمان نہیں گزرتا تھا کہ تصویر کی خاطر یہ نشست اختیار کی ہے۔

ایک تصویر میں عقیلہ اپنی زنانہ سائیکل لئے کھڑی تھی، پیچھے کتابیں بندھی تھیں اور ایک پاؤں پائدان پر تھا، گویا کالج جانے کے لئے پا بہ رکاب ہے۔ یہ تصویر عقیلہ نے ایک سہیلی کی فرمائش پوری کرنے کے لئے لے لی۔

اگلی تصویر میں عقیلہ کوٹھے پر منڈیر کے سہارے کہنی ٹکائے اور ہاتھ کی پشت پر ٹھوڑی دھرے کھڑی تھی۔ یہ تصویر سب تصویروں سے

ایسی تھی مسعود اس کو دیکھ کر پھڑک گیا، کیونکہ یہ ادا کسی اور تصویر میں نہیں آنے پائی تھی ۔

"ذرا مجھے دکھائیے" کہہ کر عقیلہ نے یہ تصویر تھیالی اور کتاب میں رکھ کر بغل کے نیچے دبالی۔ مسعود نے وہ تصویر واپس مانگی تو انکار کر دیا، جس پر مسعود بہت جزبز ہوا، کیونکہ تمام تصویروں میں اسے یہی تصویر سب سے زیادہ پسند آئی تھی اور اس نے سوچا تھا کہ وہ اسے ہر وقت اپنے بٹوہ میں رکھا کرے گا، مگر اماں کے کہنے پر بھی عقیلہ نے وہ تصویر نہ دی اور یہی کہتی رہی کہ "یہ تصویر بہت خراب آئی ۔ ۔ ۔ میں نہیں دوں گی"

یہ بات ظاہر ہے دکھاوے کی تھی، کوئی بھی اس تصویر کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ یہ شاید اس لئے کہ اس تصویر میں بیباکی و شوخی ہو اور اسے مسعود کے پاس چھوڑنا وہ معیوب سمجھتی ہو، یا اس خیال سے شرماتی ہو کہ ایسی دلکش تصویر مسعود کے پاس رہے۔ وہ تصویر اسے خود بہت بھائی تھی آج صبح یہ سب تصویریں وہ خود مصور کے ہاں سے لے کر آئی تھی اور مسعود کے آنے سے پہلے اس تصویر کو چھپ چھپ کر دیر دیر تک دیکھتی رہی تھی ۔ اسے اپنی خوب روئی اور جامہ زیبی کا پورا پورا احساس تھا، مگر اس وقت محض مسعود کو چڑانے کے لئے یا اوپری انکسار سے وہ تصویر کو برا بتا رہی تھی، ورنہ سچ تو یہ ہے کہ عقیلہ نے دل میں یہ تصویر مسعود ہی کے لئے انتخاب کی تھی، دانستہ و نادانستہ یا نیم دانستہ طور پر مسعود کی آتشِ شوق کو بھڑکا رہی تھی ۔ وہ سوچ رہی تھی کہ جو نیدہ یابندہ۔ مسعود خود تصویر چرتائی اس کی کتابوں کی الماری میں سے ڈھونڈھ کر نکال لے گا اور اس میں سے یہ تصویر چرا کر لے جائے گا ۔

اماں جان بیٹھی مسکرا رہی تھیں اور ان دونوں کی چھیڑ چھاڑ سے دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھیں کئی برس سے ان کو یہ لڑکا پسند تھا اور جب سے وہ ہوائی فوج میں اچھے عہدہ اور بڑی تنخواہ پر ملازم ہو گیا تھا، ان کی دلی خواہش تھی کہ ان کی لڑکی کی شادی اس لڑکے سے ہو۔ یہ خیال دو برس پرانا تھا، جب مسعود نیا نیا فوج میں بھرتی ہو کر عراق گیا تھا۔ اگر انہیں ڈر لگا تھا تو یہ کہ ہوائی جہاز اڑانے کی ملازمت بہت جوکھوں کی ہے، وہ کرید کرید کر مسعود سے پوچھتیں کہ کیا وہ بری فوج میں منتقل نہیں ہو سکتا، مگر اس کو تو بچپن سے ہوائی جہاز اڑانے کا شوق تھا ۔

اپنے والد سے چوری چھپے وہ تعلیم کے دوران ہی میں ہوائی کلب میں شامل ہو گیا تھا اور والد کو اس نے اس وقت خبر کی تھی جب اس کو تنہا ہوائی جہاز اڑانے کی سند مل چکی تھی ۔ یہ اس کے والد کے اچانک انتقال سے کچھ پہلے اور دوسری عالمگیر جنگ کے چھڑنے کے کچھ بعد کی بات تھی۔ والد زندہ رہتے تو ممکن تھا کہ وہ اسے ہوائی فوج میں بھرتی ہونے سے باز رکھتے، مگر اس کی بیوہ ماں کی گریہ و زاری مسعود کو اپنے ارادہ سے باز نہ رکھ سکی۔ وہ اپنی والدہ سے یہ دل آزار مذاق کرتا کہ اس کے ایک چھوڑ دو بڑے بھائی، جو اس سے زیادہ صالح، فرماں بردار اور خدمت گزار ہیں، ان کی مامتا کو ٹھنڈا رکھنے کے لئے موجود ہیں۔ یہ باتیں سن کر والدہ اور آٹھ آٹھ آنسو روتیں کہ کون ایسی منحوس ماں ہو گی جو اولاد کا مرنا چاہے ۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ مسعود نے بادلِ ناخواستہ ہی والدہ کی دل شکنی گوارا کی تھی، ورنہ اس کی دلی تمنا کچھ اور تھی بچپن سے اسے پڑھنے لکھنے کا بیحد شوق تھا۔ وہ فلسفہ کے ایم اے کے امتحان میں اول درجہ میں امتیازِ خصوصی سے کامیاب ہوا تھا۔ اس کی آرزو تھی کہ اپنی زندگی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے لئے وقف کر دے ۔ اسے یقین تھا کہ وہ فلسفہ سے ازلی مناسبت رکھتا ہے، فلسفہ کے لاینحل مسائل کو پانی کر دے گا، اس کی کتابیں مستند قرار پائیں گی اور شہرت و ناموری بھی اس کے قدم لے گی ۔

مسعود محض شمعِ علم کا پروانہ اور فلسفہ و حکمت کا پرستار تھا ۔ والد مرحوم اور بڑے بھائیوں نے بارہا اصرار کیا کہ وہ سرکاری ملازمت اختیار کرے، ان کی تمنا تھی کہ وہ گھر کا چراغ بنے مگر اسے انگریز کی ملازمت سے نفرت تھی۔ جنگ شروع ہو چکی تھی مگر کشت و خون کا بازار گرم نہیں ہوا تھا۔ جرمنوں نے نہ ابھی مغربی یورپ فتح کیا تھا، نہ روس پر چڑھائی کی تھی، نہ جاپان ابھی میدانِ جنگ میں کودا تھا، مگر ہندوستان میں فوجی بھرتی زور و شور سے ہو رہی تھی اور اس گرم بازاری میں ہر کس و ناکس دھڑا دھڑ بحری، بری اور ہوائی فوج میں بھرتی ہو رہا تھا۔ اسے یہ مشورہ بھی دیا گیا، مگر اس زمانہ میں جب کہ وہ نیا نیا کالج سے نکلا تھا، فوجی ملازمت کو وطن فروشی قرار دیتا تھا۔ وہ اس وقت انگریزوں کی شکست اور اپنے ملک کی آزادی کے خواب دیکھتا تھا۔ بہرحال مسعود نے کسی کی ایک نہ سنی۔ اس کی والدہ اس کی ہٹ سے ہمیشہ نالاں رہیں۔ کہا کرتی تھیں کہ پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آتے ہیں ۔

بچپنے سے مسعود کی طبیعت میں ضد کا مادہ تھا۔ اس کی والدہ سناتی تھیں کہ کسی بات سے روکا جاتا تو رونا تو نہیں تھا، مگر دھڑا دھڑ دیوار سے ایسا سر پھوڑتا تھا کہ موٹے موٹے گومڑے پڑ جاتے تھے۔ لڑکپن سے کتاب کا کیڑا تھا، ہمعمروں کے ساتھ زیادہ کھیلتا کودتا نہیں تھا، مدرسہ میں سب استاد بھی مداح تھے، مگر ایک مرتبہ حسبِ عادت دیر سے مدرسہ پہنچنے پر

استاد نے ہتھیلی پر بید ماری تو اس دن سے پھر مدرسہ کا رخ نہیں کیا۔ سب نے بہتیرا بہتیرا سمجھایا، ڈانٹ ڈپٹ بھی کی، مگر کوئی اثر نہیں ہوا، البتہ پڑھنے لکھنے کا مشغلہ جاری رکھا اور گھر ہی پر پڑھ کر میٹرک پاس کیا۔ کالج میں قدم رکھا تو شطرنج کا چسکا لگ گیا۔ بس پھر کیا تھا، میاں مسعود ہیں اور دن رات شطرنج کا دسترخوان بچھا ہوا ہے۔ دھن یہ سمائی کہ شطرنج میں کمال پیدا کیا جائے مگر پہلے ہی سال میں سہ ماہی اور ششماہی امتحان میں پے در پے ناکام ہوا تو بارے آنکھیں کھلیں اور شطرنج کا شوق دھیما پڑا۔

بی، اے میں ہوا بازی کا شوق دامنگیر ہوا تھا اور ایم اے میں آ کر فلسفہ کی دھن سوار ہو گئی تھی۔ ایم اے کر کے اس نے پی، ایچ، ڈی میں داخلہ لے لیا تھا اور فلسفۂ جمالیات پر تحقیق شروع کر دی تھی۔ اساتذہ اس سے بہت خوش تھے اور اس سے از خود وعدہ کیا تھا کہ تعلیم کی تکمیل کے بعد اسے فوراً لکچرار مقرر کرا دینگے اور پانچ سال بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے سرکاری وظیفہ پر ولایت بھجوا دیں گے۔ مسعود سے زیادہ خوش قسمت کون ہوگا، نوعمری میں اس نے اپنا مقصدِ حیات متعین کر لیا تھا اور اب ذریعۂ معاش کا بھی انتظام ہو گیا تھا، سو روپے ماہوار وظیفہ مل رہا تھا۔

شادی کا کبھی اسے خیال بھی نہیں آیا تھا، مگر علی گڈھ سے گرمیوں کی چھٹیوں میں پہلی بار دہرہ دون جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں برسوں کے بعد عقیلہ اور اس کی والدہ سے ملاقات ہو گئی۔ رفتہ رفتہ بے تکلفی ہو گئی اور آنا جانا بہت بڑھ گیا۔ بچپن اور لڑکپن میں ان لوگوں سے شاذونادر ملنا ہوتا تھا۔ عقیلہ کی شکل و صورت بچپن میں معمولی تھی مسعود کا کبھی اس کی طرف خیال بھی نہیں گیا تھا اور نہ اس کو اس کی والدہ کے طور طریق پسند تھے۔

عقیلہ کی والدہ وقار النساء نواحِ لکھنؤ کے ایک قصبہ کی رہنے والی تھیں، شادی سے پہلے تنگ مہری کا آڑا پائجامہ اور سلیم شاہی جوتی پہنتی تھیں، مگر شادی کے بعد اونچی ایڑی کی جوتی اور ساڑی پہننے لگی تھیں۔ ان کے شوہر ریاستِ حیدرآباد میں تحصیلدار تھے، جہاں مشہور ہے کہ من برستا تھا اور رفتہ رفتہ اول تعلقدار ہو گئے تھے، وقار النساء کے دماغ میں وہی ریاستی خو بو بس گئی تھی اور جاہ پرستی ان کی فطرت میں داخل ہو گئی تھی۔ اپنے سے کم درجہ عزیزوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتی تھیں۔ رشتہ داروں کے نام اور ان کے بچوں کی تعداد تک اکثر بھول جاتی تھیں، مگر حیدرآباد کے امراء کے کتوں اور بلیوں تک کے نام انہیں ازبر تھے، جس سے ان کی حکام رسی

اور رؤساء کے گھرانوں سے خلاء ملاء کا کنا یہ نکلتا تھا۔ لکھنؤ آتیں تو عزیزوں کے ہاں شادی غمی کے موقعوں ہی پر، یا خاص طور پر بلانے سے، تھوڑی دیر کو بڑے ٹھسّے سے جاتیں، مگر فرش پر اس طرح بے آرام ہو کر بیٹھتیں گویا ہمیشہ سے صوفوں پر بیٹھتی آئی ہیں، فرش پر بیٹھنے کی عادت نہیں ہے۔ ہاتھ سے کھانا اس تکلف سے کھاتیں گویا ماں کے پیٹ سے چھری کانٹا ہاتھوں میں پکڑے پیدا ہوئی تھیں، غرض نہ ان کی مغربیت اور رعونت کسی کو گوارا تھی، نہ عزیزوں کی مشرقیت ان کو بھاتی تھی۔

بھلا وہ مسعود کے متوسط درجہ کے گھرانے کو قریبی رشتہ کے باوجود کب خاطر میں لاتی تھیں، مگر بیوہ ہونے کے بعد ان کی کمان ذرا اتر گئی تھی اور حیدرآباد سے یوسف بے کارواں ہو کر لکھنؤ آئیں تو رفتہ رفتہ عزیزوں سے التفات فرمانے لگی تھیں اور جب سے انہیں مسعود کی ہونہاری کا اندازہ ہوا تھا، ان کی نظر انتخاب اس پر پڑنے لگی تھی۔ ہرچند ان کی عمر حیدرآباد کی زرپرست اور جاہ طلب فضا میں گزری تھی، مگر وہاں کے نوجوانوں کے اطوار کو پسند نہیں کرتی تھیں۔ جہاں بیری ہوتی ہے وہاں پتھر آتے ہی ہیں۔ عقیلہ کے بھی پیام آتے رہتے تھے، مگر ملکیوں میں بیٹی دینے پر ان کا دل نہیں ٹھکتا تھا۔

دہرہ دون میں انہوں نے مسعود کو آتے جاتے اچھی طرح پرکھا تھا تو وہ اسے پسند کرنے لگیں اور اپنا ہٹ کی قدر ہونے لگی مسعود کے دل میں بھی عقیلہ کی محبت انگڑائیاں لینے لگی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اسے کسی تعلیم یافتہ لڑکی سے بلاتکلف گفتگو کرنے اور ہنسنے بولنے کا اتفاق ہوا تھا۔ عنفوانِ شباب میں احساسِ محبت کا بیدار ہونا طبعی امر تھا۔ چندہی روز میں عقیلہ اس کے دل و دماغ میں بس گئی، اس کی والدہ کے طور طریق جو لڑکپن میں ناپسند تھے، بدل گئے تھے اور اب شفقت کی آمیزش سے خوش آیند ہو گئے تھے مسعود نے مصمم ارادہ کر لیا کہ شادی کرے گا تو عقیلہ سے، مگر خالہ جان پھر دنیادار اور جاہ طلب تھیں۔ انسان بکری کو بھی چھوڑتا ہے تو ہرا دیکھ کر اور عقیلہ تو ان کی پہلوٹھی کی بیٹی تھی۔ انہیں ایک سو پچاس تا تین سو پچاس کی لونڈوں کو پڑھانے کی نوکری ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ چند اور روز میں انہوں نے مسعود پر ایسا روغنِ قاز ملا اور اس کو ایسا شیشہ میں اتارا کہ عقیلہ کو حاصل کرنے کے لئے وہ لکچراری کا خیال چھوڑ کر اور پی ایچ ڈی کو خیرباد کہہ کر بہتر ملازمت تلاش کرنے پر آمادہ ہو گیا۔

وہ مسعود جو کل تک علم کی دیوی کا پجاری تھا، جسے انگریز کی ملازمت

سے نفرت تھی جس نے والدین اور بڑے بھائیوں کی دل شکنی کی پروا نہیں کی تھی، اب اس بات پر کف افسوس مل رہا تھا کہ چند ہی مہینے پہلے اس کی عمر مقابلے کے امتحانوں کے لئے زیادہ ہو چکی تھی۔ وہ مسعود جو کل تک حب وطن نہیں بلکہ بغض معاویہ کے تحت جرمنوں کی پیش قدمی اور انگریزوں کی پسپائی سے اس امید میں خوش ہوتا تھا کہ اس کا وطن آزاد ہو جائے گا، چار و ناچار ہوائی فوج میں بھرتی ہونے اور مملکت عظمیٰ پر اپنی جان قربان کرنے کے لئے آمادہ ہو گیا۔

پھر بھی وہ طرح طرح سے اپنے دل کو فریب دیتا تھا کہ جنگ کے اختتام پر قومی خدمت کے صلہ میں اسے یونیورسٹی میں پہلے سے دوچند تنخواہ کی جگہ مل جائے گی اور شادی کے بعد زمام اختیار خالہ جان کے ہاتھ میں نہیں، اس کے اپنے ہاتھ میں ہوگی۔ عقیلہ کو وہ اپنے مزاج کے مطابق ڈھال لے گا اور پھر اس کا نصب العین علمی خدمت ہوگا۔

عراق جانے سے قبل اس کی دلی خواہش تھی کہ اس کی منگنی ہو جائے، مگر خالہ جان بڑی زمانہ شناس تھیں، جنگ گھمسان کی ہو رہی تھی، عراق میں جرمنوں کی سازش سے رشید عالی گیلانی نے جو بغاوت برپا کی تھی، اس کی آگ ابھی پوری طرح فرو نہیں ہوئی تھی، جنگ کی ہولناکیاں بڑھ رہی تھیں اور جنگ کے ختم ہونے کے ابھی کوئی آثار نہیں تھے، چنانچہ خالہ جان لطائف الحیل سے ٹال گئیں، بلکہ پیغام کو بیچ ادھر میں لٹکائے رکھا، ہاں یا ناں دو ٹوک جواب نہیں۔ یہ بات مسعود کو سخت ناگوار گزری اور اس نے بھی عہد کیا کہ اب وہ خالہ جان سے انتظار کی گھڑیاں گنوائے گا۔

بغداد میں وہ پہلی مرتبہ مغربی تہذیب و معاشرت سے روشناس ہوا، نوجوان انگریز فوجی افسروں کا دن رات کا ساتھ تھا، شارع الرشید میں، ہوٹلوں میں، ناچ گھروں میں، سینماؤں میں، مغربی لباس میں ملبوس یہودی، انگریز اور عرب لڑکیوں کے جھرمٹ کے جھرمٹ نظر آتے تھے۔ چند ایک غریب گھروں کی یہودی لڑکیوں نے جنہیں اپنا جہیز فراہم کرنے کی فکر تھی، اس پر طرح طرح کے ڈورے ڈالے، جب وہ فوجی ہسپتال میں تین ہفتے بیمار رہا تو انگریز نرسوں نے اس کے سرہانے شب زندہ داریاں کیں اور اس سے پینگیں بڑھانی چاہیں، مگر کبھی ان کی باہمی رقابتوں کی بدولت، اور کبھی اپنی دوراندیشی سے وہ مکڑی کے تار کی طرح ان کے دام سے نکل آیا۔ یہ نہیں کہ وہ جزا و سزا کی امید و بیم میں مبتلا تھا یا شوق گزراں کو معیوب سمجھتا تھا، بلکہ وہ اسے عقیلہ کے ساتھ دغا تصور کرتا تھا، مرد و زن کی مساوات پر اس کا ایمان تھا، جو یہ اجازت نہیں دیتا تھا کہ جو بات عقیلہ کے لئے روا نہ رکھے اسے اپنے لئے جائز ٹھہرائے۔ اور عقیلہ کی عصمت و عفت پر یقین اس کے ایمان کا جزو تھا۔

اس کے بٹوے میں اور اس کی میز پر عقیلہ کی تصویر رہتی تھی، جو آنکھوں آنکھوں میں اس کے دل کا چور پکڑ کر اس سے نظریں چرانے لگتی تھی۔ جب وہ جہاز نفس کے کسی یہودی لڑکی یا انگریز نرس کا تصور دل سے نکال پھینکتا تو عقیلہ کی آنکھیں پھر پہلے کی طرح مسکرانے لگتیں۔ اس کے پاس عقیلہ کی اور بھی تصویریں تھیں۔ بغداد کی بے پناہ گرمی کی دوپہروں میں وہ اپنے کمرہ میں اکیلا بیٹھا اکثر ان تصویروں کو دیکھا کرتا اور خیالات میں ڈوب کر عجیب و غریب نظر فریب اور سحر انگیز جزیروں میں جا نکلتا۔

عراق سے واپسی پر باتوں باتوں میں مسعود نے سادہ لوحی سے یہودی اور عرب لڑکیوں کی مغربی زندگی، شراب نوشی، رقص و سرود اور بیباکیوں کے قصے سنائے تو خواہ مخواہ خالہ جان کا ماتھا ٹھنکا۔ یا تو وہ پہلے منگنی پر راضی نہ ہوئی تھیں یا اب انہوں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ کسی کو بیچ میں ڈال کر مسعود کے واپس جانے سے پہلے اس سے عقیلہ کا نکاح کرا دیں گی، وداع جنگ کے بعد ہوتی رہے گی۔ انہیں یہ اندیشہ ہو گیا تھا کہ کہیں یہ سونے کی چڑیا اڑ نہ جائے۔ مسعود کے کان تک یہ بات پہنچائی گئی، اسے اپنا پچھلا اصرار، خالہ جان کا انکار اور اپنا عہد یاد آیا۔ اب اس کا ناز برداری کرانے کا وقت تھا۔ ویسے بھی باہر کی دنیا کی ہوا کھا کر وہ سراب و تشنہ لبی کی برزخ کا قائل نہیں رہا تھا، چنانچہ اس نے خوش اسلوبی سے بات ٹال دی۔

عقیلہ کی بے شمار تصویریں مسعود نے اسی زمانہ میں کھینچی تھیں اور اب اس کی رخصت ختم ہو رہی تھی۔ آخر روانگی کا دن بھی آ گیا۔ اس روز وہ عقیلہ اور خالہ جان کے پاس بیٹھا عقیلہ کی تازہ اور پرانی تصویروں کی البم اپنے ساتھ لے جانے کے لئے مرتب کر رہا تھا۔ بیشتر اس کی اپنی کھینچی ہوئی تھیں، جو فن تصویر کشی کے اعلیٰ معیار پر پوری اترتی تھیں۔ بعض تصویریں عقیلہ کے بچپن، اسکول اور کالج کی تھیں، ایک گومتی کے کنارے کھیل کود کی تھی، ایک ہولی کھیلنے کی تھی، ایک بیڈمنٹن کھیلنے کی تھی، کچھ دہرہ دون اور منصوری میں پکنکوں کی تھیں، کچھ تاج محل اور ہمایوں کے مقبرہ اور بمبئی کی چوپاٹی کے سیر سپاٹوں کی، وغیرہ وغیرہ۔

.... مگر ایک تصویر پر مسعود ذرا ٹھٹکا، تصویر نہایت معمولی تھی، عقیلہ سفید ساڑی پہنے نہایت سادگی اور اطمینان سے کرسی پر

بیٹھی تھی اور اس کا چھوٹا بھائی، جو دس گیارہ سال کا ہوگا نیکر اور قمیص پہنے پاس کھڑا تھا۔ تصویر سے معلوم ہوتا تھا کہ مدھم روشنی میں برآمدہ میں کھینچی گئی ہے، کیونکہ پس منظر بہت زیادہ اندھیرا اندھیرا تھا، پھر بھی تصویر میں ایک بات تھی۔ عقیلہ کے دیکھنے کا انداز نہایت معصومانہ مگر بہت دلربا تھا۔ اس نے عقیلہ سے یہ تصویر مانگی، مگر چونکہ اسے خود بہت پسند تھی، اس لئے اس نے حسب عادت اس تصویر کی برائی کی اور دینے سے انکار کیا، مگر مسعود نے وہ تصویر چھین ہی لی۔ اسے اپنی یہ تصویر سب سے زیادہ عزیز تھی، مگر مجبوراً خاموش ہوگئی ۔

اتنے میں کچھ سن رسیدہ پرانے خیال کے عزیز آنکلے۔ خالہ جان نے روشن خیالی کا مظاہرہ کچھ نامناسب سمجھ کر البم اور بیٹی کی تصویریں جلدی جلدی سمیٹ دیں۔ اس کے بعد یہ نوبت ہی نہیں آئی کہ مسعود یہ تفصیل معلوم کرتا کہ یہ تصویر کس نے اور کب اور کہاں کھینچی تھی، اسی روز وہ عراق روانہ ہوگیا۔ وہ خط لکھنے کا سخت چور تھا اور خالہ جان سے یہ تفصیلات خط لکھ کر پوچھنا اسے نامناسب معلوم ہوا ۔

مگر وہ تصویر اسے بار بار اپنی طرف کھینچتی۔ البم کھول کر اس تصویر کو وہ پہروں دیکھتا۔ بعد میں البم میں سے نکال کر ہر وقت ساتھ رکھنے لگا اور جب موقع ملتا چھپ چھپ کر دیر تک دیکھتا رہتا۔ اس تصویر میں عقیلہ کی آنکھوں میں عجیب و غریب کشش تھی، جس کی کیفیت ناقابل بیان تھی۔ اس نے خود عقیلہ کی بے شمار تصویریں کھینچی تھیں، جن پر اپنی چابکدستی اور مہارت ختم کر دی تھی مگر کسی میں وہ پراسرار سحر آفریں کیفیت نہیں تھی۔ نگاہیں کسی نقطہ پر جمی ہوئی نہیں تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ فضائے افق سے بہت دور ابد کی سرحد سے بھی پرے، لامکاں کو چیرتی ہوئی کسی حقیقت کی تلاش میں رواں دواں بکھری چلی جا رہی ہیں۔ ان آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا تو ان گمبھیر پتلیوں کے اتھاہ سمندر میں ان نگاہوں کی سوت نہ ملتی۔ مسعود کی بصارت بھی اور بصیرت بھی ان کا سراغ نہ پا کر تھک ہار کر لوٹ آتی۔ ان پراسرار نگاہوں کے ڈانڈے ازل و ابد سے ملے ہوئے معلوم ہوتے۔ اس کا تخیل جس قدر دوڑ دوڑاتا وہ سرچشمہ اسی قدر سراب کی طرح دور تر ہوتا جاتا اور اس کی تشنہ لبی بڑھتی جاتی۔ جتنا وہ اس گتھی کو سلجھاتا، اتنی ہی وہ اور الجھ جاتی۔ کبھی ان نگاہوں میں سمندر کی تہ کا سکون ہوتا، کبھی طوفانی موجوں کا تلاطم، کبھی دنیا سے بے نیازی برستی، کبھی یاس ٹپکتی، کبھی گوشۂ چشم میں خفیف تبسم رقصاں معلوم ہوتا۔ غرض وہ آنکھیں اس کی اپنی دگرگوں کیفیات کی آئینہ داری کرتیں۔ مسعود کے نزدیک لینارڈو ڈاونچی اپنے کمال فن کے باوجود مونا لیزا کی آنکھوں میں وہ جادو نہ بھر سکا، جو کسی نوآموز تصویر کھینچنے والے نے ان آنکھوں میں جگا دیا تھا۔ اس کو ہر سو سے وہی نگاہیں دل میں اترتی اور نس نس میں نشتر کی طرح چبھتی معلوم ہوتیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ ان آنکھوں میں یہ کشش، یہ جاذبیت، یہ مقناطیسیت کہاں سے سمٹ آئی ۔

اس نے عقیلہ کو خلوت و جلوت میں، ہر آن ہر ادا میں دیکھا تھا، مگر جو ناقابل بیان کیفیت تصویر میں بھرپور تھی، کبھی اس کی جھلک بھی اس کو خود عقیلہ کی آنکھوں میں نظر نہیں آئی تھی۔ اسے یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ عکسی تصویر اصلی عقیلہ ہے اور وہ عقیلہ جو لکھنؤ میں رہتی ہے اس اصل کا محض عکس ہے، وہ اصل حقیقت جو اس تصویر میں منعکس رہتی تھی اب وہ عقیلہ سے بھی بہت دور تھی اور خود سے بھی بہت دور، بہت دور۔ مسعود کی روح بیقرار تھی کہ مادی جسمانی بندھن توڑ کر اس حقیقت سے ہمکنار ہو جائے ۔

عراق واپس آنے کے بعد وہ کئی ہفتے انہی خیالات میں محو رہا۔ وہ ہر وقت چپ چپ کھویا کھویا رہتا۔ ایک روز وہ حبانیہ کے ہوائی اڈے سے جہاز لے کر اڑا اور پھر کبھی واپس نہ آیا۔ شبانہ روز کی تلاش سے کئی روز بعد اس کے ہوائی جہاز کا ملبا بحر بنجیر حبانیہ کے قریب جھاڑیوں میں پڑا ملا۔ جہاز کے ڈھانچہ سے سو قدم کے فاصلہ پر "بینڈ ٹو کر ویجے" کے شاہکار "جمالیات" کے ادھ جلے صفحات میں ایک تصویر ملی جو دھوئیں سے سیاہ ہوگئی تھی اور نیچے سے آدھی جل چکی تھی، ایک لڑکی کے چہرہ کی پرچھائیں سی نظر آتی تھی، مگر وہ آنکھیں اسی طرح درخشاں اور سحر ہو نگراں تھیں!

فکاھیہ

نکتہ چیں

سیّد محمدؐ جعفری

صبح سے شام تک نکتہ چینی کرتا ہوں، قینچی کی طرح زبان چلتی ہے، بحث اور مناظرہ کا بادشاہ ہوں، بلکہ شہنشاہ۔ نکتہ چینی کے میدان میں بڑے بڑے رستم زماں مقابلے میں آنے اور خون تھوک گئے، بڑے بڑے بولنے والوں کے ناطقے بند کر دئے۔ انسان کے عیب پر، چیزوں کے نقص پر، معاملات کی خرابی پر، کاموں کی خامیوں پر جتنی جلد میری نظر جاتی ہے شاید ہی کسی کی نظر جاتی ہوگی۔ خدا کے فضل سے کبھی کوئی روشن پہلو نہیں دیکھا۔ جب نظر آیا عیب ہی نظر آیا ہے۔ جب بھی ڈالی بُری نظر ڈالی۔ ایسا ذہن رسا پایا ہے کہ کبھی دھوکا نہیں کھایا ہے۔ پہلی نظر میں تول لیتا ہوں بقول مرزا غالب ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے — ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک — اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

اور مرزا غالب کی بھی کیا حقیقت ہے وہ تو کوئی ایک آدھ صدی پہلے انتقال فرما گئے۔ میرے زمانے میں ہوتے، میرے ہم عصر ہوتے اور یہاں کراچی میں کلفٹن پر ٹہلتے ہوئے مل جاتے، تو وہ نکتہ چینی کرتا، وہ نکتہ چینی کرتا کہ مرزا حیران ہو کر بے ساختہ میرے لئے کہتے کہ "ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے" مرزا کے کلام پر وہ نکتہ چینی کرتا کہ مرزا شعر گوئی سے توبہ کر لیتے "غم روزگار" اور "غم دل" کا نام نہ لیتے اور جہاں میرا ذکر آتا گھبرا کر کہتے کہ ؎

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

اور مرزا غالب پر کیا منحصر ہے، صبح سے شام تک نکتہ چینی کرتا ہوں، زبان کی تلوار سے معلوم نہیں کتنے اپنے فن کاروں کو موت کے گھاٹ اتار چکا ہوں کہ جو زندہ رہتے تو موسیقی و مصوری و شاعری کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکتے۔ سالہا سال سے، صبح سے شام تک نکتہ چینی کرتا ہوں اب حسن و خوبی و رعنائی کی بہاروں سے لطف حاصل کرنے کی قوتیں اور صلاحیتیں کھو چکا ہوں۔ میں خزاں کا پیغمبر ہوں، بربادی و خرابی دیکھ کر خوش ہو جاتا ہوں اور جہاں کوئی اچھی چیز نظر آئی میں نے ناک بھوں چڑھائی۔ مدتیں ہو چکیں کہ ہمدردی کا جذبہ میرے دل و دماغ سے رخصت ہو چکا، آدمی کی حقیقت میری نظر میں کچھ بھی نہیں ؎

مرے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں

سوائے خونِ جگر، سو جگر میں خاک نہیں

نہ مجھے کسی سے ہمدردی ہے نہ کسی کو مجھ سے ہمدردی ہے۔ لوگ اپنے معاملات مجھ سے چھپاتے ہیں، رشتے دار اور عزیز مجھ سے کتراتے ہیں، دوست اپنے حالات مجھے نہیں سناتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ نکتہ چینی کروں گا، بنا بنایا کام بگڑ جائیگا، غضب ہو جائے گا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ میں نکتہ چینی اُن کے بھلے کے لئے کرتا ہوں۔ اللہ نے مجھے یہ کمال عطا کیا ہے، یہ صلاحیت اور یہ استعداد بخشی ہے کہ ایک نظر میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر کے دکھا دوں۔ جب مجھے خدا نے یہ نکتہ چینی کی نعمت دی ہے تو اسے خلقِ خدا کے فائدے کے لئے کیوں نہ کام میں لاؤں۔ اب یہ میری قسمت ہے کہ میں لوگوں کی خدمت کرتا ہوں اور لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہیں میں نکتہ چینی کی بدولت ساری دنیا میں اکیلا ہوں۔ دنیا والے حسد کرتے ہیں مجھ سے جلتے ہیں کہ یہ اتنا بڑا نکتہ چیں کیوں ہے۔ کوئی میرے پاس پھٹکتا بھی نہیں، میں تنہا ہوں، بالکل تنہا!——

—— میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی۔ جو لوگ میری نکتہ چینی کے تختۂ مشق رہ چکے ہیں، جو لوگ میری زبان کی تلوار سے گھائل ہو چکے ہیں، وہ مجھ سے بیزار ہو کر دور دور رہتے ہیں تو انہیں اس بات کا حق ہے، اور وہ بالکل ٹھیک کرتے ہیں، لیکن اب تو اُن لوگوں نے بھی ملنا ترک کر دیا ہے جن پر میں نے ابھی تک وار نہیں کیا ہے، جن پر اپنے نکتہ چینی کے ہنر کو میں نے ابھی تک نہیں آزمایا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب میری شہرت مجھ سے آگے آگے چلتی ہے۔ یہ میری نکتہ چینی کی شہرت ان مقامات پر جا پہنچی ہے جہاں میں ابھی تک نہیں پہنچ سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب تنکا ربڑی مشکل سے ہاتھ آتا ہے۔ کم از کم اس شہر کے لوگ تو خوب چوکنے

پاکستان شاہراہ ترقی پر

ہوگئے ہیں۔ کوئی بھولا بھٹکا مسافر باہر سے آجائے تو لاعلمی میں پھنس جاتا ہے۔ میں صبح سے شام تک نکتہ چینی کرتا ہوں اور جب تک جی بھر کے نکتہ چینی نہ کرلوں کھانا ہضم نہیں ہوتا اور صحت خراب ہوجاتی ہے۔ اس لئے میں نے نکتہ چینی کے مختلف اسلوب ایجاد کرلئے ہیں۔ مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں ہے کہ جو بات میں کہہ رہا ہوں وہ صحیح ہے یا غلط، مجھے صرف نکتہ چینی کرنے کی ضرورت ہے۔ ہر شخص اور ہر چیز پر نکتہ چینی کرنے کا ایک فارمولا یا ایک نسخہ ہے۔ جیسا آدمی ہوگا ویسا ہی فارمولا یا نسخہ نکتہ چینی استعمال ہوگا۔ کوئی تاجر ہوگا تو اس کے لئے کہوں گا چور بازاری کرتا ہے، اپنے بھائیوں کا خون چوستا ہے، سماج دشمن عناصر میں سے ہے، اسے روپیہ سے الفت ہے، روپیہ ہی اس کا دین ایمان ہے۔ کوئی وکیل ہوگا تو کہوں گا کہ یہ غریبوں میں مقدمہ بازی کی آگ بھڑکا کر خود ہاتھ سینکتا ہے، اپنی وکالت چمکانے کے لئے اس نے خاندانوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ کوئی سرکاری ملازم ہے تو کہتا ہوں کہ رشوت لیتا ہے، دوزخ میں جلے گا اقربا پروری کرتا ہے، اس کا انجام برا ہوگا۔ کبھی صوبائی تعصب کا الزام لگا کر اسے بدنام کرتا ہوں، کبھی یہ کہتا ہوں کہ سفارش سے ملازم ہوگیا ہے، اپنے افسروں کی خوشامد کرکے اپنا الو سیدھا کرتا ہے، ورنہ کام سے بالکل ناواقف ہے۔ کوئی ڈاکٹر ہو تو کہتا ہوں کہ آدمیوں کی جانوں سے کھیلتا ہے فیس کی شکل میں مریض کا خون چوس لیتا ہے جس کی موت کی گھڑی دور ہو وہ تو اس کے ہاتھ سے بچ کر نکل جاتا ہے، ورنہ شہر کے قبرستان اسی ڈاکٹر نے آباد کئے ہیں۔

میں نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ ایک تاجر، ایک وکیل، ایک سرکاری ملازم، ایک ڈاکٹر شریف اور ایماندار بھی ہوسکتا ہے میں نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ ہر طبقہ کے لوگوں میں اچھے آدمیوں کی تعداد بہت کافی ہوتی ہے، ورنہ عالم کا انتظام ایک دن نہ چل سکے۔

نکتہ چینی کرنے کے لئے بڑی سوجھ بوجھ، بڑی احتیاط اور بڑے سلیقہ کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر اگر نکتہ چیں غلط فارمولا یا نسخہ استعمال کرے تب بھی بات بگڑ جاتی ہے۔ اگر وکیل کے لئے کہہ جائے کہ مریض کا خون چوس لیتا ہے یا اسکول کے ماسٹر کے لئے کہا جائے کہ مقدمہ بازی کی آگ بھڑکاتا ہے یا تاجر کے لئے کہہ جائے کہ سفارش سے ملازم ہوگیا ہے تو کون یقین کرے گا۔ تیر ہرگز نشانے پر نہیں بیٹھے گا۔ اس لئے نکتہ چیں کو ایک شاطر شکاری کی طرح جال بچھانا پڑتا ہے۔ اگر وار اوچھا پڑے تو شکار زخمی ہوکر بھاگ جاتا ہے اور پھر اس وقت تک ہاتھ نہیں آتا جب تک کہ اس کا حافظہ بالکل ہی خراب نہ ہوجائے یا بالکل ہی بے وقوف نہ ہو۔ اسی لئے تو کہا گیا ہے کہ ع

عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیئے

میں صبح سے شام تک نکتہ چینی کرتا ہوں، مجھے بڑی مشق ہے، میں نے بڑے بڑے ببر شیروں کو مار گرایا ہے، لیکن بعض اناڑی نکتہ چینوں کی وجہ سے اس شہر میں شکار آسانی سے نہیں ملتا۔ لوگ آسانی سے ہاتھ نہیں لگتے، پاس پھٹکنے نہیں دیتے، دور سے ہی مجھے آتا دیکھ کر راہِ فرار اختیار کرلیتے ہیں۔ مجھے "بور" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ایک شاعر نے تو میری تعریف میں ایک قصیدہ کہہ ڈالا ہے۔ اس قصیدے میں مجھے "بور" کے نام سے مخاطب کرکے یوں کہا گیا ہے کہ :-

تو مرا دوست ہے اور دوست سے چلتا نہیں زور
میری تقدیر کی گردش نے بنایا تجھے "بور"
"وقت" کہتے ہیں جسے لوگ کہ "سرمایہ ہے"
کتنی افراط سے حصے میں ترے آیا ہے
دور سے دیکھ کے انساں تجھے گھبراتے ہیں
شاہ رہ چھوڑ کے گلیوں میں نکل جاتے ہیں
نکتہ چینی سے تری بھاگتے ہیں خورد و کلاں
تو جو چاہے تو کراچی میں بھی خالی ہوں مکاں

دیکھا آپ نے اب یہ صورت حالات ہوگئی ہے۔ اب کوئی فردِ بشر ہاتھ نہیں آتا۔ اس لئے میں نے یہ طریقہ نکالا ہے کہ حکومت پر نکتہ چینی کرتا ہوں۔ حکومت پر نکتہ چینی کرنے کے لئے کوئی زیادہ دشواری نہیں ہوتی۔ بہت سے فارمولے استعمال ہوسکتے ہیں، مثلاً اگر اب کے سال سردی کی لہر آئی تو میں کہوں گا کہ یہ حکومت اور حکام کی سرد مہری کی وجہ سے آئی ہے، یہ باہر کے ملکوں سے جاڑا منگوا لیتے ہیں اور عوام کا خیال نہیں کرتے اور اگر بفرضِ محال انہوں نے جاڑا نہیں منگوایا اور وہ بغیر ویزا کے چلا آیا ہے تو یہ سرحد پر بیٹھے ہوئے کیوں مکھیاں مار رہے تھے؟ اس نکتہ چینی میں تمام سابق سزا یافتہ لوگ، وہ لوگ جو کسی الکشن میں ہار چکے ہیں یا وہ لوگ جو نام و نمود کے خواہشمند ہیں یا کسی ٹھیکے کے حاصل کرنے میں ناکام رہے یا جن پر کام نہ کرنے کی وجہ سے اُن کے افسر نے سختی کی ہے، سب لوگ میرے ہم آواز ہوجائیں گے۔

یہ ایک خاص فن ہے، اس کو نکتہ چینی برائے نکتہ چینی کہتے ہیں۔ اس سے قوم اور ملک کو بہت فائدہ پہنچتا ہے۔ حکام اس کی وجہ سے بہرے ہوجاتے ہیں، پھر وہ سچی بات بھی نہیں سنتے۔ اس سے دنیا اور عاقبت دونوں سنورتی ہیں، اللہ مجھے معاف کرے میرا انجام کیا ہوگا۔ (بشکریہ ریڈیو پاکستان کراچی)

لاہور کا عجائب گھر

ملک شمس

لاہور کا عجائب گھر پاکستان بھر میں سب سے قدیم اور عظیم عجائب گھر ہے۔ اس کا آغاز ۱۸۶۴ء میں ایک صنعتی نمائش (پنجاب ایگزیبیشن) سے ہوا، جو اس عمارت میں منعقد کی گئی تھی، جہاں آج کل گوشت سبزی کی مارکیٹ ہے۔ اس نمائش کا مقصد پنجاب کی صناعی اور ہنر مندی کے اعلیٰ اور زیبن نمونے پیش کرنا تھا۔ نمائش کے اختتام پر دستکاریوں کے چیدہ چیدہ نمونے مستقل نمائش کے لئے رکھ لئے گئے۔ اس طرح موجودہ مارکیٹ میں لاہور کے عجائب خانے کی داغ بیل ڈالی گئی۔ پھر صناعی کے نمونوں کے علاوہ قدیم مجسمے، پہلے وقتوں کے سکے اور دیگر پرانی اشیاء بھی فراہم ہونے لگیں، حتیٰ کہ تیس سال کے عرصے میں جدید و قدیم اشیاء کا اس قدر وسیع ذخیرہ ہو گیا کہ کسی دوسری عمارت کی ضرورت لاحق ہوئی۔ لہٰذا ۱۸۹۴ء میں لاہور عجائب گھر کی موجودہ عمارت کی بنیاد اس چندے سے رکھی گئی جو ملکہ وکٹوریہ کی گولڈن جوبلی کے سلسلے میں فراہم کیا گیا تھا۔

تکمیلِ عمارت پر عجائب گھر کی اشیاء اپنی اس وقت کی عمارت میں منتقل ہوئیں اور اس کے ذخیروں میں برابر اضافہ ہوتا چلا گیا۔ پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر لاہور عجائب گھر کے ذخیرے اور نوادر ان شعبہ جات پر مشتمل ہے۔ صنعت و حرفت کے نمونے، ازمنہ قدیم کے آثار، پرانے سکے، پتھروں، اور معدنی اشیاء کے نمونے، اسلحہ، فنِ مصوری اور نقش نگاری کے نمونے، مسودات، محکمہ جنگلات، محکمہ زراعت اور محکمہ اصلاح دیہات سے متعلق اشیاء اور موڈل، نباتی نمونے اور مردہ حیوانات کا ذخیرہ، کتبات وغیرہ۔ لیکن آہستہ آہستہ لاہور عجائب گھر کا دائرہ محدود کیا جاتا رہا، اور یکے بعد دیگرے کئی شعبے یہاں سے ہٹا دئے گئے۔ مثلاً مردہ حیوانات کا شعبہ یہاں سے گورنمنٹ کالج لاہور منتقل کیا گیا، یہاں اس کا ایک الگ عجائب خانہ قائم ہوا۔ اب لاہور کا عجائب گھر صرف فنونِ لطیفہ اور آثارِ قدیمہ تک محدود کر دیا گیا ہے تاکہ یہ ایسے مخصوص شعبوں سے متعلقہ اشیاء کو فراہم اور محفوظ کرے اور ان سے متعلقہ علم کی تحقیق اور نشر و اشاعت کرے، چنانچہ لاہور کا عجائب خانہ پاکستان میں اپنی نوعیت کا سب سے عظیم ادارہ ہے، جس کی چہار دیواری کے اندر مختلف قوموں، اور زمانوں کی تہذیبیں اور ثقافتوں کے عروج و زوال کی داستانیں ہماری بصارت و بصیرت کو دعوت دیتی ہیں۔

اس عجائب گھر میں انسانی تہذیب کے کہنہ ترین نشانات ہزارہا برس پہلے کے پتھر کے ہتھیار ہیں، جنہیں حضرت انسان کی اولیں صنعت کہا جا سکتا ہے۔ پتھر کے ان ترشے، رگڑے اور گھسے ہوئے مدور اور نوکدار ٹکڑوں میں ہمارے ازمنۂ قبل تاریخ کے مورثوں کی داستان کے وہ ابواب مضمر ہیں، جنہیں قدیم و جدید حجری زمانوں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ آج سے کوئی پانچ چھ ہزار سال قبل انسان نے بڑی بڑی اہم ایجادات کیں، جن کی بدولت ہم تہذیب کے بامِ بلند پر پہونچے ہیں۔ اسی نوع کی ایک پانچ ہزار سالہ کہنہ تہذیب کے آثار موئن جو دڑو واقع سندھ اور ہڑپہ پنجاب سے بے نقاب ہوئے ہیں، جو ہمارے عجائب گھر کی ایک چھوٹی سی گیلری میں پڑے زبانِ حال سے ہمیں اپنے وارثوں کے معاشرے، ان کے مذہب، ان کی صنعت و حرفت ان کے علوم و فنون اور افکار کا پتہ دیتے ہیں۔

موئن جو دڑو اور ہڑپہ کے آثار جس تمدن کے مظہر ہیں، وہ وادیٔ سندھ کی تہذیب کہلاتی ہے۔ یہ اپنے عروج کے زمانے میں تمام مغربی پاکستان میں اور اس سے پرے بہار اشتر تک پھیلی ہوئی تھی۔ وادیٔ سندھ کی تہذیب کے حامل تانبہ اور ٹین ملا کر کانسی کے ہتھیار اور ظروف بناتے

تھے۔ وہ سونے چاندی کے زیورات بناتے اور انہیں دور دراز ممالک سے تجارت کے ذریعہ حاصل شدہ جواہرات سے مرصع کرتے، ان کی خوراک کاشت سے حاصل کئے ہوئے گیہوں پر بھی مشتمل تھی۔ وہ مچھلی کا شکار کانٹے سے کرتے تھے۔ دنیا میں سب سے پہلے کپاس بونے اور اسے کات کر سوتی کپڑا بننے کا سہرا انہی کے سر ہے۔ دو پہیوں والی گاڑی کا استعمال بھی ان کے ہاں تھا۔ وہ مجسمہ سازی کے فن کو بھی جانتے تھے ظروف کو نقش و نگار سے آراستہ کرتے تھے فطرت کی دیوی یعنی ماتا دیوی کی پوجا کرتے تھے۔ ان کے یہاں فن تحریر بھی تھا، جو تصویروں کے ذریعہ اظہار مطلب اور حروف تہجی کے بین بین تھا، مگر ان کی تحریروں کو، جو یقیناً بیش قیمت معلومات کی حامل ہیں، ابھی تک پڑھا نہیں جا سکا۔ ان کے رہائشی مکانوں اور مذہبی تعمیرات، شہروں کی فراخ اور سیدھی سڑکوں اور چوکوں اور شہری صفائی کے انتظامات سے ہر کوئی حیرت زدہ ہوتا ہے۔ لیکن اس بات پر بہت تعجب ہوتا ہے کہ ان کے پالتو جانوروں میں گھوڑے کا نشان نہیں ملتا اور نہ وہ لوہے جیسی دھات ہی سے آشنا تھے۔

مغربی پاکستان کی یہ عظیم الشان تہذیب آریا حملہ آوروں کے ہاتھوں کوئی ۱۵۰۰ ق۔م کے لگ بھگ تہ و بالا ہوئی، مگر ساتھ ہی اس تہذیب نے آریاؤں کی طرز معاشرت اور ان کے مذہبی تصورات پر گہرا اثر ڈالا۔ عجائب گھر لاہور کے گندھارا بت بیحد تاریخی، فنی اور ثقافتی اہمیت رکھتے ہیں۔ انہیں گوتم بدھ کے پیروکار پہلی صدی قبل مسیح سے شروع ہو کر چوتھی صدی قبل مسیح تک تراشتے رہے۔ ان مجسموں کا مسکن وہ علاقہ ہے جسے ویدوں کے زمانے سے گندھارا کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا اور جو وسط افغانستان سے لے کر راولپنڈی کے قرب و جوار تک پھیلا ہوا تھا۔ اس علاقائی نسبت کی وجہ سے ان کو گندھارا کے بت کہا جاتا ہے۔

گندھارا کے بت بیشتر گوتم بدھ کی زندگی سے متعلق ہیں، جن میں تقریباً اس کی زندگی کے تمام واقعات تراشے گئے ہیں۔ ان بتوں کے عروج کا زمانہ کشان شہنشاہوں کا دور تھا۔ بالخصوص شہنشاہ کنشک کا زمانہ۔ گندھارا کے صنم سازوں نے ہی سب سے پہلے گوتم کی وفات کے کوئی پانچ سو سال بعد اس کی مورتی تراشنے کی جرأت کی۔ گندھارا کے بت بدھ مت کے اندر ایک عظیم انقلاب کے مظہر ہیں۔ جبکہ ہنایان فرقہ

وجود میں آیا۔ گندھارا کی بت طرازی کی ایک نمایاں خصوصیت یونانی رومی عناصر ہیں۔ یہ ان اثرات کو ظاہر کرتے ہیں جن کا تعلق یونان کی ہیلنی دور کی تہذیب سے ہے یعنی وہ تہذیب جو اسکندر اعظم کی مشرقی فتوحات کے بعد اس کے جانشینوں کے عہد میں ظہور پذیر ہوئی۔

گندھارا کے بتوں میں ہیلنی اثرات ایشیائے کوچک اور شام کے رومی علاقوں سے کوشانوں کے عہد میں آئے جن کا رومیوں سے گہرا تجارتی تعلق اور ثقافتی رشتہ تھا اور جو رومی ہیلنی تہذیب و ثقافت کے علمبردار تھے۔ چنانچہ گندھارا کے بتوں میں یونانی تناسب اعضاء اور یونانی نقوش جابجا نظر آتے ہیں۔ کہیں بدھ کے روپ میں اپالو کے خدوخال ہیں، کہیں رعد کا دیوتا زیس گوتم کے پیچھے پیچھے جا رہا ہے، کہیں محبت کا دیوتا ایروس سامنے آ کھڑا ہوتا ہے، کہیں مشہور یونانی دیوی منروا جلوہ گر ہے۔ کہیں ایٹلس دنیا کو سر پر اٹھائے کھڑا ہے کہیں عیش کی میخواری کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی جمالیاتی اعتبار سے گندھارا کی مورتیوں کا مقام اتنا زیادہ بلند نہیں، مگر ان کی تاریخی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ تبت، چین، منگولیا، کوریا، ترکستان اور جاپان تک بدھ دھرم گندھارا ہی کے راستے اور ذریعہ سے پھیلا، چنانچہ گندھارا کے آرٹ نے بھی مشرق بعید کے ایشیا کے بودھی آرٹ پر اثر ڈالا۔

قطع نظر فن کے، گندھارا کی مورتیاں اس چار سو سالہ بودھی تمدن کی بھی آئینہ دار ہیں، جن کا امتزاج متعدد ملکی و غیر ملکی عناصر سے ہوا اور جو بالآخر پانچویں صدی عیسوی میں تین وحشی قوموں کے ہاتھوں تباہ ہوئی۔

لاہور کے عجائب گھر میں کچھ مورتیاں عہد گپت کی بھی ہیں جو قرون وسطیٰ کی ہند ثقافت کا زریں زمانہ کہلاتا ہے۔ ان میں سے ایک عورت کا دھڑ گپتا آرٹ کا بلند ترین شاہکار ہے، جس میں نسوانی اعضاء کا تناسب مثالی طور پر حسین ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ کالیداس کے نسوانی حسن و جمال کے تخیل کو پتھر کی ایک مورتی میں ہمیشہ کے لئے منتقل کر دیا گیا ہے۔

لاہور کے عجائب گھر کا ایک مایۂ ناز ذخیرہ سکہ جات ہیں۔ ان میں باختری، یونانی، سیتھین، پارتھوی اور کوشان فرمانرواؤں کے سکوں کو ممتاز درجہ حاصل ہے۔ اگر یہ سکے نہ ملتے تو شمال مغربی پاکستان کی تاریخ کا

ایک اہم قدیم باب، جو تقریباً دو سو سالوں پر مشتمل ہے، ناپید ہو جاتا۔ ان سکوں ہی کے مطالعے سے سکندر اعظم کے اُن یونانی جانشینوں کی تاریخ کو مرتب کیا گیا ہے جو موریا سلطنت کے زوال پذیر ہونے پر باختر سے اُٹھ کر شمال مغربی پاکستان پر حملہ آور ہوئے اور جن کی بدولت اس خطے میں عرصۂ دراز تک ہیلنی آرٹ اور تمدن کا دور دورہ رہا۔ باختریوں کے یہ سکے آرٹ کے بھی بلند پایہ نمونے ہیں، جنہیں دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ شاید دنیا میں اس سے پیشتر اور اس کے بعد اتنے حسین سکے مضروب نہیں کئے گئے۔ ان سکوں کے ذریعہ ہماری تاریخ کا ایک اور اہم عقدہ بھی حل ہوا ہے۔ انہی کی مدد سے خروشتی زبان، جو مردہ ہو چکی تھی، پڑھی گئی ہے اور اس سے اہم قیمتی تاریخی معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ سلاطین غزنہ دہلی کے سکوں کا بھی ایک بے نظیر مجموعہ ہے، جس کے مطالعہ سے اس دور کی اسلامی تاریخ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ مغل شہنشاہوں کے سکے بھی ایک لاثانی مجموعے کی شکل میں فراہم ہیں۔ ان سے ہمیں بے شمار دلچسپ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ پاک و ہند کی سات سو سالہ اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے لئے لاہور عجائب گھر کے ان سکوں سے کافی مدد ملتی ہے۔

اس عجائب گھر کے تصویر خانے کی زینت وہ حسین تصویریں ہیں جنہیں پہاڑی تصویریں کہنا چاہیئے۔ یہ تصویریں اٹھارویں صدی عیسوی میں کانگڑہ کے چھوٹے چھوٹے راجپوت راجاؤں کی سرپرستی میں بنائی گئیں۔ اگرچہ یہ تصویریں فن مصوری کے فنی تاثرات کا ہی نتیجہ ہیں۔ ان کی تکنیک مغل مصوری ہی کی تکنیک ہے، مگر ان کی روح مغل تصویروں سے جدا ہے۔ اور ان کے اسلوب کی جاذبیت الگ نوعیت رکھتی ہے۔ ان تصویروں میں ایک تغزل کا سا حسن ہے اور غنائی سی کشش ہے، ایک دلفریب رومانیت اور دل آویز ڈرامائیت! ان کی فضا اور ماحول افسانوی حسن و جمال کی دنیا میں ڈوبا ہوا ہے۔ ان پہاڑی تصویروں کا مقصد انسانوں کے حقیقی اور اصلی خد و خال کی نقش کشی نہیں، بلکہ جذبات نگاری ہے۔ یہ عشقیہ تصویریں ہیں جن کا محبوب ترین موضوع حسن و عشق کی رنگین داستانیں ہیں۔ ان میں وہی جذبات ہیں جو ماہیوں اور ڈھولوں میں ظاہر کئے جاتے ہیں۔ پیا سے جدائی، اس کا انتظار کرنا، اس سے ملنا اور روٹھنا اور منانا، غرض ان میں پریت کی وارداتوں کی نقش کشی ہے، جو یہ تصویریں اپنے دل لبھانے نرالے انداز میں کرتی ہیں۔ آئیے ذرا ایک تصویر پر چلتی ہوئی نظر ڈالیں، جس میں اپنے محبوب سے بچھڑی ہوئی عورت کی دلی کیفیات کو مصورانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ساون کا مہینہ ہے، پروا چل رہی ہے۔ یکایک آسمان پر گھنگھور گھٹائیں چھا گئیں اور بوندا باندی شروع ہو گئی۔ ادھر موروں نے شور مچانا شروع کر دیا، بادل بھی گرجنے لگے اور کالی کالی بدلیوں سے بجلی بھی چمکنے لگی۔ برکھا رت کی اس ولولہ انگیز فضا میں ایک پُر شباب لڑکی لبِ بام کھڑی اپنے پردیس گئے ہوئے پیتم کی راہ تک رہی ہے، جس کا خیال اس کے دل میں بے اختیار چٹکیاں لے رہا ہے۔

عجائب گھر کی یہ چند ایک جھلکیاں ظاہر کرتی ہیں کہ اس کے بوسیدہ پتھر اور ٹھیکریاں اس کے شکستہ بُت، اس کے بوسیدہ پتھر، اس کے پرانے وقتوں کے سکے اور اس کی تصویریں، تاریخ و تمدن کے وہ اوراق ہیں جن سے چشم بینا بہت کچھ پڑھ سکتی ہے۔ (بہ شکریہ ریڈیو پاکستان۔ لاہور)

پریوں کی وادی - کاغان: بقیہ صفحہ نمبر ۲۲

اپنی جان بھی دے دیتے ہیں۔ صوبۂ سرحد کے مزارعین ایکٹ مجریہ ۱۹۵۰ء کے نفاذ سے ان گوجروں کی حالت اب بہت بہتر ہو گئی ہے۔ چنانچہ کئی گوجر اب زمینوں کے مالک ہو چکے ہیں اور ان میں احساس کمتری کا تباہ کن جذبہ کم ہوتا جا رہا ہے۔

سامان سفر: وادی کاغان جانے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے ہمراہ گرم کپڑے، کمبل، مضبوط قسم کے جوتے، گرم موزے، عمدہ گرم لبستر، چھتریاں اور برساتیاں، ضروری دوائیں، سگرٹ، ڈبوں میں بند میوے، پنیر وغیرہ لے جائیں۔ ان کے علاوہ کھانا لے جانے کے برتن (ٹفن کیریئر) اور فلاسک بھی ضروری ہیں۔

ناران کے بغیر اس وادی کے باقی ہر پڑاؤ پر کھانے پینے کی چیزیں مثلاً آٹا، چینی، نمک اور سبزیوں کا ساتھ لے جانا ضروری ہے۔ گھی، مکھن، انڈے، مُرغ اور تازہ دودھ وادی کے ہر حصے میں مل سکتا ہے، اس لئے ان اشیاء کا ساتھ لے جانا غیر ضروری ہے۔ کھانا پکانے کا بندوبست ہر پڑاؤ پر ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار بخوبی کر سکتے ہیں۔

ناران میں ہوٹل اور کھانے پینے کی دکانیں موجود ہیں، اس لئے ناران میں ٹھہرنے والوں کے لئے ضروری نہیں کہ وہ کھانے پینے کی ضروری اشیاء مثلاً آٹا، چینی وغیرہ ساتھ رکھیں۔ البتہ تازہ پھل اور سبزیاں ساتھ لے جائی جائیں تو اچھا ہے کیونکہ تازہ پھل اور سبزیاں دیگر مقامات کے علاوہ ناران میں بھی نہیں ملتیں۔

سر سیّد کے قلمی کارنامے :—— بقیہ ص ۱۲

گو زیادہ تر مذہبی، کتابیں ہیں جن کی مدد سے انہوں نے قرآن شریف کی تفسیر لکھی اور انجیل کی شرح۔ اس میں ایک دلچسپ کتاب سید محمود کا وہ مضمون بھی شامل ہے، جس پر ان کو کیمبرج یونیورسٹی سے انعام ملا تھا۔ ان کے گول کمرہ میں وہ ڈپلوما لگا ہوا ہے، جو ان کو "فیلو آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی" بننے پر ملا تھا اور اس پر ان کو بہت فخر بھی ہے۔ دیوار پر مسز جان اسٹریچی کی جو ان کے دوست بھی ہیں ایک قد آدم تصویر آویزاں ہے۔ دوسری تصاویر سر سالار جنگ، لارڈ لٹن اور ہز ہائی نس نظام حیدرآباد کی آویزاں ہیں۔ ان کے دن خوشگواری سے گذرتے ہیں۔ ان کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں اَن تھک طاقت ہے۔ علاوہ قومی اہمیت کے مسائل پر وسیع النظری کے ان میں کام کرنے کی ایک خاص طاقت ہے اور وہ یہ کہ کام کے متعلق وہ باریک سے باریک تفصیل کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ وہ صبح ۴ بجے اٹھتے ہیں۔ اس وقت وہ اپنے اخباری آرٹیکل لکھتے ہیں یا کتابوں اور پمفلٹ کی تصنیف کرتے ہیں۔ پھر آنے والوں سے ملتے ہیں، جن میں سرکاری اور غیر سرکاری لوگ شامل ہوتے ہیں اور ساتھ کالج کی کمیٹیوں کی معتمدی کے فرائض ادا کرتے ہیں، جو اکثر نہ صرف دن تک محدود رہتے ہیں بلکہ زیادہ تر رات گئے تک ان کا وقت لے لیتے ہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کی دماغی محنت، اچھی صحت اور طولانی زندگی کی ضامن ہے۔ ان کا کھانا یورپین طرز پر ہوتا ہے اور کسی قسم کی نشہ آور مشروبات استعمال نہیں کرتے، بلکہ صرف پانی پیتے ہیں۔ رات کے کھانے پر یا کھانے کے بعد ان کے بعض احباب آجاتے ہیں اور زیر گفتگو مسائل "میٹافزکس"، مذہب و سیاست، فارسی شعر و شاعری اور لطائف و ظرائف ہوتے ہیں۔ وہ اوسط قد کے ہیں، مگر جسم گٹھا ہوا اور وزن ۱۹ اسٹون سے نکلتا ہوا ہے۔ ان کا چہرہ شاندار ہے اور اس سے ان کا عزم اور قوتِ ارادی جھلکتی ہے، جب وہ آرام کرتے ہیں تو چہرہ پر سختی کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں، لیکن جب وہ بات کرتے ہیں تو چہرہ پر دل کا جوش جھلکنے لگتا ہے، جو ان کی خصوصیت ہے۔ وہ قہقہہ بھی لگاتے ہیں اور عام لوگوں کی طرح مذاق بھی پسند کرتے ہیں۔ بعض دفعہ کھانے کی میز کے نیچے اپنی لکڑی چھپا دیتے ہیں اور ایک دم سے سانپ! سانپ! پکار اٹھتے ہیں تاکہ لوگ گھبرا جائیں۔ اکثر اوقات اصلاح قوم ہی پر گفتگو کرتے ہیں۔ ان کے ایک دوست کو اونگھنے کی عادت ہے۔ وہ ان کو چھیڑتے ہیں، وہ دوست ظاہر یہ کرتے ہیں کہ وہ سب سن رہے ہیں مگر پھر اونگھنے لگتے ہیں، چنانچہ بسا اوقات ان کو جگانے کے لئے وہ ایک دم سے شور کر دیتے ہیں اور زور سے قہقہہ مارتے ہیں۔ ان کی بیوی کو مرے ہوئے عرصہ ہو گیا۔ بعض وقت آنکھ مار کر کہتے ہیں کہ میرا ارادہ پھر شادی کرنے کا ہے۔ مگر اب کے کسی انگریز عورت سے کروں گا تاکہ میں انگریز سوسائٹی میں زیادہ گھل مل سکوں — مگر شرط یہ ہے کہ وہ ۸۰ برس کی بوڑھی ہو اور اس کے دانت کوئی نہ ہوں۔ وہ ایک پیدائشی مقرر و خطیب ہیں۔ وہ جس وقت گرمجوشی سے تقریر کرتے ہیں، تو ان کا طرزِ تقریر گلیڈ اسٹون جیسا ہو جاتا ہے۔ جذبات سے ان کے ہونٹ کانپنے لگتے ہیں اور آواز بھرا جاتی ہے اور بدن میں کپکپی محسوس ہوتی ہے۔ شدتِ جذبات کا یہ اظہار سننے والوں پر خاص اور فوری اثر کرتا ہے"

"ماہ نو" میں مضامین کی اشاعت کے متعلق شرائط

۱۔ "ماہ نو" میں شائع شدہ مضامین کا مناسب معاوضہ ادا کیا جائے گا۔

۲۔ مضامین بھیجتے وقت مضمون نگار صاحبان یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالہ یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا۔

۳۔ ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر حوالہ جات دینے ضروری ہیں۔

۴۔ ضروری نہیں کہ مضمون وصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔

۵۔ مضمون کے قابلِ اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

۶۔ ایڈیٹر مسودات میں ترمیم کرنے کا مجاز ہوگا۔ مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

تشنگی — بقیہ صفحہ ۲۸

تم سے بہت بے تکلفی سے بات کرتے ہیں۔ کیا وجہ کہ انھوں نے مجھ سے بات کرنے کی کبھی جرأت نہیں اور جب مسز ظہیر نے آنکھوں میں آنسو بھر کر مجھ سے کہا کہ ان کے میاں ان کا پورے طور پر خیال نہیں رکھتے تو میں نے سوچا کہ اس کی وجہ تم ہو ——— لیکن ریحانہ خدا گواہ ہے میں نے وہ ذلیل باتیں ہرگز نہیں کیں جو مجھ سے منسوب کی جاتی ہیں۔ درحقیقت یہ سب مسز حمید صغری کی جو خواہ مخواہ مجھ سے خفا ہو گئی ہیں شرارت ہے۔ خود ان کا ذہن ان باتوں کا موجد ہے۔

"بس آپا زاہدہ" ریحانہ نے جو نئے نئے انکشافات سے الجھ گئی تھی بات کاٹی "اب جانے دیجئے۔ بے تعلق اور غیر ذمہ دار لوگوں سے خفا ہونا بھی میں اپنی توہین سمجھتی ہوں۔ مجھے یقین تھا اور ہے کہ کوئی بھی شریف اور معقول عورت اس قسم کی گری ہوئی ذلیل باتیں منہ سے نہیں نکال سکتی۔ مجھے آپ سے کوئی شکایت ہے نہ مسز حمید صغری سے۔ بہت سے لوگوں کو قابلِ معافی سمجھنا چاہیئے۔"

"تو تم نے مجھے معاف کر دیا۔" آپا زاہدہ خوش ہو گئیں۔ آخرکار انھوں نے پورے طور پر ریحانہ کو بے وقوف بنا لیا، لیکن جب رات کو اپنے کمرہ میں آکر انھوں نے ریحانہ کی باتوں کو اپنے ذہن میں دہرایا، تو وہ اچانک چونک پڑیں۔ ریحانہ کا کیا مطلب تھا۔ اس نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ اسے یقین ہے کہ آپا زاہدہ نے اس کے خلاف کچھ نہیں کہا، بلکہ اس کے الفاظ تھے "مجھے یقین ہے کہ کوئی بھی شریف اور معقول عورت اس قسم کی گری ہوئی باتیں نہیں کر سکتی ———" تو کیا اس نے جملہ غیر مکمل چھوڑ دیا تھا؟ وہ کہنا چاہتی تھی "جیسی کہ آپ نے کی ہیں" وہ اتنی غیر ذمہ دار ہیں کہ ریحانہ ان سے خفا ہونا بھی اپنی توہین سمجھتی ہے؟ وہ انھیں اس لئے قابلِ معافی سمجھتی ہے کہ ان کی فطرت بدلی نہیں جا سکتی؟

آپا زاہدہ نے اپنے سر کو ہاتھوں پر تھامتے ہوئے گذرے ہوئے واقعات پر بے لاگ نظر ڈالی۔ ریحانہ کی کوئی حرکت بھی قابلِ گرفت نہ تھی۔ تو کیا ریحانہ کی ہر دلعزیزی آپا زاہدہ کو ان کی محرومیوں کا احساس دلاتی رہی؟ کیا وہ محض احساسِ کمتری کی بنا پر اسے نیچے گرا کر اس کی جگہ لینا چاہتی تھیں؟ اور اب ہر ایک ان کی باتوں کو تمسخر آمیز انداز سے سنتا ہے اور ان کی طرف یوں دیکھتا ہے گویا کہہ رہا ہو "ہم تمہاری حماقتوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔" اور ریحانہ بدستور مسکرایا کرتی ہے۔ اگرچہ اب اس کی مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی ہے۔

"ذلیل!" آپا زاہدہ نے اچانک زور سے نہ جانے کسے مخاطب کیا۔ اور اپنے چہرے کو تکیے میں چھپا لیا۔

لاکھوں نے اِن میں روپیہ لگایا ہے

فائدے روز روشن کی طرح واضح ہیں۔ سیونگ سرٹیفکیٹ اس وقت روپیہ لگانے کی سب سے زیادہ نفع بخش صورت ہے۔ آپ بآسانی پانچ یا دس یا اس سے زیادہ مالیت کے سرٹیفکیٹ خرید سکتے ہیں اور ضرورت پر بھنا بھی سکتے ہیں۔ دس برس میں ہر دس روپے کے ۱۵ روپے ہو جاتے ہیں۔

کاغذ بنانے کا ایک نیا کارخانہ

آپ سیونگ سرٹیفکیٹ کیوں نہ خریدیں؟

صرف اتنا ہی نہیں۔ ان تمسکات میں رقم لگانا اچھے پاکستانی ہونے کی نشانی ہے۔ آپ نہ صرف اپنی اور اپنے بال بچوں کی آئندہ خوشحالی کا سامان کرتے ہیں بلکہ اپنے ملک کو ایک پھلتا پھولتا خوشحال اور ترقی یافتہ ملک بنانے میں بھی مدد دیتے ہیں۔

ترقی کے لئے روپیہ بچانا شرط ہے

پاکستان سیونگ سرٹیفکیٹ میں روپیہ لگایئے

۵½ فیصدی منافع۔ ڈاکخانوں، سیونگ بیورو اور مقررہ ایجنٹوں سے مل سکتے ہیں۔

A.F.P.-25/56 (3)

کستان میں سماجی کام

کراچی میں نابیناؤں کا
بستی مرکز جہاں بہت سے
مفید ہنر سکھائے جاتے ہیں